باغ و بہار

میر امّن دہلوی

مُرتب

رشید حسن خاں

باغ و بہار

باغ و بہار

میر امّن دہلوی

مرتّبہ

رشید حسن خاں

انجمن ترقّی اردو (ہند)، نئی دلّی

سلسلۂ مطبوعاتِ انجمن ترقیِ اُردو (ہند) ۱۴۲۰

کتاب کا نام : ——— باغ و بہار
مصنّف : ——— میر امّن دہلوی
مرتّب : ——— رشید حسن خاں
کُل صفحات : ——— ۸۴۷
سنۂ اشاعت : ——— ۱۹۹۲ء
بہ اہتمام : ——— شمیم جہاں
تزئین کار : ——— انیس احمد
خوش نویس : ——— سیّد ابوجعفر زیدی لکھنوی
طباعت : ——— ثمر آفسٹ پرنٹرز، نئی دہلی
قیمت : ——— ۱۷۵ روپے

ISBN 81-7160-040-9

BOOK DEPOT BRANCH :
ANJUMAN TARAQQI URDU (HIND)
URDU BHAWAN, 2ND FLOOR,
CHOWHATTA, PATNA-800-004

Head Office :
ANJUMAN TARAQQI URDU (HIND)
URDU GHAR, ROUSE AVENUE,
NEW DELHI - 110 002

اُردو میں تدوین کے معلّمِ اوّل

مولانا امتیاز علی خاں عرشی (مرحوم)

کی یاد میں

جن کی شفقت بھری باتوں، پُرخلوص تنبیہوں اور
مثالی تحریروں سے میں نے تدوین کے آداب سیکھے ہیں۔
ذرّۂ آفتابِ تابانیم

فہرست

حرفِ آغاز

اُردو کی مختصر داستانوں میں جو شہرت اور مقبولیت میر امّن کی باغ و بہار کو حاصل ہوئی، وہ کسی اور داستانی قصے کو نصیب نہیں ہوئی۔ کم و بیش ایک سو نوّے سال سے یہ کتاب مختلف سطحوں کے تعلیمی نصابات میں شامل رہی ہے، اِس لیے اب تک بلا مبالغہ یہ سیکڑوں بار چھپ چکی ہے اور نقل در نقل کی وجہ سے ہر نئی پرنٹ کے متن میں کچھ نہ کچھ تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں۔ یہ کوئی حیرت کی بات نہیں، کیوں کہ ہر مشہور اور بار بار چھپنے والی کتاب کے ساتھ یہی کچھ ہوتا ہے۔ باغ و بہار کی اہمیت ہر زمانے میں تسلیم کی گئی، اِس کے باوجود کسی متنی نقّاد کو اس کے متن کا تنقیدی اڈیشن تیّار کرنے کا خیال نہیں آیا۔ ہاں کئی حضرات نے باغ و بہار کو اِس طرح ضرور شائع کیا کہ متن کے بجائے مقدّمے پر زور دیا، قصّے کے مآخذ کی نشان دہی کی یا تنقیدی رائے کا اظہار کیا۔

باغ و بہار کا پہلا تنقیدی اڈیشن رشید حسن خاں صاحب نے تیّار کیا تھا، جو مکتبۂ جامعہ نئی دہلی کے سلسلۂ "معیاری ادب" کے تحت ۱۹۶۴ء میں شائع ہوا تھا، اِس کو بہت پسند کیا گیا تھا۔ (ہندستان، پاکستان اور روس کی مختلف یونی ورسٹیوں کے نصابوں میں اِسے شامل کر لیا گیا)۔ اہلِ نظر نے اِس اڈیشن کی بہت تعریف کی؛ لیکن خدا کا شکر ہے کہ خاں صاحب اپنے اِس کام سے خود مطمئن نہیں تھے، کیوں کہ اِس اڈیشن کی تیّاری کے دوران انھیں احساس ہو گیا تھا کہ باغ و بہار کا سائنٹفک انداز میں تنقیدی اڈیشن تیّار کرنا بہت محنت طلب ہے اور اِس کام کی تکمیل کے لیے کئی سال کی مدّت درکار ہے۔ انھوں نے ۱۹۶۴ء ہی سے اِس کام کا ڈول ڈال دیا اور اہم اڈیشنوں کی تلاش شروع کر دی۔ پندرہ بیس سال کی مدّت میں انھیں باغ و بہار کی وہ خطّی اور مطبوعہ روایتیں مل گئیں جنھیں ترتیبِ متن کے لحاظ سے بنیادی حیثیت حاصل تھی۔

باغ و بہار کے ۱۰۲ صفحوں کا متن پہلی بار ۱۸۰۲ء میں ہندی مینول میں شائع ہوا تھا،

نگر وہ ہے کہاں ؛ یہ بات کسی کو معلوم نہیں تھی۔ اِس کا مکمّل اڈیشن ۱۸۰۴ء میں شائع ہوا تھا۔ اِن دونوں روایتوں کے ساتھ ساتھ اُنھوں نے اِس کی اُس پہلی خطی روایت کو بھی تلاش کر لیا جس پر میر امّن نے نظرِ ثانی کی تھی اور جس کا اُس وقت تک کسی کو علم نہیں تھا۔ اِن کے علاوہ ڈنکن فاربس اور مولوی عبدالحق کے مرتّبہ اڈیشن بھی خاں صاحب کے پیشِ نظر رہے۔

رشید حسن خاں صاحب متنی تنقید کے فن کے ماہر ہیں۔ اُنھوں نے اِس فن کے مختلف پہلوؤں پر خاصی تعداد میں مضامین لکھے ہیں، جو کتابی صورت میں بھی شائع ہو چکے ہیں۔ خاں صاحب نے کئی کلاسیکی متون مرتّب کیے ہیں، لیکن اِس میدان میں اُن کا پہلا معرکہ آرا کارنامہ فسانۂ عجائب کا وہ تنقیدی اڈیشن ہے جسے ۱۹۹۰ء میں انجمن ترقّیِ اُردو (ہند) نے شائع کیا تھا اور اب اُن کا دوسرا اہم کام باغ و بہار کا زیرِ نظر تنقیدی اڈیشن ہے۔ فسانۂ عجائب کی طرح اِس کا متن بھی انتہائی سائنٹفک انداز میں مرتّب کیا گیا ہے۔ اِس میں متنی تنقید کے طریقۂ کار کے تمام اصولوں اور ضابطوں کی پابندی کی گئی ہے۔ حواشی میں متن سے متعلّق تشریحی اور لسانی پہلوؤں سے بحث کی ہے، اشخاص، مقامات وغیرہ پر وضاحتی نوٹ لکھے ہیں۔ بھرپور مقدمہ لکھا ہے، جس میں زیرِ نظر متن کے تنقیدی اڈیشن کے سلسلے میں اپنے طریقۂ کار کی تفصیل بھی بیان کی ہے۔

فورٹ ولیم کالج میں "صاحبانِ انگریز" کو اُردو پڑھانے کے لیے جو نصابی کتابیں تیار کی گئیں، اُن کے متن کے لیے گل کرسٹ نے املا کا ایک باقاعدہ نظام تیار کیا تھا اور متن میں اعراب، علامات اور رموزِ اوقاف کا اِس انداز سے التزام کیا تھا کہ پڑھنے والا لفظوں کا تلفّظ صحیح طور پر کر سکے اور عبارت کو پڑھنے میں غلطی نہ ہو۔ خاں صاحب نے اِس متن میں اُن تمام التزامات کو ملحوظ رکھا ہے۔ باغ و بہار کے متن میں ایسے الفاظ کی تعداد خاصی ہے جن کی املا ہمارے زمانے میں بدل گئی ہے یا تلفّظ میں تبدیلی آ گئی ہے، یا وہ اب نامانوس ہیں ؛ ایک مفصل ضمیمے میں ایسے الفاظ پر وضاحتی حواشی لکھے ہیں۔

ہم کو میر امّن کی زندگی کے حالات کا بہت کم عِلم ہے، اِس لیے اِس موضوع پر

چند مضامین ہی لکھے گئے اور اُن میں بھی میر امّن کے نام اور تخلّص سے لے کر تاریخِ وفات تک بہت سی باتیں درست نہیں۔

خاں صاحب، میر امّن کے سوانحی حالات میں کوئی اہم اضافہ تو نہیں کر سکے، لیکن اب تک جو حالات پیش کیے گئے تھے، خاں صاحب نے اُن کا محقّقانہ جائزہ لے کر کئی مفروضات کی تردید کی ہے اور صحیح صورتِ حال کی نشان دہی کی ہے۔

غرض خاں صاحب نے غیر معمولی محنت، دیدہ ریزی اور اِس فن میں اپنی مہارت سے کام لے کر باغ و بہار کا ایسا اڈیشن تیار کیا ہے، جو اُردو میں متنی تنقید کا ایک مثالی اور قابلِ تقلید نمونہ بن گیا ہے۔

خلیق انجم

جنرل سکریٹری انجمن ترقّیِ اُردو (ہند)

مقدمہ

باغ و بہار کو جدید اُردو نثر کا پہلا صحیفہ کہا جائے، تو کچھ بے جا نہ ہوگا۔ فورٹ ولیم کالج خواہ کسی مقصد کے تحت قائم کیا گیا ہو، لیکن یہ واقعہ ہے کہ وہ تصنیف و تالیف کا ایسا مرکز بن گیا تھا جس کے اثرات اُردو زبان کی ترقی کے سلسلے میں دوررس اور دیرپا ثابت ہوئے۔ فورٹ ولیم کالج کو یہ شرف حاصل ہے کہ وہ اُردو میں باضابطہ تصنیف و تالیف کا پہلا ادارہ تھا، جہاں پہلی بار نئے لسانی، ادبی اور نصابی تصورات کا نقش درست ہوا تھا۔ یہ تصورات عملی صورت میں بڑے پیمانے پر کارفرما ہوئے تھے اور بہت جلد اِن کے نتائج سامنے آنے لگے تھے ——— اِسی طرح اِس ادارے میں اُردو کی کتابیں کسی بھی غرض اور کسی بھی نقطۂ نظر کے تحت لکھوائی گئی ہوں، مگر یہ حقیقت ہے کہ جدید اُردو نثر اور نئے لسانی شعور کے فروغ میں اُن کی حیثیت بنیادی رہی ہے اور یہ حیثیت تاریخی اہمیت رکھتی ہے۔

اِس ادارے سے اُردو کی بہت سی کتابیں شائع ہوئیں، جنھوں نے ایک طرف تو جدید نصابی ضرورتوں کے تصور کو ذہنوں میں روشن کیا اور دوسری طرف زبان کے نئے انداز اور بیان کے نئے اُسلوب کی نقش گری کی۔ اِن کتابوں نے کم و بیش کی نسبت کے ساتھ شہرت بھی پائی، لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ میر امّن کی باغ و بہار کو سب سے زیادہ شہرت ملی اور سب سے بڑھ کر قبولِ عام نصیب ہوا۔ اِس میں بہت زیادہ دخل اِس بات کو تھا کہ میر امّن کی نثر نے روزمرہ اور محاورۂ اہلِ زبان کی قدر و قیمت کو واضح کیا، بیان میں سادگی اور

صفائی کی ناگزیر ضرورت کا احساس دلایا؛ لیکن اِس سے بھی بڑھ کر یہ کہ چلن کی اہمیت کو روشن کیا۔ اِس بات کو یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ اِس کتاب نے زبان اور بیان کے نئے شعور کو سب سے زیادہ فروغ بخشا۔ ضمنی طور پر یہ بات بھی کسی نہ کسی حد تک قابلِ ذکر ہے کہ یہ کتاب شائع ہوتے ہی نصابِ تعلیم کا حصہ بن گئی تھی اور آج کے دن تک اِس شرف سے محروم نہیں ہو پائی ہے۔

باغ و بہار مکمل صورت میں پہلی بار ۱۸۰۴ء میں کلکتے کے "ہندوستانی چھاپا خانہ" میں طبع ہوئی تھی۔ اِس نسخے کا مفصل تعارف تو آگے آئے گا، یہاں صرف یہ کہنا ہے کہ اُس پہلی اشاعت کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اُس میں، گل کرسٹ کے مجوزہ طریقۂ کار کے مطابق، اکثر الفاظ پر اعراب لگائے گئے ہیں، نیز رموزِ اوقاف اور علامات کو بھی شاملِ عبارت رکھا گیا ہے۔ بعد کی اشاعتوں میں یہ التزامات کم ہوتے گئے، یہاں تک کہ کُلّیتاً ختم ہو گئے۔ ہمارے زمانے میں اِس کتاب کے جس قدر اڈیشن سامنے آئے ہیں، اُن میں ایسا کوئی التزام نظر نہیں آتا۔

گل کرسٹ نے اعراب اور علامات کو فورٹ ولیم کالج کی کتابوں میں اِس لیے شامل کیا تھا کہ اُس کو خوب معلوم تھا کہ اِن التزامات کے بغیر اُس کے طالبِ علم کسی بھی متن کو صحیح طور پر نہیں پڑھ پائیں گے ـــــــ اُنیسویں صدی کے آغاز میں گل کرسٹ کے سامنے جو صورتِ حال تھی، بیسویں صدی کے اختتام کے قریب ہمارے زمانے میں ویسی ہی صورتِ حال پیدا ہو گئی ہے۔ بدلتے ہوئے حالات کا نتیجہ کہیے یا اِسے حالات کے جبر سے تعبیر کیجیے، اب ہمارے طالبِ علم (اور بہت سے اساتذہ بھی) اُن التزامات کے بغیر بہت سے کلاسکی نصابی متنوں کو صحیح طور پر نہیں پڑھ سکتے۔ دامن کے چاک اور گریباں کے چاک میں کچھ فاصلہ نہیں رہا ہے۔ اِس لیے بھی یہ ضروری تھا کہ اِس کلاسکی نصابی متن کو اِس طرح مرتب کیا جائے کہ اشاعتِ اوّل کے انداز پر وہ سب التزامات شاملِ متن ہوں ـــــــ ہماری ضرورت کے علاوہ، اصولِ تدوین کے لحاظ سے بھی یہ عمل یوں ضروری ہے کہ اِس کے بغیر اِس کتاب کے متن کو منشائے مصنّف

کے مطابق پیش نہیں کیا جا سکتا۔ اشاعتِ اوّل کا متن ہمارے سامنے ہے؛ اب اگر اس کتاب کو اس طرح چھاپ دیا جائے کہ اشاعتِ اوّل کی اہم خصوصیات شاملِ متن نہ ہوں، تو اس طریقۂ کار کو واضح طور پر اصولِ تدوین کی خلاف ورزی کہا جائے گا۔

میر امّن کی دوسری کتاب گنجِ خوبی کا مکمل خطّی نسخہ، میر امّن کے ہاتھ کا لکھا ہوا موجود ہے؛ اس نسخے میں بھی میر امّن نے گل کرسٹ کے مقرر کردہ نظامِ املا کو ملحوظ رکھا ہے اور اکثر و بیش تر معروف و مجہول آوازوں کے لیے علامات کی پابندی بھی کی ہے؛ اور اس سے مصنّف کا اختیار کیا ہوا طریقۂ کار ہمارے سامنے آجاتا ہے اور یوں اُس طریقۂ کار سے صرفِ نظر کو کسی طرح مناسب نہیں کہا جا سکتا؛ بل کہ اُس طریقۂ کار کی پابندی کو لازم قرار دیا جائے گا۔

○

حکومتِ جموں کشمیر کے مالی تعاون سے مکتبۂ جامعہ (نئی دہلی) نے "معیاری ادب" کے نام سے مشہور کلاسکی متنوں کو چھاپنے کا ایک سلسلہ شروع کیا تھا۔ مقصد یہ تھا کہ صحیح متن، کم سے کم قیمت پر، بہتر طباعت کے ساتھ طالب علموں کے لیے مہیا کیے جا سکیں۔ اس سلسلے کی کتابیں محدود مقاصد کے تحت تیار کرائی گئی تھیں۔ ضخامت کو کم سے کم رکھنے کے لیے یہ طریقہ بھی اپنایا گیا تھا کہ مرتّبِ متن کا مقدمہ دو چار صفحوں سے زیادہ نہ ہو۔ باغ و بہار بھی اس سلسلے کی کتابوں کی فہرست میں شامل تھی۔ ۱۹۶۳ء کے اوائل میں اُس کو مرتّب کرنے کی ذمّے داری مجھے سونپی گئی تھی۔ ۱۹۶۴ء میں یہ اڈیشن پہلی بار شایع ہوا تھا۔ اُسی وقت یہ بات میرے ذہن میں بیٹھ گئی تھی کہ یہ نا تمام کام ہے اور یہ کہ اس کتاب کی تدوین آسان کام نہیں۔ یہ بہت بڑی ذمّے داری ہے اور بہت صبر آزما کام ہے۔ اس میں کئی مہینے نہیں، کئی سال صرف ہوں گے۔ یہ بات بھی اُنھی دنوں سمجھ میں آگئی تھی کہ اس کتاب کی اشاعتِ اوّل [ہندوستانی چھاپاخانہ، کلکتہ، سالِ طبع: ۱۸۰۴ء] سے پہلے کی ایک مطبوعہ روایت [مشمولۂ ہندی مینول، سالِ طبع: ۱۸۰۲ء] کو تلاش کرنا از بس ضروری ہے۔ اُس کی بازیافت کے بغیر تدوین کا کام ادھورا رہے گا۔

یہ بات تو مجھے معلوم تھی کہ باغ و بہار کے ایک سو دو صفحے[2] ایک انتخابی مجموعے "ہندی مینول" میں شائع ہوئے تھے، مگر مشکل یہ تھی کہ یہ بات، میری معلومات کے مطابق، کسی کو نہیں معلوم تھی کہ ہندی مینول ہے کہاں۔ عتیق صدیقی مرحوم نے اپنی عمر کا خاصا بڑا حصہ فورٹ ولیم کالج اور گل کرسٹ سے متعلق کاغذات کی چھان بین میں گزار دیا تھا۔ دہلی سے لے کر کلکتے تک وہ بڑے بڑے کتاب خانے دیکھ چکے تھے اور نیشنل آرکائیوز، سنٹرل سکریٹریٹ اور نیشنل میوزیم جیسے مقامات پر محفوظ ذخیروں کو بھی کھنگال چکے تھے، لیکن وہ مرحوم بھی اِس انتخابی مجموعے کی تلاش میں کام یاب نہیں ہو سکے تھے۔ اِس مجموعے سے متعلق کچھ تفصیلات اُنھوں نے اپنی قابلِ قدر کتاب "گل کرسٹ اور اُس کا عہد" میں بعض دوسرے مآخذ کی مدد سے فراہم کر دی تھیں، مجھے بھی مرحوم کی اِسی کتاب سے اِس مجموعے کے وجود کا علم ہوا تھا، مگر یہ دل چسپ بات تھی کہ خود وہ مجموعہ "دخترِ افراسیاب" بن کر رہ گیا تھا۔ عتیق صدیقی مرحوم کے بعد اِس سلسلے میں جن لوگوں نے (مضامین یا کتابوں کی صورت میں) کچھ لکھا، وہ سب مرحوم کی تحریر پر کوئی قابلِ ذکر اضافہ نہیں کر سکے، یوں کہ پچھلے حوالوں کو دُہرا دینے کے عمل کی تکرار ہوتی رہی۔ یہاں یہ وضاحت کر دی جائے کہ پچھلے حوالوں کو دُہرانا بجائے خود کوئی قابلِ اعتراض بات نہیں۔ بہت سے مآخذ کے سلسلے میں ہم سب مجبور ہوتے ہیں کہ پچھلے حوالے یا حوالوں پر اکتفا کریں، اِس بنا پر کہ وہ مآخذ دست یاب نہیں ہوتے، لیکن یہ ضروری ہوتا ہے کہ اِس کی صراحت کر دی جائے۔ ہندی مینول کے سلسلے میں عموماً یہ ہوا کہ اِس کا حوالہ دینے والوں نے اِس صراحت کی ضرورت نہیں سمجھی کہ یہ کتاب دست یاب نہیں اور اِس سے متعلق جو کچھ لکھا جا رہا ہے، اُس کا علم دوسرے ذرائع سے ہوا ہے۔

۱۹۶۴ء سے ۱۹۸۴ء تک مسلسل میں اِس فکر میں رہا کہ ہندی مینول کا پتا نشان معلوم کیا جائے، کیوں کہ یہ بات میرے نزدیک طے شدہ تھی کہ ایک سو دو[2] صفحات پر مشتمل اُس روایتِ اوّل کو سامنے رکھے بغیر اِس متن کی تدوین صحیح طور پر ہو ہی نہیں سکتی۔ حُسنِ اتفاق سے ڈاکٹر صدیق الرحمان قدوائی [اُستادِ شعبۂ اُردو، جواہر لال نہرو

یونی ورسٹی، نئی دہلی] ایک بہ ظاہر غیر ادبی سلسلے میں لندن جانے کا پروگرام بنا رہے تھے۔ میں نے اُن سے تاکید کر دی تھی کہ وہاں کے معروف اور کم معروف کتابی ذخیروں میں اس مجموعے کو ضرور تلاش کریں۔ قدوائی صاحب نے خود بھی گل کرسٹ کی ادبی خدمات پر پی۔ ایچ۔ ڈی کے لیے مقالہ لکھا تھا، یوں اُنھیں بہت سی تفصیلات کا علم تھا اور وہ خود بھی اِس مجموعے کو دیکھنا چاہتے تھے۔ واپس آکر اُنھوں نے یہ خوش خبری سنائی کہ ہندی مینول مل گیا۔ میں بیان نہیں کر سکتا کہ مجھے کس قدر مسرت ہوئی تھی۔ اُنھوں نے یہ بھی کہا کہ وہ بعض مجبوریوں کی بنا پر اُس کا عکس اپنے ساتھ نہیں لا سکے ہیں، مگر اس کا انتظام کر آئے ہیں کہ وہ عکس یہاں آجائے۔ سال بھر سے زیادہ مدت گزر گئی اور عکس نہیں آیا۔ قدوائی صاحب اچھے دوست ہیں، مخلص اور غم گسار ہیں، لیکن پرانے شرفاے کرام کی طرح کاہلی اور بے پروائی میں بھی کسی سے کم نہیں۔ کسو نے ہمیں سجھا گایا کہ اُنھوں نے لندن میں جن صاحب سے عکس بھیجنے کی فرمایش کی تھی، وہ صاحب اِن لوازمِ تہذیبِ اشرافیہ میں موصوف کے شریکِ غالب نکلے اور میں نے یہ خیال کیا کہ "آسمان سے گرا، کھجور میں اٹکا" والی مثل صادق آنے لگی ہے۔

اب خدا کا کرنا یہ ہوا کہ بمبئی یونی ورسٹی کے ایک سمینار میں شرکت کرنا پڑی اور وہاں ڈاکٹر عبدالستار دلوی (صدر شعبۂ اُردو، بمبئی یونی ورسٹی) کے گھر پر اُن کے برادرِ بزرگ محمد قاسم دلوی صاحب سے ملاقات ہوئی۔ بات چیت سے اندازہ یہ ہوا کہ آدمی مہذب بھی ہیں اور معقول بھی، یہ بھی معلوم ہوا کہ لندن میں رہتے ہیں۔ مجھے تو اسی کتاب کی لو لگی ہوئی تھی، سارے تکلفات کو بالاے طاق رکھ کر میں نے اُن سے کہا کہ مجھے فلاں کتاب کے عکس کی ضرورت ہے۔ قاسم صاحب نے فوری طور پر وعدہ کر لیا۔ جی تو بہت خوش ہوا، مگر ساتھ ہی یہ وسوسہ بھی دل میں پیدا ہوا کہ جو وعدہ فوراً کر لیا جاتا ہے، یوں دیکھا گیا ہے کہ اکثر وہ پورا نہیں ہوتا۔ مہینا بھر کے بعد کیا دیکھتا ہوں کہ لندن سے ایک پارسل چلا آرہا ہے جس میں ہندی مینول میں شائع شدہ باغ و بہار کے ایک سو دو صفحات کا عکس لپٹا ہوا ہے۔ جیسی حیرت آمیز مسرت مجھے اُس وقت

ہوئی تھی، ویسی مسرت سے زندگی میں بہت کم دوچار ہوا ہوں۔ بیس اکیس سال کے انتظار اور تلاش کے بعد یہ عکس آنکھوں کے سامنے آیا تھا۔

اب جو ہندی میننول میں شامل ۱۰۲ صفحات کا طبعِ اوّل کے صفحات سے مقابلہ کیا تو معلوم ہوا کہ جگہ جگہ جملے بدلے ہوئے ہیں، لفظ بدلے ہوئے ہیں اور بعض مقامات پر عبارتیں بھی بدلی ہوئی ہیں۔ اس کا سیدھا سادا مطلب یہ تھا کہ میر امّن نے جب پہلی بار اس کتاب کو لکھا ہے، تو عبارت کا انداز بہت سے مقامات پر طبعِ اوّل (یعنی مؤخر روایت) سے مختلف تھا۔ اس بات کو زیادہ مناسب طور پر اور صحیح طور پر اس طرح کہنا چاہیے کہ دوسری بار جب یہ کتاب چھپنے کے لیے گئی ہے (۱۸۰۴ء میں جس کی طباعت مکمل ہوئی تھی) تو اُس وقت اُس روایتِ اوّل پر، جس کے ۱۰۲ صفحے ہندی میننول میں شامل ہیں، میر امّن نے پورے طور پر نظرِ ثانی کی تھی۔

اس مرحلے پر یہ بات ذہن میں آئی کہ ہندی میننول میں اگرچہ باغ و بہار کے ۱۰۲ صفحے چھپے تھے، لیکن سارے قرائن اس پر دلالت کرتے ہیں کہ میر امّن نے ۱۸۰۱ء کے اواخر میں یعنی ہندی میننول کی ترتیب سے پہلے اس کتاب کو مکمل کر لیا تھا، یہ الگ بات ہے کہ ایک مجبوری کی بنا پر، جس کی تفصیل عتیق صدیقی کی محولۂ بالا کتاب میں موجود ہے، چھپے صرف ۱۰۲ صفحے؛ اس صورت میں اس کتاب کی اُس روایت کو مکمل صورت میں کہیں تو ہونا ہی چاہیے۔ میری تلاش سے زیادہ اس میں محض اتفاق کو دخل تھا (بل کہ حُسنِ اتفاق کو) کہ یہ معلوم ہوا کہ لندن ہی میں باغ و بہار کی اُس روایتِ اوّل کا مکمل خطی نسخہ محفوظ ہے۔ نیت درست تھی تو منزل یوں آسان ہوئی کہ اُس خطی نسخے کا عکس بھی فوری طور پر مل گیا۔ ہندی میننول کے مطبوعہ صفحات سے جب اس خطی نسخے کے صفحات کا مقابلہ کیا گیا تو معلوم ہوا کہ واقعتاً یہ وہی روایتِ اوّل ہے جس کی تلاش تھی۔

اس کے بعد مشہور مستشرق ڈنکن فاربس کے مرتب کیے ہوئے نسخۂ باغ و بہار کے پہلے اڈیشن کی تلاش شروع ہوئی۔ یہ ۱۸۴۶ء میں لندن میں چھپا تھا۔ اس نسخے

کا جو چوتھا اڈیشن (مطبوعہ ۱۸۶۰ء، لندن) میری نظر سے گزر چکا تھا۔ "معیاری ادب" کے سلسلے میں باغ و بہار کا جو متن مرتّب کیا تھا، اُس وقت اِس چوتھے اڈیشن سے استفادہ کیا تھا۔ مگر پہلا اڈیشن اُس وقت مجھے نہیں مل سکا تھا، جب کہ بُنیادی اہمیت اُسی پہلے اڈیشن کی ہے۔ ذرا سی کوشش سے یہ پہلا اڈیشن بھی ہاتھ آ گیا۔ ۱۸۰۴ء کا چھپا ہوا نسخہ (جو باغ و بہار کا پہلا مطبوعہ اڈیشن ہے) پہلے ہی سے موجود تھا۔ اِس طرح سب ضروری نسخے جمع ہو گئے اور ۱۹۶۴ء میں جس کام کو مکمّل کرنے کی خواہش دل میں پیدا ہوئی تھی اور ارادہ کیا تھا، اب جا کر اُس کی تکمیل کا سر و سامان مہیّا ہوا۔ اِس طویل مدّت میں اِس کام کو مکمّل کرنے کا جذبہ کبھی مدّھم نہیں پڑا، مگر آدابِ تدوین کے احترام نے ناروا عجلت کے احساس کو کبھی کارفرما نہیں ہونے دیا۔ اصولِ تحقیق پر ایمان نے بے ایمانی کی پیدا کی ہوئی قناعت پسندی کو ذہن پر اثر نہیں ڈالنے دیا اور نشاطِ کار کا ایسا احساس کبھی ذہن پر حاوی نہیں ہو سکا جس سے ہوس کے تقاضوں کو آب و رنگ ملتا ہے۔ احباب نے سہل حسب مشکل پسندی کے بہت طعنے دیے، لیکن ایسا کوئی جملہ بھی کارگر نہیں ہو سکا۔

جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، باغ و بہار کی اشاعتِ اوّل (۱۸۰۴ء) کا متن اعراب، علامات اور رموزِ اوقاف کی شمولیت کے ساتھ چھپا ہے۔ یہی صورت ہندی مینول میں شامل ۲۰ صفحات کی ہے۔ اِس طرح یہ لازم ٹھہرا کہ اِس متن کو اب جو مرتّب کیا جائے، تو اُس میں بھی بُنیادی نسخے کے التزامات کو برقرار رکھا جائے؛ یعنی ضروری الفاظ کو اعراب سے خالی نہ رکھا جائے، معروف و مجہول اور غنّہ آوازوں کے لیے علامات کو بھی شامل کیا جائے اور رموزِ اوقاف کو بھی شامل رکھا جائے۔ جب اِن پابندیوں کی رعایت کے ساتھ تدوین کا کام شروع کیا گیا تو معلوم ہوا کہ بیسیوں لفظ ایسے ہیں جن پر مصنّف کی تحریر کے مطابق اعراب لگائے جائیں تو آج بہت سے طالبِ علم اور بہت سے اساتذہ بھی اُلجھ سکتے ہیں۔ میں صرف ایک مثال سے اِس کی وضاحت کروں گا۔ اشاعتِ اوّل میں اور ہندی مینول میں بھی مصدر "چھِپنا" اور اُس کے مشتقات میں پہلے حرف کے نیچے ہر جگہ زیر ملتا ہے [یعنی: چھِپنا، چھِپتا ہے وغیرہ] ۔ گنج خوبی کا جو مخطوطہ میر امّن کے

ہاتھ کا لکھا ہوا ہے، اُس میں بھی ہر جگہ التزام کے ساتھ میر امّن نے پہلے حرف کے نیچے زیر لگایا ہے۔ آج کل دلّی والے "پِچھونا" کہتے ہیں [ہاں اہلِ لکھنؤ "بِچھونا" کہتے ہیں] ۔کچھ ایسی ہی صورتِ حال بہت سے لفظوں کے املا کے سلسلے میں سامنے آئی ۔مثلاً اشاعتِ اوّل اور ہندی مینول، دونوں میں ہر جگہ "اعلا" اور "ادنا" ملتے ہیں، اسی طرح "مُعلّا"۔ مخطوطۂ گنجِ خوبی میں بھی میر امّن نے اپنے قلم سے ہر جگہ اِن لفظوں کو اسی طرح لکھا ہے۔ اِسی طرح مثلاً "جمیرات" (جمعرات) "مزاخ" (مذاق) اور اس کی جمع "مزاخیں"۔ اِس لیے یہ طریقہ اختیار کیا گیا کہ ایسے سب مقامات پر تلفّظ اور املا سے متعلق وضاحتی حواشی لکھے جائیں، جن میں ضروری تفصیل کے ساتھ یہ بتایا جائے کہ فلاں لفظ پر جو اعراب لگائے گئے ہیں، یا جو املا اختیار کیا گیا ہے، اُس کی وجہ کیا ہے۔ اِس طرح تلفّظ اور املا سے متعلق پورا ایک ضمیمہ مرتّب ہو گیا۔ یہ بیان تفصیل طلب ہے، "طریقِ کار" کے عنوان کے تحت اِس پر مفصّل گفتگو کی جائے گی۔

حدود کا تعیّن :

اِس کتاب کو کس طرح مرتّب کیا گیا ہے، یہاں اِس کی وضاحت کرنا مقصود نہیں، اِس کی تفصیل "طریقِ کار" کے عنوان کے تحت آگے آئے گی؛ مقصد یہ ہے کہ اِس کام کی حدود کا تعیّن کر لیا جائے۔ اِس سلسلے کی پہلی کتاب فسانۂ عجائب تھی، اُس کے مقدّمے میں اِس سلسلے میں جو کچھ لکھا گیا تھا، مناسب یہ ہو گا کہ اُن مطالب کو یہاں دُہرا دیا جائے۔

تدوین کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ کسی متن کو منشائے مصنّف کے مطابق پیش کرنے کی کوشش کی جائے۔ اِس میں اصل حیثیت صحتِ متن کی ہوتی ہے۔ مصنّف نے آخری بار عبارت کس طرح لکھی تھی، یہ سب سے اہم مسئلہ ہوتا ہے۔ اِس سلسلے میں یہ بُنیادی بات ضرور ذہن میں رہنا چاہیے کہ عبارت ہو، جملہ ہو یا جملے کا ٹکڑا؛ یہ سب الفاظ کا مجموعہ ہوتے ہیں۔ اِس اعتبار سے ہر لفظ کا تعیّن مرتّب کی ذمّے داری میں شامل ہے۔ لفظ مجموعہ ہوتا ہے حرفوں کا؛ یوں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہر حرف کا تعیّن اِس ذمّے داری میں شامل ہے۔ اِس لحاظ سے دیکھیے تو معلوم ہو گا کہ الفاظ کے تعیّن اور اُن کی صورت نگاری کی صحتِ متن

میں اصل حیثیت ہوتی ہے۔

کسی کتاب کے مختلف اہم نسخوں کو (اگر وہ موجود ہوں) سامنے رکھنا ازبس ضروری، بل کہ لازم ہے۔ جب بھی مختلف نسخوں کو پیشِ نظر رکھ کر عبارت کی تصحیح کی جائے گی تو بہت سے مسائل پیدا ہوں گے۔ یوں یہ ضروری ہوگا کہ حواشی میں ایسے ہر لفظ سے متعلق ضروری تفصیلات درج کی جائیں جو کسی بھی لحاظ سے وضاحت طلب ہوں؛ خواہ بہ لحاظِ معنی و مطلب، خواہ بہ لحاظِ املا اور خواہ بہ لحاظِ قواعد۔ بہت سے جملوں کی ترتیب اور معنویت بھی تشریح کی محتاج نظر آئے گی؛ حواشی میں ایسی تشریحات کا شامل کرنا بھی ضروری قرار پائے گا۔

ایسے مفصل حواشی کی ضرورت ایک اور وجہ سے بھی ہوتی ہے۔ زمانہ گزرنے کے ساتھ بہت سے لفظ متروک ہو جاتے ہیں، یا اُن کی شکل صورت میں کسی طرح کی تبدیلی راہ پا لیتی ہے۔ میں صرف ایک مثال سے اِس کی وضاحت کروں گا: باغ و بہار کے قدیم نسخوں میں "گنبذ"[1] (مع ذالِ منقوطہ) ہے اور جدید نسخوں میں "گنبد" (مع دالِ مہملہ) ملتا ہے؛ اب "گنبذ" مستعمل نہیں رہا، اِس وجہ سے نئے مرتبین کی نظر نے کوتاہی کی۔

افعال کی کچھ شکلیں بھی اسی ذیل میں آتی ہیں۔ اس کی بھی یہاں میں صرف ایک مثال پیش کروں گا۔ اس کتاب میں ص ۱۳۷ پر ایک جملہ یوں ہے: "سب سرکاروں میں جو تحفہ چاہیتا، میری ہی دکان سے جاتا۔" طبعِ اوّل (۱۸۰۴ء) میں یہ جملہ اسی طرح ہے، لیکن بعد کے نسخوں میں "چاہیتا"، "چاہتا" بن گیا ہے، اِس لیے کہ "چاہیتا" اب غیر مانوس شکل ہے اور "چاہتا" مستعمل اور متعارف صورت ہے[2]۔

کچھ جملوں کی ترتیب میں بھی اب اجنبی پن محسوس ہوتا ہے، اور نقل در نقل کے نتیجے میں یا کسی اور وجہ سے بعض قدیم جملے، جدید شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ محض وضاحت کے خیال سے

---

[1] اس کتاب میں یہ لفظ ص ۳۰ پر آیا ہے۔ ضمیمۂ تلفظ و املا میں (ص ۵۶۰ پر) اس پر گفتگو کی گئی ہے۔

[2] اس لفظ سے متعلق دیکھیے ضمیمۂ تشریحات، ص ۱۴۳، حاشیہ ۷۔ فعل کی یہ شکل میر امّن کی دوسری کتاب گنجِ خوبی میں بھی ملتی ہے؛ اُس کے مخطوطے میں میر امّن کے اپنے قلم سے "چاہیتے" لکھا ہے: "جس تربیت اور تعلیم کو بارہ برس چاہیتے، سو تین برس کے عرصے میں بہ خوبی ہو جاتی ہے۔" (مخطوطۂ گنجِ خوبی، ص ۳۔)

ایک مثال پیش کروں گا۔ اس کتاب کے ص ۱۹ کی آخری سطر میں ایک جملہ ہے: "یہ طلسم کیوں بنایا ہے اور تو نے بستی کو چھوڑ کر جنگل پہاڑ کیوں بسیتا ہے"۔ طبعِ اوّل میں جملہ اسی طرح ہے، لیکن ڈنکن فاربس کے مرتب کیے ہوئے نسخے میں یہ اس شکل میں ملتا ہے: "....... اور تو نے بستی کو چھوڑ کر جنگل پہاڑ کیوں بستا ہے"۔ ظاہر ہے کہ اب جملہ بگڑ گیا۔ مولوی عبدالحق صاحب کے مرتب کیے ہوئے نسخے میں اس کی شکل یہ بن گئی ہے: "..... اور تو نے بستی کو چھوڑ کر جنگل پہاڑ کیوں بسایا ہے"۔ یعنی ایک قدیم انداز کے جملے نے (جس میں "نے" اُس عہد کے اور میر امن کے اندازِ بیان کے مطابق آیا ہے) جدید شکل صورت اختیار کر لی۔ "بسیتا ہے"[۱] نے پہلے "بستا ہے" کی شکل اختیار کی اور پھر وہ "بسایا ہے" بن گیا۔ اس طرح پورے جملے کی ساخت بدل گئی۔

تذکیر و تانیث میں بھی تغیرات ہوتے رہتے ہیں اور پھر مصنفین کے اپنے مختارات بھی ہوتے ہیں، مثلاً میر امن نے "خلعت" کو مؤنث لکھا ہے، اسی طرح "ناوک" کو بھی تانیث کے ساتھ لائے ہیں، جب کہ یہ دونوں لفظ، خاص کر "خلعت" بہ طورِ عموم مذکر ملتے ہیں۔ مصنفین کے ایسے مختارات شاید سب سے زیادہ پریشان کن ہوتے ہیں۔ مرتب کی یہ ذمے داری ہے کہ وہ (ممکن حد تک) مصنف کے مختارات سے بہ خوبی واقف ہو، ساتھ ہی وہ اُس عہد کی زبان اور بیان سے بھی خوب واقفیت رکھتا ہو اور اُس واقفیت کے بل پر اُس خاص متن میں امکان بھر صحیح صورتوں کا تعین کرے اور وضاحت کے لیے حواشی میں تفصیلات درج کرے۔

متن کی تصحیح اور متعلقاتِ متن کی کما حقہٗ ترتیب کے لیے یہ بھی ضروری سمجھا گیا کہ مفصل تنقیدی مباحث کو شاملِ کتاب نہ کیا جائے۔ ویسے بھی تنقید اور تدوین دو الگ موضوع ہیں؛ متضاد تو نہیں، لیکن مختلف ضرور ہیں۔ دونوں کے دائرے الگ الگ ہیں اور دونوں کے مباحث بھی مختلف ہوتے ہیں۔ ایسا کم اور بہت کم ہو سکتا ہے کہ ایک شخص ان دونوں مختلف الاحوال موضوعات کا صحیح معنی میں حق ادا کر سکے اور اس کی اصل وجہ یہ ہوتی ہے کہ یہ دونوں موضوعات

۱۔ یہ فعل اس سے پہلے آچکا ہے: "جو مرد نکھٹو ہو کر گھر بسیتا ہے، اُس کو دنیا کے لوگ طعنہ مہنا دیتے ہیں" (ص ۲۴)۔

دو مختلف اندازِ نظر، طریقِ کار اور طرزِ فکر کے متقاضی ہوتے ہیں۔ عام طور پر یہ دیکھا جاتا ہے کہ اِس خلطِ بحث سے، یعنی مقدمۂ کتاب میں طویل تنقیدی مباحث کو شامل کرنے سے، یہ نقصان ضرور ہوتا ہے کہ دونوں کا حق ادا نہیں ہو پاتا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ متعلقاتِ متن کی ضروری تفصیلات زیرِ بحث نہیں آپاتیں ــــــ مرتب کا اصل کام یہ ہے کہ وہ متن کو صحیح طور پر پیش کرے اور اُس متن سے متعلق بحثوں کو مناسب تفصیل کے ساتھ لکھے، جس میں قابلِ ذکر حصہ لسانی مباحث کا ہوگا؛ اُس کے فرائض میں یہ شامل نہیں کہ وہ تنقیدی رائے بھی دے؛ اِسی لیے یہ ضروری سمجھا گیا کہ اِس سلسلے کی زیرِ ترتیب کتابوں کے مقدمے میں مفصّل تنقیدی مباحث کو شامل نہ کیا جائے۔

تحقیق اور تدوین کا چولی دامن کا ساتھ ہے؛ مگر اِس سلسلے میں ایک بات خاص کر پیشِ نظر رہنا چاہیے کہ کسی متن کی تدوین کے سلسلے میں اور کسی مصنّف یا مترجم پر مستقل طور سے تحقیقی مقالہ لکھنے کے سلسلے میں جو بحثیں کی جائیں گی؛ اُن کی وسعت کے دائرے مختلف ہو سکتے ہیں اور ہوتے ہیں، اِس کا ضرور لحاظ رکھا جانا چاہیے۔ اِسی طرح جو تحقیقی بحثیں اُس سے پہلے کی جا چکی ہوں اور وہ قابلِ قبول بھی ہوں اور اُن پر اضافہ بھی نہ کیا جا سکتا ہو؛ تو یہ ضروری نہیں، بل کہ مناسب بھی نہیں کہ اُن سب بحثوں کو شاملِ مقدمۂ مرتّب کیا جائے۔ اُن کا حوالہ دینا کافی ہو سکتا ہے۔ اگر یہ طریقۂ کار اختیار کیا جائے کہ صرف ضروری اور بحث طلب باتوں کو مناسب اختصار کے ساتھ لکھا جائے اور تفصیلات کے لیے اصل ماخذ یا ماخذ کا حوالہ دے دیا جائے، تو یہ طریقۂ کار بالکل درست ہوگا۔ ہاں، کسی غلطی کی یا غلطیوں کی تصحیح اگر ضروری ہو، تو پھر وہاں مناسب تفصیل کے ساتھ صحیح صورتِ حال کی وضاحت ضرور کی جائے۔ اِسی طرح اگر کچھ اضافے کیے جا سکتے ہوں، تو اُن کو بھی ضروری صراحتوں کے ساتھ لازماً شامل کیا جائے۔ اِس کتاب کے مقدمے میں یہی طریقۂ کار اختیار کیا گیا ہے۔ [اِس سلسلے کی پہلی کتاب فسانۂ عجائب ہے، اُس کے مقدمے میں بھی اِسی اندازِ نظر اور طریقِ کار کو ملحوظ رکھا گیا ہے]۔

حالاتِ زندگی

میر امّن کے مفصّل حالات معلوم نہیں۔ اِس سلسلے کی ایسی معلومات، جن پر اعتماد کیا جاسکے (میرے علم کی حد تک) تین جگہ ملتی ہے: (۱) باغ و بہار کے دیباچے میں اُنھوں نے اپنے خاندان، اہلِ خانہ اور اپنے متعلق چند باتیں لکھی ہیں۔ (۲) گنجِ خوبی کے شروع میں اپنی شاعری کے متعلق چند جملے لکھے ہیں۔ (۳) فورٹ ولیم کالج میں اُن کی ملازمت اور تصانیف سے متعلق کچھ دستاویزی بیانات ملتے ہیں، جنھیں عتیق صدیقی (مرحوم) نے اپنی تحریروں میں، خاص کر اپنی کتاب گِل کرسٹ اور اُس کا عہد میں یک جا کر دیا ہے۔ اِن کے سوا اب تک ایسا کوئی ماخذ سامنے نہیں آیا ہے جس کی مدد سے حالاتِ زندگی کی حد تک معلومات میں قابلِ قبول اضافہ ہو سکے۔ انتہا یہ ہے کہ اُن کی ولادت و وفات کے سنین کا بھی علم نہیں اور نہ یہ معلوم ہے کہ اُن کا مدفن کہاں ہے۔

یہ درست ہے کہ اُن کی وفات کا سنہ لکھا گیا ہے اور اُن کی ولادت کے سنہ کے تعیّن کی بھی کوشش کی گئی ہے، نیز اُن کی زندگی سے متعلق بعض اور باتیں بھی لکھی گئی ہیں؛ مگر یہ سب کچھ ایسے قیاسات پر مبنی ہے جن کی بنا مفروضات پر ہے، یا محض واقعہ تراشی سے کام لیا گیا ہے۔ میرا نقطۂ نظر اِس سلسلے میں یہ ہے کہ ایسے ڈھیلے ڈھالے اور بعید تعبیرات پر مبنی قیاسات اور مفروضات قابلِ قبول ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ [میں یہ نہیں کہتا کہ قیاس کے لیے کوئی جگہ ہی نہیں، میں یہ کہہ بھی نہیں سکتا، ہم سب بہت سے مقامات پر قیاس سے کام لیتے ہیں؛ میں صرف یہ کہتا ہوں کہ قیاس اور مفروضات میں جو فرق ہوتا ہے، اُسے پیشِ نظر رکھنا چاہیے اور قیاس کی بنیاد قوی اور واضح قرائن پر ہونا چاہیے۔ یہ بھی ذہن میں رہنا چاہیے کہ قیاس کو کسی بھی صورت میں دلیل، سند یا شہادت کا درجہ نہیں دیا جا سکتا اور اُس پر کسی واقعے کے وجود یا عدمِ وجود کی بنیاد نہیں رکھی جا سکتی۔ قیاس کا تعلق امکان سے ہے؛ امکان اور وجود میں جو فرق ہے، اُسے پیشِ نظر رہنا چاہیے]۔

کوئی واقعہ ہو یا کوئی سنہ، اِن کے تعیّن کے سلسلے میں "شہادت" (یعنی معتبر شہادت)

پر میں جو اصرار کرتا ہوں؛ اصولی طریقۂ کار کے علاوہ اِس کی ایک وجہ اور بھی ہے۔ جن مشہور لوگوں کے متعلق ہمیں کم یا بہت کم باتیں معلوم ہوتی ہیں؛ یہ دیکھا گیا ہے کہ اُن کے متعلق کہیں سے کچھ مل جائے، تو ذوقِ طلب اُس کو قبول کر لینے کے لیے ذہن کو بہت جلد آمادہ کر لیا کرتا ہے اور چھان بِنان کو ضروری قرار نہیں دیتا؛ بل کہ بعض اوقات اِس وہم کو دل نشین کر دیا کرتا ہے کہ ہر وقت چھان بین پر اصرار، دراصل بے جا مشکل پسندی کا دوسرا نام ہے اور چلتی گاڑی میں روڑا اٹکانے کے مرادف ہے۔

یہ بھی اسی سلسلے کی کڑی ہے کہ بعض اوقات قیاس آرائی یا واقعہ فروشی کا شوق بے نہایت بہت آسانی کے ساتھ واقعہ تراشی کے دائرے میں گردش کرنے لگتا ہے۔ میر امّن کے حالاتِ زندگی کم سے کم معلوم ہیں، اِس لیے یہاں بھی یہ سب کچھ ہوا۔ اِس سلسلے میں دو مختلف مثالیں پیش کرنا کافی ہوگا۔

(۱) ممتاز حسن صاحب کا مرتّب کیا ہوا نسخۂ باغ و بہار پہلی بار ۱۹۵۸ء میں کراچی سے شائع ہوا تھا؛ اُس کے مقدمے میں مرتّب نے میر امّن کا سالِ وفات بھی لکھا تھا، جو بہ قول اُن کے ایک "نادر اطّلاع" تھی اور مفتی انتظام اللہ شہابی نے یہ "نادر اطّلاع" بہم پہنچائی تھی۔ اطّلاع یہ تھی کہ نصر اللہ خاں خورجوی کے تذکرے "ہمیشہ بہار" (کذا) میں احسن کے حالات کے ذیل میں یہ مندرج ہے کہ میر امّن کا انتقال ۱۲۱۷ھ میں ہوا تھا۔ مفتی صاحب نے بہ قولِ خود دو اور کتابوں سے اِس کی تصدیق کر لی تھی، جن میں سے ایک کتاب کا نام "مواقیت الفواتح" لکھا تھا۔ یہی نہیں، مفتی صاحب نے مذکورہ تذکرے کی فارسی عبارت بھی پیش کر دی تھی، جس میں صاف صاف مرقوم تھا کہ میر امّن کا انتقال ۱۲۱۷ھ میں ہوا تھا۔

اُس وقت تک نصر اللہ خاں خورجوی کا تذکرہ [جس کا صحیح نام "گلشنِ ہمیشہ بہار" ہے] بس ایک ہی بار شائع ہوا تھا اور کم یاب تھا۔ مجھے یہ بات معلوم تھی کہ اِس تذکرے کا ایک نسخہ رضا لائبریری رام پور میں محفوظ ہے۔ ۱۹۶۳ء میں میرا رام پور جانا ہوا اور میں نے پہلا کام یہ کیا کہ وہاں اُس تذکرے کو دیکھا۔ پورا تذکرہ دو بار پڑھ گیا، میر امّن کا اُس میں

کہیں بھی نام نہیں تھا۔ وہ عبارت ہی نہیں تھی جسے مفتی صاحب نے پیش کیا تھا۔ میں بہت حیران ہوا۔ اُس وقت تک میں مفتی صاحب کے "کمالات" سے ناواقف تھا۔ پھر میں نے "مواقیت الفواتح" کو تلاش کیا، اِس کتاب کا بھی کہیں نام نشان نہیں ملا۔ مزید دریافت پر مفتی صاحب کی خوے واقعہ تراشی سے واقف ہوا۔ اب معلوم ہوا کہ مفتی صاحب نے تذکرے کی فارسی عبارت سے لے کر کتابوں کے نام تک پورا جعل بنایا تھا؛ اصل عبارت میں اپنی طرف سے پیوند لگایا تھا اور نام تراشے تھے ——— مفتی صاحب نے خیال کیا ہوگا کہ ممتاز صاحب آج کل میر امّن کے حالاتِ زندگی معلوم کرنے کے لیے کوشاں ہیں اور حالات ہیں کہ ملتے ہی نہیں؛ ایسے میں اگر یہ اطلاع بہم پہنچائی جائے اور ساتھ ہی فارسی کی ایک عبارت بھی پیش کر دی جائے، تو وہ بلاتکلف اور بلاتامّل اُسے قبول کرلیں گے۔ مفتی صاحب کا خیال صحیح نکلا اور ممتاز صاحب نے اُس "نادر اطلاع" کو بہ آسانی قبول کرلیا اور درج کتاب کر دیا۔ یہ وہی "نشاطِ کار" کا تقاضا تھا جو بعض اوقات احتیاط کے تقاضوں کو نظرانداز کر دینے پر مجبور کر دیا کرتا ہے۔ میں نے اُسی زمانے میں رسالۂ نیا دور (لکھنؤ) میں ایک مضمون لکھا تھا جس کا عنوان تھا "گل کرسٹ کی ایک کتاب کے چند اقتباسات"۔ اُس مضمون میں مفتی صاحب کی اِس جعل سازی کی ضروری تفصیل لکھ دی تھی۔ یہ مضمون ستمبر ۱۹۶۴ء میں شائع ہوا تھا۔ رسالۂ نقوش (لاہور) کے "آپ بیتی نمبر" میں جن صاحب نے میر امّن کی "آپ بیتی" نقل کی ہے، اُنھوں نے ممتاز صاحب کے حوالے سے میر امّن کے اُس جعلی سالِ وفات کو بھی درج کر دیا ہے۔ ممتاز صاحب نے تو صورتِ حال سے واقف ہونے کے بعد مفتی صاحب کے پیش کیے ہوئے اُس حوالے کو رد کر دیا تھا، لیکن اِس "آپ بیتی" میں وہ سنہ موجود ہے اور موجود رہے گا۔

(۲) رسالۂ نقوش (لاہور) کے خاص نمبر (دسمبر ۱۹۸۵ء) میں مرزا حامد بیگ صاحب نے "میر امّن دلّی والے" کے عنوان سے ایک طویل مضمون لکھا ہے، جس میں بے بنیاد قیاسات پر درجِ مضمون تفصیلات کی بنیاد رکھی ہے؛ اِس کے نتیجے میں وہ بہت آسانی اور روانی کے ساتھ بہت سی باتیں لکھتے چلے گئے ہیں۔ مثلاً یہ کہ میر امّن جب دلّی

سے نکلے ہیں "اُس وقت اُن کی عمر تیرہ برس رہی ہوگی ؛ یوں ۱۷۵۰ء کے لگ بھگ میر امّن پیدا ہوئے ہوں گے "۔ اِس تعیّن کی ضرورت مقالہ نگار کو یوں پیش آئی کہ اُنھوں نے یہ لکھا ہے کہ میر امّن بڑھاپے کے سبب سے فورٹ ولیم کالج سے ریٹائر نہیں کیے گئے تھے [جیسا کہ عتیق صدیقی نے معتبر حوالے سے لکھا ہے] بل کہ "گمانِ غالب ہے کہ میر امّن نے کالج کے بگڑتے ہوئے حالات کے پیشِ نظر بروقت حیدر آباد کا رُخ کیا ہو" اور یوں مقالہ نگار نے نہایت آسانی کے ساتھ میر امّن کو نواب شمس الامراء کے قائم کردہ "دارُالترجمہ" میں پہنچا دیا، جہاں وہ مختلف سائنسی کتابوں کے ترجمے میں شریک رہے۔ اِن سب بے بُنیاد اور قطعی طور پر ناقابلِ قبول قیاسات کی بُنیاد دارُالترجمہ کی ایک کتاب "ستّۂ شمسیہ" پر رکھی گئی ہے، جس کے مقدّمے میں نوّاب شمس الامراء نے لکھا ہے کہ "میر امان علی دہلوی اور غلام محی الدّین حیدر آبادی ۔ ۔ ۔ ۔ جو ملازمانِ سرکار ہیں، حکم کرنے میں آیا کہ اِن علوم مذکورہ کو زبانِ انگریزی سے اُردو زبان میں ہمارے رو برو ترجمہ کریں "۔ مقالہ نگار نے یہ فرض کر لیا کہ "میر امان علی دہلوی" کوئی اور نہیں، میر امّن دلّی والے تھے : "زمانی اعتبار سے بھی میر امان علی، میر امّن ہی ہو سکتے ہیں۔ میر امّن مکمل نام نہیں، تخلص معلوم ہوتا ہے؛ اور یہ تخلص میر امان علی ہی کا موزوں تر ہے" (نقوش، ص ۳۴۶) - اِس لیے ضروری تھا کہ کم از کم ۱۸۴۰ء تک میر امّن کو زندہ رکھا جائے؛ ["ستّۂ شمسیہ کا دیباچہ میر امّن کو ۱۸۴۰ء تک حیات ثابت کرتا ہے" (ایضاً ص ۳۴۷)] اُس کی صورت اُنھیں یہ نظر آئی کہ فرض کر لیا جائے کہ وہ "۱۷۵۰ء کے لگ بھگ پیدا ہوئے ہوں گے"۔ مقالہ نگار نے اپنے طویل مقالے میں میر امّن سے متعلق جو کچھ لکھا ہے، اُس میں سے کوئی ایک بات بھی قابلِ قبول نہیں اور اِس کی اصل وجہ وہی ہے کہ قیاسات کی بُنیاد مفروضات پر رکھی گئی ہے۔

تاہم :

باغ و بہار اور گنجِ خوبی، دونوں کتابوں کے دیباچوں میں اُنھوں نے اپنا نام

"میر امّن" لکھا ہے۔ باغ و بہار طبعِ اوّل کے سرِ ورق پر اور اُس کے آخری صفحے پر بھی "میر امّن" ملتا ہے اور ہندی مینول میں بھی یہی ہے۔ اُس عہد کی کسی اور کتاب میں یا کسی اور جگہ "میر امّن" کے سوا اور کوئی دوسرا لفظ نہیں ملتا، جس سے یہ گمان بھی کیا جا سکے کہ اُن کا نام کچھ اور ہوگا۔ اور ہاں، گنجِ خوبی کا جو خطّی نسخہ میر امّن کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے، اُس کے آخری صفحے پر قطعۂ تاریخ "تاریخ گنجِ خوبی" کے عنوان کے تحت لکھا گیا ہے اور اس قطعے کے آخر میں میر امّن نے اپنے قلم سے "میر امن لطف" لکھا ہے۔ اِس کے بعد اِس میں کسی شبہے کی گنجائش نہیں رہتی کہ اُن کا نام "میر امّن" تھا اور "لطف" تخلّص تھا۔

کریم الدّین نے اپنے اُردو تذکرے طبقاتِ شعرائے ہند میں "امان و لطف" کے تحت لکھا ہے:

> "تخلّص میر امان دہلوی جو کہ مشہور بہ تخلّص امن ہے۔ یہ تخلّص اُس نے اپنے اشعارِ متفرقہ میں اختیار کیا ہے" [طبعِ اوّل کی عکسی اشاعت، اتر پردیش اُردو اکیڈمی، لکھنؤ، ص ۲۳۶]۔

یعنی اِس تذکرے میں اُن کا نام "میر امان" ملتا ہے اور تذکرہ نگار نے "امّن" کو تخلّص بتایا ہے؛ مگر اِن میں سے کوئی بات درست نہیں۔ کریم الدّین نے اپنے ماخذ کا حوالہ دیا نہیں، اور صاف معلوم ہوتا ہے کہ چوں کہ اُنھوں نے یہ فرض کر لیا ہے کہ تخلّص "امّن" تھا، اِس لیے یہ بھی قیاساً مان لیا کہ پھر اُن کا نام "میر امان" ہوگا؛ لیکن یہ وہی بات ہے جس کے لیے کہا گیا ہے کہ بناء الفاسد علی الفاسد۔ اُنھوں نے یہ جو لکھا ہے کہ "یہ تخلّص اُس نے اپنے اشعارِ متفرقہ میں اختیار کیا ہے" تو یہ قطعی طور پر درست نہیں۔ میر امّن نے اپنے کسی بھی شعر میں اپنا تخلّص "امّن" نظم نہیں کیا ہے (اور نہ کہیں اور یہ بات لکھی ہے)؛ البتہ اُنھوں نے اپنا تخلّص "لطف" ضرور نظم کیا ہے۔ اِس سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ کریم الدّین نے نام اور تخلّص کے سلسلے میں جو کچھ لکھا ہے، وہ اُن کا اپنا ایسا گمان اور قیاس ہے جو قابلِ قبول نہیں؛ مگر بعد کے لوگوں نے اِس کی تکرار کی ہے۔ مولوی محمد یحییٰ تنہا نے اپنی کتاب میں لکھا ہے: "آپ کا اصلی نام میر امان ہے اور امّن تخلّص ہے۔ اگرچہ

کہیں کہیں اشعار میں اپنا تخلّص لطف بھی ظاہر کیا ہے" [سیر المصنّفین، مرتبہ ڈاکٹر امیر اللہ شاہین، ص ۳۰]۔ مولوی صاحب نے حوالہ نہیں دیا، مگر خیال یہ ہے کہ کریم الدین کا تذکرہ اُن کے پیشِ نظر رہا ہے، اِس بنا پر کہ (میری معلومات کی حد تک) کریم الدین سے پہلے کسی اور نے "میر امّن" کا نام "میر امان" اور اُن کا تخلّص "امّن" نہیں لکھا ہے۔ ہاں آخری ٹکڑا مولوی صاحب کا اپنا اضافہ ہے۔

مولوی سید محمد نے اپنی کتاب اربابِ نثرِ اُردو میں لکھا ہے: "بیان کیا جاتا ہے کہ اُن کا اصلی نام میر امان تھا اور امّن تخلّص، مگر وہ میر امّن ہی کے نام سے مشہور ہیں.... اُن کا تخلّص امّن تھا۔ سیر المصنّفین کے مؤلف نے لکھا ہے کہ وہ کبھی اپنا تخلّص لطف بھی کرتے تھے، مگر کوئی سند یا حوالہ نہیں بیان کیا، البتّہ باغ و بہار کے خاتمے پر میر امّن نے جو ابیات لکھی ہیں، اُن کی آخری بیت یہ ہے:

تو کونین میں لطف پر لطف رکھ
خدایا بحقِّ رسولِ کبار

اِس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ لطف بھی تخلّص کرتے تھے" (ص ۵۸)۔

یعنی "میر امان" نام اور "امّن" تخلّص کے اِس مفروضے کا سلسلہ کریم الدین کے تذکرے تک پہنچتا ہے، اِس اضافے کے ساتھ کہ اُن کے دو تخلّص تھے: "امّن" اور "لطف"۔

مجھے خاص کر تعجّب اِس پر ہے کہ اِس زمانے کے ایک معروف اہلِ قلم ڈاکٹر سہیل بخاری نے بھی اپنے تحقیقی مقالے میں اِسی کو دہرایا ہے: "میر امّن کا نام میر امان تھا اور امّن اور لطف دونوں تخلّص کرتے تھے" [اُردو داستان تحقیقی و تنقیدی مطالعہ، ص ۱۱۹، شائع کردہ مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد۔ سالِ طبع مارچ ۱۹۸۷ء] مقالہ نگار نے کوئی حوالہ نہیں دیا ہے، مگر صاف ظاہر ہے کہ اُنھوں نے سیر المصنّفین اور اربابِ نثرِ اُردو میں سے کسی ایک کتاب کو یا دونوں کتابوں کو سامنے رکھا ہے اور اِس سلسلے میں تحقیق کو ضروری نہیں سمجھا۔

تخلّص

میر امّن شاعر بھی تھے، اُن کا تخلّص لطف تھا۔ اُنھوں نے اپنی دوسری کتاب گنجِ خوبی کے دیباچے میں [جو فارسی کی معروف کتاب اخلاقِ محسنی کا ترجمہ ہے] لکھا ہے:

"اور قریب ہزار بیت اُستادوں کی، جو مصنّف نے تمام کتابوں سے چُن چُن کر ہر ایک مضمون کی ہر موقع پر ترشنہ ڈالیں ہیں، اُن کو بھی اپنی سمجھ کے موافق جوں کا توں ہندی میں نظم کیا۔ اگرچہ فکرِ سخن کہنے کی ساری عمر نہیں کی، ہاں مگر خود بہ خود جو کوئی مضمون دل میں آیا، تو اُسے باندھ ڈالا۔ نہ کسو کا اُستاد، نہ کسو کا شاگرد۔

نہ شاعر ہوں میں اور نہ شاعر کا بھائی   فقط میں نے کی اپنی طبع آزمائی"

[گنجِ خوبی، ص ۵، شائع کردہ شعبۂ اُردو، دہلی یونیورسٹی، سالِ طبع ۱۹۶۶ء]

(مطبوعہ نسخے کی اِس عبارت کا خطّی نسخے سے مقابلہ کر لیا گیا ہے)۔ گنجِ خوبی کے خطّی نسخے کے آخری صفحے کی آخری سطر میں میر امّن نے اپنے قلم سے "میر امّن لطف" لکھا ہے اور باغ و بہار کے آخر میں جو قطعۂ تاریخ ہے، اُس کے آخری شعر میں بھی یہ تخلّص آیا ہے:

تو کونین میں لطف پر لطف رکھ   خدایا بہ حقِّ رسولِ کبار

گنجِ خوبی میں جس قدر اُردو اشعار آئے ہیں، وہ اُن کی اپنی صراحت کے مطابق میر امّن ہی کے نظم کیے ہوئے ہیں۔ باغ و بہار کے آخر میں جو قطعۂ تاریخ ہے، وہ بھی اُنھی کا کہا ہوا ہے۔ اِن کے علاوہ گِل کرسٹ کی مرتّب کی ہوئی ایک کتاب THE STRANGERS INFALLIBLE EAST INDIAN GUIDE[1] میں اُن کی ترجمہ کی ہوئی ایک غزل ملتی ہے۔ اِس کتاب میں پہلے حافظ کی وہ غزل درج کی

---

[1] میرے پیشِ نظر اِس کتاب کا تیسرا اڈیشن ہے جو لندن سے ۱۸۲۰ء میں شائع ہوا تھا۔ یہ نسخہ نیشنل آرکائیوز آف انڈیا، نئی دہلی میں محفوظ ہے۔ اِس کا نمبر ہے: 491-43 / G.303 ST۔ اِس کا پہلا اڈیشن ۱۸۰۲ء میں کلکتے سے شائع ہوا تھا۔

گئی ہے جس کا مطلع یہ ہے :

"حجابِ چہرۂ جاں می شود غبارِ تنم　　　خوش آں دمیکہ ازیں چہرہ پردہ برفگنم"

پہلے اِس فارسی غزل کا انگریزی نثر میں آزاد ترجمہ درج کیا گیا ہے۔ اُس کے بعد "غزل میر امّن لطف" کی لکھی گئی ہے جو اسی فارسی غزل کا ترجمہ ہے۔ گل کرسٹ نے میر امّن کے ترجمے کے متعلق لکھا ہے کہ اِس ترجمے میں فارسی کا حسن تو نہیں، پھر بھی غنیمت ہے۔ اِس کا مطلع و مقطع یہ ہے :

ہے اوٹ جلوۂ جاں کی گلی بدن میرا　　　خدا کرے کہ اُڑے خاک ہو یہ تن میرا
اُٹھا تو ہستی کو حافظ کی آ کے از رہِ لطف　　　کہ کوئی سُنے نہ ترے سامھنے سخن میرا

اِن تفصیلات سے یہ قطعی طور پر متعین ہو جاتا ہے کہ "میر امّن" نام تھا اور "لطف" تخلص تھا۔ اِس کے علاوہ جو کچھ لکھا گیا ہے، اُس کی کوئی سند اور کوئی ثبوت موجود نہیں اور یوں ایسی کوئی بات قابلِ قبول نہیں۔

مجھے صحیح معنی میں تعجب اِس پر ہے کہ ڈاکٹر وحید قریشی نے لکھا ہے :

"بعض متاخر کتب میں ان کے دو تخلص بیان کیے گئے ہیں، امّن اور لطف۔ لطف تخلص کا استدلال باغ و بہار کے اِس شعر سے کیا گیا ہے :

تو کو ہین میں لطف پر لطف رکھ　　　خدایا بحقِ رسولِ کبار

لیکن شعر میں کوئی قرینہ نہیں کہ میر امّن کا تخلص "لطف" قرار دیا جائے۔ مرزا علی لطف مولفِ تذکرۂ گلشنِ ہند شاعر تھے اور لطف تخلص کرتے تھے۔۔۔۔ یہ کلکتے ہی میں مقیم تھے۔ میر امّن نے گنج خوبی کے دیباچے میں ان کے دو[۲] شعر دیے ہیں :

---

[۱] اِس کے بعد گل کرسٹ نے اِس فارسی غزل کو انگریزی نظم میں منتقل کیا ہے اور پھر اُس منظوم ترجمے کا میر شیر علی افسوس سے اُردو غزل کی صورت میں ترجمہ کرایا ہے اور اِس کی صراحت کر دی ہے کہ افسوس کا ترجمہ "منظوم انگریزی ترجمے پر مبنی ہے"۔ افسوس کا ترجمہ اچھی خاصی نظم بن گیا ہے، جو نادر کاکوروی کی بعض نظموں کی یاد دلاتا ہے۔ ترجمہ در ترجمہ کا یہ عمل بہت دل چسپ ہے اور قابلِ مطالعہ۔

"...... اور عین مقابلے کے وقت کا یہ قطعہ لطف کا ہے:

پلٹنیں اور توپیں جب سنمکھ ہوئیں
مرہٹے مصیبت کے مارے (کذا) مرگئے
فیر سنتے ہی فقیر ہو چلے
چھوٹی جب بندوق کوے اُڑ گئے

قیاس یہ ہے کہ امّن نے باغ و بہار میں اسی لطف کا شعر دیا ہے اور لطف میر امّن کا اپنا تخلص نہیں تھا۔" [باغ و بہار ایک تجزیہ، نصرت پبلشرز لکھنؤ، ص ۱۸]

اِس بیان سے صاف طور پر یہ مطلب نکلتا ہے کہ میر امّن کا تخلص "امّن" تھا "لطف" نہیں تھا۔ جب ایک بار یہ فرض کر لیا گیا کہ "لطف" میر امّن کا تخلص نہیں تھا، تو پھر یہ بھی فرض کرنا پڑا کہ "لطف" بہ طور تخلص جن اشعار میں آیا ہے، وہ میر امّن کے نہیں ہو سکتے۔ چوں کہ مرزا علی لطف کا نام سامنے تھا، یوں فرض کر لیا گیا کہ یہ اشعار اُنھی "لطف" کے ہیں۔ یہ سب مفروضات ہیں۔ میر امّن کا تخلص "لطف" نہیں تھا، یہ بات قطعی طور پر درست نہیں۔ صحیح صورتِ حال یہ ہے کہ میر امّن کا صرف ایک تخلص "لطف" تھا اور جن اشعار کو مرزا علی لطف سے منسوب کیا گیا ہے، وہ سب میر امّن لطف کے ہیں۔

مرزا حامد بیگ نے اپنے محوّلہ بالا مقالے میں اسی سلسلے میں وحید قریشی صاحب کی طویل عبارت نقل کر کے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ "میر امّن کے لطف تخلص کرنے سے متعلق ڈاکٹر وحید قریشی کی تحقیق پر کوئی اضافہ ممکن نہیں"۔ البتہ موصوف نے اِس رائے کا اضافہ کیا ہے کہ "باغ و بہار کے خاتمۂ کتاب میں مرزا علی لطف کے اشعار کی شمولیت کا ایک سبب یہ بھی رہا ہوگا کہ لطف، ڈاکٹر جان گل کرسٹ کے بہت قریب تھے"۔ جیسا کہ لکھا جا چکا ہے، نہ ڈاکٹر صاحب کا خیال درست ہے اور نہ مرزا صاحب کی قیاس آرائی قابلِ قبول ہے۔

وطن، علاقہ اور محلہ:

اُنھوں نے باغ و بہار اور گنج خوبی میں کئی جگہ اپنے آپ کو "میر امّن دلّی والا" لکھا

ہے۔ یہ بھی لکھا ہے کہ دلّی "وطن اور جنم بھوم میرا ہے اور آنول نال دہیں گڑا ہے" [دیباچۂ باغ و بہار، ص ۶] ۔ اِس سے واضح طور پر اور قطعی طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ صحیح معنی میں "دلّی والے" تھے، یعنی یہیں پیدا ہوئے تھے اور یہیں نشو و نما پائی تھی۔

اِس سلسلے میں یہ بات ضرور ذہن میں رہے کہ میر امّن نے شاہ جہاں آباد کو نہیں، بل کہ شاہ جہانی فصیل سے باہر کی قدیم آبادی یعنی "پرانے شہر" کو "دلّی" کہا ہے۔ شاہ جہاں کی دہلی کی تعمیر کے سلسلے میں اُنھوں نے یہ صراحت کی ہے کہ:

"تب بادشاہ نے ... شہر کو دارالخلافت بنایا؛ تب سے شاہ جہاں آباد مشہور ہوا۔ اگرچہ دلّی جدی ہے۔ وہ "پرانا شہر" اور یہ "نیا شہر" کہلاتا ہے" (ایضاً، ص ۸)۔

یعنی فصیل کے اندر جو شہر بسایا گیا، وہ "نیا شہر" کہلاتا تھا؛ مگر "دلّی" اُس سے الگ تھی۔ اِس طرح میر امّن نے واضح طور پر "پرانے شہر" کو "دلّی" بتایا ہے۔ اِس بیان کی روشنی میں اگر دیکھا جائے تو یہی نظر آئے گا کہ اُنھوں نے اپنے آپ کو جو بار بار "دلّی والا" کہا ہے، تو اُس سے ایک یہ بات بھی صریحی طور پر سامنے آتی ہے کہ وہ "پرانے شہر" میں رہتے تھے۔

اُنھوں نے یہ صراحت نہیں کی کہ وہ "دلّی" (یعنی پرانے شہر) کے کس محلّے میں رہتے تھے۔ پرانے شہر کی حدود بہت وسیع تھیں، محلّے کا قطعی طور پر تعین ممکن نظر نہیں آتا۔

پرانے شہر میں ایک محلّہ "سیّد واڑہ" بھی تھا۔ ملفوظات و حالاتِ شاہ فخر الدین میں اِس محلّے کے متعلق مرقوم ہے: "سیّد واڑہ، پرانی دہلی کا ایک محلّہ ہے، جہاں میر بدیع رہا کرتے تھے۔ اِس محلّے کے سادات معتبر نسب[۳] والے ہیں" [ص ۱۵]۔

---

[۱] میر شیر علی افسوس نے لکھا ہے: "اِس عاصی کا مولد نیا شہر ہے" [دیباچۂ باغِ اُردو، مجلسِ ترقیِ ادب لاہور، ص ۱۲]۔ [۲] سیّد انشا نے پرانی دہلی کی خصوصیات کے ذیل میں لکھا ہے: "اور شہرِ قدیم کے رہنے والے جس کا نام "پرانا شہر" ہے، "ادھر" کو "ایدھر"... کہتے ہیں۔ یہ لفظ اُن کی صحبت سے نئے شہر والے بھی بولتے ہیں" [ترجمۂ دریائے لطافت، ص ۲۶]۔ [۳] یہ اقتباس عزیز مکرم ڈاکٹر شریف حسین قاسمی (مرتب سیر المنازل)

میر حسن (صاحبِ مثنوی سحر البیان) بھی اِسی محلّے سے تعلّق رکھتے تھے: "در سیّد واڑہ دہلیِ کہنہ تولّدش واقع شدہ" [مجموعۂ نغز، ص ۲۰۲]۔ میر امّن سیّد تھے (یہ اُن کے نام سے ظاہر ہے) ممکن ہے وہ بھی اِسی محلّے سیّد واڑہ میں رہتے ہوں۔ بہ ہر صورت یہ محض ایک گمان اور خیال ہے (اور اِسے قیاس کا درجہ بھی حاصل نہیں) مگر بہ ظاہر یہ بعید از امکان نہیں معلوم ہوتا۔

تعلیم:

اُنھوں نے اپنی تعلیم کا احوال بھی نہیں لکھا؛ مگر یہ بات اعتماد کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ وہ فارسی سے خوب واقف تھے۔ اِس کا واضح ثبوت اُن کی کتاب گنجِ خوبی ہے، جو اخلاقِ محسنی کا اُردو ترجمہ ہے۔ اخلاقِ محسنی فارسی کی مشہور کتاب ہے۔ ایک زمانے میں یہ بہت سے مدرسوں میں پڑھائی جاتی تھی (میں نے بھی اِسے مدرسے ہی میں پڑھا تھا)۔ اِس کی زبان بہت مشکل نہ سہی، مگر آسان بھی نہیں؛ بل کہ یوں کہنا چاہیے کہ خاصی مشکل ہے؛ ایسی کتاب کا کام یاب ترجمہ وہی کر سکتا ہے جو فارسی زبان سے اچھی طرح واقف ہو۔ عربی کی تعلیم کے متعلق یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

جاگیر اور منصب:

اُنھوں نے اپنے بزرگوں کے متعلق جو کچھ لکھا ہے، اُس سے یہ پتا نہیں چلتا کہ اُن کا سلسلۂ نسب کہاں تک پہنچتا ہے۔ اُنھوں نے اپنے بزرگوں میں سے کسی کا نام بھی نہیں لکھا۔ کہیں اور بھی اب تک اِس سلسلے کی کوئی بات دیکھنے میں نہیں آسکی ہے۔

نے بھیجا ہے، اِس نوٹ کے ساتھ: "ملفوظات و حالاتِ شاہ فخر الدین، فخر الطالبین و مناقبِ فخریہ کا اُردو ترجمہ ہے۔ اِس کے مترجم میر نذر علی دردؔ کاکوروی ہیں۔ یہ سلمان اکیڈمی کراچی سے شائع ہوا ہے۔" میری نظر سے یہ کتاب نہیں گزری۔

اُن کے والد کا نام بھی معلوم نہیں۔ اُن کی تحریر سے بس یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے بزرگ مغل دربار میں صاحبِ منصب و جاگیر تھے:

"میرے بزرگ ہمایوں بادشاہ کے عہد سے، ہر ایک بادشاہ کی رکاب میں پُشت بہ پُشت جان فشانی بجا لاتے رہے۔ اور وہ بھی پرورش کی نظر سے، قدر دانی جتنی چاہیے، فرماتے رہے۔ جاگیر و منصب اور خدمات کی عنایات سے سرفراز فرما کر مالا مال و نہال کر دیا اور "خانہ زادِ موروثی" اور "منصب دارِ قدیمی" زبانِ مبارک سے فرمایا؛ چناں چہ یہ لقب بادشاہی دفتر میں داخل ہوا۔" [دیباچۂ باغ و بہار، ص۶]

انھوں نے ایسی کوئی صراحت نہیں کی جس سے یہ معلوم ہو سکے کہ وہ لوگ کس پایے اور کس درجے کے تھے، یعنی اُن کا منصب کیا تھا اور جاگیر کتنی تھی اور کہاں تھی۔ یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ کس مغل بادشاہ نے منصب دیا تھا یا جاگیر عطا کی تھی۔ وہ لکھتے ہیں کہ "یہ لقب بادشاہی دفتر میں داخل ہوا" لیکن انھوں نے اپنے بزرگوں میں سے کسی کا نام لکھا نہیں، اِس لیے بہ ظاہر حالات اُن کے بزرگوں کے منصب و خطاب کے متعلق تفصیلات معلوم کرنے کی صورت نظر نہیں آتی۔

ہاں اُن کے اندازِ نگارش سے بہ ظاہر یہ بات مترشح ہوتی ہے کہ وہ خود کسی بادشاہی خدمت پر مامور نہیں تھے [یہ محض قیاس ہے]۔ خیال یہ ہوتا ہے کہ بہ صورتِ دیگر وہ اپنی "خدمت" کا ذکر ضرور کرتے۔ انھوں نے یہ جو لکھا ہے کہ "سورج مل جاٹ نے جاگیر کو ضبط کر لیا" (ایضاً ص۲) اِس سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ ("خانہ زادِ موروثی" ہونے کی بنا پر) بزرگوں کی جاگیر اُن کے حصے میں بھی آئی تھی [مغلوں کے دستور کے مطابق "بہ حقِ سرکار" ضبط نہیں ہوئی تھی]۔ ہاں آخر میں وہ جاگیر اُن کے پاس رہی نہیں، نہ گھر بار رہا۔ اُن کی اپنی صراحت کے مطابق سورج مل جاٹ نے جاگیر ضبط کر لی اور ابدالی کی فوجوں نے گھر بار لوٹ لیا۔

اُن کی جاگیر سے متعلق محض قیاساً میں ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔ انھوں نے یہ جو لکھا ہے کہ "جب ایسے گھر کی ...... یہ نوبت پہنچی" یعنی دلّی میں بادشاہت پر تباہی آئی (ترتیب

سورج مل جاٹ نے جاگیر کو ضبط کرلیا"؛ اِس جملے میں لفظ "تب" بہ ظاہر اِس پر دلالت کرتا ہے کہ یہ اُس زمانے کا واقعہ ہے جب" احمد شاہ ابدالی" کی واپسی (۱۷۶۱ء) کے بعد سورج مل نے آگرے اور اُس کے اطراف پر قبضہ کرلیا تھا۔ [دہلی پر کبھی اُس کا قبضہ نہیں ہوا، اگرچہ پُرانے شہر کے علاقے تک اُس کی فوجوں نے لوٹ مار ضرور کی تھی] آگرے پر سورج مل جاٹ کا قبضہ ابدالی کی واپسی کے بعد کا واقعہ ہے۔ اِن سب اُمور کی بِنا پر میرے ذہن میں یہ خیال آتا ہے کہ اُن کے بزرگوں کو جو جاگیر ملی تھی، وہ آگرے میں یا اُس کے اطراف میں (بلند شہر اور علی گڑھ تک) کہیں ہوگی؛ جبھی تو سورج مل نے اُس کو ضبط کرلیا تھا [ضمنی طور پر یہ بات بھی ذہن میں رہنا چاہیے کہ شاہ جہاں آباد کی نقش بندی سے پہلے پایۂ تخت کی حیثیت اکبر آباد کو حاصل تھی، یعنی بادشاہ وہیں رہتا تھا]۔

مذہب :

اُنھوں نے واضح الفاظ میں کہیں بھی اپنے مسلک کے متعلق کچھ نہیں لکھا ہے، البتہ باغ و بہار کے آغاز میں اُنھوں نے ایک جگہ لکھا ہے : "اور اُس کی آل پر صلوٰۃ و سلام، جو ہیں بارہ امام" (ص ۴) اور اِسی کتاب کے آخر میں لکھا ہے : "ہر ایک نامراد کا مقصد دلی اپنے کرم اور فضل سے برلا، بہ طفیل پنجتنِ پاک، دُوازدہ امام، چہاردہ معصوم علیہم الصّلوٰۃ والسّلام کے" (ص ۲۴۹)؛ اِن عبارتوں سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ وہ شیعہ تھے۔

اولاد اور اہلِ خانہ :

باغ و بہار کے دیباچے میں اُنھوں نے گل کرسٹ کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے : "نہیں تو یہ بھی غنیمت ہے کہ ایک ٹکڑا کھا کر، پانو پھیلا کر سو رہتا ہوں؛ اور گھر میں دس آدمی چھوٹے بڑے پرورش پاکر دُعا اُس قدر دان کو کرتے ہیں" (ص ۷)۔ جب وہ عظیم آباد سے کلکتے کے لیے روانہ ہوئے تھے، اُس کا ذکر کرتے ہوئے یہ صراحت بھی کی ہے کہ "عیال و اطفال کو چھوڑ کر، تنِ تنہا کشتی پر سوار ہو ....." (ص ۶)۔ اِس سے بس اِس قدر معلوم

ہوتا ہے کہ وہ صاحبِ عیال واطفال تھے اور گھر میں چھوٹے بڑے دس آدمی تھے۔ اس سے زیادہ کچھ معلوم نہیں ہو سکا ہے۔

مرزا حامد بیگ نے اپنے محولۂ بالا مقالے میں لکھنؤ کے مشہور ریختی گو جانصاحب کو میر امّن کا بیٹا بتایا ہے، لکھا ہے: "قیاس غالب ہے کہ جانصاحب، میر امّن کے بیٹے تھے۔ میر امّن کے اصل نام میر امان علی کی مناسبت سے بیٹے کا نام میر یار علی (عرف جانصاحب) بھی اس قیاس کو تقویت پہنچاتا ہے۔" مقالہ نگار نے اپنے قیاس کی بنیاد تذکرۂ سخنِ شعرا (تالیفِ عبدالغفور نسّاخ) کے اندراج پر رکھی ہے، نسّاخ نے "جانصاحب" کے لیے لکھا ہے:

"جانصاحب، میر یار علی، خلفِ میر امّن لکھنوی، شاگردِ عاشور علی خاں بہادر۔ ریختی اپنے طرز پر خوب کہتے تھے۔"

اس کے بعد انھوں نے سید محمد مبین نقوی "مرتبِ تاریخِ ریختی مع دیوانِ جانصاحب" کی عبارت کا اقتباس اس طرح دیا ہے:

"جانصاحب کی ولادت فرخ آباد میں غالباً ۱۲۳۴ھ (۱۹-۱۸۱۸ء) میں ہوئی تھی۔ نام تو ان کا میر یار علی تھا، مگر والدین پیار سے جان صاحب کہتے تھے۔ ... ان کے والد میر امّن تو فرخ آباد کے رہنے والے تھے، لیکن یہ بچپن ہی میں لکھنؤ پہنچ گئے تھے۔"

نسّاخ اور مبین نقوی کے بیانات میں میر امّن کے لکھنوی اور فرخ آبادی ہونے کے اختلاف کی مقالہ نگار نے تاویل اس طرح کی ہے: "کہا جا سکتا ہے کہ میر امّن فورٹ ولیم کالج سے مستعفی ہونے کے بعد کچھ عرصہ فرخ آباد میں مقیم رہے۔ اور اس کے بعد بطور مترجم دارالترجمہ شمس الامرا، حیدرآباد دکن سے منسلک ہو گئے۔ انھوں نے اہل وعیال کو لکھنؤ میں چھوڑا اور خود دارالترجمہ کا کام کرتے رہے۔ بہت ممکن ہے میر امّن کے لکھنؤ سے اس تعلق کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے عبدالغفور نسّاخ نے سخنِ شعرا میں ...... میر امّن کو لکھنوی لکھا ہو۔" مقالہ نگار نے جو کچھ لکھا ہے، وہ سب ایسے مفروضات کا سلسلہ ہے جس کی ایک کڑی بھی درست

نہیں۔ اِن میں سے کوئی ایک بات بھی قابلِ قبول نہیں۔ اُن کو ایک جگہ "میر امان علی" کے نام نے مغالطے میں مبتلا کیا، اور دوسری جگہ "میر امّن" نے۔ جو کچھ انھوں نے لکھا، اُس میں سے کسی ایک بات کا بھی ثبوت نہ اُن کے پاس ہے اور نہ کہیں اور موجود ہے۔ محض مفروضات، جو "کہا جا سکتا ہے"، جیسے فقروں کے تحت معرضِ اظہار میں آئے ہیں۔

میر امّن کے ایک اور بیٹے کا بھی ضمنی طور پر نام آیا ہے، جن کا تخلّص "احسن" لکھا گیا تھا۔ مفتی انتظام اللہ شہابی صاحب نے میر امّن کے سالِ وفات کے سلسلے میں جو عبارت پیش کی تھی، اُس کا آغاز اِس طرح ہوا تھا: "احسن، میر احسن نام داشت، پسرِ میر امّن.....۔" لیکن "پسرِ میر امّن" مفتی صاحب کا گڑھا ہوا فقرہ ہے، اصل تذکرے میں موجود نہیں۔ گلشنِ ہمیشہ بہار میں (جس کے حوالے سے مفتی صاحب نے یہ عبارت پیش کی تھی) صرف ایک مرزا احسن علی احسن کا ذکر ہے، جن کا میر امّن سے کچھ واسطہ نہیں۔ مفتی صاحب نے "مرزا احسن علی" کو پہلے "میر احسن" بنایا اور پھر انھیں "پسرِ میر امّن" بنا دیا۔

دہلی سے روانگی:

"جب احمد شاہ ابدالی[۱] کابل سے آیا اور شہر کو لٹوایا؛ شاہِ عالم پورب کی طرف تھے، کوئی وارث اور مالک ملک کا نہ رہا..... ایک بارگی تباہی پڑی، رئیس وہاں کے، میں کہیں تم کہیں ہو کر؛ جہاں جس کے سینگ سمائے، وہاں نکل گئے۔"

[دیباچۂ باغ و بہار، ص ۹]۔

اِس عبارت میں یہ صراحت تو موجود نہیں کہ میں بھی اُسی زمانے میں دہلی سے نکلا تھا؛

---

[۱] میر امّن نے اِس سے پہلے "احمد شاہ دُرّانی" لکھا ہے (ص ۲)۔ "احمد شاہ" کے ساتھ "دُرّانی" اور "ابدالی" دونوں لفظ ملتے ہیں۔ بیانِ واقع میں (جو احمد شاہ کے سلسلے میں ایک معتبر کتاب ہے) "ابدالی" ہے اور اِسی اندراج کی بنیاد پر میری رائے میں "ابدالی" مرجّح ہے۔ اِس اندراج کے لیے دیکھیے ضمیمۂ تشریحات، ص ۲۲۴، حاشیہ نمبر ۱۔

مگر سارے قرائن دلالت اِسی پر کرتے ہیں کہ یہی زمانہ اُن کے ترکِ وطن کا بھی ہے۔ [اُن کی اپنی صراحت کے مطابق، اُن کی جاگیر ضبط ہو چکی تھی اور گھر لُٹ چکا تھا] ۔ ممتاز حسین صاحب نے اپنے مرتب کیے ہوئے نسخۂ باغ و بہار کے مقدمے میں یہی رائے ظاہر کی ہے کہ میر امّن کی مراد ۱۷۶۱ء کے واقعات سے ہے، جب "شاہِ عالم پورب کی طرف تھے" اور ابدالی [پانی پت کے میدان میں مرہٹوں کو فیصلہ کُن شکست دے کر] دہلی میں داخل ہوا تھا۔ [ضروری تفصیل کے لیے دیکھیے ضمیمۂ تشریحات، ص ۲۶۴، حاشیہ نمبر ۱] اور اُس کی فوجوں نے تین دن تک دہلی کو بُری طرح لوٹا تھا۔ بعض اور لکھنے والوں نے بھی یہی رائے ظاہر کی ہے ـــــ یہ سنہ اگرچہ قطعی نہیں، لیکن قرینِ قیاس ضرور ہے اور اِس کو تسلیم کرنے میں بہ ظاہر کوئی قباحت نظر نہیں آتی۔ [شاہ عالم کے سلسلے میں دیکھیے اِسی کتاب میں ضمیمۂ تشریحات، ص ۲۷۲، حاشیہ نمبر ۳۳]۔

(۱۷۶۱ء میں) دہلی سے نکلنے کے بعد وہ اپنے بیان کے مطابق عظیم آباد (پٹنہ) پہنچے اور "کتنے برس بلدۂ عظیم آباد میں دم لیا۔ کچھ بنی، کچھ بگڑی۔ آخر وہاں سے بھی پاؤں اُکھڑے، روزگار نے موافقت نہ کی" (ایضاً ص ۶)۔ "کتنے برس" سے کتنی مدت مراد لی گئی ہے، اِس کا تعین فی الوقت ممکن نظر نہیں آتا، لیکن قیاس یہ کہتا ہے کہ یہ مدت خاصی طویل ہو گی۔

ڈاکٹر اختر اُرینوی نے اپنی کتاب بہار میں اُردو زبان و ادب کا ارتقا میں لکھا ہے کہ "میر شیر علی افسوس اور میر امّن دہلوی بھی عظیم آباد آئے اور (مہاراجا) شتاب رائے کے صاحب زادے کے کرم و جود سے فیض یاب ہوتے رہے" (ص ۱۴۱)۔ جیسا کہ قاضی عبدالودود صاحب نے لکھا ہے: "افسوس اور میر امّن کا اُن سے کسی قسم کا تعلق محتاجِ ثبوت ہے" [مقالاتِ قاضی عبدالودود، جلدِ اوّل، ص ۹۸]۔ اب تک ایسا کوئی معتبر حوالہ سامنے نہیں آیا ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہو کہ عظیم آباد میں میر امّن، مہاراجا شتاب رائے یا اُن کے صاحب زادے کے کرم و جود سے فیض یاب ہوئے۔ غرض کہ عظیم آباد میں میر امّن کے (طویل) قیام کے زمانے کے حالات قطعی طور پر معلوم نہیں۔ بس یہ معلوم ہے کہ آخر کار "روزگار نے موافقت نہ کی" اور "وہاں سے بھی پاؤں اُکھڑے"۔

کلکتے میں آمد:

انھوں نے صراحت کردی ہے کہ عظیم آباد سے وہ "تن تنہا" کشتی کے ذریعے کلکتے پہنچے۔ گھر والوں کو عظیم آباد میں چھوڑ دیا۔ کلکتے میں "چندے بےکاری گزری"۔ "چندے" سے دو چار یا چار چھے مہینے بھی مراد ہو سکتے ہیں اور سال بھر کے آس پاس کا زمانہ بھی۔ اُس کے بعد نوّاب دلاور جنگ نے اپنے چھوٹے بھائی کی اتالیقی کے لیے ملازم رکھ لیا۔ [نوّاب دلاور جنگ اور اُن کے بھائی میر محمد کاظم خاں کے متعلّق میں معلومات حاصل نہیں کر سکا] "قریب دو سال کے وہاں رہنا ہوا، لیکن نباہ اپنا نہ دیکھا۔ تب منشی میر بہادر علی جی کے وسیلے سے حضور تک جان گل کرسٹ صاحب بہادر ۔۔۔ کے رسائی ہوئی" ــــ عتیق صدّیقی نے اپنی کتاب گل کرسٹ اور اُس کا عہد میں لکھا ہے:

"کالج کونسل کی کارروائی مورخہ ۲۹[1] اپریل ۱۸۰۱ء سے ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ کالج کے ہندستانی شعبے میں حسبِ ذیل منشیوں کا تقرر عمل میں آیا تھا" [طبعِ دوم، ص ۱۴۰]

اِس فہرست میں میر امّن کا نام بھی ہے۔ اگر میر امّن کے بیان میں "چندے" سے تقریباً سال بھر کی مدّت مراد لی جائے اور دو سال نوّاب دلاور جنگ کے یہاں کی اتالیقی کی مدّت کو سامنے رکھا جائے تو بہ ظاہر یہ نظر آتا ہے کہ میر امّن اپریل ۱۸۰۱ء سے کم و بیش تین سال (یا چار سال) پہلے کلکتے پہنچے ہوں گے۔ اگر اِس قیاس کو تسلیم کر لیا جائے، تو

[1] عتیق صدّیقی نے اپنی اِسی کتاب کے ص ۱۷۶ پر فورٹ ولیم کالج کے "ہندستانی شعبے کے منشیوں کی فہرست" درج کی ہے؛ اُس میں یہ بھی مرقوم ہے کہ ۴ مئی ۱۸۰۱ء کو "ماتحت منشی" کی حیثیت سے چالیس روپے ماہانہ مشاہرے پر میر امّن کا تقرر ہوا۔ تاریخوں کے اِس اختلاف کی توجیہ یہ کی جا سکتی ہے کہ ۲۹ اپریل کو تجویز منظور کی گئی تھی اور باقاعدہ تقرر ۴ مئی کو ہوا۔ صدّیقی صاحب نے اپنی انگریزی کتاب اوریجن آف ماڈرن ہندستانی لٹریچر میں ۲۹ اپریل کی کارروائی کی جو عبارت درج کی ہے، اُس سے اِس توجیہ کی بہ خوبی تائید ہوتی ہے۔ عبارت یہ ہے:

"At a council of the college held on the 29th April 1801, it was Resolved that the following persons shall be appointed Moonshees on the college establishment at the salaries affixed" (PP. 105).

پھر یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ ۱۷۶۱ء میں دہلی سے نکلنے کے بعد وہ ۳۶، ۳۷ برس تک عظیم آباد میں رہے ہوں گے۔

یہاں میر امّن کے ایک اور بیان کو بھی سامنے رکھنا ضروری ہے۔ انھوں نے باغ و بہار کے دیباچے کے آخر میں لکھا ہے: "یہ عاجز بھی ہر ایک شہر کی سیر کرتا اور تماشا دیکھتا یہاں تلک پہنچا ہے" (ص ۹)۔ "یہاں تلک" سے کلکتہ مراد ہے۔ اب یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کن شہروں کی سیر کرتے اور تماشا دیکھتے آئے تھے۔ کیا کسی جگہ (قسمت آزماؤں کی طرح) قیام بھی کیا تھا؟ اس کی مدت کتنی تھی؟ ان سوالوں کے جواب معلوم نہیں۔ یہ بھی معلوم نہیں کہ ان کے اس بیان کا تعلق عظیم آباد سے کلکتے کے سفر کے درمیانی زمانے سے ہے یا دلی سے کلکتے پہنچنے کا پورا زمانہ مراد ہے۔ عظیم آباد میں ان کے قیام کی جو قیاسی مدت لکھی گئی ہے، اس کے سلسلے میں ہر ایک شہر کی سیر کرنے والے قول کو بھی سامنے رہنا چاہیے۔ معلوم نہیں اس سفر کا درمیانی زمانہ کتنا تھا۔ یوں عظیم آباد کے زمانۂ قیام کے تعین میں معمولی فرق یا زیادہ فرق کا پیدا ہو جانا بہ خوبی ممکن ہوگا۔

ملازمت:

کلکتے میں وہ بہ طور اتالیق دو سال تک کام کرتے رہے "لیکن نباہ اپنا نہ دیکھا، تب منشی میر بہادر علی جی کے وسیلے سے "گل کرسٹ تک رسائی ہوئی"۔ "تب" کے لفظ سے میں یہ خیال کرتا ہوں کہ اتالیقی چھوڑنے کے فوراً بعد وہ گل کرسٹ تک پہنچے تھے اور ۴ رمئی ۱۸۰۱ء کو فورٹ ولیم کالج کے ہندستانی شعبے میں "ماتحت منشی" کی حیثیت سے چالیس روپے ماہانہ پر ان کا تقرر ہوا تھا [گل کرسٹ اور اُن کا عہد طبع دوم، ص ۱۲۱]۔
اِس سلسلے کی ایک دل چسپ بات یہ ہے کہ خود میر بہادر علی حسینی کا تقرر بھی اسی تاریخ کو ہوا تھا؛ یعنی یہ دونوں ایک ساتھ ملازم ہوئے تھے۔ میر امّن نے جو حسینی کے وسیلے سے رسائی حاصل کی، تو اس سے بہ ظاہر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ حسینی کی رسائی گل کرسٹ تک اِس تاریخ تقرر سے کچھ پہلے ہی سے تھی۔ اِس قیاس کی تائید یوں بھی ہوتی ہے کہ جہاں

میر امّن کا تقرر" ماتحت منشی" کی حیثیت سے ہوا، وہاں حسینی کا تقرر" چیف منشی" کے طور پر دو سو روپیے ماہانہ مشاہرے پر ہوا تھا۔ اگر گل کرسٹ اُن کو پہلے سے (اچھی طرح) نہ جانتا ہوتا اور اُن کی صلاحیت اور استعداد سے (بہ خوبی) واقف نہ ہوتا، تو اچانک یہ تقرر اس طرح شاید نہیں ہو سکتا تھا۔[1]

ملازمت سے سبک دوشی :

۴ مئی ۱۸۰۱ء سے جون ۱۸۰۶ء تک وہ کالج میں رہے۔ عتیق صدیقی نے ہفت روزہ ہماری زبان (نئی دہلی) کے ایک شمارے میں فورٹ ولیم کالج کی کارروائیوں کے حوالے سے پہلی بار یہ وضاحت کی تھی کہ ۴ جون ۱۸۰۶ء کو ہندستانی شعبے کے پروفیسر کی اس شکایت پر کہ میر امّن نے ایک طالب علم کو پڑھانے سے انکار کیا ہے، کالج کونسل کے سامنے پیش کیے گئے۔ الزام کو تسلیم کرتے ہوئے پیرانہ سالی اور جسمانی معذوری کا اُنھوں نے عذر پیش کیا۔ اُن کا بیان سننے کے بعد کالج کونسل اس نتیجے پر پہنچی کہ میر امّن کالج کی خدمات سے سبک دوش

[1] گل کرسٹ، حسینی کا بہت قائل تھا۔ جب کالج کونسل نے اُس کا بھیجا ہوا کتابوں کی طباعت کا تخمینہ منظور کرنے سے انکار کر دیا تھا، اُس وقت اُس نے کالج کونسل کو ایک طویل خط لکھا تھا، جس میں بعض شرطوں کے ساتھ یہ پیش کش کی تھی کہ وہ خود اِن کتابوں کو چھاپ سکتا ہے؛ اُس میں ایک شرط یہ بھی تھی: "تالیف، ترجمے اور نقل کے تمام اخراجات میرے ذمّے ہوں گے، لیکن حکومت میر بہادر علی حسینی کو اپنے مصارف پر میری ماتحتی میں ہندستانی کتابوں کے مقابلے اور اُن کی تصحیح کے کام پر بحال رکھے" [گل کرسٹ اور اُس کا عہد طبع دوم، ص ۱۲۷]۔

ڈاکٹر صدیق الرحمان قدوائی نے اپنے تحقیقی مقالے میں (حوالے کے ساتھ) لکھا ہے:

He calls Him Bahadurali Husaini as "One of the best Hindoostani scholars in India". He also says that he could never have affected what he had done in orthography and Grammer" if not strenuously aided by the Head Moonshee". Gilchrist and the Language of Hinduoostan, PP 79. (Rachna Prakashan New Delhi, 1972)

ہونے کے خواہش مند معلوم ہوتے ہیں۔ طے پایا کہ اِس مہینے کی تنخواہ کے علاوہ، اور چار مہینوں کی تنخواہ دے کر، کالج کی خدمات سے سبک دوش کر دیا جائے۔ ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی نے گنجِ خوبی کے مقدمے [شائع کردۂ شعبۂ اُردو، دہلی یونی ورسٹی، دہلی] میں یہی بات لکھی ہے (مگر عتیق صدیقی کی دریافت کا حوالہ نہیں دیا ہے) اور فورٹ ولیم کالج کی پروسیڈنگ کا حوالہ دیا ہے: "پروسیڈنگ آف دی کالج آف فورٹ، ہوم میسلینیس رکارڈ نمبر ۵۶۰، ڈیٹڈ ۴ جون ۱۸۰۶ء، ص ۱۳۶۔ نیشنل آرکائوز آف انڈیا، نئی دہلی۔"

بہ ہر حال یہ ثابت ہے کہ میر امّن، فورٹ ولیم کالج میں ۴ جون ۱۸۰۶ء تک کام کرتے رہے اور اسی مہینے میں سبک دوش کر دیے گئے۔ اس تاریخ تک وہ بہ قیدِ حیات تھے، مگر اُس کے بعد کا احوال معلوم نہیں۔ وہ کب تک زندہ رہے، کب انتقال ہوا، کہاں دفن ہوئے؛ اِن میں سے کوئی بات معلوم نہیں۔ ۱۸۰۶ء میں جب وہ پیرانہ سالی اور جسمانی معذوری کا عذر کرتے ہیں، تو اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ عمر کے لحاظ سے وہ اُس وقت بڑھاپے کی منزلیں طے کر رہے تھے۔ محض قیاساً یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ اُس وقت اُن کی عمر پینسٹھ (65) سال سے کم نہیں ہوگی۔ ستّر سال سے بھی کچھ زیادہ ہو، تو بھی یہ قرینِ قیاس رہے گی، بل کہ زیادہ قرینِ قیاس ہوگی؛ مگر اس سلسلے میں قطعیت کے ساتھ فی الوقت تعین نہیں کیا جا سکتا۔

گنجِ خوبی

دو کتابیں اُن کی یادگار ہیں: باغ و بہار، گنجِ خوبی۔ آخرالذکر فارسی کی مشہور کتاب اخلاقِ محسنی کا ترجمہ ہے۔ دونوں کتابیں گل کرسٹ کی فرمایش پر لکھی گئی تھیں۔ گنجِ خوبی کے دیباچے میں میر امّن نے صراحتاً لکھا ہے کہ: "سنہ ایک ہزار دو سو سترہ ہجری میں، مطابق اٹھارہ سے دو عیسوی کے، باغ و بہار کو تمام کر کے اس کو لکھنا شروع کیا" [گنجِ خوبی، شائع کردۂ شعبۂ اُردو، دہلی یونی ورسٹی۔ سالِ طبع: ۱۹۶۶ء، ص ۴]۔ کتاب کے آخر میں "تاریخ گنجِ خوبی" کے عنوان سے قطعۂ تاریخ (تکمیل) ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۲۱۹ھ

میں یہ کتاب مکمل ہوئی تھی۔ اِس کتاب کا ایک بیش قیمت خطّی نسخہ میر امّن کے ہاتھ کا لکھا ہوا، رائل ایشیاٹک سوسائٹی لندن کے کتاب خانے میں محفوظ ہے [اُس کا عکس میرے سامنے ہے]۔ اِس کتاب سے متعلق مزید تفصیل کے لیے دہلی یونی ورسٹی اڈیشن کے مقدمے کی طرف رجوع کیا جاسکتا ہے۔

باغ و بہار ــــــ آغاز و اختتام :

میر امّن نے باغ و بہار کے خاتمے کی عبارت میں لکھا ہے :

"جب یہ کتاب فضلِ الٰہی سے اختتام کو پہنچی، جی میں آیا کہ اِس کا نام بھی ایسا رکھوں کہ اُسی میں تاریخ نکلے۔ جب حساب کیا، تو بارہ سو پندرہ ہجری کے آخر سال میں کہنا شروع کیا تھا۔ باعث عدمِ فرصت کے بارہ سو سترہ سنہ کی ابتدا میں انجام ہوئی۔ اِس فکر میں تھا کہ دل نے کہا "باغ و بہار[1]" اچھا نام ہے کہ ہم نام و ہم تاریخ اِس میں نکلتی ہے۔ تب میں نے یہی نام رکھا" [ص ۲۴۹]۔

---

[1] یہ دل چسپ اتفاق ہے کہ محمد غوث زرّیں نے بھی، ۱۲۱۷ھ میں قصۂ چہار درویش کا اُردو میں ترجمہ کیا تھا اور اُس کی تاریخ "باغ و بہار" سے نکالی تھی۔ اِس ترجمے سے متعلق ضروری معلومات کے لیے دیکھیے ڈاکٹر گیان چند جین کی کتاب اُردو کی نثری داستانیں۔ نیز اُن کے مجموعۂ مضامین حقائق میں زرّیں کے لکھے ہوئے فارسی قصۂ چہار درویش پر بھی ایک تحریر شامل ہے۔ یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ زرّیں نے چہار درویش کے قصّے کو پہلے فارسی میں لکھا تھا، اُس کے بعد اُس نے راجا رام دین کی فرمایش پر اپنے فارسی متن کا اُردو میں ترجمہ کیا۔ اُردو کے مقابلے میں فارسی متن نسبتاً مفصّل ہے۔

ایک بات اور : زرّیں کا نام محمد غوث ہے، لیکن چار درویش (اُردو) کے کئی نسخوں پر "محمد عوض" مندرج ہے۔ ڈاکٹر نثار احمد فاروقی کو اس کا ایک خطّی نسخہ ملا تھا، مکتوبۂ ۲۲ ستمبر ۱۸۰۳ء، اُس میں مصنّف کا نام "محمد غوث زرّیں ساکن بجنور شگفتہ زمین" درج ہے۔ یہ قیاس کیا گیا کہ "کسی کم سواد کاتب نے محمد غوث کو "محمد غوض" لکھ دیا ہوگا جسے بعد میں "محمد عوض" پڑھ لیا گیا" [ڈاکٹر گیان چند جین نے اپنی کتاب اُردو کی نثری داستانیں میں یہ پوری بات لکھی ہے۔ میرے سامنے یہی کتاب ہے اور داوین کی عبارت اُسی سے ماخوذ ہے]۔ اِس سلسلے میں یہ عرض کرنا ہے کہ یہ محض قیاس نہیں، حقیقت ہے۔ اِس کا ثبوت یہ ہے کہ میرے سامنے اِس کتاب کا جو خطّی نسخہ ہے، اُس میں مصنّف کا نام "محمد غوض"
←

یہ بیان بہت واضح ہے؛ اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۲۱۵ھ کے آخر میں اِس کتاب کا آغاز ہوا تھا اور ۱۲۱۷ھ کے آغاز میں یہ مکمّل ہو گئی؛ لیکن ہندی مینول اور اِس کتاب کی ایک خطّی روایت (مخزونہ انڈیا آفس لندن) کی دست یابی نے میر امّن کے اِس واضح بیان کو ناقابلِ قبول بنا دیا ہے۔ اِن دونوں روایتوں کے اندراجات کو بعد میں پیش کیا جائے گا، پہلے عتیق صدیقی کے ایک اہم قول کو پیش کرنا ضروری ہے؛ کیوں کہ سب سے پہلے اُنھی نے میر امّن کے منقولۂ بالا بیان پر شک ظاہر کیا تھا اور گل کرسٹ کے ایک خط کو دستاویزی شہادت کے طور پر پیش کیا تھا [ہندی مینول اور مذکورہ خطّی نسخے کے اندراجات کا اُس وقت تک کسی کو علم نہیں تھا]۔

عتیق صاحب نے لکھا ہے: "بعض ایسی دستاویزی شہادتیں ہم کو ملتی ہیں جن سے گمان ہوتا ہے کہ چار درویش ۱۸۰۱ء کے اواخر میں مکمّل ہو چکی تھی" [گل کرسٹ اور اُس کا عہد، طبعِ دوم، ص ۱۳۲]۔ اِس سلسلے میں اُنھوں نے گل کرسٹ کے ایک خط کا حوالہ دیا تھا، جو اُس نے کالج کونسل کو بھیجا تھا:

> "اِس معاملے میں ہمارے سامنے سب سے زیادہ اہم اور واضح بیان گل کرسٹ کا ہے، جس کے مطابق ۱۲ جنوری ۱۸۰۲ء کو چار درویش، ہرکارہ پریس میں فارسی رسمِ خط میں چھپ رہی تھی اور اِس تاریخ تک اُس کے ۵۸ صفحات چھپ چکے تھے۔ اِس کے یہ معنی ہیں کہ ۱۸۰۱ء کے اواخر میں کتاب مکمّل ہو چکی تھی اور چھاپے خانے کے سپرد کی جا چکی تھی" [ایضاً، ص ۱۳۳]۔

گل کرسٹ نے کالج کونسل کو جو خط لکھا تھا، اُس خط کے ساتھ "اُن کتابوں کی طباعت کا تخمینہ" بھی منسلک تھا جو "یا تو چھپ چکی تھیں، یا چھپ رہی تھیں، یا اِسی سال چھپنے

لکھا ہوا ہے۔ ظاہر ہے کہ جو بھی اِسے دیکھے گا، وہ یہی سمجھے گا کہ یہ "محمد عوض" ہے۔ "غ" پر غلطی سے نقطہ لگ گیا ہے۔ کسی نسخے کے ایسے ہی اندراج سے "محمد غوث" نے "محمد عوض" کا روپ دھارا ہے۔ میرے پاس جو خطّی نسخہ ہے یہ دراصل ایک مطبوعہ نسخے کی نقل ہے۔ مطبع مسیحائی (لکھنؤ) میں چھپے ہوئے نسخے کو ۱۸۴۵ء میں سیّد بشارت اللہ نے اپنے لڑکے سیّد ظہور الحق کے لیے نقل کیا ہے۔ یہ نقل خاصا غلط نویس ہے۔

والی تھیں" (ایضاً)۔ عتیق صاحب نے تخمینے والے اُس نقشے کو بھی اِسی بیان کے ذیل میں نقل کر دیا ہے، اُس کے مطابق "چار درویش" کے پانچ سو نسخوں کی طباعت کے اخراجات کا تخمینہ آٹھ ہزار آٹھ سو روپے لکھا گیا ہے۔ یہ صراحت بھی موجود ہے کہ ہرکارہ پریس میں اِس کتاب کے ۵۰ صفحے چھپ چکے ہیں اور کُل "فولیو" ۲۲۴ ہیں۔ یہ تفصیلات اِس بات کو واضح کرتی ہیں کہ جنوری ۱۸۰۲ء سے پہلے یہ کتاب مکمل ہو چکی تھی، اِس کی طباعت کے خرچ کا تخمینہ تیار کر لیا گیا تھا اور اسے پریس بھیج دیا گیا تھا، جہاں چھپائی شروع ہو گئی تھی۔

عتیق صاحب کی پیش کی ہوئی اِس "دستاویزی شہادت" کے پیشِ نظر میر امّن کا یہ قول قابلِ قبول نہیں ٹھہرتا کہ یہ کتاب ۱۲۱۷ھ کی ابتدا میں مکمل ہوئی ——— میر امّن کے اِس قول کی اُنھوں نے یہ توجیہ کی ہے:

"اِس سلسلے میں ایک اور امکان کا اظہار کر دینا ضروری ہے اور وہ یہ ہے کہ جنوری ۱۸۰۲ء میں اور کتابوں کے ساتھ ساتھ "چار درویش" کی طباعت بھی جب ملتوی[1] کی گئی، تو اُس وقت میر امّن نے "چار درویش" کے مسودے پر نظرِ ثانی کر کے اُسے "باغ و بہار" بنایا ہو اور اِسی مناسبت سے اُس کا سنہ تالیف ۱۲۱۷ھ مطابق ۱۸۰۲ء قرار دیا ہو" [ایضاً ص ۴۲]۔

عتیق صاحب نے ازراہِ احتیاط "نظرِ ثانی" کے لیے "امکان" کا اظہار کیا ہے اور یہ بجائے خود درست تھا، یوں کہ اُس وقت تک ایسی کوئی شہادت سامنے نہیں آ سکی تھی جو سند کا کام دے سکتی؛ لیکن ہندی مینول کی دست یابی کے بعد [جس میں پہلی بار اِس کتاب کے ۱۰۲ صفحے چھپے تھے] یہ ثابت ہو گیا ہے کہ میر امّن نے اِس کتاب کی پہلی روایت پر نظرِ ثانی کی تھی اور جب ۱۸۰۴ء میں یہ کتاب پہلی بار مکمل طور پر چھپ کر سامنے آئی، تو وہ نظرِ ثانی شدہ روایت تھی [جس میں بہت سی تبدیلیاں کی گئی تھیں]۔

عتیق صاحب کے اِن اندراجات کے بعد اب ہندی مینول اور مذکورہ خطّی نسخے کے

---

[1] اِس کی ضروری تفصیل ہندی مینول کے تعارف کے ذیل میں آئے گی۔

اندراجات کو پیش کیا جاتا ہے ــــــــ اِس کتاب کے آغاز میں، حمد و نعت کے بعد یہ عبارت ملتی ہے:

"منشا اِس تالیف کا یہ ہے کہ سنہ ایک ہزار دو سو پندرہ ہجری، اور اٹھارہ سے ایک سال عیسوی، مطابق ایک ہزار دو سو سات سنہ فصلی کے، عہد میں اشرف الاشراف مارکوئس ولزلی گورنر جنرل ... کے ... چرچا علم کا پھیلا ... اِس واسطے کتنی کتابیں اسی سال بہ موجب فرمایش کے تالیف ہوئیں" [ص ۵]۔

لیکن ہندی مینول میں یہ عبارت اِس طرح ملتی ہے:

"اشرف الاشراف ولزلی مارکوئس گورنر جنرل ... کے وقت میں ... کہ ایک ہزار دو سو پندرہ برس ہجری اور اٹھارہ سے ایک سال عیسوی مطابق ایک ہزار دو سو سات سن فصلی کے ہیں، چرچا علم کا پھیلا ... چناں چہ یہ کتاب اسی سال بہ موجب فرمایش کے تالیف ہوئی" [ص ۲]۔

آخری جملے سے واضح طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ باغ و بہار ۱۲۱۵ھ میں مکمل ہو چکی تھی۔ اِس کی تائید ایک اور اندراج سے ہوتی ہے۔ باغ و بہار کے آخر میں میر امّن کا کہا ہوا قطعۂ تاریخ شامل ہے، جس کا پہلا شعر یہ ہے:

"مرتّب ہوا جب یہ باغ و بہار — تھے سنہ بارہ سو سترہ در شمار" [ص ۲۵۰]

مگر اِس کتاب کا جو مکمل مخطوطہ دست یاب ہوا ہے [جس کا تعارف آگے آئے گا] اُس میں یہ شعر اِس صورت میں مندرج ہے:

"مرتّب ہوا جب یہ باغ و بہار — تھے سن بارہ سو پندرہ در شمار"

اِس سے بھی اسی کی تائید ہوتی ہے کہ یہ کتاب (پہلی روایت کی صورت میں) ۱۲۱۵ھ میں مکمل ہو چکی تھی۔ [بہ ظاہر نظرِ ثانی کے وقت ۱۲۱۵ کو ۱۲۱۷ سے بدلا گیا ہے]

۱۲۱۵ھ مشتمل ہے ۱۸۰۰ء اور ۱۸۰۱ء پر۔ انجمن ترقی اردو کراچی کی شائع کی ہوئی تقویم کے مطابق یکم محرم ۱۲۱۵ھ، ۲۵ مئی ۱۸۰۰ء کے مطابق ہے اور یکم محرم ۱۲۱۶ھ کو مئی ۱۸۰۱ء کی چودہ تاریخ تھی۔ اگر اِس بات کو مان لیا جائے کہ یہ کتاب ۱۲۱۵ھ میں مکمل ہو چکی تھی، تو

اِس کا مطلب یہ ہوگا کہ ۱۳ مئی ۱۸۰۱ء تک یہ تیار ہو چکی تھی یہ بات معلوم ہے کہ فورٹ ولیم کالج میں میر امّن کے تقرر کا فیصلہ ۲۹ اپریل ۱۸۰۱ء کو ہوا تھا اور ۴ مئی ۱۸۰۱ء کو وہ باضابطہ ملازم ہوئے تھے۔ اُنھوں نے بالصّراحت یہ لکھا ہے کہ یہ کتاب گل کرسٹ کی فرمایش پر لکھی گئی : "جان گل کرسٹ صاحب نے.... لطف سے فرمایا کہ اِس قصّے کو ٹھیٹھ ہندوستانی گفتگو میں.... ترجمہ کرو۔ موافق حکم حضور کے میں نے اُسی محاورے سے لکھنا شروع کیا جیسے کوئی باتیں کرتا ہے" (ص ۶)۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ گل کرسٹ نے اِس کام کی فرمایش کب کی تھی ؟ ملازمت کے بعد؟ مگر اِس صورت میں تو یہ ماننا ہوگا کہ میر امّن نے ۴ مئی کو شروع کر کے ۱۳ مئی کو (یعنی دس دن میں) اِس کام کو مکمّل کر لیا۔ بہ ظاہر یہ بات ماننے کے قابل نہیں معلوم ہوتی کہ اِتنا بڑا کام دس دن میں مکمّل ہو جائے۔ لامحالہ یہی ماننا پڑے گا کہ ملازمت سے پہلے ہی گل کرسٹ نے اُن سے فرمایش کی ہوگی اور یہ فرمایش اُس وقت کی گئی ہوگی جب اُن کے اپنے قول کے مطابق "منشی میر بہادر علی جی کے وسیلے سے حضور تک جان گل کرسٹ صاحب بہادر کے رسائی ہوئی" تھی۔

آغاز کے سلسلے میں میر امّن نے عبارتِ خاتمہ میں یہ صراحت بھی کی ہے : "جب حساب کیا تو بارہ سو پندرہ ہجری کے آخر سال میں کہنا شروع کیا تھا"۔ "آخر سال" سے اُن کی مراد کیا ہے، اِس کا قطعی طور پر تعیّن تو مشکل ہے۔ اِس سے سال کا آخری مہینا مراد لیا جا سکتا ہے اور یہ بھی بہ خوبی ممکن ہے کہ آخری دو مہینے مراد لیے گئے ہوں ہم (از روے احتیاط) یہ فرض کیے لیتے ہیں کہ سال کے آخری دو مہینے کی مدّت مراد لی گئی ہے۔ تقویم کے مطابق یکم ذی قعدہ ۱۲۱۵ھ مطابق ہے ۱۶ مارچ ۱۸۰۱ء کے، اور یکم محرم ۱۲۱۶ھ، ۴ مئی ۱۸۰۱ء کے مطابق ہے۔ اِس حساب کے لحاظ سے یہ ماننا ہوگا کہ ۱۶ مارچ ۱۸۰۱ء سے لے کر ۱۳ مئی ۱۸۰۱ء کے درمیانی وقفے میں کسی وقت اِس کام کا آغاز ہوا ہوگا اور اِس صورت میں بھی یہی ماننا ہوگا کہ ملازمت (۴ مئی ۱۸۰۱ء) سے پہلے اِس کام کی فرمایش کی گئی ہوگی۔ لیکن اِس سلسلے میں یہ بات ضرور ذہن میں رہنا چاہیے کہ یہ عبارتِ منقولہ نظرِ ثانی کے بعد کی لکھی ہوئی ہے، اِس لیے اُن کا یہ قول کہ ۱۲۱۵ھ کے آخر سال میں کہنا شروع کیا، کچھ زیادہ اہمیت

نہیں رکھتا، اِسے بہ آسانی نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔
یہاں پر یہ بات بھی واضح ہو جانا چاہیے کہ ہندی" نسخہ" (یعنی روایت اوّل) کے دیباچے کی عبارت سے واضح طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ جس وقت یہ دیباچہ لکھا گیا ہے، اُس وقت وہ فورٹ ولیم کالج میں ملازم تھے: "تب منشی میر بہادر علی جی کے وسیلے سے حضور تک جان گل کرسٹ صاحب..... کے رسائی ہوئی۔ بارے طالع کی مدد سے ایسے جوان مرد کا دامن ہاتھ لگا ہے، چاہیے کہ دن کچھ بھلے آویں۔ نہیں تو یہ بھی غنیمت ہے کہ ایک ٹکڑا کھا کر، پانو پھیلا کر سو رہتا ہوں اور گھر میں دس آدمی چھوٹے بڑے پرورش پا کر دُعا اُس قدر دان کو کرتے ہیں"۔۔۔۔ آخری جملے سے صراحت کے ساتھ معلوم ہوتا ہے کہ جس وقت یہ تحریر لکھی گئی ہے، وہ اُس وقت گل کرسٹ کے تحت کام کر رہے تھے۔ اِس عبارت سے پہلے گل کرسٹ کی تعریف کرتے ہوئے اُنھوں نے یہ شعر بھی لکھا ہے:

"سرکار سے دے کے آب و دانا نادان کو بنایا جس نے دانا"

(۱۸۰۴ء کے مطبوعہ نسخے میں یہ شعر شامل نہیں) مصنفین کا یہ عام انداز رہا ہے کہ مقدمہ یا دیباچہ اصل کتاب کی تکمیل کے بعد لکھتے ہیں۔ سارے قرائن دلالت اِسی پر کرتے ہیں کہ میر امّن نے بھی اِسی روایت کی پابندی کی ہے اور دیباچہ، کتاب کی تکمیل کے بعد لکھا ہے اور یہ بالکل درست ہے کہ جب وہ دیباچہ لکھ رہے تھے، اُس وقت وہ کالج کے ملازم تھے اور گل کرسٹ کی زیرِ نگرانی کام کر رہے تھے۔
اب مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ باغ و بہار کی پہلی روایت ہجری سنہ کے لحاظ سے ۱۲۱۵ھ میں مکمل ہو گئی تھی۔ ۱۲۱۶ھ کا آغاز ۱۴ مئی ۱۸۰۱ء کو ہوتا ہے، اِس لحاظ سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ عیسوی سنہ کے لحاظ سے ۱۳ مئی ۱۸۰۱ء تک یہ پہلی روایت مرتب ہو چکی تھی۔ اُس کے بعد اِس پر نظرِ ثانی کی گئی اور میر امّن کی صراحت کے مطابق ۱۲۱۷ھ کی ابتدا میں نظرِ ثانی کا کام مکمل ہوا۔ "ابتدا" سے اگر سال کے پہلے دو مہینوں کی مدت بھی احتیاطاً مراد لی جائے، تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ مئی جون ۱۸۰۲ء کے دوران نظرِ ثانی کا کام مکمل ہوا تھا [تقویم کے مطابق یکم محرم ۱۲۱۷ھ، ۴ مئی ۱۸۰۲ء کے مطابق ہے]۔ نظرِ ثانی کے بعد اِس کا

تاریخی نام "باغ و بہار" رکھا گیا، جس سے ہجری سنہ ۱۲۱۷ھ نکلتا ہے [پہلے اِس کا نام "چار درویش" تھا]۔ نظرِ ثانی کے بعد میر امّن نے وہ عبارتِ خاتمہ لکھی جس کو اوپر نقل کیا گیا ہے، جس میں اُنھوں نے یہ لکھا کہ یہ کتاب ۱۲۱۷ھ میں مرتّب ہوئی ہے۔ نظرِ ثانی ہی میں اُنھوں نے آخرِ کتاب میں شامل قطعۂ تاریخ کے دوسرے مصرعے میں "۱۲۱۵" کو ۱۲۱۷ سے بدلا" اور اُسی وقت آغازِ کتاب میں شامل روایتِ اوّل کی اُس عبارت میں تبدیلی کی، جس کو اوپر نقل کیا گیا ہے۔

روایتِ اوّل میں اُنھوں نے لکھا تھا: "چناں چہ یہ کتاب اِسی سال بہ موجب فرمایش کے تالیف ہوئی"۔ اب اُسے اِس طرح بدل دیا: "اِس واسطے کتنی کتابیں اِسی سال بہ موجب فرمایش کے تالیف ہوئیں"، اور اِس طرح "یہ کتاب اِسی سال تالیف ہوئی" کا تعیّن ختم ہو گیا۔

اِس کے بعد، اِسی سلسلے میں میر امّن کے ایک اور بیان کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے۔ اُن کی ایک عرضی کتاب کے شروع میں شامل ہے، جس میں اُنھوں نے لکھا ہے:

"اِس بے وطن نے حکم اشتہار کا سُن کر، چار درویش کے قصّے کو، ہزار جدّ و کد سے اُردوے معلّٰی کی زبان میں باغ و بہار بنایا۔ فضلِ الٰہی سے سب صاحبوں کے سیر کرنے کے باعث سرسبز ہوا۔ اب اُمّیدوار ہوں کہ اِس کا پھل مجھے بھی ملے......"۔

شروع کی سطروں سے صاف طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ "اشتہار کا حکم سُن کر" اُنھوں نے یہ کتاب لکھی، لیکن یہ محض اندازِ بیان کی خرابی ہے۔ "اشتہار" سے قطعی طور پر وہ تجویز مراد ہے جسے کالج کونسل نے ۲ر نومبر ۱۸۰۱ء کو منظور کیا تھا، جس میں یہ کہا گیا تھا کہ اچھی کتابوں پر انعامات دیے جائیں گے۔ اُنھوں نے یہ جو لکھا ہے کہ "چار درویش کے قصّے کو...... باغ و بہار بنایا" یہ واضح طور پر اِس پر دلالت کرتا ہے کہ یہ اُس وقت کی بات ہے جب وہ پہلی روایت پر (جس کا نام "چار درویش" تھا) نظرِ ثانی کر چکے تھے اور اُس کا تاریخی نام "باغ و بہار" رکھ چکے تھے اور یہ عرضی اُنھوں نے اُس وقت لکھی ہے جب اُن کی کتاب انعام کی غرض سے کالج کونسل کے سامنے پیش کی گئی [اِس کی تفصیل "انعام" کے تحت آئے گی]۔ اُن

کا یہ جملہ "سب صاحبوں کے سیر کرنے کے باعث سرسبز ہوا" بھی اسی پر دلالت کرتا ہے کہ اُس وقت تک کتاب "صاحبوں" کی نظر سے گزر چکی تھی۔

کتاب کا نام:

گل کرسٹ نے ۲۰ جنوری ۱۸۰۲ء کو کالج کونسل کے نام ایک طویل خط لکھا تھا، جسے محقق صدیقی نے اپنی محوّلہ بالا کتاب میں نقل کر دیا ہے (ص ۱۲۵) اُس میں گل کرسٹ نے اِس کتاب کا نام "چار درویش" لکھا ہے۔ گل کرسٹ نے کتابوں کی طباعت کا جو تخمینہ کونسل کے پاس بھیجا تھا (جس کا حوالہ آچکا ہے) اُس میں بھی اس کا نام "چار درویش" ہے۔ محقق صاحب نے لکھا ہے: "فورٹ ولیم کالج کی کارروائیوں کے رجسٹر کے مطابق اِس کا نام "چار درویش" ہے" (ایضاً ص ۱۳۰)۔ اِس طرح یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جب اِس کتاب کی پہلی روایت مکمّل ہوئی تھی، تو اِس کا نام "چار درویش" تھا۔ بعد کو جب میر امّن نے پہلی روایت پر نظرِ ثانی کی، تب اِس کا تاریخی نام "باغ و بہار" رکھا۔

اِس سلسلے میں بہ ظاہر ایک اشکال سامنے آتا ہے۔ ہندی مینول میں مشمولہ کتابوں کی فہرست بھی دی گئی ہے؛ ایک طرف اُردو رسم خط میں اور دوسری طرف (آخر میں) رومن رسم خط میں؛ دونوں صفحوں پر اِس کا نام "باغ و بہار" لکھا گیا ہے؛ لیکن درحقیقت اِس میں اشکال نہیں۔ یہ معلوم ہے کہ ہندی مینول ۱۸۰۲ء میں چھپا ہے۔ یہ سالِ طباعت اُس کے سرورق پر مرقوم ہے اور ۱۸۰۲ء کے وسط تک میر امّن نظرِ ثانی کے کام کو مکمّل کر چکے تھے۔ جب مینول کی فہرستِ مضامین تیار کی گئی [اُس میں شامل کتابوں کے اجزا تو مختلف چھاپے خانوں میں چھپے تھے اور سرورق، صراحت کے مطابق "ہندوستانی پریس" میں چھپا ہے] تو اُس وقت نظرِ ثانی کا کام مکمّل ہو چکا تھا اور "چار درویش" کا نام "باغ و بہار" رکھا جا چکا تھا۔

---

۵ ہندی مینول کے اِن دونوں صفحوں کا عکس اِس کتاب میں شامل کر لیا گیا ہے۔

باغ و بہار کی تیاری میں مدد اور نثر کی درستی کا دعوا :

دُوا فزا دسنے یہ دعوا کیا ہے کہ اُنھوں نے باغ و بہار کی عبارت کی درستی اور اُس کی تیاری میں حصہ لیا ہے ۔ پہلا بیان گل کرسٹ کا ہے ۔ اُس کے بھیجے ہوئے تخمینے کے مطابق [جس کا حوالہ اوپر آچکا ہے] کتابوں کی چھپائی کے لیے رقم منظور کرنے کے سلسلے میں سکریٹری کالج کونسل نے یہ لکھا تھا : "کالج کونسل نے مجھے یہ ہدایت کی ہے کہ اِس امر سے آپ کو مطّلع کر دوں کہ .... آئندہ اُس وقت تک نہ تو کوئی کتاب قبول کی جائے اور نہ کوئی رقم اِس مد میں صرف کی جائے ، جب تک مسوّدات کالج کونسل کے سامنے پیش نہ کر لیے جائیں ...." [گل کرسٹ اور اُس کا عہد ، طبع دوم ، ص ۱۲۵] [1] گل کرسٹ نے اِس جواب کے یہ معنی نکالے اور صحیح نکالے کہ یہ ہندستانی شعبے کے لیے اِتنی بڑی رقم کالج کونسل منظور نہیں کرنا چاہتی" [ایضاً] گل کرسٹ نے اِس خط کے جواب میں جو مفصّل خط لکھا ، اُس سے جھنجلاہٹ چھلکی پڑتی ہے ۔ اِسی خط میں اُس نے یہ بھی لکھا تھا : " ہندستانی (ادب) حقیقتاً ابھی تک طفولیت کے دور سے گزر رہا ہے ۔ اگر اِس وقت شدید کفایت شعاری برتی گئی ، تو وہ کبھی پروان نہ چڑھ سکے گا ۔ صرف چار درویش کے ساٹھ صفحات تیّار کرانے میں مجھے سات آٹھ مہینے تک محنت و توجہ کرنی پڑی ہے ۔ اِسی سے اور کتابوں کے متعلّق اندازہ لگایا جا سکتا ہے " [ایضاً ص ۱۲۶] ۔

گل کرسٹ نے کس انداز سے محنت اور توجّہ کی تھی ، اُس کی تفصیل تو معلوم نہیں ، لیکن یہ معلوم ہے کہ اُس کے زمانے میں جو کتابیں تیار ہوئی تھیں ، وہ اُس کی نگرانی میں تیّاری کے مرحلوں سے گزری تھیں ۔ اُس کی اِسی عبارت کا آخری جملہ بھی اِس طرف اشارہ کر رہا ہے ۔ یہ ظاہر ہے کہ اِس ادارے میں پہلی بار ایک نئے انداز سے منظّم طور پر کام شروع کیا گیا تھا ؛ اِس لیے یہ قدرتی بات تھی اور یہ لازم تھا کہ اُس نئے انداز کی نگرانی اور دیکھ بھال پوری طرح

---

[1] ڈاکٹر صدیق الرحمان قدوائی نے گل کرسٹ سے متعلق جو تحقیقی مقالہ (انگریزی میں) لکھا ہے ، اُس میں اُنھوں نے گل کرسٹ کی اصل عبارت بھی لکھی ہے ۔

کی جاتی۔ گویا یہ ایک عمومی انداز تھا کتابوں کی ترتیب و تسوید کی نگرانی کا۔ اِس میں عبارت پر نظر ڈالنا اور مشورے دینا بھی شامل ہوگا۔ میر امّن کو اُردو لکھنا تو حسینی اور افسوس بھی نہیں سکھا سکتے تھے [وہ خود میر امّن سے کم درجہ نثر نگار ہیں] ہاں عمومی طور پر مشورے دیے جا سکتے تھے اور جموعی طور پر رائے ظاہر کی جا سکتی تھی اور گل کرسٹ نے اِسی اندازِ نگرانی کی طرف (غالباً) اشارہ کیا ہے۔

اِس کا اندازہ ایک اور طرح بھی کیا جا سکتا ہے۔ گنجِ خوبی کا جو مخطوطہ میر امّن کے ہاتھ کا لکھا ہوا لندن میں ہے [جس کا ذکر اوپر آ چکا ہے] میر امّن نے اُس پوری کتاب کو گل کرسٹ کے نظامِ املا کے مطابق لکھا ہے۔ اعراب نگاری اور معروف مجہول اور لین آوازوں کے لیے علامات کی شمولیت کا (بڑی حد تک) اہتمام کیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ گل کرسٹ کی ترتیب اور کڑی نگرانی کا اثر ہے۔ [اُس زمانے کی بات چھوڑیے، آج اُردو کے بیش تر مصنّفین کو اِن باتوں سے دور کا بھی علاقہ نہیں] ۔ گل کرسٹ کے ذہن میں نئی نصابی کتابوں کا تصوّر بہت واضح تھا۔ اُسے شکایت تھی کہ "ابھی ہندستانی نثر میں ایک بھی کتاب ایسی نہیں ہے جو قدر و قیمت یا صحّت کے اعتبار سے اِس قابل ہو کہ میں اپنے شاگردوں کو پڑھنے کے لیے دے سکوں۔ کسی ایسی جگہ سے شہد نکالنا میرے بس کی بات نہیں ہے جہاں مکّھیوں کا کوئی چھتّا ہی نہ ہو" [گل کرسٹ کے ایک خط کا اقتباس : گل کرسٹ اور اُس کا عہد، طبعِ دوم، صفحہ ۱۳۸]۔ باغ و بہار کے پیش لفظ میں اُس نے نوطرزِ مرصّع کی عبارت کے متعلق بُری رائے ظاہر کی ہے۔ اِن باتوں کے پیشِ نظر، پہلا کام تو اُس نے یہی کیا ہوگا کہ طرزِ تحریر کی طرف توجّہ دلائی ہوگی اور مرتّبین کو بتایا ہوگا کہ اسلوبِ تحریر کا احوال اور انداز کیا ہونا چاہیے [اِس کا اعتراف میر امّن نے باغ و بہار کے دیباچے میں کیا ہے] ۔ بار بار اُس پر نظر بھی ڈالی ہوگی اور اپنے اندازِ نظر کے مطابق مشورے بھی دیے ہوں گے۔ اِس طرح ہم بہ آسانی کہہ سکتے

لہ باغ و بہار کی اشاعتِ اوّل کے آخر میں انگریزی میں جو ورق ہے، اُس کے پہلے صفحے پر (جو گویا ٹائٹل پیج ہے) یہ بھی مرقوم ہے :
Under the Superintendence of John Gilchrist.
اِس سے بھی یہی ظاہر کرنا مقصود ہے۔

ہیں کہ باغ و بہار (اور دوسری کتابوں) کی تیاری گل کرسٹ کی عمومی ہدایات کے تحت کی گئی اور اُس کی نگرانی میں وہ مرتب[1] ہوئیں۔ اِس میں بنیادی طور پر عبارت کے انداز اور بیان کے اسلوب پر توجہ کی گئی ہوگی اور مشورے دیے گئے ہوں گے، یعنی اُردو پن اور چلن کا پہلو نمایاں لیے ہے۔ روایتی مشکل نگاری، بے جا آرایش پسندی اور صنعت گری سے پرہیز کیا جائے، وغیرہ۔ گل کرسٹ کے مندرجۂ بالا قول کا مطلب میرے نزدیک یہی ہے۔

دوسرے شخص میر شیر علی افسوس ہیں۔ آرایشِ محفل کے دیباچے میں اُنھوں نے یہ لکھا ہے کہ گل کرسٹ کے حکم کے مطابق اُنھوں نے متعدد کتابوں کی اصلاح کی ہے [اُن کی صراحت کے مطابق اِن کتابوں کی تعداد چھے ہے]۔ اِس کتاب کا جو مطبوعہ نسخہ ہے، اُس میں تو صرف یہ عبارت ملتی ہے:

"جب میں "باغِ اُردو" کی تحریر سے فراغت پا چکا، صاحب مدرسِ ہندی مسٹر جان گل کرسٹ بہادر دام لطفہ نے ... فرمایا فی الواقع تو اِس فن میں دستگاہ کامل رکھتا ہے ... اب جتنی کتابیں کہ لوگوں کی تالیف ہیں یا ترجمے، تو اُنھیں اصلاح دے۔ زنہار اِس امر میں کسی کی خاطر نہ کرنا۔ اُن کی صحت و غلطی کی پرسش تجھی سے ہوگی، مولفوں مترجموں سے کچھ علاقہ نہیں۔ میں مجبور تھا، حکم اُن کا رد نہ کر سکا۔ طوعاً کرہاً اِس کام میں مشغول ہوا۔ چناں چہ چار کتابیں تو بالکل درست کیں تفصیل اُن کی دیباچۂ رقعی میں لکھ چکا ہوں اور ایک آدھ کے چھلے ہی مربوط کر دیے۔ بعد اُس کے اِس کام سے دست بردار ہوا کہ محنت برباد گئی لازم جس کا نتیجہ ہو، وہ بے فائدہ ہے۔" [آرایشِ محفل، مجلسِ ترقیِ ادب لاہور، ص ۳]۔

یعنی مطبوعہ نسخے میں اُن کتابوں کی تفصیل نہیں لکھی گئی۔ اِس کی وجہ بھی اُنھوں نے اِسی دیباچے میں لکھ دی ہے: "بعضے مولفین و مترجمین نے چھاپے کے وقت جو درخواست کی کہ نام کتبِ مسطورہ کے اگر دیباچے میں رہیں گے تو ہماری کسرِ شان ہوگی۔ ناگزیر اُن کے پاسِ خاطر (کذا) راقم نے صفحۂ تحریر سے نکال ڈالے" [ایضاً ص ۲]۔ اِس کی نشان دہی اُنھوں نے

[1] ڈاکٹر صدیق الرحمان قدوائی نے اپنے محولہ بالا تحقیقی مقالے میں بھی یہی رائے ظاہر کی ہے [ص ۷۹]۔

ضرور کردی کہ خطی نسخے میں یہ تفصیل موجود ہے اور یہ واقعہ ہے کہ موجود ہے۔ ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ کے کتاب خانے میں اس کتاب کا جو خطی نسخہ محفوظ ہے [نمبر U/۱۰۸ ۔ اُس پر فورٹ ولیم کالج کی مہر ثبت ہے] اُس کے دیباچے میں افسوس کی مکمل عبارت موجود ہے:

"..... طوعاً کرہاً اس کام میں مشغول ہوا، چناں چہ نثرِ بے نظیر، قصۂ گل بکاولی، مادھونل، توتا کہانی، قصۂ حاتم، قصۂ چار درویش کو واجبی واجبی درست کیا، یعنے جس میں جتنی غلطی دیکھی، صحیح کی۔ ماجرا اس کا یوں ہے کہ قصہ چار درویش کا تو محاورے میں اکثر درست و عبارت اُس کی نہایت چست تھی، جوں کی توں رہی، پر کہیں کہیں جملے بے ربط تھے، سو مربوط کر دیے۔ اور توتا کہانی، حاتم کا قصہ بھی علیٰ ہذا القیاس محاورے میں ٹھیک تھا، کیوں کہ مترجم ان کا بھی زبان دان بلکہ شاعر بھی ہے، لیکن بہ سبب بے پروائی و سہل انگاری کے اس نے اصل سے جو مطابق نہ کیا، اس لیے عبارت بیش تر بدلی گئی۔ اور مادھونل کا تو مترجم زبان دانی میں کامل صاحبِ دیوان لیکن ترجمے کے وقت آتے شاید مطابقت کا قصد نہ کیا۔ یا تو للّو سری لال کب، کہ معاون تھا، وہی اس بات پر متوجہ نہ ہوا، الغیب عنداللہ۔ بنا بر اس کے، نئے سر سے بنانے میں آیا۔ کچھ فقرے رہ گئے ہوں تو رہ گئے ہوں۔ اور نثرِ بے نظیر بھی چھاپے کے وقت اسی طرح درست کرنے میں آئی۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ بے رنگ تھی اور نظم بھی اس کی نہایت رنگین، صنائع بدائع سے بھری ہوئی، میر حسن سا شاعر اس کا مصنف، اور مولّف اس کا فنِ شاعری سے ماہر نہ تھا، بنا بر اس کے مطابق اُس کے نہ کر سکا، ہاں اپنی وضع کی ایک کتاب جدی لکھی، چناں چہ اکثر صاحبوں کے پاس وہ موجود ہے۔ اور قصہ گل بکاولی کا، یعنے مذہبِ عشق، ہر چند کہ اس کے مترجم کو نثر نویسی کا سلیقہ بھلا چنگا تھا، لیکن اصل سے اس کو اس نے بھی اکثر جاگہ مطابق نہ کیا۔ نظم کو تو بیشتر چھوڑ دیا، بلکہ کہیں مقام نثر کے بھی ترجمہ نہ کیے تھے۔ سوائے اس کے، اس زبان کی جمیع طرزوں سے بھی واقف نہ تھا، لہٰذا مضمون رنگین

اس قصّے کا اُتنے رنگت کے ساتھ بند ہو نہ سکا۔ قصہ کوتاہ، اِس ہیچ مداں کو از بس کہ اس کا مضمونِ عالی پسند آیا، بے اختیار جی لگ گیا، اِس لیے موافق اُس کے مرتبے کے عبارت تمام و کمال، بہ طرزِ شاعری درست کی۔ لیکن جہاں مترجم کی بھی عبارت اُسی وضع پر دیکھی، رہنے دی، کیوں کہ کچھ اپنے تئیں تعصب نہ تھا، فقط اِس قصّے کا بنانا منظور تھا۔ پر نام اِس لیے داخل نہ کیا کہ نثرِ بے نظیر میں ہر گاہ کہ یہ امر نہ ہوا، تو کسی میں نہ ہو، چنانچہ کسی کتاب کے آخر (کذا) اپنا نام ثبت نہ کیا۔ ساتھ اِس کے اِس کام سے دست بردار بھی ہوا کہ محنت برباد گنہ لازم جس کا نتیجہ ہو، وہ بے فائدہ ہے[1]۔"

[خاص ناموں پر خط میں نے کھینچے ہیں، نیز کاما، فل اسٹاپ اور اضافت کے زیر بھی میں نے لگائے ہیں]۔

یعنی افسوس نے گل کرسٹ کے حکم کے مطابق چھپے کتابوں کو بہ نظرِ اصلاح دیکھا۔ چار درویش کے متعلق اُنھوں نے [مصنّفانہ دیانت کے ساتھ] یہ صراحت کر دی ہے کہ "عبارت اُس کی نہایت چست تھی، جوں کی توں رہی"۔ بس کچھ بے ربط جملوں کو درست کیا گیا؛ اِس "اصلاح" کی حیثیت قطعی طور پر ضمنی ہے بل کہ صحیح معنوں میں اِسے "اصلاح" سے تعبیر ہی نہیں کرنا چاہیے؛ یہ سمجھنا چاہیے کہ بعض جملوں کے در و بست کے متعلق ایک انشا پرداز اور مصنّف نے اپنی رائے ظاہر کی ہے۔ یہ عام بات ہے کہ کتنے ہی بڑے انشا پرداز کی عبارت کو دوسرا اچھا انشا پرداز دیکھے گا، تو وہ بعض [یا بہت سے] مقامات پر اپنے اندازِ نگارش اور اپنے مختارات کی روشنی میں اُن مقامات کو اِس نظر سے دیکھ سکتا ہے کہ اِس جملے کو

---

[1] یہ اعتراف ضروری ہے کہ مجھے پہلی بار آرایشِ محفل کے اِس خطّی نسخے کے وجود کی اور اِس میں موجود اِس منقولہ عبارت کی اطّلاع ڈاکٹر عبیدہ بیگم کے تحقیقی مقالے فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات [سالِ طبع ۱۹۸۳ء] سے ملی تھی مگر مصنّفہ نے بہت اجمال کے ساتھ اِس کا حوالہ دیا ہے۔ حُسنِ اتفاق سے مجھے جنوری ۱۹۸۵ء میں مغربی بنگال انجمن ترقّیِ اُردو کی کان فرنس کے سلسلے میں کلکتے جانا پڑا۔ میں نے وہاں ایشیاٹک سوسائٹی کے کتاب خانے میں اِس مخطوطے کو نکلوا کر دیکھا اور اُس سے اِس عبارت کو نقل کیا۔ بہ ہر حال تقدم کا شرف مصنّفہ کو حاصل ہے۔

یوں لکھا جاتا تو بہتر ہوتا" یا یہ کہ میں لکھتا تو یوں لکھتا۔ اِس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ایسے مقامات پر لازماً کوئی غلطی ہوتی ہے اور پھر ہر مصنّف کا اپنا اندازِ نظر اور اپنا طرزِ بیان ہوتا ہے۔ جہاں تک میر امّن کا تعلق ہے، تو افسوس کے مقابلے میں وہ چلن کے زیادہ قائل تھے اور اُن کی تحریر میں افسوس اور حسینی (وغیرہ) سے کہیں زیادہ [اور بہتر طور پر] استعمالِ عام کی روشنی پھیلی ہوئی نظر آتی ہے [اور سلاست و فصاحت کی بھی]۔ صاحبِ سیر المصنّفین نے اِن الفاظ میں اِس کو بیان کیا ہے:

"میر امّن کے طرزِ بیان کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ محاورے اور روزمرّہ کے آگے قواعدِ زبان کی پروا نہیں کرتے۔ بہادر علی اور میر امّن میں ایک خاص فرق یہی ہے کہ حسینی قواعدِ زبان کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ اُن کے فقرے طولانی اور بے مزہ ہو جاتے، مگر وہ آگے پیچھے کے دو چار لفظ محذوف کر کے قواعد کی خلاف ورزی کرنا نہیں چاہتے اور میر امّن اِس کے برخلاف بول چال کی زبان کو ترجیح دیتے ہیں۔" [ص ۵۸]۔

افسوس نے جو کچھ لکھا ہے، اُسے اِسی روشنی میں دیکھنا چاہیے۔[1]

---

[1] معلوم نہیں میر امّن نے اُس اصلاح کو قبول بھی کیا تھا یا نہیں۔ میر امّن نے اپنے آپ کو ہر جگہ "میر امّن دلّی والا" لکھا ہے۔ کوئی مقام ہو، وہ "دلّی والا" کے بغیر اپنا نام نہیں لکھتے۔ بہ ظاہر یہ التزام سادہ سی بات معلوم ہوتی ہے، لیکن میرا خیال یہ ہے کہ کلکتے کے اُس مجمعے میں، جہاں کئی دوسرے لوگ، جو اُن کے خیال میں دلّی والے [یعنی اہلِ زبان] نہیں تھے، یا ویسے دلّی والے نہیں تھے جیسا وہ اپنے آپ کو سمجھتے تھے، وہ لوگ درجے کے لحاظ سے اُن پر فوقیت رکھتے تھے۔ اِس صورتِ حال میں وہ ایک طرح سے اپنی برتری کا اظہار اور اعلان کرنا چاہتے ہیں۔ باغ و بہار کے آخر میں اُنھوں نے جو کچھ لکھا ہے، وہ بھی اِسی جذبے کا مظہر ہے؛ ورنہ اُس مقام پر اِس اظہار کا کوئی محل نظر نہیں آتا۔

میں کبھی کبھی یہ سوچتا ہوں کہ میر امّن سے اگر اِس "اصلاحِ بے ربطی" کے متعلق دریافت کیا جاتا، تو غالباً وہ [منہ بنا کر] یہی کہتے کہ "بہت سے ایسے ہیں کہ دس پانچ برس کسو سبب سے دلّی میں گئے اور رہے، وہ بھی کہاں تک بول سکیں گے، کہیں نہ کہیں چوک ہی جائیں گے۔ اور جو شخص سب آفتیں ←

اِس سلسلے میں ایک اور بات ذہن میں آتی ہے؛ لیکن پہلے بہ طورِ تمہید، گنجِ خوبی کے اُس مخطوطے کے متعلّق چند الفاظ کہنا ضروری ہیں جو میر امّن کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے اور جس کا عکس میرے سامنے ہے۔ اِس تمہیدی عبارت کے بغیر وہ بات اچھی طرح معرضِ بیان میں نہیں آپائے گی۔

گنجِ خوبی کے اِس مخطوطے میں گل کرسٹ کے نظامِ املا کی پابندی کی کوشش نظر آتی ہے۔ واقعی تعجب ہوتا ہے کہ میر امّن، جو بڑھاپے کے عالم میں وہاں پہنچے تھے، اُن کو دو ڈھائی سال ہی میں گل کرسٹ نے اپنے سانچے میں اِس طرح ڈھال لیا تھا کہ اُن کی تحریر میں اعراب اور علامات نے بڑی حد تک دخل پالیا۔ میں بہ طورِ مثال گنجِ خوبی کے مخطوطے سے دو جملے (مطابقِ اصل) نقل کرتا ہوں۔ کتاب کا پہلا ہی جملہ ہے: "مخلوق کی کیا مجال جو خالق کے اخلاق اَور اَوصاف بیان مَیں لاوے۔" ——— "کیا" میں "یائے مشموم"، "مَیں" اور "جو" میں واوِ مجہول، "اَوصاف" میں واوِ لین، "مخلوق" میں واوِ معروف کی صورت نویسی اور "مَیں" میں نونِ غنّہ کا نقطے سے خالی رہنا؛ یہ سب گل کرسٹ کے نظامِ املا کے عین مطابق ہے ——— اِسی صفحے پر دوسرا جملہ ہے: "حُسنِ خُلق

←

رہ کر، دلّی کا روڑا ہو کر رہا اور دس پانچ پشتیں اُسی شہر میں گزریں، اور اُس نے دربار امراؤں کے اور میلے ٹھیلے، عرس، چھڑیاں، سیر تماشا اور کوچہ گردی اُس شہر کی مدّت تلک کی ہوگی، اور وہاں سے نکلنے کے بعد اپنی زبان کو لحاظ میں رکھا ہوگا؛ اُس کا بولنا البتّہ ٹھیک ہے۔" ——— کلکتّے کے اُس مجمعے میں تو بہ ظاہر ایسا کوئی دوسرا شخص نظر آتا نہیں جو میر امّن کے اِس معیار پر پورا اُترتا ہو۔ [افسوس پیدا ضرور دلّی میں ہوئے تھے، مگر گیارہ سال کی عمر میں دلّی سے باہر چلے گئے تھے اور اُن کی بھی دس پانچ پشتیں یہاں نہیں گزری تھیں] ——— ایک بات اور: مرزا رجب علی بیگ سرور کو اگر یہ بات معلوم ہو جاتی کہ افسوس نے (جنھوں نے نشو و نما لکھنؤ میں پائی تھی) میر امّن کے بے ربط جملوں کی اصلاح کی تھی؛ تو اللہ جانے وہ اور کیا لکھتے اور کیا طوفان اُٹھاتے، جب کہ اِس علم کے بغیر ہی اُنھوں نے یہ لکھا ہے کہ میر امّن نے محاوروں کے ہاتھ پانو توڑے ہیں۔

میں بے بدل ہیں: چنانچہ خُلقِ محمدی ضرب المثل ہے"۔ "ہیں" میں کشتی دار ی کی صورت اور "ضرب المثل" میں الف کے نیچے خط اُسی تربیت کا نتیجہ ہے۔

لیکن سوالیہ نشان اور ندائیہ نشان اُن کی تحریر میں کہیں نظر نہیں آتے، نیز کاما اور فُل اسٹاپ، دونوں کے لیے صرف ایک نشان ، اُنھوں نے استعمال کیا ہے۔ اِس مخطوطے کے شروع کے صفحوں میں جزمِ مدوّر اور جزمِ غیر مدوّر جس التزام کے ساتھ ملتے ہیں، آخر تک اُن کے التزام کی یہ صورت بھی باقی نہیں رہی ہے؛ البتّہ آخرِ لفظ میں واقع یاے معروف، یاے مجہول اور یاے لین کی کتابت میں آخر تک یکسانی برقرار رہی ہے اور اُنھیں گل کرسٹ کے نظامِ املا کے مطابق ہی لکھا گیا ہے جن لفظوں میں ہاے مخلوط ہے، اُسے عموماً دوچشمی صورت میں لکھا گیا ہے؛ البتّہ ایسے بعض الفاظ کا املا (پُرانی عادت کے مطابق) باغ و بہار کے املا سے مختلف ہے؛ مگر ایسے لفظوں کی تعداد کم ہے۔

پیراگراف پوری کتاب میں کسی ایک جگہ نہیں بنایا گیا ہے۔ پہلی سطر سے آخری سطر تک پوری کتاب میں عبارت مسلسل لکھتے چلے گئے ہیں۔ انتہا یہ ہے کہ جہاں سے نیا باب شروع ہوتا ہے وہاں بھی نئی سطر سے اُسے شروع نہیں کیا [اور یہ بھی پُرانی عادت کا اثر ہے]۔

اِس مخطوطے کو دیکھ کر مجھے یہ واضح طور پر محسوس ہوتا ہے کہ میر امّن نے تو باغ و بہار کو گل کرسٹ تک رسائی کے بعد ہی شروع کر دیا تھا اور اُس وقت تک وہ اُس کے نظامِ املا سے پوری طرح روشناس نہیں ہو سکے ہوں گے اور اُنھوں نے جو متن تیّار کیا ہوگا، وہ گل کرسٹ کے نظامِ املا کے مقابلے میں، زیادہ تر اُن کی عادت اور روش کے مطابق کاغذ پر آیا ہوگا۔ اُس نگارش میں رُموزِ اوقاف، علامات اور اعراب کی پابندی اور یکسانی کو اُس نے مکمّل کیا ہوگا۔

میر امّن نے گنجِ خوبی کو باغ و بہار کے بعد لکھا ہے۔ جب وہ دو سال سے زیادہ اُس کے زیرِ نگرانی متن تیّار کرنے کے بعد بھی، اپنے دوسرے مخطوطے میں [جو اُس زمانے میں شائع نہیں ہوا تھا] آخر تک اُس کے نظامِ املا کی مکمّل طور پر پابندی نہیں کر سکے، تو یہ بات

بہ آسانی سمجھ میں آسکتی ہے کہ شروع شروع میں انھوں نے جس متن کو اپنے قلم سے لکھا ہوگا، رموزِ اوقاف، علامات اور یکسانیِ املا کے لحاظ سے اُس کا احوال وہ نہیں ہوگا، جو اُس مطبوعہ نسخے [کے] کا ہے جو ہمارے سامنے ہے۔ اِس سے گل کرسٹ کے اُس قول کی صحت کا کچھ نہ کچھ اندازہ ضرور کیا جاسکتا ہے۔

فی الوقت ہمیں یہ نہیں معلوم کہ پریس میں جو فرمے کمپوز ہوتے تھے، اُن کی تصحیح کا کیا انتظام کیا گیا تھا۔ وہاں کی چھپی ہوئی تین ۳ کتابیں اِس وقت میرے سامنے ہیں[1]: ہندی مینول، باغ و بہار، مثنوی سحر البیان [سالِ طبع ۱۸۰۵ء؛ لیکن میر شیر علی افسوس کے مقدمے میں بہ صراحت موجود ہے کہ انھوں نے اِسے (گل کرسٹ کے حکم کے مطابق) ۱۸۰۳ء میں مکمل کر دیا تھا، یعنی اِس کا مسودہ گل کرسٹ کی موجودگی میں مکمل ہو چکا تھا]۔ اِن تینوں مطبوعہ کتابوں میں املا، علامات اور رموزِ اوقاف کا جو یکساں انتظام اور اہتمام نظر آتا ہے، اُس سے یہی خیال ہوتا ہے کہ گل کرسٹ مسودے کو اور پھر کمپوز شدہ فرموں کو بہ طورِ خود دیکھتا ہوگا اور تصحیح کرتا ہوگا۔ اِس تصحیح کا تعلق عموماً علامات و رموزِ اوقاف اور اِن کے متعلقات سے ہوتا ہوگا، اور املا کی اُن پابندیوں سے جن کو اُس کے مرتّبہ نظامِ املا میں بنیادی حیثیت حاصل تھی؛ مثلاً ہاے ملفوظ و مخلوط کا امتیاز اور یاے معروف و مجہول و لین کی شکل صورت، اور اِسی طرح کے دوسرے املائی رموز اور اُمور۔

اِن باتوں کے پیشِ نظر مجھے گل کرسٹ کے اِس قول میں کوئی مبالغہ نظر نہیں آتا کہ اُس نے باغ و بہار کے بیش تر صفحات کی تیاری پر اچھا خاصا وقت صرف کیا ہوگا۔ اِس بات کو ماننے میں بھی تامّل نہیں ہونا چاہیے کہ شروع کا یہ زمانہ گویا میر امّن کی ٹریننگ کا تھا کہ اُن کو ایک نئے نظامِ املا سے روشناس کرایا جا رہا تھا اور اُس کا عادی بنایا جا رہا تھا۔ اگر ایسا نہ ہوتا، تو رموزِ اوقاف، علامات اور یکسانیِ املا کا وہ احوال نہ ہوتا جو ہمارے سامنے ہے اور اِن کتابوں کا بھی وہی حال ہوتا جو دوسرے اداروں اور مطبعوں کی چھپی ہوئی کتابوں کا ہے۔

---

[1] یعنی ہندی مینول میں شامل باغ و بہار کی روایتِ اوّل کے ۱۰۲ صفحے۔

انعام :

"کالج کونسل نے ۲ر نومبر ۱۸۰۱ء کو ایک تجویز منظور کی تھی، جس میں یہ کہا گیا تھا کہ دیسی زبانوں میں ادبی کتابوں کی تصنیف و تالیف کی ہمت افزائی کے خیال سے متبحر دیسی لوگوں کو انعامات دیے جائیں" [گل کرسٹ اور اُس کا عہد، طبع دوم، ص ۱۴۲] ــــ اس کے تحت کالج کونسل نے ۳۱ر اگست ۱۸۰۲ء کو یہ فیصلہ کیا کہ : "فاضل دیسی میر امّن، جو کالج سے وابستہ ہیں، اُن کو چہار درویش کے ہندستانی ترجمے کے لیے، جسے ہندستانی پروفیسر نے آج ہی پیش کیا ہے، پانچ سو روپے دیے جائیں" [ایضاً] ۔ یعنی میر امّن کو انھی اس کتاب پر پانچ سو روپے بہ طورِ انعام کالج کونسل کی طرف سے ملے تھے۔

اس سلسلے میں دو باتیں وضاحت طلب ہیں۔ منقولہ عبارت کا یہ ٹکڑا "جسے ہندستانی پروفیسر نے آج ہی پیش کیا ہے"، یہ تحریر ۳۱ر اگست ۱۸۰۲ء کی ہے۔ یہ بات اوپر زیرِ بحث آ چکی ہے کہ اس کتاب کی دوسری [یعنی نظرِ ثانی شدہ] روایت تقریباً وسط ۱۸۰۲ء تک مکمل ہو چکی تھی، اس صورت میں یہ مان لینا قطعی طور پر قرینِ قیاس ہوگا کہ "۳۱ر اگست ۱۸۰۲ء" کو جو نسخہ پیش کیا گیا، وہ نظرِ ثانی شدہ روایت تھی۔ اس پر ایک دلیل یہ بھی لائی جا سکتی ہے کہ میر امّن کی جو عرضی کتاب کے شروع میں شامل ہے، اُس میں انھوں نے صراحتاً لکھا ہے کہ "چار درویش کے قصّے کو ...... باغ و بہار بنایا"۔ یہ قطعی طور پر اس پر دلالت کرتا ہے کہ یہ وہ نسخہ تھا جس کا نام "باغ و بہار" رکھا جا چکا تھا اور یہ عرضی ملازمت حاصل کرنے کے سلسلے کی نہیں، بل کہ انعام حاصل کرنے کے سلسلے کی کڑی ہے ــــ دوسری بات: اُس وقت تک کتاب تو مکمل صورت میں چھپی نہیں تھی، اس لیے ظاہر ہے کہ اس کا خطّی نسخہ پیش کیا گیا ہوگا۔

باغ و بہار ــ ترجمہ، تالیف یا تصنیف :

میر امّن نے باغ و بہار کے دیباچے میں لکھا ہے: "یہ قصّہ چار درویش کا ابتدا

میں امیر خسرو ۔۔۔۔ نے کہا تھا۔ اب خداوند نعمت ۔۔۔ جان گل کرسٹ صاحب نے ۔۔۔۔ لطف سے فرمایا کہ اِس قصّے کو ٹھینٹھ ہندوستانی گفتگو میں ۔۔۔۔ ترجمہ کرو۔" آخری جملے سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب فارسی متن کا ترجمہ ہے؛ لیکن یہاں بھی اندازِ بیان کا دیسا ہی پیچ ہے، جو اُن کی عرضی میں ہے، جس کے ایک جملے سے صاف صاف معلوم ہوتا ہے کہ کالج کونسل کا انعامی اشتہار شائع ہونے کے بعد اُنھوں نے اپنی کتاب [باغ و بہار] لکھی ہے؛ حالاں کہ حقیقت یہ نہیں۔ وہ کہنا یہ چاہتے ہیں کہ اپنی یہ کتاب اُس اشتہار کے مطابق، انعام کے لیے پیش کر رہے ہیں — صحیح صورتِ حال کی مکمّل وضاحت ہو جاتی ہے اِس کتاب کے پہلے اڈیشن کے سرورق کی اِس عبارت سے:

"باغ و بہار ۔۔۔۔ ماخذ اُس کا نوطرزِ مرصّع وہ ترجمہ کیا ہوا عطا حسین خاں کا
ہے فارسی قصّۂ چار درویش سے۔"

[سرورق کا عکس اس کتاب میں شامل ہے] اِس سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ نوطرزِ مرصّع، فارسی قصّۂ چہار درویش کا ترجمہ ہے اور باغ و بہار کا ماخذ نوطرزِ مرصّع ہے۔

گل کرسٹ کے لکھے ہوئے پیش لفظ ["PREFACE"] کا جو ایک صفحہ باغ و بہار کی اشاعتِ اوّل کے آخر میں شامل ہے؛ اُس میں یہی بات گل کرسٹ نے واضح تر انداز میں لکھی ہے۔ خلاصہ اُس کا یہ ہے کہ فارسی میں امیر خسرو کا لکھا ہوا قصّۂ چہار درویش ایک زمانے سے مقبول رہا ہے۔ عطا حسین خاں[1] نے نوطرزِ مرصّع کے نام سے اُس کا ترجمہ کیا۔ اُس ترجمے کی زبان مغلق اور مرصّع تھی ——— یہ موجودہ روایت

---

[1] سرورق پر اور "پیش لفظ" میں یہی نام ہے؛ لیکن نوطرزِ مرصّع کے دیباچے میں اُنھوں نے اپنا نام "میر محمد حسین عطا خاں" لکھا ہے اور یہی صحیح ہے۔ نوطرزِ مرصّع کے مرتّب ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی نے اپنے مقدّمے میں نام سے متعلق ضروری تفصیل لکھ دی ہے۔

["THE PRESENT VERSION"] اُسی مذکورہ ترجمے سے میر امّن نے تیار کی ہے [اِس صفحے کا عکس بھی اِس کتاب میں شامل ہے]۔

مولوی عبدالحق مرحوم نے بھی یہی لکھا ہے۔ فارسی قصّۂ چہار درویش کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "میر امّن کی باغ و بہار اسی کتاب کا ترجمہ کہی جاتی ہے اور وہ خود بھی یہی کہتے ہیں۔ ... لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ فارسی کا ترجمہ نہیں۔ قصّہ وہی ہے، مگر اس کا ماخذ بجائے فارسی کے، اُردو کی کتاب نوطرزِ مرصّع ہے" [مقدمۂ باغ و بہار، طبعِ دوم (۱۹۴۴ء)، ص ۳]۔

یعنی یہ قطعی طور پر ثابت ہے کہ باغ و بہار ترجمہ نہیں۔ میر امّن نے اصلاً نوطرزِ مرصّع کو سامنے رکھا ہے اور قصّے کو اپنی زبان اور اپنے خاص انداز میں لکھا ہے۔ مذہبِ عشق فارسی سے ترجمہ کیا ہوا داستانی قصہ ہے، اُسے سب نے ترجمہ ہی کہا ہے، مگر اسی ترجمے [یعنی مذہبِ عشق] کو سامنے رکھ کر، پنڈت دیا شنکر نسیم نے اُس داستانی قصّے کو اختصار اور خاص پیرایۂ اظہار کے سانچے میں ڈھال کر پیش کیا ہے اور اُن کی کتاب گلزارِ نسیم کو کوئی شخص ترجمہ نہیں کہے گا، کسی نے کہا بھی نہیں ہے؛ اُسے تصنیف کہا جاتا ہے اور وہ ہے بھی تصنیف۔ یا مثلاً مرزا غالب کو تاریخی حالات حکیم احسن اللہ خاں نے فراہم کیے تھے، مرزا صاحب نے اُن کو اپنی زبان اور اپنے انداز میں لکھا اور اُس کا نام مہرِ نیم روز رکھا؛ تو اِس کتاب [مہرِ نیم روز] کو تالیف نہیں کہا گیا، مرزا صاحب کی تصنیف کہا گیا ہے۔ مقصود اِس سے یہ ہے کہ جس طرح گلزارِ نسیم ترجمہ نہیں، تصنیف ہے اور جس طرح مہرِ نیم روز تالیف یا ترجمہ نہیں، تصنیف ہے؛ اُسی طرح باغ و بہار کو بھی [جو ترجمہ تو خیر ہے ہی نہیں] تالیف کے بجائے تصنیف کی حیثیت حاصل ہو گئی ہے۔ میر امّن کی نثر میں ایسی تخلیقی شان اور ایسا تصنیفی انداز نمایاں ہے، جس کی مثالیں کم یاب ہیں۔ یہاں اوسط درجے کے یا اُن سے بہتر درجے کے نثر نگاروں کا ذکر نہیں، یہاں میر امّن کا تذکرہ ہے، جن کی نثر میں تخلیقی انداز ہے اور اِس نثر نے اِس قصّے کو ایسی کتاب کا درجہ بخش دیا ہے جسے بلا تکلّف تصنیف کہا جا سکتا ہے، جب کہ

اُن کی دوسری کتاب گنجِ خوبی کو ترجمہ ہی کہا گیا ہے اور وہ واقعتاً ترجمہ ہے۔ زبان میر امّن کی ہے اور بیان بھی اُن کا اپنا ہے؛ لیکن وہ اصل فارسی عبارت سے سرِمو تجاوز نہیں کرتے۔ اصل سے اِس قدر وفاداری نے، زبان اور بیان کی کئی خوبیوں کے باوجود، اُسے ترجمے کی سطح سے اوپر نہیں اُٹھنے دیا ہے؛ جب کہ باغ و بہار میں وہ ایک قصّے کو اپنے طور پر لکھتے ہیں اور اُس کی جزئیات میں بھی دخل دیتے چلے جاتے ہیں اور قصّے کو لکھتے اِس طرح ہیں کہ اُس کا قالب بدل جاتا ہے۔ اس عمل نے اِس کتاب کو تصنیف کے درجے پر پہنچا دیا ہے[1]۔

---

[1] مولوی عبدالحق صاحب نے اپنے محوّلۂ بالا مقدمے میں باغ و بہار اور نوطرزِ مرصّع کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے: "اصل میں ترجمہ اِن دونوں میں سے کوئی بھی نہیں، فارسی قصّے کو اپنی اپنی زبان میں بیان کر دیا ہے۔" یہ واقعہ ہے کہ اگر خالص تکنیکی انداز سے دیکھا جائے تو نوطرزِ مرصّع کو ترجمہ کہنا مشکل اور بہت مشکل ہے۔ صحیح صورت یہی ہے کہ تحسین، فارسی کے قصّۂ چہار درویش کو، کہانی کی حد تک فارسی متن کے مطابق اپنی زبان میں لکھتے چلے گئے ہیں۔ یعنی فارسی عبارت کی پابندی نہیں کرتے، صرف قصّے کی پابندی کرتے ہیں۔ یوں کہنا یہ چاہیے کہ نوطرزِ مرصّع، فارسی قصّے کو سامنے رکھ کر لکھی گئی ہے؛ یا یوں کہیے کہ فارسی قصّے پر مبنی ہے، اور میر امّن نے بنیادی طور پر نوطرزِ مرصّع کو سامنے رکھ کر، اُسی قصّے کو اپنی زبان میں لکھا ہے۔ جس طرح نوطرزِ مرصّع زبان اور بیان کی حد تک فارسی قصّے سے مختلف ہے ـــــ اُسی طرح باغ و بہار، نوطرزِ مرصّع سے مختلف ہے ـــــ یہاں یہ بات ضرور ذہن میں رہنا چاہیے کہ میر امّن نے اصلاً نوطرزِ مرصّع کو اپنے سامنے رکھا ہے، لیکن کوئی فارسی نسخہ بھی اُن کے سامنے ضرور تھا۔ مولوی عبدالحق صاحب نے صفی کے قصّۂ چہار درویش سے جو اقتباسات پیش کیے ہیں، بہ ظاہر تو یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہی نسخہ میر امّن کے سامنے رہا ہوگا۔ کلکتے کی ایشیاٹک سوسائٹی میں صفی والے قصّۂ چہار درویش کا خطّی نسخہ موجود ہے، جو اصلاً فورٹ ولیم کالج کی ملکیت تھا؛ اُس سے بھی اِس امکان کی تائید کا ایک قرینہ سا نکلتا ہے کہ میر امّن کے سامنے شاید یہی نسخہ ہوگا۔ قطعی بات سب خطّی نسخوں کو دیکھنے کے بعد ہی کہی جا سکتی ہے۔

امیر خسرو سے منسوب روایت:

قصّے کے ماخذ کے بارے میں میر امّن نے لکھا ہے کہ: "یہ قصّہ چار درویش کا ابتدا میں امیر خسرو دہلوی نے اِس تقریب سے کہا کہ حضرت نظام الدین اولیا... جو اُن کے پیر تھے... اُن کی طبیعت ماندی ہوئی، تب مرشد کے دل بہلانے کے واسطے امیر خسرو یہ قصّہ ہمیشہ کہتے اور بیمار داری میں حاضر رہتے۔ اللہ نے چند روز میں شفا دی، تب انھوں نے غسلِ صحّت کے دن یہ دعا دی کہ جو کوئی اِس قصّے کو سُنے گا، خدا کے فضل سے تندرست رہے گا۔ جب سے یہ قصّہ فارسی میں مروّج ہوا" [ص ۵]۔

"یہ قصّہ ہمیشہ کہتے" سے لازمی طور پر یہ مطلب نہیں نکلتا کہ یہ تصنیف بھی انھی کی ہے؛ لیکن اِس ٹکڑے سے عام طور پر یہی مطلب مراد لیا گیا ہے اور غالباً میر امّن کا مقصد بھی یہی تھا کہ یہ قصّہ امیر خسرو کی تصنیف ہے۔ شیرانی صاحب نے اِس سے متعلّق جو مضمون لکھا تھا[۱] اور جو پہلی بار رسالہ کارواں [لاہور] کے سال نامے [۱۹۳۳ء] میں شائع ہوا تھا، اُس میں تفصیل کے ساتھ اِس پر بحث کی ہے اور حتمی طور پر یہ ثابت کر دیا ہے کہ اِس قصّے سے امیر خسرو کا کچھ تعلّق نہیں۔ یہ واقعی دل چسپ بات ہے کہ اب تک کی معلومات کے مطابق میر امّن واحد شخص ہیں جنھوں نے یہ بات لکھی ہے۔ نوطرزِ مرصّع میں اِس روایت کا ذکر نہیں [جو میر امّن کا اصل ماخذ ہے]۔ مولوی عبدالحق صاحب نے چہار درویش کے جس فارسی نسخے سے اپنے مقدّمۂ باغ و بہار میں اختلافات کا حوالہ دیا ہے، اُس میں اِس کا وجود نہیں اور شیرانی صاحب کے سامنے چہار درویش کا جو نسخہ تھا، وہ بھی اِس روایت سے خالی تھا۔ زرّیں نے بھی فارسی قصّۂ چہار درویش کا اُردو میں ترجمہ کیا ہے۔ میں نے اُس ترجمے کو دیکھا ہے؛ وہ بھی اِس روایت سے خالی ہے؛ یعنی زرّیں نے جس فارسی نسخے کو

۱؎ میں شیرانی مرحوم کے پوتے جناب مظہر محمود شیرانی کا بطورِ خاص ممنون ہوں کہ موصوف نے اِسے میرے لیے فراہم کیا اور یوں اصل مضمون سے میں استفادہ کر سکا۔

اپنا ماخذ بنایا تھا، اُس میں بھی یہ روایت موجود نہیں تھی۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ میرامّن نے یہ روایت اپنے زمانے میں سُنی ہوگی۔ اِس امکان سے انکار تو نہیں کیا جا سکتا، لیکن یہ سوال پھر بھی ذہن میں پیدا ہوتا ہے کہ اگر یہ روایت مشہور تھی، تو پھر کیا وجہ ہے کہ کوئی دوسرا شخص کہیں بھی اس کا ذکر نہیں کرتا۔ بہ ظاہر یہی خیال ہوتا ہے کہ اِس روایت کے مصنف خود میرامّن ہیں اور بہ قولِ شیرانی صاحب "کوئی تعجب نہیں اگر امیر خسرو کو اِس کا مصنف بنا کر اور نظام الدّین اولیاؒ سے تبریک دلوا کر مرتّب قصہ نے اِس کو مقبولِ عام بنانے کی غرض سے دروغِ مصلحت آمیز والا حیلہ تراشا ہو۔ نیم مذہبی قصّوں میں مصنّفین قاری و سامع کو ثوابِ دارین کی بشارت اکثر دیا کرتے ہیں۔"

بہ ہر حال، قطعیت کے ساتھ تو میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ روایت میرامّن کی تراشی ہوئی ہے، اِس کا کوئی قطعی ثبوت موجود نہیں؛ یہ امکان البتّہ ہے کہ اُنھوں نے اِسے کسی سے سُنا ہو۔ اِسی طرح یہ بھی بعید از قیاس نہیں کہ اِس روایت کو خود اُنھوں نے بنایا ہو، اِس قصّے کو عظمت اور اُس کے نتیجے میں خاص وقعت اور شہرت دینے کے لیے۔ گل کرسٹ نے بھی اپنے پیش لفظ میں امیر خسرو والی روایت کا ذکر کیا ہے، مگر قرینہ قوی موجود ہے کہ اُس نے اِس سلسلے میں میرامّن کے نوشتے کو سامنے رکھا ہے۔ بہ ہر صورت، میرامّن کے اِس بیان کے سوا، اُن سے پہلے یا اُن کے زمانے میں اور کہیں اب تک یہ روایت دیکھنے میں نہیں آئی ہے اور اِسی سے یہ خیال ہوتا ہے کہ شاید یہ اُنھی کی بنائی ہوئی ہے[1]

[1] ڈاکٹر حسینی شاہد نے مجھے بتایا کہ اُن کے لڑکپن تک حیدرآباد میں اِس روایت کو بہت سے لوگ مانتے تھے اور بیماروں کو یہ قصہ سُنایا جاتا تھا۔ اُنھوں نے بتایا کہ وہ خود بھی ایسے ایک دو موقعوں پر موجود رہے ہیں۔ ڈاکٹر امیر عارفی (استادِ شعبۂ اُردو، دہلی یونی ورسٹی، دہلی) نے بھی، جو اصلاً حیدرآبادی ہیں، اِس روایت کی تائید کی اور یہ بتایا کہ ایک بار بیماری کے زمانے میں اُن کو بھی یہ سنائی گئی تھی۔ اِسے اُنھوں نے اپنے لڑکپن کے زمانے کی بات بتایا۔ اِن حضرات کے بہ قول اب یہ روایت ختم ہو چکی ہے۔ دہلی میں مجھے ایسا کوئی شخص نہیں ملا جو اِس سلسلے میں کچھ بتا سکتا۔ غالباً یہاں یہ روایت حیدرآباد کی طرح کارفرما نہیں رہی۔

شیرانی صاحب نے اپنے مذکورہ مضمون میں فارسی چہار درویش کے مطبوعہ نسخے کا بھی ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ اُس میں امیر خسرو والی روایت موجود ہے اور میر امّن نے اِس روایت کو اُسی نسخے سے اخذ کیا ہے: "میر احمد خلف شاہ محمد نے اس کی ترتیب دی ہے اور قاضی محمد ابراہیم بن قاضی نور محمد نے چھاپا ...... اِس نسخے میں قصّے کی تالیف امیر خسرو کے نام منسوب کی گئی ہے۔ میر امّن نے بھی اس روایت کو قبول کیا ہے"۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہاں شیرانی صاحب کو غلط فہمی ہوئی۔ جس نسخے کا اُنھوں نے ذکر کیا ہے، وہ موخّر مطبوعہ نسخہ ہے۔ اُس کے مرتّب نے اپنے مقدّمے میں اِس کی صراحت بھی کردی ہے کہ کئی خطّی نسخوں "واز نسخۂ اُردو ترجمۂ میر امّن دہلوی نیز مقابلہ کردہ"۔ یعنی یہ نسخہ میر امّن کی باغ و بہار کے بعد کا ہے، اِس لیے اِس میں جو امیر خسرو والی روایت ہے، وہ باغ و بہار سے نقل ہوسکتی ہے، ایسا نہیں ہوسکتا کہ میر امّن نے اِس روایت کو اُس فارسی مطبوعہ نسخے سے اخذ کیا ہو۔ عظیم الشان صدیقی صاحب نے ہماری زبان (دہلی) کے شمارۂ ۲۲ اپریل ۱۹۶۴ء میں ایک مضمون کی صورت میں صورتِ حال کی وضاحت کردی تھی۔ اُس فارسی نسخے کی پہلی اشاعت ۱۲۹۵ھ کی ہے۔ شیرانی صاحب نے غالباً اُس کا موخّر مطبوعہ نسخہ دیکھا، جس میں سے میر احمد کا دیباچہ نکال دیا گیا ہے اور یوں اُن کو غلط فہمی ہوئی۔ دہلی یونی ورسٹی لائبریری میں اِس کی پہلی اشاعت موجود ہے اور میں نے اُس سے استفادہ کیا ہے۔

خطّی نسخے:

باغ و بہار کا ایسا کوئی خطّی نسخہ میری نظر سے نہیں گزرا جو میر امّن کا لکھا ہوا ہو یا اُن کی نظر سے گزر چکا ہو۔ یہ کتاب فوراً ہی چھپنے چلی گئی تھی اور جلد ہی چھپ بھی گئی تھی، اِس لیے اِس میں ذرا بھی تعجب کی بات نہیں کہ بہت سی دوسری کتابوں کی طرح اِس کے خطّی نسخے نہیں ملتے۔ عہدِ مصنّف کے ایک دو نسخے ہوں گے تو ضرور؛ مثلاً ایک تو وہی ہوگا جسے انعام کے لیے کالج کونسل کے سامنے پیش کیا گیا تھا۔

بہ ہر صورت، اِس کتاب کے حسبِ ذیل خطّی نسخے اب تک میرے علم میں آئے ہیں۔
دتاسی کے پاس اِس کا ایک خطّی نسخہ تھا، جس کا علم ڈاکٹر ثریّا حسین کے (مطبوعہ) تحقیقی مقالے کے ایک اندراج سے ہوتا ہے، اُنھوں نے لکھا ہے:

"مارسیلز کی میونسپل لائبریری میں بھی اُس کے کتب خانے کے پچاس قلمی نسخے موجود ہیں، جن کی فہرست میں نے اپنے مارسیلز کے دورانِ قیام جنوری ۱۹۶۰ء میں تیار کی تھی۔ ۔ ۔ جن میں سے کچھ اہم قلمی نسخے مندرجۂ ذیل ہیں:
۱۔ باغ و بہار، مؤلفہ میر امّن، اُردو قلمی نسخہ، ۱۲۱۷ھ میں بڑی تقطیع کے ۹۲ صفحوں میں لکھا گیا ہے" [گارسین دتاسی، اُردو خدمات، علمی کارنامے، ص ۵۶]۔

یہ ۱۲۱۷ھ کا نوشتہ نسخہ تو گویا کتاب کی نظرِ ثانی شدہ روایت کی تکمیل کے فوراً بعد کا ہو سکتا ہے۔ مقالہ نگار نے یہ صراحت نہیں کی کہ اِس کے آخر میں ترقیمہ ہے یا نہیں، مگر ۱۲۱۷ھ کا حوالہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ آخر میں یا شروع میں کوئی عبارت یا صراحت ہے ضرور۔

ڈنکن فاربس نے بھی باغ و بہار کو مرتّب کیا تھا۔ اُس نے اپنے مرتّبہ نسخے [اشاعتِ اوّل، لندن، ۱۸۴۶ء] کے پیش لفظ میں دو خطّی نسخوں کا ذکر کیا ہے۔ اُس نے اپنے اڈیشن کی ترتیب کے سلسلے میں لکھا ہے کہ میرا مرتّب کیا ہوا یہ متن باغ و بہار کی اشاعتِ اوّل پر مبنی ہے، اور میں نے دو خطّی نسخوں سے بھی مدد لی ہے، جن میں سے ایک نسخہ وہ ہے جو گل کرسٹ کی ملکیت تھا۔ اُس نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ "IN ALL PROBABILITY" یہ میر امّن کے ہاتھ کا لکھا ہوا وہی نسخہ ہے جو اُنھوں نے گل کرسٹ کے سامنے بہ غرضِ منظوری پیش کیا (ہوگا)۔ دوسرا نسخہ مسٹر رومر[1] کی ملکیت ہے، جو میر امّن کے شاگرد تھے۔ اِس نسخے کا کچھ حصّہ مصنّف (یعنی میر امّن) کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے اور کچھ حصّہ مصنّف کی نگرانی میں لکھوا گیا ہے۔

---

[1] جان رومر: ایسٹ انڈیا کمپنی کا ملازم تھا۔ گنج خوبی کا جو مخطوطہ میر امّن کے ہاتھ کا لکھا ہوا رائل ایشیاٹک سوسائٹی لندن کے کتاب خانے میں محفوظ ہے، اُسے میر امّن نے اپنے اِسی شاگرد جان رومر کے لیے اپنے قلم سے لکھا تھا۔ اُس نسخے کے آخر میں یہ صراحت موجود ہے۔

ایک قدیم خطی نسخہ (ن) :

انڈیا آفس لندن کے کتاب خانے میں باغ و بہار کا ایک خطی نسخہ محفوظ ہے اور اس کا عکس میرے سامنے ہے۔ اِس نسخے کے آخر میں کوئی ترقیمہ نہیں، شروع میں بھی ایسی کوئی تحریر نہیں جس سے اِس کے متعلق کچھ معلوم ہو سکے۔ خط پختہ نستعلیق ہے، لیکن لکھنے والے نے بعض مقامات پر ایسی غلطیاں کی ہیں جن سے اُس کا کم سواد ہونا بھی ظاہر ہوتا ہے۔ آخر میں بس "تمام شد" مرقوم ہے۔ صفحات پر نمبر شمار موجود نہیں، البتہ ہر ورق کے آخری صفحے کے آخر میں ترک [یعنی اگلے صفحے سے شروع ہونے والی عبارت کا پہلا لفظ] موجود ہے۔ میرے شمار کے مطابق کُل صفحات ۱۹۷ ہیں اور مسطر ۱۳ سطری ہے۔ متن مکمل ہے اور کہیں بھی کسی طرح کی خرابی کے آثار نظر نہیں آتے۔

فورٹ ولیم کالج کی چھپی ہوئی کتابوں میں، گل کرسٹ کے نظامِ املا کے مطابق، بہت سے الفاظ پر حرکات ضرور ملتی ہیں، مجہول اور لین آوازوں کے لیے علامتیں پابندی کے ساتھ استعمال کی جاتی تھیں اور علاماتِ قرأت کا التزام بھی ملحوظ رکھا جاتا تھا۔ اِس خطی نسخے کا احوال یہ ہے کہ زیر زبر تو کم سے کم لفظوں پر نظر آتے ہیں اور یہی احوال علامات کا ہے۔ شروع کے صفحوں میں تو مجہول اور لین آوازوں کے لیے کچھ لفظوں پر وہی علامتیں ملتی ہیں جو فورٹ ولیم کالج کی کتابوں میں بہ طورِ عموم ملتی ہیں؛ لیکن اُن کا اوسط کم ہوتا گیا ہے اور رموزِ اوقاف کسی ایک جگہ بھی نظر نہیں آتے۔ مجہول اور لین آوازوں کے لیے کچھ لفظوں پر جو گل کرسٹ کی مقررہ کی ہوئی علامتیں ملتی ہیں، اُن سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ ناقل کے سامنے کوئی ایسا نسخہ باغ و بہار کا تھا جس پر گل کرسٹ کے مقررہ نظام کے تحت علامتیں لگی ہوئی تھیں۔ چوں کہ ناقل [عام اُردو والوں کی طرح] اعراب و علامات و رموزِ اوقاف کے استعمال اور التزام کا خوگر نہیں تھا، اِس لیے وہ پوری طرح اُس نظامِ املا کی پابندی نہیں کر سکا، بس کہیں کہیں نقل مطابقِ اصل کے تحت علامتیں لگا گیا۔

یہ مخطوطہ کس نسخے کی نقل ہے، اِس سلسلے میں کچھ کہنا یوں زیادہ مشکل نظر آتا ہے کہ کسی

مقامات پر بعض اُلجھنوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے، اُن کو بیان کیا جائے گا۔ مگر خاص بات یہ ہے کہ ہندی مینوں میں شامل باغ و بہار کے ۲۰ صفحات کے متن کا جب اس خطی نسخے کے متن سے مقابلہ کیا گیا، تو معلوم ہوا کہ ہندی مینوں کے صفحات کا متن بہ طورِ عموم اِس نسخے کے متن کے مطابق ہے۔ جہاں کہیں ایک آدھ لفظ کا اختلاف یا فرق ہے، تو اُس کا تعلق اکثر مقامات پر ناقل کی غلط نگاری سے ہے ــــ میں محض بہ طورِ مثال ایسے بس دوچار مقامات کی نشان دہی کرتا ہوں جہاں ہندی مینوں کا متن اشاعتِ اوّل (۱۸۰۴ء) کے متن سے مختلف ہے اور اس خطی نسخے کے متن سے مطابقت رکھتا ہے۔ ہندی مینوں کے لیے ھم، خطّی نسخے کے لیے ن اور اشاعتِ اوّل (۱۸۰۴ء) کے لیے ک بہ طورِ مخففات استعمال کیے گئے ہیں۔

ک میں ص ۴ پر ایک شعر یوں ہے:

جس کا ثانی اور مقابل ہے نہ ہووے گا کبھو   ایسے یکتا کو خدائی سب طرح شایان ہے

ھم میں یہ شعر اِس طرح ملتا ہے:

جس کا ثانی اور مقابل آج تک پیدا نہیں   ایسے واحد کو خدائی سب طرح شایان ہے

ن میں بھی یہ شعر اِسی طرح ہے۔ اِسی سلسلے کے دوسرے شعر کا پہلا مصرع ک میں یوں ہے: "لیکن اِتنا جانتا ہوں خالق و رازق ہے وہ"۔ ھم میں یہ مصرع یوں ہے: "اِس زمانے میں بھی بعضے مرد ہیں جوہر شناس"۔ ن میں بھی یہ مصرع اِسی طرح ہے ــــ اِسی صفحے پر نعتیہ اشعار میں پہلے شعر کا دوسرا مصرع ک میں اِس طرح ہے: "اِس لیے پرچھائیں اُس قد کی نہ تھی مشہور ہے"۔ ھم میں یہ اِس طرح ہے: "اِس لیے پرچھائیں اُس کی پاس سے نت دور ہے"۔ ن میں بھی یہ مصرع ھم کے مطابق ہے، ہاں اِس میں "اس کے پاس" ہے اور یہ محض کتابت کا فرق ہے، متن کا نہیں ــــ ص ۵ کی ساتویں سطر میں ک میں ایک جملہ یوں ہے: "جو صاحب دانا اور ہندوستان کی زبان بولنے والے ہیں"۔ ھم میں اِسے یوں لکھا گیا تھا: "جو صاحب دانا اور زبان بولنے والے ہندوستان کے ہیں"۔ ن میں بھی یہ جملہ اِسی طرح ہے ــــ ک میں ص ۵ ہی پر ایک عبارت یوں ہے: "نجیبوں کے

قدردان جان گل کرسٹ صاحب نے کہ ہمیشہ اقبال اُن کا زیادہ رہے جب تلک گنگا جمنا ہے، لطف سے فرمایا۔" م میں یہ عبارت اس طرح ہے: "نجیبوں کے قدردان، غریبوں کے فیض رساں، عاجزوں کے ہاتھ پکڑنے والے، بیچاروں کی پرورش کرنے والے دانا زمانے کے۔ BYT سرکار سے دے کے آپ و دانا ٭ نادان کو بنایا جس نے دانا، یعنی جان گل کرسٹ صاحب نے کہ ہمیشہ اقبال اُن کا......" ـــــ ن میں بھی یہ عبارت اسی طرح یعنی م کے مطابق ہے [یہاں زیادہ مثالوں کی یوں ضرورت نہیں کہ اس کتاب کے ضمیمۂ تشریحات میں ایسے جملہ اختلافاتِ متن کی نشان دہی کر دی گئی ہے، انھیں دیکھا جا سکتا ہے، لیکن یہ ضرور عرض کروں کہ ایسے اختلافات اچھی خاصی تعداد میں ہیں]۔

ہندی مینول میں باغ و بہار کے صرف ۱۰۲ صفحے چھپے تھے، جو پہلے درویش کی سیر کے اختتام سے ذرا پہلے تک کے متن پر مشتمل ہیں۔ بقیہ متن میں بھی ک اور ن میں اختلافات ملتے ہیں۔ میں یہاں بھی صرف دو چار مثالوں پر اکتفا کروں گا۔

ک میں ص ۱۰۶ پر ایک جملہ یوں ہے: "تب بیمار اور دردمند دیس دیس اور ملک ملک کے، جو دور دور سے آتے ہیں، دروازے پر جمع ہوتے ہیں، اُن کی بڑی بھیڑ ہوتی ہے" ـــــ ن میں یہ عبارت یوں ہے: "تب بیمار اور دردمند ہر ملک کے جو جمع ہوتے ہیں اور دور دور سے آتے ہیں دروازے پر اکٹھے ہوتے ہیں بڑی بھیڑ لگتی ہے" ـــــ ک میں ص ۱۲۲ پر چوتھی سطر میں ایک جملہ یوں ہے: "وہ وزیر زادی جس نے اپنے تئیں سوداگر بچہ مشہور کیا تھا، اُسے دیکھ کر متعجب ہوئی" ـــــ ن میں یہ جملہ یوں ہے: "یہ سوداگر بچہ جو فی الحقیقت وزیرزادی تھی اُسے دیکھ کر...." ـــــ ک میں ص ۱۵۴ پر ولایتِ سراندیپ کے ذکر میں یہ بھی ہے کہ "اُس شہر میں بڑا بت خانہ تھا" ن میں یہاں "بت خانہ" کی جگہ "گرجا" ہے ـــــ ک میں اسی صفحے کی آخری سطر میں ایک جملہ ہے: "اُس حجّام نے سارا بدن میرا پونچھ پانچھ کر......" ن میں "حجّام" کی جگہ "ڈاکٹر" ہے ـــــ ک میں ص ۱۶۸ پر اٹھارویں سطر میں ہے: "پنڈت نے ایک خلعت بڑے بت کی سرکار سے دے کر" ن میں "پنڈت" کی جگہ "پادری" ہے ـــــ ک میں

ص ۱۷۰ پر ہے: "میں ...... دہرے میں گیا"۔ ن میں "دہرے" کی جگہ "گرجے میں گیا" ہے ــــ ک میں ص ۲۰۵ پر یہ ہے کہ شہزادی فرنگ نے "ایک جرّاح کو بلوایا"۔ ن میں "جرّاح" کی جگہ "ڈاکٹر" ہے ــــ ک میں ص ۱۵۹ پر ایک جملہ یوں ہے: "طہارت کر، کونے میں چھپ کر نماز پڑھ لیتا"۔ ن میں یہ جملہ اس طرح ہے: "بدن کو طہارت دے کر، کونے میں ......"

میرا خیال ہے کہ اثباتِ مدّعا کے لیے یہ مثالیں کافی ہیں۔ اب تک جو مثالیں پیش کی گئی ہیں، اُن سے بہ ظاہر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ن کا متن کسی ایسے نسخے پر مبنی ہے جو نظرِ ثانی سے پہلے کا نسخہ تھا اور یہ وہی نسخہ تھا [یا اُس نسخے کی نقل تھی] جس پر ہندی مینول کا متن مبنی تھا؛ لیکن بعض مقامات پر یہ عجیب بات سامنے آتی ہے کہ م اور ن کے متن میں اختلاف ہے اور ن کا متن ک کے مطابق ہے۔ مثلاً ص ۳۲ پر ایک جملہ یوں ہے: "میرا دل چاہتا نہیں کہ تمھیں اکیلا چھوڑ کر جاؤں"۔ ن میں بھی یہ جملہ اسی طرح ہے، جب کہ م میں اس کی صورت یہ ہے: "میرا جی تو چاہتا نہیں کہ ......" ــــ ص ۴۹ پر ایک جملہ اس طرح ہے: "سب کی سب متفکّر ہوئیں اور قدم پر گرنے لگیں"۔ ن میں بھی یہ جملہ اسی طرح ہے، جب کہ م میں اس کی صورت یہ ہے: "سب کی سب متفکّر ہوئیں اور تدبیر کرنے لگیں"۔ ــــ ص ۵۷، سطر ۶: "اِسی خاطر سے، پیچ تاب کھا کر میں چپکی ہو رہی"۔ م میں یہ اس طرح ہے: "اُس کی خاطر سے پیچ تاب کھا کر میں چپکی ہو رہی"۔ اور ن میں یوں ہے: "اِسی خاطر پیچ تاب کھا کر میں چپکی ہو رہی"۔ یہاں ن کا متن ک اور م دونوں سے مختلف ہے ــــ ص ۵۶، س ۷: "کنول اور فانوسِ خیال"۔ م میں "کنول فانوسِ خیال" ہے، یعنی "اور" موجود نہیں، مگر ن میں "اور" موجود ہے، یعنی ن کا متن ک کے مطابق ہے اور م سے مختلف ہے۔

لیکن سب سے زیادہ اہم اختلاف یہ ہے کہ کتاب کے آخر میں جہاں عبارتِ خاتمہ ہے، جو ص ۲۴۹ پر تیرھویں سطر سے شروع ہوتی ہے اور جس میں میر امّن نے یہ لکھا ہے کہ اس کتاب کا آغاز ۱۲۱۵ھ کے آخر سال میں ہوا اور اختتام ۱۲۱۷ھ کے آغاز میں ہوا؛ یہ پوری

عبارت لفظ بہ لفظ ن میں موجود ہے۔ اِس عبارت کے خاتمے پر میر امّن کا کہا ہوا جو قطعۂ تاریخ ہے، اُس میں پہلے شعر کا دوسرا مصرع ن میں بدلا ہوا ہے۔ مصرع یہ ہے: "تھے سنہ بارہ سو سترہ در شمار"۔ ن میں یہ مصرع یوں ہے: "تھے سن بارہ سو پندرہ در شمار"؛ مگر دوسرا شعر:

"کرو سیر اب اس کی تم رات دن　　کہ ہے نام و تاریخ "باغ و بہار""

ن میں بھی اِسی طرح ہے۔ یہ عجیب تر صورتِ حال ہے۔ اِن سب اختلافات کو دیکھ کر میں اِس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ن کے کاتب کے سامنے اِس کتاب کی دو روایتیں تھیں، ایک تو وہ جسے پہلی روایت کہنا چاہیے اور نسخۂ ھم جس پر مبنی ہے اور دوسری وہ روایت جو نظرِ ثانی کے بعد مرتّب ہوئی تھی۔ ن کے کاتب نے بنیادی طور پر تو پہلی روایت کو سامنے رکھا ہے اور بعض مقامات پر نظرِ ثانی شدہ روایت سے بھی کام لیا ہے اور عبارتِ خاتمہ کو نظرِ ثانی شدہ روایت سے نقل کیا، اِس استثنا کے ساتھ کہ پہلے شعر کے دوسرے مصرعے کو پہلی روایت کے مطابق رہنے دیا۔ یہ ہے تو عجیب تر صورتِ حال، مگر ایسے ہی کسی قیاس سے اِس کی توجیہ کی جا سکتی ہے۔ اِس کے سوا فی الوقت اور کوئی توجیہ میرے ذہن میں نہیں آتی۔ ایک امکان یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ن کے کاتب نے جس نسخے سے نقل تیار کی ہے، وہ اِسی طرح ہو۔

بہ ہر صورت، نسخۂ ن کی اہمیت مسلّم ہے۔ پہلی روایت پر میر امّن نے نظرِ ثانی کی تھی، اِس کا ثبوت تو ہندی مینول سے مل جاتا ہے؛ لیکن اُس میں بس ۱۰۲ صفحے ہیں۔ باقی حصّے پر کس طرح نظرِ ثانی کی گئی تھی، اُس کا گوشوارہ اِسی خطّی نسخے کی مدد سے تیار کیا جا سکتا ہے اور یہ بہت اہم بات ہے۔

اِس خطّی نسخے کی ایک اہمیت اور بھی ہے کہ کئی مقامات پر متن کی تصحیح اِسی کی مدد سے کی جا سکتی ہے۔ اُن تصحیحات کے مکمّل حوالے توضیح و تشریحات میں بہ ذیلِ اختلافِ نسخ لکھے گئے ہیں، یہاں محض بہ طورِ مثال ایک تصحیح کا ذکر کیا جاتا ہے۔ ص ۱۰۹ پر تیسری سطر میں ایک جملہ ہے: "مدّت تئیں یہی میرا کام تھا"۔ ک میں یہ اِس طرح ہے: "مدّتیں یہی میرا کام تھا" [ک ص ۱۰۹]۔ صاف ظاہر ہے کہ "مدتیں" غلطیِ طباعت ہے۔ ڈنکن فاربس کے مرتّب کیے ہوئے نسخے میں "مدّت تلک" ہے اور بہ ظاہر یہ "مدّتیں" کی قیاسی تصحیح ہے۔

ن میں "مدّت تئیں"[1] ہے [ک میں "مدّتیں" بہ ظاہر اِسی کی بگڑی ہوئی شکل ہے] یہاں ن کے متن کا صحیح ہونا مسلّم ہے اور اُسی کو ترجیح دی گئی ہے ـــــــ اِس نسخے کے لیے "ن" بہ طورِ علامت استعمال کیا گیا ہے۔

مطبوعہ نسخے :

باغ و بہار اِتنی بار چھپی ہے کہ اِس کی سب اشاعتوں کا گوشوارہ تیار کرنا مشکل ہے[2] [اور اِس کی کچھ ایسی ضرورت بھی نہیں] ۔ تدوین کے نقطۂ نظر سے اِس کے تین نسخے قابلِ ذکر ہیں۔ زمانی ترتیب کے مطابق سب سے پہلے ہندی مینول کا نام آتا ہے، جس میں اِس کے ۱۰۲ صفحے پہلی بار شامل کیے گئے تھے۔ دوسرا نسخہ وہ ہے جو مکمل ۱۸۰۴ء میں پہلی بار ہندوستانی پریس کلکتے میں چھپا تھا اور تیسرا نسخہ وہ ہے جسے ڈنکن فاربس نے مرتب کیا تھا۔ ضمنی طور پر اِس کا ایک موخر نسخہ بھی قابلِ ذکر ہے، جسے مولوی عبدالحق صاحب نے مرتب کیا تھا۔ باقی جس قدر نسخے اب تک چھپے ہیں، وہ پرانی اشاعتیں ہوں، یا ہمارے زمانے کے اہلِ علم

۱۔ "مدّت تئیں" مدّت تک کے مفہوم میں مستعمل رہا ہے۔ صرف ایک مثال؛ خواجہ میر درد کی ایک رباعی کا پہلا شعر ہے؛ مدّت تئیں اس باغ و بوستاں کو دیکھا ؛ یعنی کہ بہار اور خزاں کو دیکھا ۔ یہ دیوانِ مطبوعہ میں موجود ہے۔

۲۔ دتاسی کے خطبات میں متعدد مقامات پر باغ و بہار سے متعلق معلومات محفوظ ہیں اور جین صاحب کی کتاب اُردو کی نثری داستانیں میں اِس کے بعض نسخوں اور ترجموں سے متعلق بھی کچھ باتیں ملتی ہیں؛ تفصیل کے لیے اِن کو دیکھا جاسکتا ہے۔ دتاسی نے اِس کتاب کا فرانسیسی زبان میں ترجمہ بھی کیا تھا (دیکھیے ڈاکٹر ثریا حسین کی کتاب گارسیں دتاسی - اُردو خدمات علمی کارنامے، ص ۱۴۳)۔ دتاسی کے پہلے خطبے سے معلوم ہوتا ہے کہ باغ و بہار کو اُس نے اپنے یہاں نصاب میں شامل کیا تھا [خطباتِ گارساں دتاسی، انجمن ترقیِ اُردو اورنگ آباد، ص ۱۴] اُس نے اِسی خطبے میں اِس کتاب کے اپنے ترجمے کا بھی ذکر کیا ہے (ص ۴۲)۔ دتاسی کے اِس مجموعۂ خطبات میں صفحات ۴۱، ۴۲، ۹۸، ۱۱۸، ۱۵۷، ۱۷۴، ۱۸۴، ۱۹۰، ۱۸۹، ۲۸۳، ۲۹۱، ۳۲۰، ۳۴۴، ۳۷۴، ۶۶۹ کو دیکھا جاسکتا ہے۔ ڈاکٹر ثریا حسین کی محولۂ بالا کتاب میں ص ۳۷۹ پر باغ و بہار کے کئی اڈیشنوں کا حوالہ موجود ہے جو دتاسی کے ذاتی کتب خانے میں تھے۔ قومی زبان (کراچی) کے دو شماروں ؛ جون ۱۹۶۴ء، جولائی ۱۹۶۴ء میں باغ و بہار کے دو منظوم نسخوں کا تعارف کرایا گیا ہے (وغیرہ)۔

نے انھیں مرتب کیا ہو؛ یہ سب یا تو اشاعتِ اوّل [۱۸۰۴ء] کی نقل ہیں یا ڈنکن فاربس کے نسخے پر مبنی ہیں، اِس لیے تدوین کے لحاظ سے ان کو یہ حیثیت حاصل نہیں کہ متن کی تصحیح میں ان کو سامنے رکھا جائے۔

① ہندی مینوئل (م):

اِس سے پہلے گل کرسٹ کے ایک خط کا حوالہ آچکا ہے جو اُس نے کالج کونسل کو لکھا تھا اور جس کے ساتھ اُن کتابوں کی طباعت کے خرچ کا گوشوارہ بھی منسلک کر دیا تھا جو چھپ رہی تھیں یا چھپنے والی تھیں۔ اِس کے جواب میں کالج کونسل کے سکریٹری نے اُس کو مطلع کیا کہ "آئندہ اُس وقت تک نہ تو کوئی کتاب قبول کی جائے اور نہ کوئی رقم اِس مد میں صرف کی جائے جب تک مسوّدات کالج کونسل کے سامنے پیش نہ کر لیے جائیں"۔ گل کرسٹ نے بجا طور پر اِس کے یہ معنی نکالے کہ کونسل کتابوں کی طباعت کے لیے رقم دینا نہیں چاہتی۔ غرض کہ سوال و جواب کے بعد "صاحبانِ کالج کونسل نے ...... گل کرسٹ کے استدلال سے عاجز آ کر لکھا کہ زیرِ طبع ہندستانی کتابوں کی جو فہرست اُس نے اپنے خط مورخہ ۱۲ر جنوری ۱۸۰۲ء کے ساتھ منسلک کی تھی، اور جن کی مزید طباعت کالج کونسل نے روک دی تھی، اُن کے مطبوعہ اجزا نیز غیر مطبوعہ حصّوں کا انتخاب چھاپ کر ایک جلد بنا دی جائے اور یہ کتاب پانچ سو صفحات سے زیادہ نہ ہو اور دس ہزار سے زیادہ اُس پر لاگت نہ آئے" [گل کرسٹ اور اُس کا عہد، طبع دوم، ص ۱۲۸]۔

گل کرسٹ نے اپنے خط کے ساتھ جو نقشہ بھیجا تھا، اُسے عتیق صاحب نے اپنی محوّلۂ بالا کتاب میں نقل کر دیا ہے [ص ۱۲۳ - ۱۲۴]۔ اُس میں "چار درویش" کا نام بھی شامل ہے جس کے متعلق یہ صراحت کر دی گئی ہے کہ وہ ہرکارہ پریس میں چھپ رہی ہے اور اب تک اُس کے ۸۰ صفحے چھپ چکے ہیں۔ غرض کہ کالج کونسل کی تجویز کے مطابق مختلف کتابوں کے اجزا کو یک جا کر کے ہندی مینوئل کے نام سے ایک کتاب تیار کر دی گئی۔ اُس میں باغ و بہار کے ۲۰۰ صفحے شامل ہیں۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ ۱۲ر جنوری کو جب گل کرسٹ نے پہلا خط لکھا تھا، اُس کے بعد طباعت جاری رہی تھی اور جس وقت ہندی مینوئل کو تیار

کیا گیا، اُس وقت تک اِس کے ۱۰۲ صفحے ہر کارہ پریس میں چھپ چکے تھے۔

ہندی مینول کی نایابی کا احوال لکھا جا چکا ہے۔ میرے علم میں اب تک اِس کا صرف ایک نسخہ ہے جو لندن کے اسکول آف اورینٹل اینڈ افریقن اسٹڈیز کے کتاب خانے میں محفوظ ہے۔ ہندستان کے کسی کتاب خانے میں اب تک اِس کے وجود کا علم نہیں ہو سکا ہے۔ میں نے کلکتے کی ایشیاٹک سوسائٹی کی لائبریری میں اور نیشنل لائبریری میں خاص طور پر اِس کو تلاش کیا، لیکن وہاں بھی اِس کا سراغ نہیں ملا۔ جناب محمد قاسم دلوی نے لندن سے اِس کے اوّل و آخر کے دو دو صفحات کا اور باغ و بہار کے ۱۰۲ صفحوں کا عکس بھیجا ہے؛ اِس کتاب کے یہی اجزا میرے سامنے ہیں۔ [ضرورت اِس کی ہے کہ اِس انتخابی مجموعے کے حالہ و ماعلیہ کا کوئی اچھا کام کرنے والا مطالعہ کرے؛ اِس سے بہت سی نئی باتیں معلوم ہو سکتی ہیں]

ہندی مینول کے سلسلے میں ایک عجیب اتّفاق رونما ہوا جس کا ذکر کرنا ضروری ہے۔ مجھے ایک زمانے سے اِس کی تلاش تھی۔ ۱۹۶۲ یا ۱۹۶۴ میں ایک بار ڈاکٹر مختار الدّین آرزو سے باغ و بہار کی تدوینِ نو کا ذکر آیا۔ اُنھوں نے کہا کہ اُن کے پاس ایک قدیم نسخہ ٹائپ میں چھپا ہوا ہے، جو ہے تو باغ و بہار کا حصّہ، لیکن اُس کا سرورق اور آخر کے صفحات موجود نہیں؛ اِس لیے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ یہ کب کا چھپا ہوا ہے۔ اُنھوں نے ازراہِ لطفِ خاص وہ نسخہ مجھے دے دیا۔ میں نے اِسے دیکھا، لیکن کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ کون سی اشاعت ہے۔ شروع کا صفحہ، جس پر بسم اللہ مرقوم ہے، موجود، لیکن آخر سے ناقص۔ آخری مطبوعہ صفحے پر صفحہ نمبر ۱۰۲ موجود ہے؛ لیکن کسی شخص نے آٹھ صفحے اپنے قلم سے لکھ کر، پہلے درویش کی سیر کو مکمّل کر دیا ہے۔ میں نے اُسے رکھ لیا اور پھر بھول گیا۔ اب جو لندن سے ہندی مینول میں شامل چار درویش کے ۱۰۲ صفحوں کا عکس آیا، تو اچانک مجھے وہ نسخہ یاد آیا؛ اُسے نکال کر دیکھا؛ مقابلہ جو کرتا ہوں تو معلوم ہوا کہ یہ تو ہندی مینول کا حصّہ ہے؛ کسی شخص نے اصل کتاب سے اِن اوراق کو الگ کر لیا تھا۔ اور پھر کسی شخص نے یہ دیکھ کر کہ پہلے درویش کی سیر ناتمام ہے، اپنے قلم سے اُسے مکمّل کر دیا

اور جلد بند هوالی - کیا عرض کروں کس قدر مسرت ہوئی !! اب ہندی مینول میں شامل اجزائے باغ و بہار کے دو نسخے میرے سامنے ہیں : ایک اصل نسخہ، یعنی ہندی مینول میں شامل اوراق کا مجموعہ [عطیۂ ڈاکٹر آرزو] اور ایک اُس کا عکس [لندن سے قاسم دلوی صاحب کا بھیجا ہوا] - اِس مجموعے کو بڑی اہمیت اور بُنیادی حیثیت حاصل ہے - اِس میں شامل کتابوں کے اوراق، اُن سب کتابوں کی پہلی روایت کے امین ہیں - جب بھی اُن میں سے کسی کتاب کو مرتب کیا جائے گا، اِس مجموعے میں شامل اُس کتاب کے اجزا کو لازماً سامنے رکھنا ہوگا - اِس کے بغیر تدوین کی تکمیل نہیں ہو سکتی - باغ و بہار کے جو ۱۰۲ صفحے اِس میں شامل ہیں، اِن کی حیثیت بھی پہلی روایت کی ہے - اِن اوراق سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جب پہلی بار میر امن نے اِس کتاب کو لکھا ہے، تو کس طرح لکھا تھا - اِس کی بھی تصدیق اِس مجموعے سے ہوتی ہے کہ میر امن نے پہلی روایت پر نظرِ ثانی کی تھی اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ نظرِ ثانی کس طرح کی گئی تھی - اِس نسخے میں شامل متن کی ایک اہمیت یہ بھی ہے کہ اِس کی مدد سے طبعِ اوّل کی بعض ایسی اغلاطِ طباعت کو دور کیا جا سکتا ہے، جن کی درستی ویسے شاید مشکل تر ہوتی - ضمیمۂ تشریحات میں ایسے کئی حوالے آپ کو ملیں گے، میں یہاں صرف ایک مثال پر اکتفا کروں گا - ہمارے نسخے میں ص ۵۲ پر ایک جملہ ہے : "جب سہی سانجھ ہوتی، جیسے ہی وہ خواجہ سرا اُس جوان کو ... لے آتا" - طبعِ اوّل میں "سہی سانجھ" کی جگہ "سی سانجھ" ہے ("جب سی سانجھ ہوتی") - ظاہر ہے کہ یہ طباعت کی غلطی ہے - [غلط نامے میں یہ موجود نہیں] - ڈنکن فاربس کے نسخے میں یہاں صرف "سانجھ" ہے ["جب سانجھ ہوتی"] - "سی سانجھ" کو اُس نے بے معنی سمجھ کر صرف "سانجھ" لکھا - ہندی مینول میں یہاں "سہی سانجھ" ہے [ن میں بھی یہی ہے] اور یہی صورت صحیح ہے [اِس لفظ کی تشریح سے متعلق دیکھیے ص ۲۹۹ پر حاشیہ ۱] -

اِس مجموعے میں باغ و بہار کے ۱۰۲ صفحے شامل ہیں - چھپائی نستعلیق ٹائپ کی ہے - مسطر ۱۳ سطری ہے اور گل کرسٹ کے نظامِ املا کی اِن میں بڑی حد تک پابندی کی گئی ہے، یعنی علامات و رموز و اعراب کا اہتمام بھی ملحوظ رکھا گیا ہے، لیکن ۱۸۰۴ء کے مطبوعہ نسخے

سے مقابلہ کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ اِس موخّر نسخے میں یہ اہتمام بڑے پیمانے پر کیا گیا ہے اور اِس کو التزام کی حیثیت حاصل ہو گئی ہے۔ پہلے درویش کی سیر مکمل نہیں آسکی ہے۔ ہمارے مرتّبہ نسخے کے مطابق ص ۳۴ پر ساتویں سطر میں "چھپ رہی۔ فقیر تو!" پر ص ۱۰۲ کی آخری سطر ختم ہو جاتی ہے۔ پہلے صفحے کا آغاز "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" سے ہوتا ہے اور کتاب شروع ہو جاتی ہے۔ میر امّن کی عرضی اِس میں شامل نہیں۔ صفحات نمبر پہلے صفحے سے ڈالے گئے ہیں۔ اندازہ یہ ہوتا ہے کہ جو کتاب جہاں تک چھپ چکی تھی، وہ سب صفحات لے کر اِس مجموعے میں شامل کر لیے گئے اور ہر کتاب کے صفحات کے نمبر شمار الگ سے ڈالے گئے ہیں۔ جب وہ حصّہ ختم ہو گیا ہے اور کسی نئی کتاب کے اجزا شروع ہوئے ہیں، تو پھر ایک، دو سے نمبر شمار شروع کیے گئے ہیں۔ اِس مجموعے کے پہلے سرورق کا [جو اُردو رسمِ خط میں ہے] اور آخری ورق کا [جو رومن میں ہے] عکس اِس کتاب میں شامل کر لیا گیا ہے۔ اُن سے اِس میں شامل کتابوں کی تفصیل معلوم کی جا سکتی ہے۔ سالِ طبع ۱۸۰۲ء درج ہے۔

ایک خاص بات یہ ہے کہ بعض عنوانات رومن اور ناگری رسمِ خط میں ملتے ہیں مثلاً دوسرے صفحے پر اشعارِ حمد سے پہلے GHUZUL لکھا ہوا ہے۔ ص ۳ پر اشعار سے پہلے UBYAT ہے۔ ص ۱۵ پر ایک شعر سے پہلے फर्द लکھا ہوا ہے اور ص ۵۲ پر جہاں سے پہلے درویش کی سیر کا قصّہ شروع ہوتا ہے، وہاں सैर पहिले दरवेश की مرقوم ہے۔ دو سطروں کے بعد اشعار سے پہلے अशआर लکھا ہوا ہے اور ص ۹۰ پر شعر سے پہلے फर्द ہے۔ اِس کی وجہ بھی سمجھ میں نہیں آسکی اور ضرورت بھی خطّی نسخے (ن) میں ہندی یا رومن رسمِ خط کہیں بھی نہیں ملتا۔ اِس سے یہ اندازہ کرنا شاید غلط نہ ہو کہ اصل مسوّدے میں یہ کچھ نہیں تھا، پریس میں کسی وجہ سے رومن اور ناگری رسمِ خط میں بعض سرخیوں کو ٹائپ کیا گیا۔ ۱۸۰۴ء والی اشاعت میں بھی رومن یا ناگری رسمِ خط میں کہیں کچھ نہیں ملتا۔ [چوں کہ میں ہندی مینول کا مکمل عکس حاصل نہیں کر سکا، اِس لیے میں نے اپنے استفادے کو اُس میں شامل باغ و بہار کے ۱۰۲ صفحات تک محدود رکھا ہے]

—— اِس نسخے کے لیے (ھ) بطورِ علامت مقرر کیا گیا ہے۔

۴ (الف) اشاعتِ اوّل (ک)

ذاتی ترتیب کے لحاظ سے دوسری [اور مکمل اشاعت کے لحاظ سے پہلی] مطبوعہ روایت وہ ہے جو کلکتے سے ۱۸۰۴ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس نسخے کے سرورق پر سالِ طبع اور پریس کے متعلق یہ مرقوم ہے: "ہندوستانی چھاپاخانہ سنہ ۱۸۰۳ عیسوی مطابق سنہ ۱۲۱۸ ہجری کے" [اِس صفحے کا عکس اِس کتاب میں آغازِ متن سے پہلے شامل کر دیا گیا ہے]۔ اِس اشاعت کے آخری صفحے پر [جو مکمل رومن رسم خط میں ہے] سالِ طبع ۱۸۰۴ء لکھا ہوا ہے اور پریس کا نام "ہندوستانی پریس"۔ [اِس صفحے کا عکس اِس کتاب کے آخر میں شامل ہے]۔ سالِ طبع کا یہ اختلاف کوئی نئی چیز نہیں، متعدد کتابوں میں اِس کی مثال ملتی ہے کہ سرورق پر ایک سالِ طبع ہے اور آخری صفحے پر [یا عبارتِ خاتمۃ الطبع میں] دوسرا۔ مثلاً فسانۂ عجائب کے بعض نسخوں کا یہی احوال ہے [باغ و بہار مرتّبہ فاربس (اشاعتِ اوّل) میں بھی ایسا ہی اختلاف پایا جاتا ہے۔ اِس نسخے کے تعارف میں نشان دہی کی گئی ہے]۔ اِس سلسلے میں میرا خیال یہ ہے کہ سرورق پر عموماً وہ سنہ درج ہوتا ہے جب کتاب چھپنے کے لیے پریس جاتی ہے اور چھپائی شروع ہوتی ہے۔ جب کتاب کی چھپائی مکمل ہوتی ہے اور سنہ بدل چکا ہوتا ہے تو اُس صورت میں آخری صفحے پر وہی نیا سنہ لکھا جاتا ہے۔ [یہ واضح کر دیا جائے کہ یہ کلیّہ نہیں]۔ اِس لحاظ سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ باغ و بہار ۱۸۰۳ء میں کسی وقت چھپنا شروع ہوئی تھی اور غالباً ۱۸۰۴ء میں اُس کی طباعت مکمل ہوئی۔ اِس اعتبار سے یہ کہنا چاہیے کہ یہ کتاب ۱۸۰۴ء میں شائع ہوئی۔

اِس اشاعت کے نسخے صحیح معنی میں کم یاب ہیں۔ اِس وقت تک اِس کے تین ۳ نسخے میرے علم میں آ سکے ہیں: (۱) مخزونہ کتاب خانۂ انجمن ترقّیِ اُردو، دہلی۔ (۲) مخزونہ کتاب خانۂ مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ۔ (۳) مخزونہ کتاب خانۂ انڈیا آفس، لندن۔ میں نے اوّل الذکر نسخے سے استفادہ کیا ہے۔ یہ نسخہ مکمل ہے۔ اصل کتاب ص ۲۵۰ پر ختم ہو جاتی ہے۔ ص ۲۵۱ پر "فہرست باغ و بہار کی" ہے۔ اِسی صفحے پر بارھویں سطر میں

"غلط نامہ" لکھا ہوا ہے۔ تیرھویں سطر میں "غلط" اور "صحیح" کے عنوانات ہیں۔ چودھویں سطر سے غلط نامہ شروع ہو جاتا ہے جو ص ۲۶۹ پر ختم ہوتا ہے۔ یہ ایک کالمی ہے۔ آخر میں دو ورق اور ہیں، جن کا ایک صفحہ سادہ ہے اور تین صفحات کے اندراجات انگریزی زبان اور رومن رسمِ خط میں ہیں۔ آخری صفحہ "آخری سرورق" ہے۔ اُس سے پہلے کے صفحے پر انتساب کی عبارت ہے اور اُس سے پہلے صفحے پر پیش لفظ ہے۔ [اِن تینوں صفحوں کا عکس اِس کتاب کے آخر میں شامل کر لیا گیا ہے] ۔ کتاب نستعلیق ٹائپ میں چھپی ہے۔ سطر اٹھارہ سطری ہے۔

طویل غلط نامے کے باوجود طباعت کی کچھ غلطیاں باقی رہ گئی ہیں۔ حواشی میں اِن کی نشان دہی کی گئی ہے، یہاں محض بہ طورِ مثال چند اغلاط کی نشان دہی کی جاتی ہے [جو کہ کے متن میں موجود ہیں، لیکن غلط نامے میں موجود نہیں] ۔ "حویلی کو گھیر لیا دروازے پر نرسنگا بجایا" [ک ص ۲۳۱] ۔ صحیح لفظ "نرسنگا" ہے [جو ف اور ن میں ہے] ۔ "جتنے باشندے اِس شہر کے ہیں میرا دشمن ہوئے" [ک ص ۲۳۱ ۔ ہمارے مرتبہ نسخے میں بھی یہ دونوں جملے ص ۲۳۱ پر ہیں] ۔ واضح طور پر "میرا" غلطیِ طباعت ہے، "میرے" ہونا چاہیے [جو ن میں ہے۔ ف میں بھی یہاں "میرا" ہے، اور یہ نقلِ محض کا نتیجہ ہے] ۔ "اور اُس کی قیمت کا روپے دھر دیتا ہے" [ک ص ۱۸۶ ۔ ہمارے نسخے میں بھی یہی صفحہ ہے] ۔ "کا" واضح طور پر غلطیِ طباعت ہے، "کے" ہونا چاہیے جس طرح ف میں ہے۔ [ن میں یہاں "قیمت کا روپیہ" ہے، مگر وہ اختلافِ نسخ کے ذیل میں آتا ہے] ۔ "پنڈا ایک خلعت بڑے بُت کی سرکار سے دے کر اُسے رخصت کرتے ہیں" [ک ص ۱۶۸ ۔ ہمارے نسخے میں بھی یہی صفحہ ہے] ۔ صاف ظاہر ہے کہ یہاں "پنڈا" طباعت کی غلطی ہے، "پنڈے" کا محل ہے [ف میں "پنڈے" ہے] ۔ ہمارے نسخے میں ص ۱۷۰ پر ایک جملہ ہے: "وے سُن کر اُس پیر زال کے روبہ رو گئے"۔ ک میں "پیر ذال" [مع ذالِ منقوطہ] ہے [ص ۱۷۰] ۔ ظاہر ہے کہ یہ کرشمۂ طباعت ہے۔ ف میں "پیر زال" ہے، یہی صحیح ہے اور اِسی کی مطابقت اختیار کی گئی ہے۔ ک میں ص ۱۷۷ پر "شاہِ راہ" ہے، ف میں "شاہ راہ" ہے اور

یہی صحیح ہے۔ ک میں ہ کے نیچے زیر، طباعت کی غلطی ہے۔

(ب) اشاعتِ اوّل کا سرورق:

مولوی عبدالحق صاحب نے اپنے مرتبہ نسخۂ باغ و بہار کے مقدمے میں لکھا ہے:

"فارسی اور نوطرزِ مرصّع کے مطالعے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ باغ و بہار فارسی کتاب کا ترجمہ نہیں، بلکہ اس کا ماخذ نوطرزِ مرصّع ہے۔ تعجب اس بات کا ہے کہ میرامّن نے فارسی کتاب اور اس کے ترجمے کا تو ذکر کیا، مگر نوطرزِ مرصّع کا ذکر صاف اڑا گئے۔" (ص۱۱)

میری معلومات کی حد تک سب سے پہلے شیرانی صاحب نے اپنے مذکورہ مضمون [مشمولہ کاروان] میں اس کی تردید کی تھی:

"...... لیکن حقیقت میں میر امّن پر کوئی الزام عائد نہیں ہوتا۔ یہ ایک اتفاق ہے کہ میر نے اپنے دیباچے میں نوطرزِ مرصّع کا بہ حیثیتِ ماخذ کوئی ذکر نہیں کیا، مگر اپنی تالیف کے سرورق پر صاف الفاظ میں اس کا اظہار کیا ہے، چناں چہ عبارتِ سرورق ملاحظہ ہو۔"

اس کے بعد انھوں نے سرورق کی عبارت کا یہ حصہ نقل کیا ہے: " باغ و بہار تالیف کیا ہوا میر امّن دلّی والے کا۔ ماخذ اس کا نوطرزِ مرصّع کہ وہ ترجمہ کیا ہوا عطا حسین خاں کا ہے فارسی قصۂ چہار درویش سے۔" [اس سرورق کا عکس اس کتاب میں متن سے پہلے شامل کر لیا گیا ہے۔ اس میں مکمل عبارت دیکھی جا سکتی ہے۔ یہاں ترتیب بھی بدلی ہوئی ہے۔ نیز اس میں "کہ" موجود نہیں، اور "چہار درویش" کے بجائے "چار درویش" ہے] شیرانی صاحب نے مزید لکھا ہے کہ گل کرسٹ نے بھی اپنے پیش لفظ میں یہی وضاحت کی ہے۔ اس کے بعد لکھا ہے: "یہ بیانات میر امّن کو ہر قسم کے الزام سے بری کر دیتے ہیں۔"

یہ صحیح ہے کہ اشاعتِ اوّل کے سرورق پر منقولہ عبارت موجود ہے، لیکن ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا وہ میر امّن کی لکھی ہوئی ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ بات کہ کیا سرورق میر امّن کا تیار کیا ہوا ہے۔ فورٹ ولیم کالج کی چھپی ہوئی کئی کتابوں کے

سرورق عموماً اسی انداز کے ملتے ہیں [مثلاً عتیق صاحب نے اپنی محولۂ بالا کتاب میں اخلاقِ ہندی طبعِ اوّل کے سرورق کا عکس چھاپا ہے، اُس میں اوپر کی دو سطریں اِس سرورق کی دو سطروں سے خاصی ملتی جلتی ہیں]۔ اگر یہ سرورق میر امّن کا بنایا ہوا ہے، تو پھر متن میں اُنھوں نے ایسی عبارت کیوں لکھی جس سے یہ مترشّح ہوتا ہے کہ یہ کتاب فارسی قصّۂ چہار درویش کا براہِ راست ترجمہ ہے! اِس سلسلے میں کوئی قطعی بات نہیں کہہ سکتا، لیکن ذہن میں سوالیہ نشان ضرور پیدا ہوتا ہے۔

(ج) پیش لفظ:

اِس کتاب کے آخر میں [''آخری سرورق'' اور انتساب کے صفحے سے پہلے] انگریزی میں ایک عبارت ہے، جس کا عنوان ہے: ''PREFACE''۔ کل انیس سطریں ہیں۔ نہ تو شروع میں کسی کا نام ہے اور نہ آخر میں۔ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ پیش لفظ گل کرسٹ کا لکھا ہوا ہے۔ ڈنکن فاربس نے اپنے مرتّبہ نسخۂ باغ و بہار کے پیش لفظ میں اِس کی پوری عبارت نقل کر دی ہے۔ اُس نے اِس کے لیے APPRENTLY BY DR. GILCHRIST لکھا ہے۔ یعنی یقین کے ساتھ وہ یہ نہیں کہتا کہ یہ پیش لفظ گل کرسٹ کا لکھا ہوا ہے۔ ''بہ ظاہر گل کرسٹ کا ہے''۔ یہ اُس کی رائے ہے اور تقاضائے احتیاط یہ ہے کہ یہی کہا جائے۔

میرا یہ خیال تھا (اور ہے) کہ یہ پیش لفظ ناتمام ہے۔ اِس خیال کی وجہ یہ تھی کہ آخر میں نام تو ہونا چاہیے تھا (جیسا کہ عام طور پر ہوتا ہے)۔ یہ بھی خیال تھا کہ عبارت اچانک ختم ہو جاتی ہے اور بہ ظاہر ناتمامی کا احساس ہوتا ہے۔ اِس کتاب کی طبعِ اوّل کے جو تین نسخے میرے علم میں ہیں [جن کا ذکر آچکا ہے]، اُن تینوں نسخوں میں بس یہی ایک صفحہ ہے۔ انڈیا آفس (لندن) کے صفحات کا عکس مالک رام صاحب نے منگا کر دیا اور علی گڑھ کے نسخے کو میری درخواست پر ایم۔ حبیب خاں صاحب نے وہاں جا کر دیکھا؛ معلوم ہوا کہ دونوں نسخوں میں وہی ایک صفحہ ہے۔ نسخۂ انجمن ترقّیِ اُردو میرے سامنے ہے؛

اُس کا بھی یہی احوال ہے۔ ڈنکن فاربس نے اپنے مرتّبہ نسخے کے مقدّمے میں اِس بیش لفظ کی عبارت نقل کر دی ہے، اُس نے بھی بس اِتنی ہی عبارت لکھی ہے۔

اِس چھان بین کے بعد یہ تو اندازہ ہوگیا کہ بیش لفظ کی اِتنی ہی عبارت شاملِ کتاب ہوئی تھی۔ اِس کا امکان بہ ہر حال ہے کہ عبارت اِس سے زیادہ لکھی گئی ہو اور شاملِ کتاب کسی وجہ سے نہ ہو سکی ہو، یا یہ کہ شیرازہ بندی میں ایک حصّہ شامل نہیں ہو پایا۔ [یہ محض گمان اور صرف خیال ہے، لیکن میں اسے حقیقت سے قطعی طور پر عاری نہیں سمجھتا]۔ موجودہ صورت میں یہی مان لیا جاتا ہے کہ بیش لفظ کی بس اِتنی ہی عبارت شاملِ کتاب ہوئی ہے۔ اِس صفحے کا عکس اِس کتاب کے آخر میں شامل کر لیا گیا ہے۔

(ن) اعراب، علامات، رموزِ اوقاف:

اِس نسخے میں الفاظ پر اعراب اور علامات، نیز عبارت میں رموزِ اوقاف کا خاص اہتمام ملتا ہے۔ اُن کی ضروری تفصیل سے پہلے یہ واضح کرنا ضروری ہے کہ گل کرسٹ نے جب کتابیں مرتّب کرانے اور چھاپنے کا منصوبہ بنایا تھا، تو پہلے یہ بنیادی کام کیا تھا کہ ایک مکمّل نظامِ املا[1] مرتّب کر لیا تھا۔ اُسے اُردو رسمِ خط اور غیر ملکی طلبہ، دونوں کی مشکلوں کا

---

[1] گل کرسٹ کو یہ شرف حاصل ہے کہ اُردو میں اُس نے سب سے پہلے املا پر ایک مستقل رسالہ لکھا تھا۔ وہ رسالہ تو اب تک نہیں مل سکا ہے، لیکن اُس کا خلاصہ موجود ہے۔ یہ تلخیص میرے علم کے مطابق میر شیر علی افسوس کی کتاب باغِ اُردو (ترجمۂ گلستانِ سعدی) کے شروع میں چھپی تھی، جو مع سرورق سات صفحوں پر مشتمل ہے۔ سرورق کے علاوہ صفحات کا مسطر تیرہ سطری ہے اور ایک سطر میں (کم و بیش کی نسبت کے ساتھ) ۱۲ لفظ آئے ہیں۔ اکبر علی خاں صاحب نے مطلع کیا کہ حفیظ الدّین کی کتاب خرد افروز میں بھی یہ تلخیص شامل ہے اور حفیظ الدّین نے اِس سے متعلق ایک مختصر سی عبارت بھی لکھی ہے۔ انھوں نے اُس عبارت کی نقل بھی بھیجی ہے۔ باغِ اُردو (طبعِ اوّل ۱۸۰۲ء) کے متعلق صفحات کا عکس بھی اُنھی کی معرفت دست یاب ہوا ہے۔ اِس سے پہلے باغِ اُردو کی ایک مؤخر اشاعت کے صفحات کا عکس میرے پاس تھا جسے ازراہِ لطف ڈاکٹر تنویر احمد علوی نے فراہم کیا تھا، مگر اُس نسخے کا سرورق موجود نہیں، یوں سالِ اشاعت اور پریس کا علم نہیں ہو سکا تھا، اب جو مقابلہ کیا تو طبعِ اوّل اور اِس مؤخر اشاعت

←

خوب علم تھا۔ اُسے یہ بھی معلوم تھا کہ اُردو میں حروفِ علّت کی آوازیں نئے طالب علموں کے لیے بہت پریشان کُن ثابت ہوں گی اگر اُن کے تعیّن کی کوئی صورت نہ ہو۔ اُسے اچھی طرح علم تھا کہ اُردو کی تحریروں میں آخرِ لفظ میں واقع یاے معروف و مجہول کے امتیاز کو مطلقاً ملحوظ نہیں رکھا جاتا اور یہی احوال ہاے ملفوظ و ہاے مخلوط کی تشکیل صورت کا ہے۔ عبارت میں نہ پیراگراف ہوتے ہیں نہ رموزِ اوقاف۔ طالبِ علم کے لیے یہ معلوم کرنے کی کوئی صورت

کے سرورق کی عبارت میں بھی فرق ہے۔ میں نے اُسی زمانے میں "گل کرسٹ کا نظامِ املا" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا تھا، اب از سرِ نو اُس کو لکھنے کا ارادہ ہے۔ طبعِ اوّل کے سرورق پر جو عبارت ہے، اُس کا ضروری حصّہ یہ ہے: "...جو رسالہ مسٹر جان گل کرسٹ صاحب، دام اقبالہ نے واسطے رسم خط و اعراب کے بنایا ہے، اُس کا خلاصہ یہ ہے اور جو کوئی کلیہ اُس کو دریافت کیا چاہے، تو اُس رسالے میں دیکھ لے۔"

ابھی یہ لکھا جا چکا ہے کہ گل کرسٹ کے رسالۂ املا کی تلخیص حفیظ الدین کی کتاب خرد افروز میں بھی شامل ہے۔ حفیظ الدین نے اِس تلخیص کے سلسلے میں لکھا ہے:

"مخفی نہ رہے کہ ہندی کی جتنی کتابیں خواہ نظم خواہ نثر، نستعلیق یا نسخ خط میں چھاپا ہوئی ہیں، سب بہ موجب جان گل کرسٹ صاحب کے رسم خط کے موافق ہیں، اِس لیے کہ لوگوں کو عبارت پڑھنے میں آسانی ہو۔ کیوں کہ جو کتاب کہ اِس رسم خط کے موافق نہیں، اُس کے پڑھنے میں، اور تو کیا، اہلِ ہند کہ جن کی یہ زبان ہے، وہ بھی اٹکتے ہیں، علی الخصوص یاے معروف و مجہول میں، کیوں کہ جب تک لفظ کے معنی اور مرجع ضمیروں کا بہ خوبی دریافت نہ کیا جائے اور صورتِ تحریر ایک سی ہو تو البتہ اُس کے پڑھنے میں غلطی ہوگی۔ اور وے لوگ کہ جنھوں نے یہ قاعدے نہ دیکھے اور مطلق اِس رسم خط سے آشنا نہیں، اگرچہ چھاپے کی کتابیں دیکھتے دیکھتے مہارت ہو جاتی ہے اور اجمالاً اِس قاعدے سے واقف ہو جاتے ہیں، لیکن ابتداءً تو نہایت جھجکتے ہیں بلکہ جا بجا اٹکتے ہیں۔ مثل مشہور، محنت برباد گنہ لازم۔ پس اِن کے حق میں یے قاعدے بے فائدہ ہیں، بلکہ وہی نقص جیسا کا تیسا باقی رہا۔ اِس لیے بہ نظرِ فائدۂ عام اُس رسالے کا خلاصہ، جو جان گلکرسٹ صاحب نے رسمِ خط کے لیے ایجاد کیا ہے، اِس کتاب کے ساتھ چھپوایا، تاکہ جو اِس خلاصے کو دیکھے، بہ خوبی کتابوں کے پڑھنے پر قادر ہو اور بے کھٹکے آنکھ موندے اپنی منزلِ مقصود کو پہنچے۔" [اصل کتاب (خرد افروز، طبعِ اوّل) میری نظر سے نہیں گزری۔ اکبر علی خاں صاحب نے یہ عبارت اِس صراحت کے ساتھ بھیجی ہے کہ یہ طبعِ اوّل کی نقل ہے، اُسی کے مطابق اِسے درج کیا گیا ہے]۔

نہیں کہ لفظ کے آخر میں جو واو آیا ہے، وہ معروف ہے، مجہول ہے یا معدولہ ہے (وغیرہ)۔ اُس نے اِن سب اُمور کو پیشِ نظر رکھ کر ایک جامع نظامِ املا مرتب کیا تھا، پھر اُس سے بھی بڑا یہ کام کیا تھا کہ نہایت سختی کے ساتھ اور بہت التزام کے ساتھ مطبوعات میں اُس کی پابندی کرائی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ عہدِ گل کرسٹ کی چھپی ہوئی [نستعلیق ٹائپ] کی کتابوں میں ایک ہی نظامِ املا سامنے آتا ہے اور اُس کی پابندی کا اہتمام اور التزام نظر آتا ہے۔ باغ و بہار کی اِس اشاعت میں بھی یہ اہتمام اور التزام پوری طرح سامنے آتا ہے۔

گل کرسٹ نے ی کو چار قسموں میں بانٹا تھا: معروف، مجہول، لین، مشموم۔ قاعدہ یہ بنایا تھا کہ جب ی لفظ کے آخر میں آئے گی اور معروف ہوگی، تو اُسے متعارف صورت (ی) میں لکھا جائے گا۔ اِس ی کا نام اُس نے "یاے داہنی" رکھا تھا۔ یہ صراحت کر دی تھی کہ اِس کے نیچے نقطے نہیں ہوں گے۔ جیسے: وہی، کی۔

جب مجہول ہوگی، تو اُسے [خواہ وہ لفظ کا جُز ہو، جیسے دیے، یا الحاقی ہو جیسے: مثلاً یے نعم] تو اُسے متعارف صورت میں دراز لکھا جائے گا، مثلاً: دیے، کے، سے۔ نقطے اِس کے نیچے بھی نہیں ہوں گے ــ ـــــــ آخرِ لفظ میں آنے والی یاے ماقبل مفتوح کو کشتی دار لکھا جائے گا، جیسے: ہے، مے۔ نقطے یہاں بھی نہیں ہوں گے۔

وہ ی جو درمیانِ لفظ ہوتی ہے اور اُس کی آواز حرفِ ماقبل کی آواز میں شامل ہو کر نکلتی ہے، اُس کا نام اُس نے "یاے مشموم" رکھا تھا [جسے ہم آسانی کی خاطر "یاے مخلوط" بھی کہہ سکتے ہیں]۔ اِس ی کی پہچان یہ بنائی تھی کہ اِس کے نقطے نیچے اوپر رکھے جائیں گے، جیسے: کیا، پیار۔

لفظ کے بیچ میں جو ی آتی ہے، اُس کا نام اُس نے "یاے شوشہ دار" رکھا تھا۔ معروف و مجہول کا امتیاز اِس طرح متعین کیا تھا کہ یاے مجہول کے اوپر ایک چھوٹا سا دائرہ بنایا جائے گا، جیسے: کھیل، دیر، میل، جیل۔ حرفِ ماقبل حرکت سے خالی رہے گا۔ اِس علامت کا نام اُس نے "جزمِ مدوّرہ" رکھا تھا۔ اگر معروف ہوگی، تو خالی رہے گی، اُس پر کوئی علامت نہیں ہوگی، حرفِ ماقبل یہاں بھی حرکت سے خالی رہے گا، جیسے: کیل،

چیل، چیر، قیل۔

اگر اِس "یاے شوشہ دار" سے پہلے والے حرف پر زبر ہے، تو اُس صورت میں اِس پر آٹھ کے ہندسے جیسا چھوٹا سا نشان بنایا جائے گا، جیسے: فیض، طفیل، ہیں، دیر۔ اِس علامت کا نام اُس نے "جزمِ غیر مدوّرہ" رکھا تھا۔ حرفِ ماقبل یہاں بھی حرکت (یعنی زبر) سے خالی رہے گا۔

ی کی طرح واو کی بھی چار قسمیں کی تھیں: معروف، مجہول، ماقبل مفتوح، معدولہ۔ —— مجہول واو کے لیے وہی علامت مقرر کی گئی جو یاے شوشہ دارِ مجہول کے لیے مقرر کی گئی تھی، جیسے: مور، چور، گول۔ "واو و یاے مجہول کی علامت کا نشان جزمِ مدوّرہ مقرر کیا" [تلخیصِ رسالۂ گل کرسٹ]۔ البتہ جمع کی صورت میں اِس واو پر کوئی علامت نہیں ہوگی: "واو جمع کا ہمیشہ مجہول رہتا ہے، اِس واسطے کوئی علامت اُس کی مقرر نہیں کی، مثلاً: لڑکو، لڑکوں" [ایضاً]۔

واوِ معروف پر [یاے شوشہ دارِ معروف کی طرح] کوئی علامت نہیں ہوگی۔ واوِ ماقبل مفتوح پر [یاے لین کی طرح] آٹھ کے ہندسے جیسی علامت آئے گی، جیسے: قول، غور —— واوِ معدولہ کا سر خالی رہے گا، جیسے: خود، خوشامد۔ اِن چاروں کے حروفِ ماقبل حرکت سے خالی رہیں گے۔

ہاے ملفوظ اور ہاے مخلوط میں صورت کا امتیاز ملحوظ رکھا جائے گا۔ ہاے مخلوط کو ہمیشہ دو چشمی لکھا جائے گا، جیسے: گھر، تھیں —— "جب الفِ مقصورہ بہ صورت یا کے ہو، تب اُس کے دامن میں ایک نشان بہ صورت خنجری زبر کے دیا جائے گا، جیسے: موسیٰ" [ایضاً] —— "اور الف ولامِ وصل و یا و واو جو حالتِ وصل میں متلفّظ نہیں ہوتے، اُن کے نیچے خطِ عرضی دیا گیا۔ جیسا: فی التّاریخ، ابوالقاسم وغیرہ" [ایضاً]۔

ہاے مختفی "ہندی میں اکثر ساتھ یاے مجہول کے بدل ہوتی ہے اہلِ ہند کے محاورے میں، جیسا: مُردے کو" [ایضاً]۔

باغ و بہار کے اِس نسخے [یعنی اشاعتِ اوّل] میں بھی اِن قاعدوں کی پابندی کی گئی ہے۔ بعض مثالیہ جملے: "مارے بھوکھ کے طاقت گویائی کی نہ تھی" — "میرے آنے کی کسو کو خبر نہ ہووے!" — "روتا دیکھ کر پوچھا" — "خدمت کر رہیں ہیں" — "اُن پر ایک چوکی ہاتھی دانت کی" — "تو میں نیشاپور کو چلوں" — "تمھیں اولاد دینی اُس کے نزدیک کیا بڑی بات ہے" — "کیا صانع ہے" — "یہ تماشا ہے" — "چُپکا ہو رہے" — "دل میں خوش ہوئی" — "عالم خوشی کا" "پردۂ غیب سے کیا ظاہر ہوتا ہے" — اِنتظار کھینچتا ہے" — "ایک بارگی وہی خواجہ سرا" — "نجیبوں کے قدر دان"۔

اہتمام اور التزام کا اندازہ اِس سے کیا جا سکتا ہے کہ ک کے متن میں ایک جگہ ص ۱۲ پر "تمھیں" چھپ گیا ہے، غلط نامے میں اُس کی تصحیح کی گئی ہے اور "تمھیں" کو صحیح بتایا گیا ہے۔ [اُس زمانے کی بات چھوڑیے، ہم میں سے بہت سے لوگ اِس زمانے میں اِس کی پابندی نہیں کر پاتے ہیں]۔ ک میں ص ۲۲ پر ایک جگہ "دو بیتے" چھپا ہے، غلط نامے میں "دو پتے" [مع واوِ معدولہ] لکھنے کی ہدایت ملتی ہے۔ ص ۳۰ پر ایک جگہ "ایسے" یاے معروف کے ساتھ "ایسی" چھپ گیا ہے؛ غلط نامے میں اِس کی بھی تصحیح کی گئی ہے اور "ایسے" لکھنے کی ہدایت کی گئی ہے۔ غرض کہ اِس طرح کی تصحیحات کئی جگہ ملتی ہیں۔

اضافت کے زیر نہایت پابندی کے ساتھ لگائے گئے ہیں۔ ایک جگہ ص ۵۹ پر لفظِ خانم میں اضافت کا زیر چھوٹ گیا ہے، غلط نامے میں اُس کی تصحیح کی گئی ہے۔ مشدّد حرفوں پر تشدید ضرور لگائی گئی ہے۔ گاف پر التزام کے ساتھ دو مرکز ملتے ہیں۔ الفِ ممدودہ کو ہر جگہ مد کے ساتھ لکھا گیا ہے۔ ہاے ملفوظ شوشے دار ہو یا کہنی دار، اُس کے نیچے شوشہ [ٹکن] ضرور ملتا ہے، جیسے: کہو، ہی۔

"اُس" اور "اُن" کے الف پر پیش اور "اِس" اور "اِن" کے الف کے نیچے زیر ضرور ملتا ہے، یہی احوال "اِتنا" اور "اُتنا" کا ہے۔ اہتمام کا اندازہ یوں کیجیے کہ

کی، کے متن میں ایک جگہ جن "دو پر" ان " چھپا ہوا ہے، غلط نامے میں اِس کی تصحیح کرکے "اُن" لکھا گیا ہے۔ "وہ" کے واو پر ہر جگہ پیش ملتا ہے، اِسی طرح "وُہی" "یہ" کی ی کے نیچے ہر جگہ زیر ملتا ہے، مگر "یہی" میں اِس کا التزام نہیں ملتا۔

جملۂ معترضہ کو قوسین میں لکھا گیا ہے، مثلاً: "شجیعوں کے قدر دان حبان گِل کرِسٹ صاحب نے (کہ ہمیشہ اِقبال اُن کا زیادہ رہے جب تلک گنگا جمنا بہے) لطف سے فرمایا کہ اِس قصّے کو...." [ک ص ۳] ——— "....تب شاہ جہان آباد مشہور ہوا (اگرچہ دِلّی جُدی ہے۔ وُہ پُرانا شہر اور یہہ نیا شہر کہلاتا ہی) اور وہاں کے بازار کو اُردوے مُعلّا خطاب دیا" [ک ص ۵]۔

اگر مرکّب کا ایک جُز دوسری سطر کے شروع میں آیا ہے، تو اُس صورت میں پہلی سطر کے آخر میں ایک چھوٹا سا خط بہ طورِ علامت لگایا گیا ہے، جیسے: "نواب دلاور- جنگ نے بلوا کر" [ک ص ۴]۔ اِسی صفحے پر: "اشرف- البلاد کلکتے میں"۔ پہلی مثال میں پہلی سطر "دلاور" پر ختم ہو جاتی ہے اور "جنگ" دوسری سطر کے شروع میں آیا ہے۔ دوسری مثال میں پہلی سطر "اشرف" پر ختم ہوتی ہے، اور "البلاد" دوسری سطر کے آغاز میں آیا ہے۔ اِس علامت کو اپنے مقامات پر التزام کے ساتھ استعمال کیا گیا ہے۔

جن لفظوں کے آخر میں قائم صورت میں ہاے مختفی آتی ہے [جیسے: مدرسہ] مُحرّف صورت میں ایسے لفظوں کے آخر میں عموماً یاے مجہول ملتی ہے، جیسے: "مدرسے کا، قصّے کو، شاہ نامے میں"۔ یہ تینوں مثالیں ص ۲ سے منقول ہیں۔ یا مثلاً: تقدیر کے حوالے، سیلے خطرے جلتا ہی، ایک گوشے میں، دیوان خانے کی تیّاری کو حکم کیا۔

مُعلّا، اعلا، ادنا؛ اِن لفظوں کے آخر میں ہر جگہ الف ملتا ہے۔ "اُردوے مُعلّا" بہ طورِ مثال ابھی اوپر آ چکا ہے۔ [میر امّن نے مخطوطۂ گنج خوبی میں اپنے قلم سے اِن لفظوں کو ہر جگہ اِسی طرح لکھا ہے۔ مفصّل بحث ضمیمۂ تلفّظ و املا میں]۔

بہت سے غیر عربی فارسی لفظوں کے آخر میں بھی الف ملتا ہے، جیسے: راجا، بھروسا، تارا، پیسا، ڈبیا، بُلبُلا، پتا۔

اکثر لفظوں میں ایک حرف پر یا دو حرفوں پر حرکات ملتی ہیں، جیسے: مُنتظر، عُہدے، قدم، قبلہ گاہ، قدر دانی، جو جھگی، رِکاب، مُسلمان، اُبرالا، کوشش، شِفا، مُسافر، بہشت، سرہانے، کتاب، عَہد، خِدمات، تاجر، طلب، دُرست، گناہ۔ لیکن جزم کو کہیں استعمال نہیں کیا گیا ہے۔

ٹ کے لیے ت کے نقطوں پر چھوٹا سا خط لگایا گیا ہے: ت ——— ڈ کے لیے د پر ویسا ہی خط: د ——— ڑ کے لیے ر پر یہی خط: ر۔ جیسے: مٹّی، مٹّی، بوڑھا، ڈانٹا ——— آخر لفظ میں واقع نونِ غنّہ کو نقطے کے بغیر لکھا گیا ہے، جیسے: ہیں، یہاں، جہاں، میں، میں۔

پیراگراف بنائے گئے ہیں ——— کاما اور فُل اسٹاپ لگائے گئے ہیں۔ فُل اسٹاپ کے لیے چھوٹا سا کھڑا خط ملتا ہے، جیسے: "شہر بے سر ہو گیا۔" ——— کاما کے لیے چھوٹا سا ڈیش (-) استعمال کیا گیا ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ اِن دونوں رموز کی پوری طرح اور بہت سے مقامات پر صحیح طور پر پابندی نہیں ہو سکی ہے۔ ڈنکن فاربس نے بھی اپنے مرتّبہ نسخۂ باغ و بہار کے پیش لفظ میں اِس طرف توجّہ دلائی ہے اور اِسے خامی قرار دیا ہے۔ یہی احوال پیراگرافوں کا ہے۔ فاربس کے نسخے (ف) میں پیراگراف ک سے مختلف طور پر ملتے ہیں۔

فجائیہ نشان (!) ملتا ہے، جیسے: "سُبحان اللہ! کیا صانع ہے" (ک ص ۱)۔ "تمھیں اولاد دینی اُس کے نزدیک کیا بڑی بات ہے! قبلۂ عالم! اِس تصوّرِ باطل کو دل سے دور کرو" (ک ص ۱۱)۔

سوالیہ نشان (؟) بھی لایا گیا ہے، مثلاً: "اِس سوال کا کیا جواب دو گے؟" (ک ص ۱۱) لیکن اِس کا التزام نظر نہیں آتا۔ فاربس کے نسخے (ف) میں رموزِ اوقاف کا اہتمام ک کے مقابلے میں کچھ بہتر دکھائی دیتا ہے۔

(۴) مرتّبۂ ڈنکن فاربس (ف):

مشہور مستشرق ڈنکن فاربس نے باغ و بہار کو مرتّب کیا تھا۔ اِس نسخے کی چار اشاعتیں میرے علم میں ہیں۔ دو اشاعتیں، پہلی اور چوتھی، میری نظر سے گزری ہیں اور میں نے اِن دونوں سے استفادہ کیا ہے۔ پہلی بار یہ لندن سے ۱۸۴۶ء میں اور چوتھی بار وہیں سے ۱۸۶۰ء میں شائع ہوا تھا[1]۔ مرتّب نے اپنے مقدّمے میں یہ لکھا ہے کہ میرے اِس نسخے کا متن اصلاً "۱۸۰۳ء" کی اشاعتِ کلکتہ [یعنی طبعِ اوّل] پر مبنی ہے اور دو خطّی نسخے بھی میرے سامنے ہیں، جن میں سے ایک مکمّل طور پر میر امّن کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ [اِن خطّی نسخوں کی ضروری تفصیل اِس سے پہلے "خطّی نسخے" کے عنوان کے تحت لکھی جا چکی ہے]۔ اِس لحاظ سے یہ نسخہ قابلِ ذکر قرار پاتا ہے۔ اِس کی دوسری اہمّیت یہ ہے کہ مولوی عبدالحق صاحب کا مرتّبہ نسخۂ باغ و بہار، فاربس کے اِسی مرتّبہ نسخے پر مبنی ہے [اِس کی بحث نسخۂ عبدالحق کے تحت آ رہی ہے]۔

میں نے جب مکتبۂ جامعہ کے لیے "معیاری ادب" کے سلسلے میں باغ و بہار کو مرتّب کیا تھا، تو اُس وقت فاربس کے مرتّبہ نسخے کی چوتھی اشاعت کو سامنے رکھا تھا [اِس کی اصل وجہ یہ تھی کہ اشاعتِ اوّل اُس وقت مجھے نہیں مل سکی تھی] لیکن اب میں نے چوتھی اشاعت کے بجائے، اُس کی پہلی اشاعت [۱۸۴۶ء] کو سامنے رکھا ہے۔ اِس ترجیح کی وجہ صرف یہ ہے کہ چوتھی اشاعت کے مقدّمے میں فاربس نے وضاحتاً لکھا

---

[1] اِس کا دوسرا اڈیشن لندن ہی سے ۱۸۴۹ء میں شائع ہوا تھا۔ اِس اڈیشن کا ایک نسخہ بمبئی یونی ورسٹی لائبریری میں موجود ہے۔ [یہ اطّلاع ڈاکٹر یونس اگاسکر نے اپنے ایک خط میں دی ہے]۔ اِس اشاعت کا ایک نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ کی لائبریری میں ہے اور وہیں اِس کا تیسرا اڈیشن بھی ہے جو لندن ہی سے ۱۸۵۱ء میں شائع ہوا تھا۔ بمبئی یونی ورسٹی لائبریری میں فاربس کا کیا ہوا باغ و بہار کا انگریزی ترجمہ بھی موجود ہے، جو لندن سے ۱۸۶۲ء میں شائع ہوا تھا [مکتوبِ اگاسکر صاحب]

ہے کہ میر امّن کے اصل متن میں کچھ ایسے قابلِ اعتراض حصّے بھی تھے، جو مشرقی تحریروں میں عموماً پائے جاتے ہیں۔ میں نے ایسے حصّوں کو ڈائرکٹر آف پبلک انسٹرکشن اور پرنسپل کلکتہ یونی ورسٹی کے ایما پر یا تو حذف کر دیا یا قدرے مختلف الفاظ میں بیان کر دیا۔ اِس کے بعد اُس نے ڈائرکٹر مذکور کی چٹھی بھی درج کر دی ہے۔ اسی بنا پر میں نے مناسب بل کہ ضروری سمجھا کہ اشاعتِ اوّل کو سامنے رکھا جائے جو تغیّر و تبدّل سے محفوظ رہی ہے۔

اِس نسخے کے سرورق کی آخری دو سطریں یہ ہیں: "سنہ ۱۸۴۵ عیسوی مطابق سنہ ۱۲۶۱ ہجری کے / ولیم واٹسن کے چھاپے خانے میں"۔ مگر کتاب کے آخری صفحے پر سالِ طبع ۱۸۴۶ء درج ہے۔ یہاں بھی وہی صورت معلوم ہوتی ہے جس کا تذکرہ طبعِ اوّل [۱۸۰۴ء] کے تعارف کے ذیل میں آ چکا ہے۔ اُسی کے بہ موجب اِس نسخے کے لیے بھی یہی کہا جائے گا کہ یہ ۱۸۴۶ء میں شائع ہوا تھا۔ متن ص ۲۶۰ پر ختم ہوتا ہے۔ اُس کے بعد نہایت مفصّل فرہنگ ہے جس پر صفحات کے نئے نمبر شمار ڈالے گئے ہیں۔ اِس فرہنگ کے مفصّل ہونے کا اندازہ اِس سے کیا جا سکتا ہے کہ یہ ۱۳۰ صفحات پر حاوی ہے۔ الفاظ کو پہلے اُردو رسم خط میں اور پھر رومن رسم خط میں لکھا گیا ہے۔ اِس سے تلفّظ کے تعیّن میں آسانی ہوتی ہے۔ الفاظ کے معانی انگریزی میں لکھے گئے ہیں۔

ایک خاص بات یہ ہے کہ فاربس نے گل کرسٹ کے نظامِ املا کی مکمّل طور پر پیروی نہیں کی ہے۔ اِس نسخے میں کاما کے لیے تو وہی نشان ملتا ہے جو کہ اس میں ہے، لیکن فل اسٹاپ کے لیے پھول کا نشان ✱ استعمال کیا گیا ہے۔ یہ بھی واقعہ ہے کہ کے سے کے مقابلے میں اِس نسخے میں کاما اور فل اسٹاپ، دونوں کے استعمال کی ترقی یافتہ اور بہتر صورت نظر آتی ہے۔

سب سے زیادہ فرق علامتوں کے استعمال کا ہے۔ گل کرسٹ کے مجوّزہ نظام کے برخلاف، فاربس نے علامتوں کا کام زبر زیر پیش سے لیا ہے۔ یہ اہم بات ہے ــــــ یائے شوشہ دار معروف کے حرفِ ماقبل کے نیچے زیر لگایا ہے اور ایسی یائے مجہول کے حرفِ ماقبل کو حرکت سے خالی رکھا ہے۔ یائے ماقبل مفتوح، شوشہ دار ہو یا دامنی، اُس

کے حرفِ ماقبل پر زیر لگایا گیا ہے، مثلاً: چیل، کیل - تیل، جیل - غیب، مین، مئی۔
یائے مشموم کو کسی بھی علامت کے بغیر لکھا گیا ہے اور نقطے معمول کے مطابق لگائے گئے
ہیں، جیسے: پیار۔

واوِ معروف کے حرفِ ماقبل پر پیش لگایا گیا ہے، واوِ مجہول کے حرفِ ماقبل
کو خالی رکھا گیا ہے، واوِ ماقبل مفتوح کے حرفِ ماقبل پر زبر لگایا گیا ہے اور واوِ
معدولہ کے حرفِ ماقبل پر پیش لگایا گیا ہے۔ اگر اُس کے بعد الف ہے، تو پھر حرفِ
ماقبل کو خالی رکھا گیا ہے، جیسے: طُور، نُور - چور، مور - دَوڑ، عَورت - خواہ، سرا، خُوش۔

گل کرسٹ کے نظامِ املا میں جزم کی کوئی جگہ نہیں تھی، فاربس نے جزم کو بکثرت
استعمال کیا ہے، مثلاً: "محرّم، معشوقہ، مسجد" ---- آخرِ لفظ میں واقع ی کے
نیچے ہر جگہ نقطے ملتے ہیں، جیسے: "دی، کی، تھی"۔

مرکب لفظ اگر دو ٹکڑے ہو کر دو سطروں میں آیا ہے، تو کٹ کے برخلاف، وہاں
کوئی علامت استعمال نہیں کی گئی ہے۔ وہ الف اور لام جو لکھے جاتے ہیں، لیکن پڑھنے
میں نہیں آتے، اُن کے اوپر یہ نشان صہ بنایا گیا ہے، جیسے: "فی الحقیقت"،
"اشرف الاشراف"۔ کٹ میں اِن حروف کے نیچے خط کھینچا گیا ہے۔ ہاں فت میں
صرف الف لام کے اوپر یہ نشان ملتا ہے [مثلاً "فی الحقیقت" میں ی کو اِس میں
شامل نہیں کیا گیا ہے۔ اِسی طرح دوسرے مقامات پر] ---- اضافت کے زیر اور
تشدید کا التزام ملتا ہے۔ پیراگراف بنائے گئے ہیں اور کٹ کے مقابلے میں، بہ لحاظِ
تکمیلِ مفہوم، یہ زیادہ بہتر اور مناسب معلوم ہوتے ہیں۔

آخرِ لفظ میں واقع ی کی صرف ایک شکل ملتی ہے، خواہ وہ معروف ہو یا مجہول
یا لین۔ پہچان اِس طرح قائم کی ہے کہ جس یائے معروف کے حرفِ ماقبل کے نیچے
زیر ہے، وہ معروف ہے۔ جس کے حرفِ ماقبل پر زبر ہے، وہ لین ہے اور جس کا
حرفِ ماقبل خالی ہے، وہ مجہول ہے، جیسے: تھی، بھی، تھی۔ ی کے نیچے نقطے التزام
کے ساتھ لگائے گئے ہیں۔ ہائے ملفوظ اور ہائے مخلوط کی صورت کا امتیاز ملحوظ نہیں

دکھا گیا ہے، مثلاً: "غصّے میں بھری ٹھوئی"، "باھر آدمی"، "مجھی پکارا"، "پادشاھزادی کی کیا تقصیر تھی؟" —— لیکن "یہ" ہمیشہ ایک ملفوظ ہ کے ساتھ ملتا ہے اور حرفِ اوّل کے نیچے التزام کے ساتھ زیر ملتا ہے، اِسی طرح "وہ" کے واو پر ہر جگہ پیش ملتا ہے۔

آخری نونِ غنّہ پر بھی ہر جگہ نقطہ ملتا ہے۔ میں بہ طورِ مثال شروعِ کتاب سے دو جملے [مطابقِ اصل] نقل کرتا ہوں۔ اِن سے املا، اعراب، علامات اور رموزِ اوقاف کی صورتِ حال واضح ہو جائے گی:

"اب آغاز قصّے کا کرتا ھوں۔ ذرّہ کان دھر کر سنو اور منصفی کرو * سیر میں چار درویش کی یوں لکھا ھے۔ اور کہنے والی نی کہا ھے۔ کہ آگی رُوم کی مُلک میں کوئی شہنشاہ تھا۔ کہ نوشیروان کی سی عدالت اور حاتم کی سی سخاوت اُس کی ذات میں تھی *"

ڈ، ڑ اور ٹ کے لیے چار نقطے بہ طورِ علامت لائے گئے ہیں: "کڑوڑوں"، "اُٹھائی"، "ڈبڈبا کر"۔ لفظوں پر اعراب بھی لگائے گئے ہیں۔ ایک خاص بات یہ ہے کہ عربی کے جن لفظوں کا آخری حرف اصلاً مشدّد ہے، مفرد صورت میں بھی اُن پر التزام کے ساتھ تشدید ملتی ہے، جیسے: حدّ، محلّ، خاصّ، عامّ۔ مصرع:
"کہ یہ میری گفتگو مقبولِ طبعِ خاصّ و عامّ" [مقدّمہ]۔ ک میں ایسے کسی لفظ پر تشدید موجود نہیں۔

اِس نسخے میں اغلاط اچھی خاصی تعداد میں پائی جاتی ہیں۔ غلط نامہ اِس میں شامل نہیں۔ میں دو تین مثالوں پر اکتفا کروں گا۔ [ضمیمۂ تشریحات میں بہ ذیلِ اختلافِ نسخ اِن کی تفصیل موجود ہے]۔ ص ۱۲۸ پر ایک جملہ یوں ہے [اِن مثالوں میں ف کے املا کی پابندی نہیں کی گئی ہے]: "کتّا صندلی سے جتنا چاہا اُتنا کھایا"۔ ک کے متن میں بھی یہ جملہ اِسی طرح ہے، مگر اُس کے غلط نامے میں اِس کی تصحیح کی گئی ہے اور اسے اِس طرح صحیح بتایا گیا ہے: "کتّے نے صندلی سے

نیچے اُتر.....''۔ صاف ظاہر ہے کہ مرتّب نے کے کے غلط نامے کو نہیں دیکھا۔
ف ص ۱۳۲ : ''جو کچھ سواری اور برداری درکار ہو''۔ کے میں ''باربرداری'' ہے اور یہی درست ہے۔ کے میں ص ۲۱۹ پر ایک جملہ یوں چھپا ہوا ہے : ''بیگمات اور خواصوں میں پلا گیا اور کھیلا کودا گیا''۔ ف میں بھی یہ جملہ اسی طرح ہے، بل کہ اس میں گاف پر زبر بھی لگایا گیا ہے (''گَیا'')۔ یہ بات صاف ظاہر ہے کہ کے میں ''گیا'' غلطیِ طباعت ہے [البتہ غلط نامے میں یہ مذکور نہیں]؛ ''پلا کیا'' ہونا چاہیے۔ [نسخۂ مولوی عبدالحق میں ''پلا کیا'' ہی ہے] ۔ ف میں ص ۴۵ پر ایک جملہ یوں ملتا ہے: ''جب سانجھ ہوتی''۔ کے میں ''جب سی سانجھ ہوتی'' ہے۔ مرتّب کی سمجھ میں ''سی سانجھ'' نہیں آسکا ہوگا [یوں کہ یہ کوئی لفظ ہی نہیں، یہاں طباعت کی غلطی ہے] اُس نے متعارف لفظ ''سانجھ'' لکھ دیا اور ''سی'' کو چھوڑ دیا۔ م اور ن میں ''سہی سانجھ'' ہے، اور یہی درست ہے۔ [تفصیل کے لیے دیکھیے ضمیمۂ تشریحات میں ص ۲۹۹، حاشیہ نمبر ۱]
مجموعی طور پر بہ لحاظِ متن یہ نسخہ کے کے مطابق ہے۔ اس میں ادنیٰ اضافہ نہیں جس کے لیے کہا جاسکے کہ وہ کسی خطّی نسخے سے منقول ہے، اور متن میں کہیں ایسا نمایاں فرق بھی نہیں جس کے لیے یہ کہا جاسکے کہ کے کے مقابلے میں یہ کسی بھی اعتبار سے ترجیحی حیثیت رکھتا ہے۔ ہر لحاظ سے ترجیحی حیثیت کے کو حاصل ہے ——
اس نسخے کے لیے ''ف'' بہ طورِ علامت استعمال کیا گیا ہے۔

مرتّبۂ مولوی عبدالحق (ع)

اِس نسخے کی بُنیادی نسخے کے طور پر تو کوئی حیثیت نہیں، لیکن ایک دو باتیں ایسی ہیں جنھوں نے اِسے ایسی اہمیت بخش دی ہے جو بہ ہر صورت قابلِ ذکر ہے۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ اِس نسخے پر مولوی صاحب نے جو مقدّمہ لکھا تھا، اُس میں یہ بھی لکھا تھا کہ میر امّن نے اگرچہ نوطرزِ مرصّع پر اپنے نسخے کی بُنیاد رکھی ہے، لیکن اُنھوں نے کہیں بھی اِس کا ذکر نہیں کیا ہے۔ پھر متعدد مثالوں سے مولوی صاحب نے اِس بات کو ثابت

کیا تھا کہ جہاں جہاں فارسی کے متن [مراد ہے اُس نسخے کے متن سے جو مولوی صاحب کے سامنے تھا لیکن جس کا تعارف انھوں نے نہیں کرایا اور نہ کسی طرح کی نشان دہی کی] اور نوطرزِ مرصّع کے متن میں اختلاف ہے، میر امّن نے ایسے مقامات پر نوطرزِ مرصّع کی پیروی کی ہے۔ اِس کی اصل وجہ یہ تھی کہ مولوی صاحب نے طبعِ اوّل کو نہیں دیکھا تھا، جس میں یہ صراحت موجود ہے۔ متعدّد لوگوں نے اِس کی تردید کی؛ لیکن اِس سے ایک فائدہ یہ ضرور ہوا کہ مولوی صاحب کے پیشِ نظر فارسی نسخے کے بہت سے مقامات کا متن سامنے آگیا اور یہ بحث بھی مکمّل ہوگئی کہ میر امّن نے اصلاً نوطرزِ مرصّع کو سامنے رکھا ہے۔

ایک خاص بات یہ ہے کہ مولوی صاحب نے اپنے مرتّبہ نسخے پر جو مقدّمہ لکھا تھا، اِس زمانے میں اُس نے اِس کتاب کی اہمّیت کو صحیح معنی میں روشن کیا اور میر امّن کی نثر کی خوبی اور اہمّیت کو اُجاگر کیا اور اُس کے محاسن کی نشان دہی کی۔ اِس سلسلے میں مولوی صاحب کو اوّلیّت کا شرف حاصل ہے۔ مولوی صاحب نے یہ کہیں نہیں لکھا کہ اُن کے نسخے کا متن کس نسخے پر مبنی ہے، حالاں کہ یہ سب سے ضروری بات تھی۔ اب یہ بات اعتماد اور یقین کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ مولوی صاحب نے ڈنکن فاربس کے مرتّب کیے ہوئے نسخے پر اپنے نسخے کے متن کی بنیاد رکھی ہے اور یہ بھی کہ باغ و بہار کی اشاعتِ اوّل [۱۸۰۴ء] اُن کی نظر سے نہیں گزری تھی۔ اِس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ جن مقامات پر ک اور ف میں اختلاف ہے [خواہ یہ اختلاف ک میں موجود غلطیِ طباعت کا پیدا کیا ہوا کیوں نہ ہو] وہاں بہ طورِ عموم ع کا متن ف کے مطابق ہے۔ اِس کی بعض مثالیں پیش کی جاتی ہیں:

فاربس کے نسخے [ف] کے تعارف میں "سہی سانجھ" کا حوالہ آچکا ہے کہ فاربس کے یہاں صرف "سانجھ" ہے؛ مولوی صاحب کے مرتّبہ نسخے [ع] میں بھی صرف "سانجھ" ہے ـــــ ف میں ص ۱۴۲ پر "ٹانکے مرہم لگایا" ہے، یہی ع میں ہے؛ جب کہ ک [طبعِ اوّل] میں "ٹانکے لگا کر مرہم لگایا" ہے۔ [غالباً ف کی طباعت میں

"لگاکر" چھوٹ گیا تھا' ع میں بھی وہ اُسی طرح نقل ہوا] —— پہلے درویش کی سیر میں جہاں باغ کے خریدنے کا ذکر ہے' وہاں ایک جملہ یوں ہے: "ایک باغ... تالاب' کنوئیں پختہ سمیت"۔ ف میں یہاں "کوئی سمیت" ہے اور یہی ع میں ہے —— اِسی بیان میں ک میں باغ کی قیمت "لاکھ روپے" ہے' ف میں "پانچ ہزار" ہے اور یہی ع میں ہے —— اِسی بیان میں اِس سے پہلے' جہاں لڑکے کے شربتِ ورقُ الخیال کی صراحی لانے کا ذکر ہے' وہاں ک میں ہے: "ایک صراحی ہمیشہ بلاناغہ اِسی وقت حاضر کیا کرے"۔ ف میں "بلاناغہ" موجود نہیں' ع میں بھی یہ لفظ موجود نہیں —— ہمارے نسخے میں ص ۱۲۷ پر ایک جملہ ہے: "جو کچھ سواری اور بار برداری درکار ہو"۔ ف میں "سواری اور برداری" ہے اور یہی ع میں ہے۔ ہمارے نسخے میں ص ۲۰۰ پر' پانچویں سطر میں ایک جملہ ہے: "باری داروں نے میری خبر عرض کی"۔ ک میں یہی ہے' ف میں اِس نے یہ صورت اختیار کرلی: "باری دروان نے میری خبر عرض کی"۔ چوں کہ ف میں یاے معروف و مجہول کی طباعت میں املائی امتیاز کو ملحوظ نہیں رکھا گیا ہے' اِس لیے مولوی صاحب نے یہی قیاس کیا کہ "باری دروان نے" دراصل "بارے دروان نے" ہوگا اور اُنھوں نے اپنے نسخے میں یہی لکھا: "بارے دروان نے میری خبر عرض کی"۔ پورا ٹکڑا بدل گیا —— ع میں بعض ایسے مقامات سامنے آتے ہیں جہاں اُس کا متن ف سے مختلف ہے [اور ک سے بھی] میں اِس کی تین مثالیں پیش کرنے پر اکتفا کروں گا۔ ہمارے نسخے میں ص ۱۸۲ پر ایک جملہ یوں ہے: "ایسا ازدحام تھا کہ تھالی پھینکیے تو آدمیوں کے سر پر چلی جائے"۔ ک اور ف میں یہی ہے' لیکن ع میں "... آدمیوں کے سروں چلی جائے" ہے —— اِسی صفحے پر ایک جملہ یوں ہے: "میں نے وہ خاتم اُس سے لی اور سلام کرکر رخصت ہوا"۔ ک اور ف میں یہی ہے' ع میں "تب" کا اضافہ ہے: "تب میں نے وہ خاتم ..." —— ہمارے نسخے میں ص ۲۲۶ پر پہلی سطر میں ایک جملہ ہے: "بہ خوبی و دیانت داری اور ہوشیاری سے کرے گا"۔ ف میں بھی یہ جملہ اِسی طرح' مگر ع میں

یوں ہے: "خوبی و دیانت داری اور ہوشیاری سے کرے گا" [ص ۲۰۵]۔ "یہ" سے کے حذف نے جملے کو زبانِ حال کے مطابق بنا دیا ہے۔ اِنھی مثالوں پر اکتفا کرتا ہوں۔ ضمیمہ تشریحات میں بہ ذیلِ اختلافِ نسخ ایسی جملہ تفصیلات لکھ دی گئی ہیں۔ یہاں پھر عرض کروں کہ مولوی صاحب کا مقدمہ جو ۲۶ صفحات پر مشتمل ہے، بہت کام کی چیز ہے۔ اُنھوں نے اِس کتاب کے محاسن پر مختصراً جو گفتگو کی ہے اور اجمال کے ساتھ جس طرح لسانی جائزہ لیا ہے، آج بھی وہ پڑھنے اور سرمشق کے طور پر سامنے رکھنے کی چیز ہے۔ اور ہاں، یہ اہم بات کہ باغ و بہار ہو یا نوطرزِ مرصّع، [اصطلاحی معنی میں] اِن میں سے کوئی بھی ترجمہ نہیں، تحسین نے اپنی زبان میں اور اپنے انداز سے فارسی کے قصّے کو اُردو میں لکھا اور میر امّن نے نوطرزِ مرصّع کو سامنے رکھ کر اُسی قصّے کو اپنی زبان میں اور اپنے انداز سے لکھا: اِس کی طرف سب سے پہلے مولوی صاحب نے اپنے اِسی مقدمے میں توجہ دلائی تھی۔

اِس نسخے کا دوسرا اڈیشن میرے سامنے ہے جو انجمن ترقّیِ اردو (ہند) دہلی کی طرف سے ۱۹۴۴ء میں شائع ہوا تھا۔ اِس میں فرہنگ شامل ہے، لیکن بہت مختصر ہے۔ غلط نامہ موجود نہیں۔

قصّۂ چہار درویش [فارسی]:

اب تک کی معلومات کے مطابق سب سے پہلے تحسین نے فارسی قصّے کو اُردو کا جامہ پہنایا تھا، لیکن تحسین نے اپنی کتاب میں یہ نہیں بتایا کہ فارسی کا کون سا نسخہ اُن کے سامنے تھا۔ فارسی قصّے کے نسخے اچھی خاصی تعداد میں مختلف کتاب خانوں میں محفوظ ہیں۔ مولوی عبدالحق صاحب نے باغ و بہار کے مقدمے میں ایک فارسی نسخے کی متعدد عبارتیں نقل کی ہیں، لیکن صراحتاً تو یہ نہیں لکھا کہ وہ کون سا نسخہ ہے جو اُن کے سامنے ہے، البتہ اُنھوں نے یہ ضرور لکھا ہے کہ "فارسی نسخے کے شروع میں جو منظوم حمد ہے، اُس کے مقطعے میں صفی تخلص ہے" اُنھوں نے مقطع بھی نقل کر دیا ہے۔ اِس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے سامنے صفی کا

نسخہ تھا۔ کلکتے کی ایشیاٹک سوسائٹی کے کتاب خانے میں فارسی کے قصۂ چہار درویش کا ایک خطی نسخہ محفوظ ہے، جس کے آغاز میں منظوم حمد ہے اور اُس کے مقطعے میں تحفی تخلص موجود ہے اور یہ وہی مقطع ہے جسے مولوی صاحب نے اپنے مقدمے میں نقل کیا ہے۔ اِس میں امیر خسرو والی روایت موجود نہیں۔ یہ فورٹ ولیم کالج کی کتاب ہے' اُس کی مُہر موجود ہے، کل صفحات ۲۲۶۔ خط نسخہ نستعلیق۔ ترقیمہ موجود نہیں۔ جین صاحب نے اپنی کتاب میں فارسی کے کئی مخطوطوں کا حوالہ دیا ہے [ص ۲۵۵ سے ص ۲۵۷ تک]۔ شیرانی صاحب کے پاس محمد علی کا لکھا ہوا خطی نسخہ تھا، جس کا اُنھوں نے باغ و بہار سے متعلق اُس مضمون میں ذکر کیا ہے جو سال نامۂ کارواں [لاہور] میں شائع ہوا تھا۔

جین صاحب نے اپنی کتاب اُردو کی نثری داستانیں ہیں اور اُس سے پہلے میرے نام اپنے طویل خط میں یہ لکھا تھا کہ فارسی قصۂ چہار درویش کا سب سے پرانا اور ضخیم نسخہ علی گڑھ یونی ورسٹی لائبریری کے "ذخیرۂ حبیب گنج" میں ہے۔ یہ قول اُن کے یہ ۲۴؍۱۲؍۱۲۱۱ھ ۱۲؍۶۱۷ کا مکتوبہ ہے [ایضاً ص ۲۶۵]۔ ڈاکٹر نفیس جہاں نے میر امّن پر پی۔ ایچ۔ ڈی کے لیے مقالہ لکھا تھا، جو چھپ چکا ہے [میر امّن دہلوی: حیات و تالیفات، دہلی، ۱۹۸۶ء] اُس میں اُنھوں نے لکھا ہے: "پروفیسر گیان چند جین نے مسلم یونی ورسٹی کے حبیب گنج کلکشن میں چہار درویش کے جس قدیم ترین نسخے کا ذکر کیا ہے، اُس کا اب وہاں پتا نہیں چلتا" [ص ۸۴]۔ اب سے سال بھر پہلے میں نے بہ طورِ خود اِس کو تلاش کرایا۔ میری درخواست پر جناب رئیس نعمانی نے دو بار پورے ذخیرے کو اور اُس کے رجسٹر کو کھنگالا، لیکن یہ نسخہ نہیں ملا۔ میں نے جین صاحب کو خط لکھا اور صورتِ حال سے مطلع کیا۔ اُن کا اصرار ہے کہ وہ نسخہ وہاں تھا اور یہ کہ میں نے اُس سے نوٹس لیے تھے۔

ڈاکٹر نفیس جہاں نے اپنے مقالے میں کئی نسخوں کا حوالہ دیا ہے۔ غرض کہ فارسی متن کے نسخے متعدد ہیں اور اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے ہیں، جب تک اُن سب نسخوں کو [عکس کی صورت میں] یک جا کر کے، اُن کا مفصّل مطالعہ نہ کیا جائے، اُس وقت تک

کئی باتیں وضاحت طلب رہیں گی اور صحیح طور پر کوئی فیصلہ نہیں کیا جاسکے گا۔

اصل میں یہ ایک الگ اور مستقل تحقیقی مقالے کا موضوع ہے۔ فارسی کے سب نسخوں کو جمع کیا جائے، اُن کا مطالعہ کیا جائے اور پھر داستان کے اجزا کی کمی بیشی، تقدّم و تاخّر اور ایسے ہی دوسرے اُمور پر مفصل گفتگو کی جائے ـــــ اسی طرح نوطرزِ مرصّع اور باغ و بہار کا تقابلی مطالعہ بھی اسی کا ایک جز بنایا جائے۔ اِس مکمّل، مربوط اور یک جائی مطالعے کے بعد صحیح طور پر نتائج نکالے جاسکیں گے۔ یہ بات بھی قطعیت کے ساتھ اُسی وقت کہی جاسکے گی کہ تحسین اور میر امّن، اِن دونوں کا کارنامہ صرف زبان اور محض اندازِ بیان ہے، یا اصل قصّے میں بھی اِن لوگوں نے دخل دیا ہے اور اضافے کیے ہیں، اور اگر دخل دیا ہے، تو اُس کی نوعیت کیا ہے، اُس کی مکمّل طور پر تفصیل اُسی وقت مرتّب کی جاسکے گی۔ ایسے مطالعے کے بغیر کوئی رائے ظاہر کرنا مناسب نہیں۔ ویسے بھی باغ و بہار کے متن کی تدوین کا اِس مطالعے سے براہِ راست تعلّق نہیں، یوں بھی اِس تحریر میں اِس موضوع کو چھیڑنا مناسب نہیں۔ اِس سے طریقِ کار کی بھی خلاف ورزی ہوگی اور وہ کام بھی ناقص اور نامکمل رہے گا۔ کوئی بات ڈھنگ کی اور قرینے کی نہیں کہی جاسکے گی۔ صرف گمان اور محض قیاس کے دائرے میں گردش کرنا اور ہوا میں گرہ لگانا کوئی معقول کام نہیں۔

جین صاحب نے اپنی محوّلۂ بالا کتاب میں لکھا ہے: "لیکن نوطرزِ مرصّع، میر امّن کا واحد ماخذ نہیں، اُنھوں نے کسی فارسی نسخے سے بھی یقیناً استفادہ کیا ہے، کیوں کہ بعض مقامات پر وہ نوطرزِ مرصّع سے کافی ہٹ جاتے ہیں" [ص ۲۷۰]۔ ڈاکٹر نفیس جہاں نے اپنے مقالے میں تفصیل کے ساتھ نوطرزِ مرصّع اور باغ و بہار کے اختلافات کو درج کیا ہے [ص ۹۲ سے ص ۱۱۴ تک]۔ اِن سے یہ تو ثابت ہوجاتا ہے کہ بہت سے مقامات پر اِن دونوں کتابوں میں مکمّل مطابقت نہیں، مگر یہ نہیں معلوم ہوتا کہ ایسے سب مقامات پر میر امّن نے کسی فارسی نسخے کی پیروی کی ہے یا بعض مقامات پر خود بھی دخل دیا ہے۔ ایسی سب باتوں کا قطعی طور پر فیصلہ اُسی وقت

ہوسکے گا جب فارسی کے نسخوں کا تقابلی مطالعہ کیا جائے اور پھر نوطرزِ مرصّع اور باغ و بہار سے اُن کا تقابل کیا جائے۔ فارسی قصۂ چہار درویش کے ایک موخّر مطبوعہ نسخے کا اِس سے پہلے "امیر خسرو سے منسوب روایت" کے ذیل میں ذکر آچکا ہے۔

قصّے کے مآخذ اور بعض دیگر متعلّقات:

ہفتے وار ہماری زبان [دہلی] کے شمارۂ ۲۲ نومبر ۱۹۸۳ء میں گیان چند جین صاحب کا ایک مضمون شائع ہوا تھا، اُس میں اُنھوں نے لکھا تھا: "میرے ایک شاگرد رحمت یوسف زئی نے ... مجھے بتایا کہ چار درویش کے پہلے درویش کی سیر داستانِ چہل وزیر کی ایک کہانی سے ماخوذ ہے۔ میں نے کتاب لے کر دیکھی اور اُسے درست پایا۔" اپنی کتاب اُردو کی نثری داستانیں میں اُنھوں نے داستانِ چہل وزیر کا تعارف کرایا ہے اور ضروری تفصیل بھی لکھی ہے۔

اِس قصّے کے بیش تر اجزا دوسری داستانوں میں مل جاتے ہیں۔ جین صاحب نے ایسے مآخذ کی نشان دہی کی ہے۔ میں نہایت درجہ اختصار کے ساتھ اُنھی کے مندرجات کو یہاں پیش کیے دیتا ہوں، تفصیل کے لیے اُن کی کتاب کو دیکھنا چاہیے:

ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ چار درویش کا کوئی نسخہ [مراد ہے فارسی قصۂ چہار درویش سے] بارھویں صدی ہجری سے، یعنی اٹھارویں صدی عیسوی سے پہلے کا نہیں ملتا۔ قصّے کی تصنیف اِس سے کچھ ہی پہلے ہوئی ہو گی۔ ہمیں پہلے اور چوتھے درویشوں کی سرگذشت کا صحیح مآخذ معلوم ہے۔ بقیہ کے مماثلات کہیں کہیں ملتے ہیں۔

پہلے درویش کی سیر: یہ حکایت تمام وکمال داستانِ چہل وزیر میں ملکہ کی اٹھارویں داستان سے لی گئی ہے۔ دوسرے درویش کی سیر: شہزادیِ بصرہ کی سرگذشت کا نقشِ اوّل کتھا کوش میں مدن منجری کی کہانی ہے۔ جوگی اور کنکھجورے کے علاج کا واقعہ بالکل اِسی طرح حکیم جالینوس اور اُس کے شاگرد بقراط کے بارے میں پڑھنے میں آیا ہے۔ خواجہ سگ پرست کے بے وفا بھائیوں کی روایت کی ابتدا الف لیلہ کی دو کہانیوں میں

ملتی ہے۔" دو کتوں والے شیخ" میں دونوں بھائی شیخ کو اسی طرح دغا دیتے ہیں ——
"آذربائیجانی جوان کی واردات سند باد جہازی کے چوتھے سفر کی یاد دلاتی ہے تیسرے
درویش کی سیر میں وارد غہ بہزاد والا واقعہ الف لیلہ کی قمرالزماں کی داستان سے
ماخوذ ہے۔ چوتھے درویش کی سیر تمام و کمال الف لیلہ کی کہانی" شہزادہ زین الاصنام
اور شاہ جنات" ہے، صرف انجام مختلف ہے۔

تحسین نے نوطرزِ مرصع کے دیباچے میں لکھا ہے کہ یہ داستان اُن کے ایک
ساتھی نے سنائی تھی۔ تحسین نے پہلے اِس قصّے کو فارسی میں لکھا تھا اور پھر اپنے آقا
کی فرمائش پر اُسے اُردو میں لکھا۔ یہ اور ایسے ہی بعض دوسرے اندراجات سے یہ واضح
طور پر معلوم ہوتا ہے کہ یہ قصہ مقبول رہا ہے۔ ایسی کہانیاں اور داستانیں جو مقبول ہوتی
ہیں، سنائی جاتی رہتی ہیں اور لکھنے میں بھی آتی رہتی ہیں؛ اُن میں الفاظ، بیانات
اور ترتیب میں اختلافات پیدا ہو جانا قدرتی بات ہے۔ فارسی کے مختلف نسخوں میں
جو باہم اختلافات ہیں [یعنی جو اب تک سامنے آئے ہیں، اور وہ بھی جو اب تک
سامنے نہیں آسکے ہیں] وہ اِسی کی ترجمانی کرتے ہیں۔ یوں بھی یہ ضروری ہے کہ فارسی
کے جس قدر نسخے اب تک علم میں آسکے ہیں، اُن کو یک جا کر کے، تقابلی مطالعہ کیا جائے
اور پھر اُردو کے نسخوں سے اُن کا مقابلہ کیا جائے، تب صحیح صورتِ حال سامنے آسکے گی۔

ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی نے نوطرزِ مرصع کے مقدمے میں ص ۴۸ پر یہ لکھا ہے کہ
تحسین نے محمد علی والے فارسی نسخے کو سامنے رکھا ہے [جس کا تعارف شیرانی صاحب
نے اپنے مذکورہ مقالے میں کرایا تھا اور مثالیں بھی پیش کی تھیں] مگر اُن کا یہ قول
بہ طورِ خود اِس نسخے کے مطالعے پر مبنی نہیں، انھوں نے شیرانی صاحب کے پیش کیے
ہوئے اقتباسات پر اپنے خیال کی بنیاد رکھی ہے۔ جب تک کوئی شخص محمد علی والے
فارسی نسخے کو مکمل طور پر نہ پڑھے اور نوطرزِ مرصع سے اُس کا مکمل طور پر تقابل نہ کرے،

اور ساتھ ہی ساتھ دوسرے فارسی نسخے بھی اُس کے سامنے ضرور ہوں؛ تب تک اِس سلسلے میں قطعیت کے ساتھ کچھ کہنا تقاضائے احتیاط کے خلاف ہے۔

محمد علی کے فارسی نسخے کا تعارف پہلی بار شیرانی صاحب نے اپنے مذکورہ مضمون میں کرایا تھا۔ اُنھوں نے اُس نسخے کو خود پڑھا تھا۔ اُس کی بعض عبارتیں بھی نقل کی تھیں۔ اُنھوں نے محمد علی کی وہ فارسی عبارت بھی نقل کی تھی جس میں اُس نے لکھا ہے کہ:

"روزے ایں غلامِ مستہام در محفلِ اقدس ..... بہ تقریبے حکایتے از دل ریشان درویشاں و سرگذشتے از سرگذشتگانِ قلندران بہ زبانِ ہندی بعرضِ عرضِ ہمایوں رسانید ..... بہ ایں کمینہ ... فرمان صادر شد کہ آں را از عبارتِ ہندی بہ زبانِ فارسی ترجمہ نماید۔ بناءً علی ہذا ..... آں حکایت را بالسطر بہ زبانِ عجمی نقل نمود۔"

اِس عبارت سے بعض حضرات نے یہ مطلب اخذ کیا کہ محمد علی کے سامنے ہندی زبان میں لکھی ہوئی یہ داستان تھی، اُس کا اُس نے بہ موجبِ فرمائش اُردو میں ترجمہ کیا۔ ڈاکٹر نفیس جہاں نے اپنے محوّلۂ بالا تحقیقی مقالے میں لکھا ہے: "محمد علی کا یہ بیان بھی محلِ نظر ہے کہ میں نے سطر بہ سطر اِس قصّے کو ہندی سے فارسی میں منتقل کیا" [ص ۷۹]۔ اُنھوں نے دراصل اپنے اِس بیان کی بنیاد مقدّمۂ باغ و بہار میں مندرج ممتاز حسین صاحب کے اِس قول پر رکھی ہے:

"اول تو وہ [محمد علی] یہ نہیں بتاتا کہ اُس نے کس ہندی سے ترجمہ کیا، برج سے، راجستھانی سے، اودھی سے، یا کھڑی سے ..... اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ یہ قصہ ... ہندی میں رائج تھا، تو پھر دیکھنا پڑے گا کہ ...."۔

[مقالہ نگار نے ممتاز صاحب کی یہ عبارت نقل کر دی ہے]۔

ڈاکٹر سہیل بخاری اِس سے بھی کئی قدم آگے بڑھ گئے ہیں، اُنھوں نے اِس سلسلے میں لکھا ہے: "خود محمد علی کا بیان ہے کہ اُس نے یہ قصہ کسی اُردو نسخے سے فارسی میں ترجمہ

کیا ہے" [اُردو داستان۔ تحقیقی و تنقیدی مطالعہ، ص ۱۱۹]۔

یہ کہنا کہ محمد علی نے خود یہ لکھا ہے کہ اُس نے "اُردو نسخے سے فارسی میں ترجمہ کیا ہے" اُس مرحوم پر اتہام لگانا ہے۔ اُس نے یہ بات ہرگز نہیں لکھی۔ دوسرے یہ کہ "بہ زبانِ ہندی" کا مطلب وہ نہیں جو ممتاز صاحب نے سمجھا ہے۔ اُس زمانے کی کتابوں میں اور شاعری میں "ہندی" سے ریختہ مراد لیا جاتا تھا جس کا دوسرا نام اُردو ہے۔ میر کے عہد تک اِس کی مثالیں خاصی اچھی تعداد میں ملتی ہیں۔ میں میر کے ایک شعر اور ایک نثری حوالے پر اکتفا کرتا ہوں :

کیا جانوں لوگ کہتے ہیں کس کو سرورِ قلب — آیا نہیں یہ لفظ تو ہندی زبان کے بیچ

(کلیاتِ میر، مرتبہ آسی، ص ۴۷۶)

صاف طور پر "ہندی زبان" سے اُردو زبان مراد ہے [جس میں "سرورِ قلب" کا لفظ آتا ہے اور میر اسی "ہندی زبان" کو جانتے ہیں]۔

زرّیں نے اپنے ترجمۂ چہار درویش کے آغاز میں لکھا ہے :

"ایک روز فرمایا اگر کلام زبانِ ہندی میں انتظام پائے، سامع کو بہ سہولت سرور آئے۔ یہ خوشنودی آقا کو بہبودی دنیا و عقبیٰ جان کر سرمو رشتۂ ادب کو ہاتھ سے نہ دیا اور زبان اُردو میں قلم بند کیا۔"

خط کشیدہ ٹکڑے اِس پر گواہ ہیں کہ "ہندی" سے "اُردو" مراد ہے [میرے سامنے زرّیں کی اِس کتاب کا جو نسخہ ہے، اُس کا تعارف اِس سے پہلے کرایا جا چکا ہے۔ ہاں سرورق پر کتاب کا نام "نوطرزِ مرصع" مرقوم ہے]۔

دوسری بات یہ کہ محمد علی کی فارسی عبارت سے یہ مطلب لازماً نہیں نکلتا کہ اُس نے جو حکایت سُنائی تھی، وہ کاغذ پر لکھی ہوئی تھی۔ جب تک اِس کے خلاف کوئی قرینہ نہ پیش کیا جائے، اُس کی عبارت کا مطلب یہی لیا جائے گا کہ اُس نے درویشوں کی ایک داستان سُنائی تھی اور اُسی طرح سُنائی تھی جس طرح حکایتیں یا داستانیں سُنائی جاتی تھیں، یعنی زبانی ـــــ بادشاہ نے اِس قصّے کو پسند کیا اور فرمایش کی کہ اِسے

فارسی میں لکھو۔ اس نے حکم کی تعمیل کی اور اُردو میں سنائے ہوئے قصّے کو فارسی میں لکھا۔

نظرِ ثانی :

ہندی مینول اور پیرس مخطوطہ نسخے (ن) کی دست یابی نے یہ تو قطعی طور پر ثابت کر دیا ہے کہ باغ و بہار کی پہلی روایت پر نظرِ ثانی کی گئی تھی۔ ہندی مینول کے تعارف کے ذیل میں جو مثالیں نقل کی گئی ہیں، وہ اِس کا واضح ثبوت ہیں، مگر اِس سلسلے میں ہمیں یہ نہیں معلوم کہ نظرِ ثانی کا فیصلہ میر امّن نے بہ طورِ خود کیا تھا یا اِس میں کسی دوسرے شخص کی فرمائش کو بھی دخل تھا۔ یہ بھی واضح طور پر نہیں معلوم کہ نظرِ ثانی کے کام کو میر امّن نے تنہا انجام دیا تھا یا کسی دوسرے شخص [یا اشخاص] کے مشورے بھی شامل رہے تھے۔ افسوس کی جو عبارت نقل کی گئی ہے، اُس سے یہ تو معلوم ہوتا ہے کہ افسوس نے باغ و بہار کے متن کو شروع سے آخر تک دیکھا تھا۔ ظاہر ہے کہ پہلی روایت کی تکمیل کے بعد ہی یہ ممکن تھا کہ وہ اِس کتاب کے متن کو پڑھ سکتے۔ اِس کا مطلب دوسرے لفظوں میں یہ بھی ہے کہ پہلی روایت کے متن کے سلسلے میں افسوس نے کچھ نہ کچھ درستی کا کام ضرور کیا تھا [وہ چند جملے سہی]۔ اِس کا بھی اچھا خاصا امکان ہے کہ مصنّف کو کچھ مشورے بھی دیے ہوں۔

پہلی روایت [ہندی مینول اور مخطوطہ نسخہ] اور عہدِ مصنّف کی دوسری اور آخری روایت [طبعِ اوّل ۱۸۰۴ء] میں متن کے جو اختلافات ہیں، اُن کو اگر یک جا کر لیا جائے اور پھر مطالعہ کیا جائے تو صاف صاف معلوم ہوتا ہے کہ جملوں کو ساخت کے لحاظ سے بہتر بنایا گیا ہے، جس سے چستی اور روانی بڑھ گئی ہے۔ کہیں کہیں قافیہ بندی کا حُسن بھی نمایاں کیا گیا ہے [جو میر امّن کی تحریر کا ایک خاص وصف ہے] اور کہیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی غلطی کی، یا یوں کہیے کہ کسی غیر مناسب بیان کی تصحیح کی گئی ہے۔ میں یہاں دس گیارہ مثالیں پیش کرتا ہوں، جن سے نظرِ ثانی کی کیفیت اور نوعیت کا بہ خوبی اندازہ کیا جا سکے گا۔ چوں کہ ضمیمۂ تشریحات میں اختلافِ نسخ کو شامل

کر لیا گیا ہے، اس لیے جملہ تبدیلیوں کا احوال اُس سے بہ خوبی معلوم کیا جا سکتا ہے۔

ص ۱۹ پر چودھویں سطر میں ایک جملہ ہے: "نوبت خانے میں شادیانے بجنے لگے"؛ مگر پہلے اس کو اس طرح لکھا گیا تھا: "نوبت خانے میں شادیانے کے ٹکورے بجنے لگے" [م۔ ن] ——— اسی صفحے پر سترھویں سطر میں ہے: "اندرونِ محل داخل ہوئے"؛ مگر پہلے اس کی شکل یہ تھی: "اندرون محل کے داخل ہوئے" [م۔ ن]۔ دونوں جملوں کو اصلاحوں نے چست بنا دیا ہے ——— ص ۱۹۰ پر چوتھی سطر میں ایک جملہ ہے: "پرنالے کی راہ سے نکلنا ہے تو نکل"؛ لیکن اس کی پہلی شکل یہ تھی: "پانی کے پرنالے کی راہ سے ......" [ن]۔ "پانی کے" زائد ٹکڑا تھا؛ اُس کے حذف نے جملے کو بہتر بنا دیا ——— اسی صفحے پر چھٹی سطر میں اسی پرنالے کے سلسلے میں ہے: "لوہے کی مینخیں اور سیخیں ... جمع کر کے لے آؤ تو اُس کو کشادہ کر دوں"۔ "تو اُس کو کشادہ کروں" یہ ٹکڑا ن میں نہیں؛ یعنی نظرِ ثانی کے وقت اس کا اضافہ کیا گیا ہے اور اس سے معنویت میں اضافہ ہوا ہے۔

ص ۱۸۹ پر تیرھویں سطر میں ایک جملہ یوں ہے: "ایسا درد سے تڑپنے لگا کہ ایک آن کی آن میں مر گیا"؛ مگر پہلے اس کو اس طرح لکھا گیا تھا: "ایسا درد سے بے قرار ہوا کہ ......" [ن]۔ ظاہر ہے کہ پورے ٹکڑے کو بدلا گیا ہے اور یہ واقعہ ہے کہ معنویت کے لحاظ سے یہ اصلاح بہت عمدہ ہے ——— ص ۵۹، سطر ۱: "ملتی نہیں کرم کی ریکھا۔ اِن آنکھوں کے سبب یہ کچھ دیکھا"؛ لیکن پہلی روایت [م۔ ن] میں یہ اس طرح تھا: "کرم کی ریکھا مٹتی نہیں۔ اِن آنکھوں کے سبب یہ کچھ دیکھا"۔ اصلاح نے قافیہ بندی کا حُسن پیدا کر دیا ——— ص ۲۱۴، س ۱۲: "قلعے میں بیٹھے آرام کیا کرو"؛ مگر یہ اصلاحی شکل ہے، پہلے اس کی صورت یہ تھی: "قلعے میں بیٹھے گوز مارا کرو" [ن] ——— ص ۱۰۸، س ۷: "ایک قلفی چینی کی معجون بھری ہوئی دی کہ ... بلاناغہ نہار نوشِ جان فرمایا کرو"۔ پہلے اسے یوں لکھا گیا تھا: "... بلاناغہ نگل جایا کرو" [ن]۔ "معجون" کے لیے "نگل جانا" قطعی طور پر غیر مناسب تھا، اُسے بدلا گیا۔

"سِراندیپ کی شہزادی کے قصّے میں ہے: "میں نے اپنے اوپر لازم کیا کہ آن اور جل اُس کو پہنچایا کروں" [ص ۱۵۰] ۔ پہلے "کھانا اور جل" تھا [ن] ۔ نظرِ ثانی میں "جل" کی رعایت سے "آن" لایا گیا اور یہ "کھانا" سے کہیں بہتر ہے ——

"نہیں تو آج رات کو تو سَتّیا ناس ہو گا" [ص ۱۷۱] ۔ ن میں یوں ہے: "نہیں تو ...... سنگسار ہو گا"۔ یہ قول مندر کی بڑی پجارن کا ہے۔ ظاہر ہے کہ "سنگسار" اُس کی زبان سے قطعاً غیر مناسب تھا، اُسے بدلا گیا ہے۔

ص ۱۸۱ پر ایک جملہ ہے: "اور اُتنا ہی کھود کر، چھان پھٹک کر تو بڑے میں ڈالا"۔ کے ستن میں "اتنا ہی" کے بجائے "دِتنا ہی" چھپا ہے، مگر غلط نامے میں اس کی تصحیح کی گئی ہے اور "اتنا ہی" کو صحیح لکھا گیا ہے؛ لیکن ن میں "دِتنا ہی" ہے۔ اِس کا صاف طور پر مطلب یہ ہے کہ میر امّن نے پہلے "وِتنا ہی" لکھا تھا۔ ص ۹۶، س ۱۷: "جتنی خرچ کرو، اس میں اُتنی ہی برکت ہوتی ہے"۔ مگر ن میں "وِتنی ہی" ہے۔ یہاں بھی اصلاح کی وہی صورت ہے —— "وِتنا" اور "وِتنی" کے سلسلے میں ایک خیال میرے ذہن میں یہ آتا ہے کہ شاید یہ افسوس کی اصلاح ہو۔ اِس خیال کی وجہ یہ ہے کہ گنجِ خوبی میں کئی جگہ "وِتنا" ملتا ہے، مثلاً: "جتنا خزانہ سالِ گذشتہ میں لایا تھا، وِتنا نہ لایا" [مخطوطۂ گنجِ خوبی، ص ۴۴۳، نسخۂ مطبوعہ، دہلی یونی ورسٹی اڈیشن ص ۳۱۶] ۔ میر امّن نے واو کے نیچے زیر بھی لگایا ہے۔

"ہمّت بلند رکھ کہ تو را اور خلق پاس
ہمّت ہو جتنی، وِتنا ترا اعتبار ہو" [مخطوطۂ گنجِ خوبی ص ۳۱۔ نسخۂ مطبوعہ ص ۳۵]

یہاں بھی میر امّن نے اپنے قلم سے واو کے نیچے زیر لگایا ہے۔ اِس کا صاف طور پر مطلب یہ ہے کہ "وِتنا" اور "وِتنی" میر امّن کی زبان پر تھا اور اُنھوں نے [اپنی] بول چال کے مطابق اُسے لکھا بھی ہے۔ گنجِ خوبی، فورٹ ولیم کالج میں گل کرسٹ کے زمانے میں چھپی نہیں تھی، اُس کے خطّی نسخے میں یہ لفظ باقی رہ گئے۔ باغ و بہار میں بھی اِن لفظوں کو لکھا تھا؛ لیکن یہ کتاب چوں کہ گل کرسٹ کی نگرانی میں چھپی اور اُسی کے حکم کے مطابق

افسوس نے بھی اِس کے متن کو بہ نظرِ اصلاح دیکھا تھا، اِس لیے اِس کے متن میں یہ لفظ محفوظ نہیں رہ سکے۔ ایک جگہ غلطی سے شاملِ متن ہوگیا، تو غلط نامے میں اُس کی تصحیح کردی گئی۔

نظرِ ثانی میں پوری عبارت بھی بدل گئی ہے۔ ہندی مینوں کے تعارف میں اِس کی مثال موجود ہے، اُسے دیکھا جاسکتا ہے۔ اِن اصلاحوں کا مطالعہ دل چسپی کی چیز ہے اور اِس سے اُس اہتمام کا بھی بہ خوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے جو گل کرسٹ کے ملحوظِ خاطر رہتا تھا۔

باغ و بہار کی نثر — اہمیت اور اجزائے ترکیبی :

سب سے پہلے یہ ضروری بات پیشِ نظر رہنا چاہیے کہ میر امّن کی حیثیت قصہ گو یا داستان نگار کی نہیں۔ واقعات ہوں یا کردار، یہ سب اُن کو اسی طرح ملے تھے۔ اگر دسترخوان پر طرح طرح کے کھانے رکھے گئے ہیں، یا بہ قولِ شیرانی: "مصنّف کی جغرافیائی معلومات، جیسا کہ افسانوں کا دستور ہے، ناقص ہے"، یا ایسی ہی کچھ اور باتیں، تو یہ سب بھی اُن کی "تصنیف" نہیں۔ اُنھوں نے اصل قصّے کو، جسے پہلے اردو ہی میں مرصّع زبان میں لکھا جاچکا تھا، اپنی زبان میں لکھا ہے اور اصل حیثیت اُس زبان اور اُس اندازِ بیان کی ہے۔ تحسین کی نوطرزِ مرصّع اُن کا اصل ماخذ ہے؛ اُس کو سامنے رکھیے تو معلوم ہوگا کہ ہر کردار تحسین کی زبان میں باتیں کر رہا ہے۔ باغ و بہار میں ہر کردار اپنی زبان میں باتیں کرتا ہے۔

ہاں یہ ضرور ہے کہ بہت سے مقامات پر میر امّن نے منظر نگاری یا تصویر کشی کے ذیل میں کچھ جزئیات کا اضافہ کیا ہے اور دونوں کتابوں کے ایسے مقامات کو آمنے سامنے رکھ کر دیکھا جائے تو صاف صاف معلوم ہوگا کہ میر امّن کے اضافوں نے اُس منظر کو جان دار اور بھرپور بنا دیا ہے۔ زیادہ تفصیل کی گنجائش نہیں، میں صرف ایک مکالمے کو بہ طورِ مثال پیش کرتا ہوں، صورتِ حال کا اسی سے بہ خوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

تیسرے درویش کی سیر میں ایک مقام پر کٹنیاں، شہزادی کو ڈھونڈتی پھر رہی ہیں۔ ایک کٹنی اس گھر میں آجاتی ہے جہاں شہزادی موجود ہے۔ نوطرزِ مرصع میں کٹنی، شہزادی سے کہتی ہے: "اے صاحب زادی! میں ایک دخترِ عاجزہ، حاملہ رکھتی ہوں کہ دردِ زہ میں گرفتار ہے اور بے اختیار زبان دکباب چاہتی ہے" [مرتبۂ نورالحسن ہاشمی، طبع اوّل، ص ۲۲۴] - اب میر امّن کا بیان دیکھیے:

"میں غریب رنڈیا، فقیرنی ہوں؛ ایک بیٹی میری ہے کہ وہ دو جی سے پورے دنوں، دردِ زہ میں مرتی ہے اور مجھ کو اتنی وسعت نہیں کہ آدھی کا تیل چراغ میں جلاؤں، کھانے پینے کو تو کہاں سے لاؤں! اگر مر گئی، تو گور و کفن کیوں کر کروں گی! اور جَنی، تو دائی جنائی کو کیا دوں گی! اور جاگر ستھواڑا، اچھوانی کہاں سے پلاؤں گی! آج دو دن ہوئے ہیں کہ جُھوکی پیاسی پڑی ہے" [ص ۲۱۱]-

دونوں کے بیانات میں اندھیرے اُجالے کا فرق ہے۔ میر امّن نے جن جزئیات کا اضافہ کیا ہے، اُن سے مکالمے میں جان پڑ گئی ہے اور پورا منظر متحرک محسوس ہونے لگتا ہے۔ یہی میر امّن کا کمال ہے۔ بہ قولِ مولوی عبدالحق: "لفظ کو اُس کے صحیح مفہوم میں، ٹھیک موقع پر استعمال کرنا اصل انشا پردازی ہے اور اِس میں میر امّن کو بڑا کمال حاصل ہے" [مقدمۂ باغ و بہار] -

میر امّن کی با محاورہ اور روزمرّہ سے آراستہ نثر کا ایک بہت بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اُردو نثر کا یہ نیا اسلوب، فارسی کی اُس طاقتور نثری روایت کے دباؤ سے ذہنوں کو آزاد کرانے کا نقطۂ آغاز بنا، جس نے ہندستان کے اہلِ علم کو جس طرح اپنا گرویدہ، بل کہ یوں کہیے کہ اسیر بنا رکھا تھا۔ ابوالفضل، ظہوری، طغرا اور نعمت خان عالی جیسے مشکل پسندوں کی نثر کو مثال اور معیار کی حیثیت حاصل تھی۔ یہ نثر جو بیان کی پیچیدگی میں اپنی مثال آپ تھی اور جس میں لفظی و معنوی صنعتوں کا بہت زیادہ عمل دخل تھا، اِس نثر کے اثرات چھائے ہوئے تھے۔ نوطرزِ مرصع کو اُردو میں اِسی روایت کا پہلا [ہلکا سا اور کچھ بگڑا

ہوا سا] نقش کہنا چاہیے۔ ایسے حالات میں معمولی یا اوسط درجے کی صلاحیت رکھنے والا کوئی شخص ایسے نئے اسلوب کا ڈول نہیں ڈال سکتا تھا جو فارسی کی اُس طاقتور روایت کے اثر اور دباؤ کو کم کر سکے اور اِس کے ساتھ ہی اُس مرصّع روایت کے مقابلے میں ایک سادہ و صاف [لیکن پُر کار] روایت کو اِس طرح پیش کر سکے کہ اب اُس کو مثال اور معیار کی حیثیت حاصل ہو جائے ــــــــ میر امّن کی نثر نے یہی کام کیا ہے۔ باغ و بہار نے اُردو میں نثر نگاری کے اُس اسلوب کی تشکیل کی، جس نے آگے چل کر منفرد علمی حیثیت حاصل کی۔ میر امّن کی اصل حیثیت ایک ایسے صاحبِ طرز نثر نگار کی ہے جس نے اُردو میں سادہ و پُر کار پیرایۂ اظہار کا نقش درست کیا، روزمرہ اور محاورۂ اہلِ زبان کی اہمیت کو صحیح معنی میں پہلی بار روشن کیا اور جس چیز کو چلن کہتے ہیں، لغت اور قواعد کے مقابلے میں اُس کی افضلیت اور برتری کا اظہار اور اعلان کیا۔

پروفیسر احتشام حسین کے الفاظ ہیں: "ادبی نثر کی ترقّی کے لیے جس طرح کا ماحول ہونا چاہیے تھا، وہ آہستہ آہستہ ہندستان میں پیدا ہو رہا تھا۔ اٹھارویں صدی کا خاتمہ ہوتے ہوتے تاریخ نے ایک اور کروٹ بدلی تھی اور زندگی نئے حدود کی طرف بڑھ رہی تھی" [اُردو ادب کی تنقیدی تاریخ، ص ۱۲۸] ۔ ادب، خاص کر نثر میں "نئے حدود کی طرف" بڑھنے کے لیے فورٹ ولیم کالج نے راستہ بنایا تھا۔ اِس ادارے میں پہلی بار اِس زبان کی وسعت سامنے آئی۔ کالج میں اچھے اچھے مصنّفین کو گل کرسٹ نے یک جا کر دیا تھا، یہ اُس کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔ اُن مصنّفین میں شیر علی افسوس اور بہادر علی حسینی جیسے کئی لوگ شامل تھے، جو علم میں شاید میر امّن پر فضیلت رکھتے ہوں، لیکن یہ واقعہ ہے کہ نثر نگاری میں اُن میں سے کوئی ایک بھی میر امّن کے برابر کا نہیں۔ اُن سب نے [گل کرسٹ کی فرمائش اور ہدایت کے مطابق] سادہ و صاف نثر لکھی ہے، مگر اُس نثر میں دلوں کو چھو لینے اور ذہنوں کو متاثر کرنے کی ویسی صلاحیت نہیں۔

سادہ و صاف نثر لکھنا بجائے خود کوئی بڑی بات نہیں۔ جس زمانے میں میر امّن نے کلکتے میں باغ و بہار لکھی ہے، اُسی زمانے میں، یعنی اُنھی دنوں شمالی ہندستان میں ایک دوسرے مصنّف زرّیں نے بھی قصّۂ چہار درویش کا اُردو میں ترجمہ کیا تھا۔ اِس ترجمے کی زبان آسان ہے، سادہ و صاف ہے؛ لیکن اُبالی کھچڑی کی طرح بے مزہ بھی ہے۔ میر امّن کی نثر میں جو حُسن، طاقت اور چھا جانے والی کیفیت ہے، اُس میں اُن کے زمانے کا کوئی شخص اُن کا شریک نظر نہیں آتا۔ یہی وجہ ہے کہ باغ و بہار کو جدید اُردو نثر کا پہلا صحیفہ کہا گیا ہے۔ اِس کتاب نے ایک نئے طاقتور اسلوب کی بنیاد ڈالی، جو معیار ساز ثابت ہوا۔ باقی سب کی نثریں خوب ہیں، مشکل پسندی سے محفوظ ہیں، آسان ہیں؛ مگر اُن میں وہ طاقت نہیں کہ ایک نئے اُسلوب کی تشکیل ہو سکے اور ایک نئے پیرایۂ اظہار کے خطّ و خال روشن ہو سکیں۔ نئی روایت کی تشکیل ہر شخص کے بس کی بات نہیں ہوتی۔ کالج کے کسی اور مصنّف میں یہ جُرات اور ہمّت نظر نہیں آتی جو [اُس زمانے میں جب فارسی زبان، قواعد اور لُغت کی حکم رانی کا دور تھا] قواعد اور لُغت پر استعمالِ عام کو ترجیح دے سکے اور اُس کو اپنے اوپر اتنا اعتماد ہو کہ : مستند ہے میرا فرمایا ہوا۔ افسوس ہوں، حسینی ہوں یا دوسرے لوگ؛ ساری کوشش اور کاوش کے باوجود اُن کے یہاں "کتابی زبان" کے اثرات کارفرما رہتے ہیں۔

تکرارِ الفاظ

جن عناصر نے باغ و بہار کی نثر کو حُسن بخشا ہے اور ساتھ ہی ساتھ اُسے بول چال کی زبان سے قریب تر کر دیا ہے، اُن میں سے چند اہم اجزا کی، اختصار کے ساتھ، نشان دہی کی جاتی ہے۔ (۱) تکرارِ الفاظ اُن کے اندازِ بیان کی ایک اہم خصوصیت ہے۔ اِس خصوصیت نے کئی شکلوں میں اپنے آپ کو نمایاں کیا ہے۔ کبھی تو وہ تابع مہمل کی پیوندکاری کرتے ہیں؛ اور اِس سے اُردو میں اور بول چال، دونوں کا رنگ چمک اُٹھتا ہے۔

کچھ مثالوں سے اِس کا اندازہ ہوگا [یہ وضاحت کر دی جائے کہ یہاں استقصا منظور نہیں، اِس لیے ایسے ہر بیان کے ذیل میں زیادہ مثالیں پیش نہیں کی گئیں]

مثلاً: موٹے جھوٹے کپڑے (ص۱۸) تب لوٹ پوٹ رہیں گے (ص۲۰) کچھ پیسے پاس رہے تھے (ص۲۷) دھو دھا کر صاف کیا (ص۱۸) لوگ طعنہ مہنا دیتے ہیں (ص۲۴) دولتِ دنیا کھو کھا کر (ص۲۴) ہاتھ منہ دھو دھا کر۔ ڈھونڈھ ڈھانڈھ کر پکڑ لاوے (ص۶۹) کپڑے ویڑے پھینک پھانک دیے (ص۶۵) ننگا منگا فقیر بن کر (ص۶۵) بھون بھان کر کھا لیتے (ص۶۴) بغیر پوچھے گچھے (ص۳۱) ورثہ بانٹ چونٹ نہیں لیتا (ص۱۳۶) سب چھوڑ چھاڑ کر (ص۱۱) لڑھکتا پڑتا پہاڑ سے نیچے آیا (ص۱۴۸) منا منو کر (ص۹۵)۔

(۲) اِسی انداز کی ایک دوسری شکل یہ ہے کہ کبھی مرادف اور کبھی قریب المفہوم لفظوں کو ایک ساتھ لاتے ہیں، اِس سے بھی گفتگو کا انداز نمایاں رہتا ہے، مثلاً: آدمیوں کی ساتھ سنگت سے (ص۹) ایک بیٹا جیتا جاگتا مجھے دے (ص۱۱) سپاہ گری کا کسب و فن (ص۲۱) قرض دام سے کام چلے (ص۲۹) تلاش میں ناو نواڑے کی (ص۶۴) اُس کے لاڈ پیار کا کیا ٹھکانا (ص۲۱) سر پر بوڑھا بڑا نہ رہا (ص۲۱) راہ باٹ میں اگر بھینٹ ملاقات ہو جاتی (ص۲۳) رعیت پرجا مگن ہوئے (ص۱۵) اُس نے دو ایک خط خطوط جو لکھے (ص۲۳) مجھے حقے بحرے سے کیا کام ہے (ص۱۳۵) راہی مسافر، جنگل میدان میں سونا اُچھالتے چلے جاتے (ص۱) گھاٹ باٹ اِس دریا کا (ص۶۸)۔

(۳) کبھی وہ جملے میں ایک لفظ کو مکرر لاتے ہیں اور اِس تکرار سے بھی وہی فائدہ حاصل ہوتا ہے، جیسے: ابھی سے پڑے پڑے رہنا خوب نہیں (ص۲۰) جنس ملک ملک کی گھر میں موجود تھی (ص۲۰) قلیے، کباب، تحفہ تحفہ، مزے دار (ص۲۳) ہزار ہزار شکر بجا لایا (ص۲۳)۔

(۴) اِسی انداز کی ایک شکل وہ ہے جس میں وہ متضاد لفظ ایک ساتھ لاتے ہیں، جیسے: تمام آدمی چھوٹے بڑے، لڑکے بوڑھے، غریب غنی شہر کے باہر چلے (ص۷۴) راجا پرجا قدیم سے رہتے تھے (ص۷) جہلم میں اپنے بیگانے، چھوٹے بڑے جمع ہوئے (ص۲۱) جتنے آدمی وہاں کے ہزاری اور بزاری نظر پڑے (ص۹۷)۔

(۵) اِس انداز کا حُسن اُس وقت کچھ اور بڑھ جاتا ہے جب وہ طویل جملوں میں ایسے متعدد لفظ یک جا کر دیتے ہیں، جن میں سے بعض میں دو دو مرادف یا قریب المفہوم لفظوں کے ٹکڑے ہوتے ہیں، مثلاً: "سب دولت دُنیا، گھر بار، آل اولاد، آشنا دوست، نوکر چاکر، ہاتھی گھوڑے چھوڑ کر اکیلے پڑے ہیں ... اور قبر کے اندر کا احوال معلوم نہیں کہ کیڑے مکوڑے، چیونٹے سانپ اُن کو کھا گئے" (صـ۱۵)۔

(۶) یا پھر موقعے کی مناسبت سے ایسے کئی لفظ ایک ساتھ لاتے ہیں جو اصل میں ایک ہی مفہوم کی ترجمانی کرتے ہیں۔ اِس طرح عبارت میں بیان کا حُسن تو پیدا ہوتا ہی ہے، لفظیات کے ذخیرے پر لکھنے والے کی نظر کس قدر مُحیط ہے، اِس کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ ایسے مقامات پر عبارت میں داستان سرائی کا سا انداز پیدا ہو جاتا ہے اور یہ داستانی انداز پڑھنے والے کی نظر میں دل چسپی کی چمک پیدا کر دیتا ہے اور توجّہ کو پوری طرح اپنی طرف کھینچ لیتا ہے، مثال کے طور پر اِن ٹکڑوں کو دیکھیے: "ویسے ہی آدمی غُنڈے، پھانکڑے، مُفت پر کھانے پینے والے، جھوٹھے، خوشامدی آکر آشنا ہوئے" (صـ۲۲)۔ "اور نوکر چاکر، خدمت گار، پہلیے، ڈھلیت، خاص بردار، ثابت خانی، سب چھوڑ کر کنارے لگے" (صـ۲۲)۔ "فرّاشوں نے فرش فروش بچھا کر چھت، پردے، چلونیں تکلّف کی لگا دیں" (صـ۲۱)۔ "تب اُس نمک حرام، بے رحم، کٹّر، سنگ دل نے" (صـ۵۵)۔ "ایک جوانِ شکیل، خوش لباس، نیک خو، صاحبِ مروّت" (صـ۶۳)۔ "ایک طرف آتش بازی، پھُل جھڑی، انار، داؤدی، جھنجھنیا، مرواریہ، مہتابی، ہوائی، چرخی، ہتھ پھول، جاہی جوہی، پٹاخے، ستارے چھُٹتے تھے" (صـ۵۶)۔ "وہ بالغ ہوا، مسیں بھیگنے لگیں، چھب تختی درست ہوئی ... دربان اور ردّسنے، میوڑے، باری دار اور یساول، چوبدار اُس کو ... منع کرنے لگے" (صـ۱۵)۔ "یہ حالت دیکھ کر دائی، دوا، چھوچھو، انگا، سب کی سب متفکّر ہوئیں" (صـ۴۹)۔

(۷) اِس داستانی اندازِ نگارش کی خوبی میں ایسے مقامات پر اور زیادہ اضافہ ہو گیا ہے جہاں اُنھوں نے طویل جملوں میں ایسے ٹکڑے یک جا کیے ہیں جن میں سجع کا سا

انداز ہے اور جس سے عبارت میں ایک خاص طرح کی خوش آہنگی پیدا ہو جاتی ہے، مثلاً: "ایک روز بہار کے موسم میں کہ..... بدلی گھمنڈ رہی تھی، پھوئیاں پڑ رہی تھیں، بجلی بھی کوندہ رہی تھی اور ہوا نرم نرم بہتی تھی" (ص۵۵)۔ "ایک صراحی شربت کی تکلف سے بنا کر، برف میں لگا کر، لڑکے کے ہاتھ لوا کر لایا" (ص۴۹)۔ "میں دل کے شوق اور اٹھکھیلیوں کے ذوق سے" (ص۴۹)۔ "اُس لڑکے سے ٹھٹھا، مزاح کر کر دل بہلاتی تھی۔ وہ بھی..... اچھی اچھی، میٹھی میٹھی باتیں کرنے لگا اور اپنے جیسے کی نقلیں لانے، بلکہ آہ اور بھی بھرتے اور سسکیاں لینے" (ص۴۹)۔ "وہ پھول سا بدن سوکھ کر کانٹا ہو گیا اور وہ رنگ جو کندن سا دمکتا تھا، ہلدی سا بن گیا۔ منہ میں پھیپھڑی بندھ گئی، آنکھیں پتھرا گئیں" (ص۹۲)۔

(۸) میر امن کے حالاتِ زندگی کی بیش تر تفصیلات معلوم نہیں، اس لیے میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ قصہ گوئی اور داستان سرائی سے بھی اُن کو کچھ ربط رہا ہے۔ لیکن اس کتاب میں متعدد مقامات پر عبارت کا انداز کچھ ایسا ہے جو داستان سرائی کی ہلکی سی جھلک لیے ہوئے نظر آتا ہے۔ مثلاً اس عبارت کو دیکھیے: "بارے جب آفتاب، تمام دن کا مسافر تھکا ہوا، گرتا پڑتا اپنے محل میں داخل ہوا اور ماہ تاب، اپنے دیوان خانے میں اپنے مصاحبوں کو ساتھ لے کر نکل بیٹھا" (ص۴۸)۔ یا پھر جگہ جگہ چھوٹے چھوٹے ٹکڑے طویل جملوں کی ساخت میں اس طرح شامل کیے گئے ہیں کہ وہ مفہوم کی تکرار کا حق ادا کرتے ہیں اور اس طرح بات کو پُر زور بناتے ہیں؛ ایسے مقامات پر بھی قصہ گوئی کے رنگ کی ہلکی سی چھوٹ پڑتی ہوئی دکھائی دیتی ہے، مثلاً یہ عبارت:

"اے بیرن! تو میری آنکھوں کی پتلی اور ماں باپ کی موئی مٹی کی نشانی ہے۔ تیرے آنے سے میرا کلیجا ٹھنڈا ہوا۔ جب تجھے دیکھتی ہوں، باغ باغ ہوتی ہوں۔ تو نے مجھے نہال کیا" (ص۴۲)۔

اس سے پہلے تیسرے درویش کی سیر سے ایک کُٹنی کی گفتگو نقل کی جا چکی ہے، اُسے ایک بار پھر پڑھیے، تو یہ محسوس ہوگا کہ کوئی باکمال قصہ گو تفصیل بیانی سے مدد لے کر

اپنے بیان کو پُرزور بنا رہا ہے۔ ایسے مقامات اچھی خاصی تعداد میں اس کتاب میں سامنے آتے ہیں۔ بہ ہر حال قصہ گوئی سے اُن کا کچھ تعلق رہا ہو یا نہ رہا ہو؛ جہاں جہاں منظر نگاری، مرقع کشی یا کسی واقعے یا بیان کی تفصیلات معرضِ تحریر میں آئی ہیں، ایسے سب مقامات پر بیان کا رنگ بہت چوکھا ہو گیا ہے اور پڑھنے والا یہ محسوس کرتا ہے کہ وہ کسی نہایت دل چسپ بیان کو سُن رہا ہے، جس میں شامل تفصیلات اُس کے خیال اور ذہن کو متاثر کرتی چلی جا رہی ہیں۔ محض وضاحتِ مزید کے لیے اِس منظر کو دیکھیے :

"دیکھتا ہوں کہ دو رویہ صف باندھے، دست بستہ سہیلیاں اور خواصیں اور اُردا بیگنیاں، قلماقنیاں، ترکنیاں، حبشنیاں، اذبکنیاں، کشمیرنیاں جواہر میں جڑی، عُہدے لیے کھڑی ہیں۔ اندر کا اکھاڑا کہوں یا پریوں کا اُتارا" [ص ۴۹]۔

⑨ مرادف اور قریب المفہوم لفظوں پر اُن کی نظر بہت گہری ہے اور یہ صفت بھی بیانیہ کے حُسن کو چمکاتی ہے۔ مثلاً ایک جیل خانے کے لیے اُنھوں نے پانچ لفظ استعمال کیے ہیں : بندی خانہ، زندان، محبوس خانہ، بندت خانہ، قید خانہ۔ اِسی طرح محبوس، بندیوان، قیدی۔ اِسی طرح مثلاً : "جتنے چور چکار، جیب کترے، صبح خیزیے، اُٹھائی گیرے، دغا باز تھے" [ص ۱۰]۔ یا مثلاً نوکر چاکر، خدمت گار، بہلیے، ڈھلیت، خاص بردار، ثابت خانی" [ص ۲۲]۔ ایسی مثالیں بہت ہیں۔ داستان گو کے تخیّل کی جھلک اِس اندازِ بیان میں دکھائی دیتی ہے۔ پُرانے قصہ گویوں کی ایک خوبی یہ بھی ہوتی تھی کہ وہ زیادہ سے زیادہ نام جانتے ہوں اور اُن کو سلیقے کے ساتھ اپنے بیان میں کھپانے پر قادر ہوں۔ باغ و بہار کی نثر کے بہت سے مقامات اِس خوبی اور اِس فنّی چابک دستی اور اِس مہارت سے معمور نظر آتے ہیں۔

امالہ : امالے کی بعض بہت دل چسپ مثالیں اُن کی عبارت میں ملتی ہیں اور ایسے مقامات پر عام بول چال کی زبان کا اثر اُبھر آتا ہے، ایسی چند مثالیں : دل میرا دیدھے میں ہے (ص۴۷) شاگردپیشے اور مجرائی .... حاضر تھے (ص۵۹) بوڑے حنانے کی (ص۱۳۹)

مجرے گاہ میں (ص۱۶) اُس ماجرے کی حقیقت پوچھتا تھا (ص۵۰) آہستے سے کہا (ص۲۶) اصل نقشے کا تھا (ص۲۹) تکلیف روز مرّے کے خرچ کی ہونے لگی (ص۲۹) اِدھر اُدھر بڑے پھرے (ص۲۷) عصے بردار کھڑے ہیں (ص۲۵) نمک پروردے (ص۱۳) یہ کیا معنے رکھتا ہے (ص۳۹) کئی مرتبے (ص۲۰۴)۔

"بہ" کے مرکّبات : اِسی طرح مرکّبات میں "بہ" کا استعمال اُن کی عبارت میں اِس طرح ملتا ہے کہ بعض مقامات پر تو اجنبی پن پیدا ہو جاتا ہے لیکن اکثر مقامات پر بات چیت کا انداز نکھر جاتا ہے۔ ایسی بعض مثالیں : رنگ بہ رنگ کی شکلیں (ص۶) رنگ بہ رنگ کے جانور (ص۳۲) گلابیاں رنگ بہ رنگ کی (ص۳۱) پیڑھی بہ پیڑھی (ص۸) زار بہ زار روئے اور دُبلاپے سے (ص۱۱۳) لہو میں تر بہ تر (ص۲۶) خوشی بہ خوشی اجازت دی (ص۳۴) خلعتیں طرح بہ طرح کی اور جواہر رنگ بہ رنگ کے (ص۸) میں خوشی بہ خوشی بُت خانے میں آیا (ص۱۴۳)۔

قافیہ بندی : یہ خیال کرنا کہ میر امّن نے پوری کتاب میں ساری کی ساری عبارت اُسی طرح لکھی ہے جس طرح بہ قول اُن کے : "ہندو مسلمان، عورت مرد، لڑکے بالے، خاص و عام آپس میں بولتے چالتے ہیں" کسی طرح درست نہیں ہوگا۔ اِس کتاب میں وہ سب عناصر موجود ہیں جو اُس دور کی انشا پردازی کا جُز تھے۔ بس فرق یہ ہے کہ دوسروں کے یہاں اُن کا تناسب اور اُن کی ترکیب وہ نہیں، جو میر امّن کی عبارت میں ہے۔ یہاں صنعتیں بھی ہیں، قافیہ بندی بھی ہے، اجنبی طرزِ ادا بھی ہے، فارسی کے انداز پر تراشے گئے جملے بھی ہیں جن میں بھدّا پن سمایا ہوا ہے، لفظی تعقید اور تنافر بھی ہے؛ یہ سب بھی، مگر مجموعی طور پہ عبارت میں اُردو پن نمایاں رہا ہے اور سہلِ ممتنع کا رنگ چھایا ہوا ہے۔ اُنھوں نے قافیہ بند ٹکڑے عبارت میں سموئے ہیں، مگر ایسے مقامات پر ذہن یہ محسوس نہیں کرنے پاتا کہ لکھنے والا قافیہ بندی کا ہُنر دکھانا چاہتا ہے، بل کہ ایسے بیش تر مقامات پر عبارت کا حُسن کم نہیں ہونے پاتا اور کہیں کہیں تو بڑھ جاتا ہے۔ قافیہ بندی کی یہ چند مثالیں اثباتِ مدّعا کے لیے کافی ہوں گی :

"اور زمین پانی کا بتاشا! لیکن یہ تماشا ہے (ص۴۳)" وہ شرابی اپنی خرابی دل میں سوچا (ص۵۸)، شیر اور بکری ایک گھاٹ پانی پیتے ہیں۔ سارے غریب و غربا دعا دیتے ہیں اور جیتے ہیں (ص۵)، سر سے پانو تک موتیوں میں جڑاہی، روش پر آکر کھڑی ہوئی (ص۴۲)، یہ سب بہار اُس کے بغیر میری آنکھوں میں خار تھی (ص۱۴۱)، بادشاہ کو خرد مند وزیر کا کہنا یاد آیا اور دونوں کو مطابق پایا (ص۱۷)، مکھڑا سورج کی مانند چمکنے اور کندن کی طرح دمکنے لگا (ص۲۹)، میں یہ تسلی پاکر اپنی استقامت کے مکان پر آکر منتظر تھا کہ کب شام ہو، جو میرا مطلب تمام ہو (ص۸۷)۔

پوری کتاب ایسی مثالوں سے بھری ہوئی ہے۔ کمال کی بات یہ ہے کہ یہ قافیہ بندی ذوق پر گراں نہیں گزرتی، اِس کے برعکس عبارت میں ایک خاص انداز کی خوبی کا اضافہ کر دیتی ہے۔

صنعتیں : میرامّن کی نثر میں مناسباتِ لفظی کی کمی نہیں۔ مراعاتُ النّظیر، تضاد اور تجنیس جیسی لفظی صنعتیں پوری کتاب میں بکھری ہوئی ہیں۔ کچھ مثالوں سے اِس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے: تو نے اپنی عنایت سے سب کچھ دیا، لیکن ایک اِس اندھیرے گھر کا دیا نہ دیا (ص۱)، جو فکر میرے جی کے اندر ہے، سو تدبیر سے باہر ہے (ص۱۲)، شبِ قدر کو وہاں قدر نہ تھی (ص۴۳)، میرا دل تو اُس پر لٹّو ہوئی رہا تھا، چکّی کی طرح اُس کے اختیار میں تھی (ص۵۸)، خدا نے مار کر پتھر جلایا (ص۵۹)، غصّے کی آگ میں پھنک رہی ہوں، آخر جل بل کر بھسم ہو جاؤں گی (ص۶۲)، اُس کی حمد و ثنا میں زبان انسان کی گویا گونگی ہے (ص۱)، تیری امید کا سوکھا درخت اِن کی توجّہ سے ہرا ہو کر پھلے گا (ص۱۹)، سوداگری بھول کر تماش بینی کا اور لینے دینے کا سودا ہوا (ص۴۳)۔ ایسی مثالیں اِس کتاب میں بہت ملتی ہیں۔

بہت سے مقامات پر طویل عبارت کے مختلف ٹکڑے لفظی مناسبتوں سے معمور ہیں [قافیہ بندی مزید برآں] بس دو مثالوں پر اکتفا کرتا ہوں: جاتے جاتے ان جیت ایک دریا [جس کے دیکھنے سے کلیجا پانی ہو] راہ میں ملا۔ کنارے پر کھڑے ہو کر جو

دیکھا... کچھ تحمّل بیڑا نہ پایا۔ یا الٰہی! اب اِس سمندر سے کیوں کر پار اُتریں... آخر یہ لہر آئی کہ... میں تلاش میں ناؤ نواڑے کی جاؤں۔ جب تلک اسباب گزارے کا ہاتھ آوے، تب تلک وہ نازنین بھی آرام پاوے۔ تب میں نے کہا... گھاٹ باٹ اِس دریا کا دیکھوں (ص۶۶)۔ اِس آندھی اور اندھیرے میں یہ روشنی خالی حکمت سے نہیں۔ شاید اِس شمع کے نور سے میرے بھی گھر کا چراغ روشن ہو (ص۱۸)۔

صنعتیں اور لفظی رعایتیں، سچ تو یہ ہے کہ زبان کا جز رہی ہیں۔ جہاں تناسب بگڑ جاتا ہے، بس وہاں نظر رُکتی ہے اور میر امّن کے یہاں ایسے مقامات کم سے کم ہیں جہاں تناسب بگڑا ہو، یہی وجہ ہے کہ [جب تک خاص طور پر متوجہ نہ کیا جائے] عام طور پر یہ خیال بھی ذہن میں نہیں آتا کہ باغ و بہار کی نثر میں قافیہ بندی کا اہتمام بھی ہے اور لفظی رعایتوں کی صنعت گری بھی ہے۔ یہ بات لکھنے والے کے کمالِ فن پر دلالت کرتی ہے۔ ہاں یہ واضح ہے کہ اِسے خواہ انشا پردازی کہا جائے یا داستانی پیرایۂ اظہار سے تعبیر کیا جائے، مگر یہ انداز بول چال کی زبان کا نہیں۔

عربی فارسی اور ہندی الفاظ —: میر امّن کی نثر کے سلسلے میں ایک اور بات بھی وضاحت طلب ہے۔ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ اُنھوں نے عربی فارسی الفاظ بہت کم استعمال کیے ہیں۔ صورتِ حال یہ ہے کہ اُن کی عبارت میں بہ طورِ عموم ایسے عربی فارسی لفظ شامل نہیں ہو پائے ہیں جو غیر مانوس ہوں۔ ایک طرف تو یہ صورتِ حال ہے، دوسری طرف یہ ہوا ہے کہ جگہ جگہ کم مانوس یا نامانوس غیر عربی فارسی لفظوں کو جملے میں اِس طرح کھپایا ہے کہ ایسے مقامات پر عبارت کے وہ ٹکڑے چمک اُٹھے ہیں اور اندازِ بیان میں نیاپن پیدا ہو گیا ہے۔ کمال اُن کا یہ ہے کہ یہ کم مانوس لفظ اُن کی عبارت میں آ کر اپنی اجنبیت کھو دیتے ہیں۔ اِس قدر برمحل ہوتے ہیں کہ ذہن میں ایک نئی چمک پیدا ہو جاتی ہے اور نظر میں نئے پن کی روشنی شامل ہو جاتی ہے اور پڑھنے والا فوری طور پر محسوس کر لیتا ہے کہ عربی یا فارسی کے متعارف لفظ کا نہایت عمدہ بدل مل گیا ہے۔ اُن کی نثر میں عربی فارسی کے لفظ کم نہیں، مگر یہ الفاظ چوں کہ مانوس اور نظر آشنا ہوتے

ہیں، یوں وہ نظر کو اپنی طرف نہیں کھینچ پاتے۔ اُن کے مقابلے میں دوسرے لفظ چوں کہ کم مانوس ہیں، یوں اُن کا نیا پن ذہن پر اپنا گہرا نقش ثبت کر دیتا ہے اور نظر کو اچانک اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔ وہ جگہ جگہ ایسی پیوند کاری کرتے ہیں کہ عبارت کا وہ ٹکڑا چمک اُٹھتا ہے اور پھر پوری عبارت پراثر انداز ہو جاتا ہے، مثلاً: "جو مرد نکھٹّو ہو کر گھر سیتا ہے"۔ "گھر سینا" ایسا محاورہ ہے جس سے لوگ عام طور پر مانوس نہیں، مگر یہ عام فہم اور دل کش اور مفہوم کو بہت عمدگی اور ہمہ گیری کے ساتھ ادا کر رہا ہے۔ اِس ایک ٹکڑے نے پوری عبارت پر اپنا اثر ڈالا ہے۔ نظر اِس پر خاص کر رُک جاتی ہے اور ذہن میں نئے پن کا احساس اپنی جگہ بنا لیتا ہے۔ مثلاً اِس چار سطری ٹکڑے کو دیکھیے:
"اُسی وقت خواجہ سرا کو حکم کیا کہ کل صبح کو قیمت اِس باغ کی لونڈی سمیت چکا کر، قبالہ باغ کا اور خط کنیزک کا لکھوا کر اِس شخص کے حوالے کر، اور مالک کو زرِ قیمت خزانۂ عامرہ سے دلوا دو۔ اِس بردہ اِنگی کے سنتے ہی آداب بجا لایا اور مُنہ پر رونق آئی" [ص۵۵]
اِس عبارت میں آخری ٹکڑا [مُنہ پر رونق آئی] ایسا لگتا ہے جس پر نظر اچانک رُک جاتی ہے، اِس سے پہلے کے سارے جملے اور ترکیبیں نظر سے ذرا سی دیر کے لیے اوجھل ہو جاتی ہیں اور محسوس ہوتا ہے کہ یہ ہے نیا پن۔

ہر اچھے قصہ گو کی طرح میر امّن نے اِس کا بہت لحاظ رکھا ہے کہ جہاں کوئی خاص کردار آ گیا ہے تو وہ کردار اپنی ہی زبان میں باتیں کرتا ہے۔ مثلاً جوتشی جب زائچہ بناتا ہے یا کُٹنی جب باتیں کرتی ہے یا لکڑہارا جب کچھ کہتا ہے، تو ایسے سارے مقامات پر غیر عربی فارسی لفظ یا تو بالکل نہیں [مثلاً جوتشی کی گفتگو میں] یا پھر نہ ہونے کے برابر ہیں۔ ایسے مقامات سے یہ استدلال کرنا کہ باغ و بہار میں ہندی لفظوں کا اوسط زیادہ ہے، یا یہ کہ اُن کی تعداد زیادہ ہے، درست نہیں ہوگا۔ فسانۂ عجائب میں بھی ایسے مقامات پر ایسے کرداروں کی گفتگو کا یہی انداز ہے۔ یہ تو قصہ گوئی کا خاص انداز تھا۔ ہاں یہ درست ہے کہ میر امّن کی نثر میں ایسے لفظ بہت سلیقے کے ساتھ شامل ہوئے ہیں جن کی جگہ دوسرے انشا پرداز عموماً عربی فارسی کے لفظ لاتے ہیں۔

مثلاً: "بدلی گھمنڈ رہی تھی، پھوئیاں پڑ رہی تھیں" یہ انداز دوسروں کے یہاں نہیں ملتا اور ایسے ہی ٹکڑے اُن کی نثر کا حسن اور زیادہ بڑھاتے ہیں اور اُن کا نقش پڑھنے والے کے ذہن پر اس قدر گہرا ہوتا ہے کہ وہ مجموعی طور پر اُن کی نثر کو اسی انداز سے معمور فرض کر لیتا ہے۔

مرکبات: فارسی مرکبات اُن کے یہاں کم ہیں اور جو ہیں، وہ کثیرالاستعمال ہیں، مثلاً ص ۲ سے ص ۱۲۱ تک میں صفحوں میں کل مرکباتِ اضافی و عطفی ۱۲۱ ہیں۔ ان میں اگر "نیک اندیش"، "قدردان"، "شب بیدار"، "نکتہ رس" اور "جہاں پناہ" جیسے مرکبات کو بھی شامل کر لیا جائے تو اُن کی تعداد ۱۳۰ کے لگ بھگ ہو جائے گی۔ یہ اوسط کچھ زیادہ نہیں، معمولی ہے اور اس نے بھی اُن کی نثر کو بوجھل ہونے کے اثرات سے بچائے رکھا ہے۔

اُن کے یہاں برچھی و تلوار، تخت و چھتر، چرن برداری، زیر جھروکے اور چین آرام جیسے مرکبات بھی مل جاتے ہیں، لیکن ایسے مرکبات کی تعداد زیادہ نہیں۔ وہ فارسی مرکبات کو اضافت یا حرفِ عطف کے بغیر، اس طرح بھی لکھتے ہیں، جس طرح وہ بول چال میں آتے ہیں، اور کبھی وہ ایسا اندازِ بیان اختیار کرتے ہیں کہ مرکب صفاتی ٹکڑا سے جملے کی آرائش کو بہت بڑھا دیتے ہیں، مثلاً اس جملے کو دیکھیے: "اسی واسطے دل حیران اور خاطر پریشان تھا (ص۵)۔ ایک اور انداز یہ ہے کہ توصیفی مرکبات میں ترتیب تو وہی فارسی ترکیب والی برقرار رہتی ہے، لیکن موصوف اُردو ہوتا ہے اور صفت کے طور پر فارسی یا عربی کا لفظ آتا ہے، مثلاً: خلعتیں فاخرہ، پنجرے آہنی، خواصیں شکیل۔ اِس انداز سے اُردو پن جملوں میں چمک اٹھتا ہے۔

فارسیت اور اجنبی طرزِ ادا: یہ دلچسپ بات ہے کہ باغ و بہار میں ایسے بہت سے مقامات ہیں جہاں طرزِ ادا میں اجنبی پن شامل نظر آتا ہے یا صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ یہاں فارسی کے انداز پر جملے گڑھے گئے ہیں، جیسے فارسی جملوں کا ترجمہ کیا جا رہا ہو۔ ایسے طویل جملے بھی ہیں جن میں تقدیم و تاخیر، تعقید اور کاواک

اندازِ بیان نے بھدا پن نمایاں کر دیا ہے۔ ایسے مقامات کم نہیں۔ زیادہ مثالوں کی گنجایش نہیں، اِس لیے نسبتاً کم مثالوں پر اکتفا کرتا ہوں۔ یہ پہلو اگر نظر میں ہو تو پڑھنے والا ایسے سارے مقامات پر از خود اِس صورتِ حال کو سمجھ سکتا ہے۔ سادہ و صاف اندازِ بیان اور عربی فارسی لفظوں کے مقابلے میں ہندی لفظوں کے کھپانے اور اُس سے پیدا شدہ حُسن کاری کے متعلق اوپر جو کچھ لکھا گیا ہے، ایسے مقامات پر اُس سے مختلف صورتِ حال سامنے آتی ہے۔ مثلاً اِس طویل مرکب جملے کو دیکھیے: "بہ موجب حُکم بادشاہ کے، اُس آدھی رات میں [کہ عین اندھیری تھی] مَلِکہ کو [جو جوبن بھرے میں پلی تھیں اور سوا اپنے محل کے دوسری جگہ نہ دیکھی تھی] بھونڈی، لے جا کر ایک میدان میں، کہ وہاں پرندہ پَر نہ مارتا، انسان کا تو کیا ذکر، چھوڑ کر چلے آئے" (ص۹۱)۔ مُبتدا کی خبر کس قدر دور واقع ہوئی ہے! پہلے ٹکڑے میں جو لفظی تعقید ہے، وہ مزید برآں۔ چند اور مثالیں: فقیر موافق فرمانے اُس کے (ص۳۰)، ساتویں برس میں پانو دیا (ص۲۴۲)، ایلچی نے زمین خدمت کی چومی (ص۱۱۹)، غور میں گیا (سوچنے لگا) (ص۱۰۱)، رعشہ ہو گیا (کانپنے لگا) (ص۱۶۴)، کسب کر رہا تھا (ہنر دکھا رہا تھا) (ص۱۵۱)، آخر یہ حالت اپنی پہنچائی (ص۴۳)، تجھ سا عقل مند... صحبت مے نوشی کی باہم گرم کرے، یہ کیا معنے رکھتا ہے (ص۳۹)، سب قوم... آ کر جمع ہوئے (ص۱۶)، اگر تم میں قوت نہ تھی، تو کیوں ایسی کچّی ہوس پکائی (ص۴۷) اور سرانجام سرکشی کا کیا (ص۱۱)، ہزار محنت سے وہ کئی منزلیں کاٹ کر اُس کے مکان پر پہنچا (ص۲۲)، نہ مجلس خوشی کی خوشی آرے (ص۴۲)، محبت اُس کی دل سے نہ بھولی (ص۵۲)، میں نے اپنے دل میں یہ قول کیا تھا (یعنی عہد کیا تھا) (ص۴۶)، میں سرِ مو تفاوت کہتا ہوں (یعنی غلط کہتا ہوں) (ص۱۴۴)، اب حیا و شرم بیچ اور صبر و قناعت کو کام فرما (ص۴۵)، ایں بہ مجرد سُننے اِس قصّے کے (ص۲۰۶)، کسو کو اُس کے آنے کی آہٹ کی خبر نہ ہوئی (ص۱۹)، مجھے باعث ہوا (اصرار کیا) (ص۲۰)، تلاش کر کے میری خاطر پیدا کر کے لا (ڈھونڈھ کر) (ص۲۲۶)، خدا کے توکّل پر بھروسا کر کے (ص۲۵)، یہ وہی لونڈی ہے جو اُس باغ کے ساتھ

خرید ہوئی (ص۵۶)، جس واسطے یہ محنت کشی کر گزرا، وہ مطلب ہاتھ نہ آیا (ص۲۰۶)، وہ ہرن نظروں سے چھلاوا ہوگیا (ص۱۹۵)، جب دوپہر ہوئی، برخاست ہوکر اندرونِ محل داخل ہوئے (ص۱۵)، سب قوم جمع ہوئے (ص۲۸)۔

جگہ جگہ فارسی کے انداز پر اُردو کے مرکب ٹکڑے ایسے آئے ہیں جن میں لفظی تعقید نے فارسی پن کے اثر کو نمایاں کر دیا ہے، صرف چند مثالیں : بہ سبب نام آوری کے (ص۶۹)، واسطے اپنے نبی کی آل کے (ص۴۲)، بہ موجب فرمایش کے (ص۵)، درود طفیل پیغمبر کی روح کے (ص۱۷)، ایک کونے میں اُس مکان کے چُپکا جا بیٹھا (ص۱۹)، ماں باپ کے نام کو سبب لاج لگنے کا ہے (ص۲۴)، بہ سبب نام آوری کے (ص۶۹)، لیے دونوں کی باتیں حاتم نے سُنیں (دونوں کی یے باتیں) (ص۲۷)، نباہ اپنا نہ دیکھا (ص۳)۔

<u>"نے" اور "کو" کا استعمال</u> : "نے" کے استعمال کی چند مثالیں : تب میں نے بے اختیار اُس پری کو ... بغل میں لے آیا (ص۱۱۱)، تو نے بستی کو چھوڑ کر جنگل پہاڑ کیوں پکڑا ہے (ص۱۹۷)، ذرا حسرت آئی، تو میں اپنے تئیں مُردہ خیال کیا (ص۱۴۵)، میں پاس جاکر جو دیکھا (ص۱۰۹)، جب میں جیتا اُٹھ کر، اُس معشوق کے مقابل جاکر سلام کیا (ص۱۹۷)، القصہ رات کو چپکے سے دونوں بھائی اور کوتوال کے ڈنڈے نے مجھے اُس پہاڑ پر لے گئے (ص۱۴۵)[1]۔

<u>"کو" کا استعمال</u> : اِس قصے کو ... ترجمہ کرو (ص۶)، جاگیر کو ضبط کرلیا (ص۶)، نواب علی مردان خان نہر کو لے کر آیا (ص۳)، اب میں آغاز اُس کو کرتا ہوں جو ہے منظور کام (ص۷)۔

۱؎ "نے" کا استعمال خاصی سیّال حالت میں رہا ہے اور بہت بعد تک اِس کے اثرات کارفرما رہے ہیں۔ انشا اور مومن کے یہاں سے ایسی چند مثالیں : غیر کے ملنے کا طعنہ جو دیا میں، تو کہا (کلامِ انشا، ص ۸) میں کہا : میں غلام ہوں، بولا (۱۴۵) ساتھ کے اپنے ہم صفیر جتنے تھے، سب نے رو دیا (۲۰۱)۔ رو دیا بے اختیار اُس شوخ نے تاثیر سے (مومن۔ دیوان مرتبہ مولوی ضیا احمد، طبع ثانی، ص ۲۴۷) دیکھ اشکِ لالہ گونِ رقیب اُس نے ہنس دیا (۱۰۷) رو دیا اُس نے جو میری لاغری کو دیکھ کر (۴۵) ـــ یہی احوال "کو" کے استعمال کا ہے۔

سب کو کہہ دو حاضر رہیں (ص۱۶) یہ نیّت کرکے اُس طرف کو چلے (ص۱۸) سب نے فقیر کو باپ کی پگڑی بندھوائی (ص۲۱) دیوان خانے کی تیّاری کو حکم کیا (ص۲۱) شبِ قدر کو وہاں قدر نہ تھی (ص۸۰) سب کو کہا (ص۲۰۵) میں نے خواص کو کہا (ص۴۷) بادشاہ بیگم کو کہو (ص۹۶) اپنے خاوند کو جاکر کہو (ص۲۱۴) اُس نازنین کو وہ تیل مل دیا (ص۲۲۶) رو بہ قبلہ کھڑا ہوا خدا کو کہتا تھا (ص۱۴۴)۔

جمع الجمع : اِس کتاب میں "سلاطینوں" اور "امراؤں" یہ دو لفظ کئی جگہ آئے ہیں (ص ۹، ۱۹، ۱۷۵، ۴۸، ۱۱۸) [اُن کی دوسری کتاب گنجِ خوبی میں ایسے متعدد لفظ ہیں، مثلاً : اقرباؤں، اصحابوں، مشایخوں، نذورات، اشرافوں؛ اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لفظ اُس زمانے میں اِس طرح مستعمل تھے]۔ اِس کے برخلاف جمع کو واحد کے طور پر بھی لایا گیا ہے : "میں رئیس اور اکابر اِس شہر کا ہوں" (ص۲۲۹)۔ [گنجِ خوبی میں بھی ایسی مثالیں موجود ہیں، مثلاً : "ایک امرا اُس گھڑی حاضر تھا" (شائع کردہ دہلی یونی ورسٹی، ص۱۲۳)؛ ایک اصحاب نے ..... سوال کیا" (ص۸۹)]۔

تذکیر و تانیث : پرانے شاعروں اور نثر لکھنے والوں کے یہاں اِس سلسلے میں بڑی رنگارنگی پائی جاتی ہے؛ حقیقت تو یہ ہے کہ بہت سے لفظوں کی تذکیر و تانیث میں اختلاف آج تک موجود ہے۔ میر امّن کے یہاں بھی بعض مثالیں ایسی ملتی ہیں جو آج ہم کو بہت عجیب معلوم ہوں گی، مثلاً اُنھوں نے "شک" "فانوس" اور "خلعت" کو مونّث لکھا ہے، جب کہ بہ طورِ عموم یہ لفظ مذکر مستعمل رہے ہیں۔ اِس سلسلے میں قابلِ ذکر لفظ یہ ہیں [یہ وضاحت کر دی جائے کہ ہر لفظ کے آگے صرف ایک صفحے کا نمبر لکھا گیا ہے، لیکن اِس کا لازماً مطلب یہ نہیں کہ وہ لفظ بس ایک ہی جگہ آیا ہے۔ بعض لفظ متعدد مقامات پر آئے ہیں، مثلاً "التماس" ص ۸۲، ۸۶، ۴۴، ۹۶، ۲۲۵ پر آیا ہے، یا "فانوس" ص ۳۶ اور ۵۶ پر آیا ہے]۔

مذکّر : آرام ۵، آنول نال ۷، التماس ۸۲، بہشت ۱۶۳، ٹھیپ ۱۹، جان و مال ۱۶، جان و ایمان ۱۶۳، جسم جھم ۶، جبین ۱۶، ڈلیاں ۱۰، راجا پرجا ۲۰، رعیت پرجا ۱۶،

رقم (جواہر) ص۱۳۱، رسن وسال ص۴۲، شہر پناہ ص۸، قوت ص۲۰۶، قند ص۱۵۱، لالچ ص۶۹، مینڈ ص۱۴۵، ننگ وناموس ص۵۲، واویلا ص۱۱۹ -

مؤنث : آئین ص۱۳۲، انند ص۱۴، تپ ص۲۳۱، حفظ وامان ص۲۳۵، خلعت ص۴۹، خلعتیں ص۳۱، خمیں (خم کی جمع) ص۱۲۱، دوہتڑ ص۱۲۰، دھرا ہر ص۱۵، ڈھارس ص۱۵، رمز ص۴۷، ساتھ سنگت ص۹، سنگھاسن ص۱۸۵، سانس ص۱۱، سنجاف ص۱۴، شک ص۱۲۶، عرض معروض ص۱۵، غرور ص۳۹، فاتحہ ص۲۰۹، فانوس ص۱۹، فانوسیں ص۲۳۶، فکر ص۱۳، گلاب پاشیں [گلاب پاش کی جمع] ص۲۴۳، مانند ص۲۰، ناوک ص۱۹۷، نقب ص۵۶، واویلا ص۲۴۱، ہول ص۵۷ -

اختلافِ عدد و معدود : عدد جمع ہو اور معدود واحد یا یہ کہ فعل واحد لایا جائے، قدما کے یہاں اس کی مثالیں ملتی ہیں۔ میرامن کے یہاں بھی یہ صورتیں نظر آتی ہیں۔ وہ کہیں تو دونوں جز حالتِ جمع میں لاتے ہیں اور کہیں اس کے برخلاف؛ یہاں تک کہ ایک ہی جملے میں یہ صورتیں یک جا مل جاتی ہیں، مثلاً: پان سو اشرفی کے بدلے، پان پان سے جوتیاں ان کے سر پر لگاؤ (ص۲۷)۔ یا ان دو جملوں کو دیکھیے: پان سے اشرفی ..... انعام پاوے (ص۶۹)۔ پانچ سو اشرفیاں ..... دلوادیں (ص۴۳)۔ اختلافِ عدد و معدود کی بس چند مثالیں اور: دو شخص کو ص۹۱، دو درویش کا احوال ص۱۱۵، چاروں درویش آپس میں ایک ایک کو تکنے لگا ص۱۱۳، دو منزل کی ایک منزل کرتا ہوا ص۲۵، ناگاہ دو جوان کو دیکھا ص۱۴۲، چاروں فقیر نے بھی دعا دی ص۲۴۰، یہ آسمان دو شخص کو ص۱۱۵، چار پری زادے نے ص۱۰۳، اگر ہزار سوار آوے ص۶۵۔

شتر گربہ ـــ "نا" علامتِ مصدر : شتر گربہ (مثلاً "تم" اور "تو" کا اجتماع) کی مثالیں اچھی خاصی تعداد میں ملتی ہیں۔ میں صرف تین مثالوں پر اکتفا کروں گا: غالب ہے کہ وہ دوستی تمھارے باپ کی یاد کر کر، ایک بوزنہ جو باقی ہے، تجھے دے (ص۲۲۳)، والد اس عاجز کا ..... بڑا سوداگر تھا (ص۲)، قبلۂ عالم اس تصورِ باطل کو دل سے دور کرو (ص۱۱۴)۔

اساتذۂ دہلی اس اصول پر کار فرما رہے ہیں کہ اسمِ مذکر و مؤنث کی نسبت سے

علامتِ مصدر "نا" بدلتی رہے گی، مثلاً: کتاب پڑھنی اور اخبار پڑھنا۔ میر امّن کے یہاں کبھی یہی التزام ملتا ہے، مثلاً: اولاد دینی ص۱۳، دُعا مانگنی ص۱۷، وظیفہ پڑھنا ص۱۷۔ صرف ایک جگہ "جلدی کرنا" آیا ہے: جلدی کرنا اور اُن کے درمیان مخل ہونا ص۱۹۔ غالباً قافیے کی رعایت نے یہاں یہ صورتِ حال پیدا کی ہے۔

<u>ہائے مخلوط اور نونِ غنّہ</u> : ہائے مخلوط اور نونِ غنّہ کا استعمال سیّال حالت میں رہا ہے اور اب تک اُس کے اثرات کارفرما ہیں۔ خود میر امّن نے مخلوطہ کو صحیح خوبی میں اپنے قلم سے "بھوک" اور "بھبھوکا" لکھا ہے۔ باغ و بہار میں ایسے لفظ بھی ہیں جو کہیں مع ہائے مخلوط اور دوسری جگہ بغیر ہائے مخلوط ملتے ہیں، جیسے: ٹھنڈا اور ٹھنڈھا۔ اور کچھ لفظ ایسے بھی ہیں جو ہر جگہ صرف مع ہائے مخلوط آئے ہیں، جیسے: تڑپھنا، سانجھے [اب "سانجے" لکھتے ہیں] بھوٹھا، بھوٹھا، جھوٹھ [مگر "جھوٹا" دوسری حد کے بغیر آیا ہے]۔ ضمیمۂ تلفظ و املا میں ایسے الفاظ زیرِ بحث آ گئے ہیں، اس لیے یہاں مزید مثالوں سے قطعِ نظر کرتا ہوں۔

ہائے مخلوط ہی جیسا احوال نونِ غنّہ کا ہے [دلّی والوں کے لہجے میں ویسے بھی متعدد لفظوں میں نونِ غنّہ کی آواز شامل رہتی ہے]، مثلاً "ٹھینٹھ" مع نونِ غنّہ ملتا ہے۔ چوں کہ ضمیمۂ تلفظ و املا میں ایسے لفظ بھی زیرِ بحث آ گئے ہیں، اس لیے یہاں تفصیل کی ضرورت نہیں۔

سے، میں، کا، کی، کے، تو، آن: اِن کو جگہ جگہ جملوں میں اِس طرح لایا گیا ہے کہ آج اِس طرزِ استعمال اور طرزِ ادا میں اجنبی پن جھلکتا ہے، مثلاً:

سب علم سے ماہر ہوا (ص۲۹)، اور شہر کے سوداگر بچے سے شادی کر دی تھی (ص۲۱)، اپنے مطلب سے کامیاب ہوا (ص۲۲)، اِس سال کے گزرنے سے اِس کی امانت اِس کے حوالے کر دوں گا (ص۲۲) [یعنی اِس سال کے گزرنے کے بعد، یا گزرتے ہی]۔ کئی دن سے دوڑ دھوپ کر جنگل سے پکڑ لایا ہوں [یعنی کئی دن تک] (ص۲۷)۔ میاں "مجھ سے" کی جگہ "مجھے"، جیسے: دونوں بھائیوں نے مجھے کہا (ص۱۳۵)۔

اب تو بھی جا کر اُس کی استدعا کر اور اپنے ساتھ ہی ساتھ لے آ [یعنی اُس سے استدعا کر] (ص۷۱)، عذرِ مہمان داری کا کر کے اُس کے شامل نہ ہوتا (ص۳۵)۔ مجلس کا شریک ہو (ص۱۹)۔

میں وہ نقد لے کر بازار میں گیا (ص۲۴)، آج کے دن غریب خانے میں کرم کیجیے (ص۳۲)، ہر سال میں ایک دفعہ (ص۲۲۲)، ایک کوٹھڑی میرے تحت میں کر دی (ص۱۹۴)، گلے میں چمٹ گئی (ص۲۰۴)، خرید کرنے بازار میں گیا (ص۲۲۴)، نسبت ناتا کرنے میں راضی کیا (ص۲۳)، میرے منہ میں جیسے کسو نے مُہر دے دی (ص۱۵۵)۔

ایسے مرنے پر میں راضی ہوں (ص۲۰۴)، از برائے خدا یہ کیا مذکور ہے (ص۲۱۳)۔

میرے قبلہ گاہ نے ... میری اتالیقی کے لیے مقرر کیے تھے، تو تعلیم کامل ہر نوع کی پا کر قابل ہوں [تو = تاکہ] (ص۶)۔

"اُس پاس"، "کس پاس" جیسے ٹکڑے قدیم اساتذہ کے یہاں بالعموم ملتے ہیں۔ [غالب کی ایک رباعی کا تیسرا مصرع ہے: جس پاس روزہ کھول کے کھانے کو کچھ نہ ہو] ۔ باغ و بہار میں اِس کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں، مثلاً: بادشاہ پاس لے چلوں (ص۲۱۹)، اُس پاس لے جاؤ (ص۲۷)، اِس فقیر پاس جو کچھ تھا (ص۲۹)، فقیر جوہری پاس گیا (ص۳۵)، بادشاہ پاس جا کر کہتا ہوں (ص۷۱)۔

مندرجۂ ذیل جملے میں [فارسی کے انداز پر] "جب تلک" حرفِ نفی کے اضافے کے بغیر آیا ہے: پر میں نے پنڈ نہ چھوڑا، جب تلک وہ راضی ہوا (ص۳۵)۔ یا جیسے "اِلّا" کو مع اضافہ "نہ" لانا: وِالّا نہ، جیسا کرے گا، ویسا پائے گا (ص۲۲۶)۔ وِالّا نہ، کسو بادشاہ کے ہاتھ ... نہ لگا (ص۲۴۲)۔ وِالّا نہ، اپنے تو سان گمان میں بھی یہ بات نہ تھی (ص۲۴۰)۔

"کتنی" اور "کتنے" کا استعمال: "کتنی کتابیں اُسی سال ... تالیف ہوئیں" (ص۵) [یعنی کئی کتابیں]۔ "کتنے برس بلدۂ عظیم آباد میں رہا (ص۵) یعنی کئی سال، برسوں تک۔

اِسی طرح اِن جملوں میں "کوئی" اور "کئی" کا استعمال: "کوئی دن میں یہ ارادہ رکھتا

ہوں کہ سب چھوڑ چھاڑ کر ... نکل جاؤں" (ص ۱۴۷) ۔ یعنی چند روز میں، جلد ہی —
"کئی برس کے عرصے میں ایک بارگی یہ حالت ہوئی" (ص ۲۲) ۔ یعنی چند ہی سال میں —
اسی طرح: کتنے دن پیچھے وہ مردِ بزرگ جان بہ حق تسلیم ہوا (ص ۲۳۵) ۔

کئی جملوں میں "علاوہ" کا استعمال بھی توجہ طلب نظر آتا ہے، مثلاً: "علاوہ، دانا اور نیک اندیش تھا (ص ۱۴۱) ۔ علاوہ، اپنی تقصیر کی خجلت سے مرا جاتا ہے" (ص ۱۴۲) ۔
[اب ایسے مواقع پر "اس کے علاوہ" کہتے ہیں] ۔

افعال: میر امن کی نثر میں افعال کی عجیب رنگا رنگی پائی جاتی ہے۔ کچھ تو ایسے فعل ہیں کہ پڑھنے والا اچانک یہ محسوس کرتا ہے کہ نیا لفظ سامنے آگیا ہے، مثلاً: نہیں تو ... ننگیا لیں گے [سب کچھ چھین لیں گے] (ص ۱۵۶)، چڑھوان جوتا اڑایا [پہنا] (ص ۱۰۷)، گھوڑے کو ٹنگیا کر (ص ۲۱۵)، آپس میں بتیاتے ہیں (ص ۲۰۳)، سب سرکاروں میں جو تحفہ چاہیتا [چاہیے ہوتا] (ص ۱۳۷)، مجھے بھی بادشاہ زادی کہوایا (ص ۹۱)، شیطان نے ورغلانا [ورغلایا] (ص ۱۱۲)، خدا سے لو لگائے رہیں تھیں (ص ۹۲) ۔

اس کے علاوہ مثلاً دھری ہیں اور دھریں ہیں، باتیں بنائیں مجھے خوش نہیں آتیں، دیگیں ٹھنٹھنا رہیں ہیں، صافیوں سے بندھیں اور بچھڑوں سے ڈھکی رکھی ہیں، چنی ہوئی اور چنیں ہوئی۔ یا طرح طرح کے مرکب فعل، جیسے: نگاہ کیا، مصیبت کھینچی ہے۔

یا جیسے "کرکر" باغ و بہار میں بہ طورِ عموم ملتا ہے، مثلاً: نیست و نابود کرکر (ص ۱)، نماز ادا کرکر (ص ۱۱)، نیاز کرکر (ص ۱۵)، سرفراز کرکر (ص ۶)، مقرر کرکر (ص ۱۸)، خرید کرکر (ص ۲۴)، طلب کرکر (ص ۸۵)، یاد کرکر (ص ۲۲۳، ص ۳۲)، توبہ استغفار کرکر (ص ۱۷)، ارادہ کرکر (ص ۱۹)، محنت کشی کرکر (ص ۲۰۶)، تاکید کرکر (ص ۴۸)، دریافت کرکر (ص ۴۷)، استقبال کرکر (ص ۳۸)، سیر کرکر (ص ۱۴۱)، فراغت کرکر (ص ۲۴۳) ۔

[سرسید نے آثار الصنادید میں ایک جگہ لکھا ہے: "اگلی تاریخ کی کتابوں میں اس بازار کو لاہوری بازار کرکر لکھا ہے" (طبع دوم ص ۵۲) ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ

عہدِ سرسیّد تک یہ کلمہ استعمال میں رہا ہے، البتّہ یہ ضرور ہے کہ باغ و بہار میں اس کی مثالیں زیادہ ملتی ہیں]۔

"کر" جگہ جگہ اِس طرح آیا ہے کہ آج اُس میں اجنبی پن محسوس ہوتا ہے، جیسے: خیمہ چوبوں پر استادہ کر، طنابوں سے کھنچوایا (ص۸)، حمدِ حق اور نعتِ احمد کو یہاں کر انصرام (ص۹)، فقیر سے صحبت بہت گرم کر، مزے کی باتیں کرنے لگا (ص۲۳)، خدا خدا کر جب صبح نزدیک ہوئی (ص۲۶)، میں کئی دن سے دوڑ دھوپ کر...... پکڑ لایا ہوں (ص۱۷)۔

اِس جملے میں "ہو" بھی اسی طرح آیا ہے: اِس بات سے دِق ہو کہنے لگی (ص۴۲)۔
ضمیمہ الفاظ اور طریقِ استعمال میں افعال کی ایسی بیشتر اقسام کو یک جا کر دیا گیا ہے، تفصیل کے لیے اُسے دیکھا جا سکتا ہے۔

الفاظ: میر امّن کا یہ بڑا کمال ہے کہ اُنھوں نے لفظوں کی تراش اور کم معروف ہندی الفاظ کے برمحل استعمال کا نیا شعور بخشا ہے۔ دیدارو (خوب صورت) سُتّا ہو، بھیدو (محرمِ راز)، سرے پاو (خلعت)، سادی خوزادی، بچھا ہنڈسے چوچلے، بندیت خانہ، برپیچ، پرچھا، سُرت، اُبرالا جیسے بیسیوں لفظ اِس کتاب میں آئے ہیں، جن سے عبارت میں تازگی اور نیاپن پیدا ہو گیا ہے اور پہلی بار یہ اندازہ ہوتا ہے کہ پچھلے دنوں میں کیسے کیسے کام کے لفظ ہمارے پاس تھے، جن کو ہم چھوڑتے گئے اور بھولتے گئے۔ "چکمک" (چقماق)، "تالیقہ" اور "جمیرات" جیسے لفظ واقعتاً عام بول چال کی نمایندگی کرتے ہیں۔ اِسی طرح "مزاخ" اور اِس کی جمع "مزاخیں" عوامی استعمال کی نشان دہی کرتی ہیں۔ اُنھوں نے عربی کے بعض ساکن الاوسط الفاظ کو متحرک الاوسط کر لیا ہے، جیسے: نقَب؛ یہ بھی استعمالِ عام کی ترجمانی ہے۔ ضمیمہ ۳ میں چوں کہ ایسے بیشتر الفاظ کو یک جا کر دیا گیا ہے اور ضمیمہ ۲ میں تلفظ اور املا کی بحثیں آ گئی ہیں، اِس لیے یہاں زیادہ مثالوں کی ضرورت نہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ اِس کتاب میں خاص خاص افعال اور الفاظ ایک ایسا موضوع ہے جو مفصّل مطالعے کا مستحق ہے۔ اِس

مطالعے کے بغیر میر امّن کی نثر کے پورے محاسن نظروں کے سامنے نہیں آپائیں گے اور یہ اچھی طرح معلوم نہیں ہو پائے گا کہ اس کتاب نے اردو نثر میں ایک نئے اسلوب کی جو بنیاد رکھی تھی، اُس کے اجزائے ترکیبی کیا ہیں۔ اِس کی مقبولیت کا راز بھی اِسی پردے میں چھپا ہوا ہے۔

طریقِ کار :

اِس مقدّمے کے پہلے حصّے میں یہ وضاحت کی جاچکی ہے کہ باغ و بہار کے یہ پانچ نسخے پیشِ نظر رہے ہیں :

۱۔ خطّی نسخہ [روایتِ اوّل]	:	ن
۲۔ ہندی مینوئل	:	م
۳۔ طبعِ اوّل [۱۸۰۴ء]	:	ک
۴۔ مرتّبہ ڈنکن فاربس	:	ف
۵۔ مرتّبہ مولوی عبدالحق	:	ع

متن کی بنیاد ک پر رکھی گئی ہے۔ ک کے آخر میں طویل غلط نامہ شامل ہونے کے باوجود، متن میں طباعت کی بعض غلطیاں باقی رہ گئی ہیں؛ م، ف اور ن کی مدد سے اُن کی تصحیح کی گئی ہے اور ضمیمہ ۱ میں بہ ذیلِ اختلافِ نسخ ایسے جملہ مقامات کی نشان دہی کردی گئی ہے۔ اِس کا خاص طور پر لحاظ رکھا گیا ہے کہ سختی کے ساتھ اصل متن کی پابندی کو لازم سمجھا جائے۔ پوری کتاب میں صرف ایک جگہ ص ۷۰ پر "سے" کا اضافہ کیا گیا ہے۔ امتیاز کے لیے اِسے قوسین میں لکھا گیا ہے اور ضمیمۂ تشریحات میں (ص ۲۳۴، حاشیہ ③ کے تحت) اِس پر گفتگو کی گئی ہے کہ یہ اضافہ کیوں ضروری سمجھا گیا۔ اِس ایک اضافے کے علاوہ، کسی دوسری جگہ کوئی اضافہ نہیں کیا گیا۔

اِس سے پہلے یہ وضاحت کی جاچکی ہے کہ گل کرسٹ کے مقررہ نظامِ املا کے تحت ک میں اضافت کے زیر اور تشدید لگانے کا التزام ملتا ہے۔ اِسی طرح علامات اور

اعراب بھی ملتے ہیں۔ معروف و مجہول آوازوں کا تعین تو بہت التزام کے ساتھ کیا گیا ہے۔ اسی کی مطابقت میں اِس متن میں بھی اضافت کے زیر التزام کے ساتھ لگائے گئے ہیں اور یہی صورت تشدید کی ہے۔ اضافت کے سلسلے میں بہ طورِ عموم کـ کی مطابقت اختیار کی گئی ہے؛ مگر اضافت کا معاملہ یہ ہے کہ بہت سے مقامات پر ذہن میں کچھ اُلجھن پیدا ہوسکتی ہے [اور ہوئی ہے] کہ یہاں اضافت کا زیر آنا چاہیے تھا یا نہیں آنا چاہیے تھا۔ ایسے سارے مقامات پر [نشان کے طور پر] گول دائرے کے اندر حاشیے کا نمبر لکھا گیا ہے اور ضمیمۂ تشریحات میں ایسے سارے وضاحت طلب مقامات پر ضروری گفتگو کی گئی ہے۔

بعض الفاظ کی تذکیر و تانیث کے سلسلے میں وضاحت کی ضرورت محسوس کی گئی؛ ایسے سارے مقامات پر بھی گول دائرے کے اندر حاشیے کا نمبر لکھا گیا ہے اور اُس کے مطابق ضمیمۂ تشریحات میں حسبِ ضرورت مفصّل یا مختصر بحث کی گئی ہے۔ مثلاً ص ۹ پر "ساتھ سنگت" آیا ہے اور ص ۱۲ پر [پہلی بار] "جان و مال" آیا ہے، اِن پر مفصّل بحث بالترتیب ص ۲۷۳ پر حاشیہ ③ کے تحت اور ص ۲۷۷ کے حاشیہ ① میں دیکھی جاسکتی ہے [وغیرہ]۔

لفظوں میں ضرورت کے مطابق حروف پر زبر، زیر، پیش لگائے گئے ہیں اور جزم بھی لگایا گیا ہے۔ اصل کی مطابقت کے علاوہ، اِس کو یوں بھی ضروری سمجھا گیا کہ اب [کسی نہ کسی وجہ سے] تلفظ کا مسئلہ طلبہ اور اساتذہ، دونوں کے لیے پریشان کن ہوگیا ہے، خاص کر [اب] کم معروف اور نامانوس لفظوں کا صحیح طور پر پڑھنا بہت مشکل ہوگیا ہے۔ اِسی طرح معروف، مجہول، مخلوط اور غنّہ آوازوں کے تعیّن کے لیے علامات سے کام لیا گیا ہے۔ اِس کی تفصیل یہ ہے:

درمیانِ لفظ واقع یاے معروف کے نیچے چھوٹا سا الف لگایا گیا ہے، جیسے: تیر، چیل ——— یاے مجہول کے لیے حرفِ ماقبل کے نیچے زیر لگایا گیا ہے، جیسے: دیر، تیل ——— واوِ معروف پر اُلٹا پیش لگایا گیا ہے، جیسے: طور۔

چوُل ——— واوِ مجہول کے لیے حرفِ ماقبل پر پیش لگایا گیا ہے، جیسے: چوُرا
توُڑ ——— واوِ معدولہ کے نیچے چھوٹا سا خط کھینچا گیا ہے، جیسے: خوٗد۔ ایسے مقامات پر واو سے پہلے جو حرف ہے، اُس پر پیش نہیں لگایا گیا ——— مخلوط آوازوں کے لیے اُن حروف پر آٹھ کے ہندسے جیسا نشان بنایا گیا ہے، جیسے: کیٗا، پیٗاس، ہوٗئی (بروزنِ فع) ——— نونِ غنّہ پر اُلٹے قوس کا نشان بنایا گیا ہے، جیسے: مُنہ۔

کاما، سیمی کولن، ندائیہ، استفہامیہ جیسے رموزِ اوقاف کو پابندی کے ساتھ شاملِ عبارت کیا گیا ہے۔ خاص خاص ناموں پر خطِ ضرور کھینچا گیا ہے [اِس سلسلے کی پہلی کتاب فسانۂ عجائب میں بھی اِنھی علامات کو استعمال کیا گیا ہے اور اِسی طرح رموزِ اوقاف کی پابندی کی گئی ہے]۔ کُرّے کے متن میں جن جملوں کو قوسین کے اندر لکھا گیا ہے، اُن کو اُسی طرح قوسین کے اندر رکھّا گیا ہے۔ ایک خاص اہتمام یہ بھی کیا گیا ہے کہ جن مقامات پر جملے میں دو ٹکڑوں کے درمیان کاما نہیں آسکتا، مگر خواندگی کی آسانی کے لحاظ سے وہاں پر فصل ضروری ہے، تو ایسے مقامات پر دو لفظوں کے درمیان [کتابت میں] ذرا سا فصل رکھّا گیا ہے، تاکہ اِس طرح وہی فائدہ حاصل ہو سکے جو دوسرے مقامات پر کاما سے حاصل ہوتا ہے اور کسی طرح کی معنوی خرابی بھی پیدا نہ ہو۔ [فسانۂ عجائب میں بھی اِس کا التزام کیا گیا ہے]۔

اِس سلسلے کی پہلی کتاب فسانۂ عجائب کے متن میں صرف اختلافِ نسخ کے نمبرشمار ڈالے گئے تھے۔ بعد کو یہ محسوس کیا گیا کہ متن کے ایسے بہت سے مقامات ہیں پڑھنے والے کی نظر سرسری طور پر گزر جاتی ہے، جہاں اُسے رُکنا چاہیے تھا اور یہ معلوم ہونا چاہیے تھا کہ اِس مقام پر کوئی بات بحث طلب ہے یا کسی طرح کی تشریح کی ضرورت ہے۔ اِس کا اہتمام ضرور کیا جانا چاہیے کہ وضاحت طلب مقامات پر پڑھنے والے کی نظر رُکے اور وہ اُس وضاحت کو دیکھ سکے جو ضمیموں میں پیش کی گئی ہے۔ اِس بنا پر اِس کتاب میں یہ طریقہ اختیار کیا گیا کہ متن کے ہر صفحے پر نمبرشمار ڈالے گئے ہیں،

یہ نمبر دو طرح کے ہیں۔ جو نمبر شمار گول دائرے کے اندر ہیں، تو اُس کا مطلب یہ ہے کہ یہ مقام کسی نہ کسی لحاظ سے تشریح طلب ہے۔ اِس کے برخلاف جو نمبر معمول کے مطابق لکھے گئے ہیں [جیسے: ۱۲] تو یہ صرف اختلافِ نسخ کو ظاہر کرتے ہیں۔ جن لفظوں میں تلفّظ اور املا کے لحاظ سے کوئی بات تشریح طلب ہے، تو ایسے الفاظ پر پھول کا نشان بنا دیا گیا ہے، تاکہ پڑھنے والا پہلی ہی نظر میں سمجھ لے کہ اِس لفظ میں املا یا تلفّظ کے لحاظ سے کوئی بات بحث طلب ہے یا وضاحت طلب ہے۔

یہ ضرور واضح کر دیا جائے کہ علامات کے استعمال میں بہ قدرِ ضرورت کا خیال ضرور پیشِ نظر رہا ہے۔ مرتّب کی رائے میں جن مقامات پر اُن کو لانا ضروری تھا، اُنھی مقامات پر اُنھیں شاملِ عبارت کیا گیا ہے۔ مثلاً واوِ معدولہ کی علامت کو ہر جگہ نہیں لایا گیا، ایسے ہی مقامات پر اُسے لکھا گیا ہے جہاں کسی نہ کسی اعتبار سے اُس کی ضرورت محسوس کی گئی۔ مثلاً خوش، خود، خواجہ، خواہ مخواہ، خدا نخواستہ، خواہش، اُستخوان، خواب، درخواست، خوار، خوان جیسے عام لفظوں میں اِس علامت کو شامل کرنا ضروری نہیں سمجھا گیا۔ اِس کے برخلاف مثلاً "مے خوری" کے نیچے علامت لگائی گئی ہے۔ وجہ اِس کی یہ ہے کہ کے میں "مے خوری" اور "خوش خوری" کو مع واوِ معدولہ لکھا گیا ہے اور "غوطہ خور" کو مع واوِ مجہول لکھا گیا ہے۔ اِسی لیے اِسے "غُوطہ خُور" لکھا گیا ہے اور اُن دونوں کو "مے خوری" (ص ۶۲) اور "خوش خوری" (ص ۵۰) لکھا گیا ہے۔ اِسی طرح "خورجی"، "خورزادی"، "بھوئیڈ پیری"، "خورِش" جیسے لفظوں کو بھی مع علامت لکھا گیا ہے، اِس لیے کہ یہ نسبتاً کم معروف ہیں۔

"دو" سے مرکّب الفاظ بہ طورِ عموم کے میں مع واوِ معدولہ ملتے ہیں، [زبانوں پر بھی اِسی طرح ہیں] جیسے: دو رستہ، دو پارہ، دوگانہ، دو رویہ، دو زانو، دو بار؛ ایسے لفظوں میں واوِ معدولہ کی علامت کو شاملِ لفظ کرنا ضروری نہیں سمجھا گیا، البتّہ ضمیمۂ تشریحات میں احتیاطاً ایسے الفاظ کے ذیل میں صراحت ضرور کر دی گئی ہے۔

آخر میں تین ۳ ضمیمے شامل کیے گئے ہیں۔ پہلے ضمیمے میں چار طرح کے بیانات شامل ہیں: ① اختلافِ نسخ۔ ② تشریح طلب مقامات کی وضاحت۔ ③ اشخاص، مقامات اور عمارتوں سے متعلق ضروری تفصیلات۔ ④ انتخابِ اشعار۔ اِس کتاب میں اشعار اِس قدر کم ہیں[1] کہ الگ سے ایک ضمیمے کا مسالا اکٹھا نہیں ہو پاتا، اِس لیے اُن کو بھی اِسی کے ذیل میں رکھا گیا ہے۔

دوسرا ضمیمہ تلفّظ اور املا کے مباحث سے متعلق ہے۔ باغ و بہار میں بہت سے لفظ تلفّظ یا املا کے لحاظ سے آج کے قاری کو بحث طلب معلوم ہوں گے۔ مثلاً میر امّن نے ہر جگہ "چھپنا" لکھا ہے، جب کہ دِلّی والے اب "چھُپنا" بولتے ہیں۔ یا میر امّن نے ہر جگہ "اعلا" اور "ادنا" لکھا ہے یا جیسے اُنھوں نے "نَقب" لکھا ہے۔ [گنجِ خوبی میں اُنھوں نے ایسے کئی لفظوں کو متحرک الاوسط نظم کیا ہے۔ مثلاً "نَفَع" (نسخۂ مطبوعۂ دہلی یونی ورسٹی، ص ۲۶۳) "عِطَر" (ص ۲۰۵) "سَہَل" (ص ۲۲۷)]۔ ایسی ہی اور بہت سی مثالیں ہیں۔ ایسے تمام الفاظ کے تلفّظ یا املا کے سلسلے میں مفصّل یا ضرورت کے لحاظ سے مختصر بحث کی گئی ہے اور کوشش کی گئی ہے کہ اہم بحثوں کے تحت ضروری تفصیلات کو یک جا کر دیا جائے۔ کوئی شخص، خاص کر کوئی اُستاد اگر ایسے مباحث سے دل چسپی رکھتا ہے اور پوری ذمّے داری کے ساتھ اِس متن کو پڑھانا چاہتا ہے اور

---

[1] باغ و بہار میں شامل اشعار کی تفصیل یہ ہے: میر امّن کی عرضی میں دو ۲ شعر آئے ہیں [جن میں سے ایک شعر فردوسی کا ہے]۔ ۹ شعر حمد و نعت کے بیان میں آئے ہیں [یہ سب شعر خود میر امّن کے ہیں]۔ بارہ شعر کا ایک قطعہ کتاب کے آخر میں آیا ہے، خاتمۂ کتاب کے طور پر۔ [یہ بھی میر امّن کا ہے]۔ اِن کے علاوہ ۱۴ شعر اور ہیں، جن میں سے دو دو ۲ شعر تو پانچوں قصّوں کے آغاز میں تمہیدی بیان کے طور پر آئے۔ یہ کل دس شعر ہوئے [بہ ظاہر یہ بھی میر امّن کے کہے ہوئے ہیں]۔ اِس طرح اصل داستان میں کُل بارہ شعر آئے ہیں۔ ایک دوہا ہے (ص ۱۷۰ یہ)۔—— اشعار کے علاوہ متن میں تین کبت بھی شامل ہیں (ص ۸۱، ص ۹۲ اور ص ۱۳۷ پر)۔ اِن میں سے پہلے دو کبت ["نکھ ہوں کٹا دیکھے...." اور "جب ذات نہ تھے...."] نوطرزِ مرصّع میں بھی موجود ہیں۔ آخری کبت ["روٹھے کیوں نہ راجا...."] میر امّن کا اضافہ ہے۔

اُس کے لیے پہلے خود ان مسائل کو سمجھنا چاہتا ہے، تو اُس کے لیے ضروری مواد یک جا ہو جائے۔

ضمیمہ ۲ میں تلفظ یا املا کے سلسلے میں بھی ضمنی طور پر بعض اُمور زیرِ بحث آ گئے ہیں۔ اِس کے لیے یہ طریقہ اختیار کیا گیا ہے کہ ضمیمۂ تلفظ و املا میں [حروفِ تہجّی کے مطابق] اُس لفظ کو درج کر کے، اُس کے آگے ضمیمۂ تشریحات کے اُس صفحے کا اور حاشیے کا نمبر لکھ دیا گیا ہے جہاں وہ زیرِ بحث آیا ہے۔

تیسرا ضمیمہ افعال، الفاظ اور طریقۂ استعمال پر مشتمل ہے۔ میر امّن کی نثر میں طرح طرح کے مفرد اور مرکّب افعال ملتے ہیں؛ بہت سے جملوں کی بناوٹ بہ طورِ خاص توجّہ طلب ہے اور بہت سے لفظ بھی قابلِ توجّہ ہیں؛ کوشش کی گئی ہے کہ ایسی زیادہ سے زیادہ مثالوں کو یک جا کر دیا جائے۔ میر امّن کی زبان اور اُن کے اسلوب کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے اور اُس کی وسعت اور رنگا رنگی کا اندازہ کرنے کے لیے اِس ضمیمے کا مطالعہ افادیت سے خالی نظر نہیں آئے گا۔ ہاں یہ وضاحت کر دی جائے کہ اکثر ایک لفظ کے سامنے ایک ہی صفحے کا نمبر لکھا گیا ہے، لیکن لازمی طور پر اِس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ لفظ بس اُسی ایک صفحے پر آیا ہے۔ البتہ بعض خاص الفاظ کے ذیل میں اِس طریقے کا رسے انحراف کیا گیا ہے، مثلاً "بندی خانہ" قید خانے کے معنی میں اب بالکل اجنبی لفظ ہے؛ اِس لفظ کے آگے اُن سب صفحات کا نمبر لکھ دیا گیا ہے جہاں یہ آیا ہے۔

مفصّل فرہنگ کو شاملِ کتاب کیا گیا ہے۔ اِس سلسلے میں یہ وضاحت ضروری ہے کہ لفظ کے وہی معنی لکھے گئے ہیں، جن معنوں میں وہ اُس مقام پر استعمال میں آیا ہے۔ خاص خاص الفاظ کے سامنے اُس صفحے کا نمبر بھی لکھ دیا گیا ہے جہاں وہ اُس معنی میں (پہلی بار) آیا ہے۔ ضروری مقامات پر معانی کے ذیل میں مآخذ کا حوالہ بھی دے دیا گیا ہے۔ اگر ایک لفظ ایک سے زیادہ معنی میں آیا ہے، تو اُس کی صراحت ضرور کر دی گئی ہے، مثلاً لفظ "بکاول" کے ذیل میں لکھا گیا ہے: "بکاول

(ص ۷۷-۱۵۵) : اِس لفظ کے کئی معنی ہیں : باورچی ——— باورچی خانے کا داروغہ؛ وہ شخص جو امرا و سلاطین کے سامنے کھانا چُنے [نور] - ص ۱۵۵ پر پہلے معنی میں آیا ہے اور ص ۷۷ پر آخری معنی میں" یا جیسے : "بھدئی" (ص ۸۸) : حمّال [سامان اُٹھانے والا] - ص ۹۱ : کہار [ڈولی اُٹھانے والے] "- یا جیسے "توقّف" ؛ یہ لفظ چار معنوں میں آیا ہے، اِس لیے اِسے معنوں کے لحاظ سے الگ الگ لکھا گیا ہے : ① "توقّف کا مکان نہیں" (۱۴۹) : یہ ٹھہرنے کی جگہ نہیں۔ ② توقّف کرو (۱۵۳) : رُک جاؤ، ٹھہر جاؤ [ابھی سزا نہ دو] - ③ توقّف کیجیے (۷۹) : انتظار کیجیے، ٹھہریے۔ ④ توقّف ہوگا (۲۴۴) : اگر دیر ہوگی، تاخیر ہوگی"۔ مآخذ کے سلسلے میں "نور" سے مراد نوراللغات ہے، "اصطلاحات" سے فرہنگِ اصطلاحاتِ پیشہ وراں اور آصفیہ سے فرہنگِ آصفیہ مراد ہے۔

آخر میں اشاریہ ہے اور یہ صرف متنِ کتاب کے مندرجات پر مشتمل ہے — یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ مقدمے کے صفحات پر نمبر شمار الگ سے ڈالے گئے ہیں اور اصل متن نئے نمبر شمار سے شروع ہوتا ہے۔

اِس کتاب میں آٹھ صفحوں کا عکس بھی شامل کیا گیا ہے، جن میں سے پانچ صفحے تو باغ و بہار طبعِ اوّل سے تعلّق رکھتے ہیں، اِس تفصیل کے ساتھ: طبعِ اوّل کے سرورق کے پہلے صفحے کا عکس، اِسے مقدمۂ مرتّب کے بعد اور اصل متن کے شروع ہونے سے پہلے ص ۱ کے طور پر شامل کیا گیا ہے۔ کتاب کے آخر میں ایک صفحہ تو طبعِ اوّل میں شامل میر امّن کی عرضی کا عکس ہے۔ اِس کا مقصد یہ ہے کہ اُس اشاعت کی طباعت کا ایک مکمّل نمونہ سامنے آجائے۔ طبعِ اوّل سے متعلّق باقی تین صفحوں میں سے ایک صفحہ تو وہ ہے جس میں گِل کرسٹ کا پیش لفظ ہے۔ ایک صفحہ وہ ہے جو انتساب سے تعلّق رکھتا ہے اور ایک صفحہ طبعِ اوّل کا آخری صفحہ ہے۔ یہ تینوں صفحے انگریزی میں ہیں۔ اِن کے علاوہ دو صفحے ہندی مینول سے متعلّق ہیں: ایک تو سرورق کے پہلے صفحے کا عکس ہے اور دوسرا اُس کتاب کا آخری صفحہ ہے۔ اِن

دونوں صفحات سے ہندی مینول کے مندرجات اور سنہ طباعت کی تفصیلات سامنے آجاتی ہیں۔ آخر میں مخطوطۂ گنج خوبی بہ خطِ میر امّن کے ایک صفحے کا عکس ہے۔

اِس سلسلے کی پہلی کتاب فسانۂ عجائب تھی جس طرح اُسے پسندیدگی کی نظر سے دیکھا گیا اور اہلِ نظر نے اُس کی خوبیوں کا اعتراف کیا' اُس سے کام کرنے کا حوصلہ بڑھا۔ توقع کرتا ہوں کہ یہ کتاب بھی، جو اُسی سلسلے کی دوسری کڑی ہے' قبولِ عام کے شرف سے محروم نہیں رہے گی اور طالب علموں، خاص کر اساتذہ کے لیے کار آمد اور مفید ثابت ہوگی۔ اِس سلسلے کی چار کتابیں اور میری نظر میں ہیں: نوطرزِ مرصّع، مثنوی سحر البیان، مثنوی گلزارِ نسیم اور قصائدِ سودا کا مجموعہ۔ اگر صحت نے ساتھ دیا اور حالات نے موافقت کی' تو یہ کتابیں بھی اِسی انداز پر مرتب ہوں گی اور اہم کلاسکی متنوں کے پڑھنے اور پڑھانے میں وہ ضروری آسانیاں فراہم کر سکیں گی جن کی آج بہت ضرورت ہے۔

اِس کتاب کے سلسلے میں متعدد حضرات نے مختلف اعتبارات سے مدد کی ہے۔ اِس ضمن میں سب سے پہلا نام ڈاکٹر صدیق الرحمان قدوائی کا ہے' جنھوں نے ہندی مینول کو تلاش کیا تھا۔ ڈاکٹر عبدالستار دلوی کی وساطت سے جناب قاسم دلوی سے نیاز حاصل ہوا اور موصوف نے بڑی فراخ دلی کے ساتھ ہندی مینول کا عکس بھیجا' جس کے بغیر یہ کام مکمل ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ ڈاکٹر مختار الدین آرزو سے ہندی مینول میں شامل باغ و بہار کے صفحات کا مجموعہ ملا تھا۔ مالک رام صاحب نے انڈیا آفس لندن کی لائبریری میں محفوظ باغ و بہار کی اشاعتِ اوّل کے آخری تین صفحات کا عکس منگوا کر دیا۔ اِن میں سے آخری دو صفحے میرے پیشِ نظر نسخے میں موجود نہیں تھے۔ [اِن دونوں صفحوں کا عکس اِس کتاب کے آخر میں شامل کر دیا گیا ہے]۔ ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی (اُستادِ شعبۂ اُردو' بنارس ہندو یونی ورسٹی) نے میری درخواست پر عربی کے ایک مشہور قول کے سلسلے میں عربی کی متعدد ضخیم کتابوں کی ورق گردانی کی (اُن کے مکتوب کی عبارت ص ۳۹۲ پر مندرج ہے)۔ ڈاکٹر گیان چند جین' ڈاکٹر حنیف نقوی' ڈاکٹر نیّر مسعود رضوی اور جناب شمس الرحمان فاروقی سے بعض مسائل کے سلسلے میں مشورہ کیا گیا۔ جناب رئیس نعمانی اور ایم حبیب خاں صاحب

نے میری خاطر دو دفعہ مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ میں بعض نسخوں کو تلاش کیا۔ اکبر علی خاں نے گل کرسٹ کے رسالۂ رسمِ خط کا عکس فراہم کیا، جو میر شیر علی افسوس کی کتاب باغِ اردو کی اشاعتِ اوّل میں شامل تھا۔ اِس کتاب کی یہ اشاعت میری دسترس سے باہر تھی۔ اِس سے متعلق حفیظ الدّین کی ایک عبارت کی نقل بھی فراہم کی۔ ڈاکٹر یونس اگاسکر نے بمبئی یونی ورسٹی کے کتاب خانے میں محفوظ ڈنکن فاربس کی مرتبہ باغ و بہار کے دوسرے اور تیسرے اڈیشن اور اُس کے انگریزی ترجمے سے متعلق تفصیلات بھیجیں۔ اِن سب حضرات کا شکریہ ادا کیا جاتا ہے۔

آخر میں ڈاکٹر خلیق انجم کا خاص طور پر شکریہ ادا کرتا ہوں۔ اِس زمانے میں حالات کے دباؤ کی وجہ سے اِس قدر ضخیم کتاب کو چھاپنا دوسرے ناشرین کے لیے مشکل ہوتا۔ خلیق صاحب نے بہت خوش دلی کے ساتھ اور بہت دل چسپی کے ساتھ اِس کی کتابت اور طباعت کے مراحل کو طے میں معاونت کی اور اِس سے پہلے اِس کام کو جلد تر مکمّل کرنے کے لیے برابر اصرار کرتے رہے۔ اور ہاں، ایک ضروری بات تو رہی جا رہی ہے۔ سیّد ابوجعفر زیدی صاحب نے جس احتیاط اور اہتمام کے ساتھ اِس متن کی کتابت کی ہے اور التزامات کی پابندی کی ہے، یہ بہت مشکل کام تھا۔ اُن کا شکریہ خاص طور پر ادا کرتا ہوں۔

رشید حسن خاں
گائر ہال، دہلی یونی ورسٹی، دہلی
۲۸ جولائی ۱۹۹۱ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

باغ و بہار

واسطے زُبدۂ نوئینانِ عالیشان اشرف خاص شاہ کیوان بارگاہ انگلستان مارکوئیس
ولزلی گورنر جنرل بہادر دام افضالہٗ کے جو حامی و حافظ مدرسے کے ہیں

ماخذ اُسکا نو طرز مُرصّع وُہ ترجمہ کیا ہوا عطا حسین خاں کا ہی
فارسی قصۂ چار درویش سے

جانِ گلکرسٹ صاحب والا شان ذوی القدر کی فرمایش سے
تالیف کیا ہوا میر امن دلی والے کا

رُشتہ و شُستہ ہوں ہیں جن الفاظ کو جس پانی سے
دُر رو ہی آب گہر سب منھ پہ اُسکے وُہ زُلال
خامہ کوتاہی میرا ہی جو فصاحت ایک چیز
سنو زباں کی ہی میری خاک منہ لے زر و مال
ختم اب کرتا ہی سو یہ مدعا اہی خامہ
دوست ہوں شاد تیرے اور ہوں دشمن پامال

ہندوستانی چھاپہ خانہ
سنہ ۱۸۰۳ عیسوی مطابق سنہ ۱۲۱۸ ہجری کے

باغ و بہار طبع اوّل کے سرورق کا پہلا صفحہ

(۱) نقل عرضی کی، جو مدرسے (۲) کے مختار کار (۳) صاحبوں کے حضور میں دی گئی :

صاحبانِ والاشان، نجیبوں کے قدردانوں کو خدا سلامت رکھے۔
اِس بے وطن نے حکم اِشتہار (۴) کا سُن کر، چار درویش
کے قصے کو، ہزار جدّوکدّ سے اُردوئے مُعلّا (۵) کی زبان (۶) میں باغ و بہار
بنایا۔ فضلِ الٰہی سے سب صاحبوں کے سیر کرنے کے باعث سرسبز
ہوا۔ اب اُمیدوار ہوں کہ اِس کا پھل مجھے بھی ملے، تو میرا غنچۂ دل
مانندِ گُل کے کھلے۔ بہ قولِ حکیم فردوسی کے، کہ شاہ نامے میں کہا
ہے :

بسے رنج بُردم دریں سال سی (۷) عجم زندہ کردم بہ ایں پارسی
سو اُردو کی آراستہ کر زباں کیا میں نے بنگالا (۸) ہندوستاں (۹)

خداوند (۱۰)! آپ قدردان ہیں، حاجت عرض کرنے کی نہیں۔
الٰہی (۱۱)! تارا اقبال کا چمکتا رہے۔

عرضی میر امّن دِلّی والے کی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سبحان اللہ! کیا صانع ہے کہ جس نے ایک مٹھی خاک سے، کیا کیا (1) صورتیں اور مٹی کی مورتیں پیدا کیں۔ باوجود دو رنگ کے، ایک گورا، ایک کالا؛ اور یہی ناک کان، ہاتھ پانو سب کو دیے ہیں، تس پر رنگ بہ رنگ کی شکلیں جدی جدی بنائیں، کہ ایک کی سج دھج سے (2) دوسرے کا ڈیل ڈول ملتا نہیں۔ کروڑوں خلقت میں جس کو چاہیے، پہچان لیجے۔ آسمان اس کے دریائے وحدت کا ایک بلبلا ہے اور زمین پانی کا بتاشا؛ لیکن یہ تماشا ہے کہ سمندر ہزاروں لہریں مارتا ہے، پر اس کا بال بیکا نہیں کر سکتا۔ جس کی یہ قدرت اور سکت ہو، اس کی حمد و ثنا میں زبان انسان کی گویا گونگی ہے؛ کہے تو کیا کہے! بہتر یوں ہے کہ جس بات میں دم نہ مار سکے، چپکا ہو رہے۔

عرش سے لے فرش تک جس کا کہ یہ سامان ہے
حمد اس کی گر لکھا چاہوں، تو کیا امکان ہے
جب پیمبر نے کہا ہو: "میں نے پہچانا نہیں" (5)
پھر جو کوئی دعویٰ کرے اس کا، بڑا نادان ہے
رات دن یہ مہر و مہ پھرتے ہیں صنعت دیکھتے
پر ہر اک، (6) واحد کی صورت، دیدۂ حیران ہے

جس کا ثانی اور مقابل ہے نہ ہووے گا کبھو
ایسے یکتا کو خدائی سب طرح شایان ہے
لیکن اتنا جانتا ہوں خالق و رازق ہے وہ
ہر طرح سے مجھ پر اُس کا لطف اور احسان ہے (۴)

اور دُرود اُس کے دوست پر، جس کی خاطر زمین اور آسمان کو پیدا کیا اور درجہ رسالت کا دیا۔

جسمِ پاکِ مصطفیٰ اللہ کا اک نور ہے
اس لیے پرچھائیں اُس قد کی نہ تھی، مشہور ہے
حوصلہ میرا کہاں اتنا، جو نعت اُس کی کہوں
پر سخن گویوں کا یہ بھی قاعدہ، دستور ہے (۸)

اور اُس کی آل پر صلوٰۃ و سلام، جو ہیں بارہ امام۔ (۹)

حمدِ حق اور نعتِ احمد کو یہاں کر اختصار
اب میں آغاز اُس کو کرتا ہوں، جو ہے منظور کام
یا الٰہی! واسطے اپنے نبی کی آل کے
کر یہ میری گفتگو مقبولِ طبعِ خاص و عام (۱۴)

منشا اس تالیف کا یہ ہے کہ سنہ ایک ہزار دو سو پندرہ برس ہجری، اور اٹھارہ سے ایک سال عیسوی، مطابق ایک ہزار دو سو سات سنہ فصلی کے، عہد میں اشرف الاشراف مارکوئس ولزلی (۱۶) گورنر جنرل (۱۷) لارڈ مارننگٹن (۱۸) صاحب کے [جن کی تعریف میں عقل حیران (۱۹) اور فہم سرگردان ہے۔ جتنے وصف سرداروں کو چاہییں، (۲۰)

ان کی ذات میں خدا نے جمع کیے ہیں۔ غرض قسمت کی خوبی اس ملک کی تھی جو ایسا
حاکم تشریف لایا، جس کے قدم کے فیض سے ایک عالم نے آرام پایا۔ مجال نہیں کہ
کوئی کسو پر زبردستی کر سکے۔ شیر اور بکری ایک گھاٹ پانی پیتے ہیں۔ سارے غریب و
غربا دعا دیتے ہیں اور جیتے ہیں] چرچا علم کا پھیلا۔ صاحبانِ ذی شان کو شوق ہوا کہ
اردو کی زبان سے واقف ہو کر، ہندوستانیوں سے گفت و شنود کریں اور ملکی کام
کو بہ آگاہیِ تمام انجام دیں؛ اس واسطے کتنی کتابیں اسی سال بموجب فرمایش کے تالیف[2] ہوئیں۔

جو صاحب دانا اور ہندوستان کی زبان بولنے والے ہیں، ان کی خدمت میں
گزارش کرتا ہوں کہ یہ قصہ چار درویش کا ابتدا میں امیر خسرو دہلوی نے اس
تقریب سے کہا کہ حضرت[5] نظام الدین اولیا زری زر بخش، جو ان کے پیر تھے،
اور درگاہ ان کی دلی[6] میں قلعے سے تین کوس، لال دروازے[7] کے باہر، متیا دروازے[8] سے
آگے، لال بنگلے[9] کے پاس ہے؛ ان کی طبیعت ماندی ہوئی؛ تب مرشد کے دل بہلانے
کے واسطے امیر خسرو[11] یہ قصہ ہمیشہ کہتے اور بیمارداری میں حاضر رہتے۔ اللہ نے چند روز
میں شفا دی، تب انھوں نے غسلِ صحت کے دن یہ دعا دی کہ: جو کوئی اس قصے
کو سنے گا، خدا کے فضل سے تندرست رہے گا۔ جب سے یہ قصہ فارسی میں
مروج ہوا۔

اب خداوندِ نعمت، صاحبِ مروت، نجیبوں کے قدردان جان[15] گل کرسٹ[16]
صاحب نے (کہ ہمیشہ اقبال ان کا زیادہ رہے، جب تلک گنگا جمنا بہے) لطف[18] سے
فرمایا کہ اس قصے کو ٹھیٹھ ہندوستانی گفتگو میں، جو اردو کے لوگ ہندو مسلمان، عورت مرد،

لڑکے بالے، خاص و عام آپس میں بولتے چالتے ہیں، ترجمہ کرو۔ موافق حکم حضور کے میں نے بھی اُسی محاورے سے لکھنا شروع کیا جیسے کوئی باتیں کرتا ہے۔

پہلے اپنا احوال یہ عاصی، گنہگار میر امن دلّی والا بیان کرتا ہے کہ میرے بزرگ ہمایوں بادشاہ کے عہد سے، ہر ایک بادشاہ کی رکاب میں، پُشت بہ پُشت جاں فشانی بجالاتے رہے۔ اور وہ بھی پرورش کی نظر سے، قدردانی جتنی چاہیے، فرماتے رہے۔ جاگیر و منصب اور خدمات کی عنایات سے سرفراز کرکر مالامال اور نہال کر دیا اور "خانہ زادِ موروثی" اور "منصب دارِ قدیمی" زبانِ مبارک سے فرمایا؛ چناں چہ یہ لقب بادشاہی دفتر میں داخل ہوا۔

جب ایسے گھر کی (کہ سارے گھر اُس گھر کے سبب آباد تھے) یہ نوبت پہنچی کہ ظاہر ہے، عیاں راچہ بیاں؛ تب سورج مل جاٹ نے جاگیر کو ضبط کرلیا، اور احمد شاہ دُرّانی نے گھر بار تاراج کیا۔ ایسی ایسی تباہی کھاکر، ویسے شہر سے (کہ وطن اور جنم بھوم میرا ہے۔ اور آنول نال وہیں گڑا ہے) جلا وطن ہوا، اور ایسا جہاز (کہ جس کا ناخدا بادشاہ تھا) غارت ہوا؛ میں بے کسی کے سمندر میں غوطے کھانے لگا۔ ڈوبتے کو تنکے کا آسرا بہت ہے؛ کتنے برس بلدۂ عظیم آباد میں دم لیا۔ کچھ بنی، کچھ بگڑی۔ آخر وہاں سے بھی پانو اُکھڑے، روزگار نے موافقت نہ کی۔ عیال و اطفال کو چھوڑ کر، تنِ تنہا کشتی پر سوار ہو، اشرف البلاد کلکتے میں آب و دانے کے زور سے آپہنچا۔ چندے بے کاری گزری۔ اتفاقاً نواب دلاور جنگ نے بلوا کر اپنے چھوٹے بھائی میر محمد کاظم خاں کی اتالیقی کے

واسطے مقرر کیا۔ قریب دو سال کے وہاں رہنا ہوا، لیکن نباہ اپنا نہ دیکھا، تب [١] منشی میر بہادر علی جی کے وسیلے سے حضور تک جان گل کرسٹ صاحب بہادر دام اقبالہٗ کے رسائی ہوئی۔ بارے طالع کی مدد سے ایسے جواں مرد کا دامن ہاتھ لگا ہے، چاہیے کہ دن کچھ بھلے آویں۔ نہیں تو یہ بھی غنیمت ہے کہ ایک ٹکڑا کھا کر پانو پھیلا کر سو رہتا ہوں، اور گھر میں دس آدمی چھوٹے بڑے پرورش پاکر دعا اس قدردان کو کرتے ہیں، خدا قبول کرے۔

حقیقت اردو کی زبان کی بزرگوں کے منہ سے یوں سنی ہے کہ دلی شہر ہندوؤں کے نزدیک چوجگی ہے۔ انھیں کے راجا پرجا قدیم سے رہتے تھے اور اپنی بھاکھا [٢] بولتے تھے۔ ہزار برس سے مسلمانوں کا عمل ہوا۔ سلطان محمود غزنوی آیا، پھر غوری اور لودی بادشاہ ہوئے۔ اس آمد و رفت کے باعث کچھ زبانوں نے ہندو مسلمان کی آمیزش پائی۔ آخر امیر تیمور نے (جن کے گھرانے میں اب تلک نام نہاد سلطنت کا چلا جاتا ہے) ہندوستان کو لیا۔ ان کے آنے اور رہنے سے لشکر کا بازار شہر میں داخل ہوا، اس واسطے شہر کا بازار "اردو" کہلایا۔ [٧] [٨] پھر ہمایوں بادشاہ، پٹھانوں کے ہاتھ سے حیران ہوکر ولایت گئے۔ آخر وہاں سے آن کر پس ماندوں کو گوشمالی دی، کوئی مفسد باقی نہ رہا کہ فتنہ و فساد برپا کرے۔

جب اکبر بادشاہ تخت پر بیٹھے، تب چاروں طرف کے ملکوں سے سب قوم، قدردانی اور فیض رسانی اس خاندان لاثانی کی سن کر، حضور میں آکر جمع

ہوئے؛[1] لیکن ہر ایک کی گویائی اور بولی جُدی جُدی تھی۔ اِکٹھے ہونے سے آپس میں
لین دین، سودا سُلَف، سوال جواب کرتے ایک زُبان اُردو[2] کی مقرّر ہوئی۔

جب حضرت شاہ جہاں صاحبِ قِران[3] نے قلعۂ مبارک[4] اور جامع مسجد[5] اور
شہر پناہ[6] تعمیر کروایا[7]، اور تختِ طاؤس[8] میں جواہر[9] جڑوایا، اور دَل بادَل[10] سا خیمہ
چوبوں پر استادکر طنابوں سے کھنچوایا[11]، اور نواب[12] علی مردان خاں[13] نہر کو لے کر
آیا؛ تب بادشاہ نے خوش ہو کر جشن[14] فرمایا اور شہر کو اپنا دارُالخلافت[15] بنایا؛ تب
سے شاہ جہان آباد مشہور ہوا (اگرچہ دِلّی[16] جُدی ہے۔ وُہ[17] "پُرانا شہر" اور یہ "نیا شہر"
کہلاتا ہے) اور[18] وہاں کے بازار کو "اُردوئے مُعلّا"[19] خطاب دیا۔

امیر تیمور کے عہد سے محمد شاہ[20] کی بادشاہت، بلکہ احمد شاہ[21] اور عالمگیر ثانی[22]
کے وقت تک[23]، پیڑھی بہ پیڑھی سلطنت یکساں چلی آئی؛ ندان[24] زُبان اُردو کی
منجتے منجتے ایسی منجی کہ کسو شہر کی بولی اس سے ٹکر نہیں کھاتی؛ لیکن قدر دانِ[25]
منصف چاہیے، جو[26] تجویز کرے۔ سو اب[27] خدا نے بعد مدت کے جان گل کرسٹ
صاحب سا دانا، نکتہ رس پیدا کیا کہ جنھوں نے اپنے گیان اور آگت[28] سے اور
تلاش و محنت سے قاعدوں کی کتابیں تصنیف کیں؛ اِس سبب سے ہندوستان[29]
کی زُبان کا ملکوں میں رواج ہوا اور نئے سر[30] سے رونق زیادہ ہوئی۔ نہیں تو
اپنی دستار و گفتار و رفتار کو کوئی بُرا نہیں جانتا۔ اگر ایک گنوار سے پوچھیے تو شہر[31]
والے کو نام رکھتا ہے اور اپنے تئیں سب سے بہتر سمجھتا ہے۔ خیر، عاقلاں خود می
دانند۔

جب احمد شاہ ابدالی[32] کابل سے آیا اور شہر کو لٹوایا؛ شاہ عالم[33] پورب کی

طرف تھے، کوئی وارث اور مالک ملک کا نہ رہا، شہر بے شہر ہوگیا۔ سچ ہے: بادشاہت کے اقبال سے شہر کی رونق تھی، ایک بارگی تباہی پڑی۔ رئیس وہاں کے، ایک کہیں تم کہیں ہوکر، جہاں جس کے سینگ سمائے، وہاں نکل گئے۔ جس ملک میں پہنچے، وہاں کے آدمیوں کی ساتھ سنگت سے بات چیت میں فرق آیا۔ اور بہت ایسے ہیں کہ دس پانچ برس کسو سبب سے دلی میں گئے اور رہے، وہ بھی کہاں تلک بول سکیں گے، کہیں نہ کہیں چوک ہی جائیں گے۔ اور جو شخص سب آفتیں سہہ کر، دلی کا روڑا ہوکر رہا، اور دس پانچ پشتیں اُسی شہر میں گزریں، اور اُس نے دربار اُمراؤں کے اور میلے ٹھیلے، عرس، چھڑیاں، سیر تماشا اور کوچہ گردی اُس شہر کی مدت تلک کی ہوگی، اور وہاں سے نکلنے کے بعد اپنی زبان کو لحاظ میں رکھا ہوگا، اُس کا بولنا البتہ ٹھیک ہے۔ یہ عاجز بھی ہر ایک شہر کی سیر کرتا اور تماشا دیکھتا یہاں تلک پہنچا ہے۔

شروع قصّے کا

اب آغاز قصّے کا کرتا ہوں، ذرا کان دھر کر سُنو اور مُنصفی کرو۔ سیر میں چار درویش کی یوں لکھا ہے اور کہنے والے نے کہا ہے کہ آگے رُوم کے مُلک میں کوئی شہنشاہ تھا کہ نوشیرواں کی سی عدالت اور حاتم کی سی سخاوت اُس کی ذات میں تھی۔ نام اُس کا آزاد بخت اور شہر قسطنطنیہ[2] (جس کو اِستنبول کہتے ہیں) اُس کا پایۂ تخت تھا۔ اُس کے وقت میں رعیت آباد، خزانہ معمور، لشکر مرفّہ، غریب غربا آسودہ؛ ایسے چین سے گزران کرتے اور خوشی سے رہتے کہ ہر ایک کے گھر میں دن عید اور رات شبِ[3] برات تھی۔ اور جتنے چور چکار، جیب کترے، صبح خیزیے، اُٹھائی گیرے، دغاباز تھے، سب کو نیست و نابود کر کر، نام[5] و نشان اُن کا اپنے مُلک بھر میں نہ رکھا تھا۔ ساری رات دروازے گھروں کے بند نہ ہوتے اور دُکانیں بازار کی کُھلی رہتیں۔ راہی، مُسافر جنگل میدان میں سونا اُچھالتے چلے جاتے؛ کوئی نہ پوچھتا کہ تمھارے مُنھ میں کَے دانت ہیں اور کہاں جاتے ہو؟

اُس بادشاہ کے عمل میں ہزاروں شہر تھے اور کئی سلطان نعل بندی دیتے۔ ایسی بڑی سلطنت پر ایک ساعت اپنے دل کو خدا کی یاد اور بندگی سے غافل نہ کرتا۔ آرام دُنیا کا، جو چاہیے، سب موجود تھا؛ لیکن فرزند (کہ زندگانی کا پھل ہے) اُس کی قسمت کے باغ میں نہ تھا۔ اِس خاطر اکثر فکرمند رہتا اور پانچوں وقت کی نماز کے بعد اپنے کریم سے کہتا کہ اے اللہ! مجھ عاجز کو تو نے اپنی عنایت سے سب کچھ دیا، لیکن ایک اِس اندھیرے گھر کا دیا نہ دیا۔ یہی ارمان جی میں باقی ہے کہ میرا

نام لیوا اور پانی دیوا کوئی نہیں۔ اور تیرے خزانۂ غیب میں سب کچھ موجود ہے، ایک بیٹا جیتا جاگتا مجھے دے، تو میرا نام اور اس سلطنت کا نشان قائم رہے۔

اسی امید میں بادشاہ کی عمر چالیس برس کی ہوگئی۔ ایک دن شیش محل میں نماز ادا کر کر وظیفہ پڑھ رہے تھے، ایک بارگی آئینے کی طرف خیال جو کرتے ہیں، تو ایک سفید بال مونچھوں میں نظر آیا کہ مانند تارِ مقیش کے چمک رہا ہے۔ بادشاہ دیکھ کر آب دیدہ ہوئے اور ٹھنڈی سانس بھری۔ پھر دل میں اپنے سوچ کیا کہ افسوس! تو نے اتنی عمر ناحق برباد دی اور اس دنیا کی حرص میں ایک عالم کو زیر و زبر کیا۔ اتنا ملک جو لیا، اب تیرے کس کام آوے گا! آخر یہ سارا مال اسباب کوئی دوسرا اڑاوے گا۔ تجھے تو پیغام موت کا آچکا۔ اگر کوئی دن جیے بھی، تو بدن کی طاقت کم ہوگی؛ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ میری تقدیر میں نہیں لکھا کہ وارث چھتر اور تخت کا پیدا ہو۔ آخر ایک روز مرنا ہے اور سب کچھ چھوڑ جانا ہے؛ اس سے یہی بہتر ہے کہ میں ہی اسے چھوڑ دوں اور باقی زندگی اپنے خالق کی یاد میں کاٹوں۔

یہ بات اپنے دل میں ٹھہرا کر، پائیں باغ میں جا کر، سب مجرائیوں کو جواب دے کر فرمایا کہ کوئی آج سے میرے پاس نہ آوے، سب دیوانِ عام میں آیا جایا کریں اور اپنے کام میں مستعد رہیں۔ یہ کہہ کر آپ ایک مکان میں جا بیٹھے اور مصلیٰ بچھا کر عبادت میں مشغول ہوئے۔ سوائے رونے اور آہ بھرنے کے کچھ کام نہ تھا۔ اسی طرح بادشاہ آزاد بخت کو کئی دن گزرے۔ شام کو روزہ کھولنے کے وقت ایک چھوہارا کھاتے اور تین گھونٹ پانی

پیتے اور تمام دن رات جانماز پر پڑے رہتے۔

اِس بات کا باہر چرچا پھیلا۔ رفتہ رفتہ تمام مُلک میں خبر گئی کہ بادشاہ نے بادشاہت سے ہاتھ کھینچ کر گوشہ نشینی اختیار کی۔ چاروں طرف غنیموں اور مُفسدوں نے سر اُٹھایا اور قدم اپنی حد سے بڑھایا۔ جس نے چاہا، مُلک دبا لیا اور سرانجام سرکشی کا کیا۔ جہاں کہیں حاکم تھے، اُن کے حُکم میں خللِ عظیم واقع ہوا۔ ہر ایک صوبے سے عرضی بدعملی کی حضور میں پہنچی۔ درباری، اُمرا جتنے تھے، جمع ہوئے اور صلاح مصلحت کرنے لگے۔ آخر یہ تجویز ٹھہری کہ نواب وزیر عاقل اور دانا ہے اور بادشاہ کا مُقرّب اور مُعتمد ہے اور درجے میں بھی سب سے بڑا ہے؛ اُس کی خدمت میں چلیں، دیکھیں وہ کیا مُناسب جان کر کہتا ہے۔

سب عمدہ، امیر، وزیر کے پاس آئے اور کہا: بادشاہ کی یہ صورت اور مُلک کی وہ حقیقت؛ اگر چندے اور تغافل ہوا، تو اِس محنت کا مُلک لیا ہوا مُفت میں جاتا رہے گا، پھر ہاتھ آنا بہت مشکل ہے۔ وزیر پُرانا، قدیم نمک حلال اور عقل [۷] مند، نام بھی خرد مند، اِسم بامُسمّیٰ تھا؛ بولا: اگرچہ بادشاہ نے حضور میں آنے کو منع کیا ہے؛ لیکن تم چلو، میں بھی چلتا ہوں؛ خُدا کرے بادشاہ کی مرضی آوے جو روبرو بُلاوے۔ یہ کہہ کر سب کو اپنے ساتھ دیوانِ عام تلک لایا۔ اُن کو وہاں چھوڑ کر آپ دیوانِ خاص میں آیا اور بادشاہ کی خدمت میں محلی کے ہاتھ کہلا بھیجا کہ یہ پیر غلام [۱۱] حاضر ہے، کئی دِنوں سے جمالِ جہاں آرا نہیں دیکھا؛ اُمیدوار ہوں کہ ایک نظر دیکھ کر قدم بوسی کروں تو خاطر جمع ہو۔

یہ عرض وزیر کی بادشاہ نے سُنی؛ از بس کہ قدامت اور خیرخواہی اور تدبیر اور جاں نثاری اُس کی جانتے تھے اور اکثر اُس کی بات مانتے تھے، بعد تامّل کے فرمایا: خردمند کو بُلاؤ۔ بارے جب پروانگی ہوئی، وزیر حضور میں آیا، آداب بجا لایا اور دست بستہ کھڑا رہا۔ دیکھا تو بادشاہ کی عجب صورت بن رہی ہے کہ زار بہ زار رونے اور دُبلاپے سے آنکھوں میں حلقے پڑ گئے ہیں اور چہرہ زرد ہو گیا ہے۔ خردمند کو تاب نہ رہی، بے اختیار دوڑ کر قدموں پر جا گرا۔ بادشاہ نے ہاتھ سے سر اُس کا اُٹھایا اور فرمایا: لو مجھے دیکھا، خاطر جمع ہوئی! اب جاؤ، زیادہ مجھے نہ ستاؤ، تم سلطنت کرو۔

خردمند سُن کر، ڈاڑھ مار کر رویا اور عرض کی: غلام کو آپ کے تصدّق اور سلامتی سے ہمیشہ بادشاہت میسّر ہے، لیکن جہاں پناہ کی یک بہ یک اس طرح کی گوشہ گیری سے تمام مُلک میں تہلکہ پڑ گیا ہے، اور انجام اس کا اچھا نہیں۔ یہ کیا خیال مزاجِ مبارک میں آیا! اگر اس خانہ زادِ موروثی کو بھی محرم اس راز کا کیجے، تو بہتر ہے؛ جو کچھ عقلِ ناقص میں آوے، اِلتماس کرے۔ غلاموں کو جو یہ سرفرازیاں بخشی ہیں، اِسی دن کے واسطے کہ بادشاہ عیش و آرام کریں اور نمک پروردے تدبیریں مُلک کی رہیں۔ خدانخواستہ جب فکر مزاجِ عالی کے لاحق ہوئی، تو بندہ ہائے بادشاہی کس دن کام آویں گے!

بادشاہ نے کہا: سچ کہتا ہے؛ پر جو فکر میرے جی کے اندر ہے، سو تدبیر سے باہر ہے۔ سُن اے خردمند! میری ساری عُمر اِسی مُلک گیری کے دردِ سر میں کٹی، اب یہ سِن و سال ہوا، آگے موت باقی ہے؛ سو اُس کا بھی پیغام آیا کہ

سیاہ بال سفید ہو چلے۔ وُہ مَثَل ہے: ساری رات سوئے، اب صُبح کو بھی نہ جاگیں!
اب تلک ایک بیٹا پیدا نہ ہوا، جو میری خاطر جمع ہوتی؛ اِس لیے دل سخت
اُداس ہوا اور میں سب کچھ چھوڑ بیٹھا۔ جس کا جی چاہے، مُلک لے یا مال لے،
مجھے کچھ کام نہیں؛ بلکہ کوئی دن میں یہ ارادہ رکھتا ہوں کہ سب چھوڑ چھاڑ کر، جنگل
اور پہاڑوں میں نکل جاؤں اور مُنہ اپنا کسو کو نہ دکھاؤں، اِسی طرح یہ چند
رُوز کی زندگی بسر کروں۔ اگر کوئی مکان خوش آیا، تو وہاں بیٹھ کر بندگی اپنے
معبُود کی بجا لاؤں گا، شاید عاقبت بہ خیر ہو۔ اور دُنیا کو تو خوب دیکھا، کچھ
مزہ نہ پایا۔ اِتنی بات بول کر اور ایک آہ بھر کر بادشاہ چُپ ہوئے۔

خردمند اُن کے باپ کا وزیر تھا۔ جب یہ شہزادے تھے، تب سے محبت
رکھتا تھا؛ علاوہ، دانا اور نیک اندیش تھا؛ کہنے لگا: خُدا کی جناب سے
نااُمید ہونا ہرگز مُناسب نہیں۔ جس نے اٹھارہ ہزار عالَم کو ایک حُکم میں پیدا
کیا، تمھیں اولاد دینی اُس کے نزدیک کیا بڑی بات ہے۔ قبلۂ عالَم! اِس
تصوُّرِ باطل کو دل سے دور کرو، نہیں تو تمام عالَم درہم برہم ہو جائے گا۔ اور
یہ سلطنت کس کس محنت اور مشقت سے تمھارے بزرگوں نے اور تم نے پیدا
کی ہے، ایک دم میں ہاتھ سے نکل جائے گی اور بے خبری سے مُلک ویران
ہو جائے گا؛ خُدانخواستہ بدنامی حاصل ہوگی۔ اِس پر بھی باز پُرس رُوزِ قیامت
کی ہُوا چاہے کہ تجھے بادشاہ بنا کر، اپنے بندوں کو تیرے حوالے کیا تھا؛ تو
ہماری رحمت سے مایوس ہوا اور رعیت کو حیران پریشان کیا؛ اِس سوال کا
کیا جواب دوگے؟ پس عبادت بھی اُس رُوز کام نہ آوے گی؛ اِس واسطے کہ

آدمی کا دل، خدا کا گھر ہے؛ اور بادشاہ فقط عدل کے واسطے پوچھے جائیں گے۔ غلام کی بے ادبی معاف ہو؛ گھر سے نکل جانا اور جنگل جنگل پھرنا، کام جوگیوں اور فقیروں کا ہے، نہ کہ بادشاہوں کا؛ تم اپنے جوگا کام کرو۔ خدا کی یاد اور بندگی جنگل، پہاڑ پر موقوف نہیں۔ آپ نے یہ بیت سنی ہوگی (۳):

خدا اس پاس، یہ ڈھونڈھے جنگل میں
ڈھنڈھورا شہر میں، لڑکا بغل میں

اگر منصفی فرمائیے اور اس فدوی کی عرض قبول کیجیے، تو بہتر یوں ہے کہ جہاں پناہ ہر دم اور ہر ساعت دھیان اپنا خدا کی طرف لگا کر دعا مانگا کریں۔ اس کی درگاہ سے کوئی محروم نہیں رہا۔ دن کو بندوبست ملک کا اور انصاف، عدالت غریب غربا کی فریادیں؛ تو بندے خدا کے دامنِ دولت کے سایے میں امن و امان، خوش گزران رہیں۔ اور رات کو عبادت کیجیے اور درود پیمبر کی روحِ پاک کو نیاز کر کر؛ درویش گوشہ نشین (۹)، متوکلوں سے مدد لیجیے۔ اور روزِ راتب یتیم، اسیر، عیال داروں، محتاجوں اور رانڈ بیواؤں کو کر دیجیے۔ ایسے اچھے کاموں اور نیک نیتوں کی برکت سے، خدا چاہے تو امید قوی ہے (۱۱) کہ تمھارے دل کے مقصد اور مطلب سب پورے ہوں اور جس واسطے مزاج عالی مکدر رہتا ہے، وہ آرزو بر آوے اور خوشی خاطرِ شریف کو ہو جاوے۔ پروردگار کی عنایت پر نظر رکھیے کہ وہ ایک دم میں جو چاہتا ہے، سو کرتا ہے۔ بارے خردمند وزیر کی (۱۲) ایسی ایسی عرض معروض کرنے نے آزاد بخت کے دل کو ڈھارس بندھی، فرمایا: اچھا! تو جو کہتا ہے، بھلا یہ بھی کر دیکھیں؛ آگے، جو اللہ کی مرضی ہے، سو ہی ہوگا۔

جب بادشاہ کے دل کو تسلّی ہوئی، تب وزیر سے پوچھا کہ اور سب اَمیر و وَزیر
کیا کرتے ہیں اور کس طرح ہیں؟ اُس نے عرض کی کہ سب ارکانِ دولت قبلۂ عالم
کے[1] جان و مال کو دُعا کرتے ہیں، آپ کی فکر سے سب حیران و پریشان ہو رہے ہیں۔
جمالِ مبارک اپنا دِکھائیے، تو سب کی خاطر جمع ہووے؛ چناں چہ اِس وقت دیوانِ
عام میں حاضر ہیں۔ یہ سُن کر بادشاہ نے حکم کیا: اِن شاءَ اللہ تعالیٰ کل دربار کروں
گا، سب کو کہہ دو حاضر رہیں۔ خردمند یہ وعدہ سُن کر خوش ہوا اور دونوں ہاتھ
اُٹھا کر دُعا دی کہ جب تلک یہ زمین و آسمان[4] برپا ہیں، تمھارا تاج و تخت قائم
رہے اور حضور سے رخصت ہو کر خوشی خوشی باہر نکلا اور یہ خوش خبری اُمراؤں سے
کہی۔ سب امیر ہنسی خوشی گھر کو گئے۔ سارے شہر میں آنند ہو گئی۔ رعیت، پرجا نگن
ہوئے[7] کہ کل بادشاہ بارِ عام کرے گا۔ صبح کو سب خانہ زاد[9] اعلا ادنا اور ارکانِ
دولت چھوٹے بڑے اپنے اپنے پایے اور مرتبے پر آ کر کھڑے ہوئے اور منتظر
جلوۂ بادشاہی کے تھے۔

جب پہر دن چڑھا، ایک بارگی پردہ اُٹھا اور بادشاہ نے برآمد ہو کر تختِ
مبارک پر جلوس فرمایا۔ نوبت خانے میں شادیانے بجنے لگے۔ سبھوں نے نذریں
مبارک بادی کی گزرانیں اور مجرے گاہ میں تسلیمات و کورنشات بجا لائے۔ موافق
قدر و منزلت کے ہر ایک کو سرفرازی ہوئی۔ سب کے دل کو خوشی اور چین ہوا۔ جب
دوپہر ہوئی، برخاست ہو کر اندرونِ محل[12] داخل ہوئے۔ خاصہ[13] نوش جان فرما کر
خواب گاہ میں آرام کیا۔

اُس دن سے بادشاہ نے یہی مقرر کیا کہ ہمیشہ صبح کو دربار کرنا اور تیسرے پہر

کتاب کا شغل* یا وِرد وظیفہ پڑھنا اور خدا کی درگاہ میں توبہ استغفار کرکر اپنے مطلب کی دعا مانگنی۔ ایک روز کتاب میں بھی لکھا دیکھا کہ اگر کسو شخص کو غم یا فکر[۱] ایسی لاحق ہو کہ اُس کا علاج تدبیر سے نہ ہو سکے، تو چاہیے کہ تقدیر کے حوالے کرے اور آپ گورستان کی طرف رجوع کرے۔ درود طفیل پیغمبر کی روح کے اُن کو بخشے اور اپنے تئیں نیست و نابود سمجھ کر، دل کو اس غفلت دنیاؤی[۲] سے ہشیار رکھے اور عبرت سے رووے اور خدا کی قدرت کو دیکھے کہ مجھ سے آگے کیسے کیسے صاحب مُلک و خزانہ اِس زمین پر پیدا ہوئے، لیکن آسمان نے سب کو اپنی گردش میں لا کر خاک میں ملا دیا۔ یہ کہاوت ہے[۳]:

چلتی چکی دیکھ کر، دِیا کبیرا رو[۴]
دو پاٹن کے بیچ آ، ثابت گیا نہ کو

اب جو دیکھیے، سوائے ایک مٹّی کے ڈھیر کے، اُن کا کچھ نشان باقی نہیں رہا اور سب دولت دنیا، گھر بار، آل اولاد، آشنا دوست، نوکر چاکر، ہاتھی گھوڑے چھوڑ کر اکیلے پڑے ہیں۔ یہ سب اُن کے کچھ کام نہ آیا؛ بلکہ اب کوئی نام بھی نہیں جانتا کہ یے[۵] کون تھے۔ اور قبر کے اندر کا احوال معلوم نہیں کہ کیڑے مکوڑے، چیونٹے، سانپ اُن کو کھا گئے، یا اُن پر کیا بیتی اور خدا سے کیسی بنی! ایسے[۶] باتیں اپنے دل میں سوچ کر، ساری دنیا کو پیکھنے کا کھیل جانے؛ تب اُس کے دل کا غنچہ ہمیشہ شگفتہ* رہے گا، کسو حالت میں پژمردہ نہ ہوگا۔

یہ نصیحت جب کتاب میں مطالعہ* کی، بادشاہ کو خردمند وزیر کا کہنا یاد آیا اور دونوں کو مطابق پایا۔ یہ شوق ہوا کہ اِس پر عمل کروں؛ لیکن سوار ہو کر اور

بھیڑ بھاڑ لے کر بادشاہوں کی طرح سے جانا اور پھرنا مناسب نہیں۔ بہتر یہ ہے کہ لباس بدل کر، رات کو اکیلے مقبروں میں، یا کسی مردِ خدا گوشہ نشین کی خدمت میں جایا کروں اور شب بیدار رہوں؛ شاید اِن مردوں کے وسیلے سے دُنیا کی مُراد اور عاقبت کی نجات میسّر ہو۔

یہ بات دل میں مقرر کر کر، ایک روز رات کو موٹے جھوٹے کپڑے پہن کر، کچھ روپے اشرفی لے کر، چپکے قلعے سے باہر نکلے اور میدان کی راہ لی۔ جاتے جاتے ایک گورستان میں پہنچے۔ نہایت صدقِ دل سے درود پڑھ رہے تھے، اور اُس وقت بادِ تُند چل رہی تھی، بلکہ آندھی کہا چاہیے۔ ایک بارگی بادشاہ کو دُور سے ایک شعلہ سا نظر آیا کہ مانند صبح کے تارے کے روشن ہے۔ دل میں اپنے خیال کیا کہ اِس آندھی اور اندھیرے میں یہ روشنی خالی حکمت سے نہیں۔ یا یہ طلسم ہے کہ اگر پھٹکری اور گندھک کو چراغ میں بتّی کے آس پاس چھڑک دیجیے، تو کیسی ہی ہوا چلے، چراغ گُل نہ ہوگا۔ یا کسو ولی کا چراغ ہے کہ جلتا ہے۔ جو کچھ ہو سو ہو، چل کر دیکھا چاہیے؛ شاید اِس شمع کے نور سے میرے بھی گھر کا چراغ روشن ہو اور دل کی مُراد ملے۔

یہ نیّت کر کے اُس طرف کو چلے۔ جب نزدیک پہنچے، دیکھا تو چار فقیر بے نوا، کفنیاں گلے میں ڈالے اور سر زانو پر دھرے، عالمِ بے ہوشی میں خاموش بیٹھے ہیں اور اُن کا یہ عالم ہے جیسے کوئی مسافر اپنے ملک اور قوم سے بچھڑ کر، بے کسی اور مفلسی کے رنج و غم میں گرفتار ہو کر حیران رہ جاتا ہے؛ اسی طرح سے یہ چاروں نقشِ دیوار ہو رہے ہیں۔ اور ایک چراغ پتھر پر دھرا ٹمٹما رہا ہے۔

ہرگز ہوا اُس کو نہیں لگتی؛ گویا فانوس(۱) اُس کی آسمان بنا ہے کہ بے خطرے جلتا ہے۔

آزاد بخت کو دیکھتے ہی یقین آیا کہ مقرر تیری آرزو اِن مردانِ خدا کے قدم کی برکت سے بر آوے گی اور تیری اُمید کا سوکھا درخت اِن کی توجّہ سے ہرا ہو کر پھلے گا۔ اِن کی خدمت میں چل کر اپنا احوال کہہ اور مجلس کا شریک ہو، شاید تجھ پر رحم کھا کر دُعا کریں، جو بے نیاز کے یہاں قبول ہو۔ یہ ارادہ کر کر چاہا کہ قدم آگے دھرے، وہیں(۴) عقل* نے سمجھایا کہ اَے بے وُقوف! جلدی نہ کر، ذرا دیکھ لے؛ تجھے کیا معلوم ہے کہ یہ کون ہیں اور کہاں سے آئے ہیں اور کیدھر جاتے ہیں! کیا جانیں یہ دیو ہیں یا غولِ بیابانی ہیں کہ آدمی کی صورت بن کر باہم مِل بیٹھے ہیں۔ بہر صورت، جلدی(۶) کرنا اور اِن کے درمیان جا کر مخل ہونا خوب نہیں۔ ابھی ایک گوشے میں چھپ کر حقیقت اِن درویشوں کی جاننا چاہیے۔ آخر بادشاہ نے یہی کیا کہ ایک کونے میں اُس مکان کے چُپکا جا بیٹھا کہ کسو کو اُس کے آنے کی آہٹ کی خبر نہ ہوئی۔ اپنا دھیان اُن کی طرف لگایا کہ دیکھیے آپس میں کیا بات چیت کرتے ہیں۔

اتفاقاً ایک فقیر کو چھینک آئی، شکر خدا کا کیا۔ وُہ تینوں قلندر اُس کی آواز سے چونک پڑے، چراغ کو اُکسایا۔ ٹیپ تو روشن تھا، اپنے اپنے بستروں پر حقے بھر کر پینے لگے۔ ایک اُن آزادوں میں سے بولا: اَے یارانِ ہمدرد و رفیقانِ جہاں گرد! ہم چار صورتیں، آسمان کی گردش سے اور لیل و نہار کے انقلاب سے، دربدر خاک بسر ایک مدت پھریں۔ الحمدُ لِلّٰہ! کہ طالع کی مدد اور قسمت کی یاوری سے آج اِس مقام پر باہم ملاقات ہوئی

اور کل کا احوال کچھ معلوم نہیں کہ کیا پیش آوے! ایک گت رہیں یا جُدا جُدا ہو جاویں۔ رات بڑی پہاڑ ہوتی ہے، ابھی سے پڑ پڑ رہنا خوب نہیں! اس سے یہ بہتر ہے کہ اپنی اپنی سرگذشت، جو اس دنیا میں جس پر بیتی ہو (بہ شرطے کہ جھوٹ اس میں کوڑی بھر نہ ہو) بیان کرے، تو باتوں میں رات کٹ جائے۔ جب تھوڑی شب باقی رہے، تب لوٹ پوٹ رہیں گے۔ سبھوں نے کہا: یا ہادی! جو کچھ ارشاد ہوتا ہے، ہم نے قبول کیا؛ پہلے آپ ہی اپنا احوال (جو دیکھا ہے) شروع کیجیے تو ہم مستفید ہوں۔

سیر پہلے درویش کی

پہلا درویش دو زانو ہو بیٹھا اور اپنی سیر کا قصہ اس طرح سے کہنے لگا۔

یا معبود اللہ! ذرا ادھر متوجہ ہو اور ماجرا اس بے سر و پا کا سنو۔

یہ سرگذشت میری ذرا کان دھر سنو! | مجھ کو فلک نے کر دیا زیر و زبر، سنو!
جو کچھ کہ پیش آئی ہے شدت مرے تئیں | اس کا بیان کرتا ہوں، تم سر بہ سر سنو!

اے یاراں! میری پیدائش اور وطن بزرگوں کا ملک یمن ہے۔ والد اس عاجز کا ملک التجار خواجہ احمد نام بڑا سوداگر تھا۔ اس وقت میں کوئی مہاجن یا بیوپاری ان کے برابر نہ تھا۔ اکثر شہروں میں کوٹھیاں، اور گماشتے خرید و فروخت کے واسطے مقرر تھے اور لاکھوں روپے نقد اور جنس ملک ملک کی گھر میں موجود تھی۔ ان کے یہاں دو لڑکے پیدا ہوئے۔ ایک تو یہی فقیر جو کفنی سیلی پہنے ہوئے، مرشدوں کی حضوری میں حاضر اور بولتا ہے۔ دوسری ایک بہن، جس کو (۱۵)

قبلہ گاہ نے اپنے جیتے جی اَور شہر کے سوداگر بچّے سے شادی کر دی تھی، وُہ اپنی سُسرال میں رہتی تھی۔

(۱)

غرض جس کے گھر میں اِتنی دَولت اور ایک لڑکا ہو، اُس کے لاڈ پیار کا کیا ٹھکانا ہے! مجھ فقیر نے بڑے چاو چوز سے* ماں باپ کے سایے میں پرورش پائی اور پڑھنا لکھنا، سپاہ گری کا کسب و فن[۲]، سوداگری کا بہی کھاتا، روزنامہ سیکھنے لگا۔ چودہ برس تک نہایت خوشی اور بے فکری میں گزری[۳]، کچھ دُنیا کا اندیشہ دل میں نہ آیا۔ یک بہ یک ایک ہی سال میں والدین قضائے[۴] الٰہی سے مر گئے۔ عجب طرح کا غم ہوا، جس کا بیان نہیں کر سکتا۔ ایک بارگی یتیم[۵] ہو گیا، کوئی سر پر بوڑھا بڑا نہ رہا۔ اِس مصیبتِ ناگہانی سے رات دن رویا کرتا، کھانا پینا سب چھوٹ گیا۔

چالیس دن جوں توں کر کٹے۔ چہلم* میں اپنے بیگانے، چھوٹے بڑے جمع ہوئے۔ جب فاتحہ[۶] سے فراغت ہوئی، سب نے فقیر کو باپ کی پگڑی بندھوائی اور سمجھایا: دُنیا میں سب کے ماں باپ[۷] مرتے آئے ہیں اور اپنے تئیں بھی ایک روز مرنا ہے، پس[۸] صبر کرو، اپنے گھر کو دیکھو۔ اب باپ کی جگہ تم سردار ہوئے، اپنے کاروبار، لین دین سے ہشیار[۹] رہو۔ تسلّی دے کر وُہ رخصت ہوئے۔ گماشتے[۱۰]، کاروباری، نوکر چاکر جتنے تھے، آن کر حاضر ہوئے، نذریں دیں اور بولے: کوٹھے[۱۱] نقد و جنس کے اپنی نظرِ مبارک سے دیکھ لیجے[۱۲]۔ ایک بارگی جو اُس دولتِ بے انتہا پر نگاہ پڑی، آنکھیں کھل گئیں۔ دیوان خانے کی تیّاری* کو حکم کیا[۱۳]۔ فرّاشوں نے فرش فروش بچھا کر، چھت، پردے، چلونیں تکلّف کی لگا دیں۔ اور اچھے اچھے

خدمت گار دیدارو نوکر رکھے، سرکار سے زرق برق کی پوشاکیں بنوادیں۔ فقیر مسند پر تکیہ لگا کر بیٹھا۔ ویسے ہی آدمی غنڈے، پھانکڑے، مفت بر کھانے پینے والے، جھوٹھے، خوشامدی آکر آشنا ہوئے اور مصاحب بنے۔ ان سے آٹھ پہر صحبت رہنے لگی۔ ہر کہیں کی باتیں اور زٹلیں واہی تباہی ادھر اُدھر کی کرتے اور کہتے: اس جوانی کے عالم میں کیفی کی شراب یا گلِ گلاب کھنچوائیے، نازنین معشوقوں کو بلوا کر، ان کے ساتھ پیجیے اور عیش کیجیے۔

غرض آدمی کا شیطان آدمی ہے۔ ہر دم کے کہنے سننے سے اپنا بھی مزاج بہک گیا۔ شراب، ناچ اور جوئے کا چرچا شروع ہوا۔ پھر تو یہ نوبت پہنچی کہ سوداگری بھول کر، تماش بینی کا اور دینے لینے کا سودا ہوا۔ اپنے نوکر اور رفیقوں نے جب یہ غفلت دیکھی، جو جس کے ہاتھ پڑا، الگ کیا، گویا لوٹ مچادی۔ کچھ خبر نہ تھی کتنا روپیا خرچ ہوتا ہے، کہاں سے آتا اور کیدھر جاتا ہے۔ مالِ مفت دلِ بے رحم۔ اس ولخرچی کے آگے اگر گنجِ قارون کا ہوتا، تو بھی وفا نہ کرتا۔ کئی برس کے عرصے میں ایک بارگی یہ حالت ہوئی کہ فقط ٹوپی اور لنگوٹی باقی رہی۔ وہ آشنا (جو دانت کاٹی روٹی کھاتے تھے اور چمچا بھر خون اپنا ہر بات میں زبان سے نثار کرتے تھے) کافور ہو گئے، بلکہ راہ باٹ میں اگر کہیں بھینٹ ملاقات ہو جاتی، تو آنکھیں چرا کر منہ پھیر لیتے۔ اور نوکر چاکر، خدمت گار، بہلیے، دعلیت، خاص بردار، ثابت خانی، سب چھوڑ کر کنارے لگے۔ کوئی بات کا پوچھنے والا نہ رہا۔ جو کہے: یہ کیا تمھارا حال ہوا؟ سوائے غم اور افسوس کے کوئی رفیق نہ ٹھہرا۔ اب دمڑی کی ٹھڈیاں میسّر نہیں، جو چبا کر پانی پیوں۔ دو تین

فاقے کرکے کھینچے، تاب بھوکھ کی نہ لاسکا، لاچار بےحیائی کا برقع منہ پر ڈال کر، یہ قصد کیا بہن کے پاس چلیے؛ لیکن یہ شرم دل میں آتی تھی کہ قبلہ گاہ کی وفات کے بعد نہ بہن سے کچھ سلوک کیا نہ خالی خط لکھا، بلکہ اُس نے دو ایک خط خطوط ماتم پرسی اور اشتیاق کے جو لکھے، اُن کا بھی جواب اُس خوابِ خرگوش میں نہ بھیجا۔ اِس شرمندگی سے جی تو نہ چاہتا تھا، پر سوائے اُس گھر کے اور کوئی ٹھکانا نظر میں نہ ٹھہرا۔ جوں توں پاپیادہ، خالی ہاتھ، گرتا پڑتا، ہزار محنت سے وہ کئی منزلیں کاٹ کر، ہمشیر کے شہر میں جاکر اُس کے مکان پر پہنچا۔

وہ ماجائی میرا یہ حال دیکھ کر، بلائیں لے اور گلے مل کر بہت روئی۔ تیل ماش اور کالے ٹکے مجھ پر سے صدقے کیے، کہنے لگی: اگرچہ ملاقات سے دل بہت خوش ہوا، لیکن بھیا! تیری یہ کیا صورت بنی؟ اِس کا جواب میں کچھ نہ دے سکا، آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا کر چپکا ہو رہا۔ بہن نے جلدی خاصی پوشاک سلوا کر حمام میں بھیجا۔ نہا دھو کر وہ کپڑے پہنے۔ ایک مکان اپنے پاس بہت اچھا، تکلف کا میرے رہنے کو مقرر کیا۔ صبح کو شربت اور لوزیات، حلوا سوہن، پستہ، مغزی ناشتے کو، اور تیسرے پہر میوے خشک و تر، پھل پھلاری؛ اور رات دن دونوں وقت پلاؤ، نان، قلیے، کباب تحفہ تحفہ، مزے دار منگوا کر اپنے روبرو کھلا کر جاتی؛ سب طرح خاطرداری کرتی۔ میں نے ویسی تصدیع کے بعد جو یہ آرام پایا، خدا کی درگاہ میں ہزار ہزار شکر بجا لایا۔ کئی مہینے اِس فراغت سے گزرے کہ پانو اُس خلوت سے باہر نہ رکھا۔

ایک دن وہ بہن (جو بجائے والدہ کے میری خاطر رکھتی تھی) کہنے لگی:

اے بہن! تو میری آنکھوں کی پتلی اور ماباپ کی موئی مٹّی کی نشانی ہے، تیرے آنے سے میرا کلیجا ٹھنڈا ہوا، جب تجھے دیکھتی ہوں باغ باغ ہوتی ہوں، تو نے مجھے نہال کیا؛ لیکن مردوں کو خدا نے کمانے کے لیے بنایا ہے، گھر میں بیٹھے رہنا اُن کو لازم نہیں۔ جو مرد نکھٹّو ہو کر گھر سیتا ہے، اُس کو دُنیا کے لوگ طعنہ مہنا دیتے ہیں خصوصاً اِس شہر کے آدمی، چھوٹے بڑے، بے سبب تمھارے رہنے پر کہیں گے: اپنے باپ کی دولتِ دُنیا کھو کھا کر، بہنوئی کے ٹکڑوں پر آپڑا۔ یہ نہایت بے غیرتی اور میری تمھاری ہنسائی اور ماباپ کے نام کو سبب لاج لگنے کا ہے۔ نہیں تو میں اپنے چمڑے کی جوتیاں بنا کر تجھے پہناؤں اور کلیجے میں ڈال رکھوں۔ اَب یہ صلاح ہے کہ سفر کا قصد کرو؛ خدا چاہے تو دِن پھریں اور اِس حیرانی اور مفلسی کے بدلے، خاطر جمعی اور خوشی حاصل ہو۔

یہ بات سُن کر مجھے بھی غیرت آئی، اُس کی نصیحت پسند کی، جواب دیا: اچھا! اَب تم ماں کی جگہ ہو؛ جو کہو، سو کروں۔ یہ میری مرضی پا کر، گھر میں جا کے، پچاس توڑے اشرفی کے اصیل اور لونڈیوں کے ہاتھوں میں لوا کر میرے آگے لا رکھے اور بولی: ایک قافلہ سوداگروں کا دمشق کو جاتا ہے، تم اِن روپیوں سے جنسِ تجارت کی خرید کرو۔ ایک تاجر ایمان دار کے حوالے کر کے، دستاویز پکّی لکھوا لو اور آپ بھی قصدِ دمشق کا کرو۔ وہاں جب خیریت سے جا پہنچو، اپنا مال مع منافع سمجھ بوجھ لیجو، یا آپ بیچیو۔ میں وہ نقد لے کر بازار میں گیا۔ اسباب سوداگری کا خرید کر کر ایک بڑے سوداگر کے سپرد کیا، نوشت خواند سے خاطر جمع کر لی۔ وہ تاجر دریا کی راہ سے جہاز پر سوار ہو کر روانہ ہوا، فقیر نے خشکی کی راہ چلنے کی

تیاری کی۔ جب رخصت ہونے لگا، بہن نے ایک سرٖ پاؤ بھاری اور ایک گھوڑا جڑاؤ ساز سے تواضع کیا۔ اور مٹھائی، پکوان ایک خاص دان میں بھر کر ہرنے سے لٹکا دیا اور چھاگل پانی کی شکار بند میں بندھوا دی۔ امام ضامن کا روپیا میرے بازو پر باندھا، دہی کا ٹیکا ماتھے پر لگا کر، آنسو پی کر بولی: سدھارو، تمھیں خدا کو سونپا! پیٹھ دکھائے جاتے ہو، اسی طرح جلد اپنا منہ دکھائیو! میں نے فاتحہ خیر کی پڑھ کر کہا: تمھارا بھی اللہ حافظ ہے، میں نے قبول کیا۔ وہاں سے نکل کر گھوڑے پر سوار ہوا اور خدا کے توکل پر بھروسا کر کے، دو منزل کی ایک منزل کرتا ہوا دمشق کے پاس جا پہنچا۔

غرض جب شہر کے دروازے پر گیا، بہت رات جا چکی تھی، دربان اور نگاہ بانوں نے دروازہ بند کیا تھا۔ میں نے بہت منت کی: مسافر ہوں، دور سے دھاوا مارے آتا ہوں؛ اگر کواڑ کھول دو، شہر میں جا کر دانے گھاس کا آرام پاؤں۔ اندر سے گھرک کر بولے: اس وقت دروازہ کھولنے کا حکم نہیں، کیوں اتنی رات گئے تم آئے؟ جب میں نے جواب صاف ان سے سنا، شہر پناہ کی دیوار کے تلے، گھوڑے پر سے اتر، زین پوش بچھا کر بیٹھا۔ جاگنے کی خاطر ادھر ادھر ٹہلنے لگا۔ جس وقت آدھی رات اُدھر لفد آدھی رات اُدھر ہوئی، سنسان ہو گیا؛ دیکھتا کیا ہوں کہ ایک صندوق قلعے کی دیوار پر سے نیچے چلا آتا ہے۔ یہ دیکھ کر میں اچنبھے میں ہوا کہ یہ کیا طلسم ہے! شاید (۱۰) خدا نے میری حیرانی و سرگردانی پر رحم کھا کر خزانہ غیب سے عنایت کیا۔

جب وہ صندوق زمین پر ٹھہرا، ڈرتے ڈرتے میں پاس گیا۔ دیکھا تو کاٹھ کا صندوق ہے۔ لالچ سے اسے کھولا۔ ایک معشوق خوب (۱۲) صورت، کامنی سی عورت،

جس کے دیکھنے سے ہوش جاتا رہے؛ گھائل، لہو میں تر بہ تر، آنکھیں بند کیے پڑی کلبلاتی ہے۔ آہستہ آہستہ ہونٹھ ہلتے ہیں اور یہ آواز منہ سے نکلتی ہے: اے کم بخت بے وفا، اے ظالم پُر جفا! بدلا اس بھلائی اور محبت کا یہی تھا جو تو نے کیا! بھلا ایک زخم اور بھی لگا! میں نے اپنا تیرا انصاف خدا کو سونپا۔ یہ کہہ کر، اسی بے ہوشی کے عالم میں دوپٹے کا آنچل منہ پر لے لیا، میری طرف دھیان نہ کیا۔ فقیر اس کو دیکھ کر اور یہ بات سن کر سُن ہوا، جی میں آیا: کس بے حیا، ظالم نے کیوں ایسے نازنین صنم کو زخمی کیا؟ کیا اس کے دل میں آیا اور ہاتھ اس پر کیوں کر چلایا؟ اس کے دل میں تو محبت اب تلک باقی ہے، جو اس جاں کندنی کی حالت میں اس کو یاد کرتی ہے! میں آپ ہی آپ یہ کہہ رہا تھا، آواز اس کے کان میں گئی؛ ایک مرتبہ کپڑا منہ سے سرکا کر مجھ کو دیکھا۔ جس وقت اس کی نگاہیں میری نظروں سے لڑیں، مجھے غش آنے اور جی سنسنانے لگا۔ بہ زور اپنے تئیں تھانبا، جرأت کر کے پوچھا: سچ کہو، تم کون ہو اور یہ کیا ماجرا ہے؟ اگر بیان کرو، تو میرے دل کو تسلی ہو۔ یہ سن کر، اگرچہ طاقت بولنے کی نہ تھی، آہستے سے کہا: شکر ہے، میری حالت زخموں کے مارے یہ کچھ ہو رہی ہے، کیا خاک بولوں! کوئی دم کی مہمان ہوں۔ جب میری جان نکل جاوے، تو خدا کے واسطے جواں مردی کر کے، مجھ بدبخت کو اسی صندوق میں کسی جگہ گاڑ دیجو؛ تو میں بھلے بُرے کی زبان سے نجات پاؤں اور تو داخلِ ثواب کے ہو۔ اتنا بول کر چپ ہوئی۔

رات کو مجھ سے کچھ تدبیر نہ ہو سکی۔ وہ صندوق اپنے پاس اٹھا لایا اور گھڑیاں گننے لگا کہ کب اتنی رات تمام ہو تو فجر کو شہر میں جا کر، جو کچھ علاج اس کا ہو سکے، بہ مقدور اپنے کروں۔ وہ تھوڑی سی رات ایسی پہاڑ ہو گئی کہ دل گھبرا گیا۔ بارے

خدا خدا کر صبح جب نزدیک ہوئی، مرغ بولا، آدمیوں کی آواز آنے لگی، میں نے فجر کی نماز پڑھ کر صندوق کو خورجی میں کسا۔ جونہیں دروازہ شہر کا کھلا، میں شہر میں داخل ہوا۔ ہر ایک آدمی اور دکان دار سے حویلی کرایے کی تلاش کرنے لگا۔ ڈھونڈھتے ڈھونڈھتے ایک مکان خوش قطع، نیا، فراغت کا بھاڑے لے کر جا اترا۔ پہلے اس معشوق کو صندوق سے نکال کر، روئی کے پہلوؤں پر ملائم بچھونا کر کے ایک گوشے میں لٹایا اور آدمی اعتباری وہاں چھوڑ کر، فقیر جراح کی تلاش میں نکلا۔ ہر ایک سے پوچھتا پھرتا تھا کہ اس شہر میں جراح کاریگر کون ہے اور کہاں رہتا ہے؟ ایک شخص نے کہا: ایک حجام جراحی کے کسب اور حکیمی کے فن میں یکتا ہے اور اس کام میں نپٹ پکا ہے۔ اگر مردے کو اس پاس لے جاؤ، خدا کے حکم سے ایسی تدبیر کرے کہ ایک بار وہ بھی جی اٹھے۔ وہ اس محلے میں رہتا ہے اور عیسیٰ نام ہے۔

میں یہ مژدہ سن کر بے اختیار چلا۔ تلاش کرتے کرتے پتے سے اس کے دروازے پر پہنچا۔ ایک مرد سفید ریش کو دہلیز پر بیٹھے دیکھا اور کئی آدمی مرہم کی تیاری کے لیے کچھ پیس پاس رہے تھے۔ فقیر نے مارے خوشامد کے ادب سے سلام کیا اور کہا: میں تمھارا نام اور خوبیاں سن کر آیا ہوں۔ ماجرا یہ ہے کہ میں اپنے ملک سے تجارت کے لیے چلا، قبیلے کو بہ سبب محبت کے ساتھ لیا۔ جب نزدیک اس شہر کے آیا، تھوڑی سی دور رہا تھا جو شام پڑ گئی۔ ان دیکھے ملک میں رات کو چلنا مناسب نہ جانا، میدان میں ایک درخت کے تلے اتر پڑا۔ پچھلے پہر ڈاکا آیا، جو کچھ مال اسباب پایا، لوٹ لیا۔ گہنے کے لالچ سے اس بی بی کو بھی گھائل کیا۔ مجھ

سے کچھ نہ ہو سکا۔ رات جو باقی تھی، جوں توں کر کاٹی، فجر ہی شہر میں آن کر ایک مکان کرایے لیا، اُن کو وہاں رکھ کر میں تمھارے پاس دوڑا آیا ہوں۔ خدا نے تمھیں یہ کمال دیا ہے، اِس مسافر پر مہربانی کرو، غریب خانے تشریف لے چلو، اُس کو دیکھو۔ اگر اُس کی زندگی ہوئی، تو تمھیں بڑا جس ہوگا اور میں ساری عمر غلامی کروں گا۔ عیسیٰ جرّاح بہت رحم دل اور خدا پرست تھا، میری غریبی کی باتوں پر ترس کھا کر، میرے ساتھ اُس حویلی تک آیا۔ زخموں کو دیکھتے ہی میری تسلّی کی، بولا کہ خدا کے کرم سے اِس بی بی کے زخم چالیس دن میں بھر آویں گے، غسلِ شفا کا کروا دوں گا۔

غرض اُس مردِ خدا نے سب زخموں کو نیم کے پانی سے دھو دھا کر صاف کیا۔ جو لائق ٹانکوں کے پائے، اُنھیں سیا۔ باقی گھاؤں پر، اپنے کھیسے سے ایک ڈبیا نکال کر، کتنوں میں بتّی رکھی اور کتنوں پر پھائے چڑھا کر، پٹّی سے باندھ دیا اور نہایت شفقت سے کہا: میں دونوں وقت آیا کروں گا، تو خبردار رہیو، ایسی حرکت نہ کرے جو ٹانکے ٹوٹ جائیں۔ مرغ کا شوربا، بجائے غذا، اِس کے حلق میں چوائیو اور اکثر عرقِ بید مشک گلاب کے ساتھ دیا کیجو، جو قوت رہے۔ یہ کہہ کر رخصت چاہی۔ میں نے بہت منّت کی اور ہاتھ جوڑ کر کہا: تمھاری تشفّی دینے سے میری بھی زندگی ہوئی، نہیں تو سوائے مرنے کے کچھ سوجھتا نہ تھا، خدا تمھیں سلامت رکھے۔ عطر پان دے کر رخصت کیا۔ میں رات دن خدمت میں اُس پری کی حاضر رہتا، آرام اپنے اوپر حرام کیا۔ خدا کی درگاہ سے روز روز اُس کے چنگے ہونے کی دعا مانگتا۔

اتفاقاً وہ سوداگر بھی آپہنچا اور میرا مالِ امانت (۱) میرے حوالے کیا۔ میں نے اُسے اَونے پَونے بیچ ڈالا اور دارو دَرمن میں خرچ کرنے لگا۔ وہ مردِ جرّاح ہمیشہ آتا جاتا۔ تھوڑے عرصے میں سب زخم بھر کر انگور کر لائے۔ بعد کئی دن کے غسلِ شِفا کا کیا، عجب طرح کی خوشی حاصل ہوئی۔ خلعت اور اشرفیاں عیسیٰ حجام کے آگے دھریں اور اُس پری کو، مُکلّف فرش بچھا کر، مسند پر بٹھایا۔ فقیر، غریبوں کو بہت سی خیر خیرات کی۔ اُس دن گویا بادشاہت ہفت اِقلیم کی اِس فقیر کے ہاتھ لگی۔ اور اُس پری کا، شفا پانے سے، ایسا رنگ نکھرا کہ مکھڑا (۲) سورج کی مانند چمکنے اور کندن کی طرح دمکنے (۳) لگا۔ نظر کی مجال نہ تھی جو اُس کے جمال پر ٹھہرے۔ فقیر بہ سر و چشم اُس کے حکم میں حاضر رہتا، جو فرماتی، سو بجا لاتا۔ وہ اپنے حُسن کے غرور اور سرداری کے دماغ میں، جو میری طرف کبھو دیکھتی تو فرماتی: خبردار! اگر تجھے ہماری خاطر منظور ہے تو ہرگز ہماری بات میں دم نہ ماریو۔ جو ہم کہیں، سو بِلا عُذر کیے جائیو، اپنا کسی بات میں دخل نہ کریو، نہیں تو پچھتاوے گا۔ اُس کی وضع (۴) سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ حق میری خدمت گزاری اور فرماں برداری کا اُسے البتہ منظور ہے۔ فقیر بھی اُس کی بے مرضی ایک کام نہ کرتا۔ اُس کا فرمانا بہ سر و چشم بجا لاتا۔

ایک مدت اِسی راز و نیاز میں کٹی۔ جو اُس نے فرمائش کی، وہیں میں نے لا کر حاضر کی۔ اِس فقیر پاس جو کچھ جنس اور نقد (۵) اصل و نفع کا تھا، سب صرف ہوا۔ اُس بیگانے ملک میں کون اعتبار کرے، جو قرض دام سے کام چلے، آخر تکلیف روز مرے (۶) کے خرچ کی ہونے لگی۔ اِس سے دل بہت گھبرایا، فکر سے

دُبلا ہوتا چلا، چہرے کا رنگ کلَھواں (۱) ہوگیا؛ لیکن کس سے کہوں! جو کچھ دل پر گزرے، سو گزرے! قہرِ درویش برجانِ درویش! ایک دن اُس پری نے اپنے شعور سے دریافت کر کے کہا: اے فُلانے! تیری خدمتوں کا حق ہمارے جی میں نقش کا لحجر ہے، پر اُس کا عوض بالفعل ہم سے نہیں ہوسکتا؛ اگر واسطے خرچ ضروری کے کچھ درکار ہو، تو اپنے دل میں اندیشہ نہ کر، ایک ٹکڑا کاغذ اور دوات قلم حاضر کر۔ میں نے تب معلوم کیا کسی مُلک کی بادشاہ زادی ہے، جو اس دل و دِماغ سے گفتگو کرتی ہے؛ فی الفور قلم دان آگے رکھ دیا۔ اُس نازنین نے ایک شُقّہ دستخطِ خاص سے لکھ کر میرے حوالے کیا اور کہا: قلعے کے پاس تِرپولیا ہے، وہاں اُس کوچے میں ایک حویلی بڑی سی ہے، اُس مکان کے مالک کا نام سیدی بہار ہے؛ تو جا کر اِس رقعے کو اُس تلک پہنچا دے۔

فقیر مُوافق فرمانے اُس کے، اُسی نام و نشان پر منزلِ مقصود تک جا پہنچا۔ دربان کی زبانی کیفیت خط کی کہلا بھیجی۔ سُنتے ہی ایک حبشی جوان خوب صورت (۹)، ایک پھینٹا طرح دار باندھے ہوئے باہر نکل آیا۔ اگرچہ رنگ سانولا تھا، پر گویا تمام نمک بھرا ہوا۔ میرے ہاتھ سے خط لے لیا، نہ بولا نہ کچھ پوچھا، اُنھیں قدموں پھر اندر چلا گیا۔ تھوڑی دیر میں گیارہ کشتیاں سربمُہر، زربفت کے تورہ پوش پڑے ہوئے، غلاموں کے سر پر دھرے باہر آیا، کہا: اِس جوان کے ساتھ جا کر یہ کشتیاں پہنچا دو۔ میں بھی سلام کر، رخصت ہو، اپنے مکان میں لایا۔ آدمیوں کو دروازے کے باہر سے رخصت کیا، وہ کشتیاں امانت حضور میں اُس پری کے گزرانیاں۔

دیکھ کر فرمایا: یہ گیارہ[۱] بدرے اشرفیوں کے لے اور خرچ میں لا، خدا رزّاق ہے۔ فقیر اُس نقد کو لے کر ضروریات میں خرچ کرنے لگا۔ اگرچہ خاطرِ جمع ہوئی، پر دل میں یہ خلش رہی: یا الٰہی! یہ کیا صورت ہے! بغیر پوچھے گچھے اِتنا مال، نا آشنا صورت اجنبی نے، ایک پرزے کاغذ پر میرے حوالے کیا! اگر اُس پری سے یہ بھید پوچھوں، تو اُس نے پہلے ہی منع کر رکھا تھا، مارے ڈر کے[۲] دم نہیں مار سکتا تھا۔

بعد آٹھ دن کے وہ معشوقہ مجھ سے مخاطب ہوئی کہ حق[۳] تعالیٰ نے آدمی کو انسانیت[۴] کا جامہ عنایت کیا ہے کہ نہ پھٹے نہ میلا ہو؛ اگرچہ پرانے کپڑے سے اُس کی آدمیت میں فرق نہیں آتا، پر ظاہر میں خلق اللہ کی نظروں میں اعتبار نہیں پاتا۔ وہ توڑے اشرفی کے ساتھ لے کر، چوک کے چوراہے پر، یوسف سوداگر کی دکان میں جا اور کچھ رقم جواہر کے[۵] بیش قیمت اور دو خلعتیں[۶] زرق برق کی مول لے آ۔ فقیر وہیں[۷] سوار ہو کر اُس کی دکان پر گیا۔ دیکھا تو ایک جوانِ[۸] شکیل، زعفرانی جوڑا[۹] پہنے گدی پر بیٹھا ہے اور اُس کا یہ عالم ہے کہ ایک عالم، دیکھنے کے لیے، دکان[۱۰] سے بازار تک کھڑا ہے۔ فقیر کمال شوق سے نزدیک جا کر، سلام[۱۱] علیک کر کر بیٹھا اور جو جو چیز مطلوب تھی، طلب کی۔ میری بات چیت اُس شہر کے باشندوں کی سی نہ تھی، اُس جوان نے گرم جوشی[۱۲] سے کہا: جو صاحب کو چاہیے، سب[۱۳] موجود ہے؛ لیکن یہ فرمائیے کس ملک سے آنا ہوا اور اِس اجنبی شہر میں رہنے کا کیا باعث ہے؟ اگر اِس حقیقت سے مطلع[۱۴] کیجیے تو مہربانی سے بعید نہیں۔ میرے تئیں اپنا

اَحوال ظاہر کرنا منظور نہ تھا؛ کچھ بات بنا کر اور جواہر، پوشاک لے کر اور قیمت اُس کی دے کر رخصت چاہی۔ اُس جوان نے رُوکھے پھیکے ہو کر کہا: اَے صاحب! اگر تم کو ایسی ہی نا آشنائی کرنی تھی، تو پہلے دوستی اِتنی گرمی سے کرنی کیا ضرور تھی! بھلے آدمیوں میں صاحب سلامت کا پاس بڑا ہوتا ہے۔ یہ بات اِس مزے اور انداز سے کہی، بے اختیار دل کو بھائی اور بے مُروّت ہو کر وہاں سے اُٹھنا، اِنسانیت کے مُناسب نہ جانا؛ اُس کی خاطر پھر بیٹھا اور بولا: تمھارا فرمانا سر آنکھوں پر، مَیں حاضر ہوں۔

اِتنے کہنے سے بہت خوش ہوا، ہنس کر کہنے لگا: اگر آج کے دن غریب خانے میں کرم کیجیے، تو تمھاری بدولت مجلس خوشی کی جما کر، دو چار گھڑی دل بہلاویں اور کچھ کھانے پینے کا شُغل باہم بیٹھ کر کریں۔ فقیر نے اُس پری کو کبھو اکیلا نہ چھوڑا تھا؛ اُس کی تنہائی یاد کر کر چند در چند عُذر کیے، پَر اُس جوان نے ہرگز نہ مانا۔ آخر وعدہ اُن چیزوں کو پہنچا کر میرے پھر آنے کا لے کر اور قسم کھلا کر رخصت دی۔ مَیں دُکان سے اُٹھ کر، جواہر اور خلعتیں اُس پری کی خدمت میں لایا۔ اُس نے قیمت جواہر کی اور حقیقت جوہری کی پوچھی۔ مَیں نے سارا اَحوال مول تول کا اور مہمانی کے بجِد ہونے کا کہہ سُنایا۔ فرمانے لگی: آدمی کو اپنا قول قرار پورا کرنا واجب ہے؛ ہمیں خُدا کی نگہبانی میں چھوڑ کر، اپنے وعدے کو وفا کر۔ ضیافت قبول کرنی سُنّت رسول کی ہے۔ تب مَیں نے کہا: میرا دل چاہتا نہیں کہ تمھیں اکیلا چھوڑ کر جاؤں، اور حُکم یوں ہوتا ہے؛ لاچار جاتا ہوں۔ جب تلک آؤں گا، دل یہیں لگا رہے گا۔ یہ کہہ کر پھر اُس جوہری

کی دُکان پر گیا۔ وُہ مُونڈھے پر بیٹھا میرا اِنتظار کھینچ رہا تھا، دیکھتے ہی بُولا:
آؤ مِہربان! بڑی راہ دِکھائی۔ وُہیں اُٹھ کر میرا ہاتھ پکڑ لیا اور چلا۔ جاتے
جاتے ایک باغ میں لے گیا۔ وُہ بڑی بہار کا باغ تھا۔ حوض اور نہروں میں
فوّارے چھوٹتے تھے، میوے طرح بہ طرح کے پَھل رہے تھے، ہر ایک درخت
مارے بوجھ کے جھوم رہا تھا، رنگ بہ رنگ کے جانور اُن پر بیٹھے چہچہے کر رہے تھے؛
اور ہر مکانِ عالی شان میں فرش ستھرا بچھا تھا۔ وہاں لبِ نہر ایک بنگلے میں جا کر
بیٹھا۔ ایک دم کے بعد آپ اُٹھ کر چلا گیا، پھر دوسری پوشاک (۴) معقول پہن کر آیا۔
میں نے دیکھ کر کہا: سُبحان اللہ! چشمِ بد دُور! سُن کر مسکرایا اور بولا: مناسب
یہ ہے کہ صاحب بھی اپنا لباس بدل ڈالیں۔ اُس کی خاطر میں نے بھی دوسرے
کپڑے پہنے۔

اُس جوان نے بڑی ٹیپ ٹاپ سے تیاری ضیافت کی کی اور سامان خوشی
کا، جیسا چاہیے، موجود کیا اور فقیر سے صحبت بہت گرم کر، مزے کی باتیں کرنے
لگا۔ اِتنے میں ساقی صُراحی و پیالہ بلّور کا لے کر حاضر ہوا اور گزک کئی قسم کی
لا رکھی، نمک دان چُن دیے۔ دَورِ شراب کا شروع ہوا۔ جب دُو چار جام
کی نوبت پہنچی، چار لڑکے اَمرد، صاحبِ (۸) جمال، زلفیں کھولے ہوئے مجلس
میں آئے، گانے بجانے لگے۔ یہ عالم ہوا اور ایسا سماں بندھا: اگر تان سین
اُس گھڑی ہوتا، تو اپنی تان بھول جاتا اور بیجو باورا سُن کر باولا ہو جاتا۔ اِس
مزے میں ایک بارگی وُہ جوان آنسو بھر لایا، دُو چار قطرے بے اِختیار نکل
پڑے اور فقیر سے بولا: اب ہمارے تمھارے (۹) دوستی جانی ہوئی، پس دل کا بھید

دوستوں سے چھپانا کسو مذہب میں درست نہیں۔ ایک بات بے تکلّف، آشنائی
کے بھروسے کہتا ہوں، اگر حکم کرو، تو اپنی معشوقہ کو بُلوا کر اِس مجلس میں تسلّی
اپنے دل کی کروں، اُس کی جُدائی سے جی نہیں لگتا۔ یہ بات ایسے اِشتیاق
سے کہی کہ بغیر دیکھے بھالے فقیر کا دل بھی مشتاق ہوا۔ میں نے کہا: مجھے
تمھاری خوشی درکار ہے، اِس سے کیا بہتر، دیر نہ کیجیے؛ سچ ہے: معشوق بن
کچھ اچھا نہیں لگتا۔

اُس جوان نے چلون کی طرف اِشارت کی۔ وونہیں ایک عورت
کالی کلوٹی، بھتنی سی، جس کے دیکھنے سے انسان بے اجل مرجاوے، جوان کے
پاس آن بیٹھی۔ فقیر اُس کے دیکھنے سے ڈر گیا، دل میں کہا: یہی بلا محبوبہ ایسے
جوانِ پری زاد کی ہے، جس کی اِتنی تعریف اور اِشتیاق ظاہر کیا! میں لاحول
پڑھ کر چپکا ہو رہا۔ اُسی عالم میں تین دن رات مجلس شراب اور راگ رنگ
کی جمی رہی۔ چوتھی شب کو غلبہ نشے اور نیند کا ہوا، میں خوابِ غفلت میں
بے اختیار سو گیا۔ جب صبح ہوئی، اُس جوان نے جگایا، کئی پیالے خمار شکنی کے
پلا کر، اپنی معشوقہ سے کہا: اب زیادہ تکلیف مہمان کو دینی خوب نہیں۔
دونوں ہاتھ پکڑ کے اُٹھے۔ میں نے رخصت مانگی، خوشی بہ خوشی
اجازت دی۔ تب میں نے جلد اپنے قدیمی کپڑے پہن لیے، اپنے گھر کی
راہ لی اور اُس پری کی خدمت میں جا حاضر ہوا۔ مگر ایسا اِتّفاق کبھو نہ ہوا
تھا کہ اُسے تنہا چھوڑ کر، شب باش کہیں ہوا ہوں؛ اِن تین دن کی غیر حاضری
سے نہایت خجل ہو کر عذر کیا اور قصّہ ضیافت کا اور اُس کے نہ رخصت

کرنے کا سارا عرض کیا۔ وہ ایک دانا زمانے کی تھی، تبسّم کرکے بولی: کیا مضائقہ اگر ایک دوست کی خاطر رہنا ہوا، ہم نے معاف کیا، تیری کیا تقصیر ہے! جب آدمی کسو کے گھر جاتا ہے، تب اُس کی مرضی سے پھر آتا ہے۔ لیکن یہ مفت کی مہمانیاں کھا پی کر چُپکے ہو رہو گے، یا اِس کا بدلا بھی اُتارو گے؟ اب یہ لازم ہے کہ جا کر اُس سوداگر بچّے کو اپنے ساتھ لے آؤ اور اُس سے دو چند ضیافت کرو۔ اور اسباب کا کچھ اندیشہ نہیں، خُدا کے کرم سے ایک دم میں سب لوازمہ تیار ہو جاوے گا اور بہ خوبی مجلس ضیافت کی رونق پاوے گی۔

فقیر موافق حُکم کے جوہری پاس گیا اور کہا: تمھارا فرمانا میں نے تو سر آنکھوں سے بجا لایا؛ اب تم بھی، مہربانی کی راہ سے، میری عرض قبول کرو۔ اُس نے کہا: جان و دل سے حاضر ہوں۔ تب میں نے کہا: اگر اِس بندے کے گھر تشریف لے چلو، عین غریب نوازی ہے۔ اُس جوان نے بہت عذر اور حیلے کیے، پر میں نے پنڈ نہ چھوڑا، جب تلک وہ راضی ہوا۔ ساتھ ہی ساتھ اُس کو اپنے مکان پر لے چلا؛ لیکن راہ میں یہی فکر کرتا آتا تھا کہ اگر آج اپنے تئیں مقدور ہوتا تو ایسی تواضع کرتا کہ یہ بھی خوش ہوتا۔ اب میں اِسے لیے جاتا ہوں، دیکھیے کیا اتّفاق ہوتا ہے! اسی حیص بیص میں گھر کے نزدیک پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ دروازے پر دھوم دھام ہو رہی ہے، گلیاں ریت میں جھاڑو دے کر چھڑکاؤ کیا ہے، یساول اور عصے بردار کھڑے ہیں۔ میں حیران ہوا، لیکن اپنا گھر جان کر قدم اندر رکھا۔ دیکھا تو تمام حویلی میں

فرش مکلّف لائق ہر مکان کے، جا بہ جا بچھا ہے اور مسندیں لگیں ہیں۔ پان دان، گلاب پاش، عطر دان، پیک دان، چنگیریں، نرگس دان قرینے سے دھریں ہیں۔ طاقوں پر رنگترے، کنولے(۴)، نارنگیاں اور گلابیاں رنگ بہ رنگ کی چنی ہیں۔ ایک طرف رنگ آمیز ابرک کی ٹٹیوں میں چراغاں کی بہار ہے، ایک طرف جھاڑ اور سرو کنول کے روشن ہیں اور تمام دالان اور شہ نشینوں میں طلائی شمع دانوں(۵) پر کافوری شمعیں چڑھی ہیں اور جڑاؤ فانوسیں اوپر دھری ہیں۔ سب آدمی اپنے اپنے عہدوں پر مستعد ہیں۔ باورچی خانے میں دیگیں کھدکھدا رہیں ہیں۔ آب دار خانے کی ویسی ہی تیاری ہے۔ کوری کوری ٹھلیاں رکابی کی گھڑونچیوں پر، صافیوں سے بندھیں(۷) اور کٹوروں سے ڈھکی رکھی ہیں۔ آگے چوکی پر ڈونگے، کٹورے، بیلہ مع تھالی، سرپوش دھرے۔ برف کے آب خورے لگے رہیں ہیں اور شورے کی صراحیاں ہل رہی ہیں۔ غرض سب اسباب بادشاہانہ موجود ہے۔ اور کنچنیاں، بھانڈ، بھگتیے، کلاونت، قوال، اچھی پوشاک پہنے، ساز کے سر ملائے حاضر ہیں۔

فقیر نے اس جوان کو لے جا کر مسند پر بٹھایا اور دل میں حیران تھا کہ یا الٰہی! اتنے عرصے میں یہ سب تیاری کیوں کر ہوئی! ہر طرف دیکھتا پھرتا تھا، لیکن اس پری کا نشان کہیں نہ پایا۔ اسی جستجو میں ایک مرتبہ باورچی خانے کی طرف جا نکلا۔ دیکھتا ہوں تو وہ نازنین ایک مکان میں گلے میں کرتی، پانو میں تہ پوشی، سر پر سفید رومالی اوڑھے ہوئے(۱۴)، سادی خوزادی بن گہنے پاتے بیٹھی ہوئی،

(نہیں محتاج زیور کا، جسے خوبی خدا نے دی
کہ جیسے خوش نُما لگتا ہے دیکھو، چاند بن گہنے)(۱)

خبر گیری میں ضیافت کی لگ رہی ہے اور تاکید ہر ایک کھانے کی کر رہی ہے کہ خبردار! بامزہ ہو اور آب نمک، بو باس درست رہے۔ اس محنت سے وہ گلاب سا بدن سارا پسینے پسینے ہو رہا ہے۔ میں پاس جا کر تصدق ہوا اور اس شعور و لیاقت کو سراہ کر دعائیں دینے لگا۔ یہ خوشامد سن کر، تیوری چڑھا کر بولی: آدمی سے ایسے ایسے کام ہوتے ہیں کہ فرشتے کی مجال نہیں۔ میں نے ایسا کیا کیا ہے جو تو اتنا حیران ہو رہا ہے؟ بس، بہت باتیں بنائیں مجھے خوش نہیں آتیں۔ بھلا کہہ تو، یہ کون آدمیت(۳) ہے کہ مہمان کو اکیلا بٹھا کر ادھر اُدھر پڑے پھرتے! وہ اپنے جی میں کیا کہتا ہو گا! جلد جا، مجلس میں بیٹھ کر مہمان کی خاطرداری کر اور اُس کی معشوقہ کو بھی بلوا کر اُس کے پاس بٹھلا۔ فقیر وونہیں اُس جوان کے پاس گیا اور گرم جوشی کرنے لگا۔ اتنے میں دو غلام صاحب(۷) جمال صراحی اور جام جڑاؤ ہاتھ میں لیے روبرو آئے، شراب پلانے لگے۔ اس میں میں نے اُس جوان سے کہا: میں سب طرح مخلص اور خادم ہوں، بہتر یہ ہے کہ وہ صاحب(۸) جمال، کہ جس کی طرف دل صاحب کا مائل ہے، تشریف لاوے تو بڑی بات ہے۔ اگر فرماؤ، تو آدمی بلانے کی خاطر جاوے۔ یہ سنتے ہی خوش ہو کر بولا: بہت اچھا، اس وقت تم نے میرے دل کی بات کہی۔ میں نے ایک خوجے کو بھیجا۔ جب آدھی رات گئی، وہ چڑیل خاصے چوڈول پر سوار ہو کر بلائے ناگہانی سی آ پہنچی۔

فقیر نے لاچار خاطر سے مہمان کی استقبال کر کر، نہایت تپاک سے برابر اُس جوان کے لا بٹھایا۔ جوان اُس کے دیکھتے ہی ایسا خوش ہوا جیسے دُنیا کی نعمت ملی۔ وُہ بھتنی بھی اُس جوانِ پری زاد کے گلے لپٹ گئی۔ سچ مچ یہ تماشا ہُوا جیسے چودھویں رات کے چاند کو گہن لگتا ہے۔ جتنے مجلس میں آدمی تھے، اپنی اپنی اُنگلیاں دانتوں میں دابنے لگے کہ کیا کوئی بلا اِس جوان پر مسلّط ہوئی! سب کی نگاہ اُسی طرف تھی۔ تماشا مجلس کا بھول کر، اُس کا تماشا دیکھنے لگے۔ ایک شخص کنارے سے بولا: یارو! عشق اور عقل میں ضد ہے۔ جو کچھ عقل میں نہ آوے، یہ کافر عشق کر دکھاوے۔ لیلیٰ کو مجنوں کی آنکھوں سے دیکھو۔ سبھوں نے کہا: آمنّا، یہی بات ہے۔

یہ فقیر بہ موجب حکم کے مہمان داری میں حاضر تھا۔ ہر چند جوان ہم پیالہ، ہم نوالہ ہونے کو مجوّز ہوتا تھا؛ پر میں ہرگز، اُس پری کے خوف کے مارے، اپنا دل کھانے پینے یا سیر تماشے کی طرف رجوع نہ کرتا تھا اور عذر مہمان داری کا کر کے، اُس کے شامل نہ ہوتا۔ اِسی کیفیت (۶) سے تین شبانہ روز گزرے۔ چوتھی رات وُہ جوان نہایت جوشش سے مجھے بُلا کر کہنے لگا: اَب ہم بھی رخصت ہوں گے، تمھاری خاطر اپنا سب کاروبار چھوڑ چھاڑ کر، تین دن سے تمھاری خدمت میں حاضر ہیں؛ تم بھی تو ہمارے پاس ایک دَم بیٹھ کر ہمارا دل خوش کرو۔ میں نے اپنے جی میں خیال کیا: اگر اِس وقت کہنا اِس کا نہیں مانتا، تو آزردہ ہوگا؛ پس نئے دوست اور مہمان کی خاطر رکھنی ضرور ہے، تب یہ کہا: صاحب کا حکم بجا لانا منظور کہ اَلْاَمْرُ فَوْقَ الْاَدَب۔ سُنتے ہی اِس کو، جوان نے پیالہ تواضع کیا

اور میں نے پی لیا۔ پھر تو ایسا پیہم دَور چلا کہ تھوڑی دیر میں سب آدمی مجلس کے کَیفی ہو کر بے خبر ہو گئے اور میں بھی بے ہوش ہو گیا۔

جب صبح ہوئی اور آفتاب دو نیزے بلند ہوا، تب میری آنکھ کھلی، تو دیکھا میں نے نہ وہ تیاری ہے، نہ وہ مجلس، نہ وہ پری؛ فقط خالی حویلی پڑی ہے؛ مگر ایک کونے میں کمل لپٹا ہوا دھرا ہے۔ جو اس کو کھول کر دیکھا تو وہ جوان اور اس کی رنڈی، دونوں سر کٹے پڑے ہیں۔ یہ حالت دیکھتے ہی حواس جاتے رہے۔ عقل کچھ کام نہیں کرتی کہ یہ کیا تھا اور کیا ہوا! حیرانی سے ہر طرف تک رہا تھا، اتنے میں ایک خواجہ سرا (جسے ضیافت کے کام کاج میں دیکھا تھا) نظر پڑا۔ فقیر کو اس کے دیکھنے سے کچھ تسلی ہوئی، احوال اس واردات کا پوچھا۔ اس نے جواب دیا: تجھے اس بات کے تحقیق کرنے سے کیا حاصل، جو تو پوچھتا ہے؟ میں نے بھی اپنے دل میں غور کی کہ سچ تو کہتا ہے۔ پھر ایک ذرا تامل کر کے میں بولا: خیر نہ کہو، بھلا یہ تو بتاؤ وہ معشوقہ کس مکان میں ہے؟ تب اس نے کہا: البتہ جو میں جانتا ہوں، سو کہہ دوں گا؛ لیکن تجھ سا آدمی عقل مند، بے مرضی حضور کے، دو دن کی دوستی پر بے محابا بے تکلف ہو کر صحبت مے نوشی کی باہم گرم کرے، یہ کیا معنے رکھتا ہے!

فقیر اپنی حرکت اور اس کی نصیحت سے بہت نادم ہوا، سوائے اس بات کے زبان سے کچھ نہ نکلا: فی الحقیقت اب تو تقصیر ہوئی، معاف کیجیے۔ بارے وہ محلّی نے مہربان ہو کر اس پری کے مکان کا نشان بتایا اور مجھے

رُخصت کیا ؛ آپ اُن دونوں زخمیوں کے گاڑنے دابنے کی فکر میں رہا۔ میں تُہمت سے اُس فساد کی⁽⁴⁾ الگ ہُوا اور اِشتیاق میں اُس پری کے ملنے کے لیے، گھبرایا ہوا، گرتا پڑتا، ڈھونڈھتا، شام کے وقت اُس کوچے میں اُسی پتے پر جا پہنچا اور نزدیک دروازے کے ایک گوشے میں ساری رات تَلمَلاتے کٹی۔ کِسو کی آمد و رفت کی آہٹ نہ ملی اور کوئی احوال پُرساں میرا نہ ہوا۔ اِسی بے کَسی کی حالت میں صبح ہو گئی۔ جب سورج نکلا، اُس مکان کے بالاخانے کی ایک کھڑکی سے وُہ ماہ رُو میری طرف دیکھنے لگی۔ اُس وقت عالمِ خوشی کا جو مجھ پر گزرا، دل ہی جانتا ہے، شکر خدا کا کیا۔

اِتنے میں ایک خوجے نے میرے پاس آ کر کہا: اُس مسجد میں تو جا کر بیٹھ، شاید تیرا مطلب اُس جگہ بَر آوے اور اپنے دل کی مُراد پاوے۔ "فقیر" فرمانے سے اُس کے، وہاں سے اُٹھ کر اُسی مسجد میں جا رہا؛ لیکن آنکھیں دروازے کی طرف لگ رہی تھیں کہ دیکھیے پردۂ غیب سے کیا ظاہر ہوتا ہے۔ تمام دن جیسے روزہ دار شام ہونے کا اِنتظار کھینچتا ہے، میں نے بھی وُہ روز ویسی ہی بے قراری میں کاٹا۔ بارے جس تس طرح سے شام ہوئی اور دن پہاڑ سا چھاتی پر سے ٹلا؛ ایک بارگی وُہی خواجہ سرا (جن نے اُس پری کے مکان کا پتا دیا تھا) مسجد میں آیا۔ بعد فراغت⁽⁵⁾ نمازِ مغرب کے، میرے پاس آ کر اُس شفیق نے (کہ سب راز و نیاز کا محرم تھا) نہایت تسلّی دے کر ہاتھ پکڑ لیا اور اپنے ساتھ لے چلا۔ رفتہ رفتہ ایک باغیچے⁽⁶⁾ میں مجھے بٹھا کر کہا: یہاں رہو، جب تک تمھاری آرزو بر آوے۔ اور آپ رُخصت ہو کر، شاید میری حقیقت حضور میں

کھنچ گیا۔ میں اُس باغ کے پھولوں کی بہار اور چاندنی کا عالَم اور حَوض ، نہروں میں فُوّارے ، ساوَن بھادوں کے اُچھلنے کا تماشا دیکھ رہا تھا ؛ لیکن جب پھولوں کو دیکھتا ، تب اُس گُل بدن کا خیال آتا۔ جب چاند پر نظر پڑتی ، تب اُس مَہ رُو کا مُکھڑا یاد کرتا۔ یہ سب بہار اُس کے بغیر میری آنکھوں میں خار تھی۔

بارے خُدا نے اُس کے دل کو مہربان کیا۔ ایک دم کے بعد وُہ پری دروازے سے ، جیسے چَودھویں رات کا چاند ، بناوٹ کیے ، گلے میں پشواز (۱) بادلے (۲) کی سنجاف (۳) کی ، موتیوں کا دَر دامن ٹکا ہوا اور سر پر اُوڑھنی ، جس میں آنچل پلّو ، لہر گوکھرو لگا ہوا ، سر سے پاؤں تک موتیوں میں جڑی ، رَوِش پر آکر کھڑی ہوئی۔ اُس کے آنے سے ترو تازگی (۳) نئے سِرے سے اُس باغ کو اور اِس فقیر کے دل کو ہوگئی۔ ایک دم اِدھر اُدھر سَیر کر کر ، شہ نشین (۴) میں مُغرّق مسند پر تکیہ لگا کر بیٹھی۔ میں دَوڑ کر پروانے کی طرح (جیسے شمع (۵) کے گرد پھرتا ہے) تصدّق ہوا اور غُلام کی مانند دونوں ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہوا۔ اِس میں وُہ خوجہ میری خاطر بہ طورِ سفارش کے عرض کرنے لگا۔ میں نے اُس محلّی سے کہا : بندہ گنہ گار ، تقصیر وار ہے ، جو کچھ سزا میرے لائق ٹھہرے ، سو ہو۔ وُہ پری از بس کہ ناخوش تھی ، بد دماغی سے بولی کہ اب اِس کے حق میں یہی بھلا ہے کہ ستو توڑے اشرفی کے لیوے ، اپنا اسباب دُرست کر کے وطن کو سدھارے۔

میں یہ بات سُنتے ہی کاٹھ ہو گیا اور سوکھ گیا کہ اگر کوئی میرے بدن کو کاٹے ، تو ایک بوند لہو کی نہ نکلے اور تمام دُنیا آنکھوں کے آگے اندھیری لگنے لگی اور ایک آہ نامرادی کی بے اختیار جگر سے نکلی ، آنسو بھی ٹپکنے لگے۔ سوائے خُدا کے

اُس وقت کسوٗ کی توقّع نہ رہی، مایوسِ محض ہو کر اِتنا بولا: بھلا ٹک اپنے دل میں غور فرمائیے اگر مجھ کم نصیب کو دُنیا کا لالچ ہوتا، تو اپنا جان و مال حُضور میں نہ کھوتا۔ کیا ایک بارگی حقِ خدمت گُزاری اور جاں نثاری کا عالَم سے اُٹھ گیا، جو مجھ سے کم بخت پر اِتنی بے مہری فرمائی! خیر، اب میرے تئیں بھی زندگی سے کچھ کام نہیں۔ معشوقوں کی بے وفائی سے بے چارے عاشقِ نیم جاں کا نباہ نہیں ہوتا۔

یہ سُن کر تیکھی ہو، تیوری چڑھاکر خفگی* سے بولی: چہ خوش! آپ ہمارے عاشق ہیں! میڈکی کو بھی زُکام ہوا! اَے بے وُقوف! اپنے حوصلے سے زیادہ باتیں بنانیں(۲) خیالِ خام ہے۔ چھوٹا مُنہ، بڑی بات! بس چُپ رہ، یہ نکمّی بات چیت مت کر۔ اگر کسی اور نے یہ حرکتِ(۳) بے معنی کی ہوتی، پروردگار کی سوں، اُس کی بوٹیاں کٹوا چیلوں کو بانٹتی۔ پر کیا کروں، تیری خدمت یاد آتی ہے۔ اب اِسی میں بھلائی ہے کہ اپنی راہ لے۔ تیری قسمت کا(۴) دانا پانی ہماری سرکار میں یہیں تلک تھا۔ پھر میں نے روتے بسورتے کہا: اگر میری تقدیر میں یہی لکھا ہے کہ اپنے دل کے مقصد کو نہ پہنچوں اور جنگل پہاڑ میں سر ٹکراتا پھروں، تو لاچار ہوں۔ اِس بات سے بھی دِق ہو کہنے لگی: میرے تئیں یہ پھسپھندرے(۶) چوچلے اور رمز کی باتیں پسند نہیں آتیں۔ اِس اِشارے کی گفتگو کے جو لائق ہو، اُس سے جا کر کر۔ پھر اُسی خفگی کے عالَم میں اُٹھ کر اپنے دولت خانے کو چلی۔ میں نے بہتیرا* سر پٹکا، متوجّہ نہ ہوئی۔ لاچار میں بھی اُس مکان سے اُداس اور نا اُمید ہو کر نکلا۔

غرض چالیس دن تک یہی نوبت رہی۔ جب شہر کی کوچہ گردی سے اُکتاتا، جنگل میں نکل جاتا۔ جب وہاں سے گھبراتا، پھر شہر کی گلیوں میں دیوانہ سا آتا۔ نہ دن کو کھاتا، نہ رات کو سوتا،(۲) جیسے دھوبی کا کُتا نہ گھر کا نہ گھاٹ کا۔ زندگی انسان کی کھانے پینے سے ہے، آدمی اناج کا کیڑا ہے؛ طاقت بدن میں مطلق نہ رہی، آپاہج ہو کر اُسی مسجد کی دیوار کے تلے جا پڑا، کہ ایک روز وہی خواجہ سرا جمعے کی نماز پڑھنے آیا، میرے پاس سے ہو کر چلا۔ میں یہ شعر آہستہ ناطاقتی سے پڑھ رہا تھا:

اِس دردِ دل سے موت ہو، یا دل کو تاب ہو
قسمت میں جو لکھا ہو، الٰہی! شتاب ہو(۴)

اگرچہ ظاہر میں صورت میری بالکل تبدیل ہو گئی تھی؛ چہرے کی یہ شکل بنی تھی کہ جن نے مجھے پہلے دیکھا تھا، وہ بھی نہ پہچان سکتا کہ یہ وہی آدمی ہے؛ لیکن وہ محلی آوازِ درد کی سن کر متوجّہ ہوا۔ میرے تئیں بہ غور دیکھ کر افسوس کیا اور شفقت سے مخاطب ہوا کہ آخر یہ حالت اپنی پہنچائی! میں نے کہا: اب تو جو ہوا سو ہوا۔ مال سے بھی حاضر تھا، جان بھی تصدّق کی؛ اس کی خوشی یوں ہی ہوئی، تو کیا کروں! یہ سن کر، ایک خدمت گار میرے پاس چھوڑ کر مسجد میں گیا۔ نماز اور خطبے سے فراغت کر کر جب باہر نکلا؛ فقیر کو ایک میانے(۸) میں ڈال کر، اپنے ساتھ خدمت میں اُس پری بے پروا کی لے جا کر چِق کے باہر بٹھایا۔(۹) اگرچہ میری رُوَیّت(۱۱) کچھ باقی نہ رہی تھی، پر مدّت تلک شب و روز اُس پری کے پاس اتّفاق رہنے کا ہوا تھا؛ جان بوجھ کر بےگانی ہو کر خوجے(۱۲) سے پوچھنے لگی:

یہ کون ہے؟ اُس مَردِ آدمی نے کہا: یہ وُہی کم بخت، بدنصیب ہے، جو حضور کی خفگی اور عتاب میں پڑا تھا؛ اُسی سبب سے اِس کی یہ صورت بنی ہے۔ عشق کی آگ سے جلا جاتا ہے۔ ہر چند آنسوؤں کے پانی سے بجھاتا ہے، پَر وہ دُونی بھڑکتی ہے، کچھ فائدہ نہیں ہوتا۔ علاوہ، اپنی تقصیر کی خجالت سے مُوا جاتا ہے۔

پری نے ٹھٹھولی سے فرمایا: کیوں جھوٹھ بکتا ہے! بہت دن ہوئے اُس کی خبرِ وطن پہنچنے کی مجھے خبرداروں نے دی ہے، وَاللّٰہُ اَعْلَم یہ کون ہے اور تو کس کا ذِکر کرتا ہے! اُس دم خواجہ سرا نے ہاتھ جوڑ کر التماس کیا: اگر جان کی امان پاؤں، تو عرض کروں۔ فرمایا: کہہ، تیری جان تجھے بخشی۔ خوجا بولا: آپ کی ذات قدردان ہے؛ واسطے خدا کے چلون کو درمیان سے اُٹھوا کر پہچانیے اور اِس کی بےکسی کی حالت پر رَحم کیجیے، ناحق شناسی خوب نہیں۔ اب اِس کے احوال پر جو کچھ ترس کھائیے، بجا ہے اور جائے ثواب ہے، آگے حدِّ ادب؛ جو مزاجِ مبارک میں آوے، سو ہی بہتر ہے۔

اِتنے کہنے پر مُسکرا کر فرمایا: بھلا کوئی ہو، اسے دارُالشِّفا میں رکھو؛ جب بھلا چنگا ہوگا، تب اِس کے احوال کی پرسش کی جائے گی۔ خوجے نے کہا: اگر اپنے دستِ خاص سے گلاب اِس پر چھڑکیے اور زبان سے کچھ فرمائیے، تو اِس کو اپنے جینے کا بھروسا بندھے۔ ناامیدی بُری چیز ہے، دُنیا بہ اُمید قائم ہے۔ اِس پر بھی اُس پری نے کچھ نہ کہا۔ یہ سوال جواب سُن کر میں بھی اپنے جی سے اُکتا رہا تھا، بِدھڑک بول اُٹھا کہ اب اِس طور کی زندگی کو دل نہیں

چاہتا، یا تو تو گور میں لٹکا چکا ہوں، ایک روز مرنا ہے؛ اور علاج میرا بادشاہ زادی کے ہاتھ میں ہے، کریں یا نہ کریں، وہ جانیں۔

بارے مُقلّبُ القلوب نے اُس سنگ دل کے دل کو نرم کیا، مہربان ہو کر فرمایا: جلد بادشاہی حکیموں کو حاضر کرو۔ وہ نہیں طبیب آ کر جمع ہوئے، نبض، قارورہ دیکھ کر بہت غور کی۔ آخر تشخیص میں ٹھہرا کہ یہ شخص کہیں عاشق ہوا ہے؛ سوائے وصلِ معشوق کے اِس کا کچھ علاج نہیں۔ جس وقت وہ ملے، یہ صحت پاوے۔ جب حکیموں کی بھی زبانی یہی مرض میرا ثابت ہوا، حکم کیا: اِس جوان کو گرمابے میں لے جاؤ؛ نہلا کر، خاصی پوشاک پہنا کر حضور میں لے آؤ۔ وہ نہیں مجھے باہر لے گئے۔ حمّام کروا، اچھے کپڑے پہنا، خدمت میں بیگم کی حاضر کیا۔ تب وہ نازنین تپاک سے بولی: تو نے مجھے بیٹھے بٹھائے ناحق بدنام اور رسوا کیا، اب اور کیا کیا چاہتا ہے؟ جو تیرے دل میں ہے، صاف صاف بیان کر۔

یا فقرا! اُس وقت یہ عالم ہوا کہ شادی مرگ ہو جاؤں۔ خوشی کے مارے ایسا پھولا کہ جامے میں نہ سماتا تھا اور صورت شکل بدل گئی۔ شکر خدا کا کیا اور اُس سے کہا: اِس دم ساری حکیمی آپ پر ختم ہوئی کہ مجھ سے مُردے کو ایک بات میں زندہ کیا۔ دیکھو تو اُس وقت سے اِس وقت تک میرے احوال میں کیا فرق ہو گیا! یہ کہہ کر، تین بار گرد پھرا اور سامنے آ کر کھڑا ہوا اور کہا: حضور سے یوں حکم ہوتا ہے کہ جو تیرے جی میں ہو، سو کہہ؛ بندے کو ہفت اقلیم کی سلطنت سے زیادہ یہ ہے کہ غریب نوازی کر کر اِس عاجز کو قبول کیجیے اور

اپنی قدم بوسی سے سرفرازی دیجیے۔ ایک لمحہ تو سُن کر غوطے میں گئی، پھر کَن انکھیوں سے دیکھ کر کہا: بیٹھو، تم نے خدمت اور وفاداری ایسی ہی کی ہے، جو کچھ کہو، سو بجا ہے اور اپنے بھی دل پر نقش ہے، خیر، ہم نے قبول کیا۔

اُسی دن اچھی ساعت، شُبھ لگن میں چپکے چپکے قاضی نے نکاح پڑھ دیا۔ بعد اِتنی محنت اور آفت کے خدا نے یہ دن دکھایا کہ میں نے اپنے دل کا مدعا پایا؛ لیکن جیسی دل میں آرزو اُس پری سے ہم بستر ہونے کی تھی، ویسی ہی جی میں بے کلی اُس وارداتِ عجیب کے معلوم کرنے کی تھی، کہ آج تک میں نے کچھ نہ سمجھا کہ یہ پری کون ہے؟ اور وہ حبشی سا نولا، سجیلا (جس نے ایک پُرزے کاغذ پر اِتنی اشرفیوں کے بدرے میرے حوالے کیے) کون تھا؟ اور تیاری ضیافت کی بادشاہوں کے لائق ایک پہر میں کیوں کر ہوئی؟ اور وے دونوں بے گناہ اُس مجلس میں کس لیے مارے گئے؟ اور سبب خفگی اور بے مروتی کا، باوجود خدمت گزاری اور ناز برداری کے، مجھ پر کیا ہوا؟ اور پھر ایک بارگی اِس عاجز کو یوں سربلند کیا! غرض اِسی واسطے بعد رسم رسوماتِ عقد کے، آٹھ دن تلک، باوصف اِس اشتیاق کے قصدِ مباشرت کا نہ کیا۔ رات کو ساتھ سوتا، دن کو یونہیں اُٹھ کھڑا ہوتا۔

ایک دن غسل کرنے کے لیے میں نے خواص کو کہا کہ تھوڑا پانی گرم کردے تو نہاؤں۔ ملکہ مسکرا کر بولی: کس برتے پر تتا پانی؟ میں خاموش ہو رہا؛ لیکن وہ پری میری حرکت سے حیران ہوئی، بلکہ چہرے پر آثار خفگی کے نمود ہوئے۔ یہاں تلک کہ ایک روز بولی: تم بھی عجب آدمی ہو! یا اُتنے گرم،

یا اپنے ٹھنڈے! اِس کو کیا کہتے ہیں؟ اگر تم میں قوت نہ تھی، تو کیوں ایسی کچی ہوس پکائی! اُس وقت میں نے بے دھڑک ہو کر کہا: اے جانی! منصفی شرط ہے، آدمی کو چاہیے کہ انصاف سے نہ چوکے۔ بولی: اب کیا اِنصاف رہ گیا ہے؟ جو کچھ ہونا تھا، سو ہو چکا۔ فقیر نے کہا: واقعی بڑی آرزو اور مراد میری یہی تھی، سو مجھے ملی؛ لیکن دل میرا دُبدھے[1] میں ہے اور دُودِلے آدمی کی خاطر پریشان رہتی ہے، اُس سے کچھ ہو نہیں سکتا، اِنسانیت سے خارج ہو جاتا ہے۔ میں نے اپنے دل میں یہ قول کیا تھا کہ بعد اِس نکاح کے (کہ عین دل کی شادی ہے) بعضی باتیں (جو خیال میں نہیں آتیں اور نہیں کھلتیں) حضور میں پوچھوں گا کہ زبانِ مبارک سے اُس کا بیان سنوں، تو جی کو تسکین ہو۔ اُس پری نے چیں بہ جبیں ہو کر کہا: کیا خوب! ابھی سے بھول گئے! یاد کرو، بارہا ہم نے کہا ہے کہ ہمارے کام میں ہرگز دخل نہ کیجو[2] اور کسی بات کے متعرض نہ ہوجو[3]؛ خلافِ معمول یہ بے ادبی کرنی کیا لازم ہے! (۴) فقیر نے ہنس کر کہا: جیسی[5] اور بے ادبیاں معاف کرنے کا حکم ہے، ایک یہ بھی سہی۔ وہ پری نظریں بدل کر، تیہے میں آکر، آگ کا بگولا بن گئی اور بولی: اب تو بہت سر چڑھا؛ جا اپنا کام کر، اِن باتوں سے تجھے کیا فائدہ ہوگا؟ میں نے کہا: دنیا میں اپنے بدن کی شرم سب سے زیادہ ہوتی ہے، لیکن ایک دوسرے کا واقف کار ہوتا ہے؛ پس جب ایسی چیز دل پر روا رکھی، تو اور کون سا بھید چھپانے کے لائق ہے؟

میری اِس رمز کو وہ پری[6] وقوف سے دریافت کر کر کہنے لگی: یہ بات

سچ ہے، پر جی میں یہ سوچ آتا ہے کہ اگر مجھ نگوڑی کا راز فاش ہو، تو بڑی قیامت مچے۔ میں بولا: یہ کیا مذکور ہے! بندے کی طرف سے یہ خیال دل میں نہ لاؤ اور خوشی سے ساری کیفیت جو بیتی ہے[1] فرماؤ۔ ہرگز ہرگز میں دل سے زبان تک نہ لاؤں گا، کسو کے کان پڑنا کیا امکان ہے۔ جب اُس نے دیکھا کہ اب سوائے کہنے کے اس عزیز سے چھٹکارا نہیں، لاچار ہوکر بولی: ان باتوں کے کہنے میں بہت سی خرابیاں ہیں، تو خواہ نخواہ درپے ہوا۔ خیر تیری خاطر عزیز ہے، اس لیے اپنی سرگذشت بیان کرتی ہوں، تجھے بھی اس کا پوشیدہ رکھنا ضرور ہے، خبر شرط![2]

غرض بہت سی تاکید کرکر کہنے لگی کہ میں بدبخت ملکِ دمشق کے سلطان کی بیٹی ہوں اور وہ سلاطینوں سے بڑا بادشاہ ہے۔ سوائے میرے کوئی لڑکا بالا اُس کے یہاں نہیں ہوا۔ جس دن سے میں پیدا ہوئی، ماں باپ کے[3] سایے میں ناز و نعمت اور خوشی خرمی سے پلی۔ جب ہوش آیا، تب اپنے دل کو خوب صورتوں اور نازنینوں کے ساتھ لگایا؛ چناں چہ ستھری ستھری[4] پری زاد ہمجولی امرازادیاں مصاحبت میں اور اچھی اچھی قبول صورت ہم عمر خواصیں[5]، سہیلیاں خدمت میں رہتی تھیں[6]۔ تماشا ناچ[7] اور راگ رنگ کا ہمیشہ دیکھا کرتی۔ دنیا کے بھلے برے سے کچھ سروکار نہ تھا۔ اپنی بے فکری کے عالم کو دیکھ کر، سوائے خدا کے شکر کے کچھ منہ سے نہ نکلتا تھا۔

اتفاقاً طبیعت خود بہ خود ایسی بے مزہ ہوئی کہ نہ مصاحبت کسو کی بھاوے، نہ مجلس خوشی کی خوش آوے۔ سودائی سا مزاج[8] ہوگیا، دل

اُداس اور حیران۔ نہ کسو کی صورت اچھی لگے، نہ بات کہنے سُننے کو جی چاہے۔ میری یہ حالت دیکھ کر دائی، دَدا، چھوچھو، اَنگا؛ سب کی سب متفکر ہوئیں اور قدم پر گرنے لگیں۔ یہی خواجہ سَرا نمک حلال قدیم سے میرا مَحرم اور ہم راز ہے، اس سے کوئی بات مخفی نہیں؛ میری وحشت دیکھ کر بولا: اگر بادشاہ زادی تھوڑا سا شربت وَرَقُ الخیال کا نوشِ جاں فرماویں، تو اَغلب ہے کہ طبیعت بحال ہو جاوے اور فرحت مزاج میں آوے۔ اِس کے اِس طرح کے کہنے سے مجھے بھی شوق ہوا، تب میں نے فرمایا: جلد حاضر کر۔ مَحَلّی باہر گیا؛ ایک صُراحی اُسی شربت کی تکلف سے بنا کر، برف میں لگا کر، لڑکے کے ہاتھ لوا کر آیا۔ میں نے پیا۔ جو کچھ اُس کا فائدہ بیان کیا تھا، ویسا ہی دیکھا۔ اُس وقت اِس خدمت کے اِنعام میں ایک بھاری خِلعت خوجے کو عنایت کی اور حکم کیا کہ ایک صُراحی ہمیشہ بِلا ناغہ اِسی وقت حاضر کیا کر۔

اُس دن سے یہ مقرر ہوا کہ خواجہ سَرا صُراحی اُسی چھوکرے کے ہاتھ لوا لاوے اور بندی پی جاوے۔ جب اُس کا نشہ طلوع ہوتا، تو اُس کی لہر میں اُس لڑکے سے ٹھٹھا، مزاخ کر کر دل بہلاتی تھی۔ وہ بھی جب ڈھیٹھ ہوا، تب اچھی اچھی، میٹھی میٹھی باتیں کرنے لگا اور اَچنبھے کی نقلیں لانے، بلکہ آہ ادہی بھی بھرنے اور سِسکیاں لینے۔ صورت تو اُس کی طرح دار، لائق دیکھنے کے تھی؛ بے اختیار جی چاہنے لگا۔ میں نے دل کے شوق سے اور اٹھکھیلیوں کے ذوق سے ہر روز اِنعام، بخشش دینے لگی؛ پر

وہ کم بخت ویسے کپڑوں سے (جیسے ہمیشہ پہنے رہتا تھا) حضور میں آتا، بلکہ وہ لباس بھی میلا کچیلا (۲) ہو جاتا۔ ایک دن پوچھا: تجھے سرکار سے اِتنا کچھ ملا، پر تو نے اپنی صورت ویسی کی ویسی ہی پریشان بنا رکھی، کیا سبب ہے؟ وے روپے کہاں خرچ کیے، یا جمع کر رکھے؟

لڑکے نے جب خاطر داری کی باتیں جو سنیں اور مجھے اپنا احوال پرساں پایا، آنسو ڈبڈبا کر کہنے لگا: جو کچھ آپ نے اِس غلام کو عنایت کیا، سب اُستاد نے لے لیا، مجھے ایک پیسا نہیں دیا۔ کہاں سے دوسرے کپڑے بناؤں، جو پہن کر حضور میں آؤں۔ اِس میں میری تقصیر نہیں، میں لاچار ہوں۔ اِس غریبی کے کہنے پر اُس کے (۶) ترس آیا، وونہیں خواجہ سرا کو فرمایا: آج سے اِس لڑکے کو اپنی صحبت میں تربیت کر اور لباس اچھا تیار کروا کر پہنا اور لونڈوں میں بے فائدہ کھیلنے کودنے نہ دے؛ بلکہ اپنی خوشی یہ ہے کہ آداب لائق حضور کی خدمت کے سیکھے اور حاضر رہے۔ خواجہ سرا موافق فرمانے کے بجا لایا اور میری مرضی جو اُدھر دیکھی، نہایت اُس کی خبر گیری کرنے لگا۔ تھوڑے دنوں میں، فراغت اور خوش خوری (۹) کے سبب سے، اُس کا رنگ روغن کچھ کا کچھ ہو گیا اور کینچلی سی ڈال دی۔ میں اپنے دل کو ہر چند سنبھالتی، پر اُس کافر کی صورت جی میں ایسی کھب گئی تھی، یہی جی چاہتا تھا کہ مارے پیار کے اُسے کلیجے میں ڈال رکھوں اور اپنی آنکھوں سے ایک پل جدا نہ کروں۔ آخر اُس کو مصاحبت میں داخل کیا، اور خلعتیں طرح بہ طرح کی اور جواہر رنگ بہ رنگ کے پہنا کر دیکھا کرتی۔ بارے اُس کے نزدیک

رہنے سے آنکھوں کو ٹھنڈک، کلیجے کو ٹھنڈک ہوئی۔ ہر دم اُس کی خاطرداری کرتی۔ آخر کو میری یہ حالت پہنچی کہ اگر ایک دم کچھ ضروری کام کو میرے سامنے سے جاتا، تو چین نہ آتا۔

بعد کئی برس کے وہ بالغ ہوا، مسیں بھیگنے لگیں، چھب تختی درست ہوئی، تب اُس کا چرچا باہر درباریوں میں ہونے لگا۔ دربان اور رونے، پیشوڑے، باری دار اور یساول، چوبدار اُس کو محل کے اندر آنے جانے سے منع کرنے لگے۔ آخر اُس کا آنا موقوف ہوا۔ مجھے تو اُس بغیر کل نہ پڑتی تھی، ایک دم پہاڑ تھا، جب یہ احوال ناامیدی کا سُنا، ایسی بدحواس ہو گئی گویا مجھ پر قیامت ٹوٹی اور یہ حالت ہوئی کہ نہ کچھ کہہ سکتی ہوں، نہ اُس بن رہ سکتی ہوں۔ کچھ بس نہیں چل سکتا، الٰہی کیا کروں! عجب طرح کا قلق ہوا۔ مارے بے قراری کے اُسی محلی کو (جو میرا بھیدو تھا) بُلا کر کہا کہ مجھے غور اور پرداخت اِس لڑکے کی منظور ہے، بالفعل صلاحِ وقت یہ ہے کہ ہزار اشرفی پونجی دے کر، چوک کے چوراہے میں دُکان جوہری کی کروا دو، تو تجارت کر کے، اُس کے نفع سے اپنی گزران فراغت سے کیا کرے۔ اور میرے محل کے قریب ایک حویلی اچھے نقشے کی، رہنے کے لیے بنوا دو۔ لونڈی غلام، نوکر چاکر جو ضرور ہوں، مول لے کر اور درماہا مقرر کر کر اُس پاس رکھوا دو کہ کسو طرح بے آرام نہ ہو۔ خواجہ سرا نے اُس کی بود و باش کی اور جوہری پنے اور تجارت کی سب تیاری کر دی۔ تھوڑے عرصے میں اُس کی دُکان ایسی چمکی اور نمود ہوئی کہ جو خلعتیں فاخرہ اور جواہر بیش قیمت،

سرکار میں بادشاہ کی اور امیروں کی درکار و مطلوب ہوتے، اُسی کے یہاں بہم پہنچتے۔ آہستہ آہستہ یہ دُکان جمی کہ جو تحفہ ہر ایک مُلک کا چاہیے، وہیں ملے۔ سب جوہریوں کا رُوزگار اُس کے آگے مَندا ہوگیا۔ غرض اُس شہر میں کوئی برابری اُس کی نہ کرسکتا، بلکہ کسی مُلک میں ویسا کوئی نہ تھا۔

اِسی کاروبار میں اُس نے تو لاکھوں روپے کمائے، پر جُدائی اُس کی رُوز بہ رُوز نقصان میرے تَن بدن کا کرنے لگی۔ کوئی تدبیر نہ بن آئی کہ اُس کو دیکھ کر اپنے دل کی تسلّی کروں۔ بدان صَلاح کی خاطِر اُسی واقف کار محلّی کو بُلایا اور کہا: کوئی ایسی صورت بَن نہیں آتی کہ ذرا اُس کی صورت میں دیکھوں اور اپنی جان کو صَبر دوں؟ مگر یہ طَرح ہے کہ ایک سُرنگ اُس کی حَویلی سے کُھدوا کر محل میں ملا دو۔ حُکم کرتے ہی، کئی دِنوں میں ایسی نَقب تیار ہوئی کہ جب سہی سانجھ ہوتی، چُھپکے ہی وہ خواجہ سَرا اُس جوان کو اُسی راہ سے لے آتا۔ تمام شب شراب کباب، عَیش و عِشرت میں کٹتی۔ مَیں اُس کے ملنے سے آرام پاتی، وہ میرے دیکھنے سے خوش ہوتا۔ جب فَجر کا تارا نکلتا اور مُوَذِّن اذان دیتا: محلّی اُسی راہ سے اُس جوان کو اُس کے گھر پہنچا دیتا۔ اِن باتوں سے سِوائے اُس خُوجے کے اور دو دائیوں کے (جنھوں نے مجھے دودھ پلایا اور پالا تھا) چوتھا آدمی کوئی واقف نہ تھا۔

ایک مُدّت اِس طَرح سے گُزری۔ ایک رُوز کا یہ ذِکر ہے کہ مُوافق معمُول کے خُوجہ جو اُس کو بُلانے گیا: دیکھے تو وہ جوان فکر مند سا، چُپکا بیٹھا ہے۔ محلّی نے پوچھا: آج خیر ہے، کیُوں ایسے دِل گیر ہو رہے ہو؟ چلو،

حضور میں یاد فرمایا ہے۔ اُس نے ہرگز کچھ جواب نہ دیا، زبان نہ ہلائی۔ خواجہ سرا اپنا سا مُنہ لے کر اکیلا پھر آیا اور احوال اُس کا عرض کیا۔ میرے تئیں شیطان جو خراب کرے، اِس پر بھی محبت اُس کی دل سے نہ بھولی۔ اگر یہ جانتی کہ عشق اور چاہ ایسے نمک حرام، بے وفا کی آخر کو بدنام اور رُسوا کرے گی اور ننگ و ناموس سب ٹھکانے لگے گا؛ تو اُسی دم اُس کام سے باز آتی اور توبہ کرتی، پھر اُس کا نام نہ لیتی، نہ اپنا دل اُس بے حیا کو دیتی۔ پر ہونا تو یوں تھا، اِس لیے حرکتِ بے جا اُس کی خاطر میں نہ لائی اور اُس کے نہ آنے کو، معشوقوں کا چوچلا اور ناز سمجھا؛ اُس کا نتیجہ یہ دیکھا کہ اِس سرگذشت سے، بغیر دیکھے بھالے، تو بھی واقف ہوا۔ نہیں تو مَیں کہاں اور تو کہاں! خیر، جو ہوا سو ہوا!

اِس خر دماغی پر اُس گدھے کی خیال نہ کر، دوبارہ خوجے کے ہاتھ پیغام بھیجا کہ اگر تو اِس وقت نہیں آوے گا، تو مَیں کسو نہ کسو ڈھب سے وہیں آتی ہوں؛ لیکن میرے آنے میں بڑی قباحت ہے۔ اگر یہ راز فاش ہوا، تو تیرے حق میں بہت بُرا ہے۔ ایسا کام نہ کر جس میں رسوائی کے اور کچھ پھل نہ ملے۔ بہتر یہی ہے جلد چلا آ، نہیں تو مجھے پہنچا جان۔

جب یہ سندیسا گیا اور اِشتیاق میرا نپٹ دیکھا؛ بھونڈی سی صورت بنائے ہوئے، ناز نخرے سے آیا۔ جب میرے پاس بیٹھا، تب میں نے اُس سے پوچھا کہ آج رُکاوٹ اور خفگی کا کیا باعث ہے؟ اِتنی شوخی اور گستاخی تو نے کبھو نہ کی تھی، ہمیشہ بلا عذر حاضر ہوتا تھا۔ تب اُس نے

کہا کہ مَیں گُم نام، غریب، حُضور کی توجُّہ سے اور دامنِ دَولت کے باعث اِس مقدُور کو پہنچا، بہت آرام سے زندگی کٹتی ہے، آپ کے جان و مال کو دُعا کرتا ہوں۔ یہ تقصیر، بادشاہ زادی کے مُعاف کرنے کے بھروسے، اِس گُنہ گار سے سرزد ہوئی؛ اُمّید وار عفو کا ہوں۔ میں تو جان و دل سے اُسے چاہتی تھی، اُس کی بناوٹ کی باتوں کو مان لیا اور شرارت پر نظر نہ کی؛ بلکہ پھر دل داری سے پوچھا: کیا تجھ کو ایسی مُشکل کٹھن* پیش آئی جو ایسا مُتفکّر ہو رہا ہے؛ اُس کو عرض کر، اُس کی بھی تدبیر ہو جائے گی۔

غرض اُس نے اپنی خاکساری کی راہ سے یہی کہا کہ مجھ کو سب مشکل ہے اور آپ کے رُو بہ رُو سب آسان ہے۔ آخر اُس کے فحوائے کلام اور بت کہاوے* سے یہ کُھلا کہ ایک باغ نہایت سرسبز اور عمارتِ عالی، حوض، تالاب، کنوئیں پختہ سمیت*، غُلام کی حویلی کے نزدیک، نافِ شہر* میں بِکاؤ ہے؛ اور اُس باغ کے ساتھ ایک لونڈی بھی گائن، کہ علمِ موسیقی میں خوب سلیقہ رکھتی ہے؛ لیکن یے دونوں باہم بکتے ہیں، نہ اکیلا باغ؛ جیسے اونٹ کے گلے میں بلّی۔ جو کوئی وہ باغ لیوے، اُس کنیز کی بھی قیمت دیوے۔ اور تماشا یہ ہے باغ کا مول لاکھ روپے اور اُس باندی کا بہا پانچ لاکھ۔ فدوی سے اِتنے روپے بالفعل سرانجام نہیں ہو سکتے۔ میں نے اُس کا دل بہت بے اِختیار شوق میں اُن کی خریداری کے پایا کہ اِسی واسطے دل حیران اور خاطر پریشان تھا۔ باوجودے کہ رُو بہ رُو میرے پاس بیٹھا تھا، تب بھی اُس کا چہرہ ملین اور جی اُداس تھا۔ مجھے تو خاطرداری اُس کی ہر گھڑی

اور ہر پل منتظر رہتی، اُسی وقت خواجہ سرا کو حکم کیا کہ کل صبح کو قیمت اُس باغ کی لونڈی سمیت چکا کر، قبالہ باغ کا اور خطِ کنیزک کا لکھوا کر اِس شخص کے حوالے کرو، اور مالک کو زرِ قیمت خزانۂ عامرہ سے دِلوا دو۔ اِس پروانگی (۲) کے سنتے ہی آداب بجا لایا اور منہ پر رونق (۴) آئی۔ ساری رات اُسی قاعدے سے (جیسے ہمیشہ گزرتی تھی) ہنسی خوشی سے کٹی۔ فجر ہوتے ہی وہ رخصت ہوا۔ خوجے نے موافق فرمانے کے، اُس باغ کو اور لونڈی کو خرید کر دیا۔ پھر وہ جوان رات کو موافق معمول کے آیا جایا کرتا۔

ایک روز بہار کے موسم میں کہ مکان بھی دِل چسپ تھا، بدلی گھمنڈ رہی تھی، پھوہیاں (۵) پڑ رہی تھیں، بجلی بھی کوندھ رہی تھی اور ہوا نرم نرم بہتی تھی، غرض عجیب کیفیت اُس دم تھی؛ جو نہیں رنگ بہ رنگ کے حباب اور گلابیاں طاقوں پہ چنی ہوئیں نظر پڑیں، دِل للچایا کہ ایک گھونٹ لوں۔ جب دو تین پیالوں کی نوبت پہنچی، دو نہیں خیال اُس باغِ نو خرید کا گزرا۔ کمالِ شوق ہوا کہ ایک دم اِس عالم میں وہاں کی سیر کیا چاہیے۔ کم بختی جو آوے، اونٹ چڑھے کتا کاٹے؛ اچھی طرح بیٹھے بٹھائے، ایک دائی کو ساتھ لے کر، سرنگ کی راہ سے اُس جوان کے مکان میں گئی، وہاں سے باغ کی طرف چلی۔ دیکھا تو ٹھیک اُس باغ کی بہار بہشت کی برابری کر رہی ہے۔ قطرے مینہ کے درختوں کے سبز سبز پتوں پر جو پڑتے ہیں، گویا زمرد کی پٹریوں پر موتی جڑے ہیں۔ اور سرخی پھولوں کی اُس ابر میں ایسی بھلی لگتی ہے، جیسے شام کو شفق پھولے ہے اور نہریں لبالب،

مانند فرشِ آئینے⁽¹⁰⁾ کے نظر آتی ہیں اور موجیں لہراتی ہیں۔

غرض اُس باغ میں ہر طرف سیر کرتی پھرتی تھی کہ دن ہو چکا، سیاہی شام کی نمود ہوئی۔ اتنے میں وہ جوان ایک روِش پر نظر آیا اور مجھے دیکھ بہت ادب اور گرم جوشی سے آگے بڑھ کے، میرا ہاتھ اپنے ہاتھ پر دھر کر بارہ دری کی طرف لے چلا۔ جب وہاں میں گئی، تو وہاں کے عالم نے سارے باغ کی کیفیت کو دل سے بھلا دیا، یہ روشنی کا ٹھاٹھ تھا۔ جا بہ جا قمقمے سروِ چراغاں، کنول اور فانوسِ خیال، شمعِ مجلس حیران⁽⁷⁾ اور فانوسیں روشن تھیں، کہ شبِ⁽⁸⁾ برات، باوجود چاندنی اور چراغاں کے، اُس کے آگے اندھیری لگتی۔ ایک طرف آتش بازی، پھُل جھڑی، انار، داؤدی، چھچھوندیا⁽⁹⁾، مرواریدِ، مہتابی، ہوائی، چرخی، ہتھ پھول، جاہی جوہی، پٹاخے، ستارے چھٹتے تھے۔

اِس عرصے میں بادل پھٹ گیا اور چاند نکل آیا، بعینہٖ جیسے نافرمانی جوڑا پہنے ہوئے کوئی معشوق نظر آجاتا ہے۔ بڑی کیفیت⁽¹¹⁾ ہوئی۔ چاندنی⁽¹²⁾ چھٹکتے ہی جوان نے کہا: اب چل کر باغ کے بالاخانے پر بیٹھیے۔ میں ایسی احمق ہو گئی تھی کہ جو وہ نگوڑا کہتا، سو میں مان لیتی۔ اب یہ ناچ نچایا کہ مجھ کو اوپر لے گیا۔ وہ کوٹھا ایسا بلند تھا کہ تمام شہر کے مکان اور بازار کے چراغاں گویا اُس⁽¹³⁾ کے پائیں باغ تھے۔ میں اُس جوان کے گلے میں بانہہ ڈالے ہوئے خوشی کے عالم میں بیٹھی تھی؛ اتنے میں ایک رنڈی نہایت بھونڈی سی، صورت نہ شکل⁽¹⁴⁾ چولھے میں سے نکل، شراب کا شیشہ ہاتھ میں لیے ہوئے آ پہنچی۔

مجھے اُس وقت اُس کا آنا نہایت بُرا لگا اور اُس کی صورت دیکھنے سے دل میں ہَول اُٹھی۔ تب میں نے گھبرا کر جوان سے پوچھا: "یہ تحفۂ علّت کون ہے، تو نے کہاں سے پیدا کی؟" وہ جوان ہاتھ باندھ کر کہنے لگا: "یہ وُہی لونڈی ہے جو اِس باغ کے ساتھ، حضور کی عنایت سے خرید ہوئی۔"

میں نے معلوم کیا کہ اِس اَحمق نے بڑی خواہش سے اِس کو لیا ہے، شاید اِس کا دل اِس پر مائل ہے؛ اِسی خاطر سے، پیچ تاب کھا کر میں چُپکی ہو رہی، لیکن دل اُسی وقت سے مُکدّر ہوا اور ناخوشی مزاج پر چھا گئی۔ تِس پر قیامت اُس ایسے تیسے نے یہ کی کہ ساقی اُسی چھنال کو بنایا۔ اُس وقت میں اپنا لہو پیتی تھی اور جیسے طوطی کو کوئی کوّے کے ساتھ ایک پنجرے میں بند کرتا ہے، نہ جانے کی فرصت پاتی تھی اور نہ بیٹھنے کو جی چاہتا تھا۔

قِصّہ مختصر، وہ شراب بوند کی بوند تھی، جس کے پینے سے آدمی حیوان ہو جائے۔ دو چار جام پے در پے اُسی تیز آب (۸) کے جوان کو دیے اور آدھا پیالہ، جوان کی منّت سے میں نے بھی زہر مار کیا۔ آخر وہ پلشت، بے حیا بھی بدمست ہو کر اُس مردُود سے بے ہُودہ اَدائیں کرنے لگی اور وہ چیلا بھی نشے میں بے لحاظ ہو چلا اور نامعقول حرکتیں کرنے لگا۔ مجھے یہ غیرت آئی اگر اِس وقت زمین پھاٹے، تو میں سما جاؤں، لیکن اُس کی دوستی کے باعث میں بلبلی اِس پر بھی چُپ ہو رہی پر وہ تو اَصل کا پاجی تھا، میرے اِس درگذر کرنے کو نہ سمجھا، نشے کی لہر میں اور بھی دو پیالے چڑھا گیا کہ رہتا سہتا ہوش جو تھا، وہ بھی گُم ہوا اور میری طرف سے

مطلق دھڑکا جی سے اٹھا دیا۔ بے شرمی سے، شہوت کے غلبے میں، میرے رو بہ رو اس بے حیا نے اس بدذوڑے سے صحبت کی۔ اور وہ چھنل پاپی بھی اس حالت میں نیچے پڑی ہوئی نخرے* تلے کرنے لگی اور دونوں میں چوما چاٹی ہونے لگی۔ نہ اس بے وفا میں وفا، نہ اس بے حیا میں حیا۔ جیسی روح، ویسے فرشتے۔

میری اس وقت یہ حالت تھی جیسی (۱) اوسر چوکی ڈومنی گاوے تال بے تال۔ اپنے اوپر لعنت کرتی تھی کہ کیوں تو یہاں آئی، جس کی یہ سزا پائی۔ آخر کہاں تک سہوں، میرے سر سے پانو تک آگ لگ گئی اور انگاروں پر لوٹنے لگی۔ اس غصے اور طیش میں یہ کہاوت (بیل نہ کودا، کودی گون (۲)؛ یہ تماشا دیکھے کون (۳)) کہتی ہوئی وہاں سے اٹھی۔

وہ شرابی اپنی خرابی دل میں سوچا کہ اگر بادشاہ زادی اس وقت ناخوش ہوئی، تو کل میرا کیا حال ہوگا اور صبح کو کیا قیامت مچے گی! اب (۴) بنے تو اس کا کام تمام کر ڈالوں۔ یہ ارادہ اس غیبانی کی صلاح سے جی میں ٹھہرا کر (۵) گلے میں پٹکا ڈال، میرے پانو آکر پڑا اور پگڑی سر سے اتار کر منت و زاری کرنے لگا۔ میرا دل تو اس پر لٹو ہوئی (۶) رہا تھا؛ جیدھر لیے پھرتا تھا، پھرتی تھی اور چکئی (۶) کی طرح میں اس کے (۷) اختیار میں تھی؛ جو کہتا تھا، سو کرتی تھی۔ جوں توں مجھے پھسلا پندھلا کر پھر بٹھلایا اور اسی شراب دو آتشہ کے (۸) دو چار پیالے بھر بھر کر آپ بھی پیے اور مجھے بھی دیے۔ ایک تو (۹) غصے کے مارے جل بھن کر کباب ہو رہی تھی، دوسرے ایسی شراب پی؛ جلد بے ہوش ہوگئی، کچھ حواس باقی نہ رہے۔ تب اس بے رحم، نمک حرام، کٹر* سنگ دل

نے تلوار سے مجھے گھائل کیا، بلکہ اپنی دانست میں مار چکا۔ اُس دم میری آنکھ کھلی تو منہ سے یہی نکلا: خیر! جیسا ہم نے کیا، ویسا پایا؛ لیکن تو اپنے تئیں میرے اِس خونِ ناحق سے بچائیو۔

مبادا! ہو کوئی ظالم! ترا گریباں گیر③
مرے لہو کو تو دامن سے دھو، ہوا سو ہوا

کسی سے یہ بھید ظاہر نہ کیجو، اور ہم نے تو تجھ سے جان تک بھی دَر گذر نہ کی۔ پھر اُس کو خدا کے حوالے کرکر میرا جی ڈوب گیا، مجھے اپنی سُدھ بُدھ کچھ نہ رہی۔ شاید اُس قصائی نے مجھے مُردہ خیال کر، اُس صندوق میں ڈال کر قلعے کی دیوار کے تلے لٹکا دیا؛ سو تو نے دیکھا۔ میں کسو کا بُرا نہ چاہتی تھی، لیکن یہ خرابیاں قسمت میں لکھی تھیں۔ مٹتی نہیں کرم کی ریکھا۔ اِن آنکھوں کے سبب یہ کچھ دیکھا۔ اگر خوب صورتوں کے دیکھنے کا دل میں شوق نہ ہوتا، تو وہ بدبخت میرے گلے کا طوق نہ ہوتا۔ اللہ نے یہ کام کیا کہ تجھ کو وہاں پہنچا دیا اور سبب میری زندگی کا کیا۔ اب حیا جی میں آتی ہے کہ یہ رسوائیاں کھینچ کر اپنے تئیں جیتا نہ رکھوں، یا کسو کو منہ نہ دکھاؤں؛ پر کیا کروں، مرنے کا اختیار اپنے ہاتھ میں نہیں۔ خدا نے مار کر پھر جلایا، آگے دیکھیے کیا قسمت میں بدا ہے۔ ظاہر میں تو تیری دوڑ دھوپ اور خدمت کام آئی، جو ویسے زخموں سے شفا پائی۔ تو نے جان و مال سے میری خاطر کی اور جو کچھ اپنی بساط تھی، حاضر کی۔ اُن دنوں تجھے بے خرچ اور دُودلا دیکھ کر، وہ شقہ سیدی بہار کو (جو میرا خزانچی ہے) لکھا۔ اُس میں یہی مضمون تھا کہ

یَں خیر و عافیت سے اب فُلانے مکان میں ہوں ، مجھ بدطالع کی خبر والدۂ شریفہ کی خدمت میں پہنچائیو۔ اُس نے تیرے ساتھ دو کشتیاں نقد کی خرچ کی خاطر بھیج دیں۔ اور جب تجھے خلعت اور جواہر کے خرید کرنے کو یوسف سوداگر بچے کی دُکان پر بھیجا ؛ مجھے یہ بھروسا تھا کہ وُہ کم حوصلہ ہر ایک سے جلد آشنا ہو بیٹھتا ہے ؛ تجھے بھی اَجنبی جان کر ، اَغلَب ہے کہ دوستی کرنے کے لیے ، اِترا کر دعوت اور ضیافت کرے گا۔ سو میرا منصوبہ ٹھیک بیٹھا۔ جو کچھ میرے دل میں خیال آیا تھا ، اُس نے ویسا ہی کیا۔ تو جب اُس سے قول قرار پھر آنے کا کر کر میرے پاس آیا اور مہمانی کی حقیقت اور اُس کا بجِد ہونا مجھ سے کہا ؛ مَیں دل میں خوش ہوئی کہ جب تو اُس کے گھر میں جا کر کھاوے پیوے گا ، تب اگر تو بھی اُس کو مہمانی کی خاطر بُلاوے گا ، وُہ دوڑا چلا آوے گا ؛ اِس لیے تجھے جلد رُخصت کیا۔ تین دن کے پیچھے جب تو وہاں سے فراغت کر کے آیا اور میرے رُو بہ رُو عُذر غیر حاضری کا شرمندگی سے لایا ، میں نے تیری تشفّی کے لیے فرمایا : کچھ مُضائقہ نہیں ، جب اُس نے رضا دی ، تب تو آیا ؛ لیکن بے شرمی خوب نہیں کہ دوسرے کا اِحسان اپنے سر پر رکھیے اور اُس کا بدلا نہ کیجیے۔ اب تو بھی جا کر اُس کی اِستدعا کر اور اپنے ساتھ ہی ساتھ لے آ۔

جب تو اُس کے گھر گیا ، تب میں نے دیکھا کہ یہاں کچھ اَسباب مہمان داری کا تیار نہیں۔ اگر وُہ آجاوے تو کیا کروں۔ لیکن یہ فُرصت پائی کہ اِس مُلک میں قدیم سے بادشاہوں کا یہ معمول ہے کہ آٹھ مہینے کاروبارِ مُلکی اور مالی کے واسطے مُلک گیری میں باہر رہتے ہیں اور چار مہینے موسم برسات کے قلعۂ مبارک

میں جلوس فرماتے ہیں۔ اُن دِنوں دُو چار مہینے سے بادشاہ، یعنی* ولی نعمت* مجھ بدبخت کے، بند و بست کی خاطر مُلک گیری کو تشریف لے گئے تھے۔ جب تک تو اُس جوان کو ساتھ لے کر آوے کہ سیدی بہار نے میرا احوال خدمت میں بادشاہ بیگم کی (کہ والدہ مجھ ناپاک کی ہیں) عرض کیا۔ پھر میں، اپنی تقصیر اور گُناہ سے خجل ہو کر، اُن کے رُو بہ رُو جا کر کھڑی ہوئی اور جو سرگذشت تھی، سب بیان کی۔ ہر چند اُنھوں نے میرے غائب ہونے کی کیفیت، دُور اندیشی اور مِہرِ مادری سے، چھپا رکھی تھی کہ خُدا جانے اِس کا انجام کیا ہو، ابھی یہ رُسوائی ظاہر کرنی خوب نہیں۔ میرے بدلے میرے عیبوں کو اپنے پیٹ میں رکھ چھوڑا تھا، لیکن میری تلاش میں تھیں۔ جب مجھے اُس حالت میں دیکھا اور سب ماجرا سُنا، (۲) آنسو بھر لائیں اور فرمایا: اے کم بخت، ناشُدنی! تو نے جان بوجھ کر نام و نشان بادشاہت کا سارا کھویا، ہزار افسوس! اور اپنی زندگی سے بھی ہاتھ دھویا! کاشکے تیرے عوض میں پتھر جنتی تو صبر آتا! اب بھی توبہ کر، جو قسمت میں تھا، سو ہوا۔ اب آگے کیا کرے گی؟ جیوے گی یا مرے گی؟
میں نے نہایت شرمندگی سے کہا: مجھ بے حیا کے نصیبوں میں یہی لکھا تھا جو اِس بدنامی اور خرابی میں ایسی ایسی آفتوں سے بچ کر جیتی رہوں، اِس سے مرنا ہی بھلا تھا۔ اگرچہ کلنک کا ٹیکا میرے ماتھے پر لگا، پر ایسا کام نہیں کیا جس میں ماں باپ کے نام کو عیب لگے۔
اب یہ بڑا دُکھ ہے کہ وے دونوں بے حیا میرے ہاتھ سے بچ جاویں اور آپس میں رنگ رلیاں مناویں، اور میں اُن کے ہاتھوں سے یہ کچھ دُکھ

دیکھوں؛ حیف ہے کہ مجھ سے کچھ نہ ہو سکے! یہ اُمّیدوار ہوں کہ خانساماں کو پروانگی ہو تو اسبابِ ضیافت کا بہ خوبیِ تمام اِس کم بخت کے مکان میں تیّار کرے؛ تو میں دعوت کے بہانے سے اُن دونوں بدبختوں کو بلوا کر، اُن کے عملوں کی سزا دوں اور اپنا عوض لوں۔ جس طرح اُس نے مجھ پر ہاتھ چھوڑا اور گھائل کیا، میں بھی دونوں کے پُرزے پُرزے کروں؛ تب میرا کلیجا ٹھنڈا ہو۔ نہیں تو اِس غصّے کی آگ میں پھُنک رہی ہوں، آخر جل بل کر بھوبَھل ہو جاؤں گی۔

یہ سُن کر اَمّا نے، آتما کے درد سے مہربان ہو کر، میری عیب پوشی کی اور سارا لوازمہ ضیافت کا اُسی خواجہ سرا کے ساتھ (جو میرا محرم ہے) کر دیا۔ سب اپنے اپنے کارخانے میں آ کر حاضر ہوئے۔ شام کے وقت تو اُس موبے کو لے کر آیا۔ مجھے اُس قحبہ باندی کا بھی آنا منظور تھا، چناں چہ پھر تجھ کو تقیّد کر کر اُسے بھی بلوایا۔ جب وہ بھی آئی اور مجلس جمی؛ شراب پی پی کر سب بدمست اور بے ہوش ہوئے اور اُن کے ساتھ تو بھی کیفی ہو کر مُردہ سا پڑا؛ میں نے قلماقنی کو حکم کیا کہ اُن دونوں کا سر تلوار سے کاٹ ڈال۔ اُس نے وونہیں ایک دم میں شمشیر نکال، دونوں کے سر کاٹ، بدن لال کر دیے۔ اور تجھ پر غصّے کا یہ باعث تھا کہ میں نے اِجازت ضیافت کی دی تھی، نہ دو دن کی دوستی پر اعتماد کر کے شریک مے خوری کا ہو۔ البتّہ یہ تیری حماقت اپنے تئیں پسند نہ آئی۔ اِس واسطے کہ جب تو پی پا کر بے ہوش ہوا، تب توقّع رِفاقت کی تجھ سے کیا رہی! پر تیری خدمت کے حق ایسے میری گردن پر ہیں کہ

جو تجھ سے ایسی حرکت ہوتی ہے، تو معاف کرتی ہوں۔

لیے، میں نے اپنی حقیقت اِبتدا سے اِنتہا تک کہہ سُنائی۔ اب بھی دل میں کچھ اور ہوس باقی ہے؟ جیسے میں نے تیری خاطر کر کے، تیرے کہنے کو سب طرح قبول کیا؛ تو بھی میرا فرمانا اِسی صورت سے عمل میں لا۔ صَلاحِ وقت یہ ہے کہ اب اِس شہر میں رہنا میرے اور تیرے حق میں بھلا نہیں؛ آگے تو مختار ہے۔

(۲) یا معبودَ اللہ! شہ زادی اِتنا فرما کر چُپ رہی۔ فقیر تو دل و جان سے اُس کے حکم کو سب چیز پر مُقدّم جانتا تھا اور اُس کی محبّت کے جال میں پھنسا تھا، بولا: جو مرضیِ مُبارک میں آوے، سو بہتر ہے؛ یہ فدوی بے عُذر بجا لاوے گا۔ جب شہ زادی نے میرے تئیں فرماں بردار و خدمت گار اپنا پورا سمجھا، فرمایا: دو گھوڑے چالاک اور جانباز (کہ چلنے میں ہوا سے باتیں کریں) بادشاہ کے خاص اَصطبل* سے منگوا کر تیار رکھ۔ میں نے ویسے ہی پَری زاد، چار گُردے کے گھوڑے چُن کر، زین بندھوا کر منگوائے۔ جب تھوڑی سی رات باقی رہی، بادشاہ زادی مردانہ لباس پہن اور پانچوں ہتھیار باندھ کر ایک گھوڑے پر سوار ہوئی اور دوسرے مَرکب پر میں مسلّح ہو کر چڑھ بیٹھا اور ایک طرف کی راہ لی۔

جب شب تمام ہوئی اور پَرچھا ہونے لگا، تب ایک پوکھر کے کنارے پہنچے۔ اُتر کر منہ ہاتھ دھوئے۔ جلدی جلدی کچھ ناشتا کر کے، پھر سوار ہو کر چلے۔ کبھو ملکہ کچھ کچھ باتیں کرتی اور یوں کہتی کہ ہم نے تیری خاطر شرم حیا،

مُلکؒ مال ، ماباپ سب چھوڑا ؛ ایسا نہ ہو کہ تو بھی اُس ظالِم(۲) بے وَفا کی طَرح سُلوک کرے۔ کدھو مَیں کچھ احوال اِدھر اُدھر کا راہ کٹنے کے لیے کہتا اور اُس کا بھی جواب دیتا کہ بادشاہ زادی! سب آدمی ایک سے نہیں ہوتے۔ اُس پاجی کے نُطفے میں کچھ خَلَل ہوگا، جو اُس سے ایسی حرکت واقع ہوئی۔ اور مَیں نے تو جان و مال تم پر تَصَدُّق کیا اور تم نے مجھے ہر طَرح سرفرازی بخشی؛ اب مَیں بندہ بے زَر داموں کا ہوں۔ میرے چمڑے کی اگر جوتیاں بنوا کر پہنو تو مَیں آہ نہ کروں۔ ایسی ایسی باتیں باہَم ہوتی تھیں اور رات دن چلنے سے کام تھا۔ کبھو جو ماندگی(۳) کے سبب کہیں اُترتے، تو جنگل کے چرند(۴) و پرند شکار کرتے۔ حلال کرکے، نمک دان سے نُون نکال، چَقماقؒ سے آگ جھاڑ، بھون بھان کر کھا لیتے۔ اور گھوڑوں کو چھوڑ دیتے، وِےؒ اپنے مُنہ سے گھاس پات چر چُگ کر اپنا پیٹ بھر لیتے۔

ایک رُوز ایسے کَفِ دَست میدان میں جا نکلے کہ جہاں بستی کا نام نہ تھا اور آدمی کی صورت نظر نہ آتی تھی ؛ اِس پر بھی، بادشاہ زادی کی رِفاقت کے سبب سے دن عید اور رات شبِ بَرات معلوم ہوتی تھی۔ جاتے جاتے، اَن چیت ایک دریا (کہ جس کے دیکھنے سے کلیجا(۷) پانی ہو) راہ میں ملا۔ کنارےؒ پر کھڑے ہو کر جو دیکھا تو جہاں تلک نگاہ نے کام کیا، پانی ہی تھا، کچھ تھل بیڑا نہ پایا۔ یا(۹) اِلٰہی! اب اِس سمندر سے کیوں کر پار اُتریں! ایک دَم اِسی سوچ میں کھڑے رہے۔ آخر یہ دل میں لہر آئی کہ مَلِکہ کو یہیں بٹھا کرؒ، مَیں تلاش میں ناو، نواڑےؒ(۱۱) کی جاؤں۔ جب تلک اَسباب گُزارے(۱۲) کا ہاتھ آوے، تب تلک وہ

نازنین بھی آرام پاوے۔ تب میں نے کہا: اے ملکہ! اگر حکم ہو تو گھاٹ باٹ
اِس دریا کا دیکھوں۔ فرمانے لگی: مَیں بہت تھک گئی ہوں اور بھوکھی پیاسی (1)
ہو رہی ہوں؛ مَیں ذرا دم لے لوں، جب تَیں تو پار چلنے کی کچھ تدبیر کر۔

اُس جگہ ایک درخت پیپل کا تھا بڑا چھتر باندھے ہوئے، کہ اگر ہزار سوار آوے، تو دھوپ اور مینھ میں اُس کے تلے آرام پاوے۔ وہاں اُس کو بٹھا کر مَیں چلا اور چاروں طرف دیکھتا تھا کہ کہیں بھی زمین پر یا دریا میں نشان انسان کا پاؤں۔ بہتیرا سر مارا، پر کہیں نہ پایا۔ آخر مایوس ہو کر وہاں سے پھر آیا، تو اُس پری کو پیڑ کے نیچے نہ پایا۔ اُس وقت کی حالت کیا کہوں کہ سُرت جاتی رہی، دیوانہ باولا ہو گیا۔ کبھو درخت پر چڑھ جاتا اور ڈال ڈال، پات پات پھرتا۔ کبھو ہاتھ پانو چھوڑ کر زمین میں گرتا اور اُس درخت کی جڑ کے آس پاس تصدق ہوتا۔ کدھو چنگھاڑ مار کر اپنی بے بسی پر روتا۔ کبھو پچھم (4) سے پورب کو دوڑا جاتا، کدھو اُتر سے دکھن (5) کو پھر آتا۔ غرض بہتیری خاک چھانی، لیکن اُس گوہرِ نایاب کی نشانی نہ پائی۔ جب میرا کچھ بس نہ چلا، تب روتا اور خاک سر پر اُڑاتا ہوا تلاش ہر کہیں کرنے لگا۔

دل میں یہی خیال آیا کہ شاید کوئی جن اُس پری کو اٹھا کر لے گیا اور مجھے یہ داغ دے گیا۔ یا اُس کے ملک سے کوئی اُس کے پیچھے لگا چلا آتا تھا؛ اِس وقت اکیلا پا کر، منا منو کر پھر شام کی طرف لے اُبھرا۔ ایسے خیالوں میں گھبرا کر کپڑے ویڑے پھینک پھانک دیے، ننگا مُنگا فقیر بن کر، شام کے ملک میں صبح سے شام تک ڈھونڈھتا پھرتا اور رات کو کہیں پڑ رہتا۔ سارا جہان

رو رو مارا، پر اپنی بادشاہ زادی کا نام و[1] نشان کسی سے نہ سُنا، نہ سبب غائب ہونے
کا معلوم ہوا۔ تب دل میں یہ آیا کہ جب اُس جان کا تو نے کچھ* پتا نہ پایا، تو
اَب جینا بھی حیف ہے۔ کسی جنگل میں ایک پہاڑ نظر آیا، تب اُس پر چڑھ گیا
اور یہ ارادہ کیا کہ اپنے تئیں گرا دوں، کہ ایک دَم میں سر، مُنہ پتھروں
سے ٹکراتے ٹکراتے پھوٹ جاوے گا، تو ایسی مصیبت سے جی چھوٹ جاوے
گا۔ یہ دل میں کہہ کر، چاہتا ہوں کہ اپنے تئیں گراؤں، بلکہ پاؤں بھی اُٹھ چکے
تھے، کہ کسو نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ اِتنے میں ہوش آگیا۔ دیکھتا ہوں تو ایک
سوار[5] سبز پوش، مُنہ پر نقاب* ڈالے، مجھے فرماتا ہے کہ کیوں تو اپنے مرنے کا
قصد کرتا ہے! خُدا کے فضل سے نااُمید ہونا کُفر ہے۔ جب تلک سانس ہے،
تب تلک آس ہے۔ اَب تھوڑے دنوں میں رُوم کے مُلک میں تین درویش
تجھ سارکے، ایسی ہی مصیبت میں پھنسے ہوئے اور ایسے ہی تماشے دیکھے ہوئے،
تجھ سے مُلاقات کریں گے۔ اور وہاں کے بادشاہ کا آزاد بخت نام ہے، اُس
کو بھی ایک بڑی مُشکل درپیش ہے۔ جب وہ بھی تم چاروں فقیروں کے
ساتھ ملے گا، تو ہر ایک کے دل کا مطلب اور مُراد جو ہے، بہ خوبی حاصل
ہوگی۔

میں نے رکاب پکڑ کر بوسہ دیا اور کہا: اے خُدا کے وَلی! تمھارے اِتنے
ہی فرمانے سے میرے دلِ پُر اضطرار کو تسلّی ہوئی؛ لیکن خُدا کے واسطے یہ
فرمائیے کہ آپ کون ہیں اور اِسم شریف کیا ہے؟ تب اُنھوں نے فرمایا کہ
مُرتضیٰ علی میرا نام ہے اور میرا یہی کام ہے کہ جس کو جو مُشکل کٹھن[9] پیش آوے، تو

میں اُس کو آسان کر دوں۔ اِتنا فرما کر نظروں سے پوشیدہ ہو گئے۔ بارے
اِس فقیر نے اپنے مولا مشکل کشا کی بشارت سے خاطر جمع کر، قصد قسطنطنیہ
کا کیا۔ راہ میں جو کچھ مصیبتیں قسمت میں لکھی تھیں، کھینچتا ہوا؛ اُس بادشاہ زادی
کی ملاقات کے بھروسے، خدا کے فضل سے یہاں تک آ پہنچا اور اپنی خوش نصیبی
سے تمھاری خدمت میں مشرف ہوا۔ ہمارے تمھارے آپس میں ملاقات تو
ہوئی، باہم صحبت اور بات چیت میسر آئی؛ اب چاہیے کہ بادشاہ آزاد بخت
سے بھی روشناس اور جان پہچان ہو۔ بعد اُس کے مقرر ہم پانچوں اپنے
مقصدِ دلی کو پہنچیں گے۔ تم بھی دعا مانگو اور آمین کہو۔ یا ہادی! اِس
حیران، سرگرداں کی سرگذشت یہ تھی، جو حضوری میں درویشوں کی کہہ سنائی۔
اب آگے دیکھیے کہ کب یہ محنت اور غم ہمارا، بادشاہ زادی کے ملنے سے، خوشی و
خرمی سے بدل ہو!

آزاد بخت ایک کونے میں چھپا ہوا، چپکا، دھیان لگائے، پہلے
درویش کا ماجرا سن کر خوش ہوا؛ پھر دوسرے درویش کی حقیقت کو سننے
لگا۔

سیر دوسرے درویش کی

جب دوسرے درویش کے کہنے کی نوبت پہنچی، وہ چار زانو ہو بیٹھا اور بولا: (۲)

اَے یارو! اِس فقیر کا ٹک ماجرا سُنو — میں اِبتدا سے کہتا ہوں تا اِنتہا، سُنو!
جس کا علاج کر نہیں سکتا کوئی حکیم — ہے گا ہمارا درد بہت لا دوا، سُنو!

اَے دلق پوشو! یہ عاجز، بادشاہ زادہ فارس (۳) کے مُلک کا ہے۔ ہر فن کے آدمی وہاں پیدا ہوتے ہیں، چناں چہ "اِصفہان (۴) نصفِ جہان" مشہور ہے۔ ہفت اِقلیم میں اُس اِقلیم کے برابر کوئی ولایت نہیں، کہ وہاں کا ستارہ آفتاب ہے اور وہ، ساتوں کواکب میں، نیّرِ اعظم (۵) ہے۔ آب و ہوا وہاں کی خوش، اور لوگ روشن طبع (۶) اور صاحبِ سلیقہ (۷) ہوتے ہیں۔ میرے قبلہ گاہ نے (جو بادشاہ اُس مُلک کے تھے) لڑکپن سے، قاعدے اور قانون سلطنت کے تربیت (۸) کرنے کے واسطے، بڑے بڑے دانا اُستاد ہر ایک علم اور کسب (۹) کے چن کر میری اتالیقی کے لیے مقرر کیے تھے؛ تو تعلیم کامل ہر نوع کی پا کر قابل ہوں۔ خدا کے فضل سے چودہ برس کے سن (۱۰) و سال میں سب علم سے ماہر ہوا۔ گفتگو معقول، نشست (۱۱) و برخاست پسندیدہ، اور جو کچھ بادشاہوں کو لائق اور درکار ہے، سب حاصل کیا۔ اور یہی شوق شب و روز تھا کہ قابلوں کی صحبت میں، قصّے ہر ایک مُلک کے اور احوال اُلوالعزم (۱۲) بادشاہوں اور نام آوروں کا سُنا کروں۔

ایک روز ایک مُصاحبِ دانا نے، کہ خوب تواریخ داں اور جہاں دیدہ تھا، مذکور کیا کہ اگرچہ آدمی کی زندگی کا کچھ بھروسا نہیں، لیکن اکثر وصف ایسے ہیں کہ اُن کے سبب سے اِنسان کا نام قیامت تک زبانوں پر بہ خوبی چلا جائے گا۔ میں نے کہا: اگر تھوڑا سا احوال اُس کا (۱) مُفصّل بیان کرو، تو میں بھی سُنوں اور اُس پر عمل کروں۔ تب وہ شخص حاتِم طائی کا ماجرا اِس طرح سے کہنے لگا کہ حاتِم کے وقت میں ایک بادشاہ عَرب کا نَوفَل (۲) نام تھا؛ اُس کو حاتِم کے ساتھ، بہ سبب نام آوری کے، دشمنی کمال (۳) ہوئی۔ بہت سا لشکر، فوج جمع کرکر لڑائی کی خاطر چڑھ آیا۔ حاتِم تو خُدا ترس اور نیک مرد تھا، یہ سمجھا کہ اگر میں بھی جنگ کی تیاری کروں، تو خُدا کے بندے مارے جائیں گے اور بڑی خوں ریزی ہوگی؛ اُس کا عذاب میرے نام لکھا جائے گا۔ یہ بات سوچ کر، تنِ تنہا اپنی جان لے کر، ایک پہاڑ کی کھوہ میں جا چھپا۔ جب حاتِم کے غائب ہونے کی خبر نَوفَل کو معلوم ہوئی، سب اسباب، گھر بار حاتِم کا قُرق کیا اور مُنادی کروا دی کہ جو کوئی ڈھونڈھ ڈھانڈھ کر پکڑ لاوے، پانسَے اشرفی بادشاہ کی سرکار سے اِنعام پاوے۔ یہ سُن کر سب کو لالچ آیا اور جستجو حاتِم کی کرنے لگے۔

ایک روز ایک بُڈھا اور اُس کی بُڑھیا، دو تین بچے چھوٹے چھوٹے ساتھ لیے ہوئے، لکڑیاں توڑنے کے واسطے اُس غار کے پاس، جہاں حاتِم پوشیدہ تھا، پہنچے اور لکڑیاں اُس جنگل سے چُننے لگے۔ بُڑھیا بولی کہ اگر ہمارے دن کچھ بھلے آتے، تو حاتِم کو کہیں ہم دیکھ پاتے اور اُس کو پکڑ کر

نَوفَل کے پاس لے جاتے، تو وہ پانچ سَو اَشرفی دیتا، ہم آرام سے کھاتے، اِس دُکھ دَھندھے[1] سے چھوٹ جاتے۔ بوڑھے نے کہا: کیا بَڑبَڑ کرتی ہے! ہمارے طالع میں یہی لکھا ہے کہ رُوز لکڑیاں توڑیں اور سر پر دَھر کر بازار میں بیچیں، تب نُون، رُوٹی[2] مُیَسّر آوے؛ یا ایک روز جنگل سے باگھ* لے جاوے۔ لے اپنا کام کر۔ ہمارے ہاتھ حاتِم کاہے کو آوے گا اور بادشاہ [سے] اِتنے روپَے دِلاوے گا! عَورت نے ٹھنڈی سانس بھری اور چُپکی ہو رہی۔[3]

یِہ دونوں کی باتیں حاتِم نے سُنیں؛ مَردمی اور مُرَوَّت سے بَعید جانا کہ اپنے تئیں چھپائے اور جان کو بچائے اور اِن دونوں بےچاروں کو مطلب تک نہ پہنچائے۔ سچ ہے: اگر آدمی میں رَحم نہیں، تو وہ اِنسان نہیں اور جس کے جی میں درد نہیں، وہ قصائی* ہے۔[5]

دردِ دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو
ورنہ طاعت کے لیے کچھ کم نہ تھے کرّوبیاں[6]

غَرَض حاتِم کی جواں مَردی نے نہ قُبول کیا کہ اپنے کانوں سے سُن کر چُپکا ہو رہے، وُونہیں باہر نکل آیا اور اُس بوڑھے سے کہا کہ اَے عزیز! حاتِم مَیں ہی ہوں، میرے تئیں نَوفَل کے پاس لے چل۔ وہ مجھے دیکھے گا، جو کچھ روپَے دینے کا قَرار کیا ہے، تجھے دیوے گا۔ پیرمرد نے کہا: سچ ہے اِس صورت میں بَھلائی اور بَہبُودی میری البتّہ ہے؛ لیکن وہ کیا جانیے تجھ سے کیا سُلوک کرے! اگر مار ڈالے، تو مَیں کیا کروں! یِہ مجھ سے ہرگز نہ ہو سکے گا کہ تجھ سے انسان کو، اپنی طَمَع کی خاطِر، دُشمن کے حوالے کروں۔

وُہ مال کتنے دِن کھاؤں گا اور کب تک جیوں گا! آخر مر جاؤں گا، تب خُدا کو کیا جواب دوں گا؟

حاتم نے بہتیری منّت کی کہ مجھے لے چل، مَیں اپنی خوشی سے کہتا ہوں اور ہمیشہ اِسی آرزو میں رہتا ہوں کہ میرا جان و مال کسو کے کام آوے تو بہتر ہے؛ لیکن وُہ بوڑھا کسو طرح راضی نہ ہوا کہ حاتم کو لے جاوے اور اِنعام پاوے۔ آخر لاچار ہوکر حاتم نے کہا: اگر تُو مجھے یوں نہیں لے جاتا، تو مَیں آپ سے آپ بادشاہ پاس جاکر کہتا ہوں کہ اِس بوڑھے نے مجھے جنگل میں ایک پہاڑ کی کھوہ میں چھپا رکھا تھا۔ وُہ بوڑھا ہنسا اور بولا: بھلائی کے بدلے بُرائی ملے تو یا نصیب! اِس ردّ و بدل کے سوال جواب میں آدمی اور بھی آن پہنچے، بھیڑ لگ گئی۔ اُنھوں نے معلوم کیا کہ حاتم یہی ہے؛ تُرت پکڑ لیا اور حاتم کو لے چلے۔ وُہ بوڑھا بھی افسوس کرتا ہوا پیچھے پیچھے ساتھ ہو لیا۔ جب نوفل کے روبرو لے گئے، اُس نے پوچھا کہ اِس کو کون پکڑ لایا؟ ایک بدذات، سنگ دِل بولا کہ ایسا کام سِوائے ہمارے کون کرسکتا ہے؟ یہ فتح ہمارے نام ہے، ہم نے عرش پر جھنڈا گاڑا ہے۔ ایک اور لن ترانی والا ڈینگ مارنے لگا کہ مَیں کئی دن سے دَوڑ دھوپ کر، جنگل سے پکڑ لایا ہوں۔ میری محنت پر نظر کیجیے اور جو قرار ہے، سو دیجیے۔ اِسی طرح، اشرفیوں کے لالچ سے، ہر کوئی کہتا تھا کہ یہ کام مجھ سے ہوا۔ وُہ بوڑھا چپکا ایک

کونے میں لگا ہوا، سب کی شیخیاں سن رہا تھا اور حاتم کی خاطر کھڑا روتا تھا۔

جب اپنی اپنی دلاوری اور مردانگی سب کہہ چکے، تب حاتم نے بادشاہ سے کہا: اگر سچ بات پوچھو تو یہ ہے کہ وہ بوڑھا، جو الگ سب سے کھڑا ہے، مجھ کو لایا ہے۔ اگر قیافہ پہچان جانتے ہو، تو دریافت کرو اور میرے پکڑنے کی خاطر جو قبول کیا ہے(۱)، پورا کرو؛ کہ سارے ڈیل میں(۲) زبان حلال ہے۔ مرد کو چاہیے: جو کہے، سو کرے؛ نہیں تو جیبھ حیوان کو بھی خدا نے دی ہے، پھر حیوان اور انسان میں کیا تفاوت ہے! نوفل نے اس لکڑہارے بوڑھے کو پاس بلا کر پوچھا کہ سچ کہہ اصل کیا ہے؟ حاتم کو کون پکڑ لایا؟ اس بچارے نے، سر سے پانو تک جو گزرا تھا، راستی کہہ سنایا اور کہا: حاتم میری خاطر آپ سے چلا آیا ہے۔ نوفل یہ ہمت حاتم کی سن کر متعجب ہوا کہ بل بے تیری سخاوت! اپنی جان کا بھی خطرہ نہ کیا! جتنے جھوٹھ دعوے حاتم کے پکڑ لانے کے کرتے تھے، حکم کیا کہ ان کی ٹنڈیاں کس کر؛ پان سو اشرفی کے بدلے، پان پان سے جوتیاں ان کے سر پر لگاؤ، کہ ان کی بھی جان نکل پڑے۔ وونہیں تڑ تڑ پیزاریں پڑنے لگیں، کہ ایک دم میں سر ان کے گنجے ہو گئے۔ سچ ہے: جھوٹھ بولنا ایسا ہی گناہ ہے کہ کوئی گناہ اس کو نہیں پہنچتا۔ خدا سب کو اس بلا سے محفوظ رکھے(۹) اور جھوٹھ بولنے کا چسکا نہ دے۔ بہت آدمی جھوٹھ موٹھ بکے(۱۱) جاتے ہیں لیکن آزمایش کے وقت سزا پاتے ہیں۔

غرض اُن سب کو موافق اُن کے اِنعام دے کر، نوفل نے اپنے دل میں خیال کیا کہ حاتم سا شخص ہے (کہ ایک عالم کو اُس سے فیض پہنچتا ہے، اور محتاجوں کی خاطر جان اپنی دریغ نہیں کرتا، اور خدا کی راہ میں سرتاپا حاضر ہے) دشمنی رکھنی اور اُس کا مدّعی ہونا مروّت اور جواں مردی سے بعید ہے۔ وونہیں حاتم کا ہاتھ بڑی دوستی اور گرم جوشی سے پکڑ لیا اور کہا: کیوں نہ ہو! جب ایسے ہو، تب ایسے ہو۔ تواضع، تعظیم کر کے پاس بٹھلایا اور حاتم کا مُلک و اَملاک اور مال و اسباب جو کچھ ضبط کیا تھا، وونہیں چھوڑ دیا۔ (٣) نئے سر سے سرداری قبیلۂ طے کی اُسے دی۔ اور اُس بڈھے کو پانچ سو اشرفیاں اپنے خزانے سے دِلوا دیں۔ وہ دعا دیتا ہوا چلا گیا۔

جب یہ ماجرا حاتم کا میں نے تمام سنا، جی میں غیرت آئی اور یہ خیال گزرا کہ حاتم اپنی قوم کا فقط رئیس تھا، جن نے ایک سخاوت کے باعث یہ نام پیدا کیا کہ آج تک مشہور ہے؛ میں خدا کے حکم سے بادشاہ تمام ایران کا ہوں، اگر اِس نعمت سے محروم رہوں، تو بڑا افسوس ہے۔ فی الواقع دنیا میں کوئی کام بڑا داد و دہش سے نہیں؛ اِس واسطے کہ آدمی جو کچھ دنیا میں دیتا ہے، اُس کا عوض عاقبت میں لیتا ہے۔ اگر کوئی ایک دانہ بوتا ہے، تو اُس سے کتنا کچھ پیدا ہوتا ہے! یہ بات دل میں ٹھہرا کر، میرِ عمارت (٥) کو بلوا کر حکم کیا کہ ایک مکانِ (٦) عالی شان، جس کے چالیس دروازے بلند اور بہت کشادہ ہوں، باہر شہر کے

جلد بنواؤ۔ تھوڑے عرصے میں ویسی ہی عمارتِ وسیع، جیسا دل چاہتا تھا،
بن کر تیار ہوئی۔ اور اُس مکان میں ہر روز، ہر وقت فجر سے شام تک،
محتاجوں اور بے کسوں کے تئیں روپے، اشرفیاں دیتا۔ اور جو کوئی جس
چیز کا سوال کرتا، میں اُسے مالا مال کرتا۔

غرض چالیسوں دروازے سے حاجت مند آتے اور جو چاہتے،
سو لے جاتے۔ ایک روز کا یہ ذکر ہے کہ ایک فقیر سامھنے کے دروازے
سے آیا اور سوال کیا۔ میں نے اُسے ایک اشرفی دی۔ پھر وُہی دوسرے
دروازے سے ہو کر آیا، دو اشرفیاں مانگیں؛ میں نے پہچان کر درگزر
کی اور دیں۔ اِسی طرح اُن نے ہر ایک دروازے سے آنا اور ایک
ایک اشرفی بڑھانا شروع کیا، اور میں بھی جان بوجھ کر اَن جان ہوا اور
اُس کے سوال کے موافق دیا کیا۔ آخر چالیسویں دروازے کی راہ سے آکر
چالیس اشرفیاں مانگیں۔ وُہ بھی میں نے دِلوا دیں۔ اِتنا کچھ لے کر، وُہ
درویش پھر پہلے دروازے سے گھس آیا اور سوال کیا۔ مجھے بہت بُرا معلوم
ہوا، میں نے کہا: سُن اَے لالچی! تو کیسا فقیر ہے کہ ہرگز فقر کے تینوں
حرفوں سے بھی واقف نہیں! فقیر کا عمل اُن پر چاہیے۔ فقیر بولا: بھلا داتا!
تمھیں بتاؤ۔ میں نے کہا: ف سے فاقہ، ق سے قناعت، ر سے ریاضت
نکلتی ہے؛ جس میں یہ باتیں نہ ہوں، وُہ فقیر نہیں۔ اِتنا جو تجھے ملا ہے،
اِس کو کھا پی کر پھر آئیو اور جو مانگے گا، لے جائیو۔ یہ خیرات اِحتیاج
رفع کرنے کے واسطے ہے، نہ جمع کرنے کے لیے۔ اَے حریص! چالیس

دروازوں سے تو نے ایک اشرفی سے چالیس اشرفیوں تک لیں؛ اس کا حساب تو کر، کہ ریوڑی کے پھیر کی طرح کتنی اشرفیاں ہوئیں! اور اس پر بھی تجھے حرص پھر پہلے دروازے سے لے آئی! اتنا مال جمع کر کر کیا کرے گا؟ فقیر کو چاہیے کہ ایک روز کی فکر کرے، دوسرے دن پھر نئی روزی رزّاق دینے والا موجود ہے۔ اب حیا و شرم پکڑ اور صبر و قناعت کو کام فرما۔ یہ کیسی فقیری ہے جو تجھے مرشد نے بتائی ہے!

یہ میری بات سن کر خفا اور بد دماغ ہوا اور جتنا مجھ سے لے کر جمع کیا تھا، سب زمین میں ڈال دیا اور بولا: بس بابا! اتنے گرم مت ہو، اپنی کائنات لے کر رکھ چھوڑو، پھر سخاوت کا نام نہ لیجو، سخی ہونا بہت مشکل ہے۔ تم سخاوت کا بوجھ نہیں اٹھا سکتے، اس منزل کو کب پہنچو گے! ابھی دلّی دور ہے! "سخی" کے بھی تین حرف ہیں؛ پہلے اُن پر عمل کرو تب سخی کہلاؤ۔ تب تو میں ڈرا اور کہا: بھلا داتا! اس کے معنے مجھے سمجھاؤ۔ کہنے لگا: س سے سمائی، اور خ سے خوفِ الٰہی، اور ی سے یاد رکھنا اپنی پیدائش اور مرنے کو۔ جب تلک اتنا نہ ہو لے، تو سخاوت کا نام نہ لے، اور سخی کا یہ درجہ ہے کہ اگر بدکار ہو، تو بھی دوست خدا کا ہے۔ اس فقیر نے بہت ملکوں کی سیر کی ہے؛ لیکن سوائے بصرے کی بادشاہ زادی کے، کوئی سخی دیکھنے میں نہ آیا۔ سخاوت کا جامہ خدا نے اس عورت پر قطع کیا ہے۔ اور سب نام چاہتے ہیں، پر ویسا کام نہیں کرتے۔ یہ سن کر میں نے بہت منت کی اور قسمیں دیں کہ میری تقصیر

معاف کرو اور جو چاہیے، سو تو میرا دیا ہرگز نہ لیا اور یہ بات کہتا
ہوا چلا: اب اگر اپنی ساری بادشاہت مجھے دے، تو اُس پر بھی نہ
تھوکوں اور نہ دھر ماروں۔ (۱) وہ تو چلا گیا، پر بصرے کی بادشاہ زادی
کی یہ تعریف سُننے سے دِل بے کل ہوا، کسی طرح کل نہ تھی۔ اب یہ
آرزو ہوئی کہ کسو صورت سے بصرے چل کر اُس کو دیکھا چاہیے۔

اِس عرصے میں بادشاہ نے وفات پائی اور تخت پر میں بیٹھا۔
سلطنت ملی، پر وہ خیال نہ گیا۔ وزیر اور امیروں سے (جو پائے تختِ
سلطنت کے اور ارکان، مملکت کے تھے) مشورت کی کہ سفر بصرے کا
کیا چاہتا ہوں، تم اپنے کام میں مستعد رہو؛ اگر زندگی ہے، تو سفر کی
عمر کوتاہ ہوتی ہے، جلد پھر آتا ہوں۔ کوئی میرے جانے پر راضی نہ ہوا۔
لاچار، دل تو اُداس ہو رہا تھا؛ ایک دن بغیر سب کے کہے سُنے، چپکے (۵)
وزیر باتدبیر کو بلا کر مختار اور وکیلِ مطلق اپنا کیا اور سلطنت کا مدار المہام
بنایا۔ پھر میں نے گیروا بستر پہن، فقیری بھیس کر، اکیلے راہ بصرے کی
لی۔ تھوڑے دِنوں میں اُس کی سرحد میں جا پہنچا؛ تب سے یہ تماشا
دیکھنے لگا کہ جہاں رات کو جا کر مقام کرتا، نوکر چاکر اُسی ملک کے،
استقبال کر کر، ایک مکانِ معقول میں اُتارتے اور جتنا لوازمہ ضیافت
کا ہوتا ہے، بخوبی موجود کرتے اور خدمت میں دست بستہ تمام رات
حاضر رہتے۔ دوسرے دن دوسری منزل میں یہی صورت پیش آتی۔ اِسی
آرام سے مہینوں کی راہ طے کی۔ آخر بصرے میں داخل ہوا؛ وونہیں ایک

جوانِ(1) شکیل، خوش لباس، نیک خو، صاحبِ مُروّت(2) (کہ دانائی اُس کے قیافے سے ظاہر تھی) میرے پاس آیا اور بہت شیریں زبانی سے کہنے لگا کہ میں فقیروں کا خادم ہوں، ہمیشہ اِسی تلاش میں رہتا ہوں کہ جو کوئی مُسافر، فقیر یا دُنیادار، اِس شہر میں آوے، میرے گھر میں قدم رنجہ فرماوے۔ سوائے ایک مکان کے، یہاں اور پردیسی(4) کے رہنے کی جگہ نہیں ہے۔ آپ تشریف لے چلیے اور اُس مقام کو زینت بخشیے اور مجھے سرفراز کیجیے۔

فقیر نے پوچھا: صاحب کا اِسمِ شریف(5) کیا ہے؟ بولا: اِس گم نام کا نام بہزاد بخت کہتے ہیں۔ اُس کی خوبی اور تملّق دیکھ کر یہ عاجز اُس کے ساتھ چلا اور اُس کے مکان میں گیا۔ دیکھا تو ایک عمارتِ عالی لوازمِ شاہانہ سے تیار ہے۔ ایک دالان میں اُس نے لے جاکر بٹھایا اور گرم پانی منگواکر ہاتھ پاؤں(7) دُھلوائے اور دسترخوان بچھواکر مجھ تنِ تنہا کے رُوبرو بکاوَل نے ایک تورے کا تورا چُن دیا۔ چار مُشقاب: ایک میں یخنی پلاؤ، دوسری میں قورما پلاؤ، اور تیسری میں متنجن پلاؤ، چوتھی میں کوکو پلاؤ، اور ایک قاب زردے کی۔ اور کئی طرح کے قلیے(9): دوپیازہ، نرگسی، بادامی، روغن جوش(10)۔ اور رُوٹیاں کئی قسم کی: باقرخانی(11)، تُنکی، شیرمال، گاؤدیدہ، گاؤزبان(12)، نانِ نعمت، پراٹھے۔ اور کباب: کوفتے کے، تکّے کے، مُرغ کے۔ خاگینہ، ملغوبہ، شب دیگ، دم پُخت، حلیم(13)، ہریسا، سموسے، ورقی، قبولی، فرنی، شیر برنج، ملائی، حلوا(14)، فالودہ،

پن بھتا، نمش، آش شورہ، ساقِ عروس، نوریات، مربا، اچار دان،
دہی کی قلفیاں۔ یہ نعمتیں دیکھ کر روح بھر گئی۔ جب ایک ایک نوالہ
ہر ایک سے لیا، پیٹ بھی بھر گیا؛ تب ہاتھ کھانے سے کھینچا۔ وہ شخص
متحیّر ہوا کہ صاحب نے کیا کھایا! کھانا تو سب امانت دھرا ہے، بے تکلف
اور نوشِ جاں فرمائیے۔ میں نے کہا: کھانے میں شرم کیا ہے! خدا تمھارا
خانہ آباد رکھے؛ جو کچھ میرے پیٹ میں سمایا، سو میں نے کھایا۔ اور ذائقے
کی اس کے کیا تعریف کروں کہ اب تک زبان چاٹتا ہوں اور جو ڈکار
آتی ہے، سو معطر۔ تو اب مزید کرو۔

جب دسترخوان اٹھا؛ زیر انداز کاشانی مخمل کا مقیشی بچھاکر، چلمچی،
آفتابہ طلائی لاکر، بیسن دان میں سے خوش بو بیسن دے کر، گرم پانی سے
میرے ہاتھ دھلائے۔ پھر پان دان جڑاؤ میں گلوریاں سونے کے بکھرولوں
میں بندھی ہوئیں، اور چوگھڑوں میں کھلوریاں اور چکنی سپاریاں
اور لونگ، الائچیاں روپے کے ورقوں میں مڑھی ہوئیں لاکر رکھیں۔
جب میں پانی پینے کو مانگتا، تب صراحی برف میں لگی ہوئی آبدار لے
آتا۔ جب شام ہوئی، فانوسوں میں کافوری شمعیں روشن ہوئیں۔ وہ عزیز
بیٹھا ہوا باتیں کرتا رہا۔ جب پہر رات گئی، بولا: اب اس چھپر کھٹ میں
(کہ جس کے آگے دالان پیش گیر کھڑا ہے) آرام کیجیے۔ فقیر نے کہا: اے
صاحب! ہم فقیروں کو ایک بوریا یا مرگ چھالا بستر کے لیے بہت
ہے؛ یہ خدا نے تم دنیاداروں کے واسطے بنایا ہے۔ کہنے لگا: یہ سب

اسباب، درویشوں کی خاطر ہے، کچھ میرا مال نہیں۔ اُس کے بجد ہوئے سے، ان بچھونوں پر (کہ پھولوں کی سیج سے بھی نرم تھے) جا کر لیٹا۔ دونوں پٹیوں کی طرف گل دان اور چنگیریں پھولوں کی چنی ہوئیں، اور عود سوز اور لخلخے روشن تھے۔ جدھر کی کروٹ لیتا، دماغ معطر ہو جاتا۔ اِس عالم میں سو رہا۔ جب صبح ہوئی، ناشتے کو بھی بادام، پستے، انگور، انجیر[4]، ناشپاتی، انار، کشمش، چھوہارے اور میوے کا شربت لا حاضر کیا۔

اِسی طور سے تین دن رات رہا۔ چوتھے روز میں نے رخصت مانگی۔ ہاتھ جوڑ کر کہنے لگا: شاید اِس گنہ گار سے صاحب کی خدمت گاری میں کچھ قصور ہوا کہ جس کے باعث مزاج تمھارا مکدّر ہوا! میں نے حیران ہو کر کہا: برائے[5] خدا یہ کیا مذکور ہے! لیکن مہمانی کی شرط تین دن تلک ہے، سو میں رہا؛ زیادہ رہنا خوب نہیں۔ اور علاوہ، یہ فقیر واسطے سیر کے نکلا ہے؛ اگر ایک ہی جگہ رہ جاوے، تو مناسب نہیں، اِس لیے اجازت چاہتا ہے، نہیں تو تمھاری خوبیاں ایسی نہیں کہ جدا ہونے کو جی چاہے۔ تب وہ بولا: جیسی مرضی! لیکن ایک ساعت توقف کیجے کہ بادشاہ زادی کے حضور جا کر عرض کروں۔ اور تم جو جایا چاہتے ہو، تو جو کچھ اسباب، اوڑھنے بچھانے کا اور کھانے کے باسن روپے سونے کے اور جڑاؤ کے اِس مہمان خانے میں ہیں، یہ سب تمھارا مال ہے؛ اِس کے ساتھ لے جانے کی خاطر جو فرماؤ، تدبیر کی جائے۔ میں نے کہا: لاحول پڑھو! ہم فقیر نہ ہوئے، بھاٹ ہوئے! اگر یہی حرص دل میں ہوتی، تو فقیر کاہے کو ہوتے،

دُنیا داری کیا بُری تھی! اُس عزیز نے کہا: اگر یہ احوال بلکہ سُنے، تو خدا جانے
مجھے اِس خدمت سے تغیر* کرکر کیا سلوک کرے! اگر تمھیں ایسی ہی بے پروائی
ہے؛ تو اِن سب کو ایک کوٹھڑی میں امانت بند کرکر، دروازے کو سربمہر
کردو؛ پھر جو چاہو، سو کیجو۔

میں نہ قبول کرتا تھا اور وہ بھی نہ مانتا تھا۔ لاچار یہی صلاح ٹھہری
کہ سب اسباب کو بند کرکر قفل کردیا اور منتظر رخصت کا ہوا۔ اتنے میں ایک
خواجہ سرا معتبر، سر پر سرپیچ اور گوشپیچ اور کمر میں بندی باندھے،
ایک عصا سونے کا جڑاؤ ہاتھ میں، اور ساتھ اُس کے کئی خدمتگار(۳) معقول،
عُہدے لیے ہوئے؛ اِس شان و شوکت سے میرے نزدیک آیا۔ ایسی
ایسی مہربانگی اور ملائمت سے گفتگو کرنے لگا کہ جس کا بیان نہیں کرسکتا۔
پھر بولا کہ اے میاں(۴)! اگر توجہ اور کرم کرکر اِس مشتاق کے غریب خانے
کو اپنے قدم کی برکت* سے رونق بخشو، تو بندہ نوازی اور غریب پروری
سے بعید نہیں۔ شاید شہزادی سنے کہ کوئی مسافر یہاں آیا تھا؛ اُس کی
تواضع، مدارات کسو نے نہ کی، وہ یونہیں چلا گیا؛ اِس واسطے، وَاللہُ اَعْلَم
مجھ پر کیا آفت لاوے اور کیسی قیامت اُٹھاوے! بلکہ جان زندگی پر ہے۔
میں نے اِن باتوں کو نہ مانا۔ تب خواہ(۵) مخواہ منتیں کرکے، میرے تئیں
اور ایک حویلی میں (کہ پہلے مکان سے بہتر تھی) لے گیا۔ اُسی پہلے میزبان
کی مانند تین دن رات، دونوں وقت، ویسے ہی کھانے اور صبح اور تیسرے
پہر شربت اور تفنن کی خاطر میوے کھلائے؛ اور باتیں نقرئی و طلائی

اور فرش فروش اور اسباب، جو کچھ وہاں تھا، مجھ سے کہنے لگا کہ ان سب کے تم مالک مختار (٦) ہو، جو چاہو، سو کرو۔

مَیں یہ باتیں سُن کر حیران ہوا اور چاہا کہ کسی نہ کسی طرح یہاں سے رخصت ہو کر بھاگوں۔ میرے بشرے* کو دیکھ کر وہ مخلی بولا: اے خدا کے بندے! جو تیرا مطلب یا آرزو ہو، سو مجھ سے کہہ، تو حضور میں ملکہ کے جا کر عرض کروں۔ میں نے کہا: مَیں فقیری کے لباس میں دنیا کا مال کیا مانگوں، کہ تم بغیر مانگے دیتے ہو اور مَیں انکار کرتا ہوں۔ تب وہ کہنے لگا کہ حرص دنیا کی کسی کے جی سے نہیں گئی، چنانچہ کسو کبت نے یہ کبت کہا ہے:

نکھ بن کٹا دیکھے، بہس بھاری جٹا دیکھے، جوگی کن پھٹا دیکھے، چھار لائے تن میں (٥)
مونی ان بول دیکھے، سیوڑا سر چھول دیکھے، کرت کلول دیکھے، بن کھنڈی بن میں
بیر دیکھے، سور دیکھے، سب گنی اور کوڑھ دیکھے، مایا کے پور دیکھے، بھول رہے دھن میں
آدی انت سکھی دیکھے، جنم ہی کے دکھی دیکھے، پر وے نہ دیکھے، جن کے لوبھ نا ہیں من میں

میں نے یہ سُن کر جواب دیا کہ یہ سچ ہے، پر مَیں کچھ نہیں چاہتا۔ اگر فرماؤ تو ایک رقعہ سربمہر* اپنے مطلب کا لکھ کر دوں، جو حضور ملکہ کے پہنچا دو، تو بڑی مہربانی ہے، گویا تمام دنیا کا مال مجھ کو دیا۔ بولا: بسر و چشم، کیا مضائقہ۔ میں نے ایک رقعہ لکھا۔ پہلے شکر خدا کا، پھر احوال، کہ یہ بندہ خدا کا کئی روز سے اس شہر میں وارد ہے اور سرکار سے سب طرح کی خبر گیری ہوتی ہے۔ جیسی خوبیاں اور نیک نامیاں ملکہ

کی سُن کر اشتیاق دیکھنے کا ہوا تھا، اُس سے چار چشم پایا۔ اب حضور کے ارکانِ دولت یوں کہتے ہیں کہ جو مطلب اور تمنّا تیری ہو، سو ظاہر کر؛ اس واسطے بے حجابانہ، جو دل کی آرزو ہے، سو عرض کرتا ہوں کہ مَیں دُنیا کے مال کا محتاج نہیں، اپنے مُلک کا مَیں بھی بادشاہ ہوں؛ فقط یہاں تلک آنا اور محنت اُٹھانا آپ کے اشتیاق کے سبب سے ہوا، جو تنِ تنہا اِس صورت سے آپ پہنچا ہوں۔ اب اُمّید ہے کہ حضور کی توجّہ سے یہ خاک نشین مطلب دلی کو پہنچے، تو لائق ہے؛ آگے جو مرضیِ مُبارک۔ لیکن اگر یہ اِلتماس خاکسار کا قبول نہ ہوگا، تو اِسی طرح خاک چھانتا پھرے گا اور اِس جانِ بے قرار کو آپ کے عشق میں نثار کرے گا؛ مجنوں اور فرہاد کی مانند جنگل میں یا پہاڑ پر مر رہے گا۔ یہی مُدّعا لکھ کر اُس خوجے کو دیا۔ اُس نے بادشاہ زادی تلک پہنچایا۔ بعد ایک دم کے پھر آیا اور میرے تئیں بُلایا اور اپنے ساتھ محل کی ڈیوڑھی پر لے گیا۔ وہاں جاکر دیکھا تو ایک بوڑھی سی عورت صاحبِ لیاقت، سنہری کرسی پر، گہنا پاتا پہنے ہوئے بیٹھی ہے اور کئی خوجے، خدمت گار تکلّف کے لباس پہنے ہوئے، ہاتھ باندھے سامھنے کھڑے ہیں۔ مَیں، اُسے مختار کار جان کر اور دیرینہ سمجھ کر، دست بسر ہوا۔ اُس ماما نے بہت مہربانی سے سلام کیا اور حکم کیا کہ آؤ بیٹھو، خوب ہوا تم آئے؛ تمھیں نے ملکہ کے اشتیاق کا رقعہ لکھا تھا؟ مَیں شرم کھاکر چُپ ہو رہا اور سر نیچا کرکے بیٹھا۔

ایک ساعت کے بعد بولی کہ اے جوان! بادشاہ زادی نے سلام کہا

ہے۔ اور فرمایا ہے کہ مجھ کو خاوند کرنے سے عیب نہیں۔ تم نے میری درخواست کی، لیکن اپنی بادشاہت کا بیان کرنا اور اس فقیری میں اپنے تئیں بادشاہ سمجھنا اور اُس کا غرور کرنا نہایت بے جا ہے؛ اس واسطے کہ سب آدمی آپس میں فی الحقیقت ایک ہیں، لیکن فضیلت دینِ(۱) اسلام کی البتہ ہے۔ اور مَیں بھی ایک مدّت سے شادی کرنے کی آرزومند ہوں۔ اور جیسے تم دولتِ دُنیا سے بے پروا ہو، میرے تئیں بھی حق(۲) تعالیٰ نے اِتنا مال دیا ہے کہ جس کا کچھ حساب نہیں۔ پَر ایک شرط ہے کہ پہلے مَہر ادا کرلو، اور مَہر شہزادی کا: ایک بات ہے، جو تم(۳) سے ہوسکے۔ میں نے کہا: مَیں سب طرح حاضر ہوں، جان و مال سے دریغ نہیں کرنے کا؛ وہ بات کیا ہے؟ کہو تو مَیں سُنوں۔ تب اُس نے کہا: آج کے دن رہ جاؤ، کل تمھیں کہہ دوں گی۔ میں نے خوشی سے قبول کیا اور رخصت ہوکر باہر آیا۔

دن تو گزرا، جب شام ہوئی، مجھے ایک خواجہ سرا محل میں بلا کر لے گیا۔ جاکر دیکھا تو اکابرِ عالم اور فاضل صاحبِ شرع حاضر ہیں۔ مَیں بھی اُسی جلسے میں جاکر بیٹھا، کہ اتنے میں دسترخوان بچھایا گیا اور کھانے اقسام اقسام کے شیریں اور نمکین(۴) چُنے گئے۔ وے(۵) سب کھانے لگے اور مجھے بھی تواضع کرکر شریک کیا۔ جب کھانے سے فراغت ہوئی، ایک دائی(۷) اندر سے آئی اور بولی کہ بہرِور کہاں ہے؟ اُسے بلاؤ۔ پیادوں نے وہیں حاضر کیا۔ اُس کی صورت بہت مرد آدمی کی سی، اور بہت سی کنجیاں روپے(۸)، سونے کی کمر میں لٹکتیں ہوئیں۔ سلام علیک کرکر میرے

پاس آکر بیٹھا۔ وہیں دائی کہنے لگی کہ اے بہرور! تو نے جو کچھ دیکھا ہے مفصل اُس کا بیان کر۔ بہرور نے یہ داستان کہنی شروع کی اور مجھ سے مخاطب ہو کر بولا: اے عزیز! ہماری بادشاہ زادی کی سرکار میں ہزاروں غلام ہیں کہ سوداگری کے کام میں متعین ہیں، اُن میں سے ایک میں بھی ادنیٰ خانہ زاد ہوں۔ ہر ایک مُلک کی طرف لاکھوں روپے کا اسباب اور جنس دے کر رخصت فرماتی ہیں۔ جب وہ وہاں سے پھر آتا ہے، تب اُس سے اُس دیس کا احوال اپنے حضور میں پوچھتی ہیں اور سنتی ہیں۔

ایک بار یہ اتفاق ہوا کہ یہ کم ترین[5] تجارت[6] کی خاطر چلا اور شہر نیم روز میں پہنچا۔ وہاں کے باشندوں کو دیکھا تو سب کا لباس سیاہ ہے اور ہر دم نالہ و آہ ہے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُن پر کچھ بڑی مصیبت پڑی ہے۔ اِس کا سبب جس سے میں پوچھتا، کوئی جواب میرا نہ دیتا۔ اِسی حیرت میں کئی روز گزرے۔ ایک دن جونہیں صبح ہوئی، تمام آدمی چھوٹے بڑے، لڑکے بوڑھے، غریب غنی شہر کے باہر چلے، ایک میدان میں جا کر جمع ہوئے، اور اُس ملک کا بادشاہ بھی، سب امیروں کو ساتھ لے کر، سوار ہوا اور وہاں گیا؛ تب سب برابر قطار باندھ کر کھڑے ہوئے۔

میں بھی اُن کے درمیان کھڑا تماشا دیکھتا تھا؛ پر یہ معلوم ہوتا تھا کہ وے سب کسو کا انتظار کھینچ رہے ہیں۔ ایک گھڑی کے عرصے میں دور سے ایک جوان پری زاد[7]، صاحب جمال، پندرہ سولہ برس کا سن و سال[8]، غل اور شور کرتا ہوا اور کف منہ سے جاری، زرد بیل کی سواری، ایک ہاتھ میں کچھ

لیے، مقابل خلق اللہ کے آیا اور اپنے بیل پر سے اُترا۔ ایک ہاتھ میں ناتھ اور ایک ہاتھ میں ننگی تلوار لے کر دو زانو بیٹھا۔ ایک گل اندام، پری چہرہ اُس کے ہمراہ تھا؛ اُس کو اُس جوان نے، وہ چیز جو ہاتھ میں تھی، دی۔ وہ یتیم، لے کر، ایک سرے سے ہر ایک کو دکھاتا جاتا تھا۔ لیکن یہ حالت تھی کہ جو کوئی دیکھتا تھا، بے اختیار ڈاڑھ مار کر روتا تھا۔ اسی طرح سب کو دکھاتا اور رُلاتا ہوا، سب کے سامھنے سے ہو کر اپنے خاوند کے پاس پھر گیا۔ اُس کے جاتے ہی وہ جوان اُٹھا اور اُس غلام کا سر شمشیر سے کاٹ کر اور سوار ہو کر، جدھر سے آیا تھا، اودھر کو چلا۔ سب کھڑے دیکھا کیے۔ جب نظروں سے غائب ہوا، لوگ شہر کی طرف پھرے۔

میں ہر ایک سے اس ماجرے کی حقیقت پوچھتا تھا، بلکہ روپیوں کا لالچ دیتا اور خوشامد، منت کرتا کہ مجھے ذرا بتا دو کہ یہ جوان کون ہے، اور اس نے یہ کیا حرکت کی، اور کہاں سے آیا اور کہاں گیا؛ ہرگز کسی نے نہ بتلایا اور نہ کچھ میرے خیال میں آیا۔ یہ تعجب دیکھ کر، جب میں یہاں آیا اور ملکہ کے روبرو اظہار کیا، تب سے بادشاہ زادی بھی حیران ہو رہی ہے اور اُس کے تحقیق کرنے کی خاطر دو دلی ہو رہی ہے؛ لہٰذا مہر اپنا یہی مقرر کیا ہے کہ جو اُس عجوبے کی کماحقہٗ خبر لاوے، اُس کو پسند فرماوے اور وہی مالک سارے مال، ملک کا اور ملکہ کا ہووے۔

یہ ماجرا تم نے سب سنا، اپنے دل میں غور کرو؛ اگر تم اُس جوان کی خبر لا سکو، تو قصد ملک نیم روز کا کرو اور جلد روانہ ہو۔ نہیں تو، انکار کر کے اپنے گھر کی راہ لو۔

میں نے جواب دیا کہ اگر خُدا چاہے تو جلد اُس کا اَحوال سر سے پانو[1] تک دریافت
کرکر، بادشاہ زادی کے پاس آ پہنچتا[2] ہوں اور کام یاب ہوتا ہوں۔ اور جو میری
قسمت بد ہے، تو اِس کا کچھ عِلاج نہیں؛ لیکن مَلِکہ اِس کا قَول[3] قَرار کریں کہ اپنے
کہنے سے نہ پھریں۔ اور بالفعل ایک اندیشہ[4] مشکل میرے دل میں خلش کر رہا ہے؛
اگر مَلِکہ، غریب نوازی اور مسافر پروری سے، حضور میں بلاویں اور پردے کے
باہر بٹھلاویں[5] اور میرا اِلتماس اپنے کانوں[6] سُنیں اور اُس کا جواب اپنی زبان سے
فرماویں؛ تو میری خاطر جمع ہو اور مجھ سے سب کچھ ہو سکے۔

یہ میرے مطلب کی بات اُس ماما[7] نے رُو بہ رُو اُس پری پیکر کے عَرض
کی۔ بارے قَدردانی کی راہ سے حُکم کیا کہ اُنھیں[8] بُلا لو۔ دائی پھر باہر آئی اور
مجھے اپنے ساتھ، جس محل[9] میں بادشاہ زادی تھی، لے گئی۔ کیا دیکھتا ہوں کہ دو رویہ
صف[10] باندھے، دست بستہ سہیلیاں اور خواصیں[11] اور اُردا بیگنیاں، قلماقنیاں،
تُرکنیاں، حبشنیاں، اُذبکنیاں[12]، کشمیرنیاں، جواہر میں جڑی، عُہدے لیے
کھڑی ہیں۔ اِندر کا اکھاڑا کہوں یا پریوں کا اُتارا! بے اِختیار ایک آہ،
بے خودی سے، زبان تک آئی اور کلیجا تھلکنے لگا؛ پر بہ زور اپنے تئیں تھانبا۔
اُن کو دیکھتا بھالتا اور سیر کرتا ہوا آگے چلا؛ لیکن پانو[13] سو سو من کے ہو گئے۔ جس کو
دیکھوں، پھر یہ نہ جی چاہے کہ آگے جاؤں۔ ایک طرف چلمن پڑی تھی اور
مونڈھا جڑاؤ بچھوا رکھا تھا اور ایک چوکی بھی صندل کی بچھی تھی۔ دائی نے
مجھے بیٹھنے کی اِشارت کی۔ میں مونڈھے پر بیٹھ گیا اور وہ چوکی پر۔ کہنے لگی: لو، اب
جو کہنا ہے، سو جی بھر کر کہو۔ میں[14] نے مَلِکہ کی خوبیوں کی اور عدل و انصاف،

داد[1] دہش کی پہلے تعریف کی، پھر کہنے لگا: جب سے میں اِس مُلک کی سرحد[2] میں آیا، ہر ایک منزل میں یہی دیکھا کہ جا بہ جا مُسافر خانے اور عمارتیں عالی بنی ہوئی ہیں، اور آدمی ہر ایک عہدے کے تعینات[*] ہیں، کہ خبر گیری مسافروں اور مُحتاجوں کی کرتے ہیں۔ مجھے بھی تین[3] تین دن ہر ایک مقام میں گزرے۔ چوتھے روز جب رُخصت ہونے لگا، تب بھی کسو نے خوشی سے نہ کہا کہ جاؤ۔ اور جتنا اسباب اُس مکان میں تھا: شطرنجی، چاندنی، قالینیں، سیتل پاٹی، منگل کوٹ، دیوار گیری، چھت، پردے، چلونیں، سائبان[4]، نم گیرے، چھپر کھٹ، شمع[5] غلاف[*]، ادوچہ، توشک، بالاپوش، سیج بند، چادر، تکیے، تکینی، گل تکیے، مسند، گاؤ تکیے، دیگ، دیگچے، پتیلے[6]، طباق، رکابی، بادیے، تشتری، چمچے، بکاولی، کفگیر، طعام بخش، سرپوش، سینی، خوان پوش، تورہ پوش، آبخورے، بھڑے، صراحی، لگن، پان دان، چوگھرے، چنگیر، گلاب پاش، عود سوز، آفتابہ[7]، چلمچی؛ سب میرے حوالے کیے کہ یہ تمھارا مال ہے۔ جی چاہو اب لے جاؤ، نہیں تو ایک کوٹھری میں بند کر کر اپنی مُہر کرو۔ جب تمھاری خوشی ہوگی، پھرتے ہوئے لیے[9] جائیو۔ میں نے یوں نہیں کیا۔ پر یہ حیرت ہے کہ جب مجھ سے فقیر تنہا سے یہ سلوک ہوا، تو ایسے غریب ہزاروں تمھارے مُلکوں میں آتے جاتے ہوں گے، پس اگر[10] ہر ایک سے یہی مہمان داری کا طور رہتا ہوگا، تو مبلغ[11] بے حساب خرچ ہوتے ہوں گے۔ پس اتنی دولت، کہ جس کا یہ صرف ہے، کہاں سے آئی اور کیسی ہے؟ اگر گنج[12] قارون ہو، تو بھی وفا نہ کرے۔ اور ظاہر میں اگر مَلکہ کی سلطنت پر نگاہ کیجے، تو اُس کی آمد[13]،

فقط باورچی خانے کے خرچ کو بھی کفایت نہ کرتی ہوگی، اور شہر چین کا تو کیا ذکر ہے۔ اگر اس کا بیان ملکہ کی زبان سے سنوں، تو خاطر جمع ہو۔ قصد ملکِ نیم روز کا کروں اور جوں توں وہاں جا پہنچوں۔ پھر سب احوال دریافت کر کے ملکہ کی خدمت میں، بہ شرطِ زندگی، بارِ دِگر حاضر ہوں، اپنے دل کی مراد پاؤں۔

یہ سن کر، ملکہ نے اپنی زبان سے کہا کہ اے جوان! اگر تجھے آرزو کمال ہے کہ یہ ماہیت دریافت کرے، تو آج کے دن بھی مقام کر۔ شام کو تجھے حضور میں طلب کر کر، جو کچھ احوال اس دولتِ بے زوال کا ہے، بے کم و کاست کہا جائے گا۔ میں یہ تسلی پا کر، اپنی اِستقامت کے مکان پر آ کر منتظر تھا کہ کب شام ہو، جو میرا مطلب تمام ہو۔ اتنے میں خواجہ سرا کئی چوگوشے تورہ پوش پڑے، بقچیوں کے سر پر دھرے آ کر موجود ہوا اور بولا کہ حضور سے اُلُش خاص عنایت ہوا ہے، اِس کو تناول کرو۔ جس وقت میرے سامنے کھولے، بو باس سے دماغ معطر ہوا اور روح بھر گئی۔ جتنا کھا سکا کھا لیا، باقی اُن سبھوں کو اُٹھا دیا اور شکرِ نعمت کہ بھیجا۔ بارے جب آفتاب، تمام دن کا مسافر تھکا ہوا، گرتا پڑتا اپنے محل میں داخل ہوا اور ماہتاب، دیوان خانے میں اپنے مصاحبوں کو ساتھ لے کر نکل بیٹھا؛ اُس وقت دائی آئی اور مجھ سے کہنے لگی کہ چلو، بادشاہ زادی نے یاد فرمایا ہے۔ میں اُس کے ہم راہ ہو لیا۔ خلوتِ خاص میں لے گئی۔ روشنی کا یہ عالم تھا کہ شبِ قدر کو وہاں قدر نہ تھی۔ اور بادشاہی فرش پر مسندِ مُغرّق بچھی، مرصع کا تکیہ لگا ہوا، اور اُس پر ایک شمیانہ موتیوں کی جھالر کا، جڑاؤ استادوں پر کھڑا ہوا۔ اور سامنے مسند کے جواہر کے درخت

پھول پات لگے ہوئے، گویا عین مین قدرتی ہیں، سونے کی کیاریوں (۲) میں سجے ہوئے
اور دونوں طرف دستِ راست اور دستِ چپ، شاگرد پیشے اور مجرائی
دست بستہ، باادب، آنکھیں نیچی کیے ہوئے حاضر تھے۔ اور طوائف اور
گائنیں سازوں کے سُر بنائے منتظر۔ یہ سماں اور یہ تیاری کرّوفر (۴) کی
دیکھ کر عقل ٹھکانے نہ رہی۔ دائی سے پوچھا کہ دن کو وہ زیبائش اور
رات کو یہ آرائش (۵) کہ دن عید اور رات شبِ برات کہا چاہیے، بلکہ دُنیا
میں بادشاہ ہفت اقلیم کو یہ عیش میسّر نہ ہوگا! ہمیشہ یہی صورت رہتی ہے؟
دائی کہنے لگی کہ ہماری ملکہ کا جتنا کارخانہ تم نے دیکھا، یہ سب اسی دستور
سے جاری ہے، اس میں ہرگز خلل نہیں، بلکہ افزوں ہے۔ تم یہاں بیٹھو!
ملکہ دوسرے مکان میں تشریف رکھتی ہیں، جاکر خبر کروں۔

دائی یہ کہہ کر گئی اور اُنھیں پانو پھر آئی کہ چلو حضور میں۔ یہ مجرد اُس
مکان میں جاتے ہی بھچک (۷) رہ گیا۔ نہ معلوم ہوا کہ دروازہ کہاں اور دیوار
کیدھر ہے! اس واسطے کہ حلبی (۸) آئینے قدِ آدم چاروں طرف لگے اور اُن
کی پردازوں میں ہیرے اور موتی جڑے ہوئے تھے۔ ایک کا عکس ایک
میں نظر آتا تو یہ معلوم ہوتا کہ جواہر (۹) کا سارا مکان ہے۔ ایک طرف پردہ پڑا تھا،
اُس کے پیچھے ملکہ بیٹھیں تھیں۔ وہ دائی پردے سے لگ کر بیٹھی اور مجھے بھی بیٹھنے
کو کہا۔ تب دائی، ملکہ کے فرمانے سے، اس طور بیان کرنے لگی کہ سُن اے
جوانِ دانا! سلطان اس اقلیم کا بڑا بادشاہ تھا۔ اُن کے گھر میں سات بیٹیاں
پیدا ہوئیں۔ ایک روز بادشاہ نے جشن فرمایا۔ یے ساتوں لڑکیاں سولہ سنگار،

بارہ ابھرن، بال بال گج موتی پروکر بادشاہ کے حضور کھڑی تھیں۔ سلطان
کے کچھ جی میں آیا تو بیٹیوں کی طرف دیکھ کر فرمایا: اگر تمھارا باپ بادشاہ
نہ ہوتا اور کسی غریب کے گھر تم پیدا ہوتیں، تو تمھیں بادشاہ زادی اور ملکہ
کون کہتا! خدا کا شکر کرو کہ شہ زادیاں کہلاتی ہو۔ تمھاری یہ ساری خوبی میرے
دم سے ہے۔ چھ لڑکیاں ایک زبان ہو کر بولیں کہ جہاں پناہ جو فرماتے ہیں، بجا
ہے اور آپ ہی کی سلامتی سے ہماری بھلائی ہے؛ لیکن یہ ملکہ، جہاں سب
بہنوں سے چھوٹی تھیں، پر عقل و شعور میں اس عمر میں بھی گویا سب سے بڑی
تھیں، چپکی کھڑی رہیں، اس گفتگو میں بہنوں کی شریک نہ ہوئیں، اس واسطے
کہ یہ کلمہ کفر کا ہے۔ بادشاہ نے نظرِ غضب سے ان کی طرف دیکھا اور کہا:
کیوں بی بی! تم کچھ نہ بولیں، اس کا کیا باعث ہے؟ تب ملکہ نے، دونوں
ہاتھ اپنے رومال سے باندھ کر، عرض کی کہ اگر جان کی امان پاؤں اور تقصیر
معاف ہو، تو یہ لونڈی اپنے دل کی بات گزارش کرے۔ حکم ہوا کہ کہہ کیا
کہتی ہے؟ تب ملکہ نے کہا کہ قبلۂ عالم! آپ نے سنا ہے کہ سچی بات کڑوی لگتی
ہے، سو اس وقت میں اپنی زندگی سے ہاتھ دھو کر عرض کرتی ہوں۔ اور جو کچھ
میری قسمت میں لکھنے والے نے لکھا ہے، اس کا مٹانے والا کوئی نہیں، کسو
طرح نہیں ٹلنے کا۔

خواہ تم پاتو گھسو، یا کہ رکھو سر بہ سجود
بات پیشانی کی جو کچھ ہے، سو پیش آتی ہے

جس بادشاہِ علی الاطلاق نے آپ کو بادشاہ بنایا، انھیں نے مجھے بھی بادشاہ زادی

کھوایا۔ اُس کی قُدرت کے کارخانے میں کسو کا اِختیار نہیں چلتا۔ آپ کی ذات ہماری ولی نعمت اور قبلہ و کعبہ ہے، حضرت کے قدمِ مبارک کی خاک کو اگر سُرمہ کروں تو بجا ہے۔ مگر نصیب ہر ایک کے، ہر ایک کے ساتھ ہیں۔

بادشاہ یہ سُن کر طیش میں آئے اور یہ جواب دل پر سخت گراں معلوم ہوا، بیزار ہوکر فرمایا: چھوٹا مُنہ بڑی بات! اب اِس کی یہی سزا ہے کہ گہنا پاتا جو کچھ اِس کے ہاتھ گلے میں ہے، اُتار لو اور ایک میانے میں چڑھا کر ایسے جنگل میں کہ جہاں نام و نشان آدمی آدم زاد کا نہ ہو، پھینک آؤ؛ دیکھیں اِس کے نصیبوں میں کیا لکھا ہے۔

بموجب حکم بادشاہ کے، اُس آدھی رات میں (کہ عین اندھیری تھی) ملکہ کو (جو نُور بھونرے میں پلی تھیں اور سوائے اپنے محل کے دوسری جگہ نہ دیکھی تھی) بھونی، لے جا کر ایک میدان میں، کہ وہاں پرندہ پر نہ مارتا، انسان کا تو کیا ذکر ہے، چھوڑ کر چلے آئے۔ ملکہ کے دل پر عجب حالت گزرتی تھی کہ ایک دم میں کیا تھا اور کیا ہو گیا! پھر اپنے خُدا کی جناب میں شکر کرتیں اور کہتیں: تو ایسا ہی بے نیاز ہے۔ جو چاہا، سو کیا اور جو چاہتا ہے، سو کرتا ہے اور جو چاہے گا، سو کرے گا۔ جب تلک نتھنوں میں دم ہے، تجھ سے نا اُمید نہیں ہوتی۔ اِسی اندیشے میں آنکھ لگ گئی۔ جس وقت صُبح ہونے لگی، ملکہ کی آنکھ کھل گئی، پکاریں کہ وضو کو پانی لانا۔ پھر ایک بارگی رات کی بات جیت یاد آئی کہ تو کہاں اور یہ بات کہاں، یہ کہہ کر، اُٹھ کر تیمم کیا اور دوگانہ شکر کا پڑھا۔ اے عزیز! ملکہ کی اُس حالت کے سُننے سے چھاتی پھٹتی ہے۔ اُس بھولے بھالے جی سے پوچھا

چاہیے کہ کیا کہتا ہوگا! غرض اُس میانے میں بیٹھی ہوئی خُدا سے لَو لگائے[۱] رہتی تھیں اور یہ کبت اُس دم پڑھتی تھیں:

(۲)

جب دانت نہ تھے تب دودھ دیو، جب دانت دیے، کہا: آنّ نہ دَے ہے
جو جَل میں تھل میں پنچھی پسُو کی سُدھ لیت، سُو تیری بھی لے ہے
کاہے کو سوچ کرے مَن مُورکھ، سُوچ کرنے کچھ ہاتھ نہ آئے ہے
جان کو دیت، اَجان کو دیت، جہان کو دیت، سُو تُو کو بھی دَے ہے

سچ ہے: جب کچھ بَن نہیں آتا، تب خُدا ہی یاد آتا ہے؛ نہیں تُو اپنی اپنی تدبیر میں ہر ایک لُقمان اور بوعلی سینا ہے۔ اب خُدا کے کارخانے کا تماشا سُنو۔ اِسی طرح تین دن رات صاف[۳] گزر گئے کہ مَلکہ کے مُنہ میں ایک کھیل بھی اُڑ کر نہ گئی۔ وہ پھول سا بدن سُوکھ[۴] کر کانٹا ہوگیا اور وہ رنگ جو کُندن سا دَمکتا تھا، ہلدی سا بَن گیا۔ مُنہ میں پھیپھڑی بَندھ گئی، آنکھیں پتھرا گئیں، مگر ایک دَم اَٹک رہا تھا کہ وہ آتا جاتا تھا۔ جب تلک سانس، تب تلک آس۔ چوتھے روز صُبح کو ایک دَرویش خِضر کی سی صورت، نورانی چہرہ، روشن دل، آکر پیدا ہوا، مَلکہ کو اُس حالت میں دیکھ کر بُولا: اَے بیٹی! اگرچہ تیرا باپ بادشاہ ہے، لیکن تیری قسمت میں یہ بھی بَدا تھا۔ اب اِس فقیر بوڑھے کو اپنا خادِم سمجھ اور اپنے پیدا کرنے والے کا رات دن دھیان رکھ، خُدا خوب کرے گا۔ اور فقیر کے کچکول میں جو ٹکڑے بھیک[۵] کے موجود تھے، مَلکہ کے روبرو رکھے اور پانی کی تلاش میں پھرنے لگا۔ دیکھے تو ایک کُنواں[۶] تو ہے، پر ڈول، رسّی کہاں، جس سے پانی بھرے۔ تھوڑے پتّے درخت سے توڑ کر دَونا[۷] بنایا اور

اپنی سیلی کھول کر، اس میں باندھ کر، پانی نکالا اور ملکہ کو کچھ کھلایا پلایا۔ بارے ٹک ہوش آیا۔ اس مردِ خدا نے، بے کس اور بے بس جان کر، بہت سی تسلی دی، خاطر جمع کی اور آپ بھی رونے لگا۔ ملکہ نے جب غم خواری اور دل داری اُس کی بے حد دیکھی، تب اُن کے بھی مزاج کو استقلال ہوا۔ اُس روز سے اُس پیر مرد نے یہ مقرر کیا کہ صبح کو بھیک مانگنے کے لیے شہر میں نکل جاتا۔ جو ٹکڑا پارچہ پاتا، ملکہ کے پاس لے آتا اور کھلاتا۔

اس طور سے تھوڑے روز گزرے۔ ایک دن ملکہ نے تیل سر میں ڈالنے اور کنگھی چوٹی کرنے کا قصد کیا۔ جونہیں مباف کھولا، چٹلے میں سے ایک موتی گاوانہ گول، آب دار نکل پڑا۔ ملکہ نے اُس درویش کو دیا اور کہا: شہر میں سے اِس کو بیچ لاؤ۔ وہ فقیر اُس گوہر کو بیچ کر اُس کی قیمت بادشاہ زادی کے پاس لے آیا۔ تب ملکہ نے حکم کیا کہ ایک مکان موافق گزران کے اِس جگہ بنواؤ۔ فقیر نے کہا: اے بیٹی! نیو دیوار کی کھود کر، تھوڑی سی مٹی جمع کرو۔ ایک دن میں پانی لا کر، گارا کر کر، گھر کی بنیاد درست کر دوں گا۔ ملکہ نے اُس کے کہنے سے مٹی کھودنی شروع کی۔ جب ایک گز عمیق گڑھا کھودا گیا، زمین کے نیچے سے ایک دروازہ نمود ہوا۔ ملکہ نے اُس در کو صاف کیا، ایک بڑا گھر جواہر اور اشرفیوں سے معمور نظر آیا۔ ملکہ نے پانچ چار لپ اشرفیوں کی لے کر، پھر بند کیا اور مٹی دے کر اوپر سے ہموار کر دیا۔ اتنے میں فقیر آیا۔ ملکہ نے فرمایا کہ راج اور معمار، کاریگر اور اپنے کام کے اُستاد اور مزدور جلد دست⑨ بلاؤ، جو اس مکان پر ایک عمارت بادشاہانہ، کہ طاقِ کسریٰ کا جفت⑩ ہو اور قصرِ نعمان[الف]

سے بنقت* لے جائے ؛ اور شہر پناہ اور قلعہ اور باغ اور باولی اور ایک مسافر خانہ کہ لاثانی ہو، جلد تیار کریں ؛ لیکن پہلے نقشہ اُن کا ایک کاغذ پر درست کر کے حضور میں لاویں، جو پسند کیا جائے۔

فقیر نے ایسے ہی کار کُن کار کردہ، ذی ہوش لا کر حاضر کیے۔ موافق فرمانے کے تعمیر عمارت کی ہونے لگی۔ اور نوکر چاکر ہر ایک کارخانہ جات کی خاطر چُن چُن کر، فہمیدہ اور بادیانت ملازم ہونے لگے۔ اُس عمارتِ عالی شان کی تیاری کی خبر رفتہ رفتہ بادشاہِ ظلِّ سبحانی کو، جو قبلہ گاہ ملکہ کے تھے، پہنچی۔ سُن کر بہت متعجب ہوئے اور ہر ایک سے پوچھا کہ یہ کون شخص ہے جس نے یہ محلات بنانے شروع کیے ہیں؟ اُس کی کیفیت سے کوئی واقف نہ تھا جو عرض کرے۔ سبھوں نے کانوں پر ہاتھ رکھے کہ کوئی غلام نہیں جانتا کہ اِس کا بانی کون ہے۔ تب بادشاہ نے ایک امیر کو بھیجا اور پیغام دیا کہ میں اُن مکانوں کے دیکھنے کو آیا چاہتا ہوں۔ اور یہ بھی معلوم نہیں کہ تم کہاں کی بادشاہ زادی ہو اور کس خاندان سے ہو؟ یہ سب کیفیت دریافت کرنی اپنے تئیں منظور ہے۔

جونہیں ملکہ نے یہ خوش خبری سُنی، دل میں بہت شاد ہو کر عرضی لکھی کہ جہاں پناہ سلامت! حضور کے تشریف لانے کی خبر طرف غریب خانے کے سُن کر نہایت خوشی حاصل ہوئی اور سبب حرمت اور عزت اِس کم ترین کا ہوا۔ زہے طالع اُس مکان کے کہ جہاں قدمِ مبارک کا نشان پڑے اور وہاں کے رہنے والوں پر دامنِ دولت سایہ کرے اور نظرِ توجّہ سے وے دونوں سرفراز ہوویں! یہ لونڈی اُمّید وار ہے کہ کل روزِ پنجشنبہ روزِ مبارک ہے اور

میرے نزدیک بہتر روز نوروز سے ہے، آپ کی ذات مشابہ آفتاب کے ہے، تشریف فرما کر، اپنے نور سے اس ذرّہ بے مقدار کو قدر و منزلت بخشیے اور جو کچھ اس عاجزہ سے میسّر ہو سکے، نوش جان فرمائیے۔ یہ عین غریب نوازی اور مسافر پروری ہے، زیادہ حدِ ادب۔ اور اس عمدہ کو بھی کچھ تواضع کر کر رخصت کیا۔

بادشاہ نے عرضی پڑھی اور کہلا بھیجا کہ ہم نے تمہاری دعوت قبول کی، البتہ آویں گے۔ ملکہ نے نوکروں اور سب کارباریوں کو حکم کیا کہ لوازمہ ضیافت کا ایسے سلیقے سے تیار ہو کہ بادشاہ دیکھ کر اور کھا کر بہت محظوظ ہوں اور ادنا اعلا جو بادشاہ کی رکاب میں آویں، سب کھا پی کر خوش ہو کر جاویں۔ ملکہ کے فرمانے اور تاکید کرنے سے سب قسم کے کھانے سلونے اور میٹھے اس ذائقے کے تیار ہوئے کہ اگر باہمن کی بیٹی کھاتی، تو کلمہ پڑھتی۔ جب شام ہوئی، بادشاہ منڈپ تخت پر سوار ہو کر ملکہ کے مکان کی طرف تشریف لائے۔ ملکہ اپنی خاص خواص، سہیلیوں کو لے کر استقبال کے واسطے چلیں۔ جوں بادشاہ کے تخت پر نظر پڑی، اس آداب سے مجرا شاہانہ کیا کہ یہ قاعدہ دیکھ کر بادشاہ کو اور بھی حیرت نے لیا۔ اور اسی انداز سے جلو کر کر بادشاہ کو تخت مرصّع پر لا بٹھایا۔ ملکہ نے سوا لاکھ روپے کا چبوترہ تیار کروا رکھا تھا، اور ایک سو ایک کشتی جواہر اور اشرفی اور پشمینہ اور نوربافی اور ریشمی اور طلا بافی اور زردوزی کی لگا رکھی تھی، اور دو زنجیر فیل اور دس راس اسپ عراقی اور یمنی مرصّع کے ساز سے تیار کر رکھے تھے، نذر گزرانے اور آپ دونوں ہاتھ باندھے روبرو کھڑی رہیں۔ بادشاہ نے بہت مہربانی سے فرمایا کہ تم کس ملک کی شہزادی ہو

اور یہاں کس صورت سے آنا ہوا؟

مَلِکہ نے آداب بجا لا کر اِلتماس کیا کہ یہ لونڈی وہی گنہ گار ہے جو غضبِ سُلطانی کے باعث اِس جنگل میں پہنچی، اور یہ سب تماشے خُدا کے ہیں جو آپ دیکھتے ہیں۔ یہ سُنتے ہی بادشاہ کے لہو نے جوش مارا، اُٹھ کر محبّت سے گلے لگا لیا اور ہاتھ پکڑ کے، اپنے تخت کے پاس کُرسی بچھوا کر، حُکم بیٹھنے کا کیا؛ لیکن بادشاہ حیران اور مُتعجّب بیٹھے تھے۔ فرمایا کہ بادشاہ بیگم کو کہو کہ بادشاہ زادیوں کو اپنے ساتھ لے کر جلد آوِیں۔ جب وُے آئیں؛ ماں، بہنوں نے پہچانا اور گلے مل کر رُوئیں اور شُکر کیا۔

مَلِکہ نے اپنی والِدہ اور چھوٹی ہمشیروں کے رُو بہ رُو اِتنا کچھ نقد اور جواہر رکھا کہ خزانہ تمام عالم کا اُس کے پاسنگ میں نہ چڑھے۔ پھر بادشاہ نے سب کو ساتھ بٹھا کر خاصہ نوشِ جان فرمایا۔ جب تلک جہاں پناہ جیتے رہے، اِسی طرح گزری: کبھو کبھو آپ آتے اور کبھی مَلِکہ کو بھی اپنے ساتھ محلوں میں لے جاتے۔

جب بادشاہ نے رِحلت فرمائی، سلطنت اِس اِقلیم کی مَلِکہ کو پہنچی کہ اِن کے سِوا دوسرا کوئی لائق اِس کام کے نہ تھا۔

اَے عزیز! سرگزشت یہ ہے جو تو نے سُنی۔ پَس دولتِ خُداداد کو ہرگز زوال نہیں ہوتا، مگر آدمی کی نیّت درست چاہیے؛ بلکہ جتنی خرچ کرو، اُس میں اُتنی ہی برکت ہوتی ہے۔ خُدا کی قُدرت میں تعجّب کرنا کسی مذہب میں روا نہیں۔ دائی نے یہ بات کہہ کر کہا کہ اب اگر قصد وہاں کے جانے کا اور اُس

خبر لانے کا دل میں مقرر رکھتے ہو تو جلد روانہ ہو۔ میں نے کہا: اِسی وقت میں جاتا ہوں، اور خدا چاہے تو جلد پھر آتا ہوں۔ آخر رخصت ہو کر اور فضلِ الٰہی پر نظر رکھ کر اُس سمت کو چلا۔

برس دن کے عرصے میں، ہرج مرج کھینچتا ہوا شہرِ نیم روز میں جا پہنچا۔ جتنے وہاں کے آدمی ہزاری اور بزاری نظر پڑے، سیاہ پوش تھے۔ جیسا احوال سنا تھا، اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ کئی دنوں کے بعد چاند رات ہوئی۔ پہلی تاریخ سارے لوگ اُس شہر کے چھوٹے بڑے، لڑکے بالے، اُمرا بادشاہ، عورت مرد ایک میدان میں جمع ہوئے۔ میں بھی اپنی حالت میں حیران، سرگردان اُس کثرت کے ساتھ، اپنے مال مُلک سے جُدا، فقیر کی صورت بنا ہوا کھڑا دیکھتا تھا کہ دیکھیے پردۂ غیب سے کیا ظاہر ہوتا ہے! اتنے میں ایک جوان گاؤ سوار، مُنہ میں کف بھرے، جوش خروش کرتا ہوا جنگل میں سے باہر نکلا۔ یہ عاجز، جو اتنی محنت کر کے اُس کے احوال دریافت کرنے کی خاطر گیا تھا، دیکھتے ہی اُسے، حواس باختہ ہو کر حیران کھڑا رہ گیا۔ وہ جوان مرد قدیم قاعدے پر جو کام کرتا تھا، کر کر پھر گیا اور خلقت شہر کی شہر کی طرف متوجہ ہوئی۔ جب مجھے ہوش آیا، تب میں پچتایا کہ یہ کیا تجھ سے حرکت ہوئی! اب مہینے بھر پھر راہ دیکھنی پڑی! لاچار سب کے ساتھ چلا آیا اور اُس مہینے کو ماہِ رمضان کی مانند ایک ایک دن گن گن کر کاٹا۔ بارے دوسری چاند رات آئی، مجھے گویا عید ہوئی۔ غُرّے کو پھر بادشاہ خلقت سمیت وہیں جا کر اکٹھے ہوئے۔ تب میں نے دل میں مصمم ارادہ کیا کہ اب کی بار جو ہو سو ہو، اپنے تئیں سنبھال کر اِس ماجرائے عجیب

کہ معلوم کیا چاہیے۔ ناگاہ جوان بہ دستور زرد بیل پر زین باندھے سوار ہوا، آ پہنچا اور اُتر کر دو زانو بیٹھا۔ ایک ہاتھ میں ننگی سیف اور ایک ہاتھ میں بیل کی ناتھ پکڑی اور مرتبان غلام کو دیا۔ غلام ہر ایک کو دکھا کر لے گیا۔ آدمی دیکھ کر رونے لگے۔ اُس جوان نے مرتبان پھوڑا اور غلام کو ایک تلوار ایسی ماری کہ سر جدا ہو گیا اور آپ سوار ہو کر مڑا۔ میں اُس کے پیچھے جلد قدم اُٹھا کر چلنے لگا۔ شہر کے آدمیوں نے میرا ہاتھ پکڑا اور کہا: یہ کیا کرتا ہے! کیوں جان بوجھ کر مرتا ہے! اگر ایسا ہی تیرا دم ناک میں آیا ہے، تو بہتیری طرحیں مرنے کی ہیں، مر رہیو۔ ہر چند میں نے منت کی اور زور بھی کیا کہ کسو صورت سے اُن کے ہاتھ سے چھوٹوں، چھٹکارا نہ ہوا۔ دو چار آدمی لپٹ گئے اور پکڑے ہوئے بستی کی طرف لے آئے۔ عجب طرح کا قلق پھر مہینے بھر گزرا۔

جب وہ بھی مہینا تمام ہوا اور سلخ کا دن آیا؛ صبح کو اُسی صورت سے سارے عالم کا وہاں ازدحام ہوا۔ میں الگ سب سے، نماز کے وقت اُٹھ کر، آگے ہی جنگل میں، جو عین اُس جوان کی راہ پر تھا، گھس کر چھپ رہا کہ یہاں تو کوئی میرا مزاحم نہ ہو گا۔ وہ شخص اُسی قاعدے سے آیا اور وہی حرکتیں کر کر سوار ہوا اور چلا۔ میں نے اُس کا پیچھا کیا اور دوڑتا دھوپتا ساتھ ہو لیا۔ اُس عزیز نے آہٹ سے معلوم کیا کہ کوئی چلا آتا ہے؛ ایک بارگی باگ موڑ کر ایک نعرہ مارا اور گھرکا، تلوار کھینچ کر میرے سر پر آ پہنچا، چاہتا تھا کہ حملہ کرے۔ میں نے نہایت ادب سے جھک کر سلام کیا اور دونوں ہاتھ باندھ کر کھڑا رہ گیا۔ وہ قاعدہ داں متکلم ہوا کہ اے فقیر! تو ناحق مارا گیا ہوتا، پر بچ گیا، تیری حیات کچھ باقی ہے؛ جا،

کہاں آتا ہے! اور جڑاؤ خنجر موتیوں کا اُس اور آویزہ لگا ہوا کمر سے نکال کر میرے آگے پھینکا اور کہا: اِس وقت میرے پاس کچھ نقد موجود نہیں جو تجھے دوں، اِس کو بادشاہ پاس لے جا، جو تُو مانگے گا، ملے گا۔ ایسی ہیبت اور ایسا رُعب اُس کا مجھ پر غالب ہوا کہ نہ بولنے کی قدرت، نہ چلنے کی طاقت؛ مُنہ میں گھگی بندھ گئی، پانو بھاری ہو گئے۔

اِتنا کہہ کر وہ غازی مرد نعرہ بھرتا ہوا چلا۔ میں نے دل میں کہا: ہر چہ بادا باد! اب رہ جانا تیرے حق میں بُرا ہے، پھر ایسا وقت نہ ملے گا۔ اپنی جان سے ہاتھ دھو کر میں بھی روانہ ہوا۔ پھر وہ پھرا اور بڑے غصّے سے ڈانٹا اور مقرّر ارادہ میرے قتل کا کیا۔ میں نے سر جھکا دیا اور سوگند دی کہ اے رستمِ وقت کے! ایسی ہی ایک تیغ مار کہ صاف دو ٹکڑے ہو جاؤں، ایک تسمہ باقی نہ رہے اور اِس حیرانی اور تباہی سے چھوٹ جاؤں، میں نے اپنا خون مُعاف کیا۔ وہ بولا کہ اے شیطان کی صورت! کیوں اپنا خونِ ناحق میری گردن پر چڑھاتا ہے اور مجھے گنہ گار بناتا ہے! جا اپنی راہ لے، کیا جان بھاری پڑی ہے؟ میں نے اُس کا کہا نہ مانا اور قدم آگے دھرا۔ پھر اُس نے دیدہ و دانستہ آنا کانی دی اور میں پیچھے لگ لیا۔ جاتے جاتے دو کوس وہ جھاڑ جنگل طے کیا۔ ایک چار دیواری نظر آئی۔ وہ جوان دروازے پر گیا اور ایک نعرۂ مُہیب مارا۔ وہ در آپ سے آپ کھل گیا۔ وہ اندر پیٹھا، میں باہر کا باہر کھڑا رہ گیا۔ الٰہی اب کیا کروں! حیران تھا۔ بارے ایک دم کے بعد غلام آیا اور پیغام لایا کہ چل، تجھے رو بہ رو بلایا ہے، شاید تیرے سر پر اجل کا فرشتہ آیا ہے! کیا تجھے

کم بختی لگی تھی! میں نے کہا: زہے نصیب! اور بے دھڑک اُس کے ساتھ اندر باغ کے گیا۔

آخر ایک مکان میں لے گیا، جہاں وُہ بیٹھا تھا۔ میں نے اُسے دیکھ کر فراشی[۳] سلام کیا۔ اُس نے اِشارت بیٹھنے کی کی۔ میں اَدب سے دوزانو بیٹھا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ وُہ مرد اکیلا ایک مسند پر بیٹھا ہے اور ہتھیار زرگری کے آگے دھرے ہیں اور ایک جھاڑ زمرد کا تیار کرچکا ہے۔ جب اُس کے اُٹھنے کا وقت آیا، جتنے غلام اُس شہ نشین[۶] کے گرد پیش حاضر تھے، حجروں میں چھپ گئے۔ میں بھی مارے وسواس[۸] کے ایک کوٹھری میں جا گھسا۔ وُہ جوان اُٹھ کر، سب مکانوں کی کنڈیاں چڑھا کر، باغ کے کونے کی طرف چلا اور اپنی سواری کے بیل کو مارنے لگا۔ اُس کے چلّانے کی آواز میرے کان میں آئی، کلیجا کانپنے لگا؛ لیکن اِس ماجرے[۱۰] کے دریافت کرنے کی خاطر یہ سب آفتیں سہی تھیں، ڈرتے ڈرتے دروازہ کھول کر، ایک درخت کے تنے کی آڑ میں جا کر کھڑا ہوا اور دیکھنے لگا۔ جوان نے وُہ سونٹا جس سے مارتا تھا، ہاتھ سے ڈال دیا اور ایک مکان کا قفل کنجی سے کھولا اور اندر گیا۔ پھر وُونہیں باہر نکل کر، نرگاو کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا اور مُنہ چوما اور دانہ گھاس کھلا کر اِدھر کو چلا۔ میں دیکھتے ہی جلد دوڑ کر پھر کوٹھری میں جا چھپا۔

اُس جوان نے زنجیریں سب دروازوں کی کھول دیں، سارے غلام باہر نکلے۔ زیر انداز اور سلپچی، آفتابہ لے کر حاضر ہوئے۔ وُہ وضو کر کر نماز کی خاطر کھڑا ہوا۔ جب نماز ادا کرچکا، پکارا کہ وُہ درویش کہاں ہے؟ اپنا نام سنتے ہی میں دوڑ کر رُو بہ رُو[۱۲] جا کھڑا ہوا۔ فرمایا: بیٹھ۔ میں تسلیم کر کر بیٹھا۔ خاصہ[۱۳]

آیا، اُس نے تناوُل فرمایا، مجھے بھی عنایت کیا، مَیں نے بھی کھایا۔ جب دسترخوان بڑھایا اور ہاتھ دُھوئے، غلاموں کو رُخصت دی کہ جاکر سُو رہو۔ جب کوئی اُس مکان میں نہ رہا، تب مجھ سے ہم کلام ہوا اور پوچھا کہ اَے عزیز! تجھ پر کیا ایسی آفت آئی ہے جو تو اپنی موت کو ڈھونڈھتا پھرتا ہے؟

مَیں نے اپنا اَحوال آغاز سے انجام تک، جو کچھ گزرا تھا، تفصیل وار بیان کیا اور کہا: آپ کی توجّہ سے اُمّید ہے کہ اپنی مُراد کو پہنچوں۔ اُس نے یہ سُنتے ہی ایک ٹھنڈی سانس بھری اور بے ہوش ہوا اور کہنے لگا: ہائے خُدایا! عشق کے درد سے تیرے سوا کون واقف ہے! جس کی نہ پھٹی ہو بوائی، کیا جانے پیر پرائی۔(۲) اِس درد کی قدر درد مند ہو سو جانے۔

آفتوں کو عشق کی، عاشق سے پوچھا چاہیے

کیا خبر فاسق کو ہے، صادق سے پوچھا چاہیے

بعد ایک لحظے کے ہوش میں آکر ایک آہِ جگر سوز بھری کہ سارا مکان گونج گیا۔ تب مجھے یقین ہوا کہ یہ بھی اِسی عشق کی بلا میں گرفتار ہے اور اِسی مرض کا بیمار ہے۔ تب تو مَیں نے دِل چلا کر کہا کہ مَیں نے اپنا اَحوال سب عرض کیا، آپ توجّہ فرما کر اپنی سرگذشت سے بندے کو مطّلع فرمائیے، تو بہ مقدور اپنے پہلے تمھارے واسطے سعی کروں اور دل کا مطلب، کوشش کر کر، ہاتھ میں لاؤں۔

اَلقِصّہ وہ عاشقِ صادق مجھ کو اپنا ہم راز اور ہمدرد جان کر، اپنا ماجرا اِس صورت سے بیان کرنے لگا کہ سُن اَے عزیز! مَیں بادشاہ زادہ جگر سوز اِس

اِقلیمِ نیم رُوز کا ہوں۔ بادشاہ یعنی[1] قبلہ گاہ نے، میرے پیدا ہونے کے بعد نجومی اور رَمّال اور پنڈت[2] جمع کیے اور فرمایا کہ احوال شہزادے کے طالعوں کا دیکھ اور جانچو اور جنم پتری درست کرو۔ اور جو کچھ ہونا ہے، حقیقت پَل پَل گھڑی گھڑی اور پہر پہر اور دِن دِن، مہینے مہینے اور برس برس کی مفصّل حضور میں عرض کرو۔ بہ موجب حکمِ بادشاہ کے سب نے متّفق ہو، اپنے اپنے علم کے رُو سے ٹھہرا[4] اور سادھ کر (۳) اِلتماس کیا کہ خُدا کے فضل سے ایسی نیک ساعت اور سُبھ لگن (۵) میں شہزادے کا تولّد اور جنم ہوا ہے کہ چاہیے سکندر کی سی بادشاہت کرے اور نوشیرواں سا عادل ہو؛ اور جتنے علم اور ہنر ہیں، اُن میں کامل ہو؛ اور جس کام کی طرف دل اُس کا مائل ہو، وہ بہ خوبی حاصل ہو؛ سخاوت و شجاعت میں ایسا نام پیدا کرے کہ حاتم اور رُستم کو لوگ بھول جاویں؛ لیکن چودہ[6] برس تک سورج اور چاند کے دیکھنے سے ایک بڑا خطرہ نظر آتا ہے، بلکہ یہ وسواس ہے کہ جُنونی اور سودائی ہو کر بہت آدمیوں کا خون کرے اور بستی سے گھبراوے، جنگل میں نکل جاوے اور چرند پرند کے ساتھ دل بہلاوے۔ اِس کا تقیّد رہے کہ رات دن آفتاب، ماہتاب کو نہ دیکھے، بلکہ آسمان کی طرف بھی نگاہ نہ کرنے پاوے۔ جو اِتنی مدّت خیر و عافیت سے کٹے تو پھر ساری عمر سُکھ اور چین سے سلطنت کرے۔

یہ[9] سُن کر بادشاہ نے اسی لیے اِس باغ کی بنا ڈالی اور مکانِ متعدّد (۱۰) ہر ایک نقشے کے بنوائے۔ میرے تئیں تہ خانے میں پلنے کا حکم کیا اور اوپر ایک برج نمدے کا تیّار کروایا[11]، تو دھوپ اور چاندنی اُس میں سے نہ چھنے۔ میں، دائی، دودھ پلائی اور

اُٹھگا، پھُوپھُو اور کئی خواصوں کے ساتھ اِس مُحافظت سے اُس مکانِ عالی شان میں پرورش پانے لگا۔ اور ایک اُستادِ دانا،(۲) کار آزمودہ واسطے میری تربیت(۳) کے مُتعیّن کیا، تو تعلیم ہر علم اور ہُنر کی اور مشق ہفت قلم لکھنے کی کرے۔ اور جہاں پناہ ہمیشہ میرے خبرگیراں رہتے، دم بہ دم کی کیفیت روزمرّہ حُضور میں عرض ہوتی۔ مَیں اُس مکان ہی کو عالمِ دُنیا جان کر، کھلونوں اور رنگ بہ رنگ پھولوں سے کھیلا کرتا۔ اور تمام جہان کی نعمتیں کھانے کے واسطے مَوجود رہتیں، جو چاہتا سُو کھاتا۔ دس برس کی عُمر تک، جتنی صنعتیں اور قابلیّتیں تھیں، تحصیل کیں۔

ایک روز اُس گنبد کے نیچے روشن دان سے ایک پھول اچنبھے کا نظر پڑا، کہ دیکھتے دیکھتے بڑا ہوتا جاتا تھا۔ میں نے چاہا کہ ہاتھ سے پکڑ لوں، جُوں جُوں میں ہاتھ لمبا(۹) کرتا تھا، وہ اونچا ہوتا جاتا تھا۔ مَیں حیران ہو کر اُسے تک رہا تھا، تو وہیں ایک آواز قہقہے کی میرے کان میں آئی۔ میں نے اُس کے دیکھنے کو گردن اُٹھائی۔ دیکھا تو ٹَھِدّا چیر کر ایک مکھڑا چاند کا سا نکل رہا ہے۔ دیکھتے ہی اُس کے میرے عقل و ہوش بجا نہ رہے۔ پھر اپنے تئیں سنبھال کر دیکھا تو ایک مرصّع کا تخت پری زادوں کے کاندھے پر مُعلّق کھڑا ہے اور ایک تخت نشین، تاج جواہر کا سر پر اور خلعت جھلا بور بدن میں پہنے، ہاتھ میں یاقوت کا پیالہ لیے اور شراب پیتے ہوئے بیٹھی ہے۔ وہ تخت بلندی سے آہستہ آہستہ نیچے اُتر کر اُس برج میں آیا۔ تب پری نے مجھے بُلایا اور اپنے نزدیک بٹھایا، باتیں پیار کی کرنے لگی اور مُنہ سے مُنہ لگا کر، ایک جام شرابِ(۱۰) گلِ گلاب کا میرے تئیں پلایا اور کہا: آدمی زاد بے وفا ہوتا ہے، لیکن دل ہمارا تجھے چاہتا ہے۔ ایک دم میں ایسی ایسی انداز و ناز کی باتیں کیں کہ دل

محو ہوگیا اور ایسی خوشی حاصل ہوئی کہ زندگانی کا مزا پایا اور یہ سمجھا کہ آج تو دنیا میں آیا۔

حاصل یہ ہے کہ میں تو کیا ہوں، کسو نے یہ عالم نہ دیکھا ہوگا نہ سنا ہوگا۔ اُس مزے میں خاطر جمع سے ہم دونوں بیٹھے تھے کہ گریال میں غُلیلا لگا۔ اب اُس حادثۂ ناگہانی کا ماجرا سُن، کہ وونہیں چار پری زادنے آسمان پر سے اُتر کر کچھ اُس معشوق کے کان میں کہا۔ سُنتے ہی اُس کا چہرہ تغیر ہوگیا اور مجھ سے بولی کہ اے پیارے! دل تو یہ چاہتا تھا کہ کوئی دم تیرے ساتھ بیٹھ کر دل بہلاؤں اور اسی طرح ہمیشہ آؤں، یا تجھے اپنے ساتھ لے جاؤں؛ پر یہ آسمان دو شخص کو ایک جگہ آرام سے اور خوشی سے رہنے نہیں دیتا۔ لے جان! تیرا خُدا نگہبان ہے۔ یہ سُن کر میرے حواس جاتے رہے اور طوطے ہاتھ کے اُڑ گئے۔ میں نے کہا کہ اجی! اب پھر کب ملاقات ہوگی؟ یہ کیا تم نے غضب کی بات سُنائی! اگر جلد آؤ گی تو مجھے جیتا پاؤ گی، نہیں تو پچھتاؤ گی۔ یا اپنا ٹھکانا اور نام و نشان بتاؤ کہ میں ہی اُس پتے پر ڈھونڈھتے ڈھونڈھتے، اپنے تئیں تمھارے پاس پہنچاؤں۔ یہ سُن کر بولی: دور پار! شیطان کے کان بہرے! تمھاری صد و بیست سال کی عمر ہووے۔ اگر زندگی ہے تو پھر ملاقات ہو رہے گی، میں جنوں کے بادشاہ کی بیٹی ہوں اور کوہِ قاف میں رہتی ہوں۔ یہ کہہ کر تخت اُٹھایا اور جس طرح اُترا تھا، وونہیں بلند ہونے لگا۔

جب تلک سامھنے تھا، میری اور اُس کی چار آنکھیں ہو رہی تھیں۔ جب نظروں سے غائب ہوا، یہ حالت ہوگئی جیسے پری کا سایہ ہوتا ہے۔ عجب طرح کی

اُداسی دل پر چھاگئی۔ عقل و ہوش رُخصت ہوا، دُنیا آنکھوں کے تلے اندھیری ہوگئی۔ حیران پریشان، زار زار رُونا اور سر پر خاک اُڑانا، کپڑے پھاڑنا۔ نہ کھانے کی سُدھ، نہ بھلے بُرے کی بُدھ۔

اِس عشق کی بدولت کیا کیا خرابیاں ہیں
دل میں اُداسیاں ہیں اور اِضطرابیاں ہیں

اِس خرابی سے دائی اور مُعلّم خبردار ہوئے، ڈرتے ڈرتے بادشاہ کے رُو بہ رُو گئے اور عرض کی کہ بادشاہ زادۂ عالمیان کا یہ حال ہے۔ معلوم نہیں خود بہ خود یہ کیا غضب ٹوٹا، جو اُن کا آرام اور کھانا پینا سب چھوٹا۔ تب بادشاہ، وزیر، اُمرائے صاحبِ (۲) تدبیر اور حکیمِ حاذق، مُنجّمِ صادق، مُلّا، سیانے خوب، درویشِ (۳) سالِک اور مجذوب اپنے ساتھ لے کر اُس باغ میں رونق افزا ہوئے۔ میری بے قراری اور نالہ و زاری دیکھ کر اُن کی بھی حالت اِضطراب کی ہوگئی۔ آب دیدہ ہو کر بے اِختیار گلے سے لگا لیا اور اُس کی تدبیر کی خاطر حکم کیا۔ حکیموں نے قوّتِ دل اور خللِ دماغ کے واسطے نسخے لکھے (۴) اور مُلّاؤں نے نقش و تعویذ پلانے اور پاس رکھنے کو دیے، دُعائیں پڑھ پڑھ کر پھونکنے لگے۔ اور نجومی بولے کہ ستاروں کی گردش کے سبب یہ صورت پیش آئی ہے، اِس کا صدقہ دیجیے۔

غرض ہر کوئی اپنے اپنے علم کی باتیں کہتا تھا، پر مجھ پر جو گزرتی تھی، میرا دل ہی سہتا تھا۔ کسو کی سعی اور تدبیر میری تقدیرِ بد کے کام نہ آئی۔ دن بہ دن دیوانگی کا زور ہوا اور میرا بدن بے آب و دانے کم زور ہو چلا، رات دن چلّانا اور سر پٹکنا ہی باقی رہا۔ اِس حالت میں تین سال گزرے۔ چوتھے برس ایک

سوداگر سیر و سفر کرتا ہوا آیا اور ہر ایک مُلک کے تحفے تحائف عجیب و غریب جہاں پناہ کے حضور میں لایا، مُلازمت حاصل کی۔ بادشاہ نے بہت توجّہ فرمائی اور احوال پُرسی اُس کی کرکے پوچھا کہ تم نے بہت مُلک دیکھے، کہیں کوئی حکیم کامل بھی نظر پڑا، یا کسو سے مذکور اُس کا سُنا؟ اُس نے اِلتماس کیا کہ قبلۂ عالَم! غلام نے بہت سیر کی؛ لیکن ہندوستان میں دریا کے بیچ ایک پہاڑی ہے، وہاں ایک گوسائیں جٹا دھاری نے بڑا مندر مہادیو کا اور سنگت اور باغ بڑی بہار کا بنایا ہے، اُس میں رہتا ہے۔ اور اُس کا یہ قاعدہ ہے کہ ہر شیو رات کے روز اپنے استھان سے نکل کر دریا میں پیرتا ہے اور خوشی کرتا ہے۔ اشنان کے بعد جب اپنے آسن پر جانے لگتا ہے، تب بیمار اور دردمند دیس دیس اور مُلک مُلک کے، جو دور دور سے آتے ہیں، دروازے پر جمع ہوتے ہیں، اُن کی بڑی بھیڑ ہوتی ہے۔ وہ مہنت، جسے اِس زمانے کا افلاطون کہا چاہیے، قارورہ اور نبض دیکھتا ہوا اور ہر ایک کو نسخہ لکھ کر دیتا ہوا چلا جاتا ہے۔ خُدا نے ایسا دستِ شِفا اُس کو دیا ہے کہ دوا پیتے ہی اثر ہوتا ہے اور وہ مرض بالکل جاتا رہتا ہے۔ یہ ماجرا میں نے بہ چشمِ خود دیکھا اور خُدا کی قُدرت کو یاد کیا کہ ایسے ایسے بندے پیدا کیے ہیں۔ اگر حُکم ہو تو شہزادۂ عالمیاں کو اُس پاس لے جاویں، اُس کو ایک نظر دِکھاویں۔ اُمید قوی ہے کہ جلد شفائے کامل ہو۔ اور ظاہر میں بھی یہ تدبیر اچھی ہے کہ ہر ایک مُلک کی ہوا کھانے سے اور جابہ جا کے آب و دانے سے مزاج میں فرحت آتی ہے۔

بادشاہ کو بھی اُس کی صلاح پسند آئی اور خوش ہو کر فرمایا: بہت بہتر، شاید

اُس کا ہاتھ راس آوے اور میرے فرزند کے دل سے وحشت جاوے۔ ایک امیرِ معتبر، جہاں دیدہ، کار آزمودہ کو اور اُس تاجر کو میری رکاب میں تعینات کیا اور اسبابِ ضروری* ساتھ کر دیا۔ نواڑے، بجرے، مور پنکھی، پلوار، بجکے، رکھیلے، اُلاق، پٹیلیوں[2] پر مع سر انجام سوار کر کر رخصت کیا۔ منزل منزل چلتے چلتے اُس ٹھکانے پر جا پہنچے۔ نئی ہوا اور نیا دانہ پانی کھانے پینے سے کچھ مزاج ٹھہرا، لیکن خاموشی کا وُہی عالم تھا اور رونے سے کام دم بہ دم۔ یاد اُس پری کی دل سے بھولتی نہ تھی۔ اگر کبھو بولتا تو یہ بیت پڑھتا:

نہ جانوں کس پری رو کی نظر ہوئی
ابھی تو تھا بھلا چنگا مرا دل

بارے جب دو تین مہینے گزرے، اُس پہاڑ پر قریب چار ہزار مریض کے جمع ہوئے، لیکن سب یہی کہتے تھے کہ اب خدا چاہے تو گسائیں اپنے مٹھ سے نکلیں گے اور سب کو اُن کے فرمانے سے شفائے کلی ہوگی۔

القصہ جس دن وہ دن آیا، صبح کو جوگی مانند آفتاب کے نکل آیا اور دریا میں نہایا اور پیرا۔ پار جا کر پھر آیا اور بھبھوت، بھسم تمام بدن میں لگایا۔ وہ گورا بدن مانند انگارے کے راکھ میں چھپایا، اور ماتھے پر ملا گیر کا ٹیکا دیا۔ لنگوٹ باندھ کر، انگوچھا* کاندھے پر ڈالا، بالوں کا جوڑا باندھا۔ مونچھوں پر تاؤ دے کر، چرڑھواں[11] جوتا[12] اڑایا۔ اُس کے چہرے سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ ساری دنیا اُس کے نزدیک کچھ قدر نہیں رکھتی۔ ایک قلم دان جڑاؤ بغل میں لے کر، ایک ایک کی طرف دیکھتا اور نسخہ دیتا ہوا میرے نزدیک آ پہنچا۔

جب میری اور اُس کی چار نظریں ہوئیں، کھڑا رہ کر غور میں گیا اور مجھ سے کہنے لگا:
ہمارے ساتھ آؤ۔ مَیں ہمراہ ہو لیا۔

جب سب کی نوبت ہو چکی، میرے تئیں باغ کے اندر لے گیا اور ایک مقطع، خوش نقشہ خلوت خانے میں مجھے فرمایا کہ یہاں تم رہا کرو، اور آپ اپنے آستھان میں گیا۔ جب ایک چلا گزرا، تو میرے پاس آیا اور آگے کی نسبت مجھے خوش پایا، تب مسکرا کر فرمایا کہ اِس باغیچے میں سیر کیا کرو۔ جس میوے پر جی چلے، کھایا کرو۔ اور ایک قلفی چینی کی معجون بھری ہوئی دی کہ اِس میں سے چھ ماشے ہمیشہ بلاناغہ نہار نوشِ جاں فرمایا کرو۔ یہ کہہ کر وہ تو چلا گیا اور میں نے اُس کے کہنے پر عمل کیا۔ ہر روز قوّت بدن میں اور فرحت دل کو معلوم ہونے لگی، لیکن حضرتِ عشق کو کچھ اثر نہ کیا، اُس پری کی صورت نظروں کے آگے پھرتی تھی۔

ایک روز طاق میں ایک جِلد کتاب کی نظر آئی۔ اُتار کر دیکھا تو سارے عِلم دین و دُنیا کے اُس میں جمع کیے تھے، گویا دریا کو کوزے میں بھر دیا تھا۔ ہر گھڑی اُس کا مطالعہ کیا کرتا۔ علمِ حکمت اور تسخیر میں نہایت قوّت بہم پہنچائی۔ اِس عرصے میں برس دن گزر گیا، پھر وُہی خوشی کا دن آیا۔ جوگی اپنے آسن پر سے اُٹھ کر باہر نکلا، میں نے سلام کیا۔ اُن نے قلم دان مجھے دے کر کہا: ساتھ چلو۔ مَیں بھی ساتھ ہو لیا۔ جب دروازے سے باہر نکلا، ایک عالم دعا دینے لگا۔ وہ امیر اور سوداگر مجھے ساتھ دیکھ کر، گسائیں کے قدموں پر گرے اور ادائے شکر کرنے لگے کہ آپ کی توجّہ سے بارے اتنا تو ہوا۔ وہ اپنی عادت پر دریا کے گھاٹ تک گیا اور اشنان، پوجا جس طرح ہر سال کرتا تھا، کی۔ پھرتی بار بیماروں کو

دیکھتا بھالتا چلا آتا تھا۔

اِتّفاقاً سَودائیوں کے غول میں ایک جوانِ (۱) خوب صورت، شکیل (کہ ضُعف سے کھڑے ہونے کی طاقت اُس میں نہ تھی) نظر پڑا۔ مجھ کو کہا کہ اِس کو ساتھ لے آؤ۔ سب کی دارو درمن کرکے، جب خلوت خانے میں گیا، تھوڑی سی کھوپڑی اُس جوان کی تراش کر، چاہا کہ کنکھجورا (۲)، جو مغز پر بیٹھا تھا، زنبور سے اُٹھا لیوے۔ میرے خیال میں گزرا اور بول اُٹھا کہ اگر دستِ پناہ آگ میں گرم کرکر اُس کی پیٹھ پر رکھیے تو خوب ہے، آپ سے آپ نکل آوے گا۔ اور جو یوں کھینچیے گا، تو مغز کے گودے کو نہ چھوڑے گا، پھر خوف زندگی کو ہے۔ یہ سن کر میری طرف دیکھا اور چپکا اُٹھ، باغ کے کونے میں ایک درخت کولے میں پکڑ، جٹا کی لٹ کی گلے میں پھانسی لگا کر رہ گیا۔ میں پاس جا کر جو دیکھا تو واہ واہ یہ تو مر گیا! یہ اچنبھا دیکھ کر نہایت افسوس ہوا۔ لاچار جی میں آیا اُسے گاڑ دوں۔ جوں درخت سے جدا کرنے لگا، دو کنجیاں اُس کی لٹوں میں سے گر پڑیں۔ میں نے اُن کو اٹھا لیا، اور اُس گنج خوبی کو زمین میں دفن کیا۔ وے دونوں کنجیاں لے کر سب قفلوں میں لگانے لگا۔ اِتّفاقاً دو حجرے کے تالے اُن تالیوں سے کھلے۔ دیکھا تو زمین سے چھت تلک جواہر بھرا ہوا ہے، اور ایک پیٹی مخمل سے مڑھی، سونے کے پتر (۱۱) لگی، قفل دی ہوئی ایک طرف دھری ہے۔ اُس کو جو کھولا، تو ایک کتاب دیکھی کہ اُس میں اِسمِ اعظم اور حاضراتِ جن (۱۳) و پری کی اور روحوں کی ملاقات اور تسخیرِ آفتاب کی ترکیب لکھی (۱۴) ہے۔ ایسی دولت کے ہاتھ لگنے سے نہایت خوشی حاصل ہوئی اور اُن پر عمل کرنا شروع کیا۔ دروازہ

باغ کا کھول دیا، اپنے اُس امیر کو اور ساتھ والوں کو کہا کہ کشتیاں منگوا کر، یہ سب
جواہر و نقد و جنس اور کتابیں بار کر لو۔ اور ایک نواڑے پر آپ سوار ہو کر وہاں
سے بحر کو روانہ کیا۔ آتے آتے جب نزدیک اپنے مُلک کے پہنچا، جہاں پناہ کو خبر
ہوئی؛ سوار ہو کر اِستقبال کیا اور اِشتیاق سے بے قرار ہو کر کلیجے سے لگا لیا۔ میں
نے قدم بوسی کر کر کہا کہ اِس خاکسار کو قدیم باغ میں رہنے کا حُکم ہو۔ بولے کہ اے
برخوردار! وُہ مکان میرے نزدیک منحوس ٹھہرا، لہٰذا اُس کی مرمّت اور تیّاری
موقوف کی، اب وُہ مکان لائق انسان کے رہنے کے نہیں رہا۔ اور جس محل میں
جی چاہے اُترو۔ بہتر یوں ہے کہ قلعے میں کوئی جگہ پسند کر کے، میری آنکھوں کے
رُو بہ رُو رہو اور بائیں باغ جیسا چاہو، تیّار کروا کر، سیر تماشا دیکھا کرو۔ میں نے
بہت ضِد اور ہٹ کر کر اُس باغ کو نئے سِرے سے تعمیر کروایا اور بہشت کی
مانند آراستہ کر، داخل ہوا۔ پھر فراغت سے، جنوں کی تسخیر کی خاطر چِلّے
بیٹھا اور ترکِ حیوانات کر کر، حاضرات کرنے لگا۔

جب چالیس دن پورے ہوئے، تب آدھی رات کو ایک ایسی آندھی
آئی کہ بڑی بڑی عمارتیں گر پڑیں اور درخت جڑ پیڑ سے اُکھڑ کر کہیں سے
کہیں جا پڑے۔ اور پری زادوں کا لشکر نمود ہوا۔ ایک تخت ہَوا سے اُترا،
اُس پر ایک شخص شان دار، موتیوں کا تاج اور خلعت پہنے ہوئے بیٹھا تھا۔
میں نے دیکھتے ہی بہت مؤدّب ہو کر سلام کیا۔ اُس نے میرا سلام لیا اور کہا:
اے عزیز! یہ کیا تو نے ناحق دُند مچایا، ہم سے تجھے کیا مدّعا ہے؟ میں نے اِلتماس
کیا کہ یہ عاجز بہت مُدّت سے تمھاری بیٹی پر عاشق ہے اور اُسی لیے کہاں سے

کہاں خراب و خستہ ہوا اور جیتے جی مُوا۔ اب زندگی سے بہ تنگ آیا ہوں اور اپنی جان پر کھیلا ہوں جو یہ کام کیا ہے۔ اب آپ کی ذات سے اُمّید وار ہوں کہ مجھ حیران سرگردان کو اپنی توجّہ سے سرفراز کرو اور اُس کے دیدار سے زندگی اور آرام بخشو، تو بڑا ثواب ہوگا۔

یہ میری آرزو سُن کر بولا کہ آدمی خاکی اور ہم آتشی[1]، اِن دونوں میں مُوافقت آنی مشکل ہے۔ میں نے قسم کھائی کہ میں اُن کے دیکھنے کا مشتاق ہوں، اور کچھ مطلب نہیں۔ پھر اُس تخت نشین نے جواب دیا کہ انسان اپنے قول[2] قرار پر نہیں رہتا۔ غرض کے وقت[3] سب کچھ کہتا ہے، لیکن یاد نہیں رکھتا۔ یہ بات میں تیرے بھلے کے لیے کہہ سُناتا ہوں کہ اگر تو نے کبھو قصد کچھ اور کیا، تو وہ بھی اور تو بھی دونوں خراب خستہ ہوگے، بلکہ خوف جان کا ہے۔ میں نے پھر دوبارہ سوگند یاد کی کہ جس میں طرفین[*] کی بُرائی ہووے، ویسا کام ہرگز نہ کروں گا، مگر ایک نظر دیکھتا رہوں گا۔ یے باتیں ہوتیاں تھیں کہ اَن چِت وہ پری کہ جس کا مذکور تھا، نہایت ٹھسّے سے، بناؤ[*] کیے ہوئے آپہنچی اور بادشاہ کا تخت وہاں سے چلا گیا۔ تب[4] میں نے بے اختیار اُس پری کو جان کی طرح بغل میں لے آیا[5] اور یہ شعر پڑھا:

کہاں ایمرؔ مرے گھر کیوں نہ آوے[6]
کہ جس کے واسطے کھینچے ہیں چلّے

اُسی خوشی کے عالم میں باہم اُس باغ میں رہنے لگے۔ مارے ڈر کے کچھ اور خیال نہ کرتا، بالائی مزے لیتا اور فقط دیکھا کرتا۔ وہ پری میرے قول[7] قرار کے نباہنے

پر دل میں حیران رہتی اور بیٹھے وقت کہتی کہ پیارے! تم بھی اپنی بات کے بڑے سچے ہو، لیکن ایک نصیحت میں دوستی کی راہ سے کرتی ہوں: اپنی کتاب سے خبردار رہیو، کہ جنّ کسی نہ کسی دن تمھیں غافل پاکر چُرا لے جائیں گے۔ میں نے کہا: اُسے میں اپنی جان کے برابر رکھتا ہوں۔

(۲)

اتّفاقاً ایک روز رات کو شیطان نے وَرغلانا۔ شہوت کی حالت میں یہ دل میں آیا کہ جو کچھ ہو سو ہو، کہاں تلک اپنے تئیں تھامُوں! اُسے چھاتی سے لگالیا اور قصدِ جماع کا کیا۔ وُونہیں ایک آواز آئی: یہ کتاب مجھ کو دے، کہ اس میں اسمِ اعظم ہے، بے ادبی نہ کر۔ اُس مستی کے عالم میں کچھ ہوش نہ رہا، کتاب بغل سے نکال کر، بغیر جانے پہچانے حوالے کر دی اور اپنے کام میں لگا۔ وُہ نازنیں یہ میری نادانی کی حرکت دیکھ کر بولی کہ ہے ظالم! آخر چُوکا اور نصیحت بھُولا۔ یہ کہہ کر بے ہوش ہو گئی۔ اور میں نے اُس کے سرہانے ایک دیو دیکھا کہ کتاب لیے کھڑا ہے۔ چاہا کہ پکڑ کر خوب ماروں اور کتاب چھین لوں، اتنے میں اُس کے ہاتھ سے کتاب دوسرا لے بھاگا۔ میں نے جو افسُوں یاد کیے تھے، پڑھنے شروع کیے۔ وُہ جنّ، جو کھڑا تھا، بیل بن گیا؛ لیکن افسوس! کہ پری ذرا بھی ہوش میں نہ آئی اور وُہی حالت بے خودی کی رہی۔ تب میرا دل گھبرایا، سارا عیش تلخ ہو گیا۔

اُس روز سے آدمیوں سے نفرت ہوئی۔ اِس باغ کے گوشے میں پڑا رہتا ہوں اور دل کے بہلانے کی خاطر یہ مرتبان زُمرّد کا جھاڑ دار بنایا کرتا ہوں اور ہر مہینے اُس میدان میں اُسی بیل پر سوار ہو کر جایا کرتا ہوں۔ مرتبان کو

توڑ کر غلام کو مار ڈالتا ہوں، اس اُمید پر کہ سب میری یہ حالت دیکھیں اور افسوس کھاویں؛ شاید کوئی ایسا خدا کا بندہ مہربان ہو کہ میرے حق[1] میں دعا کرے تو میں بھی اپنے مطلب کو پہنچوں۔ اے رفیق! میرے جنون اور سودا[2] کی یہ حقیقت ہے جو میں نے تجھے کہہ سنائی۔

میں سن کر آب دیدہ ہوا اور بولا کہ اے شہزادے! تو نے واقعی عشق کی بڑی محنت اٹھائی، لیکن قسم خدا کی کھاتا ہوں کہ میں اپنے مطلب سے در گزرا، اب تیری خاطر جنگل، پہاڑ میں پھروں گا اور جو مجھ سے ہو سکے گا، سو کروں گا۔ یہ وعدہ کر کر میں اس جوان سے رخصت ہوا اور پانچ برس تک سودائی سا ویرانے میں خاک چھانتا پھرا، سراغ[3] نہ ملا۔

آخر اکتا کر ایک پہاڑ پر چڑھ گیا اور چاہا کہ اپنے تئیں گرا دوں کہ ہڈی پسلی کچھ ثابت نہ رہے۔ وہی[4] سوار برقع[5] پوش آ پہنچا اور بولا کہ اپنی جان مت کھو، تھوڑے دنوں کے بعد تو اپنے مقصد سے کامیاب ہوگا۔ یا سائیں اللہ! تمھارے دیدار تو میسر ہوئے" اب خدا کے فضل سے اُمید وار ہوں کہ خوشی اور خرمی حاصل ہو اور سب نامراد اپنی مراد کو پہنچیں[6]۔

سرگزشت آزاد بخت بادشاہ کی

جب دوسرا درویش بھی اپنی سیر کا قصّہ کہہ چکا، رات آخر ہوگئی اور وقت صُبح کا شُروع ہونے پر آیا۔ بادشاہ آزاد بخت چپکا اپنے دولت خانے کی طرف روانہ ہوا۔ محل میں پہنچ کر نماز ادا کی۔ پھر غُسل خانے میں جا، خِلعتِ فاخرہ پہن کر، دیوانِ عام میں تخت پر نکل بیٹھا اور حُکم کیا کہ یساول جاوے، چار فقیر فلانے مکان پر وارد ہیں، اُن کو بہ عزّت اپنے ساتھ حضور میں لے آوے۔

بہ موجب حُکم کے چوب دار وہاں گیا۔ دیکھا تو چاروں بے نوا جھاڑا جھٹکا پھر، ہاتھ مُنہ دھو کر، چاہتے ہیں کہ رِسا کریں اور اپنی اپنی راہ لیں، چیلے نے کہا: شاہ جی! بادشاہ نے چاروں صورتوں کو طلب فرمایا ہے، میرے ساتھ چلیے۔ چاروں درویش آپس میں ایک ایک کو تکنے لگا اور چوب دار سے کہا: بابا! ہم اپنے دل کے بادشاہ ہیں، ہمیں دُنیا کے بادشاہ سے کیا کام ہے! اُس نے کہا: میاں اللہ! مضایقہ نہیں، اگر چلو تو اچھا ہے۔ اِتنے میں چاروں کو یاد آیا کہ مولا مُرتضیٰ نے جو فرمایا تھا، سُو اب پیش آیا۔ خوشی ہوئے اور یساول کے ہم راہ چلے۔ جب قلعے میں پہنچے اور رُو بہ رُو بادشاہ کے گئے، چاروں قلندروں نے دُعا دی کہ بابا! تیرا بھلا ہو۔ بادشاہ دیوانِ خاص میں جا بیٹھے اور دو چار خاص امیروں کو بُلایا اور فرمایا کہ چاروں گدڑی پوشوں کو بُلاؤ۔ جب وہاں گئے، حُکم بیٹھنے کا کیا۔ احوال پُرسی فرمائی کہ تمھارا کہاں سے آنا ہوا اور کہاں کا اِرادہ ہے؟

مکان مُرشدوں کے کہاں ہیں؟

انھوں نے کہا کہ بادشاہ کی عُمر و دَولت زیادہ رہے؛ ہم فقیر ہیں، ایک مُدّت سے اِسی طرح سیر و سفر کرتے پھرتے ہیں، خانہ بدوش ہیں؛ وہ مثَل ہے: فقیر کو جہاں شام ہوئی، وہیں[1] گھر ہے۔ اور جو کچھ اِس دُنیاے ناپایدار میں دیکھا ہے، کہاں تک بیان کریں۔ آزاد بخت نے بہت تسلّی اور تشفّی کی اور کھانے کو منگوا کر اپنے رُو بہ رُو ناشتا کروایا۔ جب فارغ ہوئے، پھر فرمایا کہ اپنا ماجرا تمام بے کم و کاست مجھ سے کہو۔ جو مجھ سے تمھاری خدمت ہو سکے گی، قُصور نہ کروں گا۔

فقیروں نے جواب دیا کہ ہم پر جو کچھ بیتا ہے، نہ ہمیں بیان کرنے کی طاقت ہے اور نہ بادشاہ کو سُننے[2] سے فرحت ہوگی؛ اِس کو مُعاف کیجے[3]۔ تب بادشاہ نے تبسّم کیا اور کہا: شب کو جہاں تم بستروں پر بیٹھے اپنا اپنا اَحوال کہ رہے تھے، وہاں مَیں بھی موجود تھا، چُناں چہ دُو دَرویش کا اَحوال سُن چکا ہوں؛ اب چاہتا ہوں کہ دونوں جو باقی ہیں، وے بھی کہیں، اور چند روز بہ خاطرِ جمع میرے پاس رہیں کہ قدمِ دَرویشاں رَدِّ بلا ہے۔ بادشاہ سے یہ بات سُنتے ہی، مارے خوف کے کانپنے لگے اور سر نیچے کر کے چُپ ہو رہے؛ طاقت گویائی کی نہ رہی۔

آزاد بخت نے جب دیکھا کہ اب اِن میں مارے رُعب کے حواس[4] نہیں رہے جو کچھ بولیں، فرمایا کہ اِس جہان میں کوئی شخص ایسا نہ ہوگا جس پر ایک نہ ایک وارداتِ عجیب و غریب نہ ہوئی ہوگی۔ باوجودے کہ مَیں بادشاہ ہوں، لیکن مَیں نے بھی ایسا تماشا دیکھا ہے کہ پہلے مَیں ہی اُس کا بیان کرتا ہوں، تم بہ خاطرِ جمع سُنو۔ دَرویشوں نے کہا: بادشاہ سلامت!

آپ کا اَلطاف فقیروں کے حال پر ایسا ہے، اِرشاد فرمائیے۔ آزاد بخت نے اپنا اَحوال شُروع کیا اور کہا:

اَے شاہو! بادشاہ کا اَب ماجرا سُنو
جو کچھ کہ میں نے دیکھا ہے اور ہے سُنا، سُنو
کہتا ہوں میں فقیروں کی خدمت میں سر بسر
اَحوال میرا خوب طرح دل لگا سُنو

میرے قبلہ گاہ نے جب وَفات پائی اور مَیں اِس تخت پر بیٹھا، عینِ عالَم شباب کا تھا اور سارا یہ مُلک رُوم کا میرے حُکم میں تھا۔ اِتّفاقاً ایک سال کوئی سوداگر بَدَخشاں کے مُلک سے آیا اور اَسبابِ تجارت کا بہت سا لایا۔ خبرداروں نے میرے حُضور میں خبر کی کہ ایسا بڑا تاجر آج تک شہر میں نہیں آیا۔ میں نے اُس کو طلب فرمایا۔

وُہ تُحفے ہر ایک مُلک کے لائق میری نذر کے، لے کر آیا۔ فی الواقع ہر ایک جنس بے بہا نظر آئی۔ چُناں چہ ایک ڈبیا میں ایک لعل تھا نہایت خوش رنگ اور آب دار، قد و قامت دُرست اور وَزن میں پانچ مثقال کا۔ میں نے باوُجود سلطنت کے ایسا جواہر کبھو نہ دیکھا تھا اور نہ کسو سے سُنا تھا، پسند کیا۔ سوداگر کو بہت سا اِنعام و اِکرام دیا اور سند راہ داری کی لکھ دی کہ اُس سے ہماری تمام قلمرو میں کوئی مُزاحم محصول کا نہ ہو اور جہاں جاوے، اُس کو آرام سے رکھیں، چوکی پہرے میں حاضر رہیں، اُس کا نقصان اپنا نقصان سمجھیں۔ وُہ تاجر حُضور میں دربار کے وقت حاضر رہتا۔ اور آدابِ سلطنت

سے خوب واقف تھا اور تقریر و خوش گوئی اُس کی لائق سُننے کے تھی۔ اور مَیں اُس لعل کو ہر رُوز جواہِر خانے سے منگواکر سَر دربار دیکھا کرتا۔

ایک رُوز دیوانِ عام کیے بیٹھا تھا اور اُمرا، ارکانِ دولت اپنے اپنے پایے پر کھڑے تھے اور ہر مُلک کے بادشاہوں کے ایلچی، مبارک باد کی خاطِر جو آئے تھے، وُہ بھی سب حاضر تھے؛ اُس وقت میں نے مُوافِق معمول کے اُس لعل کو منگوایا۔ جواہِر خانے کا داروغہ لے کر آیا۔ مَیں ہاتھ میں لے کر تعریف کرنے لگا اور فرنگ کے ایلچی کو دیا۔ اُن نے دیکھ کر تبسّم کیا اور زمانہ سازی سے صِفت کی۔ اِسی طرح ہاتھوں ہاتھ ہر ایک نے لیا اور دیکھا اور ایک زبان ہو کر بولے کہ قبلۂ عالَم کے اِقبال کے باعث یہ مُیسّر ہوا ہے، وَاِلّا کِسُو بادشاہ کے ہاتھ آج تک ایسا رَقم بے بہا نہیں لگا۔ اُس وقت میرے قبلہ گاہ کا وزیر، کہ مردِ دانا تھا اور اُسی خدمت پر سرفراز تھا، وِزارت③ کی چوکی پر کھڑا تھا، آداب بجا لایا اور اِلتماس کیا کہ کچھ عرض کیا چاہتا ہوں اگر جان بخشی④ ہو۔

مَیں نے حُکم کیا کہ کہہ۔ وُہ بولا: قبلۂ عالَم! آپ بادشاہ ہیں اور بادشاہوں سے بہت بعید ہے کہ ایک پتھر کی اِتنی تعریف کریں۔ اگرچہ رنگ، ڈھنگ، سَنگ میں لاثانی ہے، لیکن سَنگ ہے۔ اور اِس دَم سب مُلکوں کے ایلچی دربار میں حاضر ہیں؛ جب اپنے اپنے شہر میں جاویں گے، البتّہ یہ نقل کریں گے کہ عجب بادشاہ ہے کہ ایک لعل کہیں سے پایا ہے، اُسے ایسا تحفہ بنایا ہے کہ ہر رُوز رُوبرو منگاتا ہے اور آپ اُس کی تعریف کر کر سب کو دِکھاتا ہے۔ پس جو بادشاہ

یارا جا یہ احوال سُنے گا، اپنی مجلس میں ہنسے گا۔ خُداوند! ایک ادنیٰ سوداگر نیشا پور میں ہے؛ اُس نے بارہ دانے لعل کے، کہ ہر ایک سات سات مثقال کا ہے، پٹّے میں نصب کر کر کُتّے کے گلے میں ڈال دیے ہیں۔ مجھے سُنتے ہی غُصّہ چڑھ آیا اور کھسیانے ہو کر فرمایا کہ اِس وزیر کی گردن مارو۔

جلّادوں نے وُونہیں اُس کا ہاتھ پکڑ لیا اور چاہا کہ باہر لے جاویں، فرنگ کے بادشاہ کا ایلچی دست بستہ رُو بہ رُو آ کھڑا ہوا۔ میں نے پوچھا کہ تیرا کیا مطلب ہے؟ اُس نے عرض کی: اُمّید وار ہوں کہ تقصیر سے وزیر کی واقف ہوؤں۔ میں نے فرمایا کہ جھوٹھ بولنے سے اور بڑا گُناہ کون سا ہے، خصوصاً بادشاہوں کے رُو بہ رُو؟ اُن نے کہا: اِس کا دُروغ ثابت نہیں ہوا؛ شاید جو کچھ کہ عرض کی ہے، سچ ہو۔ ابھی بے گُناہ کا قتل کرنا دُرست نہیں۔ اُس کا میں نے یہ جواب دیا کہ ہرگز عقل میں نہیں آتا، ایک تاجر کہ نفع کے واسطے شہر بہ شہر اور مُلک بہ مُلک خراب ہوتا پھرتا ہے اور کوڑی کوڑی جمع کرتا ہے؛ بارہ دانے لعل کے، جو وزن میں سات سات مثقال کے ہوں، کُتّے کے پٹّے میں لگا وے۔ اُس نے کہا: خُدا کی قُدرت سے تعجّب نہیں، شاید کہ باشد۔ ایسے تحفے اکثر سوداگروں اور فقیروں کے ہاتھ آتے ہیں، اِس واسطے کہ یہ دونوں ہر ایک مُلک میں جاتے ہیں اور جہاں سے جو کچھ پاتے ہیں، لے آتے ہیں۔ صلاحِ دولت یہ ہے کہ اگر وزیر ایسا ہی تقصیر وار ہے، تو حُکم قید کا ہو؛ اِس لیے کہ وزیر، بادشاہوں کی عقل ہوتے ہیں اور یہ حرکت سلاطینوں سے بدنُما ہے کہ ایسی بات پر، کہ جھوٹھ سچ اُس کا ابھی ثابت نہیں ہوا، حُکم قتل کا فرمائیں اور اُس کی تمام عُمر کی خدمت

اور رنگ خلائی بھول جائیں۔ بادشاہ سلامت! اگلے شہریاروں نے بندی خانہ اِسی سبب ایجاد کیا ہے کہ بادشاہ یا سردار اگر کسو پر غضب ہوں، تو اُسے قید کریں۔ کئی دن میں غصہ جاتا رہے گا اور بے تقصیری اُس کی ظاہر ہو گی؛ بادشاہ خونِ ناحق سے محفوظ رہیں گے، کل کو روزِ قیامت میں ماخوذ نہ ہوئیں گے۔

میں نے جتنا اُس کے قائل کرنے کو چاہا، اُس نے ایسی معقول گفتگو کی کہ مجھے لاجواب کیا۔ تب میں نے کہا کہ خیر، تیرا کہنا پذیرا ہوا، میں خون سے اس کے درگزرا؛ لیکن زندان میں مقید رہے گا۔ اگر ایک سال کے عرصے میں اِس کا سخن راست ہوا، کہ ایسے لعل کُتّے کے گلے میں ہیں، تو اِس کی نجات ہو گی! اور نہیں تو بڑے عذاب سے مارا جاوے گا۔ فرمایا کہ وزیر کو بندی خانے میں لے جاؤ۔ یہ حکم سن کر ایلچی نے زمین خدمت کی چومی اور تسلیمات کی۔

جب یہ خبر وزیر کے گھر میں گئی؛ آہ، واویلا مچا اور ماتم سرا ہو گیا۔ اُس وزیر کی ایک بیٹی تھی برس چودہ پندرہ کی، نہایت خوب صورت اور قابل؛ نوشت خواند میں درست۔ وزیر اُس کو نپٹ پیار کرتا تھا اور عزیز رکھتا تھا، چناں چہ اپنے دیوان خانے کے پچھواڑے ایک رنگ محل اُس کی خاطر بنوا دیا تھا اور لڑکیاں عمدوں کی اُس کی مصاحبت میں، اور خواصیں شکیل خدمت میں رہتیں، اُن سے ہنسی خوشی کھیلا کودا کرتی۔ اتفاقاً جس دن وزیر کو محبوس خانے میں بھیجا، وہ لڑکی اپنی ہمجولیوں میں بیٹھی تھی اور خوشی سے گڑیا کا بیاہ رچایا تھا اور ڈھولک، پکھاوج لیے ہوئے رت جگے کی تیاری کر رہی تھی، اور کڑاہی چڑھا کر گلگلے اور رحم تلتی اور بنا رہی تھی، کہ ایک

باؤگی اُس کی ماں روتی پیٹتی، سر کھُلے پاؤں ننگے، بیٹی کے گھر میں گئی اور دوہتڑ اُس لڑکی کے سر پر ماری اور کہنے لگی: کاش کہ تیرے بدلے خدا اندھا بیٹا دیتا تو میرا کلیجا ٹھنڈا ہوتا اور باپ کا رفیق ہوتا۔ وزیر زادی نے پوچھا: اندھا بیٹا تمھارے کس کام آتا؟ جو کچھ بیٹا کرتا، میں بھی کر سکتی ہوں۔ اَمّاں نے جواب دیا: خاک تیرے سر پر! باپ پر یہ بپتا پڑی ہے کہ بادشاہ کے رُو بہ رُو کچھ ایسی بات کہی کہ بندی خانے میں قید ہوا۔ اُس نے پوچھا: وہ کیا بات تھی؟ ذرا میں بھی سُنوں۔ تب وزیر کے قبیلے نے کہا کہ تیرے باپ نے شاید یہ کہا کہ نیشاپور میں کوئی سوداگر ہے، اُس نے بارہ عدد لعلِ بے بہا کُتّے کے پٹّے میں ٹانکے ہیں۔ بادشاہ کو باور نہ ہوا، اُسے جھوٹھا سمجھا اور اسیر کیا۔ اگر آج کے دن بیٹا ہوتا، تو ہر طرح سے کوشش کر کر اِس بات کو تحقیق کرتا اور اپنے باپ کا اُپرالا کرتا اور بادشاہ سے عرض معروض کر کے میرے خاوند کو بندی خانے سے مخلصی دِلواتا۔ وزیر زادی بولی: اَمّاں جان! تقدیر سے لڑا نہیں جاتا۔ چاہیے انسان بلائے ناگہانی میں صبر کرے اور اُمّید وار فضلِ الٰہی کا رہے۔ وہ کریم ہے، مشکل کسو کی اٹکی نہیں رکھتا۔ اور رونا دھونا خوب نہیں، مبادا دشمن اور طرح سے بادشاہ کے پاس لگا دیں اور لُترے چُغلی کھا دیں، کہ باعث زیادہ خفگی کا ہو! بلکہ جہاں پناہ کے حق میں دُعا کرو۔ ہم اُس کے خانہ زاد ہیں، وہ ہمارا خداوند ہے۔ وہی غضب ہوا ہے، وہی مہربان ہوگا۔

اُس لڑکی نے عقل مندی سے ایسی ایسی طرح ماں کو سمجھایا کہ کچھ اُس کو صبر و قرار آیا، تب اپنے محل میں گئی اور چُپکی ہو رہی۔ جب رات ہوئی، وزیر زادی

نے دادا کو بلایا۔ اُس کے ہاتھ پاؤں پڑی، بہت سی منّت کی اور رونے لگی اور کہا: مَیں یہ ارادہ رکھتی ہوں کہ اَمّا جان کا طعنہ مجھ پر نہ رہے اور میرا باپ مخلصی پاوے۔ جو تو میرا رفیق ہو، تو مَیں نیشاپور کو چلوں اور اُس تاجر کو، جس کے کُتّے کے گلے میں ایسے لعل ہیں، دیکھ کر، جو بن آوے، کر آؤں اور اپنے باپ کو چھڑاؤں۔

پہلے تو اُس مرد نے انکار کیا، آخر بہت کہنے سُننے سے راضی ہوا۔ تب وزیر زادی نے فرمایا: چُپکے چُپکے اَسباب سفر کا دُرست کر اور جنس تجارت کی لائق نذر بادشاہوں کے خرید کر، اور غلام و نوکر چاکر جتنے ضرور ہوں، ساتھ لے؛ لیکن یہ بات کسو پر نہ کھلے۔ دادا نے قبول کیا اور اُس کی تیاری میں لگا۔ جب سب اَسباب مہیّا کیا؛ اونٹوں اور خچّروں پر بار کر کر روانہ ہوا اور وزیر زادی بھی لباسِ مردانہ پہن کر ساتھ جا ملی؛ ہرگز کسو کو گھر میں خبر نہ ہوئی۔ جب صبح ہوئی، وزیر کے محل میں چرچا ہوا کہ وزیر زادی غائب ہے، معلوم نہیں کیا ہوئی۔

آخر بدنامی کے ڈر سے ماں نے بیٹی کا گُم ہونا چھپایا۔ اور وزیر زادی نے اپنا نام سوداگر بچّہ رکھا۔ منزل بہ منزل چلتے چلتے نیشاپور میں پہنچی۔ خوشی بہ خوشی کاروان سرا میں جا اُتری اور سب اپنا اَسباب اُتارا۔ رات کو رہی، فجر کو حمّام میں گئی اور پوشاکِ پاکیزہ ⑨، جیسے رُوم کے باشندے پہنتے ہیں، پہنی اور شہر کی سیر کے واسطے نکلی۔ آتے آتے جب چوک میں پہنچی، چوراہے پر کھڑی ہوئی۔ ایک طرف دُکان جوہری کی نظر پڑی کہ بہت سے جواہر کا ڈھیر لگ رہا ہے اور غلام لباسِ فاخرہ پہنے ہوئے دست بستہ کھڑے ہیں اور ایک شخص جو سردار ہے،

بَرس پچاس ایک کی اُس کی عُمر ہے، طالع مَندوں کی سی خِلعت اور نیمہ آستین
پہنے ہوئے، اور کئی مُصاحِب (۲) باوَضع نزدیک اُس کے کُرسیوں پر بیٹھے ہیں اور
آپس میں باتیں کر رہے ہیں۔

وُہ وَزیر زادی جس نے اپنے تئیں سوداگر بچہ کر مشہور کیا تھا، اُسے دیکھ کر مُتعجّب
ہوئی اور دل میں سمجھ کر خوش ہوئی کہ خُدا جھوٹھ نہ کرے، جس سَوداگر کا میرے
باپ نے بادشاہ سے مَذکور کیا ہے، اَغلَب ہے کہ یہی ہو۔ بارِ خُدایا! اِس کا
اَحوال مجھ پر ظاہر کر۔

اِتّفاقاً ایک طرف جو دیکھا تو ایک دُکان ہے، اُس میں دُو پنجرے آہنی
لٹکتے ہیں اور اُن دونوں میں دُو آدمی قید ہیں۔ اُن کی مجنوں کی سی صورت ہو رہی ہے
کہ چرم و اُستخوان باقی ہے اور سر کے بال اور ناخن بڑھ گئے ہیں، سر اَوندھائے
بیٹھے ہیں اور دُو حَبشی بَد ہیئت، مُسَلّح دونوں طرف کھڑے ہیں۔ سَوداگر بچے
کو اَچنبھا آیا، لاحول پڑھ کر دوسری طرف جو دیکھا تو ایک دُکان میں قالیچے
بچھے ہیں، اُن پر ایک چَوکی ہاتھی دانت کی، اُس پر گدیلا مخمل کا پڑا ہوا؛ ایک
کُتّا جواہر کا پٹّا گلے میں اور سونے کی زنجیر سے بندھا ہوا بیٹھا ہے اور دُو غلام
اَمرَد (۱۰)، خوب صورت اُس کی خدمت کر رہے ہیں: ایک تو مُورچھل جڑاؤ دستے
کا لیے جھلتا ہے اور دوسرا رُومال تار کشی کا ہاتھ میں لے کر مُنہ اور پاؤں اُس
کا پونچھ رہا ہے۔

(۱۱) سوداگر بچے نے خوب غور کر کر جو دیکھا تو پٹّے میں کُتّے کے بارہ مُوں
دانے لعل کے، جیسے سُنے تھے، مَوجود ہیں۔ شُکر خُدا کا کیا اور فکر میں گیا کہ کس

صورت سے اُن لعلوں کو بادشاہ پاس لے جاؤں اور دکھا کر، اپنے باپ کو چھڑاؤں!
یہ تو اس حیرانی میں تھا، اور تمام خلقت چوک اور رستے کی اُس کا حسن (۴) جمال دیکھ کر حیران تھی اور ہکا بکا ہو رہی تھی۔ سب آدمی آپس میں یہ چرچا کرتے تھے کہ آج تلک اِس صورت و شبیہ کا انسان نظر نہیں آیا۔ اُس خواجہ نے بھی دیکھا۔ ایک غلام کو بھیجا کہ تو جا کر بہ منت اُس سوداگر بچے کو میرے پاس بلا لا۔

وہ غلام آیا اور خواجہ کا پیام لایا کہ اگر مہربانی فرمائیے تو ہمارا خداوند صاحب کا مشتاق ہے، چل کر ملاقات کیجئے۔ سوداگر بچہ تو یہ چاہتا ہی تھا، بولا: کیا مضائقہ۔ جونہیں خواجہ کے نزدیک آیا اور اُس پر خواجہ کی نظر پڑی، ایک برچھی عشق کی سینے میں گڑ گئی۔ تعظیم کی خاطر سرو قد اٹھا، لیکن حواس باختہ۔ سوداگر بچے نے دریافت کیا کہ اب یہ دام میں آیا۔ آپس میں بغل گیری ہوئی۔ خواجہ نے سوداگر بچے کی پیشانی کو بوسہ دیا اور اپنے برابر بٹھایا۔ بہت سا تملق کر کے پوچھا کہ اپنے نام و نسب سے مجھے آگاہ کرو، کہاں سے آنا ہوا اور کہاں کا ارادہ ہے؟
سوداگر بچہ بولا کہ اِس کم ترین کا وطن روم ہے اور قدیم سے استنبول زاد بوم ہے۔ میرے قبلہ گاہ (۹) سوداگر ہیں۔ اب بہ سبب پیری کے طاقت سیر و سفر کی نہیں رہی، اس واسطے مجھے رخصت کیا ہے کہ کاروبار تجارت کا سیکھوں۔ آج تلک میں نے قدم گھر سے باہر نہ نکالا تھا، یہ پہلا ہی سفر درپیش ہوا۔ دریا کی راہ ہوا (۱۲) نہ پڑا، خشکی کی طرف سے قصد کیا، لیکن اس عجم کے ملک میں آپ کے اخلاق اور خوبیوں کا جو شور ہے، محض صاحب کی ملاقات کی آرزو

میں یہاں تک آیا ہوں۔ بارے فضلِ الٰہی سے خدمتِ شریف میں مُشرّف ہوا اور اُس سے زیادہ پایا، تمنا دل کی بر آئی، خُدا سلامت رکھے؛ اب یہاں سے کوچ کروں گا۔

یہ سُنتے ہی خواجہ کے عقل و ہُوش جاتے رہے، بولا کہ اَے فرزند! ایسی بات مجھے نہ سُناؤ، کوئی دن غریب خانے میں کرم فرماؤ۔ بھلا یہ تو بتاؤ کہ تمھارا اَسباب اور نوکر چاکر کہاں ہیں؟ سوداگر بچّے نے کہا کہ مُسافر کا گھر سَرا ہے؛ انھیں وہاں چھوڑ کر، میں آپ کے پاس آیا ہوں۔ خواجہ نے کہا کہ بھٹیار خانے میں رہنا مُناسب نہیں؛ میرا اِس شہر میں اِعتبار ہے اور بڑا نام ہے، جلد اُنھیں بُلوا لو۔ میں ایک مکان تمھارے اَسباب کے لیے خالی کر دیتا ہوں۔ جو کچھ جنس لائے ہو، میں دیکھوں؛ ایسی تدبیر کروں گا کہ یہیں تمھیں بہت سا نفع ملے۔ تم بھی خوش ہوگے اور سفر کے ہرج مرج سے بچوگے اور مجھے بھی، چند رُوز رہنے سے، اپنا اِحسان مند کروگے۔ سوداگر بچّے نے اُوپری(۳) دل سے عُذر کیا، لیکن خواجہ نے پذیرا نہ کیا اور اپنے گُماشتے کو فرمایا کہ بار بردار جلد بھیجو اور کاروان سرا سے اِن کا اَسباب منگوا کر فُلانے مکان میں رکھواؤ۔

سوداگر بچّے نے ایک زنگی غُلام کو اُن کے ساتھ کر دیا کہ سب مالِ متاع لدوا کر لے آ، اور آپ شام تلک خواجہ کے ساتھ بیٹھا رہا۔ جب گُذری کا وقت ہو چکا اور دُکان بڑھائی، خواجہ گھر کو چلا؛ تب دونوں غُلاموں میں سے ایک نے کُتّے کو بغل میں لیا، دوسرے نے کُرسی اور قالیچہ اُٹھا لیا، اور اُن دونوں حبشی غُلاموں نے اُس پنجرے کو مزدوروں کے سر پر دَھر دیا اور آپ پانچوں ہتھیار

باندھے ساتھ ہوئے۔ خواجہ، سوداگر بچے کا ہاتھ ہاتھ میں لیے، باتیں کرتا ہوا حویلی میں آیا۔

سوداگر بچے نے دیکھا کہ مکانِ(۲) عالی شان لائق بادشاہوں یا امیروں کے ہے۔ لبِ نہر فرش چاندنی کا بچھا ہے اور مسند کے روبہ رو اسبابِ عیش کا چنا ہے۔ کتے کی صندلی بھی اُسی جگہ بچھائی اور خواجہ، سوداگر بچے کو لے کر بیٹھا۔ بے تکلف تواضع شراب کی کی، دونوں(۳) پینے لگے۔ جب سرخوش ہوئے، تب خواجہ نے کھانا مانگا۔ دسترخوان بچھا(۴) اور دُنیا کی نعمت چُنی گئی۔ پہلے ایک لنگری میں کھانا لے کر، سرپوشِ طلائی ڈھانپ کر کتے کے واسطے لے گئے اور ایک دسترخوان زربفت کا بچھا کر، اُس کے آگے دھر دی۔ کتے نے صندلی سے نیچے اُتر جتنا چاہا، اُتنا کھایا اور سونے(۵) کی لگن میں پانی پیا، پھر چوکی پر جا بیٹھا۔ غلاموں نے رومال سے ہاتھ منہ اُس کا پاک کیا۔ پھر اُس طباق اور لگن کو غلام پنجرے کے نزدیک لے گئے اور خواجہ سے کنجی مانگ کر قفلِ قفس کا کھولا؛ اُن دونوں انسانوں کو باہر نکال کر، کئی سونٹے مار کر، کتے کا جھوٹا(۶) انھیں کھلایا اور وہی پانی پلایا۔ پھر تالا بند کر کر تالی خواجہ کے حوالے کی۔ جب یہ سب ہو چکا، تب خواجہ نے آپ کھانا شروع کیا۔ سوداگر بچے کو یہ حرکت پسند نہ آئی، گھن کھا کر، ہاتھ کھانے میں نہ ڈالا۔ ہر چند خواجہ نے منت کی، پر اُس نے انکار ہی کیا۔ تب خواجہ نے سبب اُس کا پوچھا کہ تم کیوں نہیں کھاتے؟

سوداگر بچے نے کہا: یہ حرکت تمھاری اپنے تئیں بدنما معلوم ہوئی، اس لیے کہ انسان اشرف المخلوقات ہے اور کتا نجس العین ہے، پس

خُدا کے دُو بندوں کو کُتّے کا جھوٹا[10] کھلانا کس مذہب و ملّت میں رَوا ہے؟ فقط یہ غنیمت نہیں جانتے کہ وے تمہاری قید میں ہیں، نہیں تو تم اور وے برابر ہیں۔ اب میرے تئیں شک آئی کہ تم مسلمان نہیں، کیا جانوں کون ہو کہ کُتّے کو پوجتے ہو۔ مجھے تمہارا کھانا کھانا مکرُوہ ہے، جب تلک یہ شُبہہ دل سے دور نہ ہو۔

خواجہ نے کہا: اَے بابا! جو کچھ تو کہتا ہے، میں یہ سب سمجھتا ہوں اور اِسی خاطر بدنام ہوں کہ اِس شہر کی خلقت نے میرا نام "خواجۂ[5] سگ پرست" رکھا ہے۔ اِسی طرح پُکارتے ہیں اور مشہور کیا ہے؛ لیکن خُدا کی لعنت کافروں اور مُشرکوں پر ہوجیو۔ کلمہ پڑھا اور سوداگر بچّے کی خاطر جمع کی۔ تب سوداگر بچّے نے پوچھا کہ اگر مسلمان بہ دِل ہو، تو اس کا کیا باعث ہے کہ ایسی حرکت کرکے اپنے تئیں بدنام کیا ہے؟ خواجہ نے کہا: اَے فرزند! نام میرا بدنام ہے اور دُگنا محصول اِس شہر میں بھرتا ہوں، اِسی واسطے کہ یہ بھید کسو پر ظاہر نہ ہو۔ عجب یہ ماجرا ہے کہ جو کوئی سُنے، سوائے غم اور غُصّے کے اُسے کچھ اور حاصل نہ ہو؛ تو بھی مجھے مُعاف رکھ، کہ نہ مجھ میں قُدرت کہنے کی اور نہ تجھ میں طاقت سُننے کی رہے گی۔ سوداگر بچّے نے اپنے دل میں غور کی کہ مجھے اپنے کام سے کام ہے، کیا ضرور ہے جو ناحق میں[10] زیادہ مُجوّز ہوؤں؛ بولا: خیر، اگر لائق کہنے کے نہیں تو نہ کہیے؛ کھانے میں ہاتھ ڈالا اور نوالہ اُٹھا کر کھانے لگا۔ دُو مہینے تک اِس[11] ہوشیاری اور عقل مندی سے سوداگر بچّے نے خواجہ کے ساتھ گزران کی کہ کسو پر ہرگز نہ کھلا کہ یہ عورت ہے۔ سب یہی جانتے تھے کہ مرد ہے۔ اور خواجہ سے رُوز بہ رُوز ایسی محبّت زیادہ ہوئی کہ ایک دم اپنی[12] آنکھوں

سے جُدا نہ کرتا۔

ایک دن عیش سے خوشی کی صحبت میں سوداگر بچّے نے رونا شروع کیا۔ خواجہ نے دیکھتے ہی خاطِر داری کی اور رُومال سے آنسو پونچھنے لگا اور سبب گریہ کا پوچھا۔ سوداگر بچّے نے کہا: اَے قبلہ! کیا کہوں! کاشکے تمھاری خدمت میں بندگی پیدا نہ کی ہوتی اور یہ شفقت، جو صاحب میرے حق میں کرتے ہیں، نہ کرتے! اب دو مشکلیں میرے پیش آئی ہیں: نہ تمھاری خدمت سے جُدا ہونے کو جی چاہتا ہے اور نہ رہنے کا اتّفاق یہاں ہو سکتا ہے۔ اب جانا ضرور ہوا، لیکن آپ کی جُدائی سے اُمید زندگی کی نظر نہیں آتی۔

یہ بات سُن کر خواجہ بے اختیار ایسا رونے لگا کہ ہچکی بندھ گئی اور بولا کہ اَے نورِ چشم! ایسی جلدی اِس اپنے بوڑھے خادم سے سیر ہوئے کہ اِسے دل گیر کیے جاتے ہو! قصد روانہ ہونے کا دل سے دُور کرو۔ جب تلک میری زندگی ہے، رہو۔ تمھاری جُدائی سے ایک دم میں جیتا نہ رہوں گا، بغیر اَجل کے مر جاؤں گا۔ اور اِس مُلکِ فارس کی آب و ہوا بہت خوب اور موافق ہے۔ بہتر تو یوں ہے کہ ایک آدمی معتبر بھیج کر، اپنے والدین کو مع اسباب یہیں بلوا لو۔ جو کچھ سواری اور بار برداری درکار ہو، میں موجود کروں۔ جب ماں باپ تمھارے اور گھر بار سب آیا، اپنی خوشی سے کاربار تجارت کا کیا کرو۔ میں نے بھی اس عمر میں زمانے کی بہت سختیاں کھینچی ہیں اور مُلک مُلک پھرا ہوں؛ اب بوڑھا ہوا، فرزند نہیں رکھتا؛ میں تجھے بہتر اپنے بیٹے سے جانتا ہوں اور اپنا ولی عہد و مختار کرتا ہوں؛ میرے کارخانے سے بھی ہوشیار

اور خبر دار ہو۔ جب تلک جیتا ہوں، ایک ٹکڑا کھانے کو اپنے ہاتھ سے دو! جب مر جاؤں، گاڑ داب دیجو اور سب مال و متاع میرا لیجو۔

تب سوداگر بچّے نے جواب دیا کہ واقعی صاحب نے زیادہ باپ سے میری غم خواری اور خاطر داری کی کہ مجھے ماں باپ بھول گئے؛ لیکن اس عاصی کے والد نے ایک سال کی رخصت دی تھی؛ اگر دیر لگاؤں گا، تو وے اس پیری میں روتے روتے مر جائیں گے۔ پس رضامندی پدر کی خوشنودی خدا کی ہے۔ اور اگر وہ مجھ سے ناراض ہوں گے، تو میں ڈرتا ہوں کہ شاید دعائے بد نہ کریں، کہ دونوں جہان میں خدا کی رحمت سے محروم رہوں۔ اب آپ کی یہی شفقت ہے کہ بندے کو حکم کیجے کہ فرمانا قبلہ گاہ کا بجا لاوے اور حقِ پدری سے ادا ہووے۔ اور صاحب کی توجّہ کا ادائے شکر، جب تلک دم میں دم ہے، میری گردن پر ہے؛ اگر اپنے ملک میں بھی جاؤں گا، تو ہر دم دل و جان سے یاد کیا کروں گا۔ خدا مسبّب الاسباب ہے، شاید پھر کوئی ایسا سبب ہو کہ قدم بوسی حاصل کروں۔

غرض سوداگر بچّے نے ایسی ایسی باتیں لون مرچیں لگا کر خواجہ کو سنائیں کہ وہ بچارا لاچار ہو کر ہونٹھ چاٹنے لگا۔ از بس کہ اس پر شیفتہ اور فریفتہ ہو رہا تھا، کہنے لگا: اچھا اگر تم نہیں رہتے، تو میں ہی تمھارے ساتھ چلتا ہوں۔ میں تجھ کو اپنی جان کے برابر جانتا ہوں! پس جب جان چلی جاوے، تو خالی بدن کس کام آوے۔ اگر تو اسی میں رضامند ہے، تو چل اور مجھے بھی لے چل۔ سوداگر بچّے سے یہ کہہ کر اپنی بھی تیاری سفر کی کرنے لگا اور گماشتوں کو حکم

گیا کہ بار برداری کی فکر جلدی کرو۔

جب خواجہ کے چلنے کی خبر مشہور ہوئی، وہاں کے سوداگروں نے سُن کر سب نے تہیّہ سفر کا کیا۔ خواجہ سگ پرست گنج اور جواہر بے شمار، نوکر اور غلام اَن گنت، تحفے اور اسباب شاہانہ بہت سا ساتھ لے کر، شہر کے باہر تنبو اور قنات اور بے چوبے اور سراپردے اور گنڈلے کھڑے کروا کر، اُن میں داخل ہوا۔ جتنے تجار تھے، اپنی اپنی بساط موافق مال سوداگری کا لے کر ہمراہ ہوئے۔ بڑا اپنے خود ایک لشکر ہو گیا۔

ایک دن جوگنی کو پیٹھ دے کر وہاں سے کوچ کیا۔ ہزاروں اونٹوں پر شلیتے اسباب کے اور خچروں پر صندوق نقد، جواہر کے لاد کر، پانچ سو غلام دشت قپچاق اور زنگ و روم کے مسلّح، صاحب شمشیر، تازی اور ترکی و عراقی و عربی گھوڑوں پر چڑھ کر چلے۔ سب کے پیچھے خواجہ اور سوداگر بچہ خلعت فاخرہ پہنے، سکھپال پر سوار، اور ایک تخت بغدادی اونٹ پر کسا، اس پر کتا مسند پر سویا ہوا، اور اُن دونوں قیدیوں کے قفس ایک شتر پر لٹکائے ہوئے روانہ ہوئے۔ جس منزل میں پہنچتے، سب سوداگر خواجہ کی بارگاہ میں آکر حاضر ہوتے اور دسترخوان پر کھانا کھاتے اور شراب پیتے۔ خواجہ سوداگر بچے کے ساتھ ہونے کی خوشی میں شکر خدا کا کرتا اور کوچ در کوچ چلا جاتا تھا۔ بارے بہ خیر و عافیت نزدیک قسطنطنیہ کے آپہنچے۔ باہر شہر کے مقام کیا۔ سوداگر بچے نے کہا: اے قبلہ! اگر رخصت دیجے تو میں جاکر ماں باپ کو دیکھوں اور مکان صاحب کے واسطے خالی کروں۔ جب مزاج سامی میں

آوے، شہر میں داخل ہوجیے۔

خواجہ نے کہا: تمھاری خاطر تو میں یہاں آیا! اچھا خیر، جلد مِل جُل کر میرے پاس آؤ اور اپنے نزدیک میرے اُترنے کو مکان دو۔ سوداگر بچّہ رُخصت ہوکر اپنے گھر میں آیا۔ سب وزیر کے محل کے آدمی حیران ہوئے کہ یہ مرد کون گھس آیا! سوداگر بچّہ، یعنے بیٹی وزیر کی، اپنی ماں کے پانو پر جاگری اور رُوئی اور بولی کہ مَیں تمھاری جائی ہوں۔ سُنتے ہی، وزیر کی بیگم گالیاں دینے لگی کہ اَے تتری! تو بڑی ڈِھیٹھ نِکلی! اپنا مُنہ تو نے کالا کیا اور خاندان کو رُسوا کیا! ہم تو تیری جان کو رُوپیٹ کر، صبر کر کے تجھ سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے؛ جا دَفع ہو۔ تب وزیرزادی نے سر پر سے پگڑی اُتار کر پھینک دی اور بولی: اَے اَماجان! مَیں بُری جگہ نہیں گئی، کچھ بدی نہیں کی؛ تمھارے بہ موجب فرمانے کے بابا کو قید سے چھڑانے کی خاطر یہ سب فکر کی۔ اَلحمدُ لِلہ! کہ تمھاری دُعا کی برکت سے اور اللہ کے فضل سے پورا کام کر کے آئی ہوں کہ نیشاپور سے اُس سوداگر کو بہ مع کُتّے، جس کے گلے میں دو لعل پڑے ہیں، اپنے ساتھ لائی ہوں۔ اور تمھاری اَمانت میں بھی خیانت نہیں کی، سفر کے لیے مردانہ بھیس کیا ہے۔ اب ایک روز کا کام باقی ہے؛ وہ کر کر، قبلہ گاہ کو بندی خانے سے چھڑاتی ہوں اور اپنے گھر میں آتی ہوں۔ اگر حکم ہو تو پھر جاؤں اور ایک روز باہر رہ کر خدمت میں آؤں۔ ماں نے جب خوب معلوم کیا کہ میری بیٹی نے مَردوں کا کام کیا اور اپنے تئیں سب طرح سلامت و محفوظ رکھا ہے، خُدا کی درگاہ میں ناک گھِسنی کی اور خوش ہو کر بیٹی کو چھاتی

سے لگا لیا اور مُنہ چوما، بلائیں لیں، دُعائیں دیں اور رُخصت کیا، کہ تو جو مُناسب جانے سو کر، میری خاطر جمع ہوئی۔

وزیر زادی پھر سوداگر بچّہ بن کر خواجہ سگ پرست پاس چلی۔ وہاں خواجہ کو جُدائی اُس کی ازبس کہ شاق ہوئی، بے اختیار ہو کر کوچ کیا۔ اتّفاقاً نزدیک شہر کے ایدھر سے سوداگر بچّہ جاتا تھا اور اُودھر سے خواجہ آتا تھا، عین راہ میں مُلاقات ہوئی۔ خواجہ نے دیکھتے ہی کہا: بابا! مجھ بوڑھے کو اکیلا چھوڑ کر کہاں گیا تھا؟ سوداگر بچّہ بولا: آپ سے اجازت لے کر اپنے گھر گیا تھا، آخر مُلازمت کے اشتیاق نے وہاں رہنے نہ دیا، آکر حاضر ہوا۔ شہر کے دروازے پر، دریا کے کنارے، ایک باغ (۷) سایہ دار دیکھ کر خیمہ اِستادہ کیا اور وہیں اُترے۔ خواجہ اور سوداگر بچّہ باہم بیٹھ کر شراب و کباب پینے کھانے لگے۔ جب عصر کا وقت ہوا، سیر تماشے کی خاطر خیمے سے نکل کر صندلیوں پر بیٹھے۔ اتّفاقاً ایک قراولِ بادشاہی اُدھر آنکلا، اِن کا لشکر اور حشمت (۸) برخاست دیکھ کر اچنبھے (۹) ہو رہا اور دل میں کہا: شاید ایلچی کسو بادشاہ کا آیا ہے۔ کھڑا تماشا دیکھتا تھا۔

خواجہ کے شاطر نے اُس کو آگے بُلایا اور پوچھا کہ تو کون ہے؟ اُس نے کہا: میں بادشاہ کا میر شکار ہوں۔ شاطر نے خواجہ سے اُس کا احوال کہا۔ خواجہ نے ایک غلامِ کافری کو کہا کہ جا کر بازدار سے کہہ کہ ہم مسافر ہیں، اگر جی چاہے تو آؤ بیٹھو، قہوہ، قلیان حاضر ہے۔ جب میر شکار نے نام سوداگر کا سُنا، زیادہ متعجّب ہوا اور تیہیم (۱۰) کے ساتھ خواجہ کی مجلس میں آیا۔ وہ لوازم اور شان و شوکت

اور سپاہ و غُلام دیکھے۔ خواجہ اور سوداگر بچّے کو سلام کیا اور مرتبہ سگ کا نگاہ کیا؛ ہوش اُس کے جاتے رہے، ہکّا بکّا سا ہو گیا۔ خواجہ نے اُسے بٹھلا کر تھوڑے کی ضیافت کی۔ قراوُل نے نام[1] و نشان خواجہ کا پوچھا۔ جب رُخصت مانگی، خواجہ نے کئی تھان اور کچھ تحفے اُسے دے کر اجازت دی۔

صُبح کو جب بادشاہ کے دربار میں حاضر ہوا، درباریوں سے خواجہ سوداگر کا ذِکر کرنے لگا۔ رفتہ رفتہ مجھ کو خبر ہوئی۔ میر شکار کو میں نے رُو بہ رُو طلب کیا اور سوداگر کا اَحوال پوچھا۔ اُس نے جو کچھ دیکھا تھا، عرض کیا۔ سُننے[2] سے کتّے کے تجمّل کے اور دُو آدمیوں کے پنجرے میں قید ہونے کے، مجھ کو خفگی آئی، میں نے فرمایا: وُہ مردُود تاجر واجِبُ القتل ہے۔ نسقچیوں کو حُکم کیا کہ جلد جاؤ، اُس بے دِین کا سر کاٹ لاؤ۔ قضا کار وُہی ایلچی فرنگ کا دربار میں حاضر تھا، مُسکرایا۔ مجھے اور بھی غضب زیادہ ہوا، فرمایا کہ اے بے اَدب! بادشاہوں کے حُضور میں بے سبب دانت کھولنے اَدب سے باہر ہیں۔ بے محل ہنسنے سے رونا بہتر ہے۔ اُس نے اِلتماس کیا: جہاں پناہ! کئی باتیں خیال میں گُزریں، لہٰذا فِدوی متبسّم ہوا: پہلے یہ کہ وزیر سچّا ہے، اب قید خانے سے رِہائی پاوے گا۔ دُوسرے یہ کہ بادشاہ خونِ ناحق سے اُس وزیر کے بچے۔ تیسرے یہ کہ قبلۂ عالم نے بے سبب اور بے تقصیر اُس سوداگر کو حُکم قتل کا کیا؛ اِن حرکتوں سے تعجب آیا کہ بے تحقیق، ایک بے وُقوف کے کہنے سے آپ ہر کِسُو کو حُکم قتل کا کر بیٹھتے ہیں۔ خُدا جانے فی الحقیقت اُس خواجہ کا اَحوال کیا ہے۔ اُسے حُضور میں طلب کیجیے اور اُس کی وارِدات پوچھیے؛ اگر تقصیر وار ٹھہرے، تب مُختار ہو؛ جو مرضی میں آوے،

اُس سے سُلوک کیجیے۔

جب ایلچی نے اِس طرح سے سمجھایا، مجھے بھی وزیر کا کہنا یاد آیا، فرمایا: جلد سوداگر کو اُس کے بیٹے کے ساتھ اور وُہ سگ اور قفس حاضر کرو۔ قُورچی اُس کے بُلانے کو دَوڑائے۔ ایک دَم میں سب کو حضور میں لے آئے۔ رُو بہ رُو طَلَب کیا۔ پہلے خواجہ اور اُس کا پسر آیا، دونوں لِباسِ فاخرہ پہنے ہوئے۔ سوداگر بچّے کا جمال دیکھنے سے سب اَدنا اَعلا حیران اور بھَیچک(۳) ہوئے۔ ایک خوانِ طلائی جواہر سے بھرا ہوا، کہ ہر ایک رقم کی چھوٹ نے سارے مکان کو روشن کر دیا، سوداگر بچّہ ہاتھ میں لیے آیا اور میرے تخت کے آگے بچھا اور کیا۔ آداب، کورنشات بجا لا کر کھڑا ہوا۔ خواجہ نے بھی زمین چومی اور دُعا کرنے لگا۔ اِس گویائی سے بولتا تھا کہ گویا بُلبُلِ ہزار داستان ہے۔ مَیں نے اُس کی لیاقت کو بہت پسند کیا، لیکن عتاب کے رُو(۵) سے کہا: اے شیطان آدمی کی صورت! تو نے یہ کیا جال پھیلایا ہے اور اپنی راہ میں کنوآں کھودا ہے؟ تیرا کیا دین ہے؟ اور یہ کون آئین ہے؟ کس پیغمبر کی اُمّت ہے؟ اگر کافر ہے، تو بھی یہ کیسی مَت ہے؟ اور تیرا کیا نام ہے کہ تیرا یہ کام ہے؟

اُن نے کہا: قبلۂ عالم کی عُمر و دولت بڑھتی رہے!(۷) غلام کا دین یہ ہے کہ خُدا واحد ہے، اُس کا کوئی شریک نہیں اور محمّد مصطفیٰ (صلّی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم) کا کلمہ پڑھتا ہوں، اور اُس کے بعد بارہ امام کو اپنا پیشوا جانتا ہوں۔ اور آئین میری یہ ہے کہ پانچوں وقت کی نماز پڑھتا ہوں اور روزہ رکھتا ہوں اور حج بھی کر آیا ہوں اور اپنے مال سے خُمس، زکوٰۃ دیتا ہوں

اور مسلمان کہاتا ہوں۔ لیکن ظاہر میں یہ سارے عیب جو مجھ میں بھرے ہیں، جن کے سبب سے آپ ناخوش ہوئے ہیں اور تمام خلق اللہ[1] میں بدنام ہو رہا ہوں، اِس کا ایک باعث ہے کہ ظاہر نہیں کر سکتا۔ ہر چند سنگ پرست مشہور ہوں اور مُضاعَف محصول دیتا ہوں؛ یہ سب قبول کیا ہے، پر دل کا بھید کسو سے نہیں کہا۔

اِس بہانے سے میرا غُصّہ زیادہ ہوا اور کہا: مجھے تو باتوں میں بھُسلاتا ہے! مَیں نہیں ماننے کا، جب تلک اِس اپنی گُم راہی کی دلیلِ معقول عرض نہ کرے کہ میرے دل نشیں ہو، تب تو جان سے بچے گا، نہیں تو اِس کے قِصاص میں تیرا پیٹ چاک کرواؤں گا، تو سب کو عبرت ہو کہ بارِ دیگر کوئی دینِ مُحمّدی میں رَخنہ نہ کرے۔ خواجہ نے کہا: اَے بادشاہ! مجھ کم بَخت کے خون سے دَر گُذر کر اور جتنا مال میرا ہے، کہ گِنتی اور شُمار سے باہر ہے، سب کو ضَبط کر لے اور مجھے اور میرے بیٹے کو، اپنے تخت کے تَصدُّق کر کر چھوڑ دے اور جاں بخشی[2] کر۔ مَیں نے تبسُّم کر کے کہا: اَے بے وُقوف! اپنے مال کی طَمَع مجھے دِکھاتا ہے! سِوائے سچ بولنے کے اب تیری مَخلصی نہیں۔ یہ سُنتے ہی خواجہ کی آنکھوں سے بے اِختیار آنسو ٹپکنے لگے اور اپنے بیٹے کی طرف دیکھ کر ایک آہ بھری اور بولا: مَیں تو بادشاہ کے رُو بہ رُو گُنہ گار ٹھہرا، مارا جاؤں گا؛ اب کیا کروں! تجھے کس کو سونپوں! مَیں نے ڈانٹا کہ اَے مکّار! بس اب عُذر بہت کیے؛ جو کہنا ہے، جلد کہہ۔

تب تو اُس مرد نے قدم بڑھا کر، تخت کے پاس آ کر، پایے کو بوسہ دیا اور

صفت و ثنا کرنے لگا اور بولا: اے شہنشاہ! اگر حکم قتل کا میرے حق میں نہ ہوتا، تو سب ریاستیں سہتا اور اپنا ماجرا نہ کہتا؛ لیکن جان سب سے عزیز ہے، کوئی آپ سے گنوئیں میں نہیں گرتا، پس جان کی محافظت واجب ہے اور ترک واجب کا، خلاف حکم خدا کے ہے۔ خیر، جو مرضی مبارک یہی ہے تو سرگذشت[3] اس پیر ضعیف کی سنیے۔ پہلے حکم ہو کہ وہ دونوں قفس، جن میں دو آدمی قید ہیں، حضور میں لاکر رکھیں۔ میں اپنا احوال کہتا ہوں؛ اگر کہیں جھوٹھ کہوں، تو اُن سے پوچھ کر مجھے قائل کیجیے اور انصاف فرمائیے۔ مجھے یہ بات اُس کی پسند آئی۔ پنجروں کو منگوا کر، اُن دونوں کو نکلوا کر خواجہ کے پاس کھڑا کیا۔

خواجہ نے کہا: اے[8] بادشاہ! یہ مرد جو داہنی طرف ہے، غلام کا بڑا بھائی ہے اور جو بائیں کو کھڑا ہے، منجھلا برادر ہے؛ میں ان دونوں سے چھوٹا ہوں۔ میرا باپ ملکِ فارس میں سوداگر تھا۔ جب میں چودہ برس کا ہوا، قبلہ گاہ نے رحلت کی۔ جب تجہیز و تکفین سے فراغت ہوئی اور پھول اٹھ چکے؛ ایک روز ان دونوں بھائیوں نے مجھے کہا کہ اب باپ کا مال جو کچھ ہے، تقسیم کر لیں۔ جس کا دل جو چاہے، سو کام کرے۔ میں نے سن کر کہا: اے بھائیو! یہ کیا بات ہے! میں تمھارا غلام ہوں، بھائی چارگی[11] کا دعویٰ نہیں رکھتا۔ ایک باپ مر گیا، تم دونوں میرے پدر کی جگہ میرے سر پر قائم ہو۔ ایک نانِ خشک چاہتا ہوں جس میں زندگی بسر کروں اور تمھاری خدمت میں حاضر رہوں؛ مجھے حصے بخرے سے کیا کام ہے! تمھارے آگے کے جھوٹے سے اپنا پیٹ بھر لوں گا اور تمھارے پاس رہوں گا۔ میں لڑکا ہوں،

کچھ پڑھا لکھا بھی نہیں، مجھ سے کیا ہو سکے گا! ابھی تم مجھے تربیت کرو۔

یہ سُن کر جواب دیا کہ تو چاہتا ہے اپنے ساتھ ہمیں بھی خراب اور مُحتاج کرے۔ مَیں چُپکا ایک گوشے میں جاکر رونے لگا۔ پھر دل کو سمجھایا کہ بھائی آخر بُزُرگ ہیں، میری تعلیم کی خاطر چشم نمائی کرتے ہیں کہ کچھ سیکھے۔ اِسی فکر میں سو گیا۔ صُبح کو ایک پیادہ قاضی کا آیا اور مجھے دارُالشَّرع میں لے گیا۔ وہاں دیکھا تو یہی دونوں بھائی حاضر ہیں۔ قاضی نے کہا: کیوں اپنے باپ کا وِرثہ (۱) بانٹ چونٹ نہیں لیتا؟ میں نے گھر میں جو کہا تھا (۲)، وہاں بھی جواب دیا۔ بھائیوں نے کہا: اگر یہ بات اپنے دل سے کہتا ہے، تو ہمیں لادعویٰ لکھ دے کہ باپ کے مال (۳) و اَسباب سے مجھے کچھ علاقہ نہیں۔ تب بھی میں نے یہی سمجھا کہ یہ دونوں (۴) میرے بُزُرگ ہیں، میری نصیحت کے واسطے کہتے ہیں کہ باپ کا مال لے کر بے جا تصرُّف نہ کرے۔ بہ مُوجِب اِن کی مرضی کے فارغ خطی بہ مُہرِ قاضی میں نے لکھ دی۔ یہ راضی ہوئے، مَیں گھر میں آیا۔

دوسرے دن مجھ سے کہنے لگے: اَے بھائی! یہ مکان جس میں تو رہتا ہے، ہمیں درکار ہے؛ تو اپنی بود (۵) و باش کی خاطر اَور جگہ لے کر جا رہ۔ تب میں نے دریافت کیا کہ یہ باپ کی حویلی میں بھی رہنے سے خوش نہیں۔ لاچار اِرادہ اُٹھ جانے کا کیا۔ جہاں پناہ! جب میرا باپ جیتا تھا، تو جس وقت (۶) سفر سے آتا، ہر ایک مُلک کا تحفہ بہ طریق سوغات کے لاتا اور مجھے دیتا؛ اِس واسطے کہ چھوٹے بیٹے کو ہر کوئی زیادہ پیار کرتا ہے۔ میں نے اُن کو بیچ (۷) بیچ کر تھوڑی سی اپنی خرچ کی پونجی بہم پہنچائی تھی، اُسی (۸) سے کچھ خرید فروخت

کرتا۔ ایک بار لونڈی میری خاطر ترکستان سے میرا باپ لایا۔ اور ایک دفعہ گھوڑے لے کر آیا، ان میں سے ایک بچھیرا ناکند، کہ ہونہار تھا، وہ بھی مجھے دیا۔ میں اپنے پاس سے دانہ گھاس اس کا کرتا تھا۔

آخر ان کی بے مروتی دیکھ کر ایک حویلی خرید کی، وہاں جا رہا۔ یہ کتا بھی میرے ساتھ چلا آیا۔ واسطے ضروریات کے اسباب خانہ داری کا جمع کیا اور دو غلام خدمت کی خاطر مول لیے اور باقی پونجی سے ایک دکان[3] بزازی کی کر کے، خدا کے توکل پر بیٹھا۔ اپنی قسمت پر راضی تھا۔ اگرچہ بھائیوں نے بد خلقی کی، پر خدا جو مہربان ہوا، تین برس کے عرصے میں ایسی دکان جمی کہ میں صاحب(۶) اعتبار ہوا۔ سب سرکاروں میں، جو تحفہ چاہیتا(۷)، میری ہی دکان(۸) سے جاتا۔ اس میں بہت سے روپے کمائے اور نہایت فراغت سے گزرنے لگی۔ ہر دم جناب(۹) باری میں شکرانہ کرتا اور آرام سے رہتا۔ یہ کبت اکثر اپنے احوال پر پڑھتا:

روٹھے کیوں نہ راجا، داتیں کچھ ناہیں کاجا، ایک تو سے مہاراجا، اور کون کو سراہیے
روٹھے کیوں نہ بھائی، داتیں کچھ نہ بسائی، ایک تو ہی ہے سہائی، اور کون پاس جائیے
روٹھے کیوں نہ متر، شترو، آٹھوں جام ایک راورے بچن کے ٹیک کو نبھائیے
سنسار ہے روٹھا، ایک تو ہے انوٹھا، سب چھوٹیں گے انگوٹھا، ایک تو نہ روٹھا چاہیے(۱۱)

اتفاقاً جمعے کے روز میں اپنے گھر[12] بیٹھا تھا کہ ایک غلام میرا سودے سلف کو بازار گیا تھا، بعد ایک دم کے روتا ہوا آیا۔ میں نے سبب پوچھا کہ تجھے کیا ہوا؟ خفا ہو کر بولا کہ تمھیں کیا کام ہے، تم خوشی مناؤ، لیکن قیامت

میں کیا جواب دوگے؟ میں نے کہا: اَے حَبشی! ایسی کیا بلا تجھ پر نازل ہوئی؟ اُس نے کہا: یہ غضب ہے کہ تمھارے بڑے بھائیوں کی، چوک کے چوراہے میں، ایک یہودی نے مُشکیں باندھی ہیں اور قمچیاں مارتا ہے اور ہنستا ہے کہ اگر میرے روپے نہ دوگے، تو مارتے مارتے مار ہی ڈالوں گا، بھلا مجھے ثواب تو ہوگا۔ پس تمھارے بھائیوں کی یہ نوبت اور تم بے فکر ہو: یہ بات اچھی ہے؟ لوگ کیا کہیں گے؟ یہ بات غلام سے سنتے ہی لہو نے جوش کیا، ننگے پاؤں بازار کی طرف دوڑا اور غلاموں کو کہا: جلد روپے لے کر آؤ۔ جونہیں وہاں گیا، دیکھا تو جو کچھ غلام نے کہا تھا، سچ ہے، ان پر مار پڑ رہی ہے۔ حاکم کے پیادوں کو کہا: واسطے خدا کے! ذرا رہ جاؤ، میں یہودی سے پوچھوں کہ ایسی کیا تقصیر کی ہے، جس کے بدلے یہ تعزیر کی ہے۔

یہ کہہ کر میں یہودی کے نزدیک گیا اور کہا: آج روزِ آدینہ ہے، ان کو کیوں ضربِ شلاق کر رہا ہے؟ اُس نے جواب دیا: اگر حمایت کرتے ہو تو پوری کرو، ان کے عوض روپے حوالے کرو، نہیں تو اپنے گھر کی راہ لو۔ میں نے کہا: کیسے روپے! دستاویز نکال، میں روپے گن دیتا ہوں۔ اُن نے کہا: تمسک حاکم کے پاس دے آیا ہوں۔ اِس میں میرے دونوں غلام دو بدرہ روپے لے کر آئے۔ ہزار روپئے میں نے یہودی کو دیے اور بھائیوں کو چھڑا لیا۔ ان کی یہ صورت ہو رہی تھی کہ بدن سے ننگے اور بھوکے پیاسے۔ اپنے ہمراہ گھر میں لایا، وہیں حمام میں نہلوایا، نئی پوشاک پہنائی، کھانا کھلایا۔ ہرگز ان سے یہ نہ کہا کہ اتنا مال

باپ کا تم نے کیا کیا، شاید شرمندہ ہوں۔

اے بادشاہ! بیٹے دونوں موجود ہیں، پوچھیے کہ سچ کہتا ہوں یا کوئی بات جھوٹ بھی ہے۔ خیر، جب کئی دن میں مار کی کوفت سے بحال ہوئے، ایک روز میں نے کہا کہ اے بھائیو! اب اس شہر میں تم بے اعتبار ہو گئے ہو، بہتر یہ ہے کہ چند روز سفر کرو۔ یہ سن کر چپ ہو رہے۔ میں نے معلوم کیا کہ راضی ہیں، سفر کی تیاری کرنے لگا۔ پال، پرتل، باربرداری اور سواری کی فکر کر کے، بیس ہزار روپیہ کی جنس تجارت کی خرید کی۔ ایک قافلہ سوداگروں کا بخارے کو جاتا تھا، اُن کے ساتھ کر دیا۔

بعد ایک سال کے وہ کارواں پھر آیا، ان کی خیر خبر کچھ نہ پائی۔ آخر ایک آشنا سے قسمیں دے کر پوچھا۔ اس نے کہا: جب بخارے میں گئے، ایک نے جوئے خانے میں اپنا تمام مال ہار دیا؛ اب وہاں کی جاروب کشی کرتا ہے اور پھڑ کو لیپتا پوتتا ہے۔ جواری جو جمع ہوتے ہیں، اُن کی خدمت کرتا ہے؛ وہ بطریق خیرات کے کچھ دیتے ہیں، وہاں گرا پڑا رہتا ہے۔ اور دوسرا بوزہ فروش کے لڑکے پر عاشق ہوا، اپنا مال سارا صرف کیا؛ اب وہ (٦) بوزے خانے کی ٹہل (٧) کیا کرتا ہے۔ قافلے کے آدمی اِس لیے نہیں کہتے کہ تو شرمندہ ہوگا۔

یہ احوال اس شخص سے سن کر میری عجب حالت ہوئی۔ مارے فکر کے نیند، بھوک جاتی رہی۔ زادِ راہ لے کر قصد بخارے کا کیا۔ جب وہاں پہنچا، دونوں کو ڈھونڈھ ڈھانڈھ کر اپنے مکان میں لایا۔ غسل کروا کر نئی پوشاک

پہنائی اور اِن کی خجالت کے ڈر سے ایک بات مُنہ پر نہ رکھی۔ پھر مال سوداگری کا اِن کے واسطے خریدا اور ارادہ گھر کا کیا۔ جب نزدیک نیشاپور کے آیا، ایک گانو میں مع مال اسباب اِن کو چھوڑ کر گھر میں آیا، اِس لیے کہ میرے آنے کی کسو کو خبر نہ ہو۔ بعد دو دن کے مشہور کیا کہ میرے بھائی سفر سے آئے ہیں، کل اُن کے استقبال کی خاطر جاؤں گا۔ صبح کو چاہا کہ چلوں، ایک گرہست اُسی موضع کا میرے پاس آیا اور فریاد کرنے لگا۔ میں اُس کی آواز سُن کر باہر نکلا۔ اُسے روتا دیکھ کر پوچھا کہ کیوں زاری کرتا ہے؟ وہ بولا: تمھارے بھائیوں کے سبب سے ہمارے گھر لوٹے گئے۔ کاشکے اُن کو تم وہاں نہ چھوڑ آتے!

میں نے پوچھا: کیا مصیبت گزری؟ بولا کہ رات کو ڈاکا آیا، اُن کا مال و اسباب لوٹا اور ہمارے گھر بھی لوٹ لے گئے۔ میں نے افسوس کیا اور پوچھا کہ اب وے دونوں کہاں ہیں؟ کہا: شہر کے باہر ننگے مُنگے، خراب خستہ بیٹھے ہیں۔ وونہیں دو جوڑے کپڑوں کے ساتھ لے کر گیا، پہنا کر گھر میں لایا۔ لوگ سُن کر اِن کے دیکھنے کو آتے تھے اور یے مارے شرمندگی کے باہر نہ نکلتے تھے۔ تین مہینے اِسی طرح گزرے، تب میں نے اپنے دل میں غور کی کہ کب تلک یہ کونے میں دبکے بیٹھے رہیں گے۔ بہتر تو اِن کو اپنے ساتھ سفر میں لے جاؤں۔ بھائیوں سے کہا: اگر فرمائیے تو یہ فدوی آپ کے ساتھ چلے۔ یے خاموش رہے۔ پھر لوازمہ سفر کا اور جنس سوداگری کی تیار کر کے چلا اور اِن کو ساتھ لیا۔

جس وقت مال کی زکوٰۃ دے کر اسباب کشتی پر چڑھایا اور لنگر اُٹھایا،

ناؤ چلی(۱)، یہ کتّا کنارے پر سو رہا تھا، جب چونکا اور جہاز کو مانجھ دھار(۲) میں دیکھا
حیران ہو کر بھونکا اور دریا میں کود پڑا اور پیرنے لگا۔ میں نے ایک پن سوئی(۳)
دوڑا دی۔ بارے سگ کو لے کر کشتی میں پہنچایا۔ ایک مہینا(۴) خیر و عافیت
سے دریا میں گزرا۔ کہیں منجھلا بھائی میری لونڈی پر عاشق ہوا، ایک دن بڑے
بھائی سے کہنے لگا کہ چھوٹے بھائی کی منّت اٹھانے سے بڑی شرمندگی حاصل
ہوئی، اس کا تدارک کیا کریں؟ بڑے نے جواب دیا کہ ایک صلاح دل میں
ٹھہرائی ہے، اگر بن آوے تو بڑی بات ہے۔ آخر دونوں نے مصلحت کر کے
تجویز کی کہ اسے مار ڈالیں اور سارے مال اسباب(۵) کے قابض متصرّف(۶) ہوں۔
ایک دن میں جہاز کی کوٹھری میں سوتا تھا اور لونڈی پانو(۷) داب رہی تھی،
منجھلا بھائی آیا اور جلدی سے مجھے جگایا۔ میں ہڑبڑا کر چونکا اور باہر نکلا۔ یہ کتّا
بھی میرے ساتھ ہو لیا۔ دیکھوں تو بڑا بھائی جہاز کی باڑ(۸) پہ ہاتھ ٹیکے،
کھڑا ہوا، تماشا دریا کا دیکھ رہا ہے اور مجھے پکارتا ہے۔ میں نے پاس جا کر
کہا: خیر تو ہے؟ بولا: عجب طرح کا تماشا ہو رہا ہے کہ دریائی آدمی موتی کی
سیپیاں اور مونگے کے درخت ہاتھ میں لیے ناچتے ہیں۔ اگر اور کوئی ایسی بات
خلافِ قیاس کہتا تو میں نہ مانتا، بڑے بھائی کے کہنے کو راست جانا، دیکھنے کو
سر جھکایا۔ ہر چند نگاہ کی، کچھ نظر نہ آیا اور وہ یہی کہتا رہا: اب دیکھا؟ لیکن
کچھ ہو تو دیکھوں۔ اس میں مجھے غافل پا کر، منجھلے نے اچانک پیچھے آ کر ایسا
دھکیلا(۱۰) کہ بے اختیار پانی میں گر پڑا، اور وہ روتے ڈھونے لگے کہ دوڑیو! ہمارا
بھائی دریا میں ڈوبا۔

اِستے میں ناؤ بڑھ گئی⁽¹⁾ اور دریا کی لہر مجھے کہیں سے کہیں لے گئی۔ غوطے پر غوطے کھاتا تھا اور موجوں میں چلا جاتا تھا⁽²⁾ آخر تھک گیا۔ خدا کو یاد کرتا تھا، کچھ بس نہ چلتا تھا۔ ایک بارگی کسو چیز پر ہاتھ پڑا، آنکھ کھول کر دیکھا تو یہی کتا ہے۔ شاید جس دم مجھے دریا میں ڈالا، میرے ساتھ یہ بھی کودا اور پیرتا ہوا میرے ساتھ بہتا چلا جاتا تھا۔ میں نے اِس کی دم پکڑ لی۔ اللہ نے اِس کو میری زندگی کا سبب کیا۔ سات دن اور رات یہی صورت گزری، آٹھویں دن کنارے جا لگے۔ طاقت مطلق نہ تھی، لیٹے لیٹے کروٹیں کھا کر جوں توں اپنے تئیں خشکی میں ڈالا۔ ایک دن بے ہوش پڑا رہا۔ دوسرے دن کتے کی آواز کان میں گئی، ہوش میں آیا، خدا کا شکر بجا لایا، اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ دور سے سوادِ شہر نظر پڑا، لیکن قوت کہاں کہ ارادہ کروں؟ لاچار دو قدم چلتا، پھر بیٹھتا۔ اِسی حالت سے شام تک کوس بھر راہ کاٹی۔ بیچ میں ایک پہاڑ ملا، رات کو وہاں گر رہا۔ صبح کو شہر میں داخل ہوا۔ جب بازار میں گیا، نان بائی اور حلوائیوں کی دکانیں نظر آئیں، دل ترسنے لگا۔ نہ پاس پیسا⁽³⁾ جو خرید کروں، نہ جی چاہے کہ مفت مانگوں۔ اِسی طرح اپنے دل کو تسلی دیتا ہوا کہ اگلی دکان سے لوں گا، چلا جاتا تھا۔ آخر طاقت نہ رہی اور پیٹ میں آگ لگی، نزدیک تھا کہ روح بدن سے نکلے؛ ناگاہ دو جوان کو دیکھا کہ لباس عجم کا پہنے اور ہاتھ پکڑے چلے آتے ہیں۔ اِن کو دیکھ کر خوش ہوا کہ یہ اپنے ملک کے انسان ہیں، شاید آشنا صورت ہوں، اِن سے اپنا احوال کہوں گا۔ جب نزدیک آئے، تو میرے دونوں برادرِ حقیقی تھے۔ دیکھ کر نپٹ

شاد ہوا، شکر خدا کا کیا کہ خدا نے آبرو رکھ لی، غیر کے آگے ہاتھ نہ پسارا۔ نزدیک جا کر سلام کیا اور بڑے بھائی کا ہاتھ چوما۔ اُنھوں نے مجھے دیکھتے ہی غُل[٢] و شور کیا۔ منجھلے بھائی نے طمانچہ[٤] مارا کہ میں لڑکھڑا کر گر پڑا۔ بڑے بھائی کا دامن پکڑا کہ شاید یہ حمایت کرے گا، اُس نے لات ماری۔

غرض دونوں نے مجھے خوب خورد خام[٧] کیا اور حضرت یوسف کے بھائیوں کا سا کام کیا۔ ہر چند میں نے خدا کے واسطے دیے اور گھگھیایا، ہرگز رحم نہ کھایا۔ ایک خلقت اکٹھی ہوئی، سب نے پوچھا: اِس کا کیا گناہ ہے؟ تب بھائیوں نے کہا: یہ حرام زادہ ہمارے بھائی کا نوکر تھا، سو اُس کو دریا میں ڈال دیا اور مال اسباب سب لے لیا۔ ہم مدت سے تلاش میں تھے، آج اِس صورت سے نظر آیا۔ اور مجھ سے پوچھتے تھے کہ اے ظالم! یہ کیا تیرے دل میں آیا کہ ہمارے بھائی کو مار کھپایا! کیا اُس نے تیری تقصیر کی تھی! اُن نے تجھ سے کیا برا سلوک کیا تھا کہ اپنا مختار بنایا تھا! پھر اِن دونوں نے اپنے گریبان چاک کر ڈالے اور بے اختیار جھوٹھ[١٠] موٹھ بھائی کی خاطر روتے تھے اور لات مکی مجھ پر کرتے تھے۔

اِس میں حاکم کے پیادے آئے، اِن کو ڈانٹا کہ کیوں مارتے ہو، اور میرا ہاتھ پکڑ کر کوتوال کے پاس لے گئے۔ یے دونوں بھی ساتھ چلے اور حاکم سے بھی یہی کہا اور بہ طور رشوت کے کچھ دے کر اپنا انصاف چاہا اور خون ناحق کا دعوی کیا۔ حاکم نے مجھ سے پوچھا۔ میری یہ حالت تھی کہ مارے بھوک کے اور مار پیٹ کے طاقت گویائی کی نہ تھی؛ سر نیچے کیے کھڑا تھا،

کچھ مُنہ سے جواب نہ نکلا۔ حاکم کو بھی یقین ہوا کہ یہ مقرّر خونی ہے، فرمایا کہ اِسے میدان میں لے جا کر سُولی دو۔ جہاں پناہ! میں نے روپے دے کر ان کو یہودی کی قید سے چھڑایا تھا، اُس کے عوض انھوں نے بھی روپے خرچ کرکے میری جان کا قصد کیا۔ یہ دونوں حاضر ہیں، اِن سے پوچھیے کہ میں اِس میں سرِ مُو تفاوت کہتا ہوں؟

خیر، مجھے لے گئے۔ جب دار کو دیکھا، ہاتھ زندگی سے دُھوئے۔ سوائے اِس کُتّے کے کوئی میرا رونے والا نہ تھا۔ اِس کی یہ حالت تھی کہ ہر ایک آدمی کے پانو میں لوٹتا اور چِلّاتا تھا۔ کوئی لکڑی، کوئی پتھر سے مارتا، لیکن یہ اُس جگہ سے نہ سرکتا۔ اور میں رُو بہ قبلہ کھڑا ہوا خُدا کو کہتا تھا کہ اِس وقت میں تیری ذات کے سوا میرا کوئی نہیں جو آڑے آوے اور بے گناہ کو بچا دے۔ اب تو ہی بچاوے تو بچتا ہوں۔ یہ کہ کر، کلمۂ شہادت کا پڑھ کر تیورا کر گر پڑا۔ خُدا کی حکمت سے اُس شہر کے بادشاہ کو قولنج کی بیماری ہوئی۔ اُمرا اور حکیم جمع ہوئے۔ جو عِلاج کرتے تھے، فائدہ مند نہ ہوتا تھا۔ ایک بُزرگ نے کہا کہ سب سے بہتر یہ دوا ہے کہ محتاجوں کو کچھ خیرات کرو اور بندی والوں کو آزاد کرو۔ دوا سے دُعا میں بڑا اثر ہے۔ وُونہیں بادشاہی چیلے پنڈت خانوں کی طرف دوڑے۔

اتفاقاً ایک اُس میدان میں آنکلا۔ اِزدحام دیکھ کر معلوم کیا کہ کسو کو سُولی چڑھاتے ہیں۔ یہ سُنتے ہی، گھوڑے کو دار کے نزدیک لاکر، تلوار سے طنابیں کاٹ دیں۔ حاکم کے پیادوں کو ڈانٹا اور تنبیہ کی کہ ایسے وقت میں

کہ بادشاہ کی یہ حالت ہے، تم خدا کے بندے کو قتل کرتے ہو! اور مجھے چھڑوا
دیا۔ تب یہ دونوں بھائی پھر حاکم کے پاس گئے اور میرے قتل کے واسطے
کہا۔ شحنے* نے تو رشوت کھائی تھی، جو یہ کہتے تھے، سو کرتا تھا۔ کوتوال
نے ان سے کہا کہ خاطر جمع رکھو؛ اب میں اسے ایسا قید کرتا ہوں کہ آپ سے
آپ، مارے بھوکھوں کے بے آب و دانہ مر جاوے، کسو کو خبر نہ ہووے۔
مجھے پکڑ لائے اور ایک گوشے میں رکھا۔ اس شہر سے باہر کوس ایک پر
ایک پہاڑ تھا کہ حضرت سلیمان کے وقت میں (۲) دیووں نے ایک کنواں
تنگ و تاریک اس میں کھودا تھا، اس کا نام "زندانِ سلیمان" کہتے تھے۔
جس پر بڑا غضب بادشاہی ہوتا، اسے وہاں محبوس کرتے، وہ خود بہ خود مر جاتا۔
القصہ رات کو چپکے سے دونوں بھائی اور کوتوال کے ڈنڈے (۴) نے مجھے اس
پہاڑ پر لے گئے اور اس غار میں ڈال کر، اپنی خاطر جمع کر کے پھرے۔

اے بادشاہ! یہ کتا میرے ساتھ چلا گیا۔ جب مجھے کنوئیں میں گرایا، تب
یہ اس (۶) کے مینڈ پر لیٹ رہا۔ میں اندر بے ہوش پڑا تھا۔ ذرا سرت* آئی تو
میں (۸) اپنے تئیں مردہ خیال کیا اور اس مکان کو گور سمجھا۔ اس میں دو شخصوں
کی آواز کان میں پڑی کہ کچھ آپس میں باتیں کرتے ہیں؛ یہی (۹) معلوم کیا کہ
نکیر منکر* ہیں، مجھ سے سوال کرنے آئے ہیں۔ سرسراہٹ* رسی کی سنی،
جیسے کسو نے وہاں لٹکائی۔ میں حیرت میں تھا۔ زمین کو ٹٹولتا تو ہڈیاں ہاتھ
میں آتیں۔ بعد ایک ساعت کے آواز چپڑ چپڑ منہ چلانے کی میرے کان
میں آئی، جیسے کوئی کچھ کھاتا ہے۔ میں نے پوچھا کہ اے خدا کے بندو! تم

کون ہو؟ خُدا کے واسطے بتاؤ! وُہ ہنسے اور بولے: یہ زِنْدان مِہتر سُلَیمان کا ہے اور ہم قیدی ہیں۔ میں نے اُن سے پوچھا: کیا میں جیتا ہوں؟ پھر کِھلکِھلا کر ہنسے اور کہا: اب تلک تُو تو زندہ ہے، پَر اب مرے گا۔ میں نے کہا، تُم جو کھاتے ہو، کیا ہو جو مجھے بھی تھوڑا سا دو! تب جُھنجلا کر خالی جواب دیا اور کچھ نہ دیا۔ وُہ کھا پی کر سو رہے، مَیں مارے ضُعف و ناتوانی کے غَش میں پڑا رُوتا تھا اور خُدا کو یاد کرتا تھا۔ قبلۂ عالَم! سات دن دریا میں اور اِتنے دن بھائیوں کے بُہتان کے سبب دانہ نہ مُیسّر آیا۔ عِلاوہ، کھانے کے بدلے مار پیٹ کھائی اور ایسے (۳) زِندان میں پھنسا کہ صورت رِہائی کی مُطلَق خیال میں بھی نہ آتی تھی۔

آخر جاں (۴) کَنْدَنی کی نَوبت پہنچی۔ کبھو دَم آتا، کبھو نِکل جاتا تھا۔ لیکن کبھو کبھو آدھی رات کو ایک شخص آتا اور رومال میں روٹیاں اور پانی کی صُراحی ڈوری میں باندھ کر لٹکا دیتا اور پُکارتا۔ وُہ دونوں آدمی جو میرے پاس محبوس تھے، لے لیتے اور کھاتے پیتے۔ اُوپر سے کُتّے نے ہمیشہ یہ اَحوال دیکھتے دیکھتے عقل دوڑائی کہ جس طرح یہ شخص آب (۵) و نان کُنوئیں میں لٹکا دیتا ہے، تو بھی ایسی فِکر کر کہ کچھ اُس بے کس کو، جو میرا خاوِند ہے، آذُوقہ پہنچے، تو اُس کا دَم بچے۔ یہ خیال کر کے شہر میں گیا۔ نان بائی کی دُکان میں مُنبر پر گِردے چُنے ہوئے دَھرے تھے؛ جَست مار کر ایک کُلچہ مُنہ میں لیا اور بھاگا۔ لوگ پیچھے دوڑے، ڈھیلے مارتے تھے، لیکن اُس نے نان کو نہ چھوڑا۔ آدمی تھک کر پھرے۔ شہر کے کُتّے پیچھے لگے؛ اُن سے لڑتا بھِڑتا، روٹی کو بچائے، اُس چاہ پر آیا اور نان کو اندر ڈال دیا۔ (۸) روزِ روشن تھا؛ میں نے روٹی کو اپنے پاس پڑا دیکھا اور کُتّے کی آواز

سُنی، کلیجے کو اُٹھالیا۔ اور یہ کتّا روٹی پھینک کر، پانی کی تلاش میں گیا۔

کسی گانو کے کنارے ایک بڑھیا کی جھونپڑی تھی۔ ٹھلیا اور بدھنا پانی سے بھرا ہوا دھرا تھا اور وہ پیرزن چرخا[۲] کاتتی تھی۔ کتّا کوزے کے نزدیک گیا، چاہا کہ لوٹے کو اُٹھا دے، عورت نے ڈانٹا۔ لوٹا اُس کے منھ سے چھوٹا، گھڑے پر گرا۔ مٹکا پھوٹا، باقی باسن لڑھ گئے، پانی بہ چلا۔ بڑھیا لکڑی لے کر مارنے کو اُٹھی۔ یہ تنگ اُس کے دامن میں لپٹ گیا، اُس کے پانو[۳] پر منھ ملنے اور دُم ہلانے لگا اور پہاڑ کی طرف دوڑ گیا، پھر اُس کے پاس آکر کبھو رسّی اُٹھاتا، کبھو ڈول منھ میں پکڑ کر دکھاتا اور منھ اُس کے قدموں پر رگڑتا اور آنچل چادر کا پکڑ کر کھینچتا۔ خدا نے اُس عورت کے دل میں رحم دیا کہ ڈول رسّی کو لے کر اس کے ہمراہ چلی۔ یہ اُس کا آنچل پکڑے گھر سے باہر ہو کر آگے آگے ہو لیا۔

آخر اُس کو پہاڑی[۴] پر لے آیا۔ عورت کے جی میں کتّے کی اس حرکت سے اِلہام ہوا کہ اس کا میاں مقرّر[۵] اس غار میں گرفتار ہے، شاید اُس کی خاطر پانی چاہتا ہے۔ غرض پیرزن کو لیے ہوئے غار کے منھ پر آیا۔ عورت نے لوٹا پانی کا بھر کر رسّی سے لٹکایا۔ میں نے وہ باسن لے لیا، اور نان کا ٹکڑا کھایا، دو تین گھونٹ پانی پیا، اِس پیٹ کے کتّے کو راضی کیا۔ خدا کا شکر کر کر ایک کنارے بیٹھا اور خدا کی رحمت کا منتظر تھا کہ دیکھیے اب کیا ہوتا ہے۔

یہ حیوانِ[۶] بے زبان اِسی طور سے نان لے آتا اور بڑھیا کے ہاتھ پانی پلواتا۔ جب بھٹیاروں[۷] نے دیکھا کہ کتّا ہمیشہ روٹی لے جاتا ہے، ترس کھا کر مقرّر کیا کہ جب اسے دیکھتے، ایک گردا[۸] اس کے آگے پھینک دیتے۔ اور اگر وہ عورت

پانی نہ لاتی، تو یہ کُتّا اُس کے باسن پھوڑ ڈالتا؛ لاچار وُہ بھی ہر رُوز ایک صُراحی پانی کی دے جاتی۔ اِس رفیق نے آب[1] و نان سے میری خاطر جمع کی اور آپ زِندان کے مُنْہ پر پڑا رہتا۔ اِس طَرح چھَ[2] مہینے گزرے۔ لیکن جو آدمی ایسے زِندان میں رہے کہ دُنیا کی ہَوا اُس کو نہ لگے، اُس کا کیا حال ہو! بُزا پوست[3] و اُستخوان مجھ میں باقی رہا، زِندَگی وَبال ہوئی۔ جی میں آوے کہ یا اِلٰہی! یہ دَم نکل جاوے تو بہتر ہے۔

ایک رُوز رات کو وُہ دونوں قَیدی سوتے تھے، میرا دل اُمَنڈ آیا، بے اِختیار رُونے لگا اور خُدا کی درگاہ میں نَاک گِھسنی کرنے۔ پچھلے پَہر کیا دیکھتا ہوں کہ خُدا کی قُدرت سے ایک رسّی غار میں لٹکی اور آواز سَہج میں سُنی کہ اَے کم بَخت[4] بدنصیب! ڈُور کا سِرا اپنے ہاتھ میں مضبوط باندھ اور یہاں سے نکل۔ میں نے سُن کر دل میں خیال کیا کہ آخر بھائی مجھ پر مہربان ہوکر، لُہو کے جُوشش سے آپ ہی نکالنے آئے۔ نہایت خوشی سے اُس طَناب کو کمر میں خُوب کسا۔ کسو نے مجھے اوپر کھینچا۔ رات ایسی اَندھیری تھی کہ جن نے مجھے نکالا، اُس کو میں نے نہ پہچانا کہ کون ہے۔ جب مَیں باہر آیا، تب اُس نے کہا: جلد آ، یہاں کھڑے ہونے کی جگہ[5] نہیں۔ مجھ میں طاقت تُو نہ تھی، پَر مارے ڈر کے لُڑھَکتا پُڑتا[6] پہاڑ سے نیچے آیا۔ دیکھوں تو دُو گھوڑے زِین بندھے ہوئے کھڑے ہیں۔ اُس شخص نے ایک پر مجھے سوار کیا اور ایک پر آپ چَڑھ لیا اور آگے ہُوا۔ جاتے جاتے دریا کے کنارے پر پہنچا۔

صُبح ہو گئی۔ اُس شہر سے دس بارہ کوس نکل آئے۔ اُس جوان کو دیکھا

کہ اُونچی بنا ہوا، زِرہ(۱) بکتر پہنے، چار آئینہ باندھے، گھوڑے پر پاکھر ڈالے۔ میری طرف غضب کی نظروں سے گھور کر اور ہاتھ اپنا دانتوں سے کاٹ کر، تلوار میانؒ سے کھینچی اور گھوڑے کو جست کر کر مجھ پر چلائی۔ میں نے اپنے تئیں گھوڑے پر سے نیچے گرا دیا اور گھگھیانے لگا کہ میں بے تقصیر ہوں، مجھے کیوں قتل کرتا ہے! اے صاحبِ مُروّتؒ! ویسے زندان سے میرے تئیں تو نے نکالا، اب یہ بے مُرَوّتی کیا ہے! اُس نے کہا: سچ کہہ تو کون ہے؟ میں نے جواب دیا کہ مسافر ہوں، ناحق کی بلا میں گرفتار ہو گیا تھا، تمہارے تصدّق سے بارے جیتا نکلا ہوں۔ اور بہت باتیں خوشامد کی کہیں۔

خُدا نے اُس کے دل میں رحم دیا، شمشیر کو غلاف(۳) کیا اور بولا: خیر، خُدا جو چاہے سو کرے۔ جا تیری جاں بخشی(۴) کی۔ جلد سوار ہو، یہاں توقف کا مکان نہیں۔ گھوڑوں کو جلد کیا اور چلے۔ راہ میں افسوس کھاتا اور پچتاتا جاتا تھا۔ ظہر کے وقت تک ایک جزیرے میں جا پہنچے۔ وہاں گھوڑے سے اُترا، مجھے بھی اُتارا۔ زین، خوگیر(۶) مرکبوں کی پیٹھ سے کھولا اور چرنے کو چھوڑ دیا۔ اپنی بھی کمر سے ہتھیار کھول ڈالے اور بیٹھا۔ مجھ سے بولا: اے بدنصیب! اب اپنا احوال کہہ، تو معلوم ہو کہ تو کون ہے۔ میں نے اپنا نام نشان بتایا اور جو جو کچھ بپتا بیتی تھی، اُس سے آخر تک کہی۔

اُس جوان نے جب میری سرگذشت سب سُنی، رونے لگا اور مخاطب ہوا کہ اے جوان! اب میرا ماجرا سُن۔ میں کنیا(۸) زیرباد(۹) کے دیس کے راجا(۱۰) کی ہوں۔ اور وہ گبرو جوان، جو زندانِ سُلیمان میں قید ہے، اُس کا نام بہرہ مند(۱۱)

ہے، میرے پتا کے منتری کا بیٹا ہے۔ ایک روز مہاراج نے آگیا(۱) دی کہ جتنے راجا اور کنوّر ہیں، میدان میں زیرِ جھروکے(۳) نکل کر تیراندازی اور چوگان بازی کریں، تو گھڑ چڑھی اور کسب ہر ایک کا ظاہر ہووے۔ مَیں، رانی کے نیڑے(۴) جو میری ماتا تھیں، اٹاری پر اُوجھل بیٹھی تھی اور دائیاں اور سہیلیاں حاضر تھیں، تماشا دیکھتی تھی۔ یہ دیوان کا پوت سب میں سندر تھا اور گھوڑے کو کاوے دے کر کسب(۵) کر رہا تھا؛ مجھ کو بھایا اور دل سے اُس پر رِیجھی۔ مدّت تلک یہ بات گپت(۶) رکھی۔

آخر جب بہت بیاکل ہوئی، تب دائی سے کہا اور ڈھیر سا انعام دیا۔ وہ اُس جوان کو کسو ڈھب سے پوشیدہ میری(۷) دھراہر میں لے آئی۔ تب یہ بھی مجھے چاہنے لگا۔ بہت دن اِس عشق(۸) میں گئے۔ ایک روز چوکیداروں نے آدھی رات کو ہتھیار باندھے اور محل میں آتے دیکھ کر اُسے پکڑا اور راجا سے کہا۔ اُسنے حکمِ قتل کیا۔ سب ارکانِ دولت نے کہہ سُن(۱۰) کر جان بخشی کروائی۔ تب فرمایا کہ اِس کو زندانِ سلیمان میں ڈال دو۔ اور دوسرا جوان جو اُس کے ہم راہ اسیر ہے، اُس کا بھگنا ہے؛ اُس رَین کو وہ بھی اُس کے ساتھ تھا۔ دونوں کو اُس کنوئیں میں چھوڑ دیا۔ آج تین برس ہوئے کہ وے پھنسے ہیں؛ مگر کسو نے نہیں دریافت کیا کہ یہ جوان راجا کے گھر میں کیوں آیا تھا۔ بھگوان نے میری پت رکھی؛ اُس کے شکرانے کے بدلے میں نے اپنے اوپر لازم کیا کہ اَن اور جل اُس کو پہنچایا کروں۔ جب سے اُٹھوارے میں ایک دن آتی ہوں اور آٹھ دن کا اَزوقہ اکٹھا دے جاتی ہوں۔

کل کی رات سپنے* میں دیکھا کہ کوئی مانس کہتا ہے کہ شتابی اُٹھ اور گھوڑا، جوڑا اور کمند اور کچھ نقد خرچ کے واسطے لے کر، اُس غار پر جا اور اُس بچارے کو وہاں سے نکال۔ یہ سُن کر میں چونک پڑی اور مگن ہو کر مردانہ بھیس کیا اور ایک صندوقچہ جواہرِ واشرفی سے بھر لیا اور یہ گھوڑا اور کپڑا جوڑا لے کر وہاں گئی کہ کمند سے اُسے کھینچوں۔ کرم میں تیرے تھا کہ ویسی قید سے اس طرح چھٹکارا پاوے۔ اور میرے اس کرتب سے محرم کوئی نہیں، شاید وہ کوئی دیوتا تھا کہ تیری مخلصی کی خاطر مجھے بھجوایا۔ خیر، جو میرے بھاگ میں تھا، سو ہوا۔ یہ کہتا کہ کر، پوری، کچوری، ماس کا سالن انگوچھے سے کھولا۔ پہلے قند نکال ایک کٹورے میں گھولا اور عرق بید مشک کا اس میں ڈال کر مجھے دیا۔ میں نے اُس کے ہاتھ سے لے کر پیا۔ پھر تھوڑا سا ناشتا کیا۔ بعد ایک ساعت کے، میرے تئیں لنگی بندھوا کر دریا میں لے گئی۔ قینچی سے میرے سر کے بال کترے، ناخن لیے، نہلا دھلا کر کپڑے پہنائے، نئے سر⁽⁴⁾ سے آدمی بنایا۔ میں دوگانہ شکرانے⁽⁵⁾ کا رو بہ قبلہ ہو کر پڑھنے لگا۔ وہ نازنین اس میری حرکت کو دیکھتی رہی۔

جب نماز سے فارغ ہوا، پوچھنے لگی کہ یہ تو نے کیا کام کیا؟ میں نے کہا: جس خالق نے ساری خلقت کو پیدا کیا اور تجھ سی محبوبہ سے میری خدمت کروائی اور تیرے دل کو مجھ پر مہربان کیا اور ویسے زندان سے خلاص کروایا، اُس کی ذات لاشریک ہے، اُس کی میں نے عبادت کی اور بندگی بجا لایا اور ادائے شکر⁽⁶⁾ کیا۔ یہ بات سُن کر کہنے لگی: تم مسلمان ہو؟ میں نے کہا:

شکر، اَلحمدُ لِلّٰہ! بولی: میرا دل تمھاری باتوں سے خوش ہوا، میرے تئیں بھی سکھاؤ اور کلمہ پڑھاؤ۔ میں نے دل میں کہا: اَلحمدُ لِلّٰہ! کہ یہ ہمارے دین کی شریک ہوئی۔ غرض میں نے لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدُ الرَّسُوْلُ اللّٰہ، پڑھا اور اُس سے پڑھوایا۔ پھر وہاں سے گھوڑوں پر سوار ہوکر ہم دونوں چلے۔ رات کو اُترتے، تو وہ ذکر دین ایمان کا کرتی اور سُنتی اور خوش ہوتی۔ اسی طرح دو مہینے تلک بہم شبانہ روز چلے گئے۔

آخر ایک وِلایت میں پہنچے کہ درمیان سرحد ملکِ زیرباد اور سراندیپ کے تھی۔ ایک شہر نظر آیا کہ آبادی میں اِستنبول سے بڑا، اور آب و ہوا بہت خوش اور موافق۔ بادشاہ اُس شہر کا کسریٰ سے زیادہ عادل اور رعیت پرور۔ دیکھ کر دل نپٹ شاد ہوا۔ ایک حویلی خرید کرکے بود باش مقرر کی۔ جب کئی دن میں رنجِ سفر سے آسودہ ہوئے، کچھ اسبابِ ضروری درست کرکے، اُس بی بی سے موافق شرعِ محمدی کے نکاح کیا اور رہنے لگا۔ تین سال میں وہاں کے اکابر و اصاغر سے مل جُل کر اِعتبار بہم پہنچایا اور تجارت کا ٹھاٹھ پھیلایا۔ آخر وہاں کے سب سوداگروں سے سبقت لے گیا۔

ایک روز وزیرِ اعظم کی خدمت میں سلام کے لیے چلا۔ ایک میدان میں کثرت خلق اللہ کی دیکھی۔ کسو سے پوچھا کہ کیوں اِتنا اِزدحام ہے؟ معلوم ہوا کہ دو شخصوں کو زِنا اور چوری کرتے پکڑا ہے، اور شاید خون بھی کیا ہے؛ اُن کو سنگسار کرنے کو لائے ہیں۔ مجھے، سُنتے ہی، اپنا احوال یاد آیا کہ ایک دن مجھے بھی اِسی طرح سولی چڑھانے لے گئے تھے، خدا نے

بچا لیا۔ آیا یہ کون ہیں گے کہ ایسی بلا میں گرفتار ہوئے ہیں! معلوم نہیں کہ راست ہے، یا میری طرح تہمت میں گرفتار ہوئے ہیں! بھیڑ کو چیر کر اندر گھسا۔ دیکھا تو یہی میرے دونوں بھائی ہیں کہ ٹنڈیاں کیے، سر و پا برہنہ اِن کو لیے جاتے ہیں۔ اِن کی صورت دیکھتے ہی خون نے جوش کیا اور کلیجا جلا۔ محصّلوں کو ایک مٹھی اشرفیاں دیں اور کہا کہ ایک ساعت توقّف کرو، اور وہاں سے گھوڑے کو سرپٹ پھینک کر حاکم کے گھر گیا۔ ایک دانۂ یاقوت بے بہا کا نذر گزرانا اور اِن کی شفاعت کی۔ حاکم نے کہا: ایک شخص اِن کا مدّعی ہے اور اِن کے گناہ ثابت ہوئے ہیں اور بادشاہ کا حکم ہو چکا ہے، میں لاچار ہوں۔

بارے بہت منّت و زاری سے، حاکم نے مدّعی کو بلوا کر پانچ ہزار روپے پر راضی کیا کہ وہ دعویٰ خون کا معاف کرے۔ میں نے روپے گن دیے اور لادعویٰ لکھوا لیا اور ایسی بلا سے مخلصی دلوائی۔ جہاں پناہ! اِن سے پوچھیے کہ سچ کہتا ہوں یا جھوٹ بکتا ہوں۔ وے دونوں بھائی سر نیچے کیے شرمندہ سے کھڑے تھے۔ خیر، اِن کو چھڑوا کر گھر میں لایا، حمّام کروا کر لباس پہنوایا۔ دیوان خانے میں مکان رہنے کو دیا۔ اِس مرتبے اپنے قبیلے کو اِن کے روبرو نہ کیا۔ اِن کی خدمت میں حاضر رہتا اور اِن کے ساتھ کھانا کھاتا، سونے کے وقت گھر میں جاتا۔ تین برس تک اِن کی خاطرداری میں گزری اور اِن سے بھی کوئی حرکت بد واقع نہ ہوئی کہ باعث رنجیدگی کا ہووے۔ جو میں سوار ہو کر کہیں جاتا، تو یہ گھر میں رہتے۔

اتّفاقاً وہ بی بی نیک بخت ایک دن حمّام کو گئی تھی، جب دیوان خانے

میں آئی، کوئی مرد نظر نہ پڑا، اُس نے بُرقع اُتارا۔ شاید یہ منجھلا بھائی لیٹا ہوا جاگتا تھا، دیکھتے ہی عاشق ہوا۔ بڑے بھائی سے کہا۔ دونوں نے میرے مار ڈالنے کی باہم صلاح کی۔ میں اس حرکت سے مطلق خبر نہ رکھتا تھا، بلکہ دل میں کہتا تھا کہ اَلحَمدُ لِلّٰہ ! اِس مرتبہ اب تک اِنھوں نے کچھ ایسی بات نہیں کی، اب اِن کی وضع دُرست ہوئی، شاید غیرت کو کام فرمایا۔ ایک روز بعد کھانے کے بڑے بھائی صاحب آب دیدہ ہوئے اور اپنے وطن کی تعریف اور ایران کی خوبیاں بیان کرنے لگے۔ یہ سُن کر دوسرے بھی بسورنے لگے۔ میں نے کہا: اگر ارادہ وطن کا ہے تو بہتر، میں تابعِ مرضی کے ہوں، میری بھی یہی آرزو ہے، اب اِنشاءَ اللہ تعالیٰ میں بھی آپ کی رکاب میں چلتا ہوں۔ اُس بی بی سے دونوں بھائیوں کی اُداسی کا مذکور کیا اور اپنا ارادہ بھی کہا۔ وہ عاقلہ بولی کہ تم جانو؛ لیکن پھر کچھ دغا کیا چاہتے ہیں، یہ تمھاری جان کے دشمن ہیں، تم نے سانپ آستین میں پالے ہیں اور ان کی دوستی کا بھروسا رکھتے ہو۔ جو جی چاہے سو کرو، لیکن موذیوں سے خبردار رہو۔ بہ ہر تقدیر، تھوڑے عرصے میں تیاری سفر کی کر کے خیمہ میدان میں اِستادہ کیا۔ بڑا قافلہ جمع ہوا اور میری سرداری اور قافلہ باشی پر راضی ہوئے۔ اچھی ساعت دیکھ کر روانہ ہوا لیکن اِن کی طرف سے اپنی جانب میں ہوشیار رہتا، اور سب صورت سے فرماں برداری اور دل جوئی اِن کی کرتا۔

ایک روز ایک منزل میں منجھلے بھائی نے مذکور کیا کہ ایک فرسنگ اِس مکان سے ایک چشمہ جاری ہے مانند سلسبیل کے، اور میدان میں

خودرو کوسوں تلک لالہ و نافرمان اور نرگس و گلاب پھولا ہے۔ واقعی عجب مکان سیر کا ہے؛ اگر اپنا اختیار ہوتا، تو کل وہاں جاکر تفریح طبیعت کی کرتے اور ماندگی بھی رفع ہوتی۔ میں بولا کہ صاحب مختار ہیں؛ فرماؤ تو کل کے دن مقام کریں اور وہاں چل کر سیر کرتے پھریں۔ تب بولے: آزیں چہ بہتر! میں نے حکم کیا کہ سارے قافلے میں پکار دو کہ کل مقام ہے۔ اور بکاول کو کہا کہ حاضری قسم بہ قسم کی تیار کر، کل سیر کو چلیں گے۔ جب صبح ہوئی، ان دونوں برادروں نے کپڑے پہن، کمر باندھ کر مجھے یاد دلایا کہ جلد ٹھنڈے ٹھنڈے چلیے اور سیر کیجیے۔ میں نے سواری مانگی۔ بولے کہ پیادہ جو لطف سیر کا ہوتا ہے، سو سواری میں معلوم! نفروں کو کہہ دو: گھوڑے ڈریا کر لے آویں۔

دونوں غلاموں نے قلیان اور قہوہ دان لے لیا اور ساتھ ہوئے۔ راہ میں تیر اندازی کرتے ہوئے چلے جاتے تھے۔ جب قافلے سے دور نکل گئے، ایک غلام کو انھوں نے کسی کام کو بھیجا۔ تھوڑی دور آگے بڑھ کر دوسرے کو بھی اس کے بلانے کو رخصت کیا۔ کم بختی جو آئی، میرے منہ میں جیسے کسو نے مہر دے دی۔ جو وہ چاہتے تھے، سو کرتے تھے اور مجھے باتوں میں پرچائے لیے جاتے تھے؛ مگر یہ کتا ساتھ رہ گیا۔

بہت دور نکل گئے؛ نہ چشمہ نظر آیا، نہ گلزار؛ مگر ایک میدان پرخار تھا۔ وہاں مجھے پیشاب لگا۔ میں بول کرنے کو بیٹھا۔ اپنے پیچھے چمک تلوار کی سی دیکھی۔ مڑ کر دیکھوں، تو منجھلے بھائی صاحب نے مجھ پر تلوار ماری کہ سر دو پارہ ہوگیا۔

جب تلک بولوں کہ اَے ظالم! مجھے کیوں مارتا ہے، بڑے بھائی نے شانے پر لگائی۔ دونوں زَخم کاری لگے، تیوراکر گرا؛ تب اِن دونوں بے رحموں نے بہ خاطرِ جمع (١) میرے تئیں چوُر زخمی کیا اور لہولُہان کر دیا۔ یہ کُتّا میرا اَحوال دیکھ کر اِن پر بھونکا، اِس کو بھی گھائل کیا۔ بعد اُس کے اپنے ہاتھوں سے اپنے بدنوں میں زخموں کے نشان کیے اور سَروپا برہنہ قافلے میں گئے اور ظاہر کیا کہ حرامیوں نے اُس میدان میں ہمارے بھائی کو شہید کیا اور ہم بھی لڑ بھڑ کر زخمی ہوئے، جلدی کوُچ کرو، نہیں تو اب کاروان پر گر کر سب کو نِنگیا لیں (٢) گے۔ قافلے کے لوگوں نے بدوؤں کا نام جو سُنا، وُوہیں بدحواس ہوئے اور گھبرا کر کوُچ کیا اور چل نکلے۔

میرے قبیلے نے سلوک اور خوبیاں اِن کی سُن رکھیں (٣) تھیں، جو جو مجھ سے دغائیں کیں تھیں؛ یہ وارِدات اِن کا ذِلوں سے سُن کر، جلد خنجر سے اپنے تئیں ہلاک کیا اور جان بہ حق (۴) تسلیم ہوئی۔ اَے دَرویشو! اُس خواجۂ سگ پرست نے جب اپنی کیفیت (۵) اور مصیبت اِس طرح سے یہاں تلک کہی، سُنتے ہی مجھے بے اِختیار رُونا آیا۔ وُہ سوداگر دیکھ کر کہنے لگا کہ قبلۂ عالَم! اگر بے اَدَبی نہ ہوتی، تو برہنہ ہو کر، میں اپنا سارا بدن کھول کر دِکھاتا۔ تِس پر بھی، اپنی راستی پر، گریبان مونڈھے تلک چیر کر دِکھایا۔ واقعی چارانگل (٦) تن اُس کا بغیر زخم کے ثابت نہ تھا۔ میرے حضور سر سے عمامہ (٧) اُتارا۔ کھوپری (٨) میں ایسا بڑا گڑھا (٩) پڑا تھا کہ ایک انار سموچا اُس میں سما دے۔ ارکانِ دولت جتنے حاضر تھے، سب نے اپنی آنکھیں

بند کرلیں، طاقت دیکھنے کی نہ رہی۔

پھر خواجہ بولا کہ بادشاہ سلامت! جب یہ بھائی اپنی دانست میں میرا کام تمام کر کے چلے گئے، ایک طرف میں اور ایک طرف یہ سگ میرے نزدیک زخمی پڑا تھا۔ لہو اتنا بدن سے گیا کہ مطلق طاقت اور ہوش کچھ باقی نہ تھا۔ کیا جانوں دم کہاں اٹک رہا تھا کہ جیتا تھا۔ جس جگہ میں پڑا تھا، ولایت سراندیپ کی سرحد تھی اور ایک شہر بہت آباد اس کے قریب تھا۔ اس شہر میں بڑا بت خانہ تھا اور وہاں کے بادشاہ کی ایک بیٹی تھی نہایت قبول صورت اور صاحب جمال۔ اکثر بادشاہ اور شہ زادے اس کے عشق میں خراب تھے۔ وہاں رسم حجاب کی نہ تھی، اس سے وہ لڑکی تمام دن ہمجولیوں کے ساتھ سیر شکار کرتی پھرتی۔ ہم سے نزدیک ایک بادشاہی باغ تھا۔ اس روز بادشاہ سے اجازت لے کر اسی باغ میں آئی تھی۔ سیر کی خاطر اس میدان میں پھرتی پھرتی آ نکلی۔ کئی خواصیں بھی ساتھ سوار تھیں۔ جہاں میں پڑا تھا، آئیں۔ میرا کراہنا سن کر پاس کھڑی ہوئیں۔ مجھے اس حالت میں دیکھ کر وے بھاگیں اور شہ زادی سے کہا کہ ایک مردوا اور ایک کتا لہو میں شور بور پڑا ہے۔ ان سے یہ سن کر آپ ملکہ میرے سر پر آئی، افسوس کھا کر کہا: دیکھو تو کچھ جان باقی ہے؟ دو چار دائیوں نے اتر کر دیکھا اور عرض کی: اب تلک تو جیتا ہے۔ ترت فرمایا کہ آبانت، قالیچے پر لٹا کر، باغ میں لے چلو۔

وہاں لے جا کر، جراح سرکار کا بلا کر، میرے اور میرے کتے کے علاج کی خاطر بہت تاکید کی اور امیدوار انعام و بخشش کا کیا۔ اس حجام نے سارا

بدن میرا پونچھ پانچھ کر خاک (۱) خون سے پاک کیا اور شراب سے دھو دھا کر زخموں کو ٹانکے دے کر مرہم لگایا۔ اور بید مشک کا عرق، پانی کے بدلے، میرے حلق (۲) میں چوایا۔ ملکہ آپ میرے سرہانے بیٹھی رہتی اور میری خدمت کرواتی اور تمام دن رات میں دو چار بار کچھ شوربا (۳) یا شربت اپنے ہاتھ سے پلاتی۔

بارے مجھے ہوش آیا تو دیکھا کہ ملکہ نہایت افسوس سے کہتی ہے: کس (۴) ظالم خون خوار نے تجھ پر یہ ستم کیا! بڑے بت سے بھی نہ ڈرا! بعد دس روز کے عرق اور شربت اور معجونوں کی قوت سے میں نے آنکھ کھولی۔ دیکھا تو اندر کا اکھاڑا میرے آس پاس جمع ہے اور ملکہ سرہانے کھڑی ہے۔ ایک آہ بھری اور چاہا کہ کچھ حرکت کروں، طاقت نہ پائی۔ بادشاہ زادی مہربانی سے بولی کہ اے عجمی (۵)! خاطر جمع رکھ، کہ درست! اگرچہ کسو ظالم نے تیرا یہ احوال کیا، لیکن بڑے بت نے مجھ کو تجھ پر مہربان کیا ہے، اب چنگا ہو جاوے گا۔ قسم اس خدا کی، جو واحد اور لاشریک ہے، میں اسے دیکھ کر پھر بے ہوش ہو گیا۔ ملکہ نے بھی دریافت کیا اور گلاب پاش سے گلاب اپنے ہاتھ سے چھڑکا۔ بیس دن کے عرصے میں زخم بھر آئے اور انگور کر لائے۔ ملکہ ہمیشہ رات کو، جب سب سو جاتے، میرے پاس آتی اور کھلا پلا جاتی۔

غرض ایک چلے میں غسل کیا۔ بادشاہ زادی نہایت خوش ہوئی، حجام کو انعام بہت سا دیا اور مجھ کو پوشاک (۶) پہنوائی۔ خدا کے فضل سے اور خبرگیری اور سعی سے ملکہ کی خوب چاق چوبند ہوا اور بدن نہایت تیار ہوا اور کتا

بھی فربہ① ہو گیا۔ روز مجھے شراب پلاتی اور باتیں سُنتی اور خوش ہوتی۔ میں بھی ایک آدھ نقل یا کہانی اَنوٹھی* کہہ کر اُس کے دل کو بہلاتا۔

ایک دن پوچھنے لگی کہ اپنا اَحوال تو بیان کرو کہ تم کون ہو اور یہ واردات تم پر کیونکر ہوئی۔ میں نے سارا ماجرا اپنا اوّل سے آخر تک کہہ سُنایا سُن کر رونے لگی اور بولی کہ اب میں تجھ سے ایسا سُلوک کروں گی کہ اپنی ساری مصیبت بھول جاوے گا۔ میں نے کہا: خُدا تمھیں سلامت رکھے، تم نے نئے ② سر سے میری جان بخشی کی ہے، اب میں تمھارا ہو رہا ہوں؛ واسطے خُدا کے اِسی طرح ہمیشہ مجھ پر اپنی مہربانی کی نظر رکھیو۔ غرض تمام رات اکیلی میرے پاس بیٹھی رہتی اور صحبت رکھتی۔ بعضے دن دائی اُس کی بھی ساتھ رہتی۔ ہر③ ایک طور کا ذکر مذکور سُنتی اور کہتی۔ جب مَلکہ اُٹھ جاتی اور میں تنہا ہوتا، طہارت④ کر، کونے میں چھپ کر نماز⑤ پڑھ لیتا۔

ایک بار ایسا اِتّفاق ہوا کہ مَلکہ اپنے باپ کے پاس گئی تھی، میں خاطرِ جمع سے وُضو کر کے نماز پڑھ رہا تھا کہ اچانک شہزادی دائی سے بولتی ہوئی آئی کہ دیکھیں عجمی اِس وقت کیا کرتا ہے، سوتا ہے یا جاگتا ہے۔ مجھے مکان پر جو نہ دیکھا، تعجّب میں ہوئی کہ آیں، یہ کہاں گیا ہے! کِسو⑥ سے کچھ لگا تو نہیں لگایا! کونا کُتھرا* دیکھنے لگی اور تلاش کرنے لگی۔ آخر جہاں میں نماز کر رہا تھا، وہاں آ نکلی۔ اُس لڑکی نے کبھو نماز کاہے کو دیکھی تھی، چپکی کھڑی دیکھا کی۔ جب میں نے نماز تمام کر کے دُعا کے لیے ہاتھ اُٹھائے اور سجدے* میں گیا، بے اِختیار کھلکھلا کر ہنسی اور بولی: کیا یہ آدمی

سَودائی ہوگیا! یہ کیسی کیسی حرکتیں کر رہا ہے!

مَیں ہنسنے کی آواز سُن کر دل میں ڈرا۔ مَلِکہ آگے آکر پوچھنے لگی کہ اَے عَجَمی! یہ تُو کیا کرتا تھا؟ مَیں کچھ جواب نہ دے سکا، اِس میں دائی بُولی: بَلا لُوں، تیرے صَدقے گئی، مجھے یوں معلوم ہوتا ہے کہ یہ شخص مُسلمان ہے اور لَاتؔ، مَنَاتؔ کا دشمن ہے، اَن دیکھے خُدا کو پوجتا ہے۔ مَلِکہ نے یہ سُنتے ہی ہاتھ ہاتھ پر مارا، بہت غُصّے ہوئی کہ مَیں کیا جانتی تھی کہ یہ تُرک ہے اور ہمارے خُداؤں سے مُنکِر ہے! تبھی ہمارے بُت کے غَضَب میں پڑا تھا! مَیں نے ناحق[1] اِس کی پَرَوَرِش کی اور اپنے گھر میں رکھا! یہ کہتی ہوئی چلی گئی۔ مَیں سُنتے ہی بَدحَواس[2] ہوا کہ دیکھیے اب کیا سُلوک کرے! مارے خَوف کے نیند اُچاٹ ہوگئی۔ صُبح تک بے اِختیار رُویا کیا اور آنسوؤں سے مُنہ دُھویا کیا۔

تین دن رات اِسی خَوف و رِجا میں رُوتے گزرے[3]، ہرگز آنکھ نہ جھپکی۔ تیسری شَب مَلِکہ شراب کے نشے میں مَخمور اور دائی ساتھ[4] لیے میرے مَکان پر آئی۔ غُصّے میں بھری ہوئی اور تیر کمان ہاتھ میں لیے، باہر چمن کے کنارے بیٹھی۔ دائی سے پیالہ شراب کا مانگا۔ پی کر کہا: دَیا! وہ عَجَمی جو ہمارے بڑے بُت کے قَہر میں گرِفتار ہے، مُوا، یا اب تک جیتا ہے؟ دائی نے کہا: بَلَیّا[5] لُوں، کچھ دَم باقی ہے۔ بُولی کہ اب وہ ہماری نظروں سے گرا، لیکن کہ سکّہ[6] باہر آوے۔ دائی نے مجھے پُکارا۔ مَیں دَوڑا۔ دیکھوں تو[7] مَلِکہ کا چہرہ مارے غُصّے کے تمتما[8] رہا ہے اور سُرخ ہوگیا ہے؛ رُوح قالِب میں نہ رہی، سلام کیا اور ہاتھ باندھ کر کھڑا ہوا۔ غَضَب کی نگاہ سے مجھے دیکھ کر دائی سے

بولی: اگر میں اِس دین کے دُشمن کو تیرے ماروں، تو میری خطا بڑا بُت معاف کرے گا یا نہیں؟ یہ مجھ سے بڑا گُناہ ہوا ہے کہ میں نے اِسے اپنے گھر میں رکھ کر خاطر داری کی۔

دائی نے کہا: بادشاہ زادی کی کیا تقصیر ہے! کچھ دُشمن جان کر نہیں رکھا، تم نے اِس پر ترس کھایا؛ تم کو نیکی کے عوض نیکی ملے گی اور یہ اپنی بدی کا ثمرہ بڑے بُت سے پا رہے گا۔ یہ سُن کر کہا: دائی! اِسے بیٹھنے کو کہہ۔ دائی نے مجھے اِشارت کی کہ بیٹھ جا۔ میں بیٹھ گیا۔ مَلکہ نے اَور جام شراب کا پیا اور دائی سے کہا کہ اِس کم بخت کو بھی ایک پیالہ دے تو آسانی سے مارا جاوے۔ دائی نے جام دیا۔ میں نے بے عُذر پیا اور سلام کیا۔ ہرگز میری طرف نگاہ نہ کی، مگر کن انکھیوں سے چوری چوری دیکھتی تھی۔ جب مجھے سُرور ہوا، کچھ شعر پڑھنے لگا، ازاں جُملہ ایک بیت یہ بھی پڑھی:

قابو میں ہوں میں تیرے، گو اب جیا، تو پھر کیا!
خنجر تلے کسو نے ٹک دم لیا، تو پھر کیا!

سُن کر مُسکرائی اور دائی کی طرف دیکھ کر بولی: کیا تجھے نیند آتی ہے؟ دائی نے مرضی پاکر کہا کہ ہاں مجھ پر خواب نے غلبہ کیا ہے۔ وُہ تو رُخصت ہو کر جہنّم واصل ہوئی۔ بعد ایک دم کے مَلکہ نے پیالہ مجھ سے مانگا۔ میں جلد بھر کر رُو بہ رُو لے گیا۔ ایک ادا سے میرے ہاتھ سے لے کر پی لیا، تب میں قدموں پر گرا۔ مَلکہ نے ہاتھ مجھ پر جھاڑا اور کہنے لگی: اے جاہل! ہمارے بڑے بُت میں کیا بُرائی دیکھی جو غائب خُدا کی پرستش کرنے لگا؟ میں نے کہا: انصاف

شرط ہے، ٹک غور فرمائیے کہ بندگی کے لائق وہ خدا ہے کہ جس نے ایک قطرے پانی سے تم سار کا محبوب پیدا کیا اور یہ حسن و جمال دیا کہ ایک آن میں ہزاروں انسان کے دل کو دیوانہ کر ڈالو۔ بت کیا چیز ہے کہ کوئی اس کی پوجا کرے! ایک پتھر کو سنگ تراشوں نے گڑھ کر (۱) صورت بنائی اور دام احمقوں کے واسطے بچھایا۔ جن کو شیطان نے ورغلایا (۲) ہے، وے مصنوع کو صانع جانتے ہیں۔ جسے اپنے ہاتھوں سے بناتے ہیں، اس کے آگے سر جھکاتے ہیں۔ اور ہم مسلمان ہیں، جس نے ہمیں بنایا ہے، ہم اسے مانتے ہیں۔ ان کے واسطے دوزخ، ہمارے لیے بہشت بنایا ہے۔ اگر بادشاہ زادی ایمان خدا پر لاوے، تب اس کا مزا (۳) پاوے اور حق و باطل میں فرق کرے اور اپنے اعتقاد کو غلط سمجھے۔

بارے ایسی ایسی نصیحتیں سن کر اس سنگ دل کا دل ملائم ہوا، خدا کے فضل و کرم سے رونے لگی اور بولی: اچھا، مجھے بھی اپنا دین سکھاؤ۔ میں نے کلمہ تلقین کیا۔ ان نے بہ صدقِ دل پڑھا اور توبہ استغفار کر کر مسلمان ہوئی۔ تب میں اس کے پانو پڑا۔ صبح تک کلمہ پڑھتی اور استغفار کرتی رہی، پھر کہنے لگی: بھلا میں نے تو تمھارا دین قبول کیا؛ لیکن ماباپ کافر ہیں، ان کا کیا علاج؟ میں نے کہا: تمھاری بلا سے! جو جیسا کرے گا، ویسا پاوے گا۔ بولی کہ مجھے چچا کے بیٹے سے منسوب کیا ہے اور وہ بت پرست ہے؛ کل کو خدا نہ خواستہ بیاہ ہو اور وہ کافر مجھ سے ملے اور اس کا نطفہ میرے پیٹ میں ٹھہر جاوے، تو بڑی قباحت ہے۔ اس کی فکر ابھی سے

کیا چاہیے کہ اِس بلا سے نجات پاؤں۔ میں نے کہا: تم بات تو معقول کہتی ہو؛ جو مزاج میں آوے، سو کرو۔ بولی کہ میں اب یہاں نہ رہوں گی، کہیں نکل جاؤں گی۔ میں نے پوچھا: کس صورت سے بھاگنے پاؤ گی اور کہاں جاؤ گی؟ جواب دیا کہ پہلے تم میرے پاس سے جاؤ، مسلمانوں کے ساتھ سرا میں جا رہو، تو سب آدمی سُنیں اور تم پر گمان نہ لے جاویں۔ تم وہاں کشتیوں کی تلاش میں رہو۔ جو جہاز عجم کی طرف چلے، مجھے خبر کیجو۔ میں اِس واسطے دائی کو تمھارے پاس اکثر بھیجا کروں گی۔ جب تم کہلا بھیجو گے، میں نکل کر آؤں گی اور کشتی پر سوار ہو کر چلی جاؤں گی؛ اِن کم بخت بے دینوں کے ہاتھ سے مخلصی پاؤں گی۔

میں نے کہا: تمھارے (۴) جان و ایمان کے قربان ہوا، دائی کو کیا کرو گی؟ بولی: اُس کی فکر سہل ہے، ایک پیالے میں زہر ہلاہل پلا دوں گی۔ یہی صلاح مقرر ہوئی۔ جب دن ہوا، میں کاروان سرا میں گیا۔ ایک حجرہ کرایے لیا اور جا رہا۔ اُس جدائی میں فقط وصل کی توقع پر جیتا تھا۔ جب دو مہینے میں (۵) سوداگر روم و شام و اصفہان (۶) کے جمع ہوئے، ارادہ کوچ کا تری کی راہ سے کیا اور اپنا اسباب جہاز پر چڑھانے لگے۔ ایک جگہ رہنے سے اکثر آشنا صورت ہو گئے تھے، مجھ سے کہنے لگے: کیوں صاحب! تم بھی چلو نہ! یہاں کفرستان میں کب تلک رہو گے! میں نے جواب دیا کہ میرے پاس کیا ہے جو اپنے وطن کو جاؤں! یہی ایک لونڈی، ایک کُتّا، ایک صندوق بساط میں رکھتا ہوں؛ اگر تھوڑی سی جگہ بیٹھ رہنے کو دو اور اُس کا نول (۷) مقرر کرو، تو میری خاطر جمع ہو، میں بھی سوار ہوں۔

سوداگروں نے ایک کوٹھری میرے تخت میں کر دی۔ میں نے اُس کے
نَول کا روپیہ① بھر دیا۔ دِل جمعی کر کر، کسو بہانے سے دائی کے گھر گیا اور کہا: اَے
امّاں! تجھ سے رُخصت ہونے آیا ہوں، اب وطن کو جاتا ہوں؛ اگر تیری توجّہ
سے ایک نظر مَلِکہ کو دیکھ لوں، تو بڑی بات ہے۔ بارے دائی نے قبول کیا۔
میں نے کہا: مَیں رات کو آؤں گا، فلانے مکان پر کھڑا رہوں گا۔ بولی: اچّھا۔
مَیں کہہ کر سرا میں آیا۔ صندوق اور بچھونے اُٹھا کر جہاز میں لایا اور ناخُدا کو سونپ
کر کہا: کل فجر کو اپنی کنیز کو لے کر آؤں گا۔ ناخدا بولا: جلد آئیو، صُبح ہم لنگر
اُٹھاویں گے۔ میں نے کہا: بہت خوب۔ جب رات ہوئی، اُسی مکان پر،
جہاں دائی سے وعدہ کیا تھا، جا کر کھڑا رہا۔ پہر رات گئے محل کا دروازہ
کھلا اور مَلِکہ میلے کچیلے کپڑے پہنے، ایک پیٹی جواہر کی لیے باہر نکلی۔ وہ
پٹاری میرے حوالے کی اور ساتھ چلی۔ صُبح ہوتے کنارے دریا کے ہم پہنچے۔
ایک لَنبُوٹ② پر سوار ہو کر جہاز میں جا اُترے۔ یہ وفادار کتّا بھی ساتھ تھا۔
جب صُبح خوب روشن ہوئی، لنگر اُٹھایا اور روانہ ہوئے۔ بہ خاطر جمع چلے جاتے
تھے، ایک بَندَر سے آواز توپوں کی شَلَّک* کی آئی۔ سب حیران اور فکر مند
ہوئے۔ جہاز کو لنگر کیا اور آپس میں چرچا ہونے لگا کہ کیا شاہِ بندر کچھ دغا کرے
گا! توپ چھوڑنے کا کیا سبب ہے!

اِتّفاقاً سب سوداگروں کے پاس خوب صورت لونڈیاں تھیں۔ شاہِ بندر
کے خوف سے، کہ مبادا چھین لے، سب نے کنیزکوں کو صندوقوں میں بند کیا۔ میں
نے بھی ایسا ہی کیا کہ اپنی شہ زادی کو صندوق میں بٹھا کر قُفل کر دیا۔ اِس عرصے

میں شاہِ بندر ایک غُراب پر مع نوکر چاکر بیٹھا ہوا نظر آیا۔ آتے آتے جہاز پر آپ چڑھا۔ شاید اُس کے آنے کا یہ سبب تھا کہ بادشاہ کو دائی کے مرنے کی اور مَلِکہ کے غائب ہونے کی جب خبر معلوم ہوئی، مارے غیرت کے اُس کا تو نام نہ لیا، مگر شاہِ بندر کو حکم کیا کہ میں نے سُنا ہے عجمی سوداگروں کے پاس لونڈیاں خوب خوب ہیں، سو میں شہ زادی کے واسطے لیا چاہتا ہوں۔ تم اُن کو روک کر، جتنی لونڈیاں جہاز میں ہوں، حضور میں حاضر کروگے۔ اُنھیں دیکھ کر، جو پسند آویں گی، اُن کی قیمت دی جائے گی، نہیں تو واپس ہوں گی۔

بہ موجب حکم بادشاہ کے یہ شاہِ بندر اِس لیے آپ جہاز پر آیا۔ اور میرے نزدیک ایک اَور شخص تھا، اُس کے پاس بھی ایک باندی قبول صورت صندوق میں بند تھی، شاہِ بندر اُسی صندوق پر آکر بیٹھا اور لونڈیوں کو نکلوانے لگا۔ میں نے خدا کا شکر کیا کہ بھلا بادشاہ زادی کا مذکور نہیں۔ غرض جتنی لونڈیاں پائیں، شاہِ بندر کے آدمیوں نے ناو[2] پر چڑھائیں۔ اور خود شاہِ بندر جس صندوق پر بیٹھا تھا، اُس کے مالک سے بھی ہنستے ہنستے پوچھا کہ تیرے پاس بھی تو لونڈی تھی؟ اُس احمق نے کہا: آپ کے قدموں کی سوگند میں[3] نے ہی یہ کام نہیں کیا، سبھوں نے تمھارے ڈر سے لونڈیاں صندوقوں میں چھپائیں ہیں۔ شاہِ بندر نے یہ بات سُن کر سب صندوقوں کا جھاڑا لینا شروع کیا۔ میرا بھی صندوق کھولا اور مَلِکہ کو نکال کر سب کے ساتھ لے گیا۔ عجب طرح کی مایوسی ہوئی کہ یہ ایسی حرکت پیش آئی کہ تیری جان تو مفت گئی اور مَلِکہ سے دیکھیے کیا سلوک کرے! اُس کی فکر میں اپنی بھی جان کا ڈر بھول گیا۔ سارے

دن رات خُدا سے دُعا مانگتا رہا۔ جب بڑی فجر ہوئی، سب لونڈیوں کو کشتی پر سوار کر کے لائے۔ سوداگر خوش ہوئے، اپنی اپنی کنیزکیں لیں۔ سب آئیاں، مگر ایک مَلِکہ اُن میں نہ تھی۔ میں نے پوچھا کہ میری لونڈی نہیں آئی، اِس کا کیا سبب ہے؟ اُنھوں نے جواب دیا کہ ہم واقف نہیں، شاید بادشاہ نے پسند کی ہو گی۔ سب سوداگر مجھے تسلّی اور دِلاسا دینے لگے کہ خیر، جو ہوا سو ہوا، تو کُڑھ مت، اُس کی قیمت ہم سب بہری کر کر تجھے دیں گے۔ میرے حواس باختہ ہو گئے، میں نے کہا کہ اب میں عجم نہیں جانے کا۔ کشتی والوں سے کہا: یارو! مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلو، کنارے پر اُتار دیجو۔ وے راضی ہوئے۔ میں جہاز سے اُتر کر غُراب میں آ بیٹھا۔ یہ کُتا بھی میرے ساتھ چلا آیا۔

جب بندر میں پہنچا، ایک صندوقچہ جواہر کا، جو مَلِکہ اپنے ساتھ لائی تھی، اُسے تو رکھ لیا، اور سب اسباب شاہِ بندر کے نوکروں کو دیا، اور میں جاسوسی میں ہر کہیں پھرنے لگا کہ شاید خبر مَلِکہ کی پاؤں، لیکن ہرگز سُراغ نہ ملا اور نہ اِس بات کا پتا پایا۔ ایک رات کو کسو مکر سے بادشاہ کے بھی محل میں گیا اور ڈھونڈھا، کچھ خبر نہ ملی۔ قریب ایک مہینے کے شہر کے کوچے اور محلّے چھان مارے، اور اُس غم سے اپنے تئیں قریبِ ہلاکت کے پہنچایا اور سودائی سا پھرنے لگا۔ آخر اپنے دل میں خیال کیا کہ غالب ہے شاہِ بندر کے گھر میں میری بادشاہ زادی ہووے تو ہووے، نہیں تو اور کہیں نہیں۔ شاہِ بندر کی حویلی کے گرد پیش دیکھتا پھرتا تھا کہ کہیں سے بھی جانے کی راہ

پاؤں تو اندر جاؤں۔

ایک بدررو نظر پڑی کہ موافق آدمی کی آمد و رفت کے ہے، مگر جالی آہنی اُس کے دہانے پر جڑی ہے۔ یہ قصد کیا کہ اِس بدررو کی راہ سے چلوں۔ کپڑے بدن سے اُتارے اور اُس کیچڑ میں اُترا۔ ہزار محنت سے اُس جالی کو توڑا اور سنڈاس کی راہ سے چور محل میں گیا۔ عورتوں کا سا لباس بنا کر ہر طرف دیکھنے بھالنے لگا۔ ایک مکان سے آواز میرے کان میں پڑی جیسے کوئی مناجات کر رہا ہے۔ آگے جا کر دیکھوں تو ملکہ ہے کہ عجب حالت سے روتی ہے اور نک گھسنی کر رہی ہے اور خدا سے دعا مانگتی ہے کہ صدقے اپنے رسول کے اور اُس کی آلِ پاک کے، مجھے اِس کفرستان سے نجات دے! اور جس شخص نے مجھے اسلام کی راہ بتائی ہے، اُس سے ایک بار خیریت سے ملا! میں دیکھتے ہی دوڑ کر پاؤں پر گر پڑا۔ ملکہ نے مجھے گلے لگا لیا۔ ہم دونوں پر ایک دم بے ہوشی کا عالم ہو گیا۔ جب حواس بجا ہوئے، میں نے کیفیت ملکہ سے پوچھی۔ بولی: جب شاہِ بندر سب لونڈیوں کو کنارے پر لے گیا، میں خدا سے یہی دعا مانگتی تھی کہ کہیں میرا راز فاش نہ ہو اور میں پہچانی نہ جاؤں اور تیری جان پر آفت نہ آوے۔ وہ ایسا ستار ہے کہ ہرگز کسو نے نہ دریافت کیا کہ یہ ملکہ ہے۔ شاہِ بندر ہر ایک کو بہ نظرِ خریداری دیکھتا تھا، جب میری باری ہوئی، مجھے پسند کر کر اپنے گھر میں چپکے بھیج دیا، اوروں کو بادشاہ کے حضور گزرانا۔

میرے باپ نے جب اُن میں مجھے نہ دیکھا، سب کو رخصت کیا۔ یہ سب

پر یہ پیچ میرے واسطے کیا تھا۔ اب یوں مشہور کیا ہے کہ بادشاہ زادی بہت بیمار ہے۔ اگر مَیں ظاہر نہ ہوئی، تو کوئی دن میں میرے مرنے کی خبر سارے مُلک میں اُڑے گی، تو بدنامی بادشاہ کی نہ ہووے؛ لیکن اب مَیں اِس عذاب میں ہوں کہ شاہِ بندر مجھ سے اَور اِرادہ دِل میں رکھتا ہے اور ہمیشہ ساتھ سونے کو بُلاتا ہے، مَیں راضی نہیں ہوتی۔ اَز بس کہ چاہتا ہے، اب تک میری ہی رضامندی منظور ہے، لہٰذا چُپ ہو رہتا ہے۔ پر حیران ہوں اِس طَرح کہاں تک نبھے گی۔ سو میں نے بھی جی میں یہ ٹھہرایا ہے کہ جب مجھ سے کچھ اَور قصد کرے گا، تو مَیں اپنی جان دوں گی اور حرِ رہوں گی؛ لیکن تیرے ملنے سے ایک اَور تدبیر دل میں سوجھی ہے، خُدا چاہے(۱) تو سوائے اِس فِکر کے، دوسری کوئی طَرح مخلصی کی نظر نہیں آتی۔ میں نے کہا: فرماؤ تو وہ کون سی تدبیر ہے؟ کہنے لگی: اگر تو سعی اور محنت کرے، تو ہو سکے۔ میں نے کہا: مَیں فرماں بردار ہوں؛ اگر حکم کرو، تو جلتی آگ میں کُود پڑوں اور سیڑھی پاؤں، تو تمھاری خاطر آسمان پر چلا جاؤں۔ جو کچھ فرماؤ، سو بجا لاؤں۔

مَلِکہ نے کہا: تُو بڑے بُت کے بُت(۲) خانے میں جا اور جس جگہ جوتیاں اُتارتے ہیں، وہاں ایک سیاہ ٹاٹ پڑا رہتا ہے؛ اِس مُلک کی رسم ہے کہ جو کوئی مُفلس اور محتاج ہو جاتا ہے، اُس جگہ وہ ٹاٹ اوڑھ کر بیٹھتا ہے۔ یہاں کے لوگ جو زیارت کو جاتے ہیں، موافق اپنے اپنے مقدور کے اُسے دیتے ہیں۔ جب دو چار دن میں مال جمع ہوتا ہے، پنڈے(۳) ایک خلعت بڑے بُت کی سرکار سے دے کر اُسے رُخصت کرتے ہیں۔ وہ تو نگر ہو کر چلا

جاتا ہے۔ کوئی نہیں معلوم کرتا کہ یہ کون تھا۔ تو بھی جاکر اُس پلاس کے نیچے بیٹھ اور ہاتھ منہ اپنا خوب طرح چھپالے اور کسُو سے نہ بول۔ بعد تین دن کے باہمن اور بُت پرست ہرچند تجھے خلعت دے کر رخصت کریں، تو وہاں سے ہرگز نہ اُٹھ۔ جب نہایت منت کریں، تب تو بولیو کہ مجھے روپیہ پیسا(۲) کچھ درکار نہیں، مَیں مال کا بھوکھا نہیں؛ مَیں مظلوم ہوں، فریاد کو آیا ہوں۔ اگر برہمنوں کی ماتا میری داد دے تو بہتر؛ نہیں، بڑا بُت میرا انصاف کرے گا اور اُس ظالم سے یہی بڑا بُت میری فریاد کو پہنچے گا۔ جب تک وہ ما باہمنوں کی آپ تیرے پاس نہ آوے؛ بہتیرا(۴) کوئی مناوے، تو راضی نہ ہوجیو۔ آخر لاچار ہوکر وہ خود تیرے نزدیک آوے گی۔ وہ بہت بوڑھی ہے، دو سو چالیس برس کی عمر ہے، اور چھتّیس بیٹے اُس کے جنے ہوئے بُت خانے کے سردار ہیں۔ اور اُس کا بڑے بُت کے پاس بڑا درجہ ہے، اِس سبب اُس کا اِتنا بڑا حکم ہے کہ جتنے چھوٹے بڑے اِس ملک کے ہیں، اُس کے کہنے کو اپنی سعادت جانتے ہیں۔ جو وہ فرماتی ہے، بہ سر و چشم مانتے ہیں۔ اُس کا دامن پکڑ کر کہیو: اے مائی! اگر مجھ مظلوم مسافر کا انصاف ظالم سے نہ کرے گی، تو مَیں بڑے بُت کی خدمت میں ٹکریں ماروں گا۔ آخر وہ رحم کھا کر تجھ سے میری سفارش(۶) کرے گا۔

جب وہ تیرا احوال پوچھے تو کہیو کہ مَیں عجم کا رہنے والا ہوں۔ بڑے بُت کی زیارت کی خاطر اور تمھاری عدالت سن کر کالے کوسوں سے

یہاں آیا ہوں۔ کئی دنوں آرام سے رہا۔ میری بی بی بھی میرے ساتھ آئی تھی۔ وُہ جوان ہے اور صورت شکل بھی اچھی ہے اور آنکھ ناک سے دُرست ہے۔ معلوم نہیں کہ شاہِ بندر نے اُسے کیوں کر دیکھا، بہ زور مجھ سے چھین کر اپنے گھر میں ڈال دیا۔ اور ہم مسلمانوں کا یہ قاعدہ ہے کہ جو نامحرم عورت کو اِن کی دیکھے یا چھین لے، تو واجب ہے کہ اُس کو جس طرح ہو، مار ڈالیں اور اپنی جُورو کو لے لیں۔ اور نہیں تو، کھانا پینا چھوڑ دیں، کیوں کہ جب تلک وُہ جیتا رہے، وُہ عورت خاوند پر حرام ہے۔ اب یہاں لاچار ہو کر آیا ہوں، دیکھیے تم کیا اِنصاف کرتی ہو! جب مَلِکہ نے مجھے یہ سب سِکھا پڑھا دیا، مَیں رُخصت ہو، اُسی تاب دان کی راہ سے نکلا اور وُہ جالی آہنی پھر لگا دی۔

صُبح ہوتے بُت خانے میں گیا اور وُہ سیاہ پلاس اوڑھ کر بیٹھا۔ تین رُوز میں اِتنا روپیہ اور اشرفی اور کپڑا میرے نزدیک جمع ہوا کہ انبار لگ گیا۔ چوتھے دِن پنڈے، بھجن کرتے اور گاتے بجاتے، خِلعت لیے میرے پاس آئے اور رُخصت کرنے لگے۔ مَیں راضی نہ ہوا اور دُہائی بڑے بُت کی دی کہ مَیں گدائی کرنے نہیں آیا، بلکہ اِنصاف کے لیے بڑے بُت اور برہمنوں کی ماتا کے پاس آیا ہوں۔ جب تلک اپنی داد نہ پاؤں گا، یہاں سے نہ جاؤں گا۔ یِتّے سُن کر، اُس پیر زال کے رُو بہ رُو گئے اور میرا احوال بیان کیا۔ بعد اُس کے ایک چوبے آیا اور میرے تئیں کہنے لگا کہ چل، ماتا بلاتی ہے۔ مَیں وُو نہیں ٹاٹ کالا سِر سے پاؤں تک اوڑھے ہوئے دِہرے میں

گیا۔ دیکھتا ہوں کہ ایک جڑاؤ سنگھاسن پر، جس میں لعل، الماس اور موتی، مونگا لگا ہوا ہے، بڑا بُت بیٹھا ہے۔ اور ایک کرسیِ زرّیں پر فرشِ معقول بچھا ہے، اُس پر ایک بڑھیا سیاہ پوش، مسند تکیے لگائے، اور دو لڑکے دس بارہ برس کے، ایک داہنے، ایک بائیں، شان و شوکت اور تجمّل سے بیٹھی ہے۔ مجھے آگے بُلایا۔ میں ادب سے آگے گیا اور تخت کے پایے کو بوسہ دیا، پھر اُس کا دامن پکڑ لیا۔ اُس نے میرا احوال پوچھا۔ میں نے اُسی طرح، جس طور سے ملکہ نے تعلیم کر دیا تھا، ظاہر کیا۔ سُن کر بولی کہ کیا مسلمان اپنی استریوں کو اوجھل میں رکھتے ہیں؟ میں نے کہا: ہاں، تمھارے بچّوں کی خیر ہو، یہ ہماری رسمِ قدیم ہے۔ بولی کہ تیرا اچھا مذہب ہے۔ میں ابھی حکم کرتی ہوں کہ شاہِ بندر بہ مع تیری جورو، آن کر حاضر ہوتا ہے، اور اُس گیدی کو ایسی سیاست کروں کہ بارِ دیگر ایسی حرکت نہ کرے اور سب کے کان کھڑے ہوں اور ڈریں۔ اپنے لوگوں سے پوچھنے لگی کہ شاہِ بندر کون ہے؟ اُس کی یہ مجال ہوئی کہ بگانی تریا کو بہ زور چھین لیتا ہے! لوگوں نے کہا کہ فلانا شخص ہے۔ یہ سُن کر، اُن دونوں لڑکوں کو (جو پاس بیٹھے تھے) فرمایا کہ جلدی اِس مانُس کو ساتھ لے کر بادشاہ کے پاس جاؤ اور کہو کہ ماتا فرماتی ہے کہ حکم بڑے بُت کا یہ ہے کہ شاہِ بندر آدمیوں پر زور زیادتی کرتا ہے، چناں چہ اِس غریب کی عورت کو چھین لیا ہے۔ اُس کی تقصیر بڑی ثابت ہوئی۔ جلد اُس گُم راہ کے مال کا تالیقہ* کر کر، اِس ترک کے (کہ ہمارا منظورِ نظر ہے) حوالے کر، نہیں تو آج رات کو تو ستیاناس ہوگا اور

ہمارے غضب میں پڑے گا۔ وے دونوں طفل اٹھ کر منڈل سے باہر آئے اور سوار ہوئے۔ سب پنڈے سنکھ بجاتے اور آرتی گاتے جلو میں ہولیے۔

غرض وہاں کے چھوٹے بڑے، جہاں ان لڑکوں کا پانو پڑتا تھا، وہاں کی مٹی تبرک جان کر اٹھا لیتے اور آنکھوں سے لگاتے۔ اسی طرح بادشاہ کے قلعے تک گئے۔ بادشاہ کو خبر ہوئی، ننگے پانو استقبال کی خاطر نکل آیا اور ان کو بڑے مان مہت سے لے جا کر اپنے پاس تخت پر بٹھایا اور پوچھا: آج کیوں کر تشریف فرمانا ہوا؟ ان دونوں برہمن بچوں نے، ما کی طرف سے جو کچھ سن آئے تھے، کہا اور بڑے بت کی خفگی سے ڈرایا۔

بادشاہ نے سنتے ہی فرمایا: بہت خوب! اور اپنے نوکروں کو حکم کیا کہ محصل جاویں اور شاہِ بندر کو بہ مع اس عورت کے جلد حضور میں حاضر کریں؛ تو میں تقصیر اس کی تجویز کر کے سزا دوں۔ یہ سن کر میں اپنے دل میں گھبرایا کہ یہ بات تو اچھی نہ ہوئی۔ اگر شاہِ بندر کے ساتھ ملکہ کو بھی لاویں، تو پردہ فاش ہوگا اور میرا کیا احوال ہوگا! دل میں نہایت خوف زدہ ہو کر خدا کی طرف رجوع کی؛ لیکن میرے منھ پر ہوائیاں اڑنے لگیں اور بدن کانپنے لگا۔ لڑکوں نے میرا یہ رنگ دیکھ، شاید دریافت کیا کہ یہ حکم اس کی مرضی کے موافق نہ ہوا؛ دونہیں خفا و برہم ہو کر اٹھے اور بادشاہ کو جھڑک کر بولے: اے مردک! تو دیوانہ ہوا ہے، جو فرماں برداری سے بڑے بت کی نکلا اور ہمارے بچن کو جھوٹھ سمجھا، جو دونوں کو بلوا کر تحقیق کیا چاہتا ہے! اب خبردار! تو غضب میں بڑے بت کے پڑا۔ ہم نے تجھے حکم پہنچا دیا، اب تو جان اور

بڑا بُت جانے۔

اِس کہنے سے بادشاہ کی عَجَب حالت ہوئی کہ ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا اور سر سے پاؤں تلک رَعشہ ہو گیا، مِنّت کر کے منانے لگا۔ پٹے دونوں ہرگز نہ بیٹھے، لیکن کھڑے رہے۔ اِس میں جتنے اَمیر اُمَرا وہاں حاضر تھے، ایک مُنہ ہو کر بَدگوئی شاہِ بَندر کی کرنے لگے کہ وُہ ایسا ہی حرام زادہ، بَدکار اور پاپی ہے۔ ایسی ایسی حَرکتیں کرتا ہے کہ حُضور میں بادشاہ کے کیا کیا عرض کریں۔ جو کچھ بَرہمنوں کی ماتا نے کہلا بھیجا ہے، درست ہے؛ اِس واسطے کہ حُکم بڑے بُت کا ہے، یہ دَروغ کیوں کر ہوگا۔ بادشاہ نے جب سب کی زُبانی ایک ہی بات سُنی، اپنے کہنے سے بہت خَجِل اور نادِم ہوا۔ جلد ایک خِلعتِ پاکیزہ مجھے دی اور حُکم نامہ اپنے ہاتھ سے لکھ، اُس پر دَستی مُہر کر کر میرے حوالے کیا۔ اور ایک رُقعہ (۲) مادرِ بَرہمنان کو لکھا اور جَواہر، اَشرفیوں کے خوان لڑکوں کے رُو بہ رُو پیش کش رکھ کر رُخصت کیا۔ مَیں خوشی بہ خوشی بُت خانے میں آیا اور اُس بُڑھیا کے پاس گیا۔

(۴)
—— بادشاہ کا خط (۳) جو آیا تھا، اُس کا یہ مضمون تھا: اَلقاب کے بعد بندگی، عَجز و نیاز لکھ کر لکھا تھا کہ مُوافق حُکمِ حُضور کے (۵) اِس مردِ مسلمان کو خدمت شاہِ بَندر کی مُقرّر ہوئی اور خِلعت دی گئی؛ اب یہ اُس کے قتل کرنے کا مختار ہے۔ اور سارا مال و اَموال اُس کا اِس مُرک کا ہوا، جو چاہے سو کرے۔ اُمّید وار ہوں کہ میری تقصیر مُعاف ہو۔ بَرہمنوں کی ماں نے خوش ہو کر فرمایا کہ نَوبت (۶) خانے میں بُت خانے کی نَوبت بجے۔ اور پانچ سو سپاہی بَرقنداز،

جو بال باندھی کوڑی ماریں، مُسلّح میرے ہمراہ کر دیے اور حُکم کیا کہ بندر میں جاکر، شاہِ بندر کو دستگیر کرکے اِس مُسلمان کے حوالے کریں۔ جس طرح کے عذاب سے اِس کا جی چاہے، اُسے مارے۔ اور خبردار! سوائے اِس عزیز کے، کوئی محلّے سرا میں داخل نہ ہووے۔ اور اُس کے مال و خزانے کو امانت اِس کے سُپرد کریں۔ جب یہ بہ خوشی رُخصت کرے، رسید اور صافی نامہ اِس سے لے کر پھر آویں۔ اور ایک سرے پاؤ بُتِ بُزُرگ کی سرکار سے میرے تئیں دے کر، سوار کروا کر وِداع کیا۔

جب مَیں بندر میں پہنچا، ایک آدمی نے بڑھ کر شاہِ بندر کو خبر کی۔ وُہ حیران سا بیٹھا تھا کہ مَیں جا پہنچا۔ غُصّہ تو دل میں بھر ہی رہا تھا، دیکھتے ہی شاہِ بندر کو، تلوار کھینچ کر ایسی گردن میں لگائی کہ اُس کا سر الگ بُھٹّا سا اُڑ گیا۔ اور وہاں کے گُماشتے، خزانچی، مُشرِف، داروغوں کو پکڑوا کر سب دفتر ضبط کیے۔ اور مَیں محلّے میں داخل ہوا، مَلِکہ سے مُلاقات کی۔ آپس میں گلے لگ کر روئے اور شُکر خُدا کا کیا۔ میں نے اُس کے، اُس نے میرے آنسو پونچھے۔ پھر باہر مسند پہ بیٹھ کر، اہلِ کاروں کو خِلعتیں دیں اور اپنی اپنی خدمتوں پر سب کو بحال کیا۔ نوکر اور غُلاموں کو سرفرازی دی۔ وُہ لوگ جو منڈپ سے میرے ساتھ متعیّن ہوئے تھے، ہر ایک کو انعام و بخشش دے کر اور اُن کے جمعدار، رسالے دار کو جوڑے پہنا کر رُخصت کیا اور جواہر بیش قیمت اور تھان نور بافی اور شال بافی اور زردوزی اور جنس و تحفے ہر ایک مُلک کے اور نقد بہت سا بادشاہ کی نذر کی خاطر، اور موافق ہر ایک

امراؤں کے درجہ بہ درجہ، اور پنڈیاین کے لیے اور سب پنڈوں کے تقسیم کرنے کی خاطر اپنے ساتھ لے کر، بعد ایک ہفتے کے میں بت کدے میں آیا اور اس ماتا کے آگے بہ طریق بھینٹ کے رکھا۔ اس نے ایک اور خلعت سرفرازی کی مجھے بخشی اور خطاب دیا۔ پھر بادشاہ کے دربار میں جا کر پیش کش گزرانی، اور جو جو ظلم و فساد شاہِ بندر نے ایجاد کیا تھا، اس کے موقوف کرنے کی خاطر عرض کی۔ اِس سبب سے بادشاہ اور امیر، سوداگر سب مجھ سے راضی ہوئے۔ بہت نوازش مجھ پر فرمائی اور خلعت اور گھوڑا دے کر منصب، جاگیر عنایت کی اور آبرو، حرمت بخشی۔

جب بادشاہ کے حضور سے باہر آیا، شاگرد پیشوں کو اور اہل کاروں کو اتنا کچھ دے کر راضی کیا کہ سب میرا کلمہ پڑھنے لگے۔ غرض میں بہت مرفہ الحال ہو گیا اور نہایت چین و آرام سے اس ملک میں، ملکہ سے عقد باندھ کر، رہنے لگا اور خدا کی بندگی کرنے لگا۔ میرے انصاف کے باعث رعیت، پرجا سب خوش تھے۔ مہینے میں ایک بار بت خانے میں اور بادشاہ کے حضور آتا جاتا۔ بادشاہ روز بہ روز زیادہ سرفرازی فرماتا، آخر مصاحبت میں مجھے داخل کیا۔ میری بے صلاح کوئی کام نہ کرتا۔ نہایت بے فکری سے زندگی گزرنے لگی، مگر خدا ہی جانتا ہے، اکثر اندیشہ ان دونوں بھائیوں کا دل میں آتا کہ وے کہاں ہوں گے اور کس طرح ہوں گے!

بعد مدت دو برس کے ایک قافلہ سوداگروں کا ملک زیرباد سے اس بندر میں آیا۔ وے سب قصد عجم کا رکھتے تھے، انھوں نے یہ چاہا کہ دریا کی راہ

سے اپنے مُلک کو جاویں۔ وہاں کا قاعدہ یہ تھا کہ جو کارواں آتا، اُس کا سردار سَوغات و تُحفہ ہر ایک مُلک کا میرے پاس لاتا اور نذر گزرانتا۔ دوسرے رُوز مَیں اُس کے مکان پر جاتا، وہ نیکی (۲) بہ طریق محصُول کے اُس کے مال سے لیتا اور پروانگی کوچ کی دیتا۔ اِسی طَرح وہ سَوداگر زیرباد کے بھی میری مُلاقات کو آئے اور بے بہا پیش کَش لائے۔ دوسرے دن مَیں اُن کے خیمے میں گیا۔ دیکھا تو دُو آدمی پھٹے پُرانے کپڑے پہنے، گٹھری، بُقچے سر پر اُٹھا کر میرے رُوبہ رُو لاتے ہیں۔ بعد مُلاحظہ کرنے کے پھر اُٹھا لے جاتے ہیں اور بڑی محنت اور خدمت کر رہے ہیں۔ میں نے خوب سمجھا کر جو دیکھا، تو یہی میرے دونوں بھائی ہیں۔ اُس وقت غیرت اور حمیّت نے نہ چاہا کہ اِن کو اِس طَرح خدمت گاری میں دیکھوں۔ جب مَیں اپنے گھر کو چلا، آدمیوں کو کہا کہ اُن دونوں شخصوں کو لیے آؤ۔ جب اِن کو لائے، پھر لباس و پُوشاک بنوادی اور اپنے پاس رکھا۔ اِن بدذاتوں نے پھر میرے مارنے کا منصُوبہ کر کر، ایک رُوز آدھی رات میں سب کو غافل پا کر، چُوروں کی طَرح میرے سرہانے آ پہنچے۔ میں نے اپنی جان کے ڈر سے چوکیداروں کو دروازے پر رکھا تھا اور یہ کتّا وفادار میری چارپائی کی پٹّی تلے سُوتا تھا۔ جُوں اِنھوں نے تلواریں میان سے کھینچیں، پہلے کُتّے نے بھونک کر اِن پر حملہ کیا۔ اُس کی آواز سے سب جاگ پڑے، مَیں بھی ہل ہلا کر چونکا۔ آدمیوں نے اُن کو پکڑا، معلوم ہوا کہ آپ ہی ہیں۔ سب لعنتیاں (۸) دینے لگے کہ باوجود اس خاطرداری کے یہ کیا حرکت اِن سے ظہور میں آئی۔

بادشاہ سلامت! تب تو مَیں بھی ڈرا۔ مَثَل مشہور ہے: ایک خطا، دو خطا، تیسری خطا: بادر بہ خطا۔ دل میں یہی صَلاح ٹھہری کہ اب اِن کو مُقیّد کروں۔ لیکن اگر بَندی خانے میں رکھوں(۳)، تو ان کا کون خبر گیران رہے گا؛ بھوکھ پیاس سے مرجائیں گے، یا کوئی اور سوانگ* لائیں گے؛ اِس واسطے قفس* میں رکھا ہے کہ ہمیشہ میری نظروں کے تلے رہیں، تو میری خاطر جمع رہے۔ مبادا آنکھوں سے اوجھل ہوکر کچھ اور مکر کریں۔ اور اِس کُتّے کی عزّت اور حُرمت، اِس کی نمک حلالی اور وفاداری(۴) کا سبب ہے۔ سُبحان اللہ! آدمی بے وَفا بدتر حیوانِ باوفا سے ہے۔ میری یہ سرگذشت تھی جو حضور میں عرض کی؛ اب خواہ قتل فرمائیے یا جان بخشی کیجے، حکم بادشاہ کا ہے۔

مَیں نے سن کر، اُس جوانِ باایمان پر آفریں کی اور کہا کہ تیری مُروّت میں کچھ خلل نہیں اور ان کی بے حیائی اور حرام زادگی(۵) میں ہرگز قصور نہیں۔ سچ ہے: کُتّے کی دُم کو بارہ برس گاڑو، تو بھی ٹیڑھی کی ٹیڑھی رہے(۶)۔ اُس کے بعد مَیں نے حقیقت اُن بارہوں لعل کی (کہ اُس کُتّے کے پٹّے میں تھے) پوچھی۔ خواجہ بولا کہ بادشاہ کی صد و بیست سال کی عمر ہو، اُسی بندر میں، جہاں مَیں حاکم تھا، بعد تین چار سال کے ایک روز بالاخانے پر محل کے (کہ بلند تھا) واسطے سیر اور تماشے دریا و(۹) صحرا کے مَیں بیٹھا تھا اور ہر طرف دیکھتا تھا۔ ناگاہ ایک طرف جنگل میں، کہ وہاں شاہ راہ نہ تھی(۱۰)، دو آدمی کی تصویر سی نظر آئی کہ چلے جاتے ہیں۔ دوربین لے کر دیکھا تو عجب ہیئت کے انسان دکھائی دیے۔ چوب داروں کو اُن کے بلانے کے واسطے دوڑایا۔

جب وے آئے، معلوم ہوا کہ ایک عورت اور ایک مرد ہے۔ رنڈی کو محل سرا میں ملکہ کے پاس بھیج دیا اور مرد کو روبہ رو بلایا۔ دیکھا تو ایک جوان برس بیس بائیس کا، داڑھی مونچھ آغاز ہے، (۱) لیکن دھوپ کی گرمی سے اُس کے چہرے کا رنگ کالے توے کا سا ہو رہا ہے، اور سر کے بال اور ہاتھوں کے ناخون بڑھ کر بن مانس کی صورت بن رہا ہے۔ (۲) اور ایک لڑکا برس تین چار ایک کا کاندھے پر، اور دو آستینیں کُرتے کی بھری ہوئیں، ہیکل کی طرح گلے میں ڈالے۔ عجب صورت اور عجب وضع اُس کی دیکھی۔ میں نے نہایت حیران ہو کر پوچھا: اے عزیز! تو کون ہے اور کس مُلک کا باشندہ ہے اور یہ کیا تیری حالت ہے؟ وہ جوان بے اختیار رونے لگا اور وہ ہمیانی کھول کر میرے آگے زمین پر رکھی اور بولا: اَلجُوع، اَلجُوع! واسطے خدا کے کچھ کھانے کو دو! مدت سے گھاس اور بناس پتیاں کھاتا چلا آتا ہوں، ایک ذرا قوت مجھ میں باقی نہیں رہی۔ وونہیں نان و کباب اور شراب میں نے منگوا دی، وہ کھانے لگا۔

اتنے میں خواجہ سرا محل سے کئی تھیلیاں اور اُس کے قبیلے کے پاس سے لے آیا۔ میں نے اُن سب کو کھلوایا۔ ہر ایک قسم کے جواہر دیکھے کہ ایک ایک دانہ اُن کا، خراج سلطنت کا کہا چاہیے۔ ایک سے ایک اَن مول: ڈول میں اور تول میں اور آب داری میں۔ اور اُن کی چھوٹ پڑنے سے سارا مکان بوقلموں ہو گیا۔ جب اُس نے ٹکڑا کھایا اور ایک جام دارو کا پیا اور دم لیا، حواس بجا ہوئے، تب میں نے پوچھا: یہ پتھر تجھے کہاں ہاتھ لگے؟ جواب دیا کہ میرا وطن ولایتِ آذربائیجان ہے۔ (۹) لڑکپن میں گھر بار، ماں باپ

سے جُدا ہوکر بہت سختیاں کھینچیں اور ایک مُدّت تلک میں زندہ دَرگور تھا اور کئی بار مَلَکُ الموت کے پنجے سے بچا ہوں۔ میں نے کہا: اَے مردِ آدمی! (۱) مُفصّل کہہ تو معلوم ہو۔ تب وُہ اپنا اَحوال بیان کرنے لگا کہ میرا باپ سَوداگر پیشہ تھا۔ ہمیشہ سفر ہندوستان و رُوم و چین و خطا و فرنگ کا کرتا۔ جب میں دس بَرس کا ہوا، باپ ہندوستان کو چلا، مجھے اپنے ساتھ لے جانے کو چاہا۔ ہرچند والدہ نے اور خالا، مُمانی، پھوپھی (۲) نے کہا کہ ابھی یہ لڑکا ہے، لائقِ سفر کے نہیں ہوا؛ والد نے نہ مانا اور کہا کہ میں بوڑھا ہوا؛ اگر یہ میرے رُو بہ رُو تربیت نہ ہوگا، تو یہ حسرت گور میں لے جاؤں گا۔ مرد بچا ہے (۳)، اب نہ سیکھے گا تو کب سیکھے گا۔

یہ کہہ کر مجھے خواہ مخواہ ساتھ لیا اور روانہ ہوا۔ خیر و عافیت سے راہ کٹی۔ جب ہندوستان میں پہنچے، کچھ جنس وہاں بیچی (۴)، اور وہاں کی سوغات لے کر زیرباد کے مُلک کو گئے۔ یہ بھی سفر بہ خوبی ہوا۔ وہاں سے بھی خرید فروخت کرکے جہاز پر سوار ہوئے کہ جلدی وطن میں پہنچیں۔ بعد ایک مہینے کے ایک رُوز آندھی اور طوفان آیا اور مینہ موسلا دھار برسنے لگا۔ سارا زمین و آسمان دُھواں دھار ہوگیا اور پتوار جہاز کی ٹوٹ گئی۔ مُعلّم، ناخدا سر پیٹنے لگے۔ دس دن تلک ہوا اور مَوج جدھر چاہتی تھی، لیے جاتی تھی۔ گیارہویں (۱۰) رُوز ایک پہاڑ سے ٹکر کھا کے جہاز پُرزے پُرزے ہوگیا۔ نہ معلوم ہوا کہ باپ اور نوکر چاکر اور اسباب کہاں گیا۔

میں نے اپنے تئیں ایک تختے پر دیکھا۔ سہ شبانہ رُوز وُہ پڑا بے اختیار چلا گیا (۱۱)، چوتھے دن کنارے پر جا لگا۔ مجھ میں فقط جان باقی تھی۔ اُس پر سے

اُتر کر، گھٹنیوں چل کر، بارے کسو نہ کسو طرح زمین پر پہنچا۔ دور سے کھیت نظر آئے اور بہت سے آدمی وہاں جمع تھے، لیکن سب سیاہ فام اور ننگے مادر زاد۔ مجھ سے کچھ بولے، لیکن میں نے اُن کی زبان مطلق نہ سمجھی۔ وہ کھیت چنوں کا تھا؛ وہ آدمی آگ کا الاؤ جلا کر، بوٹوں[1] کے ہولے کرتے تھے اور کھاتے تھے۔ اور کئی ایک گھر بھی وہاں نظر آئے۔ شاید اُن کی خوراک یہی تھی اور وہیں بستے تھے۔ مجھے بھی اشارت کرنے لگے کہ تو بھی کھا۔ میں نے بھی ایک مٹھی اُکھاڑ کر بھونے اور پھانکنے لگا۔ تھوڑا سا پانی پی کر ایک گوشے میں سو رہا۔ بعد دیر کے جب جاگا، اُن میں سے ایک شخص میرے نزدیک آیا اور راہ دکھانے لگا۔ میں نے تھوڑے سے چنے اور اُکھیڑ لیے اور اُس راہ پر چلا۔ ایک کف دست میدان تھا، گویا صحرائے قیامت کا نمونہ کہا چاہیے؛ وہی بوٹ کھاتا ہوا چلا جاتا تھا۔ بعد چار دن کے ایک قلعہ نظر آیا۔ جب پاس گیا، تو ایک کوٹ دیکھا بہت بلند، تمام پتھر کا، اور ہر ایک اننگ اُس کی دو دو کوس کی، اور دروازہ ایک سنگ کا تراشا ہوا۔ ایک قفل بڑا سا جڑا تھا لیکن وہاں انسان کا نشان نظر نہ پڑا۔ وہاں سے آگے چلا۔ ایک ٹیلا دیکھا کہ اُس کی خاک سُرمے کے رنگ سیاہ تھی۔ جب اُس تل کے پار ہوا، تو ایک شہر نظر پڑا بہت بڑا، گرد شہر پناہ اور جابجا برج۔ ایک طرف شہر کے دریا تھا بڑے پاٹ کا۔ جاتے جاتے دروازے پر گیا اور بسم اللہ کہہ کر قدم اندر رکھا۔ ایک شخص کو دیکھا پوشاک اہل فرنگ کی پہنے ہوئے کرسی پر بیٹھا ہے۔ جوں اُن نے مجھے اجنبی مسافر دیکھا اور میرے منہ سے بسم اللہ سنی، پکارا کہ آگے

آؤ۔ میں نے جا کر سلام کیا۔ نہایت مہربانی سے سلام کا جواب دیا۔ تُرت میرے رُوبرو
(۱)
پاؤ رُوٹی اور مسکہ اور مُرغ کا کباب اور شراب رکھ کر کہا: پیٹ بھر کر کھاؤ۔ میں نے تھوڑا سا کھایا اور پیا اور بے خبر ہو کر سُویا۔ جب رات ہو گئی تب آنکھ کھلی۔ ہاتھ مُنہ دُھویا۔ پھر مجھے کھانا کھلایا اور کہا: اَے بیٹا! اپنا احوال کہہ۔ جو کچھ مجھ پر گزرا تھا، سب کہہ سُنایا۔ تب بُولا کہ یہاں تو کیوں آیا؟ میں نے دِق ہو کر کہا: شاید تو دیوانہ ہے! میں نے بعد مُدّت کی محنت کے اب بستی کی صورت دیکھی ہے، خُدا نے یہاں تلک پہنچایا، اور تو کہتا ہے کیوں آیا۔ کہنے لگا: اب تو آرام کر، کل جو کہنا ہوگا، کہوں گا۔

جب صُبح ہوئی، بُولا: کوٹھری میں پھاوڑا اور چھلنی اور تُوبڑا ہے، باہر لے آ۔ میں نے دل میں کہا کہ خُدا جانے روٹی کھلا کر کیا محنت مجھ سے کروائے گا! لاچار وُہ سب نکال کر اُس کے رُوبرو لایا۔ تب اُس نے فرمایا کہ اُس ٹیلے پر جا اور ایک گز کے مُوافق گڑھا کھود۔ وہاں سے جو کچھ نکلے، اِس چھلنی میں چھان۔ جو نہ چھن سکے، اُسے تُوبڑے میں بھر کر میرے پاس لا۔ میں وُہ سب چیزیں لے کر وہاں گیا اور اُتنا ہی کھود کر، چھان چھون کر تُوبڑے میں ڈالا۔ دیکھا تو
(۵)
سب جواہر رنگ بہ رنگ کے تھے۔ اُن کی جُوت سے آنکھیں چُوندھیا گئیں۔ اُسی طرح تھیلے کو مُونہا مُنہ بھر کر اُس عزیز کے پاس لے گیا۔ دیکھ کر بُولا کہ جو اِس
(۷)
میں بھرا ہے، تو لے اور یہاں سے جا، کہ تیرا رہنا اِس شہر میں خوب نہیں۔ میں نے جواب دیا کہ صاحب نے اپنی جانب میں بڑی مہربانگی کی کہ اِتنا کچھ کنکر پتھر دیا، لیکن میرے کس کام کا! جب بھُوکھا ہوں گا، تو نہ اِن کو چبا سکوں گا نہ

پیٹ بھرے گا۔ پس اگر اور بھی دو، تو میرے کس کام آئیں گے! وہ مرد ہنسا اور کہنے لگا کہ مجھ کو تجھ پر افسوس آتا ہے کہ تو بھی ہماری مانند مُلکِ عجم کا متوطّن ہے، اِس لیے مَیں منع کرتا ہوں؛ نہیں تو، جان۔ اگر خواہ نہ خواہ تیرا یہی قصد ہے کہ شہر میں جاؤں، تو میری انگوٹھی لیتا جا۔ جب بازار کے چوک میں جاوے، تو ایک شخص سفید ریش (١) وہاں بیٹھا ہوگا اور اُس کی صورت شکل مجھ سے بہت مشابہ ہے، میرا بڑا بھائی ہے، اُس کو یہ چھاپ دیجو، تو وہ تیری خبر گیری کرے گا۔ اور جو کچھ وہ کہے، اُسی موافق کام کیجو، نہیں تو مُفت مارا جائے گا۔ اور میرا حکم یہیں تلک ہے، شہر میں میرا دخل نہیں۔

مَیں نے وہ خاتم اُس سے لی اور سلام کر کر رخصت ہوا، شہر میں گیا۔ بہت خاصہ شہر دیکھا۔ کوچہ و بازار صاف اور زن و مرد بے حجاب آپس میں خرید فروخت کرتے، سب خوش لباس۔ مَیں سیر کرتا اور تماشا دیکھتا جب چوک کے چوراہے میں پہنچا، ایسا اِزدِحام تھا کہ تھالی پھینکیے تو آدمیوں کے سر پر چلی جائے۔ خِلقت کا یہ ٹھٹ بندھ رہا تھا کہ آدمی کو راہ چلنا مشکل تھا۔ جب کچھ بھیڑ چھٹی، مَیں بھی دھکم دھکا کرتا ہوا آگے گیا۔ بارے اُس عزیز کو دیکھا کہ ایک چوکی پر بیٹھا ہے اور ایک جڑاؤ چپاق رو بہ رو دھرا ہے۔ مَیں نے جا کر سلام کیا اور وہ مُہر دی۔ نظرِ غضب سے میری طرف دیکھا اور بولا: کیوں تو یہاں آیا اور اپنے تئیں بلا میں ڈالا؟ مگر میرے بے وقوف بھائی نے تجھے منع نہ کیا تھا؟ مَیں نے کہا: اُنھوں نے تو کہا، لیکن مَیں نے نہ مانا اور تمام کیفیت (٨) اپنی اِبتدا سے اِنتہا تک کہہ سنائی۔ وہ شخص اُٹھا اور مجھے ساتھ

لے کر اپنے گھر کی طرف چلا۔ اُس کا مکان بادشاہوں کا سا دیکھنے میں آیا اور بہت سے نوکر چاکر اُس کے تھے۔ جب خلوت میں جا کر بیٹھا، یہ مُلائمت بولا کہ اے فرزند! یہ کیا تو نے حماقت کی کہ اپنے پاؤں سے گور میں آیا! کوئی بھی اِس کم بخت طلسماتی شہر میں آتا ہے! میں نے کہا: مَیں اپنا احوال پیش تر کہہ چکا ہوں، اب تو قسمت لے آئی؛ لیکن شفقت فرما کر یہاں کی راہ و رسم سے مطلع کیجے، تو معلوم کروں کہ اِس واسطے تم نے اور تمھارے بھائی نے مجھے منع کیا۔ تب وہ جوان مرد بولا کہ بادشاہ اور تمام رئیس اِس شہر کے رانڈے ہوئے ہیں۔ عجب طرح کا اُن کا رَویّہ اور مذہب ہے۔ یہاں بُت خانے میں ایک بُت ہے کہ شیطان اُس کے پیٹ میں سے نام اور ذات اور دین ہر کسو کا بیان کرتا ہے۔ پس جو کوئی غریب مسافر آتا ہے، بادشاہ کو خبر ہوتی ہے؛ اُسے مَندَر میں لے جاتا ہے اور بُت کو سجدہ کرواتا ہے۔ اگر ڈنڈوت کی، تو بہتر؛ نہیں تو بچارے کو دریا میں ڈبوا دیتا ہے۔ اگر وہ چاہے کہ دریا سے نکل کر بھاگے، تو آلت اور خُصیے اُس کے لمبے ⑤ ہو جاتے ہیں، ایسے کہ زمین میں گھسٹتے ہیں، مارے بوجھ کے وہ ہرگز چل نہیں سکتا۔ ایسا کچھ طلسم اِس شہر میں بنایا ہے۔ مجھ کو تیری جوانی پر رحم آتا ہے؛ مگر تیری خاطر ایک تدبیر کرتا ہوں کہ بھلا کوئی دن تو تو جیتا رہے اور اِس عذاب سے بچے۔ میں نے پوچھا: وہ کیا صورت تجویز کی ہے، ارشاد ہو۔ کہنے لگا: تجھے کتخدا کروں اور وزیر کی لڑکی تیری خاطر بیاہ لاؤں۔ میں نے جواب دیا کہ وزیر اپنی بیٹی مجھ سے مفلس کو کب دے گا، مگر جب اُن کا دین قبول کروں؛ سو یہ مجھ سے نہ ہو سکے گا۔

کہنے لگا: اِس شہر کی یہ رَسم ہے کہ جو کوئی اُس بُت کو سجدہ کرے؛ اگر فقیر ہو اور بادشاہ کی بیٹی کو مانگے، تو اُس کی خوشی کی خاطر حوالے کریں اور اُسے رنجیدہ نہ کریں۔ اور میرا بھی بادشاہ کے نزدیک اِعتبار ہے اور عزیز رکھتا ہے، لہٰذا سب اَرکان اور اَکابِر یہاں کے میری قدر کرتے ہیں۔ اور درمیان ایک ہفتے کے دو دن بُت کدے میں زیارت کو جاتے ہیں اور عبادت بجا لاتے ہیں، چناں چہ کل سب جمع ہووین گے، میں تجھے لے جاؤں گا۔

یہ کہہ کر، کھلا پلا کر سُلا رکھا۔ جب صُبح ہوئی، مجھے ساتھ لے کر بُت خانے کی طرف چلا۔ وہاں جا کر جو دیکھا تو آدمی آتے جاتے ہیں اور پرستش کرتے ہیں۔ بادشاہ اور امیر بُت کے سامھنے پنڈِتوں کے پاس، سر ننگے کیے، ادب سے دو زانو بیٹھے تھے اور نا کتخدا لڑکیاں اور لڑکے خوب صورت جیسے حور و غلمان، چاروں طرف صف باندھے کھڑے تھے۔ تب وُہ عزیز مجھ سے مُخاطِب ہوا کہ اَب میں جو کہوں، سو کر۔ میں نے قبول کیا کہ جو فرماؤ، سو بجا لاؤں۔ بولا کہ پہلے بادشاہ کے ہاتھ پانو کو بوسہ دے، بعد اُس کے وزیر کا دامن پکڑ۔ میں نے ویسا ہی کیا۔ بادشاہ نے پوچھا کہ یہ کون ہے اور کیا کہتا ہے؟ اُس مرد نے کہا: یہ جوان میرے رشتے میں ہے، بادشاہ کی قدم بوسی کی آرزو میں دور سے آیا ہے، اِس توقع پر کہ وزیر اِس کو اپنی غلامی میں سر بلند کرے، اگر حکم بُتِ کلاں کا اور مرضی حضور کی ہووے۔ بادشاہ نے پوچھا کہ ہمارا مذہب اور دین و آئین قبول کرے گا تو مبارک ہے۔ وُونہیں بُت خانے کا نقار خانہ بجنے لگا

اور بھاری خِلعت مجھے پہنائی اور ایک رسّی سیاہ میرے گلے میں ڈال کر، کھینچتے ہوئے، بُت کی (۲) سِنگھاسَن کے آگے لے جاکر، سجدہ کرواکر کھڑا کیا۔

بُت سے آواز نکلی کہ اے خواجہ زادے! خوب ہوا کہ تو ہماری بندگی میں آیا، اب ہماری رحمت اور عنایت کا اُمّیدوار رہ۔ یہ سُن کر سب خِلقت نے سجدہ کیا اور زمین میں لوٹنے لگے اور پکارے: دھن ہے! کیوں نہ ہو، تم ایسے ہی ٹھاکُر ہو۔ جب شام ہوئی، بادشاہ اور وزیر سوار ہوکر وزیر کے محل میں داخل ہوئے اور وزیر کی بیٹی کو، اپنے طور کی ریت رَسم کر کے، میرے حوالے کیا اور بہت سا دان دَہیز دیا اور بہت منّت (۴) دار ہوئے کہ بہ مُوجِب (۵) حُکم بڑے بُت کے اِسے تمھاری خدمت میں دیا ہے۔ ایک مکان میں ہم دونوں کو رکھا۔ اُس نازنین کو جو میں نے دیکھا، تو فی الواقع اُس کا عالَم پَری کا سا تھا۔ نکھ سکھ (۶) سے دُرست۔ جو جو خوبیاں پدمنی کی سُنی جاتی ہیں، سو سب اُس میں موجود تھیں۔ بہ فَراغت تمام میں نے صحبت کی اور حَظ اُٹھایا۔ صبح کو غُسل کر کے بادشاہ کے حُجرے میں حاضر ہوا۔ بادشاہ نے خِلعت دامادی کی عنایت کی اور حُکم فرمایا کہ ہمیشہ دربار میں حاضر رہا کرے۔ آخر کو بعد چند روز کے بادشاہ کی مُصاحبت میں داخل ہوا۔

بادشاہ میری صحبت سے نہایت محظوظ ہوتے اور اکثر خِلعت اور انعام عنایت کرتے، اگرچہ دُنیا کے مال سے میں غنی تھا، اس واسطے کہ میرے قبیلے کے پاس اتنا نقد و جنس اور جواہر تھا کہ جس کی حدّ و (۹) نہایت نہ تھی۔

دُو سال تک بہت عیش و آرام سے گزری۔ اِتّفاقاً وزیر زادی کو پیٹ رہا۔ جب ستو اتسا ہوا اور ان گنا مہینا[1] گزر کر پورے دن ہوئے، پیڑیں لگیں[2]، دائی جنائی آئی تو مُوا لڑکا پیٹ میں سے نکلا۔ اُس کا بِس جچا کو چڑھا[3] وہ بھی مر گئی۔ مَیں مارے غم کے دیوانہ ہو گیا کہ یہ کیا آفت ٹوٹی۔ اُس کے سرہانے بیٹھا رُوتا تھا، ایک بارگی رُونے کی آواز سارے محل میں بلند ہوئی اور چاروں طرف سے عورتیں آنے لگیں۔ جو آتی تھی، ایک دو ہتّڑ میرے سر پر مارتی اور اپنی کُس اور کُون کو ننگا کر کے، میرے مُنہ کے مُقابل کھڑی رہتی اور رُونا شروع کرتی۔ اِتنی رنڈیاں اکٹھی ہوئیں کہ میں اُن کے جوتڑوں میں چھپ گیا۔ نزدیک تھا کہ جان نکل جاوے، اِتنے میں کسو نے پیچھے سے گریبان میرا کھینچ کر گھسیٹا۔ دیکھوں تو وُہی مردِ عجمی ہے جس نے مجھے بیاہا تھا۔ کہنے لگا کہ احمق! تو کس لیے رُوتا ہے؟ میں نے کہا: اے ظالم! یہ تو نے کیا بات کہی! میری بادشاہت لُٹ گئی، آرام خانہ داری کا گیا گزرا؛ تو کہتا ہے کیوں غم کرتا ہے! وُہ عزیز تبسّم کر کے بولا کہ اب اپنی موت کی خاطر رُو۔ میں نے پہلے ہی تجھے کہا تھا کہ شاید اس شہر میں تیری اجل لے آئی ہے، سُو ہی ہوا۔ اب سِوائے مرنے کے تیری رہائی نہیں۔ آخر لوگ مجھے پکڑ کر بُت خانے میں لے گئے۔ دیکھا تو بادشاہ اور اُمرا اور چھتیس فرقہ رعیّت، یہ رجا وہاں جمع ہیں اور وزیر زادی کا مال اموال سب دھرا ہے۔ جو چیز جس کا جی چاہتا ہے، لیتا ہے اور اُس کی قیمت کے رُوپے دھر دیتا ہے۔

غرض سب اسباب کے نقد روپے ہوئے۔ اُن روپیوں کا جواہر خریدا گیا اور ایک صندوقچے میں بند کیا اور ایک دوسرے صندوق میں نان، حلوا اور گوشت کے کباب اور میوۂ خشک و تر اور کھانے کی چیزیں لے کر بھر دیں اور لاش اُس بی بی کی ایک صندوق میں رکھ کر، صندوق آرتھی کا ایک اونٹ پر لدوایا اور مجھے سوار کیا اور صندوقچہ جواہر کا میری بغل میں دیا اور سارے باہمن آگے آگے بھجن کرتے اور سنکھ بجاتے چلے اور پیچھے ایک خلقت مبارک باد کہتی ہوئی ساتھ ہو لی۔ اس طور سے اُسی دروازے سے کہ میں پہلے روز آیا تھا، شہر کے باہر نکلا۔ جونہیں داروغہ کی نگاہ مجھ پر پڑی، رونے لگا اور بولا: اے کم بخت اجل گرفتہ! میری بات نہ سُنی اور اس شہر میں جاکر مفت اپنی جان دی۔ میری تقصیر نہیں، میں نے منع کیا تھا۔ اُن نے یہ بات کہی، لیکن میں تو ہکا بکا ہو رہا تھا؛ نہ زبان یاری دیتی تھی کہ جواب دوں، نہ اوسان بجا تھے کہ دیکھیے انجام میرا کیا ہوتا ہے۔

آخر اُسی قلعے کے پاس، جس کا میں نے پہلے روز دروازہ بند دیکھا تھا، لے گئے اور بہت سے آدمیوں نے مل کر قفل کو کھولا اور تابوت اور صندوق کو اندر لے چلے۔ ایک پنڈت میرے نزدیک آیا اور سمجھانے لگا کہ مانُس ایک دن جنم پاتا ہے اور ایک روز ناس ہوتا ہے، دُنیا کا یہی آواگون ہے۔ اب یہ تیری استری اور پوت اور دھن اور چالیس دن کا اسباب بھوجن کا موجود ہے؛ اس کو لے اور یہاں رہ، جب تلک بڑا بُت تجھ پر مہربان ہووے۔ میں نے غصے میں چاہا کہ اُس بت پر اور وہاں کے رہنے

والوں پر اور اِس ربِّ رَحیم پر لعنت کہوں اور اُس باغبان کو دھول چھکّڑ کروں، وُہی مردِ عجمی اپنی زبان میں مانع ہوا کہ خبردار! ہرگز دَم مت مار۔ اگر کچھ بھی بولا، تو اِسی وقت تجھے جَلا دیں گے۔ خیر، جو تیری قسمت تھا سو ہوا۔ اب خُدا کے کرم سے اُمیدوار رہ، شاید اللہ تجھے یہاں سے جیتا نکالے۔

آخر سب مجھے تنِ تنہا چھوڑ کر اُس حصار سے باہر نکلے اور دروازہ پھر مُقفّل کردیا۔ اُس وقت مَیں اپنی تنہائی اور بے بَسی پر بے اختیار رُویا اور اُس عورت کی لوتھ پر لاتیں مارنے لگا کہ اَے مُردار! اگر تجھے جَنتے ہی مرجانا تھا، بیاہ کاہے کو کیا تھا اور پیٹ سے کیوں ہوئی تھی؟ مار موڑ کر پھر چُپکا بیٹھا۔ اِس میں دِن چڑھا اور دھوپ گرم ہوئی، سر کا بھیجا پکنے لگا اور تعفّن کے مارے روح نکلنے لگی۔ جیدھر دیکھتا ہوں، مُردوں کی ہڈیاں اور صندوق جواہر کے ڈھیر لگے ہیں۔ تب کئی صندوق پُرانے لے کر نیچے اوپر رکھے کہ دن کو دھوپ سے اور رات کو اُوس سے بچاو ہو۔ اب پانی کی تلاش کرنے لگا۔ ایک طرف جھرنا سا دیکھا کہ قلعے کی دیوار میں پتھر کا تراشا ہوا، گھڑے کے مُنہ کے مُوافق ہے۔ بارے کئی دن اُس پانی اور کھانے سے زندگی ہوئی۔

آخر آزُوقہ تمام ہوا۔ مَیں گھبرایا اور خُدا کی جناب میں فریاد کی۔ وُہ ایسا کریم ہے کہ دروازہ کوٹ کا کھلا اور ایک مُردے کو لائے۔ اُس کے ساتھ ایک پیر مرد آیا۔ جب اُسے بھی چھوڑ کر گئے، یہ دل میں آیا کہ اِس بوڑھے کو مار کر اِس کے کھانے کا صندوق سب کا سب لے لے۔ ایک صندوق کا پایہ ہاتھ میں لے کر اُس کے پاس گیا۔ وُہ بچارا سر زانو پر دھرے حیران بیٹھا تھا۔ مَیں

نے پیچھے سے آکر اُس کے سر میں ایسا مارا کہ سر پھٹ کر، مغز کا گُودا نکل پڑا اور فی الفور جان بہ حق تسلیم ہوا۔ اُس کا آزوقہ لے کر میں کھانے لگا۔ مدت (۳) تئیں یہی میرا کام تھا کہ جو زندہ، مُردے کے ساتھ آتا، اُسے میں مار ڈالتا اور کھانے کا اسباب لے کر بہ فراغت کھاتا۔

بعد کتنی مدت کے ایک مرتبہ ایک لڑکی تابوت کے ہمراہ آئی، نہایت قبول صورت۔ میرے دل نے نہ چاہا کہ اُسے بھی ماروں۔ اُن نے مجھے دیکھا اور مارے ڈر کے بے ہوش ہو گئی۔ میں اُس کا بھی آزوقہ (۵) اُٹھا کر اپنے پاس لے آیا، لیکن اکیلا نہ کھاتا۔ جب بھوکھ لگتی، کھانا اُس کے نزدیک لے جاتا اور ساتھ مل کر کھاتا۔ جب اُس عورت نے دیکھا کہ مجھے یہ شخص نہیں ستاتا، دن بہ دن اُس کی وحشت کم ہوئی اور رام ہوتی چلی، میرے مکان میں آنے جانے لگی۔ ایک روز اُس کا احوال پوچھا کہ تو کون ہے؟ اُس نے جواب دیا کہ میں بادشاہ کے وکیلِ مطلق کی بیٹی ہوں۔ اپنے چچا کے بیٹے سے منسوب ہوئی تھی۔ شبِ عروسی (۶) کے دن اُسے قولنج ہوا۔ ایسا درد سے تڑپنے لگا کہ ایک آن کی آن میں مر گیا۔ مجھے اُس کے تابوت کے ساتھ لا کر یہاں چھوڑ گئے ہیں۔ تب اُس نے میرا احوال پوچھا۔ میں نے بھی تمام و کمال بیان کیا اور کہا: خدا نے تجھے میری خاطر یہاں بھیجا ہے۔ وہ مسکرا کر چپکی ہو رہی۔

اسی طرح کئی دن میں آپس میں محبت زیادہ ہو گئی۔ میں نے اُسے ارکان مسلمانی کے سکھا کر کلمہ پڑھایا اور متعہ (۷) کر کر صحبت کی۔ وہ بھی حاملہ ہوئی، ایک بیٹا پیدا ہوا۔ قریب تین برس کے اسی صورت سے گزری (۸)۔ جب لڑکے کا

دُودھ بڑھایا، ایک رُوز بی بی سے کہا کہ یہاں کب تلک رہیں گے اور کس طَرح یہاں سے نکلیں گے؟ وُہ بُولی: خُدا نکالے تو نکلیں، نہیں تو ایک رُوز یونہیں مرجائیں گے۔ مجھے اُس کے کہنے پر اور اپنے رہنے پر کمال رِقّت آئی، رُوتے رُوتے سُو گیا۔ ایک شخص کو خواب میں دیکھا کہ کہتا ہے: پَرنالے کی راہ سے نکلنا ہے تو نکل۔ مَیں مارے خُوشی کے چَونک پڑا اور جُورو کو کہا کہ لُوہے کی میخیں اور سیخیں، جو پُرانے صندوقوں میں ہیں، جمع کر کے لے آؤ تو اُس کو کُشادہ کردوں۔ غرض مَیں اُس مُوری کے مُنہ پر میخ رکھ کر پتّھروں سے ایسا ٹھونکتا کہ تھک جاتا۔ ایک بَرس کی محنت میں وُہ سُوراخ اِتنا بڑا ہوا کہ آدمی نکل سکے۔ بعد اُس کے، مُردوں کی آستینوں میں اچّھے اچّھے جواہر چُن کر بھرے اور ساتھ لے کر، اُسی راہ سے ہم تینوں باہر نکلے۔ خُدا کا شُکر کیا اور بیٹے کو کاندھے پر بٹھالیا۔ ایک مہینا ہوا ہے کہ سَر راہ چُھوڑ کر، مارے ڈر کے جنگل، پہاڑوں کی راہ سے چلا آتا ہوں۔ جب گرسنگی ہوتی ہے، گھاس پات کھاتا ہوں۔ قوّت بات کہنے کی مجھ میں نہیں۔ یہ میری حقیقت ہے جو تم نے سُنی۔

بادشاہ سلامت! میں نے اُس کی حالت پر تَرس کھایا اور حمّام کروا کر اچّھا لباس پہنوایا اور اپنا نائب بنایا۔ اور میرے گھر میں مَلِکہ سے کئی لڑکے پیدا ہوئے، لیکن خُردسالی میں مَر مَر گئے۔ ایک بیٹا پانچ بَرس کا ہو کر مُوا، اُس کے غم میں مَلِکہ نے بھی وَفات پائی۔ مجھے کمال غم ہوا اور وُہ مُلک، بغیر اُس کے کاٹنے لگا، دل اُداس ہو گیا، اِرادہ عجَم کا کیا۔ بادشاہ سے عرض کر کر، خدمت شاہِ بَندَری کی اُس جوان کو دِلوادی۔ اِس عرصے میں بادشاہ

بھی مر گیا۔ میں اِس وفادار کُتّے کو اور سب مال، خزانہ، جواہر ساتھ لے کر نیشاپور میں آ رہا، اِس واسطے کہ میرے بھائیوں کے احوال سے کوئی واقف نہ ہووے۔ میں "خواجۂ سگ پرست" مشہور ہوا اور اِس بدنامی میں دُگنا محصول آج تک بادشاہِ ایران کی سرکار میں بھرتا ہوں۔

اِتفاقاً یہ سوداگر بچہ وہاں گیا۔ اِس کے وسیلے سے جہاں پناہ کا قدم بوس ہوا۔ میں نے پوچھا: کیا یہ تمھارا فرزند نہیں؟ خواجہ نے جواب دیا: قبلۂ عالم! یہ میرا بیٹا نہیں، آپ ہی کی رعیت ہے؛ لیکن اب میرا مالک اور وارث، جو کچھ کہیے، سو یہی ہے۔ یہ سن کر سوداگر بچے سے میں نے پوچھا کہ تو کس تاجر[۳] کا لڑکا ہے اور تیرے ④ ما باپ کہاں رہتے ہیں؟ اُس لڑکے نے زمین چومی[۵] اور جان کی امان[۶] مانگی اور بولا کہ یہ لونڈی، سرکار کے وزیر کی بیٹی ہے۔ میرا باپ حضور کے عتاب میں بہ سبب اِسی خواجہ کے لعلوں کے پڑا اور حکم یوں ہوا کہ اگر ایک سال تک اُس کی بات کرسی نشیں نہ ہوگی، تو جان سے مارا جاوے گا۔ میں نے سن کر یہ بھیس بنایا اور اپنے تئیں نیشاپور پہنچایا۔ خدا نے خواجہ کو بہ مع کتّے اور لعلوں کے حضور میں حاضر کر دیا۔ آپ نے تمام احوال سن لیا؛ اُمیدوار ہوں کہ میرے بوڑھے باپ کی مخلصی ہو۔

یہ بیان وزیر زادی سے سن کر خواجہ نے ایک آہ کی اور بے اِختیار گر پڑا۔ جب گلاب اُس پر چھڑکا گیا، تب ہوش میں آیا اور بولا کہ ہائے کم بختی! اِتنی دُور سے، یہ رنج و محنت کھینچ کر، میں اِس توقع پر آیا تھا کہ اِس سوداگر بچے کو متبنّیٰ کر کر اپنا فرزند کروں گا اور اپنے مال متاع کا اِس کو

ہبہ نامہ لکھ دوں گا، تو میرا نام رہے گا اور سارا عالَم اِسے خواجہ زادہ کہے گا؛ سو میرا خیال خام ہوا اور بالعکس کام ہوا۔ اِن نے عورت ہو کر مجھ مردِ پیر کو خراب کیا، مَیں رنڈی کے چرتر میں پڑا۔ اب میری وُہ کہاوت ہوئی: گھر میں رہے نہ تیرتھ گئے، مونڈ مُنڈا فضیحت بھئے۔

اَلقصّہ مجھے اُس کی بے قراری اور نالہ وزاری پر رَحم آیا۔ خواجہ کو نزدیک بُلایا اور کان میں مُژدہ اُس کے وَصل کا سُنایا کہ غمگین مت ہو، اِسی سے تیری شادی کر دیں گے۔ خُدا چاہے تو اَولاد تیری ہوگی اور یہی تیری مالک ہوگی۔ اِس خوش خبری کے سُننے سے فی الجُملہ اُس کو تسلّی ہوئی۔ تب میں نے کہا کہ وزیر زادی کو محل میں لے جاؤ اور وزیر کو پنڈت خانے سے لے آؤ اور حمّام میں نہلاؤ اور خلعتِ سَرفرازی کی پہناؤ اور جلدی میرے پاس لاؤ۔ جس وقت وزیر آیا، لبِ فرش تک اُس کا اِستقبال فرمایا اور اپنا بُزرگ جان کر گلے لگایا اور نئے سَر سے قلم دانِ وِزارت کا عنایت فرمایا اور خواجہ کو بھی جاگیر و مَنصب دیا اور ساعتِ سعید دیکھ کر، وزیر زادی سے نکاح پڑھوا کر منسوب کیا۔ کئی سال میں دو بیٹے اور ایک بیٹی اُس کے گھر میں پیدا ہوئے، چُنان چہ بڑا بیٹا، مَلِکُ التُّجار ہے اور چھوٹا، ہماری سرکار کا مُختار ہے۔

اَے دَرویشو! میں نے اِس لیے یہ نَقل تمھارے سامھنے کی کہ کل کی رات دو فقیروں کی سَرگُذشت میں نے سُنی تھی؛ اب تم دونوں بھی جو باقی رہے ہو، یہ سمجھو کہ ہم اُسی مکان میں بیٹھے ہیں اور مجھے اپنا خادِم اور اِس گھر کو اپنا تکیہ جانو، بے وَسواس اپنی اپنی سیر کا اَحوال کہو

اور چندے میرے پاس رہو۔ جب فقیروں نے بادشاہ کی طرف سے بہت خاطرداری دیکھی، کہنے لگے: خیر، جب تم نے گداؤں سے الفت کی، تو ہم دونوں بھی اپنا ماجرا بیان کرتے ہیں، سُنیے۔

سیر تیسرے درویش کی

تیسرا درویش ① گوٹ باندھ بیٹھا اور اپنی سیر کا بیان اس طرح سے کرنے لگا:

اَحوال اِس فقیر کا اَے دوستاں! سُنو
یعنی جو مجھ پہ بیتی ہے، وہ داستاں سُنو
جو کچھ کہ شاہِ عشق نے مجھ سے کیا سُلوک
تفصیل وار کرتا ہوں اُس کا بیاں، سُنو!

کہ یہ کم ترین بادشاہ زادہ عجم کا ہے۔ میرے وَلی نعمت وہاں کے بادشاہ تھے اور سوائے میرے کوئی فرزند نہ رکھتے تھے۔ میں جوانی کے عالم میں مُصاحبوں کے ساتھ چوپڑ، گنجفہ، شطرنج، تختہ نرد کھیلا کرتا، یا سوار ہوکر سیر و شکار میں مشغول رہتا۔ ایک دن کا یہ ماجرا ہے کہ سواری تیار کروا کر اور سب یار آشناؤں کو لے کر میدان کی طرف نکلا۔ باز، بَہری، جُرّہ، باشا، سُرخاب اور تیتروں پر اُڑاتا ہوا دُور نکل گیا۔ عجب طرح کا ایک قطعہ بہار کا نظر آیا کہ جیدھر نگاہ جاتی تھی، کوسوں تلک سبز، اور پھولوں سے ⑧ لعل زمین نظر آتی تھی۔ یہ سماں ⑨ دیکھ کر گھوڑوں کی باگیں ڈال دیاں اور قدم قدم سیر کرتے ہوئے چلے جاتے تھے۔ ناگاہ اُس صحرا میں دیکھا کہ ایک کالا ہرن، اُس پر زر بفت کی جھول اور بجھنور کلی مرصّع کی ⑪ اور گھونگرو سونے کے

زرد دُوزی پٹّے میں ٹکے ہوئے گلے میں پڑے، (۱) خاطرِ جمع سے اُس میدان میں (کہ جہاں انسان کا دخل نہیں اور پرندہ پر نہیں مارتا) چرتا پھرتا ہے۔ ہمارے گھوڑوں کے سُم کی آہٹ پاکر چونکّا ہوا اور سر اُٹھا کر دیکھا اور آہستہ آہستہ چلا۔

مجھے اُس کے دیکھنے سے یہ شوق ہوا کہ رفیقوں سے کہا کہ تم یہیں کھڑے رہو، میں اُسے جیتا پکڑوں گا۔ خبردار! تم قدم آگے نہ بڑھائیو اور میرے پیچھے نہ آئیو۔ اور گھوڑا میری رانوں تلے ایسا پرند (۲) تھا کہ بارہا ہرنوں کے اوپر دوڑا کر، اُن کی کرچھالوں کو بھلا کر، ہاتھوں سے پکڑ پکڑ لیے تھے؛ اُس کے عقب دوڑایا۔ وُہ، دیکھ کر چھلانگیں بھرنے لگا اور ہوا ہُوا۔ اور گھوڑا بھی باد (۳) سے باتیں کرتا تھا، لیکن اُس کی گرد کو نہ پہنچا۔ وُہ رہوار بھی پسینے پسینے ہو گیا اور میری بھی جیب (۴) مارے پیاس کے چٹخنے لگی، پر کچھ بس نہ چلا۔ شام ہونے لگی اور میں کیا جانوں کہاں سے کہاں نکل آیا۔ لاچار ہو کر اُسے بھلاوا دیا اور ترکش میں سے تیر نکال کر اور قُربان سے کمان سنبھال کر، چلّے میں جوڑ کر، کشش کان تلک لا کر، ران کو اُس کی تاک، اَللّٰہُ اَکْبَرْ کہہ کر مارا۔ بارے پہلا ہی تیر اُس کے پانو میں ترازو ہوا۔ تب لنگڑاتا ہوا پہاڑ کے دامن کی سمت چلا۔ فقیر بھی گھوڑے پر سے اُتر پڑا اور پاپیادہ اُس کے پیچھے لگا۔ اُس نے کوہ کا ارادہ کیا اور میں نے بھی اُس کا ساتھ دیا۔ کئی اُتار چڑھاو کے بعد ایک گنبد (۵) نظر آیا۔ جب پاس پہنچا، ایک باغیچہ (۶) اور ایک چشمہ دیکھا۔ وُہ ہرن تو نظروں سے چھلاوا ہو گیا؛ میں نہایت تھکا تھا، ہاتھ پانو دھونے لگا۔

ایک بارگی آواز رونے کی اُس بُرج کے اندر سے میرے کان میں آئی، جیسے کوئی کہتا ہے کہ اَے بچّے! جس نے تجھے تیر مارا، میری آہ کا تیر اُس کے کلیجے میں لگیو! وہ اپنی جوانی سے پھل نہ پاوے اور خدا اُس کو میرا سا دُکھیا بناوے! مَیں یہ سُن کر وہاں گیا۔ دیکھا تو ایک بزرگ ریش سفید، اچھی پوشاک پہنے ایک مسند پر بیٹھا ہے اور ہرن آگے لیٹا ہے، اُس کی جانگ سے تیر کھینچتا ہے اور بد دُعا دیتا ہے۔ میں نے سلام کیا اور ہاتھ جوڑ کر کہا کہ حضرت سلامت! یہ تقصیر نادانستہ اِس غلام سے ہوئی، مَیں یہ نہ جانتا تھا، خدا کے واسطے مُعاف کرو۔ بولا کہ بے زبان کو تو نے ستایا ہے؛ اگر اَن جان یہ حرکت تجھ سے ہوئی، اللہ مُعاف کرے گا۔ مَیں پاس جا بیٹھا اور تیر نکالنے میں شریک ہوا۔ بڑی دِقّت سے تیر کو نکالا اور زخم میں مرہم بھر کر چھوڑ دیا۔ پھر ہاتھ دُھو دھا کر؛ اُس پیر مرد نے کچھ حاضری⑤، جو اُس وقت موجود تھی، مجھے کھلائی۔ میں نے کھا پی کر ایک چارپائی پر لمبی تانی⑥۔

ماندگی کے سبب خوب پیٹ بھر کر سویا۔ اُس نیند میں آواز نوحہ و زاری کی کان میں آئی۔ آنکھیں مل کر جو دیکھتا ہوں، تو اُس مکان میں نہ وہ بوڑھا ہے نہ کوئی اور ہے، اکیلا مَیں پلنگ پر لیٹا ہوں اور وہ دالان خالی پڑا ہے۔ چاروں طرف بھیانک ہو کر دیکھنے لگا۔ ایک کونے میں پردہ پڑا نظر آیا۔ وہاں جا کر اُسے اُٹھایا۔ دیکھا تو ایک تخت بچھا ہے اور اُس پر ایک پری زاد عورت، برس چودہ ایک کی، مہتاب کی سی صورت اور زلفیں دونوں طرف چھوٹیں ہوئیں، ہنستا چہرہ، فرنگی لباس پہنے ہوئے

عجب ادا سے دیکھتی ہے اور بیٹھی ہے اور وہ بزرگ، اپنا سر اُس کے پانو پر دھرے بے اختیار رو رہا ہے اور ہوش حواس کھو رہا ہے۔

میں اُس پیر مرد کا یہ احوال اور اُس نازنین کا حُسن و جمال دیکھ کر مرجھا گیا اور مُردے کی طرح بے جان ہوکر گر پڑا۔ وہ مردِ بزرگ یہ میرا حال دیکھ کر، شیشہ گلاب کا لے آیا اور مجھ پر چھڑکنے لگا۔ جب میں جیتا اُٹھ کر، اُس معشوق کے مقابل جاکر سلام کیا؛ اُس نے ہرگز نہ ہاتھ اُٹھایا اور نہ ہونٹھ ہلایا۔ میں نے کہا: اَے گل بدن! اتنا غرور کرنا اور جواب سلام کا نہ دینا کس مذہب میں درست ہے!

کم بولنا ادا ہے ہر چند، پر نہ اتنا
مند جائے چشمِ عاشق، تو بھی وہ منہ نہ کھولے②

واسطے اُس خدا کے جس نے تجھے بنایا ہے، کچھ تو منہ سے بول۔ ہم بھی اتفاقاً یہاں آنکلے ہیں، مہمان کی خاطر ضرور ہے۔ میں نے بہتیری باتیں بنائیں، لیکن کچھ کام نہ آئیں۔ وہ چُپکی[3]، بُت کی طرح بیٹھی سُنا کی۔ تب میں نے بھی آگے بڑھ کر ہاتھ، پانو پر چلایا۔ جب پانو کو چھیڑا، تو سخت معلوم ہوا۔ آخر یہ دریافت کیا کہ پتھر سے اِس لعل کو تراشا ہے اور آزر④ نے اِس بُت کو بنایا ہے۔ تب اُس پیر مرد بُت پرست⑤ سے پوچھا کہ میں نے تیرے ہرن کی ٹانگ میں گھیرا مارا، تو نے اِس عشق کی⑥ ناوک سے میرا کلیجا چھید کر وار پار کیا، تیری دعا قبول ہوئی؛ اب اِس کی کیفیت مفصّل بیان کر کہ یہ طلسم کیوں بنایا ہے اور تو نے بستی کو چھوڑ کر جنگل پہاڑ⑧ کیوں بسایا ہے؟

تجھ پر جو کچھ بیتتا ہے، مجھ سے کہہ:

جب اُس کا بہت پیچھا لیا، تب اُس نے جواب دیا کہ اِس بات نے مجھے تو خراب کیا، کیا تو بھی سُن کر ہلاک ہُوا چاہتا ہے؟ میں نے کہا: لو اَب بہت مکر چکر کیا، مطلب کی بات کہو، نہیں تو مار ڈالوں گا۔ مجھے نہایت ڈرپے دیکھ کر بولا: اَے جوان! حق تعالیٰ ہر ایک انسان کو عشق کی آنچ سے محفوظ رکھے۔ دیکھ تو، اِس عشق نے کیا کیا آفتیں برپا کی ہیں! عشق ہی کے مارے عورت خاوند کے ساتھ ستی ہوتی ہے اور اپنی جان کھوتی ہے، اور فرہاد و مجنوں کا قصہ سب کو معلوم ہے۔ تو اُس کے سُننے سے کیا پھل پاوے گا! ناحق گھر بار، دولتِ دُنیا چھوڑ چھاڑ کر نکل جاوے گا! میں نے جواب دیا: بس اَب اپنی دوستی تہہ کر رکھو، اِس وقت مجھے اپنا دشمن سمجھو۔ اگر جان عزیز ہے، تو صاف کہو۔ لاچار ہو کر، آنسو بھر لایا اور کہنے لگا کہ مجھ خانہ خراب کی یہ حقیقت ہے کہ بندے کا نام نعمان (۴) سیاح ہے۔ میں بڑا سوداگر تھا۔ اِس سِن میں، تجارت کے سبب ہفت اِقلیم کی سیر کی اور سب بادشاہوں کی خدمت میں رسائی ہوئی۔

ایک بار یہ خیال جی میں آیا کہ چاروں دانگ مُلک تو پھرا، لیکن جزیرۂ فرنگ کی طرف نہ گیا اور وہاں کے بادشاہ کو اور رعیت و سپاہ کو نہ دیکھا اور رسم و راہ وہاں کی کچھ نہ دریافت ہوئی؛ ایک دفعہ (۵) وہاں بھی چلا چاہیے۔ رفیقوں اور شفیقوں سے صلاح لے کر اِرادہ مُصمّم کیا اور تحفہ، ہدایا (۶) جہاں تہاں کا، جو وہاں کے لائق تھا، لیا اور ایک قافلہ

سوداگروں کا اکٹھا کر کر، جہاز پر سوار ہو کر روانہ ہوا۔ ہوا جو موافق پائی، کئی مہینوں میں اس ملک میں جا داخل ہوا۔ شہر میں ڈیرا کیا۔ عجب شہر دیکھا کہ کوئی شہر اس شہر کی خوبی کو نہیں پہنچتا۔ ہر ایک بازار و کوچے میں پختہ سڑکیں بنی ہوئیں اور چھڑکاو کیا ہوا۔ صفائی ایسی کہ ایک تنکا کہیں پڑا نظر نہ آیا، کوڑے کا تو کیا ذکر ہے۔ اور عمارتیں رنگ بہ رنگ کی، اور رات کو رستوں میں دو رستہ ② قدم بہ قدم روشنی۔ اور شہر کے باہر باغات کہ جن میں عجائب گل بوٹے اور میوے نظر آئے کہ شاید سوائے بہشت کے کہیں اور نہ ہوں گے۔ جو وہاں کی تعریف کروں، سو بجا ہے۔

غرض سوداگروں کے آنے کا چرچا ہوا۔ ایک خواجہ سرا معتبر سوار ہو کر اور کئی خدمت گار ساتھ لے کر قافلے میں آیا اور بیوپاریوں سے پوچھا کہ تمھارا سردار کون سا ہے؟ سبھوں نے میری طرف اشارت کی۔ وہ محلّی میرے مکان میں آیا۔ میں تعظیم بجا لایا۔ باہم سلام علیک ④ ہوئی۔ اس کو سوزنی ⑤ پر بٹھایا، تکیے کی تواضع کی۔ بعد اس کے میں نے پوچھا کہ صاحب کے تشریف لانے کا کیا باعث ہے، فرمائیے؟ جواب دیا کہ شہزادی نے سنا ہے کہ سوداگر آئے ہیں اور بہت جنس لائے ہیں؛ لہٰذا مجھ کو حکم کیا کہ جا کر ان کو حضور میں لے آؤ۔ پس تم، جو کچھ اسباب لائق بادشاہوں کی سرکار کے ہو، ساتھ لے کر چلو اور سعادت آستانہ بوسی کی حاصل کرو۔ میں نے جواب دیا کہ آج تو ماندگی ⑥ کے باعث قاصر ہوں، کل جان و مال سے حاضر ہوں۔ جو کچھ اس عاجز کے پاس موجود ہے، نذر گزرانوں گا۔ جو پسند آوے، مال سرکار کا ہے۔

یہ وعدہ کر کر اور عطر پان دے کر خواجہ کو رُخصت کیا۔ اور سب سوداگروں کو اپنے پاس بُلا کر، جو جو تحفہ جس کے پاس تھا، لے لے کر جمع کیا اور جو میرے گھر میں تھا، وُہ بھی لیا اور صُبح کے وقت دروازے پر بادشاہی محل[۲] کے حاضر ہوا۔

باری[۳] داروں نے میری خبر عرض کی۔ حُکم ہوا کہ حضور میں لاؤ۔ وُہی خواجہ سرا نکلا اور میرا ہاتھ ہاتھ میں لے کر، دوستی کی راہ سے باتیں کرتا ہوا لے چلا۔ پہلے خواص[۴] پُرے[۵] سے ہو کر ایک مکانِ عالی شان میں لے گیا۔ اَے عزیز! تو باوَر نہ کرے گا، یہ عالَم نظر آیا گویا پَر کاٹ کر پریوں کو چھوڑ دیا ہے۔ جس طرف دیکھتا تھا، نگاہ گڑ جاتی تھی، پانو زمین سے اُکھڑے جاتے تھے۔ بہ زور اپنے تئیں سنبھالتا ہوا رُو بہ رُو پہنچا۔ جونہیں بادشاہ زادی پر[۶] نظر پڑی، غش کی نوبت ہوئی اور ہاتھ پانو میں رعشہ ہو گیا۔ بہ ہر صورت سلام کیا۔ دونوں طرف دستِ راست اور دستِ چپ صف بہ صف[۷] نازنینانِ پری چہرہ دست بستہ کھڑیں تھیں۔ میں جو کچھ قسم جواہر اور پارچہ پوشاکی اور تحفے[۸] اپنے ساتھ لے گیا تھا؛ سب کی کشتیاں حضور میں چُنیں گئیں۔ از بس کہ سب جنس لائق پسند کے تھی؛ خوش ہو کر خانساماں کے حوالے ہوئی[۹] اور فرمایا کہ قیمت اِس کی، بہ موجب فرد کے، کل دی جائے گی۔ میں تسلیمات بجا لایا اور دل میں خوش ہوا کہ اِس بہانے سے بھلا کل بھی آنا ہو گا۔ جب رُخصت ہو کر باہر آیا، تو سودائی کی طرح کہتا کچھ تھا اور مُنہ سے کچھ نکلتا تھا۔ اُسی طرح سرا میں آیا، لیکن حواس[۱۰] بجا نہ تھے۔

سب آشنا دوست پوچھنے لگے کہ تمھاری کیا حالت ہے؟ میں نے کہا: اِتنی آمد و رفت سے گرمی دماغ میں چڑھ گئی ہے۔

غرض وہ رات تلملاتے کاٹی۔ فجر کو پھر جا کر حاضر ہوا اور اُسی خواجہ سرا کے ساتھ پھر محل میں پہنچا۔ وُہی عالم جو کل دیکھا تھا، دیکھا۔ بادشاہ زادی نے مجھے دیکھا اور ہر ایک کو اپنے اپنے کام پر رخصت کیا۔ جب بر چھا ہوا، خلوت میں اُٹھ گئیں اور مجھے طلب کیا۔ جب میں وہاں گیا، بیٹھنے کا حکم کیا۔ میں آداب بجا لا کر بیٹھا۔ فرمایا کہ یہاں جو تو آیا اور یہ اَسباب لایا، اِس میں منافع کتنا منظور ہے؟ میں نے عرض کی کہ آپ کے قدم دیکھنے کی بڑی خواہش تھی، سو خدا نے میسّر کی، اب میں نے سب کچھ بھر پایا اور دونوں جہان کی سعادت حاصل ہوئی۔ اور قیمت جو کچھ فہرست میں ہے، نصف کی خرید ہے اور نصف نفع ہے۔ فرمایا: نہیں، جو قیمت تو نے لکھی ⑤ ہے، وہ عنایت ہوگی، بلکہ اور بھی اِنعام دیا جائے گا، بہ شرطے کہ ایک کام تجھ سے ہو سکے تو حکم کروں۔

میں نے کہا کہ غلام کا جان و مال اگر سرکار کے کام آوے، تو میں اپنے طالعوں کی خوبی سمجھوں اور آنکھوں سے کروں۔ یہ سن کر قلم دان یاد فرمایا۔ ایک شقّہ ⑥ لکھا اور موتیوں ⑦ کے دُلمیان میں رکھ کر، ایک رومال شبنم کا اوپر لپیٹ کر میرے حوالے کیا اور ایک انگوٹھی نشان کے واسطے اُنگلی سے اُتار، دی اور کہا کہ اُس طرف کو ایک بڑا باغ ہے، دِل کشا اُس کا نام ہے، وہاں تو جا کر، ایک شخص کیخسرو ⑨ نام داروغہ ہے، اُس کے ہاتھ

میں یہ انگشتری دیجو اور ہماری طرف سے دُعا کہیو اور اِس رُقعے کا جواب مانگیو، لیکن جلد آئیو؛ اگر کھانا وہاں کھائیو[۱]، تو پانی یہاں پیجو۔ اِس کام کا اِنعام تجھے ایسا دوں گی کہ تو دیکھے گا۔

مَیں رُخصت ہوا اور پوچھتا پوچھتا چلا۔ قریب دو کوس کے جب گیا، وہ باغ نظر پڑا۔ جب پاس پہنچا، ایک عزیز مُسلّح مجھ کو پکڑ کے دروازے میں باغ کے لے گیا۔ دیکھوں تو ایک جوان شیر کی سی صورت، سونے کی کُرسی پر، زِرہِ[۲] داؤدی پہنے[۲]، چار آئینہ باندھے، فولادی خُود سر پر دھرے نہایت شان[۳] شوکت سے بیٹھا ہے اور پان سے جوان تیار ڈھال، تلوار ہاتھ میں لیے اور ترکش[۴] کمان باندھے، مستعد[۵] پَرا باندھے کھڑے ہیں۔ میں نے سلام کیا۔ مجھے نزدیک بُلایا۔ میں نے وہ خاتم[۶] دی اور خوشامد کی باتیں کر کر، وہ رومال دکھایا اور شُقّے[۷] کے بھی لانے کا احوال کہا۔ اُس نے سُنتے ہی اُنگلی دانتوں سے کاٹی اور سر دُھن کر بولا کہ شاید تیری اجل تجھ کو لے آئی ہے! خیر، باغ کے اندر جا۔ سرو کے درخت میں ایک آہنی پنجرہ لٹکتا ہے، اُس میں ایک جوان قید ہے؛ اُس کو یہ خط[۸] دے کر، جواب لے کر جلدی پھر آ۔ مَیں شتاب باغ میں گُھسا۔ باغ کیا تھا، گویا جیتے جی بہشت میں گیا۔ ایک ایک چمن رنگ بہ رنگ کا پھول رہا تھا اور فوّارے چھوٹ[۹] رہے تھے، جانور چہچہے مار رہے تھے۔ مَیں سیدھا چلا گیا اور اُس درخت میں وہ قفس[۱۰] دیکھا۔ اُس میں ایک جوانِ[۱۱] حسین نظر آیا۔ میں نے ادب سے سر نِہوڑایا[۱۳] اور سلام کیا اور وہ خریطہ[۱۲] سر بہ مُہر پنجرے کی تیلیوں کی

راہ سے دیا۔ وہ عزیز رُقعہ کھول کر پڑھنے لگا اور مجھ سے مشتاق دار احوال مُلکہ کا پوچھنے لگا۔

ابھی باتیں تمام نہ ہوئیں تھیں کہ ایک فوج زنگیوں کی نمود ہوئی اور چاروں طرف سے مجھ پر آ ٹوٹی اور بے تحاشی (۲) برچھی و تلوار مارنے لگی۔ ایک آدمی پہنچنے کی بساط کیا، ایک دم میں چور زخمی کر دیا۔ مجھے کچھ اپنی سُدھ بُدھ نہ رہی۔ پھر جو ہوش آیا، اپنے تئیں چارپائی پر پایا کہ دو پیادے اُٹھائے لیے جاتے ہیں اور آپس میں بتیاتے ہیں۔ ایک نے کہا: اِس مُردے کی لوتھ کو میدان میں پھینک دو، کتے، کوے کھا جائیں گے۔ دوسرا بولا: اگر بادشاہ تحقیق کرے اور یہ خبر پہنچے، تو جیتا گڑوا دے اور بال بچوں کو کولھو میں پِروا دے (۵)۔ کیا ہمیں اپنی جان بھاری پڑی ہے جو ایسی نامعقول حرکت کریں۔

میں نے یہ گفتگو سُن کر، دونوں یاجوج ماجوج سے کہا کہ واسطے خدا کے مجھ پر رحم کرو، ابھی مجھ میں ایک رمق جان باقی ہے، جب مر جاؤں گا، جو تمہارا جی چاہے گا سو کیجو۔ مُردہ بہ دستِ زندہ۔ لیکن یہ تو کہو، مجھ پر یہ کیا حقیقت بیتی، مجھے کیوں مارا اور تم کون ہو؟ بھلا اِتنا تو کہہ سُناؤ! تب اُنھوں نے رحم کھا کر کہا کہ وہ جوان جو قفس میں بند ہے، اِس بادشاہ کا بھتیجا ہے اور پہلے اِس کا باپ تخت نشین تھا۔ رحلت کے وقت یہ وصیّت اپنے بھائی کو کی کہ ابھی میرا بیٹا، جو وارث اِس سلطنت کا ہے، لڑکا اور بے شعور (۷) ہے، کاروبارِ بادشاہت کا خیر خواہی اور ہوشیاری سے تم کیا کیجو۔

جب یہ بالغ ہو، اپنی بیٹی سے شادی اِس کی کر دیجو اور مُختار تمام مُلک اور خزانے کا کیجو۔

یہ کہہ کر اُنھوں نے وَفات پائی اور سلطنت کی نوبَت چھوٹے بھائی پر آئی۔ اُس نے وَصیّت پر عمل نہ کیا، بلکہ دیوانہ اور سَودائی مشہور کر کے پنجرے میں ڈال دیا۔ اور چوکی گاڑھی چاروں طرف باغ کے رکھی ہے کہ پرندہ پَر نہیں مار سکتا۔ اور کئی (۴) مرتبے زہرِ ہلاہل دیا ہے؛ لیکن زندگی زبردست ہے، اثر نہیں کیا۔ اب وُہ شہ زادی اور یہ شہ زادہ، دونوں عاشق معشوق بَن رہے ہیں؛ وُہ گھر میں تلپھے ہے اور یہ قفَس میں تڑپھے ہے۔ تیرے ہاتھ شوق کا نامہ اُس نے بھیجا؛ یہ خبر ہرکاروں نے بہ جنس بادشاہ کو پہنچائی، حبشیوں کا دستہ متعیّن ہوا۔ تیرا یہ احوال کیا اور اُس جوان (۵) قیدی کے قتل کی وزیر سے تدبیر پوچھی۔ اُس نمک حرام نے مَلکہ کو راضی کیا ہے کہ اُس بے گُناہ کو بادشاہ کے حُضور اپنے ہاتھ سے شہ زادی مار ڈالے۔

میں نے کہا: چلو، مرتے مرتے یہ تماشا بھی دیکھ لیں۔ آخر راضی ہو کر، وُہ دونوں اور میں زخمی، چُپکے ایک گوشے میں جا کر کھڑے ہوئے۔ دیکھا تو تخت پر بادشاہ بیٹھا ہے اور مَلکہ کے ہاتھ میں ننگی تلوار ہے اور شہ زادے کو پنجرے سے باہر نکال کر رُوبہ رُو کھڑا کیا۔ مَلکہ جلّاد بن کر، شمشیرِ برہنہ (۶) لیے ہوئے اپنے عاشق کے قتل کرنے کو آئی۔ جب نزدیک پہنچی، تلوار پھینک دی اور گلے میں چمٹ گئی۔ تب وُہ عاشق بولا کہ ایسے مرنے پر میں راضی ہوں۔ یہاں بھی تیری آرزو ہے، وہاں بھی تیری تمنّا

رہے گی۔ مَلکہ بُولی کہ اِس بہانے سے مَیں تیرے دیکھنے کو آئی تھی۔ بادشاہ یہ حرکت دیکھ کر سخت برہم ہوا اور وزیر کو ڈانٹا کہ تو یہ تماشا مجھے دِکھلانے کو لایا تھا! محلّی مَلکہ کو جُدا کرکے محل میں لے گئے، اور وزیر نے خفا ہوکر تلوار اُٹھائی اور بادشاہ زادے کے اوپر دوڑا، کہ ایک ہی وار میں کام اُس بچارے کا تمام کرے۔ جُوں چاہتا ہے کہ تیغا چلاوے، غیب سے ایک تیر ناگہانی اُس کی پیشانی پر بیٹھا کہ دوسار ہوگیا اور وُہ گر پڑا۔ بادشاہ یہ واردات دیکھ کر محل میں گھس گئے۔ جوان کو پھر قفس میں بند کرکر باغ میں لے گئے۔

مَیں بھی وہاں سے نکلا۔ راہ میں سے ایک آدمی مجھے بُلاکر مَلکہ کے حضور لے گیا۔ مجھے گھائل دیکھ کر، ایک جرّاح کو بُلوایا اور نہایت تقیّد سے فرمایا کہ اِس جوان کو جلد چنگا کرکے غسلِ شفا کا دے؛ یہی تیرا مُجرا ہے۔ اِس کے اوپر جتنی محنت تو کرے گا، ویسا ہی اِنعام اور سرفرازی پاوے گا۔ غرض وُہ جرّاح، بہ مُوجب اِرشادِ مَلکہ کے، تگ ودو کرکے، ایک چلّے میں نہلا دُھلا مجھے حضور میں لے گیا۔ مَلکہ نے پوچھا کہ اب تو کچھ کسر باقی نہیں رہی ہے؟ میں نے کہا کہ آپ کی توجّہ سے اب ہٹّا کٹّا ہوں۔ تب مَلکہ نے ایک خلعت اور بہت سے روپے، جو فرمائے تھے بلکہ اُس سے بھی دوچند عطا کیے اور رُخصت کیا۔

میں نے وہاں سے سب رفیق اور نوکر چاکروں کو لے کر کوچ کیا۔ جب اِس مقام پر پہنچا، سب کو کہا: تم اپنے وطن کو جاؤ۔ اور میں نے اِس پہاڑ پر یہ مکان اور اُس کی صورت بنا کر، اپنا رہنا مقرّر کیا اور نوکروں

اور غلاموں کو، موافق ہر ایک کی قدر کے، روپے دے کر آزاد کیا اور یہ کہ دیا کہ جب تلک میں جیتا رہوں، میرے قوت[1] کی خبر گیری تمھیں ضرور ہے، آگے مختار ہو۔ اب وُہی اپنی نمک حلالی سے میرے کھانے کی خبر لیتے ہیں، اور میں بہ خاطر جمع[2] اِس بُت کی پرستش کرتا ہوں۔ جب تلک جیتا ہوں، میرا یہی کام ہے۔ یہ میری سرگذشت ہے جو تو نے سُنی۔

یا فُقرا! میں نے یہ مجرد[3] سُننے اِس قصّے کے، کفنی گلے میں ڈالی اور فقیروں کا لباس کیا اور اشتیاق میں فرنگ کے مُلک کے دیکھنے کے، روانہ ہوا۔ کتنے ایک عرصے میں جنگل[4]، پہاڑوں کی سیر کرتا ہوا، مجنوں اور فرہاد کی صورت بن گیا۔ آخر میرے شوق نے اُس شہر تلک پہنچایا۔ گلی کوچے[5] میں باولا سا پھرنے لگا۔ اکثر مَلِکہ کے محل[6] کے آس پاس رہا کرتا، لیکن کوئی ڈھب ایسا نہ ہوتا جو وہاں تلک رسائی ہو۔ عجب حیرانی تھی کہ جس واسطے یہ محنت کشی کر کر گیا، وُہ مطلب ہاتھ نہ آیا۔ ایک دن بازار میں کھڑا تھا کہ ایک بارگی آدمی بھاگنے لگے اور دکان[7] دار دکانیں بند کر کے چلے گئے۔[1] یا وُہ رونق تھی، یا سنسان[8] ہو گیا۔ ایک طرف سے ایک جوان رستم کا سا کلہ جبڑا، شیر کی مانند گونجتا اور تلوار دو دستی جھاڑتا ہوا، زرہ بکتر گلے میں اور ٹوپ جھلم کا سر پر اور طمنچے[9] کی جوڑی کمر میں، کیفی کی طرح بکتا جھکتا نظر آیا اور اُس کے پیچھے دو غلام، بنات کی پوشاک پہنے، ایک تابوت مخمل کا شانی سے مڑھا ہوا سر پر لیے چلے آتے ہیں۔

میں نے یہ تماشا دیکھ کر ساتھ چلنے کا قصد کیا۔ جو کوئی آدمی میری نظر

پڑتا ہے، مجھے منع کرتا، لیکن مَیں کب سُنتا ہوں۔ رفتہ رفتہ وُہ جوان مرد ایک عالی شان مکان میں چلا، مَیں بھی ساتھ ہوا۔ اُس نے پھرتے ہی چاہا کہ ایک ہاتھ مارے اور مجھے دُو ٹکڑے کرے۔ مَیں نے اُسے قسم دی کہ مَیں بھی یہی چاہتا ہوں، مَیں نے اپنا خون مُعاف کیا، کسو طرح مجھے اِس زندگی کے عذاب سے چھڑا دے، کہ نہایت بہ تنگ آیا ہوں۔ مَیں جان بوجھ کر تیرے سامھنے آیا ہوں، دیر مت کر۔ مجھے مرنے پر ثابت قدم دیکھ کر، خُدا نے اُس کے دل میں رحم ڈالا اور غُصّہ بھی ٹھنڈا ہوا، بہت توجّہ اور مہربانی سے پوچھا کہ تُو کون ہے اور کیوں زندگی سے بیزار ہوا ہے؟

مَیں نے کہا: ذرا بیٹھیے تو کہوں، میرا قصّہ بہت دُور دراز ہے۔ اور عشق کے پنجے میں گرفتار ہوں، اِس سبب لاچار ہوں۔ یہ سُن کر، اُس نے اپنی کمر کھولی اور ہاتھ مُنہ دُھو دھا کر کچھ ناشتا کیا، مجھے بھی باعث ہُوا۔ جب فراغت کر کے بیٹھا، بولا، کہہ، تجھ پر کیا گزری؟ مَیں نے سب وارِدات اُس پیر مرد کی اور مَلِکہ کی اور اپنے وہاں جانے کی کہہ سُنائی۔ پہلے، سُن کر رویا اور یہ کہا کہ اِس کم بخت نے کس کس کا گھر گھالا! لیکن بھلا تیرا علاج میرے ہاتھ میں ہے؛ اَغلَب ہے کہ اِس عاصی کے سبب سے تُو اپنی مُراد کو پہنچے۔ اور تُو اندیشہ نہ کر اور خاطر جمع رکھ۔ حجّام کو فرمایا کہ اِس کی حجامت کر کے حمّام کروا دے۔ ایک جوڑا کپڑا اُس کے غلام نے لا کر پہنایا۔ تب مجھ سے کہنے لگا کہ یہ تابوت جو تُو نے دیکھا، اُسی شہزادہ مرحوم کا ہے جو قفس میں مُقیّد تھا۔ اُس کو دوسرے وزیر نے آخر مکر سے

مارا۔ اُس کی تو نجات ہوئی کہ مظلوم مارا گیا۔ مَیں اُس کا گُنہگار ہوں۔ مَیں نے بھی اُس وزیر کو بہ ضربِ شمشیر مارا اور بادشاہ کے مارنے کا اِرادہ کیا۔ بادشاہ گڑگڑایا اور سوگند کھانے لگا کہ مَیں بے گُناہ ہوں۔ مَیں نے اُسے نامرد جان کر چھوڑ دیا۔ جب سے میرا کام یہی ہے کہ ہر مہینے کی نوچندی جُمیرات کو مَیں اِس تابوت کو اِسی طَرح شہر میں لیے پھرتا ہوں اور اُس کا ماتم کرتا ہوں۔

اُس کی زبانی یہ اَحوال سُننے سے مجھے تسلی ہوئی کہ اگر یہ چاہے گا تو میرا مقصد بَر آوے گا۔ خُدا نے بڑا اِحسان کیا جو ایسے جُنونی کو مجھ پر مہربان کیا۔ سچ ہے: خُدا مہربان ہو تو کُل مہربان۔ جب شام ہوئی اور آفتاب غُروب ہوا، اُس جوان نے تابوت کو نکالا اور ایک غُلام کے عِوَض، وہ تابوت میرے سَر پر دَھرا اور اپنے ساتھ لے کر چلا۔ فرمانے لگا کہ مَلِکہ کے نزدیک جاتا ہوں، تیری سفارِش تا بہ مَقدُور کروں گا؛ تو ہرگز دَم نہ مارِیو، چُپکا بیٹھا سُنا کیجو۔ مَیں نے کہا: جو کچھ صاحِب فرماتے ہیں، سو ہی کروں گا؛ خُدا تم کو سلامت رکھے جو میرے اَحوال پر تَرَس کھاتے ہو۔ اُس جوان نے قَصد بادشاہی باغ کا کیا۔ جب اندر داخل ہوا؛ ایک چبوترہ سنگِ مَرمَر کا، ہشت پہلو باغ کے صَحن میں تھا اور اُس پر ایک نَم گیرا سُفَیدہ بادلے کا، موتیوں کی جھالر لگی ہوئی، اَلماس کے اِستادوں پر کھڑا تھا اور ایک مسند مُغرَّق بچھی تھی، گاؤ تکیہ اور بغلی تکیے زَربَفت کے لگے ہوئے؛ وہ تابوت وہاں رکھوایا اور ہم دونوں کو فرمایا کہ اُس درخت کے پاس جا کر بیٹھو۔

بعد ایک ساعت کے مشعل کی روشنی نظر آئی۔ ملکہ آپ، کئی خواصیں[1] پس و پیش اہتمام کرتی ہوئیں، تشریف لائیں؛ لیکن اداسی اور خفگی چہرے پر ظاہر تھی، آ کے مسند پر بیٹھیں۔ یہ گوکا ادب سے دست بستہ کھڑا رہا۔ پھر ادب سے، دور فرش کے کنارے مؤدّب[2] بیٹھا، فاتحہ پڑھیں[3] اور کچھ باتیں کرنے[4] لگا۔ میں کان لگائے سن رہا تھا۔ آخر اُس جوان نے کہا کہ ملکۂ جہان[5] سلامت! ملکِ عجم کا شہزادہ آپ کی خوبیاں اور محبوبیاں غائبانہ سن کر، اپنی سلطنت کو برباد دے[6]، فقیر بن[7]، مانند ابراہیم ادہم[8] کے تباہ ہو[9]، اور بڑی محنت کھینچ کر یہاں تلک آ پہنچا ہے۔ سائیں! تیرے کارنے چھوڑا شہرِ بلخ[10]۔ اور اس شہر میں[11] بہت دنوں سے حیران پریشان پھرتا ہے۔ آخر وہ قصد مرنے کا کر کے میرے ساتھ لگ[12] چلا۔ میں نے تلوار سے ڈرایا، اُس نے گردن آگے دھر دی اور قسم دی کہ اب میں یہی چاہتا ہوں، دیر مت کر۔ غرض تمھارے عشق میں ثابت ہے۔ میں نے خوب آزمایا، سب طرح پورا پایا؛ اِس سبب سے اُس کا مذکور میں درمیان لایا۔ اگر حضور سے اُس کے احوال پر، مسافر جان کر، توجّہ ہو، تو خدا ترسی اور حق شناسی[13] سے دور نہیں۔

یہ ذکر ملکہ نے سن کر فرمایا: کہاں ہے؟ اگر شہزادہ ہے تو کیا مضائقہ! روبرو آوے۔ وہ گوکا وہاں سے اُٹھ کر آیا اور مجھے ساتھ لے کر گیا۔ میں ملکہ کے دیکھنے سے نہایت شاد ہوا، لیکن عقل[14] و ہوش برباد ہوئے، عالم سکوت کا ہو گیا، یہ ہیاو[15] نہ پڑا کہ کچھ کہوں۔ ایک دم میں ملکہ سدھاری اور

کوکا اپنے مکان کو چلا۔ گھر آکر بولا کہ میں نے تیری سب حقیقت اوّل سے آخر تک ملکہ کو کہہ سنائی اور سفارش بھی کی؛ اب تو ہمیشہ رات کو بلاناغہ جایا کر اور عیش، خوشی منایا کر۔ میں اُس کے قدم پر گر پڑا، اُس نے گلے لگا لیا۔ تمام دن گھڑیاں گنتا رہا کہ کب سانجھ ہو، جو میں جاؤں۔ جب رات ہوئی، میں اُس جوان سے رخصت ہو کر چلا اور پائیں باغ میں، ملکہ کے چبوترے پر تکیہ لگا کر جا بیٹھا۔

بعد ایک گھڑی کے ملکہ تنِ تنہا ایک خواص کو ساتھ لے کر، آہستہ آہستہ آکر مسند پر بیٹھیں۔ خوش طالعی سے یہ دن میسّر ہوا، میں نے قدم بوس کیا۔ انھوں نے سر میرا اٹھا لیا اور گلے سے لگا لیا اور بولیں کہ اس فرصت کو غنیمت جان اور میرا کہا مان؛ مجھے یہاں سے لے نکل، کہیں اور ملک چل۔ میں نے کہا: چلیے۔ یہ کہہ کر ہم دونوں باغ کے باہر تو ہوئے، پر حیرت سے اور خوشی سے ہاتھ پانو پھول گئے اور راہ بھول گئے۔ اور ایک طرف کو چلے جاتے تھے، پر کچھ ٹھکانا نہیں پاتے تھے۔ ملکہ برہم ہو کر بولی کہ اب میں تھک گئی، تیرا مکان کہاں ہے؟ جلد چل کر پہنچ، نہیں تو کیا کیا چاہتا ہے! میرے پانو میں پھپھولے پڑ گئے ہیں، رستے میں کہیں بیٹھ جاؤں گی۔ میں نے کہا کہ میرے غلام کی حویلی نزدیک ہے، اب آپہنچے، خاطر جمع رکھو اور قدم اٹھاؤ۔ جھوٹھ تو بولا، پر دل میں حیران تھا کہ کہاں لے جاؤں! عین راہ پر ایک دروازہ مقفّل نظر پڑا۔ جلدی سے قفل کو توڑ کر مکان کے بھیتر گئے۔ اچھی حویلی، فرش بچھا ہوا، شراب کے شیشے بھرے قرینے سے

طاق میں دھرے اور باورچی خانے میں نان، کباب تیار تھے۔ ماندگی کمال ہو رہی تھی، ایک ایک گلابی شراب پرتگالی کی(۱) اُس گزک کے ساتھ لی اور ساری رات باہم خوشی کی۔ جب اِس چین سے صبح ہوئی، شہر میں غل مچا کہ شہزادی غائب ہوئی۔ محلہ محلہ، کوچہ کوچہ منادی پھرنے لگی(۲) اور کٹنیاں اور ہرکارے چھوٹے کہ جہاں سے ہاتھ آوے، پیدا کریں۔ اور سب دروازوں پر شہر کے بادشاہی غلاموں کی چوکی آ بیٹھی۔ گذر بانوں کو حکم ہوا کہ بغیر پروانگی(۳) چیونٹی باہر شہر کے نہ نکل سکے۔ جو کوئی سراغ ملکہ کا لاوے گا، ہزار اشرفی اور خلعت انعام پاوے گا۔ تمام شہر میں کٹنیاں پھرنے اور گھر گھر میں گھسنے لگیں۔

مجھے جو کم بختی لگی، دروازہ بند نہ کیا۔ ایک بڑھیا شیطان کی خالا، اُس کا خدا کرے منہ کالا، ہاتھ میں تسبیح لٹکائے، برقع اوڑھے، دروازہ کھلا پا کر، بدھڑک چلی آئی اور سامھنے ملکہ کے کھڑی ہو کر، ہاتھ اٹھا کر دعا دینے لگی کہ الٰہی! تیری نتھ(۴)، چوڑی سہاگ کی سلامت رہے(۵) اور کماؤ کی پگڑی(۶) قائم رہے! میں غریب رنڈیا(۷)، فقیرنی ہوں، ایک بیٹی میری ہے کہ وہ دوجی سے(۸)، پورے دِنوں، دردِ زہ میں مرتی ہے اور مجھ کو اتنی وسعت نہیں کہ آدھی کا تیل چراغ میں جلاؤں، کھانے پینے کو توشہ کہاں سے لاؤں! اگر مر گئی، تو گور کفن(۹) کیونکر کروں گی! اور جنی، تو دائی(۱۰) جنائی کو کیا دوں گی! اور جچا کو ستھوارا(۱۱)، اچھوانی کہاں سے پلاؤں گی! آج دو دن ہوئے ہیں کہ بھوکی(۱۲) پیاسی پڑی ہے۔ اے صاحب زادی! اپنی خیر کچھ ٹکڑا(۱۳) پارچہ

دِلا، تو اُس کو پانی پینے کا آدھار ہو۔
مَلِکہ نے ترس کھاکر، اپنے نزدیک بُلاکر، چار نان اور کباب اور ایک انگوٹھی چھنگلیا سے اُتار کر حوالے کی کہ اِس کو بیچ باچ کر گہنا پاتا بنا دیجو اور خاطرِ جمع سے گزران کیجو اور کبھو آیا کیجو، تیرا گھر ہے۔ اُس نے اپنے دل کا مُدّعا، جس کی تلاش میں آئی تھی، بہ جِنس پایا؛ خوشی سے دُعائیں دیتی اور بَلائیں لیتی دفع ہوئی۔ ڈیوڑھی میں نان، کباب پھینک دیے، مگر انگوٹھی کو مُٹھی میں لے لیا، کہ پتا مَلِکہ کے ہاتھ کا میرے ہاتھ آیا۔ خُدا اُس آفت سے جو بچایا چاہے، اُس مکان کا مالک جوان مردِ سپاہی، تازی گھوڑے پر چڑھا ہوا، نیزہ ہاتھ میں لیے، شِکاربند سے ایک ہرن لٹکائے آپہنچا۔ اپنی حویلی کا تالا ٹوٹا اور کواڑ کُھلے پائے؛ اُس دلّالہ کو نکلتے دیکھا؛ مارے غُصّے کے ایک ہاتھ سے اُس کے جُھونٹے پکڑ کر لٹکا لیا اور گھر میں آیا۔ اُس کے دونوں پانو میں رسّی باندھ کر، ایک درخت کی ٹہنی میں لٹکایا۔ سر تلے پانو اوپر کیے؛ ایک دم میں تڑپھ تڑپھ کر مر گئی۔ اُس مرد کی صورت دیکھ کر یہ ہیبت غالب ہوئی کہ ہوائیاں مُنہ پر اُڑنے لگیں اور مارے ڈر کے کلیجا کانپنے لگا۔ اُس عزیز نے ہم دونوں کو بدحواس دیکھ کر تسلّی دی کہ بڑی نادانی تم نے کی! ایسا کام کیا اور دروازہ کھول دیا!
مَلِکہ نے مُسکرا کر فرمایا کہ شہ زادہ، اپنے غلام کی حویلی کہہ کر مجھے لے آیا اور مجھ کو پُھسلایا۔ اُس نے اِلتماس کیا کہ شہ زادے نے بیانِ واقعی کہا۔ جتنی خلق اللہ ہے، بادشاہوں کی لونڈی غلام ہیں۔ انھیں کی بَرکت

اور فیض سے سب کی پرورش اور نباہ ہے۔ یہ غلام، بے دام و درم زرخرید تمھارا ہے؛ لیکن بھید چھپانا عقل کا مقتضا ہے۔ اے شاہ زادے! تمھارا اور ملکہ کا اس غریب خانے میں توجّہ فرمانا اور تشریف لانا، میری سعادت دونوں جہان کی ہے، اور اپنے فدوی کو سرفراز کیا۔ میں نثار ہونے کو تیار ہوں، کسو صورت میں جان و مال سے دریغ نہ کروں گا، آپ شوق سے آرام فرمائیے، اب کوڑی بھر خطرہ نہیں۔ یہ مُردار کُٹنی اگر سلامت جاتی، تو آفت لاتی۔ اب جب تلک مزاجِ شریف چاہے، بیٹھے رہیے اور جو کچھ درکار ہو، اس خانہ زاد کو کہیے؛ سب حاضر کرے گا۔ اور بادشاہ تو کیا چیز ہے، تمھاری خبر فرشتے کو بھی نہ ہو گی۔ اس جواں مرد نے ایسی ایسی باتیں تسلّی کی کہیں کہ ٹک خاطر جمع ہوئی، تب میں نے کہا: شاباش! تم بڑے مرد ہو! اس مروّت کا عوض ہم سے بھی جب ہو سکے گا، تب ظہور میں آوے گا۔ تمھارا نام کیا ہے؟ اس نے کہا: غلام کا اسم بہزاد خاں ہے۔ غرض چھ مہینے تک جتنی شرط خدمت کی تھی، بہ جان و دل بجا لایا، خوب آرام سے گزری۔

ایک دن مجھے اپنا ملک اور ماں باپ یاد آئے، اس لیے نہایت متفکّر بیٹھا تھا۔ میرا چہرہ ملین دیکھ کر، بہزاد خاں رو بہ رو ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہوا اور کہنے لگا کہ اس فدوی سے اگر کچھ تقصیر خدمت گزاری میں واقع ہوئی ہو، تو ارشاد ہو۔ میں نے کہا: از برائے خدا یہ کیا مذکور ہے! تم نے ایسا سلوک کیا کہ اس شہر میں ایسے آرام سے رہے جیسے اپنی ماں کے پیٹ میں کوئی رہتا ہے۔ نہیں تو یہ ایسی حرکت ہم سے ہوئی تھی کہ تنکا تنکا ہمارا دشمن تھا۔ ایسا

دوست ہمارا کون تھا کہ ذرا دم لیتے۔ خُدا تمھیں خوش رکھے، بڑے مرد ہو۔ تب اُس نے کہا: اگر یہاں سے دِل، برداشتہ ہوا ہو تو جہاں حُکم ہو، وہاں خیر و عافیت سے پہنچا دوں۔ فقیر بولا کہ اگر اپنے وطن تک پہنچوں، تو والدین کو دیکھوں۔ میری تو یہ صورت ہوئی، خدا جانے اُن کی کیا حالت ہوئی ہوگی! مَیں جس واسطے جلا وطن ہوا تھا، میری تو آرزو بر آئی! اب اُن کی بھی قدم بوسی واجب ہے۔ میری خبر اُن کو کچھ نہیں کہ مُوا، یا جیتا ہے، اُن کے دل پر کیا قلق گزرتا ہوگا! وہ جواں مرد بولا کہ بہت مُبارک ہے، چلیے۔ یہ کہہ کے، ایک راس گھوڑا ترکی، سَو کوس چلنے والا اور ایک گھوڑی جلد، جس کے پَر نہیں کٹے تھے لیکن شایستہ، مَلِکہ کی خاطر لایا اور ہم دونوں کو سوار کروایا۔ پھر زِرہ بکتر پہن، سلاح باندھ، اُدیچی بن، اپنے مَرکَب پر چڑھ بیٹھا اور کہنے لگا: غلام آگے ہو لیتا ہے، صاحب خاطر جمع سے گھوڑے دبائے ہوئے چلے آویں۔

جب شہر کے دروازے پر آیا، ایک نعرہ مارا اور تبر سے قفل کو توڑا اور نگہبانوں کو ڈانٹ ڈپٹ کر للکارا کہ بُرا چُوت دو! اپنے خاوند کو جا کر کہو کہ بہزاد خاں، مَلِکۂ مہر نگار اور شہزادۂ کام گار کو، جو تمھارا داماد ہے، ہانکے پکارے لیے جاتا ہے؛ اگر مَردمی کا کچھ نشہ ہے، تو باہر نکلو اور مَلِکہ کو چھین لو؛ یہ نہ کہیو کہ چُپ چاپ لے گیا؛ نہیں تو قلعے میں بیٹھے آرام کیا کرو۔ یہ خبر بادشاہ کو جلد جا پہنچی۔ وزیر اور میر بخشی کو حُکم ہوا: اُن تینوں بد ذات مُفسِدوں کو باندھ کر لاؤ، یا اُن کے سر کاٹ کر حضور میں پہنچاؤ۔ ایک دم کے بعد غٹ فوج کا نمود ہوا اور تمام زمین و آسمان گرد باد ہوگیا۔ بہزاد خاں نے

مَلکہ کو اور اِس فقیر کو ایک دَر میں پُل کے، کہ بارہ پُتلے[1] اور جَون پور کے پُل[2] کے برابر تھا، کھڑا کیا اور آپ گھوڑے کو تُنگیا کر[3]، اُس فوج کی طرف پھرا اور شیر کی[4] مانند گونج کر، مَرکَب کو ڈپَٹ کر فوج کے درمیان گھسا۔ تمام لشکر کائی سا پھٹ گیا اور یہ، دونوں سرداروں تلک جا پہنچا۔ دونوں کے سر کاٹ لیے۔ جب سردار مارے گئے، لشکر تتر بتر[5] ہو گیا۔ وہ کہاوت ہے: سر سے سرواہ۔ جب بیل پھوٹی، رائی رائی ہو گئی[6]۔ وونہیں آپ بادشاہ کتنی فوج بکتر پوشوں کی ساتھ لے کر کُمک[*] کو آئے۔ اُن کی بھی لڑائی اُس یکّہ[7] جوان نے مار دی، شکستِ فاش کھائی، بادشاہ پس پا ہوئے۔ سچ ہے: فتح[*] دادِ الٰہی ہے؛ لیکن بہزاد خاں نے ایسی جواں مردی کی کہ شاید رستم سے بھی نہ ہو سکتی۔

جب بہزاد خاں نے دیکھا کہ مَطلع صاف ہُوا، اب کون باقی رہا ہے جو ہمارا پیچھا کرے گا، بے وسواس ہو کر اور خاطر جمع کر، جہاں ہم کھڑے تھے، آیا اور مَلکہ کو اور مجھ کو ساتھ لے کر چلا۔ سفر کی عُمر کوتاہ ہوتی ہے، تھوڑے عرصے میں اپنے مُلک کی سرحد میں جا پہنچے[8]۔ ایک عرضی صحیح سلامت آنے کی بادشاہ کے حضور میں، جو قبلہ گاہ مجھ فقیر کے تھے، لکھ کر روانہ کی۔ جہاں پناہ پڑھ کر شاد ہوئے، دوگانہ[9] شُکر کا ادا کیا، جیسے سوکھے دھان میں پانی پڑا۔ خوش ہو کر سب امیروں کو جِلَو میں لے کر، اِس عاجز کے استقبال کی خاطر لبِ دریا آ کر کھڑے ہوئے اور نواڑوں کے واسطے میرِ بحر[10] کو حُکم ہوا۔ میں نے دوسرے کنارے پر سواری بادشاہ کی کھڑی دیکھی، قدم بوسی کی آرزو میں گھوڑے کو

دریا میں ڈال دیا۔ ہیلہ مار کر (1) حضور میں حاضر ہوا۔ مجھے مارے اِشتیاق کے کلیجے سے لگا لیا۔

اب ایک اَور آفتِ ناگہانی پیش آئی کہ جس گھوڑے پر مَیں سوار تھا، شاید وُہ بچہ اُسی مادیان کا تھا جس پر مَلِکہ سوار تھی، یا جنسِیّت کے باعث؛ میرے مَرکَب کو دیکھ کر، گھوڑی نے بھی جلدی کر کر، اپنے تئیں مَلِکہ سمیت میرے پیچھے دریا میں گرایا اور پیرنے لگی۔ مَلِکہ نے گھبرا کے باگ کھینچی؛ وُہ مُنہ کی نرم تھی، اُلٹ گئی۔ مَلِکہ غوطے کھا کر، بہ مع گھوڑی دریا میں ڈوب گئی کہ پھر اُن دونوں کا نشان نظر نہ آیا۔ بہزاد خاں نے یہ حالت دیکھ کر، اپنے تئیں گھوڑے سمیت مَلِکہ کی مدد کی خاطر دریا میں پہنچایا۔ وُہ بھی اُس بھنور میں آگیا، پھر نکل نہ سکا۔ بہتیرے ہاتھ پانو مارے؛ کچھ بس نہ چلا، ڈوب گیا۔ جہاں پناہ نے یہ واردات دیکھ کر، مہا جال منگوا کر پھنکوایا اور ملّاحوں اور غوطہ خوروں کو فرمایا۔ اُنھوں نے سارا دریا چھان مارا، تھاہ کی مٹی لے لے آئے، پر وے دونوں ہاتھ نہ آئے۔ یا فُقرا! یہ حادثہ ایسا ہوا کہ مَیں سودائی اور جُنونی ہو گیا اور فقیر بن کر یہی کہتا پھرتا تھا: اِن تینوں کا یہی پیکھ؛ وُہ بھی دیکھا، یہ بھی دیکھ۔ اگر مَلِکہ کہیں غائب ہو جاتی یا مر جاتی، تو دل کو تسلّی آتی، پھر تلاش کو نکلتا یا صبر کرتا؛ لیکن جب نظروں کے روبرو غرق ہو گئی، تو کچھ بس نہ چلا۔ آخر جی میں یہی لہر آئی کہ دریا میں ڈوب جاؤں، شاید اپنے محبوب کو مر کر پاؤں۔

ایک روز رات کو اُسی دریا میں پیٹھا اور ڈوبنے کا ارادہ کر کر، گلے

تک پانی میں گیا۔ چاہتا ہوں کہ آگے پانو رکھوں اور غوطہ کھاؤں ! وُہی سوارِ بُرقع پوش، جنھوں نے تم کو بشارت دی ہے، آپہنچے۔ میرا ہاتھ پکڑلیا اور دلاسا دیا کہ خاطر جمع رکھ، مَلِکہ اور بہزاد خاں جیتے ہیں، تو اپنی جان ناحق[۲] کیوں کھوتا ہے! دُنیا میں ایسا بھی ہوتا ہے۔ خُدا کی درگاہ سے مایوس مت ہو۔ اگر جیتا رہے گا، تو تیری مُلاقات اُن دونوں سے ایک نہ ایک روز ہو رہے گی۔ اب تو رُوم کی طرف جا۔ اور بھی دو[۳] درویش دِل ریش وہاں گئے ہیں۔ اُن سے تو جب ملے گا، اپنی مُراد کو پہنچے گا۔

یا فقرا! بہ موجب حُکم اپنے ہادی کے میں بھی خدمت[۴] شریف میں آکر حاضر ہوا ہوں، اُمیدِ قوی[۵] ہے کہ ہر ایک اپنے اپنے مطلب کو پہنچے۔ اِس[۶] گدا کا یہ احوال تھا، جو تمام کمال کہہ سنایا۔

چوتھے درویش کی سیر ①

چوتھا فقیر اپنی سیر کی حقیقت رو رو کر اس طرح دُہرانے لگا:

قصّہ ہماری بے سر و پائی کا اب سُنو ٹک اپنا دھیان رکھ کے مِرا حال سب سُنو
کس واسطے میں آیا ہوں یہاں تک، تباہ ہو سارا بیان کرتا ہوں اِس کا سبب، سُنو

یا مرشد اللہ! ذرا متوجّہ ہو۔ یہ فقیر، جو اس حالت میں گرفتار ہے، چین کے بادشاہ کا بیٹا ہے۔ نازو نعمت سے پرورش پائی اور بہ خوبی تربیت ہوا۔ زمانے کے بھلے بُرے سے کچھ واقف نہ تھا، جانتا تھا کہ یونہیں ہمیشہ نبھے گی۔ عین بے فکری میں یہ حادثہ روبہ کار ہوا کہ قبلۂ عالم، جو والد اِس یتیم کے تھے، اُنھوں نے رحلت فرمائی۔ جاں کندنی کے وقت اپنے چھوٹے بھائی کو (جو میرے چچا ہیں) بلایا اور فرمایا کہ ہم نے تو سب مال مُلک چھوڑ کر ارادہ کوچ کا کیا؛ لیکن یہ وصیّت میری تم بجا لائیو اور بزرگی کو کام فرمائیو: جب تلک شہ زادہ، جو مالک اِس تخت و چھتر کا ہے، جوان ہو اور شعور سنبھالے اور اپنا گھر دیکھے بھالے، تم اِس کی نیابت کیجو اور سپاہ و رعیّت کو خراب نہ ہونے دیجو۔ جب وہ بالغ ہو، اُس کو سب کچھ سمجھا بجھا کر تخت حوالے کرنا۔ اور روشن اختر جو تمھاری بیٹی ہے، اُس سے شادی کر کے، تم سلطنت سے کنارہ پکڑنا۔ اِس سلوک سے بادشاہت ہمارے خاندان میں قائم رہے گی؛ کچھ خلل نہ آوے گا۔ یہ کہہ کر، آپ تو جاں بہ حق تسلیم ہوئے، چچا بادشاہ ہوا

اور بندوبست ملک کا کرنے لگا۔ مجھے حکم کیا کہ زنانے محل میں رہا کرے، جب تک جوان نہ ہو، باہر نہ نکلے۔

یہ فقیر چودہ برس کی عمر تک بیگمات (۴) اور خواصوں میں پلا کیا اور کھیلا کودا کیا۔ چچا کی بیٹی سے شادی کی خبر سن کر شاد تھا اور اس اُمید پر بے فکر رہتا اور دل میں کہتا کہ اب کوئی دن میں بادشاہت بھی ہاتھ لگے گی اور کتخدائی بھی ہوگی؛ دُنیا بہ اُمید قائم ہے۔ ایک حبشی مبارک نام، کہ والدِ مرحوم کی خدمت میں تربیت ہوا تھا اور اس کا بڑا اعتبار تھا اور صاحبِ شعور اور نمک حلال تھا؛ میں اکثر اس کے نزدیک جا بیٹھتا۔ وہ بھی مجھے بہت پیار کرتا اور میری جوانی دیکھ کر خوش ہوتا اور کہتا کہ الحمدللہ! اے شاہزادے! اب تم جوان ہوئے، انشاء اللہ تعالیٰ عن قریب تمھارا عمو (۶) ظلِ سبحانی کی نصیحت پر عمل کرے گا، اپنی بیٹی اور تمھارے والد کا تخت تمھیں دے گا۔

ایک روز یہ اتفاق ہوا کہ ایک ادنا (۷) سہیلی نے بے گناہ میرے تئیں ایسا طمانچہ کھینچ (۵) کر مارا کہ میرے گال پر پانچوں انگلیوں کا نشان اُکھڑ آیا۔ میں روتا ہوا مبارک کے پاس گیا۔ اس نے مجھے گلے سے لگا لیا اور آنسو آستین سے پونچھے اور کہا کہ چلو آج تمھیں بادشاہ پاس لے چلوں، شاید دیکھ کر مہربان ہو اور لائق سمجھ کر، تمھارا حق تمھیں دے۔ اسی وقت چچا کے حضور میں لے گیا۔ چچا نے دربار میں نہایت شفقت کی اور پوچھا کہ کیوں دل گیر ہو؟ اور آج یہاں کیوں کر آئے؟ مبارک بولا کہ کچھ عرض کرنے آئے ہیں۔ یہ سن کر

خود بہ خود کہنے لگا کہ اب میاں کا بیاہ کر دیتے ہیں۔ مُبارک نے کہا: بہت مُبارک ہے۔ وُہ نہیں نُجومی اور رَمّالوں کو رُو بہ رُو طَلَب کیا اور اُوپری دِل سے پوچھا کہ اِس سال کون سا مہینا اور کون سا دِن اور گھڑی مُبارک ہے، کہ سَر اَنجام شادی کا کروں۔ اُنھوں نے مَرضی پاکر، گن گنا کر عَرض کی کہ قبلۂ عالم! یِہ بَرَس سارا نَحس ہے، کسی چاند میں کوئی تاریخ سَعد نہیں ٹھہرتی۔ اگر یہ سال تمام بہ خَیر و عافِیَت کٹے، تو آیندہ کارِ خَیر کے لیے بہتر ہے۔

بادشاہ نے مُبارک کی طرف دیکھا اور کہا: شاہ زادے کو مَحَل[1] میں لے جا؛ خُدا چاہے تو اِس سال کے گُزرنے سے، اِس کی اَمانَت اِس کے حوالے کر دوں گا؛ خاطِر جمع رکھے اور پڑھے لکھے۔ مُبارک نے سلام کیا اور مجھے ساتھ لیا، مَحَل میں پہنچا دیا۔ دُو تین دن کے بعد مَیں مُبارک کے پاس گیا، مجھے دیکھتے ہی رُونے لگا۔ مَیں حیران ہوا اور پوچھا کہ دادا! خَیر تُو ہے؟ تمھارے رُونے کا کیا باعِث ہے؟ تب وُہ خَیر خواہ (کہ مجھے دل و جان سے چاہتا تھا) بُولا کہ مَیں اُس رُوز تمھیں اُس ظالِم کے پاس لے گیا؛ کاشکے اگر یِہ جانتا تو نہ لے جاتا۔ میں نے گھبرا کر کہا: میرے جانے میں کیا ایسی قَباحَت ہوئی، کہو تو صَحیح!

تب اُس نے کہا کہ سب اَمیر وَزیر، اَرکانِ دَولت چھوٹے بڑے تمھارے باپ کے وقت کے تُمھیں دیکھ کر خوش ہوئے اور خُدا کا شُکر کرنے لگے کہ اب ہمارا صاحِب زادہ جوان ہوا اور سلطنت کے لائق ہوا؛ اب کوئی دِن میں حق حق دار کو ملے گا؛ تب ہماری قدر دانی کرے گا اور خانہ زاد مورُوثیوں کی قدر سمجھے گا۔ یِہ خبر اُس بے ایمان کو پہنچی، اُس کی چھاتی پر سانپ پھِر گیا، مجھے خَلوت میں

بُلا کر کہا: اَے مُبارَک! اب ایسا کام کر کہ شہزادے کو کِسو فریب سے مار ڈال اور اُس کا خطرہ میرے جی سے نکال، جو میری خاطر جمع ہو۔ تب سے مَیں بے حواس ہو رہا ہوں کہ تیرا چچا تیری جان کا دُشمن ہوا۔ جونہیں مُبارَک سے یہ خبر نامُبارَک میں نے سُنی، بغیر مارے مر گیا اور جان کے ڈر سے اُس کے پاؤں پر گر پڑا، کہ واسطے خُدا کے! مَیں سلطنت سے گزرا، کِسو طرح میرا جی بچے! اُس غُلام باوَفا نے میرا سر اُٹھا کر چھاتی سے لگا لیا اور جواب دیا کہ کچھ خطرہ نہیں، ایک تدبیر مجھے سوجھی ہے، اگر راست آئی، تو کچھ پرواہ نہیں۔ زندگی ہے تو سب کچھ ہے۔ اَغلَب ہے کہ اِس فکر سے تیری جان بھی بچے اور اپنے مطلب سے کام یاب ہو۔

یہ بھروسا دے کر، مجھے ساتھ لے کر، اُس جگہ جہاں بادشاہِ مغفور، یعنے والد اِس فقیر کے سوتے بیٹھتے تھے، گیا اور میری بہت خاطر جمع کی۔ وہاں ایک کُرسی بچھی تھی۔ ایک طرف مجھے کہا اور ایک طرف آپ پکڑ کر صَندَلی کو سَرکایا اور کُرسی کے تلے کا فرش اُٹھایا اور زمین کو کھودنے لگا۔ ایک بارگی ایک کھڑکی نمود ہوئی کہ زنجیر اور قفل اُس میں لگا ہے۔ مجھے بُلایا۔ مَیں اپنے دل میں مُقرّر یہ سمجھا کہ میرے ذبح کرنے اور گاڑ دینے کو یہ گڑھا اِس نے کھودا ہے، موت آنکھوں کے آگے پھر گئی: لاچار چُپکے چُپکے کلمہ (۹) پڑھتا ہوا نزدیک گیا۔ دیکھتا ہوں تو اُس دریچے کے اندر عمارت ہے اور چار مکان ہیں۔ ہر ایک دالان میں دس دس خُمیں (۱۰) سونے کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی لٹکتی ہیں اور ہر ایک گولی کے مُنہ پر ایک سونے کی اینٹ اور ایک بندر جڑاؤ کا بنا ہوا

بیٹھا ہے۔ اُنتالیس گولیاں چاروں مکان میں گنیں۔ اور ایک خُم کو دیکھا کہ مُونہا مُونہہ اَشرفیاں بھری ہیں، اُس پر نہ بیموں ہے نہ خشت ہے۔ اور ایک حَوض جواہر سے لبالب بھرا ہوا دیکھا۔ میں نے مُبارک سے پوچھا کہ اے دادا! یہ کیا طلسم ہے اور کس کا مکان ہے اور یہ کس کام کے ہیں؟ بولا کہ یہ بوزنے جو دیکھتے ہو، اِن کا یہ ماجرا ہے کہ تمھارے باپ نے جوانی کے وقت سے مَلِکِ صادِق (جو بادشاہ جِنّوں کا ہے) اُس کے ساتھ دوستی اور آمد و رفت پیدا کی تھی؛ چناں چہ ہر سال میں ایک دفعہ کئی طرح کی تحفہ خوش بوئیں اور اِس مُلک کی سوغاتیں لے جاتے اور ایک مہینے کے قریب، اُس کی خدمت میں رہتے۔ جب رُخصت ہوتے، تو مَلِکِ صادِق ایک بندر زُمُرّد کا دیتا۔ ہمارا بادشاہ اُسے لاکر اِس تہ خانے میں رکھتا۔ اِس بات سے سوائے میرے کوئی دوسرا مُطّلع نہ تھا۔

ایک مرتبہ غُلام نے عرض کی کہ جہاں پناہ لاکھوں روپیے کے تحفے لے جاتے ہیں اور وہاں سے ایک بوزنہ پتّھر کا مُردہ آپ لے آتے ہیں، اِس کا آخر فائدہ کیا ہے؟ جواب میری اِس بات کا مُسکرا کر فرمایا: خبردار! کہیں ظاہر نہ کیجو، خبر شرط ہے! یہ ایک بیموں بے جان، جو تُو دیکھتا ہے، ہر ایک کے ہزار دیو زبردست تابع اور فرماں بردار ہیں؛ لیکن جب تلک میرے پاس چالیسوں بندر پورے جمع نہ ہو دیں، تب تک یہ سب نکمّے ہیں، کچھ کام نہ آویں گے۔ سو ایک بندر کی کمی تھی کہ اُسی برس بادشاہ نے وفات پائی۔ اِتنی محنت کچھ نیک نہ لگی، اُس کا فائدہ ظاہر نہ ہوا۔ اے

شاہ زادے! تیری یہ حالت بے کسی کی دیکھ کر مجھے یاد آیا اور یہ جی میں ٹھہرایا کسو طرح تجھ کو ملکِ صادق (۱) کے پاس لے چلوں اور تیرے چچا کا ظلم بیان کروں۔ غالب ہے کہ وہ، دوستی تمھارے باپ کی یاد کر کر، ایک تُوزہ جو باقی ہے، تجھے دے۔ تب اُن کی مدد سے تیرا مُلک تیرے ہاتھ آوے اور چین (۲) یا چین کی سلطنت تو بہ خاطرِ جمع کرے، اور بالفعل اِس حرکت سے تیری جان بخشی ہے۔ اگر اور کچھ نہ ہوا، تو اِس ظالم کے ہاتھ سے، سوائے اِس تدبیر کے اور کوئی صورت مخلصی کی نظر نہیں آتی۔ میں نے اُس کی زبانی یہ سب کیفیت (۴) سُن کر کہا کہ دادا جان! اب تو میری جان کا مختار ہے، جو میرے حق میں بھلا ہو، سو کر۔ میری تسلّی کر کے، آپ عطر اور بخور اور جو کچھ وہاں کے لے جانے کی خاطر مناسب جانا، خرید کرنے بازار میں گیا۔

دوسرے دن میرے اُس کافر چچا کے پاس (جو بجائے ابو جہل کے تھا) گیا اور کہا: جہاں پناہ! شہ زادے کے مار ڈالنے کی ایک صورت میں نے دل میں ٹھہرائی ہے، اگر حکم ہو تو عرض کروں۔ وہ کم بخت خوش ہو کر بولا: وہ کیا تدبیر ہے؟ تب مبارک نے کہا کہ اِس کے مار ڈالنے میں سب طرح آپ کی بدنامی ہے، مگر میں اِسے باہر جنگل میں لے جا کر ٹھکانے لگاؤں اور گاڑ داب کر چلا آؤں، ہرگز کوئی محرم نہ ہوگا کہ کیا ہوا۔ یہ بندش مبارک سے سُن کر بولا کہ بہت مبارک، میں یہ چاہتا ہوں کہ وہ سلامت نہ رہے۔ اِس کا دغدغہ میرے دل میں ہے، اگر مجھے اِس فکر سے تو چھڑاوے گا، تو اِس خدمت کے عوض بہت کچھ پاوے گا۔ جہاں تیرا جی چاہے،

نے جاکر کھپا دے اور مجھے یہ خوش خبری لادے۔

مُبارک نے بادشاہ کی طرف سے اپنی دِل جمعی کرکے، مجھے ساتھ لیا اور وے تحفے لے کر، آدھی رات کو شہر سے کوچ کیا اور اُتّر کی سمت چلا۔ ایک مہینے تلک پیہم چلا گیا۔ ایک روز رات کو چلے جاتے تھے جو مبارک بولا کہ شکر خدا کا، اب منزلِ مقصود کو پہنچے۔ میں نے سُن کر کہا کہ دادا! یہ تو نے کیا کہا؟ کہنے لگا: اے شہزادے! جنوں کا لشکر کیا نہیں دیکھتا؟ میں نے کہا: مجھے تیرے سوا اور کچھ نظر نہیں آتا۔ مبارک نے ایک سُرمے دانی نکال کر، سلیمانی سُرمے کی سلائیاں میری دونوں آنکھوں میں پھیر دیں؛ وونہیں جنوں کی خلقت اور لشکر کے تنبو قنات نظر آنے لگے؛ لیکن سب خوش رو اور خوش لباس۔ مبارک کو پہچان کر، ہر ایک آشنائی کی راہ سے گلے ملتا اور مزاخیں کرتا۔

آخر جاتے جاتے بادشاہی سراچوں کے نزدیک گئے اور بارگاہ میں داخل ہوئے۔ دیکھتا ہوں تو روشنی قرینے سے روشن ہے اور صندلیاں طرح بہ طرح کی دو رویہ بچھی ہیں اور عالم، فاضل، درویش اور امیر، وزیر، میر بخشی، دیوان اُن پر بیٹھے ہیں۔ اور یساول، گرز بردار، اَحدی، چیلے ہاتھ باندھے کھڑے ہیں۔ اور درمیان میں ایک تخت مرصّع کا بچھا ہے، اُس پر ملکِ صادق، تاج اور چارقب موتیوں کی پہنے ہوئے، مسند پر تکیے لگائے، بڑی شان شوکت سے بیٹھا ہے۔ میں نے نزدیک جاکر سلام کیا۔ مہربانگی سے بیٹھنے کا حکم کیا۔ پھر کھانے کا چرچا ہوا۔ بعد فراغت

کے دسترخوان بڑھایا گیا، تب مبارک کی طرف متوجہ ہوکر احوال میرا پوچھا۔ مبارک نے کہا کہ اب اِن کے باپ کی جگہ پر چچا اِن کا بادشاہت کرتا ہے اور اِن کا دشمنِ جانی ہوا ہے؛ اِس لیے میں اِنھیں وہاں سے لے بھاگ کر، آپ کی خدمت میں لایا ہوں، کہ یتیم ہیں اور سلطنت اِن کا حق ہے؛ لیکن [۵] بغیر مربّی کسو سے کچھ نہیں ہو سکتا۔ حضور کی دست گیری کے باعث اِس مظلوم کی پرورش ہوتی ہے۔ اِن کے باپ کی خدمت کا حق یاد کر کے، اِن کی مدد فرمائیے اور وہ چالیسواں بندر عنایت کیجیے، جو چالیسوں پورے ہوں اور یہ اپنے حق کو پہنچ کر، تمھارے جان و مال کو دعا دیں۔ سوائے صاحب کی پناہ کے، کوئی اِن کا ٹھکانا نظر نہیں آتا۔

یہ تمام کیفیت سن کر، ملکِ صادق نے تامّل کر کے کہا کہ واقعی حقوقِ خدمت اور دوستی بادشاہِ مغفور کے ہمارے اوپر بہت تھے اور یہ بچارا تباہ ہو کر، اپنی سلطنتِ موروثی چھوڑ کر، جان بچانے کے واسطے یہاں تلک آیا ہے اور ہمارے دامنِ دولت میں پناہ لی ہے؛ تا مقدور کسو طرح ہم سے کمی نہ ہوگی اور درگذر نہ کروں گا۔ لیکن ایک کام ہمارا ہے! اگر وہ اِس سے ہو سکا اور خیانت نہ کی اور بہ خوبی انجام دیا اور اِس امتحان میں پورا اترا؛ تو میں [۱۰] قول قرار کرتا ہوں کہ زیادہ بادشاہ سے سلوک کروں گا اور جو یہ چاہے گا، سو دوں گا۔ میں نے ہاتھ باندھ کر التماس کیا کہ اِس فدوی سے تا بہ مقدور جو خدمت سرکار کی ہو سکے گی، بہ سر و چشم بجا لاوے گا اور اُس کو

(۱) بہ خوبی و دیانت داری اور ہوشیاری سے کرے گا اور اپنی سعادت دونوں جہان کی سمجھے گا۔ فرمایا کہ تو ابھی لڑکا ہے، اِس واسطے بار بار تاکید کرتا ہوں۔ مبادا خیانت کرے اور آفت میں پڑے۔ میں نے کہا: خدا، بادشاہ کے اقبال سے آسان کرے گا اور میں حتّی المقدور کوشش کروں گا اور امانت حضور تک لے آؤں گا۔

یہ سن کر، ملکِ صادق نے مجھ کو قریب بلایا اور ایک کاغذ، دستی سے نکال کر، میرے تئیں دکھلایا اور کہا: یہ جس شخص کی شبیہ ہے، اُسے جہاں سے جانے، تلاش کر کے میری خاطر پیدا کر کے لا۔ اور جس گھڑی تو اُس کا نام و نشان پاوے اور سامھنے جاوے، میری طرف سے بہت اِشتیاق ظاہر کیجو۔ اگر یہ خدمت تجھ سے سرانجام ہوئی؛ تو جتنی توقّع تجھے منظور ہے، اُس سے زیادہ غور پرداخت کی جائے گی۔ وَاِلّا نہ، جیسا کرے گا، ویسا پاوے گا۔

میں نے اُس کاغذ کو جو دیکھا، ایک تصویر نظر پڑی کہ غش سا آنے لگا۔ بہ زور، مارے ڈر کے اپنے تئیں سنبھالا اور کہا: بہت خوب، میں رخصت ہوتا ہوں؛ اگر خدا کو میرا بھلا کرنا ہے، تو بہ موجب حکمِ (۹) حضور کے مجھ سے عمل میں آوے گا۔ یہ کہہ کر، مبارک کو ہمراہ لے کر، جنگل کی راہ لی۔ گانو گانو، بستی بستی، شہر شہر، ملک ملک پھرنے لگا اور ہر ایک سے اُس کا نام (۱۰) و نشان تحقیق کرنے۔ کسو نے نہ کہا کہ ہاں میں جانتا ہوں، یا کسی سے مذکور سنا ہے۔ سات برس تک اُسی عالم میں حیرانی و پریشانی سہتا ہوا،

ایک نگر میں وارد ہوا۔ عمارتیں (۱) عالی اور آباد، لیکن وہاں کا ہر ایک متنفّس اِسمِ اعظم پڑھتا تھا اور خدا کی عبادت، بندگی کرتا تھا۔

ایک اندھا ہندوستانی فقیر، بھیک مانگتا نظر آیا، لیکن کسو نے ایک کوڑی یا ایک نوالہ نہ دیا۔ مجھے تعجب آیا اور اُس کے اوپر رحم کھایا! جیب (۲) میں سے ایک اشرفی نکال کر اُس کے ہاتھ (۳) دی۔ وہ لے کر بولا کہ اے داتا! خدا تیرا بھلا کرے، تو شاید مسافر ہے، اِس شہر کا باشندہ نہیں۔ میں نے کہا: فی الواقع سات برس سے میں تباہ ہوا ہوں۔ جس کام کو نکلا ہوں، اُس کا سُراغ نہیں ملتا، آج اِس بلدے (۴) میں آپہنچا ہوں۔ وہ بوڑھا دعائیں دے کر چلا، میں اُس کے پیچھے لگ لیا۔ باہر شہر کے ایک مکانِ (۵) عالی شان نظر آیا؛ وہ اُس کے اندر گیا، میں بھی چلا۔ دیکھا تو جا بہ جا عمارت گر پڑی ہے اور بے مرمت ہو رہی ہے۔

میں نے دل میں کہا کہ یہ محل (۶) لائق بادشاہوں کے ہے۔ جس وقت تیاری اِس کی ہوگی، کیا ہی مکانِ (۷) دل چسپ بنا ہوگا! اور اب تو ویرانی سے کیا صورت بن رہی ہے! پر معلوم نہیں کہ اُجاڑ کیوں پڑا ہے اور یہ نابینا اِس محل میں کیوں بستا ہے! وہ کور لاٹھی ٹیکتا ہوا چلا جاتا تھا کہ ایک آواز آئی، جیسے کوئی کہتا ہے کہ اے باپ! خیر تو ہے، آج سویرے کیوں پھر آتے ہو؟ پیر مرد نے سن کر جواب دیا کہ بیٹی! خدا نے ایک جوان مسافر کو میرے احوال پر مہربان کیا، اُس نے ایک مہر مجھ کو دی۔ بہت دنوں سے پیٹ بھر کر اچھا کھانا نہ کھایا تھا؛ سو گوشت، مصالح (۸)، گھی، تیل،

آٹا، نون، مول لیا۔ اور تیری خاطر کپڑا، جو ضرور تھا، خرید کیا۔ اب اِس کو
[1] قطع کر اور سی کر پہن۔ اور کھانا پکا، تو کھا پی کے اُس سخی کے حق[2] میں دُعا دیں۔
اگرچہ مطلب اُس کے دل کا معلوم نہیں، پر خدا دانا بینا ہے، ہم بے کسوں
کی دُعا قبول کرے۔

میں نے یہ احوال اُس کی فاقہ کشی کا جو سُنا، بے اختیار جی میں آیا
کہ بیس اشرفیاں اور اُس کو دوں؛ لیکن آواز کی طرف دھیان جو گیا، تو
ایک عورت دیکھی کہ ٹھیک وہ تصویر اُسی معشوق کی تھی۔ تصویر کو نکال کر مقابل
کیا، سرِ مو تفاوت نہ دیکھا۔ ایک نعرہ دل سے نکلا اور بے ہوش ہوا۔
مبارک میرے تئیں بغل میں لے کر بیٹھا اور پنکھا کرنے لگا۔ مجھ میں[3] ذرا سا
ہوش آیا۔ اُسی کی طرف تاک رہا تھا، جو مبارک نے پوچھا کہ تم کو کیا ہو گیا؟
ابھی منہ سے جواب نہیں نکلا، وہ نازنین بولی کہ اے جوان! خدا سے ڈر
اور [4] بیگانے ستر پر نگاہ مت کر؛ حیا اور شرم سب کو ضرور ہے۔ اِس لیاقت
سے گفتگو کی کہ میں اُس کی صورت اور سیرت پر محو ہو گیا۔ مبارک میری خاطرداری
بہت سی کرنے لگا، لیکن دل کی حالت کی اُس کو کیا خبر تھی۔ لاچار ہو کر میں
پکارا کہ اے خدا کے بندو اور اِس مکان کے رہنے والو! میں غریب مسافر
ہوں؛ اگر اپنے پاس مجھے بلاؤ اور رہنے کو جگہ دو، تو بڑی بات ہے۔
اُس اندھے نے نزدیک بلایا اور آواز پہچان کر گلے لگایا[5] اور جہاں وہ
گل بدن بیٹھی تھی، اُس مکان میں لے گیا۔ وہ ایک کونے میں چھپ[6] گئی۔
اُس بوڑھے نے مجھ سے پوچھا کہ اپنا ماجرا کہہ، کہ کیوں گھر بار چھوڑ کر اکیلا

پڑا پھرتا ہے اور تجھے کس کی تلاش ہے؟ میں نے مُلکِ صادِق کا نام نہ لیا اور وہاں کا کچھ ذِکر مذکور نہ کیا، اِس طور سے کہا کہ یہ بے کس، شہزادہ چین و ماچین کا ہے، چناں چہ میرے وَلی نعمت ہنوز بادشاہ ہیں۔ ایک سوداگر سے، لاکھوں روپئے دے کر یہ تصویر مُول لی تھی۔ اِس کے دیکھنے سے سب ہوش آرام جاتا رہا اور فقیر کا بھیس کر کر تمام دُنیا چھان ماری۔ اب یہاں میرا مطلب مِلا ہے، سو تمہارا اِختیار ہے۔

یہ سُن کر اندھے نے ایک آہ ماری اور بولا: اَے عزیز! میری لڑکی بڑی مصیبت میں گرِفتار ہے۔ کسو بَشر کی مجال نہیں کہ اِس سے نکاح کرے اور پھل پاوے۔ میں نے کہا: اُمّیدوار ہوں کہ مُفصّل بیان کرو۔ تب اُس مردِ عجمی نے اپنا ماجرا اِس طور سے ظاہِر کیا کہ سُن اَے بادشاہ زادے! میں رئیس اور اکابِر اِس کم بخت شہر کا ہوں۔ میرے بُزُرگ نام آور اور عالی خاندان تھے۔ حق تعالیٰ نے یہ بیٹی مجھے عنایت کی۔ جب بالغ ہوئی، تو اِس کی خوب صورتی اور نزاکت اور سلیقے کا شور ہوا اور سارے مُلک میں مشہور ہوا کہ فُلانے کے گھر میں ایسی لڑکی ہے کہ اُس کے حُسن کے مُقابل حور، پری شرمندہ ہے؛ اِنسان کا تو کیا مُنہ ہے کہ برابری کرے۔ یہ تعریف اِس شہر کے شہزادے نے سُنی۔ غائبانہ، بغیر دیکھے بھالے عاشق ہوا۔ کھانا پینا چھوڑ دیا، اُٹھوائی کھٹوائی لے کر پڑا۔

آخر بادشاہ کو یہ بات معلوم ہوئی۔ میرے تئیں رات کو خلوت میں بُلایا اور یہ مذکور درمیان میں لایا اور مجھے باتوں میں پھسلایا، حتّیٰ کہ نِسبت ناتا

کرنے میں راضی کیا۔ میں بھی سمجھا کہ جب بیٹی گھر میں پیدا ہوئی، تو کسو نہ کسو سے بیاہا ہی چاہیے؛ پس اس سے کیا بہتر ہے کہ بادشاہ زادے سے منسوب کردوں، اس میں بادشاہ بھی منت دار ہوتا ہے۔ میں قبول کرکے رخصت ہوا۔ اسی دن سے دونوں طرف تیاری بیاہ کی ہونے لگی۔ ایک روز اچھی ساعت میں قاضی، مفتی، عالم، فاضل، آکابر سب جمع ہوئے؛ نکاح باندھا گیا اور مہر معین ہوا۔ دلہن کو بڑی دھوم دھام سے لے گئے، سب رسم رسومات کرکے فارغ ہوئے۔ نوشہ نے رات کو جب قصدِ جماع کا کیا، اس مکان میں ایک شور غل ایسا ہوا کہ جو باہر لوگ چوکی میں تھے، حیران ہوئے۔ دروازہ کوٹھری کا کھول کر چاہا دیکھیں کہ یہ کیا آفت ہے؛ اندر سے ایسا بند تھا کہ کواڑ کھول نہ سکے۔ ایک دم میں وہ رونے کی آواز بھی کم ہوئی۔ پٹ کی چول اکھاڑ کر دیکھا، تو دولھا سر کٹا ہوا پڑا تڑپھتا ہے اور دلہن کے منہ سے کف چلا جاتا ہے اور اسی مٹی، لہو میں لتھڑی ہوئی بے حواس پڑی لوٹتی ہے۔

یہ قیامت دیکھ کر سب کے ہوش جاتے رہے۔ ایسی خوشی میں یہ غم ظاہر ہوا۔ بادشاہ کو خبر پہنچی، سر پیٹتا ہوا دوڑا۔ تمام ارکان سلطنت کے جمع ہوئے، پر کسو کی عقل کام نہیں کرتی کہ اس احوال کو دریافت کرے۔ (۹) نہایت کو، بادشاہ نے اس قلق کی حالت میں حکم کیا کہ اس کم بخت، بھونڈ پیری دلہن کا بھی سر کاٹ ڈالو۔ یہ بات بادشاہ کی زبان سے جونہیں نکلی، پھر ویسا ہی ہنگامہ برپا ہوا۔ بادشاہ ڈرا اور اپنی جان کے خطرے سے نکل

بھاگا اور فرمایا کہ اسے محل سے باہر نکال دو۔ خواصوں نے اس لڑکی کو میرے گھر میں پہنچا دیا۔ یہ چرچا دُنیا میں مشہور ہوا۔ جن نے سُنا، حیران ہوا۔ اور شہزادے کے مارے جانے کے سبب سے، خود بادشاہ اور جتنے باشندے اِس شہر کے ہیں، میرے دُشمنِ جانی ہوئے۔

جب ماتم داری سے فراغت ہوئی اور چہلم ہو چکا، بادشاہ نے اَرکانِ دَولت سے صلاح پوچھی کہ اب کیا کیا چاہیے۔ سبھوں نے کہا: اَور تو کچھ ہو نہیں سکتا، پر ظاہر میں دل کی تسلّی اور صبر کے واسطے، اُس لڑکی کو اُس کے باپ سمیت مروا ڈالیے اور گھر بار ضبط کر لیجیے۔ جب میری یہ سزا مقرّر کی، کوتوال کو حکم ہوا۔ اُس نے آکر چاروں طرف سے میری حویلی کو گھیر لیا اور نرسنگا دروازے پر بجایا اور چاہا کہ اندر گھسیں اور بادشاہ کا حکم بجا لاویں؛ غیب سے اینٹ پتھر ایسے برسنے لگے کہ تمام فوج تاب نہ لا سکی؛ اپنا سر منہ بچا کر جیدھر تیدھر بھاگی۔ اور ایک آوازِ مہیب بادشاہ نے محل میں اپنے (۱۰) کانوں سے سنی کہ کیوں کم بختی آئی ہے! کیا شیطان لگا ہے؟ بھلا چاہتا ہے تو اُس نازنین کے احوال کا متعرّض نہ ہو؛ نہیں تو جو کچھ تیرے بیٹے نے اُس سے شادی کر کر دیکھا، تو بھی اُس کی دشمنی سے دیکھے گا۔ اب اگر اُن کو ستاوے گا، تو سزا پاوے گا۔

بادشاہ کو مارے دہشت کے تپ چڑھی، وونہیں حکم کیا کہ اِن بدبختوں سے کوئی مزاحم نہ ہو؛ کچھ کہو نہ سنو، حویلی میں پڑا رہنے دو، زور ظلم اِن پر نہ کرو۔ اُسی دن سے عامل، باوجود یہ کہ پاس جان کر، دعا تعویذ اور سیانے، جنتر منتر کرتے ہیں۔

اور سب باشندے اِس شہر کے اِسمِ اَعظَم اور قرآن مجید پڑھتے ہیں۔ مُدّت سے
یہ تماشا ہو رہا ہے، لیکن اب تک کچھ اِسرار معلوم نہیں ہوتا اور مجھے بھی ہرگز
اِطّلاع نہیں؛ مگر اِس لڑکی سے ایک بار پوچھا کہ تم نے اپنی آنکھوں سے
کیا دیکھا تھا؟ یہ بولی کہ اور تو کچھ میں نہیں جانتی، لیکن یہ نظر آیا کہ جس وقت
میرے خاوند نے قصدِ مباشرت کا کیا؛ جھٹ پٹ کر ایک تختِ مُرصّع کا
نکلا، اُس پر ایک جوان (۲) خوب صورت شاہانہ لباس پہنے بیٹھا تھا اور ساتھ
بہت سے آدمی اِہتمام کرتے ہوئے اُس مکان میں آئے اور شہ زادے کے
قتل کے مُستَعِد ہوئے۔ وہ شخص سردار میرے نزدیک آیا اور بولا: کیوں جانی!
اب ہم سے کہاں بھاگو گی! اُن کی صورتیں آدمی کی سی تھیں، لیکن پاؤں بکریوں
کے سے نظر آئے۔ میرا کلیجا دھڑکنے لگا اور خوف سے غش میں آگئی۔ پھر مجھے کچھ
سُدھ نہیں کہ آخر کیا ہوا۔ تب سے میرا یہ اَحوال ہے کہ اِس پھوٹے مکان میں ہم
دونوں جی پڑے رہتے ہیں۔ بادشاہ کے غُصّے کے باعث اپنے رفیق سب
جُدا ہوگئے۔ اور میں گدائی کرنے جو نکلتا ہوں، تو کوئی کوڑی نہیں دیتا، بلکہ
دُکان پر کھڑے رہنے کے رَوا دار نہیں۔ اِس کم بخت لڑکی کے بدن پر لتّا
نہیں کہ ستر (۷) چھپاوے، اور کھانے کو میسّر نہیں جو پیٹ بھر کھاوے۔
خُدا سے یہ چاہتا ہوں کہ موت ہماری آوے، یا زمین پھٹے اور یہ ناشُدنی
سَماوے۔ اِس جینے سے مرنا بھلا ہے۔ خُدا نے شاید ہمارے ہی واسطے تجھے
بھیجا ہے، جو تو نے رَحم کھا کر ایک مُہر دی۔ کھانا بھی مزے دار پکا کر
کھایا اور بیٹی کی خاطر کپڑا بھی بنایا۔ خُدا کی درگاہ میں شُکر کیا اور تجھے دُعا دی۔

اگر اس پر آسیب جن یا پری کا نہ ہوتا، تو تیری خدمت میں لونڈی کی جگہ دیتا اور اپنی سعادت جانتا۔ یہ احوال اس عاجز کا ہے۔ تو اس کے درپے مت ہو اور اس قصد سے درگزر۔

یہ سب ماجرا سن کر، میں نے بہت منت و زاری کی کہ مجھے اپنی فرزندی میں قبول کر! جو میری قسمت میں بدا ہوگا، سو ہوگا۔ وہ پیر مرد ہرگز راضی نہ ہوا۔ شام جب ہوئی، اس سے رخصت ہو کر سرا میں آیا۔ مبارک نے کہا: تو شہزادے مبارک ہو! خدا نے اسباب تو درست کیا ہے۔ بارے یہ محنت اکارت نہ گئی۔ میں نے کہا: آج کتنی خوشامد کی، پر وہ اندھا بے ایمان راضی نہیں ہوتا! خدا جانے دیوے گا یا نہیں! پر میرے دل کی یہ حالت تھی کہ رات کاٹنی مشکل ہوئی، کہ کب صبح ہو تو پھر جا کر حاضر ہوں۔ کبھو یہ خیال آتا تھا: اگر وہ مہربان ہو اور قبول کرے، تو مبارک، ملکِ صادق کی خاطر لے جائے گا۔ پھر کہتا: بھلا ہاتھ تو آوے، مبارک کو مناونا کر میں عیش[۲] کروں گا۔ پھر جی میں یہ خطرہ آتا کہ اگر مبارک بھی قبول کرے، تو جنوں[۱] کے ہاتھ سے وہی[۳] نوبت میری ہوگی، جو بادشاہ زادے کی ہوئی۔ اور اس شہر کا بادشاہ کب چاہے گا کہ اس کا بیٹا مارا جائے، اور دوسرا خوشی منائے۔

تمام رات نیند اچاٹ ہو گئی اور اسی منصوبے کے اُدھیڑ بُن میں کٹی۔ جب روز[۴] روشن ہوا، میں چلا۔ چوک میں سے اچھے اچھے تھان پوشاکی اور گوٹا کناری اور میوہ[۵] خشک و تر خرید کر کے، اس بزرگ کی خدمت میں حاضر ہوا۔

نہایت خوش ہوکر بولا کہ سب کو اپنی جان سے زیادہ کچھ عزیز نہیں؛ پر اگر میری جان بھی تیرے کام آوے، تو دریغ نہ کروں اور اپنی بیٹی ابھی تیرے حوالے کروں؛ لیکن یہی خوف آتا ہے کہ اس حرکت سے تیری جان کو خطرہ نہ ہو، کہ یہ داغ لعنت کا میرے اوپر تا قیامت رہے۔ میں نے کہا: اب اس بستی میں بے کس واقع ہوں، اور تم میرے دین دنیا کے باپ ہو۔ میں اس آرزو میں مدّت سے کیا کیا تباہی اور پریشانی کھینچتا ہوا اور کیسے کیسے صدمے اٹھاتا ہوا یہاں تک آیا اور مطلب کا بھی سراغ پایا، خدا نے تمھیں بھی مہربان کیا جو بیاہ دینے پر رضامند ہوئے؛ لیکن میرے واسطے آگا پیچھا کرتے ہو۔ ذرا منصف ہوکر غور فرماؤ تو، عشق کی تلوار سے سر بچانا اور اپنی جان کو چھپانا کس مذہب میں درست ہے! ہرچہ بادا باد! میں نے سب طرح اپنے تئیں برباد دیا ہے، معشوق کے وصال کو میں زندگی سمجھتا ہوں، اپنے مرنے جینے کی مجھے کچھ پرواہ نہیں؛ بلکہ اگر نا امید ہوں گا، تو بن اجل مرجاؤں گا اور تمھارا قیامت میں دامن گیر ہوں گا۔

غرض اس گفت و شنید اور ہاں ناں میں قریب ایک مہینے کے خوف و رجا میں گزرا۔ ہر روز اس بزرگ کی خدمت میں دوڑا جاتا اور خوشامد برآمد کیا کرتا۔ اتفاقاً وہ بوڑھا کاہلہ ہوا۔ میں اس کی بیمار داری میں حاضر رہا۔ ہمیشہ قارورہ حکیم پاس لے جاتا۔ جو نسخہ لکھ دیتا، اسی ترکیب سے بنا کر پلاتا۔ اور شوربا اور غذا اپنے ہاتھ سے پکا کر کوئی نوالہ کھلاتا۔ ایک دن مہربان ہوکر کہنے لگا: اے جوان! تو بڑا ضدی ہے۔ میں نے ہرچند ساری قباحتیں

کہ سُنائیں، اور منع کرتا ہوں کہ اِس کام سے باز آ، جی ہے تو جہان ہے؛ پر خواہ مخواہ کنوئیں میں گرا چاہتا ہے۔ اچھا آج اپنی لڑکی سے تیرا مذکور کروں گا، دیکھوں وُہ کیا کہتی ہے۔ یا فقیرَ اللہ! یہ خوش خبری سُن کر میں ایسا پھولا کہ کپڑوں میں نہ سمایا، آداب بجا لایا اور کہا کہ اَب آپ نے میرے جینے کی فکر کی۔ رُخصت ہو کر مکان پر آیا اور تمام شب مُبارک سے یہی ذکر مذکور رہا۔ کہاں کی نیند اور کہاں کی بھوکھ! صُبح کو تڑکے وقت پھر جا کر موجود ہوا، سلام کیا۔ فرمانے لگا کہ تُو اپنی بیٹی ہم نے تم کو دی، خُدا مُبارک کرے! تم دونوں کو خُدا کی حفظ و امان میں سونپا! جب تلک میرے دَم میں دَم ہے، میری آنکھوں کے سامھنے رہو۔ جب میری آنکھ مُند جائے گی؛ جو تمھارے جی میں آوے گا سو کیجو، مختار ہو۔

کتنے دِن پیچھے وُہ مردِ بزرگ جاں بہ حق تسلیم ہوا، رو پیٹ کر تجہیز و تکفین کیا۔ بعد تیجے کے، اُس نازنین کو، مُبارک ڈولی کر کر کارواں سرا میں لے آیا اور مجھ سے کہا کہ یہ امانت مَلکِ صادق کی ہے، خبردار! خیانت نہ کیجو اور یہ محنت مشقت برباد نہ دیجو! میں نے کہا: اَے کاکا! مَلکِ صادق یہاں کہاں ہے! دل نہیں مانتا، میں کیونکر صبر کروں! جو کچھ ہو سو ہو، جیوں یا مروں، اب تو عیش کروں۔ مُبارک نے دِق ہو کر ڈانٹا کہ لڑکپن نہ کرو، ابھی ایک دَم میں کچھ کا کچھ ہو جاتا ہے! مَلکِ صادق کو دُور جانتے ہو، جو اُس کا فرمانا نہیں مانتے ہو! اُس نے چلتے وقت پہلے ہی اُونچ نیچ سب سمجھا دی ہے۔ اگر اُس کے کہنے پر رہو گے اور صحیح سلامت اِس کو

وہاں تک لے چلو گے ؛ تو وُہ بھی بادشاہ ہے، شاید تمھاری محنت پر توجّہ کر کے تمھیں کو بخشش دے، تو کیا اچھّی بات ہووے۔ پیٹ کی پیٹ رہے اور میت کا میت ہاتھ لگے۔

بارے اُس کے ڈرانے اور سمجھانے سے مَیں حَیران ہوکر چُپکا ہو رہا۔ دو سانڈنیاں خرید کیں اور کجاوُوں (۲) پر سوار ہوکر، مَلِکِ صادِق کے مُلک کی راہ لی۔ چلتے چلتے ایک میدان میں آواز غُل شُور کی آنے لگی۔ مُبارَک نے کہا: شُکر خُدا کا، ہماری محنت نیک (۳) لگی، یہ لشکر جِنّوں کا آپہنچا۔ بارے مُبارَک نے اُن سے مِل جُل کر پوچھا کہ کہاں کا ارادہ کیا ہے؟ وُہ بولے کہ بادشاہ نے تمھارے استِقبال کے واسطے ہمیں تَعیِنات (۵) کیا ہے، اب تمھارے فرماں بَردار ہیں ؛ اگر کہو تو ایک دَم میں رُوبرُو لے چلیں۔ مُبارَک نے کہا: دیکھو کِس کِس محنتوں سے خُدا نے بادشاہ کے حُضور میں ہمیں سُرخ رُو کیا، اب جلدی کیا ضُرور ہے۔ اگر خُدا نہ خواستہ کچھ خَلَل ہو جاوے، تو ہماری محنت اَکارَت ہو اور جہاں پناہ کی غَضَبی (۶) میں پڑیں۔ سبھوں نے کہا کہ اِس کے تم مُختار ہو؛ جس طَرح جی چاہے، چلو۔ اگرچہ سب طرح کا آرام تھا، پر رات دِن چلنے سے کام تھا۔

جب نزدیک جا پہنچے ؛ مَیں، مُبارَک کو سُوتا دیکھ کر، اُس نازنین کے قدموں پر سر رکھ کر، اپنے دل کی بے قراری اور مَلِکِ صادِق کے سبب سے لاچاری نہایت مِنّت و زاری سے کہنے لگا کہ جس روز سے تمھاری تصویر دیکھی ہے، خواب و خُورِش اور آرام میں نے اپنے اوپر حرام کیا ہے۔ اب جو خُدا نے یہ دن دِکھایا،

تو محض بے گانہ ہو رہا ہوں۔ فرمانے لگی کہ میرا بھی دل تمھاری طرف مائل ہے، کہ تم نے میری خاطر کیا کیا ہرج مرج اُٹھایا اور کس کس مشقتوں سے لے آئے ہو۔ خدا کی یاد کرو، اور مجھے بھول نہ جائیو! دیکھو تو پردۂ غیب سے کیا ظاہر ہوتا ہے۔ یہ کہہ کر، ایسی بے اختیار ڈاڑھ مار کر روئی کہ ہچکی لگ گئی۔ ایدھر میرا یہ حال، اُدھر اُس کا وہ احوال؛ اِس میں مبارک کی نیند ٹوٹ گئی۔ وہ ہم دونوں مشتاقوں کا رونا دیکھ کر، رونے لگا اور بولا: خاطر جمع رکھو (۷)، ایک روغن میرے پاس ہے، اس گل بدن کے بدن میں مل دوں گا؛ اُس کی بو سے ملکِ صادق کا جی ہٹ جائے گا، غالب ہے کہ تمھیں کو بخش دے۔

مبارک سے یہ تدبیر سن کر دل کو ڈھارس (۹) ہو گئی، اُس کے گلے سے لگ کر لاڈ کیا اور کہا: اے دادا! اب تو میرے باپ کی جگہ ہے، تیرے باعث میری جان بچی، اب بھی ایسا کام کر جس میں میری زندگانی ہو، نہیں تو اِس غم میں مر جاؤں گا۔ اُس نے ڈھیر سی تسلی دی۔ جب روز روشن ہوا، آواز جنوں کی معلوم ہونے لگی۔ دیکھا تو کئی خواص ملکِ صادق کے آئے ہیں اور وہ سرے پاؤ بھاری ہمارے لیے لائے ہیں اور ایک چوڈول، موتیوں کی توڑ پڑی ہوئی اُن کے ساتھ ہے۔ مبارک نے اُس نازنین کو وہ تیل مل دیا اور پوشاک پہنا، بناؤ کروا کر ملکِ صادق کے پاس لے چلا۔ بادشاہ نے دیکھ کر، مجھے بہت سرفراز کیا اور عزت و حرمت سے بٹھایا اور فرمانے لگا کہ تجھ سے میں ایسا سلوک کروں گا کہ کسو نے آج تک کسو سے نہ کیا ہوگا۔ بادشاہت تو تیرے باپ کی موجود ہے، علاوہ اب تو میرے بیٹے کی جگہ ہوا۔

بے توجّہ کی باتیں کر رہا تھا، اِتنے میں وہ نازنین بھی روبہ رو آئی۔ اُس روغن کی بو سے یک بہ یک دماغ پراگندہ(۱) ہوا اور حال بے حال ہو گیا۔ تاب اُس باس کی نہ لا سکا، اُٹھ کر باہر چلا گیا اور ہم دونوں کو بلوایا اور مبارک کی طرف متوجّہ ہو کر فرمایا کہ کیوں جی! خوب شرط بجا لائے! میں نے خبر دار کر دیا تھا کہ اگر خیانت کرو گے، تو خفگی میں پڑو گے؛ یہ بو کیسی ہے؟ اب دیکھو تمھارا کیا حال کرتا ہوں۔ بہت جز بز ہوا۔ مبارک نے مارے ڈر کے اپنا اِزار بند کھول کر دکھا دیا کہ بادشاہ سلامت! جب حضور کے حکم سے اِس کام کے ہم متعیّن ہوئے تھے؛ غلام نے پہلے ہی اپنی علامت کاٹ کر، ڈبیا میں بند کر کے، سر بہ مُہر سرکار کے خزانچی کے سپرد کر دی تھی اور مرہم سلیمانی لگا کر روانہ ہوا تھا۔

(۲) مبارک سے یہ جواب سن کر، میری طرف آنکھیں نکال کے گھورا اور کہنے لگا: تو یہ تیرا کام ہے! اور طیش(۳) میں آ کر، منہ سے برا بھلا بکنے لگا۔ اُس وقت اُس کے بہت کہا ونے سے یوں معلوم ہوتا تھا کہ شاید جان سے مجھے مروا ڈالے گا۔ جب میں نے اُس کے بُشرے سے یہ دریافت کیا؛ اپنے جی سے ہاتھ دھو کر اور جان کھو کر، سر غلاف(۴) مبارک کی کمر سے کھینچ کر مَلِک صادق کی توند میں ماری۔ چھری کے لگتے ہی نِہُرا(۵) اور جھومنا۔ میں نے حیران ہو کر جانا کہ مقرّر مر گیا۔ پھر اپنے دل میں خیال کیا کہ زخم تو ایسا کاری نہیں لگا، یہ کیا سبب ہوا! میں کھڑا دیکھتا تھا کہ وہ زمین پر لوٹ لاٹ، گیند کی صورت بن کر آسمان کی طرف اُڑ چلا۔ ایسا بلند ہوا کہ آخر نظروں سے غائب ہو گیا۔ پھر ایک

پل کے بعد، بجلی کی طرح کڑکتا اور غصے میں کچھ بے معنی بکتا ہوا نیچے آیا اور مجھے ایک لات ماری، کہ میں تیورا کر چاروں شانے چت گر پڑا اور جی ڈوب گیا۔ خدا جانے کتنی دیر میں ہوش آیا۔ آنکھیں کھول کر جو دیکھا، تو ایک ایسے جنگل میں پڑا ہوں کہ جہاں سوائے کپکڑ (۱) اور ٹینٹی (۲) اور جھڑ بیری (۳) کے درختوں کے کچھ اور نظر نہیں آتا۔ اب اس گھڑی عقل کچھ کام نہیں کرتی کہ کیا کروں اور کہاں جاؤں۔ نا امیدی سے ایک آہ بھر کر ایک طرف کی راہ لی۔ اگر کہیں کوئی آدمی کی صورت نظر پڑتی، تو ملکِ صادق کا نام پوچھتا۔ وہ دیوانہ جان کر جواب دیتا کہ ہم نے تو اس کا نام بھی نہیں سنا۔

ایک روز پہاڑ پر جا کر میں نے بھی (۴) ارادہ کیا کہ اپنے تئیں گرا کر ضائع کروں۔ جوں مستعد (۵) کرنے کا ہوا، وہی (۶) سوار صاحبِ ذوالفقار (۷)، بُرقع پوش آ پہنچا اور بولا کہ کیوں تو اپنی جان کھوتا ہے! آدمی پر دکھ درد سب ہوتا ہے۔ اب تیرے برے دن گئے اور بھلے دن آئے۔ جلد روم کو جا۔ تین شخص ایسے ہی آگے گئے ہیں، ان سے ملاقات کر اور وہاں کے سلطان سے مل۔ تم پانچوں کا مطلب ایک ہی جگہ ملے گا۔ اِس فقیر کی سیر کا یہ ماجرا ہے جو عرض کیا۔ بارے بشارت سے اپنے مولا مشکل کشا کی (۸) مرشدوں کی حضوری میں آ پہنچا ہوں، اور بادشاہِ ظلّ اللہ (۹) کی بھی ملازمت حاصل ہوئی؛ چاہیے کہ اب سب کی خاطر جمع ہو۔ (۱۰)

یہ (۱۱) باتیں چار درویش اور بادشاہ آزاد بخت میں ہو رہی تھیں کہ اِتنے میں ایک محلی (۱۲) بادشاہ کے محل (۱۳) میں سے دوڑا ہوا آیا اور مبارک باد کی تسلیمیں

بادشاہ کے حضور بجا لایا اور عرض کی کہ اِس وقت شاہزادہ پیدا ہوا کہ آفتاب و مہتاب اُس کے حُسن کے رُو بہ رُو شرمندہ ہیں۔ بادشاہ نے متعجب ہو کر پوچھا کہ ظاہر میں تو کسو کو حمل* نہ تھا، یہ آفتاب کس کے بُرجِ حمل سے نمود ہوا؟ اُس نے اِلتماس کیا کہ ماہ رُو خواص[۱]، جو بہت دِنوں سے غضبِ بادشاہی میں پڑی تھی، بے کسوں کی مانند ایک کونے میں رہتی تھی اور مارے ڈر کے اُس کے نزدیک کوئی نہ جاتا، نہ احوال پوچھتا تھا؛ اُس پر یہ فضلِ الٰہی ہوا کہ چاند سا بیٹا اُس کے پیٹ سے پیدا ہوا۔

بادشاہ کو ایسی خوشی حاصل ہوئی کہ شاید شادی مرگ[۲] ہو جائے۔ چاروں فقیر نے بھی دُعا دی کہ بھلا بابا! تیرا گھر آباد رہے اور اُس کا قدم مبارک ہو! تیرے سایے کے تلے بوڑھا بڑا ہو! بادشاہ نے کہا: یہ تمھارے قدم کی برکت ہے؛ وَاِلّا نہ[۳]، اپنے تو سان[۴] گمان میں بھی یہ بات نہ تھی۔ اجازت ہو تو جا کر دیکھوں۔ دَرویشوں نے کہا: بسم اللہ، سدھاریے۔ بادشاہ محل میں تشریف لے گئے۔ شہزادے کو گود میں لیا اور شکر پروردگار کی جناب میں کیا، کلیجا ٹھنڈا ہوا۔ وونہیں چھاتی سے لگائے ہوئے لاکر فقیروں کے قدموں پر ڈالا۔ دَرویشوں نے دُعائیں پڑھ کر جھاڑ پھونک دِیا۔ بادشاہ نے جشن کی تیاری کی۔ دوہری* نوبتیں جھڑنے[۵] لگیں۔ خزانے کا مُنہ کھول دیا۔ داد و دِہش سے ایک کوڑی کے محتاج کو لکھ پتی کر دیا۔ ارکانِ دولت جتنے تھے، سب کو دو چند جاگیر و منصب کے فرمان ہو گئے۔ جتنا لشکر تھا، انھیں پانچ برس کی طلب انعام ہوئی۔ مشائخ اور اکابر[۶] کو

مَدَدِ مُعاش[1] اور اَلتَمغا* عنایت ہُوا۔ بے نواؤں کے مٹنے[2] اور ٹکڑ گداؤں کے
چھلّے اَشرفی اور روپیوں کی کھچڑی سے بھر دیے۔ اور تین بَرس کا خزانہ
رَعیّت کو مُعاف کیا، کہ جو کچھ بُو دیں جُوتیں، دونوں حصّے اپنے گھروں میں
اُٹھا لے جائیں۔ تمام شہر میں، ہزاری بزاری کے گھروں میں، جہاں دیکھو
وہاں تھئی تھئی ناچ[4] ہو رہا ہے۔ مارے خوشی کے ہر ایک اَدنا اعلا
بادشاہِ وقت بن بیٹھا۔

عَین شادی میں ایک بارگی اَندرونِ محل سے رونے پیٹنے کا
غُل اُٹھا۔ خواصیں اور تُرکنیاں اور اُردا بیگنیاں اور محلی، خوجے سر میں
خاک ڈالتے ہوئے باہر نکل آئے اور بادشاہ سے کہا کہ جس وقت شہزادے
کو نہلا دُھلا کر دائی کی گود میں دیا، ایک اَبر کا ٹکڑا آیا اور دائی کو گھیر
لیا؛ بعد ایک دَم کے دیکھیں تو اَنگا بے ہوش پڑی ہے اور شہزادہ
غائب ہو گیا۔ یہ کیا قیامت ٹوٹی! بادشاہ یہ تعجّبات سُن کر حیران
ہو رہا اور تمام مُلک میں واویلا پڑ گئی۔ دو دن تلک کسو کے گھر ہانڈی
نہ چڑھی۔ شہزادے کا غم کھاتے اور اپنا لَہو پیتے تھے۔ غرض زندگانی سے
لاچار تھے، جو اِس طرح جیتے تھے۔

جب تیسرا دن ہُوا، وُہی بادل پھر آیا اور ایک پنگھوڑا* جڑاؤ، موتیوں
کی توڑ پڑی ہوئی لایا۔ اُسے محل میں رکھ کر آپ ہوا ہُوا۔ لوگوں نے
شہزادے کو اُس میں انگوٹھا چُوستے ہوئے پایا۔ بادشاہ بیگم نے جلدی، بلائیں
لے کر، ہاتھوں میں اُٹھا کر چھاتی* سے لگا لیا۔ دیکھا تو کُرتا آبِ رواں کا،

موتیوں کا دردامن (۱) لٹکا ہوا گلے میں ہے، اور اس پر شلّو کا تماجی کا پہنایا ہے، اور ہاتھ پانو (۲) میں کھڑوے مرصّع کے اور گلے میں ہیکل نورتن کی پڑی ہے اور جھنجھنا، چُسنی، چٹے بٹے جڑاؤ دھرے ہیں۔ سب مارے خوشی کے واری پھیری ہونے لگیں اور دعائیں دینے لگیں کہ تیری ما کا پیٹ ٹھنڈا رہے اور تو بوڑھا آڑھا ہو۔

بادشاہ نے ایک بڑا محل نیا تعمیر کروا کر اور فرش بچھوا، اس میں درویشوں کو رکھا۔ جب سلطنت کے کام سے فراغت ہوتی، تب آ بیٹھتے اور سب طرح سے خدمت اور خبرگیری کرتے۔ لیکن ہر چاند کی نوچندی جمعرات کو وہی پارۂ ابر آتا اور شہزادے کو لے جاتا۔ بعد دو دن کے، تحفہ کھلونے اور سوغاتیں ہر ایک ملک کی اور ہر ایک قسم کی شہزادے کے ساتھ لے آتا، جن کے دیکھنے سے عقل انسان کی حیران ہو جاتی۔ اسی قاعدے سے بادشاہ زادے نے خیریت سے ساتویں (۱۰) برس میں پانو دیا۔ عین سال گرہ کے روز بادشاہ آزاد بخت نے فقیروں سے کہا کہ سائیں اللہ! کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ شہزادے کو کون لے جاتا ہے اور پھر دے جاتا ہے! بڑا تعجب ہے! دیکھیے انجام اس کا کیا ہوتا ہے! درویشوں نے کہا: ایک کام کرو، ایک شقّہ شوقیہ (۱۲) اس مضمون کا لکھ کر شہزادے کے گہوارے میں رکھ دو، کہ تمھاری مہربانی اور محبت دیکھ کر اپنا بھی دل مشتاق ملاقات کا ہوا ہے؛ اگر دوستی کی راہ سے اپنے احوال کی اطلاع دیجیے، تو خاطر جمع (۱۳) ہو اور حیرانی بالکل (۱۵) دفع ہو۔ بادشاہ نے موافق صلاح درویشوں کے، افشانی کاغذ پر ایک رقعہ (۱۶) اسی عبارت کا

ترقیم کیا اور جہد زرّیں میں رکھ دیا۔

شہ زادہ بہ موجب قاعدۂ قدیم کے غائب ہوا۔ جب شام ہوئی، آزاد بخت درویشوں کے بستروں پہ آکر بیٹھے اور کلمہ کلام ہونے لگا، ایک کاغذ لپٹا ہوا بادشاہ کے پاس آ پڑا۔ کھول کر پڑھا تو جواب اسی شقّے کا تھا۔ یہی دو سطریں لکھی تھیں کہ ہمیں بھی اپنا مشتاق جانیے۔ سواری کے لیے تخت جاتا ہے؛ اِس وقت اگر تشریف لائیے تو بہتر ہے، باہم ملاقات ہو۔ سب اسباب عیش و طرب کا مہیّا ہے، صاحب ہی کی جگہ خالی ہے۔

بادشاہ آزاد بخت درویشوں کو ہمراہ لے کر تخت پر بیٹھے۔ وہ تخت، حضرت سلیمان کے تخت کی مانند ہوا پر چلا۔ رفتہ رفتہ ایسے مکان پر جا اُترے کہ عمارتِ عالی شان اور تیاری کا سامان نظر آتا ہے، لیکن یہ معلوم نہیں ہوتا کہ یہاں کوئی ہے یا نہیں۔ اتنے میں کسو نے ایک ایک سلائی سلیمانی سُرمے کی اُن پانچوں کی آنکھوں میں پھیر دی۔ دو دو بوندیں آنسو کی ٹپک پڑیں۔ پریوں کا اکھاڑا دیکھا کہ استقبال کی خاطر، گُلاب پاشیں لیے ہوئے اور رنگ بہ رنگ کے جوڑے پہنے ہوئے کھڑا ہے۔ آزاد بخت آگے چلے، تو دو رُویہ ہزاروں پری زاد مؤدّب کھڑے ہیں۔ اور صدر میں ایک تخت زمرّد کا دھرا ہے، اُس پر ملک شہبال، شاہ رخ کا بیٹا، تکیے لگائے بڑے تزک سے بیٹھا ہے۔ اور ایک پری زاد لڑکی رو بہ رو بیٹھی شہ زادۂ بختیار کے ساتھ کھیل رہی ہے۔ اور دونوں بغل میں کرسیاں اور صندلیاں قرینے سے بچھی ہیں، اُن پر عمدہ پری زاد بیٹھے ہیں۔ ملک شہبال، بادشاہ کو دیکھتے ہی،

سَرو قد اُٹھا اور تخت سے اُتر کر بغل گیر ہوا اور ہاتھ میں ہاتھ پکڑے اپنے برابر تخت پر لاکر بٹھایا اور بڑے تپاک اور گرم جوشی سے باہم گفتگو ہونے لگی۔ تمام روز ہنسی خوشی کھانے اور میوے اور خوش بوؤں کی ضیافت رہی اور راگ رنگ سُنا کیے۔

دوسرے دن جب پھر دونوں بادشاہ جمع ہوئے، شہبال نے بادشاہ سے درویشوں کے ساتھ لانے کی کیفیت پوچھی۔ بادشاہ نے چاروں بے نواؤں کا ماجرا، جو سُنا تھا، مفصّل بیان کیا اور سفارش کی اور مدد چاہی، کہ انھوں نے اتنی محنت اور مصیبت کھینچی ہے، اب صاحب کی توجّہ سے اگر اپنے اپنے مقصد کو پہنچیں تو ثواب عظیم ہے اور یہ مخلص بھی تمام عمر شکر گزار رہے گا۔ آپ کی نظرِ توجّہ سے ان سب کا بیڑا پار ہوتا ہے۔ مَلِکِ شہبال نے سُن کر کہا: بسرو چشم، مَیں تمھارے فرمانے سے قاصر نہیں۔ یہ کہہ کر نگاہِ گرم سے دیوؤں اور پریوں کی طرف دیکھا اور بڑے بڑے جن، جو جہاں سردار تھے، اُن کو نامے لکھے کہ اس فرمان کو دیکھتے ہی اپنے تئیں حضورِ پُرنور میں حاضر کرو۔ اگر کسی کے آنے میں توقّف ہوگا، تو اپنی سزا پاوے گا اور پکڑا ہوا آوے گا۔ اور آدم زاد، خواہ عورت خواہ مرد، جس کے پاس ہو، اُسے اپنے ساتھ لیے آوے۔ اگر کوئی پوشیدہ کر رکھے گا اور ثانی الحال ظاہر ہوگا، تو اُس کا زن و بچہ کولھو میں پیرا جائے گا اور اُس کا نام نشان باقی نہ رہے گا۔

یہ حکم نامہ لے کر دیو چاروں طرف متعیّن ہوئے۔ یہاں دونوں

بادشاہوں میں صحبت گرم ہوئی اور باتیں اختلاط کی ہونے لگیں۔ اُس میں ملکِ شہپال، درویشوں سے مخاطب ہو کر بولا کہ اپنے تئیں بھی بڑی آرزو لڑکے ہونے کی تھی اور دل میں یہ عہد کیا تھا کہ اگر خُدا بیٹا دے یا بیٹی؛ تو اُس کی شادی، بنی آدم کے بادشاہ کے یہاں جو لڑکا پیدا ہوگا، اُس سے کروں گا۔ اِس نیّت کرنے کے بعد[۲] معلوم ہوا کہ بادشاہ بیگم پیٹ سے ہیں۔ بارے دن اور گھڑیاں اور مہینے گنتے گنتے، پورے دن ہوئے اور یہ لڑکی پیدا ہوئی۔ موافق وعدے کے، تلاش کرنے کے واسطے عالمِ جنّیات[۳] کو میں نے حکم کیا[۴]: چار دانگ[۵] دُنیا میں جستجو کرو؛ جس بادشاہ یا شہنشاہ کے یہاں فرزند پیدا ہوا ہو، اُس کو بہ جنس، احتیاط سے[۶] جلد اُٹھا کر لے آؤ۔ وہ نہیں بہ موجب فرمان کے پری زاد چاروں سمت پراگندہ ہوئے۔ بعد دیر کے اِس شہزادے کو میرے پاس لائے۔

میں نے شکر خُدا کا کیا اور[۷] اپنی گود میں لے لیا۔ اپنی بیٹی سے زیادہ اِس کی محبت میرے دل میں پیدا ہوئی۔ جی نہیں چاہتا کہ ایک دم نظروں سے جُدا کروں؛ لیکن اِس خاطر بھیج دیتا ہوں کہ اگر اِس کے ما باپ نہ دیکھیں گے، تو اُن کا کیا احوال ہوگا؛ لہٰذا ہر مہینے میں ایک بار منگا لیتا ہوں۔ کئی دن اپنے نزدیک رکھ کر پھر بھیج دیتا ہوں۔ اِنشاء اللہ تعالیٰ! اب ہمارے تمھارے ملاقات ہوئی، اِس کی کتخدائی کر دیتا ہوں۔ موت حیات سب کو لگی پڑی ہے؛ بھلا جیتے جی اِن کا سہرا دیکھ لیں۔

بادشاہ آزاد بخت نے[۹] باتیں ملکِ شہپال کی سُن کر اور اُس کی

خوبیاں دیکھ کر، نہایت محظوظ ہوئے اور بولے: پہلے ہم کو شہ زادے کے غائب ہوجانے اور پھر آنے سے عجب عجب طرح کے خطرے دل میں آتے تھے، لیکن اب صاحب کی گفتگو سے تسلّی ہوئی۔ یہ بیٹا اب تمھارا ہے؛ جس میں تمھاری خوشی ہو، سو کیجے۔ غرض دونوں بادشاہوں کی صحبت مانند شکر، شیر کے رہتی اور عیش کرتے۔ دس پانچ دن کے عرصے میں بڑے بڑے بادشاہ گلستانِ اِرَم کے اور کوہستان کے اور جزیروں کے، جن کی طلب کی خاطر لوگ تعینات ہوئے تھے، سب آکر حضور میں حاضر ہوئے۔ پہلے مَلکِ صادق سے فرمایا کہ تیرے پاس جو آدم زاد ہے، حاضر کر۔ اُس نے زَنِیٹ غم غصّہ کھاکر، لاچار اُس گُل عذار کو حاضر کیا۔ اور ولایتِ عمّان کے بادشاہ سے شہ زادی جن کی (جس کے واسطے شہ زادہ مُلکِ نیم رُوز کا گاؤ سوار ہوکر سودائی بنا تھا) مانگی۔ اُس نے بھی بہت سی عُذر معذرت کر کے حاضر کی۔ جب بادشاہِ فرنگ کی بیٹی اور بہزاد خاں کو طلب کیا، سب مُنکرِ پاک ہوئے اور حضرت سلیمان کی قسم کھانے لگے۔ آخر دریائے قلزم کے بادشاہ سے جب پوچھنے کی نوبت آئی، تو وہ سر نیچا کر کے چُپ ہو رہا۔ مَلکِ شہبال نے اُس کی خاطر کی اور قسم دی اور اُمّیدوار سرفرازی کا کیا، اور کچھ دھونس دھڑکا بھی دیا؛ تب وہ بھی ہاتھ جوڑ کر عرض کرنے لگا کہ بادشاہ سلامت! حقیقت یہ ہے کہ جب بادشاہ اپنے بیٹے کے استقبال کی خاطر دریا پر آیا اور شہ زادے نے مارے جلدی کے گھوڑا دریا میں ڈالا؛ اتفاقاً میں اُس روز سیر و شکار کی خاطر نکلا تھا، اُس جگہ میرا گزر ہوا۔ سواری

کھڑی کرکے یہ تماشا دیکھ رہا تھا، اِس میں شہزادی کو بھی گھوڑی دریا میں لے گئی۔ میری نگاہ جو اُس پر پڑی، دل بے اِختیار ہوا۔ پری زادوں کو حُکم کیا کہ شہزادی کو بہ مَع[۲] گھوڑی لے آؤ۔ اُس کے پیچھے بہزاد خاں[۳] نے گھوڑا پھینکا۔ جب وُہ بھی غوطے کھانے لگا؛ اُس کی دِلاوری اور مَردانگی[۴] پسند آئی، اُس کو بھی ہاتھوں ہاتھ پکڑ لیا۔ اُن دونوں کو لے کر میں نے سواری پھیری۔ سُو وِئے[۵] دونوں صحیح سلامت میرے پاس مَوجود ہیں۔

یہ اَحوال کہہ کر، دونوں کو رُو بہ رُو بُلایا۔ اور سُلطانِ شام کی شہزادی کی تلاش بہت کی اور سبھوں سے بہ سختی[۶] و مُلایمت[۷] اِستِفسار کیا؛ لیکن کِسو نے حامی نہ بھری اور نہ نام و نشان بتایا۔ تب مَلِکِ شہبال نے فرمایا کہ کوئی بادشاہ یا سردار غیر حاضر بھی ہے، یا سب آ چکے؟ جنُوں[۸] نے عرض کی کہ جہاں پناہ! سب حضور میں آئے ہیں، مگر ایک مُسلسل جادو، جس نے کوہِ قاف کے پردے میں ایک قلعہ جادو کے عِلم سے بنایا ہے؛ وُہ اپنے غرور سے نہیں آیا ہے اور ہم غُلاموں کو طاقت نہیں جو بہ زور اُس کو پکڑ لاویں۔ وُہ بڑا قَلب مکان ہے اور وُہ خود بھی بڑا شَیطان ہے۔

یہ سُن کر، مَلِکِ شہبال کو تَیش آیا اور لڑائی کی فَوج جنُوں[۹] اور عفریتوں اور پری زادوں کی تعیناتی کی اور فرمایا کہ اگر راستی سے اُس شہزادی کو ساتھ لے کر حاضر ہو، فَبِہا؛ وَاِلّا، اُس کو زیر و زبر کر کے، مشکیں باندھ کر لے آؤ اور اُس کے گڑھ اور مُلک کو نیست نابُود[۱۰] کر کے، گدھے کا ہل پھروا دو۔ وُہ نہیں حکم ہوتے ہی، ایسی کتنی فَوج روانہ ہوئی کہ ایک آدھ دِن کے عرصے میں

وَیسے جُوش خَرُوش والے سَرکَش کو حَلقہ بہ گوش کرکے پکڑ لائے اور حُضور میں دَست بَستہ کھڑا کیا۔ مَلِکِ شہبالؔ نے ہرچند سَرزَنش کرکر پوچھا، لیکن اُس مَغرور نے سِوائے ناں کے، ہاں نہ کی۔ نہایت کو، غُصّے ہوکر فرمایا کہ اِس مَردُود کے بَند بَند جُدا کرو اور کھال کھینچ کر بُھس بَھرو۔ اور پری زاد کے لشکر کو تَعَیّن (۲) کیا کہ کوہِ قاف میں جاکر، ڈھونڈھ ڈھانڈھ کر پَیدا کرو۔ وُہ لشکرِ مُتَعَیّنَہ شہ زادی کو بَلی تلاش کرکے لے آیا اور حُضور میں پہنچایا۔ اُن سب اَسیروں نے اور چاروں فقیروں نے مَلِکِ شہبالؔ کا حُکم اور انصاف دیکھ کر دُعائیں دیں اور شاد ہوئے۔ بادشاہ آزادبَخت بھی بہت خوش ہوا۔ تب مَلِکِ شہبالؔ نے فرمایا کہ مَردوں کو دِیوانِ خاص (۳) میں اور عورتوں کو بادشاہی محل (۴) میں داخل کرو۔ اور شہر میں آئینہ بَندی (۵) کا حُکم کرو، اور شادی کی تیّاری جلدی ہو (۶)۔

گویا حُکم کی دیر تھی۔ ایک روز نیک ساعت اور مُبارک مَہُورَت دیکھ کر، شہ زادہ بَختیار کا عَقد اپنی بیٹی روشن اختر سے باندھا، اور خواجہ زادۂ یَمَن کو دِمَشق کی شہ زادی سے بیاہا (۷)، اور مُلکِ فارِس کے شہ زادے کا نِکاح بَصرے کی شہ زادی سے کردیا، اور عَجَم کے بادشاہ زادے کو فِرَنگ کی مَلِکہ سے مَنسُوب کیا، اور نیم رُوز کے بادشاہ کی بیٹی کو بہزاد خاں کو دِیا، اور شہ زادۂ نیم رُوز کو جِنّ (۸) کی شہ زادی حوالے کی، اور چین کے شہ زادے کو اُس پیر مَردِ عَجَمی (۹) کی بیٹی سے (جو مَلِک صادِق کے قبضے میں تھی) کَتخُدا (۱۰) کیا۔ ہر ایک نامُراد بہ دَولت مَلِکِ شہبالؔ کی (۱۱)، اپنے اپنے مقصد اور مُراد کو پہنچا (۱۲)۔ بعد اُس کے چالیس دِن

تلک جشن فرمایا اور عیش و عشرت میں رات دن مشغول رہے۔

آخر ملکِ شہبال نے ہر ایک بادشاہ زادے کو تحفے اور سوغاتیں اور مال اسباب دے دے کر، اپنے (۴) اپنے وطن کو رخصت کیا۔ سب بخوشی و (۳) خاطرِ جمعی روانہ ہوئے اور بہ خیر و عافیت جا پہنچے اور بادشاہت کرنے لگے؛ مگر ایک بہزاد خاں اور خواجہ زادہ یمن کا، اپنی خوشی سے، بادشاہ آزاد بخت کی رفاقت میں رہے۔ آخر یمن کے خواجہ زادے کو خانساماں اور بہزاد خاں کو میر بخشی شہزادۂ صاحبِ اقبال (۵) یعنی بختیار کی فوج کا کیا۔ جب تلک جیتے رہے، عیش کرتے رہے۔

الٰہی! جس طرح یہ (۷) چاروں درویش اور پانچواں بادشاہ آزاد بخت اپنی مراد کو پہنچے، اسی طرح ہر ایک نامراد کا مقصدِ دلی اپنے کرم اور فضل سے بر لا، بطفیلِ پنجتنِ پاک، دوازدہ امام، چہاردہ معصوم علیہم الصلوٰۃ والسلام کے۔ آمین یا الٰہ العالمین۔

(۹) جب یہ کتاب فضلِ الٰہی سے اختتام کو پہنچی، جی میں آیا کہ اس کا نام بھی ایسا رکھوں کہ (۱۰) اسی میں تاریخ نکلے۔ جب حساب کیا، تو بارہ سو پندرہ (۱۱) ہجری کے آخر سال میں کہنا شروع کیا تھا۔ (۱۲) باعثِ عدمِ فرصت کے بارہ سو (۱۳) سترہ سنہ کی ابتدا میں انجام ہوئی۔ اس فکر میں تھا کہ دل نے کہا "باغ و بہار" اچھا نام ہے، کہ یہ ہم نام و ہم تاریخ اس میں نکلتی ہے؛ تب میں نے یہی نام رکھا۔ جو کوئی اس کو پڑھے گا، گویا باغ کی سیر کرے گا۔

بلا، باغ کو آفتِ خزاں کی بھی ہے، اور اس کو نہیں، یہ ہمیشہ سرسبز رہے گا۔

مُرتّب ہوا جب یہ باغ و بہار ❊ تھے سنہ بارہ سو سترہ در شمار (۲)

کرو سیر اب اس کی تم رات دن ❊ کہ ہے نام و تاریخ "باغ و بہار"

خزاں کا نہیں اس میں آسیب کچھ ❊ ہمیشہ تر و تازہ ہے یہ بہار

مرے خونِ دل سے یہ سیراب ہے ❊ اور لختِ جگر کے ہیں سب برگ و بار (۴)

مجھے بھول جاویں گے سب بعدِ مرگ ❊ رہے گا مگر یہ سخن (۵) یادگار

اسے جو پڑھے، یاد مجھ کو کرے ❊ یہی قاریوں سے مرا ہے قرار

خطا گر کہیں ہو، تو رکھیو معاف ❊ کہ پھولوں میں پوشیدہ رہتا ہے خار

ہے انساں مرکّب زِ سہو و خطا ❊ یہ چوکے گا، ہر چند ہو ہوشیار

بس اس کے سوا چاہتا کچھ نہیں ❊ یہی ہے دعا میری آسے کردگار

تری یاد میں مَیں رہوں دم بہ دم ❊ کٹے اس طرح میرا لیل و نہار

نہ پرسش کی سختی ہو مجھ پہ کبھو ❊ نہ شب گور کی اور نہ روزِ شمار

تو کونین میں لطف پر لطف رکھ ❊ خدایا! بہ حقِّ رسولِ کبار

تمام شد (۶)

ضمیمہ ۱

تشریحات، اختلافِ نسخ، انتسابِ اشعار

افراد، مقامات، عمارتیں

ص ۲ ① ک میں کتاب کا آغاز اسی عرضی سے ہوتا ہے، لیکن صفحات کے نمبر شمار اگلے صفحے سے شروع ہوتے ہیں؛ یہ عرضی ایک صفحے میں آئی ہے اور اس صفحے پر کوئی اور عبارت نہیں۔ ف میں یہ عرضی آخر کتاب میں "خاتمۂ کتاب" کے فوراً بعد ہے۔ م اور ن میں یہ عرضی موجود نہیں۔ ع میں عرضی شروعِ کتاب میں ہے اور اس کا عنوان یہ ہے: "عرضی میر امّن دلّی والے کی جو مدرسے کے مختار کار صاحبوں کے حضور میں دی گئی"؛ آخری سطر "عرضی میر امّن دلّی والے کی"، اس میں موجود نہیں (یہ عبارت عنوان میں آگئی ہے)۔ ف میں یہ عرضی ک کے مطابق ہے؛ بس فرق یہ ہے کہ ک میں یہ شروعِ کتاب میں ہے اور ف میں آخرِ کتاب میں۔ ② "مدرسے" سے مراد فورٹ ولیم کالج ہے۔ اس وضاحت کی ضرورت یوں محسوس کی گئی کہ عتیق صدّیقی نے اپنی کتاب گل کرسٹ اور اُس کا عہد میں یہ لکھا ہے کہ "گل کرسٹ نے اورینٹل سیمنری کے نام سے ایک مدرسہ قائم کیا جو خالصتاً سرکاری ادارہ تھا" (ص ۱۰۸)۔ یہ مدرسہ "۱۷۹۹ء کے آغاز میں شروع ہوا تھا اور ۱۸۰۰ء کے وسط میں ختم ہوگیا۔ پھر اِسی مدرسے کی بنیادوں پر ویلزلی نے وہ عظیم الشّان عمارت تعمیر کی جو ہماری ادبی تاریخ میں فورٹ ولیم کالج کے نام سے مشہور ہوئی" (ایضاً ص ۱۳۳)۔ میر امّن نے گنجِ خوبی میں بھی فورٹ ولیم کالج کے لیے "مدرسہ" کا لفظ استعمال کیا ہے۔ میر شیر علی افسوس نے باغِ اُردو کے مقدمے میں فورٹ ولیم کالج کو "مدرسۂ ہندی" لکھا ہے (باغِ اُردو، شائع کردہ مجلسِ ترقیِ ادب لاہور، ص ۲۲)۔ ک اور ف میں "مدرسہ" پر اعراب موجود نہیں؛ البتہ ف کی فرہنگ میں اسے بہ فتحِ اوّل و سکونِ دوم لکھا گیا ہے (اصلاً بھی اِسی طرح ہے)؛ اُسی کے مطابق اعراب لگائے گئے ہیں۔ ③ ک، ف، ع: سب میں یہ مرکّب اضافت کے زیر کے بغیر ہی ہے۔ آصفیہ میں بھی اس مرکّب کو اضافت کے بغیر لکھا گیا ہے، جب کہ اس قبیل کے دیگر مرکّبات "مختارِ عام"، "مختارِ کل" اور "مختارِ مطلق" کو مع اضافت لکھا گیا ہے۔ فیلن اور پلیٹس کے لغات کا بھی یہی احوال ہے، یعنی اِن دونوں لغات میں بھی "مختارِ عام" اور "مختارِ کل" کو تو مع اضافت لکھا گیا ہے اور "مختار کار" کو بغیر اضافت لکھا گیا ہے۔ سب لغات کے اِن اندراجات سے

بہ ظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ خاص مرکب (مختار کار) اضافت کے بغیر ہی مستعمل رہا ہے۔ ک کی مطابقت اختیار کی گئی ہے۔ (۴) عتیق صدّیقی مرحوم نے اِس اشتہار کے سلسلے میں اپنی کتاب گل کرسٹ اور اُس کا عہد میں لکھا ہے: "اِس کا سلسلہ یہ تھا کہ کالج کونسل نے ۲ر نومبر ۱۸۰۲ء کو ایک تجویز منظور کی تھی، جس میں یہ کہا گیا تھا کہ: دیسی زبانوں میں ادبی کتابوں کی تصنیف و تالیف کی ہمّت افزائی کے خیال سے متبحر دیسی لوگوں کو انعامات دیے جائیں گے۔" (طبع دوم، ص ۱۳۱)۔ شہ ش: کذا۔ (۶) ک اور ف میں اِسی طرح (یعنی آخر میں الف) ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے ضمیمۂ تلفّظ و املا میں لفظ "معلّا" کی بحث۔ (۷) یہ لفظ اِس عرضی میں دو جگہ آیا ہے اور دونوں جگہ ک میں ز سے کے اوپر پیش لگا ہوا ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے ضمیمۂ تلفّظ و املا میں "زبان"۔ (۸) یہ شعر "ہجوِ سلطان محمود" کے اشعار میں شامل ہے، جس کے متعلق شیرانی مرحوم دلائل کے ساتھ یہ لکھ چکے ہیں کہ فردوسی نے یہ ہجو نہیں کہی تھی، بعد کو شاہ نامے ہی سے کچھ اشعار لے کر کچھ تبدیلی کے ساتھ اور کچھ اشعار کا اضافہ کر کے یہ طویل ہجو تیار کر لی گئی۔ اب سنجیدہ ایرانی اہلِ علم و تحقیق کی بھی یہی رائے ہے۔ شیرانی مرحوم نے اِس ہجو کے مختلف اشعار سے متعلق تفصیل سے گفتگو کی ہے کہ اُن کی حیثیت کیا ہے، اِس شعر کے متعلق اُنھوں نے لکھا ہے: "یہ شعر اگرچہ مطبوعہ شاہ ناموں میں ہجو کے سوا کہیں نہیں ملتا، لیکن قلمی شاہ نامے نوشتۂ ۷۵۲ھ کے خاتمے میں یوں آیا ہے: بسے رنج بردم درین سال سی ؛ عجم کرم کردم بدین پارسی" (مقالاتِ شیرانی، جلد چہارم، ص ۱۸۹)۔ عام مطبوعہ نسخوں میں دوسرا مصرع یوں ملتا ہے: عجم زندہ کردم بدین پارسی۔ (۹) صرف یہ صراحت کرنا ہے کہ ک، ف، ع میں اِس لفظ کا یہی املا ہے: یعنی آخر میں الف ہے۔ (۱۰) یہ مرکب ک میں جہاں بھی آیا ہے، ہر جگہ نون پر نقطہ موجود ہے، اِسی کی مطابقت اختیار کی گئی ہے۔ یہ واضح کر دیا جائے کہ اِس قبیل کے دوسرے مرکبات اِس کتاب میں کہیں تو مع نونِ غنّہ ملتے ہیں اور کہیں نون پر نقطہ ہے؛ اِس سلسلے میں ہر جگہ ک کی مطابقت کو ترجیح دی گئی ہے۔ ایسے مختلف مرکبات کو دیکھنے سے اندازہ یہ ہوتا ہے کہ جو مرکب عام لوگوں کی زبان پر مع نونِ غنّہ آتے ہیں (یا اُس زمانے میں آتے ہوں گے، یا پھر یہ کہ میر امّن اُن کو اِسی طرح مستعمل سمجھتے ہوں گے) اُن میں آخری نون پر نقطہ نہیں ملتا، دوسرے مرکبات پر نقطہ ملتا ہے۔ اِس لفظ کے اعراب کے سلسلے میں دیکھیے ضمیمۂ تلفّظ و املا میں "قدر دان"۔ (۱۱) صرف یہ صراحت کرنا ہے کہ ک، ف، ع میں اِس لفظ کا یہی املا ہے، یعنی آخر میں الف ہے۔

ص ۲۳ (۱) طلبہ کے استفادے کے لیے یہ وضاحت کی جاتی ہے کہ مورت، صورت جیسے لفظوں کی جب "یں" کے اضافے سے جمع بنائی جاتی ہے، تب بھی رسے کا زبر برقرار رہتا ہے۔ ایسے بعض لفظ

زبانوں پر آتے اس طرح ہیں جیسے "رے" ساکن ہو، مگر یہ محض لہجے کی کارفرمائی ہوتی ہے۔ یہاں بھی دیکھیے کہ "صوَرتیں" میں "رے" کا زبر تلفظ میں جس وضاحت کے ساتھ اپنے آپ کو نمایاں کر لیتا ہے، "موَرتیں" میں "رے" کا زبر اتنی وضاحت کے ساتھ نمایاں نہیں ہو پاتا (اور "مورتی" اور "مورتیاں" اور "مورتیوں" میں تو وہ بالکل نمایاں نہیں ہوتا، بل کہ "رے" ساکن رہتی ہے) مگر "صوَرتیں" کی رعایت سے اسے بھی "موَرتیں" ہی پڑھا جائے گا۔ اسی بنا پر دونوں لفظوں میں "رے" پر زبر لگایا گیا ہے۔ ② م، ن، ک، ع، سب میں "دوسرے" ہے۔ یہ وضاحت یوں کی گئی کہ شاید کسی طالبِ علم کے ذہن میں یہ احتمال پیدا ہو کہ "شکلیں" کی رعایت سے "دوسری" ہوگا۔ "دوسرے" کا مطلب یہ ہے کہ یہاں لفظ "شخص" (یا اس کا مرادف کوئی دوسرا لفظ) مقدر ہے (یعنی ایک کی سج دھج سے دوسرے شخص (یا آدمی) کا ڈیل ڈول ملتا نہیں)۔ اُردو میں مقدرات کا یہ انداز عام ہے۔ ۳ھ م، ن، ع: لیجیے۔ ۴ھ م، ن: جو بات عقل میں نہ آوے، چکا ہو رہے۔ م میں "چکا ہو رہے" کے بعد رومن رسمِ خط میں GHUZUL لکھا ہوا ہے۔ ن میں اس کے بجائے "بیت" لکھا ہوا ہے۔

⑤ دیکھیے اس ضمیمے کے آخر میں ص ۳۹۲ پر۔

۶ھ م، ک، ف، ع: ہر ایک۔ ("ایک" کے مخفف "اک" کو بھی "ایک" لکھنا قدیم انداز ہے۔ اب چوں کہ ایسے اشعار کو، جن میں "اک" کی جگہ "ایک" لکھا ہوا ہو، ساقط الوزن سمجھا جاتا ہے، اس لیے یہاں "اک" لکھا گیا ہے)۔ ⑦ "واحد" "شخص" اور "ہر واحد" "ہر شخص" کے معنی میں اس زمانے میں بالعموم مستعمل تھا۔ میر امن کی دوسری کتاب گنجِ خوبی میں بھی ایک جگہ آیا ہے: "ادب ایسی نعمت ہے کہ ہر واحد سے خوش نما ہے" (مخطوطہ گنجِ خوبی، ص ۴۴)۔ خواجہ میر درد کا شعر ہے: تقید گاہِ امکاں میں ہے وہ کچھ بخششِ مطلق ؛ کہ ہر واحد کو لاکھوں دام یہاں تنخواہ ہوتے ہیں۔ "بلکہ ہر واحد کو بھی خواص و اوصاف ایک سے نہ دیے۔" (میر شیر علی افسوس، آرایشِ محفل، مجلسِ ترقیِ ادب لاہور، ص ۱۱)۔ "ہر اک" چاند اور سورج کے لیے آیا ہے (جن کے لیے "پھرتے ہیں" آیا ہے) اسی لیے اس کے بعد کا ما لگایا گیا ہے۔ ص ۴۴ ۸ھ م، ن: جس کا ثانی اور مقابل آج تک پیدا نہیں۔ ۹ھ م، ن: ایسے واحد کو۔ ۱۰ھ م، ن: اس زمانے میں بھی بعضے مرد ہیں جوہر شناس ؛ ہر طرح سے مجھ پر ..... ④ میرا خیال ہے کہ یہ اشعار خود میر امن کے ہیں۔ ۱۲ھ م میں اس کے بعد رومن رسمِ خط میں UBYAT لکھا ہوا ہے۔ ن میں اس کے بجائے "بیت" ہے۔ ۱۳ھ م، ن، ک، ف، ع: ایک۔ ۱۴ھ م: اس لیے پرچھائیں اس کی پاس سے نت دور رہے۔ ن: اس لیے پرچھائیں اُس کے پاس سے نت دور ہے۔

(۸) میرا خیال ہے کہ یہ اشعار خود میر امّن کے ہیں (۹) حضراتِ شیعہ (رسول اللہؐ کے بعد) حسبِ ذیل بارہ اماموں کو مانتے ہیں: حضرت علیؓ، امام حسنؓ، امام حسینؓ، امام زین العابدینؒ، امام محمد باقرؒ، امام جعفر صادقؒ، امام موسیٰ کاظمؒ، امام علی رضاؒ، امام محمد تقیؒ، امام علی نقیؒ، امام حسن عسکریؒ، امام محمد مہدیؒ۔ "امام مہدی" کے بارے میں حضراتِ شیعہ کا یہ عقیدہ ہے کہ وہ زندہ ہیں اور مناسب وقت پر ظاہر ہوں گے۔ نلہ م، ن: حمد کو اور نعت کو میں یہیں تلک (ن: یہاں تلک) کر کر تمام، کام جو منظور ہے کرتا ہوں اس کو انصرام۔ م میں اِن اشعار سے پہلے رومن رسم خط میں "UBYAT" لکھا ہوا ہے۔ ن میں اِس جگہ "بیت" ہے۔ للہ ع: احمدؐ۔ ۱۲ ع: نبیؐ۔ ۱۳ ف: خاصّ و عامّ۔ (۱۴) بظاہر یہ اشعار خود میر امّن کے ہیں۔ ۱۵ م اور ن میں یہ مکمل عبارت کچھ تبدیلی اور تقدّم و تاخّر کے ساتھ یوں ہے: "اشرف الاشراف دولتی مارکوئیس گورنر جنرل لاد (ن: لارڈ) ہارنگٹن صاحب کے وقت میں کہ جن کی تعریف میں عقل حیران اور فہم سرگردان ہے۔ جتنے وصف سرداروں کو چاہئیں (ن: چاہیے) اُن کی ذات میں خدا نے جمع کیے ہیں۔ غرض قسمت کی خوبی اِس ملک کی تھی جو ایسا حاکم تشریف لایا، جس کے قدم کے فیض سے ایک عالم نے آرام پایا۔ مجال نہیں کہ کوئی کسو پر زبردستی کرے۔ شیر اور بکری ایک گھاٹ میں پانی پیتے ہیں۔ سارے غریب و غربا دعا دیتے ہیں اور جیتے ہیں کہ ایک ہزار دو سو پندرہ برس ہجری اور اٹھارہ سے ایک سال عیسوی مطابق ایک ہزار دو سو سات سن فصلی کے ہیں جرچا علم کا پھیلا۔ صاحبانِ ذی شان کو...." (۱۶) شاید یہ خیال کیا جائے کہ یہاں "سالِ عیسوی" ہونا چاہیے اور یہ فرض کر لیا جائے کہ اضافت کا زیر چھوٹ گیا ہے؛ اِس لیے یہ وضاحت کی جاتی ہے کہ اِس عبارت میں لفظِ "سال" اضافت کے بغیر ہی مرجّح ہے، اِس بنا پر کہ اِس سے پہلے "برس ہجری" آیا ہے اور اِس میں لفظِ "برس" لازماً اضافت کے بغیر آیا ہے۔ اِس لیے حُسنِ بیان کا یہی تقاضا ہے کہ لفظِ "سال" کو بھی اضافت کے بغیر پڑھا جائے اور اِسی بنا پر "سنہ فصلی" بھی اضافت کے بغیر مرجّح ٹھہرے گا۔ یہ بھی وضاحت کر دی جائے کہ ک میں بھی "سال" میں اضافت کا زیر موجود نہیں۔ (۱۷) م: مارکوسن۔ ک: مارکوس۔ ف: مارکوئیس۔ ع: مارکوئس۔ اِس لفظ (MARQUIS) کے دوسرے جُز کو "گوس" اور "کوئیس" دونوں طرح لکھا جا سکتا ہے، میں نے آخر الذکر کو ترجیح دی ہے (جس طرح ع میں ہے)، اور اِس ترجیح کی وجہ یہ قیاس ہے کہ ایسا ہی ایک لفظ "کوئی" ہے، جو بروزنِ فع بھی نظم کیا جاتا تھا۔ خود میر امّن نے اِس طرح لکھا ہے (ص ۳): جب پیمبر نے کہا ہو میں نے پہچانا نہیں ٭ پھر جو کوئی دعویٰ کرے اِس کا، بڑا نادان ہے۔ دوسرے مصرعے میں "کوئی" بروزنِ فع نظم ہوا ہے اور اِس تلفظ کو ظاہر

کرنے کے لیے اسے "کوئی" لکھا گیا ہے، یعنی واو پر علامتِ مخلوط بنائی گئی ہے۔ بالکل یہی صورت اِس "کوئس" کی ہے، یوں اسے بھی "کوئس" لکھا گیا ہے۔ "ولزلی" (WELLESLEY) کو بہ سکونِ زا بھی سُنا گیا ہے اور اِس طرح بھی سُنا گیا ہے کہ زے کسرۂ خفیف کے ساتھ تلفظ میں آتی ہے۔ میں نے اوّل الذکر کو ترجیح دی ہے اور اِس سلسلے میں جناب شمس الرّحمان فاروقی کی تحریر پر اعتماد کیا ہے۔ اُنھوں نے میرے خط کے جواب میں لکھا تھا کہ "ولزلی میں WELL کا تلفظ وہی ہے جو انگریزی لفظ WELL کا ہے۔ اِس کے بعد E ملفوظ نہیں ہے، لہٰذا WELLS کا تلفظ وہی ہے جو انگریزی لفظ WELLS کا ہے۔ LEY کا تلفظ "لی" ہے"۔ اِسی کی مطابقت اختیار کی گئی ہے اور اِسے بہ سکونِ زا لکھا گیا ہے۔ "وِل" کے واو کے نیچے جو زیر ہے، وہ کسرۂ خفیفِ مجہول کے طور پر تلفظ میں آئے گا۔ مارکوئس ولزلی لارڈ مارننگٹن: ولادت: ۱۷۶۰ء۔ متوفی: ۱۸۴۲ء۔ ۱۷۹۸ء سے ۱۸۰۵ء تک ہندستان کا گورنر جنرل رہا۔ ۱۵ اگست ۱۸۰۵ء کو ہندستان سے انگلستان کے لیے روانہ ہوا تھا۔ ولزلی ہی فورٹ ولیم کالج کا "بانی اور کرتا دھرتا تھا" [عتیق صدیقی، گل کرسٹ اور اُس کا عہد، طبع دوم، ص ۲۴] ولزلی کے حالات کے لیے دیکھیے: ڈکشنری آف نیشنل بایوگرافی، جلد ××۔ میں نے اوپر جو سنین لکھے ہیں، وہ اِسی کتاب سے ماخوذ ہیں۔

(۱۸) یہاں دو لفظ تصریح طلب ہیں۔ پہلا لفظ ہے "لارڈ"۔ م: لاد۔ ن: لاڈ۔ ک: لارد۔ ف، ع: لارڈ۔ دیباچۂ گنجِ خوبی میں یہ لفظ دو جگہ آیا ہے اور مخطوطۂ گنجِ خوبی میں دونوں جگہ "لاڑ" (مع رائے ثقیلہ) ہے۔ اِس لفظ میں املا کا یہ اختلاف پریشان کُن ہے۔ میں نے مناسب یہی خیال کیا کہ اِس لفظ کو ف کے مطابق "لارڈ" لکھا جائے۔ اِس کی اصل وجہ یہ ہے کہ دو پُرانے نسخوں یعنی ن اور ف میں ڈال موجود ہے اور ک میں اِس لفظ میں رے بھی موجود ہے، یوں اِسے "لارڈ" لکھا جاسکتا ہے [ضمنی طور پر یہ صراحت بھی بے جا نہ ہوگی کہ انگریزی لفظ "لارڈ" (تسہیل کے عمل سے دوچار ہوکر) "لاٹ" بن گیا تھا اور اِس نے استعمالِ عام میں اپنی جگہ بنائی تھی۔ آج بھی بہت سے لوگ "لاٹ صاحب" کہتے ہیں۔ پُرانی تحریروں میں بھی یہ لفظ مل جائے گا۔ مجھے یہ ذرا مستبعد معلوم ہوتا ہے کہ صحیح لفظ "لارڈ"، میر امّن کی زبان پر چڑھ گیا ہو۔ اِس کا امکان قوی تر ہے کہ اِس کی مخفف صورت "لاڈ" سے اُن کی زبان آشنا ہوسکی ہو۔ متعدد لفظوں میں ڈ اور ڑ کا بدل عام بات ہے (مثلاً علی گڑھ اور علی گڈھ۔ پُرانی تحریروں میں اکثر "علی گڈھ" ملتا ہے، یا مثلاً لاڈ اور لاڑ)۔ مخطوطۂ گنجِ خوبی میں جو "لاڑ" ہے، وہ اِسی کی ترجمانی کرتا ہے۔ ک میں جو "لارد" ہے، اُس کے متعلق میرا خیال یہ ہے کہ یہ صورت چھپتے وقت تصحیح کے عمل سے

دوچار ہونے کے بعد وجود میں آئی ہے اور تصحیح کس نے کی؛ اِس کے متعلق میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ اِس کو یوں بھی دیکھیے کہ مطبوعہ روایتِ اوّل (م) میں "لاد" ہے اور روایتِ ثانی (ک) میں "لارد" ہے اور یہ اختلاف بہ ظاہر تصحیح کے عمل کو ظاہر کرتا ہے۔ ف میں جو "لارڈ" ہے، یہ بہ ظاہر نسخۂ ف کے مرتّب (ڈنکن فاربس) کی تصحیح ہے۔ دوسرا لفظ "مارننگٹن" (MARNINGTAN) ہے۔ م: مارنگتن۔ ن: مارنگٹن۔ ک: مارننگتن۔ ف، ع: مارننگٹن۔ یہ نام دیباچۂ گنجِ خوبی میں بھی آیا ہے اور مخطوطۂ گنجِ خوبی میں "مارنگتن" (مارنگٹن) ہے، یعنی یہاں اِس لفظ میں "ٹ" ہے۔ چوں کہ ک میں "مارننگتن" ہے، اِس بنا پر مجھے یہی بہتر معلوم ہوا کہ (ف کے مطابق) اِس کو "مارننگٹن" لکھا جائے (اِس بنا پر کہ مخطوطے میں "ٹ" موجود رہی ہے)۔ (۱۹) صرف یہ صراحت کرنا ہے کہ ک میں "حیران" اور "سرگردان" دونوں لفظوں میں نون پر نقطہ موجود ہے۔ (۲۰) ن، ف، ع: چاہیے۔ فعل کی یہ صورت گنجِ خوبی میں بھی ملتی ہے: "از بس کہ جتنی خوبیاں انسان کو چاہئیں" (مخطوطۂ گنجِ خوبی، دیباچہ، ص ۵)۔

ص ۵ ۔ لہ م، ن: باہم گفت وشنود کریں اور ملکی کام کو انجام دیں۔ چناں چہ یہ کتاب اِسی سال بہ موجب فرمایش کے تالیف ہوئی۔ جو صاحب دانا اور ..... (۴) ک اور ف میں "تالیف ہوئی" ہے؛ البتہ ع میں "تالیف ہوئیں" ہے۔ "تالیف ہوئی" بہ ظاہر یہاں غلطیِ طباعت ہے۔ م اور ن میں جو "تالیف ہوئی" ہے، تو اِس لیے ہے کہ وہاں "یہ کتاب" آیا ہے۔ غالباً اِسی بنا پر یہ غلطی رونما ہوئی ہوگی۔ اِس کی تائید یوں بھی ہوتی ہے کہ آگے چل کر ایک جملہ آتا ہے: "جنھوں نے اپنے گیان اور اٹکل سے..... قاعدوں کی کتابیں تصنیف کیں" (ص ۸)۔ وہاں ک اور ف، دونوں میں "تصنیف کیں" ہے۔ اِسی وجہ سے اِس مقام پر پہلے کو ع کے مطابق لکھا گیا ہے۔ سلہ ع: ہندستان۔ سلہ م، ن: اور زبان بولنے والے ہندستان کے ہیں۔ (۵) "محمد بن احمد بن علی البخاری۔ سلطان المشائخ، نظام الدین اولیا اور محبوبِ الٰہی کے لقب سے مشہور ہیں۔ دلّی والے عموماً "سلطان جی" ہی کے مختصر پیارے لقب سے پکارتے ہیں" [واقعاتِ دار الحکومت دہلی، جلد دوم، ص ۲۷۹] ولادت: ۲۷ صفر ۶۳۱ھ۔ [ایضاً ص ۵۰۷] وفات: ۱۸ ربیع الآخر ۷۲۵ھ [ایضاً ص ۲۸۷، نیز سیر الاولیا؛] "زری زر بخش" آپ کا خطاب، دلّی والوں کی زبان سے سنا ضرور گیا ہے؛ خواجہ حسن ثانی نظامی (فرزند خواجہ حسن نظامی مرحوم) نے بھی اِس کی تصدیق کی؛ مگر کسی کتاب میں یہ خطاب میری نظر سے نہیں گزرا اور خواجہ حسن ثانی نے بھی یہی بات کہی۔ (۶) درگاہ کی عمارت اور اُس سے متعلق دیگر تفصیلات کے لیے دیکھیے

آثار الصنادید اور واقعاتِ دارالحکومت دہلی جلدِ دوم۔ موخر الذکر میں تفصیلات زیادہ ہیں۔ (۷) "لال دروازہ" کے نام سے دہلی کے دو دروازے مشہور تھے اور یہ بات دریافت طلب ہے کہ میر امّن کی مراد ان میں سے کس دروازے سے ہے۔ پہلے دونوں دروازوں کی مختصراً نشان دہی کی جاتی ہے۔ ان دونوں میں نسبتاً زیادہ مشہور وہ دروازہ تھا، جس کا پرانا نام "کابلی دروازہ" تھا، بعد کو اُسے "لال دروازہ" کہنے لگے اور آج کل وہ "خونی دروازہ" کے نام سے مشہور ہے۔ سرسید نے آثار الصنادید میں "کابلی دروازہ دہلی شیر شاہ" کے عنوان کے تحت لکھا ہے: "اگرچہ اس شہر کا اب کچھ نشان نہیں رہا، مگر شہر شاہ جہان آباد کے دلّی دروازے کے باہر، جیل خانۂ سرکاری کے متصل، ایک بہت خوب صورت دروازہ قائم ہے۔ یہ دروازہ شیر شاہ کی دلّی کا ہے، اور اس دروازے سے کابل کو راہ جاتی تھی، اس واسطے "کابلی دروازہ" کہتے ہیں۔ یہ دروازہ چونے اور پتھر سے بہت خوب صورت بنا ہوا ہے اور دروازے پر حجرے اور نشیمن بہت خوب صورتی سے بنائے ہیں، اور رو کار اس کی ساری سنگِ سُرخ کی ہے، اس سبب سے عوام میں "لال دروازہ" کے نام سے مشہور ہے" [طبعِ دوم ص ۲۷]۔ سیر المنازل میں بھی اس کی نشان دہی کی گئی ہے: "مکانِ جیل خانۂ محبوسانِ مجوزۂ صاحب عدالت فوج داری و لال دروازۂ دہلی قدیم، متصلِ آں کوٹلہ فیروز شاہ" [سیر المنازل، مرتبۂ ڈاکٹر شریف قاسمی، ص ۶۵]۔ واقعاتِ دارالحکومت دہلی میں بھی اس کا ذکر ملتا ہے: "شاہ جہان آباد کے دلّی دروازے کے باہر تھوڑی دور پر پرانی دلّی کا "کابلی دروازہ" ہے، جسے "لال دروازہ" بھی کہتے ہیں.... اس دروازے پر دالان اور حجرے اور نشیمن بہت خوب صورت بنے ہوئے ہیں، اب اس میں جیل خانے کے سپاہی رہتے ہیں" (ص ۵۹۴)۔ یہ دروازہ اب بھی موجود ہے۔ جیل خانے کی پرانی عمارت تو رہی نہیں، اُس کی جگہ مولانا آزاد میڈیکل کالج کی نئی عمارت ہے۔ اس سلسلے میں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ عام طور پر اب اس دروازے کو "خونی دروازہ" کہا جاتا ہے اور اس کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ ۱۸۵۷ء میں کرنل ہڈسن نے تین مغل شہزادوں کو اسی مقام پر قتل کیا تھا۔ اس دروازے پر سنگِ مرمر کا ایک تختہ اب حکومت کی طرف سے لگا دیا گیا ہے، جس میں اسے "خونی دروازہ" لکھا گیا ہے اور شہزادوں کے قتل والی ضروری تفصیل بھی درج کر دی گئی ہے۔ دوسرا "لال دروازہ" وہ ہے جو پرانے قلعے کے مغربی دروازے کے سامنے ہے۔ واقعاتِ دارالحکومت دہلی میں شیر شاہ کی دلّی سے متعلق ایک بحث کے سلسلے میں اس کا ذکر بھی آیا ہے: "پرانے قلعے کے مغربی دروازے کے بالکل سامنے ایک اور دروازہ موجود ہے جو "لال دروازہ" کہلاتا ہے،

جو اُسی قسم کا ہے جیسا کہ موجودہ جیل کے سامنے کا دروازہ ہے، مگر یہ اُس سے ذرا بڑا اور بہتر ہے اور اِس دروازے کو بالعموم شیر شاہ کی دلّی کا جنوبی دروازہ قرار دیا جاتا ہے۔ اِس جنوبی دروازے کی دونوں جانب برج اور تھوڑا سا حصّہ فصیل کا بھی باقی ہے" [جلدِ دوم ص ۶۴۴]۔ یہ دروازہ اب بھی موجود ہے اور اچھی خاصی حالت میں ہے ــــ اِس دروازے کا جو محلِّ وقوع ہے، اُس کی بنا پر یہ خیال (بلکہ یقین) ہوتا ہے کہ میر امّن کی مراد اسی دروازے سے ہوگی۔ پُرانے جیل خانے کے پاس جو لال دروازہ ہے (یعنی خونی دروازہ) وہ دہلی دروازے سے تھوڑے ہی فاصلے پر ہے اور اِس طرح شہر سے قریب ہے۔ میر امّن نے لکھا ہے: "لال دروازے کے باہر، مٹیا دروازے سے آگے" اور "باہر" کا لفظ بہ ظاہر اسی پر دلالت کرتا ہے کہ شہر سے زیادہ فاصلے پر واقع یہی دروازہ مراد ہے۔ دو قرینے اور بھی اِس خیال کی تائید کرتے ہیں: ایک تو مٹیا دروازے کا محلِّ وقوع (جس کا ذکر اِس کے بعد آیا ہے) جو اسی لال دروازے سے قریب کی نسبت رکھتا ہے۔ دوسرا قرینہ یہ ہے کہ سیر المنازل (مرتبہ ڈاکٹر شریف قاسمی، شائع کردہ غالب انسٹی ٹیوٹ دہلی) میں اِس کا ذکر اِس طرح آیا ہے: "در آنجا مزارِ فاطمہ سام واقع۔ در آنجا مزارِ نور الدین ملک یار پرّاں متّصلِ لال دروازۂ دہلیِ قدیم واقع" [ص ۷]۔ حضرت فاطمہ سام کی قبر علاقۂ کاکا نگر میں آج بھی موجود ہے اور ملک یار پرّاں کا مزار بھی اُس کے قریب ہی باغِ بیدل میں موجود ہے (موجودہ نیشنل اسٹیڈیم کی پشت پر) اور مصنّف نے اِس مزار کو "لال دروازۂ دہلیِ قدیم" کے پاس بتایا ہے اور اِس طرح اِس لال دروازے کا وجود قطعی طور پر متعیّن ہو جاتا ہے اور اِس طرح بہ ظاہر سارے قرائن اسی پر دلالت کرتے ہیں کہ میر امّن کی مراد اسی "لال دروازۂ دہلیِ قدیم" سے ہے، جسے شیر شاہ کی دہلی کا جنوبی دروازہ بتایا گیا ہے۔ پھر یوں بھی دیکھیے کہ میر امّن نے لکھا ہے: "قلعے سے تین کوس، لال دروازے کے باہر، مٹیا دروازے سے آگے، لال بنگلے کے پاس ہے"۔ اب اِن مقامات کے ترتیبی ذکر اور اُن کے محلِّ وقوع پر نظر ڈالیے تو صاف صاف معلوم ہوگا کہ یہ سب ایک ہی علاقے میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر واقع مقامات ہیں۔ [ہاں، واقعاتِ دارالحکومت دہلی میں ایک اور "لال دروازہ" کا تذکرہ ملتا ہے (ص ۱۹۷) مگر یہ ہماری بحث سے خارج ہے۔ یہ بہت پُرانا نہیں]۔ اصل بحث کے بعد مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ "لال دروازہ" کے ذیل میں کابلی دروازے کا بھی نام آیا ہے اور خونی دروازے کا بھی؛ جس طرح "لال دروازہ" نام کے دو دروازے ہیں، اُسی طرح کابلی دروازے بھی دو ہیں اور خونی دروازہ بھی دو دروازوں کو کہتے ہیں۔ محض اِس خیال سے کہ طلبہ کے ذہن میں کوئی

اُلجھن پیدا نہ ہو، ان دونوں دروازوں کے متعلق بھی ضروری باتیں لکھی جاتی ہیں: "کابلی دروازہ" نام کے دو دروازے تھے۔ ایک تو وہی کابلی دروازہ جس کو شیر شاہی دہلی کا دروازہ بتایا گیا ہے اور جو "لال دروازہ" کے نام سے مشہور ہوا اور بعد کو اُسے "خونی دروازہ" کہنے لگے اور جو اب بھی موجود ہے۔ دوسرا کابلی دروازہ شاہ جہان کی دہلی کی فصیل کا تھا۔ سرسید نے آثار الصنادید میں جہاں چودہ دروازوں کے نام لکھے ہیں، کابلی دروازے کا نام بھی لکھا ہے۔ سیر المنازل میں بھی کئی جگہ اس کا ذکر آیا ہے مثلاً: "متصل آن کٹرہ گاڑی بانان .... وکٹرہ سعادت خان .... و حویلی خان جہان خان و دروازہ کابلی شہر پناہ" (ص ۳۹)۔ "از کابلی دروازہ مرقوم تا باغ شالامار شاہ راہ جاریست" (ص ۴۰) واقعاتِ دار الحکومت دہلی میں کئی جگہ اس دروازے کا تذکرہ ملتا ہے، مثلاً: "مٹھائی کا پل کابلی دروازے کے پاس ہے" (جلد دوم ص ۲۷۴)۔ "کابلی دروازہ اب نہیں رہا۔ اس طرف کا دروازہ اور فصیل دونوں میدان صاف کرنے کو توڑ دیے گئے۔ اب کابلی دروازے کا پتا یہ ہے کہ لاہوری دروازے کے باہر جو نیا بازار بنا ہے، اور ایک چوڑی سڑک برن بسچین روڈ نکل گئی ہے، اس کے خاتمے پر کوئنز روڈ آکر ملتی ہے، یہ دروازہ تھا" (ص ۲۵۱)۔ "کابلی دروازے سے لے کر اجمیری دروازے تک ایک چوڑی اور سیدھی سڑک نکال دی ہے جو فصیلوں کے برابر برابر چلی گئی ہے" (ص ۵۰۲)۔ محمد حسین آزاد نے آبِ حیات میں ذوق کے والد کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے: "دلی میں کابلی دروازے کے پاس رہتے تھے"۔ اسی طرح "خونی دروازہ" بھی دو دروازوں کو کہا جاتا ہے۔ ایک تو وہی پرانا کابلی دروازہ، جس کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ اس نام کا دوسرا دروازہ دریبہ کلاں (علاقہ چاندنی چوک) کے سرے پر تھا۔ سرسید نے آثار الصنادید کے پہلے اڈیشن میں اس کا ذکر کیا ہے: "دریبہ کے سرے پر ایک دروازہ بنا ہوا ہے محراب دار، خوش نما، اس دروازے کا نام خونی دروازہ ہے۔" [آثار الصنادید، شائع کردہ سنٹرل بک ڈپو دہلی، ص ۸۰۷] گویا سرسید نے جب یہ کتاب لکھی ہے تو یہ دروازہ موجود تھا۔ واقعاتِ دار الحکومت دہلی میں اس دروازے کا کسی قدر مفصل تذکرہ ملتا ہے اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس کا نام "خونی دروازہ" کیوں پڑا: "خونی دروازہ: بازار دریبہ کلاں کے سرے پر چاندنی چوک کی طرف یہ دروازہ دورِ آخری مغلیہ کا بنا ہوا ہے۔ اب دروازہ اور محراب تو باقی نہیں، صرف اِدھر اُدھر کے دو پاکھے اور ان پر دو چھوٹی برجیاں رہ گئی ہیں۔ "خونی دروازہ" اس وجہ سے نام پڑا کہ نادر شاہ نے جب ۱۷۳۹ء میں دلی کو لوٹا، تو اسی دروازے کے سامنے باشندگانِ دہلی کا بڑا قتلِ عام ہوا۔ پہلے

اِس دروازے کا سامنے والا حصہ بازار کا "لاہوری بازار" یا "اُردو بازار" کہلاتا تھا، اب سارے کا سارا "چاندنی چوک" ہی کہلانے لگا" (ص ۲۱۱) ⑧ یہ دروازہ لال بنگلے سے پہلے، حضرت فاطمہ سام کے مزار کے آس پاس کہیں پر تھا (حضرت فاطمہ سام کا مزار کاکا نگر میں آج بھی موجود ہے)۔ سیرالمنازل میں ایک "دروازۂ افتادہ" کا ذکر ملتا ہے: "مقبرۂ بادشاہ زادہ ہا معروف بہ لال بنگلہ، از آں پیش دروازۂ افتادہ واقع، از آنجا غیاث پورۂ دہلی است مزارِ حضرت نظام الدین اولیا و امیر خسرو" (ص ۱۶۲) عزیز مکرم ڈاکٹر شریف قاسمی (اُستادِ شعبۂ فارسی دہلی یونی ورسٹی) ایک قدیم کتاب تذکرۂ اولیائے دہلی کو مرتب کر رہے ہیں (یہ کتاب عہدِ اورنگ زیب کی لکھی ہوئی ہے)۔ اُس میں حضرت فاطمہ سام کے مزار کے تحت یہ عبارت ملتی ہے: "قبرے الآن نزدیکِ دروازۂ نخّاسِ دہلی قدیم، کہ آں را متیہ دروازہ می گویند، در خرابہ است" (ص ۲۶۶)۔ اور اِس طرح یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ سیرالمنازل میں جس "دروازۂ افتادہ" کا ذکر کیا گیا ہے وہ یہی "متیہ دروازہ" (مٹیا دروازہ) تھا۔ فرہنگِ آصفیہ (جلدِ اوّل) میں "اولیائے ہند" کے ذیل میں حضرت "فاطمہ صائمہ" کا بھی تذکرہ ہے، اِس سلسلے میں مؤلف نے لکھا ہے: "آپ کا مزار پُرانی دہلی میں مٹیا دروازے کے باہر نخاس کے قریب واقع ہے۔" بہ ظاہر مؤلف نے تذکرۂ اولیائے دہلی کی عبارت کا ترجمہ کر دیا ہے، مگر اِس سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ مٹیا دروازے کا نام اُس وقت تک دہلی والوں کے لیے غیر مستعمل نہیں تھا۔ ⑨ اِس کا حال سیرالمنازل، آثارالصنادید اور واقعاتِ دارالحکومت دہلی، تینوں کتابوں میں ملتا ہے۔ سیرالمنازل میں وہ کتبے بھی نقل کیے گئے ہیں جو اِس عمارت کے اندر قبروں پر یا گنبدوں کے اندر تھے۔ آثار کی عبارت نقل کی جاتی ہے: "لال بنگلہ: پُرانے قلعے کے قریب یہ مقبرہ ہے لال کنور، شاہ عالم کی ماں کا۔ قریب ۱۱۹۳ھ ہجری مطابق ۱۷۷۹ء کے شاہ عالم نے یہ مقبرہ بنایا۔ چھوٹے گنبد میں تو لال کنور کی قبر ہے اور بڑے گنبد میں بیگم جان، شاہ عالم کی بیٹی کی قبر ہے۔ یہ گنبد مع دالانوں کے نرے سنگِ سرخ کے ہیں، خواہ اِس سبب سے اور خواہ لال کنور کے دفن ہونے کے سبب سے "لال بنگلہ" کے نام سے مشہور ہے۔ اب اِس نواح میں بہت سی قبریں خاندانِ تیموریہ (کی) ہو گئی ہیں۔ اِس کے صحن میں ایک مجحّر نواب فتح آبادی بیگم اور ایک مجحّر میرزا بلاقی کا حالت میں بہادر شاہ بادشاہِ ثانی نے بنایا ہے [طبعِ دوم ص ۹۷] واقعات میں محلِ وقوع کی تفصیل یوں دی گئی ہے: "پُرانے قلعے اور حضرت نظام الدین کی درگاہ کے بیچ میں، سیّد عابد کے مقبرے کے پاس، جی آئی پی ریلوے لین کی داہنی طرف، بالکل ریل کی سڑک کے کنارے، آثار کی بارہ دری سے ملا ہوا،

میل ۹۵۲ کے سامنے ایک عمارت لال بنگلے کے نام سے مشہور ہے" (ص ۶۵۹)۔ یہ عمارت اب دہلی کے گولف کلب کے احاطے میں آگئی ہے۔ دونوں بنگلوں کی عمارت مع گنبد اب بھی موجود ہے، مگر جن کتبوں کو سیر المنازل میں نقل کیا گیا ہے، اُن کا کہیں بھی نشان نہیں ملتا اور ایک گنبد کے اندر اب کوئی قبر بھی نہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی وقت قبر کا نشان مٹا دیا گیا۔ لال پتھر کی سلوں کا فرش جو لگا ہوا ہے، وہ بہت پرانا نہیں معلوم ہوتا۔ دوسرے گنبد کے اندر دو زنانہ قبریں موجود ہیں، مگر اُن پر کوئی کتبہ نہیں۔ میں مارچ ۱۹۸۶ء میں خواجہ حسن ثانی نظامی صاحب کی معیت میں اس عمارت کو دیکھنے کے لیے گیا تھا۔ ۱۰ م اور ن میں "تب" موجود نہیں۔ (۱۱) امیر خسرو کے نام اور سالِ ولادت و وفات کی تفصیلات اور اختلافات کے لیے دیکھیے ڈاکٹر وحید مرزا کی کتاب امیر خسرو شائع کردۂ ہندستانی اکیڈمی الہ آباد، سالِ طبع ۱۹۴۹ء، صفحات ۲۶، ۲۷، ۱۸۸۔ نیز ممتاز حسن صاحب کی کتاب امیر خسرو دہلوی، شائع کردہ مکتبۂ جامعہ دہلی ۱۹۸۲ء، صفحات ۱۱۲، ۱۴۱، ۲۲۳۔ ۱۲ م، ن: بیمارداری کی خدمت میں۔ ۱۳ م: ن: تھا۔ ۱۴ م، ن: بخیلوں کے قدرداں غریبوں کے فیض رساں عاجزوں کے ہاتھ پکڑنے والے بیچاروں کی پرورش کرنے والے دانا زمانے کے۔ BYT سرکار سے دے کے آب و دانا ؛ نادان کو بنایا جس نے دانا یعنے جان گلکرسٹ صاحب ...... (۱۵) م: گلکرسٹ۔ ن: گلکرسٹ۔ ک: گلکرسٹ۔ ف: گلکرسٹ۔ ع: گلکرسٹ۔ یہ لفظ اس دیباچے میں تین جگہ آیا ہے: ص ۵، ص ۷، ص ۸؛ اور ان تینوں مقامات پر ک میں "گلکرست" ہے، یعنی آخر میں ت ہے۔ ف میں بھی اسی طرح ہے۔ م اور ن میں بھی جن مقامات پر یہ لفظ آیا ہے، وہاں اسے ت کے ساتھ لکھا گیا ہے۔ ک کے سرورق پر بھی یہ لفظ موجود ہے: "جان گلکرست صاحب دام ثروتہ کی فرمایش سے" اور وہاں بھی آخر میں ت ہے۔ دیباچۂ گنج خوبی میں بھی یہ لفظ دو جگہ آیا ہے اور مخطوطۂ گنج خوبی میں دونوں مقامات پر "گلکرست" ہے، یعنی آخر میں ت ہے۔ گنج خوبی پہلی بار اردو رسم خط میں ۱۸۴۶ء میں کلکتے کے مطبع احمدی میں چھپی تھی؛ اس نسخے میں بھی ان دونوں مقامات پر "گلکرست" ہی چھپا ہے۔ اس نسخے کے سرورق پر بھی یہ لفظ آیا ہے اور وہاں بھی "گلکرست" ہے۔ اس طرح یہ صورتِ حال سامنے آتی ہے کہ باغ و بہار کے نسخۂ ع کو چھوڑ کر (جو اشاعتِ جدید ہے) جس قدر پرانے خطی و مطبوعہ نسخے ہیں ان دونوں کتابوں (یعنی باغ و بہار اور گنج خوبی) کے، اُن سب میں بالتکرار "گلکرست" ملتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اصل لفظ "گلکرسٹ" ہے، مگر کسی پرانے نسخے میں کسی ایک جگہ بھی ٹ کا نہ ہونا اس پر دلالت کرتا ہے کہ اس خاص لفظ کو میر امن نے (اور

دوسرے لوگوں نے بھی) اِسی طرح لکھنا بہتر سمجھا ہے۔ ع میں جو "گلکرسٹ" ہے تو یہ واضح طور پر نسخۂ ع کے مرتّب کی تصحیح ہے اور میری رائے میں اِس تصحیح کا حق نہ ع کے مرتّب کو پہنچتا تھا اور نہ مجھے پہنچتا ہے۔ اِس میں شک نہیں کہ اصل لفظ "گلکرسٹ" ہے اور اِس پر اگر نظر رکھی جائے تو بہ ظاہر ع کے مرتّب کا عمل درست نظر آئے گا، مگر اصولِ تدوین سے مطابقت نہیں رکھتا، اِس لیے کہ یہ صورت قطعی طور پر منشائے مصنّف سے مطابقت نہیں رکھتی۔ ایسے مواقع پر اصلاً اِس بات کی اہمیت ہے کہ مصنّف نے کس لفظ کو کس طرح درست قرار دیا ہے اور کس طرح استعمال کیا ہے۔ آج کیا صورت مستعمل ہے یا اصلاً کیا تھا، اُس کی حیثیت ثانوی ہو جاتی ہے، جو صرف تشریحات کے ذیل میں جگہ پانے کی مستحق ہوتی ہے۔ میں نے اِس پوری صورتِ حال پر غور کرنے کے بعد مناسب یہی خیال کیا کہ اِس خاص لفظ کے املا میں کسی طرح کی تبدیلی کو روا نہ رکھا جائے، اِس لیے اِس کتاب میں ہر جگہ اِس لفظ کو ک کے مطابق ت کے ساتھ لکھا گیا ہے؛ البتّہ اِتنی ترمیم کی گئی ہے کہ طالب علموں کی آسانی کی خاطر، اِس کے دونوں ٹکڑوں کو الگ الگ (گل کرست) لکھا گیا ہے؛ اِس سے ضمنی فائدہ یہ بھی حاصل ہوا ہے کہ اعراب آسانی اور صحت کے ساتھ لگائے جا سکتے ہیں۔

میر امّن نے دیباچۂ گنجِ خوبی میں اِس لفظ کو ایک شعر میں بھی باندھا ہے: "رہیں شاد و آباد گل کرست صاحب ؛؛ رہیں اُن کے خوش آشنا یار بھائی" [باقی حصّہ اِس ضمیمے کے آخر میں ص ۲۹۳ پر]

⑰ جان بارتھ وک گل کرسٹ ۱۷۵۹ء میں ایڈنبرا میں پیدا ہوا۔ ایک قسمت آزما کی حیثیت سے ۱۷۸۲ء میں بمبئی پہنچا اور وہیں اُس نے ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت ایک ڈاکٹر (اسسٹنٹ سرجن) کی حیثیت سے اختیار کی۔ ۱۰ رجولائی سنہ ۱۸۰۰ء کو فورٹ ولیم کالج کا قیام عمل میں آیا اور اُسی سال ہندستانی زبان کے پروفیسر کی حیثیت سے اِس کالج میں گل کرسٹ کا تقرر ہوا۔ ۲۴ فروری سنہ ۱۸۰۴ء کو گل کرسٹ کا استعفا منظور کر لیا گیا اور وہ انگلستان چلا گیا۔ [یہ معلومات عتیق صدیقی کی کتاب گل کرسٹ اور اُس کا عہد سے ماخوذ ہیں] ۱۸ ف : جمنا۔ ⑱ طلبہ کی توجّہ اِس طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں کہ اِس جملے میں لفظ "لطف" اِس طرح آیا ہے کہ ایہام کا پہلو نمایاں ہو گیا ہے۔ "لطف" میر امّن کا تخلّص بھی تھا اور یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ یہاں یہ لفظ عام معنی میں آیا ہے۔ اگر اِس لفظ پر تخلّص کا نشان (ــــ) بنا دیا جاتا تو ایہام کا یہ لطف ختم ہو جاتا؛ اِسی بنا پر اِس سے احتراز کیا گیا۔

۱۹ ع : ہندستانی۔

صن ا۔ لہ ف: خاص و عام۔ ۲؎ ن: بولتے ہیں۔ (۴) م، ک، ف: کسی نسخے میں واؤ پر کوئی حرکت یا جزم موجود نہیں۔ ہاں میم پر پیش ضرور لگا ہوا ہے۔ اصل لفظ "مُحاوَرَہ" (بہ فتحِ واو) ہے، مگر اُردو والوں کی زبان سے یہ لفظ اِس طرح سُننے میں آتا ہے کہ زبر کی آواز واضح طور پر اپنے آپ کو نمایاں نہیں کرتی۔ اگر کوئی شخص "مُحاوَرے سے" کہے تو سُننے والوں کی اجنبیت کا احساس ضرور ہوگا۔ اُردو والوں کے لہجے کی فصاحت کا تقاضا یہی معلوم ہوتا ہے کہ اِسے اُسی طرح پڑھا جائے جس طرح بولتے ہیں، یعنی واؤ کے زبر پر زور نہ دیا جائے۔ ۵؎ م، ن: جیسی۔ ۵؎ ن: سرفراز اور منصب دار قدیمی زبان مبارک سے فرمایا۔ (۶) اِس جملے میں "خانہ زاد" اور "منصب دار" کو مع اضافت اور بغیر اضافت دونوں طرح پڑھا جاسکتا ہے؛ لیکن اِن کو مع اضافت مرجّح سمجھا گیا ہے۔ ایک وجہ تو یہ ہے کہ ک، م، ن، ع؛ سب میں "خانہ زاد" اور "منصب دار" کے آخری حرفوں کے نیچے اضافت کا زیر لگا ہوا ہے۔ آگے چل کر "آغازِ قصّہ" میں "خانہ زاد موروثی" ایک اور جملے میں بھی آیا ہے: "اگر اس خانہ زاد موروثی کو بھی محرم اِس راز کا کیجے" اور یہاں بھی ک اور ف میں "خانہ زاد" کی دال کے نیچے اضافت کا زیر لگا ہوا ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ "آغازِ قصّہ" ہی میں یہ لفظ ایک اور جملے میں بھی آیا ہے، اور جس طرح اِس جملے میں "خانہ زاد موروثی" اور "منصب دار قدیمی" دو برابر کے ٹکڑے موجود ہیں، اُسی طرح وہاں بھی "خانہ زاد اعلا ادنا" اور "ارکان دولت چھوٹے بڑے" دو ٹکڑے آئے ہیں۔ جملہ یہ ہے: "صبح کو سب خانہ زاد اعلا ادنا اور ارکان دولت چھوٹے بڑے اپنے اپنے پایے اور مرتبے پر آکر کھڑے ہوئے۔" یہ طے ہے کہ "ارکانِ دولت" میں لفظِ "ارکان" کو لازماً مع اضافت پڑھا جائے گا، اور اِس بنا پر (حُسنِ بیان اور حُسنِ تناسب کے نقطۂ نظر سے) یہ بھی لازم ہوگا کہ پہلے ٹکڑے میں "خانہ زاد" کو بھی مع اضافت پڑھا جائے [خانہ زادِ اعلا ادنا اور ارکانِ دولت چھوٹے بڑے] اور اِس طرح یہ متعیّن کرنے میں آسانی ہوگی کہ اِن تینوں جملوں میں لفظ "خانہ زاد" کو مع اضافت پڑھنا چاہیے۔ ۷؎ م اور ن میں "تب" موجود نہیں۔ (۸) سورج مل جاٹ بھرت پور کا راجا تھا۔ [متوفی: ۲۵ر دسمبر ۱۷۶۳ء] جاٹوں نے سورج مل کی سرکردگی میں اُس زمانے میں دہلی کے اطراف میں بہت لوٹ مار کی تھی۔ ۱۷۵۳ء میں اُنھوں نے خاص کر دہلی کے نواحی علاقوں مثلاً محلہ سیّد واڑا، عبداللہ نگر وغیرہ کو خوب لوٹا تھا [فال آف دی مغل امپائر، اشاعت ۱۹۷۱ء، جلد اوّل، صفحات ۳۰۰، ۳۰۱]۔

[یہ اعتراف ضروری

ہے کہ ڈاکٹر وحید قریشی نے باغ و بہار سے متعلق اپنے طویل مقالے میں یہ حوالہ دیا ہے اور میں نے اِسی مقالے سے پہلی بار یہ معلومات حاصل کی تھی، پھر سرکار کی کتاب سے اِس کا مقابلہ کیا، یوں سرکار کی کتاب کا حوالہ دیا گیا ہے۔] ۹۵ءم اور ن میں "اور" موجود نہیں۔ (۱۰) "احمد خان" خلیفہ محمد زماں خاں ابدالی، سدوزئی" (بیانِ واقع ص ۱۰۵) ولادت: ۱۱۳۵ھ (ایضاً حاشیہ ص ۱۰۵) بیانِ واقع کے مصنف نے لکھا ہے کہ تیرہ جمادی الاوّل ۱۱۶۰ھ کی رات میں نادر شاہ کو اُس کے محافظ سپاہیوں نے قتل کر دیا (ص ۱۷۳) مگر اِس کتاب کے مرتب نے ایک اور حوالے سے لکھا ہے کہ نادر شاہ کا قتل ۱۱ رجمادی الآخر ۱۱۶۰ھ (۸ رجون ۱۷۴۷ء) کو ہوا تھا اور یہی مرجح ہے۔ نادر شاہ کے قتل کے بعد احمد شاہ تختِ سلطنت پر بیٹھا۔ احمد شاہ نے ہندستان پر متعدد حملے کیے اور اُس کی فوجوں نے دہلی کو کئی مرتبہ بُری طرح لوٹا۔ خاص کر ۱۷۵۶ء کے حملے کے بعد اور پھر ۱۷۶۱ء میں پانی پت کی جنگ میں جیتنے کے بعد۔ میر امّن نے اِن واقعات کو جس طرح لکھا ہے، اُس سے بہ ظاہر یہی خیال پیدا ہوتا ہے کہ اُن کی مراد ۱۷۶۱ء کی غارت گری سے ہے۔ ۱۴ رجنوری ۱۷۶۱ء کو ابدالی کی فوجوں نے مرہٹوں کو پانی پت کے میدان میں شکست دی اور اُس کے بعد اُس کی فوجیں ۲۹ رجنوری ۱۷۶۱ء کو دہلی میں داخل ہوئیں۔ ابدالی کی فوجوں نے تین دن تک دہلی کو خوب لوٹا تھا۔

(۱۱) طلبہ کے استفادے کے لیے یہ وضاحت کی جاتی ہے کہ "جَلا" اور "جِلا" دو مختلف المعنی لفظ ہیں۔ روشنی اور صیقل کرنے کے معنی میں "جِلا" آتا ہے، جس سے جِلا دینا، جِلا کرنا وغیرہ بنتے ہیں، اور ترکِ وطن کرنے یا دیس سے باہر نکال دینے کے معنی میں "جَلا" آتا ہے۔ "جَلا وطن" اِسی سے بنا ہے۔ عربی کے لحاظ سے "جلاء" مع ہمزہ ہے، لیکن اُردو میں (ایسے اور لفظوں کی طرح) آخر کا ہمزہ ساقط ہو چکا ہے۔ پیشِ نظر سبھی نسخوں میں بھی ہمزہ کے بغیر ہی ہے۔ اِسی کی مطابقت اختیار کی گئی ہے۔ (۱۲) یہ پٹنہ کا دوسرا نام ہے۔ اورنگ زیب عالم گیر کا پوتا شہزادہ عظیم الشان (ابنِ بہادر شاہ اوّل) دنوں تک بہار کا صوبے دار رہا تھا، اُسی کے زمانے میں یہ نام پڑا ہے (غالباً اُس کے نام کی مناسبت سے)۔

(۱۳) ڈاکٹر اختر اُرینوی نے اپنی کتاب "بہار میں اُردو زبان و ادب کا ارتقا" میں لکھا ہے: "مہاراجا شتاب رائے کا ادبی ذوق بہت بلند اور اعلیٰ تھا..... چناں چہ میر شیر علی افسوس اور میر امّن دہلوی بھی عظیم آباد آئے اور شتاب رائے کے صاحب زادے کے کرم وجود سے فیض یاب ہوتے رہے" (ص ۱۳۴)۔ مصنف نے حوالہ دیا ہے: "خطبۂ صدارت صلاح الدین خدا بخش ۱۹۳۰ء" قاضی

عبد الودود صاحب نے اِس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے: "شتاب رائے کا متخلّص بہ شتاب اور فن کا روں کا نہایت قدر داں ہونا ثابت نہیں۔ یہ بھی کسی نے نہیں لکھا کہ" ان کا ادبی ذوق بہت بلند اور اعلیٰ تھا۔" افسوس اور میر امن کا اُن سے کسی قسم کا تعلق محتاجِ ثبوت ہے" [مقالاتِ قاضی عبد الودود، جلد اوّل، ص ۲۸] ۱۴ ک، ف: پاؤں (م، ن، ع: پانو)۔

ص ۷۔ (۱) میر بہادر علی حسینی بستی "سواناتہ" کے رہنے والے تھے، جو "شہر تھانیسر کے تیرہ کوس دکّھن ہوتی سے پانچ منزل مغرب" میں تھی۔ (جائزہ مخطوطاتِ اُردو، مشفق خواجہ، ص ۱۰۰) عتیق صدّیقی نے اپنی کتاب گل کرسٹ اور اُس کا عہد میں فورٹ ولیم کالج کے پُرانے کاغذات کے حوالے سے یہ لکھا ہے کہ ۴ر مئی ۱۸۰۱ء کو چیف منشی کی حیثیت سے فورٹ ولیم کالج میں اُن کا تقرر ہوا تھا۔ گل کرسٹ نے کالج کونسل کے نام اپنے خط مرقومہ ۲ر جنوری ۱۸۰۲ء کو اُردو کتابوں کی تالیف و طباعت کے سلسلے میں لکھا تھا: "تالیف، ترجمے اور نقل کے تمام اخراجات میرے ذمّے ہوں گے، لیکن حکومت میر بہادر علی حسینی کو اپنے مصارف پر میری ماتحتی میں ہندستانی کتابوں کا مقابلہ اور تصحیح کے کام پر بحال رکھّے" (ایضاً، ص ۱۲۷)۔ اِس سے حسینی کی اہمیت کا بہ خوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ حسینی سے متعلق دیگر تفصیلات کے لیے دیکھیے عتیق صدّیقی کی محوّلۂ بالا کتاب، اور میر بہادر علی حسینی کی کتاب اخلاقِ ہندی (شائع کردہ مجلسِ ترقّیِ ادب لاہور) پر ڈاکٹر وحید قریشی کا مقدمہ۔ ۲ ن، ک، ف: پاؤں۔ ع: پانو۔ ۳ م، ن: کہتے تھے۔

(۲) م، ف: محمودِ غزنوی۔ ک: محمود غزنوی۔ یہاں م اور ف کی مطابقت اختیار کی گئی ہے اِس بنا پر کہ اِس سے پہلے "امیر خسرِو دہلوی" آیا ہے اور ک میں بھی وہاں واو کے نیچے اضافت کا زیر موجود ہے۔ "محمودِ غزنوی" کی وہی حیثیت ہے جو "خسرِو دہلوی" کی ہے، اِس لیے یہاں بھی لفظِ "محمود" کو مع اضافت رکھنا انسب ہوگا، چوں کہ دو نسخوں میں اضافت کا زیر موجود ہے، اِس لیے ترجیح کا فائدہ حاصل کیا جا سکتا ہے اور اِس طرح اِن دونوں اندراجات میں مطابقت بھی برقرار رہتی ہے۔ [یہ واضح کر دیا جائے کہ ایسے مرکبات مع اضافت اور بغیرِ اضافت صحیح دونوں طرح ہیں، اور مستعمل بھی دونوں طرح رہے ہیں۔] ۵ م، ن: لودی اور غوری۔ ۶ ع: ہندستان۔ (۷) "پٹھانوں" سے مراد ہے شیر شاہ سوری سے، جو افغان تھا اور جس نے ہمایوں کو شکست دے کر ہندستان کی حکومت پر قبضہ کیا تھا اور ہمایوں کو ایران جانا پڑا تھا۔ (۸) "ولایت" سے مراد ایران ہے۔ ۹ "کو فتنہ و فساد برپا کر کے" یہ ٹکڑا م اور ن میں نہیں۔

ص ۸ ۔ (۱) م، ن، ک، ع؛ سب میں "جمع ہوئے" ہے [مراد یہ ہے کہ مختلف قوموں کے لوگ جمع ہوئے] "سب قوم..... جمع ہوئے ... آج یہ اندازِ بیان اجنبی معلوم ہوتا ہے، مگر میر امّن کی نثر میں ایسی متعدد مثالیں موجود ہیں، مثلاً: "جو تھے رعیّت جو کھیتی کرتے ہیں" (مخطوطۂ گنجِ خوبی ص ۵۲) مطلب یہ ہے کہ رعیّت کے لوگ جو کھیتی کرتے ہیں۔ یا مثلاً: "میرے انصاف کے باعث رعیّت پرجا سب خوش تھے" (باغ و بہار، ص ۱۷۵) یعنی رعیّت کے لوگ۔ (۲) طلبہ کے ذہن میں یہ بات واضح رہے کہ "اردو" یہاں زبان کے معنی میں نہیں، لشکر کے معنی میں آیا ہے۔ یعنی لشکر میں ایک ملی جلی زبان کا چلن شروع ہوا ــــــ م میں اِس ٹکڑے میں "سوال جواب کرتے کرتے" ہے۔ (۳) ک اور ف میں "شاہِ جہاں" ہے، یعنی ہ کے نیچے اضافت کا زیر موجود ہے۔ عام طور پر "شاہ جہاں" (بغیرِ اضافت) لکھا اور بولا جاتا ہے۔ نظم میں مع اضافت ضرور آسکتا ہے، مگر وہ شعری ضرورت کی بات ہے۔ اِس کے باوجود میں نے یہاں ک کی مطابقت کو ترجیح دی ہے؛ اِس کی خاص وجہ یہ ہے کہ اِسی صفحے کی آخری سطر میں "شاہِ عالم" آیا ہے اور م، ک، ف؛ تینوں نسخوں میں "شاہِ عالم" (مع اضافت) ہے۔ اِسے بھی عام طور پر "شاہ عالم" بغیرِ اضافت کہا اور لکھا جاتا ہے۔ چوں کہ م، ک، ف؛ تینوں قدیم نسخوں میں اضافت کا زیر موجود ہے، اِس لیے میں نے اُس سے انحراف کو مناسب نہیں سمجھا۔ جب "شاہِ عالم" کو (اصل کی مطابقت میں) مع اضافت لکھا گیا، تو پھر "شاہِ جہاں" بھی لکھا جا سکتا ہے اور بہ ظاہر کوئی وجہ ایسی نظر نہیں آتی کہ یہاں اصل کی مطابقت سے انحراف کو روا رکھا جائے۔ یہ بھی پیشِ نظر رہے کہ "شاہ جہاں" اور "شاہ عالم" مستعمل صورتیں ضرور ہیں، مگر قواعد کے لحاظ سے "شاہِ جہاں" اور "شاہِ عالم" صحیح شکلیں ہیں، یعنی "شاہِ جہاں" بجائے خود غلط نہیں (بل کہ بہ لحاظِ اصل یہی صحیح صورت ہے) اِس لیے یہاں ک کی مطابقت سے کوئی قباحت لازم نہیں آتی۔ [اصل سے انحراف وہیں روا رکھا گیا ہے جہاں کوئی غلطی ہو یا اُسی درجے کی کوئی قباحت لازم آتی ہو اور یہاں ایسا نہیں] اِس سلسلے میں یہ بات بھی قابلِ لحاظ ہے کہ اِسی صفحے کی ساتویں سطر میں "شاہ جہان آباد" آیا ہے اور وہاں کسی نسخے میں "شاہ" کی ہ کے نیچے زیر نہیں (اِس بنا پر کہ لفظ کی نسبت ہی بدل گئی ہے) اِس سے صاف طور پر یہی معلوم ہوتا ہے کہ اِس مقام پر "شاہِ جہاں" بہ کسرِ ہ جو ہے، وہ طباعت کی غلطی کا کرشمہ نہیں، بل کہ اِسی طرح لکھا گیا ہے۔ اِن ٹکڑے میں دوسرا جز "صاحب قران" ہے۔ یہ مرکب بالعموم

بغیرِ اضافت مستعمل رہا ہے، نظم میں اکثر اسی طرح دیکھا گیا ہے۔ مگر یہاں م، ک، ف، تینوں نسخوں میں "صاحبِ قِران" (مع اضافت) ہے۔ یہاں بھی صورت وہی ہے کہ مستعمل صورت "صاحبقران" ہے، مگر "صاحبِ قِران" بھی بجائے خود درست ہے۔ م، ک، ف، تینوں نسخوں میں اس مرکب کو ملا کر نہیں لکھا گیا ہے، منفصل لکھا گیا ہے [صاحب قران] اور ب کے نیچے زیر لگایا گیا ہے۔ یہ التزام بجائے خود اِس پر دلالت کرتا ہے کہ اِس مرکب کو مع اضافت ہی رکھا گیا ہے۔ [شاکر ناجی کے یہاں یہ مرکب مع اضافت موجود ہے: ناجی سجن کے ابرو ہم رنگساں ہیشہ ؛ سکہ ہے مہرِ رخاں میں اس صاحبِ قراں کا۔ دیوان، مرتبہ افتخار بیگم صدیقی] - اِس سلسلے میں یہ بات بھی دیکھنے کی ہے کہ "شاہِ جہان صاحبِ قِران" میں دونوں ٹکڑوں کا مع اضافت ہونا بہتر معلوم ہوتا ہے۔ یعنی حُسنِ بیان کا تقاضا یہ ظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ یا تو "شاہ جہان صاحب قران" لکھا جاتا، یا "شاہِ جہان صاحبِ قِران"، دونوں اجزا یا تو مع اضافت ہوں یا بغیر اضافت۔ اگر ایک جز مع اضافت ہو اور دوسرا بغیر اضافت ہو، یا اِس کے برعکس ہو، تو بیان کا تناسب ختم ہو جائے گا۔ ہاں یہ صراحت بھی ضروری ہے کہ م اور ک میں "شاہِ جہاں" (مع نونِ غنہ) ہے اور "صاحبِ قِران" میں نون پر نقطہ موجود ہے، اِسی کی پابندی اختیار کی گئی ہے۔

④ شاہ جہان نے اپنے جلوس کے بارھویں سال (ذی حجہ ۱۰۴۸ھ) میں دریائے جمنا کے کنارے قلعے کی تعمیر کا حکم دیا۔ ۲۴ ربیع الاول ۱۰۵۸ھ (۱۶۴۸ء) کو بادشاہ نے اِس قلعے میں پہلی بار جلوس کیا۔ عملِ صالح میں لکھا ہوا ہے کہ پچاس لاکھ روپے قلعے کی تعمیر میں صرف ہوئے اور اِسی قدر رقم قلعے کے اندر مختلف عمارتوں کی تعمیر میں صرف ہوئی۔ (جلدِ سوم ص ۳۲) قلعے کی تعمیر اور اِس کی عمارتوں سے متعلق تفصیلات عملِ صالح میں مندرج ہیں۔ نیز آثار الصنادید میں بھی ضروری باتیں لکھ دی گئی ہیں اور واقعاتِ دارالحکومت دہلی (جلدِ دوم) میں ص ۴۱ سے ص ۸۸ تک بہت تفصیل کے ساتھ اِن باتوں کو لکھا گیا ہے۔ مفصّل معلومات کے لیے اِن کتابوں کو دیکھا جا سکتا ہے۔ ⑤ "دسویں شوال ۱۰۶۰ ہجری موافق ۱۶۵۰ء مطابق سال بست و چہارم جلوس میں اِس مسجد کی بنیاد ... پڑنی شروع ہوئی اور ہر روز پانچ ہزار راج، مزدور، بیل دار، سنگ تراش کام کرتے تھے؛ باوجود اِس اہتمام کے چھے برس میں دس لاکھ روپیہ خرچ ہو کر یہ مسجد تمام ہوئی" [آثار الصنادید، طبع دوم، ص ۶۵] واقعاتِ دارالحکومت دہلی (جلدِ دوم) میں زیادہ تفصیلات ہیں، اُسے دیکھا جا سکتا ہے۔ ⑥ "۲۴ سنہ جلوسی، مطابق ۱۰۶۰ھ، موافق ۱۶۵۰ء میں شاہ جہان کے حکم بموجب مٹی اور پتھر سے ڈیڑھ لاکھ روپے خرچ ہو کر شہر کی فصیل تیار ہوئی، مگر

دوسرے برس برسات میں اکثر جگہ سے گر پڑی، اِس واسطے شاہ جہاں نے چونے اور پتھر سے از سرِ نو بننے کا حکم دیا..... ۱۰۶۹ھ ہجری مطابق ۱۶۵۸ء میں، چار لاکھ روپے خرچ ہو کر یہ فصیل تیار ہو گئی۔ طول اِس کا چھے ہزار چھے سو چونسٹھ گز کا ہے اور چار گز چوڑی اور نو گز اونچی ہے اور اِس میں ستائیس برج، دس دس گز کے قطر سے ہیں۔" [آثار الصنادید، طبعِ دوم، ص ۵۰] واقعاتِ دارالحکومت دہلی میں اس بیان پر یہ اضافہ کیا گیا ہے کہ اِس فصیل میں ۲۷ برج... "چودہ دروازے، چودہ کھڑکیاں تھیں" (جلدِ دوم ص ۹۳) اِن دروازوں اور کھڑکیوں کے نام بھی اِس کتاب میں لکھے ہوئے ہیں۔ ⑦ اِس جملے میں آخری لفظ "شہر پناہ" مونث ہے، اِس بنا پر قاعدے کے لحاظ سے یہاں فعل مونث آنا چاہیے؛ لیکن سبھی نسخوں میں اِسی طرح مرقوم ہے۔ نیز اگلے جملے میں "جواہر جڑوایا" آیا ہے؛ بہ ظاہر اُس کا تقاضا بھی یہی ہے کہ یہاں "تعمیر کروایا" ہو؛ غالباً اسی وجہ سے (قافیہ بندی کی رعایت کی بنا پر) میرامّن نے یہاں فعل مذکر استعمال کیا ہے۔ یا پھر یہ مانا جائے کہ وہ "شہر پناہ" کو مذکر مانتے تھے۔ چوں کہ متعدد لفظوں کی تذکیر و تانیث کے لحاظ سے میرامّن کی نثر میں موجودہ طرزِ استعمال کے خلاف صورتیں سامنے آتی ہیں، اِس بنا پر یہاں بھی یہی فرض کر لینا کچھ ایسا بے جا نہ ہوگا۔ ⑧ تختِ طاؤس کی تفصیل متعدد کتابوں میں ملتی ہے، ضروری تفصیلات کے لیے عملِ صالح اور واقعاتِ دارالحکومت دہلی کو دیکھا جا سکتا ہے (جلدِ دوم ص ۶۱ سے ص ۶۴ تک)۔ یہ کہا گیا ہے کہ تقریباً ایک کرور روپے اِس تخت میں صرف ہوئے تھے۔ ⑨ م، ن: تمام جواہر جڑوائے۔ ⑩ عملِ صالح میں اِس کی تفصیلات مرقوم ہیں، مختصر یہ کہ یہ خیمہ جس کا نام "دل بادل" تھا، ستّر گز لمبا اور ۴۵ گز چوڑا تھا اور ایک لاکھ روپے کے صرف سے احمد آباد کے کارخانے میں تیار ہوا تھا.... ایک ہزار آدمی اِس کے نیچے بیٹھ سکتے تھے۔ یہ خیمہ تین ہزار فرّاشوں کی مدد سے کھڑا کیا گیا تھا۔ [جلدِ سوم ص ۵۶، ۵۷]۔ ⑪ م، ن: کھینچوایا۔ ک اور ف میں پہلے حرف کے نیچے زیر لگا ہوا ہے۔ یہ صراحت یوں کی گئی کہ مصدر "کھینچنا" کے جملہ مشتقات کو میرامّن نے ہر جگہ بہ فتحِ اوّل استعمال کیا ہے۔ گویا "کَھینچنا" بہ فتحِ اوّل ہے اور اُس کا لازم "کِھنچنا" بہ کسرِ اوّل۔ ⑫ عہدِ شاہ جہاں کا بلند مرتبہ امیر تھا "علی مردان خاں امیر الامرا ہفت ہزاری ہفت ہزار سوار، پنج ہزار دو اسپہ سہ اسپہ، دو کرور دام انعام" (عملِ صالح، جلدِ سوم، ص ۴۴۸) شاہ جہاں کے اکتیسویں سالِ جلوس (۱۰۶۷ھ) میں انتقال ہوا۔ (ایضاً)۔ ⑬ اِس نہر کے کئی نام تھے: فیض نہر،

نہرِ سعادت خاں ، نہرِ علی مردان خاں۔ مختلف کتابوں میں یہ سب نام ملتے ہیں۔ یہی نہر فتح پوری اور چاندنی چوک کے بازار کے بیچوں بیچ میں سے ہوتی ہوئی قلعے کے اندر گئی تھی اور قلعے کی عمارتوں کے تذکرے میں اِس نہر کو "نہرِ بہشت" کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔ سرسیّد نے آثار الصنادید میں مرآتِ آفتاب نما کے حوالے سے لکھا ہے: "اوّل بانی اِس نہر کا سلطان جلال الدّین فیروز شاہ خلجی ہے، اُس نے سنہ ۶۹۱ھ مطابق سنہ ۱۲۹۱ عیسوی کے اِس نہر کو سوادِ پرگنۂ خضر آباد میں دریا سے کاٹا اور تیس کوس تک پرگنہ سفیدوں میں، جہاں اُس کی شکارگاہ تھی، لاکر چھوڑ دیا۔ پھر کسی بادشاہ کو اُس کا خیال نہ رہا کہ وہ نہر بند ہوگئی تھی۔ سنہ ۹۶۹ھ مطابق سنہ ۱۵۶۱ع جلال الدّین اکبر بادشاہ کے عہد میں شہاب الدین احمد خاں صوبے دارِ دہلی نے اِس نہر کو پھر صاف کرایا اور اپنی جاگیر میں لایا اور "نہرِ شہاب" اِس کا نام رکھا۔ ایک مدّت بعد یہ نہر پھر بند ہوگئی تھی۔ سنہ ۱۰۴۸ ہجری مطابق سنہ ۱۶۳۸ع کے شہاب الدّین محمّد شاہ جہاں نے اِس نہر کے سفیدوں تک صاف ہوتے کا اور سفیدوں سے قلعۂ شاہ جہاں تک نئی کھُدنے کا حکم دیا۔ چناں چہ یہ نہر تیّار ہوئی اور جب قلعہ بن چکا، تو قلعے اور شہر میں جاری ہوئی۔ ایک مدّت بعد اِس نہر کا پھر وہی حال ہوگیا تھا۔ تخمیناً سنہ ۱۸۲۰ع مطابق سنہ ۱۲۳۶ ہجری کے سرکارِ انگریزی نے پھر نہر کو جاری کیا اور اب تک یہ دستور جاری ہے اور مرمّت اور شکست و ریخت سے تیّار اور مصفّا رہتی ہے" [طبع دوم ص ۳۵۵] "علی مردان خاں کی نہر کابلی دروازے سے شہر میں داخل ہوکر، شہر اور قلعے دونوں میں دوڑتی ہے اور پھر دریا میں جاملتی ہے" [واقعاتِ دارالحکومت دہلی، جلدِ دوم، ص ۹۴] "اصل نام اِس نہر کا، جو شہر میں جاتی تھی "فیض نہر" تھا، لیکن یہی نہر عام طور پر "سعادت خاں کی نہر" کہلاتی تھی، مگر کچھ نہیں معلوم کہ یہ سعادت خاں کون تھے" [ایضاً ص ۲۳۵] "حال میں بہ لحاظِ حفظانِ صحت نہر بالکل پاٹ کر بند کردی گئی ہے" (ایضاً ص ۲۳۵)۔ اِس نہر کے پرانے نشانات ابھی تک: دہلی کے نواحی علاقے شکور بستی کے پاس موجود ہیں، اگرچہ رفتہ رفتہ وہ سب ختم ہوتے جاتے ہیں اور زمین ہموار ہوتی جاتی ہے اور نہر کا نشان مٹتا جاتا ہے۔ ہسٹری آف شاہ عالم کے نام سے انگریزی میں ایک کتاب ہے، اُس میں اِس نہر کی بعض اور تفصیلات بھی ملتی ہیں۔ اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ نہر پانی پت کے پاس سے کاٹ کر لائی گئی تھی۔ (۱۴) عملِ صالح (جلدِ سوم، ص ۵۸، ۶۲) سے معلوم ہوتا ہے کہ قلعے میں شاہ جہاں کے ورود کے دن سے یہ جشن شروع ہوا تھا اور "مقرر فرمودند کہ تا نو روز

این جشنِ والا زینت افزاے روزگار باشد و ہر روز صد خلعت بہ صد نفر از بندہ ہای درگاہ دادہ باشند"۔ اسی سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ۲ ربیع الثانی ۱۰۵۰ھ تک ۹ دن مسلسل یہ جشن جاری رہا تھا اور اسی تاریخ سے نئے سال کا "جشنِ وزنِ قمری" شروع ہو گیا تھا۔ ۱۵ ک کے متن میں "دار الخلافہ" چھپا ہوا ہے، مگر غلط نامے میں اس کی تصحیح کی گئی ہے اور "دار الخلافت" کو صحیح لفظ بتایا گیا ہے۔ ف، ن، ع میں "دار الخلافت" ہی ہے، البتہ م میں "دار الخلافہ" ہے۔ ک کے غلط نامے کے مطابق "دار الخلافت" کو ترجیح دی گئی ہے۔ ۱۶ ن: "وہ پرانا شہر کہلاتا ہے"۔ "یہ نیا شہر کہلاتا ہے" اس نسخے میں موجود نہیں۔ (۱۷) "پرانا شہر" سے میر امن کی مراد اس آبادی سے ہے جو "شاہ جہان آباد" کے آباد ہونے سے پہلے موجود تھی۔ یہ "شیر شاہ کی دلّی" کہلاتی تھی اور اس کی حدیں اس "نئے شہر" سے تقریباً مل جاتی تھیں۔ [موجودہ خونی دروازے کا پرانا نام "کابلی دروازہ" تھا اور اسے شیر شاہ کی دلّی کی فصیل کا دروازہ بتایا گیا ہے] سیر المنازل میں ہے: "دہلیِ قدیم از خواجہ قطب الدین تا فیروز آباد مقابلِ کشمیری دروازہ دار الخلافہ مشہور است" (ص ۷۰)۔ سید انشا نے "پرانی دلّی کی خصوصیات" کے ذیل میں لکھا ہے: "اور شہرِ قدیم کے رہنے والے، جس کا نام "پرانا شہر" ہے، "اِدھر" کو "اِیدھر"، "اُدھر" کو "اودھر"، "کدھر" کو "کیدھر" کہتے ہیں ..... یہ لفظ اُن کی صحبت سے نئے شہر والے بھی بولتے ہیں" [ترجمۂ دریاے لطافت ص ۲۶]۔ میر شیر علی افسوس نے باغِ اردو کے دیباچے میں، یہ بتاتے ہوئے کہ میری ولادت دلّی میں ہوئی، لکھا ہے: "اس عاصی کا مولد نیا شہر ہے" [باغِ اردو، شائع کردہ مجلسِ ترقیِ ادب لاہور، ص ۲۱] مطلب یہ ہے کہ شاہ جہان آباد کی آبادی کو (جو فصیل کے اندر تھی) "نیا شہر" بھی کہا جاتا تھا اور فصیل سے باہر کی آبادی کو "پرانا شہر" یا "دہلیِ قدیم" بھی کہا جاتا تھا۔ ۱۸ م اور ن میں "اور" موجود نہیں۔ (۱۹) یہ بازار لال قلعے کے لاہوری دروازے کے سامنے سے شروع ہوتا تھا اور چاندنی چوک کے بازار سے مل جاتا تھا۔ سر سید نے آثار الصنادید میں "اُردو بازار اور چاندنی چوک" کے تحت لکھا ہے: "قلعہ کے لاہوری دروازے کے آگے، چالیس گز چوڑا اور ایک ہزار پانسو گز لمبا بازار ہے۔ اگلی تاریخ کی کتابوں میں اس بازار کو "لاہوری بازار" کر کر لکھا ہے۔ اس بازار کو ۱۰۶۰ھ مطابق ۱۶۵۰ء کے جہاں آرا بیگم بنتِ شاہ جہان بادشاہ نے بنایا ہے۔ قلعے کے لاہوری دروازے سے چار سو اسی (۴۸۰) گز پر ایک چوک ہے اسّی گز کا مربّع، اُس چوک میں کوتوالی چبوترہ ہے۔ اُس چوک سے چار سو گز آگے ایک اور چوک ہے ہشت پہل، سو گز سے سو گز، اُس چوک کو چاندنی چوک

کہتے ہیں ... اُس کے آگے چار سو ساٹھ گز لنبا اور بازار ہے اور سراسر اُس میں نہر بہتی ہے۔ اُس بازار کے سرے پر فتح پوری مسجد ہے" (آثار الصنادید، طبع دوم، ص ۵۲)۔ آثار الصنادید طبعِ اوّل میں انھوں نے لکھا تھا: "یہ ایک بازار ہے نہایت وسیع ... یہ بازار قلعے کے لاہوری دروازے سے فتح پوری تک ہے۔ اِس بازار کے پہلے حصّے کو تو "اُردو بازار" کہتے ہیں، اور اُس کے آگے جہاں تر پولیا اور کوتوالی ہے، وہ اِسی نام سے مشہور ہے، اور اُس کے آگے "چاندنی چوک" کہلاتا ہے، اور اُس کے آگے "فتح پوری کا بازار" کہلاتا ہے۔ غرض کہ یہ بازار ہے چالیس گز کے عرض سے، بیس گز اِدھر اور بیس گز اُدھر اور بیچ میں سراسر نہر جاری ہے اور گرد نہر کے دو رستہ درخت لگے ہوئے ہیں۔" (آثار الصنادید، سنٹرل بک ڈپو، اُردو بازار، دہلی، طبع ۱۹۶۵ء، ص ۲۰۰)۔ "وہ حصّہ جو قلعے کے لاہوری دروازے اور دریبے کے خونی دروازے کے مابین ہے، "اُردو بازار" کہلاتا تھا، جس کی وجہِ تسمیہ غالباً یہ معلوم ہوتی ہے کہ کسی زمانے میں اِس حصّۂ شہر میں لشکری لوگ رہتے تھے" [واقعاتِ دار الحکومت دہلی، جلدِ دوم، ص ۲۰۷]۔ سیر المنازل میں دو جگہ اِس بازار کا ذکر ملتا ہے، مگر اِس میں "بازارِ اُردو" لکھا گیا ہے [ص ۳۴، ۳۹]۔ سیر المنازل کی تحریر سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ بازار دراصل لشکر والوں کا پُرانا بازار ہوگا۔ امیر تیمور کے ذکر میں لکھا ہے: "اُن کے آنے اور رہنے سے لشکر کا بازار شہر میں داخل ہوا، اِس واسطے شہر کا بازار "اُردو" کہلایا۔" اور پھر آگے چل کر یہ بھی لکھا ہے: "جب ...... صاحبِ قِران نے قلعہ ..... تعمیر کروایا ... تب سے شاہ جہاں آباد مشہور ہوا .... اور وہاں کے بازار کو اُردوے مُعلّا خطاب دیا۔"

یہ وہی لشکری نسبت ہے۔ اِس خیال کی تصدیق ایک اور طرح بھی ہوتی ہے۔ واقعاتِ دار الحکومت دہلی میں "اُردو کا مندر" کے عنوان کے ذیل میں لکھا گیا ہے: "قلعے کے لاہوری دروازے کے پاس لالہ رام چند کی تولیت میں یہ مندر ہے جو شاہ جہاں کے عہد کا کہلاتا ہے۔ اِس شہر میں جینیوں کا یہ سب سے قدیم مندر ہے۔ چوں کہ یہ مندر بادشاہی جینی فوجی لوگوں کا تھا، اِس سبب سے "اُردو کا مندر" کہلانے لگا ... اِس مندر کی بنا کی نسبت یہ مشہور ہے کہ پہلے یہ لشکری مندر تھا اور صرف ایک راوٹی میں کسی جینی سپاہی نے اپنی ذاتی پوجا کے لیے ایک مورت رکھ لی تھی۔ بعد میں یہاں مندر کی عمارت بن گئی" [جلدِ دوم، ص ۲۰۶]۔ یہ مندر اب بھی موجود ہے اور اب اِسی کے پاس سے چاندنی چوک والی سڑک شروع ہوتی ہے۔ جس طرح یہ "اُردو کا مندر" تھا (یعنی لشکر والوں کا) اُسی طرح "اُردو کا بازار" ہوگا۔ بعد کو استعمالِ عام میں "اُردو بازار" ہو گیا ہوگا۔ "اُردو بازار" کی جو حدود لکھی گئی ہیں، اُن کو سامنے رکھا

جائے تو بہ آسانی یہ کہا جا سکتا ہے کہ "اُردو بازار" اِسی "اُردو کا مندر" کے پاس سے شروع ہوتا تھا اور دریبہ کے سرے پر واقع خونی دروازے تک چلا گیا تھا۔ (۲۰) محمد شاہ، تختِ نشینی: ۲۹ر ستمبر ۱۷۱۹ء۔ متوفی: ۱۶ر اپریل ۱۷۴۸ء۔ (۲۱) احمد شاہ، تختِ نشینی: ۱۹ر اپریل ۱۷۴۸ء۔ متوفی: یکم جنوری ۱۷۷۵ء (۲۲) عالمگیرِ ثانی، تختِ نشینی: ۲ر جون ۱۷۵۴ء۔ متوفی: ۲۹ر نومبر ۱۷۵۹ء۔ یہ صراحت کی جاتی ہے کہ م اور ک میں اضافت کا زیر موجود نہیں، مگر ف میں موجود ہے، یعنی "عالمگیرِ ثانی" ہے۔ چوں کہ ایسے اور ناموں کو ک میں مع اضافت ہی لکھا گیا ہے، اِس لیے یہاں بھی ف کے مطابق اضافت کے زیر کو برقرار رکھا گیا ہے۔ ۲۳؎ ف، ع: "تلک"۔ ۲۴؎ م اور ن میں "نداں" موجود نہیں۔ ۲۵؎ ک اور ف میں اضافت کا زیر موجود ہے۔ ۲۶؎ م، ن: کہ جو۔ ۲۷؎ م اور ن میں یہ عبارت یوں ہے: "سو اب خدا نے بعد مدّت کے ایسا دانا نکتہ رس پیدا کیا ہے کہ جس کی توجہ سے زبان ہندوستان کی از سرِ نو قاعدے پر آئی اور نئے سرے سے رونق پائی۔ نہیں تو اپنی دستار و گفتار و ..... (۲۸) ک میں "اکت" (مع کاف) ہے۔ ف اور ع میں "اَگت" (گاف کے ساتھ) ہے۔ پلیٹس نے اپنے لغت میں دونوں لفظ درج کیے ہیں، مگر فیلن کے لغت میں اور آصفیہ، امیر اللغات اور نور اللغات میں صرف "اُکت" (کاف کے ساتھ) مندرج ہے۔ نور و امیر اللغات میں سند کے متعدد اشعار بھی لکھے گئے ہیں۔ اِس طرح یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اُردو میں مستعمل لفظ "اُکت" ہے (بہ ضمِ اوّل و فتحِ دوم) ک کی مطابقت اختیار کی گئی ہے۔ ۲۹؎ ع: ہندستان۔ (۳۰) ک اور ف میں سین کے نیچے زیر موجود ہے۔ لفظ "سِر" ہر جگہ اِن نسخوں میں بہ کسرِ سین ملتا ہے۔ مخطوطۂ گنجِ خوبی میں بھی میر امّن نے ہر جگہ "سِر" کے سین کے نیچے زیر لگایا ہے۔ اِسی طرح "نئے سِرے" اِس کتاب میں جہاں بھی آیا ہے ک اور ف میں ہر جگہ سین کے نیچے زیر ملتا ہے۔ اِسی کی مطابقت اختیار کی گئی ہے۔ ۳۱؎ ع: شہر والوں کو۔ (۳۲) ۱۴ر جنوری ۱۷۶۱ء کو احمد شاہ ابدالی نے پانی پت کے میدان مرہٹوں کو شکست دی۔ "اُس کے بعد دہلی میں آیا اور مرزا جواں بخت کو شاہ عالم کی جگہ بٹھا کر... ۲۲ر مارچ ۱۷۶۱ء کو قندھار واپس چلا گیا" [مقدمۂ نادراتِ شاہی، مرتبہ مولانا امتیاز علی خان عرشی مرحوم] دہلی کے اِس زمانۂ قیام میں (بھی) اُس کی فوجوں نے شہر کو خوب لوٹا تھا۔ یہ صراحت بھی ضروری ہے کہ م، ک، ف میں اِسی طرح ہے، یعنی "شاہ" کو اضافت کے بغیر لکھا گیا ہے۔ (۳۳) "بادشاہ کا اسلامی نام "میرزا عبداللہ" اور خاندانی "عالی گوہر" ہے۔ بچپن میں "لال میاں" اور "میرزا بُلاقی" بھی کہلاتے

تھے۔ بادشاہ ہوکر "ابوالمظفر جلال الدین محمد شاہ عالم ثانی" لقب اختیار کیا۔ ۱۰ رشعبان ۱۱۶۷ھ (۲ رجون ۱۷۵۴ء) کو عماد الملک نے اِن کے باپ کو "عالم گیر ثانی" کے لقب سے تخت پر بٹھایا... عماد الملک نے ۸ ربیع الآخر سنہ مذکور (۱۱۷۳ھ) کو عالم گیر ثانی کو قتل کرا دیا۔ ۴ رجمادی الاولیٰ (۱۱۷۳ھ) ۲۴ ر دسمبر ۱۷۵۹ء کو شاہ زادے (یعنی شاہ عالم) نے موضع کھٹولی [صوبۂ بہار] میں "شاہ عالم" لقب کے ساتھ اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا... شوال ۱۱۷۴ھ تک پٹنہ میں رہے (انگریزوں کی محافظت میں)۔ ۲۴ ر صفر سنہ ۶ جلوس ۱۱۷۹ھ، ۱۲ راگست ۱۷۶۵ء کو بادشاہ نے ہر سہ صوبۂ بنگال کی دیوانی انگریزوں کو عطا کر دی ... بادشاہ کا قیام الہ آباد میں قرار پایا اور انگریزی فوج حفاظت کو متعین ہوئی... انگریزی فوجوں نے لارڈ لیک کی سرکردگی میں دلّی پر حملہ کیا اور ۱۱ ر رجب ۱۲۱۸ھ، ۷ ر اکتوبر ۱۸۰۳ء کو مرہٹوں سے دلّی چھین کر، بادشاہ پر قبضہ کر لیا... ۷ ر رمضان ۱۲۲۱ھ، ۱۹ ر نومبر ۱۸۰۶ء کو شاہ عالم اِس دنیا سے رخصت ہوئے۔ اُن کی کل مدّتِ حکومت ۴۸ سال ہے جس میں سے ۱۲ برس بہار و الہ آباد میں... گزارے تھے۔" [امتیاز علی خاں عرشی، مقدمۂ نادراتِ شاہی] ہاں یہ بھی وضاحت کر دی جائے کہ م، ک اور ف تینوں نسخوں میں "شاہِ عالم" ہے، یعنی ہ کے نیچے زیر لگا ہوا ہے۔ اِسی کی مطابقت کو ترجیح دی گئی ہے۔

ص ۹ ① صرف یہ صراحت کرنا ہے کہ ک اور ف میں سین کے نیچے زیر لگا ہوا ہے (سِر)، اِسی کی مطابقت اختیار کی گئی ہے۔ ۲ م، ن: ہر طرف کو نکل گئے جس ملک میں .... ③ ک میں "کی ساتھ سنگت" ہے۔ اِس کے برخلاف م، ن اور ع میں "کے ساتھ سنگت" ہے۔ ایسے مرکبات جن کا ایک جز مذکر ہو اور ایک مونث (جیسا کہ یہ مرکب ہے) اُن سے پہلے "کے" یا "کی" سے متعلق کوئی بات قطعیت کے ساتھ نہیں کہی جا سکتی؛ دونوں صورتیں ہو سکتی ہیں۔ یہاں "کی" کو اِس لیے ترجیح دی گئی ہے کہ وہ روایتِ ثانی (یعنی نسخۂ ک) میں ہے۔ چوں کہ بہ طورِ عموم یہ طریقہ کار اختیار کیا گیا ہے کہ ک کے متن کو ترجیح دی جائے اور اِس طریق کار سے صرف اُس صورت میں انحراف روا رکھا گیا ہے جب کوئی فاش غلطی ہو یا قطعیت کے ساتھ اُس کے خلاف تعیّن کیا جا سکے [اور ایسا چند مقامات پر ہوا ہے اور اُن مقامات پر حاشیے میں نشان دہی کر دی گئی ہے اور اُس کی وجہ بھی بیان کر دی گئی ہے] چوں کہ یہاں اِن دونوں میں سے ایک بھی بات نہیں، یعنی نہ تو قطعیت کے ساتھ تعیّن کیا جا سکتا ہے اور نہ کسی صورت کو غلط کہا جا سکتا ہے [یعنی "کے ساتھ سنگت" بھی درست ہے اور "کی ساتھ سنگت" بھی

صحیح ہے] اِس لیے کؔ کی مطابقت اختیار کی گئی ہے اور "کی" کو برقرار رکھا گیا ہے۔ ۸؎ مؔ، نؔ: وہ بھی۔ ۹؎ مؔ، نؔ: ہو رہا۔ (۹) مؔ، کؔ، فؔ میں "اُسی" ہے، یعنی الف پر پیش لگا ہوا ہے۔ شاید یہ خیال کیا جائے کہ یہاں "اِسی" کا محل ہے، لیکن اگر اِس پر نظر رکھی جائے کہ میر امن کلکتے میں بیٹھے ہوئے یہ سطریں لکھ رہے ہیں، تب واضح ہو جائے گا کہ اشارۂ بعید یعنی "اُسی" کا محل ہے۔ اگلی سطر میں جو "اُس شہر" ہے، اُس کی بھی یہی صورت ہے۔ ۱۰؎ مؔ، نؔ میں "بھی" موجود نہیں۔
ص ۱۰ - ۱؎ کؔ کے متن میں یہی عنوان ہے (ص ۷)، مگر اس نسخے کے آخر میں جو "فہرست باغ و بہار کی" شامل ہے (ص ۱۵۲ پر) وہاں عنوان اِس طرح ملتا ہے: "شروع قصّے میں"۔ فؔ میں اِس مقام پر اور فہرست میں "شروع قصّے میں" ہے۔ عؔ میں فہرست تو ہے ہی نہیں، البتہ متن میں فؔ کے مطابق ہے۔ ہاں عؔ کے نیچے زیر موجود نہیں۔ مؔ اور نؔ میں یہ عنوان موجود نہیں، عبارت مسلسل ہے۔ مقررہ طریقِ کار کے مطابق کؔ کے متن کو ترجیح دی گئی ہے۔ ہاں کؔ میں "شروع" کے شین پر پیش موجود ہے، قاف کے نیچے زیر لگا ہوا ہے اور صاد پر تشدید بھی ہے۔ (۲) احتیاطاً یہ صراحت کی جاتی ہے کہ سب نسخوں میں اِسی طرح (یعنی اضافت کے بغیر) ہے۔ (۳) مؔ، کؔ، فؔ، عؔ میں اضافت کا زیر موجود ہے۔ ۲؎ مؔ، نؔ: اور چودہ چکار جیب کتروں صبح خیزیوں اُٹھائی گیروں دغابازوں کو نیست نابود کر کر۔ (۵) قواعدِ شاعری میں ایک ضابطہ یہ بھی ہے کہ نشان، جہان جیسے الفاظ جب بہ ترکیبِ فارسی آئیں، تو آخر کے نون کا اعلان نہ ہو، جیسے: بے نام و نشان، رسمِ جہان۔ اِس سلسلے میں دو اُمور پیشِ نظر رہنا چاہییں: پہلی بات تو یہ کہ اِس قاعدے کا تعلق اصلاً شاعری سے ہے، نثر میں اِس کی پابندی کا التزام شاعری کی طرح نہیں کیا گیا (اور نہ کیا جا سکتا ہے)۔ دوسری بات یہ ہے کہ عہدِ غالب تک شعراے دہلی نے شاعری میں بھی اِس قاعدے کی پوری طرح یعنی لازمی طور پر پابندی نہیں کی تھی۔ نثر کا احوال یہ رہا ہے کہ ایسے مواقع پر کہیں نون کا اعلان کیا جاتا ہے اور کہیں نہیں کیا جاتا۔ کؔ میں اِس کا التزام کیا گیا ہے کہ آخرِ لفظ میں اگر نونِ غنّہ ہو تو اُس پر نقطہ نہ لگایا جائے۔ اِس میں ایسے مقامات بھی ہیں جہاں ترکیبی صورت میں ایسے نون پر نقطہ نہیں لگایا گیا ہے اور ایسے مقامات بھی ہیں جہاں ایسی صورت میں نقطہ لگایا گیا ہے۔ غور کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ گفتگو میں عام طور پر ایسے مرکبات اگر بہ اخفاے نون مستعمل رہے ہیں، تو اُن میں نون پر نقطہ نہیں لگایا گیا ہے، اور اگر بول چال میں ایسے مرکبات مع اعلانِ نون آتے ہیں، تو پھر ایسے نون پر التزام کے ساتھ نقطہ لگایا گیا ہے۔ مؔ اور کؔ:

میں "نام ونشاں" ہے، یعنی آخری نون پر نقطہ رکھا گیا ہے۔ ف اور ع میں بھی اسی طرح ہے؛ اِس بنا پر ک کے مطابق اِس مرکب کو "نام ونشان" (مع اعلانِ نون) لکھا گیا ہے۔ اور ایسے دوسرے مقامات پر بھی اِسی طریقِ کار کی پابندی کی گئی ہے، یعنی ک کی مطابقت اختیار کی گئی ہے۔ ۶ہ م، ع: دکانیں [ک، ف، ن: دوکانیں]۔ ۷ہ ف: کئی (غلطیِ طباعت)۔ ۸ہ م: آرماں۔

ص ۱۱۔ ۱ہ ن میں "تیرے" نہیں۔ ۲ہ ع: جو خیال کرتے ہیں۔ ۳ہ ف: تاحق۔ ۴ہ ع: بربادکی۔ ۵ہ ف: اڑا دے گا۔ ۶ہ م، ن: ہماری۔ ۷ہ ف: عام۔ ۸ہ ف: مستقر۔ ۹ہ م، ن: جابیٹھا۔ ۱۰ہ م، ن: ہوا۔ ۱۱ہ م، ن، ک میں "کھاتے" موجود نہیں، ف میں موجود ہے۔ یہاں معنویت کی تکمیل کے لحاظ سے ف کے متن کو ترجیح دی گئی ہے۔

ص ۱۲۔ ۱ہ م، ن: پیتا۔ ۲ہ ف، ع: جاے نماز۔ ۳ہ م، ن: پڑا رہتا۔ ۴ہ ن: نشین۔ ۵ہ ف: حد۔ ۶ہ م، ن: عمدے۔ (۷) م اور ک میں اِس لفظ پر اعراب موجود نہیں، مگر ف میں قؔ پر جزم موجود ہے اور اُس کی فرہنگ میں بھی اِسے بہ سکونِ قاف لکھا گیا ہے۔ اصل کے لحاظ سے بھی اِسی طرح ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے ضمیمۂ تلفظ و املا میں لفظِ "عَقْل"۔ ۸ہ م، ن: جانے کو۔ ۹ہ ف: خاص۔ اِس سے پہلے سولھویں سطر میں "عام" آیا ہے، ف میں "عامّ" ہے۔ ۱۰ہ م، ن: کہلا بھیجا۔ (۱۱) م، ن، ک، ف میں "پیرغلام" ہے اور ع میں "پیرِ غلام" (مع اضافت) ہے۔ تھوڑی سی تاویل اور ذرا سے تکلف کے ساتھ "پیرِ غلام" کو صحیح تو ثابت کیا جا سکتا ہے، مگر "پیر غلام" انسب ہے، یعنی اِس میں اضافتِ مقلوب مانی جائے، کہ "غلامِ پیر" مقلوب ہو کر "پیر غلام" بن گیا۔ ک، ف، م میں اِس کا اضافت کے زیر کے بغیر ہونا اسی پر دلالت کرتا ہے۔ ک کی مطابقت اختیار کی گئی ہے۔

ص ۱۳۔ ۱ہ م: اکیلا بلاو۔ ۲ہ ع: عجیب۔ ۳ہ ع: کیجیے۔ ۴ہ م، ن: کردن۔ ۵ہ م، ک، ف، ع: بند اسے۔ (۶) ن، ک، ف، ع میں "سن وسال" ہے۔ م میں "سنّ وسال" ہے۔ ک کی مطابقت اختیار کی گئی ہے [صحیح اور مستعمل دونوں طرح ہے]۔

ص ۱۴۔ ۱ہ ف: یہ۔ ع: یہ۔ ن: یہہ۔ ۲ہ م: ہر ژدہ۔ ن: ہیرزدہ۔ ۳ہ ن میں "یہ" نہیں۔ ۴ہ ف: ذرّہ۔ ک، م، ن: ذرہ۔ ع: ذرا۔ ۵ہ م، ن: اور خواہ نخواستہ۔ ۶ہ ع: نہ آئے گی۔

ص ۱۵۔ ۱ہ م، ن: پوچھا جاوے گا۔ ۲ہ ع: اپنی جوگا۔ (۳) م میں اِس کے بعد ہندی

رسمِ خط میں " बैत " لکھا ہوا ہے۔ ن میں اِس کی جگہ اُردو رسمِ خط میں "بیت" مرقوم ہے۔ جہاں تک اِس شعر کا تعلق ہے، تو میرا خیال ہے کہ یہ خود میر امّن کا ہے۔ ۷ ع : کیجیے۔ ۸ ن : تہیں ہا ہے۔ ۱ ف : فرمایں۔ ع : فرمائیں۔ ۷ م، ع : امن وامان (ک، ف، ن : امن وآمان)۔ [فیلن کے لغت میں "امن وآمان" موجود ہے۔] ۸ م : کیجے۔ ⑨ اِس ٹکڑے کو دو طرح پڑھا جا سکتا ہے : ① درویشِ گوشہ نشین، متوکّلوں سے ② درویش، گوشہ نشین متوکّلوں سے۔ پہلی صورت میں "گوشہ نشین" صفت ہے "درویش" کی، اور دوسری صورت میں "گوشہ نشین" صفت ہوگی "متوکّلوں" کی۔ دونوں صورتوں میں کوئی ایسا معنوی فرق واقع نہیں ہوتا جو قابلِ لحاظ ہو۔ نیز جملے کی ترکیب کے لحاظ سے یا یوں کہیے کہ بہ لحاظِ قواعد دونوں صورتیں بجائے خود درست ہیں۔ ع میں "درویش" کے شین کے نیچے اضافت کا زیر موجود نہیں، اور اس سے بہ ظاہر یہ خیال ہوتا ہے کہ مولوی عبدالحق مرحوم نے "گوشہ نشین" کو "متوکّلوں" سے متعلق مانا ہے۔ اِس کے برخلاف م، ک اور ف، تینوں نسخوں میں "درویش" کے شین کے نیچے اضافت کا زیر لگا ہوا ہے۔ اصل کی پابندی کے خیال سے اِسی صورت کو برقرار رکھا گیا ہے۔ یہ صراحت بھی ضروری ہے کہ م، ک، ف، ع میں "نشین" ہی ہے، یعنی آخری نون پر نقطہ موجود ہے۔ ایسی ہی ترکیب آگے چل کر ص ۸۰ پر بھی آئی ہے : "کسی مردِ خدا گوشہ نشین کی خدمت میں جایا کروں" اور وہاں بھی مذکورۂ بالا سبھی نسخوں میں "نشین" ہے، دونوں جگہ ک کی مطابقت اختیار کی گئی ہے۔ ۱۰ م، ن : روز راتب غریب غربا عیال داروں اور یتیم اسیر محتاجوں اور بیوؤں (ن : بیوؤں) کو کر دیجے۔ (ن : کر دیجیے)۔ ⑪ اِس جملے میں لفظِ "امّید" کو مع اضافت بھی پڑھا جا سکتا ہے اور بغیرِ اضافت بھی۔ م، ن اور ع میں یہ لفظ اضافت کے زیر کے بغیر ہے، لیکن ک اور ف میں دال کے نیچے اضافت کا زیر لگا ہوا ہے۔ ک میں ص ۱۰۲ پر بھی "امّیدِ قوی" ہے، یعنی اضافت کا زیر وہاں بھی لگا ہوا ہے۔ یہی صورت ف کی ہے اور اِس سے ترجیح کا تعیّن کیا جا سکتا ہے۔ نسخۂ ک میں ایسے مرکّبات کے پہلے جز عموماً مع اضافت ملتے ہیں، یعنی اضافت کا زیر لگایا گیا ہے، مثلاً : شبِ برات ۵۱، ۵۹۔ اسمِ شریف ۱۷۔ شاہِ عالم ۸۔ صاحبِ جمال ۲۹۔ تنِ تنہا ۴۴، ۷۶۔ میرِ عمارت ۶۸۔ نوشِ جاں ۱۳، ۸۹، ۹۰، ۱۰۴۔ اِنھی وجوہ سے زیرِ بحث جملے میں لفظِ "امّید" کو ک اور ف کے مطابق مع اضافت برقرار رکھا گیا ہے۔ ۱۲ ف : قوی۔

(۱۴) ع میں "وزیر کے عرض معروض کرنے سے" ہے۔ اگر ہم اپنے زمانے پر نظر رکھیں تو یہی مرجّح معلوم ہوگا، مگر میں نے ک کی مطابقت اختیار کی ہے۔ اِس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ آج قطعیت کے ساتھ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ طرزِ بیان اُس زمانے میں نہیں تھا، یا یہ کہ میر امّن کا یہ انداز نہیں تھا۔ میر امّن کی عبارتوں میں جگہ جگہ ایسے جملے ملتے ہیں جو آج اجنبی معلوم ہوتے ہیں۔ محض قیاس کی بنیاد پر کسی پرانے جملے کو بدل دینا احتیاط کے منافی ہے۔ یہ بڑی ذمّے داری ہے اور اسے آسانی کے ساتھ قبول نہیں کیا جا سکتا۔ دوسری بات یہ ہے م (اور ت) میں یہ جملہ یوں ہے: "بارے ایسی ایسی عرض معروض کرنے سے خردمند وزیر کی آزادبخت کے دل کو ڈھارس بندھی"۔ یعنی پہلے میر امّن نے اُس جملے کو اِس طرح لکھا تھا اور اِس جملے میں بھی "وزیر کی" موجود ہے، اور اِس سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ میر امّن نے یہاں "کی" ہی لکھا ہے۔ اِنھی وجوہ سے ک کی مطابقت اختیار کی گئی ہے اور جملے کو علیٰ حالہ رکھا گیا ہے۔ [۴۱] ف: ڈھارس۔ [مفصّل نوٹ ص ۲۳۷ کے حاشیہ ۹ کے ذیل میں لکھا گیا ہے]

ص ۱۹۱۔ (۱) ک میں اِسی طرح یعنی "کے جان و مال" ہے۔ اِس کے برخلاف ن اور م میں "قبلۂ عالم کی جان و مال" ہے۔ ع میں ک کے مطابق ہے۔ یہ مرکّب ص ۴۵ پر بھی آیا ہے: "آپ کے جان و مال کو دعا کرتا ہوں"۔ ک میں اِسی طرح ہے، مگر یہاں بھی م اور ن میں "کی جان و مال" ہے اور ع میں بھی یہاں "کی" ہے۔ یہ مرکّب ص ۲۰۱ پر بھی آیا ہے: "غلام کا جان و مال اگر سرکار کے کام آوے"۔ پھر ص ۲۲۵ پر بھی ملتا ہے: "تمھارے جان و مال کو دعا دیں"۔ اور اِن دونوں مقامات پر ن اور ع میں ک کے مطابق ہے۔ حُسنِ اتّفاق سے گنجِ خوبی میں یہ مرکّب موجود ہے اور وہاں بھی بہ تذکیر ملتا ہے: (۱) "اُن کا جان و مال" (مخطوطۂ گنجِ خوبی ص ۸۱) (۲) "اپنے جان و مال سے دریغ نہ کریں" (ایضاً ص ۸۳) اور اِس طرح یہ قطعی طور پر متعیّن ہو جاتا ہے کہ میر امّن نے اِس مرکّب کو بہ تذکیر لکھا ہے۔ م (اور ن) میں جو اِس مقام پر "کی" ہے (قبلۂ عالم کی جان و مال) اُس کے متعلّق یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ طباعت کی تبدیلی تھی، جس کو ک میں (نظرِ ثانی کرتے وقت) درست کر دیا گیا۔ اِس سلسلے میں یہ لکھنا بھی فائدے سے خالی نہ ہوگا کہ اِسی قبیل کا ایک اور مرکّب "جان و ایمان" بھی ک میں ص ۱۲۲ پر بہ تذکیر ملتا ہے: "میں نے کہا: تمھارے جان و ایمان کے قربان ہوا" (قصّۂ خواجۂ سگ پرست) اور اِس سے "جان و مال" کے مذکّر ہونے کی مزید توثیق ہوتی ہے۔ طلبہ کے فائدے کے لیے اِس مقام پر جلالؔ کا ایک قول نقل کیا جاتا ہے، جس سے

ایسے مرکبات سے متعلق صورتِ حال سامنے آجائے گی: "فائدہ۔ جو دو لفظ کہ معاً بولے جاتے ہیں، حرفِ عطف اُن کے درمیان ہو یا نہ ہو؛ یا باہم تذکیر و تانیث میں اختلاف رکھتے ہوں گے یا اتفاق۔ پس اگر مختلف ہیں، تو کبھی بہ رعایتِ تذکیر و تانیث جزوِ دوم کے مذکر یا مونث استعمال پاتے ہیں، مثلاً: آب و ہوا، آب و غذا، نشو و نما، چرخ پوجا، آب و گل، قلم و دوات کو مونث بولیں گے۔ نان و نمک، کشت و خون، تخت و تاج، دوات قلم کو مذکر استعمال کریں گے" (مقدمۂ مفید الشعراء)۔ اِس قول میں کئی مثالیں بحث طلب ہیں، یہاں اُن سے قطعِ نظر کرتے ہوئے اِس طرف توجہ دلانا ہے کہ ایسے مرکبات جن کا ایک جز مذکر ہو اور دوسرا مونث، یا اِس کے برعکس، اُن کی تذکیر و تانیث گویا سماعی ہے، کوئی اصول اور قاعدہ نہیں۔ جو مرکب جس طرح مستعمل ہوتا ہو اُسی طرح ٹھیک ہے۔ چوں کہ میر امّن نے گنجِ خوبی میں "جان و مال" کو بہ تذکیر استعمال کیا ہے، اِس لیے میر امّن کی تحریر میں اِس مرکب کو بہ تذکیر ہی مانا جائے گا۔ ؁ "آپ کی فکر ... ہو رہے ہیں" یہ جملہ ن میں نہیں۔ ؁ ف: عام۔ ④ سب نسخوں میں "آسمان" ہے، یعنی آخری نون پر نقطہ موجود ہے۔ اِس کی بحث اِس سے پہلے اِسی ضمیمے میں ص۔ ا کے حواشی میں آچکی ہے۔ ہاں اِس سے پہلے تیسری سطر میں "حیران و پریشان" میں بھی ک میں آخری نون پر نقطہ موجود ہے۔ دونوں جگہ ک کی مطابقت اختیار کی گئی ہے۔ ؁ م، ن: خوش خوش۔ ؁ ف، ع: آنند۔ [م، ن، ک: انند]

⑦ م، ن اور ک میں اسی طرح ہے، مگر ع میں "مگن ہوئی" ہے۔ "رعیت" اور "پرجا" دونوں لفظ مونث ہیں، اِس لحاظ سے یہ خیال کیا جا سکتا ہے کہ یہاں "مگن ہوئی" ہونا چاہیے (جیسا کہ ع میں ہے) لیکن میں نے یہاں متن کو م اور ک کے مطابق ہی رکھا ہے اور اِسی کو مرجح سمجھا ہے اور اِس کی وجہ یہ ہے کہ میر امّن کے یہاں بیان کا یہ انداز اور مقامات پر بھی پایا جاتا ہے: وہ ایسے مواقع پر کوئی لفظ مثلاً "لوگ" مقدر فرض کر لیتے ہیں اور اُس کی رعایت سے فعل جمع لاتے ہیں۔ اِس کی کئی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں مثلاً: (۱) "سب قوم قدر دانی اور فیض رسانی اس خاندانِ لاثانی کی سن کر حضور میں آکر جمع ہوئے" [ص ۸] ("سب قوم جمع ہوئے" مطلب وہی ہے کہ سب قوموں کے لوگ جمع ہوئے) (۲) "رعیت بھی اس کام میں رغبت اور دل دہی کریں" (گنجِ خوبی) یعنی رعیت کے لوگ رغبت اور دل دہی کریں۔ ؁ ف: عام۔ ⑨ اِس ٹکڑے کو اضافت کے بغیر بھی پڑھا جا سکتا ہے اور مع اضافت بھی۔ بہ لحاظِ معنویت اور بہ اعتبارِ قواعد دونوں طرح درست ہے۔ م، ن، ک،

ف اور ع : سبھی نسخوں میں پہلا ٹکڑا اضافت کے زیر کے بغیر لکھا ہوا ہے (سب خانہ زاد اعلا ادنا) اور اسے اسی طرح برقرار رکھا گیا ہے۔ یہاں پر کسی طالبِ علم کے ذہن میں ایک یہ بات آسکتی ہے کہ اس کے ساتھ کے دوسرے ٹکڑے میں تو اضافت موجود ہے : "ارکانِ دولت چھوٹے بڑے"۔ مگر غور کرنے پر یہ بات سامنے آجائے گی کہ اس ٹکڑے میں اضافت جس طرح آئی ہے، اس سے پہلے ٹکڑے سے متعلق اضافت پر استدلال نہیں کیا جاسکتا۔ "ارکانِ دولت" اور "خانہ زاد" متقابل اجزا ہوئے، اسی طرح "چھوٹے بڑے" اور "اعلا ادنا"۔ "ارکانِ دولت" اور "خانہ زاد" دونوں مرکب ہیں (طریقۂ ترکیب مختلف ہے)۔ جس طرح "اعلا ادنا" میں ترکیبی صورت نہیں، اسی طرح "چھوٹے بڑے" میں ترکیبی صورت نہیں، اور اس طرح صحیح معنی میں تقابل برقرار رہتا ہے۔ اور یہ لحاظِ اندازِ بیان جملے کا حسن بھی، اسی لیے ک (اور م) کی مطابقت اختیار کی گئی ہے۔ ۱۰ھ م، ن : شادیانے کے ٹکورے۔ ۱۱ھ م، ن : مبارک باد کی۔ ۱۲ھ م، ن : اندرون محل کے۔ ف : محل۔ ۱۳ھ ف : خاصہ۔

ص ۱۷۔ ۱ھ ن میں "یا" نہیں۔ ۲ھ ف، ع : دتیوی۔ ۳ھ ن میں یہاں پر "بیت" لکھا ہوا ہے۔ (۴) ڈاکٹر حنیف نقوی (شعبۂ اردو بنارس ہندو یونی ورسٹی) نے میرے نام خط میں لکھا ہے : "جس دوہے کے بارے میں آپ نے دریافت فرمایا تھا، وہ ڈاکٹر جمیلہ جعفری صاحبہ ریڈر شعبۂ ہندی بنارس ہندو یونی ورسٹی کی فراہم کردہ اطلاع کے مطابق کبیر ہی کا ہے، اور ڈاکٹر رام چندر شکل کی مرتبہ کبیر گرنتھ ولی میں موجود ہے۔ اس گرنتھ ولی کے مطابق اس کا متن حسبِ ذیل ہے : چلتی چکی دیکھ کے دیا کبیرا روئے ؛ دو پٹ بھیتر آئے کے ثابت بچا نہ کوئے"۔ ۵ھ م، ن : یہ۔ ۶ھ م، ن : یہ۔

ص ۱۸۔ (۱) صرف یہ صراحت کرنا ہے کہ ک میں "نشین" کے آخری نون پر نقطہ موجود ہے۔ ۲ھ م، ن : وسیلوں سے۔ ۳ھ م، ن : موٹا چھوٹا کپڑا۔ ع : موٹے چھوٹے کپڑے پہن کر اشرفی روپے لے کر۔ ۴ھ م، ن : پہنچا۔ ۵ھ م، ن : پڑھ رہا تھا۔ ۶ھ م، ن میں "اور" نہیں۔ ۷ھ ع : نیت۔ ۸ھ م، ن : چلا۔ ۹ھ م، ن : پہنچا۔ ۱۰ھ م، ن : اسی طرح یہ چار دن۔ (۱۱) م اور ک میں اسی طرح ہے، ف اور ع میں "ٹمٹما" ہے۔ اس میں شک نہیں کہ مصدر "ٹمٹمانا" کے دونوں ٹکڑوں کو (اپنے اور مصدروں کی طرح) ملا کر ہی لکھا جاتا ہے، مگر میں نے یہاں یہی مناسب خیال کیا کہ اس لفظ کے م اور ک کے پرانے املا کو برقرار رکھا جائے، کہ یہ ایک خاص طریقِ نگارش کی نشان دہی کرتا ہے، اسی بنا پر اس لفظ کے اجزا کو الگ الگ لکھا گیا ہے۔

ص ۱۹ - (۱) سب نسخوں میں اِسی طرح ہے۔ لفظِ "فانوس" مختلف فیہ رہا ہے [اگرچہ اب اِسے بالعموم بہ تذکیر استعمال کیا جاتا ہے] آصفیہ میں اِسے صرف مذکر لکھا گیا ہے، البتہ نور میں مذکر لکھ کر یہ بھی لکھا گیا ہے کہ: "برق نے خلافِ جمہور مونث کہا ہے: کیا تجلی ہیں کہوں (اُس) ساعدِ پُر نور کی ؛ آستینِ یار ہے فانوس شمعِ طور کی"۔ مولفِ نور کا یہ لکھنا کہ برق نے "خلافِ جمہور مونث کہا ہے" درست نہیں۔ اربابِ لکھنؤ میں سے جلال بھی اِس کی تانیث کے قائل تھے۔ اُنھوں نے اپنے رسالۂ تذکیر و تانیث مفید الشعرا میں اِسے صرف مونث لکھا ہے۔ صاحبِ آصفیہ نے اگرچہ اِسے صرف مذکر لکھا ہے، مگر میر امن نے اِس لفظ کو بہ تانیث استعمال کیا ہے۔ اور اِس سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ لکھنؤ کی طرح دلی میں بھی یہ لفظ مختلف فیہ رہا ہے۔ اِس کتاب میں ایک اور مقام پر بھی یہ لفظ آیا ہے: "طلائی شمع دانوں پر کافوری شمعیں چڑھی ہیں اور جھاڑ فانوسیں اوپر دھری ہیں" [باغ و بہار ص ۳۶] ۲ م: بے خطرہ۔ ن: بے خطر۔ ۳ ن: برکت۔ (۴) م، ک، ف، ع: سبھی نسخوں میں اِس مقام پر "وہیں" ہے۔ ک میں جو غلط نامہ شامل ہے، اُس میں اِس کی تصحیح بھی نہیں کی گئی ہے۔ ک میں ص ۳۰، ص ۳۳، ص ۴۱ پر بھی "وہیں" چھپا ہوا ہے، مگر غلط نامے میں اِن سب مقامات پر "وہیں" کو غلط بتایا گیا ہے اور اِس کی جگہ "وونہیں" لکھنے کی ہدایت کی گئی ہے۔ اِسی طرح ک میں ص ۴۰ پر "وہیں" چھپا ہوا ہے۔ غلط نامے میں اِس کی تصحیح کی گئی ہے اور یہاں بھی "وونہیں" کو صحیح لکھا گیا ہے۔ اِس اعتبار سے تو یہاں بھی یہ فرض کر لینا چاہیے تھا کہ یہاں کسی فروگذاشت کی بنا پر "وہیں" شاملِ غلط نامہ ہونے سے رہ گیا ہے، اور یوں یہاں بھی "وونہیں" لکھنا چاہیے، مگر میں نے یہاں اِس قیاس کو دخل نہیں دینے دیا اور "وہیں" کو برقرار رکھا ہے۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ ایک تو سبھی نسخوں میں یہاں "وہیں" ہے لیکن اصل بات یہ ہے کہ مخطوطۂ گنج خوبی میں ایک جگہ میر امن نے اپنے قلم سے (اِسی معنی میں) "وہیں" لکھا ہے (ص ۹۳) اور اِس سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ اِس لفظ کی یہ صورت بھی بجائے خود صحیح ہے، یعنی "وہیں" اور "وونہیں" دونوں لفظ بجائے خود درست ہیں اور یہ کہ میر امن نے جہاں اپنے قلم سے "وونہیں" لکھا ہے، وہاں "وہیں" بھی لکھا ہے اور اِس طرح یہ اختلافِ املا دراصل اختلافِ تلفظ کو ظاہر کرتا ہے۔ اِس بنا پر یہاں اِسی شکل کو برقرار رکھا گیا ہے۔ ۵ م، ک، ن: ذرہ۔ ف: ذرّہ۔ ع: ذرا۔ (۶) سب

نسخوں میں جملہ اسی طرح ہے، یوں اِس جملے کو اسی طرح برقرار رکھا گیا ہے، مگر طلبہ کے فائدے کے لیے اِس سلسلے میں کچھ وضاحت ضروری ہے۔ "نا" جو علامتِ مصدری کے طور پر آتا ہے، اُس میں یہ اختلاف ہے کہ ایک گروہ تو یہ کہتا ہے کہ اُس کے ساتھ اسم مذکر ہو یا مونث، علامتِ مصدر کسی حال میں تبدیل نہیں ہوگی۔ دوسرا گروہ یہ کہتا ہے کہ اسم اگر مذکر ہے تو "نا" برقرار رہے گا (جیسے: پانی پینا) اور اگر اسم مونث ہے تو پھر "نی" کہا جائے گا (جیسے: روٹی کھانی)۔ میر امّن کی تحریروں میں دوسرے قول کی پابندی ملتی ہے، یعنی انھوں نے مذکر اسم کے ساتھ "نا" اور مونث اسم کے ساتھ "نی" لکھا ہے۔ باغ و بہار اور گنجِ خوبی دونوں میں یہی صورت پائی جاتی ہے، مثلاً: مصلحت کرنی (مخطوطۂ گنجِ خوبی ص ۱۴۳) تابع ہونا اور پیروی کرنی (ایضاً ص ۱۲) اولاد دینی (باغ و بہار ص ۸) وظیفہ پڑھنا (ایضاً ص ۱۷) دربار کرنا (ایضاً ص ۱۶) دعا مانگنی (ایضاً ص ۱۷) مگر زیرِ بحث جملے میں یہ صورت برقرار نہیں رہی ہے، کیوں کہ اِس اصول کے تحت "جلدی کرنی" ہونا چاہیے تھا۔ چوں کہ سبھی نسخوں میں "جلدی کرنا" ہے، اِس لیے اسی کو برقرار رکھا گیا ہے۔ ۷ہ ف: محل۔ ۸ہ ع: جاننا چاہیے۔ ۹ہ ف: تہار۔ ۱۰ہ م، ن: پھرے۔ ۱۱ہ ن میں "کہ" نہیں۔

ص ۲۰۔ ۱ہ م، ن: اُس کے اوپر۔ ۲ہ م، ک، ف: سبہوں۔ ن، ع: سبھوں مستعمل لفظ مع ہائے مخلوط ہی ہے، اِسی بنا پر ن اور ع کے املا کو ترجیح دی گئی ہے۔ ۳ہ ن، ک، ف، ع: سب نسخوں میں یہی عنوان ہے، م میں بھی الفاظ یہی ہیں، مگر اُس میں عنوان کی عبارت ہندی رسمِ خط میں لکھی ہوئی ہے۔ ک میں اِس مقام پر تو یہی عبارت ہے، مگر کتاب کے آخر میں ص ۲۵۱ پر جو "فہرست باغ و بہار کی" شامل ہے، اُس میں اِس عنوان کی عبارت یوں ملتی ہے: "پہلے درویش کی سیر میں"۔ درجِ متن عبارت کو اختیار کیا گیا ہے۔ ۴ہ م، ن، ک: ذرہ۔ ف: ذرّہ۔ ع: زرا۔ ۵ہ م، ن: ایدھر۔ ۶ہ م، ن، ک: ذرہ۔ ف: ذرّہ۔ ع: زرا۔ ۷ہ م، ن میں "یا" نہیں۔ ۸ہ ن: تھے۔ ۹ہ ف: حضور ہی ہیں۔ ع: مرشدوں کے حضور ہی میں۔ (۱۰) سب نسخوں میں "کو" ہے۔ اگر ہم اپنے زمانے کو نظر میں رکھیں تو یہ خیال ذہن میں آئے گا کہ یہاں "کی" کا محل ہے۔ میر امّن کی نثر میں ایسے بہت سے جملے ملتے ہیں جن کا انداز آج بالکل اجنبی معلوم ہوتا ہے اور عام آدمی یہ خیال کر سکتا ہے کہ یہاں شاید کسی طرح کی غلطی راہ پا گئی ہے۔ چوں کہ ایسے جملوں کی تعداد کم نہیں، اِس لیے یہ بات تقاضائے احتیاط کے بالکل خلاف ہوگی (اور اصولِ تدوین کے بھی

خلاف ہوگی) کہ ایسے مقامات پر کسی بھی طرح کی تبدیلی کو روا رکھا جائے۔ اسی بنا پر یہاں بھی "کو" کو
برقرار رکھا گیا ہے۔ [اِس جملے سے ملتا جلتا یہ جملہ بھی ہے جو اِسی بیان کے سلسلے میں ص ۱۴ پر اٹھارویں
سطر میں آیا ہے: "دیوان خانے کی تیاری کو حکم کیا۔"] یہ دراصل قواعدِ زبان کا مسئلہ ہے۔ یہ لازم
ہے کہ پرانے متون میں ایسے جملہ مقامات پر قطعی طور پر اصل کی مطابقت اختیار کی جائے۔

ص ۲۱۔ (۱) صرف احتیاطاً یہ صراحت کی جاتی ہے کہ سب نسخوں میں اِسی طرح (دلاڈ) ہے۔
۲؎ ف: غم۔ ۳؎ ع: گزرے۔ ۴؎ ف: قضای الٰہی۔ ۵؎ م، ن: یتیم و اسیر ہوگیا۔ ۶؎
م، ن: ہاتھوں سے۔ ۷؎ ن، ع: ماں باپ۔ ۸؎ م، ن: بس۔ ۹؎ ع: ہوشیار۔
۱۰؎ ف، ع: دے۔ ۱۱؎ ع: کوٹھی نقد و جنس کی۔ ۱۲؎ ف، ع، ن: لیجیے۔ ۱۳؎ م،
ن: حکم دیا۔

ص ۲۲۔ (۱) ف میں "خدمت گار" کی ت کے نیچے اضافت کا زیر لگا ہوا ہے (خدمتِ گار
دیدار و) کسی اور نسخے میں یہ زیر موجود نہیں۔ حسنِ بیان کا تقاضا یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہاں اضافت
کا زیر نہ ہو، اِسی بنا پر ک کی مطابقت اختیار کی گئی ہے۔ ۲؎ ف: تکیہ۔ ۳؎ ع: جھانکڑے
[متن میں یہ کتابت کی غلطی ہے، کیوں کہ اِس نسخے کی فرہنگ میں "جھانکڑے" ہی ہے۔]
۴؎ م: ادھر اودھر۔ ۵؎ ن: بھٹک گیا۔ ۶؎ ک، ف: آیا۔ م، ن، ع: آتا۔ اِس مقام
پر الفاظ اور معنی کی مناسبت اِس کی متقاضی معلوم ہوتی ہے کہ "خرچ ہوتا ہے" کے مقابل "آتا ہے"
ہو، اِسی بنا پر یہاں م اور ن کے متن کو ترجیح دی گئی ہے۔ ۷؎ ف، ع: دوست آشنا۔ ۸؎
ف: خاص۔ ۹؎ م، ن: جز چھانک کر۔

ص ۲۳۔ ۱؎ ف، ع: کیا کہ۔ ۲؎ م، ن: قبلہ گاہ کی بعد وفات کے۔ ۳؎ ف: خدا۔
۴؎ ع میں "دو ایک" موجود نہیں۔ ۵؎ ف: خدا۔ ۶؎ ف: جوں توں۔ ۷؎ ع: بلائیں لی۔
۸؎ ف: خاصی۔ ۹؎ م، ن: اور پھل پھلا رہی۔

ص ۲۴۔ (۱) م، ک، ف میں میم کے نیچے زیر موجود ہے۔ پلیٹس کے لغت میں بھی اسی طرح مندرج
ہے۔ ۲؎ ف، ع: خصوصاً۔ ۳؎ ع: ماں باپ۔ ۴؎ ف، ع: حیرانی و مفلسی۔ ۵؎ ن، ع: ماں۔
۶؎ م، ن: جا کر۔ ۷؎ ف، ع میں "اور" نہیں۔ ۸؎ ن: لیا کر۔ ۹؎ م، ن: قافلہ۔ ۱۰؎ ع:
دونوں سے۔ (۱۱) ف میں "تا بجز ایمان دار" ہے، مگر ک میں اضافت کا زیر موجود نہیں۔ قواعد کے

لحاظ سے مرجح صورت وہ ہے جو ف میں ہے، مگر میں نے ک کی مطابقت کو ترجیح دی ہے اور اُس کی ایک وجہ یہ ہے کہ ایسے ٹکڑے جو اصلاً مع ترکیبِ اضافی ہیں، اِس کتاب میں اضافت کے بغیر بھی ملتے ہیں۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ م اور ن میں یہاں "تجار ایمان دار" ہے اور لفظِ "تجار" اضافت کے زیر کے بغیر ہی ہے؛ اِس سے واضح طور پر "تاجر ایمان دار" کی ترجیح کا پہلو نکلتا ہے۔

۱۲ ع : لیجیو۔ ۱۳ ن : بیچیو۔ ک، ف : بیچیئو۔ [ع : بیچیو] ۔ ۱۴ ع : نوشت دخواند۔

۱۵ م، ن : وہ تجار۔

ص ۴۵ ۔ ۱ ع : سری پاو۔ ۲ م : میں نے بھی۔ ۳ ن : دمشق کے جا پہنچا۔ ۴ ع : کہ مسافر ہوں۔ ۵ ن : کیواڑ۔ ۶ ع : گھڑک کر۔ ۷ م : ایدھر اُدھر۔ ۸ م : آدھی رات ایدھر اور آدھی رات ایدھر ہوئی (کذا)۔ ۹ ع : حیرانی و پریشانی پر۔ م، ن : حیرانی سرگردانی پر۔

(۱۰) ک اور ف دونوں نسخوں میں "خزانۂ غیب" ہے (خزانۂ غیب سے عنایت کیا)۔ اِس کے برخلاف م، ن، ع میں "خزانہ غیب سے عنایت کیا" ہے۔ "خزانۂ غیب" کا تاویل کے ساتھ مطلب تو نکالا جا سکتا ہے، اِس طور پر کہ اِس جملے میں لفظِ "صندوق" کو مقدر فرض کر لیا جائے [یعنی خزانۂ غیب سے یہ صندوق عنایت کیا] لیکن یہ تاویل ذرا دور کی بات معلوم ہوتی ہے۔ م، ن اور ع میں اضافت کا ہمزہ موجود نہیں اور یہ صورت بہ لحاظِ حُسنِ بیان اور بہ اعتبارِ لطفِ معنی بہتر معلوم ہوتی ہے اور غیر ضروری تاویل کی ضرورت بھی باقی نہیں رہتی اور روزمرّہ کا لطف بھی اِسی انداز میں نمایاں ہے؛ اِس بنا پر اِس جملے کو م کے مطابق اضافت کے بغیر مرجح سمجھا گیا ہے۔ ۱۱ ن میں "اُسے" نہیں۔ (۱۲) ک اور ف دونوں میں "معشوقِ خوب صورت" ہے۔ م اور ع میں اضافت کے بغیر "معشوق خوب صورت" ہے۔ معناً دونوں طرح درست ہے اور بہ لحاظِ حُسنِ بیان بھی دونوں صورتیں قریب قریب یکساں معلوم ہوتی ہیں۔ (ہاں یہ ضرور ہے کہ لفظِ "معشوق" کو اگر اضافت کے بغیر پڑھا جائے تو یہ صورت نسبتاً بہتر معلوم ہوگی)۔ چوں کہ بہ لحاظِ معنی اور بہ لحاظِ حُسنِ عبارت دونوں صورتیں برابر سرابر ہی ہیں؛ اِس لیے اِس مقام پر ک کی پابندی کی گئی ہے اور "معشوقِ خوب صورت" لکھا گیا ہے۔

ص ۴۶ = (۱) اِس عبارت میں لفظِ "کم بخت" اور "ظالم" کو مع اضافت بھی پڑھا جا سکتا ہے اور بغیرِ اضافت بھی۔ قواعد کے لحاظ سے دونوں صورتیں یکساں ہوں گی اور معناً بھی کوئی فرق پیدا نہیں ہوگا

اور یہی صورت حسنِ بیان کی ہے۔ ک، ف، ع : تینوں نسخوں میں اِن دونوں لفظوں کے نیچے اضافت کے زیر لگے ہوئے ہیں ؛ اِسی کی پابندی کی گئی ہے۔ ترجیح کے لیے ایک قرینہ بھی موجود ہے : پہلے ٹکڑے "اے کم بخت بے وفا" کو تو بہ آسانی دونوں طرح (یعنی مع اضافت و بغیرِ اضافت) پڑھا جا سکتا ہے اور دونوں صورتیں یکساں معلوم ہوں گی، مگر دوسرے ٹکڑے "ظالم پُرجفا" کی صورت اِس سے ذرا سی مختلف معلوم ہوتی ہے۔ "اے ظالم" تو ٹھیک ہے، مگر "اے پرجفا" بہ ظاہر اجنبی معلوم ہوتا ہے۔ اِس طرح استعمال میں آتا نہیں۔ اِسے اگر "ظالم" کی صفت کے طور پر پڑھا جائے، تب بہتر معلوم ہوگا اور معنویت نمایاں ہوگی، اور اِس لحاظ سے "ظالمِ پُرجفا" مرجّح قرار پائے گا۔ جب ایک ٹکڑے میں اضافت کی ترجیح واضح ہوگئی تو پھر محض حُسنِ بیان اور تناسبِ بیان کے اعتبار سے دوسرے ٹکڑے کو بھی مع اضافت پڑھنا بہتر ہوگا۔ ۵۳ ع، ف : کسی۔ ۵۴ ن : میں آپ سے یہ کہہ رہا تھا۔ ۵۵ سب نسخوں میں اِسی طرح ہے۔ ۵۶ م، ن، ک، ف : گئے لگا۔ ۵۷ ع : بہ مقدورِ اپنی۔

ص ۲۷۔ (۱) م میں اضافت موجود نہیں، مگر ک، ف اور ع میں "مکانِ خوش قطع" ہے؛ لیکن حُسنِ عبارت کا تقاضا یہاں یہ معلوم ہوتا ہے کہ لفظ "مکان" کو اضافت کے بغیر ہونا چاہیے۔ اگر یہاں صرف ایک صفت ہوتی، یعنی صرف "ایک مکانِ خوش قطع" ہوتا، تب تو لازماً "مکان" مع اضافت آتا؛ لیکن اِس جملے میں مکان کی تین صفتیں ہیں : خوش قطع، نیا، فراغت کا؛ اور آخری دونوں صفتیں اضافت کے بغیر ہی آسکتی ہیں اور آئی ہیں ؛ یوں اندازِ بیان کا تقاضا یہی معلوم ہوتا ہے کہ اِن سب صفتوں کو ایک انداز سے آنا چاہیے اور اِس صورت میں "ایک مکان خوش قطع، نیا، فراغت کا" واضح طور پر مرجّح معلوم ہوگا؛ اِسی بنا پر یہاں م کی مطابقت اختیار کی گئی ہے۔ "خوش قطع" میں لفظ "قطع" پر ک اور ف میں اعراب موجود نہیں، البتّہ ف کی فرہنگ میں "قَطَع" ہے۔ اصلاً "قَطْع" (بہ فتحِ اوّل و سکونِ دوم) ہے، مگر اُردو کا احوال یہ ہے کہ عام طور پر زبانوں پر "قَطَع" آتا ہے۔ "وضع قطع" کو بھی اُردو والے عموماً ضاد اور ط کے زبر کے ساتھ بولتے ہیں (جب کہ اصلاً "وَضْع قَطْع" ہے)۔ ع میں تے طا پر نہ زبر لگایا ہے نہ جزم۔ اِسے اگر کوئی صاحب "خوش قَطْع" پڑھیں گے تو یہ بہ لحاظِ اصل درست ہوگا، اور جو لوگ "خوش قَطَع" پڑھیں گے تو وہ گویا استعمالِ عام کی مطابقت اختیار کریں گے اور یوں بھی یہ صحیح ہوگا۔ ۲ ف : فن۔ ۳ ک اور ع میں دونوں جگہ "پکّا" ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ طباعت اور کتابت کی غلطی ہے۔ م اور ف میں پہلے ٹکڑے میں "پکّا" ہے اور یہی درست ہے۔ اور ہاں، م اور

ف میں "یکّا" (یعنی آخر میں الف) ہے: اِس لفظ کا صحیح املا "یکّہ" ہے اور اِسی طرح مستعمل ہے (مثلاً: یکّہ و تنہا)۔ اِسی بنا پر یہاں "یکّہ" لکھا گیا ہے۔ ۴ھ ع: بیٹھا۔ ۵ھ ن: رہتے تھے۔ ۶ھ ع: بہ سبب محبت ساتھ لیا۔ ۷ھ م: تھوڑی دور۔ ۸ھ ع: کہ۔ ۹ھ ن میں "بھی" نہیں۔

ص ۲۸۔ (۱) سب نسخوں میں اِس لفظ کا یہی املا ہے۔ اصولاً تو یہ املا خلافِ قیاس ہے، اِس بنا پر کہ واحد "گھاو" ہے، جمع کے لیے اِس کے آگے "وں" یا "ؤں" کا اضافہ ہونا چاہیے [جیسے "گاؤں" سے گاؤوں، "پاؤں" سے پاؤوں۔ یا جیسے "دیو" سے دیووں۔] مگر اِس لفظ کا یہی املا قابلِ قبول معلوم ہوتا ہے۔ ۲ھ م، ن: ناسور میں بتّی اور زخموں پر پھاہے چڑھا کر پٹّی سے باندھ دیا اور نہایت شفقت سے کہا۔ ۳ھ ف: بتّی۔ ع: پٹّی (۴) ک، ف، ع میں اِسی طرح ہے۔ یہ صراحت یوں ضروری سمجھی گئی کہ "پھایا" اور "پھاہا" دو املا اِس لفظ کے ملتے ہیں۔ آصفیہ میں بھی "پھایا۔ یا۔ پھاہا" مندرج ہے۔ ک اور ف کی مطابقت اختیار کی گئی ہے۔ ۵ھ م، ن: بجائے غذا کے۔ ۶ھ ف، ع: کیجیو۔ (۷) م، ن، ک، ف، ع، سبھی نسخوں میں "تمھاری" ہے۔ آج کل کے اندازِ نگارش کے لحاظ سے (اور قاعدے کے لحاظ سے بھی) "تمھارے" مرجّح معلوم ہوگا، مگر یہاں کسی طرح کی تبدیلی کو روا نہیں رکھا گیا۔ م اور ن میں بھی "تمھاری" لکھا ہونا اِس کی تائید کرتا ہے کہ مصنّف نے اِسی طرح لکھا ہوگا اور اِس کا تعلّق کسی طرح کی غلطیِ کتابت یا غلطیِ طباعت سے نہیں۔ وہ مقامات جہاں احتمال کی گنجایش نکلتی ہو، میں نے خاص طور پر خیال رکھا ہے کہ ایسے مقامات پر کسی طرح کی دخل اندازی نہ کی جائے۔ زبان کا احوال عجیب رہا ہے اور یقین کے ساتھ یہ کہنا مشکل ہوتا ہے بہت سے مقامات پر کہ مصنّف نے اِس طرح نہیں لکھا ہوگا۔ جب تک اِس کا یقین نہ ہو جائے کہ فلاں مقام پر لازماً غلطیِ کتابت یا غلطیِ طباعت ہے، تب تک عبارت میں دخل نہیں دینا چاہیے اور "تصحیح" سے کام نہیں لینا چاہیے، کیوں کہ ایسی تصحیحات کو بہ آسانی "تصرّف" کہا جا سکتا ہے۔ البتّہ پڑھنے والوں کی معلومات کے لیے ایسے سبھی مقامات پر وضاحتی نوٹ ضرور لکھے ہیں اور میری رائے میں یہی مناسب طریقہ ہے۔ ۸ھ ع: کے۔ ۹ھ م: رورو۔ ن: روبرو۔

ص ۲۹۔ (۱) اِس جملے میں لفظ "مال" کو مع اضافت اور بلا اضافت دونوں طرح پڑھا جا سکتا ہے۔ اضافت کے بغیر پڑھا جائے تو "امانت" کے معنی ہوں گے: جوں کا توں (آصفیہ)۔ ذرا آگے چل کر یہ لفظ اِس طرح آیا بھی ہے: "وہ کشتیاں امانت حضور میں اُس پری کے گزرانیاں" (ص ۳

سطرِ آخر) مطلب یہ ہے کہ وہ اشرفیوں سے بھری ہوئی گیارہ کشتیاں جوں کی توں اُس کی خدمت میں پیش کر دیں۔ اگر اسے مع اضافت پڑھا جائے تو یہ مفہوم ہوگا کہ وہ مال جو سفر سے پہلے اُس سوداگر کے حوالے کیا تھا، وہ اُس نے یہاں میرے حوالے کر دیا۔ م میں اضافت کا زیر موجود نہیں مگر ک اور ف میں موجود ہے (مالِ امانت)۔ چوں کہ جملہ دونوں صورتوں میں بامعنی رہتا ہے، اِس لیے مقررہ اصول کے مطابق ک کی مطابقت اختیار کی گئی ہے اور "مالِ امانت" لکھا گیا ہے۔ ② ع : کے مانند۔ لفظِ "مانند" کو بالعموم مذکر لکھا گیا ہے، لیکن میرامّن کی تحریروں میں یہ لفظ مونث ملتا ہے۔ ک میں زیرِ بحث جملے کے علاوہ متعدد مقامات پر یہ "کی" کے ساتھ موجود ہے، مثلاً: ماہِ رمضان کی مانند (ص ۱۰۶)، بہشت کی مانند (ص ۹۲) میزبان کی مانند (ص ۴۷)۔ شاید یہ خیال کیا جائے کہ یہ طباعت کی غلطی ہو سکتی ہے کہ "کے" کی جگہ "کی" چھپ گیا ہے۔ لیکن کسی ایک جگہ یا دو جگہ ایسی صورت ہوتی، تو یہ احتمال پیدا ہو سکتا تھا؛ مگر ہر جگہ "کی" کا ہونا اِس پر دلالت کرتا ہے کہ یہ چھاپے کی غلطی نہیں۔ اِس کی مکمل تصدیق ہوتی ہے مخطوطۂ گنجِ خوبی سے، کہ اُس میں کئی جگہ یہ لفظ اِسی طرح آیا ہے، مثلاً: بجلی کی مانند (ص ۲۱۰) آفتابِ فیض کی مانند (ص ۱۰۳) فلک کی مانند (ص ۳۶۶) بید کی مانند (ص ۴۷) کی مانند (ص ۱۱۵)۔ اور اِس سے واضح طور پر یہ متعین ہو جاتا ہے کہ میرامّن نے اِس لفظ کو بہ تانیث استعمال کیا ہے۔ اِسی کی پابندی کی گئی ہے۔ یہاں ایک اور پہلو کی طرف طلبہ کی توجہ منعطف کرانا بے جا نہ ہوگا : باغ و بہار میں کئی جگہ ایسے جملے بھی موجود ہیں: "مانند فرشِ آئینے کے" (ص ۵۱) "مانند آفتاب کے" (ص ۱۰۷) "مانند تارِ مقیش کے" (ص ۱۱) لیکن اُن سے "مانند" کی تذکیر ثابت نہیں ہوتی، کیوں کہ ایسے جملوں میں بہ لحاظِ قواعد "کے" ہی آتا ہے؛ اِس کا تعلق تذکیر یا تانیث سے نہیں ہوتا؛ اِس قاعدے سے ہوتا ہے کہ جب جملے میں لفظوں کی ترتیب بدل جاتی ہے، تو متعلقہ ٹکڑے کے آخر میں "کے" آتا ہے۔ مثلاً "آفتاب کی مانند" کو تبدیلیِ ترتیب کے بعد جب لکھا جائے گا تو "مانند آفتاب کے" لکھا جائے گا۔ اِس "کے" کا تعلق تذکیر و تانیث سے کچھ نہیں ہوگا۔ ③ یہاں پڑھنے والوں کی توجہ اِس طرف منعطف کرانا چاہتا ہوں کہ "چمکنا" اور "دمکنا" میں جو معنوی فرق ہے، میرامّن نے لفظوں کے مزاج شناس اور پارکھ کی حیثیت سے اُسے نہایت خوبی کے ساتھ اِس جملے میں ملحوظ رکھا ہے۔ صاحبِ نوراللغات نے لکھا ہے: "دمک" "چمک" کا فرق: "چمک" کے لیے نور لازمی ہے، اور نور پیدا کرنے والی چیز ہے۔ "دمک" کے لیے سپیدی نور کی لازمی نہیں، بلکہ

مخصوص ہے سرخی کے لیے، جیسے: سونے کی دمک، کندن کی دمک۔ سونے کا رنگ اگرچہ زردی لیے ہوتا ہے، مگر دراصل سرخ ہے۔" آرزو لکھنوی نے اپنی کتاب نظامِ اردو میں لکھا ہے: "دمک ایک خاص طرح کی تابندگی کا نام ہے، جس کا استعمال ستارہ اور کندن وغیرہ کے ساتھ مخصوص ہے، لیکن میر انیس کہتے ہیں، ع: مٹی میں وہ دمک تھی کہ کندن بھی گرد تھا۔ شاعرِ نکتہ رس مٹی سی کم حقیقت چیز کو کندن سی بیش قیمت پر ترجیح دینے کے لیے، جو صفت کندن کی تھی، اُسے مٹی کے ساتھ استعمال کرتا ہے اور "وہ" حرفِ ترقی لاکر بتاتا ہے کہ مٹی کی چمک کندن کو مات کر رہی تھی۔ اور لفظ "گرد" جو مٹی کے لیے وضع ہوا تھا، مات کی جگہ صرف کرکے، مٹی کو سونا اور سونے کو مٹی بنائے دیتا ہے۔ اگر مصنفِ موصوف یہ کندن کی صفت مٹی کے ساتھ لاکر، مٹی کی صفت کندن کے ساتھ استعمال نہ کی ہوتی، تو جملہ بے معنی غیر فصیح ہو جاتا" (نظامِ اردو ص ۸۳) ④ ک اور ف میں اس لفظ پر اعراب موجود نہیں، البتہ ف کی فرہنگ میں اسے "وَضْع" لکھا گیا ہے۔ اصلاً اسی طرح یعنی "وَضْع" ہے، مگر یہ بھی غلط نہیں کہ بول چال میں زبانوں پر "وَضَع" آتا ہے۔ ("وضع قطع" میں بھی دونوں حرکات بہ فتح دوم ہی سننے میں آتے ہیں) میں نے ک کی مطابقت میں اس لفظ پر اعراب نہیں لگائے ہیں۔ اسے اگر "وَضْع" کہا جائے تو بہ لحاظِ اصل درست ہوگا، اور اگر "وَضَع" کہا جائے تو (استعمالِ عام کے مطابق) غلط نہیں ہوگا۔ ہاں، اس جملے میں لفظ "حق" ف میں بہ تشدید "حقّ" ہے۔ ۵ ف، ع: دو نظمیں [م، ک: دو ہیں]۔ ۶ م، ن: اس فقیر کے پاس۔ ⑦ ک میں "نُفْخے" ہے، اور سب نسخوں میں "نفخ" ہے۔ میں نے یہاں بھی ک کی مطابقت اختیار کی ہے، کیوں کہ میر امن نے لفظوں کو اس انداز سے بھی استعمال کیا ہے۔ اس کی ایک مثال تو اسی صفحے پر موجود ہے، آخری سطر میں "روزمرے کے خرچ" ہے (اور یہاں سبھی نسخوں میں "روزمرے" ہے)۔ "نفخے" کی بھی یہی صورت ہے۔ ایک بات اور، اصل لفظ "نَفْخ" ہے، اس لحاظ سے "نَفْخ" کہنا چاہیے، مگر اردو کے روزمرہ اور لہجے کے اعتبار سے "نَفَخے" (بروزن "جملے") کہنا انسب ہوگا۔ ⑧ م، ن، ک، ف، ع: سب میں اسی طرح ہے۔ یہ وضاحت یوں کی گئی کہ شاید کسی پڑھنے والے کے ذہن میں یہ خدشہ پیدا ہو کہ یہاں "روزمرہ کے" ہوگا، جسے مرتب یا کاتب نے "روزمرے کے" بنا دیا۔ یہ انداز میر امن کی عبارت میں متعدد مقامات پر ملے گا۔ مثلاً ص ۲۶، سطر ۱۲: "آہستے سے کہا" [اب عموماً "آہستہ سے کہا" بولتے ہیں] یا مثلاً ص ۲۹

سطر ۱ : "اصل و نفع کا تھا" قواعد کے لحاظ سے بھی اس کی توجیہ کی جا سکتی ہے۔ یعنی جس طرح "مرثیے کے بند" لکھا جائے گا، یا "درجے کے لڑکے"، اسی طرح "روزمرے کے خرچ" لکھا جا سکتا ہے۔ "کے" (وغیرہ) کے آنے کے بعد "روزمرّہ" محرّف ہو کر "روزمرے" بن سکتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ یہ خاص مرکب عموماً غیر محرّف صورت میں استعمال میں آتا ہے، یعنی ہم عموماً "روزمرّہ کے معمولات" کہتے ہیں۔

ص ۳۰۔ (۱) م، ن : جھانولا۔ ک میں "کَھَنْوان" ہے، ف میں "کُلھوان" ہے۔ آصفیہ میں "کلھوان" ہے، یعنی اعراب کے بغیر۔ فیلن کے لغت میں یہ لفظ موجود نہیں، البتہ پلیٹس نے "کلّھوان" (ہائے ہوّز کے ساتھ) لکھا ہے۔ کسی اُستاد کا یہ شعر مجھے یاد ہے : شباب اپنا جو گزرا، کلّھوان چہرا نکل آیا؛ ملمّع تھا کہ سونا اُڑ گیا، تانبا نکل آیا۔ ک کے اندراج نیز اس شعر سے تلفّظ کی پورے طور پر تعیین ہو جاتی ہے اور یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ اس میں ہائے مخلوط ہے۔ ۲؎ ع : گزری سو گزری۔ ۳؎ ن : حق۔ ۴؎ ن : اندیشے۔ ۵؎ ن : گفت و گو۔ ۶؎ ف : دستخطِ خاص۔ [ک میں "دستخطِ خاص" ہے، یعنی اضافت کا زیر موجود ہے]۔ ۷؎ ف : خطّ۔ ۸؎ ف، ع : دو نہیں [م، ک : دو ہیں] (۹) م میں "جوانِ خوب صورت" (مع اضافت) ہے۔ ک اور ف میں اضافت کا زیر موجود نہیں۔ صحیح دونوں طرح ہو سکتا ہے۔ میں نے ک، کی مطابقت کو محض اصولاً ترجیح دی ہے اور اس صورت میں "جوان" اور "خوب صورت" دونوں ٹکڑے دو الگ الگ صفتیں بھی ہو سکتی ہیں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ "حبشی جوان" کو ایک ٹکڑا مان لیا جائے اور "خوب صورت" دوسرا صفتی ٹکڑا ہو۔ اسی احتمال کی بنا پر میں نے ان ٹکڑوں کے درمیان کاما نہیں لگایا ہے۔ ۱۰؎ ف : خطّ۔ اس سے پہلے جملے "رنگ سانولا تھا" میں ن میں "تھا" موجود نہیں۔ ۱۱؎ ع : کی۔ ۱۲؎ م، ن : میں نے سلام کیا اور رخصت ہو کر اپنے مکان میں لایا۔

ص ۳۱۔ (۱) ک میں اس کو "گیارہ" یعنی مع یائے مخلوط ہی لکھا گیا ہے، مستعمل بھی اسی طرح ہے، اسی کی مطابقت اختیار کی گئی ہے۔ ع : گیارہ بدرے اشرفیوں کی (ظاہراً غلطیِ کتابت)۔ ۲؎ ن : مارے ڈر کے تو۔ ۳؎ ف : حق۔ (۴) ک میں اس لفظ پر تشدید نہیں، ہاں اگلی سطر میں "انسانیّت" مع تشدید ہے۔ (۵) لفظ "رقم" جس معنی میں یہاں آیا ہے، مؤنث ہے اور اس میں کچھ اختلاف نہیں (آصفیہ۔ نور۔ مفید الشعرا)۔ م، ن اور ک میں یہاں "رقم جواہر کے" لکھا ہوا ہے (اور مولوی عبدالحق مرحوم کے مرتبہ نسخے (ع) میں بھی اسی طرح ہے) یہ خیال کیا جا سکتا تھا کہ

یہاں "کے" کتابت کی غلطی ہوگی، لیکن صورتِ حال یہ ہے کہ متعدد الفاظ کی تذکیر و تانیث کے سلسلے میں میر امّن کے یہاں موجودہ استعمال کے مقابلے میں مختلف صورت پائی جاتی ہے، مثلاً اِسی عبارت میں لفظِ "خلعت" کو انھوں نے مونث لکھا ہے، حالاں کہ اربابِ لغت و قواعد نے اِسے مذکر لکھا ہے۔ اِس بنا پر اِس جملے میں کسی طرح کی تبدیلی کو احتیاط کے خلاف سمجھا گیا اور متن کو ک کے مطابق ہی رکھا گیا ہے۔ (۷) یہاں یہ وضاحت کرنا ہے کہ لفظِ "خلعت" کو اربابِ لغت نے مذکر لکھا ہے (آصفیہ، نور، مفید الشعرا) میر امّن نے اِس لفظ کو مونث استعمال کیا ہے۔ اِس کتاب میں کئی جگہ یہ لفظ اسی طرح آیا ہے۔ (مخطوطہ) گنجِ خوبی میں بھی ہر جگہ یہ لفظ بہ تانیث ملتا ہے، مثلاً: ایک خلعت عنایت کی ص ۳۰، اپنے بدن کی خلعت ص ۵۹، یہ خلعت جو تو نے پہنی ہے ص ۷۹، خلعت دی ص ۱۹۴۔ تذکیر و تانیث کے معاملے میں میر امّن کے یہاں موجودہ طریقِ استعمال کے مقابلے میں متعدد الفاظ کے سلسلے میں مختلف صورت پائی جاتی ہے اور یہ لفظ بھی اسی فہرست میں شامل ہے۔ اِس کتاب میں یہ لفظ جگہ جگہ آیا ہے اور عمدہ، قیمتی لباس کے مفہوم میں آیا ہے۔ یہاں بھی یہی مفہوم ہے۔ اصلاً خلعت کا تعلق شاہی دربار سے ہوا کرتا تھا کہ بادشاہ کی طرف سے خاص خاص لوگوں کو مختلف موقعوں پر خلعت دیا جاتا تھا۔ مرتبے اور اعزاز کے لحاظ سے اِس کے اجزا (یعنی کپڑوں اور جواہرات) کی تعداد مختلف ہوتی تھی۔ انگریزی حکومت میں بھی کچھ دنوں تک اِس روایت کو برقرار رکھا گیا۔ مرزا غالب نے ایک خط میں اپنے خلعت کا ذکر کیا ہے، جس سے اِس کے اجزا کے متعلق ہلکا سا اندازہ کیا جا سکتا ہے: "پیش از غدر گورنمنٹ کے دربار میں، پارچے اور جیغہ، سرپیچ، مالائے مروارید تین رقم جواہر کی مجھ کو ملتی تھیں..... نواب لفٹنٹ گورنر بہادر پنجاب کا کل ۱۲ بجے دربار تھا..... لارڈ صاحب نے کھڑے کھڑے جیغہ، سرپیچ میری ٹوپی پر باندھا..... مالائے مروارید میر منشی نے گلے میں ڈال دی۔ یہ پارچے سات مرحمت ہوئے: دوشالا ۱، کمخواب کا تھان ۱، بنارسی تھان سنہری بوٹے ۱، بنارسی سیلا ۱، الوان کی چادر کنارہ کلابتون ۱، کنادیز کا تھان ۱، الوان کی چادر بے کنارہ ۱۔" [مکاتیبِ غالب، مرتبہ مولانا امتیاز علی خاں عرشی، طبعِ ششم، مکتوب نمبر ۸۰] ق م، ن: وہیں۔ (۸) اِس جملے میں لفظِ "جوان" کو مع اضافت بھی پڑھا جا سکتا ہے اور بغیر اضافت بھی؛ بہ لحاظِ قواعد دونوں طرح درست ہوگا، اور معناً کوئی فرق واقع نہیں ہوگا، چوں کہ م، ک اور ف میں "جوان" کے "نون" کے نیچے اضافت کا زیر لگا ہوا ہے، اِس لیے اِسی صورت کو

مرتج سمجھا گیا ہے اور اسی کی مطابقت اختیار کی گئی ہے۔ (۹) م، ک اور ف میں اس لفظ پر اعراب موجود نہیں۔ "ت" پر تو زبر ہے، "ف" پر بھی اصلاً زبر ہے، مگر تلفظ کا احوال یہ ہے کہ زبانوں پر یہ لفظ آتا اس طرح ہے جیسے "ف" پر جزم ہو اور تلفظ کی فصاحت کا تقاضا یہی ہے کہ تلفظ کا یہی انداز برقرار رہے۔ ۱۰ے اس صفحے پر یہ لفظ تین جگہ آیا ہے اور تینوں مقامات پر ک، م، ف میں "دوکان" ہے (ع: دکان)۔ (۱۱) م، ک، ف میں اسی طرح (سلامؔ) ہے۔ ۱۲ے ف: خوشی۔ ۱۳ے ع میں "سب" نہیں۔ ۱۴ے ع: ییجے۔

ص ۳۴۲۔ ۱ے ن: تو یقطے۔ ۲ے م: انسانیت (ک، ف، ع: انسانیت)۔ ۳ے م، ن: اس کے دل کی خاطر۔ ۴ے ع: بہ کرم کیجیے۔ م، ن: یہ کرم کیجیے۔ ۵ے م، ن: بتا کر۔ ۶ے ف: بجز۔ ۷ے م: میرا جی تو چاہتا نہیں۔ ن: میرا دل چاہتا نہیں۔

ص ۳۴۳۔ ۱ے یہاں سب نسخوں میں "تُونہیں" ہے۔ ۲ے م، ن: جھرمٹے اور میوے طرح بہ طرح کے بچن رہے تھے۔ درخت مارے بوجھ کے جھومتے اور رنگ بہ رنگ کے جانور ان پر بیٹھے کریاں کرتے اور چہچہے مارتے اور بیرا یک مکانِ عالی شان میں فرش ستھرے بچھے تھے۔ وہاں لب نہر..... ۳ے ن: بچھا تھا۔ (۴) صرف یہ صراحت کرنا ہے کہ م، ک، ف میں اضافت کا زیر موجود نہیں۔ اسی کی پابندی کی گئی ہے۔ ۵ے م، ن: اور سے ۶ے ع: لاکے رکھی۔ م اور ن میں "لا رکھی" موجود نہیں۔ ۷ے م، ن: اور نمک دان چنے گئے۔ (۸) م، ک، ف، ع؛ چاروں نسخوں میں اضافت کا زیر موجود ہے یعنی "صاحبِ جمال" ہے۔ یہ وضاحت یوں کی گئی کہ لفظ "صاحب" مضاف ہونے کی صورت میں مع اضافت بھی آتا ہے اور بغیرِ اضافت بھی، مثلاً: صاحب دل اور صاحبِ دل [ع: صاحبِ دل تجھے تصویر وفا کہتے ہیں۔ چکبست، نظم بہ عنوان "انگاسے"] صاحب نظر اور صاحبِ نظر۔ صاحب خانہ [ع: ہم سبھی مہمان تھے واں تو ہی صاحب خانہ تھا۔ خواجہ میر درد] صاحبِ خانہ [صاحبِ خانہ ہم ہیں کہنے کو؛ آئے ہیں چار دن کے رہنے کو۔ سحر۔ ماخوذ از نور اللغات] غرض کہ اس سلسلے میں بہت سی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔ اس سلسلے میں دو باتیں اور بھی ہیں: ایک تو یہ کہ ترکیبی صورت میں کسے میں لفظ "صاحب" اکثر مع اضافت ملتا ہے، مثلاً: صاحبِ لیاقت (ص ۱۱۷) صاحبِ شریعت (ص ۲۲۶) دوسرے یہ کہ مخطوطہ گنج خوبی میں میر امن نے تقریباً ہر جگہ ایسی صورت میں "ب" کے نیچے اضافت کا زیر لگایا ہے، مثلاً: صاحبِ جمال (ص ۳۴۳) صاحبِ ایمان (ص ۴۲) صاحبِ دین (ص ۲۹) صاحبِ شجاعت (ص ۱۵۳)۔

صاحبِ جرات (ص ۲۰۹) صاحبِ دولت (ص ۱۹۲) صاحبِ اقبال (ص ۶۷) صاحبِ عزم (ص ۷۰) صاحبِ تدبیر (ص ۲)۔ اِس سے واضح طور پر یہ بات سامنے آجاتی ہے کہ مصنف نے لفظِ "صاحب" کو بالعموم مع اضافت لکھا ہے۔ اِس کتاب میں اسی طریقِ استعمال کی پابندی کی گئی ہے اور ک کے مطابق بؔ کے نیچے اضافت کا زیر لگایا گیا ہے۔ ⑨ صرف یہ صراحت کرنا ہے کہ کسی نسخے میں اضافت کا زیر موجود نہیں۔

ص ۳۴۔ ۱؎ ع: چھپانا۔ ۲؎ م، ن: وہیں۔ ک کے متن میں بھی "وہیں" چھپا ہوا ہے، مگر غلط نامے میں اس کی تصحیح کی گئی ہے اور "وہ نہیں" کو صحیح لکھا گیا ہے۔ ۳؎ م، ن: بھوتنی سی۔ ۴؎ ن میں "میں" نہیں۔ ۵؎ ن: جلدی۔ ۶؎ م، ن: اور اپنے۔

ص ۳۵ ① سب نسخوں میں اِس لفظ کا یہی املا ہے یعنی آخر میں الف ہے۔ اِس کی بحث ضمیمہ تلفظ و املا میں آچکی ہے۔ ② طلبہ کے استفادے کے لیے یہ وضاحت کی جاتی ہے کہ اِس مرکب میں "دو" کو اِس طرح پڑھا جائے گا کہ واو کی آواز نمایاں نہ ہو۔ [یعنی لکھا تو جائے گا "دو چند" مگر پڑھنے میں آئے گا "دُچند"] "دو" کے مرکبات کا عمومی طور پر یہی احوال ہے، مثلاً: دو منزلا، دو طرفہ، دو راہہ، دو رویہ وغیرہ کہ سب میں واو کی آواز دبی ہوئی رہتی ہے۔ ۳؎ ع: تو میں۔ ۴؎ م، ن: پر راہ میں یہی فکر کرتا آتا تھا۔ ع: لیکن راہ میں یہی فکر کرتا تھا۔ ۵؎ ع: حیض بیض۔

ص ۳۶۔ ۱؎ ف، ع: لگی ہیں۔ ۲؎ ف، ع: دھرے ہیں [دیکھیے حاشیہ ۸ کی عبارت]۔ ۳؎ ع: طاقوں میں۔ ④ اصل لفظ "کنوَل" ہے، اِسی سے "کنولا" بنا ہے اور "کنولے" اِس کی جمع ہے۔ ف کی فرہنگ میں "کنوَلا" لکھا گیا ہے (KANWALA) اِس لحاظ سے تلفظ "کنوَلے" ہونا چاہیے، مگر ک میں "کنوْلے" لکھا ہوا ہے اور اِس لحاظ سے اِس کا تلفظ "کنوْلے" بروزنِ فعلن ہونا چاہیے اور یہی صورت بہتر اور مرجح معلوم ہوتی ہے۔ ⑤ ک اور ف میں "شمع" پر اعراب موجود نہیں۔ اصلاً "شمْع" ہے، جو زبانوں پر آتا اِس طرح ہے ("جمع" کی طرح) جیسے میم پر جزم ہو۔ اِس جملے میں "شمعیں" جو آیا ہے تو اُس میں تو میم پر لازماً جزم ہے۔ اُردو میں ایسے سب لفظوں کی ایسی جمعوں کو دوسرے حرف کے جزم کے ساتھ بولتے ہیں [خواہ واحد صورت میں اصلاً دوسرا حرف مفتوح ہو یا ساکن، جیسے: نظر سے نظْریں، اور شمع سے شمْعیں] اِس بنا پر حسنِ بیان کا بھی یہی تقاضا ہوگا کہ اِس مقام پر پہلے ٹکڑے میں بھی "شمْع دانوں" پڑھا جائے؛ اِسی نسبت سے یہاں میم پر جزم لگایا گیا ہے۔ ہاں، اِس کے بعد والی سطر

ین ون بیں "ستعد" ہے۔ ؁ ف، ع: رہی ہیں۔ (۷) سب نسخوں میں اِس جملے میں "بندھیں" اور "ڈھکی" ہے یعنی فعل کی دو شکلیں ہیں۔ چوں کہ یہ التزام کیا گیا ہے کہ افعال جس صورت میں جہاں آئے ہیں، اُن کو اُسی صورت میں لکھا جائے، اِس لیے یہاں بھی اِن دونوں صورتوں کو اپنی اپنی جگہ برقرار رکھا گیا ہے۔ یہ صراحت یوں کی گئی کہ کسی طالبِ علم کے ذہن میں یہ خیال نہ پیدا ہو کہ ایک ہی جملے میں ایک ہی جیسے مفہوم کے لیے فعل کی دو صورتیں کیوں ہیں، اور اِسے کتابت کی غلطی خیال کیا جائے۔ اِسی صفحے کی تیسری سطر میں "ڈھرے ہیں" ک اور م میں اِسی طرح مرقوم ہے، اور وہاں بھی اُس کو اُسی طرح برقرار رکھا گیا ہے، اگرچہ ف میں "دھرے ہیں" ہے اور آج کل اِسی طرح مستعمل ہے۔ ؁ م: ڈھکیں۔ ؁ م: ڈھنگھے۔ ؁ ک، ف: بمعہٗ۔ ؁ ف، ع: لگ رہے ہیں۔ ؁ م، ن: سماج۔ (غلطیِ طباعت)۔ ؁ ک، ف: اُڑتے ہوئے۔ (۱۴) "خزادہ"، ف: خواجہ زادہ کا مخفف، صاحب زادہ، سردار..... اِس کا املا دونوں طرح یعنی خُزادہ، خوزادہ صحیح ہے، لیکن واو سے لکھنا بہتر ہے" (نور)۔ غالب نے لکھا ہے: "خزادہ، خداوند زادہ کا مخفف ہے، لیکن فارسی نہیں، عربی نہیں؛ اُردو کا روزمرہ تھا۔ خزادہ اور خزادی، مرادفِ صاحب زادہ اور صاحب زادی ہے؛ مگر فی زمانہ متروک ہے" (مکتوب بہ نام یوسف علی خاں عزیزؔ)۔ ک میں مع واوِ معدولہ (خوزادہ) ہے، اِسی املا کو برقرار رکھا گیا ہے۔

؁ م، ن میں "بنی ہوئی" نہیں۔

ص ۲۷ (۱) موجودہ صورت میں یہ شعر کس کا ہے، میں معلوم نہیں کر سکا۔ مقدمۂ آبِ حیات میں یہ شعر اِس صورت میں ملتا ہے، لیکن شاعر کا نام مذکور نہیں: نہیں محتاج زیور کا جسے خوبی خدا نے دی؛ کہ آخر بدنما لگتا ہے دیکھو چاند کو گہنا۔ [آبِ حیات، مطبعِ مفیدِ عام پریس لاہور، سالِ طبع ۱۸۹۹ء، ص ۴۴] دیوانِ آبرو (مرتبۂ ڈاکٹر محمد حسن) میں یہ شعر ضرور موجود ہے: جسے ہو زیب ذاتی اُس کے تئیں ہے عیب آرایش؛ کرے ہے بدنما البتہ حسنِ ماہ کو گہنا (ص ۶۷)۔ ہاں ک میں یہ شعر اِسی طرح قوسین کے اندر ہے۔ ؁ ع: ایسے کام (۳) م، ک، ف، ع میں اِس لفظ پر تشدید موجود نہیں۔ ن: آدمیت ہے کہ مہمان کو اکیلا بیٹھا کر۔ ع: آدمیت ہے کہ مہمان کو اکیلا بٹھلا کر۔ ؁ م: پھریے۔ ؁ ن: بیٹھلا۔ ؁ م: دو وہیں۔ ن: دہیں۔ (۷) م، ک اور ف میں اضافت کا زیر موجود ہے۔ ن: وے غلام صاحبِ جمال۔ (۸) م، ک، ف میں اضافت کا زیر موجود ہے۔ ؁ ف: خاصّہ۔

ص ۳۸ ۱؎ ن : بیٹھایا۔ ۲؎ م، ک : جلیسی۔ ۳؎ م : گلے سے۔ ۴؎ ف : ضد۔ ۵؎ م : اور یہ۔
⑥ ک میں اِس لفظ پر تشدید موجود نہیں۔ دوسری "ی" پر زبر لگا ہوا ہے۔ م، ن میں اِس جملے کا آخری ٹکڑا "گزرے" کی بجائے "بیٹے" ہے۔ ۷؎ ع : کہا اِس کا۔
ص ۳۹ ۱؎ م، ن : اور ایسا میں بھی۔ ۲؎ م : ایک کل۔ ۳؎ ف : حواسّ۔ ۴؎ ن : کی۔
۵؎ م : کیا حاصل ہے۔ ۶؎ ک : ایک زرہ۔ م، ن : ایک ذرہ۔ ع : ایک زرا۔ ف : ایک ذرّہ۔
۷؎ م، ن : بہت نادم اور آگاہ ہوا۔ ۸؎ ن میں " اس" نہیں۔ ۹؎ ن، ف، ع : محلّی۔
ص ۴۰ ۱؎ ع : فساد کے۔ ۲؎ ع : لگ رہی تھیں۔ ۳؎ ع : دو روز۔ ۴؎ ع : بتا دیا تھا۔
⑤ ک اور ف میں اِسی طرح ہے۔ م میں " بعد فراغتِ نمازِ مغرب کے" ہے یعنی "فراغت" کی "ت" کے نیچے اضافت کا زیر موجود ہے۔ اگر قواعد کی عینک لگا کر دیکھا جائے تو م کو ترجیح حاصل رہے گی، مگر میں نے یہاں بھی ک کو مرجح قرار دیا ہے، اِس بنا پر کہ بات چیت کے انداز کو یعنی روزمرّہ کو نظر میں رکھا جائے تو اُس صورت میں بہتر صورت وہی نظر آئے گی جو ک میں ہے۔ دوسرے یہ کہ ک روایتِ ثانی ہے، اِس کا قوی امکان ہے کہ مصنّف نے نظرِ ثانی میں خود ہی زیرِ بحث اضافت کے زیر کو نکال دیا ہو اور قواعد پر روزمرّے کو ترجیح دی ہو، جو اُن کا عام انداز ہے۔ ⑥ م اور ن میں "باغچے" ("ی" کے بغیر) ہے۔ ک، ف، ع میں "باغیچے" (مع "ی") ہے۔ آگے چل کر ص ۱۰۸ پر "باغچے" "ی" کے بغیر ہے، وہاں سب نسخوں میں اِسی طرح ("ی" کے بغیر) ملتا ہے۔ تفصیلی نوٹ وہیں لکھا گیا ہے، اُسے دیکھا جائے۔ ک کی مطابقت اختیار کی گئی ہے۔
ص ۴۱ ① صرف یہ صراحت کرنا ہے کہ م اور ف میں "پ" کے نیچے زیر لگا ہوا ہے۔ آصفیہ میں بھی "پِشواز" ہے۔ ② م، ن : بادلے کے۔ یہ وضاحت ضروری ہے کہ یہاں (ک کے مطابق) "بادلے کی" ہی بہتر ہے، اِس بنا پر کہ "سنجاف" اِس معنی میں مونّث ہے (آصفیہ) اِس لیے "بادلے کی سنجاف" ہی مرجح ہے۔ ③ "تازگی" میں اصولاً "ز" پر زبر آنا چاہیے (تازہ۔ گی) مگر عام طور پر تلفّظ میں یہ لفظ اِس طرح آتا ہے کہ "ز" ساکن معلوم ہوتی ہے۔ اُردو میں تلفّظ کی فصاحت کا تقاضا یہی ہے کہ اِس لفظ کو اِسی طرح (یعنی تازْگی) کہا جائے۔ ④ صرف یہ صراحت کرنا ہے کہ ک میں آخری "نون" پر نقطہ موجود ہے۔ ⑤ ک میں اِس لفظ پر حرکات موجود نہیں۔ اصلاً "شَمَع" ہے، اگرچہ سننے میں یہ لفظ اِس طرح آتا ہے جیسے "میم" پر زبر ہو۔ فارسی ترکیب کی صورت میں تو اصل صورت

برقرار رہتی ہے، جیسے: شمعِ محفل، مگر مفرد صورت میں میم کا جزم تسہیل کے عمل سے دوچار ہوکر زبر سے قریب تر ہوجاتا ہے۔ اِس قبیل کے متعدد الفاظ کی یہی صورت ہے، جیسے: جمع، نفع۔ تلفّظ کی حد تک مناسب یہی ہے کہ اُردو کے لہجے کا لحاظ کرتے ہوئے میم کے جزم پر زور نہ دیا جائے۔ ۶؎ ع: کے مانند۔ ۷؎ م، ن: رو بہ رو کھڑا ہوا۔ ۸؎ ف، ع: محلّی۔ ن: محلا۔ ۹؎ ف: حقّ۔

ص ۴۲ ۱؎ ف: بندگی۔ (۲) سب نسخوں میں اِسی طرح ہے۔ (۳) ک میں اضافت کا زیر موجود ہے۔ (۴) سب نسخوں میں اِسی طرح ہے (یعنی "دانا" کے آخر میں الف ہے)۔ مفرد لفظ اِس معنی میں "دانہ" ہے، مگر "دانا پانی" اُردو کا ٹکڑا ہے اور غالباً اِسی بنا پر اِس مرکب میں اِسے "دانا" لکھا جانے لگا۔ ۵؎ ف: دق۔ م، ن: دق ہوئی۔ (۶) ک میں پہلے حرف پر پیش لگا ہوا ہے، مگر دوسرے حروف خالی ہیں، البتہ ف میں "پچھاہندے" ہے یعنی ہ کے نیچے زیر بھی لگا ہوا ہے۔ اِسی کی مطابقت اختیار کی گئی ہے۔ آصفیہ میں یہ لفظ موجود نہیں۔ فیلن کے لغت میں بھی نہیں، ہاں پلیٹس کے لغت میں موجود ہے۔ پلیٹس نے بھی اِسے "پچھاہندے" لکھا ہے۔ ۷؎ م، ن: یہ اِس۔

ص ۴۳ ۱؎ م، ن میں "غرض" نہیں۔ (۲) ک، ف: سوجاتا۔ م، ن، ع: سوتا۔ حسنِ عبارت اور تناسبِ بیان کا تقاضا یہی ہے کہ یہاں "سوتا" ہو۔ [نہ دن کو کھاتا، نہ رات کو سوتا] اِسی بنا پر اِس مقام پر م کے متن کو ترجیح دی گئی ہے۔ ۳؎ م میں اِس جگہ ہندی رسمِ خط میں फिर لکھا ہوا ہے۔ ن میں یہاں کوئی لفظ نہیں (دیگر نسخوں کی طرح)۔ (۴) یہ شعر سودا کا ہے اور اُن کے کلامِ مطبوعہ میں موجود ہے۔ کلامِ سودا کے خطّی نسخے "نسخۂ جانسن" میں بھی یہ شعر موجود ہے، اُس میں یہ شعر اِس طرح ہے:
اب دردِ دل سے موت ہو یا دل کو تاب ہو: قسمت کا جو لکھا ہو، الٰہی شتاب ہو۔ ۵؎ ف: بالکل۔ ۶؎ ف، ع: محلّی۔ ۷؎ م، ن: بہ غور دیکھا۔ (۸) محض احتیاطاً یہ صراحت کی جاتی ہے کہ ک میں یہ لفظ مع یائے مظہرہ ہی ہے (مستعمل بھی اِسی طرح ہے)۔ (۹) قاعدے کے لحاظ سے تو لفظ "بڑی" مع اضافت آنا چاہیے اور اِسے "بڑیِ بے پروا" لکھا جانا چاہیے۔ لیکن صورتِ حال یہ ہے کہ م، ن، ک، ف، ع، کسی نسخے میں بھی اضافت کا زیر موجود نہیں۔ اِس صورت میں یہی خیال ہوتا ہے کہ میرامّن نے اِسے اضافت کے بغیر ہی لکھا ہوگا۔ "بڑی بے پروا" قاعدے کے لحاظ سے تو درست ہوگا، لیکن یہ واقعہ ہے کہ پڑھنے میں کچھ اچھا نہیں معلوم ہوتا، شاید اِس وجہ سے کہ لفظ "بڑی" بالعموم اضافت

کے بغیر آیا ہے۔ ''بڑی بے پروا'' یا ''بڑی بے مہر'' یا ''بڑی ماہ جبیں'' جیسی ترکیبیں نہ تو نظر سے گزری ہیں اور نہ سننے میں آئی ہیں۔ اسی بنا پر یہاں اصل کی مطابقت اختیار کی گئی اور لفظ ''بڑی'' کے نیچے اضافت کا زیر نہیں لگایا گیا۔ م میں ''بڑی بے پرواہ'' ہے۔ ۱۰ـ ن: بیٹھا یا۔ (۱۱) ف، ع: روہیٹ۔ محض احتیاطاً یہ صراحت کی جاتی ہے کہ ک میں اِسے مع واوِ معروف ہی لکھا گیا ہے۔ نور میں بھی مع واوِ معروف ہے۔ آصفیہ میں یہ لفظ موجود نہیں۔ ۱۲ـ ع میں ''خوب سے'' نہیں۔

ص ۲۴۴ ۱ـ م، ن: جب ہی سے۔ ۲ـ م، ن میں ''ہے'' نہیں۔ ۳ـ م میں ''پردہ'' نہیں۔ ن میں ''پر'' نہیں۔ (۴) ک، ف، ع، تینوں نسخوں میں یہ ٹکڑا اسی طرح ہے۔ طلبہ کے استفادے کے لیے یہ وضاحت کرنا ہے کہ اِس ٹکڑے میں لفظی تعقید ہے۔ اِس تعقید کے بغیر اِس کو یوں لکھا جاتا: ''اُس کے وطن پہنچنے کی خبر'' یعنی ''کے'' کا تعلق ''اُس'' سے ہوتا اور ''کی'' کا تعلق ''خبر'' سے۔ لفظی تعقید کی وجہ سے یہ صورت پیدا ہوئی ہے کہ دونوں جگہ ''کی'' آگیا ہے۔ تعقید کی صورت میں اِس کو اسی طرح لکھا جانا چاہیے جس طرح لکھا گیا ہے۔ اگر اصل کی رعایت سے ''اُس کے خبر وطن پہنچنے کی'' لکھا جائے تو یہ غیر مناسب اندازِ بیان ہوگا۔ (۵) اصلاً ''وَاللہُ اَعلَم'' ہے، مگر بول چال میں بہ سکونِ ہ آتا ہے، اسی لیے ہ پر پیش نہیں لگایا گیا۔ م، ک، ف میں بھی پیش موجود نہیں۔ ۶ـ ف: ناحق۔ (۷) احتیاطاً یہ صراحت کی جاتی ہے کہ م، ک، ف میں ''رکھو'' تشدید کے بغیر ہی ہے۔ یہ وضاحت بھی کی جاتی ہے کہ ایسے جملہ افعال جو بہ تشدید اور بغیر تشدید، دونوں طرح استعمال میں آتے ہیں، اُن کو ہر جگہ ک کے مطابق ہی لکھا گیا ہے۔ یعنی ک میں تشدید ہے تو لازماً اُسے برقرار رکھا گیا ہے، بہ صورتِ دیگر ایسے لفظوں کو تشدید کے بغیر لکھا گیا ہے۔ ۸ـ ف: خاص۔ ۹ـ ع: سوال و جواب۔

ص ۲۴۵ ۱ـ ع: وہ۔ ۲ـ م، ن: آخر۔ ۳ـ ''تشخیص میں ٹھہرا کہ'' یہ ٹکڑا ن میں نہیں۔ (۴) ک کے متن میں ''وصل'' کے لام کے نیچے اضافت کا زیر لگا ہوا ہے (''سوائے وصلِ معشوق کے'') لیکن غلط نامے میں اِس کی تصحیح کی گئی ہے اور ''وصل'' (اضافت کے بغیر) کو صحیح لکھا گیا ہے۔ م، ف، ع میں ''وصلِ'' ہے، یعنی لام کے نیچے اضافت کا زیر موجود ہے اور یہی مرجح صورت معلوم ہوتی ہے۔ غالباً ک کے مصحح نے یہ خیال کیا ہوگا کہ لفظ ''سوائے'' کے ساتھ ''کے'' نہیں آنا چاہیے، یعنی ''سوائے وصلِ معشوق'' کافی ہے اور چوں کہ میر امّن نے اِس ٹکڑے کے آخر میں ''کے'' بھی لکھا ہے (سوائے وصلِ معشوق کے)

اِس لیے لفظِ "وصل" کی اضافت کو ختم کر دیا جانا چاہیے لیکن "سوائے" کے ساتھ آخر میں "کے" بہت سے مقامات پر ملے گا گفتگو میں بھی اور تحریر میں بھی۔ خود میر امّن کی تحریروں سے اِس کی بہت سی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں، مثلاً مخطوطۂ گنجِ خوبی میں "بجائے نصیحت کے" (ص ۴۴) "سوائے ریاست کے" (ص ۱۸۱) "سوائے اِس رستے کے" (ص ۷) "بجائے حاکمِ عادل کے" (ص ۱۴۳)۔ آخری مثال میں "حاکمِ عادل" مع اضافت آیا ہے اور اُس سے پہلے "بجائے" ہے۔ اس کو اگر "بجائے حاکم عادل کے" پڑھا جائے تو یہ روزمرہ کے بھی خلاف ہوگا اور منشائے مصنّف کے بھی (اِس لیے کہ مصنّف نے اپنے قلم سے اضافت کا زیر لگایا ہے) اِس بنا پر زیرِ بحث ٹکڑے میں لفظِ "وصل" کو مع اضافت رکھا گیا ہے (جس طرح ف اور ع میں ہے)۔ یہ اُردو کے روزمرہ اور مصنّف کے طریقِ تحریر، دونوں کے مطابق ہے۔ ۵؎ م، ن: تب حکم کیا۔ ۶؎ ف: خاصّی۔ ۷؎ م، ن: وہ ہیں۔ ک کے متن میں "وہیں" چھپا ہے، مگر غلط نامے میں اِس کی جگہ "وہ نہیں" کو صحیح بتایا گیا ہے۔ [ف، ع: وہ نہیں]۔ اِس سے پہلے چوتھی سطر میں بھی "وہ نہیں" آیا ہے اور وہاں بھی ک میں "وہیں" چھپا ہوا ہے، مگر غلط نامے میں اِس کی تصحیح کی گئی ہے اور "وہ نہیں" کو صحیح لکھا گیا ہے۔ م اور ن میں بھی "وہ ہیں" ہے۔ ۸؎ م، ن: برس کے۔ ۹؎ ف: ناحق۔ ۱۰؎ ع: شادیِ مرگ۔ ۱۱؎ "اس وقت سے" ن میں نہیں۔ ۱۲؎ م، ن: حکم ہوا کہ۔ ۱۳؎ م، ن: میں نے کہا بندے کو ......۔ ۱۴؎ ن: کر۔

ص ۱۴۶ ① محض احتیاطاً یہ صراحت کی جاتی ہے کہ م، ک، ف، ع: سب میں اِس لفظ کا یہی املا ہے۔ آصفیہ میں بھی اِسی طرح ہے۔ پڑھنے میں یہ لفظ ضرور اِس طرح آتا ہے کہ الف کا تلفظ الگ سے نہیں ہوتا، یعنی "کنکھیوں" کہا جاتا ہے۔ کہنا بھی اِسی طرح چاہیے۔ "انکھیوں" کا الف، الفِ وصل بن کر تلفظ میں اپنا وجود کھو دیتا ہے، مگر لکھنے میں وہ برقرار رہتا ہے۔ تیسری سطر میں "پیچتے ہے" آیا ہے؛ ف، ع میں اُس کی جگہ "پھبتی ہے" ہے۔ ۲؎ م، ن: قاضی نے نکاح پڑھوا لیا۔ ۳؎ م، ن میں "تھی" نہیں۔ ۴؎ م: بچّے۔ ⑤ ک کے متن میں یہاں "وہ" ہے (وہ دونوں بے گناہ) یہ لفظ ک میں ص ۲۴۴ پر چھٹی سطر میں آیا ہے۔ غلط نامے میں "ص ۲۴۴، سطر ۲" سے متعلق یہ ہدایت ملتی ہے کہ "وہ" کی جگہ "وے" لکھا جائے، لیکن سطر ۲ میں "وہ" موجود نہیں۔ چوتھی سطر میں یہ لفظ ضرور آیا ہے: "وہ جبشی سانولا سجیلا" مگر یہ سطر مراد یوں نہیں ہوسکتی کہ یہاں "وہ" واحد کے لیے آیا ہے، اور واحد کے لیے یہی لفظ آتا ہے، اِس کے بدلنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

ہاں چھٹی سطر میں "وہ دونوں" جو لکھا ہوا ہے، وہ مراد ہو سکتا ہے کیوں کہ یہاں جمع کا محل ہے۔ اِس بنا پر یہ مان لینا بے جا نہیں معلوم ہوتا کہ غلط نامے میں سطر کا ہندسہ لکھنے میں غلطی ہو گئی اور "۲" کی جگہ "۶" چھپ گیا۔ یعنی مراد یہ ہے کہ "وہ دونوں" کو "وے دونوں" کر لیا جائے۔ "وے" جمع کے لیے آتا ہے اور میرامن نے اِسے استعمال کیا ہے۔ ک ہی میں ص ۴۵ پر جمع کے لیے یہ لفظ موجود ہے: "وے روپے کہاں خرچ کیے"۔ اِسی بنا پر یہاں غلط نامے کے مطابق "وے دونوں" لکھا گیا ہے۔ م، ن، ف، ع میں اِس جگہ "وہ" ہے۔ ۶ہ ع میں "اس" نہیں۔ ۷ہ م، ن: باوجود۔ ۸ہ ف: خواص۔ ۹ہ م: اِس میری۔

ص ۴۷ ۱ہ ن: دیدھی۔ ۲ہ ع: نہ کیجیو۔ ۳ہ ع: نہ ہو جیو۔ (۴) ک میں دال پر زبر لگا ہوا ہے۔ اگلی سطر میں "بے ادبیاں" کی دال پر بھی زبر لگا ہوا ہے۔ ۵ہ م: جیسے۔ ۶ہ م: اِس پری تے۔ ن: اس پری۔

ص ۴۸ (۱) م، ک، ف میں تشدید موجود ہے۔ (۲) یعنی احتیاط ضروری ہے۔ "آصفیہ" میں یہ موجود نہیں، مگر یہ مستعمل ہے، مثلاً: قدم عشق میں ورد رکھتا تو ہے ٭ وہ جانے کہاں ہیں: خیر شرط ہے (خواجہ میر درد)۔ ۳ہ ن: ماں باپ۔ ۴ہ ن میں صرف ایک بار "ستھری" ہے۔ ۵ہ ف: خواصیں۔ ۶ہ م، ن: رہتیں تھیں۔ ۷ہ م، ن: ناچ کاچ۔ ۸ہ ن میں "مزاج" نہیں۔

ص ۴۹ ۱ہ ن، ک، ف: ستی۔ ۲ہ م: اور تدبیر کرنے لگیں۔ ۳ہ ف، ع: محلی۔ ۴ہ ف، ع: اور جو کچھ۔ ۵ہ ف، ع میں "بلاناغہ" نہیں۔ ۶ہ م، ن: ایسی ایسی۔ ۷ہ ف، ع: میٹھی باتیں۔ ۸ہ م، ن: اور آہ او ہی بھرنے۔ ۹ہ م، ن: تس پر صورت بھی اُس کی۔ ۱۰ہ م، ن: اِس شوق سے۔ ۱۱ہ م، ن: دیتی۔

ص ۵۰ ۱ہ م، ن، ع: انھیں کپڑوں سے جیسے ہمیشہ پہن رہا تھا حضور میں آتا۔ (۲) ک کے متن میں تو "میلا کچیلا" ہی ہے، مگر غلط نامے میں "کچیلا" کو غلط بتا کر اس کی جگہ "مچیلا" لکھنے کی ہدایت کی گئی ہے۔ "میلا مچیلا" نہ تو کسی اور نسخے میں ہے اور نہ کسی اور جگہ دیکھنے میں آیا۔ آگے چل کر ص ۴۶۱ پر "میلے کچیلے" آیا ہے، اور وہاں کسی طرح کی تصحیح نہیں کی گئی ہے، اِس سے میں نے یہ نتیجہ نکالا ہے: یہاں جو غلط نامے میں تصحیح کی گئی ہے، وہ بجائے خود غلط ہے، کسی غلط فہمی کے نتیجے میں یہ عمل میں آئی ہے۔ اِسی بنا پر م اور ف اور ک کے متن کے مطابق "میلا کچیلا" ہی لکھا گیا ہے۔

ک میں دونوں ٹکڑوں میں "ی" کا حرفِ ماقبل مفتوح ہے (مستعمل بھی اِسی طرح ہے) اِسی کی مطابقت
اختیار کی گئی ہے۔ یہ صراحت یوں کی گئی کہ پلیٹس کے لغت میں "میلا کچیلا" اور "میلا کُچیلا" دونوں
طرح مندرج ہے۔ ۳ ف، ع: کر تجھے۔ ۴ م، ن: دہ روپئے۔ آخری فعل ک میں "رکّھے"
مع تشدید ہی ہے۔ ۵ م، ن: یہ۔ (۶) صرف یہ صراحت کرنا ہے کہ سب نسخوں میں یہاں "اُس
کے" ہے۔ ۷ ف، ع: کہ آج سے۔ ۸ ف: تربیّت۔ (۹) ک میں "خوش" اور "خودی"
دونوں کے واو مع علامتِ معدولہ لکھے گئے ہیں۔ ۱۰ م: کچھ سے کچھ۔ ن: کچھ ہوگیا۔ ۱۱ م: جی
میں کھب گئی۔ ۱۲ ک، ف: مصاحب میں (ظاہراً غلطیِ طباعت)۔ [م، ن، ع: مصاحبت میں]
ص ۱۵ ۱ ک، ف، ع: ٹھنڈھک۔ [م، ن: ٹھنڈک]۔ ۲ ع: سامنے۔ ۳ ن
میں "سے" نہیں۔ ۴ ف: محلّ۔ ۵ ف: بر جواس۔ ۶ ف: محلّی۔ ۷ ع: دکان۔ ۸ ف:
محلّ۔ (۹) صرف یہ وضاحت کرنا ہے کہ م، ن، ک، ف، ع، سب میں اِس لفظ کا یہی املا
ملتا ہے (یعنی آخر میں الف ہے) چوں کہ سبھی نسخوں میں یہی املا ہے، اِس لیے اِسی املا کو برقرار رکھا
گیا ہے [بہ لحاظِ اصل "درماہہ" ہونا چاہیے۔ "درماہا" کو اُس کی مہنّد صورت کہا جا سکتا ہے۔]
۱۰ ف، ع: اُس کے پاس۔ ۱۱ ع: دکان۔ (۱۲) ک اور ف، دونوں میں "جواہرِ بیش
قیمت" ہے، یعنی "جواہر" کی "ر" کے نیچے اضافت کا زیر لگا ہوا ہے۔ م اور ع میں اضافت کا زیر
موجود نہیں۔ صورتِ حال یہ ہے کہ یہاں لفظِ "جواہر" کو مع اضافت بھی پڑھا جا سکتا ہے اور بغیر
اضافت بھی۔ دونوں صورتیں بہ لحاظِ قواعد بھی صحیح ہیں اور بہ اعتبارِ معنویت بھی درست ہیں۔ پہلے
ٹکڑے میں "خلعتیں، فاخرہ" ہے۔ چوں کہ "خلعتیں" اردو کی جمع ہے، اِس لیے اضافت کا سوال
ہی نہیں پیدا ہوتا۔ بہ ظاہر یہ خیال کیا جا سکتا ہے کہ پہلے ٹکڑے میں چوں کہ "خلعتیں فاخرہ" ہے، اِس
لیے حُسنِ بیان کے لحاظ سے دوسرے ٹکڑے میں "جواہر بیش قیمت" پڑھا جائے (اضافت کے
بغیر) لیکن بات وہی ہے کہ "خلعتیں" کی وجہ سے تاویل کی صورت نکل آئی ہے۔ چوں کہ صحیح دونوں
طرح ہے، اِس بنا پر محض ترجیح کے لحاظ ک، کی مطابقت اختیار کی گئی ہے اور "جواہر" کو مع اضافت
برقرار رکھا گیا ہے۔
ص ۵۲ ۱ ع: دکان۔ (۲) م، ک اور ع میں اِسی طرح (یعنی اضافت کے بغیر) ہے۔
ف میں "واقفِ کار" (مع اضافت) ہے۔ واقفِ راز، واقفِ حال، واقفِ اسرار، جیسے مرکبات

میں لفظ "واقف" عموماً مع اضافت آتا ہے، مگر "واقف کار" کی صورت اِس سے مختلف ہے اور وہ یوں کہ یہ مرکّب کم تر مع اضافت دیکھا اور سُنا گیا ہے اور بیش تر بغیرِ اضافت۔ نوریں "واقف کار" اضافت کے بغیر ہے۔ آصفیہ میں "واقفِ کار" مع اضافت ہے، مگر "واقف کاری" بغیرِ اضافت ہے اور مولّف نے اِسے "اُردو" مانا ہے۔ "واقف کار" کے معنی آصفیہ میں "کام سے واقف، کام جاننے والا، کاردان، آزمودہ، جہاں دیدہ، تجربہ کار، سرد و گرم چشیدہ" لکھے گئے ہیں۔ اور "واقف کاری" جسے مولّف نے اُردو مانا ہے، اُس کے معنی ہیں: "جان پہچان، علم، خبر، مہارت، تجربہ ....."۔ اگر "واقف کار" کام جاننے والے یا مہارت رکھنے والے کے معنی میں آئے، تب تو مع اضافت (واقفِ کار) مرجّح ٹھہرے گا، لیکن محرمِ راز اور شناسا کے مفہوم میں آئے تو اسے "واقف کار" بغیرِ اضافت لکھنا مرجّح معلوم ہوگا۔ بول چال میں آتا ہے کہ: "وہ ہمارے واقف کار ہیں"۔ یوں شاید ہی کوئی کہے کہ: "وہ ہمارے واقفِ کار ہیں"۔ زیرِ بحث جملے میں یہ مرکّب راز داں کے مفہوم میں آیا ہے۔ یہ اُردو والوں کا اندازِ استعمال ہے، اور اِس لیے یہاں یہ اضافت کے بغیر ہی مرجّح معلوم ہوتا ہے۔ اِسی بنا پر اِسے م اور ک کے مطابق برقرار رکھا گیا ہے۔ [میر امّن کی عرضی میں (جو شروعِ کتاب میں شامل ہے) اِسی قبیل کا ایک مرکّب "مختار کار" آیا ہے، اور وہ بھی اضافت کے بغیر ہے]۔

۳؎ ف: مجلّی۔ ۴؎ ف، ع: اور کہا کہ۔ ۵؎ ف: ذرّا۔ ع: زرا [م، ک: ذرا]۔ ۶؎ ف، ع: اور اپنے دل کو۔ ۷؎ ف: محلّ۔ ۸؎ ع: ملوادو۔ ۹؎ ف، ع: تھوڑے دنوں میں۔

(۱۰) ک: کہ جب سی سانجھ ہوتی۔ ف، ع: کہ جب سانجھ ہوتی۔ م، ن: کہ جب سہی سانجھ ہوتی۔ یہاں م کے متن کو ترجیح دی گئی ہے؛ اِس بنا پر کہ "سی سانجھ" بے معنی ٹکڑا ہے اور یہ غالباً غلطیِ طباعت ہے کہ "سہی" کے بجائے "سی" چھپ گیا۔ فاربس کی سمجھ میں "سی سانجھ" نہیں آیا ہوگا، اِس لیے اُس نے اِس لفظ ہی کو نکال دیا۔ "سہی شام" آصفیہ میں موجود ہے۔ مولّف نے اِسے "اُردو" اور "تابعِ فعل" لکھ کر مزید لکھا ہے: "صحیح سرِ شام"۔ مطلب یہ ہے کہ اصل لفظ تو "سرِ شام" ہے، اُس کی اُردو صورت "سہی شام" ہے۔ میر امّن نے اِس کو مزید اُردوایا اور "سہی سانجھ" بنا دیا۔ اِس موقع پر میں اپنے اِس خیال کا بھی اظہار کرنا چاہتا ہوں کہ میرے نزدیک "سرِ شام" کے مقابلے میں "سہی سانجھ" معنوی طور پر ذرا سی مختلف حیثیت رکھتا ہے۔ "سرِ شام" تو شام کا بالکل آغاز ہوا اور "سہی سانجھ ہوتی" سے مراد یہ ہے کہ جب اچھی طرح شام ہو جاتی،

یعنی "مہرِ شام" سے کچھ زیادہ۔ ۱۱؎ ع : شراب وکباب وعیش وعشرت۔ م، ن : شراب کباب عیش عشرت۔ ۱۲؎ ک : موزن۔ ۱۳؎ ک : ازان۔ ۱۴؎ ف، ع : محلی۔ ۱۵؎ م، ن : جنھوں نے کہ۔ ۱۶؎ ف، ع : مدت تلک۔ ۱۷؎ م : اسی طرح سے۔ ۱۸؎ م، ن : غرض ایک روز کا۔ ف، ع : ایک روز یہ اتفاق ہوا کہ۔ ۱۹؎ ف، ع : خواجہ سرا۔ ن : خواجہ۔ ۲۰؎ ف، ع : محلّی۔

ص ۵۳ ۱؎ م : اور زبان۔ ۲؎ م، ن میں "اور" نہیں۔ ۳؎ ف : نمک حرام۔ ۴؎ م، ن : نہیں آنے کا۔ ۵؎ ف : حق۔ ۶؎ ف، ع : تب ایسا کام۔ ۷؎ ف، ع : یہی ہے کہ۔

ص ۵۴ ۱؎ ن، ع : آپ کی۔ ۲؎ ف، ع : کہ گیا۔ ۳؎ ف، ع میں "اور" نہیں۔ (۴) صرف یہ صراحت کرنا ہے کہ ک، ف، ن میں اضافت کا زیر موجود ہے۔ ۵؎ ک : کوئیں۔ ن، ف، ع : کوئی۔ ۶؎ ن، ف، ع : یہ ہے کہ۔ ۷؎ ف، ع : پانچ ہزار روپلے۔ ۸؎ ن : اور۔ ۹؎ ف، ع میں "پاس" نہیں۔ ن : پاس بٹھایا تھا۔ ۱۰؎ ع : ملیّن۔

ص ۵۵ ۱؎ ف : خطّ۔ (۲) ک اور ف میں نون پر حرکت یا جزم موجود نہیں۔ ہاں ف کی فرہنگ میں یہ لفظ نون کے زبر کے ساتھ مندرج ہے۔ اصل کے لحاظ سے تو نون پر زبر ہی آنا چاہیے (پَرَوانگی)۔ پلیٹس کے لغت میں بھی اسی طرح مرقوم ہے۔ گفتگو کا احوال یہ ہے کہ ایسے بعض اور الفاظ کی طرح یہ لفظ بھی زبان سے ادا اِس طرح ہوتا ہے کہ نونِ ساکن کی سی کیفیت نمایاں ہو جاتی ہے۔ تلفّظ کی فصاحت اِسی طرزِ ادا کی طلب گار معلوم ہوتی ہے۔ یہ پہلو طلبہ کے پیشِ نظر ضرور رہنا چاہیے۔ ۳؎ ف، ع : جوان نے آداب بجالایا۔ (۴) صرف یہ صراحت کرنا ہے کہ ک میں اِس لفظ کو مع واوِ معروف ہی لکھا گیا ہے۔ ف، ع : روہٹ۔ (۵) ک : پھونیاں۔ (غالباً غلطیِ طباعت) م : پھوئیاں۔ ف، ع : پھوتھیاں۔ آصفیہ میں "پھوئیّاں" مع تشدید ہے۔ فیلن کے لغت میں "پھوئیاں" بغیرِ تشدید ہے۔ م کے متن کو ترجیح دی گئی ہے، کیوں کہ مستقل لفظ "پھوئیاں" ہے۔ ک میں اور فیلن کے لغت میں بھی اِسے مع واوِ معروف لکھا گیا ہے۔ ۶؎ ع : پڑ رہی تھیں۔ ۷؎ م، ن : کوند۔ ۸؎ ن : جوتیئے (ظاہراً غلطیِ کتابت)۔ ۹؎ ف : طاقوں پہ چنیں ہوئیں۔ ع : طاقوں پہ چنی ہوئی۔ ۱۰؎ م، ن : کہ وہ نہیں۔ ۱۱؎ ن : نزخیز (ظاہراً غلطیِ کتابت)۔ ۱۲؎ ن : بیٹھے بیٹھائے۔ ۱۳؎ ف، ع : مکان کو۔ ۱۴؎ ن میں "ہے" نہیں۔ ۱۵؎ م، ن : پھولا ہے۔ ع : پھولی ہے۔

ص ۵۶ (۱) طلبہ کے استفادے کے لیے اِس جملے کے ایک خاص پہلو کی طرف اُن کی توجہ

مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ م، ک، ف، ع میں شین کے نیچے اضافت کا زیر موجود ہے۔ قاعدے کے لحاظ سے بھی زیر آنا چاہیے۔ اگر لفظ "مانند" بھی مضاف ہوتا، یعنی "مانندِ فرشِ آئینہ" لکھا جاتا، تب آخر میں "کے" کی ضرورت نہ ہوتی۔ چوں کہ آخر میں "کے" موجود ہے، اِس لیے لفظ "مانند" کو اضافت کے ساتھ نہیں پڑھا جاسکتا؛ البتہ لفظ "فرش" کی اضافت برقرار رہے گی۔ شاید یہ خیال کیا جائے کہ "آئینے" یہاں مہنّد صورت میں آیا ہے، یوں اضافت محلِ نظر محسوس ہوتی ہے؛ لیکن یہ خیال درست نہیں ہوگا، اِس لیے کہ قدیم تحریروں میں اضافت کی یہ شکل عام طور پر ملتی ہے اور میر امّن کی تحریروں سے بھی اِس کی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔ "اضافتِ مہنّد" کو آج کل جس قدر محلِ نظر سمجھا جاتا ہے، اِس سے پہلے، یعنی میر امّن کے عہد میں (اور اُس کے ذرا بعد تک) یہ صورت نہیں تھی۔ ۲ م، ن: آتیں ہیں۔ ۳ م: اور موجیں لہراتیں ("ہیں" موجود نہیں)۔ ن: لہراتیں ہیں۔ ۴ ف، ع: دیکھ کر۔ ۵ ف، ع: میرے ہاتھ کو اپنے ہاتھ پر دھر کر۔ ۶ م، ن: ساری۔ (۷) ک اور ف میں "مجلس" کے سین کے نیچے اضافت کا زیر موجود نہیں، یعنی عبارت یوں ہے: "شمعِ مجلس حیران اور فانوسیں روشن تھیں"۔ م میں "مجلس" اور "شمع" دونوں لفظ مع اضافت آئے ہیں، یعنی "شمعِ مجلسِ حیران اور فانوسیں روشن تھیں"۔ دونوں صورتوں میں، یعنی "مجلس" کو مع اضافت پڑھا جائے یا بغیرِ اضافت، مفہوم میری سمجھ میں نہیں آسکتا۔ "مجلسِ حیران" یا "شمعِ مجلسِ حیران" یا مفرد لفظ "مجلس" اور "حیران" کے ایسے کوئی معنی مجھے کہیں نہیں ملے جن سے کوئی مطلب اِس مقام کے مناسب اخذ کیا جاسکتا۔ میں اِس ٹکڑے کو نہیں سمجھ سکا۔ میں نے ک کے مطابق نقل کر دیا ہے۔ مراد تو بس یہی ہے لکھنے والے کی کہ بہت ہی روشنی تھی، بہت سی شمعیں روشن تھیں۔ ہاں لفظ "حیران" کے نون پر م اور ک میں نقطہ موجود ہے۔ ایک یہ وضاحت رہ گئی تھی کہ اِس سطر میں اِس ٹکڑے سے پہلے "کنول اور فانوسِ خیال" آیا ہے، اُس ٹکڑے میں م میں "اور" موجود نہیں۔ (۸) صرف یہ صراحت کرنا ہے کہ م، ک، ف میں اضافت کا زیر موجود ہے۔ (۹) م، ن، ک، ف میں اِسی طرح ہے۔ یہ قدیم اندازِ نگارش ہے۔ ایسے جو لفظ اِس کتاب میں آئے ہیں، جن میں اصل نسخوں میں میم کی جگہ نون لکھا ہوا ہے [جیسے لنبا (لمبا)] اُن کے اِسی املا کو برقرار رکھا گیا ہے۔ یہاں بھی اِسی طریقِ کار کی پابندی کی گئی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ م اور ن میں یہ ٹکڑا اِس طرح ہے:

انار، گل ریز، داؤدی، مجھو چھنیا۔ ۱۰؎ م: ٹمٹارے (غلطیِ طباعت)۔ (۱۱) صرف یہ صراحت کرنا ہے کہ م، ک اور ف میں تشدید موجود ہے۔ (۱۲) مولوی سیّد احمد دہلوی نے فرہنگِ آصفیہ میں "چاندنی چھٹکنا" کے ذیل میں لکھا ہے کہ ہندوؤں کی بولی ہے۔" دلی کے مسلمان "چاندنی چھٹنا" یا "چٹکنا" زیادہ بولتے ہیں۔" دیگر اسناد سے قطعِ نظر، میر امّن کی یہ عبارت ہی اُن کے قول کو غلط ثابت کرنے کے لیے کافی ہے۔ ۱۳؎ م، ن: اُس کا پائیں باغ تھا۔ (۱۴) اصل لفظ "شُکل" ہے اور اِسی طرح مستعمل ہے، مگر اِس مثل میں یہ لفظ بہ فتحِ دوم آتا ہے، "بَکَل" کے قافیے کے طور پر۔ اور اِس مثل میں اِس لفظ کو اِسی طرح (بہ فتحِ دوم) پڑھنا چاہیے۔ ہاں یہ وضاحت بھی بے جا نہ ہوگی کہ آصفیہ میں یہ مثل اِس طرح مندرج ہے: "صورت نہ شکل، بھاڑ سے نکل۔" نور میں بھی اِسی طرح مندرج ہے۔ البتہ نور میں یہ صراحت ضرور ملتی ہے کہ: "اِس جگہ بول چال میں "شکل" بہ فتحِ اوّل و دوم ہے۔"

ص ۵۷ ۱؎ ف، ع: کہ یہ۔ ۲؎ ف: تحفۂ علّت۔ ۳؎ ف، ع: کہ یہ۔ ۴؎ م: اُس کی خاطر سے۔ ن: اِسی خاطر (اِس میں "سے" موجود نہیں)۔ ۵؎ م، ن: طوطے کو۔ ۶؎ م، ن میں "تھی" نہیں۔ ۷؎ ع: ہوجاوے۔ (۸) ن، م، ک، ف، ع؛ سب میں اِس لفظ کا یہی املا ہے۔ مرجّح صورت "تیزاب" ہوسکتی تھی، لیکن چوں کہ "تیز آب" بھی بامعنی ہے اور سبھی نسخوں میں یہی ہے، اِس لیے اِسی اِملا کو برقرار رکھا گیا۔ ۹؎ ع میں "بھی" نہیں۔ ۱۰؎ م، ن: وہ بھی چبلا۔ ۱۱؎ م، ن: اِس میرے درگذر کرنے کو۔ ع: اِس درگذر کرنے کو۔

ص ۵۸ (۱) دو باتیں صراحت طلب ہیں: (۱) ع میں یہاں "جیسے" ہے، اور بہ ظاہر یہی مرجّح معلوم ہوتا ہے، مگر م، ن اور ک میں "جیسی" ہے۔ م اور ک کی مطابقت اختیار کی گئی ہے، خاص کر یوں کہ "جیسی" کو یہاں کسی بھی لحاظ سے غلط نہیں کہا جاسکتا، اور جب تک واضح طور پر کوئی غلطی نہ ہو، اُس وقت تک اصل متن میں ترمیم کسی طرح مناسب نہیں ہوتی۔ (۲) ع میں اِس مثل کو یوں لکھا گیا ہے: "جیسے اوسر چوکے ڈومنی گاوے تال بے تال۔" م، ن، ک میں "چوکی" اور "گاوے" ہے اور اِسی متن کو اختیار کیا گیا ہے۔ آصفیہ میں بھی "اوسر چوکی ڈومنی ..." ہے۔ ۲؎ ع: کودے۔ (۳) اِس مثل کے پہلے جز میں سب نسخوں میں "کُون" ہے (بہ ضمِ کاف و واوِ مجہول) اِس لفظ کا تلفّظ ہے بھی یہی۔ دوسرے جز میں م میں

"گَون" (بہ فتحِ کاف) ہے اور ک میں "گُون" (بہ ضمِّ کاف و واوِ مجہول) ہے۔ یہ لفظ اُردو میں مستعمل ہے بہ فتحِ کاف، مگر فالَن نے نسخۂ ف کی فرہنگ میں اِسے بہ فتحِ کاف اور بہ ضمِّ کاف، دونوں طرح لکھا ہے اور پلیٹس کے لغت میں بھی "گُون" موجود ہے [اگرچہ اُس میں مستعمل صورت "گَون" ہی ہے]۔ اِن دو اندراجات سے بہ ظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ "گون" کا ایک تلفّظ "گُون" بھی رہا ہوگا، اگرچہ وہ استعمالِ عام میں اپنی جگہ نہیں بنا سکا۔ ک میں واو پر علامتِ مجہول واضح طور پر موجود ہے (اور اِس طرح "گُون" کا قافیہ "کُون" بہتر طور پر ہو سکتا ہے)۔ اب صورت یہ ہے کہ مستعمل لفظ "گَون" ہے اور م میں یہی ہے۔ ک میں "گُون" ہے (غالباً قافیے کی رعایت سے)۔ اِس طرح اِسے "گَون" بھی پڑھا جا سکتا ہے اور "گُون" بھی کہا جا سکتا ہے۔ میرے نزدیک م کے مطابق یہاں "گَون" (بہ فتحِ کاف) پڑھنا بہتر ہوگا [اِسی صفحے کے حاشیہ ۱۲ میں بھی م کے متن کو ترجیح دی گئی ہے]۔ ۱۳ ف، ع: اب یہ بہتر ہے کہ شاہزادی کو مار ڈالوں۔ ۱۴ م، ن، ع: ہو رہا تھا۔ [ک، ف: ہوئی رہا تھا]۔ (۶) ک، ف، ع میں "چکّی" ہے، م میں "چکئی" ہے۔ اگر اِس عبارت کو ذرا سی توجّہ کے ساتھ پڑھا جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ یہاں "چکئی" مناسب تر لفظ ہے اور اِس کی وجہ یہ ہے کہ پہلے جز میں "لٹّو" آیا ہے جس میں ایہام کا پہلو ہے۔ "لٹّو" کی لفظی مناسبت کا تقاضا یہاں یہی ہے کہ اِس جز میں "چکئی" ہو۔ بچّے لٹّو کی طرح چکئی کو بھی حسبِ دل خواہ گھماتے پھراتے ہیں اور یہ بات اِس عبارت کے مفہوم سے مکمّل مطابقت رکھتی ہے۔ ذرا سی تاویل کے ساتھ "چکّی" کی معنویت کو بھی روشن کیا جا سکتا ہے، مگر سارے قرائن دلالت اِسی پر کرتے ہیں کہ یہاں م کی مطابقت اختیار کی جائے اور "چکئی" کو ترجیح دی جائے۔ یہ بات بھی ذہن میں رہے کہ "چکئی" میں جو ہمزہ ہے، اُس کا تشدید بن جانا اور اِس طرح "چکئی" کا "چکّی" بن جانا کچھ ایسا غیر متوقّع نہیں۔ طباعت میں ایسی تبدیلیاں کبھی کبھی اپنی جگہ بہ آسانی بنا لیا کرتی ہیں۔ (۷) ک: پند ھلا کر۔ م: پھند ھلا کر۔ ن: پھنڈھلا کر۔ ف، ع: پنڈھلا کر۔ یہ لفظ آصفیہ میں موجود نہیں، فیلن کے لغت میں بھی نہیں ہے؛ البتّہ پلیٹس کے لغت میں "پندھلانا" موجود ہے۔ اِس کی ایک صورت "پنڈھلانا" بھی لکھی گئی ہے۔ ک میں "پندھلا کر" ہے اور اِسی کو ترجیح دی گئی ہے۔ ۱۵ م، ن: سے۔

ص ۵۹ ۱۶ ف: ناحق۔ ۱۷ م میں اِس کے بعد ہندی رسمِ خط میں "छे" لکھا ہوا ہے۔

ن میں یہاں کوئی لفظ نہیں۔ (۳) یہ شعر سودا کا ہے اور کلیاتِ مطبوعہ، نیز کلامِ سودا کے نسخۂ جانسن (خطی) میں موجود ہے۔ نسخۂ جانسن میں "مبادا" کی جگہ "مباد" ہے۔ ۴ہ ع: نہ کیجیو۔ ۵ہ ف اور ع میں "اور" نہیں۔ ۶ہ م، ن: باہر شہر کے لٹکا دیا۔ ۷ہ ف، ع: پیے۔ ۸ہ م، ن: نکھیں تھیں۔ [ک میں "نکھی" پر تشدید موجود ہے]۔ ۹ہ م، ن: کرم کی رکھا مٹتی نہیں۔ ۱۰ہ ۱۱ہ م میں دونوں جگہ "نہ" موجود نہیں۔ ت: جیتا نہ رکھوں یا کسو کو منہ دکھاؤں۔ ۱۲ہ ف، ع: دیکھیے کہ۔

ص ۹۰ ۱ہ ف، ع: کو۔ ع: دکان (م، ن، ک، ف: دوکان)۔ ۲ہ ن میں "ہے" نہیں۔ ۳ہ ن: اُترا۔ ۴ہ ف: اُٹھے۔ ۵ہ ف، ع: بجز۔ (۶) سب نسخوں میں اس لفظ کا املا یہی ہے، یعنی آخر میں الف ہے۔ (۷) سب نسخوں میں یہی ہے۔ غالباً "اُس کی" سے مراد "اُسی طرح کی مہمان داری" سے ہے۔ ۸ہ ف، ع: گھر کو۔ (۹) صرف یہ صراحت کرنا ہے کہ م، ک، ف میں اضافت کا زیر موجود ہے۔

ص ۹۱ ۱ہ م، ن: ملک میں تشریف رکھتے تھے۔ ع: ملک میں تشریف لے گئے تھے۔ (۲) بہ لحاظِ اصل ج پر زبر ہے (ماجَرا) لغات میں بھی اسی طرح مرقوم ہے، مگر گفتگو کا احوال یہ ہے کہ یہ لفظ زبان سے ادا اس طرح ہوتا ہے جیسے ج پر جزم ہو اور گفتگو کی فصاحت اسی تلفظ کی متقاضی ہے اور اسی طرح بولنا چاہیے۔ ۳ہ ف، ع: کہا کہ۔ ۴ہ م، ن: وہ۔ ۵ہ م، ن: میں نے۔

ص ۹۲ ۱ہ م، ن: دیکھے۔ (۲) ک اور ف میں یہاں "خان ساماں" ہے، مگر م میں "خانساماں" ہے۔ یہ لفظ اس کتاب کے آخر میں بھی آیا ہے: "آخر یمن کے خواجہ زادے کو خانساماں اور بہزاد خاں کو میر بخشی .... کیا" اور وہاں ک اور ف دونوں میں "خانساماں" ہے۔ چوں کہ م میں "خانساماں" ہے اور ک اور ف میں بھی یہ املا ایک جگہ موجود ہے، اسی بنا پر یہاں بھی "خانساماں" لکھا گیا ہے (آج کل عموماً اسی طرح لکھتے ہیں)۔ (۳) صرف یہ صراحت کرنا ہے کہ م، ک، ف میں "ی" کے نیچے اضافت کا زیر موجود ہے۔ (۴) یہ صراحت مقصود ہے کہ ک میں میم پر زبر موجود ہے۔ ۵ہ م، ن: اور۔ ۶ہ ع: اتماں۔ ۷ہ ک، ف، ع، م، ن: مردا۔ ۸ہ م، ن: حکم دیا۔ ۹ہ ف، ع: نکال کر۔ (۱۰) صرف یہ صراحت مقصود ہے کہ ک میں "خوری" کو مع واوِ معدولہ لکھا گیا ہے۔

۱۱ ف: حق

ص ۹۳ ۱ ف: حق۔ (۲) محض احتیاطاً یہ صراحت کرنا ہے کہ ک میں "جان" کے نون پر نقطہ موجود ہے۔ ۳ ن: میں نے کہا۔ ۴ ن: اور نہیں یہ فدوی بجالادے (کذا)۔ ۵ ک: زبابرار (ف، ع: فرماں بردار)۔ ۶ ف: خاص۔ ۷ ن: اور اتر کر۔ ۸ ع: ناشتہ [ن، ک، ف: ناشتا۔ صحیح املا بھی یہی ہے]۔ ۹ ن: اور ان میں یوں کہتی۔

ص ۹۴ ۱ ن: ملک و مال ماں باپ سب چھوڑے۔ (۲) ک، ف، ع: تینوں نسخوں میں "ظالم" کے میم کے نیچے اضافت کا زیر لگا ہوا ہے۔ اِس ٹکڑے میں اِس لفظ کو مع اضافت بھی پڑھا جا سکتا ہے اور بغیرِ اضافت بھی۔ بات چیت اور بول چال کے لحاظ سے ذاتی طور پر مجھے اضافت کے بغیر مرجّح معلوم ہوتا ہے، یعنی "اُس ظالم، بے وفا کی طرح"۔ چوں کہ تینوں نسخوں میں اضافت کا زیر موجود ہے اور بہ لحاظِ قواعد اِس طرح بھی صحیح ہے اور فصیح بھی ہے؛ اِس بنا پر اصل کی مطابقت اختیار کی گئی ہے اور اضافت کا زیر لگایا گیا ہے۔ ہاں یہ بھی لکھنا ضروری ہے کہ ک کے متن میں "ظالم بیوفا" چھپا ہوا ہے، غلط نامے میں یہ ہدایت ملتی ہے کہ اِسے "ظالِمِ" بنا لیا جائے اور اِس سے اِس بات کی تصدیق ہو جاتی ہے کہ میم کے نیچے اضافت کا زیر ضروری ہے۔ غالباً یہ تصحیح اِس لیے غلط نامے میں شامل کی گئی ہے کہ پڑھنے والا یہ نہ سمجھے کہ "ظالِم" میں جو ایک زیر ہے، ممکن ہے یہ لام سے متعلق ہو؛ اِس اشتباہ سے بچانے کے لیے لام اور میم دونوں کے نیچے زیر لگانے کی ہدایت کی گئی ہے۔ (۳) ک میں اِس لفظ پر اعراب موجود نہیں۔ قاعدے کے لحاظ سے "ماندگی" کے دال پر زبر آنا چاہیے، مگر بول چال میں یہ لفظ زبان سے ادا اِس طرح ہوتا ہے کہ دال پر جزم محسوس ہوتا ہے۔ تلفظ کی فصاحت کا تقاضا یہی ہے کہ اِسے "ماندگی" کہا جائے۔ ۴ ن، ع: چرند پرند۔ ۵ ن: چقمق۔ ۶ ن: وہ۔ ۷ صرف یہ صراحت کرنا ہے کہ سب نسخوں میں اِس لفظ کا یہی املا ہے، یعنی آخر میں الف ہے [صحیح املا بھی یہی ہے]۔ ۸ ن: کنارے ہوکر۔ ۹ ن میں "یا" نہیں۔ ۱۰ ن: بیٹھاکر۔ ۱۱ ع: نواڑی کے۔ (۱۲) صرف یہ وضاحت کرنا ہے کہ "گزارا" اگرچہ اب عام طور پر دوسرے معانی میں استعمال میں آتا ہے [جیسے: گزارے کی رقم دے دی گئی۔ گزارے بھر کو تو مل ہی جاتا ہے۔ اب ہمارا اِس گھر میں گزارا نہیں ہوگا (وغیرہ)] مگر قدیم اساتذہ نے گزر جانے، پار اُتر جانے کے معانی میں بھی اِس لفظ کو استعمال کیا ہے، مثلاً: جب تک نہ غلامانِ علی کا ہو گزارا؛ رضوان پکارے ہے کہ جنّت نہیں ملتی (رشک لکھنوی)

ص ۹۵ ① یہ صراحت کرنا ہے کہ ک، میں اِس لفظ کو مع یائے مخلوط (پیہاسا) لکھا گیا ہے۔ نیز اِس جملے کے دوسرے ٹکڑے میں لفظ "ذرا" آیا ہے، ک میں "ذرا" ہی ہے، ف میں "ذرّا" ہے اور ع میں "زرا" ہے۔ ۳ھ ن: گاچھ کے نیچے۔ ④ ک اور ف میں اِس لفظ پر اعراب موجود نہیں، البتہ ف کی فرہنگ میں اِسے "پَچّھَم" لکھا گیا ہے۔ آصفیہ اور نور دونوں میں "پَچّھَم" ہی ہے، اِسی بنا پر اِسے بہ فتحِ اوّل و دوم رکھا گیا ہے۔ یہ صراحت خاص کر یوں کی گئی کہ تلفّظ میں یہ لفظ "پَچّھَم" اور "پِچّھَم" دونوں طرح آتا ہے۔ پلیٹس اور فیلن کے لغات میں بھی اِس لفظ کو دونوں طرح درج کیا گیا ہے، مگر جیسا کہ فیلن کے اندراج سے ظاہر ہے، مرجّح بہ فتحِ دوم ہے، بہ کسرِ دوم کو اُس نے مشرقی علاقے کی زبان بتایا ہے۔ ہاں یہ بھی ذہن میں رہے کہ "پَچّھاں" اِسی پَچّھَم (بہ فتحِ دوم) کی ایک صورت ہے اور اِس سے بھی بہ فتحِ دوم کی ترجیح ظاہر ہے۔ ۴ھ ن: دوڑ جاتا۔ ⑤ صرف یہ صراحت مقصود ہے کہ ک، ف، ن کسی نسخے میں بھی اِس لفظ میں تشدید موجود نہیں۔ ہاں ک میں دوسرے حرف پر زبر موجود ہے (دَکھن)۔ یہ لفظ مع ہائے مخلوط اور بغیر ہائے مخلوط، دونوں طرح مستعمل ہے۔ آصفیہ میں بھی "دَکھن یا دَکن" (تشدید کے بغیر) دونوں صورتیں موجود ہیں۔ چوں کہ پیشِ نظر سبھی نسخوں میں یہ لفظ مع ہائے مخلوط ہے، اِس بنا پر اِسی املا کی پابندی اختیار کی گئی ہے۔

۶ھ ف: جتن۔ ۷ھ ن: لے بھرا۔ ۸ھ ن: پڑا رہتا۔

ص ۹۶ ① ک میں "نشان" کے آخری نون پر نقطہ موجود ہے۔ ۲ھ ن: اُس جنگل میں ایک پہاڑ نظر آیا تب میں اس پر چڑھ گیا۔ ۳ھ ن: ایسی مصیبت کی زندگی سے۔ ۴ھ ن: آ گیا ہوش۔ ⑤ ف میں رے کے نیچے اضافت کا زیر موجود ہے (سوارِ سبز پوش) مگر ک میں اضافت کا زیر موجود نہیں (جب کہ اِس نسخے میں اِس کا التزام ملتا ہے)۔ یہ لفظ صحیح دونوں طرح ہے۔ مع اضافت تو قاعدے کی رو سے صحیح ہے اور بغیر اضافت روزمرّہ کے لحاظ سے درست ہے اور یہ معلوم ہے کہ میر امّن کے یہاں عام رجحان یہ ملتا ہے کہ قواعد کے مقابلے میں روزمرّۂ اہلِ زبان کو ترجیح دی جائے۔ اِسی بنا پر اِس مرکّب کو ک کے مطابق اضافت کے بغیر ہی برقرار رکھا گیا ہے۔ ۶ھ ک، ف: تجھ سار کھے۔ [بہ ظاہر یہ غلطیِ کتابت ہے۔ ف میں ک کی نقل کی بنا پر یہ منتقل ہوئی ہوگی] ن اور ع میں "تجھ سا رکھے" ہے اور یہی صحیح صورت ہے، اِس بنا پر یہاں ن اور ع کی مطابقت اختیار کی گئی ہے۔ ۷ھ ن: فرمانے سے اور آپ کے آنے سے۔ ۸ھ ع: غلّی رفو۔ ⑨ محض احتیاطاً یہ

صراحت کی جاتی ہے کہ ک میں اسی طرح، یعنی "کَتّھن" (بہ کسرِ ثانی) نہیے۔

ص ۹۷ ؁ ن: جمع کر کر۔ ؁ ن: جو جو کچھ۔ ؁ ن: لکھیں تھیں۔ ؁ ن: اور باہم۔ ⑤ ک میں دونوں لفظوں میں نون پر نقطہ موجود ہے۔ ؁ ن: خورمی سے بدلا ہو۔ ؁ ع: چھپا ہوا۔ ⑧ محض احتیاطاً صراحت کی جاتی ہے کہ ک میں اس لفظ کو اسی طرح، یعنی مع یائے مخلوط (دھیان) لکھا گیا ہے۔ ؁ ک، ف: سنّے۔

(سیر دوسرے درویش کی)

ص ۹۸ ؁ ن: دوسرے درویش کی جب کہنے کی۔ ② ن میں اشعار سے پہلے لفظ "ابیات" ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ شعر خود میر امّن کے ہیں۔ ؁ ف: فن۔ ④ ک میں "اِصفِہان" ہے یعنی ف کے نیچے بھی زیر ہے۔ ص ۱۶۳ پر بھی یہ لفظ آیا ہے اور وہاں بھی ک میں "اِصفِہان" ہے (ک ص ۱۶۲)۔ ف میں "اِصفہان" ہے، یعنی ف پر حرکت موجود نہیں، مگر اس کی فرہنگ میں ISFAHĀN لکھا گیا ہے۔ فارسی لغات میں اسے فائے مفتوح کے ساتھ لکھا گیا ہے (برہانِ قاطع۔ غیاث اللغات)۔ اس کی ایک صورت "صفاہان" یا "سپاہان" بھی ہے اور اس سے ف کے زبر کی تائید ہو جاتی ہے۔ یہ ایک شہر کا نام ہے۔ یہ لفظ اُردو میں بھی عام طور پر ف کے زبر کے ساتھ زبانوں پر آتا ہے۔ اس کے باوجود میں نے ک کی مطابقت کو ضروری سمجھا ہے، اس خیال سے کہ مصنّف نے اسی طرح لکھا ہوگا (ایسے اختلافات عام طور پر پائے جاتے ہیں) اسی لیے ک کے مطابق ف کے نیچے زیر کو برقرار رکھا ہے۔ اگر یہ لفظ صرف ایک جگہ آیا ہوتا، تب تو غلطیِ طباعت کا احتمال بھی پیدا ہو سکتا تھا، مگر دو جگہ ایک ہی طرح اس کا پایا جانا اس پر دلالت کرتا ہے کہ یہ طباعت کی غلطی نہیں۔ ک میں "جہان" کے نون پر نقطہ نہیں، مگر "اصفہان" کے نون پر (دونوں جگہ) نقطہ ملتا ہے۔ ص ۱۶۳ پر تو یہ لفظ ترکیبِ فارسی کے ساتھ آیا ہے اور نقطہ وہاں بھی موجود ہے۔ ع میں بھی ان دونوں مقامات پر اس نون پر نقطہ ملتا ہے۔ میں نے یہی مناسب سمجھا ہے کہ دونوں مقامات پر "اصفہان" لکھا جائے، یعنی نون کے نقطے کو برقرار رکھا جائے۔ بہ ظاہر "نصفِ جہان" کی رعایت سے "اصفہاں" بہتر معلوم ہوتا ہے، مگر صورتِ حال یہ ہے کہ یہاں اگر "اصفہان" پڑھا جائے، تب بھی کوئی خرابی یا غلطی واقع نہیں ہوگی اور یوں اصل سے انحراف

ضروری نہیں۔ یہ صراحت بھی ضروری ہے کہ کے اور ف دونوں میں اضافت کا زیر موجود ہے۔ (۵) ک میں ٹی پر تشدید ہے اور رے کے نیچے اضافت کا زیر ہے، مگر ٹی پر نہ زبر ہے نہ زیر۔ ف میں "نَیّرِ" ہے۔ یعنی ن پر زبر ہے، ٹی پر تشدید ہے اور اُس کے نیچے زیر بھی ہے اور رے کے نیچے اضافت کا زیر ہے۔ اصل لفظ "نَیِّر" ٹی کے زیر کے ساتھ ہی ہے۔ آصفیہ میں بھی "نَیِّر" ہے۔ ف کی مطابقت میں ٹی کے نیچے زیر لگایا گیا ہے۔ [اُردو والے اب عموماً "نَیَّر" کہتے ہیں۔ اِس لفظ کی بحث، راقم الحروف کی کتاب زبان اور قواعد میں دیکھی جا سکتی ہے]۔ (۶) ک اور ف میں "طبع" پر حرکات موجود نہیں، مگر ف کی فرہنگ میں اِسے "طَبْع" لکھا گیا ہے (اصل کے لحاظ سے بھی اِسی طرح ہے) اِسی بنا پر ب پر جزم لگایا گیا ہے۔ (۷) ک اور ف میں اضافت کا زیر موجود ہے۔ (۸) ک اور ف میں تشدید موجود ہے۔ (۹) ک اور ف میں اِس لفظ پر اعراب موجود نہیں، مگر ف کی فرہنگ میں اِسے سین ساکن کے ساتھ لکھا گیا ہے (اصلاً بھی اِسی طرح ہے) اِسی نسبت سے سین پر جزم لگایا گیا ہے (۱۰) ک اور ف میں تشدید موجود ہے۔ لله ن: میں۔

ص ۶۹ (۱) ک اور ف میں اضافت کا زیر موجود ہے۔ (۲) ف یہ صراحت کرتا ہے کہ ک اور ف میں ن مفتوح ہے۔ اصلاً بھی اسی طرح ہے (المنجد)۔ (۳) شاید کسی کے ذہن میں یہ خیال آئے کہ یہاں "دشمنیِ کمال" (مع اضافت) بھی ہو سکتا ہے، تو اِس سلسلے میں یہ کہنا ہے کہ (ا) ک، ف، ع؛ کسی نسخے میں اضافت کا زیر موجود نہیں [جب کہ ک اور ف میں عمومی طور پر اِس کا اہتمام ملتا ہے] (۲) پڑھنے میں بھی اضافت کے بغیر ہی بہتر معلوم ہوتا ہے (۳) اِسی داستان میں ذرا آگے چل کر "اگر تجھے آرزو کمال ہے کہ یہ ماہیت دریافت کرے" آیا ہے اور اِس جملے میں لفظ "آرزو" لازماً اضافت کے بغیر آیا ہے (ورنہ آرزوے کمال لکھا جاتا)، اور یہ بھی ایک اعتبار سے دلالت کرتا ہے اِس پر کہ مصنّف نے یہاں بھی "دشمنی کمال ہوئی" اضافت کے بغیر ہی لکھا ہوگا۔ ٭ ن: کھو۔ ٭ ع: چُھپا۔ ٭ ن، ک، ف: چُھپنے لگے۔

ص ۷۰ (۱) ک اور ف میں اِسی طرح (یعنی دو ہ کے ساتھ) ہے۔ اِسی املا کو برقرار رکھا گیا ہے۔ (۲) ک میں تشدید موجود ہے۔ (۳) ن، ک، ف، ع: سب نسخوں میں "سے" موجود نہیں۔ یعنی جملہ یوں ہے: "بادشاہ اتنے روپے دلاوے گا۔" واضح طور پر یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہاں "بادشاہ سے" ہونا چاہیے، تبھی فعل "دلاوے گا" کی معنویت کی تکمیل ہوگی۔ اور اِس سے پہلے جو جملہ ہے ("ہمارے ہاتھ حاتم کا ہے کو

آدے گا") اُس سے صاف صاف معلوم ہوتا ہے کہ دوسرے جملے کے فعل کا تعلق حاتم ہی سے ہے۔ اِس کا قوی امکان ہے کہ "بادشاہ" کے بعد "سے" پہلی بار چھوٹ گیا ہو اور پھر ہر نسخے میں یہ جملہ اُسی طرح (یعنی "سے" کے بغیر) نقل کیا جاتا رہا۔ اگر اِس جملے کو علیٰ حالہٖ رکھا جائے تو اُس صورت میں نقل مطابقِ اصل کا حق تو ادا ہو جائے گا، مگر جملے کی معنویت ناتمام رہے گی۔ محض اِس بنا پر یہاں "سے" کا اضافہ کیا گیا ہے اور امتیاز کے لیے اُسے قوسین میں لکھا گیا ہے۔ پوری کتاب میں بس یہی ایک مقام ایسا ہے جہاں کسی لفظ کا اضافہ مرتب کی طرف سے کیا گیا ہے۔ ۴؎ ن : بہہ۔ ⑤ "قصائی ہے" کے بعد ن میں لفظ "بیت" ہے۔ ⑥ یہ شعر خواجہ میر دردؔ کا ہے اور اُن کے دیوانِ مطبوعہ میں موجود ہے۔ ۷؎ ف، ع : اور جو کچھ۔ ۸؎ ع : اقرار۔ ۹؎ ن : بہود۔ ۱۰؎ ن، ف، ع : کیا جانے۔ ۱۱؎ ف، ع : تجھ کو اپنی طمع کی خاطر۔

ص ۱۷۱ ۱؎ ف : کئی دن۔ ۲؎ "آخر... جواب دوں گا" یہ عبارت ن میں موجود نہیں۔ ۳؎ ن میں "کہ" نہیں۔ ۴؎ ن : پہاڑ کے کھوہ میں۔ ۵؎ ع : چھپا۔ ۶؎ ع : ملی۔ ۷؎ ف، ع : آ پہنچے۔ ۸؎ ع : اور کون۔

ص ۱۷۲ ① سب نسخوں میں "جو قبول کیا ہے" ہے۔ یہ بات ذہن میں آتی ہے کہ یہاں اگر "قول" ہوتا تو بہتر ہوتا، کیوں کہ اِس عبارت میں ساری مناسبتیں اُسی کی ہیں۔ چوں کہ سب نسخوں میں "قبول" ہے اور تاویل کے ساتھ معنی نکل ہی آتے ہیں، اِس لیے اُسی کو برقرار رکھا گیا ہے اور یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ مصنف نے اِسی طرح لکھا ہوگا۔ ② آصفیہ میں یہ مثل اِن الفاظ میں موجود نہیں (کسی اور لغت میں بھی اِس طرح نہیں ملی) آصفیہ میں یہ مثل ضرور مندرج ہے (مؤلف نے اِسے "محاورہ" قرار دیا ہے) : "منہ میں زبان حلال ہے" اور اِس کی تشریح اِس طرح کی گئی ہے : "منہ میں زبان سچ اور حق بات کے واسطے ہے۔ زبان برحق ہے، یعنی آدمی کے منہ میں زبان ہی قابلِ اعتبار اور وثوق ہے۔ حلال اِس واسطے کہا کہ آدمی حلال اور مباح چیز کو ہی منہ تک لے جاتا ہے، اگر یہ حرام ہوتی تو منہ میں نہ رہتی : منہ میں زبان حلال ہے، سوچو کہا تھا کیا، تم پھر گئے قرار سے، میں تو پھرا نہیں۔ (حیا)" ۳؎ ن : بیچارے۔ ۴؎ ن، ک، ف : پاؤں۔ ع : پاتو۔ ۵؎ ن : راستی۔ ۶؎ ف، ع : کہا کہ۔ ۷؎ ن : دعویٰ حاتم کے پکڑ لانے کا۔ ۸؎ ن : ان کا بھیجا نکل پڑے۔ ⑨ صرف یہ وضاحت کرنا ہے کہ ک اور ف میں تشدید موجود ہے۔ ۱۰؎ "اور جھوٹ

…… سزا پاتے ہیں" یہ عبارت ن میں موجود نہیں، صرف یہ ٹکڑا ہے: "اور جھوٹھ کے جاتے ہیں"۔ ظاہر ہے کہ یہ کتابت کی فروگذاشت ہے۔ (۱۱) ک، ف، ع میں اسی طرح، یعنی آخری لفظ "موٹھ" بھی مع ہائے مخلوط ہے۔

ص ۷۳ ۱؎ ن: رکھنا۔ ۲؎ ن: اور حاتم کا مال و اسباب اور ملک املاک جو کچھ ضبط کی تھی، وہ نہیں چھوڑ دی۔ (۴) صرف یہ صراحت کرنا ہے کہ ک اور ف میں حق کے نیچے زیر موجود ہے۔ ۳؎ ک: دانا۔ (ف، ع: دانہ)۔ (۵) ک اور ف میں اضافت کا زیر موجود ہے۔ (۶) ک اور ف میں اضافت کا زیر موجود ہے اور آخری نون پر نقطہ بھی موجود ہے۔

ص ۷۴ ۱؎ ن: ہوا۔ ۲؎ ع: سامنے۔ (۳) طلبہ کی توجہ اس طرف مبذول کرائی جاتی ہے کہ "لالچ" سے اصولاً "لالچی" ہونا چاہیے، مگر یہ لفظ تلفّظ میں کچھ اس طرح آتا ہے جیسے دوسرے لام پر جزم ہو۔ تلفّظ کی فصاحت کا تقاضا یہ ہے کہ اسے اسی طرح استعمال کیا جائے۔ ۳؎ ن: بہہ۔

ص ۷۵ ۱؎ ن میں "لے کر" نہیں۔ (۴) ک اور ف دونوں میں "قِطع" ہے، یعنی قاف کے نیچے زیر ہے، باقی دونوں حرف خالی ہیں، مگر ف کی فرہنگ میں اسے بہ فتحِ اوّل و سکونِ آخر "قَطْع" لکھا گیا ہے۔ اصلاً "قَطْع" ہی ہے اور لغات میں بھی اسی طرح مندرج ہے۔ میں یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتا قاف کے زیر کے متعلق؛ اس کا امکان ہے کہ مصنّف نے اسی طرح لکھا ہو، یوں کہ اُن کی زبان پر اسی طرح ہو، اور یہ کہ اُس زمانے میں کچھ لوگ اسی طرح بولتے ہوں۔ میں نے بہ طورِ احتیاط اس لفظ پر اعراب نہیں لگائے ہیں۔ اسے "قَطْع" پڑھا جائے تو اصل کے لحاظ سے اور ف کی فرہنگ کے اندراج کے لحاظ سے درست ہوگا۔ اور اسے "قِطع" کہا جائے تو یہ ک کے مطابق درست ہوگا۔ ک اور ف میں ط خالی ہے، اگرچہ ف کی فرہنگ میں وہ ساکن ہے (بہ لحاظِ اصل اسی طرح ہے) البتہ ایسے بعض اور لفظوں (مثلاً نفع، جمع) کی طرح اُردو والوں کی زبان پر یہ لفظ آتا اس طرح ہے جیسے ط پر زبر ہو۔ یہ پہلو بھی پیشِ نظر رہنا چاہیے۔ ۳؎ ن: اور قسم دی۔

ص ۷۶ (۱) ک، ف، ع: دھر۔ ن: دھار۔ مستعمل "دھار مارنا" ہے اور یوں ن کا متن مرجّح معلوم ہوتا ہے، مگر دو باتیں اس کو قبول کرنے میں مانع ہیں: ایک تو یہ کہ ک اور ف دونوں نسخوں میں اس کی تکرار ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ پلیٹس کے لغت میں یہ لفظ موجود ہے اور مع صراحت یوں کہ

اِس کا امکان ہے کہ اُس زمانے میں یہ لفظ اِس طرح بھی مستعمل رہا ہو (اور یہ امکان کچھ بعید از قیاس نہیں؛ بہت سے لفظوں کا یہ احوال ملتا ہے)۔ پھر یہ بات بھی ہے کہ یہ لفظ ایک فقیر کی گفتگو میں آیا ہے اور اُس زمانے کے (اور اِس زمانے کے بھی) ایسے فقیروں کی بات چیت میں بہت سے لفظ استعمالِ عام سے مختلف ملتے ہیں؛ اِن وجوہ سے میں نے یہ مناسب نہیں سمجھا کہ اِسے بدل دیا جائے اور اِس کے بجائے "دھار" لکھا جائے۔ ن کے نسخے کا کاتب، جیسا کہ لکھا جا چکا ہے، خاصا بے احتیاط ہے اور اُس نے بہت سی غلطیاں بھی کی ہیں، اِس بنا پر کسی ثبوت یا واضح قرینے کے بغیر کسی خاص مقام پر ک، اور ف پر اُس کو ترجیح دینا تقاضاے احتیاط کے خلاف ہوگا۔ ۲؎ ن، ک، ف: سنّے سے۔ ۳؎ ن: سلطنت ملے پر۔ ۴؎ ف: متعدد۔ ⑤ ک میں دوسرے میم پر پیش لگا ہوا ہے۔ (اُردو والوں کی زبان سے سُنا بھی اِسی طرح گیا ہے) اِسی کی مطابقت اختیار کی گئی ہے۔ [اصل کے لحاظ سے "مُہام" ہے (غیاث اللغات)] ف: مدار المہام۔ ۶؎ ف: میں۔ ۷؎ ف: سرحد۔ ۸؎ ن میں "سے" نہیں۔ ۹؎ "مقام کرتا ۔۔۔ ایک مکان" یہ عبارت ن میں موجود نہیں (ظاہراً غلطیِ کتابت)۔

ص ۷۷ ① ک اور ف میں اضافت کا زیر موجود ہے۔ حُسنِ عبارت کا بہ ظاہر یہ تقاضا معلوم ہوتا ہے کہ یہاں اضافت نہ ہو اور "خوش لباس" اور "نیک خو" کی طرح "شکیل" کو بھی بہ طورِ صفت پڑھا جائے؛ مگر یہاں اضافت کا زیر برقرار رکھا گیا ہے؛ اِس وجہ سے کہ اگر اِس کو مع اضافت پڑھا جائے، تب بھی بہ لحاظِ قواعد کسی طرح کی غلطی واقع نہیں ہوگی اور معنویت میں بھی کسی طرح کی کمی نہیں آئے گی۔ ایسی صورتوں میں جب کہ کسی طرح کی غلطی واقع نہ ہو رہی ہو، اصل کی مطابقت مرجّح قرار پائے گی اور اِسی اصول کی بنا پر یہاں بھی اصل کی مطابقت اختیار کی گئی ہے۔ اِس ترجیح کی ایک وجہ اور بھی ہے: ص ۱۰۹ پر ایسی ہی ایک ترکیب موجود ہے: "اتفاقاً سودائیوں کے غول میں ایک جوانِ خوب صورت شکیل ۔۔۔ نظر پڑا"۔ ک اور ف میں اضافت کا زیر موجود ہے۔ اِس سے معلوم ہوا کہ اِن ٹکڑوں میں پہلے جز کو مع اضافت بھی لکھا گیا ہے؛ اِسی بنا پر اِن دونوں مقامات پر اصل کی مطابقت اختیار کی گئی ہے اور اضافت کے زیر کو برقرار رکھا گیا ہے۔ ② ک اور ف میں اضافت کا زیر موجود ہے۔ ۳؎ ع: قدم رنج۔ ④ محض احتیاطاً یہ صراحت کی جاتی ہے کہ ک اور ف میں بَ کے نیچے زیر موجود ہے۔ صحیح صورت بھی یہی ہے۔ آصفیہ میں بھی بَ مکسور ہے۔ ⑤ ک اور ف میں اضافت کا زیر موجود ہے۔ ۶؎ ن: ایک دالان میں لے جا کر بٹھایا۔ ⑦ ک، ف، ع میں

یہی املا (پاتو) ہے۔ شہ ن میں "اور" موجود نہیں۔ (۹) اِس عبارت میں اِس سے پہلے جن کھانوں کے نام آئے ہیں، اُن میں پلاؤ چار طرح کا ہے۔ اِسی طرح اِس کے بعد جو لفظ "روٹیاں" آیا ہے تو اُن کی سات قسمیں گنائی گئی ہیں، یہی صورت "کباب" کی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اصل نام کے بعد اُس کی مختلف قسمیں لکھی گئی ہیں۔ اِس پر اگر نظر رکھی جائے تو زیرِ نظر ٹکڑے میں بھی "قلیے" اصل نام قرار پائے گا اور "دوپیازہ، نرگسی، بادامی، روغن جوش" اُس کی قسمیں ہوں گی۔ ایک یہ سوال پیدا ہوسکتا ہے کہ دوپیازہ ہو یا روغن جوش، ہمارے زمانے میں اِنھیں قلیے کی اقسام میں شمار نہیں کیا جاتا۔ قلیہ تو اُس سادہ گوشت کو کہتے ہیں جسے "گھی میں بھون کر شوربے دار پکائیں"۔ شوربے کے لحاظ سے اِسے قورمے کا متضاد کہیے [قورمے میں شوربا نہیں ہوتا تھا]۔ یہی وجہ ہے کہ قلیے کو بیماروں کا کھانا فرض کر لیا گیا ہے۔ دوپیازے میں شوربا نہیں ہوتا۔ پھر "نرگسی" اور "بادامی" بجائے خود کھانوں کے نام نہیں، صفات ہیں (جیسے: نرگسی کوفتے)۔ ایک صورت یہ ہے کہ "قلیے" کے بعد کاما لگایا جائے، یعنی یہ مان لیا جائے کہ صرف اِس کھانے کا نام لیا گیا ہے، اِس کی اقسام مذکور نہیں۔ اِس کے بعد "دوپیازہ" کو دوسرا نام مانا جائے اور اب "نرگسی" اور "بادامی" کو اِس کی اقسام میں شمار کیا جائے۔ یہ معلوم ہے کہ میر امّن نے نوطرزِ مرصّع کو اصلاً سامنے رکھا ہے، اُس میں اِس مقام پر یہ عبارت یوں ہے: "قلیہ و دوپیازہ، نرگسی و شیرازی و زعفرانی و بادامی"۔ (اگر یہ عبارت صحیح طور پر نقل ہوئی ہے تو) یہاں واضح طور پر "دوپیازہ" اصل نام ہے اور باقی چار نام صفاتی حیثیت رکھتے ہیں۔ البتہ "نرگسی دوپیازہ" نہ کبھی سُنا اور نہ کہیں پڑھا، یہی حال "بادامی دوپیازہ" کا ہے اور "روغن جوش" اب ایک مستقل قسم ہے قورمے کی۔ یہاں ایک بات اور توجہ طلب ہے۔ پہلے درویش کی داستان میں بھی ایک جگہ کھانوں کے نام آئے ہیں: "رات دن دونوں وقت پلاؤ، نان، قلیے، کباب" (ص ۳۴)۔ نوطرزِ مرصّع میں اِس مقام پر کسی کھانے کا نام مذکور نہیں، صرف یہ لکھا ہوا ہے: "لوزیاتِ لطیف و بامزہ و اغذیاتِ خوب و خوش ذائقہ" (ص ۸۰)۔ میر امّن کی عبارت میں "قلیے" بہ طورِ جمع آیا ہے، یعنی کئی طرح کے قلیے اور اِس صورت میں یہ مانا جاسکتا ہے کہ میر امّن نے قلیے کی اقسام کا یہاں ذکر کیا ہے۔ ایک صورت اور بھی ذہن میں آسکتی ہے: یہ عجیب بات ہے کہ میر امّن نے (اور صاحبِ نوطرزِ مرصّع نے بھی) اصل کھانے یعنی قورمے کا یہاں نام نہیں لیا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ ان حضرات نے قلیے کو قورمے کا بدل قرار دیا ہو؟ اگر ایسا ہے تو اُس صورت میں نرگسی اور بادامی کو اِس کی صفات قرار دیا

جا سکتا ہے۔ قورمے میں بادام ڈالے جائیں تو اُسی کو "بادامی قورما" کہا جا سکتا ہے۔ اِسی طرح نرگسی قورما۔

سیّد انشا نے دریائے لطافت کے دوسرے باب کے شروع میں "لفظے ہندو فرقے اور اُن کی زبان" کے ذیل میں لکھا ہے کہ یہ لوگ "پکے ہوئے گوشت کی تمام اقسام کو قلیہ کہتے ہیں" (ترجمۂ دریائے لطافت ص ۱۲)۔ اور ڈپٹی نذیر احمد نے مرآۃ العروس میں چنے کی دال کا قلیہ لکھا ہے: "خمیری روٹی اور چنے کی دال کا قلیہ دونوں وقت پہنچا کرتا ہے۔" مولّفِ فرہنگِ آصفیہ مولوی سیّد احمد دہلوی نے اس فرہنگ کی پہلی جلد کے دیباچے میں ایک جگہ لکھا ہے: "اگر کوئی ماروبینگن بیچنے والا ہے تو۔۔۔ یہ آواز لگا رہا ہے: "بھاڑ میں ڈال یا چنے کی دال میں ڈال" نام نہیں لیتا، مگر لوازمات سے دل نشیں کر دیتا ہے کہ میں وہ چیز بیچ رہا ہوں کہ اسے دل چاہے بھاڑ میں بھنوا کر بھرتا بناؤ، یا چنے کی دال میں پکا کر سالن یا قلیے کا لطف اٹھاؤ۔" (جلدِ اوّل، اشاعت ۱۹۱۸ء، ص ۶۹)۔ سودا نے بھی قصیدۂ شہر آشوب میں لکھا ہے؛ ع: ڈالا ہوا دھاں دالِ نخود قلیہ و نان ہے۔ یہ بھی ذہن میں رہے کہ "قلیہ" کے اصل معنی ہیں: توے پر بھنا ہوا گوشت یا تکے (آصفیہ)۔ اِن سب مندرجات کو سامنے رکھ کر، مجھے یہ صورتِ حال مرجح معلوم ہوتی ہے کہ اِس عبارت میں "قلیے" کو اصل کھانا مانا جائے اور باقی چاروں (دوپیازہ، نرگسی، بادامی، روغن جوش) کو اس کی اقسام کے ذیل میں رکھا جائے۔ اِس سلسلے میں یہ بات بھی توجہ طلب ہے کہ میر امّن نے "کئی طرح کے قلیے" لکھا ہے اور یہ "کئی طرح"، اِس پر دلالت کرتا ہے کہ اِس کے بعد قلیے کی اقسام مذکور ہو سکتی ہیں۔ اِس سے پہلے، پہلے درویش کی سیر میں بھی یہ لفظ آیا ہے: "اور رات دن دونوں وقت پلاؤ، نان، قلیے، کباب تحفہ تحفہ۔" یہاں بھی "قلیے" لکھا گیا ہے۔ اِس طرح یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ میر امّن نے قلیے کو اُن محدود معنوں میں استعمال نہیں کیا ہے جن معنوں میں آج ہم استعمال کرتے ہیں کہ اِس سے ایک خاص قسم کا شوربے دار سالن مراد لیتے ہیں۔ میر حسن نے مثنوی "خوانِ نعمت" میں تین جگہ "قلیے" اِسی انداز سے لکھا ہے: چِنے دوپیازے اور قلیے تمامی ؛؛ آ تار میں ہاتھ جن اوپر سلامی۔ متنجن اور قلیے چاشنی دار ؛؛ کہ جن سے ترش شیریں حرف دل دار۔ جو شیرے تھے سو اپنے شور میں تھے ؛؛ جو قلیے تھے، سو اپنے قورمے میں تھے (مثنویاتِ میر حسن، مرتبہ ڈاکٹر وحید قریشی، مجلسِ ترقی ادب لاہور، ص ۷۱، ۷۲، ۷۳)۔ ایران میں قلیہ ایک خاص طرح کا پکا ہوا گوشت ہے، جو کئی طرح کا ہوتا تھا۔ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی نے لکھا ہے: "قلیہ بلاشبہ عربی ہے، البتہ فارسی میں آکر ی کی تشدید جاتی رہی۔۔۔ ایران میں یہ کھانا بہت پسند

ہوا۔ اِس کی کئی قسمیں ہیں۔ بکری کی کلیجی اور دل قیمہ کرکے گھی میں تلتے ہیں تو اُسے "قلیہ پوتی" کہتے ہیں۔ یہی حسرۃ الملوک کے نام سے مشہور ہے ... قلیۂ سفدی اُس سالن کو کہتے ہیں جس میں گوشت اور گردوں وغیرہ کی چربی اور انڈے ڈال کر پکاتے ہیں" [مقالاتِ صدّیقی، جلدِ اوّل، ص ۱۰۸]۔ یہ بات ظاہر ہے کہ اب سے پہلے "قلیہ" اُس مفہوم میں مستعمل نہیں تھا، جس محدود مفہوم میں ہم آج استعمال کرتے ہیں۔ یہ باقاعدہ سالن تھا جو کئی طرح کا ہوتا تھا۔ اوپر جو تفصیل مذکور ہوئی، اِس تفصیل سے بہ ظاہر یہی صورت مرجّح معلوم ہوتی ہے کہ زیرِ نظر عبارت میں چاروں ناموں کو "قلیہ" کی اقسام مانا جائے، اِسی کو اختیار کیا گیا ہے۔

(۱۰) ک اور ف میں رے مفتوح ہے [دیکھیے ضمیمۂ تلفظ و املا میں "روغن"]۔ (۱۱) ک اور ف میں قاف کے نیچے زیر موجود ہے۔ (۱۲) ک میں "زبان" کے نون پر نقطہ موجود ہے۔ (۱۳) محض احتیاطاً یہ صراحت کی جاتی ہے کہ سب نسخوں میں "حلیم" حائے حطّی ہی کے ساتھ ہے۔ (۱۴) سب نسخوں میں اِس لفظ کا یہی املا ہے، یعنی آخر میں الف ہے۔ (صحیح املا بھی یہی ہے) یہ صراحت یوں ضروری سمجھی گئی کہ کچھ لوگ اِسے "حلوہ" بھی لکھ دیتے ہیں۔

ص ۷۸ (۱) صرف یہ صراحت کرنا ہے کہ ک، ف، ع میں اِس لفظ کا یہی املا ہے (یعنی آخر میں الف ہے)۔ صراحت کی ضرورت یوں محسوس کی گئی کہ بعض لوگ (غلطی سے) اِسے "مربّہ" لکھتے ہیں اور اِسی کو صحیح املا سمجھتے ہیں۔ ۔ ۲ھ ن: یہ۔ (۳) ک اور ف میں قاف مفتوح ہے۔ [صحیح صورت بھی یہی ہے۔ آصفیہ میں بھی اِسی طرح ہے]۔ (۴) ک اور ف میں لام مفتوح ہے۔ (مستعمل بھی اِسی طرح ہے)۔ (۵) ک اور ف میں رے مفتوح ہے۔ آصفیہ میں بھی "پکھرڈا" ہے۔ (۶) ک اور ف میں لام مفتوح ہے۔ پلیٹس کے لغت میں بھی اِسی طرح ہے۔ (۷) "رڈپے" محرّف صورت ہے "رڈیا" کی، تفصیل کے لیے دیکھیے ضمیمۂ تلفظ و املا میں اِس لفظ کی بحث۔ (۸) مفرد لفظ "وَرَق" ہے، مگر جس طرح "خبَر" اور "نظَر" کی جمع "خبروں" اور "نظروں" بنتی ہے، اُسی طرح "وَرَق" کی جمع بھی "وَرقوں" سُننے میں آتی ہے۔ ہاں "وَرَق" کی ایک صورت "وَرقہ" بھی ہے اور اِس میں رے ساکن رہتی ہے۔ آصفیہ میں بھی "وَرقہ" ہے۔ اِسی بنا پر یہاں "وَرقوں" لکھا گیا ہے۔ (۹) ع میں "یا" موجود نہیں۔

ص ۷۹ ۱ھ ف، ع: بیجد۔ ۲ھ ن: دوپٹیوں۔ ۳ھ ن میں "بھی" نہیں۔ (۴) ک

اور ف میں اِس لفظ پر اعراب موجود نہیں، البتّہ ف کی فرہنگ میں اِسے بہ فتحِ اوّل لکھا گیا ہے (یہی صحیح صورت ہے)۔ آصفیہ میں بھی الف پر زبر موجود ہے۔ ن : پستے بھی انگور انجیر۔ ⑤ صرف یہ صراحت کرنا ہے کہ ک میں "براے" اِسی طرح ہے، یعنی "ے" پر ہمزہ موجود نہیں۔ ۶ ن، ع : پیجیے۔ ۷ ف، ع : حضور میں۔ ۸ ع : ڈپلے۔

ص ۸۰ ۱ ن : جو کچھ چاہو۔ ۲ ن : عصی۔ ③ ف میں "خدمت گارِ معقول" (مع اضافت) ہے۔ ک میں اضافت کا زیر موجود نہیں۔ یہ ٹکڑا مع اضافت اور بغیر اضافت، دونوں طرح صحیح ہو سکتا ہے۔ بغیر اضافت کو اس لیے مرجح خیال کیا گیا کہ ایسی صورتوں میں (جب کہ کوئی لفظ یا عبارت کا کوئی جز) دونوں طرح درست ہو، ک کی مطابقت اختیار کی گئی ہے اور اِسی طریق کار پر یہاں بھی عمل کیا گیا ہے اور اضافت کا زیر نہیں لگایا گیا ہے۔ اِس جملے میں ایک پہلو اور توجّہ طلب ہے اور وہ یہ ہے کہ اگر اس کو مع اضافت پڑھا جائے (جس طرح ف میں ہے) تو اُس صورت میں "معقول" لازماً صفت ہوگی "خدمت گار" کی۔ اگر اِسے (ک کے مطابق) اضافت کے بغیر رکھا جائے، تو اِس صورت میں یہ بات واضح طور پر متعیّن نہیں ہو پاتی کہ "معقول" صفت ہے "خدمت گار" کی یا "عہدے" کی۔ ["عہدے" یہاں درجے کے معنی میں نہیں آیا ہے، بل کہ ایسے نشانِ امتیاز کے لیے آیا ہے جو خاص خاص عہدے داروں کی حیثیت سے متعلّق ہو۔ ع کی فرہنگ میں اس کے معنی "عہدے کا نشان، جیسے عصا وغیرہ" لکھے گئے ہیں] یعنی اِس کی قرأت یوں بھی ہو سکتی ہے: "کئی خدمت گار؛ معقول عہدے لیے ہوئے" اور یوں بھی: "کئی خدمت گار معقول، عہدے لیے ہوئے"۔ اِن سے جو اضافت کا زیر یہاں نہیں لگایا ہے، اُس میں اصل وجہ ہے ک کی مطابقت، اور دوسری ضمنی وجہ یہ ہے کہ اِس عبارت کے شروع ہی میں "ایک خواجہ سرا معتبر" آیا ہے اور یہاں "معتبر" صفت ہے "خواجہ سرا" کی، اِس کے قیاس پر "خدمت گار معقول" بہ آسانی آسکتا ہے اور میری راے میں یہی قرأت مرجح ہے۔ اِسی داستان میں ذرا آگے چل کر یہ لفظ پھر آیا ہے: "اُردا بیگنیاں، قلماقنیاں ..... جواہر میں جڑی، عہدے لیے کھڑی ہیں" (ص ۸۲) اور یہاں "عہدے" جس طرح آیا ہے، اُس سے واضح طور پر یہاں بھی اِسی قرأت کی ترجیح کا پہلو نکلتا ہے [خدمت گار معقول، عہدے لیے ہوئے] اِسی بنا پر میں نے "معقول" کے بعد کاما لگایا ہے۔ ④ محض احتیاطاً یہ صراحت کی جاتی ہے کہ ک میں اِس لفظ کو اِسی طرح یعنی اظہارِ ہ کے ساتھ لکھا گیا ہے۔

⑤ احتیاطاً یہ صراحت کی جاتی ہے کہ یہاں سب نسخوں میں "خواہ مخواہ" ہی ہے۔ یہ صراحت یوں کی گئی کہ اِس سے پہلے ایک جگہ "خواہ نخواہ" آیا ہے۔ ن میں اِس جملے کے آغاز میں "تب" موجود نہیں۔

ص ۸۱ ① احتیاطاً یہ صراحت کی جاتی ہے کہ سب نسخوں میں یہ مرکب اِسی طرح (یعنی عطف کے واو کے بغیر) ہے۔ ن میں "سب کے" کی جگہ "سب کو" ہے۔ ۲؎ ن: یہ۔ ۳؎ ن، ف، ع: محلّی۔ ۴؎ ن: کسو کبتا نے کبت کہی ہے۔ ⑤ ک میں یہ کبت اُردو رسمِ خط میں ہے۔ ق اور ع میں اِسے صرف ناگری رسمِ خط میں لکھا گیا ہے۔ یہاں ق سے اِس کا عکس شامل کیا جاتا ہے (اِس سے کئی لفظوں کے تلفظ کے تعیّن میں بھی مدد ملی ہے) اور ضروری لفظوں کے معنی بھی لکھے جاتے ہیں:

نख बिन कटा देखे, सीस भारी जटा देखे, जोगी कन फटा देखे, छार लाये तन में;
मौनी अनबोल देखे, सेवड़ा सिर छोल देखे, करत कलोल देखे बन खंडी मन में;
बीर देखे, सूर देखे, सब गुनी और कूर देखे, माया के पूर देखे, भूल रहे धन में;
आदि अंत सुखी देखे, जनम ही के दुखी देखे, पर वे न देखे, जिनके लोभ नाहिं मन में.

نکھ: ناخن۔ نکھ بن کٹا دیکھے: ایسے سادھو بھی دیکھے جو ناخن کاٹتے ہی نہیں۔ سیس: سر۔ سیس بھاری جٹا دیکھے: ایسے سادھو بھی دیکھے جو سر پر اپنے بالوں کی بڑی بڑی جٹائیں رکھتے ہیں۔ جوگی کن پھٹا: ایسے جوگی جو اپنے کان چیر لیتے ہیں۔ چھار: راکھ۔ چھار لائے تن میں: بدن میں بھبھوت ملے ہوئے۔ مَونی اَن بول دیکھے: ایسے سادھو دیکھے جو بولتے ہی نہیں [مَونی: مون رکھے ہوئے؛ جو بولتے ہی نہ ہوں] ۔ سیوڑا: وہ سادھو جنھوں نے سر کے بال مُنڈا دیے ہوں۔ [سرچھول: جن کا سر بالکل صاف ہو] ۔ بن کھنڈی: وہ سادھو جو جنگلوں میں رہتے ہیں۔ بیر: بہادر۔ سور: بہادر۔ گُنی: گُن والے، عقل مند۔ کوڑ: بے وقوف۔ مایا کے پور: دولت مند۔ بھول رہے دھن میں: دولت میں مست ہیں، مغرور ہیں۔ آدِ انت سُکھی: ہمیشہ خوش رہنے والے (آدِ انت: ہمیشہ) ۔ جنم کے دُکھی: ہمیشہ کے رنجیدہ، مصیبت زدہ۔ لوبھ: لالچ۔ پَر وے نہ دیکھے جن کے لوبھ ناہِ من میں: مگر ایسے لوگ نہیں دیکھے جن کے من میں لالچ یا خواہش نہ ہو۔ مطلب یہ ہے کہ دنیا میں ہر طرح کے سادھو سنت اور اچھے بُرے لوگ میں نے دیکھے، مگر ایسا کوئی شخص مجھے نہیں ملا جس کے من میں خواہش، آرزو، تمنّا یا لالچ نہ ہو۔ ۶؎ ن اور ک میں "سیورا" ہے۔ ق اور ع میں (ہندی رسمِ خط میں) "سیوڑا" ہے۔ صحیح لفظ یہی ہے، اِس لیے یہاں ق کی

مطابقت اختیار کی گئی ہے۔ ۵ ن : مہربانگی۔

ص ۸۲ ۱ ن : وہ چار چند۔ ۲ ن : اس خاک نشیں کو مطلب دلی کو پہنچائے۔ (۳) صرف یہ صراحت کرنا ہے کہ ک اور ف میں اضافت کا زیر موجود ہے۔ ۴ ن : تکلف کے لباس گلے ہیں۔ ۵ ع : سامنے۔ (۶) ک اور ف میں یہ مرکب اضافت کے بغیر ہی ہے۔ اس کی بحث میر امن کی عرضی کے ذیل میں (جو اس کتاب کے ص ۲ پر ہے) آچکی ہے۔

ص ۸۳ (۱) ک اور ف میں اسی طرح (یعنی اضافت کے بغیر) ہے۔ بول چال میں بھی اسی طرح سنا گیا ہے۔ ۲ ن : بے پرواہ۔ ۳ ف : حق تعالیٰ۔ ۴ ن : تجھ سے۔ ۵ ف : محل۔ ۶ ن : وہ۔ (۷) محض احتیاطاً یہ صراحت کرنا ہے کہ ک اور ف میں واو پر زبر موجود ہے۔ (۸) صرف یہ صراحت کرنا ہے کہ ک اور ف، دونوں میں اسی طرح (سلامتی) ہے۔

ص ۸۴ ۱ ن : وہی۔ ۲ ع : ادنیٰ [ک، ف، ن : ادنا]۔ ۳ ن : اسباب و جنس۔ ۴ ن : پوچھتی اور سنتی ہیں۔ (۵) ک اور ف میں اضافت کا زیر موجود ہے۔ (۶) "نیم روز" علاقۂ سیستان کا نام ہے۔ برہانِ قاطع کے ایرانی مرتب ڈاکٹر محمد معین نے اس لفظ کے ذیل میں اس علاقے سے متعلق ضروری تفصیلات لکھ دی ہیں اور ضروری مآخذ کا حوالہ بھی دے دیا ہے، تفصیل کے لیے اُسے دیکھا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر معین نے لکھا ہے کہ ایران کے ساسانی خاندان کے بادشاہوں کے زمانے میں بھی "نیمروز" اسی معنی میں مستعمل تھا، اور یہ کہ "خسرو انوشیروان" کے زمانے میں ایران کو چار حصّوں میں تقسیم کیا گیا تھا، جنوبی حصّے کا نام "کوست نیمروچ" تھا، جس میں کابل اور کرمان کے علاقے بھی شامل تھے۔ (۷) صرف یہ صراحت کرنا ہے کہ ک اور ف میں "جوانِ پری زاد" اور "صاحبِ جمال" دونوں مرکبات میں اضافت کا زیر موجود ہے۔ (۸) ک اور ف میں اسی طرح، یعنی مع تشدید ہے۔ یہ مرکب اس سے پہلے "شروع قصّے میں" آچکا ہے: "اب یہ سِن و سال ہوا، آگے موت باقی ہے" اور وہاں سب نسخوں میں "سِن و سال" تشدید کے بغیر ہے۔ لفظِ "سِن" اصلاً مع تشدید "سِنّ" ہے۔ عربی کے متعدد دو حرفی لفظ ہیں جو اصلاً مع تشدید ہیں، مگر مفرد صورت میں اردو میں تشدید کے بغیر استعمال میں آتے ہیں؛ جیسے: حد، رد، مد، جد، خط۔ مگر ترکیبی صورت میں عموماً مع تشدید آتے ہیں؛ جیسے: ردِّ سوال، ردّ و قبول، حدِّ ادب، مدّ و جزر، مدِّ آہ، خطّ و خال۔ اس قاعدے کے مطابق تو "سِنّ و سال" آنا چاہیے، مگر زبان کے محاورے کا عجب

احوال ہے کہ ہر لفظ کے متعلق یہ بات نہیں کہی جا سکتی کہ وہ مسلّمہ قاعدے کے مطابق ہی استعمال میں آئے گا، بعض لفظ استثنا کے دائرے میں آجاتے ہیں اور مختلف طور پر یا دونوں طرح مستعمل ہو جاتے ہیں؟ مثلاً لفظِ "خط" کو لیجیے۔ یہ اصلاً "خطّ" ہے، مفرد صورت میں اردو والے عموماً "خط" کہتے اور لکھتے ہیں اور ترکیب کی صورت میں مثلاً "خطِّ طغرا" بھی کہتے ہیں اور "خطِ شکستہ" بھی۔ لفظِ "خط" کے ذیل میں نور اللغات میں کئی اشعار ایسے مندرج ہیں جن میں بہ صورتِ ترکیب یہ لفظ بغیرِ تشدید نظم ہوا ہے، میں صرف ایک ایک مصرع نقل کرتا ہوں: ع: کچھ نہیں غم، گر خطِ رخسارِ جاناں بڑھ گیا (ناسخ)۔ ع: نہ پڑھ سکے اُسے مطلق خطِ جبیں کی طرح (جلال)۔ ع: خطِ عارض جو ترشنے سے مٹے، ہے یہ محال۔ ع: خطِ تقدیرِ عاشق کم نہیں خطِّ غلامی سے (رشک)۔ ع: خطِ توام سے لکھو گور پہ تاریخِ وفات (ذوق)۔ ع: واہ کیا کر دوں پہ یہ خطِ نسخ کھنچا (محسن کاکوروی)۔ اب اسی کتاب سے ایسے مصرعے نقل کیے جاتے ہیں جن میں یہ لفظ مع تشدید آیا ہے: ع: کیوں لگے دینے خطِّ آزادی (مومن)۔ ع: ہوں کشتۂ خطِّ سبزِ جاناں (رشک)۔ ع: کیوں میں نے خط لکھا اُسے خطِّ شکستہ سے (شاہ نصیر)۔ ع: حسن نے خطِّ غلامی لکھ دیا ہے یار کو (آتش)

اِن مثالوں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ایسے لفظ دونوں طرح (مع تشدید اور بغیرِ تشدید) استعمال میں رہے ہیں اور ایک ہی مصنف اِن کو دونوں طرح استعمال میں لاتا ہے۔ اِس لحاظ سے دیکھا جائے تو اِس مرکّب کا بھی دونوں طرح پایا جانا قاعدے کے خلاف نہیں یعنی ایک جگہ اِسے مع تشدید لکھا گیا ہو اور دوسری جگہ بغیرِ تشدید۔ اِس کا اندازہ اِسی سے کیا جا سکتا ہے کہ ایک جگہ سب نسخوں میں "سِنّ و سال" ہے اور ایک جگہ "سِن و سال"۔ اِسی بنا پر ان دونوں مقامات پر میں نے یکسانی کے خیال سے املا میں تصرّف کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ دونوں مقامات پر ک اور ف کی مطابقت اختیار کی گئی ہے۔

ص ٨٥ ① ک اور ف میں قؔ پر پیش موجود ہے۔ ٢ھ ع: سامنے۔ ٣ھ ن: اور ادھر کو۔ ٤ھ ن: جب نظروں سے غائب ہو رہے اور شہر کی طرف پھرے۔ ٥ھ ف: ذرا۔ ع: زرا۔ ٦ھ ن: ہو کر رہی ہے۔ ⑦ ک اور ف میں ق پر پیش لگا ہوا ہے، اُسی کی مطابقت اختیار کی گئی ہے۔ ٨ھ ن: مال و ملک کا۔

ص ٨٦ ① ک، ف، ع: تینوں نسخوں میں یہی املا ہے۔ ٢ھ ن: آ پہنچا ہوں اور جو

میری قسمت...۔ ۷؎ ع: قول و قرار۔ ن: قول و قرار کرے کہ... نہ پھرے۔ ۸؎ ن: بلاوے۔ ۹؎ ن: بیٹھاوے۔ ۱۰؎ ن: کانوں سے سنے... زبان سے فرماوے۔ ۵؎ ع میں "اس" نہیں۔ ۶؎ ن: اسے۔ ۹؎ ف: محل۔ ۱۰؎ ف: صفت۔ ۱۱؎ ف: خواصیں۔ (۱۲) یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ ک، ف، ع: ان سب نسخوں میں یہ لفظ مع ذال ہی ہے۔ اسی املا کو برقرار رکھا گیا ہے۔ (۱۳) ک، ف، ع: تینوں نسخوں میں یہی املا (پانو) ہے۔ ۱۴؎ ن: میں نے اول تعریف ملکہ کی خوبیوں کی اور عدل و انصاف اور داد و دہش کی کی۔

ص ۸۷ ۱؎ ع: داد و دہش۔ ۲؎ ف: سرحد۔ ۳؎ ن: تین دن۔ ۴؎ ک: سائبان۔ ف: سایبان۔ ۵؎ ک، ن: معہ۔ ف: معۂ۔ ۶؎ ع: پتیلی۔ ۷؎ ف: آفتہ (غلطی طباعت)۔ ۸؎ ن میں "اب" نہیں۔ ۹؎ ع: لے جائیو۔ ۱۰؎ ن میں "اگر" نہیں۔ (۱۱) صرف یہ صراحت کرنا ہے کہ ک میں اضافت کا زیر موجود ہے۔ (۱۲) ک میں "قارون" کے نون پر نقطہ موجود نہیں۔ ۱۳؎ ع: کیجے تو اُس کی آمد۔

ص ۸۸ ۱؎ ن: خرچوں کو۔ ۲؎ ع: ماہیت۔ ۳؎ ف: خاص۔ ۴؎ ع: سامنے۔ ۵؎ ف: محل۔ ۶؎ ف: خاص۔ ۷؎ ع: سامنے۔

ص ۸۹ ۱؎ ک: پھول و پات [ن، ف، ع: پھول پات] مستعمل لفظ "پھول پات" ہے، اس لئے یہاں ف کے متن کو ترجیح دی گئی ہے۔ ۲؎ ف اور ع میں "علین مین قدرتی ہیں" قوسین کے اندر ہے۔ ۳؎ ن: سما۔ (۴) ک، ف: کرّ و فرّ۔ ن: کر و فر۔ ع: کرّ و فر۔ اُردو میں مستعمل مرکب "کرّ و فر" ہے یعنی صرف پہلی رے مشدد رہتی ہے۔ یہی صورت اِس قماش کے دوسرے مرکبات کی رہتی ہے، مثلاً: شدّ و مد۔ یعنی آخری جُز پر تشدید نہیں آتی۔ "جزر و مد" میں "مد" آتا ہے، جب کہ "مدّ و جزر" میں "مدّ" ہے۔ اسی طرح "کرّ و فر" مستعمل صورت ہے، میری نظر سے "کرّ و فرّ" کہیں نہیں گزرا اور نہ کبھی سنا۔ آصفیہ میں بھی "کرّ و فر" ہے۔ اِنھی وجوہ سے یہاں ع کی مطابقت اختیار کی گئی ہے۔ اور ہاں "کرّ و فر" کے ذیل میں بے اختیار میر انیس کے ایک مشہور مرثیے کا یہ بند یاد آگیا: نے وہ تہمتنی تھی، نہ وہ زورِ گیو کا: منہ پھر گیا تمانچہ ضیغم سے دیو کا: ظالم شکار ہو گیا گیہان خدیو کا: کاوزدہ تھا، تو ہاتھ بھی مارا جنیو کا: نکلی بغل سے تیغ عجب کرّ و فر کے ساتھ: اک ہاتھ تن کے ساتھ گرا، ایک سر کے ساتھ۔ (۵) صرف یہ صراحت کرنا ہے کہ ک، ف، ع میں "زیبایش" اور

"آرایش" دونوں لفظوں کا یہی املا ہے، یعنی شین سے پہلے ی ہے اور ی کے نیچے زیر لگا ہوا ہے۔ (۶) ک : پانڑوں؛ ف : پانوں، ع : پانو۔ (۷) صرف یہ صراحت کرنا ہے کہ ک اور ف میں اسی طرح ہے، یعنی حرفِ اوّل مفتوح ہے [ک : بھیچک۔ ف : بھچک] پلیٹس کے لغت میں بھی اسی طرح ہے۔ آصفیہ میں یہ لفظ موجود نہیں۔ (۸) ک میں لام پر زبر موجود ہے۔ (۹) ک اور ف میں ہ کے نیچے زیر موجود ہے۔ ۱۰؎ ع : اس طور پر۔

ص ۹۰ ۱؎ ن : کنٹریں تھیں۔ ۲؎ ن : گھر میں پیدا ہوتیں۔ ۳؎ ن میں "یہ ساری" نہیں۔ (۴) ک، ف : پھٹ۔ ن : چھٹ۔ ع : پھٹی۔ ضمیمۂ تلفظ و املا میں اس کی بحث دیکھی جا سکتی ہے۔ (۵) ک اور ف میں اضافت کا ہمزہ موجود ہے (ملکۂ جہاں)۔ یہ صراحت یوں کی گئی کہ کسی کے ذہن میں یہ اشتباہ نہ پیدا ہو کہ شاید یہاں "یہ ملکہ: جہاں سب بہنوں سے چھوٹی تھیں" ہو، ن : یہ ملکہ جہاں جو سب بہنوں سے چھوٹی تھیں۔ ۶؎ ن : کے۔ (۷) یہ لحاظِ اصل بھی واو معروف ہے اور ک میں بھی مع واوِ معروف ہے؛ مگر تلفظ میں یہ لفظ کچھ اس طرح آتا ہے کہ واو کی آواز دب جاتی ہے فیلن نے اپنے لغت میں "رؤمال" لکھ کر، مزید لکھا ہے کہ مقبولِ عام تلفظ "رُمال" ہے۔ تلفظ کی فصاحت کا تقاضا یہی ہوگا کہ بول چال میں اور نثر میں اسی تلفظ کو ملحوظ رکھا جائے۔ (۸) ک، ف، ع میں یہی املا ہے۔ (۹) میں یہ معلوم نہیں کر سکا کہ یہ شعر کس کا ہے۔ (۱۰) ک، ف، ع میں "آ تی" (آ ت ی) ہی ہے۔ یہ صراحت یوں کی گئی کہ یہ نہ خیال کیا جائے کہ یہاں کتابت کی کوئی غلطی ہے (سننے میں "پیش آتی ہے" آیا ہے)۔

ص ۹۱ ۱؎ ن : کہلایا۔ ۲؎ ن : قدرت میں اور کارخانے میں۔ ۳؎ ن : بجائے قبلہ و کعبہ کے ہے۔ ۴؎ ن : ہر ایک کے ساتھ ہیں۔ (۵) ضمیمۂ تلفظ و املا میں دیکھیے "تیش" کی بحث۔ (۶) ک میں "نشان" کے آخری نون پر نقطہ موجود ہے۔ ن : نام نشان۔ (۷) ک اور ف میں اضافت کا زیر موجود ہے [بہ لحاظِ قواعد بھی اسی طرح صحیح ہے]۔ ۸؎ ن : کہ جو۔ ۹؎ ن : بلی بھی۔ ۱۰؎ ف : محل۔ ۱۱؎ ن : کرتی اور کہتی۔ ۱۲؎ ن : پائی لا۔ ۱۳؎ ن : یہ کہاں۔

(۱۴) دوگانہ : یہ لفظ تین جگہ آیا ہے، ص ۹۱، ۱۵۱، ۲۱۵؛ ان تینوں مقامات پر ک میں "دوگانہ" ہے، یعنی یہ واضح کر دیا گیا ہے کہ واو شاملِ تلفظ نہیں۔ (فارسی اور اردو دونوں میں اسی طرح مستعمل ہے۔) اسی کی مطابقت اختیار کی گئی ہے اور اسی لیے دال پر پیش نہیں لگایا گیا [کتابت : دوگانہ۔

تلفّظ: دُگانہ]۔

ص ۹۴ لے ن: نگار ہی تھی اور ... پڑھتی تھی۔ (۲) ک میں یہ کبت صرف اُردو رسمِ خط میں ہے۔ ف اور ع میں صرف ہندی رسمِ خط میں ہے۔ ن میں یہ موجود ہی نہیں۔ ف سے اِس کبت کا عکس یہاں شامل کیا جاتا ہے۔ مشکل لفظوں کے معنی بھی آخر میں لکھ دیے گئے ہیں:

जब दांत न थे तब दूध दियो, जब दांत दिये कहा अन्न न देहै;
जो जल में थल में पंछी पशु की सुध लेत, सो तेरी भी लेहै;
काहे को सोच करे, मन मूरख सोच करे, कछु हाथ न आय है;
जान को देत, अजान को देत, जहान को देत, सो तोहि भी देहै;

[لُغَت: وِیاخت: اَنّ: غذا، خوراک۔ جل تھل: پانی اور خشکی۔ پنچھی پشو: پرندے اور جانور (چوپایے وغیرہ)۔ سُدھ لیت: خبر لیتا ہے۔ مورکھ: بے وقوف۔ اَجان: غیر جان دار۔ ۳ ن: ضیافت گزر گئی (ظاہراً غلطیِ کتابت)۔ ۴ ن میں "سوکھ کر" نہیں۔ ۵ ک میں "دوبا" ہے، یہ غلطیِ طباعت ہے۔ ن، ف، ع میں "دونا" ہے۔

ص ۹۴ لے ک، ف، ع میں "پانی" موجود نہیں۔ صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ یہ لفظ دورانِ طباعت چھوٹ گیا ہے۔ ن میں "پانی نکالا" ہے اور اِسی کو اختیار کیا گیا ہے۔ ۲ ف: بے حد۔ ۳ ک، ف، ع: بھیکھ۔ ن: بھیک۔ ۴، ۵ سب نسخوں میں اِن دونوں لفظوں میں نونِ غنّہ موجود ہے۔ ۶ ن، ف: گاڑا۔ ۷، ۸ ک: اشرفیئوں۔ (ع: اشرفیوں)۔ (۹) اِس عبارت میں لفظِ "معمار" کو بغیرِ اضافت اور لفظِ "مزدور" کو مع اضافت لکھا گیا ہے اور اِس کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے۔ ک میں دونوں جگہ اضافت کا زیر موجود نہیں، البتّہ ف میں "مزدور" کی رے کے نیچے اضافت کا زیر لگا ہوا ہے۔ غور کیا جائے تو یہی صورت مرجّح معلوم ہوگی۔ پہلے ٹکڑے میں "راج اور معمار کاری گر اور اپنے کام کے اُستاد"۔ اِس طرح آیا ہے کہ لفظِ "معمار" بغیرِ اضافت مرجّح ٹھہرتا ہے؛ اِس بنا پر کہ "کاری گر" اور "اپنے کام کے اُستاد" دو صفتیں ہیں اِس کی اور آخری صفت اِس طرح آئی ہے کہ اُس کی نسبت سے حُسنِ بیان اور لطفِ زبان کا یہ تقاضا معلوم ہوتا ہے کہ "معمار" کو بھی اضافت کے بغیر پڑھا جائے۔ اگر اِسے "راج اور معمارِ کاری گر اور اپنے کام کے اُستاد" پڑھا جائے تو واضح طور پر محسوس ہوگا کہ بیان کا تناسب برقرار نہیں رہا ہے۔ اِس کے مقابلے میں لفظِ "مزدور" کی صرف ایک صفت "جلد دست" ہے اور یوں یہاں

وہ قباحت پیدا نہیں ہوتی۔ اِس کے علاوہ "جلد دست" ایسا لفظ ہے جو کثیر الاستعمال نہیں یعنی "کاری گر" اور "اپنے کام کے استاد" کی طرح بہ طورِ عموم مستعمل نہیں۔ یہ بھی ایک پہلو ہو سکتا ہے اِس ترجیح کے سلسلے میں کہ لفظِ "جلد دست" کو اضافت کے ساتھ پڑھنا بہتر ہوگا۔ بہ ہر صورت یہاں ف کے مطابق قرائت کو اختیار کیا گیا ہے [ہاں یہ نہ سمجھا جائے کہ لفظِ "کاری گر" اُردو نژاد ہے، اِس بنا پر اِس کو اضافت کے بغیر مرجّح سمجھا جا سکتا ہے۔ یہ لفظ فارسی ہے، ملاحظہ ہو برہانِ قاطع]۔ (۱۰) "ایک عمارتِ بادشاہانہ کہ طاقِ کسریٰ کا جفت ہو"۔ اِس میں "طاقِ کسریٰ کا جفت" بہ ظاہر اجنبی معلوم ہوتا ہے۔ ن میں اِس جگہ "کے" ہے: "طاقِ کسریٰ کے جفت ہو"۔ یہ بہ ظاہر ذرا بہتر قرائت معلوم ہوتی ہے، مگر ن کا احوال یہ ہے کہ اُس کے کاتب پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا، اِس لیے یہاں ک اور ف کی مطابقت کو بہتر سمجھا گیا ہے۔ چوں کہ میر امّن کی نثر میں اِس قبیل کے اجنبی اندازِ بیان سے کئی جگہ سابقہ پڑتا ہے اور کہیں بھی ایسے مقامات پر تصرّف نہیں کیا گیا ہے، اِس بنا پر یہاں بھی "کا" کو برقرار رکھا گیا ہے۔ یہاں یہ پہلو بھی نظر میں رہنا چاہیے کہ لفظِ "جُفت" مذکر ہے، اور یوں "کا" کے جواز کی ایک وجہ بھی نکالی جا سکتی ہے۔

۱۱؎ ک، ف: نعمان۔

ص ۴۴ ۹ ۱؎ ن میں اِس جگہ صرف یہ جملہ ہے: اور بادیانت بلا زم ہونے لگے" (ظاہر ہے کہ کاتب نے الفاظ چھوڑ دیے ہیں)۔ ۲؎ ع: کے خاطر۔ (۳) ک اور ف دونوں میں "بادشاہ" ہے، یعنی ہ کے نیچے اضافت کا زیر موجود ہے۔ اِسی کی مطابقت اختیار کی گئی ہے۔ اِس اضافت کی وہی صورت ہے جو مثلاً "بادشاہِ علی الاطلاق" کی ہو سکتی ہے، یعنی "ظلِّ سبحانی" کو بہ طورِ صفت لایا گیا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ عموماً اِس طرح (یعنی "بادشاہِ ظلِّ سبحانی") لکھا یا کہا نہیں جاتا، "بادشاہ ظلِّ سبحانی" بہتر معلوم ہوتا ہے، مگر بہ لحاظِ قواعد لکھ سکتے ہیں اور کہہ سکتے ہیں۔ چوں کہ اضافت کی گنجایش موجود ہے (یعنی وہ غلط نہیں اور بے قاعدہ بھی نہیں) اِس لیے ک کی مطابقت کو ترجیح دی گئی ہے۔ ۴؎ ن: بادشاہ ظلِّ سبحانی جو قبلہ گاہ ملکہ کے تھے ان کو پہنچی۔ ۵؎ ن: خوش خبر۔ (۶) ک، ن، ع میں "طرف غریب خانے کی" ہے۔ یہاں اِن نسخوں کی مطابقت اختیار نہیں کی گئی ہے، اور "کی" کے بجائے "کے" لکھا گیا ہے۔ اِس کی وضاحت ضروری ہے۔ لفظِ "طرف" کو اگر اُس کی جگہ پر لایا جائے، تب تو "غریب خانے کی طرف" لکھا جائے گا۔ اگر "طرف" کو پہلے

لایا جائے (قدیم اندازِ نگارش کے مطابق) تو اِس صورت میں "کے" لکھا جائے گا، یعنی: طرف غریب خانے کے۔ یہ عام قاعدہ ہے۔ ک میں اِس قاعدے کی پابندی کی مثالیں موجود ہیں، مثلاً لفظِ "مانند" کو میرامّن نے اِس کتاب میں بالالتزام تانیث کے ساتھ استعمال کیا ہے، مثلاً: بہشت کی مانند (ک ص ۹۲) میزبان کی مانند (ک ص ۹۴) ماہِ رمضان کی مانند (ک ص ۱۰۶) مجنوں فرہاد کی مانند (ک ص ۷۶)۔ لیکن جہاں "مانند" کو ("طرف" کی طرح) پہلے لائے ہیں، وہاں "کی" کے بجائے "کے" ملتا ہے، مثلاً: مانند فرش آئینے کے (ک ص ۵۱) مانند آفتاب کے (ک ص ۱۰۳)۔ اور اِس طرح اِسی نسخے میں یہ بات واضح طور پر سامنے آتی ہے کہ اِس سلسلے میں عام قاعدے کی پابندی کی گئی ہے۔ اِسی بنا پر (یعنی اِن مثالوں کی روشنی میں) اِس جملے میں بھی "طرف غریب خانے کے" لکھا گیا ہے۔ ۸؎ ن: وہ۔ ۹؎ ن: کل روز مبارک ہے۔

ص ۹۵ ۱؎ ن: عمدے۔ ۲؎ ک، ف: خان۔ واضح طور پر یہ غلطیِ طباعت ہے۔ ع میں "خاصِ" ہے، اِسی کو اختیار کیا گیا ہے۔ ۳؎ ف: خواصّ۔ ۴؎ ن: ادب۔ (۵) ک: جلوہ گرکر۔ ن: جلو کرکر۔ ف، ع: جلوہ کرکر۔ ن کا متن مرجّح معلوم ہوتا ہے۔ جلو کرکر، یعنی ساتھ لاکر۔ "جلو" کے معنی "ہمراہی، ہم رکابی، پارکابی" بھی ہیں (آصفیہ) اور یہاں یہی مقصود ہے، یعنی شہزادی مجرا کرکے، بادشاہ کے ساتھ چلی اور بادشاہ کو تخت پر لاکر بٹھایا۔ (۶) سب نسخوں میں یہی املا ہے (یعنی آخر میں "ہ" ہے)۔ اِسی املا کو برقرار رکھا گیا ہے۔ آصفیہ میں "چبوترا" ہے۔ (۷) ک اور ف میں اضافت کا زیر موجود ہے۔ ۸؎ ن: نظر۔ ۹؎ ن: جہربانگی۔

ص ۹۶ ۱؎ ن: غضب سلطان کے باعث۔ ۲؎ ن: یہ۔ ۳؎ ن: دیا۔ ۴؎ ن: وہ۔ ۵؎ ن: ماں۔ ۶؎ ف: خاصّہ۔ ۷؎ ن: کبھو کبھو ملکہ کو اپنے ساتھ محلوں میں لے جاتے۔ ۸؎ ف: محلّوں۔ (۹) ک میں تشدید موجود ہے۔ ۱۰؎ ن: دتبنی ہی۔ ۱۱؎ ع میں "کہ" نہیں۔

ص ۹۷ ۱؎ ن: برس کے عرصے میں۔ (۲) صرف یہ صراحت کرنا ہے کہ ک اور ف میں اضافت کا زیر موجود ہے۔ ۳؎ ن میں "جتنے" نہیں۔ ۴؎ ن: بازاری۔ (۵) ع: حیران و سرگردان۔ ک میں "سرگردان" ہے یعنی نون پر نقطہ موجود ہے۔ ص ۱۱۱ پر بھی (تیسری سطر میں) "حیران سرگردان" آیا ہے اور وہاں بھی ک میں "سرگردان" ہے۔ (۶) ن: اِس کے اور (بہ ظاہر "اور" کا

اضافہ غلطیِ کتابت ہے)۔ ک، اور ع میں "اس کے احوال" ہے۔ بہ ظاہر یہ بات ذہن میں آتی ہے
کہ "اس کا احوال" ہونا چاہیے، مگر میں نے یہاں بھی کسی طرح کی ترمیم سے گریز کیا ہے؛ اس بنا پر کہ
اُس زمانے کے اندازِ نگارش کی بنا پر "اس کے احوال" بھی درست ہے (اُس کے حالات کے
مفہوم میں)۔ ہاں اگلی سطر میں ف میں "حواس باختہ" ہے ("حواس" مع تشدید)۔ ۸؎ "جب
مجھے ... حرکت ہوئی" یہ عبارت ن میں موجود نہیں۔ ۸؎ ع: پچھتایا۔ ۹؎ ن، ع: کے
مانند۔ ۱۰؎ ن: اُٹھے۔ ۱۱؎ ع: اب کے بار۔

ص ۹۸ ۱؎ ن: بیل پر سوار ہوا آ پہنچا۔ ② ک میں "دو زانو" ہے، یعنی اِس بات کی صراحت
ہے کہ اِس لفظ میں واو شاملِ کتابت تو ہے، مگر شاملِ تلفظ نہیں۔ مستعمل بھی اِسی طرح ہے۔ ۳؎
ن: طرح۔ ۴؎ ک، ف، ع میں یہ ٹکڑا اِس طرح ہے: "سارے عالم دہاں کا ازدحام ہوا"
صاف ظاہر ہے کہ یہ طباعت کی غلطی ہے۔ ن میں یہ جملہ صحیح طور پر ہے اور اُسی سے اِس کی تصحیح
کی گئی ہے۔ ۵؎ ن: اژدہام۔ ۶؎ ع: چھُپ رہا۔ ⑦ ک، ف، ع میں رستے پر زبر
یا جزم موجود نہیں۔ ک میں ح پر زبر لگا ہوا ہے اور اِس کا بہ ظاہر مطلب یہی ہے کہ رستے پر زبر
نہیں، مستعمل بھی بہ سکونِ دوم ہے، اِسی لیے رستے پر جزم لگایا گیا ہے۔ ۸؎ ن: بُھر کر۔ ۹؎
ن: دو ہاتھ۔ ۱۰؎ ف: ناحق۔

ص ۹۹ ۱؎ ن میں "اور" اور "ہوا" موجود نہیں۔ ۲؎ ۳؎ ک، ف: پانوں۔ ن:
پاؤں۔ (ع: پانو)۔ ۴؎ ن میں "مرد" نہیں۔ ۵؎ ف: حق۔ ۶؎ "بڑا ہے ... دھوکر" یہ
حصہ ن میں نہیں۔ ۷؎ ف: ناحق۔ ۸؎ ع: بیٹھا۔ ۹؎ ن میں اِس عبارت کے اکثر اجزا موجود
نہیں: "چل تجھے کم بختی لگی میں نے کہا ....."

ص ۱۰۰ ۱؎ ف: کم بختی۔ ۲؎ ن میں "رہے" نہیں۔ ③ صرف یہ صراحت کرنا ہے کہ
ک اور ف میں تشدید موجود ہے۔ آصفیہ میں بھی "زِرا شِی سلام" (مع تشدید) ہے۔ ۴؎ ن میں
"کیا" نہیں۔ ۵؎ ن میں "کے" نہیں۔ ⑥ یہ صراحت کرنا ہے کہ سب نسخوں میں (بہ شمول ک)
نون پر نقطہ موجود ہے۔ ک میں اِس کا التزام ملتا ہے کہ جن لفظوں کے آخر میں اعلانِ نون ہوتا
ہے، ایسے مقامات پر التزام کے ساتھ اُس نون پر نقطہ ملتا ہے۔ "تخت نشین" کا لفظ اِس کتاب میں
جہاں بھی آیا ہے، ہر جگہ ک میں آخری نون پر نقطہ ملتا ہے [جب کہ "تخت نشیں" کو مع نونِ غنہ

لکھا گیا ہے] - اسی کی مطابقت اختیار کی گئی ہے۔ ن: شہ نشین کے گرد و پیش۔ ۵ ع: چھپ گئے۔
(۸) ک اور ف میں "وُسواس" ہے، یعنی پہلے واو پر پیش لگا ہوا ہے۔ میرا خیال ہے کہ ک میں یہ طباعت کی غلطی تھی، جو ف میں بھی نقل ہو گئی۔ اصلاً "وَسواس" (بہ فتحِ واو) ہے اور مستعمل بھی اسی طرح ہے، اسی بنا پر واو پر زبر لگایا گیا ہے۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ ف کے آخر میں جو فرہنگ ہے، اُس میں اسے بہ فتحِ اوّل (WASWAS) ہی درج کیا گیا ہے۔ ہاں ۲۱۱ پر بھی یہ لفظ آیا ہے اور اُس مقام پر ک میں پہلے واو پر پیش نہیں ملتا، بل کہ "وسواس" ہے، یعنی صرف ایک زبر ہے۔ اِس سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ یہاں جو "وُسواس" ہے، یہ واقعتاً طباعت کی غلطی ہے۔ ۹ک، ف: کلیجہ (ع: کلیجا)۔ ۱۰ ن، ع: ماجرے کی۔ ۱۱ ن: ادھر۔ ۱۲ ن: جاکر۔ ۱۳ ف: خاصہ۔

ص ۱۰۱ ۱ ع: بارے خدایا۔ (۲) محض احتیاطاً یہ صراحت کی جاتی ہے کہ سب نسخوں میں "پیر" (مع رائے مہملہ) ہی ہے۔ آصفیہ میں "جس" کے ذیل میں یہ مثل مندرج نہیں، البتہ "بوائی پھٹنا" کے ذیل میں اسے لکھا گیا ہے۔ اُس میں "پیڑ" مع رائے ثقیلہ ہے اور دوسرے جز میں "وہ" بھی موجود ہے، یعنی: "جس کی نہ پھٹی ہو بوائی، وہ کیا جانے پیڑ پرائی"۔ نور میں یہ مثل "جس" کے تحت مندرج ہے۔ دوسرے ٹکڑے میں اُس میں بھی "وہ" موجود ہے، مگر اس میں "پیر" (مع رائے مہملہ) ہی ہے۔ ۳ ع: جو درمند ہو۔ ۴ ک، ف، ع میں "کہ" نہیں۔ ن میں موجود ہے، یہاں ن کو ترجیح دی گئی ہے، اِس بنا پر کہ ربطِ عبارت کا تقاضا یہی معلوم ہوتا ہے کہ "کہ" شاملِ عبارت رہے۔

ص ۱۰۲ ۱ ع: یعنی۔ ۲ ن: پنڈت اور ترتیبوں کو جمع کیا (کذا)۔ (۳) ع میں "علم کی رو سے" ہے۔ ک اور ن میں "علم کے" ہے۔ میں نے ک کی مطابقت کو ترجیح دی ہے۔ اِس میں شک نہیں کہ اب عموماً "علم کی رو سے" کہیں گے، مگر اِس کا قوی امکان ہے کہ اُس زمانے میں لفظ "رو" ایسے مواقع پر مع تذکیر مستعمل ہو، یا یہ کہ میر امّن کے نزدیک اِسی طرح درست ہو۔ لفظ "رو" چہرے کے معنی میں بالاتفاق مذکر ہے اور "علم کی رو سے" میں اگرچہ چہرے کے معنی باقی نہیں رہے ہیں، مگر اِس میں بھی شک نہیں کہ معنوی نسبت وہی ہے اور یوں اِس کی تذکیر کا ایک پہلو نکل سکتا ہے۔ ۴ ک: ٹھرا (ف، ع: ٹھہرا)۔ (۵) صرف یہ صراحت کرنا ہے کہ سب نسخوں میں "سبھ"

(مع سینِ مہملہ) ہے۔ ۶؎ ن : خطر۔ ۷؎ ع : چرند و پرند۔ ۸؎ ن : کریں گے۔ ۹؎ "یہ سن کر" ن میں نہیں۔ (۱۰) ک اور ف میں اضافت کا زیر موجود ہے۔ قاعدے کے لحاظ سے تو یہ زیر بالکل درست ہے، مگر پڑھنے میں بہ ظاہر اچھا یوں معلوم ہوتا ہے کہ اضافت کے بغیر اسے پڑھا جائے۔ بہ ہر صورت اصل کی مطابقت اختیار کی گئی ہے۔ ۱۱؎ ع : کروا دیا۔

ص ۱۰۳ ۱؎ ف : خواصوں۔ (۲) ک اور ف میں اضافت کا زیر موجود ہے، اسی کی مطابقت اختیار کی گئی ہے۔ (۳) ک میں تشدید موجود ہے۔ ۴؎ ع : کیفیتِ روزمرہ۔ ک میں تشدید موجود ہے۔ ۵؎ ف، ع : جوں میں ہاتھ لنبا کرتا تھا۔ (۶) سب نسخوں میں اس لفظ کا یہی املا ہے (یہ قدیم صورت ہے، اب عموماً "لمبا" لکھتے ہیں)۔ ۷؎ ف، ع : ہو جاتا تھا۔ ۸؎ ک، ف، ع، ن میں "پیالا" ہے، لیکن اس لفظ کا صحیح املا "پیالہ" ہے، اس بنا پر یہاں "پیالہ" لکھا گیا ہے۔ ہاں، ک میں یہ لفظ مع اظہارِ یٰ ہے۔ ۹؎ ن : کہ۔ (۱۰) ک اور ع میں "جام شراب گل گلاب کا" ہے، مگر ف میں "جام شرابِ گلِ گلاب کا" ہے۔ بہ ظاہر ف کا متن مرجح معلوم ہوتا ہے، اسی لیے یہاں ف کی مطابقت اختیار کی گئی ہے۔

ص ۱۰۴ (۱) ن، ک، ف، ع میں یہی املا ہے۔ ضمیمۂ تلفظ و املا میں لفظ "مرہ" کے تحت اس پر بحث کی گئی ہے۔ ع : دنیا میں آیا ہے۔ ۲؎ ن : عین کریال میں۔ ۳؎ ک : ناگہانی۔ ۴؎ ف، ع : معشوقہ۔ ۵؎ ن : جانی۔ ۶؎ ف : خواصں۔ ۷؎ ع : طوطی ہاتھ کی اڑ گئی۔ ن : طوطے ہاتھ کی اڑ گئی۔ ہاں یہ صراحت بھی بے محل نہ ہوگی کہ سب نسخوں میں "طوطے" (طا کے ساتھ) ہے۔ اسی املا کو برقرار رکھا گیا ہے۔ ۸؎ ن، ک، ف : صد و بیست سالہ کی۔ صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ یہاں طباعت اور کتابت کی غلطی ہے۔ ع میں "صد و بیست سال" ہے اور یہی درست ہے، اسی کو اختیار کیا گیا ہے۔ ۹؎ ف : جنوں۔ ۱۰؎ ع : ہو رہی تھیں۔

ص ۱۰۵ ۱؎ ن : اس کا۔ (۲) ک اور ف میں اضافت کا زیر موجود ہے۔ ف : امرا صاحب تدبیر۔ (۳) ک اور ف میں اضافت کا زیر موجود ہے۔ (۴) ک اور ف میں تشدید موجود ہے۔ (۵) ن اور ک میں "تعویز" ہے، ف اور ع میں "تعویذ" ہے، صحیح املا بھی یہی ہے، اسی لیے یہاں ف کی مطابقت اختیار کی گئی ہے۔ ۶؎ ن : پھڑکنے لگے۔ ۷؎ ف، ع : سبب سے۔ ۸؎ ن : گزرتے تھے۔ ۹؎ ن : بے آب و دانہ [ک، ف، ع : بے آب و دانے]۔

ص ۱۰۶ ۱ ن: عجیب غریب۔ ۲ ن: فرمایا۔ ۳ ن: مذکور ہے۔ (۴) ت، ع: گسائیں۔ ک میں "گوسائیں" ہے، یعنی واو پر علامتِ مجہول موجود ہے۔ یہ لفظ ص۱۰۱ اور ص۱۰۸ پر بھی آیا ہے، اور اُن دونوں مقامات پر ک اور ن میں بھی "گسائیں" ہے۔ اُردو میں بالعموم "گسائیں" مستعمل ہے، اگرچہ اِس کی اصل شکل "گوسائیں" ہی ہے۔ ک میں "گوسائیں" کے واو پر جو علامت مجہول ہے، اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں اسی طرح لکھا گیا ہے، غلطیِ طباعت کا اِس میں دخل نہیں۔ چوں کہ یہ لفظ دونوں طرح درست ہے، اور یہ اختلافِ املا اِس کی دونوں شکلوں کی نشاندہی کرتا ہے، اِس لیے ک کی مطابقت اختیار کی گئی ہے اور اپنے اپنے مقام پر دونوں صورتوں کو برقرار رکھا گیا ہے [ایسے بعض اور لفظوں کے سلسلے میں بھی یہی طریقہ کار اختیار کیا گیا ہے اور اِس کی نشان دہی اُن مقامات پر کر دی گئی ہے]۔ ۵ ن: گوسائیں جٹا دھاری ہے۔ ۶ ن: مہادیو جی کا۔ ۷ ن: شیو راتی۔ ۸ ت: اپنی استھل سے۔ ۹ ن: ہر ملک کے جو جمع ہوتے ہیں اور دور دور سے آتے ہیں دروازے پر اکٹھے ہوتے ہیں بڑی بھیڑ لگتی ہے۔ ۱۰ ف: بالکل۔ ۱۱ ف، ع: اس کے پاس۔ ۱۲ ف، ع میں "بھی" نہیں۔ (۱۳) ک اور ف میں اضافت کا زیر موجود ہے۔

ص ۱۰۷ ۱ ن: پیش لگے۔ (۲) ک: پٹیلیوں۔ ف، ع: پٹیلیوں۔ اصل لفظ "پٹیلا" ہے اور یہ آصفیہ اور فرہنگِ اصطلاحاتِ پیشہ وراں (حصۂ پنجم ص۱۴۸) میں موجود ہے، اِس بنا پر یہاں ف کی قرأت کو ترجیح حاصل ہے اور اِسی لیے یہاں ف کی مطابقت اختیار کی گئی ہے۔ آصفیہ میں اِس کو مذکر لکھا ہے، مگر فرہنگِ اصطلاحات میں اِسے مؤنث لکھا ہے اور یوں "پٹیلا" سے "پٹیلیوں" بن سکتا ہے۔ ۳ ن: پٹیلوں پر سوار کر کر رخصت کیا۔ ۴ ک: معہ۔ ف، ع: معہ۔ ۵ ف: سرانجم (ظاہراً غلطیِ طباعت)۔ ۶ ع: بھوتا۔ ۷ ع: اپنی مٹھ سے۔ ۸ ن: تا سیر آفتاب کی برایا۔ ۹ ن: بھنت (ظاہراً غلطیِ کتابت)۔ ۱۰ ن: کی۔ (۱۱) ک، ف، ع میں اِسی طرح (یعنی تشدید کے بغیر) ہے۔ ف کے آخر میں جو فرہنگ ہے، اُس میں بھی اِسے تشدید کے بغیر (CHARHWĀN) لکھا گیا ہے۔ آصفیہ میں صرف "چڑھوّان" (مع واوِ مشدد) ہے، البتہ فیلن اور پلیٹس کے لغات میں "چڑھوان" اور "چڑھوّان" دونوں صورتیں ملتی ہیں۔ ک اور ف کی مطابقت اختیار کی گئی ہے۔ (۱۲) ن: اڑیا۔ (ظاہراً

غلطیِ کتابت ہے، "اڑیایا" ہوگا)۔ کے : اڑایا یا (یہاں بھی بظاہر غلطیِ طباعت ہے۔ اِسے یا تو "اڑایا" پڑھا جائے یا "اڑیایا")۔ ف اور ع میں "اڑایا" ہے۔ مولوی عبدالحق مرحوم نے اپنے نسخے کی فرہنگ میں "اِڑانا" لکھا ہے اور معنی لکھے ہیں : "ایڑی میں ڈالنا، پاؤں میں پہننا"۔ ف کی فرہنگ میں بھی "اِڑانا" مندرج ہے۔ اگر مصدر "اڑیانا" مانا جائے، تو اُس سے ماضیِ مطلق "اڑیایا" بنے گا [جیسے : "بتیانا" سے "بتیایا" اور "گھگیانا" سے "گھگیایا"]۔ اگر یہ مانا جائے کہ مصدر "اِڑانا" ہے، تو اُس سے ماضیِ مطلق "اِڑایا" بنے گا۔ میں نے "اِڑایا" کو ترجیح دی ہے، اِس بنا پر کہ ک میں صاف طور پر غلطیِ طباعت ہے اور یہ طے نہیں کیا جا سکتا کہ اُسے "اڑایا" پڑھا جائے یا "اڑیایا"۔ اِس کے برخلاف ف میں صاف طور پر "اڑایا" مندرج ہے اور اِسی کو مولوی عبدالحق نے نقل کیا ہے۔ مزید یہ کہ شاہد احمد دہلوی مرحوم نے میر ناصر علی دہلوی کا جو خاکہ لکھا ہے اور جو اُن کی کتاب "گنجینۂ گوہر" میں شامل ہے، اُس میں (پہلے پیراگراف کی آخری سطر میں) لکھا ہے : "کسی صاحب بہادر سے ملنے جاتے تو انگریزی جوتا پاؤں میں اڑا لیتے"۔ اور اِس سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ دہلی میں "اِڑانا" (یا اِڑا لینا) مستعمل تھا۔ اِس کے برخلاف "اڑیایا" کی کہیں بھی مثال نہیں ملی، اور یوں واضح طور پر "اِڑایا" کو ترجیح حاصل ہے۔ میں نے الف کے نیچے زیر لگایا ہے (اِڑایا)۔ ک اور ف میں بھی الف کے نیچے زیر موجود ہے۔ نیز ع کی فرہنگ میں "اِڑانا" مندرج ہے۔ ["ایڑی" کی نسبت سے الف کو مکسور ہی ہونا چاہیے] یہ صراحت یوں کی گئی کہ کراچی سے ترقیِ اردو بورڈ کا جو لغت چھپ رہا ہے، اُس کی پہلی جلد میں یہ مصدر موجود ہے، مگر اِسے "اَڑانا" (بہ فتحِ الف) لکھا گیا ہے اور سند کے طور پر باغ و بہار کے اسی جملے کو بھی پیش کیا گیا ہے۔ یہ درست نہیں۔ صحیح صورت اِڑانا (بہ کسرِ الف) ہے۔ یہ دل چسپ بات ہے کہ آصفیہ میں اور فیلن اور پلیٹس کے لغات میں یہ لفظ موجود نہیں۔

ص ۱۰۸ ۔ ؎۱ ف، ع : کہنے لگا کہ۔ ؎۲ ن : اور ایک خلوت خانہ مقطع خوش نقشے میں مجھے فرمایا۔ ③ ن، ک، ف، ع : سب نسخوں میں اِس لفظ کا یہی املا ہے (یعنی آخر میں الف ہے) اِسی املا کو برقرار رکھا گیا ہے۔ ؎۴ ن میں "تب" نہیں۔ ⑤ ن، ک، ف، ع : اِن سب نسخوں میں یہاں "باغچے" (ی کے بغیر) ہے۔ اِس سے پہلے ص ۱۰۲ پر "باغیچے" آیا ہے۔ وہاں یہ صورت ہے کہ م اور ن میں تو "باغچے" ہے اور ک، ف، ع میں "باغیچے" ہے۔ یہ لفظ آگے چل کر

تیسرے درویش کی سرگذشت کے شروع ہی میں پھر آیا ہے: "جب پاس پہنچا، ایک باغچہ اور ایک چشمہ دیکھا۔" وہاں ن، ک، ف، ع میں "باغچہ" ہی ہے۔ اصل لفظ "باغ" ہے، اِس سے اسمِ مصغّر "باغیچہ" بنا چاہیے۔ آصفیہ میں "باغچہ" کے ذیل میں یہ صراحت موجود ہے کہ: "عوام باغیچہ۔" یعنی فصیح اور صحیح "باغچہ" ہے۔ نور میں بھی یہی بات لکھی گئی ہے۔ "باغیچہ" کو بہ طورِ لغت درج تو کیا ہے، مگر یہ بھی لکھ دیا ہے کہ یہ عوام سے متعلق ہے اور صحیح لفظ "باغچہ" ہے۔ یہ گویا آصفیہ کی نقل ہے۔ اثر لکھنوی مرحوم نے فرہنگِ اثر میں نور کے اِس اندراج پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے: "عوام "باغیچہ" نہیں بلکہ "بغیچہ" یا "بغیا" کہتے ہیں۔ خواص کی زبان "باغیچہ" ہے، گو از روئے قواعدِ صحیح تصغیر "باغچہ" ہے بغیر یائے تحتانی۔" یہ صحیح ہے کہ اصل لفظ "باغچہ" ہے، مگر بہ قولِ اثر مرحوم استعمالِ عام میں (استعمالِ عوام میں نہیں) اب "باغیچہ" ہے۔ اُس زمانے میں کیا احوال تھا، اِس کے متعلق یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتا۔ میں نے طریقہ کار یہ اختیار کیا ہے (عمومی طور پر) کہ جن لفظوں کی دو صورتیں کسی نہ کسی اعتبار سے ملتی ہیں، اگر ایسے لفظ اِس کتاب میں دونوں طرح مختلف مقامات پر ملتے ہیں، تو اپنی اپنی جگہ اُن کی اُن شکلوں کو برقرار رکھا گیا ہے۔ یہ بات اِس سے پہلے لکھی جا چکی ہے کہ خود میر امّن نے بعض لفظوں کو اپنے قلم سے دو طرح لکھا ہے۔ اِس بنا پر "باغیچہ" اور "باغچہ" دونوں صورتوں کو اِن کی جگہ پر برقرار رکھا گیا ہے۔ ہاں، اِس اختلاف سے یہ ضرور معلوم ہو جاتا ہے کہ اُس زمانے میں "باغچہ" اور "باغیچہ"، دونوں صورتیں متعارف تھیں اور یہی خاص وجہ ہے اِن صورتوں کو اپنی اپنی جگہ پر محفوظ رکھنے کی۔

ؔ ف، ع: سیجوں سے۔ ؔ ن: نگل جایا کرو۔ ؔ ن: علمِ حکمت اور تسخیر کا پڑھ کر ثوت بہم پہنچائی۔ ؔ ن میں "بھی" نہیں۔ ؔ ن میں "تک" نہیں۔

ص ۱۰۹۔ ① ک اور ف میں اضافت کا زیر موجود ہے، اِسی کی پابندی اختیار کی گئی ہے۔ ن میں اِس جملے کا آخری جز یوں ہے: کھڑے ہونے کی طاقت نہ تھی۔ ② محض احتیاطاً یہ صراحت کی جاتی ہے کہ ن، ک، ف، ع: سب نسخوں میں اِس لفظ کا یہی املا ہے۔ [یعنی پ کے بعد رے ہے]۔ اِسی کو برقرار رکھا گیا ہے۔ [آصفیہ میں بھی "کھوپری" ہے]۔ ③ سب نسخوں میں یہی املا ہے (یعنی پہلا حرف کاف ہے)۔ یہ صراحت یوں کی گئی کہ آصفیہ میں "کنکھجورا" اور "کھنکھجورا" دونوں صورتیں ملتی ہیں۔ ؔ ن: کا ہے۔ [ک کے متن میں "زندگی کا" ہے، مگر غلط نامے میں اِس کی جگہ "زندگی کو" ہے "لکھنے کی ہدایت کی گئی ہے]۔ ؔ ن: بکھر کر رہ گیا۔ ؔ ع: میں نے۔

۸؎ ن: جو دیکھوں۔ ۸؎ ن میں "تو" نہیں۔ ۹؎ ن: گا پھٹے۔ ۱۰؎ ن: وہ۔ (۱۱) ک، ف، ع میں ت پر تشدید موجود ہے۔ وضاحت کی ضرورت یوں محسوس ہوئی کہ صاحبِ آصفیہ نے "پتر" لکھ کر اُس کے آگے قوسین میں لکھا ہے کہ: "عوام پتّر" ظاہر ہے کہ مولّفِ آصفیہ کا یہ قول درست نہیں۔ ۱۲؎ ن: دیا ہوا۔ (۱۳) ک اور ف، میں اِسی طرح، یعنی تشدید کے بغیر ہے۔ (۱۴) ک میں تشدید موجود ہے، ف میں تشدید کے بغیر ہے۔

ص ۱۱۰ ۱؎ ن: اپنے وزیر اور ساتھ والوں۔ ۲؎ ع: نواڑی۔ ۳؎ ن: سواری فرما کر۔ ۴؎ ن: بہتر تو۔ ۵؎ ف: ضَرّ۔ (۶) صرف یہ صراحت کرنا ہے کہ ک اور ف میں سَن کے نیچے زیر موجود ہے۔ ۷؎ ع: کروادیا۔ ۸؎ ع: کے مانند۔ ۹؎ ف: جنّوں۔ ۱۰؎ ع میں "ایک" موجود نہیں۔ (۱۱) ف میں صَن کے نیچے اضافت کا زیر ہے، مگر ک میں یہ زیر موجود نہیں، میں نے ک کی مطابقت اختیار کی ہے، حُسنِ عبارت کا تقاضا بھی یہی معلوم ہوتا ہے۔ (۱۲) ک اور ف میں واو پر ہمزہ موجود نہیں [اُردو کے لحاظ سے مرجّح صورت بھی یہی ہے]۔ ۱۳؎ ف، ع: کہا کہ۔ ۱۴؎ ن: ناحق۔ (۱۵) ک اور ف میں "اُنسی" ہے، یعنی الف پر پیش موجود ہے۔ "اُسی لیے" یہاں "اُسی کے لیے" کے مفہوم میں آیا ہے۔

ص ۱۱۱ (۱) ک میں ت پر زبر موجود ہے۔ ۲؎ ن، ع: قول و قرار۔ ۳؎ ن: وقت پر۔ ۴؎ ک، ف، ع میں اِسی طرح (یں نے) ہے۔ (۵) ن: لے لیا۔ بظاہر ن کا متن مرجّح معلوم ہوتا ہے، مگر میں نے یہاں بھی ک اور ف کے متن کو ترجیح دی ہے، اِس بنا پر کہ میر امّن کی نثر میں "نے" کے استعمال کی ایسی ایسی مثالیں موجود ہیں کہ اُن کے ہوتے ہوئے، اِس جملے میں "نے" کے استعمال پر شبہہ وارد کرنا کسی طرح مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ (۶) چمنستانِ شعرا میں شفیق نے تذکرے کے آخر میں اِس شعر کو اُن اشعار کے ساتھ درج کیا ہے جن کے انتساب کا اُسے علم نہیں تھا۔ ۷؎ ن، ع: قول و قرار۔

ص ۱۱۲ ۱؎ ف: جنّ۔ (۲) سب نسخوں میں اِسی طرح ہے۔ طلبہ کو کسی طرح کی الجھن نہ ہو، اِس لیے یہ صراحت کی جاتی ہے کہ مصدر "وَرغلانا" ہے، یہ قدیم شکل ہے۔ "ورغلانا" سے ماضیِ مطلق "وَرغلانا" بنے گا [جیسے "پہچانا" سے "پہچانا"] ہاں، اِس کی دوسری صورت "ورغلانا" کا ماضیِ مطلق "وَرغلایا" بنے گا۔ اب بالعموم "ورغلانا" اور "ورغلایا" مستعمل ہیں۔ "ورغلانا" مصدر اور "ورغلانا" اُس کا ماضیِ مطلق استعمالِ عام میں اب گویا متروک ہیں۔ یہ شکلیں پُرانے متون میں

سامنے آتی ہیں: یہاں وہی صورت ہے۔ ۱۱ ن: اتنے میں جو افسوں یاد کیے تھے پڑھنے لگا وہ جن۔۔۔۔۔ ۱۲ ف: جن۔ ۱۳ ف: ذرّا۔ ع: زرا۔ ۱۴ ن میں "کو" نہیں۔

ص ۱۱۳ | ۱ ف: حق۔ ۲ ن: سودے کی۔ ۳ ن: کچھ سراغ۔ ۴ ن: وہی۔ ۵ ن: کے۔ ف، ع: برقعہ۔ ۶ ن: پہنچے۔

ص ۱۱۴ | ① ک میں یہ عنوان موجود نہیں، عبارت مسلسل ہے؛ البتہ ف (اور ع) میں یہ عنوان موجود ہے۔ یہاں ف کی مطابقت اختیار کی گئی ہے۔ اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ ک کے آخر میں ایک صفحے پر فہرستِ مضامین لگی ہے، اور اس میں اس موقعے پر یہ عنوان ملتا ہے: "بادشاہ آزاد بخت کی حکایت"۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس داستان کا عنوان علاحدہ سے قائم کیا گیا ہے [ہونا بھی یہی چاہیے تھا]۔ ن میں اگرچہ اس مقام پر عنوان موجود نہیں، مگر اگلے صفحے پر موجود ہے۔ ص ۱۱۶ کے حاشیہ ۲ کے تحت اس کی وضاحت کر دی گئی ہے۔ ن میں عنوان کی عبارت یہ ہے: "قصہ آزاد بخت بادشاہ کا"۔ اب صورتِ حال یہ سامنے آتی ہے کہ ن، ک، ف میں یہ ایک ہی عنوان اختلافِ الفاظ کے ساتھ اس طرح ملتا ہے: ک: "بادشاہ آزاد بخت کی حکایت"۔ ن: "قصہ آزاد بخت بادشاہ کا"۔ ف: "سرگذشت آزاد بخت بادشاہ کی"۔ یہاں ف کی عبارت کو ترجیح دی گئی ہے، اس بنا پر کہ وہ شاملِ متن ہے اور اس بنا پر کہ اس سے پہلے کئی عنوانات کے ذیل میں ک کی اس فہرست اور ک کے متن کے مندرجات میں مطابقت نہیں، اس مقام کا شمار بھی انھیں مقامات کے ذیل میں بہ آسانی کیا جا سکتا ہے۔ ۲ ف: محل۔ ۳ ف: عالم۔ ۴ ن: دنیا میں تمھارے بادشاہ سے۔ ۵ ف: سبحان اللہ۔ ۶ ن، ف، ع: خورش۔ ۷، ۸ ف: خاص۔ ۹ ن: بلاؤ۔

ص ۱۱۵ | ① ن: وونہیں۔ ک، ف، ع: وونہیں۔ یہ لفظ اس کتاب میں جگہ جگہ آیا ہے اور ک میں ہر جگہ "ووہیں" ملتا ہے، مثلاً: "جو تحفہ ہر ایک ملک کا چاہیے، ووہیں ملے" (ک، ص ۵۲) "تو میں۔۔۔ ووہیں آتی ہوں" (ک، ص ۵۳) "آنول نال ووہیں گڑا ہے" (ک، ص ۶)۔ اسی طرح ہر جگہ "ووہاں" ملتا ہے؛ اس سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے ہر جگہ "ووہاں" اور "ووہیں" لکھا ہے [ان لفظوں کی اصل صورت بھی یہی ہے]۔ اسی بنا پر یہاں بھی "ووہیں" لکھا گیا ہے اور یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ اس مقام پر "وونہیں" کا تعلق طباعت کی فروگذاشت سے ہے، جو نقل ہوتی رہی۔ ن

میں "دو نہیں" کا ہونا اِس کی مزید تصدیق کرتا ہے۔ ہاں مخطوطۂ گنجِ خوبی میں کسی ایک مقام پر بھی "دو نہیں" موجود نہیں۔ یہ مزید تائید ہے اِس قیاس کی۔ ۲ھ ن، ک، ف: سُننے سے۔ ۳ھ ع: بیجیے۔ ۴ھ ن: کہ دونو جو باقی ہیں وہ بھی۔ ۵ھ ن: کرکر۔ ۶ھ ف: خواہش۔ ۷ھ ن: میں بھی۔

ص ۱۱۶ ۱ھ ن: ایسا ہی ہے۔ ۲ھ ن میں اِس کے بعد یہ سرخی ہے: "قصۂ آزاد بخت بادشاہ کا۔" ۳ھ ن میں اِس کے بعد "ابیات" ہے۔ ۴ھ ن، ف، ع میں اِسی طرح ہے۔ ک میں "میں سنا" ہے۔ "نے" کے ایسے استعمال کی کئی مثالیں میر امّن کی نثر میں ملتی ہیں اور اُس زمانے کے لحاظ سے یہ کوئی عجیب بات نہیں، مگر اِس مقام پر پہلا ٹکڑا "میں نے دیکھا ہے" جس طرح آیا ہے، اُس سے بظاہر مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ میر امّن نے اِس کے بعد "ہے سُنا" ہی لکھا ہوگا اور اِسی بنا پر مجھے یہاں ن اور ف کا متن مرجّح معلوم ہوا۔ اِسی لیے اِس مقام پر اُن دونوں نسخوں کو ترجیح دی گئی ہے۔ ۵ھ ن: مجھ پہ بھی واردات عجائب ہوا سنو۔ ۶ھ ن: نہ آیا تھا۔ ۷ھ ن میں "نے" موجود نہیں۔

ص ۱۱۷ ۱ھ ف: عالم۔ ۲ھ ک، ف: نے۔ ن، ع: کے۔ (ظاہراً طور پر ک میں غلطیِ طباعت ہے اور ف میں اُسی کی نقل ہوئی ہے)۔ (۳) ک میں واو کے نیچے زیر لگا ہوا ہے۔ (۴) صرف یہ صراحت کرنا ہے کہ ک میں "جان" کے نون پر نقطہ موجود نہیں (مستعمل بھی اِسی طرح رہا ہے)۔

ص ۱۱۸ ۱ھ ک، ف میں اِسی طرح۔ ع: ادنیٰ۔ ("ادنا" اور "اعلا" کی بحث ضمیمے میں "ادنا" کے تحت ملے گی)۔ (۲) اِس لفظ کے تلفّظ میں اختلاف ہے کہ نون مفتوح بھی ہے اور مکسور بھی (غیاث اللغات)۔ ک اور ف میں یہ بہ فتحِ اوّل ہے اور اِسی کی مطابقت اختیار کی گئی ہے۔ یہ صراحت بھی ضروری ہے کہ ک میں ہر جگہ "پور" مع واوِ معروف ہے۔ ۳ھ ن: آکر۔ ۴ھ ن میں "کہ" نہیں۔ ۵ھ ن میں "نے" نہیں۔ ۶ھ ن: سات مثقال کے۔ ۷ھ ن: فرمائے۔

ص ۱۱۹ ۱ھ ن: جائے۔ ۲ھ ع: اسی سبب سے۔ ۳ھ ف: ناحق۔ ۴ھ ن میں "کہ" نہیں۔ ۵ھ ن: اس کو۔ ۶ھ ع: بزیرا۔ (۷) صرف یہ صراحت کرنا ہے کہ ک اور ف میں آخری نون پر نقطہ موجود ہے۔ (۸) صرف یہ صراحت کرنا ہے کہ ک میں سین پر پیش اور خ پر زبر لگا ہوا ہے۔ (۹) دیکھیے ص ۲۹۴ کے آخر میں۔ ۱۰ھ ع: نوشت و خواند۔ ۱۱ھ ف: محل۔ ۱۲ھ ف: خواہشیں۔

ص ۱۲۰ ۱ ع : بان۔ ۲ ت : ما۔ ۳ ع میں "باپ پر" موجود نہیں۔ ۴ ف : ذرّا۔
ع : زرا۔ ⑤ سب نسخوں میں اسی طرح (یعنی مع نونِ غنّہ) ہے۔ یہ صراحت یوں کی گئی کہ ص ۲۴۲
پر "ٹکا ہوا" (بغیر نونِ غنّہ) آیا ہے۔ معلوم یہ ہوا کہ "ٹکنا" کو بغیر نونِ غنّہ اور "ٹانکنا" کو مع نونِ غنّہ
لکھا گیا ہے۔ آصفیہ میں بھی "ٹکنا" اور "ٹانکنا" ہے۔ ⑥ صرف یہ صراحت کرنا ہے کہ ک میں "بلاے ناگہانی"
میں "بلاے" پر ہمزہ موجود نہیں۔ ۸ ف : حقّ۔ ۸ ن : باں۔ ۹ ف : محل۔

ص ۱۲۱ ۱ ن، ک، ف : سُنّے۔ ۲ ن : اس تیاری۔ ۳ ف : محلّ۔ ۴ ع : چُھپایا۔
۵ ن : پہنچا۔ ۶ ن : اترا۔ ۷ ن : رہا۔ ۸ ن : حمام کیا۔ ⑨ صرف یہ صراحت
کرنا ہے کہ ک اور ف میں اضافت کا زیر موجود ہے۔ ۱۰ ک، ن : نکلا۔ (صاف ظاہر ہے کہ
ک میں یہاں غلطیِ طباعت ہے)۔ ۱۱ ن : پہنچا چوراہے پر کھڑا ہوا۔ ۱۲ ع : دکان۔

ص ۱۲۲ ۱ ع : ایک کے۔ ② ک اور ف میں اضافت کا زیر موجود ہے۔ ۳ ن :
یہ ہوا اگر بچہ جو فی الحقیقت وزیر زادی تھی اُسے دیکھ کر۔ ۴ ن : ہوا۔ ۵ ن : ہوا۔ ۶ ف :
بارِ خدایا۔ ع : بارے خدایا۔ ۸ ع : دکان۔ ۸ ن : دونو۔ ۹ ع : دکان۔ ⑩ ک
اور ف میں اضافت کا زیر موجود ہے۔ ⑪ ک میں اسی طرح (مع ہاے ہوّز) ہے۔ اس کی
بحث ضمیمۂ تلفظ (دانا) میں دیکھی جا سکتی ہے۔

ص ۱۲۳ ۱ ن : دکھاؤں اور اپنے۔ ۲ ف میں "کو" نہیں۔ ۳ ن میں "دو" نہیں۔
④ ع : حسن و جمال۔ بہ ظاہر ع کا متن مرجّح معلوم ہوتا ہے یعنی "حسن و جمال" بہ ترکیبِ عطفی؛
مگر ن، ک اور ف میں عطف کا واؤ موجود نہیں۔ چوں کہ یہ استعمال اس زمانے کے طرزِ نگارش
کے لحاظ سے بھی اور خود میر امّن کے اندازِ تحریر کے لحاظ سے بھی کچھ ایسا اجنبی نہیں، اس بنا پر
احتیاط کا تقاضا یہی معلوم ہوا کہ ک اور ف کے متن کو ترجیح دی جائے۔
۵ ن، ع : کیجیے۔ ۶ ع میں "یہ" نہیں۔ ۷ ف : قدّ۔ ۸ ف : حواسّ۔ ⑨ ک
میں یہاں "قبلہ گاہی" ہے، جب کہ ن، ف، ع میں "قبلہ گاہ" ہے۔ یہ لفظ اس کتاب میں
کئی جگہ آیا ہے اور اس ایک مقام کے علاوہ ک میں ہر جگہ "قبلہ گاہ" ہی لکھا ہوا ہے۔ اسی داستان
میں اس سے پہلے دو جگہ یہ لفظ آیا ہے اور دونوں جگہ ک میں "قبلہ گاہ" ہے۔ اور اسی داستان میں
اس کے بعد بھی کئی جگہ یہ لفظ آیا ہے اور ک میں ان سب مقامات پر بھی "قبلہ گاہ" ہے، مثلاً:

صفحات ۱۲۸، ۱۳۰، ۱۳۵۔ اس سے قبل پہلے درویش کی سیر میں دو بار یہ لفظ آیا ہے (صفحات ۴۱، ۴۲) کہ وہاں دونوں جگہ "قبلہ گاہ" ہے۔ پھر دوسرے درویش کی سیر (صفحات ۹۴، ص ن ۱۰۲) میں دو جگہ "قبلہ گاہ" آیا ہے۔ اس کے بعد تیسرے درویش کی سیر میں (ص ن ۲۱۵) "قبلہ گاہ" موجود ہے۔ غرض کہ ہر جگہ "قبلہ گاہ" ملتا ہے۔ اس تکرار کو پیشِ نظر رکھ کر یہاں بھی یہی مرجح معلوم ہوا کہ ن اور ض کی مطابقت اختیار کی جائے اور "قبلہ گاہ" کو ترجیح دی جائے۔ یہ بھی ذہن میں رہے کہ روایتِ اول یعنی ن میں اس مقام پر بھی "قبلہ گاہ" ہے، اس سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے "قبلہ گاہ" ہی لکھا تھا۔ بعد کو ک میں طباعت کے دوران یہاں "قبلہ گاہی" بن گیا۔ اگر یہ خیال کیا جائے کہ مصنف نے پہلے (ن میں) "قبلہ گاہ" لکھا تھا، بعد کو اصلاح کی اور اسے "قبلہ گاہی" بنا دیا، مگر سوچنے کی بات یہ ہے کہ مصنف اگر اصلاح کرتا تو ایسے سبھی مقامات پر "قبلہ گاہی" بنا دیتا۔ مجھے یقین ہے کہ یہ محض طباعت کا کرشمہ ہے کہ اس مقام پر "قبلہ گاہ"، "قبلہ گاہی" بن گیا۔ ض کا متن بھی اسی کی تائید کرتا ہے۔ اس سلسلے میں ایک اور بات بھی پیشِ نظر رہنا چاہیے: "نورِ چشمی" کی طرح "قبلہ گاہی" کی بناوٹ بھی خلافِ قیاس ہے۔ "قبلہ گاہی" مستعمل رہا ہے، مگر عموماً یہ اس طرح استعمال میں آتا رہا ہے کہ اس میں جو "ی" ہے، وہ (عربی کی) یائے متکلم کا کام کرتی رہی ہے، یعنی: میرے والد۔ میں صرف ایک مثال پر اکتفا کروں گا۔ سید انشا نے اپنے والد میر ماشا اللہ خاں کی وفات کی تاریخ کہی ہے: "تاریخِ وفاتِ قبلہ گاہی مرحوم: سدھارے قبلہ گاہی اِس جہاں سے؛ کہی تاریخ ہاتف نے "دریغا"۔" انھی کی کہی ہوئی ایک اور تاریخ کا عنوان ہے: "تاریخِ وفاتِ قبلہ گاہی میر ماشا (کذا) اللہ خاں عفی عنہ" [یہ تاریخیں ڈاکٹر عابد پیشاوری کی کتاب انشا اللہ خاں انشا (ص ۲۲) سے ماخوذ ہیں] اِن دونوں تاریخوں میں واضح طور پر "قبلہ گاہی" "میرے قبلہ گاہ" کے معنی میں آیا ہے۔ یہی اس کا طریقِ استعمال ہے۔ چوں کہ یہاں "میرے قبلہ گاہی" ہے، اس لیے "میرے" کے ساتھ "قبلہ گاہ" کی ترجیح واضح طور پر ظاہر ہے۔ یعنی یا تو "میرے قبلہ گاہ" ہو یا صرف "قبلہ گاہی" (جس کے معنی ہیں: میرے قبلہ گاہ)۔ (۱۲) ک کے متن میں "ہوا وہ" چھپا ہوا ہے، لیکن غلط نامے میں اس کی تصحیح کی گئی ہے اور "ہواؤ" کو صحیح بتایا گیا ہے۔ واو پر جو علامت ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ یہاں واو ساکن ہے مجہول آواز کے ساتھ۔ ض اور ع میں "ہواؤ" ہے۔ ک کی مطابقت اختیار کی گئی ہے اور واو کے اوپر ہمزہ نہیں لگایا گیا۔ (یہی مرجح صورت ہے یعنی جس طرح

لگاؤ، گھاؤ، بھاؤ جیسے الفاظ میں واو پر ہمزہ نہیں لکھنا چاہیے؛ وہی صورت اِس لفظ کی ہے)۔

۳؎ ف: خوشبوؤں۔

ص ۱۲۴ ۱؎ ن: خواجہ کا عقل و ہوش جاتا رہا۔ ۲؎ ع: بھٹیار خانے۔ (۳) ک اور ف میں اِس لفظ پر اعراب موجود نہیں۔ "اوپری" میں اصل لفظ "اوپَر" ہے اور اِس لحاظ سے پ پر زبر آنا چاہیے؛ مگر تلفظ میں یہ لفظ اِس طرح آتا ہے کہ جیسے پ ساکن ہو اور تلفظ کی فصاحت کا تقاضا بھی یہی ہے کہ اِسی طرح اِسے استعمال کیا جائے۔ ۴؎ ن: بیگار اور بار بردار جلد بھجواؤ کاروان سرا سے ان کا۔ ۵؎ ن: مال و متاع۔ ۶؎ ع: دکان۔ ۷؎ ن: دو تو۔ ۸؎ ن: دو تو۔

ص ۱۲۵ ۱؎ ن: لے۔ (۲) ک، ف، ع میں اضافت کا زیر موجود ہے۔ ۳؎ ن: دونو۔ ۴؎ ن: سجایا۔ ۵؎ ن: کتا صندلی سے نیچے اترا جتنا چاہا اتنا کھایا۔ ف، ع: کتا صندلی سے نیچے اتر جتنا چاہا اتنا کھایا۔ ۶؎ ن: سوتے کے۔

ص ۱۲۶ (۱) ک اور ف میں اِس لفظ کا یہی املا ہے۔ ن: جھوٹھا۔ ضمیمۂ تلفظ و املا میں اِس لفظ کے املا پر بحث کی گئی ہے۔ ۲؎ ۳؎ ن: وہ۔ ۴؎ ف: شکت۔ (۵) ک اور ف میں اضافت کا ہمزہ موجود ہے۔ ۶؎ ن: اور اِسی طرح۔ ۷؎ ک، ف، ع میں "کہ" نہیں (ن میں موجود ہے)۔ ۸؎ ن، ک، ف: سُنّے۔ ۹؎ ف: ناحق۔ (۱۰) احتیاطاً یہ صراحت کی جاتی ہے کہ ک میں "میَں" ہے، یعنی ی پر ماقبل مفتوح کی علامت موجود ہے۔ ف میں بھی "میَں" ہے۔ ۱۱؎ ن میں "اِس" نہیں۔ ۱۲؎ ن میں "اپنی" نہیں۔

ص ۱۲۷ ۱؎ ن: صحبت میں مے نوشی کی۔ ۲؎ ن: پوچھنے۔ ۳؎ ن: اور سبب گریہ کا پوچھنے۔ ۴؎ ف: حق۔ ۵؎ ع: آئی ہیں۔ ۶؎ ن: رونے لگا ایسا۔ (۷) ک اور ف میں اضافت کا زیر موجود ہے۔ ۸؎ ن، ک، ف: معۂ۔ ۹؎ ن: منگوا لو۔ ۱۰؎ ف، ع: سواری اور برداری درکار ہو۔ ۱۱؎ ف: مان۔ (۱۲) صرف یہ صراحت کرنا ہے کہ سب نسخوں میں "کار بار" (واوِ عطف کے بغیر) ہے۔ ۱۳؎ ع: کھینچی ہیں۔ ۱۴؎ ف: میں اپنا ولی عہد اور مختار۔ (۱۵) یہ صراحت کرنا ہے کہ سب نسخوں میں یہ جملہ اِسی طرح ہے۔ صراحت کی ضرورت یوں محسوس کی گئی کہ بظاہر یہ بات ذہن میں آتی ہے کہ اِس جملے کا آخری ٹکڑا "خبردار رہو" ہوتا

تو بہتر ہوتا۔ "خبردار رہو" کا "خبردار ہو" بن جانا بجائے خود کوئی تعجب کی بات نہیں ہو سکتی، طباعت کی ایسی غلطیاں عام ہیں؛ مگر اس بنا پر کہ سبھی نسخوں (ن، ک، ف، ع) میں جملہ اسی طرح ہے، اسی صورت کو برقرار رکھا گیا ہے؛ اس بنا پر کہ یہ امکان بھی اسی قدر ہے کہ مصنف نے اسی طرح لکھا ہو۔ کسی قطعی ثبوت کے بغیر اصل متن میں تبدیلی کرنا اصولاً درست نہیں۔ ہاں اگر کہیں نہایت واضح طور پر غلطی سامنے آئے تو اس صورت میں قیاس کو دخل دیا جا سکتا ہے اور وہ صورت یہاں نہیں۔ جملہ اس صورت میں بھی درست اور بامعنی ہے۔

ص ۱۲۸ ۱ ن: جیتا ہوں۔ ۲ ن: دے۔ ۳ ن: ماں۔ ۴ ن: وہ۔ ۵ ن: دونو۔ (۶) ف، ع: جہان [ن، ک: جہاں] "دونوں جہان" اور "دونوں جہاں" صحیح اور فصیح دونوں طرح ہے۔ ک کی مطابقت کو ترجیح دی گئی ہے۔ ۷ ع: کیجیے۔ ع: دیجئے۔

(۸) ن، ک اور ع میں "حق پدری" ہے، جب کہ ف میں "حقِّ پدری" (مع قاف مشدّد) ہے۔ ف میں تو خیر عربی کے ایسے مفرد الفاظ پر اکثر تشدید ملتی ہے جو اردو میں تشدید کے بغیر ہی مستعمل ہیں، اس لیے اس میں کسی لفظ پر تشدید کا ہونا چنداں قابلِ توجہ نہیں، مگر یہ لفظ ایسا ہے کہ ترکیب کی صورت میں آیا ہے اور ترکیب کی صورت میں ایسے بہت سے لفظ مشدّد ہو جاتے ہیں جو مفرد صورت میں تشدید کے بغیر ہی استعمال میں آتے ہیں اور یوں "حقِّ پدری" بہ ظاہر مرجح معلوم ہوتا ہے۔ اسی بنا پر یہاں صراحت کی ضرورت محسوس کی گئی ہے۔ عربی کے ایسے (دو حرفی) لفظ جو اردو میں مفرد صورت میں اکثر و بیش تر تشدید کے بغیر ہی مستعمل ہیں، ان میں سے اکثر تو ترکیب کی صورت میں مع تشدید ہی استعمال میں آتے ہیں، جیسے: حدِّ ادب، ردِّ بلا، سدِّ سکندر، مدّ و جزر (وغیرہ) مگر کچھ لفظ ترکیبی صورت میں تشدید کے بغیر بھی استعمال میں آتے ہیں، جیسے: قدِ دل کش۔ لفظ "حق" بھی اسی فہرست میں شامل ہے۔ "حقِ استاد" بھی درست ہے اور "حقِ پدر" بھی صحیح ہے۔ احتیاطاً اس کی ایک مثال بھی پیش کی جاتی ہے، میر کی وہ غزل جس کا مطلع ہے: فقیرانہ آئے، صدا کر چلے ؛ میاں! خوش رہو، ہم دعا کر چلے۔ اس میں یہ شعر بھی ہے: جبیں سجدہ کرتے ہی کرتے گئی ؛ حقِ بندگی ہم ادا کر چلے۔ اسی بنا پر یہاں ک کے مطابق "حقِ پدری" ہی کو ترجیح دی گئی ہے۔ (۹) صرف یہ صراحت کرنا ہے کہ ک اور ف میں "جان" کے نون پر نقطہ موجود ہے۔ یہ صراحت اس سے پہلے کی جا چکی ہے کہ ک میں جن مقامات پر [خواہ مفرد لفظ ہو یا ترکیبی صورت

ہیں] آخر لفظ میں نونِ غنہ ہے، وہاں اُسی کی مطابقت اختیار کی گئی ہے اور جن لفظوں میں اُس آخری نون پر نقطہ موجود ہے، وہاں نقطہ برقرار رکھا گیا ہے۔ ک میں عموماً ایسے مواقع پر "اندازِ گفتگو" کو ملحوظ رکھا گیا ہے، کہ ایسے جو الفاظ مع اعلانِ نون زبانوں پر آتے ہیں، اُن کو مع نونِ نقطہ دار لکھا گیا ہے، ورنہ مع نونِ غنہ لکھا گیا ہے۔ اور یہ نہایت مناسب طریق کار ہے۔ ؁ ن میں "نون" نہیں۔ ؁ ن: کی۔

ص ۱۲۹ ؁ ن: کانکر۔ (۲) یہ صراحت بھی بے جا نہ ہوگی کہ "خواجۂ سگ پرست" جہاں بھی آیا ہے، ہر جگہ ک اور فت میں اضافت کا ہمزہ موجود ہے۔ اسی کی پابندی اختیار کی گئی ہے۔ ن: خواجہ سگ پرست نے۔ (۳) ک اور فت میں اضافت کا زیر موجود نہیں۔ حُسنِ عبارت کا تقاضا بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہاں اضافت کا زیر نہ ہو۔ اس بنا پر کہ اگلے ٹکڑے میں "نوکر اور غلام ان گنت" میں اضافت موجود نہیں اور یوں بیان کا حُسن اور توازن اسی کا متقاضی ہے کہ پہلے ٹکڑے میں بھی اضافت نہ ہو۔ ؁ ن: نوکر و غلام ان گنتی۔ (۵) صرف یہ صراحت کرنا ہے کہ ک اور فت میں اضافت کا زیر موجود ہے۔ (۶) صرف یہ صراحت کرنا ہے کہ ک اور فت میں "بے" پر (اضافت کے لیے) ہمزہ موجود نہیں۔ (صحیح صورت بھی یہی ہے)۔ ع میں "برائے خود" ہے۔ ک کی مطابقت اختیار کی گئی ہے۔ (۷) ک، فت: تختِ بغدادی۔ ن: ایک تخت دو شتر بغدادی پر۔ [صاف ظاہر ہے کہ ک میں اضافت کا زیر دراصل طباعت کی غلطی ہے، جس کی نقل فت میں ہوئی ہے۔ یہ معلوم ہے کہ "بغدادی" اونٹ کی صفت ہے، نہ کہ تخت کی۔ ن کا اندراج صحیح صورتِ حال کی وضاحت کرتا ہے۔ اسی بنا پر یہاں ک کی مطابقت اختیار نہیں کی گئی اور "تخت" کو اضافت کے بغیر رکھا گیا ہے]۔ ؁ ن: کا تعین ایک اونٹ پر دھرتے ہوئے روانہ ہوئے۔ ؁ ن، ع: ماں۔

ص ۱۳۰ ؁ ن میں "خیر" نہیں۔ ؁ "ہوکر... حیران ہوئے" یہ عبارت ن میں موجود نہیں۔ ؁ فت: محل۔ ؁ ن: جو بیٹی وزیر کی تھی۔ ؁ ن، ع: ماں۔ (۹) ن، ک، فت، ع: سب میں اسی طرح ہے۔ آصفیہ میں "تنتڑی" ہے، مگر پلیٹس نے اپنے لغت میں اسے "تنتری" ہی لکھا ہے۔ ؁ ن، فت، ک: بمعۂ۔ ع: بمعہ۔ ؁ فت، ع: باہر رہ۔ ؁ ع: ماں۔

ص ۱۳۱ ؁ ن، فت، ع: جان۔ [ک کے متن میں "جان" ہی چھپا ہے، لیکن غلط نامے میں اس کی تصحیح کی گئی ہے اور "جانے" لکھا گیا ہے]۔ ؁ ن: چلا۔ ؁ ن میں "ازبس کہ"

نہیں۔ ۱۲ ف: شاق۔ ۱۳ ن: ادھر۔ ۱۴ ن: ادھر۔ (۷) ک کے اور ف میں اضافت کا زیر
موجود ہے۔ (۸) ن، ک، ف، ع، کسی میں عطف کا واو موجود نہیں۔ اس سے پہلے ک میں ص۲۱
پر یہ ترکیب آیا ہے اور وہاں "نشست وبرخاست" (مع واوِ عطف) ہے۔ دونوں مقامات پہ
ک کے متن کی پابندی اختیار کی گئی ہے اور دونوں صورتوں کو اپنی اپنی جگہ پر برقرار رکھا گیا ہے۔ خاص
وجہ یہ ہے کہ یہ مرکب دونوں طرح (یعنی مع واوِ عطف اور بغیرِ واوِ عطف) استعمال میں آتا ہے۔
(۹) محض احتیاطاً یہ صراحت کرنا ہے کہ سب نسخوں میں یہ جملہ اسی طرح ہے۔ (۱۰) ک، ف، ع
میں "وہ" موجود نہیں۔ ن میں "وہ" ہے۔ پہلے کا جو انداز ہے، اس کا تقاضا بظاہر یہی معلوم
ہوتا ہے کہ یہاں پر کوئی لفظ ہو۔ اسی بنا پر اس مقام پر ن کے متن کو ترجیح دی گئی ہے۔

ص ۱۴۲ (۱) ک میں آخری نون پر نقطہ موجود ہے۔ ایسی ترکیبی صورت میں اعلانِ نون
سے متعلق طریقِ کار کا تذکرہ اس سے پہلے آچکا ہے کہ ہر جگہ ک کی مطابقت اختیار کی گئی ہے۔
۲ ن، ک، ف: سنئے۔ ۳ ن: تجار۔ ۴ ن: آداب۔ ۵ ف: برمحل۔ ۶ ن:
پہلی۔ ۷ ن: دوسری۔ ۸ ن: تیسری۔ ۹ ف: دسے بیٹھے ہیں۔

ص ۱۴۳ ۱ ن، ف، ع: دوڑ آئے۔ ۲ ع: ادنی اعلیٰ [ن، ک، ف: ادنا
اعلا]۔ (۳) محض احتیاطاً یہ صراحت کی جاتی ہے کہ ک میں ہی یہ علامت ماقبل مفتوح موجود
ہے (کھٹیچک) اور ف میں بھی بھ پر زبر لگا ہوا ہے (بھچک)۔ ۴ ن: کرکے۔ (۵) ن، ک
اور ع میں اسی طرح ہے [اب عام طور پر ایسے مواقع پر "عتاب کی رو سے" کہتے ہیں] نور اللغات
آصفیہ میں صراحتاً مرقوم ہے کہ "رو" وجہ اور جہت کے معنوں میں مونث ہے۔ نور میں یہ مثالیہ فقرہ
بھی لکھا گیا ہے: "اس دستاویز کی رو سے تمھارا بیان غلط ہے"۔ میر امّن کے یہاں تذکیر و تانیث
کے لحاظ سے متعدد الفاظ موجودہ استعمالِ عام کے مقابلے میں مختلف طور پر ملتے ہیں۔ صرف ایک
مثال: لفظ "آئین" مذکر مستعمل ہے، مگر میر امّن نے باغ و بہار اور گنجِ خوبی، دونوں میں اسے
بہ تانیث استعمال کیا ہے [دونوں کتابوں میں یہ لفظ متعدد بار آیا ہے اور اس طرح آیا ہے کہ
قطعیت کے ساتھ اس کی تانیث متعین ہو جاتی ہے] اس کتاب میں اس کی ایک مثال تو اسی
صفحے پر موجود ہے: "اور آئین میری یہ ہے کہ"۔ اس کے متعلق اب یہی کہا جا سکتا ہے کہ اُس
زمانے میں یہ الفاظ اس طرح بھی مستعمل تھے، یا یہ کہ میر امّن نے ان کو اسی طرح استعمال کیا ہے۔

اِس بنا پر کے میں جو متن ہے، بالعموم اُس کی پابندی کی گئی ہے اور یہاں بھی ک کی مطابقت اختیار کی گئی ہے۔ ۶ کے: کواں۔ ف: کوُاں (ع: کنوّاں)۔ ⑦ کسی نسخے میں اضافت کا زیر موجود نہیں۔ لفظ "مصطفیٰ" صفت ہے، اِس لحاظ سے "محمد" کو مع اضافت آنا چاہیے (محمدِ مصطفیٰ)۔ قاعدہ تو یہی کہتا ہے، مگر میر امّن کی نثر کا احوال یہ ہے کہ اکثر و بیش تر وہ استعمالِ عام کی مطابقت اختیار کرتے ہیں اور اِس مقام پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ شاید بول چال میں یہ ٹکڑا اضافت کے بغیر ہی آتا ہوگا۔ ["علی مرتضیٰ" اور "محمد مصطفیٰ" یہ دونوں مرکب اضافت کے بغیر سننے میں آئے ضرور ہیں، اگرچہ قواعد کے لحاظ سے "علیِ مرتضیٰ" اور "محمدِ مصطفیٰ" کو ترجیح حاصل رہے گی] کے اور ف میں عام طور پر اضافت کے زیر لگانے کا التزام ملتا ہے اور اِس خاص مقام پر دونوں نسخوں میں اضافت کا زیر موجود نہ ہونے کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ مصنف نے اِسی طرح لکھا ہوگا، چوں کہ یہ احتمال موجود ہے (اور بہ ظاہر اِس اندازِ استعمال کو غلط بھی نہیں کہا جا سکتا) اِس بنا پر میں نے بھی اضافت کا زیر لگانا مناسب نہیں سمجھا۔ ۸ ف: حج۔ ۹ ن: خمس و زکوٰۃ۔

ص ۱۳۴ ① ف صرف یہ وضاحت کرتا ہے کہ کے اور ف میں جہاں بھی یہ مرکب آیا ہے، ہر جگہ قَ پر پیش لگا ہوا ہے۔ مخطوطۂ گنج خوبی میں بھی ہر جگہ قَ پر پیش ملتا ہے۔ ۲ ع: کراؤں گا۔ ③ کے میں یہاں "جان بخشی" ہے، ع میں "جان بخشی" ہے۔ یہ مرکب کے میں کئی جگہ آیا ہے اور کہیں "جان بخشی" ہے اور کسی جگہ "جان بخشی"۔ اِس سے پہلے بھی یہ وضاحت کی جا چکی ہے کہ ایسی صورتوں میں آخرِ لفظ میں اخفاے نون اور اعلانِ نون کے سلسلے میں کے کی مطابقت اختیار کی گئی ہے۔ اِس بنا پر کہ یہ دونوں مختلف صورتیں، اِس لفظ کے استعمال میں اختلاف کو ظاہر کرتی ہیں۔ اِس بنا پر اپنے اپنے مقام پر اِن میں سے ہر شکل کو اُسی طرح (یعنی کے کے مطابق) برقرار رکھا گیا ہے۔ اِسی بنا پر یہاں "جان بخشی" لکھا گیا ہے اور صـ۱۲۹ پر "جان بخشی" کو برقرار رکھا گیا ہے۔

ص ۱۳۵ ۱ ف: حق۔ ۲ کے، ف: کوئے۔ ن: کوتیں (ع: کنوئیں)۔ ③ ع: سرگزشت [ت، ف، کے: سرگذشت۔] اِس لفظ کا صحیح املا مع ذال ہی ہے۔ ۴ ن: دونو۔ ۵ ن: جس میں۔ ۶ ن: دونو۔ ۷ ن: اے دین و دنیا کے بادشاہ۔ ⑧ کے اور ف میں "داہنی" کی ہ پر حرکت یا جزم موجود نہیں۔ ف کی فرہنگ میں "داہنا" (بہ سکونِ ہ) مندرج ہے اور آصفیہ میں بھی "داہنا" اور "داہنے" کی ہ پر جزم لگا ہوا ہے۔ پلیٹس نے بھی اپنے لغت

میں اسی طرح لکھا ہے؛ البتہ فیلن نے اپنے لغت میں "داہنا" اور "داہِنا" دونوں طرح لکھا ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ بہ لحاظِ اصل ہ ساکن ہے، مگر یہ بھی واقعہ ہے کہ جب یہ لفظ زبان سے ادا ہوتا ہے، تو ہ مکسور معلوم ہوتی ہے۔ ک کی مطابقت میں میں نے بھی ہ کو خالی رکھا ہے، اسے "داہْنی" اور "داہِنی" دونوں طرح پڑھا جاسکتا ہے۔ ⑨ ن: پھول پان۔ ⑩ ن: دونو۔ اِس سے پہلے دسویں سطر میں "دونوں" آیا ہے؛ وہاں بھی ن میں "دونو" ہے۔ ⑪ ک میں "بھائی چارَی" ہے؛ ع میں بھی یہی ہے۔ ن میں "بھائی چاریکا" ہے؛ اِسے "چارے کا" اور "چاری کا" دونوں طرح پڑھ سکتے ہیں۔ ف میں "بھائی چارَی" ہے؛ چوں کہ ف میں آخرِ لفظ میں واقع یائے معروف و مجہول میں کچھ فرق نہیں، اُس کے ٹائپ میں ہر جگہ صرف "ی" ملتی ہے (اس ٹائپ میں یائے مجہول کی شکل (ے) ہوتی نہیں) اِس لیے متن کے متعلق کوئی بات نہیں کہی جاسکتی، مگر اِس کی فرہنگ میں BHĀ-Ī-CHĀRĪ لکھا گیا ہے، اِس سے قطعی طور پر تعیّن ہوجاتا ہے کہ ف کے متن میں بھی "بھائی چاری" ہی ہے۔ آصفیہ و نور میں "بھائی چارا" ملتا ہے (جو عام مستعمل لفظ ہے) مگر "بھائی چاری" موجود نہیں۔ کراچی سے ترقیِ اُردو بورڈ کا جو لغت چھپ رہا ہے، اُس کی تیسری جلد میں "بھائی چارا / بھائی چاری" دونوں لفظ موجود ہیں؛ اور آخر الذکر کی مثال میں، باغ و بہار کی اِسی عبارت کو درج کیا گیا ہے، مگر اِسے طباعت کی ستم ظریفی کہیے کہ اِس مثالیہ عبارت میں "بھائی چارے کا" چھپا ہے۔ واضح طور پر یہ غلطیِ طباعت ہے، کیوں کہ باغ و بہار کی اِن تینوں اشاعتوں میں یہاں "بھائی چاری" ہے۔ فیلن کے لغت میں بھی یہ موجود نہیں؛ البتہ پلیٹس کے لغت میں "بھائی چاری" موجود ہے: "BHĀ'Ī-CHĀRĪ, S.F. = Bhā'ī-chā-ńā, q.v. : Bhā'ī-Hissa, S.M. Share or Portion of a Brother = "Bhā'ī-ańs" "بھائی چاری" کو "بھائی انس" کا مرادف لکھا گیا ہے اور "انس" کے ذیل میں اِس طرح تشریح کی گئی ہے: "H. انس अंस ańs [S. अंश ans, q.V.], S.M. : Part, Portion Share, division ; degree of lat. or long.) ..." غرض کہ ک، ف، ع: سب میں "بھائی چاری" ہے اور پلیٹس کے لغت میں یہ لفظ موجود ہے، ایسی معنوی تفصیلات کے ساتھ جو اِس موقعے کے عین مناسب ہیں۔ اُردو میں "بھائی چارا" بیش تر بھائیوں جیسی دوستی کے مفہوم میں مستعمل ہے، اور یہاں محل ہے جایداد کی تقسیم کا، حصّے لگنے کا، اور

اِس مفہوم میں (پلیٹس کی صراحت کے مطابق) "بھائی چاری" ہی کھپتا ہے۔ اِس مفصّل صراحت کو یوں ضروری سمجھا گیا ہے کہ "بھائی چاری" اب مستعمل لفظ نہیں، میری نظر سے بھی کہیں اور یہ نہیں گزرا اور "بھائی چارا" مستعمل لفظ ہے، اِس وجہ سے طالب علموں کے ذہن میں "بھائی چاری" کے متعلق یہ شک پیدا ہو سکتا ہے کہ شاید یہ غلطیِ کتابت ہو۔ ۱۱ ت : دو تو۔

ص ۱۳۶ ① ک اور ف میں اِس لفظ پر اعراب موجود نہیں، البتّہ ف کی فرہنگ میں "وَرَثَہ" ہے۔ طلبہ کی آسانی کے لیے یہ وضاحت کی جاتی ہے کہ "وَرَثَہ" جمع ہے "وارِث" کی۔ اور "میراث، مُردے کا مال" کے معنی میں "وَرْثَہ" ہے (بہ فتحِ اوّل و سکونِ دوم و فتحِ سوم)۔ نور میں مرزا اوجؔ لکھنوی کا یہ شعر سنداً مندرج ہے، جس سے پوری طرح وضاحت ہو جاتی ہے:

"جلاتے خوں میں نہانے کو ورثۂ داغِ حسینؓ ؛ خزاں، بہار میں ہوتا ہے گُل عذارِ حسینؓ"۔ اِس وضاحت کی ضرورت یوں بھی سمجھی گئی کہ آصفیہ میں عجیب صورتِ حال ہے، جس سے اُلجھن پیدا ہو سکتی ہے۔ آصفیہ میں "وَرَثَہ: میراث پانے والے لوگ" کے بعد "وَرْثَہ" ہے اور معنی لکھے ہیں: "ترکہ، مُردے کا مال جو حق دار کو پہنچے، میراث"۔ اور یہ سب بالکل ٹھیک ہے، مگر اِس کے بعد "وَرَثَہ بٹنا" اور "وَرَثَہ پانا" لکھا ہوا ہے، اور پھر "وَرْثے میں آنا" ہے۔ آخری اندراج ٹھیک ہے، مگر اُس سے پہلے کے دونوں اندراجات میں "ر" پر جو زبر ہے، وہ خود اُن کے اپنے تعیّن ("وَرْثَہ") کے مطابق درست نہیں۔ غالباً کتابت کی غلطی سے دونوں جگہ "ر" پر جزم کے بجائے زبر لگ گیا ہے۔ ② "جو کہا ... دل سے" ن میں یہ عبارت موجود نہیں۔ یہ صراحت بھی ضروری معلوم ہوتی ہے کہ اِس جملے میں بہ ظاہر کسی لفظ کی کمی محسوس ہوتی ہے [جیسے وہاں لکھی یہی جواب دیا] چوں کہ سب نسخوں میں یہ جملہ اسی طرح ہے، اس لیے کسی طرح کی ترمیم کو مناسب نہیں سمجھا گیا۔ ۲ ت : بال اپناپ۔ ۳ ن : دونو۔ ۴ ع : بود و باش۔ ۵ ن : توجب۔ ⑦ ک، ف، ع : نسب میں اِن لفظوں میں نونِ غنّہ موجود ہے، اِسی املا کو برقرار رکھا گیا ہے۔ ۸ ن : اس سے۔

ص ۱۳۷ ۱ ن : گھوڑی۔ ۲ ت : بچھیرا۔ ۳ ع : دکان۔ ۴ ت میں "جو" نہیں۔ ۵ ع : دکان۔ ۶ صرف یہ صراحت کرنا ہے کہ ک اور ف میں اضافت کا زیر موجود ہے۔ ⑦ ن، ف، ع : چاہتا۔ ک میں "چاہیتا" (مع یائے معروف) ہے۔ کسی قدیم تحریر میں فعل کی یہ صورت میری نظر سے نہیں گزری۔ جو لغات پیشِ نظر ہیں، اُن میں بھی یہ موجود نہیں۔ پلیٹس کے

لغت میں اور نور میں "چاہیتا" اور "چاہیتی" مندرج ہے "چاہیتا" اور "چاہیتی" کے معنی میں، مگر زیرِ بحث "چاہیتا" (جو فعل ہے) اِس سے مختلف ہے۔ یہ خیال کیا جا سکتا تھا کہ شاید یہ غلطیِ طباعت ہو، مگر ایسا نہیں۔ میر امّن نے اپنی دوسری کتاب گنجِ خوبی میں بھی ایک جگہ اِس فعل کو استعمال کیا ہے، دیباچۂ کتاب میں لکھا ہے: "جس تربیت اور تعلیم کو بارہ برس چاہیئے، سو تین برس کے عرصے میں بہ خوبی ہو جاتی ہے" (مخطوطۂ گنجِ خوبی)۔ اُردو رسم خط میں گنجِ خوبی دو بار چھپی ہے، اور دونوں اشاعتوں میں یہاں "چاہیے" ہے، مگر مخطوطے میں میر امّن کے قلم کا نہایت واضح طور پر اور ہر قسم کے شک سے بری لکھا ہوا "چاہیتے" موجود ہے۔ اور اِس طرح یہ قطعی طور پر معلوم ہو جاتا ہے کہ "چاہیتا" اور "چاہیئے" اپنی اپنی جگہ بالکل درست ہیں۔ چوں کہ فعل کی یہ شکلیں اُردو والوں کے لیے (مستعمل معنوں میں) اجنبی ہیں، غالباً اِسی وجہ سے بعد کے لوگوں نے دھوکا کھایا اور متعارف شکلیں "چاہیے" اور "چاہتا" عبارت میں شامل ہو گئیں۔ پروفیسر مسعود حسین خاں نے میرے خط کے جواب میں لکھا ہے: "میرا ساتھ کوئی لغت نہیں دیتی، لیکن اُتر پردیش کی بولیوں کا مجھے جو علم ہے، اُس کی بنا پر میں فعل "چاہتا" کا پوربی تلفظ "چاہیتا" (चाहिता) جانتا ہوں۔ طویل مصوّتے کی یہ وبا بہار تک پھیلی ہوئی ہے۔ میر امّن کا قیام چوں کہ کلکتے میں رہا تھا، اِس لیے انھیں بھی اِس تلفظ کی چھوت لگ گئی ہوگی۔" (مکتوب بہ نام راقم الحروف)۔ "چاہیتا" اور اِس کی دوسری شکل "چاہیتے" کے متعلق کوئی فیصلہ تو لسانیات سے متعلق افراد کریں گے، البتہ یہاں اِتنا کہنے میں مضائقہ نہیں معلوم ہوتا کہ دکنی میں (اور غالباً اودھی میں بھی) فعل کا یہ قماش مل جاتا ہے، مثلاً ولی کی ایک مشہور غزل کا پہلا مصرع ہے: کیتا ہوں ترے نانو کوں میں وِردِ زباں کا۔ یہاں "کیتا" کا وہی قماش ہے جو "چاہیتا" کا ہے، البتہ "چاہیتا" سے میر امّن نے جو "چاہیے ہوتا" کا مفہوم مراد لیا ہے، اُس کی مثال ذرا مشکل سے مل سکے گی۔ ہاں پنجابی میں بھی اِس کا سُراغ لگایا جا سکتا ہے، وہاں بھی یہ انداز پایا جاتا ہے۔ اِسے میں لسانیات والوں کے لیے چھوڑتا ہوں۔ مختصر یہ کہ کے میں جو "چاہیتا ہے" وہ بجائے خود بالکل صحیح ہے۔ میر امّن نے اِسے یہاں "چاہیے ہوتا" کے معنی میں لکھا ہے۔ گنجِ خوبی میں "چاہیتے" بھی "چاہیے ہوتے" کے معنی میں آیا ہے۔ شہ ع: دکان۔ ۹ہ کے اور فنے میں اضافت کا زیر موجود ہے۔ ۱۰ہ کے: متر بتر۔ (۱۱) یہ کیت ف اور

ع میں صرف ہندی رسمِ خط میں ہے، ن اور ک میں صرف اُردو رسمِ خط میں ہے۔ کبت کے متن کی تصحیح ف کے مطابق کی گئی ہے۔ ف، کا عکس یہاں شامل کیا جاتا ہے۔ مشکل لفظوں کے معنی بھی آخر میں لکھے گئے ہیں:

कहे कहूं न राजा? या तें कछु नाहीं काजा, एक तुम महाराजा, और कौन को सराहिये?
कहे कहूं न भाई? या तें कछु न बसाई, एक तुही है सहाई, और कौन पास जाइये?
कहे कहूं न मित्र, शत्रु? आठौं जाम एक रावरे चरन के नेह को निभाइये,
संसार है सदा, एक तू ही है सदा, अब चूमेंगे अंगूठा, एक तू न सदा चाहिये.

اتین: اُس سے۔ کچھ ناہیں کاجا: کچھ کام نہیں۔ سہائی: مدد کرنے والا۔ متر: دوست۔ شتر: دشمن۔ آٹھوں جام: دن رات۔ راورے: تمھارے۔ چرن: پانو۔ نیہ: پریم، محبت۔ سب چومیں گے انگوٹھا: سب لوگ پیر چومیں گے۔ ۱۲ ن: گھر میں۔

ص ۱۳۸ | ۱ ع: باندھی ہیں۔ ۲ ف: میرا روپیے۔ ع: میرا رُپیہ۔ ن: میرا روپیہ۔ ک کے متن میں "میرا روپے" چھپا ہوا ہے، مگر غلط نامے میں اِس کی تصحیح کی گئی ہے اور "میرا" کی جگہ "میرے" کو صحیح بتایا گیا ہے۔ ۳ ن: روپئے۔ ع: رُپیے۔ (۴) ک، ف، ع میں اِس لفظ کا یہی املا ("پانو") ہے۔ ۵ ف: ذرا۔ ع: زرا۔ ۶ ع: ٹھہر جاؤ۔ (۷) ن، ک، ف، ع، سب نسخوں میں "ادینہ" ہے۔ اصلاً "آدینہ" ہے (غیاث اللغات)۔ چوں کہ سبھی نسخوں میں "ادینہ" ہے، اِس لیے اِسی صورت کو برقرار رکھا گیا ہے۔ اِس خیال سے کہ اُس زمانے میں اِس طرح بھی مستعمل ہوگا یا یہ کہ مصنف نے اِسی طرح لکھا ہے۔ ۸ ن: کے۔ (۹) ک، ف، ع میں اضافت کا زیر موجود ہے۔ ۱۰ ن: روپیے۔ ع: رُپئے۔ ۱۱ ن: کیا روپیہ سے۔ ع: رُپیئے۔ ۱۲ ن: روپیئے۔ ع: رُپیے۔ ۱۳ ن: دونو۔ ۱۴ ع: دو بدرسے رُپیے۔ ۱۵ ن: روپیئے۔ ع: رُپیے۔ (۱۶) ک میں ہ پر زبر لگا ہوا ہے، اِسی کی مطابقت اختیار کی گئی ہے۔ آصفیہ میں "ٹہلوانا" ہے۔ اِس میں شک نہیں کہ یہ مصدر اور اِس کے مشتقات زبانوں سے ادا اِسی طرح ہوتے ہیں کہ ہ مکسور معلوم ہوتی ہے، مگر اصلاً ہ پر زبر ہے۔ اُردو کے لہجے کا ایک یہ بھی خاصہ ہے کہ ایسے متعدد لفظ جن میں ہ یا ح درمیانِ لفظ میں آتی ہے اور اُس کا حرفِ ماقبل مفتوح ہوتا ہے یا وہ ح یا ہ مفتوح ہوتی ہے، تو اِن سب صورتوں میں تلفظ میں ایک طرح کا اِدرچھاپن پیدا ہو جاتا ہے، مثلاً "احمد" جو "افضل" کے وزن پر ہے، زبان سے ادا اِس طرح ہوتا ہے کہ الف کے زیر کی آواز میں ترچھاپن پیدا ہو جاتا ہے (یہاں عربی کے بعض فاضلوں کے تلفظ سے

بحث نہیں) اور اسی طرح مثلاً "مَحَل" کا تلفظ "مَحِل" سے قریب تر ہو جاتا ہے۔ یہی صورت "نَہلوانا" کی ہے کہ اصلاً ہَ پر زبر ہے، مگر زبان سے یہ لفظ ادا اس طرح ہوتا ہے جیسے ہ مکسور ہو۔ چوں کہ ک میں ہَ پر زبر موجود ہے (اور یہ اصل کے بھی مطابق ہے) اس بنا پر ک کی مطابقت اختیار کی گئی ہے اور ہَ پر زبر لگایا گیا ہے۔ تلفظ میں یہ لفظ "نِہلوانا" سے قریب تر ہو کر آئے گا اور تلفظ کی فصاحت کا تقاضا یہی ہوگا کہ اس کو اسی طرح ادا کیا جائے۔

ص ۱۳۹ ۱؎ ت: یہ دونو۔ ۲؎ ت: روپیے۔ ع: رُپے۔ ۳؎ ن: بچارا۔ ۴؎ ع: کی لڑکی پر۔ ۵؎ ف، ع: عاشق ہو۔ ۶؎ ع: بوزہ خانے کی (ک، ف: بوزے خانے کی)۔ اصولاً تو ع کی قرائت کو ترجیح حاصل ہونا چاہیے؛ محرّف صورت میں آخری لفظ "خانہ" کی ہائے مختفی کو ے سے بدل جانا چاہیے اور پہلے جزو "بوزہ" کو علیٰ حالہٖ رہنا چاہیے۔ اب ایسے اجزا اسی طرح استعمال میں آتے ہیں؛ مگر میں نے یہاں بھی اصل سے انحراف کو مناسب نہیں سمجھا اور ک اور ف کی مطابقت اختیار کی ہے، اس خیال سے کہ ان دونوں نسخوں میں "بوزے خانے" کا بظاہر مطلب یہی ہے کہ اس ٹکڑے کو اسی طرح لکھا گیا تھا۔ چوں کہ مسئلہ صرف آج کل کے استعمال کے لحاظ سے ترجیح کا ہے، غلط یا صحیح کا نہیں (کیوں کہ "بوزے خانے" بھی بالکل درست ہے) اسی بنا پر اصل کی مطابقت کو ترجیح دی گئی ہے۔ ۷؎ ک میں اس لفظ پر ایک نشان سا ایسا بنا ہوا ہے جیسے ہَ پر زبر ہو مگر واضح نہیں، اشتباہ ہوتا ہے۔ ف میں اس لفظ پر اعراب موجود نہیں۔ البتہ ف کی فرہنگ میں اسے ہِ کے زیر کے ساتھ لکھا گیا ہے۔ آصفیہ میں "ٹہِلنا، ٹہِل، ٹہِل جانا" مندرج ہیں، یعنی ہ کے نیچے زیر ہے۔ اصلاً تو ہَ پر زبر ہے، مگر زبانوں پر "ٹہلنا" کے مشتقات اس طرح آتے ہیں کہ ہَ کا زبر، زیر سے بدلا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ ک کا احوال یہ ہے کہ اس قبیل کے الفاظ پر اسی نسخے میں کہیں تو ہَ پر زبر ملتا ہے اور کہیں اس کے نیچے زیر ملتا ہے۔ میں نے اصل پر نظر رکھتے ہوئے ف کی فرہنگ کی مطابقت اختیار کی ہے اور ہَ پر زبر لگایا ہے۔ ۸؎ ن: دونو۔

ص ۱۴۰ ۱؎ ک: گانوں۔ ف: گانوں (ع: گانو)۔ ۲؎ ک، ف: بمعہ۔ ن، ع: بہ معہ۔ یہ صراحت بھی بے محل نہ ہوگی کہ "مال اسباب" کے درمیان عطف کا واو یہاں کسی نسخے میں موجود نہیں۔ اس کے برخلاف نویں سطر میں سب نسخوں میں "مال و اسباب" (مع واوِ عطف) ہے۔ دونوں جگہ اصل متن کی مطابقت اختیار کی گئی ہے۔ نیز یہ صراحت بھی ضروری معلوم ہوتی ہے کہ

ک اور ف دونوں میں لفظ "معہٗ" مع ہمزۂ اضافت ہے، اس کا صاف طور پر مطلب یہ ہوا کہ اس لفظ کو مضاف مانا گیا ہے، اسی بنا پر ع کے نیچے اضافت کا زیر لگایا گیا ہے۔ البتہ یہ بات طلبہ کے ذہن نشین رہنا چاہیے کہ قاعدے کے لحاظ سے تو "مع مال اسباب" لکھا جائے گا، مگر جب اس کو پڑھیں گے، تو اضافت کا زیر اپنے آپ کو نمایاں نہیں کرے گا، یعنی تلفظ میں یہ مرکب اس طرح آئے گا کہ اضافت اچھی طرح ظاہر نہ ہو۔ تلفظ کی فصاحت اسی کی طلب گار ہے۔ [دیکھیے "ضمیمۂ تلفظ و املا" میں لفظِ "مع"]۔ ۳؎ ف، ع: جاؤں۔ ۴؎ ف: گرھست۔ ن: گرست [ک، ع: گرہست] ک میں گاف کے نیچے زیر موجود ہے۔ ک کی مطابقت اختیار کی گئی ہے (اس سلسلے میں دیکھیے ضمیمۂ تلفظ و املا میں "سرہانا" کی بحث)۔ ۵؎ ع: آیا۔ ۶؎ ع: کاش کہ۔ ۷؎ ن: وہ دو تو۔ ۸؎ ن: دو جوڑے کپڑے (ظاہراً کتابت کی غلطی)۔ ۹؎ ن: یہ۔ ۱۰؎ ن: یہ۔ ۱۱؎ ف: ذکواۃ۔

ص ۱۴۱ ① ن اور ک میں واو پر ہمزہ موجود نہیں (اس لفظ کا مرجح املا یہی ہے)۔ ف، ع: پاؤ۔ ② صرف یہ صراحت کرنا ہے کہ سب نسخوں میں اسی طرح (مانجھ دھار) ہے۔ ③ ک میں واو پر علامتِ مجہول موجود ہے۔ ④ ن، ک، ف، ع: سب میں اس لفظ کا یہی املا ہے (یعنی آخر میں الف ہے)۔ ن میں صرف "پہنا" ہے؛ "ایک" موجود نہیں۔ ⑤ سب نسخوں میں اسی طرح (یعنی عطف کا واو موجود نہیں)۔ ⑥ "قابض متصرف" کے درمیان بھی عطف کا واو موجود نہیں۔ ⑦ ک، ف، ع میں اس لفظ کا یہی املا ("پانو") ہے۔ ⑧ سب نسخوں میں اس لفظ کا یہی املا ہے۔ یہ صراحت یوں کی گئی کہ آصفیہ کے مطابق "باڑھ۔ باڑھ" دونوں طرح درست ہے۔ ۹؎ ک، ف، ع، ن: تھوڑا ہوا۔ ⑩ ن اور ک میں "دھکیلا" ہے؛ اس کے برخلاف ف اور ع میں "ڈھکیلا" ہے۔ ک کی مطابقت اختیار کی گئی ہے۔ آصفیہ میں صرف "دھکیلنا" (دالِ مہملہ کے ساتھ) مندرج ہے۔ نور میں صراحت کی گئی ہے کہ لکھنؤ میں "ڈھکیلنا" ہے اور دلی والے "دھکیلنا" کہتے ہیں۔

ص ۱۴۲ ① ک میں اسی طرح یعنی واو پر ہمزہ موجود نہیں۔ ف، ع: پاؤ۔ ن میں "نادر" کی جگہ "سلف" لکھا ہوا ہے۔ میں یہ نہیں معلوم کر سکا کہ یہ کیا لفظ ہے۔ ② محض احتیاطاً یہ صراحت کی جاتی ہے کہ سب نسخوں میں دونوں ٹکڑوں کے آخر میں یائے مجہول ہے۔ ۳؎ ن: آنکھوں کھول کر۔

ع : آنکھ کھول کر۔ ۷ع : پڑا تھا۔ ۸ن : ہوش آیا۔ ۹ک : سواد (ف : سَواد)۔ ۱۰
ن : وہ کوس بھر۔ ۱۱ع : دکانیں۔ (۹) صرف یہ صراحت کرنا ہے کہ ن، ک، ف، ع، سب
میں "پَیسا" ہے، (یعنی آخر میں الف ہے)۔ ۱۲ع : دکان۔ ۱۳ع : نکلی۔
ص ۱۴۳ ۱ن : چونما۔ (۲) ن : غل شور۔ چوں کہ ک، ف، ع میں عطف کا واو موجود ہے
اس لیے واو کو برقرار رکھا گیا ہے۔ بہ ظاہر مرجح صورت "غل شور" معلوم ہوتی ہے، مگر اِس بنا پر "غل و شور"
کو بھی غلط نہیں کہہ سکتے، کیوں کہ ایسے مرکبات اُس زمانے کی تحریروں میں مل جاتے ہیں، اور واضح غلطی کے
بغیر اصل متن میں تصرف مناسب نہیں، اِس بنا پر ک کی مطابقت اختیار کی گئی ہے۔ ۳ن، ع : مجھلے۔
(۴) سب نسخوں میں یہی املا ہے (یعنی ط موجود ہے) یوں اِسی املا کو برقرار رکھا گیا ہے [اِس لفظ کا
یہ املا بھی ملتا ہے، اگرچہ اب مرجح املا ت کے ساتھ ہے]۔ ۵ن میں "میں" موجود نہیں۔
(۶) ک میں "خورد خام" ہے، یعنی واو کا سر خالی ہے۔ اِسی املا کو برقرار رکھا گیا ہے
[ملفظ "خُرد خام"]۔ ——————————— (۷) ک اور
ف میں یہاں "گِنگیایا" ہے۔ ع میں "گھگھیایا" ہے۔ اِس کے برخلاف ص ۱۴۹ پر "گھگھیانے لگا"
ہے اور وہاں ک، ف، ع میں اِسی طرح یعنی دو ہائے مخلوط کے ساتھ ہے۔ نونِ غنہ کی آواز کی
طرح ہائے مخلوط کی آواز بھی سیّال حالت میں رہی ہے اور یہ مصدر بھی اُنھی الفاظ میں شامل ہے جن
میں اِس صورتِ حال کے اثرات نمایاں رہے ہیں۔ "گھگھیانا" اور "گِھگیانا"، دونوں صورتیں کتابوں
میں ملتی ہیں، اِس بنا پر اِن دونوں مقامات پر ک کی مطابقت اختیار کی گئی ہے اور اپنے اپنے
مقام پر دونوں صورتوں کو برقرار رکھا گیا ہے۔ کیونکہ اِس طرح اِس لفظ میں اختلافِ املا کی نشان دہی
بھی ہو رہی ہے۔ ہاں مخطوطۂ گنجِ خوبی میں ایک جگہ گِھگّی (ایک ھ کے ساتھ) ملتا ہے (ص ۱۵۳) اور
آصفیہ میں صرف "گِھگیانا" ہے۔ (اب عموماً اِسی طرح لکھتے ہیں)۔ ۸ن : اکھٹے۔ ک، ف :
اکھٹی۔ ع : اکٹھی۔ [اِس لفظ کی بحث کے لیے دیکھیے "ضمیمۂ تلفظ و املا" میں "اِکٹھے"]۔ ۹
ن : پھے۔ (۱۰) محض احتیاطاً یہ صراحت کی جاتی ہے کہ سب نسخوں میں یہی املا ہے۔ ۱۱ع : لات تکّے۔
[آصفیہ میں "لات تکّی" موجود ہے]۔ ۱۲ن : یہ۔ ۱۳ف : ناحق۔
ص ۱۴۴ ۱ن : یہ۔ ع : یہ۔ ۲ع میں "کہ" نہیں۔ ۳ف، ع : کھڑا ہو۔ (۴) صرف
یہ صراحت مقصود ہے کہ سب نسخوں میں اِسی طرح ہے۔ تلفظ میں "فائدے مند" آتا ہے۔ اصل کی مطابقت

اختیار کی گئی ہے۔ ۵۳ ن: چیلے بادشاہی۔ ۵۴ ف: ازدہام۔ ن: اژدہام۔ ک کے متن میں "ازدہام" چھپا ہوا ہے، مگر غلط نامے میں اس کی تصحیح کر دی گئی ہے اور "ازدحام" لکھا گیا ہے۔
۵۵ ن: سولی پر۔

ص ۱۲۵ ۱ ن میں "یہ" نہیں۔ ہاں یہ صراحت بھی ضروری معلوم ہوتی ہے کہ ک، ف، ع میں اس مقام پر "یہ" ہی ہے، اگرچہ ایسے اکثر مقامات پر جمع کے لیے ان نسخوں میں عموماً "یے" ملتا ہے۔ مثلاً اسی صفحے کی دسویں سطر میں "یے" آیا ہے۔ ② سب نسخوں میں یہی املا ہے [اور صحیح صورت بھی یہی ہے۔ یہ صراحت یوں کی گئی کہ کچھ لوگ "دیوؤں" بھی لکھ دیتے ہیں] ۳ ف: کوا۔ ک: کووا۔ (ع: کنوان)۔ ④ ن: دنڈیلے (ظاہراً غلطیِ کتابت)۔ ک، ف، ع میں یہ جملہ اسی طرح ہے۔ یہاں "نے" کا استعمال بہ ظاہر عجیب سا معلوم ہوتا ہے، مگر میر امّن کے یہاں "نے" کے حذف اور اس کے استعمال کی اس قبیل کی مثالیں موجود ہیں (اس زمانے میں یہ عام صورت تھی) مثلاً تیسرے درویش کی کہانی کے یہ دو جملے: "جب میں جیتا اٹھ کر، اس معشوق کے مقابل جا کر سلام کیا"۔ "اور تو نے بستی کو چھوڑ کر جنگل پہاڑ کیوں بسایا ہے"۔ یہ صراحت بھی بے محل نہ ہوگی کہ اس جملے میں "ڈنڈے" ("ڈنڈا" کی محرف صورت) سپاہی کے معنی میں آیا ہے۔ پلیٹس کے لغت میں یہ لفظ اس معنی میں موجود ہے اور مولوی عبدالحق نے اپنے نسخے کی فرہنگ میں اس کے معنی "ڈنڈے بردار، ملازم" لکھے ہیں (مطلب وہی ہے)۔ ڈنکن فوربس نے اپنے نسخۂ باغ و بہار کی فرہنگ میں "ڈنڈا" کو سنسکرت بتایا ہے اور معنی لکھے ہیں: " A Staff (of office); Helapt, Staff-Bearers, or attendants" ۵ ک، ف: کوئے (ع: کنویں) ⑥ ن: اس کے من پر۔ ک اور ع میں "اس کے مینڈ پر" ہے۔ "مینڈ" کو آصفیہ میں مونث لکھا گیا ہے (اور نسخے میں بھی اسی طرح آیا ہے)۔ یہ خیال کیا جا سکتا تھا کہ "کے" غلطیِ طباعت ہے، مگر صورتِ حال یہ ہے کہ میر امّن کی نثر میں تذکیر و تانیث کا اس قدر اختلاف ملتا ہے موجودہ استعمال کے مقابلے میں، کہ کسی لفظ کے متعلق آسانی کے ساتھ کوئی بات نہیں کہی جا سکتی اور یہ فیصلہ نہیں کیا جا سکتا کہ ایسے مقامات پر لازماً طباعت کی غلطی ہے۔ مثلاً میر امّن نے "شک" کو مونث لکھا ہے: "اس کے دل میں شک آئی" یا "خم" کو مونث استعمال کیا ہے (وغیرہ)۔ اگر اس پہلو پر نظر رکھی جائے تو پھر یہ بات آسان نہیں معلوم ہوگی کہ کسی خاص لفظ کی تذکیر و تانیث کو بدلنے کا خیال

دل میں لایا جائے۔ یہ خیال ہر وقت رہے گا کہ ممکن ہے میر امّن نے اسی طرح لکھا ہو یعنی اُن کے زمانے میں اِس طرح بھی بولتے ہوں، یا یہ کہ وہ خود اِس طرح بولتے ہوں۔ یہ دونوں باتیں بہ خوبی ممکن ہیں۔ کسی دلیل کے بغیر اِس امکان کو باطل نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ کم از کم میں اِس ذمّے داری کو قبول کرنے کی صلاحیت اپنے میں نہیں پاتا کہ آج کے طریقِ استعمال کو مدِ نظر رکھ کر، محض قیاس کی بنا پر، اصل متن کو بدل دوں اور " اس کی مینڈ" لکھوں۔ میری رائے میں یہ طریقِ کار تقاضائے احتیاط اور ذمّے داری کے احساس کے خلاف ہوگا۔ اِسی بنا پر یہاں ک کی مطابقت اختیار کی گئی ہے۔ اِس بحث میں یہ بات بھی پیشِ نظر رہنا چاہیے کہ ن میں " اس کے من پر" ہے۔ اِس کا بہ ظاہر مطلب یہی ہے کہ روایتِ اوّل میں "مینڈ" کی جگہ " من" لکھا گیا تھا۔ روایتِ ثانی (ک) میں " من" کو " مینڈ" سے بدل دیا گیا۔ اب یہ دیکھیے کہ لفظ " من" کو کنویں کی مینڈ کے معنی میں نور میں مؤنث لکھا گیا ہے، مگر آصفیہ میں اِسے مذکر لکھا گیا ہے۔ اور سانپ کے مُہرے کے معنی میں " من" کو نور و آصفیہ دونوں میں مذکّر لکھا گیا ہے، مگر خانِ آرزو نے نوادر الالفاظ میں " من سانپ کی" لکھا ہے : " من سانپ کی : مہرہ کہ از مار حاصل شود ...... مار مہرہ" [نوادر الالفاظ؛ مرتبۂ ڈاکٹر سیّد عبداللہ، ص ۴۱۲] اِس سے تذکیر و تانیث کے خلفشار کا بہ خوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ قیاس یہ کہتا ہے کہ روایتِ اوّل میں " کنویں کے من پر" لکھا گیا تھا اور اس صورت میں روایتِ ثانی میں اُسے اگر " کنویں کے مینڈ پر" سے بدل دیا گیا، تو یہ مطلق تعجّب کی بات نہیں ہوگی۔ ؎ ن، ک : ذرہ۔ ف : ذرّہ۔ ع : زرا۔ ⑧ ف : میں نے۔ اگر آج کل کے استعمال پر نظر رکھی جائے تو ف کی مطابقت مرجّح معلوم ہوگی، مگر اُس زمانے میں " نے" کے استعمال کو ذہن میں رکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ جملہ بجائے خود صحیح ہے۔ اِسی لیے ک (اور ف، ع) کی مطابقت کو ترجیح دی گئی ہے۔ ۹ ن : انھیں معلوم کیا۔ ۱۰ ک، ف : منکر۔ ع : منکر نکیر۔

ص ۱۴۶ ۱ ک : تم جو کھاتے ہو کیا؟ جو ہو مجھے بھی ...... (ظاہراً طباعت کی غلطی ہے)۔ ف، ع : تم کھاتے ہو کیا ہو جو مجھے بھی ...... ن میں یہ جملہ اُسی طرح ہے جس طرح متن میں لکھا گیا ہے۔ یہاں ن کے متن کو ترجیح دی گئی ہے، اِس بنا پر کہ ک میں واضح طور پر طباعت کی غلطی ہے اور ف میں اُس کو جس طرح نقل کیا گیا ہے، اُس سے جملہ بامعنی تو ہو گیا ہے، مگر صاف صاف معلوم ہوتا ہے کہ اِس میں (تصحیح کی خاطر) تصرّف کیا گیا ہے، یوں ن کا متن مرجّح قرار

پاتا ہے۔ ۲۵؎ ک: عِشْق (ظاہراً غلطیِ طباعت)۔ (۳) صرف یہ صراحت کرنا ہے کہ ن، ک، ف، ع میں لفظ "زندان" میں ہر جگہ آخری نون پر نقطہ موجود ہے۔ اِس التزام کی بنا پر اِسے مع نونِ نقطہ دار لکھا گیا ہے۔ (۴) ک میں "جان" ہے، جب کہ ف اور ع میں "جاں" ہے، میں نے ک کی مطابقت اختیار کی ہے۔ یہ ذہن میں رہے کہ ک میں اِس سے پہلے "جاں بخشی" دو بار آیا ہے اور دونوں جگہ "جان" (مع نونِ غنّہ) ہے۔ "جاں کندنی" بھی اِسی ذیل میں آتا ہے۔ (۵) سب نسخوں میں آخری نون پر نقطہ موجود ہے۔ ۲۶؎ ک، ف: کوئے۔ ۲۷؎ ع: دکان۔ (۸) ک اور ف میں اضافت کا زیر موجود نہیں۔ زیر کا اضافہ میں نے کیا ہے، اِس بنا پر کہ میرے خیال میں یہاں اضافت ضروری ہے اور یہ فرض کر لیا ہے کہ طباعت میں اضافت کا زیر چھوٹ گیا ہے [اِس خیال کی وجہ یہ ہے کہ اِس قبیل کے دوسرے بہت سے مقامات پر ک اور ف میں اضافت کے زیر ملتے ہیں]۔

ص ۱۴۷ ۱؎ ک، ف: گاؤں۔ ع: گانو۔ ۲؎ سب نسخوں میں یہی املا ہے، یعنی آخر میں الف ہے۔ ۳؎ ک، ف: پاؤں (ع: پانو)۔ ۴؎ ف، ع: پہاڑ ہی پر۔ (۵) ک اور ف میں "گرِفتار" ہی ہے، یعنی شروع کے دونوں حرفوں کے نیچے زیر لگے ہوئے ہیں۔ (۶) سب نسخوں میں "زبان" کے نون پر نقطہ موجود ہے۔ (۷) ک اور ف میں اِسی طرح، یعنی "بھبھیا رون" دو ہائے مخلوط کے ساتھ ہے۔ (۸) ک، ف: گردا۔ ع: گُرداً۔ اصل لفظ "گرده" ہے، یعنی آخر میں ہائے مختفی ہے۔ چوں کہ سبھی نسخوں میں "گردا" ملتا ہے، اِس بنا پر اِسی املا کو برقرار رکھا گیا ہے اور یہ مان لیا گیا ہے کہ مصنف نے اِس لفظ کو ہندی لفظ کے طور پر اپنی عبارت میں استعمال کیا ہے۔

ص ۱۴۸ (۱) سب نسخوں میں "نان" کے آخری نون پر نقطہ موجود ہے۔ طلبہ کے استفادے کے لیے یہ صراحت کی جاتی ہے کہ قواعدِ شاعری کی پابندی کے خیال سے اگر اِسے "آب و ناں" لکھا جائے تو تلفظ میں عجیب کیفیت پیدا ہو جائے گی اور بیان کی فصاحت مجروح ہوتی ہوئی محسوس ہوگی۔ قواعدِ شاعری کا اطلاق نثر پر یوں بھی نہیں کیا جاتا۔ علاوہ ازیں عہدِ غالب تک اساتذۂ دہلی اِس قاعدے کو بہ طورِ التزام مانتے ہی نہیں تھے کہ عطفی و اضافی ترکیبوں کی صورت میں ایسے نون کو اعلان کے ساتھ نہ لکھا جائے۔ میر امّن نے ایسے مواقع پر عموماً بول چال کے انداز کو ملحوظ رکھا ہے اور ایسے جو مفرد یا مرکّب لفظ بول چال میں مع اعلانِ نون آتے ہیں، اُن میں آخری نون پر نقطہ ضرور لگایا ہے۔ وہی صورت یہاں ہے۔ ۲؎ ک، ف: چھ۔ ع: چھے۔ (۳) ک اور ف میں

نسخوں کے نون پر نقطہ موجود ہے۔ حاشیہ ۱۲ کے تحت ایسے مواقع پر اعلانِ نون سے متعلق صراحت کی جا چکی ہے۔ (۴) صرف یہ صراحت کرنا ہے کہ ک اور ف دونوں میں اضافت کا زیر موجود ہے۔ بظاہر یہاں اضافت کے بغیر ان لفظوں کو الگ الگ پڑھا جائے تو کچھ بہتر معلوم ہوگا، مگر میں نے محض احتیاطاً اصل سے انحراف کو روا نہیں رکھا۔ (۵) ک: جگّہہ (گاف پر زبر ہے اور ہ کے نیچے شوشہ موجود ہے)۔ ع: جگہہ۔ دَ کے نیچے شوشے کا مطلب واضح طور پر یہی ہے کہ اس لفظ میں ہائے ملفوظ ہے۔ اسی بنا پر ہ (یعنی ہائے ملفوظ) کے نیچے شوشہ لگایا گیا ہے (جس طرح ع میں ہے)۔ البتہ گاف پر زبر لگانے کی ضرورت نہیں سمجھی گئی کیوں کہ اس کا مفتوح ہونا ہر طرح کے التباس سے مبرا ہے۔ ہاں ف میں بھی آخر میں صرف ایک ہ ہے۔ (۶) ن: لڑھتا پڑھتا (ک، ف، ع: لڑھتا پڑتا)۔ آصفیہ میں "لُڑھتا پڑھتا" ہے (جس طرح ن میں ہے)، مگر میں نے یہاں بھی ک کی مطابقت کو ترجیح دی ہے۔ وجہ وہی ہے جس کا اس سے پہلے کئی بار ذکر آ چکا ہے کہ یہاں بھی معاملہ صرف ترجیح کا ہے، غلط یا صحیح کا نہیں۔ یعنی یہ نہیں کہہ سکتے کہ "لڑھتا پڑتا" غلط ہے۔ اسی بنا پر ک کی مطابقت کو ضروری خیال کیا گیا ہے۔

ص ۱۴۹ (۱) "زرہ" اور "بکتر" دو الگ الگ لفظ ہیں، مگر یہ دونوں ایک ساتھ جب آتے ہیں تو اس سے ایک ہی لباس مراد ہوتا ہے، یعنی زرہ۔ یہاں بھی یہ دونوں لفظ اسی طرح آئے ہیں، اسی لیے ان کے درمیان کاما نہیں لگایا گیا۔ [ہاں فارسی میں "بکتر" ہے]۔ ۲ے ف: ناحق۔ (۳) ک اور ف میں غ کے نیچے زیر موجود ہے (بہ لحاظِ اصل بھی اسی طرح ہے)۔ (۴) ک میں "جان" کے نون پر نقطہ موجود نہیں۔ ۵ے ن: بیچتا تا تھا۔ (۶) ک میں واو پر علامتِ مجہول موجود ہے۔ ۷ے ع: نام و نشان۔ (۸) ک میں مع نونِ مشدّد اور یائے مظہرہ "کتّیا" ہے۔ ف کی فرہنگ میں بھی بہ نونِ مشدّدِ مکسور درج ہے اور آصفیہ میں بھی "کِتّیا" ہے۔ (۹) ک میں یٰ پر علامتِ مجہول موجود ہے۔ (۱۰) سب نسخوں میں "راجا" ہی ہے (یعنی آخر میں الف ہے)۔ ۱۱ے ن: بہرور۔

ص ۱۵۰ (۱) دو باتوں کی صراحت کرنا ہے، ایک تو یہ کہ ک اور ف میں "آگیا" (مع الفِ مقصورہ) ہے۔ یہ صراحت یوں ضروری سمجھی گئی کہ آصفیہ میں "اگیا" اور "آگیا" دونوں طرح مندرج ہے۔ مزید یہ کہ ک اور ف میں گاف پر تشدید بھی موجود ہے، البتہ ع میں "اگیا" تشدید کے بغیر ہے۔ دوسرے یہ کہ ک میں "اگیا" مع اظہارِ ی ہے [ک میں یائے مخلوط کے نقطے نیچے اوپر لگے ہوئے ملتے ہیں؛

یعنی اِس لفظ کو اگر مع یائے مخلوط لکھا جاتا تو "اگیا" لکھا جاتا۔] ک کی مطابقت اختیار کی گئی ہے۔ [ہندی والوں کی زبان سے یہ لفظ مع یائے مخلوط التلفّظ سننے میں آتا ہے]۔ ک، ن میں "میں" نہیں۔

③ "دُوصر احتیں کرتا ہیں: سب نسخوں میں "جھر وکھے" (دُو ھ کے ساتھ) ہے۔ دوسرے یہ کہ ک میں "زیر" کے نیچے اضافت کا زیر موجود ہے، ن میں یہ موجود نہیں۔ ک کی مطابقت کو ترجیح دی گئی ہے۔

④ اِس لفظ میں پہلی ی معروف بھی ہے اور مجہول بھی۔ پلیٹس کے لغت میں اِس کی صراحت موجود ہے۔ چوں کہ ک میں پہلی ی پر علامتِ مجہول موجود ہے، اِس لیے اُسی کی مطابقت اختیار کی گئی ہے۔

⑤ اِس صفحے پر یہ لفظ دُو جگہ آیا ہے اور دونوں مقامات پر ک میں اِس لفظ پر ایک زبر اِس طرح لگا ہوا ہے کہ اُسے کاف سے بھی متعلق سمجھا جا سکتا ہے اور سین سے بھی۔ ف میں اِس لفظ پر اعراب موجود نہیں، مگر اُس کی فرہنگ میں اِس کو بہ فتحِ اوّل و سکونِ دوم لکھا گیا ہے (اصلاً بھی اِسی طرح ہے)۔ چوں کہ ک میں وضاحت نہیں، اِس لیے ف کے مطابق اِسے بہ فتحِ اوّل و سکونِ دوم لکھا گیا ہے۔ ⑥ ک میں "گُپَت" ہے، یعنی کاف پر پیش لگا ہوا ہے اور پ پر زبر موجود ہے۔ اصلاً "گُپْت" ہے۔ فیلن کے لغت میں "گُپَت" (بہ فتحِ دوم) کو ان پڑھوں کی زبان بتایا گیا ہے۔ ف میں گ پر پیش تو لگا ہوا ہے، مگر پ خالی ہے اور اُس کی فرہنگ میں یہ لفظ موجود نہیں۔ سننے میں "گُپْت" (بہ سکونِ دوم) آتا ہے اور بہ لحاظِ اصل بھی اِسی طرح ہے۔ مگر اِس بنا پر کہ ک میں نہایت واضح طور پر گ پر پیش اور پ پر زبر موجود ہے، میں نے اُسی کی مطابقت کو ترجیح دی ہے۔ میر امّن کے یہاں ایسے تصرفات اور بھی ملتے ہیں، اِس لیے یہاں پ کے زبر پر تعجب نہیں کرنا چاہیے۔ ہاں، "رَکّھی" ک میں مع تشدید ہی ہے۔ اِس صفحے کی سترھویں سطر میں بھی "رَکّھی" ک میں مع تشدید ہے۔ ⑦ ک میں اِس لفظ پر اعراب موجود نہیں۔ ف میں "دِھراہر" ہے یعنی دال کے نیچے زیر لگا ہوا ہے، مگر دوسری ہ پر کوئی حرکت موجود نہیں اور اُس کی فرہنگ میں یہ لفظ موجود ہی نہیں۔ پلیٹس کے لغت میں "دَھراہَر" ہے؛ میں نے اِسی کے مطابق د اور ہ پر زبر لگایا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ک میں "میری" ہے (میری دھراہر) اور ع میں "میرے" ہے۔ ک کی مطابقت اختیار کی گئی ہے۔ آصفیہ میں اور فیلن کے لغت میں یہ لفظ موجود نہیں۔ ⑧ ایک مثل ہے: عشق اور مُشک چھپائے نہیں چھپتے، لیکن اِس عبارت میں بہ ظاہر اِس مفہوم کی گنجایش دکھائی نہیں دیتی۔ (ک میں "مُشک" کے میم پر پیش موجود ہے)۔ یہ میر امّن کا اپنا اندازِ نگارش ہے، جس کی سند یا

مثال کہیں اور ملنا مشکل ہے۔ بہ ظاہر مطلب اُن کا یہی ہے کہ دنوں تک یہ عاشقی چھپی رہی۔ ۹ ن: حکم
قتل کا دیا۔ ⑩ ن، ک: کہہ۔ ع: کہ۔ ک میں د کے نیچے شوشہ موجود ہے اور اس کا صاف طور پر
مطلب یہ ہے کہ اِس لفظ میں ہائے ملفوظ ہے۔ آخر میں ہائے مختفی کا اضافہ پرانی روشِ نگارش کا نتیجہ
ہے [جس طرح مثلاً "اَس"، "کو" اوس" لکھتے تھے]۔ ف میں اِس لفظ کے آخر میں صرف ایک ہ ہے
اور اس سے اِس لفظ کا دُو حرفی ہونا ظاہر ہوتا ہے [یہ لفظ ہے بھی دُو حرفی یعنی ک اور ہ سے مرکب
ہے] اِسی بنا پر د کے نیچے شوشہ لگایا گیا ہے اور آخر کی زائد ہائے مختفی کو نکال دیا گیا ہے (جس طرح
ع میں ہے)۔ ۱۱ ن: وہ۔ ۱۲ ن: کھانا اور جل۔ ف: ان اور جل۔ ۱۳ ن، ع: اٹھوائے۔
ص ۱۵۱ ۱ ن: اور کپڑا اسے کر۔ ② صرف یہ صراحت کرنا ہے کہ ک میں واو پر ماقبل
مفتوح کی علامت موجود ہے (مستعمل بھی اِسی طرح ہے)۔ ۳ ن: قینچی۔ ④ ک اور ف میں
س کے نیچے زیر موجود ہے۔ ⑤ ک میں "دوگانہ" ہے یعنی واو شاملِ کتابت تو ہے، شاملِ
تلفظ نہیں۔ یہ واقعہ ہے کہ "دو" کے ایسے مرکبات میں واو لکھا جاتا ہے مگر وہ شاملِ تلفظ نہیں
ہوتا۔ اِسی لیے "دو" میں دال پر پیش نہیں لگایا ہے۔ ⑥ محض احتیاطاً یہ صراحت کی جاتی ہے
کہ ک، ف اور ع میں "سے" پر اضافت کا ہمزہ موجود نہیں۔ ک اور ف میں بالعموم ایسے
مقامات پر سے پر ہمزہ نہیں ملتا [مرجح املا بھی یہی ہے۔ اِس کی بحث اِس سے پہلے بھی آچکی ہے]۔
ص ۱۵۲ ① بہ لحاظِ قاعدہ لفظ "سرحد" کو مع اضافت آنا چاہیے (سرحدِ ملکِ زیرباد...)
مگر ک اور ف میں یہاں اضافت کا زیر موجود نہیں۔ اِسے طباعت کی فروگذاشت سمجھا جا سکتا تھا،
مگر پھر یہ خیال آیا کہ "سرحد ملکِ زیرباد" میں جو فارسیت آجاتی ہے، شاید اِس وجہ سے مصنف نے
یہاں اضافت کو غیر مناسب سمجھا ہو۔ یہ بات لگتی ہوئی معلوم ہوئی، اِسی بنا پر میں نے یہاں قواعد پر ک کی
مطابقت کو ترجیح دی ہے۔ ۲ ن: دل دیکھ کر۔ ③ ک اور ف میں اضافت کا زیر موجود ہے۔ ن میں
"نکالا گیا" کے بعد" اور "نہیں۔ ۴ ف، ع: ازدہام۔ ک: اژدہام۔ [ک میں اِس سے پہلے
ایک جگہ متن میں "اژدہام" چھپا ہے، مگر غلط نامے میں اُس کی تصحیح کی گئی ہے اور صحیح لفظ "ازدحام"
لکھنے کی ہدایت کی گئی ہے، اِسی بنا پر یہاں بھی صحیح لفظ "ازدحام" لکھا گیا ہے]۔ ⑤ صرف یہ صراحت
کرنا ہے کہ سب نسخوں میں اِسی طرح ہے، یعنی دونوں ٹکڑے الگ الگ ہیں: سنگ سار۔
ص ۱۵۳ ۱ "معلوم نہیں... گرفتار ہوئے ہیں" یہ عبارت ع میں موجود نہیں۔ ۲ ن میں

"ان کو" نہیں۔ ۳ ن میں "چلا" نہیں۔ ۴ ن: ایک دانہ یاقوت کا بے بہا۔ ۵ ن: تینوں گناہ۔ ۶ ن: وہ۔ ⑦ ک، ف میں اسی طرح ہے۔ ن، اور ع میں "اس مرتبہ" ہے۔ اگلے پیراگراف میں یہ لفظ پھر اسی طرح (اس مرتبے) آیا ہے اور وہاں بھی ک اور ف میں "مرتبے" ہے، ن اور ع میں "مرتبہ" ہے۔ ک اور ف کی مطابقت اختیار کی گئی ہے۔ یہ میر امن کا خاص انداز ہے۔

⑧ طلبہ کے استفادے کے لیے یہ صراحت ضروری ہے کہ اصلاً تو اس لفظ میں دال پر زبر آنا چاہیے [رنجیدہ۔ رنجیدگی] مگر تلفظ میں یہ لفظ اس طرح آتا ہے کہ دال پر سکون نمایاں رہتا ہے اور تلفظ کی فصاحت کا تقاضا بھی یہی ہے۔ ۹ ن: گدھوں میں سوار ہوکر۔ ۱۰ ن: یہ۔

ص ۱۵۴ | ۱ ن: لیٹے لیٹے جاگتا تھا۔ ② ک اور ف میں اس لفظ پر اعراب موجود نہیں۔ اصلاً "وَضْع" (بہ فتحِ اول و سکونِ دوم) ہے۔ نظم میں اسی طرح ملتا ہے اور فارسی ترکیبوں میں بھی اسی طرح آتا ہے (جیسے: وَضْعِ زمانہ، وَضْعِ حمل وغیرہ) مگر عام گفتگو میں عموماً یہ لفظ بہ فتحِ دوم زبانوں پر آتا ہے اور یہی صورت اس کے ایک خاص مرکب "وضع داری" کی ہے کہ بول چال میں یہ بھی بہ فتحِ ضاد زبان سے ادا ہوتا ہے۔ میں نے ک اور ف کی مطابقت میں اس لفظ پر اعراب نہیں لگائے ہیں۔ ۳ ن: بعد فراغت کھانے کے۔ ۴ ن: تو بہتر ہے۔ ۵ ن میں "کچھ" موجود نہیں۔ ۶ ن: یہ۔ ۷ ن: بالا ہے۔ ⑧ ک میں واو پر علامتِ مجہول موجود ہے۔

ص ۱۵۵ | ① قاعدے کے لحاظ سے تو اس لفظ میں دال کو مفتوح رہنا چاہیے، مگر عام طور پر تلفظ میں یہ لفظ اس طرح آتا ہے کہ دال پر جزم معلوم ہوتا ہے اور تلفظ کی فصاحت کا بھی یہی تقاضا معلوم ہوتا ہے۔ اس سے پہلے (ص ۱۵۳ پر) لفظ "رنجیدگی" کے ذیل میں اس کی وضاحت کی جا چکی ہے۔ جو احوال اس لفظ کا ہے، وہی صورت اس لفظ کی ہے۔ ۲ ن: یہ۔ ۳ ع: دڑیا کر۔ [مگر یہ غلطیِ کتابت ہے، کیونکہ اس نسخے کی فرہنگ میں "دُڑیانا" لکھا گیا ہے]۔ ۴ ن: جا کر۔ ۵ ن: نہ گلزار نظر آئی۔ ۶ ن: میدان ویران۔ ک میں "میدان" کے نون کے نیچے اضافت کا زیر موجود ہے۔ ⑦ ک میں "دوبارہ" ہے، یعنی اس کی نشان دہی کر دی گئی ہے کہ یہاں واو شاملِ تلفظ نہیں۔ اس سے پہلے ص ۱۵۱ پر اسی قبیل کے ایک مرکب "دوگانہ" کے ذیل میں ضروری صراحت کر دی گئی ہے۔

ص ۱۵۶ ① ک اور ف میں لفظِ "خاطر" اضافت کے زیر کے بغیر ہے ۔ صفحہ ۱۲۴ پر بھی
یہ مرکب اسی طرح آیا ہے : "بہ خاطرِ جمع چلے جاتے تھے" بہ صورتِ بعض اور مقامات پر بھی ملتی
ہے ، اِس کا مطلب یہ ہے کہ میر امّن نے یہاں قواعد کے بجائے روزمرّہ کو ترجیح دی ہے اور
جیسے بولتے ہیں ، ویسے ہی لکھا ہے ۔ قواعد کے مطابق اگر "خاطر" کو مع اضافت رکھا جاتا ، تو اس
صورت میں لفظ "جمع" کو بہ سکونِ حرفِ دوم پڑھنا لازم آتا : یعنی "بہ خاطرِ جمع" ، چوں کہ
قواعد کی رعایت یہاں ملحوظ نہیں رکھی گئی ہے ، اس لیے اب لفظ "جمع" کو بہ فتحِ دوم پڑھنا بہتر
ہوگا ، کیوں کہ اُردو کے روزمرّہ کا انداز یہی ہے ۔ ② ک میں اِس لفظ پر اعراب موجود نہیں ،
البتہ ف میں گاف کے نیچے زیر لگا ہوا ہے اور اُس کی فرہنگ میں بھی بہ کسرِ گاف "ننگیانا" ہے ۔
پلیٹس کے لغت میں بھی یہ مصدر بہ کسرِ گاف مندرج ہے ۔ "ننگا" بہ سکونِ دوم ہے ، اِس اعتبار
سے "ننگیانا" بھی بہ سکونِ دوم ہونا چاہیے ۔ گاف کے نیچے جو زیر لگایا گیا ہے ، اُس سے بہ ظاہر
یہی مترشح ہوتا ہے کہ اس مصدر میں نون ساکن ہے ، یعنی "ننگیانا" بروزنِ فاعِلاتن ہے ،
"ننگیانا" بروزنِ مفعولن نہیں ۔ اگرچہ میرے نسخے میں یہ مع نونِ غنّہ آیا ہے اور مجھے یہی محسوس
ہوتا ہے کہ اِس مصدر میں نونِ غنّہ ہے یعنی "ننگیانا" مرجح صورت ہے ۔ اِس کے باوجود ، اِس
کتاب میں میں نے ف کی مطابقت کو ترجیح دی ہے اور گاف کے نیچے زیر لگایا ہے ۔ ۳ ع :
رکھی تھیں ۔ ہاں یہ صراحت بھی کی جاتی ہے کہ ک میں تشدید موجود ہے ۔ ۴ ف : بہ حق ۔ ہاں یہ لکھنا
باقی رہ گیا تھا کہ اس سے دو سطر پہلے جو لفظ "بدحواس" آیا ہے تو وہ ف میں "بدحواسّ" ہے ۔
۵ ک اور ف میں تشدید موجود ہے ۔ ⑥ ک اور ف میں "انگل" کے الف پر پیش موجود ہے
(آصفیہ و امیر اللغات میں بھی اسی طرح یعنی بہ ضمِ الف ہے) ۔ ⑦ ع : عمامہ ۔ ک اور ف
میں تشدید موجود ہے ۔ (یہ لفظ تشدید کے بغیر اور مع تشدید دونوں طرح صحیح اور مستعمل ہے) ک اور ف
کی مطابقت اختیار کی گئی ہے ۔ ⑧ ن ، ک ، ف ، ع میں اسی طرح ، یعنی رائے مہملہ کے ساتھ ہے ۔
آصفیہ میں بھی "کھوپری" ہے ۔ یہ لفظ اِس سے پہلے بھی اسی طرح آچکا ہے ۔ ⑨ محض احتیاطاً
یہ صراحت کی جاتی ہے کہ سب نسخوں میں "گڑھا" (ڑے کے ساتھ) ہے ۔

ص ۱۵۷ ۱ ن : کرکرلیں ۔ ۲ ن : جب ان بھائیوں نے اپنی دانست میں میرا کام تمام
کرکے چلے گئے ۔ ۳ ن : جانو ۔ ۴ ف : سرحدّ ۔ ۵ ن : اس شہر میں بڑا گرھا ۔ ⑥ کے

میں ب کے نیچے اضافت کا زیر موجود نہیں۔ ف میں "صاحبِ جمال" ہے۔ ک کی مطابقت اختیار کی گئی ہے۔ ۷ ن: نہیں۔ ۸ ف: خواصیں۔ ن: کئی خواصیں سوار جہاں میں پڑا تھا آئیں۔ ۹ ف: وہ پھر کر بھاگیں۔ ۱۰ ن: ڈاکرتے۔

ص ۱۵۸ ① ک میں "خون" کے نون پر نقطہ موجود نہیں۔ اِس جملے کے آخر میں "ف اور ع میں "دے کر" موجود نہیں۔ (ظاہراً غلطیِ طباعت ہے)۔ ② ک میں اِس لفظ پر اعراب موجود نہیں، ف کے متن کی بھی یہی صورت ہے، مگر اُس کی فرہنگ میں اسے "حَلَق" لکھا گیا ہے [بہ لحاظ اصل بھی یوں ہی ہے"، اِسی نسبت سے اِس لفظ پر اعراب لگائے گئے ہیں۔ آصفیہ میں بھی اِسی طرح ہے]۔ ③ ک، ف، ع میں اِس لفظ کا یہی املا ہے، (صحیح بھی اِسی طرح ہے)۔ یہ صراحت یوں کی گئی کہ کچھ لوگ (ناواقفیت کی بنا پر) اِسے "شوربہ" بھی لکھ دیا کرتے ہیں اور اِسی کو صحیح سمجھتے ہیں۔
④ ک اور ف میں اضافت کا زیر موجود ہے۔ اِس سے پہلے جو ٹکڑا ہے، وہ ن میں اِس طرح ہے: نہایت آفرین سے کہتی ہے کہ۔ ⑤ ک کے متن میں اِس لفظ پر اعراب موجود نہیں، مگر غلط نامے میں اِس کی تصحیح اِس طرح کی گئی ہے کہ ح پر زیر لگایا گیا ہے۔ اِسی کی مطابقت اختیار کی گئی ہے۔
⑥ ک میں اِس لفظ پر اعراب موجود نہیں۔ ف میں ن پر جزم ہے اور د کے نیچے زیر بھی لگا ہوا ہے، مگر پ اور ہ خالی ہیں۔ اِس سے پہلے ص ۱۵۱ پر "پَہِن" لکھا گیا ہے، اِس بنا پر کہ ک میں اِس مقام پر یہ لفظ اِسی طرح لکھا ہوا ہے، یعنی پ کے اوپر زبر ہے اور ہ کے نیچے زیر ہے اور ضمیمہ تلفظ و املا میں اِس لفظ کے ذیل میں ضروری تفصیلات لکھ دی گئی ہیں؛ اُسی نسبت سے یہاں بھی پ کے اوپر زبر اور ہ کے نیچے زیر لگایا گیا ہے۔ ۷ ن، ع: کے۔ ۸ ن: خوب۔

ص ۱۵۹ ① ک اور ف دونوں میں ب کے نیچے زیر موجود ہے۔ (بہ لحاظ اصل بھی اِسی طرح ہے)۔ ② ک اور ف میں ن کے نیچے زیر موجود ہے۔ نیز ک میں "جان بخشی" ہی ہے یعنی نون پر نقطہ موجود نہیں۔ ۳ ن: ہر کچھ ذکر مذکور سنتی۔ ۴ ن: بدن کو طہارت دے کر۔ ۵ ن: نماز کر لیتا۔ ۶ ف: کر کر۔ ۷ ف: جو اچانک۔ ۸ ن میں "جو" نہیں۔ ۹ ع: کوئی۔

ص ۱۶۰ ۱ ف: ناحق۔ ۲ ف: بدحواس۔ ۳ ن: گزری۔ ④ صرف یہ صراحت کرنا ہے کہ سب نسخوں میں یہ جملہ اِسی طرح ہے (یعنی: دائی ساتھ لیے)۔ صراحت یوں کی گئی کہ شاید کسی کے ذہن میں یہ خیال پیدا ہو کہ یہاں کتابت کی کچھ غلطی تو نہیں۔ ⑤ سب نسخوں میں اِسی طرح

آصفیہ میں "بلیّا لینا" موجود نہیں، ہاں پلیٹس کے لغت میں ہے۔ [میرے نسخے میں "بلّیاں" (مع نونِ غنّہ) آیا ہے]۔ ۳ہ ن میں "کہ" نہیں۔ ۴ہ ن میں "تو" نہیں۔ ۵ہ ن، ک، ف: تم تما رہا ہے۔

ص ۱۶۱ ۱ہ ن میں "میں" نہیں۔ ۲ہ ن: کا عوض۔ ۳ہ ن: گلاس۔ (۴) سب نسخوں میں یہی املا ہے۔ آصفیہ میں بھی اسی طرح ہے۔ طلبہ کو اس طرف متوجّہ کیا جاتا ہے کہ اس الگ الگ لکھے ہوئے مرکّب کو پڑھا اس طرح جاتا ہے کہ الف دب جاتا ہے اور "ن" ک سے مل جاتا ہے۔ یہ مرکّب اس سے پہلے بھی آچکا ہے۔ (۵) یہ مطلع سودا کا ہے اور کلّیاتِ مطبوعہ (نیز نسخۂ جانسن) میں موجود ہے۔

ص ۱۶۲ (۱) سب نسخوں میں اسی طرح ہے۔ یہ وضاحت یوں کی گئی کہ آصفیہ میں صرف "گھرانا" ہے، البتہ نور میں اور جلال کے لغت سرمایۂ زبانِ اردو میں "گھرانا" اور "گرھنا" دونوں شکلیں ملتی ہیں۔ (۲) طلبہ کے فائدے کے لیے یہ وضاحت کی جاتی ہے کہ یہاں "ورغلاتا" ماضیِ مطلق ہے (جیسے مثلاً "پہچاننا" کا ماضیِ مطلق "پہچانا" ہے) اس کا مصدر "ورغلانا" ہے۔ یہ آصفیہ میں موجود ہے اور فیلن کے لغت میں بھی۔ ۳ہ ن: وہ۔ (۴) سب نسخوں میں یہی املا ہے (یعنی آخر میں الف ہے)۔ اردو میں "مزا" بھی لکھا جاتا ہے۔ اسے "مزہ" کی بہتر شکل ماننا چاہیے۔ [ضمیمۂ تلفّظ و املا میں اس لفظ پر بحث کی گئی ہے]۔ اس جملے میں ک اور ف میں "حقّ" پر تشدید موجود ہے۔ ع میں تشدید نہیں۔ ن: حق باطل کو۔ ۵ہ ن: اس کا۔ ۶ہ "اور وہ بت پرست ہے۔۔۔۔ بیاہ ہو" یہ عبارت ن میں نہیں۔

ص ۱۶۳ ۱ہ ن: کی چاہیے۔ ۲ہ ن میں اس کے بعد یہ ٹکڑا بھی ہے: تو بہتر ہے۔ ۳ہ ن: سلفت پر (کذا)۔ (۴) ک میں "تمھارے جان و ایمان" ہے۔ ع میں "تمھاری جان و ایمان" ہے، اور ن میں "تیری جان و ایمان" ہے۔ ک کے مطابق "تمھارے" کو ترجیح دی گئی ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اس سے پہلے ایسا ہی ایک مرکّب "جان و مال" ایک جملے میں آیا ہے: "قبلۂ عالم کے جان و مال کو دعا کرتے ہیں" (ص ۱۲)۔ "جان و مال" میں پہلا جز مونّث ہے اور دوسرا مذکّر۔ بالکل یہی نوعیت اس مرکّب "جان و ایمان" کی ہے۔ قیاس یہی کہتا ہے کہ جس طرح وہاں "جان و مال" کو مذکّر لکھا گیا ہے، اسی طرح یہاں بھی "جان و ایمان" کو بہ تذکیر لکھا جائے۔ اسی بنا پر ک کی مطابقت

اختیار کی گئی ہے [تفصیل کے لیے دیکھیے ص۱۶ کے حاشیے میں "جان و مال" کی بحث]۔ ۵ ن :
دو مہینے گزرے۔ (۶) ک میں الف اور ف، دونوں کے نیچے زیر لگے ہوئے ہیں۔ یہ لفظ اِس سے
پہلے ص۶۸ پر بھی آیا ہے اور وہاں بھی ک میں "اِصفہان" ہے۔ دونوں جگہ ک کے مطابق ف کے
نیچے زیر کو برقرار رکھا گیا ہے۔ ص۶۸ کے حواشی میں اِس کی صراحت کی جاچکی ہے۔ (۷) یہ لفظ اگلے
صفحے پر بھی آیا ہے اور ک میں دونوں جگہ واو پر ماقبل مفتوح کی علامت موجود ہے (نَوْل)۔ ف
میں بھی ن پر زبر لگا ہوا ہے۔ [بہ لحاظِ اصل بھی اِسی طرح ہے] اِسی بنا پر اسے بہ فتحِ اوّل لکھا گیا ہے۔
ص ۱۶۴ (۱) ک اور ف میں یہاں اِس لفظ کا یہی املا ہے (یعنی آخر میں ہائے مختفی ہے)۔
ع : ترپیہ۔ [اِس لفظ سے متعلق ضروری بحث "ضمیمۂ تلفظ و املا" میں کی گئی ہے]۔ ۲ ن : اے
یاں۔ ع : اے ما۔ ۳ ف : مُحَل۔ (۴) ن، ف، ع : لبنوت۔ ک میں "لنبوٹ" ہے اور یہی
مرجح ہے۔ [تلفظ : لَم بوٹ]۔ ک میں ایسے متعدد لفظوں کو میم کے بجائے (قدیم اندازِ نگارش کے
مطابق) ن کے ساتھ لکھا گیا ہے (جیسے : اچنبھا)۔ مخطوطۂ گنجِ خوبی میں بھی ایسے لفظوں کا یہی قدیم
املا ملتا ہے۔ ایسے سب لفظوں کو اُسی طرح برقرار رکھا گیا ہے۔ ۵ ن : کہ ایک۔ ۶ ن : بیٹھا کر۔
ص ۱۶۵ ۱ ک : بہ معہ۔ ف : بہ معہ۔ ع : بمعہ۔ ۲ ن : سلف پر۔ ۳ ن میں
"نے" نہیں۔
ص ۱۶۶ ۱ ع : سب آئیں۔ ۲ ف : حواس۔ ۳ ن : وہ۔ ۴ ع : کسی۔ ۵
ف : مُحَل۔ ۶ ن : اپنے تئیں ہلاک کیا اور سودائی سا پھرا۔
ص ۱۶۷ ۱ ن : موزی۔ ۲ ع : کے۔ ۳ ن : بدرو۔ ۴ ف : مُحَل۔ ۵ ک،
ف : پاتوں۔ ع : پاتو۔ ن : پاؤں پڑا۔ ۶ ف : حواس۔ (۷) ک اور ف میں تشدید موجود ہے۔
ص ۱۶۸ (۱) سب نسخوں میں عبارت اِسی طرح ہے۔ ک اور ف میں اِس کا التزام ملتا
ہے کہ جب جملہ ختم ہو، یا جملے کا کوئی ٹکڑا الگ ہو تو وہاں اُس کی مقررہ نشانی موجود ہو؛ مگر یہاں
دونوں نسخوں میں عبارت مسلسل ہے؛ بیچ میں کوئی نشان نہیں۔ بہ ظاہر "تو" کے بعد کچھ خلا سا محسوس ہوتا
ہے۔ اگر میر امّن نے اِسی طرح لکھا تھا (اور اِس کے خلاف فرض کر لینے کے لیے کوئی دلیل سامنے موجود
نہیں) تو یہ کچھ اچھا اندازِ بیان نہیں۔ ۲ ن : بڑے بت کے گرجے میں جا۔ ۳ ن : پادری۔ ک
میں یہاں "پنڈا" ہے۔ ف اور ع میں "پنڈے" ہے اور مُحَل بھی اسمِ جمع کا ہے؛ اِسی بنا پر

یہاں ف کی مطابقت اختیار کی گئی ہے۔

ص ۱۶۹ لہ ع: چھپالے۔ (۲) ک اور ف میں اسی طرح ہے، یعنی "دوپیہ" ہائے مختفی کے ساتھ اور "پیسا" الف کے ساتھ۔ ع: دُپیہ پیسا۔ ۳ے ن: اور بڑے دن اس ظالم سے یہ بڑا بت۔ (۴) طلبہ کی توجہ اس طرف مبذول کرائی جاتی ہے کہ اس لفظ میں ب پر زیر ہے اور ہ پر پیش ہے؛ مگر تلفظ میں یہ کچھ اس طرح آتا ہے کہ ہ کا پیش واضح طور پر ادا نہیں ہوتا۔ یہ بات ذہن میں رہنا چاہیے۔ ک اور ف میں ہ پر پیش موجود ہے۔ ۵ے ک، ف: درجا (ع: درجہ)۔ (۶) ک اور ف میں سین اور رے کے نیچے زیر موجود ہیں۔ ۷ے ع: اس کے بعد وہ برہمنوں کی ماتا جب تیرا سب احوال پوچھے۔

ص ۱۷۰ لہ ن میں "یہ" نہیں۔ (۲) ک اور ف میں یہی املا ہے۔ ع: دُپیہ۔ ۳ے ن: وہ۔ ۴ے ک: ذال۔ (۵) ک میں واو پر علامتِ ماقبل مفتوح موجود ہے (چَوبِلے)، ف میں بھی چ پر زبر لگا ہوا ہے۔ آصفیہ میں بھی بہ فتحِ اوّل ہے۔ ۶ے ن: ایک جوبا آیا۔ ۷ے ن: گرجے میں۔

ص ۱۷۱ لہ ن: ایک سنگھاسن جڑاؤ جس میں لعل الماس اور موتی مونگا لگا ہوا دھری ہے اس پر بڑا بت بیٹھا ہے۔ ۲ے ن میں "ہے" نہیں۔ (۳) ن: ایک داہنے ایک بائیں بیٹھے ہیں اس شان اور تجمل سے بیٹھی ہے۔ ک اور ف میں اس لفظ پر اعراب موجود نہیں۔ یہ لفظ ص۱۳۵ پر بھی آیا ہے، تلفظ کے متعلق اُس صفحے کے حاشیہ ۸ میں وضاحت کر دی گئی ہے۔ ۴ے ن: استری کو۔ (۵) ک میں اس مقام پر اضافت کا زیر واضح طور پر نظر نہیں آتا، کچھ مٹا مٹا سا نشان ہے، مگر ف میں واضح طور پر اضافت کا زیر موجود ہے، اُسی کے مطابق زیر لگایا گیا ہے۔ ۶ے ن: دیتی ہوں۔ ۷ے ن: سنگسار ہوگا۔

ص ۱۷۲ لہ ن: وہ۔ ۲ے ن: پندوے۔ ۳ے ن: بھگت۔ ۴ے ن: ماں۔ ۵ے ک: بمعہ۔ ف، ع: بمعہ۔ ۶ے ن: اس کی موافق مرضی کے۔

ص ۱۷۳ لہ ن: یہ۔ (۲) طلبہ کے استفادے کے لیے یہ وضاحت کی جاتی ہے کہ اصلاً "رُقعہ" ہے، لیکن اُردو والے اسے "رُقّہ" کہتے ہیں اور یہی فصیح تلفظ ہے۔ املا وہی رہے گا، مگر عین تلفظ میں نہیں آئے گا ["قلعہ" کی طرح]۔ ۳ے ف: خط۔ (۴) محض احتیاطاً یہ وضاحت کی جاتی ہے کہ ک اور ف دونوں میں "بندگی" کی "ی" کے نیچے اضافت کا زیر نہیں، یعنی "بندگی"

اور "عجز و نیاز" دو الگ الگ ٹکڑے ہیں۔ یہاں اگر اضافت ہوتی، یعنی "بندگیِ عجز و نیاز" ہوتا تب بھی عبارت بامعنی رہتی اور اِس صورت میں (یعنی اضافت کے بغیر) بھی معنویت علیٰ حالہٖ برقرار ہے؛ یوں اصل کی مطابقت کو ترجیح حاصل ہے۔ (۵) کے میں تشدید موجود ہے۔ اِس سے پہلے گیارھویں سطر میں بھی "لکھا" آیا ہے اور وہاں بھی کے میں تشدید موجود ہے۔ [۶] ن میں "اِس" نہیں۔ [۷] ن: بت خانے میں۔

ص ۱۷۴ [۱] ن: کہ یہ۔ [۲] ف: محل سرا۔ [۳] ف: مشرف۔ [۴] ف: محل۔ (۵) کے اور ف میں "اہلِ کاردن" (مع اضافت) ہے۔ اگلے صفحے پر بھی یہ لفظ آیا ہے اور وہاں بھی کے اور ف میں "اہلِ کاردن" ہے۔ "اہلِ کار" ضرور اصلاً مع اضافت ہے۔ دفتری عملے کے لیے یہ لفظ اصطلاحی لفظ کے طور پر استعمال میں آنے لگا اور یوں اضافت ساقط ہو گئی اور "اہل کار" کہنے لگے، بل کہ اب اِس کو لکھنے بھی میں ملا کر (یعنی "اہلکار")۔ امیر اللغات میں اِسے اضافت کے بغیر اور ملا کر "اہلکار" لکھا گیا ہے۔ (اُردو کے قاعدے سے بنی ہوئی) اِس کی جمع "اہل کاروں" (یا اہلکاروں) تو واضح طور پر اضافت کے بغیر استعمال میں آتی ہے۔ [اِس کی دوسری مثال "اہلمد" ہے] ۔ع میں "اہل کاروں" ہے اور یہاں میں نے ع کی مطابقت کو ترجیح دی ہے۔ اِس سلسلے میں ایک مثال میرے سامنے ہے۔ ص۱۷۲ پر ایک جملہ ہے: "ایک طرف جنگل میں کہ وہاں شاہ راہ نہ تھی"۔ کے میں "شاہِ راہ" ہے۔ ظاہر ہے کہ "شاہِ راہ" قطعی طور پر مستعمل نہیں؛ اِس بنا پر وہاں کے کی مطابقت کو اختیار نہیں کیا گیا اور یہ سمجھ لیا گیا کہ یہاں اضافت کا زیر دراصل طباعت کی غلطی ہے۔ اسی طرح اِس مقام پر بھی کے میں اضافت کے زیر کو قابلِ قبول نہیں سمجھا گیا ہے اور اگلے صفحے پر بھی "اہل کاروں" لکھا گیا ہے۔ [۶] ن میں "دے کر" نہیں۔ (۷) صرف یہ صراحت کرنا ہے کہ کے اور ف میں اضافت کا زیر موجود ہے۔ (۸) ہر سہ نسخوں میں اِسی طرح ہے۔ یہ صراحت یوں کی گئی کہ کسی طالبِ علم کے ذہن میں یہ خیال نہ پیدا ہو کہ "کے" شاید یہاں چھوٹ گیا ہے۔

ص ۱۷۵ (۱) محض احتیاطاً یہ صراحت کی جاتی ہے کہ کے اور ف میں یہ لفظ اِسی طرح ہے۔ [۲] ن: کی۔ [۳] ن میں "دے کر" نہیں۔ [۴] ن: ہوئی۔ [۵] ن: شاگرد پیشے والوں کو۔ [۶] کے اور ف میں "اہلِ کاروں" ہے۔ اِس کی بحث پچھلے صفحے (ص۱۷۴) کے حاشیہ ۵ میں آچکی ہے۔ [۷] کے اور ف میں لام کے نیچے زیر موجود ہے۔ (۸) صرف یہ صراحت کرنا ہے کہ کے،

دخل دہی کو غیر مناسب خیال کیا۔ اِس کی خاص وجہ یہ بھی کہ نسخۂ کے میں بہ طورِ عموم یہ صورت پائی جاتی ہے کہ جن لفظوں میں زائد واو اظہارِ حرکت کے طور پر لکھا جاتا تھا (جیسے : اوس) ایسے اکثر الفاظ اُس زائد واو کے بغیر ملتے ہیں۔ اِس کے ساتھ ساتھ یہ التزام بھی ملتا ہے کہ جن لفظوں میں واو شاملِ املا ہے مگر وہ شاملِ تلفظ نہیں، تو ایسے لفظوں میں اُس واو کے نیچے ایک خط کھینچ دیا گیا ہے۔ یہ علامت ہے اِس کی کہ یہاں واو شاملِ تلفظ نہیں۔ اِس لفظ کو بھی اِسی طرح لکھا گیا ہے۔ اِس بنا پر مناسب یہ معلوم ہوا کہ اِس املا کو برقرار رکھا جائے اور واو کے نیچے خط کھینچ دیا جائے تاکہ صحیح صورتِ حال پہلی ہی نظر میں سامنے آجائے۔ دوسری صراحت یہ کرنا ہے کہ ک، ف، ع میں "پچھیکی" ہی ہے، یعنی یہ لفظ دو بائے مخلوط کے ساتھ آیا ہے۔ آصفیہ میں "پچھی" ہے۔ البتہ نور میں "پچھتی"، "پھولی"، اور "پھلوکی" تینوں ملتی ہیں۔ ④ ن، ک : مردبچا۔ ف : مرد بچا۔ ع : مرد بچہ۔ "بچا" جدید صورت ہے بچہ کی اور اردو میں مستعمل ہے۔ نور میں سند اور تفصیل موجود ہے، مگر "مرد بچا"، کہیں دیکھنے میں نہیں آیا۔ "مرد بچہ" ہی سنا ہے۔ ن اور ک دونوں میں "مرد بچا" بہ ظاہر اِس پر دلالت کرتا ہے کہ یہ کتابت کی غلطی نہیں۔ چوں کہ "بچا" مستعمل لفظ ہے اور ن اور ک میں "مرد بچا" ہے، اِس بنا پر احتیاط کا تقاضا یہی معلوم ہوتا ہے کہ اِسی کو برقرار رکھا جائے۔ اِس سلسلے میں دو وضاحتیں ضروری ہیں : ف میں "بچّا" ہے مع تشدید، جب کہ ک میں "بچا" بغیر تشدید ہے؛ اِس سلسلے میں ہمارے سامنے یہ بات رہنا چاہیے کہ ف میں اُن بہت سے لفظوں پر بھی تشدید ملتی ہے جو ک میں تشدید کے بغیر ہیں (اور اُردو میں تشدید کے بغیر ہی مستعمل ہیں) جیسے : حقّ، محلّ، حواسّ وغیرہ۔ اِس لیے ف میں کسی لفظ پر تشدید کا ہونا، اُس میں لازماً حرفِ مشدّد کے وجود کا ثبوت نہیں۔ یوں "بچّا" کی تشدید کی بجائے خود کوئی خاص حیثیت باقی نہیں رہتی اور اِس سے ک کے "بچا" کی نفی نہیں ہوتی۔ دوسرے یہ کہ ع میں جو "بچہ" ہے، وہ مرتّب کا اختیار کردہ املا ہے، اِس سے بھی ک کے املا کی نفی نہیں ہوتی۔ ⑤ ن : خواہ نخواہ۔ ⑥ ک، ف، ع میں اِسی طرح (مع نونِ غنّہ) ہے۔ ⑦ ع : اور وہاں کے۔ ⑧ ف، ع : خرید و فروخت۔ ⑨ ع : دھتواں دھار۔ ⑩ ف : گیارھویں۔ (ک، ع : گیارہویں)۔ ک کی مطابقت اختیار کی گئی ہے۔ دیکھیے ضمیمۂ تلفظ و املا میں "بارہویں" کی بحث۔ ہاں ک میں ی کے نقطے نیچے اوپر لگے ہوئے ہیں، مطلب یہ ہے کہ اِس لفظ میں یائے مخلوط ہے، ستعمال بھی اِسی طرح ہے۔ ⑪ ع : چلا کیا۔ بہ ظاہر یہاں ع کا متن مرجح نظر آئے گا، مگر یہاں ہے "چلا گیا"۔ ف میں "گیا" ہے، یعنی گاف پر ایک زیر بھی موجود ہے" اور

غالباً یہ زیر احتیاطاً یوں لگایا گیا ہے کہ اسے "کیا" نہ پڑھا جائے۔ اِس طرح "گیا" کی تصدیق ہو جاتی ہے۔

ص ۱۸۰ ① سب نسخوں میں یہاں "بوٹ" (بغیر نونِ غنہ) ہے۔ اِسی صفحے کی گیارھویں سطر میں سب نسخوں میں "بونٹ" (مع نونِ غنہ) ہے۔ لغات میں "بوٹ" اور "بونٹ" دونوں صورتیں ملتی ہیں، گویا اِس لفظ میں اختلافِ املا (یا یوں کہیے کہ غنہ آواز کے لحاظ سے اختلافِ تلفظ) موجود ہے۔ اِسی بنا پر اپنے اپنے مقام پر اِن دونوں صورتوں کو کے کے مطابق برقرار رکھا گیا ہے۔
[1] ع: کئی دن ایک گھر بھی۔ [2] ن: بجانے لگا۔ [3] ف اور ع میں "اور" نہیں۔ [4] ع: یہی۔ [5] ع: لنگ۔ [6] ف، ع: تل۔

ص ۱۸۱ ① کے: پانوُروٹی۔ ن، ف، ع: پانو روٹی۔ "پانو" یہاں بظاہر غلطیِ کتابت کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے۔ اصل لفظ "پاؤ روٹی" ہے۔ یہی آصفیہ میں ہے۔ چوں کہ شخص "پوشاکِ اہلِ فرنگ کی پہنے ہوئے" ہے، اِس کی نسبت سے میر امن نے "پاؤ روٹی" لکھا ہے، ورنہ تو طرزِ مرصع میں یہاں "نان و کباب" ہے۔ صحیح لفظ "پاؤ روٹی" ہے، اِس لیے یہاں تصحیح سے کام لے کر "پاؤ روٹی" لکھا گیا ہے۔ [2] ف، ع: کہا کہ۔ [3] ف: دق۔ [4] ف، ع: اس۔ ⑤ کے کے متن میں یہاں "وتناہی" ہے، مگر غلط نامے میں اِس کی جگہ "اتناہی" کو صحیح بتایا گیا ہے۔ اِسی کے مطابق "اتناہی" لکھا گیا ہے۔ ن میں "وتناہی" ہے۔ [6] ع: تسلی کو۔ ⑦ کے، ف، ع میں اِسی طرح ہے۔ یہ لفظ صفحہ ۲۲۲ پر بھی آیا ہے اور وہاں کے اور ف میں "مونہا مونہ" ہے، ع میں "منہا منہ" ہے۔ آصفیہ میں "منہا منہ" ہے اور سند میں ناسخ کا یہ شعر لکھا گیا ہے: بھر جائے اگر بادہ منہا منہ نہ کروں لیں ؛ سے خواری میں ہے ظرف مرا خُم سے زیادہ۔ نور میں بھی "منہا منہ" ہے اور یہی شعر سند میں مندرج ہے۔ اب عموماً اِسی طرح (مُنہا مُنہ) کہتے ہیں، مگر میں نے اِن دونوں مقامات پر کے کے املا کو برقرار رکھا ہے، اِس خیال سے کہ ممکن ہے اُس زمانے میں تلفظ اور املا کا یہ اختلاف کارفرما رہا ہو۔ چوں کہ بعض اور الفاظ کے سلسلے میں بھی یہی طریقہ اختیار کیا گیا ہے، اِس لیے یہاں بھی احتیاطاً اُسی کی پابندی کی گئی ہے۔

ص ۱۸۲ ① محض احتیاطاً یہ صراحت کی جاتی ہے کہ کے اور ف میں اِس مرکب کو اِسی طرح (یعنی اضافت کے زیر کے بغیر) لکھا گیا ہے۔ [2] ع: تب میں نے۔ [3] ف: خاصہ۔ [4] ف، ع: خرید و فروخت۔ [5] ن: اژدہام۔ ع: اژدحام۔ [6] ع: آدمیوں کے سروں

چلی جائے۔ ۵۔ ف، ع: ٹھٹھے۔ (۸) ک اور ف میں تشدید موجود ہے۔

ص ۱۸۳ ۱۔ ن: ملایمت سے۔ ۲۔ ن میں "سے" نہیں۔ ۳۔ ع: یہاں کے۔ ۴۔ ع: کیجیے۔ (۵) ک میں گاف کے نیچے زیر اور سین کے اوپر زبر لگا ہوا ہے۔ ف میں بھی گاف کے نیچے زیر ہے۔ آصفیہ میں بھی اسی طرح ہے، اس میں یہ صراحت بھی کردی گئی ہے: "گھسٹنا..... اہلِ لکھنؤ کافِ فارسی مفتوح وسینِ مہملہ مکسور بولتے ہیں، مگر اہلِ دہلی اول مکسور، دوم مفتوح استعمال کرتے ہیں۔" نور میں بھی صراحت موجود ہے: "گھسٹنا" ھ، ہندی میں بہ کسرِ اول وفتح سوم ہے۔ اردو میں بہ فتح اول وکسرِ سوم بھی بول چال میں ہے۔ امیر مینائی نے بہ کسرِ اول وفتحِ سوم بھی کہا ہے۔" اور امیر کا متعلقہ شعر بھی درج کیا ہے۔ ۶۔ "میں مارے بوجھ کے وہ چل نہیں سکتا" یہ ٹکڑا ف اور ع میں موجود نہیں۔ ۷۔ ف اور ع میں "کچھ" موجود نہیں۔ ۸۔ "تجھے کتخدا کروں..... سو یہ مجھ سے نہ ہوسکے گا" یہ عبارت ن میں موجود نہیں۔

ص ۱۸۴ ۱۔ ع: میں۔ ۲۔ ف، ع: پنڈتوں۔ ۳۔ ن: حور غلمان۔

ص ۱۸۵ ۱۔ ک، ف، ع: کھنچے ہوئے (ن: کھنچتے ہوئے) یہاں ن کی مطابقت کو مرجح خیال کیا گیا ہے۔ (۲) سب نسخوں میں "بت کی سنگھاسن" ہے۔ "سنگھاسن" کو اب بالعموم مذکر بولتے ہیں۔ جیسا کہ اس سے پہلے لکھا جاچکا ہے، میر امّن کے یہاں متعدد الفاظ کی تذکیر وتانیث کے سلسلے میں موجودہ استعمال کے مقابلے میں مختلف صورت پائی جاتی ہے۔ اِس لفظ کو بھی اُسی فہرست میں شامل کرنا چاہیے۔ ۳۔ ف: محل۔ (۴) ک، ف، ع میں "منت وار" مع واو ہے۔ صحیح لفظ "منت دار" (مع دال) ہے۔ یہ آصفیہ میں اور پلیٹس کے لغت میں موجود ہے: "منت دار: ممنون، احسان مند..... " (آصفیہ)۔ آصفیہ میں "منت دار کرنا" بھی موجود ہے۔ طباعت میں دال کا واو بن جانا کچھ بعید نہیں، اِس لیے یہاں "دار" لکھا گیا ہے۔ (۵) ک اور ف میں اضافت کا زیر موجود ہے۔ چوں کہ قواعد کے لحاظ سے یہ بالکل صحیح صورت ہے، اِس لیے اِس زیر کو برقرار رکھا گیا ہے۔ (۶) ک میں اِس لفظ پر اعراب موجود نہیں، ف میں "پدمنی" ہے۔ آصفیہ میں "پدمنی" ہے اور میں نے آصفیہ کے مطابق میم پر زبر لگایا ہے۔ ۷۔ ف: خط۔ ۸۔ ن: جا حاضر ہوا۔ (۹) ک، ف، ع میں تشدید موجود ہے۔

ص ۱۸۶ (۱) سب نسخوں میں اِسی طرح، یعنی آخر میں الف ہے۔ (۲) ن: بیر لگی، سب

نسخوں میں اس لفظ میں رائے مہملہ ہے۔ اس لفظ کی ایک صورت "پیڑ" (مع رائے ثقیلہ) بھی ہے۔ آصفیہ میں "پیر" اور "پیڑ" دونوں لفظ موجود ہیں اور "پیڑ ہی لگنا" اس میں صرف ڑ سے کے ساتھ مندرج ہے۔ ک کی مطابقت اختیار کی گئی ہے۔ (۳) سب نسخوں میں تشدید کے بغیر ہے۔ آصفیہ میں بھی "بچا" اور "بچا گیر یاں" تشدید کے بغیر مندرج ہیں۔ سے ن: محل۔ ھ "اور اپنی... مقابل کھڑی رہتی" یہ عبارت ع میں موجود نہیں۔ اس کی جگہ نقطے لگے ہوئے ہیں۔ لے ن: میں ان کی گانٹھ اور جوتوں میں چھپ گیا۔ شہ ع: چھپ گیا۔ شہ ن میں "اے" نہیں۔ ۹ہ ک: قیمت کا روپے۔ ن: قیمت کا روپیہ۔ ف، ع: قیمت کے رُپئے۔

ص ۱۸۷ لہ ف، ع: رُپئے۔ سے ف: رُپیوں کا۔ ع: رُپیوں کا۔ سے ف: نان وحلوا۔ (۴) ک اور ف میں اضافت کا ہمزہ موجود ہے۔ شہ ن: وازقہ کا۔ ف، ع: آذوقے کا۔ لے ن: لاوا۔ شہ ن: جوں ہی۔ شہ ف: کم بخت اجل گرفتہ۔

ص ۱۸۸ لہ ن: تو بیاہ۔ سے ک، ف، ع: آپ۔ ن: اب۔ بہ ظاہر یہاں "اب" مرجح معلوم ہوتا ہے، اسی لیے یہاں ن کی مطابقت اختیار کی گئی ہے۔ سے ن: رازقہ۔ ف، ع: آذوقہ۔ ہے ک، ف، ع: پایا۔ [اصلاً "پایہ" ہے اور اردو میں اسی طرح لکھتے ہیں؛ اس بنا پر یہاں صحیح صورت کو ترجیح دی گئی ہے]۔

ص ۱۸۹ لہ ف: یہ حق۔ سے ن: رازقہ۔ ف، ع: آذوقہ۔ (۳) ک: مدتیں۔ ف، ع: مدت تلک۔ ن میں "مدت تئیں" ہے اور یہی مرجح صورت ہے۔ ک میں "مدتیں" واضح طور پر غلطیِ طباعت ہے، یہ "مدت تئیں" کی بگڑی ہوئی صورت ہے۔ ف میں جو "مدت تلک" ہے، اس کے متعلق میرا خیال یہ ہے کہ ف کے مرتب کے سامنے نسخۂ ک تھا اور یہاں "مدتیں" اس کی سمجھ میں نہیں آسکا، اس نے قیاسی تصحیح سے کام لیا اور "مدت تلک" لکھا۔ اگر نسخۂ ن میرے سامنے نہ ہوتا تو میں بھی صحیح طور پر فیصلہ نہیں کر پاتا۔ ہے ن: میں نے۔ شہ ن: رازقہ۔ ف، ع: آذوقہ۔ (۶) ک اور ف میں ع پر پیش موجود ہے۔ شہ ن: ایسا دردسے بے قرار ہوا کہ۔ (۸) ن: گذرے۔ یہاں "گزرے" اور "گزری" دونوں بامعنی ہیں۔ "برس" کے لحاظ سے "گزرے" ٹھیک ہے اور "گزری" یوں درست ہے کہ اس صورت میں "زندگی" یا ایسے ہی کسی لفظ کو مقدر مانا جائے گا۔ "اسی صورت سے" اس کی تائید کا ایک قرینہ فراہم کرتا ہے اور

تقدیر کا یہ عمل اُردو میں عام ہے۔ چوں کہ دونوں صورتیں یکساں با معنی ہیں، اِس بنا پر مقررہ طریقِ کار کے مطابق نسخۂ ک ہی کو ترجیح دی گئی ہے۔

ص ۱۹۰ ۱؎ ن : دو بولی کہ۔ ۲؎ ن : پانی کے پرنالے کی۔ ۳؎ ف : گر گر۔ ۴؎ "تو اِس کو کشادہ کروں" یہ ٹکڑا ن میں نہیں۔ ۵؎ ک : ایسی راہ سے۔ (۶) سب نسخوں میں یہی املا ہے (یعنی آخر میں الف ہے)۔ (۷) سب نسخوں میں "خورد سالی" ہے۔ چوں کہ ک میں "خورد" چھپ گیا، اِس لیے اُس کی تقلید میں باقی نسخوں میں بھی یہی املا برقرار رہا۔ یہاں جس معنی میں یہ لفظ آیا ہے، اُس معنی میں "خُرد" (واو کے بغیر) ہونا چاہیے۔ "خورد" بھی بجائے خود صحیح لفظ ہے، مگر اُس کے معنی دوسرے ہیں جو یہاں مراد نہیں۔ "خورد" ماضیِ مطلق ہے "خوردن" کا، جس کے معنی ہیں: کھانا۔ "خورد و نوش" میں یہی "خورد" (مع واو) ہے۔ اور "بزرگ" کی ضد "خُرد" ہے، جس کے معنی ہیں: چھوٹا۔ اِسی بنا پر یہاں "خُرد" لکھا گیا ہے۔ (۸) ک اور ف میں اضافت کا زیر موجود ہے۔

ص ۱۹۱ ۱؎ ع میں "کوئی" موجود نہیں۔ ۲؎ ن : کا۔ ۳؎ ن : تجار کا۔ (۴) ن، ک، ف، میں یہاں "ماں باپ" ہے۔ ع میں "ما باپ" ہے۔ اِس ایک مقام کے علاوہ ک میں ہر جگہ "ما" ہے۔ ضمیمۂ تلفظ و املا میں بہ ذیلِ "ما" یہ وضاحت کی گئی ہے کہ مخطوطۂ گنج خوبی میں ہر جگہ "ما" ملتا ہے، اِسی بنا پر یہاں بھی "ما" لکھا گیا ہے۔
۵؎ ن : چونچی۔ ۶؎ ن : آسمان۔ ک میں ن پر نقطہ موجود ہے۔ ۷؎ سب نسخوں میں "جمعہ" ہے۔
۸؎ ن : متع۔

ص ۱۹۲ ۱؎ ک، ف : سنتے سے۔ ۲؎ ف : محل۔ (۳) ک اور ف میں ق کے نیچے زیر موجود ہے۔ (۴) ک اور ف میں واو کے نیچے زیر لگا ہوا ہے۔ ۵؎ ن، ع : ہوئی۔ ۶؎ ن میں "بھی" نہیں۔ ۷؎ ن : سمجھ۔

ص ۱۹۴ (۱) ک میں واو پر علامتِ مجہول موجود ہے۔ ۲؎ ع : اپنے۔ ۳؎ ن، ف، ع : مجھ پر۔ ۴؎ ن : ملک عجم کا۔ ۵؎ ن، ف، ع : گنجیفہ۔ [ک میں ج کے نیچے زیر لگا ہوا ہے]۔ ۶؎ ف : سیر شکار۔ ۷؎ ف : جدھر۔ (۸) سب نسخوں میں اِسی طرح، یعنی "لعل" (مع عین) ہے۔ چوں کہ "لعل" خاص پتھر کے علاوہ، سرخ رنگ کے معنی میں بھی لغات میں ملتا ہے [اِسے "لال" کی معرب صورت لکھا گیا ہے] اِس بنا پر اِسی املا کو برقرار رکھا گیا ہے۔ (۹) ف، ع : بساں۔

چون کہ "سما" اور "سماں" دونوں صورتیں بجائے خود صحیح ہیں اور لغت میں موجود ہیں (آصفیہ) اِس بنا پر کے کی مطابقت اختیار کی گئی ہے اور "سما" کو برقرار رکھا گیا ہے۔ ۱۰ ت میں "دیکھا کہ" موجود نہیں۔ (۱۱) ت، ک، ف، ع میں یہ لفظ اسی طرح ہے (یعنی دو واو اور دونوں معروف)۔ ف کی فرہنگ میں بھی اسی طرح (GHŪNGRŪ) ہے۔ اب استعمالِ عام میں عموماً "گھُنگرو" آتا ہے اور آصفیہ و نور میں بھی اسی طرح ہے، مگر میں نے کے کے املا کو برقرار رکھنا مناسب خیال کیا ہے، کہ یہ اِس لفظ کا قدیم املا ہے، املا ہی نہیں، تلفظ بھی اِس میں شامل ہے ["گھُنگرو" بروزنِ فعلن۔ "گھونگرو" بروزنِ فاعلن]۔ یہ صراحت بھی غیر مناسب نہ ہوگی کہ سب نسخوں میں اِس لفظ میں صرف ایک ہائے مخلوط ہے۔

ص ۱۹۵ (۱) سب نسخوں میں اسی طرح (یعنی نونِ غنہ کے بغیر) ہے۔ (۲) ک میں رستے پر زبر موجود ہے۔ مزید تفصیل "پرندہ" کے ذیل میں ضمیمۂ تلفظ و املا میں مل سکتی ہے۔ ۳ ف، ع: باد۔ (۴) ت، ک: جیب۔ ف، ع: جیبھ۔ کے کی مطابقت اختیار کی گئی ہے (اِس لفظ کے یہ دونوں املا پرانی کتابوں میں ملتے ہیں)۔ آصفیہ میں بھی "جیب یا جیبھ" ہے۔ (۵) ک اور ف میں ذال (مع نقطہ) ہے۔ ع: گنبد۔ اِس کی بحث ضمیمۂ تلفظ و املا میں دیکھی جا سکتی ہے۔ (۶) محض احتیاطاً یہ صراحت کی جاتی ہے کہ سب نسخوں میں "باغچہ" ہے۔ اصل لفظ "باغچہ" ہی ہے، مگر اردو میں "باغیچہ" اور "بغیچہ" بھی مستعمل ہو گیا۔ آصفیہ میں "باغچہ" لکھ کر، مزید لکھا گیا ہے کہ "عوام: باغیچہ"۔ البتہ نیلن نے "باغیچہ" کو عام تلفظ لکھا ہے اور یہی انسب ہے۔ ک اور ف میں "باغچہ" پر اعراب موجود نہیں، نیلن اور پلیٹس کے لغات میں اِسے "باغچہ" لکھا گیا ہے اور بہ لحاظِ اصل اِسی طرح ہونا چاہیے (جیسے "دیگ" سے "دیگچہ")۔ ف کی فرہنگ میں بھی اِسے بسکونِ غین لکھا گیا ہے، اِسی نسبت سے غین پر جزم لگایا گیا ہے۔

ص ۱۹۶ ۱ ت: بن۔ ۲ ف، ع: جانگھ [ت، ک: جانگ]۔ ۳ ف، ع میں "یہ" نہیں۔ ۴ ع: ہاتھ دھو کر۔ (۵) ک اور ف میں ضاد کے نیچے زیر موجود ہے۔ (۶) سب نسخوں میں اِس لفظ کا یہی املا ہے۔ ضمیمۂ تلفظ و املا میں اِس لفظ سے متعلق بحث کی گئی ہے۔ ۷ ع: چھڑی ہوئیں۔

ص ۱۹۷ ۱ ف: خواہش۔ (۲) شاعر کا نام معلوم نہیں ہو سکا۔ ۳ ع: چیکے۔ (۴) ک، ف، ع: آذر۔

جو معنی یہاں مراد ہیں (یعنی بُت تراش) اُن معنوں میں صحیح لفظ "آزَر" (زائے مفتوح کے ساتھ) ہے [برہانِ قاطع - مرتبۂ ڈاکٹر معین - نوراللغات - آصفیہ میں یہ لفظ موجود نہیں] اِسی بنا پر یہاں "آزَر" لکھا گیا ہے۔ ["آذُر" مختلف لفظ ہے، اُس کی تفصیل کے لیے دیکھیے برہانِ قاطع، فرہنگِ جہانگیری۔ "آذربایجان" میں یہی ہے]۔ ⑤ محض احتیاطاً یہ صراحت کی جاتی ہے کہ ک اور ف میں اضافت کا زیر موجود ہے۔ ⑥ "ناوک" مذکر ہے (آصفیہ، نور) اور اِس لحاظ سے یہاں "کے" ہونا چاہیے، مگر صورتِ حال یہ ہے کہ ن، ک، ف، ع، سب میں "کی" ہے۔ اِس سے پہلے یہ بحث آچکی ہے کہ میر امّن کے یہاں تذکیر و تانیث کے لحاظ سے متعدد مقامات پر استعمالِ عام یا یوں کہیے کہ موجودہ طریق استعمال کے خلاف الفاظ ملتے ہیں، بربنائے احتیاط ایسے سب مقامات پر اصل کی مطابقت کو ترجیح دی گئی ہے اور کسی طرح کی تبدیلی نہیں کی گئی ہے۔ یہاں بھی اِسی اصول کے تحت "کی" کو برقرار رکھا گیا ہے۔ ؎ ن، ک، ف: کلیجہ۔ ع: کلیجا۔ ⑧ ن: بسنا ہے۔ ف: بستا ہے۔ ع: بسایا ہے۔ [یہ فعل اِس سے پہلے بھی آچکا ہے: "جو مرد نکھٹو ہو کر گھر بستا ہے" (ص ۲۴)]۔

ص ۱۹۸ ؎ ف: حق۔ ؎ ک، ف: سنّے سے۔ ؎ ف: ناحق۔ ④ ک، ف: نعمان۔ صحیح "نُعمان" ہے (المنجد، غیاث اللغات) اِسی لیے ن پر پیش لگایا گیا ہے۔ ⑤ ک اور ف میں اِس لفظ پر اعراب موجود نہیں۔ طلبہ کے استفادے کے لیے یہ وضاحت کی جاتی ہے کہ بہ لحاظِ اصل اِس لفظ کا تلفظ "دَفْعَہ" ہے، مگر اُردو والوں کی بول چال میں یہ لفظ زبان سے "دَنا" کے وزن پر ادا ہوتا ہے ("قلعہ" کی طرح) یعنی ف پر زبر آجاتا ہے اور ع پر سکون۔ اُردو میں اِسی تلفظ کو فصاحت کی سند حاصل ہے۔ ⑥ ک، ف: ہدایا۔ یہ لفظ "ہدیہ" کی جمع ہے اور بہ فتحِ اوّل درست ہے (غیاث اللغات) اِسی لیے ہ پر زبر لگایا گیا ہے۔

ص ۱۹۹ ؎ ن: اور گھروں کی عمارتیں۔ ② ک میں "دو رستہ" ہے، یعنی اِس کی نشان دہی کردی گئی ہے کہ واو شاملِ تلفظ نہیں، مستعمل بھی اِسی طرح ہے، یعنی تلفظ میں "دُرَسْتہ" آتا ہے، البتہ "دو" سے بننے والے ایسے سب مرکبات میں واو لکھا ضرور جاتا ہے۔ اِس کی صراحت اِس سے پہلے بھی کی جاچکی ہے۔ ہاں اِس پیراگراف کے آخر میں یعنی آٹھویں سطر کے آخر میں "سو بجا ہے" ن میں "سو" موجود نہیں۔ ؎ ف، ع: محلّی۔ ④ ک میں مَ پر دو پیش موجود ہیں۔ ف، ع میں "سلام علیک" ہے۔ یہ لفظ ص ۱۳۱ پر بھی آیا ہے اور وہاں بھی ک میں "سلامٌ علیک" ہے،

دہاں فـ میں بھی "سلامٌ علیک" ہے۔ چوں کہ کـ میں دونوں جگہ دو پیش موجود ہیں، اِس لیے دونوں مقامات پر کـ کی مطابقت اختیار کی گئی ہے۔ (۵) کـ اور فـ میں اعراب موجود نہیں۔ اصل لفظ "شُوزَن" ہے اور یوں زاے "شُوزَنی" ہونا چاہیے، مگر بول چال میں (ایسے اور الفاظ کی طرح) یہ لفظ اِس طرح ادا ہوتا ہے جیسے زے پر جزم ہو۔ آصفیہ میں بھی زے پر جزم لگا ہوا ہے اور فیلن کے لغت میں بھی زے بہ ساکن ہے۔ اُردو کے لحاظ سے اِس کا فصیح تلفظ "شُوزْنی" ہے۔ (۶) اصل کے لحاظ دال پر زبر آنا چاہیے (ماندَگی)، مگر ایسے بعض اور الفاظ کی طرح، یہ لفظ بھی زبانوں سے ادا اِس طرح ہوتا ہے جیسے دال ساکن ہو؛ اور تلفظ کی فصاحت اِسی کی مقتضی معلوم ہوتی ہے۔

ص ۲۰۰: ۱؎ ع: لے لیا۔ ۲؎ فـ: محلّ۔ ۳؎ فـ: باری دروان نے۔ ع: بارے دردان نے ۴؎ فـ: خواصّ۔ ۵؎ ن: پودے۔ ۶؎ ن: کی۔ (۷) کـ اور فـ میں اضافت کا زیر موجود ہے۔ (۸) کـ، فـ، ع میں یہ جملہ اِس طرح ہے: "اور تحفہ اپنے ساتھ لے گیا تھا، جب کئی کشتیاں حضور میں چنیں گئیں از بس کہ......" ن میں یہ عبارت یوں ہے: "اور تحفے اپنے ساتھ لے گیا تھا سب کی کشتیاں حضور میں چنیں گئیں از بس کہ......" صاف ظاہر ہے کہ یہاں ن کے متن کو ترجیح حاصل ہے اور کـ کی عبارت میں سقم ہے، جو ظاہراً غلطیِ طباعت کا نتیجہ ہے۔ فـ میں اُسی کی نقل ہوئی اور ع میں اُسی عبارت کی نقل ہوئی۔ اِس بنا پر یہاں ن کی مطابقت اختیار کی گئی ہے۔ (۹) کـ، ع: ہوئے۔ ن، فـ: ہوئی۔ یہاں کـ کے مقابلے میں ن اور فـ کی مطابقت کو ترجیح دی گئی ہے، اِس بنا پر کہ "خس" کے لیے "ہوئی" آنا چاہیے۔ ۱۰؎ فـ: خواصّ۔

ص ۲۰۱: ۱؎ ن: آمد رفت۔ ۲؎ ن: بیٹھے۔ ۳؎ ن: خوجہ۔ ۴؎ ن: محلّ۔ (۵) (۶) کـ میں دونوں جگہ کـ پر تشدید موجود ہے۔ (۷) ع: کی۔ (ن: کے: کے)۔ کـ میں صرف دال پر پیش لگا ہوا ہے۔ فـ میں "دُلمیاں" ہے، یعنی دال پر پیش ہے اور میم کے نیچے زیر ہے۔ یہ لفظ آصفیہ اور نور میں موجود نہیں۔ فیلن کے لغت میں بھی نہیں ملا۔ پلیٹس کے لغت میں ہے اور اُس میں "دُلمیان" لکھا گیا ہے۔ فـ کی فرہنگ میں بھی اِسی طرح مندرج ہے۔ فـ کی فرہنگ میں اور پلیٹس کے لغت میں اسے مذکر لکھا گیا ہے اور یوں کـ میں جو "کے" ہے، اُس کی مطابقت کو ترجیح حاصل ہے۔ اُسی کی مطابقت اختیار کی گئی ہے۔ کـ اور فـ میں آخری نون پر نقطہ موجود ہے؛ اِسی کے مطابق نون پر نقطے کو برقرار رکھا گیا ہے۔ ۸؎ ن: رکھا۔ (۹) کـ میں واو پر علامتِ مجہول موجود ہے اور

ن میں رے پر پیش لگا ہوا ہے؛ ر ن کی مطابقت اختیار کی گئی ہے۔ لفظ "خسرو" کے تلفظ پر بحث ضمیمۂ تلفظ و املا میں کی گئی ہے۔

ص ۲۰۲ ۔ لے ن: کھائے۔ (۲) ک: زِرَہُ داد دی۔ ف: زرۂ داؤ دی۔ چوں کہ "زرہ" میں ہائے ملفوظ ہے، ہائے مختفی نہیں (اصلاً "زِرِہ" ہے) اس لیے ہ پر اضافت کا ہمزہ نہیں آئے گا، بل کہ ہ مکسور ہوگی، اسی لیے ہ کے نیچے اضافت کا زیر لگایا گیا ہے۔ (۳) ن اور ک میں اسی طرح ہے۔ ف اور ع میں "شان و شوکت" ہے۔ بہ ظاہر یہی صورت مرجح معلوم ہوتی ہے؛ مگر واوِ عطف کے بغیر بھی صحیح ٹھہرے گا اور بعض مرکبات اس طرح (یعنی واوِ عطف کے بغیر) آتے بھی ہیں؛ اس لیے میں نے ن اور ک کی مطابقت کو ترجیح دی ہے۔ (۴) ک اور ف میں اس لفظ پر اعراب موجود نہیں، مگر ف کی فرہنگ میں اسے بہ فتحِ اوّل لکھا گیا ہے۔ صاحبِ غیاث اللغات نے یہ صراحت کی ہے کہ اصلاً "تیرکشی" تھا، کثرتِ استعمال سے ت کا زیر، زبر سے بدل گیا اور ی ساقط ہوگئی۔ آصفیہ میں بھی "ترکش" ہے۔ اسی نسبت سے ت پر زبر لگایا گیا ہے۔ ۵ ن: مستعد۔ (۶) ک اور ف میں ت کے نیچے زیر موجود ہے۔ ۷ ن: اور شقی کا احوال کہا۔ ۸ ن: خط۔ ۹ ن: چھوٹتے۔ ۱۰ ک، ف: قفص (ن، ع: قفس)۔ اس لفظ کی بحث ضمیمۂ تلفظ و املا میں لفظ "قفس" کے ذیل میں دیکھی جا سکتی ہے۔ (۱۱) صرف یہ صراحت کرنا ہے کہ ک اور ف میں اضافت کا زیر موجود ہے۔ دونوں نسخوں میں "حسین" کے نون پر نقطہ بھی موجود ہے۔ (۱۲) ک میں اضافت کا ہمزہ موجود نہیں، مگر ف میں موجود ہے اور یہاں ف کی مطابقت کو مرجح خیال کیا گیا ہے۔

ص ۲۰۳ ۔ لے ن: آ ٹوٹے۔ (۲) ک اور ف میں بھی یہی املا ہے۔ پہلے اس طرح بھی لکھتے تھے اور اسی بنا پر اس قدیم املائی صورت کو برقرار رکھا گیا ہے۔ اصل لفظ "تحاشی" ہے اور اسی نسبت سے پہلے اس کو "بے تحاشی" لکھا جاتا ہوگا، جو "بے تحاشا" میں تبدیل ہوگیا اور اب "بے تحاشا" ہی بالعموم لکھتے ہیں۔ یہ صراحت بھی کی جاتی ہے کہ سب نسخوں میں "برچھی و تلوار" مع واوِ عطف ہے۔ ۳ ن: مارنے لگے۔ ۴ ن: نہتے۔ (۵) ک، ف، ع میں اسی طرح۔ ن: پروا سے۔ پلیٹس کے لغت میں "پیرنا" اور "پیڑنا"، دونوں شکلیں موجود ہیں۔ اسی بنا پر ک کی مطابقت اختیار کی گئی ہے۔ آصفیہ میں نہ "پیرنا" ہے نہ "پیڑنا"؛ نور میں اس

معنی میں "پیلنا" ہے۔ ۶ ک، ف: تفص (ن، ع: تقفس)۔ ⑦ ک اور ف میں "ق" پر
پیش موجود ہے۔ ۸ ن: کاروبارِ سلطنت کا۔

ص ۲۰۴ ۱ ن: گرگر۔ ۲ ن: چار طرف۔ نیز یہ کہ ک میں "دکھی" مع تشدید ہی ہے۔
③ سب نسخوں میں اسی طرح (یعنی آخر میں "ے") ہے۔ ۴ ک، ف: تفص (ن، ع: تقفس)۔
⑤ صراحت یہ صراحت کرنا ہے کہ ک اور ف میں اضافت کا زیر موجود ہے۔ (ہونا بھی اسی طرح
چاہیے)۔ ۶ ن: تلوار۔ ⑦ یہ لفظ بہ فتحِ اوّل و دوم (بَرَہنہ) اور بہ فتحِ اوّل و سکونِ دوم)
(بَرْہنہ) دونوں طرح درست ہے۔ یہاں "ر" پر زبر اس لیے لگایا گیا ہے کہ ک میں "ر" پر زبر
موجود ہے [آصفیہ میں صرف "بَرَہنہ" ہے]۔

ص ۲۰۵ ۱ ن: بادشاہ مجھے دکھلانے کو لایا تھا۔ محلیوں نے ملکہ کو جدا کر کے محل میں لے گئے۔
۲ ف: محلّی۔ ۳ ف: محلّ۔ ۴ ن: کار بیچارے کا۔ ⑤ ف میں "تیرِ ناگہانی" ہے یعنی اضافت
ہے۔ اس مقام پر "تیرِ ناگہانی" مع اضافت بھی درست ہو سکتا ہے اور اگر ان لفظوں کو اضافت
کے بغیر پڑھا جائے، تب بھی ہر لحاظ سے صحیح ہوگا۔ ک میں اضافت کا زیر موجود نہیں اور میں نے
ک کی مطابقت کو ترجیح دی ہے۔ اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ میری رائے میں یہاں اگر ترجیح کا تعیّن
کرنے کی کوشش کی جائے تو وہ بغیرِ اضافت کے حق میں ہوگی اور اس کی وجہ یہ ہوگی کہ اس سے
پہلے "غیب سے" موجود ہے، یعنی جو مطلب "تیرِ ناگہانی" سے نکلتا ہے، وہ "غیب سے" میں بجائے خود
موجود ہے، اس لیے اس کو اضافت کے بغیر پڑھنا انسب ہوگا۔ اب مطلب یہ ہوگا کہ غیب سے ایک تیر
اچانک اس کی پیشانی پر لگا۔ ۶ ف: محلّ۔ ۷ ک، ف: تفص (ن، ع: تقفس)۔ ۸ ع:
حضور میں۔ ۹ ن: "ڈاکٹر نے" "چنگا کر کے" ن میں نہیں۔ ۱۱ ن: اس جراح نے۔ ⑫
ف میں اضافت کا زیر موجود ہے۔ ۱۳ ع: رپیے۔

ص ۲۰۶ ① ک میں "میرے قوت" ہے۔ آصفیہ میں "قوت" کو مؤنث لکھا ہے۔ میں نے
ک کی مطابقت کو ترجیح دی ہے، اس بنا پر کہ تذکیر و تانیث کے سلسلے میں میر امّن کے یہاں متعدد
الفاظ کے سلسلے میں آج کے استعمال کے مقابلے میں مختلف صورت پائی جاتی ہے۔ اس لفظ کو بھی اسی
فہرست میں شامل سمجھنا چاہیے۔ ہاں پہلی سطر میں ع میں "رپیے" ہے (یہ اختلاف درج کرنے سے
رہ گیا تھا)۔

(۲) طلبہ کے استفادے کے لیے یہ وضاحت کی جاتی ہے کہ یہ مرکب اُردو میں بغیرِ اضافت ہی مستعمل ہے۔ آصفیہ میں بھی اسے اضافت کے زیر کے بغیر لکھا گیا ہے اور نور میں صراحت کر دی گئی ہے کہ یہ "مرکّب مقلوب" ہے اور ترکیبِ مقلوب میں اضافت ساقط ہو جایا کرتی ہے۔ ۳ ع : یا فقر اللہ۔ ۴ ک، ف : سنئے۔ ۵ ن : اور اشتیاق فرنگ کے ملک کے دیکھنے کا کیا اور روانہ ہوا۔ ۶ ن : سیر کرتا ہوا جنگل پہاڑوں کی۔ ۷ ن : اور گلی کوچے میں۔ ۸ ف : محل۔ ۹ ع : دکان دار دکانیں۔ ۱۰ ک، ف : سن سان۔ (۱۱) ن : کلہ جبہ۔ ک، ف، ع میں "کلّہ" ہی ہے۔ اُردو میں "کلّا جبڑا" لکھتے ہیں۔ آصفیہ و نور میں بھی کلّا جبڑا ہے اور اُردو کے لحاظ سے یہی املا صحیح ہے، مگر میں نے اس خاص لفظ کو، اصل کی مطابقت کے خیال سے، اُسی طرح برقرار رکھا ہے جس طرح وہ ک اور ف میں ہے۔

ص ۲۰۷ ۱ ع : سامنے۔ (۲) ف، ع : ٹھنڈھا۔ ۳ ف : ذرا۔ ع : زرا۔ ۴ ف، ع : دور و دراز۔ ۵ ع : اس سبب سے۔ ۶ ن : اب تو۔ ۷ ن : شہزادے مرحوم۔ ۸ ک، ف : تفقص (ن، ع : قفس)۔

ص ۲۰۸ ۱ ن : میں اس وزیر کو۔ ۲ ف، ع : تب سے۔ ۳ ف : لیئۓ (ظاہراً غلطی طباعت)۔ ۴ ن، ک، ف : سنتے ہے۔ ۵ ن میں "ہو" نہیں۔ ۶ ن : سپید۔ ۷ ن میں "تھی" نہیں۔ (۸) ک اور ف میں اسی طرح، یعنی واو پر ہمزہ موجود نہیں (صحیح املا بھی یہی ہے)۔

ص ۲۰۹ ۱ ف : خواصیں۔ (۲) ک اور ف میں یہی املا ہے، یعنی واو پر ہمزہ موجود نہیں۔ ہاں، اس سے پہلے تیسری سطر میں "آ کے مسند پر بیٹھیں" ہے۔ ف اور ع میں "آ کے" کی جگہ "آ کر" ہے۔ (۳) سب نسخوں میں "پڑھیں" ہے، اسی کی مطابقت اختیار کی گئی ہے۔ "فاتحہ ..... کسی مُردے کی روح کے واسطے قرآن شریف کی آیات، سورۂ فاتحہ اور درود پڑھنا" (آصفیہ) یا تو اس وجہ سے کہ فاتحہ میں کئی چیزیں پڑھی جاتی ہیں، فعل جمع لایا گیا، یا پھر ایسی کوئی بات ہو کہ ایک بار سے زائد کچھ پڑھا گیا اور اُس کا ثواب الگ الگ مُردے کی روح کو بخشا گیا۔ یہ صراحت بھی بے محل نہ ہوگی کہ تذکیر و تانیث کے لحاظ سے یہ لفظ مختلف فیہ ہے۔ دہلی والے عموماً مونث استعمال کرتے ہیں اور لکھنؤ والے مذکّر۔ لیکن اثر لکھنوی مرحوم نے فرہنگِ اثر میں لکھا ہے کہ لکھنؤ میں بھی یہ مختلف فیہ ہے۔ ۴ ن : ہونے لگیں۔ (۵) ک میں ندائیہ نشان "سلامت" کے بعد ہے اور

یہاں یہی صحیح ہے [یعنی "سلامت" خطابیہ الفاظ میں شامل ہے، جیسے : بادشاہ سلامت، یا حضرت سلامت] ۔ یہ صراحت یوں کی گئی کہ کسی طالبِ علم کے ذہن میں یہ شک نہ پیدا ہو کہ یہاں "سلامت" دعائیہ لفظ ہے [یعنی : ملکۂ جہاں! سلامت ۔] یہاں لفظِ "سلامت" خطابیہ الفاظ کا جز ہے۔ ۷ ن : دے کر۔ ۸ ن : بن کر۔ (۸) ک اور ف میں اسی طرح ۔ ع : ابراہیم ادہم ۔ اِس ٹکڑے کو اضافت کے ساتھ اور بغیرِ اضافت دونوں طرح پڑھا جاسکتا ہے اور دونوں صورتیں بجائے خود ٹھیک ہوں گی ۔ اصلاً تو اِس میں اضافتِ اِبنی ہے، یعنی ابراہیم بیٹے کا نام ہے اور ادہم باپ کا؛ یوں بہ لحاظِ قواعد "ابراہیمِ ادہم" ہونا چاہیے؛ مگر اُردو میں استعمالِ عام کا احوال یہ ہے کہ ایسے اجزا کبھی مع اضافت استعمال میں آتے ہیں اور کبھی بغیرِ اضافت ۔ یوں میں نے مناسب یہی خیال کیا کہ یہاں بھی ک کی مطابقت کو ترجیح دی جائے ۔ ع میں جو اضافت کا زیر ہے، وہ اِس نسخے کے مرتّب کی ذمّے داری ہے اور اِس موخّر نسخے کو اُن مقدّم نسخوں پر ترجیح نہیں دی جاسکتی ۔ ۹ ن : ہوکر۔ (۱۰) ک اور ف میں اضافت کا زیر موجود ہے ۔ ۱۱ ن : میں بھی ۔ ۱۲ ن : میرے ساتھ چلا ۔ ۱۳ ف : حق ۔ ۱۴ ن : لیکن عالمِ سکوت کا ہوگیا یہ ہیاؤ نہ پڑا ۔ (۱۵) ک اور ف دونوں میں یہی املا ہے، یعنی واؤ پر ہمزہ موجود نہیں ۔ ن : ہیاو۔

ص ۱۲۰ ۱ ن میں "تے" نہیں ۔ ۲ ف : خواص ۔ ۳ ف، ع : مالک کو ۔ (۴) ک میں واؤ پر علامتِ مجہول موجود ہے ۔

ص ۱۲۱ (۱) محض احتیاطاً یہ صراحت کی جاتی ہے کہ ک اور ف میں یہاں اضافت کا زیر موجود نہیں، اور اضافت کا زیر یہاں ہونا بھی نہیں چاہیے ۔ یہ بات یوں لکھی گئی کہ کسی طالبِ علم کے ذہن میں یہ اشتباہ نہ پیدا ہو کہ اِسے "ماندگیِ کمال" ہونا چاہیے تھا اور اضافت کا زیر شاید چھوٹ گیا ہو ۔ (۲) ک، ف، ع میں اسی طرح ہے ۔ یہ صراحت یوں کی گئی کہ بہ ظاہر یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہاں "محلّے محلّے، کوچے کوچے" ہونا چاہیے ۔ ک میں اِس کا التزام ملتا ہے کہ ایسے لفظوں کے آخر میں محرّف صورت میں ہائے مختفی کی جگہ یے لکھی جائے اور یہاں دونوں ٹکڑوں میں ہائے مختفی ہی ہے، اِس لیے یہ واضح ہے کہ عبارت کو اسی طرح لکھا گیا ہے ۔ (۳) یہ صراحت کرنا ہے کہ ک اور ف میں اضافت کا زیر موجود ہے اور ترجیحی صورت بھی یہی ہے ۔ (۴) اِس جملے سے متعلق دو باتیں لکھنا ہیں، ایک تو یہ کہ "نتھ" اور "جوڑی" دو الگ الگ لفظ ہیں، اِس لیے

اِن کے درمیان کاما لگایا گیا۔ یہ صراحت یوں کی گئی کہ کسی طالبِ علم کے ذہن میں یہ بات نہ آئے کہ "نتھ چوڑی" ایک ہی ٹکڑا ہے۔ اِس کی قطعی طور پر وضاحت یوں بھی ہو جاتی ہے کہ نوراللغات میں "نتھ" کے ذیل میں یہ جملہ ملتا ہے: "خدا کرے تمھاری نتھ اور چوڑیاں برقرار رہیں"۔ دوسری بات یہ ہے کہ آصفیہ میں "نتھ" کے ذیل میں یہ دل چسپ اور کارآمد تشریح ملتی ہے: "نتھ: ناک میں پہننے کا چاندی یا سونے کا حلقہ؛ جو سہاگ کے دن سہاگنیں پہنا کرتی ہیں اور رنڈیاں اُتارا کرتی ہیں"۔ ہاں بول چال میں یہ دونوں لفظ یک جا اِس طرح گفتگو میں آتے ہیں، جیسے ایک لفظ ہو؛ گفتگو میں یہ اِسی طرح آئیں گے، کاما لگا ہونے کی بنا پر اِن کو اس طرح الگ الگ کر کے نہیں بولا جائے گا جیسے اور لفظوں کو بولتے ہیں۔ کاما تو صرف اِس لیے لگایا گیا ہے کہ یہ نہ سمجھا جائے کہ "نتھ چوڑی" کوئی ایک لفظ ہے۔ ۵ ن: رکھے۔ ۶ ف: پگڑی۔ (۷) ک میں اِس لفظ پر اعراب موجود نہیں۔ ف میں "رنڈیا" ہے، یعنی ڈال کے نیچے زیر لگا ہوا ہے۔ آصفیہ میں ڈال پر حرکت موجود نہیں، البتہ فیلن کے لغت میں ڈال کے زیر کے ساتھ ہی ہے اور پلیٹس کے لغت میں بھی اِسی طرح مندرج ہے۔ دونوں اندراج ف سے مطابقت رکھتے ہیں، مگر یہ بات ذہن میں رہے کہ تلفظ میں یہ لفظ اِس طرح آتا ہے کہ ڈال کا زیر پوری طرح نمایاں نہیں ہوتا اور فصاحت اِسی میں ہے۔ ۸ ن میں "تو" نہیں۔ (۹) محض بربنائے احتیاط یہ صراحت کی جاتی ہے کہ "گور کفن" کے بیچ میں عطف کا واو یا کاما، دونوں نہیں آئیں گے۔ "گور کفن کرنا" ("مُردے کی تجہیز و تکفین کرنا") بہ طور محاورے کے آتا ہے۔ اِسی طرح "گور گڑھا کرنا" اور "گور گڑھا ہونا"۔ (۱۰) "دائی جنائی" کے درمیان بھی کاما نہیں آئے گا، کیوں کہ یہ مرکب، بہ طور لفظِ مفرد استعمال میں آتا ہے: "دائی جنائی: ا۔ اسمِ مونث، قابلہ، دایہ" (آصفیہ)۔ (۱۱) ن، ک، ف، ع: سب نسخوں میں "ستھوارا" ہے۔ [اب عام طور پر "سٹھورا" کہتے ہیں] اُردو لغات میں تو یہ لفظ مجھے ملا نہیں، البتہ پلیٹس کے لغت میں موجود ہے۔ یہ "سٹھورا" کی قدیم صورت معلوم ہوتی ہے۔ (۱۲) "بھوکھی پیاسی" دو الگ الگ صفتیں ہیں، مگر اِن کے درمیان کاما نہیں آئے گا۔ اِس جملے میں یہ لفظ اِس طرح آئے ہیں کہ ایک ہی کیفیت کا اظہار کرتے ہیں۔ (۱۳) "ٹکڑا پارچہ" ویسے تو یہ بھی دو الگ الگ لفظ ہیں، مگر یہاں "بھوکی پیاسی" کی طرح ایک ہی کیفیت کے اظہار کے لیے آئے ہیں۔ اور ویسے بھی روزمرۂ اہلِ زبان میں "ٹکڑا پارچہ" بہ طور ایک جز کے آتا ہے۔ کاما اگر لگایا جائے گا تو معنویت اور حُسنِ استعمال، دونوں

پر حرف آجائے گا۔

ص ۲۱۲ ۔ ۱؎ ن : بیچ باچ کر۔ (۲) سب نسخوں میں اِس لفظ کا یہی املا ہے۔ یعنی آخر میں الف ہے۔ ۳؎ ن : کے ٹھنے۔ ۴؎ ع : ہوائیاں اُڑنے لگیں۔ ۵؎ ف : بدحواس۔ (۶) ک میں ق پر پیش موجود ہے۔

ص ۲۱۳ ۱؎ ن : بے درم وام۔ ف، ع : بے وام و درم۔ ۲؎ ف، ع : جان و مال۔ (۳) صرف یہ صراحت کرنا ہے کہ ک اور ف میں اضافت کا زیر موجود ہے، اِسی کی مطابقت اختیار کی گئی ہے۔ [مع اضافت اور اضافت کے بغیر، استعمال میں دونوں طرح آتا ہے] ۔ (۴) ک، ف، ع : چاہیے۔ [ن : چاہیے] صاف ظاہر ہے کہ یہاں "چاہیے" کا محل نہیں، "چاہیے" برمحل ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ک میں ایک بار طباعت کی یہ غلطی راہ پا گئی اور ف میں اُسی کی نقل ہوئی اور ع میں ف سے نقل کی گئی۔ یہاں ن کی مطابقت اختیار کی گئی ہے، اِس بنا پر کہ انسب وہی ہے۔ ۵؎ ع : فرشتوں کو بھی۔ ۶؎ ع : کہا کہ۔ ۷؎ ن : جتنی ضروریات کی خدمت تھی۔ ۸؎ ن : ماں۔ ۹؎ ع : ملیں۔ ۱۰؎ ن : ماں۔ ۱۱؎ ن : والا۔

ص ۲۱۴ ۱؎ ف : ذرا۔ ع : ذرا۔ ۲؎ ن : برداشت۔ ۳؎ ن : اور اپنے تئیں سلاح بکتر باندھ کر اونچی بنا اور اپنے مرکب پر۔ (۴) ک میں اِس لفظ پر اعراب موجود نہیں، البتہ ف اور ع میں "بُرجود" ہے، یعنی ب پر پیش لگا ہوا ہے۔ ف کے آخر میں جو فرہنگ ہے، اُس میں بھی اِسے بہ ضمِ اوّل لکھا گیا ہے۔ آصفیہ میں "بِرجود" ہے، یعنی ب کے نیچے زیر ہے اور مؤلفِ لغت نے اِس سے متعلق وضاحت بھی کی ہے اور یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ "بِرج" مبدّل ہے "بِٹ" کا اور "بِٹ" مخفف ہے "بلٹی" کا (یہ بہت دور کی نسبت معلوم ہوتی ہے)۔ اِس کے برخلاف پلیٹس نے "بُرجود" لکھا ہے اور اصل لفظ "بُرج" مانا ہے۔ سماعت کا احوال یہ ہے کہ عموماً "بُرجود" سنا گیا ہے۔ اِسی اختلاف کے پیشِ نظر یہاں ف (اور ع) کی مطابقت اختیار کی گئی ہے۔ (۵) ک اور ف میں اِس لفظ کا یہی املا ہے۔ یہ صراحت یوں کی گئی کہ اِس لفظ کے تلفظ اور املا کے سلسلے میں خاصی بحث طلب باتیں کہی گئی ہیں۔ ۶؎ ن : گُرز مارا کرو۔ (۷) یہ صراحت کی جاتی ہے کہ ک میں "آسماں" کے نون پر نقطہ موجود ہے۔ (۸) ک میں "گِرد" کے گاف کے نیچے زیر موجود ہے۔ ف کے متن میں تو اِس لفظ پر اعراب موجود نہیں، مگر اُس کی فرہنگ میں اِسے بہ کسرِ اوّل ہی لکھا گیا ہے۔

آصفیہ میں گرد باد (بہ فتح اول) ہے۔ فارسی میں "گرد باد" (بہ کسر اول) ہے (برہانِ قاطع، غیاث) میں نے کے کی مطابقت کو ترجیح دی ہے۔ [فارسی کے لغت نویسوں کے مطابق اصلاً "بادِ گرد" تھا (حلقے کی شکل میں گھومنے والی ہوا)، جو مقلوب ہو کر "گرد باد" ہو گیا]۔

ص ۲۱۵ (۱) "یہ پل شاہ جہاں آباد سے چار میل جنوب کی طرف واقع ہے۔ ایسا نفیس پل اس طرف نہیں ہے۔ اس پل کو جہانگیر بادشاہ کے عہد میں ۱۰۲۱ھ مطابق ۱۶۱۲ عیسوی کے مہربان آغا عرف آغانان المخاطب بہ "آغاے آغایان" خواجہ سرا نے بنایا ہے .... یہ پل بھی بہت خوب صورت پتھر اور چونے سے بنا ہوا ہے۔ اس کے سر پر ایک پتھر پر چند شعر پل بننے کی تاریخ اور جہاں گیر بادشاہ کی تعریف میں کندہ ہیں" (آثار الصنادید، طبع دوم، ص ۵۹)۔ اس کتاب کے آخر میں یہ اشعار نقل کر دیے گئے ہیں۔ واقعاتِ دار الحکومت دہلی (جلد دوم) میں اس پل سے متعلق زیادہ تفصیلات ملتی ہیں، چند ضروری باتیں: "یہ بڑا بھاری پل گیارہ دروں کا سنگ بست اور پختہ چونے اور سنگِ خارا کا بنا ہوا ہے .... جمنا کی ایک شاخ (یعنی نالے) پر بنا ہوا ہے۔ نام تو اس کا "بارہ پلہ" مشہور ہے، مگر در گیارہ ہی ہیں .... مگر ستون تو بارہ ہی ہیں .... بارہ ستون ہونے سے "بارہ پلہ" مشہور ہو گیا ہے۔ پل کی لمبان ۳۶۱ فٹ، اور چوڑان ۴۲ فٹ ہے؛ اور انتہائی بلندی ۲۹ فٹ۔ پل کے دونوں سروں پر بڑے بھاری پشتے ہیں۔ دروں کی منڈیر پر دونوں طرف دس دس فٹ اونچے مینار ہیں۔ شمال رخ کے دوسرے در پر، جو سب سے بلند حصہ پل کا ہے، اس پر سنگ سرخ کی ۸ فٹ اونچی، ۵ فٹ چوڑی تختی پر ذیل کا کتبہ ہے ....." (ص ۴۴۷)۔ یہ پل اب بھی موجود ہے۔ متھرا روڈ پر، خانِ خاناں کے مقبرے کے پیچھے سے جو سڑک جاتی ہے، اور جو راج دوت ہوٹل کے پاس نکلتی ہے، اُس پر واقع ہے۔ اس کے نشیب میں لوگوں نے جھگیاں اس طرح اور اس قدر ڈال لی ہیں کہ اب کتبہ نظر نہیں آتا۔ آج بھی یہ پل کسی نئے بنے ہوئے پل کی طرح کام دے رہا ہے۔ اور ہاں پل کی منڈیر پر جن "میناروں" کا ذکر آیا ہے، وہ اب بھی موجود ہیں اور تعداد میں بارہ ہیں۔

ع : بارہ پلی۔ (۲) "واقعاتِ دار الحکومت دہلی (جلد اول، ص ۲۱۲) میں اس پل کا ذکر موجود ہے۔ مصنف نے کسی فارسی کتاب کی عبارت نقل کی ہے، خلاصہ اُس کا یہ ہے کہ منعم خاں خانِ خاناں نے (جن کی جاگیر میں جون پور بھی شامل تھا) ۹۷۵ھ میں جون پور میں اور عمارتوں کے علاوہ دریائے گومتی پر ایک بہت مستحکم پل بھی بنوایا (جو آج تک موجود ہے)۔ اس پل کی تعمیر کا مہتمم

فہیم نامی غلام تھا (یہ خانِ خاناں کا مشہور غلام تھا)۔ تاریخِ تعمیر: خانِ خاناں خانِ منعم اقتدار ؎ بستہ ایں پل را بتوفیقِ کریم ؛ از رہِ تاریخِ بخشش بری، گرا فگنی ؛ لفظ "بد" را از "صراطِ مستقیم"
"جون پور کا موجودہ شہر فیروز شاہ تغلق نے ۱۳۶۰ء میں آباد کیا تھا" (ایضاً ص ۲۰۹)۔ ۹۸۱ − ۶ = ۹۷۵
(۳) کؔ اور فؔ میں تؔ پر پیش لگا ہوا ہے، اِسی کی مطابقت اختیار کی گئی ہے۔ یہ لفظ نہ تو آصفیہ میں ہے، اور نہ فیلن اور پلیٹس کے لغات میں۔ فؔ کی فرہنگ میں بھی یہ موجود نہیں۔ عؔ کی فرہنگ میں موجود ہے اور اُس میں بھی تؔ کے اوپر پیش لگا ہوا ہے۔ عؔ کے متن میں "تنگیا کر" ہے، مگر (جیسا کہ لکھا جا چکا ہے) اُس کی فرہنگ میں "تُنگیانا" مندرج ہے اور اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ عؔ کے متن میں جو یہ تؔ کے ساتھ چھپا ہے، یہ کتابت کی غلطی ہے۔ ۴ عؔ: کے باتشدید۔ (۵) صرف یہ صراحت کرنا ہے کہ کؔ اور فؔ میں دونوں ٹکڑوں پر تشدید ہے۔ [آصفیہ میں بھی "تتر بتر" (مع تشدید) ہے۔] (۶) آصفیہ میں یہ مثل یوں ہے: سر سے سروا پا۔ پلیٹس کے لغت میں اِس کی دونوں صورتیں ملتی ہیں، یعنی "سر سے سرواہ۔ سر سے سرواہا"۔ [سرواہ: پگڑی] (۷) کؔ، فؔ، عؔ: یکّا [نؔ: یکّہ]۔ اصل لفظ "یکّہ" ہے، "یکّہ و تنہا" مستعمل مرکب ہے؛ اِسی بنا پر میں نے یہاں نؔ کی مطابقت کو ترجیح دی ہے۔ ۸ نؔ: جا پہنچا۔ (۹) طلبہ کے استفادے کے لیے صرف یہ صراحت کرنا ہے کہ اِس لفظ میں "دو" کا تلفظ اِس طرح کیا جائے گا کہ واو تلفظ میں نہیں آئے گا [دُوگانہ، بروزنِ فعولن]۔ کؔ میں "دوگانہ" ہے، یعنی یہ واضح کر دیا گیا ہے کہ واو داخلِ تلفظ نہیں۔ اِس سے پہلے بھی یہ صراحت کی جا چکی ہے کہ "دو" کے مرکبات کا عمومی طور پر یہی احوال ہے کہ اُن میں واو لکھا تو ضرور جاتا ہے، مگر وہ پڑھنے میں نہیں آتا۔ (۱۰) صرف یہ صراحت کرنا ہے کہ کؔ میں اضافت کا زیر موجود ہے؛ اور یہ بھی کہ سب نسخوں میں "میرِ" ہی ہے (یعنی "امیرِ بحر" نہیں)۔

ص ۲۱۶ (۱) کؔ، فؔ، عؔ میں یہی املا ہے (یعنی آخر میں ہائے مختفی ہے)۔ آصفیہ میں اِس معنی میں "ہیلا" ہے اور اِسے ہندی کا لفظ بتایا گیا ہے۔ برہانِ قاطع میں "ہیلہ" ہے، مگر اُس کے معنی دوسرے ہیں۔ البتہ برہانِ قاطع (مرتبہ ڈاکٹر معین) کے حاشیے پر اِس لفظ کے ذیل میں یہ صراحت ملتی ہے کہ "بالکسر بہ معنی گردباد" ایک لغت میں موجود ہے (تفصیل کے لیے اِس لغت کو دیکھا جا سکتا ہے)۔ چوں کہ اِس لفظ میں ذرا سی گنجایش موجود ہے، اِس لیے اِسی املا کو برقرار رکھا

گیا ہے۔ ہاں کے میں ی پر علامت مجہول موجود ہے۔ ۲۵ ن: ملکہ نے۔ ۲۶ ن: بیٹھ گئی۔ ۲۷ ن: دم ٹوٹ کر ڈوب گیا۔ ۲۸ ن: دہ۔ ۲۹ ف: تینوں۔ ۳۰ ف: اسی دریا میں۔ ۳۱ ن، ع: بیٹھا۔

ص ۲۱۷ ۱ک، ف، ع: برقعہ۔ ۲ ن: حق ناحق۔ ف: ناحق۔ ۳ ن میں "دو" موجود نہیں۔ (۴) یہ صراحت مقصود ہے کہ ک اور ف میں اضافت کا زیر موجود ہے۔ (۵) ف: قویؔ۔ یہ صراحت کی جاتی ہے کہ ک اور ف میں اضافت کا زیر موجود ہے۔ ۶ ن: تمام وکمال۔

ص ۲۱۸ (۱) ن میں عنوان کی عبارت موجود نہیں، البتہ اتنی جگہ خالی ہے [اس کا امکان ہے کہ مخطوطے میں یہ عبارت سرخ روشنائی سے لکھی ہوئی ہو اور یوں عکس میں نہ آسکی ہو]۔ ف، ع: سیر چوتھے درویش کی۔ ۲ ع: اپنے۔ ۳ ف: ذرا۔ ع: ذرا۔ ۴ ن: شہزادوں کی طرح پرورش پاتا اور تربیت ہوتا تھا۔ ۵ ف: تربیت۔ ۶ "زمانے کے .... واقف نہ تھا" یہ ٹکڑا ف، اور ع میں موجود نہیں۔ ۷ ن: جاتا تھا۔ ۸ ع میں "کہ" نہیں۔ ۹ ن: یعنے والد اس یتیم کے جو تھے۔ ۱۰ ک، ف: جھتر۔ ۱۱ ف: بہ حق۔

ص ۲۱۹ ۱ ف: محل۔ (۲) اُردو میں "بیگم" بہ فتح گاف مستعمل ہے، مگر "بیگما"، "بیگمات" "بیگماتی" بہ سکونِ گاف زبان سے ادا ہوتے ہیں اور تلفظ کی فصاحت اسی کی متقاضی ہے۔ اسی نسبت سے گ پر جزم لگایا گیا ہے۔ ۳ ف: خواصوں۔ ۴ ف: ملا گیا (ظاہر اً غلطیِ طباعت)۔ ۵ ف: تربیّت۔ (۶) ک اور ف میں میم پر تشدید موجود ہے۔ اسی کی مطابقت اختیار کی گئی ہے۔ (اصل لفظ "عَمّ" ہے، جو عموماً بغیر تشدید مستعمل ہے) آصفیہ اور نور میں بھی "عمّو" مع تشدید مندرج ہے۔ (۷) ک اور ف میں یہی املا ہے، یعنی آخر میں الف ہے۔ ۸ ع: ایسا کھینچ طمانچہ مارا۔ (سب نسخوں میں "طمانچہ" ط کے ساتھ ہے۔ اسی املا کو برقرار رکھا گیا ہے)۔ (۹) یہ لفظ "اُبھر آیا" کے معنی میں آیا ہے۔ لغات میں یہ نہیں ملا۔ ۱۰ ن: ہیں۔ ۱۱ ف: حق۔ ۱۲ ع میں "کہ" نہیں۔

ص ۲۲۰ ۱ ف: محل۔ ۲ ف: حق حقدار۔ ۳ ف: خانہ زاد۔

ص ۲۲۱ ۱ "اور .... جی سے نکال" یہ ٹکڑا ن میں نہیں۔ ۲ ف: بے حواس۔ ۳ "ایک تدبیر .... پرواہ نہیں" یہ عبارت ن میں نہیں۔ ۴ ف، ع: پروا۔ ۵ ن میں "اس

یں "تھیں - ۱۲ ن: ٹھہرا کہ (غلطیِ کتابت) - ⑦ کے اور ف میں اِس لفظ پر اعراب موجود نہیں، البتہ ف کی فرہنگ میں "ذَبْح" مندرج ہے۔ بہ لحاظِ اصل بھی اسی طرح ہے۔ میر امّن نے گنجِ خوبی میں اِس طرح نظم کیا ہے: سو اُس گھوڑے کو ذَبْح کر میں شتاب ؛ کھلایا تھیں رات وہ آش و آب (مخطوطۂ گنجِ خوبی، ص ۱۰۱) اِسی نسبت سے ذال پر زبر اور بے پر جزم لگایا گیا ہے۔ ۱۳ ن میں "اس نے" نہیں۔ ⑨ صرف یہ صراحت کرنا ہے کہ کے اور ف میں لام کے نیچے لگا ہوا ہے۔ ⑩ "خم" کو میر امّن نے بہ تانیث استعمال کیا ہے۔ آصفیہ و نور میں اِسے مذکر لکھا گیا ہے اور اساتذہ کے کلام میں بھی بہ تذکیر ہی دیکھا گیا ہے۔ گنجِ خوبی میں بھی یہ لفظ آیا ہے اور وہاں بھی میر امّن نے اِسے بہ تانیث استعمال کیا ہے۔

ص ۲۲۲ ۱ ن: اِسی طرح کی انتالیس۔ ② ن / ع: مونہا منہ [ک، ف: مونہا مونہہ]۔ اِس کی بحث اس سے پہلے آ چکی ہے۔ یہاں کے اور ف کی مطابقت اختیار کی گئی ہے۔ ۳ ف: جتنوں۔ ۴ ن میں "تھی" نہیں۔ ۵ ع: تڑپے۔ ۶ ن: جواب میرا مسکرا کر فرمایا۔ ⑦ صرف یہ صراحت مقصود ہے کہ کے اور ف میں واو کے نیچے اضافت کا زیر موجود ہے نیز "بے جان" کے نون پر نقطہ بھی موجود ہے۔ ⑧ صرف یہ صراحت کرنا ہے کہ کے اور ف میں "دیو" کے واو کے نیچے اضافت کا زیر موجود ہے۔

ص نمبر ۲۲۳ ① چوتھے درویش کی سیر میں "ملکِ صادق" کئی جگہ آیا ہے اور کے اور ف دونوں نسخوں میں ہر جگہ کاف کے نیچے اضافت کا زیر ملتا ہے۔ چوں کہ تکرار کے ساتھ یہی صورت ملتی ہے، اِس لیے اسی کی مطابقت اختیار کی گئی ہے۔ ② "ماچین: ملکیست در جنوب چین و مشرقِ ہندوستان"۔ (غیاث اللغات) آگے چل کر اِسی سلسلے میں یہ جملہ آتا ہے: "یہ بے کس شہ زادہ چین و ماچین کا ہے"۔ یہاں عطف کا واو دونوں لفظوں کے درمیان موجود ہے اور اِس سے وضاحت ہو جاتی ہے کہ یہ دو مستقل نام ہیں۔ ۳ ن: چین کے سلطنت۔ ④ ف اور کے میں اِسی طرح یعنی اضافت کے زیر کے بغیر ہے۔ اُردو میں "جمع خاطر" اضافت کے بغیر مستعمل ہے، "بہ خاطر جمع" فارسی کا انداز ہے اور یوں قاعدے کے لحاظ سے مع اضافت ہونا چاہیے، مگر مصنف نے اِس کو بھی اُردو میں استعمال کے مطابق اضافت کے بغیر لکھا ہے۔ اسی کی مطابقت اختیار کی گئی ہے۔ ۵ ن: تیری جاں بخشی ہے۔ ۶ ن: تہ ہوا ہو۔ ⑦ صرف یہ صراحت کرنا ہے کہ کے اور ف میں

تشدید موجود ہے۔ ۸ ن: خاں۔ ۹ ف: حقّ۔ ۱۰ ن: کی عوض

ص ۲۲۴ ۱ ف، ع: لے جاکے۔ ۲ ع: کھپاوے۔ ۳ ع: لاوے۔ ④ مفرد لفظ "جمع" کو جس طرح بھی استعمال کیا جائے (جَمْع۔ جَمَع) مگر "دل جمعی" میں میم ساکن ہی رہتا ہے۔ اسی نسبت سے میم پر جزم لگایا گیا ہے۔ ۵ ن: دہ۔ ⑥ صرف یہ صراحت کرنا ہے کہ ن، ک، ف، ع: سب نسخوں میں "گیا" ہے، بل کہ ف میں تو گاف پر زبر بھی لگا ہوا ہے (گَیا)۔ یہ صراحت یوں کی گئی کہ کسی کے دل میں یہ شک نہ آئے کہ یہاں "چلا گیا" بہ ظاہر "چلتا گیا" کے مفہوم میں استعمال کیا ہے۔ ۷ ن: کہ اسے۔ ۸ ف، ع: جتّوں۔ ۹ ف: جتّوں۔ ۱۰ ن: گلے ملتے اور مزاحمیں کرتے۔ ۱۱ ع: مزاحیں۔ ۱۲ ف: گذر بردار۔ ع: گزربردار۔ ۱۳ ع: شان و شوکت۔ ۱۴ ن: دیا۔ ۱۵ ن میں "پھر" نہیں۔

ص ۲۲۵ ۱ ن: اسے۔ ۲ ن: ہے۔ ۳ ن: اسی کا۔ ۴ ف: حقّ۔ ⑤ صرف یہ صراحت مقصود ہے کہ کسی نسخے میں اضافت کا زیر موجود نہیں [بول چال کے انداز پر نظر رکھی جائے تو اسی طرح مرجّح معلوم ہوگا، جب کہ قاعدے کے لحاظ سے "بغیر" مع اضافت ہونا چاہیے]۔ ۶ ن: اس کے۔ ۷ ف: حقّ۔ ۸ ن: اس کی۔ ۹ ف: حقّ۔ ۱۰ ن: تمھاری۔ ۱۱ ن: اس کا۔ ۱۲ ع: کیفیت۔ ۱۳ ک، ف، ع میں لفظِ "ملک" موجود نہیں (ن: ملکِ صادق)، ن کو یہاں ترجیح دی گئی ہے، اِس بنا پر کہ ہر جگہ "ملکِ صادق" ہی آیا ہے۔ ۱۴ ن: بادشاہ مغفور کی ہمارے ساتھ بہت تھی۔ ۱۵ ن: لایا ہے۔ ۱۶ ع: درگزر [ن، ک، ف میں "درگذر" ہے اور یہی املا مرجّح ہے]۔ ⑰ صرف یہ صراحت کرنا ہے کہ سب نسخوں میں اِسی طرح [یعنی عطف کے واو کے بغیر] ہے۔ ۱۸ ن: لاؤں گا۔

ص ۲۲۶ ① ن، ک، ف میں اِسی طرح ہے۔ ع میں "یہ" نہیں، یعنی جملہ یوں ہے: "اُس کو خوبی و دیانت داری اور ہوشیاری سے کرے گا۔" اِس میں شک نہیں کہ اب اِسی طرح لکھیں گے، مگر میر امّن نے اُسی طرح لکھا ہے۔ ۲ ن: کروں گا۔ ۳ ن: سمجھوں گا۔ ۴ ع میں "ایک" نہیں۔ ۵ ن: دستگی۔ ۶ ن: بہت بہت۔ ۷ ع: غور و پرداخت (اور سب نسخوں میں واو کے بغیر ہے)۔ ۸ ف: کرتا ہے۔ ⑨ ک اور ف میں اضافت کا زیر موجود ہے۔ ⑩ یہ صراحت کرنا ہے کہ ک، ف، ع میں "نشان" کے آخری نون پر نقطہ موجود

ہے۔ اِس سے پہلے نویں سطر میں بھی یہ مرکّب آیا ہے اور وہاں بھی کے میں "نشان" مع نونِ نقطہ دار ہے۔

ص ۲۲۷ (۱) ک اور فے میں اضافت کا زیر موجود ہے۔ (۲) کے میں "جَیب" ہے۔ فے میں اِس لفظ پر اعراب موجود نہیں، البتّہ اُس کی فرہنگ میں صرف "جَیب" مندرج ہے۔ میرا خیال ہے کہ کے میں یَ پر ماقبل مفتوح کی علامت دراصل طباعت کی غلطی ہے؛ یَ پر مجہول کی علامت ہونا چاہیے تھی؛ اِس خیال کی وجہ یہ ہے کہ صنا پر "جیب کترے" آیا ہے اور وہاں کے میں یَ پر علامتِ مجہول موجود ہے۔ یہاں بھی لفظ "جیب" اُسی معنی میں آیا ہے، اِس لیے قیاس یہ کہتا ہے کہ یہاں بھی "جیب" ہونا چاہیے۔ "جَیب" گریبان کے معنی میں مستعمل ہے۔ پاکٹ کے معنی میں "جیب" ہی آتا ہے اور اِس مقام پر یہ لفظ "پاکٹ" کے معنی میں آیا ہے۔ اِسی بنا پر اِسے "جیب" لکھا گیا ہے۔ (۳) صرف یہ صراحت کرنا ہے کہ سب نسخوں میں یہ ٹکڑا اِسی طرح ہے۔ (۴) کے اور فے میں بَ پر پیش موجود ہے۔ اِس لفظ کی بحث ضمیمۂ "تلفّظ و املا" میں آچکی ہے۔ (۵) صرف یہ صراحت کرنا ہے کہ کے اور فے میں اضافت کا زیر موجود ہے۔ ـ۶ فے: محلّ۔ (۷) کے اور فے میں اضافت کا زیر موجود ہے۔ ـ۸ فے: محلّ۔

ص ۲۲۸ (۱) کے میں "قِطع" ہے، یعنی قاف کے نیچے زیر لگا ہوا ہے۔ فے میں بھی "قطع" ہے، مگر اُس کی فرہنگ میں "قَطَع" مندرج ہے، "مستعمل لفظ بہ فتحِ اوّل ہے" اور لغت میں بھی اِسی طرح ہے؛ اِس بنا پر قاف پر زبر لگایا گیا ہے۔ کے اور فے میں طَ خالی ہے؛ فے کی فرہنگ میں طَ پر زبر ہے۔ اِس لفظ کا احوال بھی جمع اور نفع جیسا ہے، کہ بہ لحاظِ اصل یہ سب لفظ بہ سکونِ دوم ہیں؛ مگر بول چال میں بہ فتحِ دوم آتے ہیں۔ میں نے (کے کے مطابق) طَ کو خالی رکھا ہے۔ اِسے "قطَع" پڑھا جائے، تب بھی استعمالِ عام کی بنا پر درست ہوگا (جس طرح کہ فے کی فرہنگ میں ہے) اور "قطْع" کہا جائے، تب بھی صحیح ہوگا (کہ اصلاً اِسی طرح ہے)۔ ـ۲ ف: حق۔ ـ۳ ف: ذرا سا۔ ع: زرا سا۔ (۴) ع: بگانی استری۔ کے: بگانی سترِ۔ فے: بگانی ستر۔ (ن: بگانے ستر)۔ کے میں تَ پر زبر لگا ہوا ہے، یوں اِس لفظ کو "ستر" کے سوا کچھ اور پڑھنا (مثلاً استری پڑھنا) کسی طرح ٹھیک نہیں ہوگا۔ لفظ "ستر" مذکّر ہے، اور اِس اعتبار سے "بگانے" ہونا چاہیے۔ میری رائے میں اِن سب قراءتوں میں ن کی قراءت "بگانے ستر" بہتر ہے۔ "بگانے ستر پہ نگاہ مت کر" یعنی غیر کے بدن کو مت دیکھ۔ یہ خیال رہے کہ اُس لڑکی کے بدن پر ایسا لباس نہیں تھا جس سے پورا بدن ڈھک

سکے۔ آگے چل کر وہ اندھا جب اپنی سرگذشت بیان کرتا ہے تو کہتا ہے کہ "اس لڑکی کے بدن پر لتّا نہیں کہ سر چھپا وے"۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو "بگانے ستر" مرجّح معلوم ہوگا۔ اسی بنا پر یہاں ن کے متن کو ترجیح دی گئی ہے۔ ۵ ف : ملایا۔ ۶ ع : چھپ۔

ص ۲۲۹ ۱ ع : ترپے۔ ۲ ن : ہوش و آرام۔ ۳ ن میں "اور" نہیں۔ ۴ ف : حق۔ ۵ ن : حور و پری۔

ص ۲۳۰ ۱ ن : میں نے بھی۔ ۲ ن : توکسو سے۔ ۳ ن میں "پس" نہیں۔ ۴ ف : منّت دار۔ ۵ ن : دیکھیں۔ ۶ ع : دلھن۔ ۷ ف : بے خواش۔ ۸ ع : کسی۔

(۹) ک میں "بھونڈ" ہے، یعنی واو شاملِ تلفظ نہیں۔ آصفیہ میں "بھُنڈ پیرا" ہے۔ نور میں "بھونڈ پیرا" ہے مگر اس صراحت کے ساتھ : "واو لکھا جاتا ہے، پڑھا نہیں جاتا"۔ اس میں شک نہیں کہ تلفظ میں تو واو نہیں آتا اور "بھُنڈ" کہا جاتا ہے (بھُنڈ پیری، بھُنڈ پیرا) مگر یہاں اس لفظ کا املا ک اور ف کے مطابق برقرار رکھا گیا ہے، یہ خیال کر کے کہ یہ ایسی قدیم املائی صورت ہے جس کو اس زمانے کی کتاب میں برقرار رہنا چاہیے۔ اس کا بھی امکان ہے کہ شروع شروع میں "بھونڈ" کو بہ اظہارِ واو کہا جاتا ہو اور بعد کو وہ تخفیف میں آگیا ہو۔ اگر ایسی صورت ہو تب تو اس عہد کی تحریروں میں واو کو برقرار رکھنا ضروری قرار پائے گا۔ اسی خیال سے اصل کی مطابقت اختیار کی گئی ہے۔ واو بہرحال تلفظ میں نہیں آئے گا۔ [اثر لکھنوی مرحوم نے فرہنگِ اثر میں لکھا ہے کہ : "لکھنؤ کی مستورات ایسی عورت کو "بھُن پیری" کہتی ہیں، ڈال حذف کر کے۔ "بھونڈ" منحوس اور "بھُن" جلنا ہے "بھُن پیری" کے معنی ہوئے جلے پیروں والی، جہاں جائے آگ لگ جائے اور خاک اڑنے لگے۔ "بھنڈ پیری" میں ثقالت ہے، "بھُن پیری" سبک ہے" [فرہنگِ اثر: ص۲۱۲] ۔ میں عرض کروں کہ یہاں سوال ثقیل اور غیر ثقیل کا نہیں، اثر صاحب کے اپنے لکھنے کے مطابق "بھُنڈ پیری" اور "بھُن پیری" دو مختلف المعنی لفظ ہیں]۔

ص ۲۳۱ ۱ ن : اِس۔ ۲ ف : محلّ۔ ۳ ف : خواصّوں۔ ۴ ک، ف : میرا (ظاہرا غلطیِ طباعت)۔ ۵ ع : کر لیجیے۔ ۶ ک : زسیگا (ظاہرا غلطیِ طباعت)۔ ۷ ع : بچپال کر (غلطیِ طباعت)۔ ۸ ن : جدھر تیدھر۔ ۹ ف : محلّ۔ (۱۰) ن : کانوں سے سنی۔ بہ ظاہر ن کا متن مرجّح معلوم ہوتا ہے : جیسے ص۲۳۲ پر ایک جملہ ہے : "تم نے اپنی آنکھوں سے کیا دیکھا تھا"۔

"کانوں سُنی" بھی روزمرّہ ہے، مگر بالعموم اُس کا محلِ استعمال وہ نہیں ہوتا جو یہاں ہے۔ اِس کے باوجود، میں نے یہاں کے کی مطابقت کو ترجیح دی ہے، اِس بنا پر کہ اِس کا بہ خوبی امکان موجود ہے کہ نظرِ ثانی میں اُسے اِسی طرح بنا دیا گیا ہو۔ ۱۱ ف میں "بھی" نہیں۔ ۱۲ ن: اپنا مزا۔ ع: سزا۔ [بہ ظاہر اِس مقام پر "سزا" برمحل معلوم ہوتا ہے، مگر مصنّف نے "مزا" ہی لکھا ہے اور اِس کی دلیل یہ ہے کہ ن میں "اپنا مزا" ہے۔ اِس کا واضح طور پر مطلب یہ ہے کہ مصنّف نے "مزا" ہی لکھا تھا، نظرِ ثانی میں "اپنا" نکل گیا، "مزا" باقی رہ گیا]۔ ایک بات اور: سب نسخوں میں "مزا" ہے۔ اصلاً تو "مزہ" ہے، مگر اِسے "مزہ" اور "مزا" دونوں طرح لکھا جاتا رہا ہے، اِس بنا پر اِسی املا کو برقرار رکھا گیا ہے۔ ۱۳ ن: چڑھ آئی۔ ۱۴ ک، ن: تعویز [ف، ع: تعویذ]۔

ص ۲۳۲ ۱ ن: وہ۔ (۲) صرف یہ صراحت کرنا ہے کہ ک اور ف میں اضافت کا زیر موجود نہیں۔ ۳ ف: منتعد۔ ۴ ن: صورتیں تو۔ ۵ ن: اب میرا۔ ۶ ع: دکان۔ (۷) ک میں تَ پر زبر موجود ہے۔ ۸ ف، ع: سر چھپا دے۔ (۹) ک میں خُین پر پیش اور دال پر زیر موجود ہے۔

ص ۲۳۳ ۱ ف: جن۔ ۲ ف: جنوں۔ ۳ ن: وہی۔ (۴) صرف یہ صراحت کرنا ہے کہ ک اور ف میں اِسی طرح ہے، یعنی اضافت کا زیر موجود نہیں۔ (۵) ک اور ف میں اِسی طرح (یعنی اضافت کے بغیر) ہے۔

ص ۲۳۴ ۱ ن میں اِس مقام پر کچھ عبارت چھوٹ گئی ہے۔ ۲ ف: ذرا۔ ع: زرا۔ ۳ ع: چھُپانا۔ (۴) ک میں "شنید" پر اعراب موجود نہیں، البتّہ ف میں "شُنید" ہے، یعنی شین پر پیش لگا ہوا ہے لیکن اُس کی فرہنگ میں اِسے بہ فتحِ شین لکھا گیا ہے۔ فارسی میں "شنیدن" ہی ہے [تفصیل غیاث میں]۔ آصفیہ میں "شنید" تو موجود نہیں، البتّہ "گفت و شنید" ہے مگر آخری لفظ پر اعراب موجود نہیں۔ نور میں "شَنید" کو بہ فتحِ اوّل لکھا گیا ہے اور فیلن کے لغت میں بھی اسی طرح ہے۔ اِنھی وجوہ سے شین پر زبر لگایا گیا ہے۔ [ہاں یہ عرض کردوں کہ سننے میں "گفت و شُنید" اور "گفت و شَنید" دونوں طرح آیا ہے] (۵) سب نسخوں میں اِسی طرح ہے، یعنی الف پر مد موجود ہے۔ آصفیہ و نور میں یہ مرکب موجود نہیں۔ نور میں "خوشامد در آمد" ہے (مع الفِ ممدودہ)۔ آصفیہ میں لفظ "خوشامد" کے ذیل یہ فقرہ مرقوم ہے: "خوشامد سے آمد ہے"۔ یہ فقرہ نور میں بھی ہے اور دونوں جگہ "در آمد"

مع الفِ ممدودہ ہے۔ اِس لحاظ سے زیرِ نظر ٹکڑے میں الف پر مد لکھنے کا جواز ایک طرح نکل آتا ہے (اگرچہ پڑھنے میں اور بولنے میں "خوشامد برامد" آئے گا)۔ اِس بنا پر اصل کی مطابقت اختیار کی گئی ہے۔
(۶) ن: کاہلی۔ ک، ف، ع میں اِس لفظ کا یہی املا ہے، یعنی آخر میں ہائے مختفی ہے۔ یہ ہندی کا لفظ ہے، اور یوں اِس کے آخر میں الف آنا چاہیے، مگر میں نے یہاں ک کی مطابقت کو ترجیح دی ہے، اِس خیال سے کہ اِس کا بہ خوبی امکان ہے کہ مصنّف کے خیال میں یہ لفظ فارسی الاصل ہو۔ اِس لفظ کی صورت ایسی ہے کہ اِس خیال کا پیدا ہونا بہ خوبی ممکن ہے۔ اِس بنا پر ک کے املا کو برقرار رکھا گیا ہے۔ ۷ ک: اوغرا (غلطیِ طباعت)۔ (۸) ن، ک، ف، ع: سب میں "نوالا" ہے۔ ک میں اِس سے پہلے ص۲۲۷ پر "نوالہ" ہے اور یہاں اور سبھی نسخوں میں بھی "نوالہ" ہے۔ اِس لفظ کا صحیح املا بھی یہی ہے، اِس بنا پر ک کے ص۲۲۷ کے اندراج کے مطابق یہاں بھی "نوالہ" لکھا گیا ہے۔

ص ۲۳۵ ۱ ن: تو کوتویں میں۔ ک، ف: کوئے میں۔ (ع: کنویں میں)۔ ۲ ن: فقیراللہ۔ ف: فقراللہ (ک، ع: فقراللہ)۔ (۳) "حفظ" کو نور میں مذکر لکھا گیا ہے۔ آصفیہ میں تذکیر و تانیث کی صراحت موجود نہیں، مگر اِسے "تابع فعل" لکھا گیا ہے۔ نور کے مطابق یہاں "کے" ہونا چاہیے، مگر ن، ک، ع میں "کی" ہے۔ چوں کہ تذکیر و تانیث کے اعتبار سے میر امّن کی نثر میں متعدد لفظ لغات کے اندراج سے مختلف ملتے ہیں، اِس بنا پر یہاں بھی یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ مصنّف نے اِسے بہ تانیث استعمال کیا ہے۔ اِسی بنا پر "کی" کو برقرار رکھا گیا ہے۔ ہاں "امان" کے نون پر ک میں نقطہ موجود ہے۔ ۴ ن: کئی دن۔ ۵ ف: بہ حق۔ ۶ ع: تجہیز و تکفین۔ ۷ ع: ڈولے۔ ۸ ف: دق۔ ۹ ن: سہی سلامت۔

ص ۲۳۶ ۱ ع: تجھوں کو۔ (۲) ن، ک، ف، ع میں "کجاؤں" ہے۔ اصل لفظ "کجاوہ" ہے، اِس سے اسمِ جمع "کجاووں" بنے گا، اِسی بنا پر یہاں "کجاووں" لکھا گیا ہے۔ (۳) سب نسخوں میں اِسی طرح ہے ("نیک" کاف کے ساتھ)۔ "نیک" اور "نیگ" کی بحث ضمیمۂ تلفظ و املا میں دیکھی جا سکتی ہے۔ ۴ ف، ع: جنّوں۔ (۵) اِس لفظ سے متعلق بحث ضمیمۂ تلفظ و املا میں دیکھی جا سکتی ہے، یہاں صرف یہ کہنا ہے کہ اِس کا تلفظ بر وزنِ "خیرات" ہوگا۔ ۶ ن، ک، ف: خدا نہ خواستہ۔ ع: خدانخواستہ۔ (۷) ک، اور ف میں شروع کے دونوں حرفوں پر حرکات

موجود نہیں، البتہ ف کی فرہنگ میں اِسے بہ فتحِ اوّل و دوم لکھا گیا ہے۔ "غَضَب" سے "غَضَبی" ہی بننا چاہیے، اِسی لیے یہاں ف کی فرہنگ کے مطابق ضاد پر زبر لگایا گیا ہے۔

ص ۲۴۷ ۱؎ ن: تیری طرف۔ ۲؎ ن: تو نے۔ ۳؎ ن: لے آیا ہے۔ ۴؎ ن: یاد کر۔ ع: یاد کرا۔ ۵؎ ت: دیکھ تو۔ ۶؎ ن: اِدھر۔ ⑦ ک میں واو پر کوئی علامت موجود نہیں، ص ۲۴۸ پر بھی یہ لفظ آیا ہے اور وہاں بھی ک میں واو خالی ہے۔ گل کرسٹ کے مقرر کردہ اصولِ املا کے مطابق (جس کی پابندی اِس کتاب میں پوری طرح کی گئی ہے) جس واو پر علامتِ مجہول موجود نہیں، وہ معروف ہے۔ اِسی نسبت سے اِس لفظ کو مع واوِ معروف لکھا گیا ہے۔ یہ صراحت یوں ضروری سمجھی گئی کہ اِس لفظ کا تلفظ اُس زمانے میں مع واوِ مجہول بھی تھا اور اِس کی نشان دہی کی گئی ہے کتابوں میں۔ ۸؎ ت: تجھی کو۔ ⑨ ن: ڈھارس ہوا۔ یہ لفظ اِس سے پہلے ص ۱۵ پر آیا ہے۔ ف میں اِن دونوں مقامات پر "ڈھاڑس" (مع رائے ثقیلہ) ہے، مگر اُس کی فرہنگ میں اِسے "ڈھارس" (مع رائے مہملہ) لکھا گیا ہے۔ ت اور ع میں دونوں مقامات پر "ڈھارس" ہے۔ روایتِ اوّل م میں (ص ۱۵ کے مطابق) یہ لفظ اِس طرح چھپا ہوا ہے کہ واضح طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ رے پر زبر لگا ہوا ہے [م اور ک میں ڈال اور ڑے کے لیے دال اور رے پر ایک چھوٹا سا سیدھا خط لگایا گیا ہے: دؔ، رؔ؛ اور ف میں اِن پر چار نقطے رکھے گئے ہیں: ڈ، ڑ]۔ م میں رے پر جو خط ہے، وہ ایسے دوسرے خطوں کی طرح سیدھا نہیں، زبر کی طرح ترچھا ہے اور یوں یہی کہا جا سکتا ہے کہ یہاں رے پر زبر لگایا گیا ہے۔ ک میں پہلی بار جہاں یہ لفظ آیا ہے (یعنی ص ۱۵ کے مطابق) وہاں ڈال پر تو ویسا ہی خط ہے جیسا عموماً اِس حرف پر ہوتا ہے، مگر رے پر جو خط ہے، وہ کچھ اِس طرح کا مبہم سا ہے کہ اُسے ڑے کی علامت بھی سمجھا جا سکتا ہے اور رے کا زبر بھی۔ البتہ ص ۲۴۷ کے مطابق یہ جہاں آیا ہے، وہاں واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ اِسے ڑے کے ساتھ لکھا گیا ہے۔ اُردو میں مستعمل لفظ "ڈھارس" (مع رائے مہملہ) ہے۔ آصفیہ میں بھی اِسی طرح ہے اور فیلن کے لغت میں بھی یہی صورت ہے۔ پلیٹس کے لغت میں البتہ "ڈھارس" اور "ڈھاڑس" دونوں صورتیں ملتی ہیں، مگر میرا خیال ہے کہ پلیٹس کا یہ اندراج ڈنکن فوربس کے اِسی نسخے پر مبنی ہے، کہیں اور اِس کی مثال موجود نہیں۔ میرا یہ بھی خیال ہے کہ م میں "ڈھارس" تھا، اُسے "ڈھاڑس" پڑھا گیا، یعنی رے کے زبر کو ڑے کی علامت فرض کر لیا گیا (اور یہ

یہ خوبی قرینِ قیاس ہے)۔ میں نے ان سب اُمور کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے یہی مناسب خیال کیا کہ م،
ن اور ف کی فرہنگ کی مطابقت کو ترجیح دی جائے اور دونوں مقامات پر "ڈھارس" لکھا جائے۔
سلہ ف، ع: جتّوں۔ سلہ ف: خواص۔ سلہ ع: سری یاد۔
ص ۲۳۸ (۱) محض احتیاطاً یہ صراحت کی جاتی ہے کہ سب نسخوں میں اسی طرح ہے، یعنی
الف پر مد موجود نہیں۔ ہاں پہلی سطر کے شروع میں "یے" کی جگہ ن میں "یہ" ہے۔ سلہ ف،
ع: تب میری طرف۔ (۳) سب نسخوں میں تے مفتوح ہے۔ (استعمالِ عام میں ایسے مواقع پر
"تَو" اور "تُو" دونوں آتے ہیں)۔ (۴) ک میں اضافت کا زیر موجود ہے۔ قاعدے کے لحاظ سے بھی
ہونا چاہیے کیوں کہ "سر" مضاف ہے (یعنی یہ مرکب مقلوب نہیں)۔ (۵) سب نسخوں میں اسی طرح (مستعمل بھی اسی طرح
ہے)۔ یہاں یہ صراحت یوں کی گئی کہ مولفِ آصفیہ نے "زہیرنا" کے ذیل میں لکھا ہے کہ: "گنوار "زہیرنا"
بولتے ہیں"۔ ظاہر ہے کہ مولف کا یہ قول درست نہیں۔ مزید یہ کہ مولف نے "زہیرنا" کو "پیرنا" کی بازی بتایا
ہے۔ باغ و بہار میں اس لفظ کا موجود ہونا ہی اُن کے اس قول کو غلط ثابت کرنے کے لیے کافی ہے۔
ص ۲۳۹ (۱) سب نسخوں میں "کیکڑا" (ڑے کے ساتھ) ہے۔ آصفیہ میں صرف "کیکر" ہے،
مگر فیلن اور پلیٹس کے لغات میں "کیکر" اور "کیکڑا" دونوں صورتیں موجود ہیں۔ (۲) یہ لفظ
آصفیہ میں اور فیلن کے لغت میں موجود نہیں؛ البتہ پلیٹس کے لغت میں ہے اور اسی طرح (یعنی
نون غنّہ اور یائے مجہول) ہے۔ ن: ٹنٹی۔ (۳) سب نسخوں میں اسی طرح (یعنی "جھڑ" ڈے کے
ساتھ) ہے۔ "جھڑبیری" اور "جھربیری" دونوں شکلیں لغات میں ملتی ہیں۔ سلہ ع: یہی۔ سلہ
ف: مستعد۔ سلہ ف: وہی۔ سلہ ن، ف، ع: مرشدوں کی حضور میں۔ (۸) صرف یہ صراحت
کرنا ہے کہ ک اور ف میں اضافت کا زیر موجود ہے اور "ظل" کے لام پر پیش ہے۔ (۹) ک اور
ف میں زے پر حرکت موجود نہیں۔ اصلاً زے پر زبر ہے (مُلازَمت)، مگر اُردو والوں کے تلفظ
میں عام طور پر یہ لفظ کچھ اس طرح آتا ہے جیسے زے کے نیچے زیر ہو، یعنی زبر کی آواز اس قدر
ترچھی ہوکر نکلتی ہے کہ زیر کی آواز سے قریب تر ہو جاتی ہے۔ غالباً اسی بنا پر فیلن کے لغت میں اسے "ملازِمت"
(بہ کسرِ زا) لکھا گیا ہے۔ تلفّظ کی فصاحت کا تقاضا یہی ہے کہ زے کے زبر کی آواز پر زور نہ دیا جائے
اور جس طرح یہ آواز ترچھی ہوکر نکلتی ہے، اُسی طرح استعمال میں آئے۔ (۱۰) اس سے پہلے بھی یہ وضاحت
کی جا چکی ہے کہ "خاطرجمع" کو اُردو والے اس طرح بولتے ہیں کہ "جمع" کے میم پر زبر آجاتا ہے (جب کہ

اصلاً جزم ہے) تلفظ کی فصاحت کا تقاضا یہی ہے کہ اسی طرح استعمال کیا جائے۔ یہ خیال نہیں کرنا چاہیے کہ یہاں فارسی ترکیب ہے، یہ خالص اُردو کا انداز ہے۔ ۱۱؎ ن: یہ۔ ۱۲؎ ف، ع: مخلّی۔ ن: مخل۔ ۱۳؎ ف: مخل۔

ص ۲۴۰ ۱؎ ف: خواص۔ ۲؎ ع: شادیِ مرگ۔ ۳؎ ع: تو اپنے۔ ۴؎ ن: بیاں گیاں (کذا)۔ ع: سان وگمان۔ ۵؎ ف: محل۔ ۶؎ ن: جھڑنیں لگیں۔ (۷) ک میں واو کا سر خالی ہے، یعنی واو معدولہ ہے۔ یہ بات طلبہ کے ذہن میں رہنا چاہیے کہ اس مرکب کے تلفظ میں واو کی آواز شاملِ تلفظ نہیں ہوتی۔ تلفظ کی فصاحت اسی کی متقاضی ہے۔ اس کی صراحت اس سے پہلے بھی کی جا چکی ہے۔ ۸؎ ن: اکابروں کو۔

ص ۲۴۱ (۱) صرف یہ صراحت مقصود ہے کہ کسی نسخے میں یہاں اضافت کا زیر موجود نہیں، مستعمل بھی اضافت کے بغیر ہے۔ یہ صراحت یوں کی گئی کہ کسی طالبِ علم کے ذہن میں شاید یہ اشتباہ پیدا ہو کہ ممکن ہے اضافت کا زیر چھوٹ گیا ہو۔ "مردِ خرچ" اور "مردِ معاش" دونوں مرکب اضافت کے بغیر ہیں۔ آصفیہ میں بھی اسی طرح مندرج ہیں۔ (۲) صرف یہ صراحت کرنا ہے کہ "میتے" اور "جملے" دونوں لفظوں میں تیسرے حرف کے نیچے زیر ہے (م ی تِ ے۔ ج م لِ ے)۔ ۳؎ ع: زبوں (۴) ن، ک، ف، ع: سب نسخوں میں اِن دونوں لفظوں کا یہی املا ہے (یعنی آخر میں الف ہے)۔ ۵؎ ف: مخل۔ ۶؎ ف: بخواہشیں۔ ۷؎ ن: محل۔ ف، ع: مخلّی۔ ۸؎ ن: پڑا۔ ۹؎ ن: وہی۔ ۱۰؎ ف: مخل۔

ص ۲۴۲ (۱) ک میں اسی طرح، یعنی نونِ غنہ کے بغیر ہے۔ اِس سے پہلے صفحہ ۲۲۰ پر "مانگے" آیا ہے اور وہاں یہ صراحت کردی گئی ہے کہ آصفیہ میں بھی "مکنا" کو بغیر نونِ غنہ اور "مانگنا" کو مع نونِ غنہ لکھا گیا ہے۔ اِس جملے کے آخر میں "پہنایا ہے" کی جگہ ع میں "پہناتا ہے" ہے (۲) سب نسخوں میں "پانو" ہے۔ ۳؎ ف: محل۔ ۴؎ ن: سمجھوا کر۔ ۵؎ ن: آبیٹھتا۔ ۶؎ ن: کرتا۔ ۷؎ ن: جمعرات۔ ۸؎ ن: کہ جن کے۔ ۹؎ ف: خیریت۔ (۱۰) طلبہ کے استفادے کے لیے یہ وضاحت کی جاتی ہے کہ یہاں "ساتویں" ہی پڑھنا چاہیے، یہ خیال نہ کیا جائے کہ اِسے "ساتوں" بھی پڑھا جا سکتا ہے: اِس بنا پر کہ لفظ "برس" مذکر ہے (آصفیہ) اور اِس اعتبار سے لازماً "ساتویں" کہا جائے گا۔ "برس" اگر مؤنث ہوتا، تب "ساتویں" کہا جا سکتا تھا۔ ۱۱؎ ن میں "کہ" نہیں۔

(۱۴) صرف یہ صراحت کرنا ہے کہ ک اور ف میں تشدید موجود ہے۔ (۱۳) اس سے پہلے بھی یہ صراحت کی جا چکی ہے کہ لفظ "جَمْع" ہے، مگر مفرد صورت میں زبانوں پر اِس طرح آتا ہے جیسے میم پر زبر ہو۔ ۱۴ ف : بالکل۔ (۱۵) ک اور ف میں اِس لفظ پر حرکات موجود نہیں۔ اصلاً "دَفْع" ہے اور ترکیبی صورت میں اِسی طرح زبانوں پر آتا ہے، جیسے : دَفْعِ ضَرر۔ لیکن جب یہ لفظ مفرد ہوتا ہے، تب عام طور پر زبانوں پر بہ فتحِ دوم آتا ہے اور اُردو میں تلفّظ کی فصاحت اِسی کی متقاضی معلوم ہوتی ہے۔ اِسی طرح "رفع دفع" میں بھی دونوں اجزا بہ فتحِ دوم زبان پر آتے ہیں، "رَفَع دَفَع" کہنا تقاضاے فصاحت کے عین مطابق ہوگا۔ اِسی طرح مفرد صورت میں "دَفَع" کہنا، اُردو پن کو نمایاں کرے گا۔ اِس لفظ کا احوال جمع، منع، نفع جیسا ہے۔ اِن لفظوں کی بحث ضمیمۂ تلفّظ و املا میں آچکی ہے۔ یہاں بھی "دَفَع ہو" کہنا اُردو کے عین مطابق ہوگا۔ (۱۶) ضمیمۂ تلفّظ و املا میں اِس لفظ کے ذیل میں وضاحت کی جا چکی ہے کہ اصلاً "رُقْعَہ" ہے، مگر بول چال میں "رُقَعہ" (یعنی رُقّہ) آتا ہے اور اِسی طرح کہنا چاہیے۔

ص ۴۴۳ ۱ ن : بیٹھا۔ ۲ ن : ہے۔ ۳ ع : کے مانند۔ (۴) صرف یہ صراحت مقصود ہے کہ ک، ف، ع میں اضافت کا زیر موجود ہے۔ ۵ ن : دو تو بوندیں۔ ۶ ن : اور گویا پریوں کا۔ ۷ ن : کھڑی ہیں۔ ۸ ن میں "تو" نہیں۔ ۹ ک : مادّب۔ ن : بادب کھڑے تھے۔ (۱۰) ک میں دال پر زبر لگا ہوا ہے۔ ف میں اِس لفظ پر اعراب موجود نہیں، مگر اُس کی فرہنگ میں "صَدَر" ہے۔ اصلاً "صَدْر" ہے اور ترکیبی صورت میں اِس طرح آتا ہے، جیسے: صَدْرِ محترم۔ مگر مفرد صورت میں عام لوگوں کی زبان سے "صَدَر" سنا گیا ہے۔ ک میں جو دال پر زبر ہے، وہ اِسی کی نمایندگی کرتا ہے۔ اِسی بنا پر ک کی مطابقت اختیار کی گئی ہے اور دال پر زبر کو برقرار رکھا گیا ہے۔ ۱۱ ن میں "ملک" نہیں۔ اِس کے علاوہ ن میں ہر جگہ "شہپال" ہے، جب کہ ک، ف (اور ع) میں ہر جگہ "شہبال" ہے۔ اِس اختلاف کی نشان دہی ہر جگہ ضروری نہیں سمجھی گئی۔

ص ۴۴۴ ۱ ف : سرو قد۔ ع : سرْو قد۔ طلبہ کے استفادے کے لیے احتیاطاً یہ صراحت کی جاتی ہے کہ "سرو" میں رے ساکن ہے اور واو موقوف ہے (سَرْوْ)۔ ۲ ف : کیفیت۔ ۳ ف : مفصّل۔ (۴) ک : دیوؤں۔ ف، ع : دیووں۔ ف اور ع کے املا کو ترجیح دی گئی ہے، اِس بنا پر کہ صحیح صورت بھی یہی ہے۔ خدیو اور دیو جیسے لفظ، جن کے آخر میں واو موقوف ہے، یعنی

واؤ سے پہلے حرف ساکن ہے؛ اُن کی جمع اِس طرح بنے گی کہ اصل لفظ کے آگے "وں" کا اضافہ کیا جائے گا۔ خدیو: خدیووں۔ دیو: دیووں۔۔۔ ایسے الفاظ جن کے آخر میں واؤ ساکن ہوتا ہے جیسے ہندو، بازو؛ تو اُن کی جمع اِس طرح بنتی ہے کہ اصل لفظ کے آگے "ؤں" کا اضافہ کیا جاتا ہے، جیسے بازوؤں، گیسوؤں وغیرہ۔ اِس امتیاز کو ضرور ملحوظِ خاطر رہنا چاہیے۔ ۵؎ ف: جن۔ (۶) صرف یہ صراحت کرنا ہے کہ سب نسخوں میں "پیڑا" ہی ہے۔ ۷؎ ع: نام ونشان۔

ص ۲۴۵ (۱) ک اور ف میں تشدید موجود ہے۔ ۲؎ ن: کرنے کے بعد کئی روز سے معلوم ہوا۔ ۳؎ ن: جنات۔ ۴؎ ن: دیا۔ (۵) ک اور ف میں اضافت کا زیر موجود ہے۔ ۶؎ ن میں "سے" نہیں۔ ۷؎ ن: اور اس کی گود میں لیا اور اپنی۔ ۸؎ ن: انجام اِس کی کتخدائی کا کر دیتا ہوں۔ ۹؎ ن: یہ۔

ص ۲۴۶ ۱؎ ن: ہوا اور بولا۔ ۲؎ ن: مانند شکرا اور شکرے کے (کذا)۔ (۳) اس سے پہلے یہ وضاحت کی جا چکی ہے کہ یہ لفظ بول چال میں "خَیرات" کے وزن پر سننے میں آتا ہے اور یہی فصیح تلفظ ہے۔ ۴؎ ع: غم و غصہ۔ (۵) ف میں ع پر پیش ہے۔ المنجد میں بھی "عُمان" ہے (المنجد: اُنتیسواں اڈیشن)۔ ۶؎ ف، ع: جن۔ (۷) ک کے متن میں "مُنکر پاک" ہے یعنی اضافت کا زیر موجود نہیں؛ لیکن غلط نامے میں اس کی تصحیح کی گئی ہے اور "مُنکرِ پاک" کو صحیح بتایا گیا ہے۔ ف میں بھی اضافت کا زیر موجود ہے۔ (۸) سب نسخوں میں اسی طرح ہے۔ آصفیہ میں یہ مرکب موجود نہیں۔ (۹) "پر آیا ... گھوڑا" یہ ٹکڑا ف میں موجود نہیں۔

ص ۲۴۷ ۱؎ ک، ف، ع: بمعہ۔ ن: بمعہ۔ صحیح لفظ "مع" ہے؛ اسی بنا پر "بہ مع" لکھا گیا ہے۔ ۲؎ ن: گھوڑے۔ ۳؎ ن: بہزاد نے گھوڑا چلایا۔ (۴) اصولاً "مردانگی" ہونا چاہیے، مگر تلفظ میں یہ لفظ اِس طرح آتا ہے کہ نون ساکن معلوم ہوتا ہے۔ تلفظ کے لحاظ سے یہی انداز فصیح قرار پائے گا۔ ۵؎ ن: وہ دونو۔ ۶؎ ن: بہ سختی و بہ ملایمت۔ (۷) ن، ک، ف میں اسی طرح ہے۔ ع: ملائمت۔ اصل لفظ "مُلائمَت" (بہ فتح چہارم) مگر تلفظ میں یہ اِس طرح آتا ہے جیسے "مُلائمِت" ہو۔ چوں کہ ک اور ف میں "ملایمت" ہے؛ اور یہ غلطیِ کتابت یا غلطیِ طباعت یا غلطیِ املا نہیں، اِس لیے اِسی املا کو برقرار رکھا گیا ہے۔ ۸؎ ف، ع: جتوں۔ ۹؎ ف، ع: جتوں۔ ۱۰؎ ع: نیست و نابود۔

ص ۲۴۸ ۱؎ ع: کرکے۔ (۲) سب نسخوں میں "تعیّن" ہے۔ یہ صراحت یوں کی گئی کہ کسی طالبِ علم کے ذہن میں یہ خیال نہ آئے کہ یہاں "متعیّن" تو نہیں۔ ۳؎ ف: خاصّ۔ ۴؎ ف: محلّ۔ ۵؎ ن: آئینہ بند کا حکم دو۔ ۶؎ ع: جلدی کرو۔ (۷) محض احتیاطاً یہ صراحت کی جاتی ہے کہ کے میں یاے مخلوط کی علامت موجود ہے، یعنی اُس میں "بیاہا" ہے۔ اسی کی مطابقت اختیار کی گئی ہے (مستعمل بھی اسی طرح ہے)۔ ۸؎ ف: حقّ۔ ۹؎ ن: کتخدائی۔ (۱۰) کے، ف، ع میں اسی طرح ہے، یعنی "یہ" الگ ہے اور "دولت" الگ۔ اسی املا کو برقرار رکھا گیا ہے۔ (۱۱) کے میں "کی" ہے۔ ن اور ع میں "کے" ہے۔ اب ہم عموماً ایسے مواقع پر (یعنی جب جملے میں لفظوں کی ترتیب اس طرح بدل جائے) "کے" لکھتے ہیں۔ یہاں میں نے اصل متن کو محض اس خیال سے برقرار رکھا ہے کہ ممکن ہے مصنف نے اسی طرح لکھا ہو۔ ۱۲؎ ن: پہنچے۔

ص ۲۴۹ ۱؎ ن: بادشاہ زادوں کو۔ ۲؎ ن میں "کر" نہیں۔ (۳) چوں کہ یہاں فارسی ترکیب ہے، اس لیے "جمعی" (بہ سکونِ دوم) پڑھنا بہتر ہوگا۔ (۴) کے اور ف میں تشدید موجود ہے۔ (۵) کے اور ف میں اضافت کا زیر موجود ہے۔ ۶؎ ن: یعنی۔ (۷) محض احتیاطاً یہ صراحت کی جاتی ہے کہ سب نسخوں میں یہاں "یہ" ہے۔ یہ صراحت یوں کی گئی کہ "یہ" عموماً واحد کے لیے استعمال میں آیا ہے اور جمع کے لیے عموماً "یے" لکھا گیا ہے۔ (۸) کے میں "الٰہِ العالمین" ہے، یعنی "الہ" کی ہ کے نیچے زیر لگا ہوا ہے۔ عربی کے قاعدے کے مطابق زیر ہونا چاہیے، اسی لیے "الٰہِ العالمین" لکھا گیا ہے۔ ن میں "یا" موجود نہیں، اور ف، ع میں "یا اللہ العالمین" ہے۔ (۹) ف اور ع میں اس پیراگراف کے شروع ہونے سے پہلے ایک سطر میں یہ عنوان ہے: "خاتمۂ کتاب میں"۔ ن اور کے میں نہ تو اس جگہ ایسا کوئی عنوان ہے اور نہ کے کی فہرستِ مضامین میں یہ عنوان شامل ہے؛ اس بنا پر اس عنوان کو شاملِ متن نہیں کیا گیا۔ (۱۰) کے اور ف میں یہاں تشدید موجود نہیں۔ اس سے پہلے بھی کئی جگہ یہ لفظ تشدید کے بغیر آچکا ہے۔ چوں کہ "رکھا" اور "رکّھا" دونوں طرح مستعمل رہا ہے، اس لیے ہر جگہ کے کی مطابقت اختیار کی گئی ہے۔ اسی پیراگراف میں "یہی نام رکھا" آیا ہے اور وہاں بھی ان دونوں نسخوں میں "رکھا" پر تشدید موجود نہیں۔ (۱۱) صرف یہ صراحت کرنا ہے کہ کے اور ف میں اضافت کا زیر موجود ہے۔ (۱۲) کے اور ف میں اضافت کا زیر موجود ہے۔ (۱۳) کے، ف، ع: ستھرہ۔ لیکن اس کے بعد

جو قطعۂ تاریخ ہے، اس کے دوسرے مصرعے میں ان سب نسخوں میں "سترہ" لکھا ہوا ہے۔ صحیح املا بھی یہی ہے، اس لیے یہاں بھی "سترّہ" لکھا گیا ہے۔ (۱۴) سب نسخوں میں یہاں "سن" ہے۔ اس کی بحث ضمیمۂ تلفظ و املا میں آ چکی ہے؛ اسی بنا پر یہاں "سنہ" لکھا گیا ہے۔ ۱۵ ن: کے۔ ۱۶ ن: کہا کہ۔ ۱۷ ن میں "ہے" نہیں۔

ص ۲۵۰: ۱ ع: تھی۔ (۲) یہاں بھی وہی صورت ہے جس کی نشان دہی ص ۲۴۹ کے حاشیہ ۱۴ میں کی گئی ہے۔ ۳ ن: بارہ سو پندرہ۔ (۴) وزن کے لحاظ سے یہاں پڑھنے میں صرف "اُ" آئے گا۔ "اوز" (بروزنِ فاع) کو "از" (بروزنِ فَع) تو نظم کیا گیا ہے، مگر "اُ" شاید کسی نے کہا ہو۔ (۵) ک میں "سُخَن" ہی ہے، یعنی سین پر پیش لگا ہوا ہے اور خ پر زبر۔ (۶) "تمام شد" ف اور ع میں موجود نہیں۔ ن میں کتاب "تمام شد" پر ختم ہو جاتی ہے۔ ع میں کتاب قطعے کے آخری شعر پر ختم ہو جاتی ہے۔ ف میں آخری شعر کے بعد ایک سطر کا فصل ہے، اور پھر میر امّن کی وہ عرضی ہے جو ع اور ک میں شروعِ کتاب میں آئی ہے۔ ف میں عرضی کی عبارت ص ۲۵۹ پر مکمل ہو جاتی ہے؛ ص ۲۶۰ پر پہلی سطر میں جلی ٹائپ میں یہ سرخی ہے: "فہرست باغ و بہار کی"۔ اس کے نیچے دو کالمی پانچ سطری فہرست ہے۔ ہر کالم میں پہلے ضمنی سرخی کے طور پر لفظ "کیفیت" اور اس کے آگے لفظ "صفحہ" لکھا گیا ہے۔ عنواناتِ فہرست یہ ہیں:

کیفیت	کیفیت
مقدمہ	بادشاہ کی حکایت میں
شروع قصّے میں	تیسرے درویش کی سیر میں
پہلے درویش کی سیر میں	چوتھے درویش کی سیر میں
دوسرے درویش کی سیر میں	خاتمہ کتاب میں

یہاں پر اصل کتاب ختم ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد فرہنگ کا حصّہ ہے، جس پر نمبر شمار الگ سے ڈالے گئے ہیں اور وہ الٹی طرف سے یعنی کتاب کے آخری حصّے کی طرف سے شروع ہوئے ہیں۔

[ص ۲۵۳ کا بقیہ] ⑤ پہلے مصرعے میں "میں نے پہچانا نہیں" سے واضح طور پر مراد ہے اِس مشہور قول سے : ماعرفناک حقّ معرفتک۔ میرامّن نے اِسے قولِ پیمبر یعنی حدیث بتایا ہے۔ [مرزا رجب علی بیگ سرورؔ نے بھی دیباچۂ فسانۂ عجائب میں بہ ذیلِ حمد اِس قول کو حدیث لکھا ہے : "جس کی شان میں مخبرِ صادق یہ فرمائے" دوسرا اِس عہدے سے کب بر آئے : ماعرفناک حقّ معرفتک"] شیخ سعدی نے گلستاں کے دیباچے میں لکھا ہے : "عاکفانِ کعبۂ جلالش بہ تقصیرِ عبادت معترف کہ ماعبدناک حقّ عبادتک، واصفانِ حلیۂ جمالش بہ تحیر منسوب کہ ماعرفناک حقّ معرفتک۔" [گلستاں، بہ تصحیح عبدالعظیم گرگانی، طبعِ تہران] ۔ سعدی نے جس طرح اِن اقوال کو لکھا ہے اُس سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ یہ قولِ پیمبر یعنی حدیث نہیں اور یہی بات صحیح معلوم ہوتی ہے۔ میں کوشش کے باوجود یہ معلوم نہیں کر سکا کہ یہ کس کا قول ہے۔ بہ ظاہر یہ کسی صوفی کی کہی ہوئی بات معلوم ہوتی ہے۔ ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی (اُستادِ شعبۂ اُردو، بنارس ہندو یونی ورسٹی) نے میرے خط کے جواب میں لکھا تھا :

" ماعرفناک حقّ معرفتک کے سلسلے میں آپ کا یہ فرمانا بالکل بجا ہے کہ یہ حدیث نہیں ہے؛ لیکن یہ کہ یہ کس کا قول ہے؟ اِس کی تحقیق کی میں نے کوشش ضرور کی، لیکن مجھے اِس میں کامیابی نہیں ہوئی۔ میں کسی قدر اِس کی تفصیل عرض کیے دیتا ہوں۔

جلال الدین سیوطی نے الجامع الصّغیر میں حروفِ تہجّی کی ترتیب سے مشہور احادیث و آثار کے ابتدائی ٹکڑے نقل کرتے ہوئے اُن کے مآخذ کی نشان دہی کی ہے؛ اِس کتاب میں یہ قول مذکور نہیں۔ شمس الدین سخاوی نے المقاصد الحسنۃ میں مشہور اقوال و آثار جمع کیے ہیں اور پھر اُن کے حدیث، اثر یا قول ہونے کی تحقیق کی ہے۔ اِس میں بھی ماعرفناک الخ کا ذکر نہیں۔

ملّا علی قاری نے تذکرۃ الموضوعات میں اُن تمام اقوال کو بڑی حد تک جمع کر دیا ہے جن کے بارے میں "حدیث" ہونے کا دعوا کیا گیا ہے، حالاں کہ وہ حدیث نہیں ہیں۔ لیکن زیرِ بحث قول اُن کے یہاں بھی موجود نہیں۔ البتّہ ایک دوسرا مشہور قول "من عرف نفسہ فقد عرف ربّہ" موجود ہے اور اِس کے بارے میں یہ تصریح کی ہے کہ یہ حدیث نہیں، بلکہ یحییٰ بن معاذ الرازی کا قول ہے۔

قرآنِ پاک کی ایک آیت ہے "وما قدروا اللہ حق قدرہ" (سورۂ زمر) یہ خیال آیا کہ ممکن ہے اِس آیت کی تفسیر کے ذیل میں کسی مفسّر نے متذکرۂ بالا قول نقل کیا ہو، چنانچہ متقدمین میں حافظ ابنِ کثیر کی تفسیر ابنِ کثیر اور متاخرین میں علامہ آلوسی کی روح المعانی دیکھ ڈالیں، لیکن اُن میں بھی اِس کا پتا نہ چلا۔

جرمن مستشرقین کی ایک جماعت نے احادیث کے دس مشہور مجموعوں کا اشاریہ تیار کیا ہے، احتیاطاً اُسے بھی دیکھ لیا۔

آیندہ اگر کہیں اِس کا سراغ مل گیا تو ان شاء اللہ لکھ بھیجوں گا۔"

ص ۲۹۲ س ۱۴ سے آگے:

مزید یہ کہ عتیق صدیقی نے اپنی کتاب گل کرسٹ اور اُس کا عہد میں نیز اپنی انگریزی کتاب اورجن آف ماڈرن ہندستانی لٹریچر میں میر بہادر علی حسینی کی کتاب اخلاقِ ہندی اور گل کرسٹ کی کتاب نو ایجاد یعنی نقشۂ افعالِ فارسی مع مصدراتِ آن و مترادفاتِ ہندوستانی کے سرورق کا عکس شامل کیا ہے؛ اِن دونوں کتابوں کے ان اوّلین صفحات میں "جان گلکرِست" لکھا ہوا ملتا ہے، یعنی آخر میں "ت" ہے اور گاف، لام اور رے کے نیچے زیر لگے ہوئے ہیں۔ اِن شواہد سے اِس کی مزید تصدیق ہوتی ہے کہ (۱) فورٹ ولیم کالج کی کتابوں میں اس لفظ کے آخر میں "ت" لکھی گئی ہے (۲) یہ بات بھی مصدّق ہو جاتی ہے کہ اُس کے نام کو "گلکرِست" لکھا گیا ہے، "گلکرائسٹ" نہیں لکھا گیا ہے۔

مثنوی سحر البیان کا وہ نسخہ بھی میرے سامنے ہے جسے گل کرسٹ کی فرمایش پر میر شیر علی افسوس نے مرتب کیا تھا؛ اِس نسخے کا سرورق تو موجود نہیں (انگریزی عبارت پر مشتمل سرورق، جو آخر میں شامل ہے، وہ موجود ہے) مگر افسوس نے جو مقدمہ اِس کتاب پر لکھا ہے، اُس میں گل کرسٹ کا نام آیا ہے، اور وہاں بھی "گل کرِست" ("ت" کے ساتھ) ملتا ہے۔ اِن وجوہ سے یہ لازم ہو جاتا ہے کہ اِس کتاب میں اُس کے نام کو اُسی طرح لکھا جائے جس طرح لکھا گیا ہے۔

ص ۱۱۶ ⑨:

سب نسخوں میں اوپر کی طرح ہے۔ ص ۱۴۲ پر "واویلا" بر تانیث ہے: "تمام ملک میں واویلا پڑی" پھر "ا"، "ک"، "د"، "ع" میں اِسی طرح ہے، مگر "ن" میں "پڑا" آیا ہے۔ آصفیہ میں "واویلا" کو مذکر اور نور میں مؤنث لکھا گیا ہے۔ یوں یہ لفظ مختلف فیہ ٹھہرا۔ اِسی بنا پر اِن دونوں مقامات پر کسی کی مطابقت اختیار کی گئی ہے اور دونوں جگہوں کو علیٰ حالہ رکھا گیا ہے۔

ضمیمہ ۲

تلفّظ اور املا

آب و دانے (ص ۶): ن، م، ک، ف، ع؛ سب نسخوں میں اِسی طرح ہے (یعنی آخری لفظ "دانے" ہے)۔ یہ صراحت خاص کر یوں ضروری سمجھی گئی کہ "دانہ" فارسی لفظ ہے؛ جب یہ "دانے" بنے گا تو اِس کو مہنّد کہا جائے گا (یعنی اُردو شکل)۔ یوں "آب و دانے" گویا اُس فارسی مرکّب (آب و دانہ) کی اُردو شکل ہوئی۔ (اِس عمل کو قواعد کی زبان میں "تہنید" کہتے ہیں)۔ ہمارے یہاں شاعری کے قاعدے بنانے والوں نے یہ قاعدہ بھی بنایا تھا کہ عام مہنّد ترکیبیں درست نہیں ہوتیں، اُن سے بچنا چاہیے؛ اور اِس لیے یا تو "آب و دانہ" لکھا جائے یا "آب دانے" (واو کے بغیر)۔ مؤلفِ نور اللغات نے بھی "آب و دانہ" کے ذیل میں یہی لکھا ہے: "جن اُردو ترکیبوں میں ہائے مختفی کو یائے تحتانی سے بدلتے ہیں، واوِ عاطفہ کو، جو علامت فارسی ترکیب کی ہے، حذف کر دیتے ہیں"۔ یعنی اُن کی رائے میں ایسے مقامات پر "آب دانے" لکھنا چاہیے۔ یہ صورت خواہ قاعدے کے لحاظ سے درست ہو، مگر تلفظ کے لحاظ سے قطعاً نادرست ہوگی؛ اِس لیے کہ اُردو والے ایسے سبھی مقامات پر "آب و دانے" ہی بولتے ہیں۔ مولانا احسن مارہروی نے لکھا ہے: "جس لفظ کے آخر میں ہ آئے، تو فاعلیّت، مفعولیّت اور اضافت کی حالت میں اُسے ے سے لکھا جائے، جیسے: کسی زمانے میں۔ اِسی طرح حالتِ ترکیبی یعنی حالتِ اضافت و عطف میں بھی عربی فارسی الفاظ اُسی طرح لکھے جائیں، جس طرح بولے جاتے ہیں؛ مثلاً: لب و لہجے میں، مقدمے بازی میں، وغیرہ" (علمی نقوش، ص ۱۴۳)۔ میر انیس کی رباعی ہے:

اب گرم خبر موت کے آنے کی ہے ؛ ناداں! تجھے فکر آب و دانے کی ہے ؛ ہستی کے لیے ضرور اک دن ہے فنا ؛ آنا تیرا، دلیل جانے کی ہے۔ چوں کہ چلن کو قاعدے پر عموماً افضلیت حاصل رہتی ہے، اِسی اصول کی بنا پر ایسی ترکیبوں کو بھی اُردو میں استعمالِ عام کے مطابق یائے مجہول کے ساتھ لکھا جاتا ہے۔

آتش: دیکھیے اِس ضمیمے کے آخر میں ص ۴۲۶ پر۔

آذر بایجان (بہ ضمِّ ذال): ص ۱، ۳۶۱، ح ⑨۔

آزردہ (ص ۳۸): م، ک، ف میں زے پر پیش لگا ہوا ہے، اِسی کے مطابق "زے" پر

پیش لگایا گیا ہے۔ طلبہ کی معلومات کے لیے یہ صراحت بھی کی جاتی ہے کہ فارسی میں زے پر زبر ہے۔ صاحبِ غیاث اللغات نے لکھا ہے: "آزردن، بہ فتحِ زاے معجمہ، و بہ ضمّ آن غلط است، چرا کہ مخفف آزاریدن است"۔ غالباً اسی بنا پر نور میں "آزردگی" اور "آزردہ" دونوں کو بہ فتحِ دوم لکھا ہے۔ اس کے برخلاف آصفیہ میں "آزُردہ" اور "آزُردگی" مندرج ہیں۔ [اور اُردو والوں کے لحاظ سے یہی مرجّح ہے] ہم، ک، ف کی مطابقت اختیار کی گئی ہے۔

آزُقہ (ص ۱۵۰): ک، ف، ع تینوں نسخوں میں اس مقام پر اس لفظ کا یہی املا ہے۔ اس سے پہلے ص ۱۴۶ پر بھی یہ لفظ آیا ہے (ک، ص ۱۴۹) اور وہاں بھی ک اور ف میں "آزُقہ" ہے اور ع میں "آزقہ" (زے کے پیش کے بغیر) ہے۔ ک میں ص ۱۸۷ پر ایک جگہ اور ص ۱۸۹ پر تین جگہ یہ لفظ آیا ہے اور ان تینوں مقامات پر ک میں تو یہی املا ملتا ہے، مگر ف اور ع میں ان تینوں مقامات پر "آذوقہ" (مع ذال اور بہ اضافۂ واو) ہے۔ یہ وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ لغات میں اس لفظ کے املا میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ غیاث اللغات میں "آزُقہ" اور "آزوقہ" دونوں لفظ (زے کے ساتھ) مندرج ہیں۔ مولف کی تحریر سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اصل لفظ "آزُقہ" ہے اور "آزوقہ" اُس کی اشباعی صورت ہے: "دیگا ہے بہ اشباعِ ضمۂ زا واو نیز پیدا کنند"۔ اسی ذیل میں مولف نے یہ صراحت بھی کی ہے کہ ① اس لفظ میں زے کی جگہ ذال لکھنا غلط ہے ② اور یہ کہ ابتدا میں الفِ ممدودہ ہے، اس کی جگہ الفِ مقصورہ لکھنا بھی صحیح نہیں۔ مطلب یہ نکلا "آزُقہ" اور "آزوقہ" صحیح شکلیں ہیں۔ "آذقہ" یا "آذوقہ" یا "اَذوقہ" لکھنا درست نہیں۔ اس کے برخلاف آصفیہ میں "آذوقہ۔ یا۔ اَذوقہ" (مع ذال) مندرج ہے اور مولفِ آصفیہ نے صاحبِ غیاث اللغات سے اختلاف کرتے ہوئے اس لفظ کو مع ذال صحیح بتایا ہے۔ البتہ نور میں (غیاث کی طرح) "آزُقہ اور آزوقہ" ہے۔ جیسا کہ لکھا جا چکا ہے، ک میں ہر جگہ "آزُقہ" (زے کے ساتھ اور واو کے بغیر) ہے؛ اسی کی مطابقت اختیار کی گئی ہے۔ یہ بھی عرض کیا جائے کہ بہ ظاہر یہی املا مرجّح بھی معلوم ہوتا ہے۔ ہاں ت میں ان سب مقامات پر "ازوقہ" ہے۔

آلتمغا (ص ۲۴۴): ک میں مع مد (آلتمغا) ہے۔ ت، ف، ع میں مد کے بغیر (التمغا) ہے۔ میں نے ک کے املا کو ترجیح دی ہے اور اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ لغات میں اگرچہ "التمغا" اور "آلتمغا" دونوں لفظ ملتے ہیں، مگر آصفیہ، نور اور امیر اللغات میں جس قدر مثالیں درج کی گئی ہیں،

وہ سب "آلتمغا" کی ہیں اور اس سے بہ ظاہر یہی مترشح ہوتا ہے کہ اُردو میں یہ لفظ مع مد زیادہ مستعمل رہا ہے۔ آصفیہ میں بہادر شاہ ظفر کا یہ شعر سند آ درج ہے: "آل تمغا غم نے نسلاً بعد نسلٍ لکھ دیا: خوں فشانی ہے یہ اشکِ دیدۂ پُرخوں کی اِرث"۔ ظفر کے شعر میں "آلتمغا" کا ہونا، اس کے مرجح ہونے کی قطعی دلیل ہے۔ ضمنی طور پر یہ وضاحت بھی بے محل نہ ہوگی کہ برہانِ قاطع میں اسے "آل طمغا" لکھا گیا ہے۔ اِس لغت کے ایرانی مرتب ڈاکٹر معین نے اس کے حاشیے میں ایک ترکی کتاب کے حوالے سے لکھا ہے: "التمغا۔ النون تمغا: مہرِ پادشاہانِ ترک کہ با مرکبِ سرخ بر فرمانہا نقش می کردند۔ این فرامین را مخصوصاً "یارلیغ النون تمغا" می نامند"۔ اِس سے "التمغا" کی ترجیح ظاہر ہے۔ مگر اُردو میں (اور فارسی میں بھی) بیش تر "آلتمغا" استعمال کیا گیا ہے۔ اِس کے معنی ہیں: "بخشیدن زمین و جاگیر کسے را نسلاً بعد نسلٍ" (غیاث اللغات)۔

آیندہ (ص ۲۲۰): ک، قف، ع میں اسی طرح ہے یعنی نون سے پہلے ی لکھی ہے، اسی کی مطابقت اختیار کی گئی ہے۔

اَب کی بار (ص ۹۷): ک میں اسی طرح ہے۔ ع میں "اب کے بار" ہے اور اسی بنا پر وضاحت کی ضرورت پیش آئی ہے۔ لفظ "اب کے" یائے مجہول کے ساتھ آتا ہے اور اِس میں کچھ اختلاف نہیں (آصفیہ، امیر اللغات، نور اللغات، سرمایۂ زبانِ اُردو)۔ آصفیہ میں صرف "اب کے" مندرج ہے (یعنی اس میں "اب کی" موجود نہیں): "اب کے (ف) تابع فعل: اِس دفعہ، پھر، دوبارہ، آیندہ، آگے کو، اگلی دفعہ"۔ البتہ نور میں ضروری وضاحت موجود ہے: "اِس لفظ کا استعمال لفظِ مذکر کے ساتھ یائے مجہول سے، اور لفظِ مونث کے ساتھ یائے معروف سے ہے، اور تنہا یائے مجہول کے ساتھ ہے"۔ یہی صحیح صورتِ حال ہے۔ مندرجۂ ذیل مثل امیر اللغات اور نور اللغات میں مندرج ہے اور اِس سے "اب کے" اور "اب کی" کے طریقِ استعمال کی اچھی طرح وضاحت ہو جاتی ہے: "اب کی بات اب کے ہاتھ، جب کی بات جب کے ساتھ"۔ یا جیسے غالب کا یہ شعر: کچھ خرید انہیں ہے اب کے سال؛ کچھ بنایا نہیں ہے اب کی بار [دیوانِ غالب نسخۂ عرشی، طبع اوّل، ص ۱۲۶] ۔ یا جیسے یہ مصرع: اب کے بھی دن بہار کے یوں ہی گزر گئے۔ "اب کی بار" میں لفظ "بار" جس معنی میں آیا ہے اُس معنی میں یہ مونث ہے، اِس بنا پر اسے لازماً مع یائے معروف (اب کی) لکھا جانا چاہیے۔ ک میں اسی طرح لکھا ہوا ہے (اور یہی صورت مرجح بھی ہے) اسی کی مطابقت اختیار کی گئی ہے۔ ہاں مخطوطۂ

گنجِ خوبی میں بھی "اب کی بار" دو جگہ آیا ہے (ص ۴۳، ۱۸۹) اور میراثن نے اسے اپنے قلم سے دونوں جگہ مع یائے معروف (اب کی) لکھا ہے اور اس سے تقطیعت کے ساتھ بات واضح ہوجاتی ہے۔ یہ صراحت بھی بے محل نہ ہوگی کہ کے، فت، ع میں "اب کی بار" ہے، یعنی تینوں ٹکڑوں کو الگ الگ لکھا گیا ہے، اسی کی مطابقت اختیار کی گئی ہے۔ [اضافہ اس ضمیمے کے آخر میں]

اَبُوجَہل (ص ۲۲۳): کے میں ج کے نیچے زیر موجود ہے۔ اصلاً "ابوجَہل" ہے اور امیر اللغات میں بھی اسی طرح مندرج ہے، یعنی ج پر زبر لگا ہوا ہے؛ مگر یہ بھی واقعہ ہے کہ عام اُردو والوں کی زبان سے عام طور پر "ابوجِہل" سُنا گیا ہے (طبقۂ علما سے بحث نہیں) اور کے میں ج کے نیچے جو زیر ہے، وہ اسی عام تلفظ کی نمایندگی کرتا ہے؛ اسی بنا پر میں نے اس کو بدلنا اور اس کی جگہ "صحیح" تلفظ کے تعیّن کو غیر مناسب خیال کیا۔

اَٹھوائی کھٹوائی (ص ۲۲۹): سب نسخوں میں اسی طرح ہے، یعنی پہلا ٹکڑا "اٹھوائی" ہے۔ آصفیہ و نور میں "اٹوائی کھٹوائی" ہے۔ فیلن کے لغت میں بھی صرف "اٹوائی کھٹوائی" ہے، البتہ پلیٹس کے لغت میں "اٹوائی کھٹوائی" اور "اٹھوائی کھٹوائی" دونوں صورتیں ملتی ہیں۔ کے کی مطابقت اختیار کی گئی ہے۔

اَچنبھے (ص ۲۵): م، ن، کے، فت، ع: سب نسخوں میں اس لفظ کا یہی املا ملتا ہے، اسی کی پابندی کی گئی ہے۔ یہ واضح کر دیا جائے کہ اس لفظ کو "اچمبھا" بھی اب لکھا جاتا ہے، لیکن پرانی تحریروں میں عموماً "اچنبھا" ملتا ہے۔ مخطوطۂ گنجِ خوبی میں بھی یہ لفظ کئی جگہ آیا ہے اور ہر جگہ "اچنبھا" ملتا ہے۔ ضمنی طور پر یہ لکھنا بھی بے محل نہ ہوگا کہ آصفیہ میں اس کا املا "اچمبا" یا "اچنبھا" ملتا ہے۔ "اچمبھا" اس میں موجود نہیں۔ اس کے برخلاف امیر اللغات میں صرف "اچمبھا" ہے۔ "اچنبھا" اس لغت میں مندرج نہیں؛ البتہ نور اللغات میں "اچنبھا" اور "اچمبھا" دونوں املا ملتے ہیں۔ ہاں، صاحبِ آصفیہ نے "اچمبا" جو لکھا ہے، تو یہ اگر کتابت کی غلطی نہیں، تو بہ ظاہر درست نہیں معلوم ہوتا۔ "اچمبھا" متعارف املا ہے۔

اَحَدی (ص ۲۲۴): کے اور فت میں اس لفظ پر اعراب موجود نہیں۔ صاحبِ آصفیہ نے اس لفظ کے اصل معنی لکھنے کے بعد مزید لکھا ہے: "مگر اب یہ لفظ بہ سکونِ حائے حطّی، نہایت سست، کاہل، مجہول آدمی کے واسطے مخصوص ہوگیا ہے" اور اس سے واضح طور پر یہ بات نکلتی ہے کہ اصل معنون

میں (یعنی ایک قسم کے سپاہی کے معنی میں) یہ لفظ "اَحَدی" تھا، بعد کو اس کے معنی بدل گئے۔ اِن بدلے ہوئے معنوں میں "اَحْدی" نے رواج پایا۔ چوں کہ اِس عبارت میں یہ لفظ اصل معنوں میں آیا ہے، اس لیے بہ فتحِ اوّل و دوم لکھا گیا ہے۔ [کلیاتِ جعفر زٹلی (مطبوعۂ مطبعِ محمدی دہلی) کے ایک قطعے "دربیانِ نوکری" میں یہ لفظ اصل معنی میں بہ سکونِ حَ آیا ہے: اُمرا و سب ہیں بے خبر، احدی بچائے بے دفر، اسوار پاجی سے بتر، یہ نوکری کا حظ ہے]

اَدھینہ: ص ۳۴۳، ح ⑦۔

اِڑایا: ص ۳۴۷، ح ⑫۔

اِسرار (ص ۲۴۲): ک، میں اعراب موجود نہیں، مگر ف میں الف کے نیچے زیر لگا ہوا ہے۔ آصفیہ، امیر اللغات، نور میں یہ صراحت موجود ہے کہ بھید کے معنی میں "اَسرار" ہے اور یہ اسمِ جمع ہے۔ "آسیب، جن، دیو، پری کا سایہ، بھوت پریت" کے معنوں میں "اِسرار" ہے اور اِن معنوں میں یہ جمع نہیں، واحد ہے۔ صرف ایک حوالہ: "اَسرار: ع، مذکر، نمبر (۱) سِر کی جمع؛ راز، بھید۔ نمبر (۲) آسیب، سایہ ... اِن معنوں میں بالکسر اور بجائے واحد مستعمل ہے" (امیر اللغات)۔ اثر لکھنوی نے فرہنگِ اثر میں اِس لفظ کے ذیل میں یہ بھی لکھا ہے کہ راز اور بھید کے معنی میں "اَسرار" (جو اسمِ جمع ہے) بہ طورِ واحد بھی استعمال کیا گیا ہے اور مثال میں فصاحت لکھنوی کا یہ شعر لکھا ہے: خاصانِ الٰہی ہیں، بجز پنجتنِ پاک؛ معلوم کسی کو نہیں اسرار خدا کا۔ اِس تفصیل کے بعد، اب زیرِ نظر جملے کو دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہاں کچھ ایسی صورت ہے کہ یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ یہ لفظ بھید کے معنی میں آیا ہے اور یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ یہ لفظ آسیب کے اثر کے مفہوم میں آیا ہے۔ میں نے آخری معنی کو ترجیح دی ہے اور اِسی نسبت سے الف کے نیچے زیر لگایا ہے۔ اِس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ ف میں الف کے نیچے زیر ہے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ یہاں مسلسل جس واقعے کا بیان ہے، اُس کا تعلق واضح طور پر کسی اَن دیکھی آسیبی طاقت سے ہے اور یوں جن و پری کے اثرات کا پہلو روشن تر ہے اور اِس اعتبار سے اِس جملے میں "اِسرار" ہی مرجح ٹھہرتا ہے۔

اَسیر (ص ۱۵): م، ن، ک، ف، ع: سب نسخوں میں اِس جملے میں "اسیر" ہے۔ "اسیر" کے معنی ہیں: قیدی۔ اِس عبارت میں جو مفہوم ہے، اُس سے یہ معنی مناسبت نہیں رکھتے۔ ہاں "یسیر" ایک لفظ ہے، جس کے معنی ہیں: "وہ کم سن بچہ انسان کا جس کی ماں مرگئی ہو" (نور) اور اندازہ یہ ہوتا ہے کہ اِسی "یسیر" کو میر امن نے "اسیر" لکھا ہے اور اِس کا مطلب یہ ہے کہ

اُس زمانے میں یہ لفظ اِس طرح مستعمل ہوگا۔ اِس کی توثیق ہوتی ہے اِسی کتاب کے نسخۂ م سے۔ پہلے درویش کے قصّے کے شروع ہی میں جب سوداگر بچّہ اپنے والد کے مرنے کا ذکر کرتا ہے، تو اُس موقعے پر ک میں ایک جملہ ہے: "ایک ہی سال میں والدین قضائے الٰہی سے مرگئے...... ایک بارگی یتیم ہوگیا۔" لیکن م (اور ن) میں آخری جملہ یوں ہے: "ایک بارگی یتیم و اسیر ہوگیا" اور یہاں واضح طور پر "والدین" کی رعایت ملحوظ رکھی گئی ہے اور والد کی نسبت سے "یتیم" اور والدہ کی نسبت سے "اسیر" کے لفظ آئے ہیں اور اِس سے قطعی طور پر یہ بات معلوم ہوجاتی ہے کہ "اسیر" "یسیر" ہی کی بدلی ہوئی صورت ہے۔

اَشرَفی (ص ۱۸): م، ک اور ف میں اِس لفظ پر اعراب موجود نہیں، البتہ ف کی فرہنگ میں اِسے "اَشرَفی" (بہ فتحِ شین) لکھا گیا ہے۔ اصل کے لحاظ سے اِس لفظ میں شین ساکن ہے (شعرا نے اِس طرح نظم بھی کیا ہے) آصفیہ اور نور دونوں میں اِس لفظ کو اِسی طرح (اَشرْفی) لکھا گیا ہے؛ لیکن زبانوں پر یہ لفظ بہ فتحِ دوم ہے۔ امثال میں تو خاص کر شین مفتوح رہتا ہے، جیسے: اَشرَفیاں لٹیں، کوئلوں پر مُہر۔ یا جیسے: گھر میں کوڑی نہیں، نام اَشرَفی لال۔ بعض شاعروں نے اِس طرح نظم بھی کیا ہے: مانگی ہوں منّتیں بھی سو سو کروڑ ڈھب کی؛ دھو دھو روپے اَشرَفی نذریں اٹھائیاں ہوں (انشا۔ کلامِ انشا، ص ۱۴۸)۔ چوری کا ڈر نہیں ہے دیئے شوق سے لگا؛ ڈھیروں روپے اَشرَفیاں رکھی ہیں جا بہ جا (جانؔ صاحب۔ مسدسِ تہنیتِ جشنِ بے نظیر، ص ۱۰)۔ ک میں اِس لفظ پر تو اعراب موجود نہیں، مگر ص ۸۸ پر دو بار یہ لفظ بہ صورتِ جمع آیا ہے اور اِس کا املا "اشرفیئوں" ملتا ہے۔ [ف میں اِن دونوں مقامات پر "اشرَفیئوں" ہے یعنی ف کے نیچے زیر بھی لگا ہوا ہے] اور یہ املا اِس پر دلالت کرتا ہے کہ اِس میں شین کو متحرک رکھا گیا ہے (اَشرَفیوں واحد لفظ "اشرفی" کو اگر اِس پر قیاس کرکے بہ فتحِ شین مانا جائے تو بے جا نہیں ہوگا۔ اِنھی وجوہ سے اِس لفظ کو بہ فتحِ شین ہر جگہ لکھا گیا ہے [یہ لکھا جاچکا ہے کہ ف کی فرہنگ میں بھی "اَشرَفی" ہے]۔

اَصطَبَل (ص ۲۳): ک اور ف میں اِس لفظ پر اعراب موجود نہیں؛ البتہ ف کی فرہنگ میں اِسے بہ فتحِ اوّل و سوم و چہارم (اَصطَبَل) لکھا گیا ہے۔ بہ لحاظِ اصل یہ لفظ بہ کسرِ اوّل و سکونِ چہارم (اِصطَبْل) ہے، لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ اُردو میں اِسے عموماً "اَصطَبَل" کہا جاتا ہے

(شاعری سے بحث نہیں)۔ آصفیہ میں "اَصْطَبَل" ہی لکھا گیا ہے، مؤلف نے وضاحت بھی کردی ہے کہ یہ "روزمرۂ حال کے موافق" ہے۔ نوراللغات میں اسے اصل کے مطابق "اِصْطَبْل" لکھا گیا ہے؛ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے اثر مرحوم نے فرہنگِ اثر میں لکھا ہے: "صحیح یوں ہی ہے جس طرح لکھا گیا ہے اور شاعر بھی زیادہ تر اسی طرح نظم کرتے ہیں، مگر کیا خواص، کیا عوام" بولتے "اَصْطَبَل ہیں بہ فتحِ اوّل و سکونِ صاد و فتحِ طا و با و سکونِ لام"۔ مزید یہ کہ پلیٹس نے بھی اپنے لغت میں اسے اسی طرح یعنی "اِصْطَبْل" "ASTABAL" لکھا ہے۔ فنے کی فرہنگ اور آصفیہ کے اندراج نیز دیگر لغات کے اندراجات کے مطابق اسے بہ فتحِ اوّل و سوم و چہارم لکھا گیا ہے۔

اِصْفِہان: ص ۲۰۰، ح ④ -

اَعلا اَدنا (ص ۱۲): ک میں یہاں "اعلیٰ ادنیٰ" ہے، مگر ص ۱۳۰ پر "ادنا اعلا" ہے، اسی طرح ص ۱۸۷ پر "ادنا خانہ زاد" ہے۔ اس سلسلے میں یہ بات خاص طور پر پیشِ نظر رہنا چاہیے کہ ایسے لفظ جن کے آخر میں عربی کے لحاظ سے الف کو بہ صورتِ ی بھی لکھا جاتا تھا، اردو میں وہ دونوں طرح لکھے جاتے ہیں (مثلاً مولیٰ، مولا)۔ خود میر امّن کی تحریر میں املا کا یہ اختلاف ملتا ہے، مگر "اعلا" اور "ادنا" یہ دو لفظ ایسے ہیں کہ مخطوطۂ گنج خوبی میں جہاں بھی یہ آئے ہیں، میر امّن نے ان کو (اپنے قلم سے) ہر جگہ "اعلا" اور "ادنا" لکھا ہے، کسی ایک مقام پر بھی مع "ی" (ادنیٰ اور اعلیٰ) نہیں لکھا گیا ہے، مثلاً: ادنا: ص ۳۷، ۵۵، ۱۰۱، ۱۱۲، ۱۸۵، ۲۳۵، ۲۰۲ - ادنا آدمی کو اعلا کرنے: ۲۰۶ - حضورِ اعلا: ۱۰۷، ۲۸۰ - دیوانِ اعلا: ۱۲۱، ۱۲۱، ۳۲۱، ۳۲۴، ۳۲۸ - ادنا اعلا: ۹، ۱۰، ۱۶، ۱۰۳، ۱۱۵، ۱۲۰، ۱۲۹، ۱۳۰، ۱۴۷، ۱۴۸، ۱۸۴، ۲۵۰، ۲۷۴ - مطلب یہ ہے کہ میر امّن کی اپنی تحریر میں ان دونوں لفظوں کے املا میں اختلاف نہیں پایا جاتا، انھوں نے اپنے قلم سے ہر جگہ ان لفظوں کو ایک ہی طرح لکھا ہے۔ اس سلسلے میں یہ بھی پیشِ نظر رہے کہ لفظ "معلّا" دو جگہ اس کتاب میں آیا ہے اور دونوں جگہ ک میں اس کا یہی املا ملتا ہے: "اردوے معلّا"۔ ان وجوہ سے اس کتاب میں ہر جگہ "ادنا" اور "اعلا" اور "معلّا" لکھا گیا ہے۔ نیز اسی ضمیمے میں دیکھیے "مصلّا" اور "معلّا" کی بحث۔

اَکَتّت (ع کا تیسرا مفتوح): ص ۲۷۲، حاشیہ ㉘ -

اِستَتّھی (ص ۸): م، ن، ک، ت، ع: سب نسخوں میں اس مقام پر اس لفظ کا یہی املا ملتا ہے [یعنی ت پر تشدید ہے اور ہاے مخلوط ت کے بعد ہے]۔ یہ لفظ اس کتاب میں کئی جگہ آیا ہے اور ک میں

اِس لفظ کے املا میں اُن مقامات پر اختلاف ملتا ہے۔ مثلاً ص ۱۴۳ پر "اکھٹی" آیا ہے، ک میں اِس مقام پر "اِکھٹھی" ہے (ک ص ۱۴۱) یعنی تشدید موجود نہیں اور دو ہائے مخلوط ہیں۔ [ف میں "اِکھٹھی" ہے یعنی دو ھ ہیں اور تشدید بھی ہے]۔ اِس کے بعد ص ۱۵۰ پر "اِکھٹّا" آیا ہے اور ک میں وہاں "اِکٹھا" ہے (ک ۱۴۹) یعنی صرف ایک ھ ہے اور تشدید موجود نہیں [ف میں بھی اِس مقام پر "اکٹھا" ہے]۔ ص ۱۹۹ پر بھی یہ لفظ ہے اور وہاں ک میں "اِکٹھا" ہے (ک ص ۱۹۹) یعنی صرف ایک ھ ہے اور تشدید موجود نہیں [ف میں "اِکٹّھا" ہے یعنی تشدید موجود ہے]۔ یہ لفظ گنجِ خوبی میں بھی موجود ہے اور مخطوطۂ گنجِ خوبی میں میر امّن نے اپنے قلم سے اِسے ہر جگہ صرف ایک ھ کے ساتھ لکھا ہے: "اور نہیں فوج اکٹھی ہوتی مگر مال سے" (ص ۲۲۳)۔ دوسری بار اِسی صفحے پر شعر میں آیا ہے: "تمام ملک میسّر ہو تو ہو لشکر سے ؛ یہ فوج ہووے اکٹھی خزانہ و زر سے"۔ اِسی مخطوطے میں اِسی صفحے پر "اکٹھا" بھی آیا ہے: "سلطان مال ہی اکٹھا کرنے میں مشغول رہے"۔ یہاں بھی ایک ھ ہے، مگر یہاں تشدید موجود نہیں۔ لغات میں یہ لفظ دو طرح ملتا ہے: اکھٹّا۔ اکٹّھا۔ بیش تر لغات میں "اکھٹّا" ہے [فرہنگِ آصفیہ، نور اللغات، نفس اللغۃ، امیر اللغات] البتّہ فرہنگِ شفق میں "اکٹّھا" ہے: "اِکٹّھا ہونا: بالکسر و فتح کاف عربی و تشدید تائے ہندی مخلوط الہا...... ؛ یہ کھلا آتش عناصر سے دلِ دیوانہ کو ؛ چار دیوار یں اکٹھا ہو کے زندان ہو گئیں"۔ آثر لکھنوی مرحوم نے فرہنگِ اثر میں لکھا ہے کہ "تحقیق یہ بتاتی ہے کہ دہلی میں "اکھٹّا" ہے اور لکھنؤ میں "اکٹّھا" (ص ۱۵۰)۔ دہلی و لکھنؤ کی یہ تخصیص تو درست نہیں، البتّہ یہ بات صحیح ہے کہ اِس لفظ کو دہلی و لکھنؤ دونوں جگہ دونوں طرح لکھا جاتا رہا ہے۔ پلیٹس نے اپنے لغت میں "اکٹّھا" اور "اکھٹّا" دونوں صورتیں لکھی ہیں، مگر مثالوں میں ہر جگہ "اکھٹّا" (مع تشدید) لکھا ہے اور فیلن نے بھی اپنے لغت میں مرجّح املا "اکھٹّا" قرار دیا ہے۔ چوں کہ ک میں اِس لفظ کا املا دو طرح ملتا ہے، اِس بنا پر میں نے اُس املا کو ترجیح دی ہے جو مخطوطۂ گنجِ خوبی میں ہے اور اِس بنا پر ہر جگہ "اِکٹّھا"، "اِکٹّھی" اور "اِکٹّھے" لکھا گیا ہے۔ ک میں ہر جگہ الف کے نیچے زیر ملتا ہے اور مخطوطۂ گنجِ خوبی میں بھی الف مکسور ملتا ہے؛ اِسی وجہ سے الف کے نیچے التزام کے ساتھ زیر لگایا گیا ہے۔ ایک بات اور: ک اور ف میں اِس مقام پر تشدید موجود ہے، مگر جیسی کہ اوپر صراحت کی جا چکی ہے، ک میں ص ۱۴۱ اور ص ۱۴۹ پر یہ لفظ تشدید کے بغیر ہیں۔ (ہمارے نسخے میں صفحات ۱۴۳، ۱۵۰)۔ فیلن اور پلیٹس کے لغات میں "اکٹھا" کو تشدید کے بغیر بھی لکھا گیا ہے، مگر

فیلن نے یہ صراحت بھی کردی ہے کہ تشدید کے بغیر (اکٹھا) گنوارو تلفظ ہے۔ اُردو لغات میں التزام کے ساتھ اِس کو مع تشدید لکھا گیا ہے اور ک میں پہلی بار جب یہ لفظ آیا ہے، تو وہاں بھی مع تشدید ہے، اِسی بنا پر "اکٹّھا"، "اکٹّھے" اور "اکٹّھی" کو ہر جگہ مع تشدید لکھا گیا ہے (میر اَمّن کی تحریر میں بھی دو جگہ تشدید موجود ہے)۔

اَگّیا (بروزن کردیا): ص ۳۵۰، ح ①

اُلَش (ص ۸۸): لغات میں یہ صراحت کردی گئی ہے کہ یہ ترکی لفظ ہے اور بہ ضمتین (اُلُش) ہے، مگر ک میں لام کے اوپر زبر لگا ہوا ہے۔ ف کے آخر میں جو طویل فرہنگ شامل ہے، اُس میں بھی اِسے اِسی طرح (ULASH) لکھا گیا ہے۔ آصفیہ و نور میں تو "اُلُش" ہے، مگر پلیٹس نے "اُلُش" اور "اُلَش" دونوں طرح لکھا ہے اور فیلن کے لغت میں صرف بہ فتحِ دوم "اُلَش" ملتا ہے۔ اِس کا واضح طور پر مطلب یہ ہے کہ اُردو میں اِس کا تلفظ "اُلَش" بھی کیا گیا ہے۔ اور ک اور ف میں جو لام پر زبر ہے، وہ اِسی تلفظ کی نمایندگی کرتا ہے۔ ک کی مطابقت اختیار کی گئی ہے۔

اُولُو العَزم (ص ۶۸): ک، ف، ع میں یہی املا ہے۔ بہ لحاظِ اصل (یعنی عربی کے لحاظ سے) "اولوالعزم" ہونا چاہیے (المنجد)۔ اُردو لغات کا احوال یہ ہے کہ آصفیہ میں یہ لفظ الف مع واو اور الف مع لام، دونوں فصلوں میں مندرج ہے، یعنی "الوالعزم" اور "اولوالعزم" دونوں طرح درجِ لغت کیا گیا ہے۔ مطلب اِس کا یہ ہوا کہ مؤلف کی رائے میں یہ لفظ دونوں طرح لکھا جا سکتا ہے۔ البتہ دونوں مقامات پر کسی طرح کی صراحت نہیں کی گئی ہے۔ امیر اللغات میں الف مع لام کی فصل میں "الوالعزم" ہے، الف مع واو کی فصل میں "اولوالعزم" اِس میں موجود نہیں، یعنی مؤلف نے اُردو میں اِس کا مرجّح املا پہلے واو کے بغیر مانا ہے (صراحت یہاں بھی نہیں ملتی)۔ اِس کے برخلاف نور میں صرف "اولوالعزم" ہے، یعنی مؤلفِ نور نے اِس لفظ کا املا اصل کے مطابق (دو واو کے ساتھ) صحیح مانا ہے۔ پلیٹس نے اپنے لغت میں یہ صراحت کی ہے کہ اصلاً "اولوالعزم" ہے، چوں کہ پہلا واو تلفظ میں شامل نہیں، یوں اُردو میں اِسے پہلے واو کے بغیر لکھا جانے لگا۔ بہ ہر صورت لغات کے اندراجات سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ اُردو میں اِسے "اولوالعزم" اور "الوالعزم" دونوں طرح لکھا جا سکتا ہے۔ ک اور ف کی مطابقت اختیار کی گئی ہے اور اِسے "الوالعزم" لکھا گیا ہے۔ ہاں یہ صراحت بھی ضروری ہے کہ یہ لفظ گنجِ خوبی میں موجود ہے اور میر اَمّن نے اِسے اپنے قلم سے

"اُولُوالعزم" لکھا ہے [مخطوطۂ گنجِ خوبی، گیارھواں باب] اور یوں یہی املا اس کتاب میں مُرجّح ہے۔

اَمّا (ص ۱۶۴) : دیکھیے "مّا"۔

اُمَرا (ص ۱۲) : کے اور فے دونوں میں الف کے اوپر پیش تو لگا ہوا ہے، مگر میم پر جزم یا زبر موجود نہیں، لیکن کے میں ص ۹۱ پر بھی یہ لفظ ہے اور وہاں "اُمَرا" ہے یعنی الف کے اوپر پیش بنا ہوا ہے اور میم کے اوپر زبر لگا ہوا ہے۔ اور فے کی فرہنگ میں بھی "اُمَرا" مندرج ہے بہ فتحِ میم۔ اس سلسلے میں لفظ "غربا" کو بھی پیشِ نظر رکھا جا سکتا ہے کہ اس لفظ کو کے میں ہر جگہ بہ فتحِ را (غُرَبا) لکھا گیا ہے۔ اسی بنا پر لفظ "امرا" کو بھی ہر جگہ بہ ضمِ اوّل و فتحِ دوم (اُمَرا) لکھا گیا ہے، خواہ وہ ترکیب کے بغیر آیا ہو (جس طرح یہاں آیا ہے) یا وہ مع ترکیب آیا ہو، مثلاً: اُمَرائے دولت۔

اُمَراؤں (ص ۹) : کے اور فے میں الف پر پیش تو موجود ہے مگر میم پر حرکت یا جزم موجود نہیں۔ یہ لفظ اس کے بعد ص ۱۶ پر بھی آیا ہے اور وہاں بھی کے اور فے میں میم پر حرکت یا جزم کچھ بھی نہیں۔ ص ۵۰ پر بھی یہ لفظ آیا ہے اور وہاں کے میں الف پر پیش اور میم پر زبر واضح طور پر موجود ہے۔ آصفیہ و نور میں یہ لفظ موجود نہیں، البتہ فیلن نے اپنے لغت میں اسے بہ سکونِ میم درج کیا ہے۔ (بہ ظاہر اسی طرح بہتر معلوم ہوتا ہے) مگر میں نے کے کی مطابقت کو ترجیح دی ہے اور ہر جگہ اسے بہ فتحِ میم لکھا ہے۔

اِملاک (ص ۳۷) : "املاک" جمع ہے اور اس لحاظ سے الف پر زبر آنا چاہیے؛ مگر کے میں الف کے نیچے زیر لگا ہوا ہے۔ آصفیہ میں "اَملاک" ہے یعنی الف کے اوپر زبر بھی لگا ہوا ہے اور اس کے نیچے زیر بھی ہے، مگر کسی صراحت کے بغیر۔ البتہ امیر مینائی نے امیر اللغات میں اس کی وضاحت کر دی ہے: "اَملاک: مِلک کی جمع۔ جائداد" لکھ کر آخر میں لکھا ہے: "اور بول چال میں واحد کی جگہ بہ تانیث و بہ کسر بھی مستعمل ہے"۔ آخری ٹکڑے سے واضح طور پر معلوم ہو جاتا ہے کہ کے اور فے میں الف کے نیچے جو زیر ہے، وہ بجائے خود ٹھیک ہے اور بول چال کی نمایندگی کرتا ہے۔ اسی کی پابندی کی گئی ہے۔

اَمن و اَمان : ص ۲۷۶، حاشیہ ⑦۔

اُمّید (ص ۱۱) : یہ لفظ مع میمِ مشدّد (اُمّید) اور بغیر تشدیدِ میم (اُمید) دونوں طرح صحیح اور مستعمل ہے۔ اسی طرح بہ یائے مجہول (اُمیٖد) بھی درست ہے اور مع یائے معروف (امید) بھی صحیح ہے۔

مؤلفِ آصفیہ نے لکھا ہے : " امّید ... بہ یاے معروف و مجہول و بالتّشدید و بلاتشدید ہر دو طرح درست ہے "۔ ک، اور م میں میم پر تشدید لگی ہوئی ہے اور ی پر مجہول کی علامت موجود ہے (اُمّیْد) ک میں جہاں بھی یہ لفظ آیا ہے، اسی طرح ملتا ہے۔ مخطوطۂ گنجِ خوبی میں صورتِ حال یہ ہے کہ سب سے پہلے یہ لفظ ص ۹۳ پر آیا ہے اور وہاں (ک کے مطابق) بہ یاے مجہول " امیْد " ہی لکھا ہوا ہے؛ اِس کے بعد دوسرے مقامات پر اس کا املا " امَید " ملتا ہے (یعنی ی پر ماقبل مفتوح کی علامت ہے) امَید ص ۱۲۹، ۲۹۷، امَیدوار ص ۳۳۴۔ اب یا تو یہ فرض کرلیا جائے کہ خود میرامّن اِس لفظ کے تلفظ کے سلسلے میں کسی ایک صورت کے قائل نہیں تھے؛ یا پھر یہ مان لیا جائے کہ یاے مجہول اور یاے لین کی علامتوں کے استعمال میں بے احتیاطی ہوئی ہے [ایسی بے احتیاطیوں کی کئی مثالیں اِس مخطوطے میں موجود ہیں]۔ بہ ہر صورت، چوں کہ ک اور م میں ہر جگہ یہ لفظ مع یاے مجہول ہے اور مخطوطۂ گنجِ خوبی میں بھی یہ اِس طرح ملتا ہے؛ اِس بنا پر اسی صورت کو مرجّح مانا گیا ہے اور اِس لفظ کو اِس کتاب میں ہر جگہ مع میم مشدّد و یاے مجہول لکھا گیا ہے۔ ضمنی طور پر یہ لکھنا بھی بے محل نہ ہوگا کہ اِس لفظ کو مع یاے مجہول نظم بھی کیا گیا ہے : عشق تاثیر سے نومید نہیں ؛ جاں سپاری شجرِ بید نہیں ؛؛ رازِ معشوق نہ رسوا ہوجائے ؛ ورنہ مرجانے میں کچھ بھید نہیں ؛؛ کہتے ہیں جیتے ہیں امّید پہ لوگ ؛ ہم کو جینے کی بھی امید نہیں (غالب) یہ لکھنا بھی فائدے سے خالی نہ ہوگا کہ فارسی میں بھی " آرزو کی طرح " یہ مع میم مشدّد و مع میم مخفّف اور بہ یاے مجہول و بہ یاے معروف، دونوں طرح صحیح ہے۔ اصلاً تو اِس لفظ میں ی مجہول ہی ہے، لیکن اسے معروف بھی پڑھا گیا ہے : " امید : بہ ضمِّ اوّل و کسرِ میم و یاے مجہول۔ و گاہے میم مشدّد کنند۔ و مجہول را معروف خواندن در اکثر محل درست باشد۔ از مدار و موید۔ " برہانِ قاطع میں یہ لفظ موجود نہیں تھا؛ اِس کتاب کے فاضل ایرانی مرتّب ڈاکٹر محمد معین نے حاشیے پر اِس کا اضافہ کیا ہے۔ اُن کی تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ قدیم فارسی میں اِس لفظ میں ی مجہول ہی تھی۔ فاضل مرتّب نے یاے مجہول کی علامت (^) کی مدد سے اِس کی وضاحت اِس طرح کی ہے :

" پہلوی : ŏ mê r ۔ پازند : ŏ mêdh "۔

اِنْدَر (ص ۱۵۸) : ک اور ف میں الف کے نیچے زیر ہے، مگر دال خالی ہے، یعنی اِس پر حرکت یا جزم موجود نہیں۔ آصفیہ میں " اِنْدَر " ہے (بہ فتحِ دال)۔ امیر اللّغات میں بھی " اِنْدَر " ہے، مگر اُس میں یہ وضاحت بھی موجود ہے کہ یہ سنسکرت کا لفظ ہے اور (وہاں) اِس کا صحیح

تلفظ بہ سکونِ دال ہے۔ اِس سے وضاحت ہو جاتی ہے کہ "اِنْدَر" کو اُردو والے "اِندر" کہتے ہیں۔ اِس لفظ کے ذیل میں انشا کا ایک شعر، اور پھر "اِندر کا اکھاڑا" کے ذیل میں قلق اور جانصاحب کا ایک ایک شعر درج کیا گیا ہے۔ اِن سب شعروں میں "اِنْدَر" (بہ فتحِ دال) آیا ہے اور اِس طرح اُردو میں اِس لفظ کے استعمال کی پوری طرح وضاحت ہو جاتی ہے۔ اِسی بنا پر اِس لفظ کو بہ فتحِ دال لکھا گیا ہے۔

اَن گنا جھینا (ص ۱۸۶): ک اور ف میں اِس لفظ پر اعراب موجود نہیں۔ ہگرٹ کی فرہنگ میں "اَن گِنا" (بہ کسرِ کاف) ہے۔ فیلن اور پلیٹس کے لغات میں بھی بہ کسرِ کاف ملتا ہے۔ آصفیہ میں "اَن گَنا" (بہ فتحِ کاف) ہے اور مولف نے یوں وضاحت کی ہے: "صحیح بہ کسرِ کافِ فارسی، مستعمل بہ فتح"۔ "اَن گَنا برس" کو بھی اِس میں بہ فتحِ کاف لکھا گیا ہے۔ نور میں یہ لفظ موجود ہے مگر اعراب کے بغیر۔ امیر اللغات میں "اَنگنا جھینا" اعراب کے بغیر مندرج ہے، مگر "اَنگنا برس" میں کاف کے نیچے زیر لگا ہوا ہے۔ اِس کے برخلاف جلال کے لغت سرمایۂ زبانِ اُردو میں "اَنگنا برس" (بہ فتحِ کاف) اور "اَنگنا جھینا" (بہ کسرِ کاف) ہے۔ اثر لکھنوی مرحوم نے فرہنگِ اثر میں اِس اندراج پر گفتگو کرتے ہوئے لکھا ہے: "صحیح بہ کسر رسوم ہے، مگر عورتیں بالفتح بولتی ہیں اور یہی فصیح ہے"۔ اِس سے آصفیہ کے اندراج کی مکمل طور پر تائید ہوتی ہے۔ میں نے آصفیہ کے اندراج کو ترجیح دی ہے اور اُسی کے مطابق کاف پر زبر لگایا ہے۔ ہاں اِس مرکب لفظ میں سب نسخوں میں اور محولہ بالا سب لغات میں "جھینا" (مع الف) ہے۔

اَنگوچھا (ص ۱۰۷): "اَنگوچھا" (کاف پر پیش اور واو مجہول) اور "اَنگَچھا" (بہ فتحِ کاف) دونوں طرح درست ہے۔ آصفیہ میں کاف پر اعراب موجود نہیں اور امیر اللغات میں اِسے صرف "اَنگوچھا" (بہ فتحِ کاف) لکھا گیا ہے، مگر فیلن اور پلیٹس کے لغات میں اِس کی دونوں صورتیں موجود ہیں۔ ف میں اِس لفظ پر اعراب موجود نہیں، مگر اِس کی فرہنگ میں اِسے مع واوِ معروف درج کیا گیا ہے۔ اِس کے برخلاف ک میں "اَنگوچھا" ہے یعنی واو کے اوپر علامتِ مجہول موجود ہے۔ یہ لفظ ص ۱۵۱ پر بھی آیا ہے اور وہاں بھی ک میں واو پر علامتِ مجہول موجود ہے۔ ک کی مطابقت اختیار کی گئی ہے۔

اَنْشد (ص ۱۶): م، ن اور ک میں "اَنشد" ہے۔ ف اور ع میں "آنشد" ہے۔ ک کی مطابقت اختیار کی گئی ہے۔ یہ لفظ دونوں طرح مستعمل رہا ہے۔ آصفیہ میں اِس لفظ کی دونوں صورتیں

موجود ہیں: "آنَنْد۔ یا اَنَنْد"؛ البتہ اِس لفظ سے مرکب جملہ کلمات میں اِسے "آنند" لکھا گیا ہے [مثلاً: آنند سے رہنا، آنند بدھاوا وغیرہ] لیکن "آنند کے تار بجانا" کے ذیل میں سنداً جو شاہ نصیر کا قطعہ لکھا گیا ہے، اُس میں "انند" آیا ہے: "کہ غنچے بین کے تونبے ہیں شاخِ گل سے مِیں: بجا رہی ہیں عنادل بہم انند کے تار"۔ امیر مینائی نے امیر اللغات میں صرف "انند" درج کیا ہے اور اِس کے حاشیے میں لکھا ہے: "آنند سے انند ہوگیا"۔ انھوں نے سند میں ایک تو شاہ نصیر کا وہی قطعہ لکھا ہے جو آصفیہ میں ہے (اور جس کا متعلقہ شعر اوپر نقل کیا گیا ہے) اور ایک یہ شعر نکہت (دہلوی) کا لکھا ہے: "کہیں ہے نغمۂ قانون و بین و چنگ و ستار: بجا رہے ہیں ہر اک بزم میں انند کے تار" واقعہ یہ ہے کہ یہ لفظ دونوں صورتوں میں شعرا کے یہاں ملتا ہے۔ "انند" کی تو دو مثالیں نقل کی گئیں، "آنند" کی سند میں میر سوز کا یہ شعر پیش کیا جاسکتا ہے: "جب تلک آنکھیں کھلی ہیں، دُکھ یہ دیکھیں گے یار: مُند گئیں جب انکھڑیاں اے سوز سب آنند ہیں"۔

اَنُوٹھی (ص ۱۵۹): ک اور ف دونوں میں اِس لفظ کو مع واوِ معروف لکھا گیا ہے۔ یہ بات لکھی جاچکی ہے کہ ک میں واوِ مجہول کی پہچان یہ ہے کہ اُس پر علامتِ مجہول ضرور ہوتی ہے اور واوِ معروف کو خالی چھوڑ دیا گیا ہے۔ اِس طریق کا اوّل سے آخر تک التزام ملتا ہے اور یہاں بھی واو خالی ہے؛ اِس سے یہ معلوم ہوجاتا ہے کہ یہاں واو معروف ہے۔ ف کی فرہنگ میں اِسے ANŪTHI لکھا گیا ہے، اور اِس طرح مکمل طور پر تعیّن ہوجاتا ہے۔ اِس لفظ کے ذیل میں یہ صراحت یوں ضروری سمجھی گئی کہ فیلن کے لغت میں تو اِسے صرف مع واوِ معروف لکھا گیا ہے، مگر پلیٹس کے لغت میں اِسے مع واوِ معروف اور مع واوِ مجہول، دونوں طرح درج کیا گیا ہے، اور یوں اختلاف کی گنجائش نکل آئی ہے۔ آصفیہ، نور اور امیر اللغات میں اِس لفظ کے ذیل میں معروف و مجہول کی صراحت نہیں ملتی، یوں بھی یہاں صراحت کو ضروری سمجھا گیا۔

اوپری: ص ۳۲۵، ح ④

بادشاہ (ص ۶): ک، ف، ع، تینوں نسخوں میں کہیں "بادشاہ" ہے، کہیں "پادشاہ"؛ یہی صورت "بادشاہت" اور "پادشاہت" نیز "بادشاہی" اور "پادشاہی" کی ہے۔ مثلاً ص ۶ پر ایک جملہ ہے: "میرے بزرگ ہمایوں بادشاہ کے عہد سے ہر ایک باد[شا]ہ کی رکاب میں......." ک میں یہ یوں ہے: "ہمایوں بادشاہ کے عہد سے ہر ایک پادشاہ کی رکاب میں" (ک ص ۳)۔ اِس نسخے

کے شروع کے سولہ صفحوں کا جو میں نے جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ ان ۱۶ صفحوں میں (جہاں تک کتاب کا ابتدائی حصّہ ختم ہو جاتا ہے اور پہلے درویش کی سیر شروع ہوتی ہے) بادشاہ' یا بادشاہت یا بادشاہی چھبیس جگہ تو بؔ کے ساتھ لکھے ہوئے ہیں اور چودہ جگہ پؔ کے ساتھ؛ اِس سے تناسب کا اندازہ بہ خوبی کیا جا سکتا ہے۔ مخطوطۂ گنجِ خوبی کا احوال بھی ایسا ہی ہے۔ اِس میں بھی میر امّن نے کہیں "بادشاہ" لکھا ہے اور کہیں "پادشاہ"۔ مثال کے طور پر ص ۲۳ پر ایک ہی جملے میں یہ دونوں شکلیں ملتی ہیں: "ایک امیر پادشاہ کے روبرو دست بستہ کھڑا تھا اور بادشاہ کسو مہم کی اُس سے مصلحت کر رہے تھے" (ص ۲۳)۔ نیز بہ طورِ مثال عرض کروں کہ اسی صفحۂ ۲۳ پر یہ لفظ چار بار آیا ہے؛ دو جگہ "بادشاہ" لکھا ہوا ہے اور دو جگہ "پادشاہ"۔ فارسی کا اصل لفظ "پادشاہ" ہے۔ ہندستان میں پؔ کی جگہ بؔ سے بھی مستعمل ہو گیا۔ خانِ آرزو نے اپنے لغت چراغِ ہدایت میں اِس طرف توجہ دلائی تھی: "پادشاہ: بہ بائے فارسی ... و این کہ در ہندستان بہ بائے تازی شہرت دارد، ظاہرا از جہتِ استکراہِ حرفِ اوّل از کلمۂ مذکور کہ بہ زبانِ ہندی قبیح است" (چراغِ ہدایت)۔ یہی بات مولّفِ نور اللغات نے لکھی ہے۔ "بادشاہ" کے ذیل میں انھوں نے لکھا ہے: "یہ لفظ "پادشاہ" کا مخفّف ہے ... یہ لفظ بائے فارسی سے صحیح ہے، لیکن اِس وجہ سے کہ بائے فارسی سے جزوِ اوّل بہ معنی ریح ہے، عموماً زبانوں پر بادشاہ ہے"۔ صاحبِ آصفیہ نے بھی اُردو میں مستعملِ عام لفظ "بادشاہ" کو مانا ہے۔ اور یہ واقعہ ہے کہ اُردو میں عموماً "بادشاہ"، "بادشاہت" اور "بادشاہی" استعمال میں رہے ہیں۔ چوں کہ خود میر امّن نے اِس لفظ کو دونوں طرح لکھا ہے؛ اور چوں کہ کے میں بادشاہ یا بادشاہت یا بادشاہی بؔ کے ساتھ بیش تر ملتے ہیں؛ اِس بنا پر مستعملِ عام صورت "بادشاہ" کو ہر جگہ مرجّح سمجھا گیا ہے۔ اِسی طرح "بادشاہت" اور "بادشاہی"۔ ہاں ن میں اکثر و بیش تر "پادشاہ" اور "پادشاہت" ہے۔

بارِ خدایا (ص ۱۲۲): ک: بارِ خدایا۔ ف: بارِ خدایا۔ ع: بارے خدایا۔ (یہ لفظ اِس سے پہلے ص ۱۰۱ پر بھی آیا ہے)۔ کے میں دونوں جگہ اضافت کا زیر موجود نہیں، جب کہ ک میں اِس کا التزام ملتا ہے۔ "بار خدا" گنجینے میں دونوں طرح آیا ہے، یعنی مع اضافت "بارِ خدا" اور بغیر اضافت "بار خدا"۔ آصفیہ میں "بار خدا" ہے مگر پلیٹس نے "بار خدا" اور "بارِ خدا"، "بار خدایا" اور "بارِ خدایا" دونوں طرح لکھا ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ مولانا امتیاز علی خاں عرشی (مرحوم) نے ایک بار مثنوی سحر البیان کے ایک شعر کے سلسلے میں یہ ہدایت کی تھی کہ "بار الٰہ" اضافت کے بغیر لکھنا چاہیے۔ اِس

کی تائید ہوتی ہے برہانِ قاطع کے اِس اندراج سے : "بارِ خدا، حق تعالیٰ را گویند ... و بارِ خدایا یعنی اے خدائے بزرگ"۔ یعنی اِس مرکب میں "بار" کلمۂ صفت ہے "بہ معنیِ بزرگی و رفعت و شان و شوکت" (برہانِ قاطع) قواعد کے لحاظ سے "بارِ خدا" مرکبِ مقلوب ہوا اور ترکیبِ مقلوب میں اضافت کا زیر باقی نہیں رہتا۔ اِس بنا پر اِس کلمے کی مرجّح صورت "بار خدا" اور "بار خدایا" ہوگی اضافت کے بغیر۔ ["بار الٰہ" اور "بار الہا" کو بھی اسی پر قیاس کیا جاسکتا ہے۔] ہاں یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ مخطوطۂ گنجِ خوبی میں بہت سے مقامات پر "بار خدا" آیا ہے اور کسی ایک جگہ بھی ر کے نیچے اضافت کا زیر موجود نہیں۔

بارَہُوں (ص ۱۰۷) : ن، ک : بارہوں۔ ف، ع : بارھوں۔ گیارہ سے اٹھارہ تک کی گنتیوں کے آخر میں ہائے ملفوظ ہے۔ اِن کو لکھا بھی اِسی طرح جاتا ہے اور اِسی طرح بولا جاتا ہے۔ جب یہ گنتیاں اعدادِ ترتیبی یا اعدادِ استغراقی میں تبدیل ہوتی ہیں تو آخر کی ہائے ملفوظ، ہائے مخلوط سے بدل جاتی ہے، یعنی : بارہ، بارھویں، بارھواں، بارھویں (وغیرہ)۔ اعدادِ استغراقی (بارھوں، تیرھوں وغیرہ) اب عموماً اِسی طرح مستعمل ہیں، مگر اساتذہ نے اِن کو مع ہائے ملفوظ بھی استعمال کیا ہے۔ بعض مثالوں سے اِس کی وضاحت ہوسکے گی : اے رشک! آنکھی کا بلبلِ بستانِ مدح ہوں ، جو بارَہوں ہیں گلشنِ خیر البشر کے پھول [نور اللغات۔ بہ ذیلِ "بارہ"]۔ ہیں وہ جو بارَہوں برجِ چرخ کو جن سے ہے عروج ، حکم میں اُن کے ہیں زباں، آتش و آب و خاک و باد (انشا)۔ کلامِ انشا ص (۳۰)۔ چودَہوں علم دسبِ اعلان و ذکا و دانش ، فی المثل ہووین ہم یہ بھی اگر بیسوں ایک۔ تو بھی حیدر کی ثنا کر نہ سکیں کچھ، گو ہوں ، بارَہوں برج یہ اور آٹھ پہر بیسوں ایک (ایضاً ص ۱۴۳)۔ اِن مثالوں سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ یہ اعدادِ استغراقی مع ہائے ہوز بھی مستعمل رہے ہیں۔ ک میں "بارہوں" لکھا ہوا ہے اور اِس نسخے میں اِس کا التزام ملتا ہے کہ ہائے مخلوط کو دو چشمی صورت میں لکھا جائے اور ہائے ملفوظ کو اُس کی متعارف شکل میں اور اِس طرح یہ بات متعیّن ہوجاتی ہے کہ اِس مقام پر "بارَہُوں" لکھا گیا ہے۔ ف میں (اور اُس کی تقلید میں) ع میں "بارھوں" ہے، مگر املا کے معاملے میں نسخۂ ف پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا، کیوں کہ نسخ ٹائپ کی چھپائی کے سبب سے اُس میں وہ التزامات برقرار نہیں رہے ہیں جو نستعلیق ٹائپ میں برقرار رہ سکے ہیں اور نسخۂ ک نستعلیق ٹائپ میں ہے۔ اِسی بنا پر یہاں ک کے املا کو (حسبِ معمول) ترجیح دی گئی ہے۔ ["بارَہُوں" کے

استعمال کی مثالیں موجود ہیں" اور اِن سے تائید کا فائدہ حاصل ہوتا ہے] اِسی ضمیمے میں لفظ "سرہانے" کے ذیل میں یہ بحث آچکی ہے کہ میرامن نے اسے "سرھانے" کے بجائے "سرہانے" لکھا ہے۔ وہی صورت اِس "بارہوں" کی ہے۔ جب تک اِس کے خلاف کوئی شہادت نہ ملے، اُس وقت تک "بارہوں" ہی کو ترجیح حاصل رہے گی۔ اِس کی توثیق یوں بھی ہوتی ہے کہ ① ص ۱۷۷ پر "بارہوں محل" آیا ہے اور کے میں وہاں بھی "بارہوں" مع ہائے ہوز ہے ② ص ۱۷۹ پر "گیارہویں روز" ہے اور وہاں بھی کے میں "گیارہویں" مع ہائے ہوز (اور مع یائے مخلوط) ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُس زمانے میں اعدادِ ترتیبی یا استغراقی مع ہائے مخلوط اور مع ہائے ملفوظ دونوں طرح مستعمل رہے ہیں؛ اور اِس اعتبار سے دونوں املا بجائے خود درست اور صحیح مانے جائیں گے۔ چوں کہ یہاں کے میں "بارہوں" ہے، اِس لیے اِس مقام پر اِسی کو ترجیح دی گئی ہے۔ اِس کے برخلاف نسخے میں ص ۳۴ پر ایک جملہ ہے: "جیسے چودھویں رات کے چاند کو گہن لگتا ہے" اور ص ۴۷ پر ایک اور جملہ ہے: "وہ بڑی دروازے سے جیسے چودھویں رات کا چاند...... روش پر آکر کھڑی ہوئی"۔ اِن دونوں مقامات پر کے میں "چودھویں" (مع ہائے مخلوط) ہے۔ اِن دونوں مقامات پر اِسی املا کو برقرار رکھا گیا ہے۔ اور وجہ یہی ہے کہ یہ الفاظ دونوں طرح مستعمل رہے ہیں اور املا کا یہ اختلاف اُس زمانے میں اِن کے استعمال کی صورتوں کی نمایندگی کر رہا ہے۔ چوں کہ "بارہوں" کی اسناد موجود ہیں؛ اِس لیے جن مقامات پر "بارہوں" لکھا ہوا ہے، وہاں اُسی کو برقرار رکھا گیا ہے اور چوں کہ "چودھویں" کے استعمال (بل کہ استعمالِ عام) کی مثالیں بھی موجود ہیں [مثلاً انشا کا یہ شعر:

چودھویں رات کے چاند اِس پہ نہ ہونا مغرور ؛ کہ تو سویا ہے بچھا مجھ سے بہت دور پلنگ]

اِس بنا پر جن مقامات پر "چودھویں" لکھا ہوا ہے، وہاں اِس املا کو برقرار رکھا گیا ہے۔

باغیچے، باغیچے: ص ۳۲۸، ح ⑤۔ نیز ص ۳۶۷، ح ⑥۔

باقرخانی (ص ۶۲): کے اور فٹ دونوں میں قاف کے نیچے زیر لگا ہوا ہے۔ عربی میں "باقر" بہ کسرِ سوم ہے، "باقرخانی" میں یہی لفظ ہے، مگر اُردو میں اب عام طور پر "باقر" کہتے ہیں، اِسی طرح "باقرخانی"۔ آصفیہ میں بھی قاف پر زبر لگا ہوا ہے اور فیلن کے لغت میں بھی اسی طرح (بہ فتحِ قاف) ہے، مگر پلیٹس نے اپنے لغت میں "باقرخانی" لکھا ہے اور "باقرخانی" کو عامیانہ تلفظ بتایا ہے۔ چوں کہ کے اور فٹ میں قاف کے نیچے زیر موجود ہے؛ اِس بنا پر اُسی تلفظ کو برقرار

رکھا گیا ہے۔

باگ (ص ۷۰): ن اور کے میں اسی طرح ہے۔ ف، ا اور ع میں "باگھ" ہے۔ آصفیہ میں بھی شیر کے معنی میں "باگھ" ملتا ہے، البتہ فیلن اور پلیٹس کے لغات میں "باگ" بھی مندرج ہے، اور یوں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ن اور کے میں جو املا ہے، وہ محض بے اصل نہیں۔ چوں کہ "باگ" بھی (شیر کے معنی میں) لغات میں موجود ہے، اس لیے یہاں ک ے کے املا کو ترجیح دی گئی ہے۔

بتاشا (ص ۳): سب نسخوں میں یہ لفظ اسی طرح، یعنی شین کے ساتھ ہے، اسی کی مطابقت اختیار کی گئی ہے۔ یہ پہلو بھی ذہن میں رہے کہ اس عبارت میں "بتاشا" اور "تماشا" میں قافیہ بندی کا حسن بھی نمایاں ہے (یہ میر امن کا خاص انداز ہے) اور یہ بھی ایک ضمنی تائید ہے اس کی کہ میر امن نے "بتاشا" (مع شین) ہی لکھا ہے۔ یہ صراحت یوں ضروری سمجھی گئی کہ اُس زمانے میں یہ لفظ دہلی میں "بتاسا" اور "بتاشا" دونوں طرح مستعمل تھا؛ دونوں کی ایک ایک مثال کافی ہوگی ① میر حسن نے لکھا ہے: کوئی لے کھیر کے بیٹھا ہے کاسے ٭ یہ کہتا ہے کہ لے دودھ اور بتاسے [مثنویاتِ حسن؛ مرتبۂ ڈاکٹر وحید قریشی، ص ۱۹۶] ② آبرو کی وہ غزل جس کے ردیف و قوافی "ترا شے کا" "تماشے کا" ہیں، اُس میں یہ شعر بھی ہے: کُنجی اُس کی زبانِ شیریں ہے ٭ دل مرا قفل ہے بتاشے کا (دیوانِ آبرو) مولّفِ آصفیہ نے اصل لغت کے طور پر "بتاسا" ہی لکھا ہے، البتہ اُس کے آگے قوسین میں یہ ضرور لکھ دیا ہے کہ: "مشہور بتاشا"؛ مطلب اُن کا یہی ہے کہ اصل لفظ تو "بتاسا" ہے، مگر (دہلی میں) زبانوں پر "بتاشا" ہے۔ نور میں "بتاسا" کے بعد "بتاشا" بھی مندرج ہے، لیکن اُس کے آگے قوسین میں صرف یہ لکھا ہے: "دیکھو بتاسا"؛ مطلب اس سے یہ نکلتا ہے کہ اصل لغت (اور گویا فصیح لفظ) "بتاسا" ہے۔ اثر لکھنوی نے فرہنگِ اثر میں نور کے اس اندراج پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے: "جسے خواص "بتاسا" کہتے ہیں، اُسے عوام اور دیہاتی "بتاشا" کہتے ہیں، یہ بات صاف کر دینا چاہیے تھی" (ص ۱۷۹)۔ ظاہر ہے کہ عمومی حیثیت سے اثر صاحب کی یہ بات قابلِ قبول نہیں، ہاں یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ لکھنؤ میں فصحا "بتاسا" (مع سینِ مہملہ) کہتے تھے۔ جلال نے بھی اپنے لغت سرمایۂ زبانِ اردو میں صرف "بتاسا" (مع سینِ مہملہ) درج کیا ہے؛ اسی طرح "بتاسے کا قفل" لکھا ہے۔ اس سلسلے میں آتش کا یہ شعر بھی پیش کیا جا سکتا ہے: لبِ شیریں کی ترسے چاشنی ممکن نہ ہوئی ٭ رس سے شکّر ہوئی، شکّر سے بتاسے پیدا۔ اس غزل کا مطلع ہے: رعد کا شور ہو

موزون کی صدا سے پیدا / جھومتا ابرِ بہاری ہو ہوا سے پیدا۔ دلّی میں البتہ "بتاسا" اور "بتاشا" دونوں طرح مستعمل تھا اور اب بہ طورِ عموم زبانوں پر "بتاشا" ہے۔

پَت کَھاو (ص ۵۴): ک میں اسی طرح ہے، یعنی واو پر ہمزہ موجود نہیں، بلکہ واو پر موقوف کی علامت موجود ہے، جس سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ واو ساکن ہے، اور اس سے پہلے الف ہے (کہ وہ بھی ساکن ہے)۔ ض میں "کھاؤ" ہے، یعنی واو پر ہمزہ موجود ہے اور ع میں "کھاؤ" ہے۔ ک کے املا کو اختیار کیا گیا ہے دو وجوہ سے، ایک تو یہ کہ صحیح املا یہی ہے؛ اور دوسرے یہ کہ مخطوطۂ گنجِ خوبی میں میر امّن نے اپنے قلم سے تقریباً ہر جگہ ایسے الفاظ کو ہمزہ کے بغیر لکھا ہے، مثلاً: گھاو ۴۷، ۲۷۶۔ دباو ۱۹۷۔ بچاو ۵۷، ۱۹۱، ۱۲۴، ۱۴۶، ۱۴۷، ۱۵۷، ۲۲۷۔ بناو ۲۷۔ ناو و گاو ۵۷، ۶۱۔ باو (ہوا) ۷۲، ۱۰۱۔ تاو ۴۴۔ چلاو ۸۰، ۱۴۱۔ لاو لشکر ۱۰۳۔ سیاست کے دھمکاوے ۲۵۱ (وغیرہ)۔ یہ وضاحت بھی بے جا نہ ہوگی کہ ک میں زیرِ بحث ٹکڑے میں "کھاو" (ہمزہ کے بغیر) ہے اور اسی جملے کے آخر میں "بکاؤ" مع ہمزہ ہے۔ اس کا مطلب واضح طور پر یہ ہے کہ اسم (مثلاً: گاو، ناو) اور اسمِ مصدر (مثلاً: بچاو، دباو، گھماو، پھراو) کو بالعموم ہمزہ کے بغیر لکھا گیا ہے اور جو لفظ بہ طورِ اسمِ فاعل آتے ہیں، (مثلاً: لُٹاؤ (لٹانے والا) کماؤ (کمانے والا) اُڑاؤ (اُڑانے والا) وغیرہ) اُن کو مع ہمزہ لکھا گیا ہے۔

بجاے (ص ۲۳): دیکھیے "سواے" (اسی ضمیمے میں)۔

بچارا (ص ۱۲۸): محض احتیاطاً یہ صراحت کی جاتی ہے کہ ک، ض اور ع میں اس لفظ کا یہی املا ہے (آخر میں الف)۔ آصفیہ میں یہ لفظ موجود نہیں، مگر نور میں اسے اسی طرح (مع الف) درج کیا گیا ہے۔ مخطوطۂ گنجِ خوبی میں بھی یہ لفظ کئی جگہ آیا ہے اور میر امّن نے ہر جگہ آخر میں الف لکھا ہے، مثلاً ص ۴۳، ۷۱۔

بِچھونا (ص ۲۶): م اور ک میں واو پر علامتِ مجہول موجود ہے۔ ک میں ص ۴۷ اور ص ۱۶۲ پر بھی یہ لفظ آیا ہے، اور وہاں بھی واو پر مجہول کی علامت بنی ہوئی ہے، اس طرح اس کا تلفظ "بِچھونا" متعین ہو جاتا ہے۔ اس کی مزید تائید ہوتی ہے مخطوطۂ گنجِ خوبی سے، اُس میں ص ۱۰۹ پر یہ لفظ موجود ہے اور میر امّن نے اسے بہ واوِ مجہول ہی لکھا ہے (بچھونا)۔ اسی کی پابندی کی گئی ہے۔ صراحت کی ضرورت یوں محسوس کی گئی کہ ض میں 'بچھ' پر زبر لگا ہوا

ہے (بچھونوں)۔ مگر دلچسپ بات یہ ہے کہ اس نسخے کے آخر میں جو طویل فرہنگ شامل ہے، اُس میں اسے مع واوِ مجہول ہی لکھا گیا ہے۔ ہاں یہ ضرور درست ہے کہ یہ لفظ دونوں طرح مستعمل رہا ہے۔ فیلن اور پلیٹس کے لغات میں اسے دونوں طرح (بِچھونا۔ بِچھَونا) لکھا گیا ہے، مگر یہ بھی صحیح ہے کہ فصحا نے اسے عموماً بہ واوِ مجہول ہی مانا ہے۔ جلال نے اپنے لغت سرمایۂ زبانِ اُردو میں صراحت بھی کردی ہے کہ: "یہ لفظ بہ فتح جیم فارسیِ مخلوط الہا جو زبانوں پر ہے، صحت سے عاری ہے"۔ جلال کا یہ قول کہ "بچھونا" صحت سے عاری ہے، بجائے خود قابلِ قبول نہیں، کیوں کہ اُنھی کی تحریر سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ یہ لفظ اِس طرح بھی "زبانوں پر ہے"۔ (آج بھی یہی صورت ہے) مگر اِس میں شک نہیں کہ قدیم اساتذہ نے عموماً اسے مع واوِ مجہول مانا ہے۔ آصفیہ میں یہ لفظ موجود ہے۔ اُس میں ب کے نیچے زیر تو لگا ہوا ہے، مگر چھ پر کوئی حرکت موجود نہیں۔ مؤلفِ آصفیہ نے مقدمۂ لغت میں لکھا ہے کہ: "جہاں زبر، پیش یا جزم نہ ہو، وہاں زبر سمجھنا چاہیے"۔ اِس لحاظ سے تو اسے "بِچَھونا" ماننا ہوگا۔ نور میں اسے صرف بہ ضمِ دوم لکھا گیا ہے: "بچھونا: بہ کسرِ اوّل و ضمِ دوم و واوِ مجہول"۔ مثال میں یہ شعر بھی لکھا گیا ہے: یا اُٹھتی راتوں کا سونا بھی تمھیں بھول گیا ٭ وہ دوپٹے کا بچھونا بھی تمھیں بھول گیا۔ مختصر یہ کہ یہ لفظ (بِچھونا۔ بِچھَونا) دونوں طرح مستعمل رہا ہے، مگر قدیم فصحا کے یہاں عموماً مع واوِ مجہول ملتا ہے اور میر امّن کی تحریر سے اِس کی مزید تائید ہوتی ہے۔

بَخْتیار (ص ۳۴۴): ک میں اِس لفظ پر اعراب موجود نہیں، البتہ ف میں "بختِیار" ہے، یعنی ت کے نیچے زیر لگا ہوا ہے۔ قاعدے کے لحاظ سے تو ت ساکن ہونا چاہیے، کیوں کہ یہ مرکب ہے "بَخْت" اور "یار" سے (نور میں اِس ترکیب کی صراحت موجود ہے)۔ پلیٹس کے لغت میں اِس کو بہ سکونِ ت ہی لکھا گیا ہے، مگر آصفیہ میں ت کے نیچے زیر لگا ہوا ہے اور یہ واقعہ ہے کہ اُردو میں یہ لفظ ت کے زیر کے ساتھ مستعمل ہے۔ ف (اور آصفیہ) کی مطابقت اختیار کی گئی ہے اور ت کے نیچے زیر لگایا گیا ہے۔

بَدعَمَلی (ص ۱۲): ک میں م پر زبر موجود ہے۔ ف نے میں ع اور م پر حرکات موجود نہیں، مگر اُس کی فرہنگ میں اسے "بدعَمَلی" ہی لکھا گیا ہے۔ آصفیہ میں بھی "بدعَمَلی" ہے۔ ک کی مطابقت اختیار کی گئی ہے۔

بَدلا (ص ۲۶) : م ' ت ' ک ' ف ' ع : سب نسخوں میں اِس لفظ کا یہی املا ہے۔ کے میں ص ۳۱ اور ص ۵۶ پر بھی یہ لفظ آیا ہے اور وہاں بھی سب نسخوں میں "بدلا" ہے۔ مخطوطۂ گنجِ خوبی میں بھی اِس لفظ کا یہی املا ملتا ہے (ص ۲۱۵)۔ اِسی کی مطابقت اختیار کی گئی ہے۔ وضاحت کی ضرورت یوں محسوس کی گئی کہ اِس لفظ کو "بدلہ" بھی لکھا جاتا ہے۔ یہ لفظ اُردو نژاد ہے، یعنی "بدل" سے اُردو والوں نے "بدلا" بنا لیا ہے؛ اِس بنا پر اِس لفظ کے آخر میں الف لکھنا قاعدے کے مطابق بھی ہوگا۔ یہ وضاحت بھی بے جا نہ ہوگی کہ آصفیہ میں اِسے "بدلہ" لکھا گیا ہے اور مصنف نے اِسے "عربی" لکھا ہے۔ غالباً اِسی غلط فہمی کی بنا پر اُنھوں نے اِس کے آخر میں ہائے مختفی لکھی ہے۔ اِس کے برخلاف صاحبِ نور اللغات نے "بدلا" لکھا ہے اور قوسین میں وضاحت کردی ہے کہ : "ع : بدل" یعنی عربی لفظ "بدل" ہے جس سے اُردو میں "بدلا" بن گیا ہے۔ اِس لغت میں بدلا اُتارنا، بدلا اُترنا، بدلا پانا، بدلا دینا، بدلا کرنا، بدلا لینا؛ سب میں اِس لفظ کے آخر میں الف ملتا ہے، اور یہی صحیح صورت ہے۔

بَرادَر (ص ۱۳۵) : ک اور ف میں اِس لفظ پر اعراب موجود نہیں، مگر ف کی فرہنگ میں اِسے بہ فتحِ اوّل لکھا گیا ہے۔ فارسی میں یہ بہ فتحِ اوّل ہے [حاشیۂ برہانِ قاطع مرتبۂ ڈاکٹر معین، جلدِ اوّل، ص ۲۴۶] مگر اُردو میں بہ کسرِ اوّل مستعمل ہے۔ آصفیہ میں ب کے نیچے زیر لگا ہوا ہے اور مؤلفِ نور نے صراحتاً لکھا ہے کہ : "یہ لفظ زبانوں پر بہ کسرِ اوّل ہے"۔ اِسی نسبت سے ب کے نیچے زیر لگایا گیا ہے۔

بَراسے (ہمزہ کے بغیر) ص ۳۱۵، ح ⑤

بَرچھی و تلوار (مع واوِ عطف) : ص ۳۷۰، ح ②

بُرقع (ص ۲۲) : م ' ت ' ک ' ف ' ع : میں "برقعہ" ہے۔ پرانے زمانے میں ایسے متعدد لفظوں کے آخر میں بھی ہائے مختفی لکھ دی جاتی تھی جن میں اُس کا وجود سرے سے نہیں۔ مثلاً ایک لفظ ہے "موقع"، اِس کا املا "موقعہ" بھی دیکھا گیا ہے۔ یہی صورت اِس لفظ کی ہے کہ اصل لفظ "برقع" ہے۔ اِسی بنا پر اِس لفظ کو ہائے مختفی کے بغیر (بُرقع) لکھا گیا ہے۔

بَرکت (ص ۸۰) : عربی میں ب اور ر، دونوں کے اوپر زبر ہے (بَرَکت)۔ فارسی میں اِس لفظ میں یہ تصرف ہوا کہ اِسے بہ سکونِ دوم (بَرْکت) بھی نظم کیا گیا۔ صاحبِ بہارِ عجم نے اِس کی صراحت کی ہے اور بہ سکونِ دوم کی اسناد بھی درج کی ہیں : "برکت، با لتحریک ...

و فارسیاں بسکون استعمال می نمایند، حاجی محمد جان قدسی : چناں بادِ شمشیرِ دستی فشاند ٭ کہ در خرمن عمر برکت نماند - عبداللہ ہاتفی در معراج : چو افتاد بر آفتابش عبور ٭ شد از برکتش چشمہ دریاے نور "۔ اُردو میں بھی یہی صورت ہے۔ آصفیہ میں تو اسے صرف بہ فتحِ اوّل و دوم "بَرَکت" لکھا گیا ہے، مگر صاحبِ نور اللغات نے اِس کی نشان دہی کی ہے اور مزید لکھا ہے کہ اُردو میں یہ بیش تر بہ سکونِ دوم زبانوں پر ہے، اور سند میں سحر کا شعر لکھا ہے جس میں یہ لفظ بہ سکونِ دوم نظم ہوا ہے : "برکت [ع : بہ فتحِ اوّل و دوم و سوم] .... فارسیوں نے بہ سکونِ را استعمال کیا ہے۔ اُردو میں بیش تر زبانوں پر بہ سکونِ را آتا ہے : .... سحر : سچ تو یہ ہے کہ یہ نیّت کی ہے سازی برکت ٭ ہو گا خالی نہ کبھی خوانِ حسام الدّولہ "۔ آگے چل کر "برکت ہے" کے ذیل میں داغ کا یہ شعر لکھا ہے (جس میں بہ سکونِ دوم نظم ہوا ہے) : "پی چکے سب، اب آئے زاہد آپ ٭ جائیے بس جناب برکت ہے "۔ یہ واقعہ ہے کہ بول چال میں یہ لفظ بہ سکونِ دوم ہی آتا ہے اور اِس طرح نظم بھی ہوا ہے [جیسا کہ سحر لکھنوی اور داغ دہلوی کے اشعار سے ظاہر ہے] - متن میں اِس لفظ پہ اعراب موجود نہیں اور اُس کی فرہنگ میں بھی یہ لفظ موجود نہیں۔ ک میں اِس لفظ پر ایک زبر لگا ہوا ہے، مگر اِس طرح کہ یقین کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ ب پر ہے یا رے پر۔ آگے چل کر ص ۲۱۲ پر بھی یہ لفظ آیا ہے اور وہاں بھی مت میں اعراب موجود نہیں اور ک میں صرف ایک زبر ہے اور یہاں یہ زبر ک کے اوپر ہے - ایسے الفاظ کے سلسلے میں اگر میر امّن کے عام طرزِ عمل کو سامنے رکھا جائے کہ اُنھوں نے "صَدْر" کو "صَدَر" اور "نَقْب" کو "نَقَب" لکھا ہے، تو اِس لفظ کا تلفظ "بَرْکت" (بہ سکونِ دوم) مرجّح قرار پائے گا۔ اِسی نسبت سے میں نے ہر جگہ ب پر زبر اور رے پر جزم لگایا ہے۔

بَرَہنہ : ص ۱۷۱، ح ⑦

بُرْدِ چُود : ص ۳۷۵، ح ④

بِسیکھ (ص ۲۱۶) : آصفیہ میں "بَسیکھ" (بہ فتحِ اوّل) ہے - فیلن کے لغت میں "بِسیکھ" اور "بَسیکھ" دونوں طرح مندرج ہے، مگر پلیٹس نے اپنے لغت میں اِسے صرف بہ کسرِ اوّل (بِسیکھ) لکھا ہے۔ ک اور فت دونوں میں ب کے نیچے زیر لگا ہوا ہے، اِسی کی مطابقت اختیار کی گئی ہے۔ ی کے مجہول ہونے پر سب کا اتفاق ہے۔

بَشارَت (ص ۲۶): ک، اور ف میں اس لفظ پر اعراب موجود نہیں البتہ ف کی فرہنگ میں اسے بہ فتحِ اوّل لکھا گیا ہے۔ صاحبِ غیاث اللغات نے اس لفظ کو بکسرِ اوّل اور بہ ضمِ اوّل [بِشارت ۔ بُشارت] لکھا ہے اور بہ فتحِ اوّل (بَشارت) کے متعلق لکھا ہے کہ "بہ فتح بہ ایں معنی خطا ست"۔ نور اور آصفیہ میں "بَشارت" لکھا گیا ہے، مگر دونوں لغات میں قوسین میں یہ صراحت بھی موجود ہے کہ اُردو میں یہ بہ فتحِ اوّل مستعمل ہے۔ (ف کے آخر میں جو فرہنگ ہے، اُس میں بھی اسے بہ فتحِ اوّل لکھا گیا ہے)۔ یہ واقعہ ہے کہ اُردو والے "بُشارت" سے تو قطعاً واقف نہیں، اور "بِشارت" سے بھی کم لوگ واقف ہوں گے۔ "بَشارت" سننے میں آتا ہے۔ اِنھی وجوہ سے ب پر زبر لگایا گیا ہے۔

بَشرَہ (ص ۸۱): ک، اور ف میں اس لفظ پر اعراب موجود نہیں، البتہ ف کی فرہنگ میں "بَشَرَہ" (بہ فتحِ اوّل و دوم و سوم) ہے۔ آصفیہ میں "بَشرَہ" (بہ فتحِ اوّل و سکونِ دوم و فتحِ سوم) لکھ کر، قوسین میں لکھا گیا ہے: "صحیح بَشَرہ"۔ مطلب اس کا واضح ہے، یعنی عربی کا لفظ اصلاً "بَشَرہ" ہے، مگر اُردو میں "بَشرَہ" مستعمل ہے۔ نور میں "بَشَرہ" لکھ کر، یہ بھی لکھا گیا ہے کہ "عموماً زبانوں پر بالضم ہے"۔ نور کے مؤلف نے شین کے جزم کا ذکر نہیں کیا، مگر مثال میں جو شعر لکھا ہے، اُس میں یہ بہ سکونِ دوم آیا ہے: "نامہ بر کوئی مژدہ لایا ہے ؎ اس کا بشرہ گواہی دیتا ہے"۔ اس کا واضح طور پر مطلب یہ ہوا کہ مؤلف نے اگرچہ صراحت نہیں کی، مگر وہ اس کو مانتے تھے کہ اُردو میں یہ بہ سکونِ دوم مستعمل ہے۔ میں نے نور کے مقابلے میں آصفیہ کے اندراج کو ترجیح دی ہے اور اُس کے مطابق اسے بہ فتحِ اوّل و سکونِ دوم لکھا ہے۔

بِعَینِہٖ (ص ۵۹): م میں "بعَینہٖ" ہے یعنی ی پر ماقبل مفتوح کا نشان ہے اور ن کے نیچے زیر ہے۔ ک میں "بِعینہٖ" ہے یعنی ب کے نیچے بھی زیر ہے۔ اسے بہ ظاہر "بِعَینِہٖ" پڑھنا چاہیے۔ ف میں "بِعَینِہٖ" ہے یعنی ب کے نیچے زیر ہے، ع پر زبر ہے اور نون اور ہ دونوں کے نیچے زیر لگے ہوئے ہیں۔ یہ واضح طور پر "بِعَینِہٖ" ہوا۔ اس کی توثیق ہوتی ہے اس نسخے کی فرہنگ سے، کہ اُس میں اسے رومن رسمِ خط میں Bi - aini - hi لکھا گیا ہے۔ اصل لفظ "بعینہٖ" ہے، مگر جیسا کہ مؤلفِ نور نے لکھا ہے: "عربی میں تلفظ "بِ عَے نِہی" (مفاعلن) ہے، فارسیوں نے اور اُن کی تقلید سے شعرائے اُردو نے "بِ عَے نہ" (بروزنِ فعولن) نظم کیا ہے، محسن: بعینہ

افتتاحِ سورۂ صاد آنکھ کو کہیے ۔" آصفیہ میں " بِعَیْنِہٖ " ہے ۔ یہ اصل کے مطابق ہوا ۔ اُردو شعرا کے یہاں " بعینہٖ " (بروزنِ مفاعلن) اور " بعینہٖ " (بروزنِ فعولن) دونوں طرح ملتا ہے ۔ میں سید انشا کے یہاں سے اِن دونوں کی صرف ایک ایک مثال پیش کرتا ہوں : یہی کہتی تھی اُس کو دخترِ رز ؛ کہ ہے یہ تو بعینہٖ بائے ہوّز (کلامِ انشا ص ۳۶۴) ہیں جیسے آپ یوسفِ کنعاں بعینہٖ ؛ چھب ، آنکھ ، ناک ، منہ ، لب و دنداں بعینہٖ (" ص ۱۹۶) ۔ اِس غزل کی ردیف " بعینہٖ " ہے ، اِس میں گیارہ شعر ہیں ۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ اُردو شعرا کے دواوین میں " بعینہٖ " بروزنِ فعولن کی مثالیں زیادہ ملتی ہیں اور " بعینہٖ " بروزنِ مفاعلن کی مثالیں اِس کے مقابلے میں کم ملتی ہیں ۔ م اور ک میں جس طرح یہ لفظ لکھا ہوا ہے ، اُس لحاظ سے اِس کی قرائت بہ ظاہر " بِعَیْنِہٖ " مرجّح معلوم ہوتی ہے ۔ میں نے اِسی کو ترجیح دی ہے ۔ ترجیح کے لیے ضمنی طور پر یہ وجہ بھی پیش کی جاسکتی ہے کہ " بعینہٖ " (بروزنِ فعولن) کی مثالیں اُردو میں زیادہ ملتی ہیں اور اِس کا بہ ظاہر یہی مطلب نکلتا ہے کہ اُردو میں یہ صورت زیادہ چلن میں رہی ہے اور یوں یہ مان لینا کچھ ایسا مستبعد نہیں معلوم ہوتا کہ میر امّن نے (جو چلن کو عموماً ترجیح دیتے تھے) اِسی طرح لکھا ہوگا ۔

بَکاوَل (ص ۷۷) : ک میں اِس لفظ پر اعراب موجود نہیں ، مگر ت کی فرہنگ میں اِسے " بَکاوَل " (بہ فتحِ اوّل و چہارم) لکھا گیا ہے ۔ غیاث اللغات میں اِسے سراج اللغۃ کے حوالے سے بہ ضمِ اوّل و چہارم (بُکاوُل) اور بہارِ عجم کے حوالے سے بہ فتحِ اوّل و چہارم (بَکاوَل) لکھا گیا ہے ۔ آصفیہ اور نور ، دونوں میں اِسے (بہارِ عجم کے مطابق) بہ فتحِ اوّل و چہارم لکھا گیا ہے ، سُننے میں بھی اِسی طرح آیا ہے ؛ اِنھی وجوہ سے اِسے بہ فتحِ اوّل و چہارم لکھا گیا ہے ۔

بَگُولا (ص ۴۷) : ک میں اِسے مع واوِ معروف لکھا گیا ہے ۔ پلیٹس نے اپنے لُغت میں اِس لفظ کو کسی صراحت کے بغیر ، بہ واوِ معروف اور بہ واوِ مجہول ، دونوں طرح لکھا ہے ۔ فیلن نے بھی دونوں طرح لکھا ہے ، لیکن یہ صراحت بھی کر دی ہے کہ بہ واوِ مجہول عامیانہ تلفّظ ہے ۔ آصفیہ میں اِسے صرف بہ واوِ معروف لکھا گیا ہے [سُننے میں بھی یہ لفظ بہ واوِ معروف ہی آتا ہے] ۔ ک کی مطابقت اختیار کی گئی ہے ۔

بُلَمبَرہ (ص ۶) : ک اور ف میں ب پر پیش لگا ہوا ہے ۔ ف کی فرہنگ میں بھی اِسے بہ ضمِ اوّل لکھا گیا ہے ۔ ک میں ص ۲۲۷ پر بھی یہ لفظ آیا ہے اور وہاں بھی ب پر پیش لگا ہوا ہے ۔ اصل

کے لحاظ سے یہ لفظ بہ فتحِ اوّل ہے، آصفیہ میں بھی اِسے بہ فتحِ اوّل لکھا گیا ہے، مگر اِس کے بعد قوسین میں یہ بھی لکھا گیا ہے کہ بہ ضمِ اوّل بھی جائز ہے اور اِس اندراج سے معلوم ہوتا ہے کہ ک اور ف کے متن میں ب پر جو پیش لگا ہوا ہے، وہ بے اصل نہیں۔ غیاث اللغات میں بھی "بلدہ" کو بہ فتحِ اوّل لکھ کر، یہ بھی لکھا گیا ہے کہ "بہ ضم نیز آمدہ"۔ اِن اندراجات سے یہ بات ضرور واضح ہو جاتی ہے کہ اِس لفظ کا ایک تلفظ "بُلدہ" بھی رہا ہے (کم سہی)۔ ک اور ف کی مطابقت اختیار کی گئی ہے اور ب کے پیش کو برقرار رکھا گیا ہے۔

بَلَنْد (ص ۳۹): صاحبِ غیاث اللغات کے لکھنے کے مطابق فارسی میں یہ لفظ بہ فتحِ اوّل و بہ کسرِ اوّل و بہ ضمِ اوّل تینوں طرح درست ہے؛ مگر اُنھوں نے یہ صراحت بھی کر دی ہے کہ بہ فتحِ اوّل فصیح ہے۔ برہانِ قاطع میں اِسے بہ فتحِ اوّل لکھا گیا ہے۔ اُردو والوں کی زبان سے بیش تر بہ فتحِ اوّل اور کم تر بہ ضمِ اوّل سُننے میں آیا ہے۔ آصفیہ میں "بَلند" ہے، یعنی ب پر زبر لگا ہوا ہے۔ ف میں "بُلند" ہے، یعنی ب پر پیش لگا ہوا ہے؛ لیکن ک میں ب پر زبر لگا ہوا ہے اور یہی مرجح صورت ہے، اِسی کی پابندی کی گئی ہے۔

بِلّور (ص ۲۳): یہ لفظ بہ فتحِ اوّل بھی ہے اور بہ کسرِ اوّل بھی۔ اِسی طرح لام پر تشدید بھی آتی ہے اور تشدید کے بغیر بھی صحیح ہے۔ اُردو میں شاعروں نے اِسے "بلَّور" (غَور، طَور کے قافیے میں) بھی لکھا ہے اور "بلُور" (واو معروف اور لام غیر مشدّد۔ نُور، طُور کے قوافی میں) بھی نظم کیا ہے۔ م، ک اور ف تینوں میں ب کے نیچے زیر لگا ہوا ہے اور لام پر تشدید لگی ہوئی ہے۔ م اور ک میں واو پر ماقبل مفتوح کی علامت موجود ہے (بِلَّوْر) اور ف میں لام پر زبر لگا ہوا ہے (بِلَّور)، اِسی کی پابندی کی گئی ہے۔ آصفیہ میں بھی اِسے "بلَّور" لکھا گیا ہے۔

بَنَاو (ص ۱۱۱): ک میں اِسی طرح (ہمزہ کے بغیر) ہے۔ ف میں "بناؤ" ہے۔ گنجِ خوبی کے مخطوطے میں بھی "بناو" ہمزہ کے بغیر ہے (ص ۲۷)۔ اِس مخطوطے میں صورتِ حال یہ ہے کہ ایسے اکثر الفاظ میں میر امّن نے ہمزہ نہیں لکھا ہے، مثلاً: گھاو ۲۷، ۴۳، ۲۷۹۔ بادہ گاد ۲۷، ۷۵، ۱۱۶۔ باد (ہوا) ۲۷، ۶۲، ۱۰۰۔ تاد ۴۴۔ تیو ۴۳۔ پلاو ۸۰، ۱۴۱۔ لاو لشکر ۱۰۳۔ افعال میں تو ہر جگہ واو کے اوپر ہمزہ ملتا ہے، جیسے: جاؤ، لاؤ؛ مگر حاصلِ مصدر جتنے آئے ہیں، اُن میں سے ایک دو جگہ کے استثنا کے ساتھ، کسی بھی جگہ واو کے اوپر ہمزہ موجود نہیں، جیسے: بچاو ۷۵، ۱۳۴،

۱۴۹، ۱۴۷، ۱۵۷، ۱۹۱، ۲۱۷، ۲۱۲۔ سیاست کے دمکاد سے ۱۵۱، ۲۲۔ دباد ۷، ۱۹۷۔ چوں کہ خود میر امن نے اپنے قلم سے "بناو" لکھا ہے، اور ایسے حاصل مصدروں کو بیش تر ہمزہ کے بغیر ہی لکھا ہے، کے میں بھی یہ لفظ اِسی طرح ہے (اور مرجّح املا بھی یہی ہے) اِس لیے اِس لفظ کو ہمزہ کے بغیر ہی لکھا گیا ہے اور ایسے جملہ حاصل مصدروں کو بھی ہمزہ کے بغیر ہی لکھا گیا ہے۔

لُو (مع واوِ معروف): ص ۳۸۵، ح ②

لُوٹ، لُوٹنا: ص ۳۶۳، ح ①

لُوزِنَہ (ص ۲۲۲): کے میں واو پر علامتِ مجہول موجود ہے، مگر زے خالی ہے؛ اِس پر نہ تو جزم ہے اور نہ کوئی حرکت۔ فت میں اِس لفظ پر اعراب موجود نہیں، مگر اُس کی فرہنگ میں اِسے بہ واوِ مجہول اور سکونِ زا (لَوزنَہ) لکھا گیا ہے۔ پلیٹس کے لغت میں اِسے مع واوِ مجہول اور مع واوِ معروف دونوں طرح درج کیا گیا ہے مگر زے پر دونوں صورتوں میں جزم ہے [لوزنہ - لُوزنہ]۔ فارسی لغات میں اِسے بہ کسرِ زا (لوزِنہ) لکھا گیا ہے (برہانِ قاطع - غیاث اللغات)۔ "لوزینہ" پر قیاس کیا جائے تو زے کے نیچے زیر ہی آنا چاہیے، اور اِسی اعتبار سے لغات میں اِسے بہ کسرِ زا لکھا گیا ہے؛ مگر یہ بھی واقعہ ہے کہ (ایسے بعض اور الفاظ کی طرح) اُردو میں زبانوں پر جب یہ لفظ آتا ہے تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے زے پر جزم ہو۔ چوں کہ کے میں واو پر علامتِ مجہول موجود ہے؛ علاوہ ازیں فت کی فرہنگ میں بھی اِسے مع واوِ مجہول درج کیا گیا ہے اور پلیٹس کے لغت میں بھی یہ صورت موجود ہے؛ اِن وجوہ سے یہاں اِسے مع واوِ مجہول ہی برقرار رکھا گیا ہے [اگرچہ سننے میں عموماً مع واوِ معروف آتا ہے]۔ اصلاً زے کے نیچے زیر ہے، مگر یہاں بھی فت کی فرہنگ کے اندراج کی مطابقت کو ترجیح دی گئی ہے تین وجہوں سے: ایک تو یہ کہ تلفظ میں اِس طرح بھی آتا ہے (اور بیش تر) دوسرے یہ کہ پلیٹس کے لغت میں بھی یہ صورت موجود ہے اور تیسرے یہ کہ فت کی فرہنگ میں بھی اِسے اِسی طرح لکھا گیا ہے۔

لُوزَہ (ص ۱۳۹): اصلاً اِس لفظ میں واوِ معروف ہے (برہانِ قاطع)۔ آصفیہ میں بھی اِسے مع واوِ معروف لکھا گیا ہے۔ کے میں اِسی صفحے پر یہ لفظ دو جگہ آیا ہے اور دونوں جگہ واو پر علامتِ مجہول موجود ہے، اِس کا واضح طور پر مطلب یہ ہے کہ اِس لفظ کو مع واوِ مجہول لکھا گیا ہے۔ میں نے یہاں بھی کے کی مطابقت کو ترجیح دی ہے۔ اور ہاں، فت کی فرہنگ میں بھی اِسے

مع واوِ مجہول درج کیا گیا ہے اور اس سے کے کے اندراج کی تائید ہوتی ہے۔

بوٹے ٹٹے (ص ۱۹۹) : ن، ک، ف، ع؛ سب میں اسی طرح (یعنی مع نونِ غنّہ) ہے۔ مخطوطۂ گنجِ خوبی میں بھی یہ لفظ مع نونِ غنّہ ملتا ہے : "بونٹے لگے تھے" (ص ۲۱۶) "جھاڑ بونٹوں کو" ص ۲۸۸، اور اس سے قطعیت کے ساتھ تعیّن ہو جاتا ہے کہ میر امّن نے اس لفظ کو مع نونِ غنّہ لکھا ہے۔ آصفیہ میں "بوٹا - یا - بونٹا" ملتا ہے اور اس سے بھی واضح طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ دلّی والوں کی زبان پر یہ لفظ مع نونِ غنّہ بھی تھا [دلّی میں بول چال میں ایسے متعدد لفظوں میں نونِ غنّہ کی آواز شامل رہتی ہے؛ یہ ایک طرح کا لسانی رجحان معلوم ہوتا ہے] انھی وجوہ سے اسی املا کو برقرار رکھا گیا ہے۔ [اب عموماً "بوٹا" بولتے اور لکھتے ہیں]۔

بھائی چارہ : ص ۳۴۰، ح ⑪

بَہُتیرا (ص ۴۲) : اس لفظ میں بؔ پر زبر ہے اور ہؔ پر پیش ہے اور یؔ مجہول ہے۔ (بَ ہُ تے را) یہ "بہت" (بَ ہُ ت) سے بنا ہے۔ لغات میں حرکات کی صراحت موجود ہے۔ یہاں صرف اس طرف متوجہ کرنا مقصود ہے کہ روانیِ کلام میں یہ لفظ زبان سے اس طرح بھی ادا ہوتا ہے کہ ہؔ کے پیش کی آواز اس قدر ہلکی ہو جاتی ہے جیسے جزم کی آواز سے بدل گئی ہو؛ لیکن یہ لہجے کی کارفرمائی ہے؛ اصل اعراب وہی رہیں گے۔ یعنی زبان سے ادا کسی طرح ہو، بؔ پر زبر اور ہؔ پر پیش لگایا جائے گا۔ کے اور فے میں بھی ہؔ پر پیش لگا ہوا ہے۔

بِہزاد (ص ۲۱۳) : ک اور فے میں ب کے نیچے زیر موجود ہے۔ یہ لفظ اس کتاب میں دس بار آیا ہے [کے ص ۲۱۴، ۲۱۵ (چار بار)، ۲۱۶، ۲۴۶، ۲۴۷، ۲۴۸، ۲۴۹] اور ہر جگہ کے (اور فے) میں بؔ کے نیچے زیر موجود ہے۔ اسی کی مطابقت اختیار کی گئی ہے۔ یہ صراحت یوں خاص کر کی گئی کہ بول چال میں عام طور پر یہ لفظ اس طرح سننے میں آتا ہے جیسے بؔ پر زبر ہو؛ مگر اس میں لہجے کی کارفرمائی کا دخل نسبتاً زیادہ ہوتا ہے۔ آصفیہ میں یہ لفظ موجود نہیں۔ نور میں اسے بہ کسرِ اوّل ہی لکھا گیا ہے۔ اصل کے لحاظ سے بھی یہ بہ کسرِ اوّل ہے (برہانِ قاطع، مرتبۂ ڈاکٹر معین، حاشیۂ ص ۳۲۶، جلدِ اوّل)۔

بِہِشت (ص ۵۵) : کے اور فے میں اس لفظ کو اسی طرح لکھا گیا ہے [بؔ اور ہؔ دونوں کے نیچے زیر لگے ہوئے ہیں] ان نسخوں میں جہاں بھی یہ لفظ آیا ہے، اسی طرح ہے۔ م میں بھی بؔ کے

نیچے زیر لگا ہوا ہے۔ یہی احوال مخطوطۂ گنجِ خوبی کا ہے، کہ اُس میں بھی ہر جگہ اِس لفظ کو بہ کسرِ اوّل لکھا گیا ہے [مثلاً ص ۲۹، ۳۰، ۳۱، ۷۸، ۷۹، ۸۹، ۹۳]۔ اِسی کی مطابقت اختیار کی گئی ہے۔ وضاحت کی ضرورت یوں محسوس کی گئی کہ آصفیہ میں ہر جگہ "بَہِشت" ہے [بَ کے اوپر زبر، ہِ کے نیچے زیر] اِس میں شک نہیں کہ اب بہت سے لوگوں کی زبان سے یہ لفظ اسی طرح سُننے میں آتا ہے، مگر اِس میں بھی شک نہیں کہ اِس کا قدیم تلفظ "بِہِشت" ہے (بہ کسرِ اوّل و دوم)۔ ہاں نوؔر میں اِسے صرف بہ کسرِ اوّل و دوم لکھا گیا ہے۔ جس طرح مولّفِ آصفیہ نے اختلافِ تلفّظ کے سلسلے میں کچھ وضاحت نہیں کی، اسی طرح نوؔر میں بھی اختلافِ تلفّظ کی نشان دہی نہیں کی گئی۔ [اِس کا امکان ہے کہ مولّفِ نوؔر کے نزدیک اِس لفظ میں اختلافِ تلفّظ نہ ہو] اِن لغات میں جو عدمِ وضاحت ہے، اُس سے غلط فہمی کے لیے گنجایش نکل آئی ہے۔ اب ایک ضمنی بات : تلفّظ کی طرح تذکیر و تانیث کے لحاظ سے بھی یہ لفظ مختلف فیہ ہے۔ قدما کے یہاں اکثر بہ تذکیر ملتا ہے۔ آصفیہ میں اِسے مونث لکھا گیا ہے، لیکن توسین میں یہ بھی لکھا گیا ہے کہ : "آج کل "بہشت" کو مذکر اور "جنّت" کو مونث بولتے ہیں"۔ یہ بہت غلط فہمی پیدا کرنے والا اندراج ہے اور یہ غلط فہمی لفظ "آج کل" سے پیدا ہوتی ہے۔ میر امّن نے اِسے بہ تذکیر ہی استعمال کیا ہے : "اُن کے لیے دوزخ، ہمارے لیے بہشت بنایا ہے" [باغ و بہار : قصۂ خواجہ سگ پرست، ص ۱۶۲] نوؔر میں اِس اختلاف کی نشان دہی بھی نہیں ملتی۔ ایک بات اور، "بِہِشت" ہی سے "بِہِشتی" بنا ہے، جس کی ایک صورت "بِھِشتی" بھی ہے اور یہ متفقہ طور پر بہ کسرِ اوّل ہے۔ یہاں اصل تلفّظ نے اپنے آپ کو نمایاں کیا ہے۔ اُردو میں جو یہ لفظ بہ فتحِ اوّل بھی استعمال میں آنے لگا، تو بَ کے اِس زبر کی اصل کا سُراغ مل جاتا ہے : ایرؔان کے فاضل لغت نگار ڈاکٹر محمد معین نے حاشیۂ برہانِ قاطع (جلد اوّل، ص ۳۲۷) میں فارسی لفظ "بِہِشت" کی پہلوی شکل VAHISHT بتائی ہے۔ اِس سے معلوم ہوا کہ اُردو میں آکر جو اِس لفظ میں تلفّظ کے لحاظ سے یہ تصرّف ہوا کہ لوگ اِسے بہ فتحِ اوّل بھی بولنے لگے، تو یہ بَ کا زبر محض بے اصل نہیں۔

بَہِلِیے (ص ۴۲) : ک میں اِس لفظ پر اعراب موجود نہیں۔ ف میں صرف ایک زیر ہے، جسے لام سے متعلق بھی مانا جا سکتا ہے اور ہ سے متعلق بھی سمجھا جا سکتا ہے۔ ف کی فرہنگ میں "بَہِلیا" (بہ فتحِ اوّل و دوم و کسرِ سوم) ہے۔ ایک لفظ تو "بَہلی" ہے، جس کے معنی ہیں : "بیلوں کی بڑی گاڑی جس میں اکثر عورتیں سوار ہوتی ہیں" (آصفیہ)۔ اِس کا چلانے والا "بَہلیا" ہوا، مگر یہاں یہ

معنی مراد نہیں، یہاں وہی معنی مراد ہیں جو مولوی عبدالحق نے اپنے نسخے کی فرہنگ میں لکھے ہیں:
"بہلیا (بہیلیا) خدمت گار، تیر کمان کے ساتھ۔ شکاری، خدمت گار۔" اِس معنی میں آصفیہ میں "بہلیا" (بہ فتحِ اوّل و کسرِ دوم و سکونِ سوم) ہے۔ فیلن کے لغت میں "بہلیا" موجود نہیں؛ البتہ اصل لفظ "بہیلیا" ہے (بہ فتحِ اوّل و کسرِ دوم و سکونِ سوم و کسرِ چہارم)۔ فیلن کے اِس اندراج اور آصفیہ کے اندراج کے مطابق واحد لفظ بہ فتحِ اوّل و کسرِ دوم و سکونِ سوم "بہلیا" قرار پاتا ہے اور اسمِ جمع "بہلیے" ہوا۔ اِسی کے مطابق اِس لفظ کو لکھا گیا ہے۔
بہن (ص ۳۰): یہ لفظ اِس کتاب میں کئی جگہ آیا ہے۔ ک میں ہر جگہ اِس لفظ پر ایک زبر لگا ہوا ملتا ہے جسے ب سے متعلق بھی سمجھا جا سکتا ہے اور ہ سے متعلق بھی خیال کیا جا سکتا ہے۔ اِس کے برخلاف م اور ف میں ہر جگہ ہ کے نیچے زیر لگا ہوا ہے۔ اِس کو بہ فتحِ دوم اور بہ کسرِ دوم دونوں طرح درجِ لغات کیا گیا ہے۔ فیلن اور پلیٹس کے لغات میں "بَہن" اور "بہِن" دونوں طرح مندرج ہے۔ نور میں "بہ فتحِ دوم، نیز بہ کسرِ دوم" لکھ کر، یہ بھی لکھا گیا ہے کہ: "لکھنؤ میں اہلِ زبان بہ فتحِ دوم، بروزنِ "چمن" ہی بولتے ہیں" اور انیس کا ایک شعر بھی درج کیا ہے جس میں "دلھن" اور "بہن" ہم قافیہ ہیں۔ اِس کے برخلاف آصفیہ میں صرف "بہِن" (بہ کسرِ دوم) ہے۔ م اور ف کی مطابقت اختیار کی گئی ہے اور اِس لفظ کو ہر جگہ بہ کسرِ دوم لکھا گیا ہے۔ ایسے کئی لفظ ہیں جن میں دوسرا حرف ح یا ہ ہے اور شروع کے دونوں حرف مفتوح ہیں، جیسے: محل، بہل (مثلاً بہل گیا)۔ اِن کے تلفظ کا احوال یہ ہے کہ دوسرے حرف کے زبر کی آواز اِس طرح ترچھی ہو کر نکلتی ہے کہ زیر کی آواز سے قریب تر ہو جاتی ہے اور یہ اردو کی ایک خصوصیت ہے۔ "بہن" کے زبر کا بھی یہی احوال ہے، مگر اِس لفظ میں یہ بھی ہوا کہ ہ کی آواز میں یہ ترچھاپن زیادہ نمایاں ہوا، اِس نے مستقل حیثیت اختیار کر لی اور اِس طرح "بہِن" ایک مستقل صورت بن گئی اور یہ بھی واقعہ ہے کہ دہلی میں عموماً "بہِن" سننے میں آتا ہے اور آصفیہ کا اندراج اِس پر دلالت کرتا ہے کہ یہ تلفظ بہت پہلے سے استعمالِ عام میں اپنی جگہ بنا چکا ہے۔ م اور ف میں جو ہ کے نیچے زیر ہے، وہ بھی اِسی پر دلالت کرتا ہے اور اِس طرح یہ لفظ ایسے دوسرے الفاظ (مثلاً: محل، بہل، ٹھہر وغیرہ) سے گویا مختلف حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ اِس بنا پر اِس خاص لفظ میں ہ کے نیچے اگر زیر لگایا جائے تو وہ بے محل نہ ہوگا۔ چوں کہ دو نسخوں (م اور ف) میں ہ کے نیچے

زیر ہے اور آصفیہ میں بھی اِسی طرح مندرج ہے اور ششتے میں بھی اِسی طرح آیا ہے ؛ اِن وجوہ سے اِس لفظ کے تلفّظ کے سلسلے میں م اور ف کی مطابقت اختیار کی گئی ہے۔ [اِسی سلسلے میں دیکھیے اِسی ضمیمے میں لفظ "کٹھن"]۔

بھوکھ (ص ۲۳) : م، ن، ک، ف : بھوکھ۔ ع : بھوک۔ م، ک اور ف میں بھوکھ، بھوکھا، بھوکھے، بھوکھوں ہر جگہ دُو ھ کے ساتھ ملتے ہیں۔ مخطوطۂ گنجِ خوبی میں میر امّن نے کہیں تو ان کو ایک ھ کے ساتھ لکھا ہے اور کہیں دُو ھ کے ساتھ، مثلاً : بھوکھوں ۱۰۳، بھوکھے ۱۰۲، ۲۱۴، بھوکھا ۲۲۲، بھوک ۲۶۶، بھوکا ۲۲۵، ۲۶۷۔ جو طریقہ لفظ "بھوٹ" کے سلسلے میں اختیار کیا گیا ہے، اُسی کے مطابق اِس لفظ کا املا ہر جگہ دُو ھ کے ساتھ برقرار رکھا گیا ہے۔

بھونڈ پیری : ص ۳۸۲، ح ⑨

بھوئی (ص ۹۱) : پلیٹس کے لغت میں یہ لفظ موجود ہے اور اُس میں اِسے بہ واوِ معروف اور بہ واوِ مجہول، دونوں طرح لکھا گیا ہے (بھوئی۔ بھُوئی) ک میں واو کے اوپر علامتِ مجہول موجود ہے؛ اِسی بنا پر اِسے مع واوِ مجہول لکھا گیا ہے۔

بھیانک (ص ۱۹۶) : محض احتیاطاً صراحت کی جاتی ہے کہ ک میں اِسی طرح یعنی مع یائے مظہرہ ہے۔

بھیچاک : ص ۳۲۰، ح ⑦۔ نیز ص ۳۲۸، ح ③

بھیک (ص ۹۲) : ک، ف، ع میں "بھیکھ" ہے۔ اِسی پیراگراف میں یہ لفظ پھر آیا ہے اور وہاں بھی اِن سب نسخوں میں "بھیکھ" ہے۔ یہ لفظ چوتھے درویش کی سیر میں بھی آیا ہے : "ایک اندھا ہندوستانی فقیر بھیک مانگتا نظر آیا" (ک ص ۲۲۷) اور اِس مقام پر ک، ف، ع، سب میں "بھیک" (صرف ایک ہائے مخلوط کے ساتھ) ملتا ہے۔ گویا ک میں اِس لفظ کا املا مختلف فیہ ہے۔ البتّہ ن میں ہر جگہ "بھیک" (ایک ھ کے ساتھ) ہے۔ یہ لفظ مخطوطۂ گنجِ خوبی میں بھی آیا ہے اور اُس میں میر امّن نے اِسے صرف ایک ہائے مخلوط کے ساتھ "بھیک" لکھا ہے (ص ۲۲۰)۔ چوں کہ ک میں یہ لفظ دونوں طرح ملتا ہے (بھیکھ۔ بھیک) اور میر امّن کی اپنی تحریر میں اِس کا صرف ایک املا ملتا ہے (بھیک) اور اب مستعمل بھی بالعموم اِسی طرح ہے ؛ اِن وجوہ سے اِس کتاب میں اِسے ہر جگہ "بھیک" لکھا گیا ہے۔ [یہی طریقۂ کار ایسے دوسرے الفاظ کے سلسلے میں بھی اختیار کیا گیا ہے جن کا املا ک میں کہیں دُو ھ کے ساتھ ملتا ہے اور کہیں ایک ھ کے ساتھ۔ مثال کے طور پر،

دیکھیے اسی ضمیمے میں لفظ "ٹھنڈی" کی بحث]۔
بیابانی (ص ۱۹) : ک میں با کے نیچے زیر ہے، مگر ف میں ب کے اوپر زبر لگا ہوا ہے۔ م میں اس لفظ پر اعراب موجود نہیں۔ لفظ "بیابان" فارسی میں بہ فتح اوّل بھی ہے اور بہ کسرِ اوّل بھی، لیکن بہ کسرِ اوّل کو مرجّح بتایا گیا ہے (غیاث اللغات)۔ برہانِ قاطع کے ایرانی مرتّب ڈاکٹر معین نے بھی حاشیہ (ص ۳۳۰، جلدِ اوّل) میں جو کچھ لکھا ہے، اُس سے بھی بہ کسرِ اوّل کی تائید ہوتی ہے اور آصفیہ میں بھی بہ کسرِ اوّل کو "افصح" لکھا ہے۔ ک کی مطابقت میں ب کے نیچے زیر لگایا گیا ہے۔ ک میں "غول" کے نیچے اضافت کا زیر موجود نہیں، مگر م اور ف میں موجود ہے (اور ہونا بھی چاہیے)۔ م اور ف کے مطابق لام کے نیچے اضافت کا زیر لگایا گیا ہے۔
بے ادبی (ص ۱۵، ۱۹۷) : ک میں دال پر زبر موجود ہے۔ ف میں دال خالی ہے، مگر اُس کی فرہنگ میں اِسے دال کے زبر کے ساتھ ہی لکھا گیا ہے۔ بہ لحاظِ اصل بھی دال مفتوح ہے۔ اِنھی وجوہ سے دال پر زبر لگایا گیا ہے۔
بیاکل (ص ۱۵۰) : صرف یہ صراحت کرنا ہے کہ ک میں اسی طرح یعنی (بیاکل) مع یائے مخلوط ہے۔ صراحت کی ضرورت خاص کر یوں محسوس کی گئی کہ آصفیہ میں "بیاکل" ہے۔ ظاہر ہے کہ اِس صورت میں اس لفظ کو مع یائے مخلوط نہیں پڑھا جا سکتا۔ ک کی مطابقت اختیار کی گئی ہے۔
بیاہ : یہ لفظ اِس کتاب میں متعدد مقامات پر آیا ہے، اور ہر جگہ ک میں "بیاہ" ہے، یعنی مع یائے مخلوط۔ اسی کی مطابقت اختیار کی گئی ہے۔
بے پرواہی (ص ۸) : ک میں اسی طرح ہے۔ ف اور ع میں "بے پروائی" ہے۔ ک کی مطابقت اختیار کی گئی ہے، خاص کر یوں کہ (۱) مخطوطۂ گنجِ خوبی میں کئی جگہ یہ لفظ آیا ہے اور میر امّن نے اِسے مع ہائے ہوّز لکھا ہے، مثلاً: پرواہ: ۱۲۱، ۱۹۵۔ بے پرواہ: ۸۱، ۸۷، ۲۴۲، ۳۰۸۔ بے پرواہی: ۲۹۸، ۳۰۶۔ (۲) اصل لفظ "پروا" ہے، مگر اُردو میں "پرواہ" بھی استعمال میں رہا ہے، اِس کی اور بھی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں، مثلاً: او چلے جانے والے بے پرواہ؛ کچھ فقیروں کے حال پر بھی نگاہ۔ میر سوز [دیوان شائع کردۂ دہلی یونی ورسٹی، اُردوئے معلّی میر سوز نمبر، ص ۳۴۸]۔ تم کو اتنی بھی نہیں میری اگر پرواہ ہے؛ چھوڑ دو، روٹی نہ دو، بندی کا بھی اللہ

ہے۔ جانصاحب [دیوان مطبع حیدری لکھنؤ، ص ۱۳۹]۔ قدما کے یہاں "پروا" اور "پرواہ" دونوں صورتیں ملتی ہیں اور خود اِس کتاب میں بھی یہ دونوں شکلیں موجود ہیں۔ اِسی لیے اصولاً جہاں بھی اِن دونوں میں سے جو صورت ہو، اُسے برقرار رہنا چاہیے۔ اِسی طریقے پر عمل کیا گیا ہے اور ک میں جہاں جو صورت ہے، وہاں اُسی کو برقرار رکھا گیا ہے۔ اِسی بنا پر یہاں "بے پرواہی" لکھا گیا ہے اور ص ۴۳ پر "بے پروا" کو برقرار رکھا گیا ہے؛ اِس بنا پر کہ وہاں ک میں اِسی طرح ہے۔ (اِس طریقِ کار کو ایسے الفاظ کے سلسلے میں بہ طورِ عموم اختیار کیا گیا ہے)۔

بے تحاشی: ص ۳۷۰، ح (۴)۔

بینچ ڈالا (ص ۲۹): مصدر "بیچنا" کے مشتقات اِس کتاب میں کئی جگہ آئے ہیں اور اِس کتاب کے مختلف نسخوں میں کہیں تو وہ مع نونِ غنہ ملتے ہیں اور کہیں بغیر نونِ غنہ۔ مثلاً اِس مقام پر ک میں "بیچ" نونِ غنہ کے بغیر ہے۔ ف اور ع میں بھی یہاں نونِ غنہ موجود نہیں، مگر ن میں مع نونِ غنہ ہے۔ اِس سے پہلے ص ۲۴ پر "بیچیو" آیا ہے اور وہاں ن، ک، ف، ع کسی میں نونِ غنہ موجود نہیں۔ ص ۹۲ پر "بینچ لاؤ" اور "بینچ کر" ملیں گے؛ اِن دونوں مقامات پر ک، ف، ع میں نونِ غنہ موجود ہے مگر ن میں یہ دونوں لفظ نونِ غنہ کے بغیر ملتے ہیں۔ ص ۱۳۴ پر "بینچ بینچ کر" ملے گا؛ وہاں ن، ک، ف، ع؛ سب نسخوں میں یہ دونوں لفظ مع نونِ غنہ ملتے ہیں۔ ص ۱۷۹ پر "بینچی" ہے اور اُس مقام پر سب نسخوں میں یہ لفظ مع نونِ غنہ ملتا ہے۔

اِس ضمیمے میں شامل کئی لفظوں کے ذیل میں یہ لکھا گیا ہے کہ ہائے مخلوط اور نونِ غنہ کی آوازیں عجیب سیّال حالت میں رہی ہیں (اور آج تک یہ اثرات کچھ نہ کچھ موجود ہیں) خاص کر دہلی کے علاقے میں۔ آج بھی متعدد لفظ ایسے ہیں جو زبانوں سے جب ادا ہوتے ہیں تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ اِن میں غنہ آواز شامل ہے، مگر اُن میں سے بیش تر کو لکھا جاتا ہے نونِ غنہ کے بغیر۔ ایک ہی شخص اِس قبیل کے بعض الفاظ کو کبھی کبھی دو طرح لکھ جاتا ہے۔ خود میر امّن کی تحریر میں اِس کی متعدد مثالیں موجود ہیں۔ مخطوطۂ گنجِ خوبی میں ایک ہی صفحے پر میر امّن نے اپنے قلم سے "ہاتھ" بھی لکھا ہے اور "ہات" بھی۔ اِسی طرح ایک جگہ بے نمک کھانے کے لیے "پھینکا" لکھا ہے اور دوسری جگہ "پھیکا"۔ ک میں بھی ایسے اختلافات موجود ہیں، مثلاً ہرے چنے کے لیے ایک جگہ "بوٹ" ہے اور دوسری جگہ "بونٹ"۔ اِس صورتِ حال کے پیشِ نظر یہ طریقۂ کار اختیار کیا گیا ہے کہ ایسے لفظوں کی ایسی مختلف املائی صورتوں

کو اُن کے مقامات پر علیٰ حالہٖ رکھا گیا ہے، یعنی ک کی مطابقت کو ترجیح دی گئی ہے۔ اسی بنا پر ص ۴۲ پر "بیچیو" کو برقرار رکھا گیا ہے اور یہاں "بیچ ڈالا" کو۔ اور جن مقامات پر ک میں اِس مصدر کے مشتقات مع نونِ غنّہ ملتے ہیں (جن کا اوپر حوالہ دیا جاچکا ہے) اُن کو اُسی طرح برقرار رکھا گیا ہے، مثلاً ص ۱۹۳ پر "بینچ لاؤ" اور "بینچ کر" کو علیٰ حالہٖ رہنے دیا گیا ہے۔

آصفیہ میں صرف "بیچنا" (بغیر نونِ غنّہ) ہے، مگر فیلن کے لغت میں "بیچنا" اور "بینچنا" دونوں صورتیں محفوظ ہیں اور اِس سے اِس مصدر میں اختلاف کا اندازہ بہ خوبی کیا جاسکتا ہے (تلفظ کی حد تک آج بھی اِس مصدر کے مشتقات میں یہ دو رنگی کارفرما ملتی ہے)۔

بےخبری (ص ۱۴) : ک میں اِس لفظ پر اعراب موجود نہیں۔ ف میں رے کے نیچے تو زیر ہے مگر شروع کے دونوں حرف خالی ہیں۔ اُس کی فرہنگ میں "بےخبر" تو مندرج ہے، مگر "بےخبری" موجود نہیں۔ [آصفیہ میں بھی "بےخبر" تو ہے، مگر "بےخبری" مندرج نہیں] - بہ لحاظِ اصل "بےخبری" ہونا چاہیے۔ سماعت میں "بےخبری" بھی آتا ہے اور "بےخبری" بھی، مگر اوّل الذکر بیش تر؛ اسی نسبت سے یہاں ب پر زبر لگایا گیا ہے۔

لفظِ "خوش" کا ایک مرکب "خوش خبری" بھی ہے۔ اِس کا احوال یہ ہے کہ نظم میں تو "خوش خبری" دیکھا گیا ہے، مگر سننے میں اکثر و بیش تر "خوش خبری" آیا ہے۔ ص ۱۹۲ پر یہ لفظ آیا ہے اور وہاں بھی ک اور ف، دونوں میں شروع کے دونوں حرف خالی ہیں۔ وہاں استعمالِ عام کے مطابق ب پر جزم لگایا گیا ہے۔

بیوپار یوں (ص ۱۹۹) : ک میں پہلے ٹکڑے (بیو) کی ی پر علامتِ مجہول موجود ہے (بیو) (مطلب یہ ہوا کہ اِس لفظ میں یائے مخلوط نہیں)۔ ف کی فرہنگ میں اِسے BYOPARI لکھا گیا ہے اور اِس صورت میں اِس میں واضح طور پر یائے مخلوط ہے۔ بیوڑی، ڈیوڑھی، بیوڑا، نیو جیسے لفظوں کو ک میں مع یائے مجہول (ساکن) لکھا گیا ہے (اِن سے متعلق نوٹ اِسی ضمیمے میں دیکھے جاسکتے ہیں) اور اِس صورت میں اِن سب لفظوں میں پہلا حرف گویا مکسور ہوا (اگرچہ تلفظ میں آکر یہ زیر دب جاتا ہے) اِسی نسبت سے اِس لفظ میں بھی ب کے نیچے زیر ہوا اور تلفظ کے اعتبار سے یہ فاعلاتن کے وزن پر ہوا (اگرچہ عام طور پر اِسے (مع یائے مخلوط) مفعولن کے وزن پر بولا جاتا ہے)۔ میں نے محض از رُوئے احتیاط اِس لفظ پر اعراب نہیں لگائے ہیں۔

بے وُقوف (ص ۱۹) : کے میں اِس مقام پر تو اِس لفظ پر اعراب موجود نہیں؛ البتہ ف میں واو کے اوپر پیش لگا ہوا ہے ("بے وُقوف") کے میں ص ۱۳۰، ص ۱۳۲ اور ص ۱۴۸ پر بھی یہ لفظ ہے اور اِن مقامات پر واو کے اوپر پیش لگا ہوا ہے۔ ف میں بھی اِن مقامات پر "بے وُقوف" لکھا ہوا ہے۔ اسی کی مطابقت اختیار کی گئی ہے۔ وضاحت کی ضرورت یوں محسوس کی گئی کہ اب یہ لفظ عموماً بہ فتحِ واو (بے وَقوف) سننے میں آتا ہے اور اِس تلفظ کے عام ہونے کا اندازہ یوں بھی ہوتا ہے کہ آصفیہ میں "بے وُقوف" اور "بے وُقوفی" ہی مندرج ہیں۔ چوں کہ کے اور ف دونوں میں واو کے اوپر پیش موجود ہے، اِس لیے واو کے اوپر پیش لگایا گیا ہے۔ [یہ مرکب ہے "بے" اور "وُقوف" سے اور دونوں احمق کے معنی میں مستعمل ہے۔]

پانْو (ص ؛) : کے : پانْوں۔ ف : پانْوں۔ م : پانو۔ ع : پانْو۔

یہ لفظ پہلے کئی طرح لکھا جاتا تھا۔ باغ و بہار کے نسخۂ فورٹ ولیم کالج (کے) میں اِس لفظ کے پانچ املا ملتے ہیں : پانْو، پانوں، پانْوں، پاوں، پاؤں؛ لیکن "پانو" اور "پاؤں" بیش تر اور باقی بہت کم آئے ہیں۔ "پانو" اور "پاؤں" قریب قریب برابر کی تعداد میں ملتے ہیں۔ گنج خوبی کے مخطوطے میں [جو میر امن کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے] اختلافِ املا پایا جاتا ہے؛ مگر اس میں پانچ کے بجائے چار صورتیں ملتی ہیں : پانو، پاؤں، پانْو، پانوں۔ میرے شمار کے مطابق اس مخطوطے میں "پانوں" ایک جگہ ہے، "پانْو" تین جگہ، "پانو" نو جگہ اور "پاؤں" بھی نو جگہ ہے۔ اسی مخطوطے میں [اسم جبل کے ایک دوسرے لفظ] "گانو" کے صرف دو املا ملتے ہیں : گانو، گانوں۔ اسی انداز کا ایک اور لفظ ہے "چھانو"۔ اِس مخطوطے میں اِس لفظ کے تین املا ملتے ہیں : چھانو، چھانو، چھاؤں؛ مگر اِس تناسب کے ساتھ کہ "چھانو" صرف ایک جگہ ملتا ہے، "چھاؤں" دو جگہ اور "چھانو" تین جگہ ملتا ہے۔

باغ و بہار کے نسخۂ کے میں ص ۱۳۶ پر ایک جگہ یہ لفظ اِس طرح چھپا ہوا ہے کہ نونِ غنہ کی علامت موجود نہیں۔ غلط نامے میں اِس کی تصحیح کی گئی ہے اور صحیح صورت "گانْو" بتائی گئی ہے اور اِس طرح "گانْو" کی ترجیح پوری طرح نمایاں ہو جاتی ہے۔

یوں دیکھیے تو باغ و بہار (کے) اور مخطوطۂ گنج خوبی میں مجموعی طور پر اِن تینوں لفظوں کا املا "پانو، گانو، چھانو" زیادہ مقامات پر ملتا ہے اور اِسی بنا پر اِس کتاب میں اِن تینوں لفظوں کے اِسی

املا کو ترجیح دی گئی ہے۔ اصل بحث کے بعد لفظ "پانو" کے سلسلے میں بعض ضمنی باتوں کا اندراج مزید وضاحت کے لیے مناسب معلوم ہوتا ہے۔ مؤلفِ نور اللغات نے "پاؤں" کے ذیل میں لکھا ہے: "حضرات لکھنؤ آخر میں نون (پاؤں) اور حضراتِ دہلی آخر میں واو (پانو) لکھتے ہیں۔" یہی بات تنویر نیموی نے رسالۂ اصلاح میں لکھی ہے: "پاؤں: اس کا املا مختلف فیہ ہے۔ دلی والے "پانو" لکھتے ہیں اور ردیفِ واو میں لاتے ہیں اور لکھنؤ والے "پاؤں" لکھتے ہیں اور ردیفِ نون میں لاتے ہیں۔ اور بعضے "پانوں" بھی لکھتے ہیں۔" یہ اقوال اس لحاظ سے ضرور درست ہیں کہ غالب کی وہ غزل جس کا مطلع یہ ہے:

دھوتا ہوں جب میں پینے کو اُس سیم تن کے پانو ؛ رکھتا ہے ضد سے کھینچ کے باہر لگن کے پانو

اُن کے دیوان میں ردیفِ واو میں ہے؛ اور اسی زمین میں آتش کی غزل، اُن کے دیوان میں ردیفِ نون میں ملتی ہے۔ علاوہ ازیں جلال نے اپنے رسالۂ تذکیر و تانیث "مفید الشعرا" میں "پاؤں" کو اُن الفاظ میں شامل کیا ہے "جن کے آخر میں نون ہے"۔ [اس رسالے میں الفاظ کی فصلیں حرفِ آخر کی رعایت سے قائم کی گئی ہیں] اس طرح یہ تو طے ہو جاتا ہے کہ اربابِ لکھنؤ کے یہاں اِس لفظ کا املا "پاؤں" ملتا ہے، البتہ دہلی میں "پاؤں" اور "پانو" دونوں املا ملتے ہیں۔ اِس لفظ کے سلسلے میں یہ بات بھی پیشِ نظر رہنا چاہیے کہ اصولاً بھی اس کا املا "پانو" مرجح ہوگا۔ یہ تلفظ سے قریب تر ہے اور اِس صورت میں "پانا" مصدر کے فعل "پاؤں" سے امتیاز بھی نمایاں رہتا ہے۔ اِس کی جمع "پانوؤں" بھی اُسی صورت میں بنے گی جب واحد "پانو" ہو (پانو - ؤں - پانوؤں) "پاؤں" کی جمع تو "پاؤؤں" بننا چاہیے اور اِس طرح کوئی نہیں لکھتا۔ ایک بات اور: تلفظ میں یہ لفظ بروزن "فاع" آتا ہے اور یہ "پانو" کے مساوی ہے۔ "پاؤں" بروزن "فعلن" ہوگا؛ قدما کے یہاں اِس طرح ضرور پایا جاتا ہے؛ مگر بہ قول صاحبِ نور اللغات اب "بروزن فعلن متروک ہے"۔ کلیاتِ میر مرتبۂ آسی میں جمع کی صورت میں یہ لفظ یوں ملتا ہے: "آنکھیں کفک سے اُس کی لگا کر خاک برابر ہم بھی ہوئے ؛ مہندی کے رنگ اُن پانوں نے تو بہتوں کو پامال کیا" (ص ۱۸) یہاں لفظ "پانوں" بہ طورِ جمع آیا ہے اور یہ جمع بھی اُسی صورت میں بنے گی جب واحد "پانو" ہو۔

"پتا" (ص ۶۶): سب نسخوں میں اِس لفظ کا یہی املا ہے، یعنی آخر میں الف ہے۔ یہ لفظ اِس کتاب میں متعدد مقامات پر آیا ہے؛ اور ہر جگہ م، ت، ک، ف، ع؛ سب نسخوں میں اِس لفظ کا یہی املا ملتا

ہے [صحیح املا بھی یہی ہے] یہ صراحت یوں کی گئی کہ کچھ لوگ "پتہ" بھی لکھتے ہیں اور (غلطی سے) یہ
خیال کرتے ہیں کہ اِس لفظ کا صحیح املا یہی ہے۔ پتا، پیسا، بھروسا جیسے (دیسی) الفاظ کے آخر میں
م، ک، ف، ع میں بہ طورِ عموم الف ملتا ہے۔ اِسی کی مطابقت اختیار کی گئی ہے۔

پچتا دے گا (ص ۲۹) : م، ن، ک، ف اور ع میں اِسی طرح (ہائے مخلوط کے بغیر) ہے۔
ک میں جہاں بھی "پچتانا" مصدر کے مشتقات آئے ہیں، اُن کو ھ کے بغیر ہی لکھا گیا ہے، مثلاً:
پچتایا ص۹۲، پچتاؤگی ص۹۹۔ مخطوطۂ گنج خوبی میں بھی ہر جگہ یہ لفظ اِسی طرح (ھ کے بغیر) ملتا ہے،
مثلاً: پچتادے گا ص۹۳، ص۳۲۰۔ پچتاوا ص۱۰۱، ص۱۸۲، ص۱۹۲۔ اِسی کی مطابقت اختیار کی گئی ہے اور
اِس مصدر کو اور اِس کے مشتقات کو ھ کے بغیر لکھا گیا ہے۔

آصفیہ میں بھی "پچتانا" ملتا ہے۔ مؤلف نے اِس کے ذیل میں یہ بھی لکھا ہے: "اگلے
لوگ اِس کو املائً "پچھتانا" لکھتے ہیں، مگر اِس کے مادّے سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی"۔ مطلب
یہ نکلا کہ مؤلف کے نزدیک صحیح املا "پچتانا" ہے۔ نور میں "پچھتانا" ہے لیکن جلالؔ نے اپنے
لغت سرمایۂ زبانِ اُردو میں "پچتانا" لکھا ہے۔

پچھم : ص ۳۰۶، حاشیہ (۴)

پرواہ، پرواہ : دیکھیے "بے پرواہی"۔

پروانگی : ص ۳۰۰، حاشیہ (۲)

پذیرا (ص ۱۲۴) : یہ لفظ اِس سے پہلے ص ۱۱۹ پر بھی آیا ہے۔ دونوں مقامات پر ک اور
ف میں "پذیرا" ہے اور ع میں "پزیرا"۔ ک کے املا کو ترجیح دی گئی ہے، خاص کر یوں کہ اِس
لفظ میں اصلاً ذال ہی ہے۔ برہانِ قاطع (مرتّبۂ ڈاکٹر محمد معین، طبع تہران) میں اِس لفظ کو
"بائے فارسی با ذالِ نقطہ دار" کی فصل میں لکھا گیا ہے۔ اِس کے مصدر کو بھی اِسی فصل میں درج
کیا گیا ہے اور اُس کے دوسرے مشتقات کو بھی۔ مندرجۂ ذیل الفاظ اِس لغت میں اِس فصل
میں ملتے ہیں: "پذرفت، پذرفتکار، پذرفتن، پذرفتہ، پذیر، پذیرا، پذیرش، پذیرفت،
پذیرفتکار، پذیرفتن، پذیرفتہ، پذیرہ"۔ آصفیہ میں بھی "پذیرا" (مع ذال) ہے۔ "پذیرا" کے
تلفظ میں یہ اختلاف ہے کہ حرفِ اوّل مکسور بھی ہے اور مفتوح بھی (غیاث اللغات)۔
برہانِ قاطع میں "پذیر" کو بر وزنِ "وزیر"، "پذیرا" کو بر وزنِ "نصیرا" اور "پذرفت" کو "بہ کسرِ
اوّل" لکھا گیا ہے، اِس سے تلفّظ کے اختلاف کا بہ خوبی علم ہو جاتا ہے۔ ک اور ف میں

"حرفِ اوّل پر حرکت موجود نہیں، مگر ف کی فرہنگ میں "پذیر" اور "پذیرہ" کو بہ فتحِ اوّل لکھا گیا ہے اور آصفیہ میں بھی پے پر زبر لگا ہوا ہے۔ اِن وجوہ سے اِس لفظ کو بہ فتحِ اوّل لکھا گیا ہے۔

پُر پیچ (ص ۱۶۸): ن اور ک میں اِسی طرح ہے۔ ک میں ی پر علامتِ مجہول بھی موجود ہے، جس سے کسی طرح کا شک باقی نہیں رہتا۔ ف میں "پرپنچ" ہے (اِس پر اعراب موجود نہیں اور ف کی فرہنگ میں بھی یہ لفظ شامل نہیں)۔ ع میں "پُرپنچ" ہے، مگر اِس کی فرہنگ میں پرپیچ" (مع ی) ہے۔ لغات سے معلوم ہوتا ہے کہ اصل لفظ "پرپنچ" (مع نونِ ساکن) ہے۔ فیلن نے اپنے لغت میں اِسی طرح لکھا ہے اور اِس کے ذیل میں یہ مثل بھی درج کی ہے: "کریں پرپنچ کہلائیں پنچ"۔ آصفیہ میں بھی "پَرپَنچ" ہے اور اُس میں بھی اِسی مثل کو پیش کیا گیا ہے۔ اِس مثل کے آخری ٹکڑے میں "پنچ" کا لفظ بظاہر اِسی پر دلالت کرتا ہے کہ پہلے ٹکڑے کا آخری لفظ "پرپنچ" (مع نونِ ساکن) ہے۔ فیلن نے اِس کی ایک صورت "پھر پھنڈ" بھی لکھی ہے اور اِس سے بھی "پرپنچ" کی تائید ہوتی ہے۔ پلیٹس نے بھی اپنے لغت میں "پَرَپنچ" لکھا ہے (پے اور رے دونوں پر زبر)۔ اِس کے بعد "پَرَپنچی" لکھا ہے، جو اِسی سے بنا ہے۔ غرض کہ لغات میں "پرپنچ" (مع نونِ ساکن) ہے۔ "پرپیچ" کسی لغت میں مجھے نہیں ملا اور کسی اور کتاب میں بھی نظر سے نہیں گزرا۔ ہاں ع کی فرہنگ میں ضرور "پرپیچ" ہے [جب کہ اُس کے متن میں "پُرپنچ" ہے۔ معلوم نہیں کتابت کی غلطی کہاں ہے]۔ یہ خیال کیا جا سکتا تھا کہ ک میں کتابت کی غلطی ہے، مگر ن میں بھی "پرپیچ" ہے اور یوں ک میں غلطیِ کتابت کا احتمال صحیح نہیں ٹھہرتا، اور اِس کا صاف طور پر مطلب یہی نکلتا ہے کہ مصنّف نے اِسی طرح لکھا تھا۔ [غالباً ف کے مرتّب ڈنکن فوربس نے لغت کو دیکھ کر اِس لفظ کی تصحیح کی ہے، یہ سمجھ کر کہ یہ غلطیِ کتابت ہے]۔ میر امن کی نثر میں کئی لفظوں کی شکل صورت بدلی ہوئی نظر آتی ہے اور اِس لفظ کو بھی میں اُنھی میں شامل سمجھتا ہوں؛ اِسی بنا پر میں نے ن اور ک کی مطابقت اختیار کی ہے اور "پرپیچ" کو برقرار رکھا ہے۔ یہ گویا "پرپنچ" کی ایک نئی صورت ہے۔

پُرتگالی (ص ۱۷۱): ن، ک، ف: پرتکالی۔ ع: پرتگالی۔ غیاث اللغات سے معلوم ہوتا ہے کہ اِس لفظ کا قدیم املا کاف کے ساتھ ہی ہے: "پرتکال: بالفتح و تاے فوقانی موقوف و کافِ عربی...... و نوعے از شراب است کہ بعد از ہفت بار کشیدن حاصل می شود"۔

اِس سے معلوم ہوا کہ کے اور ف میں جو املا ہے، وہ بے اصل نہیں۔ اِسی بنا پر اِس لفظ کو اِسی طرح (یعنی کاف کے ساتھ) برقرار رکھا گیا ہے۔ [ہاں اب "پرتگالی" مستعمل ہے]۔ غیاث کے مطابق پ پر زبر ہے اور ت موقوف ہے؛ مگر کے میں پ کے اوپر پیش لگا ہوا ہے اور ف کے آخر میں جو فرہنگ ہے، اُس میں بھی اِسے بہ ضمِ اوّل و فتحِ سوم (و کافِ عربی) درج کیا گیا ہے: "PURTAKALI"۔ اِسی کے مطابق یہاں پ پر پیش لگایا گیا ہے اور ت پر زبر۔

پَرِندہ (ص ۹۱): کے میں رے کے نیچے زیر لگا ہوا ہے۔ کے میں ص ۲۰۴ پر بھی یہ لفظ آیا ہے، وہاں بھی رے کے نیچے زیر موجود ہے۔ نیز ص ۹، پر "چرند پرند" ہے، یعنی یہاں بھی دونوں لفظوں میں رے کے نیچے زیر موجود ہے۔ اِس کے علاوہ، مخطوطۂ گنجِ خوبی میں بھی "پرند" (ص ۴۰) اور "پرندہ" (ص ۱۸۸) ہے، یعنی میر امّن نے دونوں جگہ رے کے نیچے زیر لگایا ہے۔ اِسی کی مطابقت اختیار کی گئی ہے۔ وضاحت کی ضرورت یوں محسوس کی گئی کہ نور میں "پَرَندہ" ہے اور آصفیہ میں "پَرَندہ" لکھ کر، یہ بھی لکھا گیا ہے کہ: "مشہور بہ فتحِ رائے مہملہ"۔ فارسی میں "پرندہ" ہے۔ مرتبِ برہانِ قاطع ڈاکٹر معین نے حاشیۂ کتاب میں "پرندہ" کا اضافہ کیا ہے اور اِسے "بہ فتحِ اوّل و دوم" لکھا ہے۔ اُردو میں بہ ہر طور زبانوں پر "پَرِندہ" ہے اور میر امّن نے بھی اِسی طرح لکھا ہے۔ ہاں "پرند" کو شعرا نے بہ فتحِ دوم نظم کیا ہے، صرف ایک مثال: وہ تیغ کی تڑپ، وہ تگ و دو سمند کی ؛ وحشت ہرن کی، تیز پری تھی پرند کی ؛ ترکیب کچھ جدا تھی ہر اک جوڑ بند کی ؛ پنہاں ہوا سوار، جو گردن بلند کی ؛ پریوں کی جان جاتی تھی یال اُس کی دیکھ کر ؛ طاؤس سر جھکاتے تھے چال اُس کی دیکھ کر (دبیر انیس) لیکن "پرندہ" اُردو والوں کی زبان پر بہ کسرِ دوم (پَرِندہ) ہی ہے۔ گویا "پرند" ایک مختلف لفظ کے طور پر مستعمل رہا ہے اور اِس کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ کے میں ص ۱۶۱ پر "پَرَند" ملتا ہے۔ اِس سے واضح طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اِن دونوں لفظوں کو مستقل لفظوں کے طور پر استعمال میں لایا گیا ہے۔ "پَرَند" میں فارسی اعراب کی رعایت کارفرما رہی اور "پَرِندہ" میں اُردو کے استعمالِ عام نے اپنے آپ کو نمایاں کیا۔

پرواہ : دیکھیے اِسی ضمیمے میں "بے پرواہی"۔

پَروَردگار (ص ۱۵): م میں دال کے نیچے زیر لگا ہوا ہے؛ مگر کے اور ف میں دال خالی ہے (اِس کا بہ ظاہر مطلب یہ ہے کہ نظرِ ثانی میں زیر کو نکال دیا گیا)؛ مگر ف کی فرہنگ میں اِسے

بہ کسرِ دال ہی لکھا گیا ہے۔ اصلاً "پروَرْدگار" ہے یعنی دال موقوف ہے۔ صاحبِ غیاث اللغات نے وضاحت بھی کر دی ہے: "بہ دالِ موقوف نہ بہ کسرِ دال، مرکب از پرورد ... گار"۔ آصفیہ میں دال خالی ہے، مگر نور میں یہ صراحت موجود ہے کہ دال موقوف ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اصلاً دال موقوف ہے، مگر اردو والوں کی بول چال میں یہ لفظ زبانوں سے اِس طرح ادا ہوتا ہے جیسے دال کے نیچے زیر ہو۔ میں نے بھی کَ کی مطابقت میں دال کو خالی رکھا ہے۔ اگر اس کو "پَرْوَرْدگار" پڑھا جائے گا تو اصل کے لحاظ سے تو یہ ضرور درست ہوگا، اور اگر اس کو "پَرْوَرْدِگار" کہا جائے گا تو اُردو میں استعمالِ عام کے اعتبار سے یہ درست ہوگا۔

پَریشان (ص ۱۴): ۴ اور کَ میں یَے پر مجہول کی علامت موجود ہے۔ کَ میں یہ لفظ جہاں بھی آیا ہے، مع علامتِ مجہول ملتا ہے، مثلاً ص ۱۲، ۴۳، ۴۴، ۴۵، ۵۰۔ علاوہ ازیں مخطوطۂ گنجِ خوبی میں بھی میر امّن نے اِس کو اسی طرح (مع یائے مجہول) لکھا ہے۔ اسی بنا پر اسے مع یائے مجہول رکھا گیا ہے۔ مولانا احسن مارہروی نے ایک خط میں لکھا ہے: "پریشان" میں دلّی والوں کی زبان سے اکثر یائے مجہول سُنی ہے اور لکھنؤ وغیرہ میں معروف۔ غرض کہ صحیح دونوں طرح ہے۔" [مکاتیبِ احسن، ص ۱۴۶] میر امّن کی تحریر سے دلّی سے متعلق مولانا احسن کے قول کی تائید ہوتی ہے۔

پڑوانا: ص ۲۷۰، ح ⑤۔

پیشواز: ص ۲۹۳، حاشیہ ①۔

پِلِشت (ص ۵۷): کَ میں اِس لفظ پر اعراب موجود نہیں۔ شَ میں پَے اور لام دونوں کے نیچے زیر لگا ہوا ہے (پِلِشت)۔ آصفیہ میں یہ لفظ موجود نہیں۔ فیلن کے لغت میں بھی موجود نہیں۔ پلیٹس نے اسے "پَلَشْت" اور "پِلِشت" لکھا ہے۔ نور میں "پَلِشت" ہے، اور سنگھ میں بھی اسی طرح آیا ہے۔ اِس بنا پر (نور اللغات کے مطابق) پَے کے اوپر زبر اور لام کے نیچے زیر لگایا گیا ہے۔ (یہ "پلید" کی ذرا بدلی ہوئی شکل ہے اور یوں بھی پَے پر زبر مرجّح ہے)۔ یہ لفظ استعمال میں رہا ہے، صرف دو مثالیں: کیا چیز ہے گلاب، کلی اُس کی جو پلشت ٭ کر بیٹھے تک مقابلہ اُس کے دہن کے ساتھ۔ انشا (کلامِ انشا، ص ۱۸۹)۔ برآوے نہ اُن سے عدو بے پلشت ٭ ازل سے ظفر اُن کی ہے سرنوشت۔ میر حسن (مثنویاتِ حسن، مجلسِ ترقّیِ ادب لاہور، ص ۲۵۷)۔

پیند جھلانا: ص ۳۰۳، حاشیہ ⑦۔

پنڈت خانہ: یہ لفظ ص ۱۱۹، ۱۲۰، ۱۳۰، ۱۴۴ اور ۱۹۲ پر آیا ہے۔ کَ میں چار مقامات پر اِس لفظ پر اعراب موجود نہیں۔ البتّہ ص ۱۲۰ کے مطابق کَ میں ڈال کے نیچے زیر لگا ہوا ہے (کَ ص ۱۱۷)۔ فَ میں سب مقامات پر ڈال کے نیچے زیر موجود ہے اور اُس کی فرہنگ میں بھی اِسے بہ کسرِ ڈال لکھا گیا ہے۔ اِسی کی مطابقت اختیار کی گئی ہے۔ آصفیہ میں یہ لفظ موجود ہے مگر ضبطِ حرکات کے بغیر۔ فیلن نے اپنے لغت میں اِسے بہ فتحِ سوم لکھا ہے اور پلیٹس نے بہ کسرِ سوم۔ طلبہ کے استفادے کے لیے یہ وضاحت کی جاتی ہے کہ جیل خانے کے معنی میں یہ لفظ مستعمل رہا ہے۔ اِس معنی میں یہ کس طرح مستعمل ہونے لگا، اِس کے متعلق میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ [پلیٹس نے اِسے "بندی خانہ" کی بگڑی ہوئی شکل بتایا ہے، اور اِس کے معنی قید خانہ اور چوہے خانہ لکھے ہیں۔] پاکستان سے ترقیِ اُردو بورڈ (کراچی) کا جو لغت چھپ رہا ہے، اُس کی چوتھی جلد میں اِس کی یہ دو مثالیں درج کی گئی ہیں: "جہت نے کہا: جس پنڈت خانے میں وہ کنیز قید ہے، اُس میں دو شخص اور بھی قید ہیں" [طلسمِ ہوش ربا، چہارم، ص ۱۱۴۷]۔ دوسری مثال اودھ پنچ سے پیش کی گئی ہے: "پنڈت خانے میں درس بدمعاشی و دُزدی و بداخلاقی کا لیں گے۔" میر امّن کا یہ عام انداز ہے کہ وہ مرادفات سے اکثر کام لیتے ہیں، قید خانے کے لیے بھی اُنھوں نے باغ و بہار میں پانچ لفظ استعمال کیے ہیں: بندی خانہ، قید خانہ، محبوس خانہ، زنداں، پنڈت خانہ۔ اور یہاں یہ صراحت بھی بے جا نہ ہوگی کہ اِس لفظ کو ہر جگہ منفصل لکھا گیا ہے، یعنی: پنڈت خانہ۔ اِس طرح یہ احتمال خود بہ خود ختم ہو جاتا ہے کہ شاید "بندیخانہ" کو "پنڈتخانہ" پڑھ لیا گیا ہو۔ یہ بھی صراحت کی جاتی ہے کہ میر امّن نے اپنی دوسری کتاب گنجِ خوبی میں بھی اِس لفظ کو قید خانے کے معنی میں کئی جگہ استعمال کیا ہے، مثلاً: "محبوس کو پنڈت خانے سے نکال لاؤ" (مخطوطۂ گنجِ خوبی، ص ۵۹)۔ ص ۱۵۸، ۲۳۲، ۲۴۳، ۳۴۳ پر بھی یہ لفظ موجود ہے۔ مزید یہ کہ میر امّن نے ہر جگہ اِس لفظ کے دونوں ٹکڑوں کو الگ الگ لکھا ہے (جس طرح کَ میں ہے)، البتّہ اعراب کسی ایک جگہ بھی موجود نہیں۔ یہ بات بھی کہنے کی ہے کہ باغ و بہار سے پہلے کی کسی کتاب میں مجھے یہ لفظ نہیں ملا، یعنی اب تک کی میری ناتمام معلومات کے مطابق سب سے پہلے اِس لفظ کو قید خانے کے معنی میں میر امّن نے استعمال کیا ہے۔

پَیْن شُوئی (ص ۱۴۱): کَ میں واو کے اوپر علامتِ مجہول موجود ہے۔ فَ کی فرہنگ میں بھی اِسے مع واوِ مجہول لکھا گیا ہے اور پلیٹس کے لغت میں بھی یہ مع واوِ مجہول مندرج ہے۔ اِنھی وجوہ

سے اسے مع واوِ مجہول لکھا گیا ہے۔ وضاحت یوں کی گئی کہ آصفیہ میں اسے مع واوِ معروف لکھا گیا ہے۔ [نور میں اور فیلن کے لغت میں یہ لفظ موجود نہیں]۔

پنگھوڑلا (ص ۱۴۲): ن، ک، ف، ع: سب میں اس لفظ کا یہی املا ہے، اسی کی مطابقت اختیار کی گئی ہے۔ یہ صراحت بے محل نہ ہوگی کہ آصفیہ اور نور میں "پنگھولا" موجود نہیں۔ آصفیہ میں "پنگوڑا" ہے۔ نور میں بھی "پنگوڑا" ہے اور اسے دہلی سے مخصوص کیا گیا ہے۔ یہ صراحت بھی موجود ہے کہ: "بہ کسرِ اوّل و واوِ معروف"۔ فیلن کے لغت میں "پنگوڑا" اور "پنگولا" ہے، البتہ پلیٹس کے لغت میں اس لفظ کی چھے شکلیں پائی جاتی ہیں: پنگوڑا، پنگوڑا، پنگوڑہ، پنگولا، پنگھوڑا، پنگھولا۔ یہ آخری شکل وہی ہے جو ن، ک اور ف میں ہے۔

پھانئے: ص ۲۸۵، حاشیہ (۴)۔

پھٹکری (ص ۱۸): یہ لفظ کئی طرح نسخے میں آیا ہے۔ فیلن اور پلیٹس کے لغات میں اسے "پھٹکری، پھٹکری، پھٹکری" تین طرح لکھا گیا ہے۔ یہاں اسے "پھٹکری" یوں لکھا گیا ہے کہ م، ک، ف: تینوں نسخوں میں یہ اسی طرح لکھا ہوا ہے، یعنی پ اور کاف دونوں کے نیچے زیر لگے ہوئے ہیں۔ علاوہ ازیں، صاحبِ آصفیہ نے بھی اسے اسی طرح لکھا ہے اور اس سلسلے میں یہ وضاحت بھی کی ہے: "ہندو اور اہلِ مشرق بہ فتحِ اوّل بولتے ہیں، اور اہلِ دہلی بہ کسرِ بائے فارسی و کافِ تازی"۔

پھسا پھندے: ص ۲۹۴، حاشیہ (۶)۔

پھنک رہی ہوں (ص ۶۲): "پھونکنا" مع نونِ غنہ ہے۔ (اصل لفظ "پھونک" بھی مع نونِ غنہ ہے) اس کا لازم "پھنکنا" ہونا چاہیے تھا، مگر "پھکنا" زیادہ مستعمل رہا ہے۔ آصفیہ میں "پھکنا" ہے۔ "پھ مع نون" کی فصل میں "پھنکنا" بھی لکھا گیا ہے، لیکن اس کے ساتھ یہ لکھا گیا ہے کہ "دیکھو پھکنا" اور اس سے "پھکنا" کی ترجیح ظاہر ہے۔ م، ن، ک، ع، ف: سب میں "پھنک" ہے، اور اسی کی پابندی کی گئی ہے۔

پہن (ص ۱۸): اس کا مصدر "پہننا" ہے۔ آصفیہ میں تو صراحت نہیں، مگر پلیٹس نے اپنے لغت میں اسے "پہننا" اور "پہننا" دونوں طرح درج کیا ہے۔ ٹہلنا، بہلنا جیسے مصادر کو لغات میں عموماً بہ فتحِ ہائے ہوز لکھا گیا ہے، البتہ تلفظ میں یہ سب اس طرح آتے ہیں کہ "ہ" کا زبر، زیر کی آواز سے قریب ہو کر نکلتا ہے اور یہ اردو والوں کے تلفظ کی خصوصیت ہے۔ ک میں ایسے بعض الفاظ میں تو "ہ"

پہ زبر لگا ہوا ملتا ہے، جیسے "نہلوانا"۔ اور بعض الفاظ میں ہ کے نیچے زیر ملتا ہے، جیسے: نہِن (کہ یہ بھی اصلاً "نہن" ہے) یہاں بھی ک میں "پہِن" ہے، یعنی پ کے اوپر زبر ہے اور ہ کے نیچے زیر لگا ہوا ہے۔ اسی کی مطابقت اختیار کی گئی ہے۔ ایسے جملہ الفاظ کے سلسلے میں عمومی طور پر ک کی مطابقت اختیار کی گئی ہے، یعنی ک میں اگر ہ پر زبر ہے تو زبر لگایا گیا ہے اور ہ اگر مکسور ہے، تو اُس لفظ میں ہ کے نیچے زیر لگایا گیا ہے۔ ایسے کئی لفظوں کے سلسلے میں "ضمیمۂ اختلافِ نسخ اور تشریحات" میں بھی مختلف صفحات کے حواشی کے ذیل میں ضروری تفصیلات ملیں گی۔

پھپھے پھکی: ص ۱۶۱، ح (۴)۔

پھوئیاں: ص ۲۰۰، حاشیہ (۵)۔

پیار (ص ۱۲): م اور ک میں "پیار" ہے، یعنی مع یائے مخلوط ہے۔ یہ لفظ ک میں ہر جگہ مع یائے مخلوط ہی ملتا ہے۔ اسی کی مطابقت اختیار کی گئی ہے۔ یہ لفظ عموماً مع یائے مخلوط ہی مستعمل ہے، مگر اس کے برخلاف بھی مثالیں ملتی ہیں، یعنی اسے "پیار" بروزنِ فعول بھی استعمال کیا گیا ہے (کم سہی)۔ صرف ایک مثال: ہو نہ بے تاب ادا تمھاری آج ؛ ناز کرتی ہے بے قراری آج ؛ بے کسی! کیوں ہے نعش پر مجمع ؛ کیا ہوئی تو مری پیاری آج۔ مومن (دیوان مرتبۂ ضیا احمد بدایونی)۔ اسی بنا پر صراحت کی ضرورت محسوس کی گئی۔

پیاسے (ص ۱۳۸): ک میں "پیاسے" مع یائے مخلوط ہے۔ اس سے پہلے ص ۵۲ پر "پیاسی" آیا ہے اور ک میں وہاں بھی "پیاسی" (مع یائے مخلوط) ہے۔ اسی کی مطابقت اختیار کی گئی ہے۔ صراحت کی ضرورت یوں محسوس کی گئی کہ ایسے بعض اور الفاظ (مثلاً پیالہ، پیار وغیرہ) کی طرح "پیاس" (اسی طرح پیاسا، پیاسی، پیاسے) بھی دونوں طرح (یعنی مع یائے مخلوط، مع یائے مظہرہ) مستعمل رہا ہے اور ایک ہی شاعر کے یہاں دونوں مثالیں مل سکتی ہیں، مثلاً میر حسن نے مثنوی "رموز العارفین" میں لکھا ہے: اک بیاباں میں لگی تھی اُس کو پیاس ؛ دور سے دیکھا کنواں اک کھیت پاس ؛؛ وہ جو قانع تھے، بجھی اُن کی پیاس ؛ بلکہ پانی بچ رہا کچھ اُن کے پاس (مثنویاتِ حسن، مجلسِ ترقیِ ادب، لاہور)۔ "پیاسے" بہ اظہارِ ی کی صرف ایک اور مثال: ساقیا! عید ہے، لا بادے سے مینا بھر کے ؛ کہ مے آشام پیاسے ہیں مہینا بھر کے۔ ذوق (دیوانِ ذوق، مرتبۂ آزاد)۔ ہاں نور میں یہ صراحت کر دی گئی ہے کہ: "بروزنِ پاس مستعمل، بروزنِ قیاس متروک

ہے" [بہ ذیلِ "پیاس"] - اصل بات یہ ہے کہ یہ لفظ (ایسے اور الفاظ کی طرح) دونوں طرح مستعمل رہا ہے (ہاں اب عموماً "پیاس" "پیاسا" وغیرہ مع یائے مخلوط مستعمل ہیں)۔

پیالہ (ص ۳۴): یہ لفظ اس کتاب میں متعدد مقامات پر آیا ہے: ص ۳۳، ۳۴، ۳۸ (دو بار) ۵۵، ۵۷ (دو بار)، ۵۸، ۱۰۳، ۱۶۰، ۱۶۱، ۱۶۳۔ کے میں کہیں تو یہ لفظ مع یائے مخلوط (پیالہ) ملتا ہے اور کہیں بہ اظہارِ ی (پیالہ)۔ ص ۳۳، ۳۴، ۳۸ اور ص ۵۵ کے مطابق کے میں "پیالہ" اور "پیالے" ہے، یعنی اس لفظ کو بہ یائے مخلوط التلفظ لکھا گیا ہے اور باقی صفحات پر یہ مع اظہارِ ی ملتا ہے۔ یعنی مندرجۂ بالا نشان زدہ صفحات میں پانچ مقامات پر تو یہ لفظ مع یائے مخلوط ہے اور سات مقامات پر مع اظہارِ یا۔ پہلے یہ وضاحت کر دی جائے کہ گل کرسٹ کے مقرر کردہ طریقِ املا کے مطابق یائے مخلوط کی پہچان یہ تھی کہ اُس کے نقطے متعارف طریقے کے مطابق ساتھ ساتھ رکھنے کے بجائے نیچے اوپر رکھے جاتے تھے۔ فارسی میں "پیالہ" بہ اظہارِ ی، بروزنِ "رسالہ" ہے۔ اُردو میں بیش تر اسی طرح مستعمل رہا ہے، مگر "پیالہ" بروزنِ "نالہ" بھی استعمال میں آتا رہا ہے۔ ایک ہی شاعر کے یہاں اس کی دونوں صورتیں مل جائیں گی، مثلاً: میر حسن نے مثنوی "گلزارِ ارم" میں لکھا ہے: شتابی دے مجھے ساقی پیالہ ؛ کہ ہو دونی نشے میں سیر لالہ - لگا کر منہ سے اپنے کوئی پیالہ ؛ کرے ہے بے تکلف سیر لالہ (مثنویاتِ حسن، مجلسِ ترقیِ ادب لاہور، ص ۲۰۰-۲۰۷)۔ آصفیہ میں تو اس کی صراحت نہیں ملتی، مگر نور کے مولف نے مقدمۂ کتاب میں، جہاں متردکات کی بحث لکھی ہے، وہاں "پیالہ" کی مثال میں نسیم دہلوی کا یہ شعر لکھا ہے: غرض پیالے سے کیا، اصلِ فقیری ترکِ دُنیا ہے ؛ ہمارا ہاتھ کیا کم ہے ہمیں کاسہ گدائی کا۔ "پیالہ" کی اور مثالیں بھی پیش کی جا سکتی ہیں، میں صرف ایک مثال پر اکتفا کروں گا: دونوں جہان کی نہ رہی پھر اُسے خبر ؛ دو پیالے تیری آنکھوں کے جس کو پلا دیے (خواجہ میر دردؔ)۔ اس زمانے میں بھی بعض مثالیں مل سکتی ہیں، مثلاً: خواہ پیالہ ہو یا نوالہ ہو ؛ بن پڑے تو جھپٹ لے جھینک نہ مانگ (یگانہ چنگیزی)۔ مقصد یہ ہے کہ یہ لفظ دونوں طرح مستعمل رہا ہے اور کے میں اس لفظ کا دونوں طرح ("پیالہ" بروزنِ فعلن، اور "پیالہ" بروزنِ فعولن) موجود ہونا میری رائے میں اُسی اختلافِ تلفظ کی نمائندگی کرتا ہے اور مجھے یہ بات احتیاط کے خلاف معلوم ہوئی کہ میں اپنی پسند کے مطابق اِن میں سے صرف ایک صورت کو برقرار رکھوں اور دوسری صورت کو ترک کر دوں؛ اس لیے میں نے یہ طریقہ اختیار کیا ہے کہ ہر جگہ کے کی مطابقت ملحوظ رکھی ہے اور یوں اپنے اپنے مقام پر یہ دونوں صورتیں برقرار رہی ہیں۔ چوں کہ یہ صرف

املا کا مسئلہ نہیں، تلفّظ بھی اِس میں شامل ہے، اِس لیے یہ طریقہ اختیار کیا گیا ہے۔

پَیدایِش (ص ۲۰): م، ن، کے، ف، ع: سب میں اِس لفظ کا یہی املا ہے۔ م، کے اور ف میں یَ کے نیچے زیر بھی لگا ہوا ہے۔ کے میں پیدایش، زیبایش، آسایش جیسے حاصل مصدروں کو عموماً مع یَ لکھا گیا ہے اور یَ کے نیچے زیر لگا ہوا ہے۔ مخطوطۂ گنجِ خوبی میں بھی ایسے لفظوں کا ہر جگہ یہی املا ملتا ہے اور ہر جگہ یَ کے نیچے زیر لگا ہوا ہے، مثلاً گنجایِش ص۳۔ زیبایِش ص۷، ص۲۱۵۔ آسایِش ص۱۴، ص۲۱، ص۲۲، ص۸۹۔ کشایِش ص۲۲، ص۲۲۰۔ فرمایِش ص۸۔ آزمایِش ص۱۲۰، ص۲۴۵۔ پالایِش ص۳۲۱ — اِسی کی مطابقت اختیار کی گئی ہے۔

پہیریں (رائے مہملہ کے ساتھ): ص ۳۶۴، ح (۲)۔

پَنِیا (ص ۵۰): م، ن، کے، ف، ع: سب نسخوں میں اِس لفظ کا یہی املا ہے۔ لفظِ "پنا" کے ذیل میں اِسی ضمیمے میں یہ وضاحت کی جا چکی ہے کہ میر امّن کے یہاں ایسے دیسی لفظوں کے آخر میں بالعموم الف ملتا ہے (ہائے مختفی نہیں)۔ یہی صورت "پَنِیا" کی ہے۔ وضاحت کی ضرورت یوں محسوس ہوئی کہ فارسی کے اندازِ نگارش کے اثر سے ایسے متعدد لفظوں کے آخر میں ہائے مختفی بھی لکھی جانے لگی تھی جن کے آخر میں الف لکھا جانا چاہیے تھا۔ یہ لفظ بھی اِسی فہرست میں شامل ہے۔ میر امّن نے گنجِ خوبی میں ایسے بیشتر لفظوں کے آخر میں الف ہی لکھا ہے۔ مثالیں لفظِ "راجا" کے ذیل میں لکھی جا چکی ہیں۔ اِس وضاحت کی تکرار بے جا نہ ہو گی کہ کے میں بھی ایسے لفظوں کے آخر میں بالعموم الف ہی ملتا ہے، مثلاً: ڈبیا ص۲۴، بدلا ص۱۳، ص۵۶، بلبلا ص۱، بتاشا ص۱، سندیا ص۴۹، بھروسا ص۵۵، کلیجا ص۶۰، پتا ص۶۱، رویا ص۱۵، ص۲۱ (وغیرہ)۔

تازگی: ص ۲۹۳، حاشیہ (۳)۔

تالیقہ (ص ۱۷۱): سب نسخوں میں اِسی طرح ہے۔ عربی میں "تعلیقۃ" ایک لفظ ہے (المنجد) مگر اُس کے معنی دوسرے ہیں۔ آصفیہ میں "تعلیقہ" کے ذیل میں لکھا گیا ہے:

"تعلیقہ: مال و اسباب کی ضبطی، مکان کی قرقی، قرق شدہ اسباب کی فہرست، جسے فردِ تعلیقہ بھی کہتے ہیں۔ یہ لفظ عربی زبان میں ضبط یا قرقی وغیرہ کے معنے میں مطلق نہیں پایا جاتا ... پس اِس صورت میں اِس لفظ کو اُردو قرار دینا واجب ہے۔" یہ بالکل صحیح ہے کہ ضبط اور قرقی

کے معنی میں یہ خالص اُردو لفظ ہے اور یہ بھی صحیح ہے کہ اب تک اُردو میں اِس کو اصل کے مطابق "تعلیقہ" لکھا جاتا رہا ہے۔ باغ و بہار کے سبھی نسخوں میں "تالیقہ" ہے اور اُردو ہونے کے لحاظ سے یہ املا بھی بے جا نہیں۔ اِسی بنا پر اِسی املا کو برقرار رکھا گیا ہے۔

تتر بتر: ص ۷، ۳۷، ح ⑤ ۔

تختہ نرد (ص ۱۹۴): سب نسخوں میں اِسی طرح (یعنی اضافت کے بغیر) ہے۔ لغات کا احوال یہ ہے کہ آصفیہ میں "تختۂ نرد" (مع اضافت) ہے۔ نور میں بھی "تختۂ نرد" ہے، مگر اِس کے آگے "ف" لکھ کر توسین میں یہ لکھا گیا ہے کہ "اُردو۔ بغیرِ اضافت"۔ اِس کا واضح طور پر مطلب یہ ہوا کہ مؤلف کے نزدیک فارسی میں "تختۂ نرد" ہے اور اُردو میں "تختہ نرد"۔ نور میں سنداً آتش کا یہ شعر بھی لکھا گیا ہے: تختہ نردِ عشق دل کھیلا جو حُسنِ یار سے ؛ چُھٹ گئے ایسے مرے چھکے کہ ششدر ہو گیا۔ آتش کے اِس شعر سے "تختہ نرد" (بغیرِ اضافت) کی سند تو مِل جاتی ہے اور اِس سے اُردو میں استعمال کا بھی اندازہ ہو جاتا ہے، مگر اِس کے باوجود قطعیت کے ساتھ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ لفظ صرف اِسی طرح صحیح ہے۔ "تختہ" سے مرکب لفظ بہت سے ہیں اور بہارِ عجم میں اِن کو یک جا کر دیا گیا ہے، اِن میں لفظِ "تختہ" بغیرِ اضافت بھی ملتا ہے اور مع اضافت بھی۔ مثلاً "تختہ پُل" بغیرِ اضافت ملتا ہے اور "تختۂ حمّام" مع اضافت۔ "تختہ مشق" کے متعلق اِس لغت میں یہ وضاحت ملتی ہے کہ: "با اضافت و بے اضافت" یعنی "تختہ مشق" بھی صحیح ہے اور "تختۂ مشق" بھی درست ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ایسے مرکبات کے متعلق کوئی ایک بات قطعی طور پر نہیں کہی جا سکتی۔ اِس اعتبار سے "تختۂ نرد" بھی صحیح ہو سکتا ہے، بہ لحاظِ قاعدہ تو صحیح ہے ہی۔ [مزید تفصیل کے لیے دیکھیے اِسی ضمیمے میں "صاحب جمال" اور "ولی نعمت"] چوں کہ ن، ک، ف، ع، سبھی نسخوں میں "تختہ نرد" بغیرِ اضافت ملتا ہے (خاص کر ک اور ف میں، جن میں ایسے الفاظ میں ہمزۂ اضافت کا التزام پایا جاتا ہے) اور آتش کی سند بھی موجود ہے اِس کی تائید میں، اِس لیے یہاں ک کی مطابقت اختیار کی گئی اور اِسے بغیرِ اضافت برقرار رکھا گیا ہے۔

ترّیو لیا (ص ۳۰): م اور ک میں "ترِیو لیا" ہے، یعنی ت کے نیچے زیر ہے اور و پر علامتِ ماقبل مفتوح موجود ہے، لام خالی ہے۔ ف میں "تَریو لِیا" ہے، یعنی لام کے نیچے زیر بھی ہے۔ فیلن اور پلیٹس کے لغات میں بھی "تریو لیا" ہے۔ آصفیہ میں "تریو لیا" ہے، یعنی لام ساکن ہے۔ نور میں

"تِرپَولیا" ہے، یعنی پے کے اوپر پیش ہے اور لام کے نیچے زیر ہے۔ اِس سے بہ ظاہر یہ خیال گزرتا ہے کہ اِس لفظ کے تلفّظ میں دہلی و لکھنؤ کا اختلاف ہوگا (دہلی میں پے کے زبر کے ساتھ، لکھنؤ میں پے کے پیش کے ساتھ)۔ یہ واقعہ ہے کہ یہ لفظ زبان سے ادا اِس طرح ہوتا ہے جیسے لام کے نیچے زیر ہو۔ [اِس قبیل کے متعدد الفاظ کا احوال یہی ہے، مثلاً: چھپ چھپا لیا، گن مِلیا، صبح خیزیا، چوگوشیا] یوں جو لام کے نیچے زیر ہے، وہ ہر طرح قابلِ قبول معلوم ہوتا ہے۔ اِسی نسبت سے اِس لفظ کو بہ کسرِ اوّل و فتحِ سوم و کسرِ چہارم لکھا گیا ہے۔

میر حسن نے مثنوی "گلزارِ ارم" میں فیض آباد کی تعریف میں لکھا ہے: سرِ بازار وان ترپولیا ہے یہ کہ جوں دروازۂ جنّت کھلا ہے۔ وہ جی ہے شہر کا ترپولیا یوں یہ کہ جیسے تین رِحمیں جسم کی ہوں۔ اشارت سے کہے ہے اُس کی محراب یہ کہ ہیں تینوں زمانے میرے الواب۔ کھلے رکھے ہیں اُس میں اِس لیے در یہ چلی آوے ہوا جنّت کی فرفر۔ [مثنویاتِ حسن، مرتبہ وحید قریشی، مجلسِ ترقّیِ ادب لاہور، ص ۱۹۲، ۱۹۳]۔

دہلی میں رانا پرتاپ باغ کے علاقے میں شاہ راہ پر ترپولیا کی عمارت ابھی تک باقی ہے۔ یہاں بس یہی ایک عمارت بچی ہے۔ پچھلے سال میں جے پور گیا تھا، وہاں دو بازاروں میں ایک ایک ترپولیا ابھی تک موجود ہے۔ [شاید اور بھی ہوں، میں معلوم نہیں کر سکا]۔

ترجُمہ (ص ٦): ک اور ف دونوں میں جیم پر پیش لگا ہوا ہے۔ اِس کے علاوہ مخطوطۂ گنجِ خوبی میں یہ لفظ دو جگہ آیا ہے اور دونوں جگہ میر امّن نے جیم پر پیش لگایا ہے (ص ۴، ۳۴۴)۔ اِسی بنا پر جیم پر پیش لگایا گیا ہے۔ یہ وضاحت بے جا نہ ہوگی کہ عربی میں "ترجَمہ" ہے۔ صاحبِ آصفیہ نے اِسی طرح اِسے درج لغت کیا ہے، لیکن "ترجمان" میں جیم پر پیش لگایا ہے۔ صاحبِ غیاث اللغات نے لکھا ہے کہ فارسی کے "ترزبان" کو معرّب کرکے "ترجمان" بنا لیا گیا۔ چوں کہ فارسی میں "زَبان" اور "زُبان" دونوں طرح ہے، اِس لیے "ترجَمان" اور "ترجُمان" دونوں طرح درست ٹھہرا۔ لیکن عربی میں جب اِس سے مصدر بنایا گیا تو اُسے عربی وزن کے مطابق "ترجَمہ" ہی مانا گیا۔ بہ ہر صورت عربی میں جو بھی صورت ہو، اُردو والے بالعموم "ترجُمہ" اور "ترجُمان" بولتے ہیں۔

ترکش: ص ۳۷، ح (۴)

تڑپھنا (ص ۲۳): سب نسخوں میں اِسی طرح، یعنی مع ہاے مخلوط ہے۔ اب "تڑپنا" لکھتے ہیں، لیکن دلّی میں اِس کا پرانا املا "تڑپھنا" ہے اور یہ کم سے کم عہدِ غالب تک تو ملتا ہی ہے۔ غالب بھی اِس مصدر کے مشتقات کو مع ہاے مخلوط لکھتے تھے (دیباچۂ مکاتیبِ غالب، مرتبہ مولانا عرشی مرحوم، بحثِ املاے غالب)۔ کے اور فے کی مطابقت اختیار کی گئی ہے۔

تعیناتت (ص ۷۸): کے میں اعراب موجود نہیں۔ اِس لفظ کی صورت یہ ہے کہ "تعیین" عربی کا مصدر ہے۔ "تعیین" کی ایک صورت "تعین" بھی ہے اور یہ فارسی کا تصرف ہے، جس نے اُردو میں بھی رواج پایا۔ اِس سے اُردو میں "تعینات" بنا (اور اُس سے "تعیناتی")۔ "تعینات" اُردو والوں کے تلفظ میں بروزنِ "خیرات" آتا ہے، یعنی عین کی آواز مخلوط ہوکر شاملِ تلفظ ہوتی ہے (وہی صورت جو مثلاً "قلعی" اور "قلعہ" اور "رقعہ" جیسے الفاظ میں پیدا ہوگئی ہے)۔ آصفیہ میں "تعینات" ہے اور نور میں بھی اِسی طرح، بل کہ اِس میں صراحت بھی موجود ہے: "اردو میں "تعینات" بروزنِ "رسیدات"... مستعمل ہے"۔ البتہ فیلن نے مقبولِ عام تلفظ TAINĀT لکھا ہے (اِسی طرح TAINĀTI) اور یہ استعمالِ عام کے عین مطابق ہے اور تلفظ کے لحاظ سے یوں ہی فصیح ہے۔ اِس لفظ کے سلسلے میں یہ لکھنا بھی دل چسپی سے خالی نہ ہوگا کہ مؤلفِ آصفیہ نے "تعینات" کو "غلط العوام" لکھا ہے۔ یہ اُن کی زیادتی ہے۔ اُردو میں یہ لفظ فصیحوں کی زبان سے برابر سننے میں آتا رہتا ہے اور نظم و نثر سے اِس کی بہت سی مثالیں بھی پیش کی جاسکتی ہیں، اُن مثالوں میں سرِ فہرست میر امن کا یہی جملہ ہوگا۔ میر امن نے گنجِ خوبی میں بھی اِس لفظ کو استعمال کیا ہے: "سوانح نگار، صاحبِ ایمان... تعینات کرے" (مخطوطۂ گنجِ خوبی، ص ۱۸۶)؛ "خفیہ نویس... تعینات کرتے ہیں" (ایضاً ص ۱۸۵)۔ ہندستانی فارسی میں بھی یہ لفظ ملتا ہے، مثلاً: "از آنجا کہ رسمِ معہودِ روزگار است، بخشیانِ دیوان کدہ ارزاق و اعمار او را داخلِ تعیناتیانِ صوبۂ دارالبقا ساختند" [عملِ صالح، جلدِ سوم، ص ۲۴۶۔ امیر الامرا علی مردان خاں کی موت کے ذکر میں]۔

تغییر (ص ۸۰): کے اور فے میں اِسی طرح ہے۔ فے میں غین کے نیچے زیر بھی لگا ہوا ہے (تغِیر)۔ البتہ ع میں "تغیّر" ہے، یعنی ی کے اوپر تشدید لگی ہوئی ہے۔ اصل لفظ (مصدر) "تغییر" ہے، "تغیر" اِسی کی تخفیف ہے اور مفرس صورت ہے۔ یہ لفظ اِس صورت میں فارسی

(اور اُردو) دونوں میں مستعمل رہا ہے۔ بہارِ عجم میں وضاحت موجود ہے: "تغیر و تغییر: بروزنِ تقصیر و تقصیر ..... میرزا رضی دانش: نشاطِ جامۂ نو صبحِ عیدِ طفلان است ؛ کجاست مے کہ تغیر لباسِ رنگ دہیم" آصفیہ میں یہ لفظ موجود نہیں، البتہ صاحبِ نور اللغات نے اس تبدیلی کی اور اُردو میں اس کے استعمال کی نشان دہی کی ہے: "تغیر: بروزنِ تقصیر.... فارسیوں نے ہمزہ حذف کر کے بروزنِ فعیل استعمال کیا۔ رشک: دیوانے تیرے بے سر و پا جنگلوں میں ہیں ؛ حیثیتیں تغیر ہوئیں، گھر بدل گئے" اُردو میں یہ لفظ مستعمل رہا ہے اور اس کی بہت سی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ یہاں مزید اسناد پیش کرنا اس لیے ضروری نہیں سمجھا گیا کہ (۱) یہ لفظ مفرس ہو کر اُردو میں آیا ہے یعنی فارسی میں استعمال کیا گیا ہے۔ (۲) اور یہ کہ اس مقام پر رشک (تلمیذ ناسخ) کا شعر (مندرجۂ نور اللغات) ہی سند کے لیے کافی ہے۔ اس وضاحت کی ضرورت یوں محسوس کی گئی کہ یہ نہ سمجھا جائے کہ متن میں جو "تغیر" ہے، یہی صحیح صورت ہے اور "تغیّر" کتابت کی غلطی ہے۔ چوں کہ آصفیہ میں یہ لفظ موجود نہیں، اس لیے یوں بھی وضاحت کی ضرورت تھی۔ ہاں میر امّن نے گنجِ خوبی میں اس لفظ (تغیر) کو متعدد مقامات پر استعمال کیا ہے، مخطوطۂ گنجِ خوبی سے بعض مثالیں پیش کی جاتی ہیں: "میرا چہرہ تغیر ہو جاوے" ص۱۴۰۔ "اُسے اُس کام سے تغیر کر کے حکم کیا" ص۱۷۔ ص ۲۳۲ پر "تغیری" بھی موجود ہے۔ باغ و بہار میں بھی متعدد مقامات پر یہ آیا ہے، ایک مثال: "سنتے ہی اُس کا چہرہ تغیر ہو گیا" (ک ص۹۹)۔ اسی "تغیر" سے "تغیری" بن گیا ہے، صرف ایک مثال: میر انیس کا وہ مرثیہ، جس کے پہلے بند کا پہلا شعر یہ ہے: ہاں اے فلکِ پیر! نئے سر سے جواں ہو ؛ اے ماہِ شبِ چار دہم! نور فشاں ہو۔ اس کے چوتھے بند کا دوسرا شعر ہے: عالم کی تغیری پہ بحالی کی ہے آمد ؛ کہتے ہیں چمن: ماہِ جلالی کی ہے آمد۔

تو (ص ۷): یہ کلمہ بہت سے مفاہیم کے لیے آتا ہے۔ یہ حرفِ جزا بھی ہے جو شرطیہ کلمے میں آتا ہے، اس کے علاوہ "تحسینِ کلام اور تاکید کے موقع پر بھی مستعمل ہے، جیسے: واہ تم تو خوب آئے۔ دیکھو تو۔ سنو تو۔ کبھی تاکید کے لیے زائد بھی آتا ہے، جیسے: میں تو آتا تھا، اُس نے روک لیا۔ تب: بس، الحاصل، حاصلِ کلام، اس وقت، پھر، اس حالت میں" (نور)۔ ان معانی کے علاوہ پُرانی تحریروں میں یہ کلمہ علت کے طور پر "تا کہ" کے معنی میں بھی ملتا ہے، مثلاً باغ و بہار:

کا یہ جملہ: "ایک بیٹا جیتا جاگتا مجھے دے تو میرا نام اور اِس سلطنت کا نشان قائم رہے" (صلا)۔
اِس لفظ کے تلفّظ کے سلسلے میں مولّفِ آصفیہ نے لکھا ہے: "یہ لفظ بہ واوِ مجہول، کبھی تائے فوقانی مفتوح، کبھی تائے مثنّاۃ مضموم کے ساتھ بولنے میں آتا ہے" (نور میں تفصیل کچھ زیادہ ہے)۔ آصفیہ کی اِس وضاحت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لفظ جملہ معانی میں "تُو" اور "تَو" دونوں طرح مستعمل رہا ہے۔ ک کا احوال یہ ہے کہ اُس میں یہ کلمہ اکثر مع واوِ مجہول "تو" ملتا ہے اور کم تر مع واوِ لین "تَو"۔ مخطوطۂ گنج خوبی میں یہ صورتِ حال سامنے آتی ہے کہ (معانی کی تفریق کے بغیر) کہیں تو "تو" لکھا ہوا ہے اور کہیں "تَو" اور کسی ایک صورت کی ترجیح کا تعیّن بہت مشکل معلوم ہوتا ہے۔ ہاں ک سے میں یہ تفریق ضرور سامنے آتی ہے کہ کلمۂ جزا کے علاوہ، اور جن معانی میں یہ لفظ آیا ہے، تو ہر جگہ واو پر علامتِ مجہول موجود ہے۔ سارا جھگڑا کلمۂ جزا کے طور پر مستعمل ہونے کے سلسلے میں سامنے آتا ہے کہ اُس صورت میں کہیں "تو" ہے اور کہیں "تَو"۔
اِس صورتِ حال کے پیشِ نظر میں نے یہ طریقہ اختیار کیا ہے کہ جہاں بھی یہ لفظ کسی بھی اعتبار سے کلمۂ جزا کے طور پر آیا ہے (کلمۂ شرط مذکور ہے یا محذوف یا مقدر) وہاں ت کو خالی رکھا ہے، مثلاً: "اگر کوئی دن جیے بھی، تو بدن کی طاقت کم ہو گی" (ص ۱۱)۔ اِس طرح اِس کی قرأت اگر "تُو" کی جائے گی، تب بھی درست ہو گی اور اگر "تَو" کہا جائے گا تب بھی صحیح ہو گا۔ جہاں جہاں یہ کلمہ دوسرے معانی میں آیا ہے تو ک کے مطابق اسے مع واوِ مجہول "تُو" لکھا گیا ہے، مثلاً: "نہیں تُو یہ بھی غنیمت ہے" (ص ۷)۔ "نہیں تُو اپنی دستار و گفتار و رفتار کو کوئی بُرا نہیں جانتا" (ص ۸)۔ "تجھے تُو پیغامِ موت کا آ چکا" (ص ۱۱)۔ "پھر تُو یہ نوبت پہنچی" (ص ۲۲)۔ "ایک بیٹا جیتا جاگتا مجھے دے تُو میرا نام اور اِس سلطنت کا نشان قائم رہے" (ص ۱۱)۔
تَو بھی (ص ۳۴): یہ کلمہ جہاں بھی آیا ہے، ک میں واو پر ماقبل مفتوح کی علامت موجود ہے (تَو بھی)۔ یہی صورت مخطوطۂ گنج خوبی کی ہے کہ اُس میں بھی اِس کلمے کو ہر جگہ مع واوِ ماقبل مفتوح "تَو بھی" لکھا گیا ہے۔ اِسی نسبت سے اِس کلمے میں ہر جگہ تَ پر زبر لگایا گیا ہے۔ ہاں آصفیہ میں بھی "تَو بھی" ہے۔
تُورا (ص ۷۷): ک، ف، ع، سب میں یہاں اِس لفظ کا یہی املا ملتا ہے (آخر میں الف)۔ اِس کتاب میں کئی مقامات پر "تورہ پوش" بھی آیا ہے اور اِس مرکب کو ان سب نسخوں میں ہر جگہ

مع ہائے مختفی لکھا گیا ہے۔ اصل لفظ "تورہ" ہے۔ آصفیہ میں بھی "تورہ" ہے۔ برہانِ قاطع اور غیاث اللغات میں "تورہ" کے جو معانی لکھے گئے ہیں، وہ اُن معنوں سے مختلف ہیں جن معنی میں یہ لفظ یہاں آیا ہے؛ یا یوں کہیے کہ ہندستان میں مستعمل رہا ہے۔ برہانِ قاطع میں "تورہ" کے جو معانی لکھے گئے ہیں، اُن میں یہ بھی ہیں: "و بہ ترکی قاعدہ و قانون و طرز و روش باشد۔ و نامِ شریعتے کہ چنگیز خاں از خود وضع کردہ بود"۔ اِسی نسبت سے "تورۂ چنگیز خانی" کہا گیا ہے۔ ہندستان میں یہ لفظ ایک اور معنی میں بھی مستعمل ہو گیا، یعنی: "حصہ بخرہ، مختلف کھانوں کا ایک خوان یا کئی خوان، جو امیروں میں شادی وغیرہ کے موقع پر کچھ روز پیش تر تقسیم کیے جاتے ہیں"۔ (آصفیہ) معنوی تبدیلی کے باوجود، اِس میں شک نہیں کہ اُردو میں بھی بالعموم "تورہ" لکھا جاتا رہا ہے اور "تورہ پوش" بھی اِسی طرح لکھا جاتا ہے۔ باغ و بہار میں "تورہ پوش" کئی جگہ آیا ہے اور کے، ف، ع سب میں ہر جگہ "تورہ پوش" ہی ملتا ہے۔ مثلاً ک میں ص ۱۸ پر "خوان پوش، تورہ پوش" آیا ہے (وغیرہ)۔ یعنی کے، ف، ع میں مرکب لفظ "تورہ پوش" میں تو جزوِ اوّل کو مع ہائے مختفی لکھا گیا ہے، مگر اِس خاص مقام پر مفرد لفظ "تورا" اِن نسخوں میں مع الف ملتا ہے۔ مَیں نے "تورہ پوش" کو تو ہر جگہ اُسی طرح لکھا ہے جس طرح وہ ملتا ہے (اور جس طرح لکھنا چاہیے) اور اِس مقام پر بھی مفرد لفظ کا املا اصل کے مطابق اختیار کیا ہے، یعنی "تورے کا تورا" کو برقرار رکھا ہے۔ اِس میں ایک وجہ تو اصل کی مطابقت ہے، اور دوسری وجہ یہ ہے کہ "تورے کا تورا" ایسا ٹکڑا ہے جو گویا اُردو کے روزمرّہ کے مطابق آیا ہے اور اِس طرح اِس کی گنجایش پیدا ہو گئی ہے کہ یہ مان لیا جائے کہ اِس خاص مقام پر مصنّف نے روزمرّہ کی اِس نوعیت کے لحاظ سے اِسی طرح لکھا ہوگا۔ چوں کہ اِس خاص مقام پر "تورا" لکھنے میں غلط نویسی کا کوئی جھگڑا پیدا نہیں ہوتا، کہ یہاں روزمرّہ کے دائرے میں آکر اِس ٹکڑے (تورے کا تورا) میں اُردوپن نمایاں ہو گیا ہے۔ اور "تورہ پوش" کو ہر جگہ مع ہائے مختفی لکھا گیا ہے تو اپنی جگہ پر وہ بھی بالکل درست ہے کہ اِس فارسی تمام مرکّب کو لکھا بھی اِسی طرح جاتا ہے اور کے، ف، ع میں بھی ہر جگہ یہ اِسی طرح ملتا ہے۔ ہاں یہ صراحت بھی بے محل نہ ہوگی کہ کے میں ہر جگہ اِس لفظ میں واو پر علامتِ مجہول ملتی ہے۔ [برہانِ قاطع اور غیاث اللغات میں بھی صراحت موجود ہے کہ یہ لفظ مع واوِ مجہول ہے] اِسی کی مطابقت اختیار کی گئی ہے۔

تَوَل (ص ۱۷۰): کے میں واو پر ماقبل مفتوح کی علامت موجود ہے (تَوَل) اور فے میں تَ پر زبر لگا ہوا ہے۔ یہ لفظ کے میں ص ۱۷۰ پر بھی آیا ہے اور وہاں بھی کے اور فے دونوں میں یہ مفتوح الاوّل ہے۔ مگر گنجِ خوبی میں یہ لفظ "بُول" کے قافیے میں آیا ہے: اگر جواب ترا خوب ہے، تو شوق سے بول ٭ کہ تیری بات جواہر کے ساتھ ہے تول (چالیسواں باب) اور یہاں واضح طور پر یہ بہ ضمِّ اوّل (مع واوِ مجہول) آیا ہے۔ یہ لفظ بہ فتحِ اوّل اور بہ ضمِّ اوّل، دونوں طرح درست ہے۔ جلال نے اپنے لغت سرمایۂ زبانِ اُردو میں اسے بہ ضمِّ اوّل لکھا ہے: "تول اور تولنا، واو مجہول کے ساتھ" آصفیہ میں اعراب موجود نہیں، البتہ نور میں وضاحت کی گئی ہے: "تَوَل (بالفتح و نیز بالضّم) مونّث، وزنِ مقرّرہ، وزن، جانچ، اندازہ۔ فصحا کی زبان پر بروزنِ قَوَل ہے۔" چوں کہ کے اور فے میں دونوں مقامات پر واضح طور پر اِس لفظ کو بہ فتحِ اوّل لکھا گیا ہے؛ اِس بنا پر اِس کتاب میں اِسی کی مطابقت اختیار کی گئی ہے اور تَ پر زبر لگایا گیا ہے۔

تَوَنگر (ص ۱۶۸): کے اور فے میں تَ پر زبر لگا ہوا ہے، اِسی کی مطابقت اختیار کی گئی ہے۔ فارسی میں "تُوانگر" ہے۔ اصل لفظ "تُوان" بھی فارسی میں بہ ضمِّ اوّل ہے، اِسی طرح "تُوانائی" اور "تُوانا"۔ لیکن برہانِ قاطع کے ایرانی مرتّب ڈاکٹر معین نے "تُوانستن" اور "تُوانا" کو حاشیے میں درج کر کے، یہ وضاحت بھی کر دی ہے کہ: "در تداولِ امروز بفتح"۔ اور یہی بات "توانگر" کے ذیل میں لکھی ہے: "لغۃً بضمِّ اوّل، در تداولِ امروز بفتح"۔ اور اِس سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ کے اور فے میں تَ پر جو زبر ہے، وہ اِسی "تداولِ امروز" کی نمایندگی کر رہا ہے جو فارسی کی طرح اُردو میں بھی نمایاں ہوا ہے۔ آصفیہ میں بھی "تَوَنگر" مندرج ہے۔ مولّف نے قوسین میں یہ بھی لکھا ہے کہ: "ف۔ صفت، صحیح تُوانگر"۔ مطلب اِس کا یہی ہے کہ فارسی میں تَ پر پیش ہے اور تَ کے بعد الف بھی ہے؛ اور اُردو میں تَ پر زبر ہے اور وہ الف موجود نہیں۔ نور میں "توانگر" ہے، اعراب کے بغیر اور اِس کے بعد یہ وضاحت ہے: "رسم الخط میں بغیر الف لکھنا نہیں چاہیے، اور بغیر الف پڑھنے میں مضائقہ نہیں"۔ یہ دراصل غیاث اللغات کی اِس عبارت کا لفظی ترجمہ ہے: "و ایں لفظ را در اصل رسم الخط بدونِ الف نوشتن خطاست و خواندن روا باشد"۔ فارسی میں جو بھی صورت ہو، اُردو میں عموماً "توَنگر" (الف کے بغیر) لکھا جاتا ہے اور یہ بالکل صحیح ہے۔

تھانْبا (ص ۲۶) : م، ن، ک، ف، ع : سبھی نسخوں میں اسی طرح ہے۔ مخطوطۂ گنجِ خوبی میں بھی "تھانْبنا" کے مشتقات اسی طرح ملتے ہیں، مثلاً : تھانب لے ص۵۵۔ باگ تھانبی ص۱۹، ص۱۲۳۔ باگ کو تھانبے ص۲۲۔ (یہ قدیم صورت ہے، اب عموماً "تھامنا" لکھتے ہیں) اسی املا کو برقرار رکھا گیا ہے۔

تَہْلُکَہ (ص ۱۲) : یہ عربی کا لفظ ہے اور عربی میں ت پر زبر ہے، ہ ساکن ہے اور ل کو مفتوح، مکسور، مضموم؛ تینوں طرح [تَہْلَکَہ، تَہْلِکَہ، تَہْلُکَہ] پڑھا جا سکتا ہے [المنجد]۔ آصفیہ میں "تہلکہ" ہے، مگر یہ بھی لکھا گیا ہے کہ : "زبان زد تہلِکہ" مگر جزم اور زیر اس طرح لگے ہوئے ہیں کہ قطعی طور پر یہ بات معلوم نہیں ہوتی کہ زیر کس حرف سے متعلق ہے؟ ہ کے نیچے ہے یا لام کے نیچے؟ نور میں البتہ اس طرح وضاحت کی گئی ہے : "اردو میں بہ فتحِ اول و سکونِ دوم و فتحِ سوم بولتے ہیں"۔ اس طرح یہ "تَہْلَکہ" ہوا۔ پلیٹس نے اپنے لغت میں اصل تلفظ لکھ کر اس کا عامیانہ تلفظ "تَہْلُکَہ" لکھا ہے۔ اور فیلن کے لغت میں "تَہَلْکَہ" اور "تَہْلُکَہ" مندرج ہے۔

م اور ک میں لام کے اوپر پیش لگا ہوا ہے، اور ف میں ہ پر جزم لگا ہوا ہے اور لام پر پیش؛ اس طرح یہ "تَہْلُکَہ" ہوا۔ چوں کہ تینوں نسخوں میں لام واضح طور پر مضموم ہے، اس لیے اسی تلفظ کی پابندی کی گئی ہے۔

تَہِیَّہ (ص ۱۲۹) : ک میں اس لفظ پر اعراب موجود نہیں، البتہ ف میں ہ کے نیچے زیر لگا ہوا ہے اور ف کی فرہنگ میں بھی اسے بہ کسرِ دوم ہی درج کیا گیا ہے۔ اصلاً بھی اسی طرح ہے (بہ فتحِ اوّل و کسرِ دوم و فتحِ سوم مشدّد : تَ ہِ یَّ ہ) اسی بنا پر ہ کے نیچے زیر لگایا گیا ہے۔ آصفیہ میں "تَہَیَّہ" ہے، یعنی شروع کے تینوں حرفوں پر زبر لگا ہوا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس طرح بھی سننے میں آتا ہے، مگر اس میں بھی شک نہیں کہ "تَہِیَّہ" (بہ کسرِ دوم) بھی سننے میں آتا ہے، کم و بیش کی بات دوسری ہے، مگر بہ کسرِ دوم استعمال میں ہے ضرور۔ یہاں آصفیہ کے بجائے ف کے اندراج کو ترجیح اسی بنا پر دی گئی ہے کہ یہ لفظ دونوں طرح (بہ کسرِ دوم، بہ فتحِ دوم) سننے میں آیا ہے اور یوں اس کی دونوں صورتیں گویا بجائے خود درست ہیں اور اس صورت میں ترجیح کا فائدہ لازمی طور پر ف کے اندراج کے حق میں جاتا ہے (جو اصل تلفظ سے بھی مطابقت رکھتا ہے)۔

تَئیں (ص ۸): نظم میں "تَیں" بروزنِ فَعَل، اور "تَئیں" بروزنِ فَع، دونوں طرح ملتا ہے، اور یہ استعمال پرانے شعرا کے یہاں بالعموم ہے: دردؔ! ہم اُس کو تو سمجھائیں گے پر اپنے تئیں آپ بھی سمجھائیے گا۔ نہیں میرے تَئیں کسی کا باک ؛ لب گریباں ہے، ہاتھ ہے اور چاک۔ میر امّن نے بھی گنجِ خوبی میں اسے دونوں طرح نظم کیا ہے، صرف ایک ایک مثال: اگرچہ تیرے تئیں مرتبہ ملا، لیکن ؛ تو اُس کے درجے سے رکھ دل میں اپنے اندیشہ (چالیسواں باب) جو کوئی جان کو عزیز رکھے ؛ بادشاہت سے اُس کے تئیں کیا کام (تیسواں باب)۔ اصل لفظ "تئیں" ہے اور "تَیں" کو ضرورتِ شعری سمجھنا چاہیے۔ ک۔ میں تو اس لفظ پر اعراب موجود نہیں، مگر ف میں "تئیں" ہے اور اُس کی فرہنگ میں اسے (رومن رسمِ خط میں) TAIN لکھا گیا ہے، اس سے تلفظ کا تعین پوری طرح ہو جاتا ہے۔ اسی نسبت سے اس لفظ کو (نثر میں) ہر جگہ مع یاے معروف لکھا گیا ہے۔ ضمنی طور پر اس لفظ کے سلسلے میں ایک دل چسپ بات کا تذکرہ بھی بے محل نہ ہوگا۔ آصفیہ میں "تئیں" کے ذیل میں لکھا گیا ہے: "اس لفظ پر ایک مرتبہ ایک لکھنوی صاحبِ زبان اور حضرت غالبؔ کے درمیان ایک عجیب لطیفہ سرزد ہوا۔ دہلی میں "اپنے تئیں" "آپ کو" کی بجائے بہت بولا جاتا تھا، لیکن لغت تراشانِ لکھنؤ نے اسے بالکل ترک کر دیا تھا اور اس کی بجائے "آپ کو" ترجیح دیتے تھے۔ حضرت غالبؔ سے پوچھا کہ آپ کے نزدیک لفظ "اپنے تئیں" بہتر ہے یا "آپ کو"؟ انھوں نے جواب دیا کہ: میں تو آپ کو حقیر، ذلیل، نالائق، نابلد سمجھتا ہوں، کسی اور سے بھی مشورہ لیجیے کہ ایسے موقع پر "اپنے تئیں" خوش نما ہے یا لفظ "آپ کو"۔ میرے نزدیک "اپنے آپ کو" کہنے سے یہ سقم نکل جاتا ہے"۔ یہ لطیفہ صاحبِ فرہنگِ آصفیہ نے (غالباً) خود تراشا ہے، لیکن اُن مرحوم کو معلوم نہیں تھا کہ "تئیں" کو مرزا غالبؔ اپنے ایک خط میں "قبیح" اور "غیر فصیح" لکھ چکے ہیں: "تئیں کا لفظ متروک اور مردود، قبیح، غیر فصیح۔ یہ پنجاب کی بولی ہے۔ مجھے یاد ہے کہ میرے لڑکپن میں ایک اصیل ہمارے ہاں نوکر رہی تھی، وہ "تئیں" بولتی تھی، تو بیبیاں اور لونڈیاں سب اُس پر ہنستی تھیں"۔ اس پر محاکمہ کرتے ہوئے قاضی عبدالودود صاحب نے اپنے طویل مقالے "غالب بہ حیثیتِ محقق" میں بجا طور پر لکھا ہے کہ: "تاریخی حیثیت سے یہ بالکل غلط ہے کہ غالبؔ کے لڑکپن میں اُس کے استعمال پر لونڈیاں تک ہنستی تھیں"۔ (نقدِ غالب، ص ۵۳) مزید تفصیل کے لیے اس مقالے کو دیکھا جا سکتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ عہدِ غالب میں بھی فصحاے دہلی کی تحریروں

میں یہ لفظ برابر ملتا ہے اور اس سے پہلے تو بالعموم مستعمل تھا [ہاں اب یہ لفظ تحریروں میں نظر نہیں آتا]۔

تیّاری (ص ۲۱) : م، ن، ک، ف، ع ؛ سبھی میں یہی املا ہے۔ ک میں جہاں بھی یہ لفظ آیا ہے، اسے مع ت (تیّار) لکھا گیا ہے، مثلاً : ۱۲۱، ۱۲۷، ۲۲۷۔ تیّاری : ۲۱، ۲۱۷۔ مخطوطۂ گنجِ خوبی میں بھی جہاں یہ لفظ آیا ہے، میر امّن نے اسے ت کے ساتھ لکھا ہے، مثلاً : تیّار ۳۱، ۴۷۔ تیّاری ۲۹، ۴۲۔ اسی کی پابندی کی گئی ہے۔ اِس وضاحت کی ضرورت یوں محسوس ہوئی کہ اُس زمانے میں اِس کو ط کے ساتھ (طیّار اور طیّاری) بھی لکھا جاتا تھا [اگرچہ آج کل عموماً "تیّار" اور "تیّاری" لکھتے ہیں اور اسی طرح لکھنا چاہیے۔ اِس لفظ سے متعلق مفصّل بحث راقم الحروف کی کتاب اُردو املا میں دیکھی جاسکتی ہے]۔

تیز آب : ص ۳۰۲، حاشیہ (۸)۔

تیلش (ص ۲۳۸) : ن، ک، ف، ع ؛ سب نسخوں میں یہاں اِس لفظ کا یہی املا ملتا ہے (یعنی ط کی جگہ ت)۔ یہ لفظ ص ۲۴۷ پر بھی آیا ہے : " ملکِ شہبال کو تیلش آیا۔" مذکورہ سبھی نسخوں میں یہاں بھی "تیلش" ہے۔ اِس سے پہلے ایک جگہ "طیلش" آیا ہے۔ بصرے کی شہزادی جب اپنی سرگذشت شروع کرتی ہے، تو آغاز ہی میں یہ جملہ ہے : " بادشاہ یہ سُن کر طیش میں آئے" (ص ۹۱) اور دل چسپ بات یہ ہے کہ اِس مقام پر مذکورہ سبھی نسخوں میں "طیلش" ہے۔ یہ لفظ مخطوطۂ گنجِ خوبی میں بھی دو جگہ موجود ہے اور دونوں جگہ میر امّن نے اپنے قلم سے "تیلش" لکھا ہے (ص ۱۲۹، ۱۴۰)۔ "تیلش" مجھے کسی لغت میں نہیں ملا۔ چوں کہ میر امّن کے یہاں یہ موجود ہے، اِس لیے اِسے "طیلش" کی مہنّد صورت کہا جاسکتا ہے۔ میں نے اِس لفظ کے دونوں املا اپنی اپنی جگہ برقرار رکھے ہیں۔ "تیلش" کو تو یوں کہ وہ خود میر امّن کے قلم سے بھی نکلا ہے اور سبھی مطبوعہ نسخوں میں بھی دو جگہ موجود ہے۔ اور "طیلش" کو یوں کہ یہ بھی سبھی مطبوعہ نسخوں میں ایک جگہ موجود ہے اور مروّج اور متعارف املا بھی یہی ہے۔ میں نے اِس بات کو احتیاط کے منافی خیال کیا کہ کسی بھی جگہ اِس لفظ کے املا میں تبدیلی کی جائے۔

تیمُور (ص ۷) : م، ک اور ف میں یہ لفظ اِسی طرح (بہ فتحِ اوّل) ہے، اِسی کی پابندی کی گئی ہے۔ وضاحت کی ضرورت یوں محسوس ہوئی کہ نور اللغات میں اِسے بروزنِ "ذی نور" یعنی

بہ کسرِ اوّل و یائے معروف) لکھا گیا ہے۔ اِس سلسلے میں یہ عرض کرنا ہے کہ (۱) اُردو میں زبانوں پر عموماً بہ فتحِ اوّل ہی ہے۔ (۲) نیز: برہانِ قاطع کے ایرانی مرتّب ڈاکٹر معین نے لفظِ "تمر" کے حاشیے میں بھی اسے بہ فتحِ اوّل لکھا ہے: "نام اصلی امیر تیمور گورکان ہم "تمر" بہ فتحِ تاء مثنّاۃ فوقانیہ وضمّ میم وسکون راء مہملہ است کہ در لغت ترکی بمعنی آہن است کہ اکنوں "تیمور" بروزن "طیفور" استعمال کنند، و آنچہ ترک است "تمر" می خوانند" [برہانِ قاطع میں لفظ "طیفور" کو "بہ فتحِ اوّل وضمِّ فا" بروزنِ دیجور" لکھا ہے] ۔ علاوہ ازیں المنجد میں بھی اسے "تیمور" ہی لکھا گیا ہے (اشاعتِ نوزدہم)۔

تیوَرانا (ص ۱۵۹): کے میں یٰ پر علامتِ مجہول موجود ہے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ اس لفظ میں یائے مخلوط نہیں، یائے مظہرہ ہے۔ اِس لفظ کا بھی وہی احوال ہے جو "تیوری" کا ہے اور جس کی بحث اس لفظ کے بعد ہی آئی ہے، یعنی "تیورانا" بھی مع یائے مظہرہ بروزنِ فاعلاتن، اور مع یائے مخلوط بروزنِ مفعولن، دونوں طرح مستعمل رہا ہے۔ صاحبِ نور نے اسے بھی دہلی و لکھنؤ کا اختلاف قرار دیا ہے: "دہلی میں فاعلاتن کے وزن پر اور لکھنؤ میں مفعولن کے وزن پر ہے"۔ مثال میں مصحفی اور داغ کے یہ شعر لکھے ہیں: دیدے تیورا گئے ہیں اور غش آتا ہے چلا؛ مجھ کو یہ ڈر ہے مرا جی نہ کہیں جائے ڈوب (مصحفی)۔ خورشید میرے سامنے یا شمع طور ہے؛ آنکھیں جو تیورا گئیں، یہ کس کا نور ہے (داغ)۔ داغ تو دہلوی تھے اور مصحفی بھی اپنے آپ کو دہلوی کہتے تھے اور سمجھتے تھے۔ بہ ہر صورت، یہ درست ہے کہ شعرائے دہلی کے یہاں "تیوری" اور "تیورانا" یہ دونوں لفظ مع یائے مظہرہ بھی ملتے ہیں اور کے میں جو ان دونوں لفظوں میں یٰ پر علامتِ مجہول ہے، وہ اسی کی توثیق کرتی ہے۔ اسی کی مطابقت اختیار کی گئی ہے اور اسی بنا پر دونوں لفظوں میں تؔ کے نیچے زیر لگایا گیا ہے۔ اس لفظ کے تلفظ کا احوال داغ کے شعر سے پوری طرح نمایاں ہو جاتا ہے اور اس سلسلے میں لفظ "تیوری" کے ذیل میں جو کچھ لکھا گیا ہے، اُس کا اطلاق "تیورانا" پر بھی ہوگا۔

تیوری (ص ۷۳): یہ لفظ اس کے بعد ص ۴۲ پر آیا ہے اور دونوں جگہ اور کے میں یٰ پر علامتِ مجہول موجود ہے (تیوری)۔ اس کا واضح طور پر مطلب یہ ہوا کہ اس لفظ میں یٰ اور واو دونوں ساکن ہیں، البتہ تلفظ میں یہ لفظ اس طرح آتا ہے کہ واو کا جزم اچھی طرح نمایاں نہیں ہوتا، اور

پہلے ٹکڑے "تے" کا تلفظ ذرا کھینچ کر ہوتا ہے۔ تلفظ میں اس صورتِ حال کو ملحوظ رکھا جانا چاہیے۔ داغ کے اس شعر سے اس لفظ کے تلفظ کی صحیح طور پر وضاحت ہو جائے گی: چڑھا دُ پھول مری قبر پر، جو آئے ہو ٭ کہ اب زمانہ گیا تیوری چڑھانے کا۔ یا مثلاً غالب کے اس شعر میں: ہے تیوری چڑھی ہوئی اندر نقاب کے ٭ ہے اک شکن پڑی ہوئی طرفِ نقاب میں۔ ڈیوڑھی، ریوڑی، تیوری؛ اس کتاب میں ان سب لفظوں کی صورت ایک جیسی ہے، کہ یہ سب بروزنِ فاعلن آئے ہیں (اسی ضمیمے میں ان لفظوں کو دیکھا جا سکتا ہے)۔ یہ وضاحت کر دی جائے کہ تیوری، ڈیوڑھی جیسے لفظوں کا تلفظ دو طرح ہوتا رہا ہے: بروزنِ فاعلن اور بروزنِ فعلن۔ بروزنِ فاعلن میں ی اور واو دونوں ساکن رہتے ہیں، اور بروزنِ فعلن میں ی مخلوط التلفظ ہوتی ہے۔ [مولفِ نور نے اسے لکھنؤ اور دہلی کا اختلاف قرار دیا ہے، "تیوری" کے ذیل میں لکھا ہے: "دہلی میں بروزنِ فاعلن، لکھنؤ میں بروزنِ فعلن" مگر دہلی اور لکھنؤ کی تخصیص درست نہیں]۔ بروزنِ فاعلن کی دو مثالیں اوپر پیش کی گئی ہیں، بروزنِ فعلن کی یہ دو مثالیں نور سے منقول ہیں: ہو گئی جرأتِ بے تاب کی حالت تغیر ٭ تم ذرا اُس پہ جو تیوری کو بدل کر بیٹھے (جرأت)۔ اپنے ہمسر پہ کبھی آپ کی تیوری نہ چڑھی ٭ آئنے کو کبھی دیکھا نہ ترش رو ہو کر (شرف)۔ چوں کہ ک میں ایسے سبھی لفظوں میں ہر جگہ ی پر علامتِ مجہول موجود ہے (یعنی ی ساکن ہے) اس بنا پر اس کتاب میں ایسے سب لفظوں کو بروزنِ فاعلن پڑھا جائے گا۔ [اسی قبیل کا لفظ "سیوتی" (ایک پھول) ہے۔ میر حسن نے اسے بروزنِ فاعلن نظم کیا ہے: کیتکی، جوہی، چنبیلی، موگرا ٭ سیوتی، مشبّو، گلاب اور موتیا (مثنویاتِ حسن۔ مجلسِ ترقیِ ادب لاہور، ص ۴۰)۔ اس سے بھی یہی واضح ہوتا ہے کہ ایسے الفاظ بہ اظہارِ یا بھی مستعمل رہے ہیں] بقیہ اس ضمیمے کے آخر میں ص ۶۱۴ پر۔

ٹانکنا، ٹکنا: ص ۳۴۳، ح ⑤۔

ٹھم ٹھما رہا ہے: ص ۲۷۹، حاشیہ ⑪۔

ٹنگیانا: ص ۳۷۷، ح ③۔

ٹھٹّھا (ص ۴۹): م، ن، ک، ف، ع: سب میں اسی طرح (یعنی مع دو ہائے مخلوط)۔ مخطوطۂ گنجِ خوبی میں یہ لفظ ایک جگہ تو صرف ایک ھ کے ساتھ آیا ہے (ص ۱۲۴) مگر باقی مقامات پر دو ھ ملتی ہیں، مثلاً ص ۲۶۹، ۲۷۲۔ اسی لیے اس لفظ کو دو ہائے مخلوط کے ساتھ ہی

لکھا گیا ہے۔

ٹھہرا کر (ص ۱۱) : ک، ف، ع، م، ن : سب نسخوں میں اسی طرح ہے۔ اِسی کی پابندی کی گئی ہے۔ مختلف تحریروں میں "ٹھہرنا" کے تین املا ملتے ہیں : ٹہرنا، ٹھہرنا، ٹھیرنا۔ آج کل بالعموم "ٹھہرنا" مستعمل ہے، لیکن قدیم تحریروں میں "ٹھیرنا" اور "ٹہرنا" بھی موجود ہے۔ "ٹہرنا" مرزا غالب کی خطی تحریروں میں بھی ملتا ہے۔ [مولانا عرشی مرحوم نے املاے غالب پر بحث کرتے ہوئے اِس پر بھی روشنی ڈالی ہے (مقدمۂ مکاتیبِ غالب)] مخطوطۂ گنجِ خوبی میں ایک جگہ "ٹھہرتی ہے" ہے (ص ۳) اور ایک جگہ "ٹھہرتا ہے" ہے (ص ۱۷)۔ دیگر مقامات پر "ٹہرے" ص ۱۹۸، "ٹہرتا ہے" ص ۲۰۱، "ٹہرائیں" ص ۲۰۷، "ٹہری" ص ۲۰۲، ۲۵، "ٹہرا" ص ۹۴۔ اِس کا مطلب بہ ظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ خود میر امّن کے یہاں اِس لفظ کے املا میں اختلاف پایا جاتا ہے (میر امّن کی اِس تحریر میں بعض اور الفاظ کے بھی دو املا ملتے ہیں) چوں کہ ک، م اور ف میں ہر جگہ "ٹھہرنا" کے مشتقات میں دو ہ ملتی ہیں، اور چوں کہ خود میر امّن کے یہاں دو جگہ "ٹھہرتی ہے" موجود ہے، اِس بنا پر اسی املا کو مرجّح مانا گیا ہے۔

ٹھنڈی (ص ۱۱) : [ک، ف : ٹھنڈھی۔ م، ن، ع : ٹھنڈی] ک میں "ٹھنڈا" اور "ٹھنڈی" کہیں تو ایک ھ کے ساتھ ہیں، جیسے : کلیجا ٹھنڈا ہوتا (ص ۱۱۶) ٹھنڈی سانس بھری (ص ۹۵) ــ اور کہیں دو ھ کے ساتھ، جیسے : ٹھنڈھی سانس بھری (ص ۹۶) کلیجا ٹھنڈھا ہوا (ص ۲۰)۔ دوسرے نسخوں میں بھی اختلافِ املا کا کچھ ایسا ہی احوال ہے، مثلاً ک میں ص ۵۷ پر "ٹھنڈھا" ہے، مگر م، ن، ف میں اِس مقام پر "ٹھنڈا" ہے۔ ک میں ص ۶۵ پر "ٹھنڈی" ہے، مگر یہاں ف اور ع میں "ٹھنڈھی" ہے۔ مخطوطۂ گنجِ خوبی میں یہ الفاظ متعدد مقامات پر آئے ہیں اور ہر جگہ میر امّن نے اِن کو صرف ایک ھ کے ساتھ لکھا ہے، مثلاً "ٹھنڈا" : ص ۳۰، ۹۲، ۲۷۱۔ ٹھنڈی : ص ۱۴۰، ۱۶۱، ۱۹۰۔ چوں کہ ک میں اِس لفظ کے دونوں املا ملتے ہیں اور مخطوطۂ گنجِ خوبی میں صرف ایک املا ملتا ہے [اور آج کل عموماً اِسی طرح لکھتے ہیں] اِس بنا پر اِن الفاظ کو ہر جگہ میر امّن کی اپنی تحریر کے مطابق ایک ھ کے ساتھ (ٹھنڈا، ٹھنڈی، ٹھنڈک) لکھا گیا ہے۔ ہاں یہ بھی عرض کر دیا جائے کہ اگر ک، م، ن، ف میں اِن الفاظ کے سلسلے میں جو اختلافِ املا ہے، اُس کا شمار کیا جائے تو مجموعی طور پر "ٹھنڈا" اور "ٹھنڈی" کی تعداد زیادہ ملے گی۔ شروع کے پچاس صفحوں کا

جو ہیں۔ نے شمار کے لحاظ سے جائزہ لیا تو یہی صورت سامنے آئی۔ میں نے اپنے متن کی بنیاد نسخۂ کے کو بنایا ہے، اگر املا کا اختلاف موجود نہ ہوتا، تو لازماً اسی کی پیروی کی جاتی اور اسی املا کو اختیار کیا جاتا، مگر صورتِ حال یہ ہے کہ خود کے میں یہ لفظ دو طرح ملتا ہے اور یہ طے کرنا مشکل معلوم ہوتا ہے کہ کس املا کو ترجیح دی جائے؛ اس لیے اس لفظ کے املا کے سلسلے میں کے پر انحصار کرنے کے بجائے، میر امّن کی تحریر پر انحصار کیا گیا ہے۔

ٹھیپ (ص ۱۹): کے میں یہ لفظ مع یائے معروف ہے اور فے کی فرہنگ میں بھی اسے مع یائے معروف لکھا گیا ہے، اسی کی مطابقت اختیار کی گئی ہے۔ آصفیہ میں یہ لفظ موجود نہیں۔ پلیٹس کے لغت میں موجود ہے اور اس میں اسے مع یائے معروف ہی درج کیا گیا ہے۔

ٹھینٹھ (ص ۵): م، ن، کے، فے، ع: سب نسخوں میں یہ لفظ اسی طرح ملتا ہے، یعنی درمیان میں نونِ غنّہ ہے اور آخر میں بھی ہائے مخلوط ہے۔ فرہنگِ آصفیہ میں "ٹھیٹ" لکھا ہوا ہے، لیکن پلیٹس نے اپنے لغت میں اس لفظ کو "ٹھینٹھ" اور "ٹھیٹھ" دونوں طرح لکھا ہے۔ کے کی مطابقت اختیار کی گئی ہے۔

ثمرہ (ص ۱۶۱): کے اور فے میں اس لفظ پر اعراب موجود نہیں؛ البتہ فے کی فرہنگ میں اسے مع میمِ ساکن "ثمْرہ" لکھا گیا ہے۔ اسی کی مطابقت اختیار کی گئی ہے۔ اصلاً ث اور م دونوں پر زبر ہے، لیکن زبانوں پر بہ سکونِ میم ہی آتا ہے۔ نور میں قدر کا یہ شعر سند آمندرج ہے (جس میں یہ لفظ بہ سکونِ میم آیا ہے): کچھ بھی غفلت کا نہ ثمرہ پایا ۔ ملی تنخواہ نہ بے کاری کی۔ مثنوی گلزارِ نسیم کا یہ شعر بھی اس سلسلے میں پیش کیا جا سکتا ہے: ہر شاخ میں ہے شگوفہ کاری ۔ ثمرہ ہے قلم کا حمد باری۔

جارُوب (ص ۱۳۹): کے میں اسے مع واوِ معروف لکھا گیا ہے، فے کی فرہنگ میں بھی اسی طرح ہے۔ شیفتہ میں یہ لفظ مع واوِ معروف اور مع واوِ مجہول، دونوں طرح آیا ہے۔ پلیٹس نے بھی اپنے لغت میں اسے دونوں طرح درج کیا ہے۔ چوں کہ کے میں یہ مع واوِ معروف ہے اور فے کی فرہنگ میں بھی اسے مع واوِ معروف درج کیا گیا ہے، اس بنا پر اسے مع واوِ معروف لکھا گیا ہے۔

جچا (ص ۱۷۸): سب نسخوں میں اسی طرح ہے۔ آصفیہ میں بھی اسی طرح مندرج ہے اور اس لحاظ سے بہ ظاہر اس لفظ سے متعلق کسی طرح کی وضاحت کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی، مگر صورتِ حال یہ ہے کہ زبانوں پر "جچّا" بھی ہے ("زچّہ" کی طرح) نسلین اور پلیٹس کے لغات میں "جچّا" بھی

مندرج ہے [اس فرق کے ساتھ کہ فیلن نے "جِدّا" کو "مقبولِ عام" تلفظ بتایا ہے اور پلیٹس نے اسے عامیانہ تلفظ بتایا ہے]۔ اسی بنا پر وضاحت کی ضرورت محسوس کی گئی۔

جُدہی (ص ۸): اس سے پہلے یہ لفظ ص ۳ پر آیا ہے: "رنگ بہ رنگ کی شکلیں جُدہی جُدہی بنائیں"۔ طلبہ کی معلومات کے لیے یہ صراحت کی جاتی ہے کہ "جُدا" اور "جُدہی" ایک ہی لفظ کی دو شکلیں ہیں [جیسے "ذرا" اور "ذری" ایک ہی لفظ کی دو صورتیں ہیں]۔ یہ لفظ دونوں صورتوں میں اس زمانے میں مستعمل رہا ہے۔ "جُدہی" کی صرف ایک مثال: انھوں کے لیے گڑگڑہی اک نئی؛ منگا کر قصائی سے رکھی جُدہی۔ میرحسن [مثنویاتِ میرحسن، مرتبہ ڈاکٹر وحید قریشی، مجلسِ ترقیِ ادب لاہور، ص ۲۵]۔ آصفیہ میں "جُدہی" مندرج نہیں، البتہ نور میں موجود ہے۔ گنجِ خوبی میں بھی یہ لفظ ملتا ہے (مخطوطۂ گنجِ خوبی، ص ۸۹)۔

جُرأت (ص ۲۹): م، ن اور ک میں اس لفظ کا املا اسی طرح ہے (یعنی الف پر ہمزہ موجود نہیں) م میں الف پر زبر بھی لگا ہوا ہے (جرَات)۔ ف میں "جرأت" ہے۔ مخطوطۂ گنجِ خوبی میں یہ لفظ جہاں بھی آیا ہے، میرامّن نے اپنے قلم سے اسے ہمزہ کے بغیر (جُرات) لکھا ہے، مثلاً: ص ۹۸، ۱۵۵، ۱۵۷، ۱۵۸، ۱۵۹، ۱۶۳، ۲۰۸، ۲۳۵۔ اسی کی مطابقت اختیار کی گئی ہے اور (م کے مطابق) الف پر زبر بھی لگایا گیا ہے۔ یہ بھی واضح کر دیا جائے کہ میرامّن نے ایسے دوسرے لفظوں میں بھی الف پر ہمزہ نہیں لگایا ہے، مثلاً: توام، تامّل، تانّی۔ توام ص ۱۱۔ تامّل ص ۱، ۱۲، ۸۵۔ تانّی دو تامّل ص ۱۳ (مخطوطۂ گنجِ خوبی)۔ ک میں بھی ان لفظوں کا یہی املا ملتا ہے۔

جَمع (ص ۱۲): یہ لفظ سب سے پہلے ص ۵ پر آیا ہے: "جتنے وصف سرداروں کو چاہییں، اُن کی ذات میں خدا نے جمع کیے ہیں"۔ یہ دل چسپ بات ہے کہ یہ لفظ اس کتاب میں بہت سے مقامات پر آیا ہے اور کسی ایک جگہ بھی م، ک اور ف تینوں نسخوں میں اس پر اعراب موجود نہیں، البتہ ف کی فرہنگ میں اسے بہ سکونِ ع درج کیا گیا ہے۔ گنجِ خوبی میں بھی یہ لفظ جگہ جگہ آیا ہے اور اُس کے مخطوطے میں کہیں بھی اس لفظ پر اعراب موجود نہیں؛ البتہ گنجِ خوبی میں یہ میم کے زبر کے ساتھ نظم ہوا ہے: مرے گا جب وہ، تو دشمن کے ہاتھ آوے گا مال؛ بس ایسے مال جمع کرنے سے ہے جی کا وبال (مخطوطۂ گنجِ خوبی، تینتیسواں باب، ص ۱۸۶)۔ لینے دینے کے واسطے ہے درم؛ کچھ جمع کرنے کی ہے خاطر کم (بیسواں باب، مخطوطہ ص ۹۴)۔ اصلاً "جَمع" ہے اور فارسی

ترکیب کی صورت میں اِس کا یہ تلفظ برقرار اور نمایاں رہتا ہے، مثلاً ع : مری نگاہ میں ہے جمع و خرچ دریا کا (غالب) لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ جب یہ لفظ مفرد ہوتا ہے تو زبانوں پر میم کے زبر کے ساتھ آتا ہے، جیسے : ہم نے بینک میں روپیا جمع کر دیا۔ کون کہے گا کہ "جَمع کر دیا"۔ اِسی طرح " زبانی جمع خرچ "۔

چوں کہ کسی نسخے میں کسی بھی جگہ "جمع" پر اعراب نہیں ملتے ہیں، اِس لیے از راہِ احتیاط میں نے یہی مناسب خیال کیا کہ اِس لفظ پر اعراب نہ لگائے جائیں؛ البتہ اُردو میں استعمالِ عام کے مطابق اور اِس لحاظ سے بھی کہ میر امّن نے اِسے (مفرد صورت میں) میم کے زبر کے ساتھ نظم کیا ہے، اِس لفظ کو میم کے زبر کے ساتھ پڑھنا بہتر ہوگا۔

ہاں یہ مسلّمات میں سے ہے کہ اِن معاملات میں قیاس ساتھ نہیں دے پاتا؛ یعنی ایک لفظ اگر ایک طرح ہے، تو یہ لازم نہیں کہ اُس انداز کا دوسرا لفظ بھی اُسی طرح ہو۔ ایسا نہیں ہوتا۔ مثلاً میر امّن نے "جمع" نظم کیا ہے، مگر اِسی وزن کے ایک اور لفظ "صلح" کو اصل کے مطابق بہ سکونِ دوم ہی استعمال کیا ہے : جو دانا ہے کرتا ہے وہ صلح عام ٭ تو اِس راہ چل، صلح ہے خوب کام (مخطوطۂ گنجِ خوبی، ص ۱۶۹)۔ یا جیسے عقل : اپنی ہی فقط عقل پہ مغرور نہ ہو ٭ جو کام ہو، تدبیر سے تو کر اُس کو (گنجِ خوبی، اٹھائیسواں باب)۔ اِس لیے یہ ضروری نہیں کہ اِس وزن کے جملہ ساکن الاوسط لفظوں کا احوال ایک جیسا ہو۔ ہاں جن لفظوں سے متعلق کسی طرح کی وضاحت ہمارے سامنے ہے، اُن کے متعلق یہ طرزِ عمل اختیار کیا جا سکتا ہے۔ اِسی لیے ایسے الفاظ، جن کے تلفظ کے متعلق مصنّف کے طرزِ عمل کا یا تعیّن کا ہم کو علم ہے، اُن سے متعلق اپنے اپنے مقام پر ضروری وضاحت کر دی گئی ہے۔ جن الفاظ کے تلفّظ کے متعلق مصنّف کے طرزِ عمل کا کسی بھی طرح علم حاصل نہیں ہو سکا ہے، اُن کو اُن کے متعیّن تلفّظ کے مطابق لکھا گیا ہے اور ضروری مقامات پر وضاحت بھی کر دی گئی ہے۔

جُمعہ (ص ۱۳۷) : ک میں جیم پر پیش تو لگا ہوا ہے، مگر دوسرے حرفوں پر سکون یا حرکت موجود نہیں۔ ف میں "جُمع" ہے، یعنی آخر میں ہائے مختفی موجود نہیں۔ بہ لحاظِ اصل "جُمُعَہ" اور "جُمْعَہ" ہے (یعنی دونوں طرح درست ہے) مگر اُردو والوں کی بول چال میں یہ لفظ بروزنِ فعل آتا ہے۔ صاحبِ نور اللغات نے اِس کی صراحت کی ہے کہ اِس لفظ کے اصل اعراب لکھ کر،

"مزید لکھا ہے: "بیش تر بول چال میں "جُما" ہے، "جمعہ" نہیں ہے"، اور یہ بالکل درست ہے۔
سیّد انشا نے دریائے لطافت میں لکھا ہے:

"بعضے اِس عبارت "جمعے کے دن عید ہوگی" کو "جُمے کے دن عید ہوگی" کہتے ہیں، لیکن "جُمے کے دن" زیادہ فصیح ہے، اگرچہ لُغت میں غلط ہے۔ اِس کی وجہ یہ کہ اُردو میں بلکہ ہر زبان میں استعمال مستند ہوتا ہے، اصل لفظ چاہے کچھ ہو اور اُسے غلط بھی نہیں بتاتے" [ترجمۂ دریائے لطافت۔ ص ۲۲۰]۔

اِس بنا پر متعمل لفظ "جُمْعَہ" (بروزنِ فُعْل) ہوگا اور اِس کی محرّف صورت "جُمّے" ہوگی۔ اِسی نسبت سے میم کے نیچے زیر لگایا گیا ہے۔ ["جُمِعرات" کو آصفیہ میں بھی میم کے زیر کے ساتھ ہی لکھا گیا ہے اور باغ و بہار میں دو جگہ "جُمیرات" آیا ہے، یہ بھی اِسی پر دلالت کرتا ہے کہ اِس لفظ کا تلفظ "فُعِل" کے وزن پر ہونا چاہیے]۔
جُمیرات (ص ۲۰۸): یہ لفظ اِس کتاب میں دو جگہ آیا ہے اور دونوں جگہ ک، ف، ع میں "جمیرات" ہے۔ ن میں دونوں جگہ "جمعرات" ہے۔ بہت سے فارسی عربی الفاظ کے تلفظ اور املا کے سلسلے میں میرامّن کا جو عمومی انداز تھا، اُس کے پیشِ نظر یہ مان لینا قطعی طور پر درست ہوگا کہ میرامّن نے "جمیرات" لکھا ہے۔ اِسی بنا پر یہاں متعارف املا کو، جو ن میں ہے، ترجیح نہیں دی گئی، بل کہ ک اور ف کی مطابقت اختیار کی گئی ہے اور ک کے املا کو برقرار رکھا گیا ہے۔ ہاں فیلن نے اپنے لُغت میں "جمعرات" لکھا ہے، اور پھر جیسا کہ اُس کا طریقہ کار اور معمول ہے، اِسے رومن رسمِ خط میں "JUMʿERĀT" لکھا ہے، یعنی میم کے بعد عین کی نشان دہی کی ہے، مگر امثال میں ہر جگہ JUMERAT ہی لکھا ہے (ع کی نشان دہی کے بغیر) اور یہ اُردو میں استعمالِ عام کے عین مطابق ہے اور میرامّن نے جو املا اختیار کیا ہے، بہ ظاہر اُس سے بھی مطابقت رکھتا ہے۔
جَنَم (ص ۹): ک اور م میں نون پر زبر لگا ہوا ہے۔ ک میں ص ۹۷ پر بھی "جنم پتری" آیا ہے۔ اِسی صفحے پر مفرد لفظ "جنم" بھی آیا ہے اور ہر جگہ نون پر زبر موجود ہے۔ سنسکرت کے لحاظ سے اِس لفظ میں نون ساکن ہے، مگر ہندی میں بہ فتحِ نون بھی متعمل رہا ہے اور محاورے میں تو بہ فتحِ نون ہی بولتا ہے۔ اُردو میں بالعموم بہ فتحِ نون متعمل رہا ہے۔ آصفیہ اور نور میں نون پر

زبر لگا ہوا ہے اور نور میں سند کے جو متعدد اشعار درج کیے گئے ہیں، اُن سب میں بھی بہ فتح نون ہی آیا ہے، ایک شعر یہ ہے : طریق کفر میں ہے کون ہم سبق اپنا ؛ کہ ہے بتوں کا جَنَم بھر ترا کتاب اپنی (بحر لکھنوی)۔ میر امّن نے گنجِ خوبی میں نون کے زبر کے ساتھ نظم بھی کیا ہے : نہیں تو وہ سارا جَنَم ہے اکارت ؛ جو حرص و ہوا اور برائی میں گزرے۔ (مخطوطۂ گنجِ خوبی، چھبیسواں باب) اِسی نسبت سے نون پر زبر لگایا گیا ہے۔

جَواہِر (ص ۳۱) : ک اور ف میں ہ کے نیچے زیر لگا ہوا ہے۔ اِس بیان میں یہ لفظ کئی جگہ آیا ہے اور ہر جگہ ک اور ف میں "جواہِر" ہے۔ مفرد لفظ "جوہر" کی جمع "جواہر" ہی بنے گی اور یوں بہ ظاہر اِس لفظ کے سلسلے میں کسی طرح کی صراحت کی ضرورت معلوم نہیں ہوتی ؛ مگر صورتِ حال یہ ہے کہ آصفیہ میں "جواہَر" ہے، یعنی ہ پر زبر لگا ہوا ہے۔ اِسی طرح "جواہَرات" اور "جواہَر خانہ"۔ آصفیہ میں تو کسی طرح کی صراحت نہیں ملتی، مگر فیلن نے اپنے لغت میں "جواہِر" لکھ کر، مزید لکھا ہے کہ مقبولِ عام تلفظ "جواہَر" ہے۔ یہ گویا توجیہ ہوئی آصفیہ کے اندراج کی۔ سَودا کے ایک قطعے میں، جس کے قوافی "بہتَر" اور "کم تَر" وغیرہ ہیں، "جواہَر" بھی آیا ہے اور اِس سے فیلن کے قول اور آصفیہ کے اندراج کی تائید کا پہلو سامنے آتا ہے۔ چوں کہ ک اور ف میں ہر جگہ "جواہِر" ہے، اِس بنا پر اُسی کی مطابقت اختیار کی گئی ہے اور ہ کے نیچے زیر لگایا گیا ہے۔

جُوں تُوں (ص ۲۱) : م اور ک میں دونوں ٹکڑوں میں واو پر مجہول کی علامت موجود ہے (جوٗں توٗں)۔ ک میں جہاں بھی یہ لفظ آئے ہیں، ہر جگہ واو پر علامتِ مجہول ملتی ہے، مثلاً : ۱۹، ۴۵، ۸۲۔ یہی صورت م کی ہے۔ مخطوطۂ گنجِ خوبی میں بھی یہ لفظ مع واوِ مجہول مندرج ہیں، ایک مثال : "جوٗں کی توٗں شکلیں ستاروں کی قلم اُس کا لکھے" (ص ۲۴۳)۔ آصفیہ میں "جُوں تُوں" کے ذیل میں یہ صراحت موجود ہے کہ "بہ ضمِ جیم و واوِ مجہول و معروف ہر دو درست"۔ یعنی "جوٗں توٗں" بھی درست ہے اور "جُوں تُوں" بھی ؛ چوں کہ اصل نسخوں (ک اور م) میں ہر جگہ یہ لفظ بہ واوِ مجہول ملتے ہیں اور مخطوطۂ گنجِ خوبی میں بھی یہی صورت ہے ؛ اِس لیے اِنھیں مع واوِ مجہول ہی لکھا گیا ہے۔

ہاں یہ وضاحت کر دی جائے کہ ف کے آخر میں جو فرہنگ ہے، اُس میں اِن لفظوں کو مع واوِ مجہول اور مع واوِ لین (جوٗں توٗں۔ جَوں تَوں) دونوں طرح لکھا گیا ہے۔ "جوں توں"

کہیں اور نہیں دیکھا گیا۔
جُو نہیں (ص ۲۶): م اور ک میں واو پر علامتِ مجہول موجود ہے، اسی کی پابندی کی گئی ہے۔ اسی ضمیمے میں لفظِ "جُوں تُوں" کے ذیل میں تلفّظ کے سلسلے میں جو کچھ لکھا گیا ہے، اُسے دیکھا جائے۔ "جوں توں" اور "جو نہیں" میں پہلا جز (جُوں) ایک ہی ہے۔ جس طرح "جُوں تُوں" میں وہ بہ واوِ مجہول ہے، اُسی طرح "جو نہیں" میں بھی بہ واوِ مجہول رہے گا۔ ک میں ہر جگہ یہ لفظ بہ واوِ مجہول ملتا ہے، مثلاً: ۲۳، ۵۰، ۸۷، ۸۸، ۱۲۰۔
جوئے (ص ۲۲): ک اور م میں اسی طرح ہے۔ یہ لفظ ص ۱۳۹ پر بھی آیا ہے اور ک میں وہاں بھی اسی طرح ہے۔ گل کرسٹ کے نظامِ املا کے مطابق واوِ معروف پر کوئی علامت نہیں ہوتی تھی، البتّہ واوِ مجہول پر ایک گول نشان بہ طورِ علامتِ مجہول بنا دیا جاتا تھا۔ یوں اِس لفظ میں واوِ معروف ہوا۔ لفظِ "جُوا" بروزنِ فَعَل ہے اور اسی طرح مستعمل رہا ہے۔ آصفیہ میں بھی "جُوا" ہے، اِس کی محرّف صورت "جُوے" ہوئی اور عموماً اسی طرح سننے میں آتا ہے۔ ک، ف اور م میں یہ جس طرح ہے، اُس سے اِس کا تلفّظ بہ ظاہر "جوئے" بروزنِ فعلن متعین ہوتا ہے؛ البتّہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ایسے مواقع پر واو کی آواز دب جاتی ہے، یوں اِسے بروزنِ فَعَل بھی کہا جا سکتا ہے۔ میں نے یہ مناسب نہیں سمجھا کہ اِس لفظ کے املا میں کسی طرح کی تبدیلی کی جائے، یوں اِسے ک کے مطابق "جوئے" ہی لکھا ہے، البتّہ یہ ضرور کہنا چاہتا ہوں کہ اِس صورت میں بھی واو کی آواز نمایاں نہیں ہوگی، صرف جیم کا پیش نمایاں ہوگا۔
جھر وکھا: ص ۲۵۱، ح (۳)
جھڑ (بیڑی): ص ۲۸۶، ح (۳)
جھلَم (ص ۲۰۶): ک میں "جھلَم" ہے، ف میں بھی جیم کے نیچے زیر موجود ہے؛ اسی کی مطابقت اختیار کی گئی ہے۔ یہ صراحت یوں کی گئی ہے کہ آصفیہ میں "جَھلَم" (بہ فتحِ اوّل و دوم) ہے۔ ہاں ع میں "جھلّم" ہے؛ مع لام مشدّد کہیں اور نہیں دیکھا گیا۔
جھنجلا کر (ص ۱۴۶): [ک، ف، ع: جھنجھلا کر۔ ن: جھنجلا کر] میں نے اِس لفظ کی حد تک ن کے املا کو ترجیح دی ہے؛ اِس کی وجہ یہ ہے کہ مخطوطۂ گنجِ خوبی میں "جھنجلانا" کے مشتقات کئی جگہ آئے ہیں اور ہر جگہ میر امّن نے اپنے قلم سے اُن کو صرف

ایک بائے مخلوط کے ساتھ لکھا ہے، مثلاً: جھنجلاکر ص ۵۹، ص ۱۷۱، جھنجلا ۱۷۸، جھنجلا دیں ص ۲۱۰۔ کسی ایک جگہ دُو ھ نہیں ملتیں۔ اِس تکرار اور التزام کی بنا پر یہ معلوم ہوا کہ مصنّف نے اِس مصدر کے مشتقات کو صرف ایک ھ کے ساتھ لکھا ہے اور ن میں جو صورت ہے وہ املاے مصنّف کے عین مطابق ہے، اِس بنا پر ن کی مطابقت اختیار کی گئی ہے۔ ہاں آصفیہ میں بھی "جھنجلانا" (ایک ھ کے ساتھ) ہے۔

جھُوبڑی (ص ۱۴۷): ک، ف، ع: سب میں اِس لفظ کا یہی املا ہے۔ وضاحت کی ضرورت یوں محسوس ہوئی کہ اِس لفظ کو دو طرح لکھا جاتا ہے: جھوپڑی، جھونپڑی۔ آصفیہ اور نور میں صرف "جھونپڑی" ہے، اِسی طرح "جھونپڑا"۔ فیلن کے لغت میں بھی یہی صورت ہے، البتہ پلیٹس کے لغت میں اِن دونوں لفظوں کو مع نونِ غنّہ اور بغیر نونِ غنّہ دونوں طرح درجِ لغت کیا گیا ہے۔ مخطوطۂ گنجِ خوبی میں بھی یہ لفظ نونِ غنّہ کے بغیر ملتا ہے (ص ۲۱، ۲۱۲، ۲۱۵) اِنھی وجوہ سے اِسے نونِ غنّہ کے بغیر لکھا گیا ہے۔

جھوٹا (ص ۱۲۵): ن، ک، ف، ع: سب میں اِس لفظ کا یہی املا ہے۔ اِسی داستان میں آگے چل کر پھر یہ لفظ آیا ہے: "تمھارے آگے کے جھوٹے سے اپنا پیٹ بھر لوں گا" وہاں بھی سب نسخوں میں "جھوٹے" ہے۔ اِسی املا کی مطابقت اختیار کی گئی ہے۔ صراحت کی ضرورت یوں محسوس ہوئی کہ دروغ کے معنی میں "جھوٹھ، جھوٹھی، جھوٹھا" کو دُو ھ کے ساتھ لکھا گیا ہے (دیکھیے لفظِ "جھوٹھ" کی بحث اِسی ضمیمے میں) "جھوٹا" اور "جھوٹھا"، اِن دُو مختلف المعنی لفظوں کے املائی امتیاز کو نظر میں رہنا چاہیے۔

جھوٹھ (ص ۲۰): ع: جھوٹ [م، ن، ک، ف: جھوٹھ]۔ م، ک، ف میں جہاں بھی یہ لفظ (دروغ کے معنی میں) آیا ہے، دُو ھ کے ساتھ (جھوٹھ) ملتا ہے۔ اِسی طرح "جھوٹھا" اور "جھوٹھی" یعنی اِن نسخوں میں اِس لفظ کا یہی ایک املا ملتا ہے، اِس بنا پر ک کی مطابقت میں اِسی املا کو اختیار کیا گیا ہے۔ اِس سلسلے میں یہ وضاحت بھی بے محل نہ ہوگی کہ مخطوطۂ گنجِ خوبی میں یہ لفظ کہیں ایک ھ کے ساتھ (جھوٹ) ملتا ہے اور کہیں دُو ھ کے ساتھ (جھوٹھ) ہے۔ مثلاً جھوٹ: ص ۱۲۷، ۱۳۲، ۱۳۵، ۱۵۸، ۱۵۹، ۲۵۸، ۲۷۹، ۲۶۰، ۲۴۱، ۲۷۲، ۲۹۵ — جھوٹھ: ص ۴۳، ۶۲، ۴۴، ۱۳۴، ۱۳۵، ۱۵۲، ۱۹۵، ۲۰۵، ۲۲۵، ۲۱۲ — اگر شمار کیا جائے تو

دونوں صورتوں کی تعداد تقریباً برابر ملے گی۔ میر امن کی تحریر میں کئی لفظوں کا املا دو طرح ملتا ہے خاص کر اُن لفظوں کا جن میں ہائے مخلوط کی بنا پر اختلافِ املا کی نمود ہوئی ہے۔ یہ لفظ بھی اسی فہرست میں شامل ہے۔ چوں کہ ہم نے اس متن کی بنیاد نسخۂ ک کو بنایا ہے، اور اس میں اِس لفظ کا صرف ایک املا ملتا ہے، اِس بنا پر اِس لفظ کے املا میں اُسی کی مطابقت اختیار کی گئی ہے۔ [یہ بھی ذہن میں رہے کہ نسخۂ م میں بھی اِس لفظ کا یہی ایک املا (بھوٹھا) ملتا ہے۔]

بھوٹھا، ہوٹھا: ص: ۱۳۱، ح (۱۱)۔

چھوٹما (ص ۲۳۸): ن، ک، ف، ع، سب میں اسی طرح یعنی مع نونِ غنّہ ہے۔ اِسی ضمیمے میں لفظ "چونٹا" کی بحث آچکی ہے۔ [آج کل "چومنا" اور "چھومنا" نونِ غنّہ کے بغیر مستعمل ہیں] جس بنا پر وہاں "چونٹا" کو برقرار رکھا گیا ہے، اُسی بنا پر یہاں "چھونٹا" کو برقرار رکھا گیا ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے "چونٹا"۔

چاپیتا: ص ۲۴۱، ح (۷)۔

چِبلا (ص ۵۷): م اور ک میں "چِبلا" ہے، یعنی چ کے نیچے زیر ہے، مگر ب خالی ہے۔ ف میں "چِبلا" ہے، آصفیہ میں بھی "چِبلّا" ہے؛ اِسی کی مطابقت اختیار کی گئی ہے۔ صراحت کی ضرورت خاص طور پر یوں محسوس کی گئی کہ اِسے بہ فتحِ دوم بھی سنا گیا ہے، نیز فیلن و پلیٹس کے لغات میں اِسے بہ کسرِ با اور بہ فتحِ با، دونوں طرح درج کیا گیا ہے۔ نور میں چ کے نیچے زیر تو ہے مگر ب خالی ہے۔

چراغ (ص ۱۸): ک میں اِس لفظ پر اعراب موجود نہیں، ہاں م اور ف میں "چِراغ" ہے۔ فارسی میں یہ لفظ بہ فتحِ اوّل بھی ہے اور بہ کسرِ اوّل بھی (بہارِ عجم)۔ برہانِ قاطع کے ایرانی مرتب ڈاکٹر معین نے اِس لفظ سے متعلق حاشیے میں لکھا ہے کہ "شکلِ پہلوی آن CIRAGH است" اور اِس سے بہ کسرِ اوّل کا سُراغ مل جاتا ہے۔ اِس کی عربی صورت "سِراج" ہے اور وہ بھی بہ کسرِ اوّل ہے۔ نور اللغات میں یہ لفظ موجود ہے اور اُس میں فارسی میں اختلافِ حرکات کا تو حوالہ دیا گیا ہے لیکن یہ صراحت نہیں کی گئی کہ اُردو میں کیا صورت ہے۔ بہ ظاہر یہ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ مولّف کے نزدیک، فارسی کی طرح، اُردو میں بھی دونوں طرح یعنی بہ فتحِ اوّل اور بہ کسرِ اوّل درست ہے۔ ہاں آصفیہ میں "چَراغ" اور "چَراغی" ہے، یعنی مولّفِ آصفیہ نے اِسے صرف بہ فتحِ اوّل

مانا ہے۔ سُننے میں یہ لفظ بہ فتحِ اوّل بھی آتا ہے اور بہ کسرِ اوّل بھی، یعنی فارسی کی طرح اُردو میں بھی یہ دونوں طرح مستعمل رہا ہے۔

جیسا کہ لکھا جا چکا ہے، ک میں اِس لفظ پر اعراب موجود نہیں، البتہ م اور ف میں چاروں جگہ چ کے نیچے زیر لگا ہوا ہے۔ (چِراغ)۔ علاوہ ازیں مخطوطۂ گنجِ خوبی میں میر امّن نے اپنے قلم سے چ کے نیچے زیر لگایا ہے، یعنی اِسے "چِراغ" لکھا ہے (ص ۲۱۶)۔ اِسی کے مطابق اِس لفظ کو بہ کسرِ اوّل لکھا گیا ہے۔

چِراغاں (۳۶) : لفظ "چراغ" کے ذیل میں حرفِ اوّل کے مفتوح یا مکسور ہونے کی بحث کی جا چکی ہے۔ ک میں اِس لفظ پر اعراب موجود نہیں، لیکن م اور ف میں "چِراغاں" ہے۔ یہ لفظ اِس کے بعد ص ۵۶ پر تین بار آیا ہے، ک میں وہاں بھی اِس لفظ پر اعراب موجود نہیں، مگر م اور ف میں تینوں جگہ "چِراغاں" ہے۔ "چِراغ" اور "چِراغاں"، اِن دونوں لفظوں کو م اور ف کے مطابق بہ کسرِ اوّل لکھا گیا ہے۔

چِخرم (۱۲۲) : ک اور ف میں اِس لفظ پر اعراب موجود نہیں۔ یہ لفظ ف کی فرہنگ میں موجود نہیں۔ فارسی میں "چَخرم" ہے (حاشیۂ برہانِ قاطع، جلدِ دوم، ص ۶۳۴) لیکن آصفیہ میں "چِخرم" ہے اور فیلن نے بھی اپنے لغت میں اِسی طرح لکھا ہے؛ اِس کا مطلب یہ ہوا کہ اُردو میں یہ لفظ بہ کسرِ اوّل مستعمل رہا ہے۔ آصفیہ کے مطابق چ کے نیچے زیر لگایا گیا ہے۔

چِلَپْچی (۷۸) : اِس مقام پر سب نسخوں میں یہی ہے۔ آگے چل کر ص ۱۰۰ پر بھی یہ لفظ آیا ہے اور وہاں سب نسخوں میں "سلپچی" ہے۔ اپنے اپنے مقام پر اِن دونوں صورتوں کو برقرار رکھا گیا ہے۔

غیاث اللغات میں "چلپچی" ہے؛ یہ صراحت بھی کی گئی ہے کہ یہ ترکی لفظ ہے، یہ بھی لکھا گیا ہے کہ: "مردم از ناواقفی 'چلمچی' گویند"۔ مگر اُردو میں چلپچی، چلمچی، سلپچی، سلفچی؛ یہ کئی صورتیں پائی جاتی ہیں (آصفیہ۔ نور) اور میں نے "سلبچی" بھی سُنا ہے۔

اعراب کا احوال یہ ہے کہ غیاث میں اِسے "بہ فتحتین و سکونِ بائے فارسی" لکھا گیا ہے۔ پھر یہ بھی لکھا ہے کہ "بعضے بہ کسرِ اوّل و فتحِ ثانی نوشتہ"۔ یعنی "چَلَپْچی" اور "چِلَپْچی" دونوں طرح درست ہے۔ آصفیہ میں "چِلَپْچی" ہے (اور سُننے میں بھی اِسی طرح آیا ہے)۔ ک میں بھی چ کے نیچے زیر لگا ہوا ہے اور لام پر زبر ہے۔ ک میں "سِلَپْچی" کے بھی سین کے نیچے زیر لگا ہوا ہے اور لام پر زبر موجود ہے؛ اِسی کی مطابقت اختیار کی گئی ہے۔

چُمّاق (۱۰۲): کے، ف اور ع میں "چُمّاق" ہے، یعنی م پر تشدید لگی ہوئی ہے، لیکن ف کی فرہنگ میں اسے تشدید کے بغیر (CHUMĀK) لکھا گیا ہے۔ ن میں "چماق" (بغیرِ تشدید) ہے۔ اصل لفظ "چُماق" بغیرِ تشدید ہے۔ (غیاث اللغات۔ برہانِ قاطع) برہانِ قاطع میں اسے بروزنِ "بُراق" لکھا گیا ہے اور اس لغت کے ایرانی مرتب ڈاکٹر معین نے اس کے حاشیے میں یہ وضاحت کی ہے کہ: "از ترکی چوماق بہ معنیِ گُرز"۔ اس سے اس لفظ کا تشدید کے بغیر ہونا مسلّم ہو جاتا ہے؛ اس کے باوجود میں نے تشدید کو برقرار رکھا ہے، محض اس خیال سے کہ یہ بہ خوبی ممکن ہے کہ مصنف نے اسی طرح یعنی مع تشدید لکھا ہو اور یہ لفظ اُس زمانے میں یہاں والوں کی زبان پر مع تشدید ہی ہو۔

چِچیا (۲۲): م، ت، کے، ف، ع؛ سب نسخوں میں اس لفظ کا یہی املا ہے (یعنی آخر میں الف ہے)۔ فارسی میں "چِچِہ" ہے (غیاث اللغات)۔ برہانِ قاطع میں یہ لفظ موجود نہیں تھا، اس کے ایرانی مرتب ڈاکٹر معین نے حاشیے میں اس لفظ کا اضافہ کیا ہے اور "چِچِہ" ہی لکھا ہے، سند میں سعدی کا یہ شعر بھی لکھا ہے: غریبے گرت ماست پیش آورد ٭ دو پیمانہ آب است و یک چِچِہ دوغ۔ میں نے م، کے اور ف کی مطابقت اختیار کی ہے اور اس بنا پر اُسی املا کو برقرار رکھا ہے [اس کو "چِچِہ" کی ہند صورت فرض کر لینا چاہیے]۔

چِچولے: ص ۳۵۸، ح ⑤

چُوسٹوں: ص ۳۶۰، ح ⑥

چوگھرا (۷۸): آصفیہ اور نور میں صرف "چوگھرا" ہے اور یہی صورت فیلن کے لغت کی ہے، البتہ پلیٹس نے "چوگھرا" اور "چوگھڑا" دونوں صورتیں درج لغت کی ہیں۔ کے، ف، ع تینوں نسخوں میں "چوگھرا" ہے۔ کے میں ص ۸۱ پر بھی "چوگھرا" ہے (ف اور ع میں بھی اسی طرح ہے) اسی کی مطابقت اختیار کی گئی ہے۔

چُونما (۱۰۰): ن، کے، ف، ع؛ سب نسخوں میں یہاں "چُونما" (مع نونِ غنہ) ہے۔ یہ لفظ آگے چل کر خواجۂ سگ پرست کے قصّے میں بھی آیا ہے، جب وزیر کی لڑکی خواجۂ سگ پرست کو اپنے ساتھ لے کر آتی ہے اور اپنی ماں سے ملنے جاتی ہے: "بیٹی کو چھاتی سے لگا لیا اور منہ چوما" (ص ۱۳۱) وہاں سب نسخوں میں "چوما" (نونِ غنہ کے بغیر) ہے۔ اسی قصّے میں اس سے ذرا آگے بڑھ کر یہ لفظ پھر آیا ہے جب خواجۂ سگ پرست شاہی دربار میں حاضر ہوتا ہے: "خواجہ نے زمین چومی"

(ص ۱۴۳) یہاں ن میں "چونٹی" ہے اور ک، ف، ع میں "چونٹی" ہے۔ اس کے بعد ص ۱۴۳ پر "چوما" ہے، وہاں ن میں "چونما" ہے اور سب نسخوں میں "چوما" ہے۔ جیسا کہ اس سے پہلے لکھا جاچکا ہے، نونِ غنّہ کی آواز بہت سے الفاظ کے سلسلے میں سیّال حالت میں رہی ہے اور دہلی میں بھی یہ صورت شروع سے رہی ہے کہ بول چال میں ایسے لفظ مع نونِ غنّہ بھی آتے ہیں، جن میں اصلاً نونِ غنّہ نہیں، اور یہ عام بات ہے۔ بول چال کے علاوہ ایسے الفاظ کتابت میں بھی مع نونِ غنّہ مل جاتے ہیں، یعنی متعدد لفظ ہیں جن کے تلفّظ میں غنّہ آواز شامل ہو جاتی ہے اور تحریر میں بھی وہ مع نونِ غنّہ اور بغیر نونِ غنّہ دونوں طرح ملتے ہیں۔ مثلاً مرزا غالب نے "چانول" کے ذیل میں لکھا ہے: "چانول اور چاول کی نظیر غلط۔ ہندی لفظ ہے، ثقات اور شرفا مع النون بولتے ہیں اور بنیے بقّال بے نون بولتے ہیں" (قاطعِ برہان مع رسائلِ متعلقہ ص ۲۸۲)۔ خود میر امّن کی تحریر میں اس کی متعدد مثالیں موجود ہیں۔ مثلاً مخطوطۂ گنجِ خوبی میں ص ۱۴۱ پر "کھانا پھینکا رہتا ہے" ملتا ہے، یعنی یہاں اُنھوں نے اپنے قلم سے "پھینکا" کو مع نونِ غنّہ لکھا ہے، اس کے برخلاف ص ۱۶۲ پر اس لفظ کو نونِ غنّہ کے بغیر لکھا ہے: "مثال پھیکے کھانے کے ہے"۔ اصل لفظ "کاسہ" ہے، لیکن میر امّن نے اپنے قلم سے "شہد کانسہ" لکھا ہے (مخطوطۂ گنجِ خوبی ص ۷۶)۔ ایسی اور مثالیں بھی پیش کی جاسکتی ہیں۔ اس صورتِ حال کے پیشِ نظر یہ مناسب نہیں معلوم ہوا کہ اِس لفظ کے املا میں کسی طرح کی تبدیلی سے کام لیا جائے، یعنی اِن دو مختلف مقامات پر اس لفظ کی دو مختلف صورتیں اُس اختلاف کو ظاہر کرتی ہیں جو غنّہ آواز کے واسطے سے بہت سے لفظوں میں پایا جاتا ہے۔ اسی بنا پر اس مقام پر کے اور ف کے مطابق "چونما" مع نونِ غنّہ کو برقرار رکھا گیا ہے اور اُن دونوں مقامات پر ک اور ف کے مطابق اِس لفظ کو نونِ غنّہ کے بغیر لکھا گیا ہے۔

چھپا کر (۱۹) : ک اور ف میں "چھپنا" مصدر کے مشتقات جہاں بھی آئے ہیں، حرفِ اوّل کے نیچے التزام کے ساتھ زیر لگا ہوا ہے (مثلاً: چھپا کر ص ۱۶، چھپانا ص ۳۰، چھپاتے ص ۴۳) م میں بھی یہی صورت ملتی ہے اور یہی صورت مخطوطۂ گنجِ خوبی کی ہے کہ میر امّن نے التزام کے ساتھ پہلے حرف کے نیچے ہر جگہ زیر لگایا ہے۔ (مثلاً: چھپانا ۱۵۵، چھپا ۵۴، ۹۳، ۱۸۲، چھپیں ۱۵۵، چھپائی ۲۶۴، ۲۶۶، چھپتا ہے ۱۷۹، چھپا دے گا ۱۷۲، چھپاتے تھے ۲۰۸، ۲۰۹، ۲۱۰، چھپ سکے ۲۶۳، چھپا رکھے ۲۷۳، چھپنے کو جاتے ۲۷)۔ اِسی بنا پر اس مصدر اور اس کے مشتقات کو ہر جگہ بہ کسرِ اوّل

لکھا گیا ہے۔ ضمنی طور پر اِس سلسلے میں تھوڑی سی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے۔ سید انشا نے دریاے لطافت میں اِس لفظ کے ذیل میں جو کچھ لکھا ہے، اُس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُس زمانے میں فصحاے دہلی کی زبان پر یہ لفظ بہ کسرِ اوّل ہی تھا (ترجمۂ دریاے لطافت ص ۲۵)۔ نیز ص ۲۲۲ پر لکھا ہے کہ: "چھپنا اور چھپنا میں کسرے اور ضمّے کی مخالفت ہے۔ فصیح بالکسر ہے اور ضمّے کے ساتھ اہلِ مغلپورہ کا لہجہ ہے، اہلِ اُردو کی زبان نہیں"۔ لیکن یہ طے ہے کہ رفتہ رفتہ یہ لفظ دہلی میں بہ ضمِّ اوّل مستعمل ہونے لگا اور اِس کا ثبوت ملتا ہے غالب کے دو خطوں سے، اُنھوں نے تیجر کے نام ایک خط میں لکھا ہے: " اور ہاں حضرت! وہ مجموعہ چھپے گا بالفتح یا چھپے گا بالضم" (عودِ ہندی مطبعِ مجتبائی میرٹھ (طبعِ اوّل) ص ۱۲۵)۔ ایک اور خط میں اُنھی کو لکھا ہے: "مجموعۂ نثرِ اُردو کا انطباع اگر میرے لکھے ہوئے دیباچے پر موقوف ہے، تو اُس مجموعے کا چھپ جانا بالفتح میں نہیں چاہتا بلکہ چھپ جانا بالضم چاہتا ہوں (ایضاً ص ۱۲۶)۔

ہاں فصحاے لکھنؤ شروع ہی سے اِس لفظ کو بہ کسرِ اوّل بولتے رہے ہیں (اور آج بھی یہی صورت ہے)۔ جلاؔل نے اپنے لُغت سرمایۂ زبانِ اُردو میں لکھا ہے کہ یہ لفظ "فصحاے لکھنؤ کی زبان پر بالکسر ہے اور اہلِ دہلی کی زبان پر بالضم"۔ یہی بات صاحبِ نور اللغات نے لکھی ہے۔ رجب علی بیگ سرور نے اپنی کتاب شگوفۂ محبت میں ایک جگہ لکھا ہے: "یہ قصّۂ یوسف جمال ... یا تو چھپا تھا، اب چھپا۔ جب یہ زیرا زبر ہوا، تب مدِّ نظر ہوا"۔ آصفیہ میں "چھپنا" ہے اور اِس سے وضاحت ہو جاتی ہے کہ دہلی میں عہدِ میر امّن و عہدِ انشا میں "چھپنا" جو بالکسر رائج تھا، وہ بعد کے زمانے میں بہ ضمِّ اوّل ہو گیا اور آج کل بہ ضمِّ اوّل ہی مستعمل ہے۔ [شگوفۂ محبت کی مثال کے لیے میں ڈاکٹر نیر مسعود کا ممنون ہوں۔ اِس کی نشان دہی بھی اُنھی نے کی تھی]

چھتّر (۱۱): ک، ف، ع میں اِس مقام پر ت کے اوپر تشدید لگی ہوئی ہے (چھتّر)۔ م اور ت میں تشدید موجود نہیں۔ ک میں ص ۶۰ پر بھی یہ لفظ آیا ہے اور وہاں تشدید موجود نہیں۔ ع اور ف میں بھی وہاں تشدید موجود نہیں۔ م اور ت میں جہاں بھی یہ لفظ آیا ہے، تشدید کے بغیر لکھا ہوا ملتا ہے۔ علاوہ ازیں مخطوطۂ گنجِ خوبی میں یہ لفظ متعدد مقامات پر آیا ہے اور کسی ایک جگہ بھی تشدید موجود نہیں، مثلاً: ص ۱۲، ۲۶، ۱۷۸، ۱۹۴۔ (یہ ذہن میں رہے کہ اِس مخطوطے میں مشدّد حروف پر تشدید لگانے کا التزام ملتا ہے) اِس لفظ پر کسی ایک جگہ بھی تشدید کا نہ ہونا اِس پر دلالت کرتا ہے کہ میر امّن نے اِس لفظ کو تشدید کے بغیر استعمال کیا ہے۔ اِسی بنا پر یہاں تشدید نہیں لگائی گئی۔ ک میں ت کے اوپر زبر موجود ہے۔ کے

میں ص ۹۰ پر بھی "بچھتر" ہے۔ آصفیہ میں بھی "بچھتر" ہے، اِسی بنا پر تت کے اوپر زبر لگایا گیا ہے۔ فیلن اور پلیٹس دونوں نے اپنے لغات میں یہ صراحت کردی ہے کہ اصل لفظ "پچھتر" ہے اور "پچھتر" اور "پچھتّر" اُس کی دوسری شکلیں ہیں۔ [فارسی لفظِ "چتر" اِسی "پچھتر" کی بدلی ہوئی صورت ہے اور "پچھتری" بھی اِسی سے بنا ہے] ۔

پُھنگلیا (۲۱۲) : ک میں پہلے حرف پر پیش تو لگا ہوا ہے، مگر باقی حروف پر اعراب موجود نہیں۔ ف میں "پُھنگلیا" ہے، یعنی لام کے نیچے زیر لگا ہوا ہے، اِس کی فرہنگ میں بھی (رومن رسم خط میں) اِسی طرح مندرج ہے۔ آصفیہ میں "پُھنگَلْیا" ہے، یعنی گاف پر زبر ہے اور لام پر جزم ہے۔ فیلن کے لغت میں بھی "پُھنگَلْیا" ہے۔ اِس کے برخلاف پلیٹس کے لغت میں "پُھنگلیا" ہے (بہ سکونِ گاف و کسرِ لام، جس طرح ف میں ہے)۔ اصل لفظ "پُھنگی" ہے اور اِس میں کچھ اختلاف نہیں، اِس کے لحاظ سے تو بہ ظاہر "پُھنگلیا" ہونا چاہیے، لیکن نسخے میں "پُھنگلیا" بھی آیا ہے۔ اِس اختلافِ تلفظ کے پیشِ نظر، ف کی مطابقت اختیار کی گئی ہے اور لام کے نیچے زیر لگایا گیا ہے۔

چُھو چُھو (۴۹) : ک میں واو پر مجہول کی علامت موجود ہے اور یہ لفظ ہے بھی بہ واوِ مجہول۔ صرف نور اللغات میں واو پر علامتِ معروف بنی ہوئی ہے، مگر آثر لکھنوی مرحوم نے فرہنگِ اثر میں اِس سے اختلاف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ: "لکھنؤ میں واوِ مجہول سے بولتے ہیں"۔ گویا دہلی اور لکھنؤ دونوں جگہ یہ لفظ مع واوِ مجہول مستعمل رہا ہے۔ فیلن اور پلیٹس کے لغات میں بھی اِسے مع واوِ مجہول لکھا گیا ہے۔ اِسی کی مطابقت اختیار کی گئی ہے۔

چھہ (۱۰۸) : ف : چھ۔ ع : چھے۔ (ن، ک : چھہ)۔ اِس سے پہلے ص ۹۰ پر بھی یہ لفظ آیا ہے اور وہاں ک اور ف میں "چھ" ہے، ن میں "چھہ" ہے اور ع میں "چھے" ہے۔ اِسی طرح ص ۲۱۴ پر بھی یہ لفظ آیا ہے اور وہاں بھی ک اور ف میں "چھ" ہے اور ع میں "چھے" ہے۔ ک اور ف میں اِس لفظ پر اعراب موجود نہیں، البتہ ف کی فرہنگ میں اِسے CHHA لکھا گیا ہے، یعنی بہ فتحِ اوّل۔ ع میں جس طرح اِسے لکھا گیا ہے، اُس کا مطلب یہ ہے کہ مرتب نے اِسے بہ فتحِ اوّل اور مع یاے لین (یعنی "چھَے" بروزنِ "طَے") مانا ہے۔

اِس لفظ کو اب جس طرح بھی بولتے اور لکھتے ہوں، مگر اِس میں شک نہیں کہ اِس کی پرانی شکل "چھہ" ہے۔ جلال نے اپنے لغت سرمایۂ زبانِ اردو میں لکھا ہے: "چھہ : جیمِ فارسیِ مخلوط الہا اور

ہائے مظہرہ کے ساتھ، عددِ معروف ۔ ۔ ۔ ۔ اور کبھی اِس لفظ کو بجائے ہائے مظہرہ، ہائے مختفیہ کے ساتھ بھی بول جاتے ہیں، اور فصیح یہی ہے، یعنی ہائے مظہرہ کی جگہ ہائے مختفیہ سے بولنا۔"

یہی بات صاحبِ نورُاللغات نے لکھی ہے [یعنی "ہائے مظہرہ" کی جگہ" ہائے مختفیہ کے ساتھ بولنا چاہیے] مطلب یہ ہوا کہ اِس لفظ کی قدیم شکل "چَھہْ" (مع ہائے ملفوظ) تھی، جو تلفظ میں آکر "چَھہ" (مع ہائے مختفی) رہ گئی۔ "چَھہْ" یا "چَھہ" دونوں کے آخر میں ہ کا شوشہ لازماً لکھا جائے گا، تبھی اُس کو بہ فتحِ اوّل پڑھا جا سکتا ہے۔ اگر اِس کو "چھ" لکھا جائے گا تو اِس صورت میں یہ کوئی لفظ نہیں ہوگا، یہ محض ایک حرف ہوگا، جو مثلاً "پوچھ" میں آتا ہے، لیکن یہ عجیب بات ہے کہ جگہ جگہ اِس کا املا "چھ" نظر آتا ہے۔ آصفیہ میں "چَھْ" ہے، یعنی پہلے حرف پر زبر لگا ہوا ہے اور دوسرے حرف پر جزم بنا ہوا ہے (جس طرح جلاؔل کے لغت میں ہے) مگر "چھ" کو "چَھہ" کیسے پڑھا جائے گا، جب تک آخر میں ہ (وہ ملفوظ ہو یا مختفی) کا شوشہ نہیں بنایا جائے گا، اِسے ایک لفظ کی حیثیت حاصل نہیں ہو سکے گی۔

ک، میں اِس کا املا ایک جگہ "چھ" ہے اور دوسری جگہ "چھہ"۔ ن میں بھی "چھہ" ہے اور (اُس زمانے کے لحاظ سے) اِس لفظ کا مرجّح املا بھی یہی ہے، (جیسا کہ جلاؔل اور صاحبِ نورُاللغات کی صراحتوں سے متعیّن ہوتا ہے) اِس بنا پر دونوں مقامات پر اِس لفظ کو "چھہ" لکھا گیا ہے۔

قدیم اندازِ نگارش کے مطابق اگر اِس کا املا "چھہ" مانا جائے، تو اِسے اصولاً بہ فتحِ اوّل پڑھنا چاہیے۔ ف کی فرہنگ میں بھی یہی تلفّظ ملتا ہے اور آصفیہ میں پہلے حرف پر زبر لگا ہوا ہے۔ "چَھاہی" میں یہی تلفّظ برقرار رہتا ہے اور "چَھٹے" میں بھی پہلے حرف پر زبر موجود ہے۔ یہی احوال چَھبّیس، چَھتّیس، اور چَھپّن کا ہے، مگر چھیالیس، چھیاسٹھ، چھہتر، چھیاسی، چھیانوے میں عموماً پہلا حرف مکسور رہتا ہے۔ اِن گنتیوں کا فصیح تلفّظ بہ کسرِ اوّل ہی ہے۔ اِس اختلاف کو اگر پیشِ نظر رکھا جائے تو یہ کہنا مشکل نہیں معلوم ہوگا کہ مفرد عدد کو بہ کسرِ اوّل بھی پڑھا جا سکتا ہے۔ جس طرح "کیوں کہ" میں "کہ" کو بہ کسرِ اوّل پڑھتے ہیں اور "چناں چہ" میں "چہ" کو بہ کسرِ اوّل بولتے ہیں، اُسی طرح "چھہ" کو بھی بہ کسرِ اوّل پڑھا جا سکتا ہے۔ چوں کہ دہلی میں اب اُردو والے مفرد عدد کو عموماً بہ کسرِ اوّل بولتے ہیں، اِس بنا پر "چھ" کو اگر بہ کسرِ اوّل پڑھا جائے تو کچھ قباحت لازم نہیں آئے گی؛ مگر میں نے "چھہ" اور "چھوں" دونوں پر اعراب نہیں لگائے، اِس بنا پر کہ اصل نسخوں میں اِن دونوں لفظوں

پر اعراب موجود نہیں۔ اگر کوئی شخص انھیں "پچھہ" اور "پچھہوں" کہے تو یہ قدیم تلفظ کی مطابقت ہوگی۔ اور اگر "پچھہ" کے بجائے "پچھ" پڑھا جائے، تو یہ مستعمل صورت کے مطابق ہوگا۔

چُھہارا (۱۱): ک، ف، ع: چھہارا۔ م، ن: چھوہارا۔

اُردو لغات (آصفیہ، نور) میں اس لفظ کے دو املا ملتے ہیں: چھُہارا، چھوارا۔ چوں کہ اِس کتاب کے سبھی پیشِ نظر نسخوں میں پہلے الف کے ماقبل ہ ہے، اِس لیے اِن کی مطابقت میں "چھُہارا" کو اختیار کیا گیا ہے۔ م اور ن میں جو "چھوہارا" ہے، تو اس میں واو قدیم طریقِ کتابت کے تحت اعراب بالحروف کے طور پر چھ کے پیش کو ظاہر کرنے کے لیے آیا ہے، اِس لیے اِس کا شمار اختلافِ املا میں نہیں کیا جانا چاہیے۔

پچھہوں (۹۴): ع: پچھیئوں [ن، ک، ف: پچھہوں]۔

لفظ "پچھہ" کے ذیل میں ضروری تفصیلات کا ذکر آچکا ہے۔ اِس لفظ کے املا میں ک (اور ف، ن) کی مطابقت اختیار کی گئی ہے۔ اِس لفظ کا قدیم املا یہی ہے۔ ع میں جو "پچھیئوں" ہے تو اُس کی وجہ یہ ہے کہ ع کے مرتب (مولوی عبدالحق مرحوم) نے مفرد عدد کو یاے لین کے ساتھ "پچھے" لکھا ہے اور یوں اِس سے "پچھیئوں" بنا۔

ہاں یہ بات "پچھہ" کے ذیل میں لکھنے سے رہ گئی تھی کہ اِس لفظ میں ہاے مخلوط کے بعد جو ہاے ملفوظ ہے، اِس سے پوری طرح یہ ثابت ہوجاتا ہے کہ اصلاً مفرد عدد کے آخر میں ہاے ملفوظ تھی [جیسا کہ جلال نے اپنے لغت میں لکھا ہے اور جس کا حوالہ وہاں دیا جاچکا ہے] یعنی اِس کی پرانی صورت "پچھہ" (بروزنِ دہ) تھی، تلفظ میں یہ ملفوظ ہ ہلکی ہوتے ہوتے مختفی ہ سے بدل گئی، مگر "پچھہوں" میں اُس ملفوظ ہ نے اپنے آپ کو برقرار اور نمایاں رکھا۔

ک اور ف میں اِس لفظ پر اعراب موجود نہیں، مگر "پچھہ" پر اگر قیاس کیا جائے تو اس کا تلفّظ "پچھہوں" ہونا چاہیے۔ لفظِ "پچھہ" کے ذیل میں تلفّظ کی جو بحث کی گئی ہے، اِس لفظ کو بھی اُسی کے دائرے میں شامل سمجھنا چاہیے۔

ہاں ایک بات اور: ک میں ایسے سب لفظ، جن کے آخر میں ہاے ملفوظ ہے، کہنی دار ہ کے ساتھ لکھے گئے ہیں اور اُس کے نیچے شوشہ لگایا گیا ہے، جیسے: پہہ۔ اور جن لفظوں کے آخر میں ہاے مختفی ہے، اُن میں کہنی دار ہ نہیں آئی ہے، جیسے: کہ، چناں چہ۔ املا کے اِس التزام کو پیشِ نظر رکھا جائے تو

کسی شک کے بغیر یہ بات سامنے آجائے گی کہ کے کے مطابق "چھپوں" میں ہاے ملفوظ ہے اور "پچھ" میں ہاے مختفی ہے۔

چین و آرام (مع واوِ عطف) : ص ۳۵۹، ح (۸)۔

چیونٹی (۲۱۱) : کے میں اِس لفظ کو مع یاے مخلوط لکھا گیا ہے۔ یہ لفظ گنجِ خوبی کے پندرھویں باب میں دو جگہ آیا ہے، ایک جگہ نثر میں اور ایک جگہ شعر میں؛ شعر یہ ہے : فقیروں پر نظر کرنی بڑھاوے ہے بڑا اپنے کو ؛ سلیمان اُس حکومت پر تھے کرتے چیونٹی کی خاطر۔ اِس شعر میں بھی یہ مع یاے مخلوط نظم ہوا ہے اور دوسری بات یہ کہ میر امّن نے اپنے قلم سے دونوں جگہ نونِ غنّہ کو واو سے پہلے لکھا ہے۔ املاے مصنّف اور استعمالِ مصنّف کے مطابق اِس لفظ کو مع یاے مخلوط لکھا گیا ہے اور نونِ غنّہ کو واو سے پہلے لکھا گیا ہے [مزید تفصیل کے لیے دیکھیے اِسی ضمیمے میں چیونٹے]۔

چیونٹے (۱۷) : کے میں "چیونٹے" ہے، مگر مخطوطۂ گنجِ خوبی میں میر امّن نے اپنے قلم سے دو جگہ اِس لفظ کو "چینوٹے" لکھا ہے۔ "چینوٹی" کی طرح یہاں بھی مصنّف کے املا کو ترجیح دی گئی ہے۔ طلبہ کے ذہن میں یہ بات رہنا چاہیے کہ چینوٹے اور چینوٹی، اِن دونوں لفظوں کے املا اور تلفّظ میں اختلاف کارفرما رہا ہے۔ املا کی صورت تو یہ ہے کہ "چیونٹے" اور "چینوٹے" اِسی طرح "چیونٹی" اور "چینوٹی" دو املا ملتے ہیں۔ تلفّظ کے لحاظ سے یہ دونوں لفظ بہ اظہارِ یٰ بروزنِ فاعلن اور مع یاے مخلوط بروزنِ فعلن، دونوں طرح ملتے ہیں، مثلاً آصفیہ میں "چیونٹے" کے ذیل میں یہ دو[2] مثالیں لکھی گئی ہیں : کمر نازک ہے تیری، کیوں اُٹھانا بارِ خنجر ہے ؛ میاں چیونٹے کے حق میں کب نکلنا پر کا بہتر ہے (شاہ نصیر)۔ زبس ہے ریختی ایجادِ رنگیں ؛ اِسی خاطر کہا کرتا ہے اکثر ؛ مُوا اتنا بھی اب کہنے لگا ہے ؛ چہ خوش، اِس چیونٹے کو بھی لگے پر۔ پہلے شعر میں "چیونٹے" مع یاے مخلوط آیا ہے اور رنگین کے قطعے میں مع یاے مظہرہ (بروزنِ فاعلن)۔ بروزنِ فاعلن کی اور مثالیں بھی پیش کی جا سکتی ہیں، مثلاً : ذخیرہ ہے جب چیونٹا کوئی پاتا ؛ تو بھاگا جماعت میں اپنی ہے جاتا۔ حالی۔ (مسدّسِ حالی : تاج کمپنی، ص ۱۲۳)۔ چوں کہ مصنّف کا واضح استعمال موجود ہے، اِس لیے اِن دونوں لفظوں (چینوٹی، چینوٹا) کو مع یاے مخلوط ترجیح دی گئی ہے۔ [طلبہ کے استفادے کے لیے ضمنی طور پر یہ صراحت بھی غیر مناسب نہ ہوگی کہ اِس کی ایک صورت "چینٹا" بھی مستعمل ہے۔ ("چینٹی" کی طرح)۔ یوں تین مستعمل صورتیں ہوئیں : چیونٹا، چینوٹا، چینٹا۔ "چیونٹا" اور "چینٹا" بہ لحاظِ

وزن برابر ہیں (بروزنِ فعلن) صورت مختلف ہے]۔

حاتم (۱۰): ک، فت اور م میں "ت" کے نیچے زیر لگا ہوا ہے [اصل کے لحاظ سے بھی اِسی طرح ہے (المنجد)] اور اِسی کی پابندی کی گئی ہے۔ صراحت کی ضرورت یوں محسوس ہوئی کہ بعض لوگوں کی زبان سے "حاتَم" بھی سُنا گیا ہے۔ ہوا یہ کہ ضرورتِ شعری کے تحت شاعروں نے اِس لفظ کو "دَم" اور "غَم" جیسے الفاظ کا ہم قافیہ بھی کیا ہے [تفصیل غیاث اللغات میں ہے؛ اُس میں شرحِ گلستان سے خانِ آرزو کا قول اِس باب میں نقل کیا گیا ہے] اُسی طرح جس طرح شعرا نے "کافِر" کو "خنجر" اور "محشر" وغیرہ کے ساتھ ہم قافیہ کیا ہے اور "کافَر" نظم کیا ہے؛ لیکن یہ ضرورتِ شعری ہے اور یہیں تک اِس تبدیلی کا دائرہ محدود رہا۔ آصفیہ میں "حاتِم" ہے اور نور میں بھی اِسے "بہ کسرِ سوم" لکھا گیا ہے۔ مولفِ نور نے وضاحت بھی کردی ہے کہ: "حاتِم بہ کسرِ سوم، فارسیوں نے اور اُن کی تقلید سے اردو شعرا نے بہ فتحِ سوم کہا ہے۔ اب بہ کسرِ تا مستعمل ہے"۔ اِس سلسلے میں یہ وضاحت بھی ضروری معلوم ہوتی ہے کہ صاحبِ نور اللغات نے یہ جو لکھا ہے کہ "اب بہ کسرِ تا مستعمل ہے" اِس سے یہ غلط فہمی نہیں پیدا ہونا چاہیے کہ پہلے بہ کسرِ تا مستعمل نہیں تھا۔ باغ و بہار کے محولۂ بالا نسخوں کا حوالہ یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ پہلے بھی اِسی طرح مستعمل تھا۔

حامی (۲۴۷): ن، ک، فت، ع میں اِسی طرح ہے، اِسی کی مطابقت اختیار کی گئی ہے۔ نور کے مولف نے "ہامی بھرنا" درجِ لغت کیا ہے اور "حامی" کے ذیل میں صراحت بھی کردی ہے کہ "حائے حطّی سے بہ معنیِ اقرار غلط ہے"۔ البتہ آصفیہ میں "حامی بھرنا" موجود ہے اور مولف نے وضاحت بھی کی ہے: "حامی بھرنا..... اقرار کرنا، ہاں کرنا..... اِس معنی میں یہ لفظ ہانہی (کذا) بہ معنی ہاں سے نکلا ہے؛ لیکن چوں کہ اِس کا رواج اِس طرح پڑگیا اور اساتذہ نے بھی خیال نہ رکھا، لہذا ہم نے بھی اِسی جگہ درج کردیا"۔ جلال نے اپنے لغت سرمایۂ زبانِ اردو میں "حامی بھرنا" حائے حطّی کی فصل میں درج کیا ہے، اثر لکھنوی نے فرہنگِ اثر میں اِس پر اعتراض کرتے ہوئے لکھا ہے: "اِس کا املا ہائے ہوز سے چاہیے، حائے حطّی سے "حامی" بہ معنیِ مددگار ہے، گو عام طور سے یہ فرق ملحوظ نہیں رکھا جاتا"۔

اِن اندراجات سے یہ بات تو واضح ہوجاتی ہے کہ "حامی بھرنا" میں "حامی" کو حائے حطّی سے بھی لکھا جاتا رہا ہے اور باغ و بہار کے بعض نسخوں میں "حامی" کا موجود ہونا اِس کی مزید تائید کرتا ہے۔ [طلبہ کے ذہن میں یہ بات رہے تو بہتر ہے کہ اب "ہامی بھرنا" لکھنا مرجح سمجھا جاتا ہے]۔

حُباب (۵۵) : م، ک، اور ف، میں ح پر پیش لگا ہوا ہے، اُسی کی مطابقت اختیار کی گئی ہے۔

عربی کا یہ لفظ (پانی کے بُلبلے کے معنی میں) اصلاً بہ فتحِ اوّل ہے (المنجد)۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بعد میں اِس میں تصرّف ہوا ہے اور بہ ضمِّ اوّل بھی استعمال میں آنے لگا۔ بہارِ عجم میں اِس کو بہ فتحِ اوّل اور بہ ضمِّ اوّل، دونوں طرح لکھا ہے۔ غیاث اللغات میں مزید تفصیل دیکھی جاسکتی ہے۔

اِس لفظ کے اصل معنی تھے : پانی کا بُلبُلا۔ اُردو میں کئی معانی کا اضافہ ہوا، اور جس معنی میں یہ لفظ اِس عبارت میں آیا ہے، یہ معنی اُردو کا اضافہ ہیں۔ اُردو میں بھی تلفّظ کا وہ اختلاف برقرار رہا اور اِس لفظ کو دونوں طرح (حَباب۔ حُباب) استعمال کیا جاتا رہا۔ آصفیہ میں "حُباب" لکھا گیا ہے، یعنی ح پر پیش بھی لگا ہوا ہے اور زبر بھی، اور اِس سے اختلافِ تلفّظ کی بہ خوبی وضاحت ہوجاتی ہے۔ یہ بات ضرور ہے کہ اہلِ علم کی زبان سے اکثر "حَباب" سُنا گیا ہے اور عام لوگوں کی زبان سے "حُباب" سُننے میں آیا ہے۔ صاحبِ نوراللغات نے اسے صرف بہ فتحِ اوّل لکھا ہے۔ اثر لکھنوی مرحوم نے فرہنگِ اثر میں "حباب سا" کے ذیل میں لکھا ہے : "اِس فقرے میں "حباب" بجائے فتحِ اوّل، ضمِّ اوّل سے بولا جاتا ہے" اور یہ بالکل صحیح ہے۔ مقصد یہ ہے کہ "حَباب" عام تلفّظ ہے اور م، ک، ف میں ح پر جو پیش لگا ہوا ہے، وہ اِسی عام تلفّظ کی نمایندگی کرتا ہے۔

حَبَشی (۲۶۴) : اصل لفظ "حَبَش" ہے، اِس سے "حَبَشی" بنے گا، اِسی طرح "حَبَشَن"۔ استعمالِ عام میں اصل لفظ "حَبَش" تو بہ فتحِ اوّل و دوم ہی آتا رہا، لیکن "حبشی" بہ فتحِ اوّل و دوم اور بہ فتحِ اوّل و سکونِ دوم، دونوں طرح مستعمل رہا، اِس فرق کے ساتھ کہ "حَبَشی" نظم میں ملے گا اور عام گفتگو میں "حَبْشی" نے جگہ بنائی۔ آصفیہ میں صرف "حَبْشی" مندرج ہے، البتہ "حَبَشَن" کے ذیل میں یہ لکھا گیا ہے کہ "بولتے بائے ساکن سے ہیں"۔ نور میں بھی یہی صورت ہے کہ "حَبَشی" کو تو "بہ فتحِ اوّل و دوم" لکھا ہے اور "حبشن" کو "بروزنِ رہ زن" یعنی بہ سکونِ دوم لکھا ہے۔ حالاں کہ "حبشن" اور "حبشی" دونوں کی ایک ہی صورت ہے استعمالِ عام میں۔ م، ک، ف میں اِس لفظ پر اعراب موجود نہیں، البتہ ف کے آخر میں جو فرہنگ شامل ہے، اُس میں اِسے بہ سکونِ دوم لکھا گیا ہے۔ ف کے اندراج اور اُردو میں استعمالِ عام کے مطابق اِسے بہ سکونِ دوم مرجّح سمجھا گیا ہے۔ اثر لکھنوی مرحوم نے فرہنگِ اثر میں لکھا ہے : "حبشی کو اُردو میں اگر کوئی بجائے سکونِ دوم، بہ فتحِ اوّل و دوم بولے، تو عربی سے واقف، مگر اُردو میں کورا سمجھا جائے گا"۔

حرکت (ص ۲۸) : م اور ک میں "حَرَکت" ہے (یعنی اِس لفظ پر صرف ایک زبر ہے) ف میں اِس لفظ پر اعراب موجود نہیں۔ ک میں جہاں کہیں یہ لفظ آیا ہے، ہر جگہ اِس پر اسی طرح صرف ایک زبر ملتا ہے۔ مثلاً پہلے درویش کی سیر میں یہ لفظ چار جگہ آیا ہے اور ک میں ہر جگہ "حَرکت" (صرف ایک زبر کے ساتھ) ہے۔ م کا احوال یہ ہے کہ اُس میں صرف ایک جگہ (جس کا حوالہ اوپر دیا گیا ہے) "حَرَکت" ہے (جس طرح ک میں ہے) اور باقی تینوں مقامات پر یہ لفظ اعراب کے بغیر (حرکت) ملتا ہے۔ ف میں صورتِ حال یہ سامنے آتی ہے کہ تین جگہ تو یہ لفظ اعراب کے بغیر ملتا ہے؛ اور ایک جگہ "حرْکت" ہے، یعنی ر پر جزم لگا ہوا ہے : "وہ پری میری حرْکت سے حیران ہوئی" (ص ۴۲)۔ نسخۂ ف میں یہ جملہ ص ۸۲ پر ہے۔ اِسی پہلے درویش کی سیر میں ایک جگہ "حرکتیں" آیا ہے : "اور نامعقول حرکتیں کرنے لگا" یہاں بھی ک میں "حَرَکتیْں" ہے، یعنی ی پر علامتِ مجہول ہے اور شروع کے حروف پر صرف ایک زبر ہے۔ یہاں بہ ظاہر زبر کا تعلق ح سے ہونا چاہیے؛ اِس لیے کہ اردو میں "حرکتوں" کہتے ہیں؛ "حَرَکتوں" کون کہے گا۔ ہاں ف کی فرہنگ میں اِس لفظ کو ح کے جزم کے ساتھ (HARKAT) درج کیا گیا ہے اور اِس سے صاف طور پر معلوم ہو جاتا ہے کہ ف کے مرتب نے اِسے بہ فتحِ اوّل و سکونِ دوم "حَرْکت" تسلیم کیا ہے۔ اصلاً "حَرَکت" (بہ فتحِ اوّل و دوم و سوم) ہے، مگر فارسی اور اُردو دونوں زبانوں میں اِسے بہ سکونِ دوم بھی استعمال کیا گیا ہے (نظم سے قطعِ نظر) یہ واقعہ ہے کہ بول چال کی حد تک عظمت، برکت، حرکت؛ یہ تینوں لفظ عام طور پر بہ سکونِ دوم استعمال میں آتے ہیں۔ اثر لکھنوی مرحوم نے فرہنگِ اثر میں لکھا ہے : "میرا اعجاز یہ ہے کہ اگر عظمت و اضافت کے ساتھ آئے تو بہ فتحِ اوّل و دوم بولیے، ورنہ بہ سکونِ دوم؛ "حَرْکت نہ ہو گی" کہیے اور "حَرْکت میں بَرْکت ہے" نہ کہ "حَرَکت میں بَرَکت"۔ یہ فیصلہ اپنی جگہ پر نہایت مناسب ہے۔ مولانا حالی کے اِس شعر سے (جو نور میں بھی منقول ہے) اِس کی پوری طرح تائید ہوتی ہے؛ وہ بھولے ہوئے ہیں یہ عادت خدا کی ؛ کہ حَرْکت میں ہوتی ہے بَرْکت خدا کی۔ ایک بات اور : "ناپسندیدہ بات" کے معنی میں بھی یہ لفظ اُردو میں مستعمل ہے۔ یہ معنی اُردو کا اضافہ ہیں اور اِن معنوں میں تو یہ لفظ بہ سکونِ دوم ہی استعمال میں آتا ہے۔ مولفِ نور نے بھی اِس کی صراحت کر دی ہے۔ اِسی طرح اِس کی جمع "حرکتیں" اور "حرکتوں" بھی بہ سکونِ دوم استعمال میں آتی ہے۔ میں نے اِن صورتِ حال کے پیشِ نظر اِس لفظ پر کہیں بھی اعراب نہیں لگائے ہیں۔ اِسے "حَرَکت" پڑھا جائے تو یہ اصل

کے مطابق صحیح ہوگا اور "حَرَکت" کہا جائے تو اُردو میں استعمالِ عام کے مطابق درست تر ہوگا؛ مگر یہ بات ضرور ذہن میں رہنا چاہیے کہ اِس کتاب میں یہ لفظ اکثر مقامات پر "غیر پسندیدہ بات" کے مفہوم میں آیا ہے، مثلاً: "لیکن وہ پری میری حرکت سے حیران ہوئی" (ص ۴۶)۔ "جو تجھ سے ایسی حرکت ہوتی ہے تو معاف کرتی ہوں" (ص ۹۳)۔ "آپ یا جی کے نطفے میں کچھ خلل ہوگا جو اُس سے ایسی حرکت واقع ہوئی" (ص ۱۴۶)۔ اِن سب مقامات پر تو اِس لفظ کو بہ سکونِ دوم ہی پڑھنا بہتر ہوگا۔

حقِ پدری (قاف کی تشدید کے بغیر): ص ۳۳۶، ح (۴)۔

حِماقت (۶۲): م، کے، ف: تینوں نسخوں میں ح کے نیچے زیر لگا ہوا ہے۔ مخطوطۂ گنجِ خوبی میں بھی یہ لفظ موجود ہے (ص ۷۷) اور میر امّن نے ح کے نیچے اپنے قلم سے زیر لگایا ہے۔ اِسی کی مطابقت اختیار کی گئی ہے۔ وضاحت یوں کی گئی ہے کہ بہ لحاظِ اصل یہ لفظ بہ فتحِ اوّل (حَماقت) ہے اور آصفیہ میں بھی ح کے اوپر زبر لگا ہوا ہے، مگر اِس میں شک نہیں کہ استعمالِ عام میں بہ کسرِ اوّل ہے۔ فیلن کے لغت میں بھی اسے بہ کسرِ اوّل لکھا گیا ہے۔ کے اور ف میں اور مخطوطۂ گنجِ خوبی میں اِس لفظ کا بہ کسرِ اوّل مندرج ہونا اِس بات پر دلالت کرتا ہے کہ تلفظ کا یہ اختلاف بہت پہلے نمایاں ہو چکا تھا اور فصحا بھی اِس لفظ کو بہ کسرِ اوّل استعمال کرنے لگے تھے۔ ہاں یہ وضاحت بھی بے محل نہ ہوگی کہ میر امّن نے اِس قبیل کے متعدد لفظوں کو، جو در اصل بہ فتحِ اوّل ہیں، بہ کسرِ اوّل لکھا ہے، مثلاً: رِفاقت، قِناعت، خِجالت، قِدامت۔ اِس لفظ "حِماقت" کو بھی اِسی فہرست میں شامل سمجھنا چاہیے۔

حَمَل (۲۴۰): کے اور ف دونوں میں میم پر زبر موجود ہے۔ اِس معنی میں اصلاً "حَمْل" ہے مگر یہ حقیقت ہے کہ اُردو میں عموماً یہ لفظ بہ فتحِ میم زبانوں پر آتا ہے۔ کے اور ف میں میم پر جو زبر ہے، یہ اُردو میں استعمالِ عام کے عین مطابق ہے۔ ہاں، آصفیہ میں بھی "حَمَل" ہے۔ نور میں وضاحت بھی کر دی گئی ہے، "حمل" کے ذیل میں مؤلف نے لکھا ہے: "شعرا نے بہ فتحِ اوّل و دوم بھی کہا ہے۔ بیش تر زبانوں پر اِسی طرح ہے؛ دائی! یقین دل کو ہے گر جائے گا حَمَل: نتھا سا لڑکا خواب میں کل پیٹ مل گیا (جان صاحب)"۔ اِس لفظ پر اِس سے پہلے اچھی خاصی بحث ہو چکی ہے۔ مثنوی گلزارِ نسیم میں یہ لفظ اِسی طرح آیا ہے، اُس پر یہی اعتراض کیا گیا تھا کہ صحیح لفظ "حَمْل" ہے اور چکبست نے یہی کہا تھا کہ مستعمل لفظ "حَمَل" ہے اور سند میں کئی شعر بھی پیش کیے تھے۔ چکبست کا یہ مضمون مضامینِ چکبست میں شامل ہے اور مزید تفصیل کے لیے معرکۂ چکبست و شرر کو دیکھا جا سکتا ہے۔ ہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ آسمان کے ایک بُرج کا

نام "حَمَل" بہ فتحِ اوّل و دوم ہی ہے۔ اسی سطر میں "برجِ حَمَل" بھی آیا ہے۔ سودا کے ایک مشہور قصیدے کا مطلع ہے: برجِ حَمَل میں بیٹھ کے خاور کا تاج دار ؛ کھینچے ہے اب خزاں پہ صفِ لشکرِ بہار۔

حَوصِلَہ (۴): م، کے، فے؛ تینوں نسخوں میں صاد کے نیچے زیر لگا ہوا ہے۔ اِس کی مزید تصدیق ہوتی ہے مخطوطۂ گنج خوبی سے، اُس میں ص ۲۳، پر یہ لفظ آیا ہے اور وہاں میر امّن نے صاد کے نیچے زیر لگایا ہے؛ اِن وجوہ سے صاد کے نیچے زیر لگایا گیا ہے۔ یہاں وضاحت یوں کی گئی کہ اصلاً عربی کا یہ لفظ بہ فتحِ حرفِ سوم (حَوصَلہ) ہے۔ نور اور آصفیہ میں بھی اِسے بہ فتحِ صاد ہی لکھا گیا ہے، لیکن یہ واقعہ ہے کہ اُردو والوں کے لہجے میں صاد کا زبر باقی نہیں رہتا، اکثر تو یہ تلفظ میں اِس طرح آتا ہے کہ صاد بہ جزم معلوم ہوتا ہے (حَوصْلہ) اور کم تر اِس طرح سننے میں آیا ہے جیسے صاد کے نیچے زیر ہو (حَوصِلہ)۔ فیلن نے اپنے لغت میں اِسے بہ سکونِ صاد ہی لکھا ہے اور اِس سے استعمالِ عام کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ پلیٹس نے اپنے لغت میں اِسے اصل کے مطابق بہ فتحِ صاد درج کیا ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ بہ سکونِ صاد (حوصْلہ) اور بہ کسرِ صاد (حوصِلہ) عامیانہ تلفظ ہے۔ بہ ہر صورت پلیٹس کے اِس اندراج سے "حوصْلہ" اور "حوصِلہ" کا زبانوں پر ہونا ضرور معلوم ہوجاتا ہے، مگر زیادہ مستعمل صورت وہی ہے جو فیلن کے لغت میں ہے یعنی "حَوصْلہ"۔ چوں کہ میر امّن نے خود اسے بہ کسرِ صاد لکھا ہے اور مطبوعہ نسخوں میں بھی صاد کے نیچے زیر ہے، اِس بنا پر اِس کتاب میں اِس لفظ کو بہ کسرِ صاد ہی برقرار رکھا گیا ہے۔

خاتِم (۱۸۲): کے اور فے میں ت کے نیچے زیر موجود ہے؛ کے میں ص ۲۰۲ پر بھی یہ لفظ آیا ہے اور وہاں بھی ت کے نیچے زیر لگا ہوا ہے۔ اِسی کی مطابقت اختیار کی گئی ہے۔ یہ وضاحت یوں کی گئی کہ یہ لفظ لغات میں بہ کسرِ تا اور بہ فتحِ تا دونوں طرح ملتا ہے [تفصیل کے لیے دیکھیے غیاث اللغات]۔ آصفیہ میں "خاتَم" ہے، آخر میں توسین میں لکھا گیا ہے: "اِس معنی میں (یعنی انگوٹھی کے معنی میں) بہ فتحِ فوقانی بھی درست ہے۔" اِس اندراج سے بھی انگوٹھی کے معنی میں بہ کسرِ تا کی ترجیح ظاہر ہے۔

خالا (۱۷۹): ن، کے، فے، ع میں یہی املا ہے (یعنی آخر میں الف ہے)۔ یہ لفظ ص ۲۱۱ پر بھی آیا ہے اور وہاں بھی اِن سب نسخوں میں "خالا" ہے۔ اصل لفظ "خالہ" ہے، "خالا" اِس کی مہنّد صورت ہے [جیسے "مزہ" کی مہنّد شکل "مزا" ہے۔ دیکھیے اِسی ضمیمے میں "مزہ"]۔ آصفیہ میں صرف "خالہ" ہے، مگر نور میں دونوں صورتیں ملتی ہیں: "خالہ (عربی میں "خالۃ" تھا۔ ماں کی بہن۔ اُردو میں "خالہ" اور "خالا" ہوگیا) مونث، ماں کی بہن۔" کے کی مطابقت میں اِسی املا کو برقرار رکھا گیا ہے۔

خاوِند (ص ۲): فارسی میں بہ فتحِ واو (خاوَند) ہے اور اسے "خداوند" کا مخفف بتایا گیا ہے (برہانِ قاطع)۔ فارسی میں "خداوند" آقا اور مالک کے معنی میں مستعمل ہے، یہی معنی "خاوند" کے ہیں (ایضاً)۔ البتہ اُردو میں "خاوند" شوہر کے معنی میں مستعمل ہے۔ "خاوند" کا لفظ اُردو میں آقا کے معنی میں بھی استعمال کیا گیا ہے، خود میر امّن نے استعمال کیا ہے، مگر اب عموماً یہ شوہر کے لیے آتا ہے۔ معنی کے ساتھ ساتھ اُردو میں اس کا تلفظ بھی بدلا ہے، یعنی اُردو میں یہ عموماً بہ کسرِ واو زبانوں پر ہے۔ آصفیہ میں تو اسے صرف بہ فتحِ واو "خاوَند" لکھا گیا ہے، مگر صاحبِ نوراللغات نے اس تصرّف کی نشان دہی کی ہے: "اُردو میں بہ کسرِ واو زبانوں پر ہے۔" میر امّن نے اسے آقا اور شوہر، دونوں معانی میں استعمال کیا ہے، مثلاً ص ۸۳ اور ص ۱۲۰ پر یہ شوہر کے معنی میں آیا ہے؛ اور اس عرضی میں اور ص ۸۵ پر آقا کے معنی میں، اور چاروں جگہ ک اور ف میں واو کے نیچے زیر لگا ہوا ہے۔ مخطوطۂ گنجِ خوبی میں بھی میر امّن نے ہر جگہ واو کے نیچے زیر لگایا ہے، مثلاً ص ۸۸، ۲۷۰۔ اسی کے مطابق واو کے نیچے زیر لگایا گیا ہے۔

خِجالت (ص ۴۴): "خَجالت" (بہ فتحِ اوّل) فارسی والوں کا بنایا ہوا لفظ ہے۔ صاحبِ غیاث نے لکھا ہے: "خجالت، بالفتح ..... صاحبِ معرّب گوید: خجالت از خطاہای عامّہ است، مگر اکثر استادان بستہ اند۔" اس کی اسناد بہارِ عجم میں موجود ہیں۔ اُردو میں مزید تصرّف یہ ہوا کہ یہ لفظ بہ کسرِ اوّل (خِجالت) بھی استعمال میں آنے لگا۔ فرہنگِ آصفیہ میں اسے بہ کسرِ اوّل (خِجالت) ہی لکھا گیا ہے۔ فیلن کے لغت میں بھی اسے بہ کسرِ اوّل لکھا گیا ہے۔ علاوہ ازیں "م" ک اور ف میں خ کے نیچے زیر لگا ہوا ہے۔ اسی بنا پر اسے بہ کسرِ اوّل لکھا گیا ہے۔ ک میں ص ۱۱۷ اور ص ۱۳۲ پر بھی یہ لفظ ہے اور دونوں جگہ خ کے نیچے زیر لگا ہوا ہے۔

خِراج (ص ۱۵۵): ک اور ف میں خ کے نیچے زیر لگا ہوا ہے۔ مخطوطۂ گنجِ خوبی میں جہاں بھی یہ لفظ آیا ہے، ہر جگہ خ کے نیچے زیر لگا ہوا ہے، مثلاً ص ۱۶، ۴۸۔ اسی کی مطابقت اختیار کی گئی ہے۔ آصفیہ میں "خَراج" ہے (خ کے اوپر زبر لگا ہوا ہے) لیکن نور میں وضاحت موجود ہے کہ عربی میں یہ لفظ بہ فتحِ اوّل (خَراج) ہے مگر "فارسی اور ان کی تقلید میں اُردو والے بہ کسرِ اوّل بولتے ہیں"۔ سب سے مفصّل عبارت صاحبِ غیاث اللغات کی ہے، جس کا ضروری حصّہ نقل کیا جاتا ہے، اس سے پوری بات واضح ہو جائے گی: "خراج: بہ فتحِ اوّل ..... و بہ این معنی بہ کسر خطاست۔ و در بہارِ عجم نوشتہ کہ "خراج" بہ فتح ..... و خانِ آرزو در خیابان نوشتہ کہ "خراج" بہ فتح، باج؛ و در فارسی بہ کسر

شہرت ندارد۔ بدانکہ طورِ فارسیانست کہ مصدرِ بابِ تفعیل کہ بروزنِ "تفعال" بود بہ فتحِ اوّل، آنرا بہ کسرِ اوّل خوانند و در بعضے مواقع، چنانکہ تکرار و تمار و تداع و تواج، کہ در اصل ہمہ مفتوح الاوّل ہستند، فارسیاں ہمہ را بہ کسرِ اوّل خوانند۔" اُردو والے بھی عام طور پر "خِراج" کہتے ہیں۔

خَرُوش (جوش خروش) (۹۷) : کے اور فہ میں خ پر حرکت موجود نہیں، ہاں کے میں واو پر علامتِ مجہول موجود ہے۔ فہ کی فرہنگ میں اسے بہ فتحِ اوّل لکھا گیا ہے۔ فارسی میں خ پر پیش ہے (برہانِ قاطع) اُردو میں زبانوں پر عموماً بہ فتحِ اوّل ہے۔ نور میں اسے (فارسی کے مطابق) "بہ ضمِ اوّل" لکھا گیا ہے، مگر آصفیہ میں "خَرُوش" ہے، یعنی خ کے اوپر زبر لگا ہوا ہے اور یہ استعمالِ عام کے عین مطابق ہے۔ فہ کی فرہنگ (اور آصفیہ) کے اندراج کے مطابق خ کے اوپر زبر لگایا گیا ہے۔

نور میں واو کو معروف لکھا گیا ہے: "خروش: (ف: بہ ضمِ اوّل و دوم و سکونِ واوِ معروف)"۔ اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ فارسی میں واوِ معروف ہے اور چوں کہ اُردو کے متعلق کوئی صراحت نہیں کی گئی، اِس بنا پر یہ فرض کرلینا قطعاً بے جا نہ ہوگا کہ مولف نے اُردو میں بھی اسے مع واوِ معروف مانا ہے۔ لیکن صحیح صورتِ حال یہ ہے کہ فارسی میں اِس لفظ میں واوِ مجہول ہے: "خروش: بہ ضمِ اوّل و ثانی و سکونِ ثالث مجہول و شینِ قرشت ..." (برہانِ قاطع)۔ "خروش: بضمتین و واوِ مجہول، بمعنی شور و غوغا۔ از کشف و برہان"۔ (غیاث اللغات)۔ فارسی کی طرح اُردو میں بھی یہ لفظ واوِ مجہول کے ساتھ زبانوں پر ہے۔ کے کے مطابق اسے مع واوِ مجہول لکھا گیا ہے۔

خِزاں (۲۵۰) : کے اور فہ میں خ کے نیچے زیر لگا ہوا ہے۔ یہ لفظ مخطوطۂ گنجِ خوبی میں بھی آیا ہے (ص ۲۱۸) اور وہاں بھی میر امّن نے خ کے نیچے زیر لگایا ہے۔ اِسی کی مطابقت اختیار کی گئی ہے۔ اصلاً "خَزاں" ہے (بہارِ عجم۔ غیاث اللغات)۔ سُننے میں "خَزاں" اور "خِزاں" دونوں طرح آتا ہے، مگر "خِزاں" بیش تر۔ فیلن نے اپنے لغت میں اسے صرف بہ کسرِ اوّل لکھا ہے۔ پلیٹس نے "خَزاں" اور "خِزاں" دونوں طرح درج لغت کیا ہے۔ آصفیہ میں خ کے نیچے زیر لگا ہوا ہے۔

خزانہ (۱۰) : م، کے، فہ میں اِس لفظ پر اعراب موجود نہیں۔ فہ کی فرہنگ میں اسے بہ فتحِ اوّل اور بہ کسرِ اوّل، دونوں طرح لکھا گیا ہے۔ عربی کے لحاظ سے خ کے نیچے زیر ہے (المنجد) لیکن اُردو میں بالعموم بہ فتحِ اوّل مستعمل ہے۔ مولفِ آصفیہ نے "خَزانہ" ہی لکھا ہے، اور وضاحت کردی ہے کہ: "مشہور بہ فتحِ خا اور صحیح بہ کسرِ خائے معجمہ ہے"۔ مطلب اُن کا یہی ہے کہ عربی کے لحاظ سے تو صحیح

بہ کسرِ خائے معجمہ ہے، لیکن اُردو میں زبانوں پر بہ فتحِ خائے معجمہ ہے اور یہی صحیح بات ہے۔ اِسی کی پابندی کی گئی ہے۔

خُسرُو، خُسرَوِ دِہلوی (ص): م میں "امیر خُسرُوؔ" اور "امیر خُسرُو دہلوی" ہے، یعنی دونوں جگہ رے مضموم ہے۔ اِس کے برخلاف ک میں "امیر خُسرُوؔ" اور "امیر خُسرَوِ دِہلَوی" ہے یعنی مفرد لفظ میں تو رے پر پیش ہے اور مرکّب صورت میں رے خالی ہے [واو کے نیچے اضافت کا زیر موجود ہے نیز "دہلوی" کے لام پر زبر لگا ہوا ہے۔] ک کی مطابقت اختیار کی گئی ہے۔ اِس لفظ کے سلسلے میں کچھ وضاحت ضروری ہے۔ فارسی لغات میں "خسرو" کو بہ ضمِّ اوّل وسوم، بہ کسرِ اوّل وسوم اور بہ ضمِّ اوّل وفتحِ سوم لکھا گیا ہے۔ حرکات کا یہ اختلاف اِن لغت نویسوں کے قیاسات پر مبنی ہے (تفصیل کے لیے دیکھیے بہارِ عجم، غیاث اللغات) اصحّ صورت یہ ہے کہ فارسی میں یہ لفظ بہ ضمِّ اوّل وفتحِ سوم (خُسرَو) ہے۔ (برہانِ قاطع) اِس لغت کے ایرانی مرتّب اور فارسی زبان کے ماہر ڈاکٹر محمد معین نے اِس لفظ کے حاشیے میں یہ وضاحت کی ہے کہ: "پہلوی: HUSRUV (نیک شہرت) ... پازند: XOSRAU" اور اِس سے واضح طور پر اِس لفظ کا بہ ضمِّ اوّل وفتحِ سوم ہونا متعیّن ہو جاتا ہے۔ بہارِ عجم میں ابنِ یمین کا جو قطعہ سنداً نقل کیا گیا ہے، اُس میں بھی یہ لفظ بہ فتحِ سوم آیا ہے۔ اِس قطعے کے قوافی "جو، تو، زَو" ہیں، مصرعِ آخر یہ ہے: زفرِ مملکتِ کیقباد و کیخسرو۔ جب یہ لفظ مضاف ہوتا ہے، اُس صورت میں رے کا زبر قطعی طور پر واضح اور متعیّن ہو جاتا ہے، مثلاً: خُسرَوِ اقلیمِ سخن۔ اِسی طرح "خُسرَوی" اور "خُسرَوانی" میں بھی رے کا زبر قطعی طور پر واضح ہو جاتا ہے۔ اِسی نسبت سے مرکّب میں خ پر پیش اور رے پر زبر لگایا گیا ہے۔ آصفیہ میں "خسرو" لکھا ہوا ہے، البتّہ نور میں اِسے "بالضّم وفتحِ را" لکھا گیا ہے اور یہ بلحاظِ اصل یہی درست ہے۔ اِس بحث کے بعد یہ عرض کروں کہ اگرچہ اصل لفظ "خُسرَو" ہے، لیکن اُردو میں عام طور پر زبانوں پر بہ ضمِّ اوّل وسوم (خُسرُو) ہے۔ کیا عالم اور کیا عامی، سبھی کی زبان سے اِسے بہ ضمِّ اوّل وسوم ہی سنا گیا ہے۔ لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ اضافت کی صورت میں یہ اصل کے مطابق بہ ضمِّ اوّل وفتحِ سوم ہی سننے میں آتا ہے، مثلاً: خُسرَوِ لاچین، خسرَوِ اقلیمِ سخن۔ اِسی طرح "خُسرَوی" اور "خُسرَوانہ" بھی بہ فتحِ سوم ہی سننے میں آتے ہیں۔ اِس کا مطلب یہ نکلا کہ اُردو میں مفرد لفظ "خُسرُو"، تو بہ ضمِّ اوّل وسوم زبانوں پر رواں ہو گیا

(اسے اُردو بول چال کا تصرّف کہیے) اور اضافت کی صورت میں، نیز اسمِ منسوب بن کر یہ اصل کے مطابق بہ فتحِ سوم ہی مستعمل رہا۔

باغ و بہار کی اِس عبارت میں یہ لفظ دو جگہ آیا ہے؛ ایک جگہ اضافت کے ساتھ: " امیر خُسرِو دہلوی" اور اِس کے بعد صرف "امیر خُسرُو" ہے۔ ک میں (جیسا کہ شروع میں لکھا جاچکا ہے) پہلے مقام پر خ پر پیش اور واو کے نیچے اضافت کا زیر لگا ہوا ہے، لیکن رے پر کوئی حرکت موجود نہیں۔ اِس کے برخلاف، دوسرے مقام پر خ پر پیش بھی ہے اور و پر مجہول کی علامت بنی ہوئی ہے " امیر خُسرُو" اور اِس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ مفرد لفظ کو بہ ضمّ اوّل و ضمّ سوم "خُسرُو" مانا گیا ہے اور اضافت کی صورت میں اسے اصل کے مطابق بہ ضمّ اوّل و فتحِ سوم مانا گیا ہے ـــــــ یہ اختلافِ حرکات اُردو میں استعمالِ عام کے عین مطابق ہے، اور اِسی کے مطابق "امیر خُسرِو دہلوی" اور "امیر خُسرُو" لکھا گیا ہے۔

ش میں "امیر خُسرُو دہلوی" اور "امیر خُسرُو" ہے، یعنی دونوں جگہ رے پر پیش لگایا گیا ہے؛ اِسے یوں قابلِ قبول نہیں سمجھا گیا کہ "خُسرِو دہلوی" ک کے اندراج سے بھی مطابقت نہیں رکھتا اور اُردو میں استعمال کے بھی قطعاً خلاف ہے۔

ایک ضمنی بات: مولانا احسن مارہروی (تلمیذِ داغ دہلوی) نے ایک خط میں لکھا ہے: "خسرو بروزنِ "جُو"، "آو" صحیح ہے، "رہرو" کے وزن پر صحیح نہیں۔ جس نے لکھا، غلط لکھا۔" [مکاتیبِ احسن، جلدِ اوّل، ص ۲۳۷]

یہ قول اِس قطعیت کے ساتھ محلِ نظر ہے۔ یہ وضاحت ضروری تھی کہ بہ ضمّ دوم اُردو کا تصرّف ہے۔ اُردو کے قوافی میں اگر کوئی شخص اِسے "ضَو" اور "نَو" جیسے الفاظ کا ہم قافیہ کرے گا، تو اُسے غلط نہیں کہا جائے گا، کیوں کہ بہ لحاظِ اصل یہ بہ فتحِ سوم ہی ہے اور قوافی میں ایسے الفاظ اصل حرکات کے ساتھ آسکتے ہیں۔ اِسے شعری ضرورت بھی کہا جاسکتا ہے۔ اسی طرح اضافت کی صورت میں تو لازماً یہ بہ فتحِ سوم آئے گا اور اسمِ منسوب کی صورت میں بھی رے کا زبر برقرار رہے گا۔ [قافیے میں "خسرو" کی مثالیں اُردو شعرا کے یہاں سے بہت سی پیش کی جاسکتی ہیں۔]

خَفگی (۴۴۲): ک اور ش میں خ اور ف پر اعراب موجود نہیں۔ فارسی میں یہ لفظ بہ فتحِ اوّل و دوم ہے [حاشیۂ برہانِ قاطع، طبعِ تہران، بہ ذیلِ "خفہ"] صاحبِ غیاث اللغات نے یہ

وضاحت بھی کردی ہے کہ بہ سکونِ دوم غلط ہے: "خفگی: بہ فتحِ اوّل و ثانی صحیح است و بہ سکونِ ثانی، چناں کہ در مردم مشہور شدہ، خطاست" [اِس اندراج سے یہ ضرور معلوم ہوجاتا ہے کہ یہ لفظ بہ سکونِ دوم مستعمل تھا ضرور]۔ اردو میں اسے بہ فتحِ دوم نظم ضرور کیا گیا ہے، مگر زبانوں پر یہ لفظ بہ سکونِ دوم ہی ہے۔ صاحبِ نوراللغات نے (غالباً غیاث اللغات کی بنیاد پر) یہ لکھا ہے کہ "بہ فتحِ اوّل و دوم صحیح ہے اور بہ سکونِ دوم غلط" مگر یہ نری فارسی کی تقلید ہے۔ اِس کے برخلاف آصفیہ میں "خفگی" ہے۔ اثر لکھنوی نے فرہنگِ اثر میں نوراللغات کے اِس اندراج پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے: "شعر سے قطعِ نظر، سوال یہ ہے کہ بول چال میں "خفگی" بہ فتحِ اوّل و دوم یا بہ سکونِ دوم ہے؟ فیصلہ یقیناً صورتِ ثانی کے حق میں ہوگا۔ "آپ کی خفگی میرے سر آنکھوں پر" اگر "خَفَگی" بہ فتحِ اوّل و دوم بولیے، تو مخاطب سمجھے گا کہ آپ عذر خواہی کے بدلے اُسے بنا رہے ہیں۔" صحیح بات وہی ہے کہ بعض شاعروں نے اِسے بہ فتحِ دوم نظم ضرور کیا ہے مگر استعمالِ عام میں یہ بہ سکونِ دوم ہی ہے۔ اِس طرح نظم بھی کیا گیا ہے۔ مولانا حالی کا شعر ہے:
ماں کی خفگی سے ہے بہت ڈرتی ؛ اُس کے تیور ہے دیکھتی رہتی (جواہراتِ حالی)۔

خود میر امّن نے گنجِ خوبی میں اِسے دو جگہ بہ سکونِ دوم نظم کیا ہے: تو بھی میرے ساتھ کچھ خفگی نہ کر ؛ تو رہیں جنّت میں باہم یک دگر (مخطوطۂ گنجِ خوبی، ص ۲۲۶)۔ جو خدا تجھ سے خوش ہے تو خوش رہ ؛ اوروں کی خفگی سے ہے کیا نقصاں (چالیسواں باب)۔ مزید بریں ف کے آخر میں جو فرہنگ ہے، اُس میں بھی اِسے بہ سکونِ دوم ہی درج کیا گیا ہے۔ اِسی وجہ سے ف پر جزم لگایا گیا ہے۔

خِلقت (۳): م، ک، ف: خِلقت۔ یہ لفظ بہ کسرِ اوّل (خِلقت) اور بہ فتحِ اوّل (خَلقت) دونوں طرح سننے میں آتا ہے۔ آصفیہ اور نور، دونوں میں معنوی امتیاز اِس طرح متعیّن کیا گیا ہے کہ آفرینش اور فطرت وغیرہ کے معانی میں "خِلقت" (بہ کسرِ اوّل) لکھا گیا ہے اور مخلوق کے معنی میں "خَلقت" (بہ فتحِ اوّل)۔ میر امّن نے مخطوطۂ گنجِ خوبی میں خ کے نیچے ہر جگہ زیر لگایا ہے، خواہ وہ بہ معنیِ پیدایش اور فطرت آیا ہو (مثلاً: خِلقت انسان کی، ص ۱۱) یا بہ معنیِ مخلوق آیا ہو (مثلاً: اِتنی ہزار خلقت، ص ۳۴۲)۔ باغ و بہار کے مطبوعہ نسخے (ک) میں بھی یہی صورت پائی جاتی ہے کہ خ کے نیچے ہر جگہ زیر لگا ہوا ہے (مثلاً ص ۱، ۹۲، ۱۲۳، ۱۸۳)۔

ص ۲۵۹ پر "خلقت" چھپا ہوا ہے، یعنی خ پر زبر زیر کچھ نہیں؛ غلط نامے میں اس کی تصحیح اس طرح کی گئی ہے: خِلقت۔ باغ و بہار کے نسخۂ م اور فت میں بھی خ کے نیچے زیر لگا ہوا ملتا ہے۔ اِن وجوہ سے اِس کتاب میں ک کے مطابق ہر جگہ اِس لفظ کو بہ کسرِ اوّل (خِلقت) لکھا گیا ہے۔

خِلوت (ص ۸۸): ک اور فت میں خ کے نیچے زیر لگا ہوا ہے۔ ک میں ص ۴۰ پر "خلوت خانے" ہے، یعنی یہاں بھی خ کے نیچے زیر موجود ہے۔ فت کے آخر میں جو فرہنگ ہے، اُس میں بھی اِسے بہ کسرِ اوّل لکھا گیا ہے۔ اِسی کی مطابقت اختیار کی گئی ہے۔ بہ لحاظِ اصل یہ لفظ بہ فتحِ اوّل (خَلوت) ہے، پلیٹس نے اپنے لغت میں خِلوت (بہ کسرِ اوّل) کو عامیانہ تلفّظ بتایا ہے، مگر فیلن نے اپنے لغت میں بہ کسرِ اوّل کو مقبولِ عام تلفّظ لکھا ہے اور آصفیہ میں بھی خ کے نیچے زیر لگا ہوا ہے؛ اِس کا واضح طور پر مطلب یہ ہے کہ اُس زمانے میں تلفّظ کا یہ اختلاف موجود تھا اور ک میں (اور فت میں بھی) خ کے نیچے جو زیر ہے، وہ بے سند نہیں، یہ استعمالِ عام کی نمایندگی کرتا ہے۔ اِسی بنا پر ک (اور فت) کی مطابقت اختیار کی گئی ہے۔

خواب : ک میں یہ لفظ مع واوِ معدولہ (خواب) ہے۔ چوں کہ یہ متعارف لفظ ہے، اِس لیے اِس میں واو کے نیچے علامتِ معدولہ کے طور پر خط نہیں کھینچا گیا؛ یہاں صراحت کر دی گئی ہے۔ [کتابت: خواب۔ تلفّظ: خاب]

خواجہ : ک میں ہر جگہ یہ لفظ مع واوِ معدولہ "خواجہ" ملتا ہے۔ آصفیہ اور نور میں بھی صراحت موجود ہے کہ اِس لفظ کا املا "خواجہ" ہے اور تلفّظ "خاجہ"۔ ایسے الفاظ جن میں واوِ معدولہ ہے اور جو اُردو میں بہت عام ہیں اور جن کے تلفّظ میں بہ ظاہر کسی طرح کے اشتباہ کی گنجایش نہیں معلوم ہوتی، ایسے لفظوں میں واو کے نیچے واوِ معدولہ کی علامت ضروری نہیں سمجھی گئی ہے (مثلاً: خود، خوش، خواہش وغیرہ) اِن الفاظ کو اگر مثلاً "خود، خوش، خواجہ" لکھا جاتا تو اصولاً یہ املا درست ہوتا، مگر اِس طرح متعارف لفظوں میں اجنبی پن سا شامل ہو جاتا، اِس لیے "خود" اور "خوش" (وغیرہ) کی طرح اِس لفظ "خواجہ" کا بھی متعارف املا اختیار کیا گیا ہے، یعنی واو کے نیچے خط نہیں کھینچا گیا ہے (جو واوِ معدولہ کی علامت ہے)۔ اِس کا تلفّظ "خاجہ" ہوگا۔

خوان : ک میں "خوان" مع واوِ معدولہ ہے۔ (ایسے بعض اور الفاظ کی طرح) اِس لفظ

کو بھی علامتِ واوِ معدولہ کے بغیر ہی لکھا گیا ہے، اِس لیے کہ یہی اِس کا متعارف املا ہے۔
[کتابت: خوان۔ تلفّظ: خان]۔

خواہش : ک میں "خواہش" (یعنی مع واوِ معدولہ) ہے۔ واو کے نیچے علامتِ واوِ معدولہ یوں نہیں لگائی گئی کہ اِس طرح اِس کے املا میں اجنبیّت سی شامل ہو جاتی۔ اِس صراحت کو کافی سمجھا گیا ہے [کتابت: خواہش۔ تلفّظ: خاہش]۔

خوجا (۴۴): م، ن، ک، ف، ع: سب نسخوں میں اِسی طرح (یعنی آخر میں الف) ہے۔ یہ "خواجہ" کی ہندی شکل ہے، اِسی بنا پر اِس کے آخر میں الف آیا ہے۔ آصفیہ میں اِسے صحیح طور پر "اُردو" لکھا گیا ہے، لیکن آخر میں ہائے مختفی لکھی گئی ہے (خوجہ)۔ یہی صورت نوراللغات میں ہے۔ فیلن کے لغت میں بھی "خوجہ" ہے، لیکن پلیٹس نے "خوجا" لکھا ہے۔ مرجّح املا یہی ہے اور اِسی کو م، ن، ک، ف اور ع میں ہر جگہ اختیار کیا گیا ہے اور اِسی کی مطابقت اختیار کی گئی ہے۔

خوراک (۱۸۰): ک میں "خوراک" ہے، یعنی اِسے مع واوِ معدولہ لکھا گیا ہے۔ اب اُردو میں اکثر اِسی طرح مستعمل ہے، مگر "خوراک" اور "خوراکی" کو مع واوِ معروف بھی نظم کیا گیا ہے۔ اِس کی صراحت نور میں موجود ہے، نیز بحر اور جان صاحب کے اشعار بھی سنداً مندرج ہیں: رزق سے محروم رازق نے نہ رکھا شکر ہے: گوشت پر اپنے گرے ٹوٹے جو ہم خوراک سے (بحر لکھنوی) دیتا خوراکی ہے رزّاق ہے موذی میرا: خرچ اِس بندی کا کیا اُن ہی ہے اُن پر چلتا (جان صاحب)۔ اِس کی اور مثالیں بھی پیش کی جا سکتی ہیں، مثلاً: نہ رنج اُن کے افلاس کا اُن کو اصلا: نہ فکر اُن کی تعلیم اور تربیت کا: نہ کوشش کی ہمّت، نہ دینے کو پیسا: اُڑانا مگر مفت ایک اک کا خاکا: کہیں اُن کی پوشاک پر طعن کرنا: کہیں اُن کی خوراک کو نام دھرنا (حالی۔ مسدّسِ حالی، تاج کمپنی، ص ۷۷)۔ صاحبِ نور نے مزید لکھا ہے: "بحر نے "خوراک" کہا ہے، لیکن اب فصحا کی زبانوں پر بروزنِ "بُراق" ہی ہے" اور یہ بالکل درست ہے، مگر اِتنی ہی درست یہ بات بھی ہے کہ قدما کے یہاں "خوراک" بروزنِ مفعول بھی ملتا ہے۔ اِسی وجہ سے اِس لفظ میں واو کے نیچے علامتِ واوِ معدولہ بنائی گئی ہے، جب کہ ایسے دوسرے الفاظ مثلاً خوش، خود، خوشی کے واو کے نیچے یہ علامت ضروری نہیں سمجھی گئی ہے، کیوں کہ اُن الفاظ میں تلفّظ کا ایسا اختلاف

نہیں پایا جاتا۔ اور اسی بنا پر یہ صراحت ضروری سمجھی گئی ہے۔

خُرجی (۲۷) : م، ک، ف، ع، س میں اِس لفظ کا یہی املا ہے۔ ک میں اِسے "خورجی" لکھا گیا ہے، اِس طرح نشان دہی کر دی گئی ہے کہ اِس لفظ میں واوِ معدولہ ہے۔ آصفیہ میں "خُرجی" ہے، مگر پلیٹس کے لغت میں "خرجی" اور "خورجی" دونوں صورتیں موجود ہیں۔ تلفظ میں "خُرجی" آتا ہے [اِس کی ایک صورت "خُرجین" بھی ہے] اگر اِس کو "خورجی" لکھا جائے تو اِس میں (بعض اور الفاظ کی طرح) واوِ معدولہ مانا جائے گا۔ چوں کہ سبھی نسخوں میں یہ لفظ مع واو ملتا ہے، اِس لیے اِس کے املا کو بدلنا مناسب نہیں سمجھا گیا، البتّہ ک کی مطابقت میں واو کے نیچے علامتِ معدولہ کے طور پر چھوٹا سا خط کھینچ دیا گیا ہے۔ اب یہ عام لفظ نہیں، اِس لیے علامتِ واوِ معدولہ ضروری سمجھی گئی ہے۔

خُرزادی : ص ۲۹۲، حاشیہ (۱۴) [خورجی کی طرح اِس لفظ کو بھی مع علامتِ واوِ معدولہ لکھنا ضروری سمجھا گیا ہے]

خوش خَبَری (۱۶) : ک، م، ف میں "ب" پر نہ حرکت ہے نہ جزم۔ ک میں ص ۸۹ پر بھی یہ لفظ آیا ہے اور وہاں بھی یہی صورت ہے۔ لفظِ "خبر" بہ فتحِ اوّل و دوم ہے اور اِس میں کچھ اختلاف نہیں۔ "خوش خبر" میں بھی "ب" مفتوح رہتی ہے، مگر "خوش خبری" کی صورت یہ ہے کہ قاعدے کے مطابق تو "ب" کو مفتوح ہونا چاہیے، مگر یہ خاص مرکّب زبانوں پر بہ سکونِ "ب" ہے۔ اِس وزن کے دوسرے لفظ جیسے "بدن" اور "اثر" اور "نظر" اِن لفظوں میں ترکیبی صورت میں دوسرا حرف مفتوح ہی رہتا ہے، جیسے : کم نَظَری، بے اَثَری، خوش نَظَری، تنگ بدَنی (وغیرہ)۔ لفظِ خبر کا ایک مرکّب "بے خَبَری" بھی عموماً بہ فتحِ "ب" مستعمل ہے، مگر اِس خاص مرکّب کو بہ سکونِ "ب" ہی سنا گیا ہے۔ شاعروں نے ضرور بہ فتحِ "ب" نظم کیا ہے، مثلاً : مژدہ اے شوق کہ کچھ خوش خَبَری آئی ہے ؛ جھومتی آج نسیمِ سحری آئی ہے۔ داغ (یادگارِ داغ)۔ یہ خوش خَبَری سنیے کہ کل رات سے صاحب ؛ ہے بے حرکت آپ کے مانوس کی گردن۔ انشا (کلامِ انشا، ص ۱۹۰) مگر شاعری کا احوال تو یہ ہے کہ "خبر" کی جمع "خبریں" کو بہ فتحِ اوّل و دوم بھی نظم کیا گیا ہے، مثلاً : ماہِ نَظَر نے دیں خَبَریں اضطراب کی ؛ اللہ! خیر ہو دلِ خانہ خراب کی۔ محسن کاکوروی (کلیاتِ نعتِ محسن، ص ۲۰۴) جب کہ بالعموم "خبریں" مستعمل ہے، یعنی بول چال میں "ب" کا زبر، جزم سے بدل جاتا ہے۔ آصفیہ میں یہ مرکّب موجود ہے مگر اعراب کے بغیر۔ فیلن نے اپنے لغت میں اِسے "خوش خَبری" (بہ سکونِ "ب") ہی لکھا ہے اور اِس سے استعمالِ عام کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ صاحبِ نور اللغات

نے "خوش خبری" کو "بہ فتحِ با" لکھا ہے اور مثال میں جلالؔ کا یہ شعر لکھا ہے : "دشمن کے وہ کہنے سے جلالؔ آتے ہیں تو کیا ہے کیا رنگ دیا ہے تری اس خوش خبری نے" لیکن یہ شعری زبان ہے، بول چال کی زبان نہیں۔ پلیٹس نے بھی "خوش خَبری" (بہ فتحِ با) لکھا ہے۔ میں نے فیلن کے اندراج کے مطابق اسے بہ سکونِ با مرجح سمجھا ہے اور اسی طرح لکھا ہے۔ اس ترجیح کا ایک قرینہ یہ بھی ہے کہ ک میں لفظ "خبر" جب مفرد آیا ہے تو ب کے اوپر زبر لگایا گیا ہے مثلاً ص ۸۸، ۸۹، ۹۱۔ مگر "خوش خبری" میں ب پر زبر کسی جگہ نہیں ملتا اور اس سے اس قیاس کو تقویت ملتی ہے کہ اس مرکب میں ب کو مفتوح نہیں مانا گیا ہے۔ [مزید دیکھیے ضمیمے کے آخر میں استدراک [۱۱۸]]۔

خوش قطع : ص ۴۸۴، حاشیہ ①۔

خوشنودی (۱۲۸) : کسے اور شسے میں اس لفظ کا یہی املا ہے (یعنی مع واو ہے) البتہ ک میں اسے "خوشنودی" لکھا گیا ہے، یعنی نشان دہی کر دی گئی ہے کہ اس لفظ میں واوِ معدولہ ہے۔ مخطوطۂ گنجِ خوبی میں میر امن نے "خوشنودی" (مع واو) بھی لکھا ہے (ص ۲۴) اور "خشنودی" (واو کے بغیر بھی) لکھا ہے۔ ص ۹، ۱۱۷۔ فارسی میں بھی اس کے دونوں املا ملتے ہیں، صاحبِ بہارِ عجم نے "خوشنود" کے ذیل میں لکھا ہے : "و بدونِ واو نیز رسمِ خط است"۔ برہانِ قاطع میں بھی اسے دونوں طرح درج کیا گیا ہے (حاشیہ ص ۵۵۷، ص ۷۹۳)۔ آصفیہ میں "خوشنودی" ہے۔ اردو میں بالعموم اسے مع واوِ معدولہ (خوشنود، خوشنودی) لکھا جاتا ہے، اسی بنا پر (ک اور ف کے مطابق) اسی املا کو ترجیح دی گئی ہے۔ چوں کہ یہ متعارف لفظ ہے، اس لیے علامتِ معدولہ نہیں لگائی گئی۔

خیال (۱۱) : شسے میں یہ لفظ کہیں تو بہ کسرِ اوّل ملتا ہے اور کہیں بہ فتحِ اوّل۔ مثلاً ص ۱۰ پر "خِیال" لکھا ہوا ہے : "ایک بارگی آئینے کی طرف خِیال جو کرتے ہیں" اور ص ۱۲ پر "خَیال" ہے : "یہ کیا خَیال مزاجِ مبارک میں آیا"۔ اس کے برخلاف ک میں ہر جگہ خ کے نیچے زیر لگا ہوا ہے، مثلاً ص ۱۰، ۱۱، ۵۵، ۹۱، ۶۷، ۷۰، ۷۹۔ ک کے مطابق اسے ہر جگہ بہ کسرِ اوّل (خِیال) لکھا گیا ہے۔ ضمنی طور پر یہ لکھنا بھی بے محل نہ ہوگا کہ عربی کا یہ لفظ اصلاً بہ فتحِ اوّل (خَیال) ہے [المنجد] فارسی لغات میں سے غیاث اللغات میں اسے بہ فتحِ اوّل لکھا گیا ہے، لیکن بہارِ عجم میں اسے بہ کسرِ اوّل لکھا گیا ہے۔ میرا خیال یہ ہے کہ ہندستان میں آ کر اس لفظ کے تلفظ میں اختلاف رونما ہوا اور بہارِ عجم کا اندراج اسی کی نمایندگی کرتا ہے۔ اردو میں اہلِ علم کی زبان سے تو اکثر و بیش تر

اِسے بہ فتحِ اوّل (خَیال) سُنا گیا ہے اور عام لوگوں کی زبان سے اکثر بہ کسرِ اوّل (خِیال) سُننے میں آیا ہے۔ فرہنگِ آصفیہ میں "خَیال" لکھا ہوا ہے، یعنی خ پر زبر بھی ہے اور زیر بھی اور اس سے اُردو میں تلفظ کے اختلاف کی نشان دہی بہ خوبی ہو جاتی ہے۔ کے میں جو "خِیال" بہ تواتر ملتا ہے، تو یہ اِس لفظ کے عمومی تلفظ کی نمایندگی کرتا ہے۔

خَیمہ (۱۳۱) : کے کے متن میں اِس لفظ پر اعراب موجود نہیں، مگر غلط نامے میں اِس کی صحیح صورت "خَیمے" بتائی گئی ہے، یعنی خ کے اوپر زبر ہے۔ مگر فت میں خ کے نیچے زیر لگا ہوا ہے اور اُس کی فرہنگ سے معلوم ہوتا ہے کہ یؔ معروف ہے۔ عربی میں "خَیمہ" ہے (المنجد)۔ فارسی میں بھی یہی صورت ہے (غیاث اللغات) بل کہ اِس میں تو یہ صراحت بھی کر دی گئی ہے کہ "بہ فتح صحیح و بہ کسر خطا ست"۔ نور میں جو کچھ لکھا گیا ہے، اُس سے یہی مترشح ہوتا ہے کہ یہ لفظ بہ فتحِ اوّل ہے، مگر آصفیہ میں اِسے بہ کسرِ اوّل و معِ یاے معروف لکھا گیا ہے۔ فیلن نے اپنے لغت میں اِسے بہ کسرِ اوّل معِ یاے مجہول لکھا ہے اور پلیٹس کے لغت میں "خَیمہ، خِیمہ، خِیْمہ" تینوں طرح مندرج ہے۔ اِن اندراجات سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ یہ لفظ تینوں طرح مستعمل رہا ہے۔ چوں کہ کے کے غلط نامے میں اِس کو بہ فتحِ اوّل صحیح بتایا گیا ہے، اِس بنا پر اِسے بہ فتحِ اوّل ہی لکھا گیا ہے [یہ لفظ دہلی میں اکثر بہ کسرِ اوّل سننے میں آیا ہے، یؔ کبھی معروف ہوتی ہے کبھی مجہول]۔

داڑھی مونچھ : ص ۳۶۱، ح ① ۔

دانا پانی : ص ۲۹۴، حاشیہ ④ ۔

داہنی : ص ۳۳۹، ح ⑧ ۔

دَرْجَہ (۴) : م، کے، فت میں اِس لفظ پر اعراب موجود نہیں، البتّہ فت کی فرہنگ میں اِسے بہ سکونِ دوم درج کیا گیا ہے۔ اصل لفظ "دَرَجَہ" ہے، مگر آصفیہ میں یہ صراحت کر دی گئی ہے کہ "اُردو میں "دَرْجَہ" بولا جاتا ہے"۔ یہی بات نور میں لکھی گئی ہے : "درجہ : ع، بہ فتحِ اوّل و دوم و سوم .... اُردو میں بہ سکونِ دوم ہے"۔ یہی صحیح صورتِ حال ہے۔ اِسی کے مطابق اِسے بہ سکونِ دوم لکھا گیا ہے۔

درگُذر (معِ ذال) : ص ۳۸۰، ح ۱۴ ۔

درباہا : ص ۲۹۸، حاشیہ ⑨ ۔

دُرُدُ (۴۲): اِس لفظ میں دال پر پیش ہی ہے۔ صراحت کی ضرورت یوں محسوس ہوئی کہ کچھ لوگوں کی زبان سے بہ فتحِ دال (دَرُدُ) بھی سُننے میں آتا ہے اور فَ کی فرہنگ میں بھی اسے بہ فتحِ اوّل لکھا گیا ہے؛ اگرچہ اُس کے متن میں دال پر پیش لگا ہوا ملتا ہے۔ آصفیہ میں دال پر پیش لگا ہوا ہے اور نور میں وضاحت بھی کر دی گئی ہے کہ "بہ فتحِ دال غلط ہے۔" [خیر، بہ فتحِ دال کو غلط تو نہیں کہا جا سکتا، مگر یہ بات ضرور ہے کہ اکثر پڑھے لکھے لوگ بہ ضمِّ اوّل بولتے ہیں] کَ میں یہاں پر تو اِس لفظ پر اعراب نہیں ملتے، لیکن ص ۳۱ پر بھی یہ لفظ آیا ہے، اور وہاں "دُرُدُ" ملتا ہے، اور فَ میں دونوں جگہ دال اور رے پر پیش لگے ہوئے ہیں۔ ہاں، اِس لفظ کی تذکیر و تانیث میں بھی اختلاف ہے، لیکن یہاں یہ بحث بے محل ہوگی۔

دُرُوغ (ص ۱۱۶): فارسی میں دال اور رے دونوں پر پیش ہے (دُرُوغ)۔ لیکن اُردو میں زبانوں پر عموماً بہ فتحِ اوّل ہے۔ کَ میں دال پر حرکت موجود نہیں، مگر واو پر علامتِ مجہول موجود ہے۔ فَ میں اِس لفظ پر اعراب موجود نہیں، البتہ اُس کی فرہنگ میں اسے بہ فتحِ اوّل لکھا گیا ہے۔ اِسی طرح فیلن نے بھی اپنے لغت میں اسے بہ فتحِ اوّل ہی لکھا ہے اور یہ اُردو میں استعمالِ عام کی صحیح طور پر نمایندگی کرتا ہے۔ فَ کی فرہنگ کے مطابق اِس لفظ کو بہ فتحِ اوّل لکھا گیا ہے۔ اِس سلسلے میں یہ لکھنا بھی دل چسپی سے خالی نہ ہوگا کہ صاحبِ غیاث اللغات نے اسے بہ ضمّتین لکھ کر یہ بھی لکھا ہے کہ: "و بہ فتحِ اوّل نیز آمدہ۔" فارسی میں بہ فتحِ اوّل ہے یا نہیں، میں اِس کے متعلق فی الوقت کچھ نہیں کہہ سکتا، البتہ یہ ضرور کہہ سکتا ہوں کہ اُردو میں بہ فتحِ اوّل ہے۔

دَرویش (۵): فارسی میں یہ لفظ اِسی طرح (بہ فتحِ اوّل) ہے، اُردو میں بھی یہی ہے اور آصفیہ میں بھی دال پر زبر لگا ہوا ہے؛ یوں بہ ظاہر اِس لفظ کے تلفظ میں کوئی اختلاف نظر نہیں آتا، لیکن دو وجوہ سے یہاں وضاحت کی ضرورت محسوس کی گئی: پہلی بات تو یہ ہے کہ بعض لوگوں کی زبان سے "دُرویش" (بہ ضمِّ اوّل) بھی سُنا گیا ہے، اور دوسری بات یہ ہے کہ نور اللغات میں اِس لفظ کو فارسی لکھ کر "بالفتح و بالضم" لکھا گیا ہے، اور اِس سے یہ غلط فہمی پیدا ہوتی ہے کہ فارسی میں بھی دال کی حرکت کا یہ اختلاف پایا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مولفِ نور اللغات نے غیاث اللغات کے ایک اندراج سے یہ غلط نتیجہ اخذ کیا ہے۔ صاحبِ غیاث اللغات نے "درویش" کو بہ فتحِ اوّل لکھ کر، اِس لفظ کی اصل پر بحث کی ہے اور مختلف اقوال نقل کیے ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اِس کی اصل "دریوزہ" یا "دریوز" تھی، اور پھر یہ لکھا ہے کہ چوں کہ دریوزہ گر یعنی بھیک مانگنے والے کی نسبت

خدارسیدوں سے مناسب نہیں معلوم ہوتی، اِس لیے (خدا رسیدہ) فقیر کو اگر "دُرویش" کہا جائے تو بہتر ہوگا اور پھر اِس "دُرویش" کے اجزا (دُر۔ ویش) کی وضاحت کی ہے۔ مؤلفِ غیاث نے یہ واضح طور پر لکھ دیا ہے کہ یہ یعنی اُن کی ذاتی رائے ہے : "کسے از اہلِ لغت ایں وجہ ننوشتہ، فقیر مؤلف بدعاے درویشاں از قوانینِ فارسیہ استخراج نمودہ۔ اگر منصفاں پسند نمایند، فبہا، و الّا معذور دارند۔" اِس طرح یہ واضح ہو جاتا ہے کہ فارسی میں صرف "دَرویش" ہے، اور "دُرویش" ایک تجویز تھی مؤلفِ غیاث اللغات کی۔ صاحبِ نور اللغات نے اِس صراحت سے قطعِ نظر کرتے ہوئے حرکات کو اِس طرح درج کیا جیسے فارسی میں "دَرویش" اور "دُرویش" دونوں صورتیں پائی جاتی ہیں (جو صحیح نہیں)۔ بہ ہر صورت اوپر جو کچھ لکھا گیا، اُس سے یہ ضرور معلوم ہو جاتا ہے کہ اُردو میں کچھ لوگوں کی زبان پر جو "دُرویش" ہے، یہ تلفّظ دراصل صاحبِ غیاث اللغات کی اُسی ترجیح کے زیرِ اثر وجود میں آیا ہے۔ جہاں تک "دَرویش" کی اصل کا تعلّق ہے، برہانِ قاطع کے ایرانی مرتّب اور مشہور لغت نویس ڈاکٹر محمّد معین نے اِس پر جو بحث کی ہے، اُسے دیکھا جائے [برہانِ قاطع، طبعِ تہران، اشاعتِ دوم، جلدِ دوم، ص ۸۴۶، حاشیہ] ہاں یہ وضاحت بھی بے محل نہ ہوگی کہ ہم اور کسے میں ہر جگہ "ی" پر علامتِ مجہول موجود ہے (اُردو میں مستعمل بھی اِسی طرح ہے)۔

دریاے وحدت (۳) : ک، ف : دریائے وحدت۔ م، ع : دریاے وحدت۔ کسے میں یہاں پر تو "ے" پر ہمزہ لگا ہوا ہے ("دریائے وحدت") لیکن ایسے دوسرے مقامات پر اضافت کی صورت میں عموماً "ے" پر ہمزہ نہیں ملتا، مثلاً : جاے ثواب ۲۴ف۔ اداے شکر ۱۲۵، ۱۵۷۔ نحواے کلام ۲۹۔ براے خود ۱۲۶۔ بلاے ناگہانی ۱۱۷۔ سواے وصل ۱۴۱۔ سواے خداکے ۴۷۔ سواے میرے ۴۴۔ اردوے معلّا (عرضی میر امّن کی) اردوے معلّا ۵۔ مخطوطۂ گنجِ خوبی کا بھی یہی احوال ہے۔ اِس میں میر امّن نے بہ صورتِ اضافت عموماً "ے" پر ہمزہ نہیں لگایا ہے، مثلاً : ابتداے سلطنت ۱۸۱۔ جزاے خیر ۴۴۔ وصایاے ہوشنگ ۱۲۹۔ ابتداے سلطنت ۱۴۱، ۱۲۰۔ سراے فانی ۴۷۔ دنیاے فانی ۸۸۔ وفاے عہد ۱۲۷، ۱۴۱۔ خداے واحد ۷۵، خداے کریم ۱۲۰، ۱۹۳۔ خداے بزرگ ۲۱۷۔ انتہاے کار ۱۳۹۔ پاے تخت ۲۲۴۔ بالاے طاق ۱۱۲۔ دعاے خیر ۱۲۶۔ جزاے خیر ۱۲۵۔ خوے حیوانی ۳۲۔ روے زمین ۴۷۔ دریاے ہلاکت ۳۰۴۔ رازہاے بادشاہی ۳۱۱۔ سواے سیاست کے ۱۸۱۔ بجاے پانی کے ۵۲۔ اِسی طرح املا کی پابندی کی گئی ہے اور اضافت

کی صورت میں ایسی "ے" پر ہمزہ نہیں لگایا گیا ہے۔ یہ عرض کر دیا جائے کہ اصولِ املا کے مطابق صحیح طریقہ یہی ہے کہ بہ صورتِ اضافت "ے" پر ہمزہ نہ لگایا جائے۔

[راقم الحروف نے اپنی کتاب "اُردو املا" میں اِس پر مفصل بحث کی ہے، اُسے دیکھا جا سکتا ہے]۔

دَرِیغ (۴۷۳): فارسی میں دال اور رے، دونوں کے نیچے زیر ہے (دِرِیغ)۔ ک ے میں "ی" پر تو علامتِ مجہول موجود ہے، لیکن دال پر حرکت موجود نہیں۔ ف ے میں بھی دال پر حرکت موجود نہیں، البتہ اُس کی فرہنگ میں یہ بہ فتحِ اوّل ملتا ہے۔ آصفیہ میں اِس لفظ پر حرکات موجود نہیں۔ نور میں اِس کو اِس طرح لکھا گیا ہے: "دریغ (ف بکسرِ اوّل و دوم و سکونِ سوم مجہول) ...." اِس اندراج سے واضح طور پر یہ معلوم نہیں ہوتا کہ اُردو میں اِس کی حرکات کیا ہیں۔ قوسین میں جن حرکات کو لکھا گیا ہے، وہ بہ ظاہر فارسی سے متعلق معلوم ہوتی ہیں۔ خیر، جو بھی صورت ہو، اُردو میں اِسے عموماً بہ فتحِ اوّل سُنا گیا ہے۔ فارسی کے ایسے متعدد لفظ ہیں جو اصلاً بہ کسرتین ہیں مگر اُردو میں وہ عام طور پر بہ فتحِ اوّل و کسرِ دوم مستعمل ہیں، اور یہ لفظ بھی اِسی فہرست میں شامل ہے۔ فیلن نے اپنے لغت میں اِسے صرف بہ فتحِ اوّل و کسرِ دوم لکھا ہے۔ پلیٹس نے اِسے بہ فتحِ اوّل و کسرِ دوم اور بہ کسرتین، دونوں طرح لکھا ہے، مگر مثالوں میں ہر جگہ "دَرِیغ" لکھا ہے اور اِس سے وضاحت کے ساتھ معلوم ہو جاتا ہے کہ اُردو میں یہ بہ فتحِ اوّل مستعمل ہے۔ اِن وجوہ سے اِس لفظ کو بہ فتحِ اوّل و کسرِ دوم لکھا گیا ہے [جس طرح ف ے کی فرہنگ میں ہے]۔

دستآویز (۲۴۳): م، ک ے اور ف ے میں اِسی طرح۔ ع میں "دستاویز" ہے۔ اصل لفظ "دست آویز" ہے، جو تلفظ کی رعایت سے "دستاویز" لکھا جانے لگا۔ اِس بات کو یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ "دست آویز" پُرانا املا ہے۔ نور میں "دستاویز" ملتا ہے لیکن آصفیہ میں "دستآویز" ہے۔ ک ے کے املا کو برقرار رکھا گیا ہے۔

دسترخوان: ک ے میں ہر جگہ "دسترخوان" (یعنی مع واوِ معدولہ) ہے۔ [کتابت: دسترخوان۔ تلفظ: دسترخان]۔

دعویٰ (۳۷): ک ے اور ف ے میں "دعویٰ" ہے اور ع میں "دعوا"۔ وہ لفظ جن کے آخر میں عربی میں الف بہ صورتِ "ی" لکھا جاتا ہے، مخطوطۂ گنج خوبی میں میر امّن نے اُن میں سے اکثر کو مع الف لکھا ہے (جیسے: ادنا، اعلا، معلا، مصلا) اور بعض کو مع "ی" جیسے عیسیٰ۔ نسخۂ ک ے میں

یہ صورتِ حال سامنے آتی ہے کہ ایسے لفظ کہیں تو قدیم املا کے مطابق ملتے ہیں اور کہیں جدید املا کے مطابق (مع الف) لیکن "دعویٰ" ایک ایسا لفظ ہے جو کسے میں ہر جگہ قدیم املا کے مطابق ملتا ہے (مثلاً، ص ۱۳۴) اور یہی حال مخطوطۂ گنجِ خوبی کا ہے کہ اُس میں میر امّن نے اِس لفظ کو "دعویٰ" لکھا ہے، مثلاً: ص ۹۷، ۱۰۷، ۱۹۹، ۲۸۰، ۲۹۰۔ صرف ایک جگہ ایک مصرعے میں اِس سے مختلف صورت ملتی ہے: کرے ادنا بھی دعواے ریاست۔ مگر یہاں یہ کہا جاسکتا ہے کہ ترکیب کی وجہ سے یہ صورت پیدا ہوئی ہے۔ بہ ہر حال چوں کہ دونوں مذکورہ نسخوں میں اِس لفظ کا املا "دعویٰ" ملتا ہے، لہٰذا اُسی کو برقرار رکھا گیا ہے۔

دَفَع (۱۳۰): کسے اور ننسے میں اِس لفظ پر اعراب موجود نہیں۔ اُردو کے محاورے میں "دفع کرنا" اور "دفع ہونا" دونوں میں دال اور فے دونوں پر زبر آتا ہے۔ اصل لفظ "دَفْع" ہے اور اضافی ترکیب کی صورت میں یہ اِسی طرح مستعمل ہے؛ جیسے: دَفْعِ دَخْلِ مُقدّر؛ مگر جب یہ لفظ ترکیب کے بغیر آتا ہے تو اُردو والے اِسے بہ فتحِ دوم ہی بولتے ہیں۔ آصفیہ میں "دَفَع" ہے اور یہ اُردو کے لحاظ سے بالکل درست ہے۔ صاحبِ نور نے "رفع دفع" کے ذیل میں لکھا ہے: "رَفع دَفع بہ فتحِ اوّل و دوم ہی بول چال میں ہے"۔ پھر "رَفع دَفع ہونا" کی سند میں یہ شعر بھی لکھا ہے: "بس آؤ عید کا دن آج ہے، گلے مل لو ؛ کہ کل کی رات کے جھگڑے رَفع دَفع ہو جائیں"۔ اثرؔ لکھنوی مرحوم نے فرہنگِ اثر میں "رفع دفع" کے تحت یہی بات لکھی ہے: "شاعروں بلکہ شاعری کو چھوڑ کر، یہ اصول رکھنا چاہیے کہ جو لفظ اُردو کے خواص میں جس طرح رائج ہو، اُسی طرح فصیح اور صحیح ہے، اصل زبان میں جو کچھ ہو۔ البتہ جب فارسی ترکیب کے ساتھ لائیے تو فارسی قواعد کا تتبع مناسب ہوگا" [ص ۳۹۲]۔ میر امّن نے جو انداز استعمالِ عام کے سلسلے میں اختیار کیا ہے، اُس پر نظر رکھی جائے، تب بھی یہاں "دَفَع" ہی انسب معلوم ہوگا۔ اِنھی وجوہ سے فے پر زبر لگایا گیا ہے (شعری زبان سے یہاں بحث نہیں)۔

دَفَعہ (۱۳۷): جو احوال "دَفَع" کا ہے، وہی صورت "دَفَعہ" کی ہے کہ یہ بھی اُردو والوں کی زبان پر بہ فتحِ اوّل و دوم ہے (دَفَعہ، بروزنِ فَعَل)۔ نیز دیکھیے ص ۳۶۸، ح ⑤۔

دُکان: یہ لفظ اِس کتاب میں ۴۴ مقامات پر آیا ہے [ص ۱۰، ۲۷، ۳۱ (تین جگہ)، ۳۲، ۳۴، ۵۱ (دو جگہ)، ۵۲، ۶۰، ۱۲۱، ۱۳۲ (دو جگہ)، ۱۳۴، ۱۳۷ (تین جگہ)، ۱۴۲ (دو جگہ)، ۱۴۶، ۲۰۶ (دو جگہ)

ص ۲۳۲] کے میں اِن مقامات کے مطابق کہیں یہ لفظ مع واو (دوکان) ملتا ہے اور کہیں بغیر واو (دُکان)۔ "دوکان" ہر جگہ مع واوِ معروف ہے اور "دکان" جہاں بھی ہے، اُس میں دال پر پیش ضرور لگا ہوا ہے۔ مثلاً ص ۲۷ کے مطابق کے میں "دُکان دار" ہے (کے ۲۳) اور ص ۲۰۶ کے مطابق کے میں "دوکان دار" ہے (کے ص ۲۰۶)۔ یا مثلاً ص ۲۳ کے مطابق کے میں "دُکان" ہے (کے ص ۲۹) اور ص ۲۳۲ کے مطابق کے میں "دوکان" ہے (کے ص ۲۳۲)۔ م کی بھی یہی صورت ہے کہ پہلے درویش کی سیر میں صفحات ۱۰، ۲۷، ۳۲، ۳۳ کے مطابق دم میں ہر جگہ "دُکان" ہے [ص ۳۲ پر یہ لفظ تین جگہ آیا ہے اور م میں اِن تینوں مقامات پر "دُکان" ہے۔ دال پر ہر جگہ پیش بھی لگا ہوا ہے] اور صفحات ۵۱ (دوبار) ۵۲ اور ۶۰ کے مطابق م میں "دوکان" ہے۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ ف اور ن میں بھی کے کے مطابق یہ لفظ آیا ہے، یعنی جہاں کے میں "دُکان" ہے، وہاں اِن نسخوں میں بھی "دُکان" ہے اور جہاں کے میں "دوکان" ہے تو اُن مقامات پر اِن نسخوں میں بھی یہ لفظ مع واو ہے۔ البتّہ ع میں ہر جگہ "دُکان" (واو کے بغیر) ہے۔

اصل لفظ "دُکّان" ہے اور اُس کی مخفّف صورت "دُکان" ہے۔ خانِ آرزو نے نوادر الالفاظ میں لکھا ہے: "لفظ دکان مخفّفِ دکّان بہ تشدید است و ایں قاعدۂ فارسیان است کہ اکثر الفاظِ متشدّدۂ عربیّہ بہ تخفیف خوانند، مثلِ قد و خد و جادہ وغیرہ۔ و ایں کہ اہلِ ہند "دوکان" بہ واو نویسند، خطاے محض است" (ص ۴۳۸)۔ فارسی و اُردو کے کئی لغات میں یہ صراحت ملتی ہے کہ اِس لفظ کو مع واو نہیں لکھنا چاہیے۔ اُردو میں اعراب بالحروف کے مطابق کئی لفظوں میں پیش کو ظاہر کرنے کے لیے واو لکھا جاتا تھا (جیسے: اوس (اُس)) وہ چلن اُٹھ گیا، مگر بعض لفظوں میں وہ زائد واو بہ طورِ یادگار نظر آجایا کرتا ہے، مثلاً "پہنچنا" کہ اب بھی بعض لوگ "پہونچنا" لکھتے ہیں۔ یہی صورت اِس لفظ کی ہے کہ "دُکان" کو "دوکان" لکھا جانے لگا، مگر یہ طے ہے کہ جو لوگ "دوکان" لکھتے ہیں، وہ پڑھتے "دُکان" ہی ہیں۔

چوں کہ کے میں اِس کا بہ طورِ عموم التزام ملتا ہے کہ قدیم روش کے مطابق جن لفظوں میں پیش کو ظاہر کرنے کے لیے واو لکھا جاتا تھا، اُن کو اُس زائد واو کے بغیر لکھا جائے، اِس لحاظ سے دیکھا جائے تو مرجح صورت "دُکان" معلوم ہوگی۔ اِس کی تائید یوں بھی ہوتی ہے کہ کے میں جن مقامات پر یہ لفظ واو کے بغیر لکھا ہوا ہے، اُن مقامات پر دال پر پیش ضرور لگا ہوا ہے اور

اِس سے قطعیت کے ساتھ یہ واضح ہو جاتا ہے کہ تلفظ کے لحاظ سے اِس لفظ کو واو کے بغیر ہی مانا گیا ہے۔ اِس سے "دُکان" کی ترجیح کا پہلو روشن ہو جاتا ہے، اِس لیے اِس کتاب میں ہر جگہ اِس لفظ کو واو کے بغیر "دُکان" لکھا گیا ہے:

دُکھن : ص ۳۰۶، حاشیہ ⑤۔

دُگنا : یہ لفظ ص ۱۲۶ اور ص ۱۹۱ پر آیا ہے، دونوں جگہ ک میں اِسی طرح، یعنی واو کے بغیر ہے۔ مستعمل بھی اِسی طرح ہے۔ محض بربنائے احتیاط یہ صراحت کی گئی ہے۔

دُلمیان : ص ۳۶۹، ح ⑦ ۔ اِضافہ: قائم چاند پوری کی ایک رباعی میں یہ لفظ آیا ہے: مت پوچھ کہ گرمی کے یہ دن کیسے ہیں ÷ مفلس کی تسلّی کو تو یہ جیسے ہیں ÷ جب خصیوں پہ ہاتھ جا پڑے ہے، گویا ÷ دارائی کی دلمیاں میں دو پیسے ہیں [کلّیاتِ قائم، مرتبہ اقتدا حسن، مجلسِ ترقّیِ ادب لاہور، جلدِ دوم، ص ۲۳] ۔ اِس رباعی میں یہ لفظ مع لامِ ساکن اور مع نونِ غنّہ نظم ہوا ہے۔ "کی" سے اِس کا مؤنث ہونا بھی معلوم ہوتا ہے لیکن "کی" اور "کے" پر تذکیر و تانیث اگر منحصر ہو، تو وہ قطعیت کے ساتھ سند کے کام نہیں آتی۔ اِس لفظ کے استعمال کی ایسی کوئی اور مثال میری نظر میں نہیں جس سے تذکیر و تانیث کا تعیّن کیا جا سکے؛ اِسی بنا پر ک کے مطابق اِس متن میں اِسے مذکّر ہی رکھا گیا ہے۔ [ویسے میرا قیاس یا یوں کہیے کہ خیال اِس لفظ کی تانیث کو مرجّح سمجھنے کے حق میں ہے، مگر ک کے متن میں اور فے کی فرہنگ میں اور پلیٹس کے لغت میں اِس کو مذکّر لکھا گیا ہے، یوں اِس میں کسی طرح کا تصرّف مناسب نہیں تھا]

دُلہن (ص ۲۳) : ک اور فے میں "دُلہن" ہے، ع میں "دلھن" ہے۔ ک میں کئی جگہ یہ لفظ آیا ہے اور ہر جگہ ہائے ملفوظ (اور کتابت کی زبان میں گھنی دار ہ) کے ساتھ ملتا ہے۔ یہ ذہن میں رہے کہ ک میں اِس کا التزام ملتا ہے کہ جن لفظوں میں ہائے مخلوط ہے، اُن کو دو چشمی ھ (ھ) کے ساتھ لکھا جائے۔ اگر کہیں یہ التزام برقرار نہیں رہا ہے، تو غلط نامے میں اُس کی تصحیح کر دی گئی ہے۔ مثلاً ص ۲۱ پر "تمہیں" چھپا ہوا ہے، مگر غلط نامے میں یہ ہدایت ملتی ہے کہ اِس کے بجائے صحیح لفظ "تمھیں" لکھا جائے۔ اِس میں شک نہیں کہ شعرا کے یہاں عموماً "دُلھن" ملتا ہے، مگر اِس کی دوسری صورت "دُلہن" بھی بجائے خود ٹھیک ہے۔ ک اور فے میں کئی جگہ "دلہن" کا ہونا اِس پر دلالت کرتا ہے کہ اِسے "دُلہن" لکھا گیا ہے، "دُلھن" نہیں۔ اِسی کی مطابقت اختیار کی گئی ہے۔

"دولھا" ک میں ہر جگہ ہائے مخلوط کے ساتھ ہے اور "دلہن" ہر جگہ ہائے ملفوظ کے ساتھ؛ دونوں لفظوں کے املا کو برقرار رکھا گیا ہے۔ اِس سلسلے میں سب سے اہم اور قطعی ثبوت یہ ہے کہ گنجِ خوبی میں میر امّن نے اِس لفظ کو مع ہائے ملفوظ نظم کیا ہے: ملک کی دُلہن، ہو راضی، اُس سے کرتی ہے نکاح، جس کو ہمت ہے اور ہر دم تیغ سے رکھتا ہے کام (گنجِ خوبی، اکتیسواں باب، دربیانِ شجاعت)
نفائس اللّغات میں حرکات کی اِس طرح صراحت کی گئی ہے کہ اِس لفظ کی دونوں صورتوں کا تعیّن ہو جاتا ہے: "دُلہن: بضمِّ اوّل وسکونِ دوم وفتحِ ہا ونون درآخر۔ وبہ ضمِّ اوّل وفتحِ ثانی مخلوط التلفظ بہ ہا و سکونِ نون مستعمل است"۔ آصفیہ میں بھی "دُلہَن" اور "دُلھن" دونوں لفظ موجود ہیں اور اِس قطعیت کے ساتھ یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ دونوں صورتیں استعمال میں آتی رہی ہیں [ہاں یہ ٹھیک ہے کہ اب اکثر "دُلھن" سننے میں آتا ہے]۔

دِمشق (ص۲۴۱): م میں دال پر حرکت موجود نہیں، مگر میم کے نیچے زیر لگا ہوا ہے۔ اِس پیراگراف میں یہ لفظ تین جگہ آیا ہے اور تینوں جگہ یہی صورت ہے کہ دال خالی ہے اور میم کے نیچے زیر لگا ہوا ہے۔ م میں ص ۸۷ پر بھی یہ لفظ آیا ہے اور وہاں بھی یہی صورت ہے (دمِشق)۔ میم کے نیچے زیر ہر جگہ اِس طرح لگا ہوا ہے کہ کسی طرح کا اشتباہ پیدا نہیں ہوتا؛ یعنی یہ واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ یہ زیر میم ہی کے نیچے ہے۔ ف میں لفظ کے شروع میں زیر اِس طرح لگا ہوا ہے کہ اُسے دال کے نیچے بھی سمجھا جا سکتا ہے اور میم کے نیچے بھی۔ ک میں البتہ "دِمَشق" ہے، یعنی دال کے نیچے زیر ہے اور میم کے اوپر زبر ہے۔ لیکن ص ۴۴ پر اور ص ۲۴۸ پر "دمِشق" ہے، یعنی جس طرح م میں یہاں میم کے نیچے زیر لگا ہوا ہے (اور دال خالی ہے) اُسی طرح ک میں بھی ان دونوں مقامات پر دال خالی ہے اور میم کے نیچے زیر واضح طور پر لگا ہوا ہے؛ یوں میم کا مکسور ہونا واضح ہو جاتا ہے۔ المنجد میں "دِمَشق" ہے۔ غیاث اللّغات میں البتہ اسے بہ کسرِ اوّل وفتحِ دوم (دِمَشق) اور بہ کسرِ اوّل و دوم (دِمِشق) لکھا گیا ہے، لیکن اوّل الذکر کی ترجیح عبارت سے ظاہر ہوتی ہے۔ آصفیہ و نور میں یہ لفظ موجود نہیں۔ لغت کے لحاظ سے، یا یوں کہیے کہ عربی کے لحاظ سے صحیح تلفّظ "دِمَشق" ہے، مگر اُردو والے عام طور پر "دَمِشق" کہتے ہیں۔ م میں جو ہر جگہ "دمِشق" ہے اور ک میں ایک جگہ ہے، اُس سے اِس تلفّظ کی تائید کا پہلو نکلتا ہے۔ ک میں اِس مقام پر جو اعراب ہیں (یعنی دال کے نیچے زیر اور میم کے اوپر زبر) میرا خیال ہے کہ یہ مصنّف کے بجائے مصحّح نے

لُغت دیکھ کر لگائے ہیں۔ اِس لفظ کے سلسلے میں م کو ترجیح دی گئی ہے، اُس کی روشنی میں (اور استعمالِ عام کے مطابق) اِسے "دِمشق" لکھا گیا ہے۔ کے میں ص ۲۴۴ اور ص ۲۴۸ پر یہ لفظ جس طرح آیا ہے، اُس سے تائید کا پہلو نمایاں ہے۔

دُو : (عدد کے معنی میں) اس لفظ کے سلسلے میں بعض وضاحتیں ضروری ہیں۔ کے میں ہر جگہ اِس کو مع واوِ مجہول (دُو) لکھا گیا ہے (مستعمل بھی اِسی طرح ہے)۔ "دوسرا" کو مع واوِ معروف لکھا گیا ہے (اور یہ بھی اِسی طرح مستعمل ہے)۔ "دو" جب مرکبات میں آیا ہے (جیسے: دومنزلہ، دوآتشہ، دوگانہ) ایسے مرکبات میں اکثر یہ مع واوِ معدولہ ملتا ہے، یعنی "دوآتشہ، دوگانہ" (تلفظ: دُ آتشہ، دُگانہ) یہ لفظ مستعمل بھی اِسی طرح ہیں۔ چوں کہ ایسے اکثر مرکبات اُردو میں بہ طورِ عموم مع واوِ معدولہ مستعمل ہیں (یعنی واو شاملِ تلفظ نہیں ہوتا، صرف شاملِ کتابت رہتا ہے) اِس لیے ایسے لفظوں میں واو کے نیچے علامتِ معدولہ ضروری نہیں سمجھی گئی ہے، البتہ ضروری مقامات پر ایسے لفظوں پر حاشیہ لکھ دیا گیا ہے، جہاں صراحت کر دی گئی ہے کہ واو معدولہ ہے یا مجہول۔

دوآتشہ (۵۵) : کے میں مع واوِ معدولہ ہے، مگر م میں "دوٗآتشہ" (یعنی مع واوِ مجہول) ہے۔ کے کی مطابقت اختیار کی گئی ہے [تلفظ: دُ آتشہ]۔ [بقیہ صفحے کے آخر میں]

دُوازدہ (۲۴۹) : کے میں اِس لفظ پر اعراب موجود نہیں؛ البتہ فنے میں "دُوازدہ" ہے اور اُس کی فرہنگ میں بھی اِسے بہ ضمِ اوّل لکھا گیا ہے۔ برہانِ قاطع میں یہ لفظ مستقل لُغت کی حیثیت سے موجود نہیں تھا، اُس کے ایرانی مرتب ڈاکٹر معین نے حاشیے پر اِس کا اضافہ کیا ہے (جلدِ دوم، ص ۸۰۹) اور اِسے "بہ فتحِ اوّل و دوم و پنجم" لکھا ہے [یعنی: "دَوَازدَہ"۔ اِسی طرح "دَوَازدَہُم" لکھا ہے]۔ آصفیہ میں تو یہ موجود نہیں، مگر نور میں اِسے بہ ضمِ اوّل لکھا گیا ہے اور پلیٹس کے لغت میں بھی بہ ضمِ اوّل ہے۔ فنے کی مطابقت اختیار کی گئی ہے۔

دوبارہ (ص ۵۴) : یہ لفظ ص ۱۱۱ پر بھی آیا ہے۔ دونوں جگہ کے میں مع واوِ معدولہ ہے، مستعمل بھی اِسی طرح ہے، اِسی لیے دال پر پیش نہیں لگایا گیا۔ [تلفظ: دُبارہ]۔

دوپٹّے (۲۶) : کے اور م دونوں میں "دوٗپٹّے" (یعنی مع واوِ مجہول) ہے۔ یہ لفظ بالعموم اِس طرح سُننے میں آتا ہے کہ واو شاملِ تلفظ نہیں ہوتا۔ لفظ "دوزانو" اور "دومنزلہ" میں جو طریقہ ترجیح اختیار کیا گیا ہے، اُسی کے مطابق اِس لفظ کو بھی مع واوِ معدولہ مرجح ٹھہرایا گیا ہے، اِسی لیے واو پر پیش نہیں

لگایا گیا [تلفظ: دُپٹّے]۔ ہاں، آصفیہ میں تو کسی طرح کی صراحت موجود نہیں، مگر نور اللغات میں صراحت موجود ہے: "اردو میں واو غیر ملفوظ ہے"۔ شعرا نے بھی بہ طورِ عموم اسی طرح استعمال کیا ہے، مثلاً، داغ: یہ سیر ہے کہ دوپٹا اُڑا رہی ہے ہوا ؛ سنبھالتے ہیں جو سینہ، کمر نہیں چھپتی۔ کسی شاعر کے یہاں "دُوپٹا" بہ اظہارِ واو نہیں ملا۔

دُو پیازہ (۲۷): کے میں "ی" کے نقطے معمول کے مطابق لگے ہوئے ہیں، مطلب یہ نکلا کہ اس لفظ میں "ی" مخلوط نہیں (مخلوط "ی" کے نقطے نیچے اوپر لگے ہوتے ہیں، جیسے: دھیان)۔ ف کی فرہنگ میں بھی اسے اسی طرح (DO-PIYĀZA) لکھا گیا ہے، جس سے وضاحت کے ساتھ تعین ہو جاتا ہے۔ اسی کی مطابقت اختیار کی گئی ہے۔ وضاحت کی ضرورت یوں محسوس کی گئی کہ اس قبیل کے بعض الفاظ (مثلاً: پیار، پیالہ، پیاس وغیرہ) کی طرح "پیاز" بھی بہ یاے مخلوط اور بہ یاے مظہرہ، دونوں طرح مستعمل رہا ہے۔ آصفیہ میں تو کسی طرح کی صراحت نہیں ملتی؛ البتہ نور میں "پیاز" کو بروزنِ "حجاز" لکھا گیا ہے اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مولف نے اس لفظ کو بہ یاے مظہرہ مانا ہے، مگر اسی لفظ کے ذیل میں "پیاز کے سے پرت اُترنا" کی سند میں داغ کا یہ شعر درج کیا ہے، جس میں یہ لفظ بہ یاے مخلوط نظم ہوا ہے: "چھیل کر میرے زخمِ دل کو وہ ؛ پیاز کے سے پرت اُتارتے ہیں" اور اس طرح یہ واضح ہو جاتا ہے کہ یہ لفظ بھی دونوں طرح مستعمل رہا ہے۔ یہی صورت "دو پیازہ" کی ہے۔ انشا نے اسے مع یاے مخلوط نظم کیا ہے: چاندنی کا جو پھول تازہ ہے ؛ سو وہ اک نرگسی دو پیازہ ہے (کلامِ انشا، ص ۳۴۲)۔

دُو چار ہیں (۹۱): م اور کے دونوں میں "دُو چار" یعنی مع واوِ مجہول ہے۔ لفظ "دو" یہاں بہ طورِ عدد آیا ہے اور یوں یہاں یہ مع واوِ مجہول ہی مرجّح ہے۔ کے اور م کے مطابق اسے مع واوِ مجہول (دُو چار) لکھا گیا ہے۔ دال پر پیش اسی لیے لگایا گیا ہے کہ یہ واضح ہو جائے کہ واو مجہول ہے۔

دو چند: یہ لفظ ص ۳۵، ۲۰۵، ۲۴۰ پر آیا ہے اور کے میں ہر جگہ مع واوِ معدولہ ہے، مستعمل بھی اسی طرح ہے، اسی لیے دال پر پیش نہیں لگایا گیا [تلفظ: دُچند]۔

دو دستی (۲۰۶): کے میں مع واوِ معدولہ ہے [تلفظ: دُدستی]۔

دُو دِلا (۵۹): اس مرکب کے املا اور تلفظ کے سلسلے میں دو صراحتیں ضروری ہیں: (۱) م میں "دو دلہ" ہے یعنی آخر میں ہاے مختفی ہے؛ اس کے برعکس کے، ف، ع، ن میں "دو دلا" ہے۔ یہ فارسی مرکب ہے

اور فارسی میں "دو دلہ" ہے [برہانِ قاطع، بہارِ عجم، غیاث اللغات]۔ میر امّن کی تحریر میں ایسے کئی لفظوں کے آخر میں (ہائے مختفی کی جگہ) الف ملتا ہے، گویا ایسے لفظوں کو مہنّد فرض کرکے مع الف لکھا گیا ہے۔ اِس مفروضے میں اِس قیاس کو بھی شاید دخل رہا ہو کہ ایسے کئی لفظ اُردو نژاد ہیں، مثلاً: بُز دلا، تھُڑ دلا۔ قیاس نے "دو دلا" کو بھی اِسی دائرے میں شامل کرلیا ۔ کے کے املا کی مطابقت اختیار کی گئی ہے اور الف کو برقرار رکھا گیا ہے۔ (۲) یہ مرکّب تین جگہ آیا ہے: دو دلے (ص ۴۷) دو دلا (ص ۵۹) دو دلی (ص ۸۵)۔ م میں "دوْ دلہ" (مع واوِ مجہول) ہے، مگر کے میں "دو دلا" مع واوِ معدولہ ہے۔ "دو دلے" کے میں مع واوِ مجہول (دوْ دلے) ہے۔ م میں یہاں واو پر کوئی نشان موجود نہیں۔ "دو دلی" کے میں مع واوِ معدولہ (دو دلی) ہے۔ یہ پریشان کن صورتِ حال ہے ۔ لفظِ "دو" کے، اکثر مرکّبات فارسی اور اُردو دونوں میں اِس طرح مستعمل رہے ہیں، [اور ہیں] کہ واو کتابت میں تو آتا ہے، مگر شاملِ تلفظ نہیں ہوتا، جیسے: دوبارہ، دوچار، دو دستی، دو رنگی، دو روزہ، دو سر، دو عالم، دوگانہ، دو نیم (وغیرہ) [فارسی کی اسناد بہارِ عجم میں منقول ہیں] مثلاً صائب کا یہ شعر: دو دل شوم چو بہ نقشِ مرا نگاہ افتد ؛ چو رہروے کہ رہش بر سرِ دوراہ افتد۔ یا جیسے یہ شعر (غالباً مولانا شبلی کا ہے): دو دل بودن دریں رہ سخت تر عیبے است سالک را ؛ خجل ہستم ز کفرِ خود کہ دارد بوے ایمان ہم؛ مگر یہ بھی واقعہ ہے کہ "دو دلا"، "دو دلی" اور "دو دلے" یہ تینوں مرکّب ایسے ہیں کہ قاعدے کے لحاظ سے جو بھی صورت ہو، اُردو میں "دُ دِلا، دُ دِلی، دُ دِلے" کہنا ذرا عجیب سا ضرور معلوم ہوگا۔ نور میں "دُو دِلی" کی سند میں منیر کا یہ شعر مندرج ہے: متحد ہوتے سے بھی ہم کو تردّد رہتا ؛ دو دلی ہوتی، اگر ہم سے ترا دل ملتا ۔ اِس شعر میں "دُو دِلی" بہ اظہارِ واو آیا ہے اور اِسی طرح اچھا معلوم ہوتا ہے اور اِس سے تائید ہوتی ہے اِس قیاس کی کہ یہ تینوں خاص مرکّب اُردو میں بہ اظہارِ واو بہتر یا یوں کہیے کہ مرجّح حیثیت رکھتے ہیں۔ م میں جو "دوْ دلہ" ہے، وہ بھی اِسی کی تائید کرتا ہے۔ "دو دلے" تو کے میں مع واوِ مجہول ہی ہے، اِس لیے اُس کے تعیّن میں تو کچھ مشکل نہیں، یوں اُسے "دُو دِلے" لکھا گیا ہے۔ دال پر پیش اِسی لیے لگایا گیا ہے کہ یہ معلوم ہوجائے کہ یہاں واوِ مجہول ہے ۔ "دو دلا" م میں مع واوِ مجہول ہے اور کے کے "دُو دلے" پر اگر قیاس کیا جائے تو یہ بھی مع واوِ مجہول مرجّح ٹھہرے گا؛ اِسی بنا پر اسے بھی "دُو دِلا" لکھا گیا ہے اور

اِنھی دونوں لفظوں کی نسبت سے ص ۸۵ پر "دُو دِلی" کو (مع واوِ مجہول) لکھا گیا ہے [تائیدِ مزید کے لیے مُنیر کی سند بھی موجود ہے]۔

دو رستہ: ص ۳۶۸، ح (۲) [تلفظ: دُرَستہ]

دو رُویہ: یہ مرکّب تین جگہ آیا ہے: ص ۸۶، ۲۲۴، ۲۴۳۔ ک میں تینوں جگہ "دو رُویہ" ہے، یعنی پہلا واو شاملِ تلفظ نہیں، اور دوسرا واو مجہول ہے۔ اِسی کی مطابقت اختیار کی گئی ہے۔ ف کی فرہنگ میں "رُدیہ" کو مع واوِ معروف لکھا گیا ہے اور ع میں بھی اِس واو پر علامتِ معروف موجود ہے [بہ لحاظِ اصل "رُدیہ" مع واوِ معروف ہی ہے] مگر میں نے ک کی مطابقت کو ترجیح دی ہے۔ اِسی لیے "رویہ" میں رے پر پیش لگایا ہے تاکہ واضح ہو جائے کہ یہ واو مجہول ہے، اور "دو" کی دال پر پیش نہیں لگایا ہے، تاکہ واضح رہے کہ یہ واو مجہول نہیں۔

دو زانو (ص ۲۰): ک میں یہاں "دُوزانُو" ہے، یعنی پہلا واو مجہول ہے اور آخری واو معروف ہے۔ م میں بھی اِسی طرح ہے۔ یہ مرکّب ص ۸۵، ۱۰۰ اور ۱۸۴ پر بھی آیا ہے اور اُن تینوں مقامات پر ک میں "دوزانُو" ہے، یعنی پہلا واو معدولہ ہے۔ یہی مؤخّر صورت مرجّح ہے اور اِسی بنا پر اُن سب مقامات پر "دوزانو" لکھا گیا ہے، یعنی آخری واو پر علامتِ معروف لگائی گئی ہے اور "دو" کی دال پر پیش نہیں لگایا گیا، تاکہ یہ معلوم ہو کہ اس میں واو مجہول نہیں۔ [تلفظ: دُزانُو]

دوسار (ص ۲۰۵): ک میں یہ لفظ مع واوِ معدولہ ہے، اِسی لیے دال پر پیش نہیں لگایا گیا۔ [تلفظ: دُسار]

دوگانہ: ص ۳۲۰، ح (۱۴) [تلفظ: دُگانہ]۔

دونوں (ص ۱۱): م، ت: دونو۔ ک میں بھی اِس مقام پر یہ لفظ آخری نون کے بغیر (دونو) ہے، مگر اِس ایک مقام کے علاوہ، باقی ہر جگہ یہ لفظ مع نونِ آخر (دونوں) ملتا ہے، مثلاً: ص ۲۰، ۳۰، ۳۵، ۳۷، ۴۲، ۱۱۶، ۱۱۷، ۱۱۸، ۱۲۲، ۱۸۵، ۲۴۷۔ ف میں اِس مقام پر بھی "دونوں" ہے اور دوسرے سبھی مقامات پر بھی یہی املا ملتا ہے۔ یہی صورت ع کی ہے کہ اُس میں بھی ہر جگہ "دونوں" ملتا ہے۔ میر امن نے مخطوطۂ گنجِ خوبی میں ہر جگہ "دونو" لکھا ہے۔ مثلاً ص ۹، ۱۱، ۱۶، ۲۲، ۲۵۔ لیکن ایسے دوسرے اعدادِ استغراقی کو مع نونِ آخر ہی لکھا ہے، مثلاً: تینوں، پانچوں۔ اِس سے معلوم ہوا کہ اعدادِ استغراقی کو روشِ عام اور قاعدے کے مطابق مع نونِ آخر ہی لکھتے تھے۔ اِس سلسلے میں یہ بات

پیشِ نظر رہنا چاہیے کہ نونِ غنہ کا استعمال مختلف صورتوں میں بڑی حد تک غیر متعین تھا اُس زمانے میں۔ خود میر امّن نے مخطوطۂ گنجِ خوبی میں "یں نے" بھی لکھا ہے اور "نیٹھنے" (صرف ایک نون کے ساتھ) بھی لکھا ہے۔ چوں کہ اِس لفظ کا صحیح املا "میں نے" ہے، اِس لیے ہم نے اِس کتاب میں اوّل الذکر صورت "میں نے" ہی کو مرجح سمجھا ہے اور ہر جگہ "میں نے" لکھا ہے اور اِس طرح کے سے کے املا کو ترجیح دی ہے: اُسی طرح یہاں بھی "دونوں" کو مرجح سمجھا گیا ہے۔

دوہتّڑ (۱۲۰): کے میں یہاں "دوہتڑ" مع واوِ مجہول ہے۔ یہ لفظ ص ۱۸۶ پر بھی آیا ہے اور وہاں کے میں یہ لفظ مع واوِ معدولہ ہے۔ چوں کہ ایسے تقریباً سب لفظوں کو بہ طورِ عموم کے میں مع واوِ معدولہ لکھا گیا ہے، اِس لیے اِس لفظ کو بھی دونوں جگہ مع واوِ معدولہ مرجح قرار دیا گیا ہے اور اِسی لیے دال پر پیش نہیں لگایا گیا [تلفظ: دَہتّڑ۔ مستعمل بھی اِسی طرح ہے]۔

دوہری (۲۴۰): کے میں یہ لفظ مع واوِ مجہول ہے (یعنی واو شاملِ تلفظ ہے)۔ اِسی کی مطابقت اختیار کی گئی ہے۔

دَھرا ہَر [بہ فتحِ اوّل۔ مؤنث]: ص ۲۵۱، ح ⑦۔

دھکیلا: ص ۳۴۵، ح ⑩۔

دِہلَوی (۵): لفظِ "خسرو" کے ذیل میں یہ لکھا جا چکا ہے کہ کے اور ف میں لام پر زبر موجود ہے یہاں اِس لفظ کے سلسلے میں صرف یہ وضاحت کرنا ہے کہ سننے میں جب یہ لفظ آتا ہے تو کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے لام ساکن ہو، مگر ایسا ہے نہیں، یہ محض لہجے کا ایک انداز ہے۔ بہ لحاظِ اصل لام مفتوح ہے اور کے میں جو لام پر زبر ہے، وہ بالکل درست ہے؛ اِسی بنا پر لام پر زبر لگایا گیا ہے۔

دھیان (۱۵): م اور کے میں "دھیان" ہے، یعنی اِس لفظ کو مع یائے مخلوط لکھا گیا ہے۔ یہ لفظ ہر جگہ اِسی طرح ملتا ہے، مثلاً ص ۷۰ تک یہ لفظ تین جگہ آیا ہے: ص ۱۵، ۱۹، ۶۷؛ اور اِن تینوں مقامات پر "دھیان" ہے؛ اِسی کی مطابقت اختیار کی گئی ہے۔ صراحت کی ضرورت خاص کر یوں محسوس کی گئی کہ (ایسے بعض اور الفاظ، مثلاً: پیاز، پیالہ، پیاس کی طرح) یہ لفظ بھی مع یائے مخلوط اور مع یائے مظہرہ، دونوں طرح استعمال میں رہا ہے (اوّل الذکر بیشتر تر)۔ بہ اظہارِ حق کی صرف ایک مثال پر اکتفا کرتا ہوں: دکھاتے آئنہ ہو اور مجھ میں جان نہیں ٭ کہو گے پھر بھی کہ میں تجھ سا بدگمان نہیں ٭ نہ کیوں نثار ہو جان فرطِ کینِ جاناں پر ٭ کہ اُس کو میرے سوا اور کا دِھیان نہیں (مومن)

دد تگی (مع تشدید) : ص ۳۷۰، ح (۲)۔

ڈبیا (۲۸) : سب نسخوں میں یہی املا ہے یعنی آخر میں الف ہے (صحیح املا بھی یہی ہے)۔ یہ وضاحت یوں کی گئی کہ کچھ لوگ اِس کو "ڈبیہ" بھی لکھنے لگے ہیں، جیسا کہ اسی ضمیمے میں ایسے متعدد الفاظ کے سلسلے میں لکھا گیا ہے کہ جو ایسے غیر فارسی عربی الفاظ کے آخر میں اکثر الف لکھا گیا ہے، یہ لفظ بھی اسی فہرست میں شامل ہے۔

ڈھارس (ڈھاڑس) : ص ۳۸۵، ح (۹)۔

ڈھنڈورا (ص ۱۵) : م، ک اور ف میں اِس لفظ پر اعراب موجود نہیں۔ ف کی فرہنگ میں یہ لفظ شامل نہیں۔ آصفیہ اور نور میں اِسے بہ فتحِ اوّل لکھا گیا ہے (دلّی میں اِسی طرح سننے میں آتا ہے) اِسی کی مطابقت اختیار کی گئی ہے اور ڈھ پر زبر لگایا گیا ہے۔ یہ وضاحت یوں کی گئی کہ اثر لکھنوی مرحوم نے فرہنگِ اثر میں اِس لفظ کے ذیل میں لکھا ہے کہ لکھنؤ میں بہ کسرِ اوّل مستعمل ہے۔ لکھنؤ کے تلفظ کی بحث سے یہاں قطعِ نظر کی جاتی ہے، صرف یہ وضاحت کافی ہوگی کہ دلّی والے اِسے بہ فتحِ اوّل ہی بولتے ہیں اور آصفیہ کا اندراج اِس کی مزید توثیق کرتا ہے۔

ڈھونڈھے (ص ۱۵) : م، ک، ف میں اِسی طرح ہے (دو چشمی ھ کے ساتھ)۔ ع میں یہاں "ڈھونڈے" ہے، لیکن ص ۴۲ پر "ڈھونڈھتے، ڈھونڈھتے" ہے۔ ک میں یہ مصدر اور اِس کے مشتقات جہاں بھی آئے ہیں، دو ہائے مخلوط کے ساتھ ملتے ہیں، اور مخطوطۂ گنجِ خوبی میں بھی اِس لفظ کا یہی املا ملتا ہے، مثلاً: ڈھونڈھے ۱۶۲۔ ڈھونڈھ ۴۴، ۹۵۔ ڈھونڈھ کر ۶۵، ۳۰۹۔ اِسی کی پابندی کی گئی ہے۔

ڈھیٹھ (۴۹) : م، ک، ف، ع، سب میں اِسی طرح (یعنی دو چشمی ھ کے ساتھ) ہے، اِسی املا کو برقرار رکھا گیا ہے۔

ڈیوڑھی (۲۰۸) : ک میں "ڈیوڑھی" ہے، یعنی یہ بات واضح طور پر معلوم ہو جاتی ہے کہ اِس لفظ میں یائے مخلوط نہیں۔ اِس قبیل کے کئی لفظ اِس کتاب میں اِسی طرح آئے ہیں، مثلاً: تیوری، جیونٹا، ریوڑی [اِسی ضمیمے میں اِن لفظوں سے متعلق نوٹ دیکھے جا سکتے ہیں] اِسی املا کو برقرار رکھا گیا ہے۔ اِس لفظ کا تلفظ بروزنِ فاعلن ہوگا۔ ہاں یہ وضاحت بھی بے محل نہ ہوگی کہ فیلن اور پلیٹس کے لغات میں یہ لفظ تین طرح ملتا ہے: بہ سکونِ واو، بہ واوِ مجہول اور

بہ واوِ معروف۔ آصفیہ میں اسے "ڈیَوڑِھی" لکھا گیا ہے، یعنی ی اور واو دونوں پر جزم ہیں اور یہ تلفظ کے کے اندراج کے عین مطابق ہے۔

ذَبْح : ص ۳۷۹، ح ⑦ ۔

ذَرا (ص ۱۰) : کے، م، ن : ذرا۔ فن : ذرّہ۔ ع : زرا۔ کے میں اس لفظ کے دو املا ملتے ہیں، کہیں "ذرا"، مثلاً : "ذرا اُس کی صورت میں دیکھوں" (ص ۴۷) نیز ص ۷، ۶۰، ۷۹، ۱۳۶۔ اور کہیں "ذرہ" لکھا ہوا ہے، مثلاً : "ذرہ اِدھر متوجّہ ہو" (۱۷) نیز ص ۱۱، ۱۵، ۳۵، ۱۴۳۔ فن میں بھی املا کا ایسا ہی اختلاف ملتا ہے، مگر اس فرق کے ساتھ کہ اس میں کہیں "ذرّہ" ہے اور کہیں "ذرّا"، مثلاً : "ذرّہ کان دھر کر سنو" (ص ۹) اور "میں ذرّا دم لے لوں" (ص ۴۶)۔

اِس کتاب میں اِس لفظ کا املا ہر جگہ "ذرا" لکھا گیا ہے اور اِس ترجیح کی اصل وجہ یہ ہے کہ مخطوطۂ گنجِ خوبی میں میر امّن نے اِس لفظ کو ہر جگہ اِسی طرح [ذرا] لکھا ہے، مثلاً : ص ۱۴، ۲۶، ۴۲، ۱۲۵، ۱۴۵، ۱۸۵، ۲۱۳، ۲۳۰۔ ضمنی طور پر عرض کیا جاتا ہے کہ "ذرا" کی اصل "ذرّہ" ہی ہے اور اُس زمانے میں یہ استعمال میں آ رہا ہے، مثلاً : وزیروں نے کی عرض کا ے آفتاب : نہ ہو تجھ کو ذرّہ کبھی اضطراب (مثنوی سحر البیان)۔ "ذرا" اِسی کی بدلی ہوئی صورت ہے۔ رفتہ رفتہ "تھوڑا"، ایک آن، ایک لمحہ" جیسے معانی میں "ذرا" ہی استعمال میں رہ گیا۔ ع میں جو "زرا" ہے (اور اِس نسخے میں اِس لفظ کا یہی املا ملتا ہے) اُس کی وجہ یہ ہے کہ اساتذۂ متاخرین میں سے بعض نے "زرا" (مع زائے ہوّز) کو مرجّح بتایا تھا، اِس دلیل کے ساتھ کہ یہ "ذرّہ" کی مُہنّد صورت ہے؛ اِس لیے اِس میں (اُردو کے قاعدے کے مطابق) زے لکھنا چاہیے۔ ڈاکٹر عبدالسّتار صدیقی مرحوم بھی "زرا" کو مرجّح قرار دیتے تھے اور اُنھی کی تقلید میں مولوی عبدالحق مرحوم بھی اِسی املا کو مرجّح سمجھتے تھے [اِس کی مفصّل بحث راقم الحروف کی کتاب اُردو املا میں دیکھی جا سکتی ہے] مگر اِس مسلک کے ماننے والے کم تھے اور کم ہیں، اب بھی بیش تر "ذرا" لکھا جاتا ہے۔

ذُوالفِقار (ص ۲۳۹) : کے میں ق کے نیچے زیر کا نشان سا معلوم ہوتا ہے، واضح طور پر زیر نظر نہیں آتا، مگر گمانِ غالب یہی ہے کہ یہ زیر ہے۔ فن میں واضح طور پر ق کے نیچے زیر لگا ہوا ہے اور اُس کی فرہنگ میں بھی اسے رومن رسمِ خط میں ق کے زیر کے ساتھ لکھا گیا ہے اور اِس طرح اُس گمان کی تائید کا پہلو بھی نکل آتا ہے۔ اصلاً "ذوالفقار" ق کے زیر کے ساتھ ہے۔

نور و آصفیہ میں تو حرکات کی وضاحت نہیں کی گئی ہے، مگر غیاث اللغات میں لکھا گیا ہے کہ: "بہ فتح صحیح است نہ بہ کسرِ فا"۔ ہاں نور و آصفیہ میں یہ صراحت ضرور کی گئی ہے کہ اِس لفظ کا دوسرا جز "فقار" بہ فتحِ فا ہے۔ اِس میں ذرا بھی شک نہیں کہ اصلاً "ذُوالفَقار" ہے، مگر یہ بات بھی ہے کہ بہت سے لوگوں کی زبان سے "ذُوالفِقار" (فے کے زیر کے ساتھ) بھی سُنا گیا ہے۔ مہذب اللغات میں مہذب لکھنوی نے اِسے "ذوالفَقار" لکھا ہے، یعنی فے پر زبر بھی لگایا ہے اور اُس کے نیچے زیر بھی لگایا ہے اور اِس سے مرتب کی مراد یہی ہے کہ یہ لفظ دونوں طرح مستعمل ہے۔ فرہنگ آصفیہ کے مطابق اُسے "ذُوالفِقار" لکھا گیا ہے۔ یہ دل چسپ بات ہے کہ اِس لفظ کے تلفظ ہی کے سلسلے میں نہیں، معنوی نسبت میں بھی غلط العام نے دخل پا لیا ہے۔ بہت سے لوگوں کا یہ خیال ہے کہ اِس تلوار کی دو زبانیں تھیں اور اِسی نسبت سے اِسے "ذوالفقار" یعنی دو زبانوں والی کہا گیا ہے۔ شعرا نے بھی اِس نسبت کے ساتھ اِسے استعمال کیا ہے، مرثیوں میں خاص طور پر۔ ایک مثال: دبیر کا وہ مشہور مرثیہ جس کے پہلے بند کا پہلا مصرع یہ ہے: "سیدالشہدا جب مہر کی مقراض جب ہوئی"، اِس کے ایک بند کے آخری تین مصرعے یہ ہیں:

چلاّئی درسے خیمے کے بنتِ شہِ نجف : آلِ نبی کا کوئی گشتہ نہ چھوڑیو : ہاں ذوالفقار! شمر کو زندہ نہ چھوڑیو۔

اِس کے بعد کے بند کا پہلا شعر ہے: یہ سُن کے دو زبانیں نکالے ہوئے چلی : سانچے میں اپنے فتح کو ڈھالے ہوئے چلی۔ ناصر علی سرہندی کا شعر ہے: از زبانِ شکوۂ ما شکرمی ریزد علی! : گفتگوی ما دوسر دارد بہ رنگ ذوالفقار۔ حالاں کہ اربابِ لغت نے یہ صراحت کر دی ہے کہ یہ دو زبانوں والی بات قطعاً درست نہیں۔ غیاث اللغات میں ضروری تفصیل موجود ہے، اُس میں قاموس کی عبارت بھی نقل کی گئی ہے اور آخر میں لکھا گیا ہے: "وانچہ در این زمانہ نقل ذوالفقار شمشیر دو زبانہ سازند، تخیلات بر غلطِ بعضے متاخرین است"۔

آصفیہ و نور میں بھی یہ صراحت موجود ہے: "یہ تلوار جنگِ بدر میں رسولِ مقبولؐ کے ہاتھ آئی، آپ نے حضرت علی کو عطا فرمائی۔ بعض لوگوں نے غلطی سے سمجھ رکھا ہے کہ اِس تلوار کی دو زبانیں تھیں۔ فارسی شعرا نے اِسی خیال سے ذوالفقار کو "شمشیر دوسر" لکھا ہے" (نور اللغات)۔

اِس سلسلے میں مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: دائرہ معارفِ اسلامیہ، جلد دہم، طبع لاہور، ص ۴۲۷۔

راجا (۲۶۳۷) : م، ن، ک، فے، ع : سب نسخوں میں یہ لفظ اسی طرح (مع الف) ہے۔ اِس وضاحت کی ضرورت یوں محسوس ہوئی کہ فارسی کے اندازِ نگارش کے اثر سے اُردو میں بھی ایسے بہت سے لفظوں کے آخر میں ہاے مختفی لکھی جانے لگی جن کے آخر میں اصولاً الف لکھنا چاہیے تھا۔ یہ لفظ اسی فہرست میں شامل ہے کہ اِس کو بھی فارسی میں "راجہ" لکھا جاتا تھا؛ اور اُردو میں بھی بہت سے لوگ اِسی طرح لکھنے لگے۔ کے میں ایسے لفظوں کے آخر میں عموماً الف ملتا ہے، مثلاً : بھروسا، تارا، میا، بتاشا، ڈبیا، بُلبلا، سنّدیسا۔

یہ وضاحت بھی مناسب معلوم ہوتی ہے کہ خود میر امّن نے مخطوطۂ گنجِ خوبی میں ایسے اکثر لفظوں کے آخر میں الف لکھا ہے، مثلاً : گھونسلا، نالا، دلاسا، بھروسا، کٹورا، روپیا، پنجرا، پٹکا، پتا، پتّا۔ اِنھی وجوہ سے کے کی مطابقت اختیار کی گئی ہے اور اِسی املا کو برقرار رکھا گیا ہے۔

رِجا (۱۶۱ن) : کے اور فے میں رے کے نیچے زیر لگا ہوا ہے۔ کے میں ص ۲۲۴ پر بھی یہ لفظ آیا ہے اور وہاں بھی (دونوں نسخوں میں) رے کے نیچے زیر موجود ہے۔ اصل کے لحاظ سے رے پر زبر ہے۔ مولفِ غیاث اللغات نے لکھا ہے : "..... و بہ کسرِ اوّل چنان کہ مشہور شدہ خطاست"۔ اِس قول میں "مشہور شدہ" قابلِ توجّہ ہے اور اِس کا صاف طور پر مطلب یہ ہے کہ یہ لفظ جو اصلاً بہ فتحِ اوّل (رَجا) ہے، بہ کسرِ اوّل (رِجا) بھی مستعمل تھا۔ مولفِ نور اللغات نے لکھا ہے : "عربی میں "رجاء" بہ فتحِ اوّل تھا۔ فارسیوں نے بغیر ہمزہ استعمال کیا اور بہ کسرِ اوّل بھی جائز کر لیا ہے"۔ فارسی لغات میں مجھے کسرے کا جواز تو نہیں ملا، مگر اِس تحریر سے بھی یہ بات ضرور معلوم ہوتی ہے کہ یہ لفظ بہ کسرِ اوّل مستعمل ضرور رہا ہے اور کے اور فے میں رے کے نیچے جو زیر ہے، وہ بے اصل نہیں۔ کے اور فے کی مطابقت اختیار کی گئی ہے۔

رَحَم (۱۱۹ن) : کے اور فے میں اِس لفظ پر اعراب موجود نہیں، البتہ فے کی فرہنگ میں اِسے بہ فتحِ اوّل و سکونِ دوم (رَحْم) لکھا گیا ہے۔ نور میں بھی (اِس معنی میں) اِسے بہ فتحِ اوّل و سکونِ دوم ہی لکھا گیا ہے اور مثال میں جان صاحب کا یہ شعر لکھا ہے (جس میں یہ بہ سکونِ دوم نظم ہوا ہے) :
دائی کر سیا! رحم کروں بے نیاز کا : رہ جائے پیٹ مجھ کو جو صدقہ رحیم کا۔ مگر آصفیہ میں اِس معنی میں "رَحَم" (بہ فتحِ اوّل و دوم) لکھا گیا ہے (تُلنا بھی اِسی طرح گیا ہے)۔ میں نے آصفیہ کے اندراج کو ترجیح دی ہے اور اُسی کے مطابق اِسے بہ فتحِ اوّل و دوم لکھا ہے۔

رَضا (۲۶۱) : م اور کے میں اِس لفظ پر اعراب موجود نہیں ۔ فے میں "رِضا" ہے، مگر اُس کی فرہنگ میں اِسے "رَضا" اور "رِضا" دونوں طرح لکھا گیا ہے۔ صاحبِ غیاث اللغات نے لکھا ہے کہ بہ کسرِ اوّل (رِضا) کے معنی ہیں: خوشنودی اور بہ فتحِ اوّل (رَضا) کے معنی ہیں: خوشنود شدن۔ یہی بات صاحبِ نور اللغات نے لکھی ہے، مگر اُنھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ "فارسیوں نے بہ معنیِ اجازت بھی استعمال کیا۔" گویا اجازت کے معنوں میں یہ لفظ مفرس ہے۔ آصفیہ میں "رَضا" ہے، یعنی جملہ معانی میں اِسے دونوں طرح صحیح بتایا گیا ہے۔ فیلن نے اپنے لغت میں اِسے صرف بہ فتحِ اوّل (رَضا) لکھا ہے۔ اِسی طرح "رَضامندی" کو بھی بہ فتحِ اوّل لکھا ہے اور یہ واقعہ ہے کہ اُردو میں عام لوگوں کی زبان پر "رَضا" اور "رَضامندی" دونوں لفظ بہ فتحِ اوّل ہیں؛ اِسی لیے رے پر زبر لگایا گیا ہے۔

رِفاقت (۲۶۲) : م، کے، فے، تینوں نسخوں میں رے کے نیچے زیر لگا ہوا ہے۔ یہ لفظ ص ۲۴۹ پر بھی آیا ہے اور وہاں بھی کے اور فے میں "رِفاقت" ہے۔ اِسی کی مطابقت اختیار کی گئی ہے۔ اصل کے لحاظ سے یہ لفظ بہ فتحِ اوّل (رَفاقت) ہے۔ آصفیہ میں بھی اِسی طرح لکھا ہوا ہے یعنی رے کے اوپر زبر لگا ہوا ہے۔ نور اللغات میں تو یہ صراحت بھی کر دی گئی ہے کہ: "بہ کسرِ اوّل غلط ہے۔" لیکن حقیقتِ حال یہ ہے کہ عام بول چال میں یہ لفظ بہ کسرِ اوّل سُننے میں آتا ہے۔ اِس کا احوال "حماقت" جیسا ہے (جس پر اِس ضمیمے میں بحث کی جا چکی ہے) جو اصلاً بہ فتحِ اوّل ہے، لیکن استعمالِ عام میں بہ کسرِ اوّل ہے اور کے میں ح کے نیچے زیر لگا ہوا ہے۔ اثر لکھنوی مرحوم نے فرہنگِ اثر میں نور اللغات کے اِس اندراج پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے: "رِفاقت.... اُردو میں بہ کسرِ اوّل غلط ہوتے ہوئے صحیح ہے، کیوں کہ اُردو میں اِسی طرح رائج ہے ... ایسے الفاظ کی ایک معقول تعداد ہے ... شاعروں، بلکہ شاعری کو چھوڑ کر، یہ اصول یاد رکھنا چاہیے کہ جو لفظ اُردو کے خواص میں جس طرح رائج ہو، اُسی طرح فصیح اور صحیح ہے، اصل زبان میں جو کچھ ہو۔ رِفاقت بھی اُردو میں بہ کسرِ اوّل ہے، پھر اُسے کیوں غلط ٹھہرایا جائے۔" میر امّن کے یہاں یہ رجحان بہت شدّت کے ساتھ کارفرما تھا کہ تلفظ میں چلن کی پابندی کی جائے اور م اور کے میں "حِماقت" کی ح کے نیچے اور "رِفاقت" کی رے کے نیچے جو زیر ہے، وہ اِسی کی نمایندگی کرتا ہے۔ اِسی کی پابندی کی گئی ہے ـــ کے میں ص ۵۹ پر بھی یہ لفظ آیا ہے، اور وہاں بھی رے کے نیچے زیر لگا ہوا ہے۔

رَفع کرنا (۲۶۳) : کے اور فے میں اِس لفظ پر اعراب موجود نہیں، البتہ فے کی فرہنگ میں "رَفع"

ہے۔ اصل لفظ "رَفع" ہے اور جب یہ لفظ فارسی ترکیب کے ساتھ آتا ہے تو اسی طرح پڑھنے میں آتا ہے، جیسے: رَفعِ شر۔ مگر جب یہ لفظ مفرد صورت میں آتا ہے تو بول چال کی حد تک بہ فتحِ دوم زبان سے ادا ہوتا ہے، اور یہی صورت "رَفَع دَفَع" کی ہے کہ یہاں بھی دونوں لفظوں میں ف مفتوح رہتا ہے۔ نور میں یہ وضاحت موجود ہے کہ "رفع دفع کرنا اور رفع دفع ہونا میں رفع دفع بہ فتحِ اوّل و دوم ہی بول چال میں ہے" اور یہ بالکل درست ہے۔ مؤلفِ نور نے یہ شعر بھی سند میں لکھا ہے: بس آؤ عید کا دن آج ہے، گلے مل لو کہ کل کی رات کے جھگڑے رفع دفع ہو جائیں (ضیا)۔ "رفع کرنا" اور "رفع ہونا" میں گفتگو میں، وہ خواص کی ہو یا عوام کی، ف مفتوح رہتا ہے۔ یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ آصفیہ میں "رَفَع" ہے، یعنی ف پر زبر ہے اور یہ اردو میں استعمالِ عام کے عین مطابق ہے۔ مؤلف نے کسی طرح کی صراحت نہیں کی، یہ کمی ہے۔ یہ بات واضح کرنا چاہیے تھی کہ اصلاً "رَفع" ہے، ترکیبِ فارسی کی صورت میں بھی "رَفع" رہتا ہے، مگر ویسے اردو والے "رَفَع" بولتے ہیں، خواہ وہ "رَفَع دَفَع" میں آئے یا "رَفَع کرنا" اور "رَفَع ہونا" میں شامل ہو۔ میراَمن کا جو عام انداز ایسے الفاظ کے متعلق ہے، اس پر بھی اگر نظر رکھی جائے تب بھی یہاں "رَفَع" کہنا انسب ہوگا۔ اور ہاں، فیلن کے لغت میں "رَفَع کرنا" ہے، یعنی ف مفتوح ہے۔ چوں کہ اس لفظ میں دوسرے حرف کے مفتوح ہونے کے متعلق واضح طور پر صراحتیں موجود ہیں، اس بنا پر ف پر زبر لگایا گیا ہے۔

رُقعہ (۱۸) : بہ لحاظِ اصل یہ لفظ بہ فتحِ اوّل و سکونِ دوم و فتحِ سوم (رُقْعَہ، بروزنِ فعلن) ہے۔ اردو میں عام طور پر یہ لفظ اس طرح تلفظ میں آتا ہے کہ قاف مشدد ہو جاتا ہے اور عین ساکن (رُقّعہ، بروزنِ شُقّہ)۔ آصفیہ میں تو اس کو اصل کے مطابق ہی لکھا گیا ہے (رُقْعَہ)، مگر نور میں صراحت موجود ہے۔ مؤلف نے اصل حرکات درج کرنے کے بعد لکھا ہے: "بول چال میں بہ فتحِ تشدیدِ دوم و حذفِ عین یعنی رُقّہ ہے"۔ یعنی تلفظ کی حد تک اس لفظ کی وہی صورت ہے جو "قلعہ" کی ہے۔ جس طرح اصل لفظ "قَلْعَہ" (بروزنِ فعلن) ہے، جو تلفظ میں "قلع" یا "قِلّع" (بروزنِ فعل) ہو جاتا ہے، اسی طرح "رُقْعَہ"، "رُقّہ" بن جاتا ہے۔ البتہ املا دونوں صورتوں میں ایک سا رہتا ہے۔ "رقعہ" کا املا تو نہیں بدلے گا [جیسے "قلعہ" کا نہیں بدلے گا] مگر تلفظ میں قاف مشدد ہو جائے گا، یعنی "رُقّہ" زبان پر آئے گا۔

رِکاب (۶ف): م، ن، ک، ف میں رے کے نیچے زیر لگا ہوا ہے۔ آصفیہ اور نور میں بھی "رِکاب" ہے۔ اثر لکھنوی نے فرہنگِ اثر میں نور کے اندراج پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ زبانوں پر بہ فتحِ اوّل ہے اور یہ صحیح ہے۔ عام طور پر اب "رَکاب" سُننے میں آتا ہے اور اِس زمانے کے لحاظ سے فصیح تلفظ یہی ہے؛ مگر میں نے ک، م اور ف کی مطابقت اختیار کی ہے، اِس خیال سے کہ اُس زمانے میں "رِکاب" زیادہ مستعمل ہوگا [بہ لحاظِ اصل بھی رے مکسور ہے]۔

رکھا۔ رکّھا: دیکھیے اِسی ضمیمے میں "لکھا، لکّھا"۔

رَمَضان (۹۴ف): ک اور ف میں اِس لفظ پر حرکات موجود نہیں، البتہ ف کی فرہنگ میں "رَمْضان" (بہ سکونِ دوم) ہے۔ اصل کے لحاظ سے "رَمَضان" ہے۔ آصفیہ و نور میں بھی اِسی طرح مندرج ہے، فارسی اور اُردو شعرا نے بھی اِسی طرح نظم کیا ہے؛ مگر استعمالِ عام میں "رَمْضان" (بہ سکونِ دوم) ہے۔ نور میں اِس کی صراحت اِس طرح کی گئی ہے: "عوام بہ سکونِ دوم و اظہارِ نون بولتے ہیں، لیکن اِس کے مرکّبات یعنی "رمضانی" اور "رمضان خان" فصحا کی زبان پر بھی بسکونِ دوم ہیں"۔ حقیقت یہ ہے کہ "رَمْضانی" اور "رَمْضان خان" کی طرح مفرد لفظ "رمضان" کو بھی عام طور پر بہ سکونِ دوم ہی استعمال کیا جاتا ہے اور "عوام" کی نہیں، عام لوگوں کی زبان سے یہ لفظ اِسی طرح سُننے میں آتا ہے۔ فیلن نے اپنے لغت میں "رَمْضان" لکھ کر وضاحت کی ہے کہ مقبولِ عام تلفظ "رَمْضان" ہے اور صحیح صورتِ حال یہی ہے۔ ف کی فرہنگ کے مطابق اِس لفظ کو بہ فتحِ اوّل و سکونِ دوم لکھا گیا ہے۔

رنگ بہ رنگ (۱۰۰ف): ک میں ب کے اوپر زبر لگا ہوا ہے۔ مخطوطۂ گنج خوبی میں بھی میر امّن نے اِس ب پر زبر لگایا ہے۔ مثلاً: "طرح بَطرح کے کھانے اور رنگ بَرنگ کے شربت" (ص ۱۰۰) اربابِ لغت نے بھی اِس ب کو ہر جگہ مفتوح لکھا ہے اور یہی صورت استعمالِ عام کی ہے [جیسے: کوچہ بہ کوچہ، در بہ در، گھر بہ گھر، دن بہ دن، روز بہ روز وغیرہ] اِسی بنا پر اِسے "بہ رنگ" لکھا گیا ہے، تاکہ اشتباہ کی گنجایش نہ رہے اور "رنگ برنگ" نہ پڑھا جائے۔

لے: یہی جھنکنا کوبکو گھر بہ گھر ہے ٭ پسر کو ٹھکانا نہیں کو بہ کو بہ ہے (حالی، مسدس)

کھلا یہ کھوگیں بہ سے دل: در بہ در مجھے ٭ رسوا کیا ذلیل کیا گھر بہ گھر مجھے (جان صاحب)

(دیوانِ جان صاحب، مطبع حیدری، لکھنؤ، ص ۹۰)

رِدْاج (ہ) : کے اور تے دونوں میں رے کے نیچے زیر لگا ہوا ہے؛ اسی کی پابندی کی گئی ہے — اصلاً یہ لفظ بہ فتحِ اوّل ہے (المنجد) لیکن (ایسے اور متعدد الفاظ کی طرح) اُردو میں یہ بیش تر بکسرِ اوّل مستعمل رہا ہے۔ مولفِ فرہنگِ آصفیہ نے اس کی وضاحت بھی کر دی ہے : "رِواج ...... یہ لفظ عربی میں بہ فتحِ رائے مہملہ ہے، مگر اُردو اور فارسی زبان میں بالکسر مروّج ہے"۔ صاحبِ غیاث اللغات نے لکھا ہے : " رواج، بہ فتح، مصدر است ..... و بکسر چنانکہ مشہور شدہ، تصرفِ فارسیان است"۔
مزید تفصیل کے لیے دیکھیے اسی ضمیمے میں لفظ "خراج"۔

رُوپلے (رُوپ لے) : یہ لفظ ص ۷۸، ۷۹ اور ۸۳ پر آیا ہے، ہر جگہ کسے میں اس کو مع واوِ معروف و یائے مجہول لکھا گیا ہے۔ (صحیح اور مستعمل صورت بھی یہی ہے) اسی کی مطابقت اختیار کی گئی ہے۔ ["رُوپلے" محرف صورت ہے، اس کی قائم صورت ہے "رُوپا"۔ چاندی کو کہتے ہیں۔ سونے رُوپلے کے : یعنی سونے چاندی کے]۔

روپیہ، رُوپیا : کسے میں اس لفظ کے املا اور تلفظ دونوں میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ املا کا اختلاف تو یہ ہے کہ کہیں اسے مع ہائے مختفی (روپیہ) لکھا گیا ہے اور کہیں آخر میں الف لکھا گیا ہے۔ مخطوطۂ گنجِ خوبی میں میر امّن نے اس لفظ کو عموماً "روپیا" (مع الف) لکھا ہے۔
اس لفظ کے املا میں یہ اختلاف شروع ہی سے پایا جاتا ہے۔ غالباً سب سے پہلے خانِ آرزو نے اپنے لغت نوادر الالفاظ میں اس کی نشان دہی کی تھی، لفظِ "چلّا" کے ذیل میں لکھا ہے : "چلّا ..... چلّہ خود لفظِ فارسی است، غایتش ہندیان موافقِ لہجۂ خود آن را بہ الف خوانند۔ بلکہ ہر لفظے کہ ہائے مختفی داشتہ باشد، آن را بہ الف خوانند، مثلِ چھچا۔ بداں کہ ایں قسم لفظ کہ آخرِ آں ہائے مختفی بود، فارسیان آن را بہ ہائے مختفی تلفظ کنند و ہندیان بہ الف، مثلِ بنگالہ و مالوا و ردپیا، کہ زرِ رائجِ ہندوستان است، آن ہا بنگالہ، و مالوہ و روپیہ گویند و نویسند۔ چنانچہ از کلامِ اساتذہ و محاورۂ اہلِ زبان بہ ثبوت رسید۔ پس در ہندی ایں قسم الفاظ را بہ ہائے مختفی خواندن غلط باشد؛ در فارسی بہ الف ..... " (نوادر الالفاظ، ص-۲۱)
گویا خانِ آرزو کے نزدیک اُردو میں اس کا مرجّح املا "روپیا" ہے — چوں کہ اس لفظ میں شروع ہی سے املا کا یہ اختلاف پایا جاتا ہے اور یہ دونوں شکلیں [روپیہ، روپیا] اسی اختلاف کی نمایندگی کرتی ہیں، اس بنا پر ہر جگہ کسے کی مطابقت اختیار کی گئی ہے۔ اس میں جہاں "روپیہ" ہے

وہاں "روپیہ" لکھا گیا ہے، اور جہاں "روپیا" ہے، وہاں اسی املا کو برقرار رکھا گیا ہے۔ مثلاً ص ۲۲ اور ص ۲۵ پر "روپیا" لکھا گیا ہے، کیونکہ اِن مقامات پر ک میں بھی یہی املا ہے اور مثلاً ص ۴۴، ۱۶۱ پر "روپیہ" لکھا گیا ہے، کیوں کہ وہاں ک میں بھی اسی طرح ہے۔ تلفظ کا اختلاف یہ ہے کہ ک میں کہیں تو یہ مع واوِ معدولہ ملتا ہے اور کہیں مع واوِ مجہول۔ تلفظ کا اختلاف اِس کی محرّف صورت "روپے" میں زیادہ نمایاں ہو جاتا ہے، کہ یہ تلفظ میں عموماً "رُپئے" آتا ہے۔ ک میں "رؤپے" یا "رُوپے" ملتا ہے، یعنی واوِ معدولہ ہو یا مجہول، آخری حرف ہر جگہ یائے لین ہے (تلفظ: رُپئے)۔

اِس کی دوسری صورت "روپیوں" ک میں ہر جگہ "روپیوں" ملتی ہے یعنی مع واوِ معدولہ [تلفظ: رُپیوں]۔ اِس صورتِ حال کے پیشِ نظر میں نے یہ طریقہ اختیار کیا ہے کہ روپیا، روپیہ، روپے، روپیوں؛ اِن سب میں رے پر پیش نہیں لگایا ہے اور "روپے" کو ہر جگہ پ کے زبر کے ساتھ (روپَے) لکھا ہے۔ "روپے" کا تلفظ تو عموماً اِسی طرح کیا جاتا ہے کہ رے پر پیش آتا ہے، واو شاملِ تلفظ نہیں ہوتا اور پ پر زبر آتا ہے (رُپَے) اور "روپیوں" کو بھی عموماً "رُپیوں" کہا جاتا ہے۔

رُوشن (ص ۱۵): اُردو والوں کی زبان سے اِس لفظ کو بہ ضمِّ اوّل (رُوشن) بھی سنا گیا ہے اور بہ فتحِ اوّل (رَوشن) بھی۔ فارسی میں بہ ضمِّ اوّل ہے (برہانِ قاطع)۔ عربی میں "رَوشن" بہ معنیِ روزن ہے (المنجد)۔ "رَوشن" کو "رُوشن" کی معرّب صورت کہا گیا ہے (غیاث اللغات)۔ آصفیہ میں لفظ "روشن" پر اعراب موجود نہیں، لیکن "رَوشنی" میں رے اور شین دونوں پر زبر لگا ہوا ہے۔ باغ و بہار میں اِس لفظ کے تلفظ کے سلسلے میں ایک اُلجھن سے دوچار ہونا پڑا ہے۔ ک میں ص ۱۵ اور ص ۸۲ پر "رُوشنی" ہے، یعنی اسے بہ ضمِّ اوّل لکھا گیا ہے اور ص ۱۶۳ پر "رَوشن" ملتا ہے، یعنی بہ فتحِ اوّل۔ یہی اُلجھن مخطوطۂ گنجِ خوبی میں سامنے آتی ہے۔ اِس مخطوطے میں یہ لفظ بہت سے مقامات پر آیا ہے، اور کہیں "رُوشن" لکھا ہوا ہے، کہیں "رَوشن"۔ حساب لگایا جائے تو یہ دونوں صورتیں برابر سرابر ٹھہریں گی۔ اب یا تو یہ فرض کر لیا جائے کہ خود میر امّن اِس لفظ کو دونوں طرح بولتے تھے، یا پھر یہ مان لیا جائے کہ واوِ مجہول اور واوِ لین کی علامتوں کے تعیّن میں غلط ملط ہوا ہے۔ اِس سلسلے میں یقین کے ساتھ کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا۔ چوں کہ ک میں اور

مخطوطۂ گنجِ خوبی میں اِس لفظ کے دونوں تلفظ ملتے ہیں اور یہ طے کرنا مشکل معلوم ہوتا ہے کہ کس تلفظ کو ترجیح دی جائے اور کس بنا پر؛ اِس لیے "روشن" اور "روشنی" پر اعراب نہیں لگائے گئے ہیں، پڑھنے والوں کو یہ آزادی حاصل رہے گی کہ وہ اِنھیں بہ فتحِ اوّل بھی پڑھ سکتے ہیں اور بہ ضمِ اوّل بھی؛ کیوں کہ دونوں تلفظ میرامّن کی اپنی تحریر میں اور اِس کتاب کی اشاعتِ اوّل (نسخۂ ک) میں موجود ہیں۔

رَوغن (ص۵۰) : ک اور ف دونوں میں رے مفتوح ہے۔ ک میں یہ لفظ جہاں بھی آیا ہے، ہر جگہ رے مفتوح ہے۔ اِسی لیے اِسے مع رائے مفتوح ہر جگہ لکھا گیا ہے۔ آصفیہ میں بھی رے پر زبر لگا ہوا ہے اور نور میں بھی اِسے بہ فتحِ اوّل لکھا گیا ہے۔ یہ ساری وضاحت محض اِس خیال سے کی گئی ہے کہ یہ لفظ بہ ضمِ اوّل (رُوغن) بھی سننے میں آتا ہے۔ فیلن نے اپنے لغت میں اِسے "رَوغن" (بہ فتحِ اوّل) لکھ کر، یہ بھی لکھا ہے کہ اَن پڑھ لوگ "رُوغن" کہتے ہیں۔

روہال : ص ۳۲۰، حاشیہ (۷)۔

رؤہت : ص ۳۰۰، حاشیہ (۴)۔

رَوِیّہ (ص۱۸۳) : ک میں اِس لفظ پر اعراب موجود نہیں، ف میں "رَوِیّا" ہے۔ اصلاً "رَوِیّہ" (بہ کسرِ واو) ہے، لیکن اُردو میں یہ فتحِ واو سننے میں آتا ہے۔ آصفیہ میں بھی "رَوَیّہ" ہے (واو پر زبر لگا ہوا ہے) اور نور میں بھی واو پر زبر لگا ہوا ہے: "رَوَیّہ (ع: بر وزنِ صَبِیّہ)"۔ نور کی عبارت سے بات واضح ہو جاتی ہے کہ مؤلف نے "رَوِیّہ" کو عربی مانا ہے اور بتایا ہے کہ اُردو میں تلفظ "رَوَیّہ" ہے۔ آصفیہ اور نور کے اندراج کے مطابق واو پر زبر لگایا گیا ہے۔ ہاں، ک، ف اور ع میں "رویّا" ہے۔ صحیح صورت "رویّہ" ہے اور اِسی بنا پر آخر میں ہائے مختفی لکھی گئی ہے۔

رِہائی (ص۱۴۶) : صرف یہ وضاحت کرنا ہے کہ ک اور ف میں رے کے نیچے زیر لگا ہوا ہے۔ مخطوطۂ گنجِ خوبی میں بھی جہاں یہ لفظ آیا ہے، رے کے نیچے زیر موجود ہے (مثلاً ص ۱۳، ۱۳۲)۔ آصفیہ میں بھی "رِہائی" ہے۔ فارسی میں "رَہا" بہ فتحِ اوّل ہے (غیاث اللغات، برہانِ قاطع حاشیہ) مگر اُردو میں زبانوں پر یہ بھی بہ کسرِ اوّل ہے۔ آصفیہ میں بھی رے کے نیچے زیر موجود ہے۔

ریوڑھی (ص۷) : ک میں "ریوڑی" ہے، یعنی واو پر علامتِ مجہول لگی ہوئی ہے اور ی کے نقطے معمول کے مطابق لگے ہوئے ہیں، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اِس لفظ میں یائے مخلوط نہیں۔ آصفیہ میں "ریوڑیْ" ہے، یعنی ی پر جزم لگا ہوا ہے۔ مؤلفِ لغت نے اِس لفظ کی سند میں اپنا ہی یہ شعر

لکھا ہے: اے شکر لب! تیرے تل کو دیکھ کر میں کیا کہوں ؛ آگیا بیٹھے بٹھائے ریوڑی کے پھیر میں۔

اِس طرح نہایت وضاحت کے ساتھ اِس کا تلفظ بروزنِ فاعلن متعیّن ہوتا ہے اور ریوں کے میں واؤ پر جو علامتِ مجہول ہے، اُس سے مطابقت ہو جاتی ہے۔ نور میں اِس لفظ کے تلفظ کا تعیّن اِس طرح کیا گیا ہے: "ریوڑی (ھ) بہ کسرِ اوّل و سکونِ دوم مجہول و ضمِ ہمزہ جو بشکلِ واو ہے و کسرِ چہارم" سند میں جان صاحب کا یہ شعر لکھا ہے: ریوڑی کے بڑی پھیر میں گنّا سی مری جان ؛ حلوائی نے ارمان تو تل بھر نہ نکالا۔ مؤلفِ نور نے جس طرح اعراب کی نشان دہی کی ہے، اُس سے تو صحیح معنی میں اُس تلفظ کا تعیّن نہیں ہو پاتا، جس کا تعیّن سند کے شعر سے ہوتا ہے۔ اِس شعر میں یہ لفظ جس طرح نظم ہوا ہے، اُس سے قطعیت کے ساتھ اِس کا تلفظ مع یائے مخلوط "رِیُوڑی" (بروزنِ فعلن) متعیّن ہوتا ہے۔ ایسے بعض اور الفاظ (مثلاً ڈیوڑھی، چیونٹی وغیرہ) کی طرح یہ لفظ بھی بروزنِ فعلن اور بروزنِ فاعلن دونوں طرح مستعمل رہا ہے۔ میر حسن نے اپنی مثنوی گلزارِ ارم میں اِسے اُسی طرح نظم کیا ہے جس طرح آصفیہ میں مندرج ہے اور جس طرح کے میں ہے (یعنی بروزنِ فاعلن): چڑھاتا ریوڑی کوئی، کوئی پھول ؛ ملیدہ ہی کوئی لاتا بہ معمول (مثنویاتِ حسن، مرتبہ ڈاکٹر وحید قریشی، مجلسِ ترقیِ ادب لاہور، ص ۱۸۱)۔ صدائیں ریوڑی والوں کی وان ہیں ؛ کڑاکڑ بولتی غلّا بیاں ہیں (ایضاً ص ۱۹۶) اِس طرح دہلی والوں کی پرانی تحریروں میں اِس کا تلفظ بہ یائے مظہرہ (بروزنِ فاعلن) مرجّح ٹھہرتا ہے۔ کے کے مطابق اِسے بروزنِ فاعلن ہی لکھا گیا ہے۔

زِ (ص ۲۵): کے اور نور میں اِس پر حرکت موجود نہیں۔ یہ "اَز" کا مخفف ہے۔ جو لغات میرے سامنے ہیں، اُن میں بھی اِس کی حرکت مذکور نہیں، یہ نہیں معلوم ہوتا کہ اِسے "زَ" پڑھا جائے یا "زِ"۔ "اَز" میں الف پر زبر ہے، یوں بہ ظاہر یہ خیال ہوتا ہے کہ الف کی حرکت زے کی طرف منتقل ہو جانا چاہیے اور اِس بنا پر اِسے "زَ" کہنا چاہیے؛ مگر سننے میں بالعموم "زِ" آیا ہے۔ حُسنِ اتفاق سے قتیل نے اپنے رسالے نہر الفصاحت میں اِس کی حرکت کا تعیّن کیا ہے اور اِسے بالکسر لکھا ہے۔ شعر میں الفاظ کی تکرار سے متعلق لکھتے ہیں: "و تکرارِ لفظ "چون" و "چو" و "از" و زای مکسور بمعنی از... نیکو نباشد... مثالِ زای معجمہ مکسور: ز اشک و ز آہ و ز نالہ، ز زاری" [نہر الفصاحت، مطبع نظامی کان پور، سالِ طبع ۱۲۹۲ھ، ص ۷] - اِسی بنا پر اِسے "زِ" لکھا گیا ہے۔

زَبان (ص ۲): یہ لفظ سب سے پہلے میر امّن کی عرضی میں دو بار آیا ہے اور دونوں جگہ

ک میں زے پر پیش لگا ہوا ہے۔ اُس کے بعد دیباچۂ کتاب میں یہ کئی جگہ آیا ہے، مگر اُن سب مقامات پر زے پر کوئی حرکت موجود نہیں۔ م میں بھی زے ہر جگہ خالی ہے اور ف میں بھی حرکت موجود نہیں، ہر جگہ زے خالی ہے؛ مگر ف کی فرہنگ میں اِسے بہ فتحِ اوّل (زَبان) لکھا گیا ہے۔ یہ لفظ گنجِ خوبی میں کئی جگہ آیا ہے اور اُس میں میر امّن نے ہر جگہ التزام کے ساتھ زے پر پیش لگایا ہے، مثلاً: زُبان ص ۱ (دو بار) ۳، ۴۔ بدزُبانی ص ۱۵، ۴۲ (وغیرہ)۔ اِس طرح اِس لفظ کے تلفّظ کا قطعی طور پر تعیّن ہو جاتا ہے اور معلوم ہو جاتا ہے کہ ک میں جو "زُبان" ہے، وہ منشائے مصنّف کے عین مطابق ہے۔ اِسی کی مطابقت اختیار کی گئی ہے اور زے پر ہر جگہ پیش لگایا گیا ہے۔ ضمنی طور پر لکھا جاتا ہے کہ یہ لفظ صحیح اور فصیح اور مستعمل دونوں طرح ہے۔ فارسی لغات میں بھی اِسے بہ ضمِ اوّل، بہ فتحِ اوّل، دونوں طرح لکھا گیا ہے [برہانِ قاطع۔ بہارِ عجم] مزید تفصیل کے لیے غیاث اللّغات کو دیکھا جا سکتا ہے۔ آصفیہ و نور میں بھی اِسے دونوں طرح لکھا گیا ہے اور ترجیح کی صراحت نہیں کی گئی ہے؛ البتہ فصحائے لکھنؤ کی زبان سے میں نے "زَبان" سنا ہے اور دریافت کرنے پر بھی یہی معلوم ہوا ہے۔

زَٹلّیں (۲۲) : ف اور ع میں لام پر تشدید موجود نہیں، م، ن اور ک میں تشدید لگی ہوئی ہے۔ "زٹل" تشدید کے بغیر ہی مستعمل ہے، لیکن اِس کی جمع "زٹلّیں" مع تشدید سننے میں آئی ہے۔ نور میں سنداً مندرجۂ ذیل شعر ملتا ہے: کیا وعظ کو واعظ کے کریں گوش ہم اے شاد ؛ بے فائدہ سُننا ہے زٹلّی کی زٹل کا۔ نور میں "زٹلّیا" بھی بہ طورِ لغت مندرج ہے اور "جعفر زٹلّی" تو مشہور ترین نام ہے۔ مقصد یہ ہے کہ "زٹل" کی دوسری شکلیں عموماً مع تشدید ہی مستعمل ہیں اور "زٹلّیں" کا بھی احوال یہی ہے؛ اِسی بنا پر یہاں م اور ک کے مطابق اِسے مع تشدید لکھا گیا ہے۔

زِرَہ (۱۴۹) : ک میں "زِرَہ" ہے، یعنی زے کے نیچے زیر ہے اور رے کے اوپر زبر۔ ک میں ص ۲۱۴ پر بھی یہ لفظ آیا ہے اور وہاں بھی "زِرَہ" لکھا ہوا ہے۔ فارسی میں "زِرِہ" ہے مگر اردو میں زبانوں پر "زِرَہ" ہے۔ نظم میں اِسے دونوں طرح استعمال کیا گیا ہے، مثلاً (۱) غُل تھا کہ وہ چمکتی ہوئی آئی، یہ گری ؛ برچھی سے اُڑ گئی وہ سناں، یہ گرہ گری ؛ ترکش کٹا، کمانِ کیانی سے زِہ گری ؛ یہ سر گرا، وہ خود گرا، یہ زِرِہ گری۔ انیسؔ [روحِ انیس، طبعِ اوّل، ص ۱۸۵] (۲) فقیرانہ ہے دل مقیم اُس کی رَہ کا ؛ غرض کیا کہ محتاج ہو بادشہ کا ؛ خدنگ آہ کا اے فلک بے طرح ہے ؛ بھروسا تو تار ون

کی مت گرِ زِرَہ کا۔ اِنشا [کلامِ اِنشا، ص ۲۳]۔ چوں کہ ک میں "زِرَہ" ہے یعنی زے کے نیچے زیر لگا ہوا ہے اور رے کے اوپر زبر ہے، اِس لیے اِس کی مطابقت اختیار کی گئی ہے۔ آصفیہ میں بھی "زِرَہ" ہے [اور اُردو میں استعمالِ عام کے یہ عین مطابق ہے]۔

زُمُرُّد (ص ۵۵): ک میں یہاں "زُمُرُّد" ہے یعنی صرف دو پیش ہیں، اِس سے ذرا سا اشتباہ پیدا ہو سکتا ہے؛ مگر یہ لفظ ک میں ص ۹۵، ۱۰۸ اور ۲۲۲ پر بھی آیا ہے اور ان سب مقامات پر "زُمُرُّد" ہے اور یوں کسی طرح کا اشتباہ باقی نہیں رہتا۔ ف میں سب مقامات پر "زُمُرُّد" ہے۔ اِسی کی مطابقت اختیار کی گئی ہے۔ یہ وضاحت بھی بے جا نہ ہوگی کہ اصلاً "زُمُرُّد" ہی ہے۔ (شروع کے تینوں حرفوں پر پیش)۔ غیاث اللغات میں اصل حرکات لکھ کر، یہ بھی لکھا گیا ہے کہ رے کے زبر کے ساتھ (زُمُرَّد) بھی استعمال کیا گیا ہے۔ مولّف کا یہ قول بہارِ عجم کے اِس اندراج پر مبنی ہے: "ظہیر الدین فاریابی در قصیدہ اے کہ مبنی بر قافیۂ "قَدَ" و "خَدَ" است آوردہ: زہرۂ سنگ از شکوہِ او چو برآید؛ گردشِ چرخش لقب نہاد زمرّد" [بہ ذیلِ لفظ زمرّد]۔ مطلب یہ نکلا کہ فارسی میں یہ لفظ بہ فتحِ حرفِ سوم بھی استعمال کیا گیا ہے، لیکن شروع کے دونوں حرفوں پر پیش ہی ہے۔ آصفیہ میں یہ لفظ موجود ہے مگر اعراب کے بغیر۔ نور میں البتہ اصل حرکات (زُمُرُّد) لکھ کر، یہ بھی لکھا گیا ہے کہ: "اُردو میں بہ فتحِ اوّل و ضمِ دوم و تشدیدِ سوم مفتوح مستعمل ہے۔" مولّفِ نور کا یہ لکھنا بالکل درست ہے کہ اب عام طور پر "زَمُرَّد" کہتے ہیں۔ اُردو شعرا کے یہاں سے بہ فتحِ سوم کی مثالیں بہ آسانی پیش کی جا سکتی ہیں۔ چوں کہ ک اور ف میں کئی جگہ "زُمُرُّد" موجود ہے، اِس بنا پر اِس متن میں اِنھی حرکات کو برقرار رکھا گیا ہے [بعض دِلّی والوں سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ "زُمُرُّد" ہی کہتے ہیں]۔

زِیادہ (ص ۵): ک میں اِسی طرح، یعنی مع یائے مظہرہ (بروزنِ فعولن) ہے۔ یہ لفظ جہاں بھی آیا ہے ک میں اِسی طرح ہے۔ صراحت کی ضرورت خاص کر یوں محسوس کی گئی کہ اگرچہ بیش تر اِس لفظ کا استعمال بروزنِ فعولن ملتا ہے، مگر اِسے بروزنِ فعلن (یعنی مع یائے مخلوط) بھی استعمال کیا گیا ہے، اِس کی مثالیں ملتی ہیں، مثلاً: نازک ہے کمر اُس کی رگِ گُل سے بھی زیادہ؛ ہے تنگ تر اُس گُل کا دہن، گُل کی کلی سے۔ جہاں دار [دیوانِ جہاں دار، مرتبہ ڈاکٹر وحید قریشی، مجلسِ ترقیِ ادب لاہور، ص ۱۳۴] سودا کا وہ مشہور قصیدہ، جس کے مطلعے کا پہلا مصرع یہ ہے: فجر ہوتے

جو گئی آج مری آنکھ جھپک، اُس میں یہ شعر بھی ہے: آ گئے تو کہ نہیں سکتا میں کچھ اُس کی تعریف؛
یوں حیا کہتی ہے مجھ سے کہ بس اب زیادہ نہ بک۔

سامھنے (۴۴) : م، ن، ک، ض میں اِس لفظ کا یہی املا ہے؛ اللّٰہ ع میں "سامنے" ہے۔ ک میں جہاں کہیں یہ لفظ آیا ہے، اِس کا یہی املا ملتا ہے، مثلاً: ص ۴۱، ۴۶، ۶۸، ۷۶۔ ض میں بھی اِن سب مقامات پر یہی املا ہے۔ اِس کے علاوہ، مخطوطۂ گنجِ خوبی میں میر امّن نے ہر جگہ اِس لفظ کو اِسی طرح (مع ہائے مخلوط) لکھا ہے، مثلاً: ص ۲، ۸، ۱۹۹، ۲۱۹، ۳۰۲، ۳۰۵۔ اِس لفظ کے اِسی املا کو برقرار رکھا گیا ہے۔

تبقّت (۹۴) : ک اور ف میں اِس لفظ پر اعراب موجود نہیں۔ اصل لفظ "تبقت" ہے، مگر فارسی میں اِسے بہ سکونِ دوم بھی استعمال کیا گیا ہے، اسناد بہارِ عجم میں موجود ہیں۔ اُردو میں بھی یہی صورت ہے کہ شعرا نے اِس لفظ کو دونوں طرح نظم کیا ہے اور اِس کی اسناد نور اللغات میں موجود ہیں۔ بول چال کا احوال یہ ہے کہ عموماً اِسے بہ کسرِ دوم سُنا گیا ہے ["برکت" اور "عظمت" کی بھی یہی صورت ہے کہ یہ لفظ بھی زبانوں پر عموماً بہ سکونِ دوم آتے ہیں] اِسی نسبت سے اِس لفظ کو بہ سکونِ دوم لکھا گیا ہے۔ ہاں ف کے آخر میں جو فرہنگ ہے، اُس میں بھی اِسے بہ سکونِ دوم ہی لکھا گیا ہے۔

سُپُرد (۴۴) : ک اور ف میں یہاں "سِپُرد" ہے، یعنی س کے نیچے زیر ہے اور پ کے اوپر پیش۔ اِس کے برخلاف م میں "سُپُرد" ہے یعنی دونوں حرفوں پر پیش ہے۔ ک میں ص ۲۴۸ پر بھی یہ لفظ آیا ہے اور وہاں "سُپُرد" لکھا ہوا ہے، یعنی شروع کے دونوں حرفوں پر پیش لگے ہوئے ہیں۔ یہاں ف میں بھی "سُپُرد" ہے۔ مخطوطۂ گنجِ خوبی میں دو جگہ یہ لفظ آیا ہے، اور دونوں جگہ واضح طور پر س پر پیش لگا ہوا ہے۔ چوں کہ ک میں ایک جگہ "سُپُرد" موجود ہے اور روایتِ اوّل یعنی نسخۂ م میں بھی "سُپُرد" ہے اور میر امّن کی اپنی تحریر میں بھی س پر پیش ملتا ہے؛ اِس بنا پر "سُپُرد" کو ترجیح دی گئی ہے۔ آصفیہ و نور میں "سِپُرد" (بہ کسرِ اوّل و ضمّ دوم) ہے۔ فارسی میں "سپردن" کی حرکات میں اچھا خاصا اختلاف ہے۔ اِس کی تفصیل غیاث اللغات میں موجود ہے۔ صاحبِ غیاث نے سارے اختلافات لکھ کر آخر میں خانِ آرزو کا یہ قول نقل کیا ہے: "و خانِ آرزو در سراج نوشتہ کہ "سپردن" پیشِ مولّف بہ ضمّ سین و کسرِ آں اختلافِ لہجہ است، و ہم چنیں بائے فارسی،

کہ بعضے مضموم خوانند و بعضے مفتوح"۔ یہی بات درست معلوم ہوتی ہے۔

سپنا (۱۵۱): ک اور ف میں اِس لفظ پر اعراب موجود نہیں۔ ف کی فرہنگ میں بھی یہ لفظ شامل نہیں۔ ع میں "سُپنے" ہے، یعنی سین پر پیش لگا ہوا ہے۔ آصفیہ میں "سُپنا" ہے، یعنی سین پر پیش موجود ہے۔ دو جگہ مثالیہ فقروں میں بھی سین پر پیش لگا ہوا ہے۔ نور میں وضاحت بھی کر دی گئی ہے کہ: "یہ لفظ صحیح بالضم ہے"۔ فرہنگِ اثر میں اِس سے اختلاف نہیں کیا گیا ہے، یہ اگرچہ کوئی دلیل نہیں، مگر ایک قرینہ ضرور ہے اِس کا کہ مولفِ فرہنگِ اثر بھی اِس سے اختلاف نہیں رکھتے تھے۔ پلیٹس کے لغت میں اِسے "سُپنا" اور "سَپنا" دونوں طرح لکھا گیا ہے، مگر دو مثالیہ فقرے جو اس کے ذیل میں لکھے گئے ہیں، اُن میں "سَپنا" (بہ فتحِ اوّل) ہی ملتا ہے۔ فیلن نے بھی اپنے لغت میں اِس لفظ کو بہ فتحِ اوّل و بہ ضمِ اوّل، دونوں طرح لکھا ہے، مگر جس طرح اِس لفظ کو درج کیا ہے، اُس سے واضح طور پر بہ ضمِ اوّل کی ترجیح ظاہر ہوتی ہے۔ البتہ نفائس اللغات میں اِسے صرف بہ فتحِ اوّل لکھا گیا ہے۔ میرے سننے میں یہ لفظ عمومی طور پر "سَپنا" (بہ فتحِ اوّل) آیا ہے، اور میں نے جن لوگوں سے معلوم کیا، اُنھوں نے بھی بہ فتحِ اوّل کی تائید کی۔ اِس کا امکان ہے کہ اب سے پہلے "سُپنا" زیادہ مستعمل رہا ہو اور پھر "سَپنا" زبانوں پر چڑھ گیا ہو۔ ایسے تغیرات متعدد لفظوں میں ملتے ہیں [اِس کی سب سے اچھی مثال "پِھینا" ہے، جس کی بحث اِسی ضمیمے میں ملے گی]۔ چوں کہ ک اور ف دونوں میں اِس لفظ پر اعراب موجود نہیں اور موجودہ صورت میں میرے لیے مشکل ہے کہ میں سین کے پیش یا زبر میں سے کسی ایک کی ترجیح کا (اُس زمانے کے لحاظ سے) فیصلہ کر سکوں، اِس بنا پر میں نے مناسب یہی خیال کیا کہ اِس خاص لفظ پر اعراب نہ لگائے جائیں، اِسی لیے اِسے اعراب کے بغیر ہی لکھا گیا ہے۔ اِسے "سُپنے میں" بھی پڑھا جا سکتا ہے اور "سَپنے میں" بھی کہہ سکتے ہیں۔

سُپیاری (۴۸): ک میں "سُپیاری" ہے، یعنی صرف سین پر پیش لگا ہوا ہے اور ف میں "سُپِیاری" ہے، یعنی پے کے نیچے زیر بھی ہے۔ پلیٹس کے لغت میں "سُپاری" کے ساتھ "سُپِیاری" بھی ہے، یعنی اُس میں بھی پے مکسور ہے۔ اِس کے برخلاف آصفیہ میں "سُپْیاری" ہے، یعنی پے کے اوپر جزم لگا ہوا ہے اور فیلن کے لغت میں بھی اِس لفظ کو اِسی طرح (بہ سکونِ پے) لکھا گیا ہے۔ میرحسن نے اِسے بہ سکونِ پے نظم کیا ہے: جہاں قہوہ ہے اور سُپیاری و پُن:

بساطی بیٹھے ہیں نیچے دکان چن [مثنویاتِ حسن، مرتبہ ڈاکٹر وحید قریشی، مجلسِ ترقیِ ادب لاہور، ص ۱۹۷]
[یہ شعر مثنوی "گلزارِ ارم" کا ہے ("گلزار" مع ذال۔ یہ نام تاریخی ہے)۔ اِس مثنوی میں ایک جگہ "سپاری" بھی آیا ہے: کسی کے ساتھ پانوں کی پٹاری ؛ بھرا بٹوے میں کتھا اور سپاری (ص ۲۶۱)]
۔ اِسی بنا پر مرجّح صورت اِس لفظ کی پ کے جزم کے ساتھ ہوگی اور اِسی طرح یعنی "سُپْیا دی" پڑھنا چاہیے۔

سَتَّر (۲۲۸) : کے میں ت پر زبر لگا ہوا ہے۔ کے میں اِس سے پہلے ص ۲۲۰ پر بھی یہ لفظ آیا ہے اور اِس کے بعد ص ۲۳۲ پر بھی موجود ہے اور اِن دونوں مقامات پر بھی ت پر زبر موجود ہے اِسی کی مطابقت اختیار کی گئی ہے۔ اصلاً "سَتّر" ہے۔ میر امّن نے ایسے کئی لفظوں کو بہ فتحِ دوم استعمال کیا ہے؛ جو دراصل بہ سکونِ دوم ہیں۔ کے کی مطابقت اختیار کی گئی ہے اور ت کے زبر کو برقرار رکھا گیا ہے۔

سَتّھواراؤ: ص ۴۷، ح (۱۱) -

سِجدہ (۱۵۹) : کے اور فے میں س کے نیچے زیر لگا ہوا ہے۔ وضاحت کی ضرورت یوں محسوس کی گئی کہ آصفیہ میں "سَجدہ" ہے، یعنی سین مکسور بھی ہے اور مفتوح بھی۔ اگرچہ آخر میں مؤلف نے "قرآن شریف کی ایک سورہ کا نام" کے ذیل میں توسین میں یہ وضاحت کی ہے: "بعض فرہنگ نویسوں کی رائے ہے کہ بہ فتحِ سینِ مہملہ اِسی کے واسطے ہے، ورنہ بہ کسر ہے"۔ مگر خود انھوں نے "سجدہ" اور "سجدہ کرنا" دونوں میں سین کے اوپر زبر بھی لگایا ہے اور اُس کے نیچے زیر بھی لگایا ہے۔ اِس طرح ذہن الجھتا ہے۔ نور میں "سِجدہ" ہے۔ غیاث اللغات میں اختلافِ حرکات کی تفصیل مذکور ہے۔ المنجد میں "سِجدہ" ہے بہ کسرِ اوّل ———— مختصر یہ ہے کہ متعارف معنی میں لفظ "سِجدہ" ہے۔

سُخَن (۴) : کے میں "سُخن" ہے، یعنی صرف ایک پیش ہے، مگر کے میں ص ۲۵۰ پر "سُخَن" ملتا ہے: ع: "رہے گا مگر یہ سُخَن یادگار" اور ص ۲۱۶ پر "سُخَنوروں" ہے، یعنی اِن دونوں مقامات پر س کے اوپر پیش ہے اور خ پر زبر۔ مخطوطۂ گنجِ خوبی میں کئی جگہ یہ لفظ ملتا ہے اور ہر جگہ س پر پیش لگایا گیا ہے۔ اِسی مخطوطے میں ایک جگہ "سُخَنوروں" ہے (ص ۲۱۶) اور یہاں س پر پیش لگایا گیا ہے اور خ پر زبر؛ اِس طرح یہ واضح طور پر متعیّن ہو جاتا ہے کہ میر امّن نے

اِس لفظ کو بہ ضمِ اوّل و فتحِ دوم استعمال کیا ہے۔ اسی کی مطابقت اختیار کی گئی ہے۔ ہاں م اور ف میں بھی اِس مقام پر سؔ پر واضح طور پر پیش لگا ہوا ہے۔

بے جا نہ ہوگا اگر اِس لفظ سے متعلق ضروری تفصیل بھی بیان کر دی جائے۔ اُردو میں "سَخُن" اور "سُخَن" دونوں طرح یہ لفظ مستعمل رہا ہے۔ یہ فارسی کا لفظ ہے۔ فرہنگِ رشیدی میں اسے "سَخُن" اور "سُخَن" لکھا گیا ہے۔ برہانِ قاطع میں اسے چار طرح صحیح بتایا گیا ہے: "سُخَن، سُخُن، سَخُن، سَخَن"۔ غیاث اللّغات میں اسے تین طرح "سُخَن، سُخُن، سَخُن" لکھا گیا ہے۔ صاحبِ بہارِ عجم کی رائے یہ ہے کہ سُخَن (بہ ضمِ اوّل و فتحِ دوم) صرف قافیے کی حد تک جائز ہے۔ مؤلف نے لکھا ہے: "و بہ فتحِ دوم ہم چنیں جائز نیست لیکن قافیۂ آں با من و تن و امثالِ آن جائز است۔" اِس کا مطلب تو یہ نکلا کہ متاخر ہندستانی اساتذۂ فارسی کے نزدیک "سُخَن" کو قافیے کی رعایت سے لایا جا سکتا ہے، ورنہ "سَخُن" کہنا چاہیے۔ مگر مرزا غالب نے ایک خط میں لکھا ہے: "سخن کا دوسرا حرف مضموم بھی ہے اور مفتوح بھی اور اِس پر متقدمین و متاخرین اور اہلِ ایران اور اہلِ ہند کو اتفاق ہے۔" (فرہنگِ غالب، ص ۱۴۴)۔

نور اللّغات میں اِس لفظ کو غیاث اللّغات کے مطابق لکھا گیا ہے اور کسی طرح کی صراحت نہیں کی گئی ہے۔ آصفیہ میں اِس کو برہانِ قاطع کے مطابق لکھا گیا ہے، مگر یہاں یہ صراحت بھی کر دی گئی ہے کہ: "مگر افصح بہ فتحِ اوّل و ضمِ ثانی"۔ یعنی مؤلف نے "سَخُن" کو فصیح تر مانا ہے اور یہ قول صاحبِ بہارِ عجم کے قول سے مطابقت رکھتا ہے۔ اور اِس سے وضاحت کے ساتھ یہ معلوم ہوتا ہے کہ جب یہ لفظ مَن اور تَن جیسے لفظوں کے قافیے کے طور پر آئے، تب تو اسے "سُخَن" کہا جائے، ورنہ "سَخُن" کہنا بہتر ہوگا۔

فسانۂ عجائب کے متن میں بھی یہ لفظ آیا ہے۔ چوں کہ وہاں مصنف کا طرزِ عمل اِس لفظ کے سلسلے میں معلوم نہیں، اِس لیے وہاں عام قاعدے کے مطابق اِس پر بحث کی گئی ہے، مگر یہاں باغ و بہار کے مصنف کے طرزِ عمل کا ہم کو بہ خوبی علم ہے، اِس لیے باغ و بہار میں اِس لفظ کی اُردو میں رائج دو صورتوں میں سے اُس صورت کو ترجیح دی گئی ہے جس کا تعین اِس کتاب کے مصنف کی تحریر سے واضح طور پر ہو جاتا ہے اور اِسی لیے اسے "سُخَن" لکھا گیا ہے۔

بِسْتَر (۱۲): م، ک اور ف میں سؔ کے نیچے زیر لگا ہوا ہے۔ اِن تینوں نسخوں میں جہاں بھی

یہ لفظ آیا ہے (ترکیبِ فارسی کے بغیر کسی بھی معنی میں؛ جیسے: "سر اُٹھایا" یا "تیئے سر سے") وہاں
س کے نیچے زیر لگا ہوا ہے۔ نیز مخطوطۂ گنجِ خوبی میں یہ لفظ (ترکیبِ فارسی کے بغیر) جہاں بھی آیا ہے،
میرامّن نے اپنے قلم سے التزام کے ساتھ س کے نیچے زیر لگایا ہے (مثلاً ص ۳، ۴ (تین جگہ)، ۱۲،
۴۴، ۷۵، وغیرہ) اِسی کی پابندی کی گئی ہے اور جہاں بھی یہ لفظ ترکیبِ فارسی کے بغیر آیا ہے، وہاں
اِسے بہ کسرِ اوّل لکھا گیا ہے۔ طلبہ کے استفادے کے لیے یہ وضاحت کی جاتی ہے کہ فارسی میں
"سَر" بہ فتحِ اوّل ہے، اِسی لیے فارسی عبارت اور فارسی مرکّبات میں اِسے بہ فتحِ سین پڑھا جاتا
ہے (اور اِسی طرح پڑھنا چاہیے) اُردو میں زبانوں پر یہ لفظ بہ فتحِ اوّل اور بہ کسرِ اوّل دونوں طرح
ہے۔ اُردو شاعروں نے بھی اِسے دونوں طرح نظم کیا ہے، یعنی "تَر" اور "پھِر" دونوں طرح کے
قوافی کے ساتھ باندھا ہے؛ البتّہ بہ فتحِ اوّل کی مثالیں نسبتاً زیادہ ملتی ہیں (اِس کو ضرورتِ شعری
بھی کہا جاسکتا ہے)۔ نور اللغات میں وضاحت کردی گئی ہے کہ "فارسی معانی اور فارسی ترکیبوں
میں "سَر" بالفتح ہے، اُردو محاورات میں بالکسر ہی فصیح ہے۔" یہی بات اثر مرحوم نے فرہنگِ اثر
میں لکھی ہے (ص ۹۲)۔ چوں کہ میرامّن نے مفرد لفظ کو ہر جگہ بہ کسرِ اوّل لکھا ہے اور مطبوعہ نسخوں
کا بھی یہی احوال ہے، اِسی لیے مفرد لفظ "سر" میں ہر جگہ س کے نیچے زیر لگایا گیا ہے۔ ہاں یہ
وضاحت پھر کردی جائے کہ اِس کتاب میں ص ۸ پر ایک جملہ ہے: "اور نیئے سِر سے رونق زیادہ
ہوئی۔" م، کے، ف؛ سب میں یہاں بھی "سِر" ہے۔ یہ لفظ کئی جگہ آیا ہے اور ک میں ہر جگہ
"نیئے سِر" ملتا ہے۔ اِسی کی پابندی کی گئی ہے۔ البتّہ فارسی مرکّبات میں س پر زبر لگایا گیا ہے
مثلاً: "سَرکشی"۔ ک میں ایسے جملہ مقامات پر س خالی ہے؛ یعنی اُس پر کوئی حرکت موجود نہیں
اور اِس کا بھی مطلب یہی ہے کہ اِن مقامات پر س مفتوح ہے۔

شُہرت (۱۴۵): ک میں س کے اوپر پیش تو لگا ہوا ہے، مگر رے خالی ہے۔ ف میں بھی اِسی
طرح ہے؛ البتّہ ف کی فرہنگ میں اِسے SURT لکھا گیا ہے، یعنی بہ سکونِ دوم۔ آصفیہ میں
"شُہرت" مندرج ہے۔ مولّف نے مزید وضاحت اِس طرح کی ہے: "گیتوں میں اور بول چال
میں تو اِس کے اعراب اِسی طرح ہیں، جس طرح پر کہ ہم نے دیے ہیں ...... مگر بعض اساتذہ نے
اِسے رائے مہملہ ساکن کے ساتھ استعمال کیا ہے، چناں چہ حضرتِ رنگین کا شعر سنداً درج کیا جاتا
ہے: گانا تو نہیں آتا، بہلاتی ہوں جی اپنا؛ ہوں لے کے سنے نہ میں واقف، ہے سرت نہ کچھ سُر کی

پنجاب میں اب بھی اسی طرح بولتے ہیں"۔ فیلن نے اپنے لغت میں "سَرَت" لکھا ہے اور جس قدر مثالیں درج کی ہیں، سب میں یہ لفظ اسی طرح (بہ فتحِ دوم) آیا ہے۔ پلیٹس نے "سُرت" اور "سُرَت" دونوں تلفظ درجِ لغت کیے ہیں، مگر جس قدر مثالیں درجِ لُغت کی ہیں، اُن سب میں "سُرَت" (بہ فتحِ دوم) لکھا ہے اور اس سے صاحبِ آصفیہ کے اس قول کی پوری طرح تائید ہوتی ہے کہ بول چال میں یعنی استعمالِ عام میں یہ لفظ بہ فتحِ دوم ہے۔ اسی بنا پر اس کو بہ ضمِّ اوّل و فتحِ دوم لکھا گیا ہے۔
["سُرتا" ہوشیار، چالاک، چوکنّا کے معنی میں اسی سے بنا ہے۔ یہ آصفیہ میں بھی موجود ہے]۔

سُر سُراہَٹ (ص ۱۴۵): کے اور فے میں اسی طرح (بہ ضمِّ اوّل و سوم) ہے۔ فے کی فرہنگ میں بھی اسی طرح ہے۔ آصفیہ میں "سَرسَراہَٹ" ہے، مگر پلیٹس نے اپنے لغت میں "سَرسَراہٹ" اور "سُرسُراہَٹ" دونوں تلفظ درج کیے ہیں اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کے اور فے میں جو پیش ہیں، وہ بے اصل نہیں اور اصل لفظ "سرسر" کو فیلن نے اپنے لُغت میں بہ فتحِ اوّل و سوم اور بہ ضمِّ اوّل و سوم (سَرسَر۔ سُرسُر) دونوں طرح لکھا ہے۔ کے کی مطابقت اختیار کی گئی ہے۔

سَرگُذَشت (ص ۲۰): م، ن، کے اور فے میں اسی طرح (مع ذال) ہے۔ ع میں "سرگزشت" ہے۔ اگلے صفحے پر بھی یہ لفظ آیا ہے اور وہاں بھی کے اور فے میں مع ذال ہے اور ع میں مع زے۔ یہی صورت اور مقامات پر بھی پائی جاتی ہے، مثلاً ص ۱۳۵ پر بھی یہ لفظ آیا ہے اور وہاں بھی ن، فے، کے میں "سرگذشت" ہے، ع میں البتہ یہاں بھی "سرگزشت" ہے۔ کے (اور فے) کے مطابق اس لفظ کا املا اختیار کیا گیا ہے۔ [اس لفظ کا صحیح املا مع ذال ہی ہے۔ گذشت، رفت و گذشت، گذشتہ، گذرگاہ، راہ گذر؛ ان سب لفظوں میں ذال ہے۔ گذشتن، گذاشتن، گزاردن اور ان کے مشتقات سے متعلق مفصّل بحث راقم الحروف کی کتاب اُردو املا میں دیکھی جا سکتی ہے]۔

سِرہانے (ص ۱۱۲): ن، کے اور ع میں "سرہانے" ہے اور فے میں "سرھانے"۔ اُردو شعرا نے بالعموم اس لفظ کو مع ہائے مخلوط التّلفظ نظم کیا ہے، ایک مثال: آگے کسی کے کیا کریں دستِ طمع دراز ÷ وہ ہاتھ سو گیا ہے سرھانے دھرے دھرے (میرؔ) یا میرؔ ہی کا یہ شعر: سرھانے میرؔ کے کوئی نہ بولو ÷ ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے ؛ مگر یہ لفظ (غالباً ہندی کے اثر سے) مع ہائے ہوز بھی مستعمل رہا ہے۔ اسی لفظ کی تخصیص نہیں، ایسے کئی لفظ ہیں جن میں یہ اختلاف پایا جاتا

ہے، مثلاً " باڑھوں " اور " بارہوں " (اِسی ضمیمے میں اِس کی تفصیل درج کی گئی ہے۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیے راقم الحروف کی کتاب اُردو املا میں گنتیوں کی بحث)۔ یہ بات کہ میر امّن نے "سرہانا" مع ہائے ملفوظ استعمال کیا ہے، اِس کی سند میر امّن کی کتاب گنج خوبی سے پیش کی جاتی ہے، اُس کے پندرھویں باب میں یہ لفظ ایک شعر میں آیا ہے، جس سے قطعیت کے ساتھ تلفّظ کا تعیّن ہوجاتا ہے : " ڈر اُس مظلوم سے جو جاگتا ہے اور روتا ہے ؛ تو غافل سوتا ہے، سرہانے پہنچا آنسو کا نالا "۔ اِس کا مزید اور قطعی ثبوت یہ بھی ہے کہ کے میں ص ۸۶ پر بھی یہ لفظ آیا ہے اور وہاں متن میں " سرھانے " چھپا ہوا ہے، مگر غلط نامے میں اِس کی تصحیح کی گئی ہے اور اِس کی جگہ صحیح لفظ " سرہانے " لکھا گیا ہے۔

سِفارِش (۱۴) : م، کے، ف میں " سِفارِش " ہے، یعنی سین اور رے کے نیچے زیر لگے ہوئے ہیں۔ یہ لفظ اِس کتاب کے ص ۲۰۸ اور ص ۲۱۰ پر بھی آیا ہے، اُن دونوں مقامات پر کے میں " سُفارِش " ہے، مگر ف میں دونوں مقامات پر " سِفارِش " ہے۔ یہ لفظ اِس کتاب کے ص ۲۴۴ پر بھی آیا ہے اور وہاں کے اور ف دونوں میں " سُفارِش " ہے۔ ف کی فرہنگ میں اِسے " سِفارِش " اور " سُفارِش " دونوں طرح درج کیا گیا ہے۔ آصفیہ اور نور میں " سفارش " (بہ کسرِ اوّل) ہے، البتہ فیلن کے لغت میں " سُفارِش " اور " سِفارِش " دونوں طرح مندرج ہے۔ فارسی میں " سُفارِش " ہے [بہارِ عجم، غیاث اللغات] اور اِسے " سپردن " کا حاصل مصدر بتایا گیا ہے۔ " سپردن " کی حرکات میں اچھا خاصا اختلاف پایا جاتا ہے، اِن اختلافات کو غیاث اللغات میں یک جا کر دیا گیا ہے۔ علاوہ دیگر اختلافات کے، " س " مکسور بھی ہے، مفتوح بھی ہے اور مضموم بھی، یوں اِس کا حاصل مصدر " سِپارِش " بھی ہوسکتا ہے اور " سُپارِش " بھی۔ " سپارش " اور " سفارش " میں کچھ فرق نہیں، بس " پ " اور " ف " کا ابدال ہے، اِسی لیے غیاث اللغات میں " سپارش و سفارش، ہر دو بہ ضمِّ اوّل و کسرِ چہارم " مندرج ہے۔ چوں کہ اِس لفظ کے تلفّظ میں اختلاف کا ہونا مسلّم ہے، اِس لیے میں نے بہت غور کرنے کے بعد مناسب یہی خیال کیا کہ کے کی مطابقت کو ترجیح دی جائے، یعنی اپنے اپنے مقام پر کے میں موجود صورت کو اختیار کیا جائے، اِسی بنا پر اِس مقام پر " سِفارِش " لکھا گیا ہے اور کے میں جن مقامات پر " سُفارِش " ہے، اُن مقامات پر اُسی کو برقرار رکھا گیا ہے۔

سُقَیلہ (۱۱) : کے میں سین پر پیش لگا ہوا ہے اور ی پر ماقبل مفتوح کی علامت موجود ہے۔

آگے چل کر ص ۱۰۱ اور ص ۲۴۳ پر بھی یہ لفظ آیا ہے اور وہاں بھی اسی طرح ملتا ہے۔ فنے میں بھی اِس لفظ کو اسی طرح لکھا گیا ہے اور م میں بھی یہ لفظ اسی طرح لکھا ہوا ہے۔ نیز مخطوطۂ گنجِ خوبی میں بھی میر امّن نے اِس لفظ کو اسی طرح لکھا ہے، یعنی سین پر پیش لگایا ہے اور ی پر ماقبل مفتوح کی علامت بنائی ہے؛ اِس بنا پر اس لفظ کو اسی طرح لکھا گیا ہے۔ اُردو میں یہ لفظ بہ فتحِ اوّل بھی سننے میں آتا ہے، بل کہ یوں کہیے کہ اب بیش تر اسی طرح مستعمل ہے؛ لیکن کچھ لوگوں کی زبان سے اِسے بہ ضمِّ اوّل و فتحِ دوم بھی سُنا گیا ہے۔ یہ واضح کر دیا جائے کہ فارسی میں "سفید" اور (اِس کی ایک شکل) "سپید" دونوں لفظ بہ کسرتین و یائے مجہول (سِپید، سِفید) ہیں (غیاث اللّغات) برہانِ قاطع میں یہ لفظ موجود ہے، لیکن تلفّظ کی صراحت نہیں کی گئی ہے؛ البتّہ اِس لُغت کے ایرانی مرتّب ڈاکٹر محمّد معین نے حاشیے میں اِس لفظ کی مختلف شکلوں کی نشان دہی کی ہے، اور اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض بولیوں یعنی گیلکی، منجی اور شفنی میں سین پر پیش ہے۔ اِس سے یہ پتا چلتا ہے کہ اُردو میں جو اس لفظ کا ایک تلفّظ سین کے پیش کے ساتھ بھی ہے، وہ بے اصل نہیں۔ فرہنگِ آصفیہ میں "سَفید" مندرج ہے، یعنی سین پر زبر بھی ہے اور زیر بھی۔ نور اللّغات میں اِس لفظ کے متعلّق لکھا گیا ہے کہ: "بہ فتحِ اوّل و کسرِ دوم صحیح اور بہ ضمِّ اوّل غلط ہے" لیکن میر امّن کے اِس خود نوشت املا کے ہوتے ہوئے اِسے "غلط ہے" کہنا صحیح نہیں۔

سلامٌ علیک: ص ۲۶۸، ح (۴)۔

سَما: ص ۲۶۷، ح (۱۰)۔

سِمْت (ص۹۵): اصلاً یہ لفظ بہ فتحِ اوّل (سَمْت) ہے۔ آصفیہ میں میم کے اوپر جزم تو لگا ہوا ہے، مگر سین خالی ہے، اُس پر کوئی حرکت موجود نہیں۔ مؤلّفِ نور نے "سَمْت، ع، بالفتح" لکھ کر یہ بھی لکھا ہے کہ "اُردو میں بالکسر ہی زبانوں پر ہے"۔ فیلن نے بھی اپنے لُغت میں اسے بہ فتحِ اوّل لکھ کر، یہ وضاحت کر دی ہے کہ مقبولِ عام تلفّظ "سِمْت" ہے [یہ واقعہ ہے کہ زبانوں پر بیش تر "سِمت" ہے]۔ ک میں سین کے نیچے زیر لگا ہوا ہے۔ مخطوطۂ گنجِ خوبی میں بھی میر امّن نے اِس لفظ کو "سِمت" ہی لکھا ہے، "ص ۳"، "ص ۳۲۶"۔ اور اِس طرح یہ بات قطعی طور پر طے ہو جاتی ہے کہ میر امّن نے اِس لفظ کو (استعمالِ عام کے مطابق) بہ کسرِ اوّل لکھا ہے؛ اِسی کی پابندی اختیار کی گئی ہے۔

سُمُنْدر (ص۳): ک میں یہاں تو میم پر پیش لگا ہوا ہے، لیکن ص ۴ پر بھی یہ لفظ آیا ہے اور وہاں

میم پر زبر لگا ہوا ہے۔ مخطوطۂ گنجِ خوبی میں یہ لفظ کئی جگہ آیا ہے اور ہر جگہ میم پر زبر لگا ہوا ملتا ہے۔
یہ لفظ بہ فتحِ میم و بہ ضمِّ میم، دونوں طرح سُننے میں آیا ہے۔ پلیٹس اور فیلن دونوں نے اسے دونوں
طرح (سَمَندر، سُمَندر) لکھا ہے، لیکن فرہنگِ آصفیہ اور نوراللغات میں میم پر صرف زبر ملتا
ہے۔ اِس اختلاف کے پیشِ نظر، اِس لفظ کا تلفظ اس کتاب میں مخطوطۂ گنجِ خوبی کے
مطابق بہ فتحِ میم مرجّح سمجھا گیا ہے۔

سِمیت (۵۴۲): فیلن اور پلیٹس کے لغات میں اس لفظ کو بہ کسرِ دوم و یائے مجہول اور بہ فتحِ
دوم لکھا گیا ہے (سِمیت، سَمیت)۔ کسے میں جہاں کہیں یہ لفظ آیا ہے، ی پر علامتِ مجہول
موجود ہے اور مخطوطۂ گنجِ خوبی میں بھی یہ لفظ ہر جگہ اسی طرح ملتا ہے، یعنی ی پر علامتِ مجہول
التزام کے ساتھ لگائی گئی ہے۔ اِنھی وجوہ سے اس لفظ کو مع یائے مجہول (سمیت) لکھا گیا ہے۔

سِنجاف (۱۱۲): م، کسے، فسے میں اس لفظ پر اعراب موجود نہیں، البتہ فسے کی فرہنگ میں
اسے بہ فتحِ اوّل لکھا گیا ہے۔ فارسی میں "سجاف" (نون کے بغیر ہے) اسی سے اُردو میں
"سنجاف" (مع نون) بن گیا۔ فارسی میں "سجاف" کے سین کے نیچے زیر ہے۔ اُردو لغات میں
"سنجاف" بہ فتحِ اوّل اور بہ کسرِ اوّل، دونوں طرح ملتا ہے۔ نور میں اسے "بہ فتحِ اوّل" لکھا گیا
ہے، لیکن آصفیہ میں "سِنجاف" اور "سِنجافی" ہے، یعنی دونوں لفظوں کے سین کے نیچے زیر
لگا ہوا ہے۔ اِس اختلاف کے پیشِ نظر، آصفیہ کے اندراج کو ترجیح دی گئی ہے اور سین کے
نیچے زیر لگایا گیا ہے۔

سن و سال، سِنّ و سال: ص ۳۱۸، ح ⑧ -

سُننے (۲۲۰): ک، فسے: سُنّے سے۔ ج: سننے سے۔ اُردو کے ایسے مصدر جن میں دو نون یک جا
ہو گئے ہیں: ایک تو وہ نون جو جزوِ لفظ کی حیثیت رکھتا ہے، اور ایک نون علامتِ مصدر "نا" کا
(جیسے: سُن + نا۔ گِن + نا۔ چُن + نا وغیرہ) اِن مصدروں میں اور اِن کے جملہ مشتقات میں قاعدے
کے لحاظ سے دو نون لکھے جانا چاہیے (مثلاً: سُننا، گِننا، چُننا۔ اِسی طرح: سُننے میں، گِننے سے،
چُننے کو) ایسے لفظوں میں ایک نون لکھ کر اُس پر تشدید لگانا ٹھیک نہیں ہوگا لیکن پُرانی تحریروں میں
ایسے الفاظ دونوں طرح ملتے ہیں، یعنی دو نون کے ساتھ بھی لکھے ہوئے (جیسے: سُننا، سُننے
سے وغیرہ) اور صرف ایک نون کے ساتھ بھی (جیسے: سُنّا، سُنّے میں)۔ ایسا بھی ہے کہ ایک ہی

تحریر میں دونوں شکلیں نظر آجاتی ہیں۔ بہت سی پرانی چھپی ہوئی کتابوں کا حال بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ [املا کا یہ اختلاف اِن مصادر اور اِن کے مشتقات تک محدود نہیں تھا، بعض اور لفظ بھی اِس دائرے میں شامل ہوگئے تھے، مثلاً " اس سے" کا املا " اسّے" بھی ملتا ہے]۔ کے میں (اور فے میں بھی) ایسے مصدر اکثر مع نونِ مشدّد ملتے ہیں، مثلاً: سُنّے: ۴۴، ۵۹، ۶۲، ۷۰، ۱۱۳۔ جُنّے لگے: ۴۶۔ گنّے لگا: ۲۳ (اِسی طرح اُسّے: ۷۸) مگر بعض جگہ اِس کے خلاف بھی ہے، مثلاً: "میں نہیں ماننے کا" (کے ص ۱۳۱) فے میں بھی یہاں دو نون ہیں۔ "اور پتھر کو لیپتا پوتتا ہے" ص ۱۳۷۔ فے میں بھی اِسی طرح ہے۔ مخطوطۂ گنجِ خوبی کا احوال یہ ہے کہ اُس میں ایسے مصدروں کو اور اُن کے مشتقات کو اکثر مع نونِ مشدّد لکھا گیا ہے اور کم تر دونوں نون لکھے گئے ہیں، مثلاً: اِس عمارت کے بنّے سے: ۳۰۔ نہ سُنّی: ۳۹۱۔ سُنّے والے کو: ۲۷۰۔ سُنّے: ۱۲۹، ۱۳۲، ۱۹۵۔ سُنّے سے: ۳۸، ۶۳۔ سُنّے میں: ۴۸، ۵۹ ـــــ اِس کے برخلاف: سُننا: ۲۷۰۔ جاننے سے: ۱۰۹۔ اِس سے مختلف انداز کی مثالیں: جوتتے ہوتے ہیں: ۶۲۔ چوٹٹے: ۲۴۷ (دوبار)۔ چوں کہ ایسے الفاظ کے سلسلے میں خود میر امّن کی تحریر میں املا کا اختلاف پایا جاتا ہے اور اُن کے یہاں، کم سہی، لیکن وہ املا بھی ملتا ہے جس کو اب رائج املا (یا صحیح املا) کہنا چاہیے اور کے میں بھی بعض مثالیں ایسی ملتی ہیں؛ اِس بنا پر اِس کتاب میں ایسے سب الفاظ کو مروّج املا کی مطابقت کے خیال سے دو نون کے ساتھ لکھا گیا ہے (مثلاً: سُننا، جاننا، ماننا، گِننا، بُننا، چُننا وغیرہ)۔ اِسی طرح: سُننے سے، ماننے کو، جاننے سے وغیرہ)۔ [ع میں ایسے سب لفظوں کو دو نون کے ساتھ ہی لکھا گیا ہے]۔

سَنہ (۳۲): کے، فے اور ع میں اِس عبارت میں دونوں مقامات پر "سن" چھپا ہوا ہے، لیکن کے اور فے کے سرورق پر (اِس معنی میں) "سنہ" چھپا ہوا ملتا ہے: "سنہ ۱۸۰۳ عیسوی، مطابق سنہ ۱۲۱۸ ہجری کے" (کے)۔ "سنہ ۱۸۴۵ عیسوی، مطابق سنہ ۱۲۶۱ ہجری کے" (فے)۔ نیز میر امّن نے مخطوطۂ گنجِ خوبی میں اپنے قلم سے سال کے لیے "سنہ" ہی لکھا ہے: "سنہ ایک ہزار دو سو سترہ ہجری میں"۔ اِسی بنا پر یہاں "سنہ" لکھا گیا ہے۔ وضاحتِ مزید کے طور پر عرض کیا جاتا ہے کہ "سِن" میں سین کے نیچے زیر ہے اور یہ "مقدارِ عُمر" کے معنی و مفہوم میں آیا کرتا ہے، جیسے: ہم سِن، کم سِن۔ یا جیسے: پرس پندرہ یا کہ سولہ کا سِن۔ ہاں، عتیق صدیقی کی کتاب گلکرسٹ اور اُس کا عہد میں اخلاقِ ہندی اور

تو ایجاد یعنی نقشۂ افعالِ فارسی کے سرورق کا عکس شامل ہے؛ ان دونوں میں بھی "سنہ" ہی لکھا ہوا ہے۔
سوال (۱۶۱) : یہ لفظ اِس کتاب میں متعدد مقامات پر آیا ہے، اور ہر جگہ م، ک، ف، نے میں سین پر پیش لگا ہوا ہے (سُوال) مگر دل چسپ صورت یہ ہے کہ ف کے متن میں اگرچہ "سُوال" ہے، مگر اُس کی فرہنگ میں اسے SAWAL (سَوال) لکھا گیا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ مخطوطۂ گنجِ خوبی میں ہر جگہ یہ لفظ اعراب کے بغیر ملتا ہے، یعنی میر امّن نے اِس لفظ کو ہر جگہ س کے پیش یا زبر کے بغیر "سوال" لکھا ہے۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ آصفیہ میں بھی لفظ "سوال" کے س پر کوئی حرکت موجود نہیں، البتّہ اِس کی جمع کو "سُوالات" یعنی سین کے پیش کے ساتھ لکھا گیا ہے۔ اصل لفظ "سُؤال" ہے، مگر سُننے میں عموماً "سَوال" آتا ہے۔ اِس کا امکان ہے کہ اُس زمانے میں "سُوال" بھی زبانوں پر ہو۔ بعض پڑھے لکھے لوگوں کی زبان سے "سُوال" میرے سُننے میں بھی ضرور آیا ہے۔ فیلن نے اپنے لغت میں اسے بہ ضمِّ اوّل (سُوال) لکھ کر، یہ بھی لکھا ہے کہ مقبولِ عام تلفّظ "سَوال" ہے۔ اِس کے برخلاف پلیٹس نے اپنے لغت میں "سَوال" (بہ فتحِ اوّل) کو عامیانہ تلفّظ لکھا ہے۔ چوں کہ ف کی فرہنگ میں اِسے بہ فتحِ اوّل لکھا گیا ہے اور خود میر امّن نے اِس لفظ کو اعراب کے بغیر لکھا ہے، اِس لیے میں نے بھی اُنھی کی پیروی اختیار کی ہے اور اِس لفظ کو اعراب کے بغیر ہی لکھا ہے۔ اگر کوئی شخص "سُوال" پڑھے گا، تو اُسے غلط نہیں کہا جا سکے گا اور اگر کوئی شخص "سَوال" کہے گا تو اُسے بھی نہیں ٹوکا جا سکتا ہے۔ میں ذاتی طور پر "سَوال" کو ترجیح دوں گا۔ میر امّن کا جو عمومی انداز ہے عربی فارسی لفظوں کے تلفّظ کے سلسلے میں، اُس کو اگر پیشِ نظر رکھا جائے تو "سَوال" (بہ فتحِ اوّل) کی ترجیح نمایاں نظر آئے گی — چوں کہ قطعیت کے ساتھ میں اِس لفظ کے تلفّظ کے سلسلے میں یہاں کوئی بات نہیں کہہ سکتا، اِس لیے یہ طریقہ اختیار کیا گیا ہے کہ سین پر کوئی حرکت نہ لگائی جائے۔

سَوانگ (۱۶۲) : ک میں "سَوانگ" ہے، یعنی ایک زبر ہے (جو ظاہر ہے کہ سین سے متعلق ہے) اور واو کا سر بھرا ہوا ہے، خالی نہیں (یعنی یہ کہ یہاں واو معدولہ نہیں) نیز اُس کے نیچے وہ خط بھی نہیں جو اِس کی علامت ہوتا ہے کہ یہاں واو شاملِ تلفّظ نہیں۔ اِس لحاظ سے دیکھیے تو اِس لفظ کا تلفّظ "سَوانگ" بروزنِ "ثواب" قرار پاتا ہے۔ اُردو میں

عمومی طور پر اِس کو دو طرح لکھا جاتا ہے: سوانگ، سانگ۔ جب اِسے "سوانگ" لکھا جاتا ہے تو اِس کے تلفظ میں واو کی آواز کسی حد تک شامل ہوتی ہے (یعنی واوِ مخلوط کے طور پر) اور جب اِسے "سانگ" لکھا جاتا ہے تو اِس کا تلفظ "مانگ" کے وزن پر ہوتا ہے [البتہ وزن کے لحاظ سے "سوانگ" اور "سانگ" کی ایک ہی صورت ہوتی ہے کہ یہ بروزنِ فاع آتے ہیں]۔ فے کی فرہنگ میں اِسے SWĀNG لکھا گیا ہے، اور یوں اِس میں واوِ مخلوط کی نشان دہی ہوتی ہے۔ لغات میں عموماً اِس کی دو ہی شکلیں ملتی ہیں: سوانگ اور سانگ۔ مگر پلیٹس کے لغت میں اِس کی چار شکلیں ملتی ہیں: SUĀNG، SUWĀNG، SAWĀNG، SWĀNG یعنی: سُوانگ، سَوانگ، سُوَانگ، سوْآنگ۔ اِن میں سے دوسری شکل وہی ہے جو کے میں ملتی ہے۔ اِس میں تو شک نہیں کہ "سوانگ" اور "سانگ" یہی دو صورتیں اُردو میں متعارف ہیں، مگر پلیٹس کے اندراج سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اِس کی ایک صورت "سَوانگ" (بروزنِ سلام) بھی ہے اور کے میں اِسی طرح مندرج ہے؛ اِس بنا پر میں نے اِس لفظ کے املا میں کسی طرح کی تبدیلی کو غیر مناسب خیال کیا اور یہ ضروری سمجھا کہ کے کے املا کو برقرار رکھا جائے (عموماً اِسی طریقِ کار کی پابندی کی گئی ہے) خاص کر یوں کہ یہ مسئلہ صرف املا کا نہیں، یہاں تلفظ بھی شامل ہے؛ اِس وجہ سے کے کے مطابق اِس لفظ کو لکھا گیا ہے۔

سِوائے (۱۱): کے، فے، م، ت، ع: سب نسخوں میں اِسی طرح ہے (یعنی ے پر ہمزہ موجود نہیں)۔ کے میں جہاں بھی یہ لفظ آیا ہے، ے پر ہمزہ موجود نہیں۔ م اور فے میں بھی یہی صورت ہے کہ ے کے اوپر ہمزہ نہیں۔ مخطوطۂ گنجِ خوبی میں بھی "سوائے" ہر جگہ ہمزہ کے بغیر ملتا ہے، مثلاً: سوائے سیاست کے ۱۸، سوائے اِس رستے کے ۷، سوائے اُس کے ۱۶، ۲۸، ۱۲۷۔ سوائے ۳۴، ۴۶، ۴۷، ۴۹۔ "سوائے" کی طرح "بجائے" کو بھی میر امن نے (مخطوطۂ گنجِ خوبی میں) ہر جگہ ہمزہ کے بغیر لکھا ہے، مثلاً: بجائے نصیحت کے ۶۴، بجائے پانی کے ۵۲، بجائے حاکمِ عادل کے ۱۴۳-۴ اور کے میں بھی یہ لفظ ہمزہ کے بغیر ہی ملتا ہے۔ [یہ بھی عرض کر دیا جائے کہ اِن لفظوں کا صحیح املا بھی یہی ہے] اِسی بنا پر اِن لفظوں کو ہر جگہ ہمزہ کے بغیر [سوائے۔ بجائے] لکھا گیا ہے۔

سُودا سُلَف (۵): کے میں "سُلَف" ہے، یعنی سین پر پیش لگا ہوا ہے اور لام پر زبر۔

اِس کے برخلاف، م میں "سُلُفت" ہے، یعنی سین اور لام دونوں پر پیش لگے ہوئے ہیں۔ فنے میں "سُلفت" ہے، یعنی سین پر پیش ہے مگر لام خالی ہے؛ البتہ اس کی فرہنگ میں اسے "سُلُفت" لکھا گیا ہے؛ اِس طرح یہ "سوداسُلُفت" ہوا۔ اِس مرکب کی یہ تین صورتیں سامنے آئیں۔ کے میں ص ۱۳۵ پر بھی "سَوداسَلَفت" ہے۔ آصفیہ میں "سَوداسُلَفت" ہے اور مفرد لفظ کو بھی "سین مع لام" کی فصل میں اِسی نسبت سے "سُلَفت" لکھا گیا ہے۔ اِس میں شک نہیں کہ یہ مرکب "سوداسَلَفت" اور "سوداسُلُفت" دونوں طرح مستعمل رہا ہے۔ [پلیٹس نے اپنے لغت میں صرف "سوداسُلَفت" لکھا ہے] مگر اِس میں بھی شک نہیں کہ زیادہ تر "سوداسُلَفت" سننے میں آیا ہے اور آصفیہ کا اندراج اِس کی توثیق کرتا ہے۔ کے کی مطابقت اختیار کی گئی ہے۔

سُوزنی: ۳۶۹ ح ⑤۔

سَوغات (۱۷۶): کے اور فنے میں سین مفتوح ہے، پلیٹس تر لغات میں بھی اسی طرح مندرج ہے [بہارِ عجم، آصفیہ، فیلن اور پلیٹس کے لغات۔ نور میں البتہ اعراب کا تعین نہیں کیا گیا ہے] اِس لحاظ سے اِس لفظ کے سلسلے میں کسی وضاحت کی ضرورت نہیں تھی، مگر غیاث اللغات کے ایک اندراج نے وضاحت کو کچھ ضروری بنا دیا ہے۔ غیاث میں مدار الافاضل کے حوالے سے اسے "بہ ضم" لکھا گیا ہے "بہ معنیِ تحفہ و ہدیہ" مگر یہ بھی لکھا ہے کہ: "وصاحبِ مؤیّد گوید کہ این لفظ ترکی است، و در لغاتِ ترکی بہ فتح نوشتہ، چناں کہ مشہور است ....."۔ "چناں کہ مشہور است" سے بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ لفظ بہ فتحِ اوّل مستعمل رہا ہے۔ "بہ ضمِ اوّل" کی حیثیت "قولِ بعض" کی ہے، اِس لفظ کے بہ فتحِ اوّل ہونے میں مطلق شبہہ نہیں۔ برہانِ قاطع میں "سین مع واو" کی فصل میں "سوغہ" کے ذیل میں لکھا گیا ہے: "بہ فتحِ اوّل و غینِ نقطہ دار، مرسوم باشد کہ سپاہیان از علوفہ و ماہیانہ بہ نویسندگاں دہند"۔ بہ خوبی ممکن ہے کہ "سَوغات" کی بنیاد یہ لفظ "سَوغہ" ہو، ذرا سی معنوی تبدیلی کے ساتھ۔ "سوغات" کی اصل "سَوغ" بھی مرقوم ہے (تفصیل کے لیے دیکھیے غیاث اللغات) ہر صورت میں یہ بات واضح ہے کہ سین پر ہر جگہ زبر ہے۔

سَونپا (۲۵): اِس مقام پر م اور کے میں یہ لفظ مع واوِ مجہول مندرج ہے (سَونپا) اور فنے میں سین پر باقاعدہ پیش لگا ہوا ہے (سُونپا)۔ اِس کے برخلاف کے میں ص ۱۶۳ پر "سَونپ کر" ہے، یعنی سین مفتوح ہے اور فنے میں بھی سین پر زبر لگا ہوا ہے۔ آصفیہ و نور میں "سونپنا"

کو بہ فتحِ اوّل لکھا گیا ہے اور سُننے میں بھی اسی طرح آتا ہے۔ البتہ فیلن اور پلیٹس کے لغات میں اِس مصدر کو "سَونپنا" اور "سُونپنا" دونوں طرح لکھا گیا ہے اور اِس سے یہ اندازہ تو ہو ہی جاتا ہے کہ یہ مصدر بہ ضمِّ اوّل بھی مستعمل رہا ہے۔ چوں کہ ک میں یہ بہ فتحِ اوّل بھی ہے اور بہ ضمِّ اوّل بھی، اور چوں کہ بیش تر استعمال اِس کا بہ فتحِ اوّل ہی رہا ہے اور اب بھی اسی طرح ہے (آصفیہ و نور کے اندراج کے مطابق) اِس بنا پر اُن دو صورتوں میں سے بہ فتحِ اوّل کو مرجّح سمجھا گیا ہے۔

سہی : دیکھیے اِس ضمیمے کے آخر میں ص ۶۱۵ پر۔
دیکھیے "صحیح"۔

سپیدی (ہ۱) : یہ لفظ سینِ مہملہ کے ساتھ بھی ملتا ہے اور شینِ منقوطہ کے ساتھ بھی۔ غیاث میں صرف "شپیدی" ہے۔ نور میں "سپیدی" اور "شپیدی" دونوں لفظ موجود ہیں، البتہ آصفیہ میں نہ "سپیدی" ہے نہ "شپیدی"۔ پلیٹس نے صرف "سپیدی" لکھا ہے اور اسے "شپیدی" کا بدلا ہوا یا بگڑا ہوا تلفظ بتایا ہے، یعنی اُس کے نزدیک عربی کے لفظ "سَیِّدی" کی یہ بدلی ہوئی صورت ہے۔ ک، ف، ع: تینوں نسخوں میں "سپیدی" (مع سینِ مہملہ) ہے، اِسی کی پابندی کی گئی ہے۔ ک میں (اور پلیٹس کے لغت اور غیاث اللغات و نور اللغات میں) اسے بہ یاے معروف لکھا گیا ہے، اِسی کی مطابقت اختیار کی گئی ہے۔

سیلی (ہ۲) : م اور ک میں ہی پر مجہول کی علامت موجود ہے۔ فیلن اور پلیٹس کے لغات میں بھی اِس لفظ کو اسی طرح لکھا گیا ہے؛ اِسی کی پابندی کی گئی ہے۔ وضاحت کی ضرورت یوں پیش آئی کہ ف میں س پر زبر لگا ہوا ہے "سَیلی" (ف ص ۲۰) لیکن یہاں یہ غالباً طباعت کی غلطی ہے، اِس بنا پر کہ اِس نسخے کے آخر میں جو فرہنگ شامل ہے، اُس میں اِسے SELI ہی لکھا گیا ہے اور یہی صحیح صورت ہے۔

شبِ برات (ہ۱) : ک، ف، ع: تینوں نسخوں میں "شب" کی ب کے نیچے اضافت کا زیر لگا ہوا ہے، اسی کی پابندی کی گئی ہے۔ ضمنی طور پر یہ لکھا جاتا ہے کہ سُننے میں یہ مرکب اضافت کے بغیر بھی آیا ہے، لیکن خواص کی زبان سے مع اضافت ہی سُنا گیا ہے اور اشعار میں بھی مع اضافت یہ نظر سے گزرا ہے۔ آصفیہ میں "شب برات" اضافت کے بغیر مندرج ہے، لیکن سند میں ناسخ کا مندرجۂ ذیل شعر درج کیا گیا ہے، جس میں یہ مع اضافت آیا ہے:
کیوں نہ اشک اپنے پھلجھڑی کی طرح ہو شبِ فرقت، شبِ برات نہیں۔

نور اللغات میں اسے "شبِ برات" لکھ کر، یہ صراحت بھی کی گئی ہے کہ : "اُردو بول چال میں بغیر اضافت ہے" لیکن سند میں ناسخ کا مندرجۂ بالا شعر درج کیا گیا ہے (جس میں یہ مع اضافت آیا ہے) غالباً یہ فرق بول چال اور ادبی زبان کا ہے۔ بول چال میں یہ اضافت کے بغیر ضرور آتا ہے، لیکن اس طرح کہ اس کی ترکیبی حیثیت گویا ختم ہو جاتی ہے اور یہ مرکّب، مفرد لفظ کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے، اور معنوی تبدیلی یہ ہوتی ہے کہ لفظ "شب برات" دن اور رات، دونوں پر حاوی ہو جاتا ہے۔ فاتحہ، آتش بازی اور رات کی عبادت؛ سب چیزیں اِس میں شامل ہو جاتی ہیں۔ مزید ایک تبدیلی اس میں یہ بھی ہوئی ہے کہ عوام کے استعمال میں اس نے "شبرات" کی شکل اختیار کر لی ہے ["شبراتی" اور "شبراتن" نام اِسی سے بنتے ہیں]۔

غرض کہ اصل لفظ "شبِ برات" ہے۔ اُردو میں زبانوں پر اضافت کے بغیر (شب برات) آتا ہے لیکن اس میں اُس خاص رات کی تحدید نہیں، مجموعی طور پر دن اور رات دونوں پر حاوی ہوتا ہے۔ اور ادبی زبان میں جب رات کی تخصیص مراد ہوتی ہے تو "شبِ برات" مع اضافت ہی آتا ہے۔ ناسخ کا منقولۂ بالا شعر اِس کی بہ خوبی وضاحت کر رہا ہے۔ مزید توثیق کے لیے آتش کے اِس شعر کو پیش کیا جا سکتا ہے : شبِ برات جو زلفِ سیاہ یار ہوئی ؛ جبیں سے صبح سے لیے عید آشکار ہوئی۔ میر امّن کے اِس جملے کو ("دن عید اور رات شبِ برات تھی") غور سے دیکھا جائے تو صاف صاف معلوم ہوگا کہ معنوی طور پر یہاں "شبِ برات" کا محل ہے یعنی عید کے دن کے مقابلے میں اُس خاص رات کا حوالہ دیا گیا ہے؛ اور اِس بنا پر معنوی مناسبت کا بھی یہی تقاضا ہے کہ یہاں "شبِ برات" ہو۔

شُبَہہ (۱۱۲۶) : ک، ف، ع : سب میں "شبہ" ہے۔ مخطوطۂ گنجِ خوبی میں بھی متعدد مقامات پر یہ لفظ آیا ہے اور ہر جگہ "شبہہ" لکھا ہوا ہے؛ اس کتاب میں اس لحاظ سے اِس لفظ کا یہی املا مرجّح قرار پاتا ہے، اِسی کی مطابقت اختیار کی گئی ہے۔ اِس لفظ کے سلسلے میں ذرا سی وضاحت کی ضرورت ہے۔ اصل لفظ "شُبْہَہ" ہے۔ صاحبِ بہارِ عجم نے لکھا ہے کہ فارسی والوں نے "شبہ" بھی استعمال کیا ہے۔ لفظِ "شبہہ" کے ذیل میں لکھا ہے : "و فارسیان بہ معنیِ گمان استعمال نمایند، و بہ فتح دوم و ہاے ملفوظ نیز آمدہ۔ بدر چاچی : بہانہ ایست غروبِ آفتاب را ہر شام ؛ درست با تو بگویم کہ نیست شک و شبہہ ؛ چو آسمان بہ سوی قصرِ شاہ کرد نظر ؛

زر قفس زیر آسمان فتادہ کلہ"۔ اُردو میں بول چال کی حد تک اصل لفظ "شُبْہَہ" کی مفرس صورت "شُبہ" مستعمل ہے۔ آتش نے "شُبہ و شک" نظم کیا ہے: شیریں کلام کا بھی مزہ کھلتا نہیں ہے شیر و شکر ملے ہیں یہ بلا شبہ و شک لذیذ۔ عطفی ترکیب کی صورت میں "ب" کا جزم اجنبی نہیں معلوم ہوتا، لیکن ترکیب کے بغیر یہ لفظ "ب" کے زبر کے ساتھ ہی استعمال میں آتا ہے۔ کے اور فے میں اس لفظ کا املا اُردو میں استعمالِ عام کے مطابق ہے۔ دونوں میں "شین" کے اوپر پیش لگا ہوا ہے مگر "ب" خالی ہے۔ اس لفظ کی مفرس صورت "ب" کے زبر کے ساتھ ہے اور اُردو میں بھی اسی طرح زبانوں پر ہے؛ اسی بنا پر "ب" کے اوپر زبر لگایا گیا ہے۔ ایک بات اور: عربی کے لغت المنجد سے معلوم ہوتا ہے کہ عربی میں واحد لفظ "شُبْہَہ" ہے اور اس کی جمع "شُبَہ" اور "شُبُہات" آتی ہیں۔ گویا عربی میں جو ایک صورت جمع کی ہے (شُبَہ) وہ اُردو میں بہ طورِ واحد مستعمل ہے اور یہ تصرف پہلے فارسی میں ہوا۔ مختصر یہ کہ عربی کا لفظ "شُبْہَہ" اُردو (اور فارسی) نظم میں اصل کے مطابق ملتا ہے، مگر اُردو کی بول چال میں "شُبَہ" نے رواج پایا۔

شَتَّا ہو (۱۳۰): اصل لفظ "شَطّاح" ہے۔ آصفیہ میں بھی یہی ہے، مگر نور میں "شَتّاہ" کو بھی درج کیا گیا ہے اور جس طرح درج کیا گیا ہے، اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ عربی "شطّاح" کی اُردو صورت "شَتّاہ" ہے اور یہ بالکل صحیح ہے۔ اُردو میں اس کی ایک صورت "شتّا" بھی ہے اور یہ بھی نور میں موجود ہے۔ اس لفظ کے سلسلے میں یہ وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ فے اور ع میں جو فرہنگیں ہیں، اُن میں "شتّا" درج ہے اور اس سے واضح طور پر یہ مطلب نکلتا ہے کہ ان نسخوں کے مرتبین نے اس جملے میں "شتّا" پڑھا ہے اور فعل "ہو نکلی" مانا ہے۔ [شتّا ہو نکلی] مگر یہ قراءت درست نہیں ہوگی۔ اس جملے میں "نکلی" فعل ہے اور اسمِ صفت "شتّا ہو" ہے۔ اصل لفظ "شتّاہ" کو میر امن نے مع اضافۂ واو استعمال کیا ہے اور یہ اُن کا خاص انداز ہے، جس طرح "دریا" کو "دریاو" اور "امرا" کو "امراو" انھوں نے لکھا ہے، اُسی طرح "شتّاہ" کو "شتّا ہو" بنا لیا ہے۔

شُجَاعت (۱۰۲): عربی میں یہ لفظ بہ فتحِ اوّل ہے۔ مولفِ غیاث اللغات نے تو یہ بھی لکھ دیا ہے کہ: "بہ فتح صحیح است و بہ ضم غلط"۔ آصفیہ میں بھی "شَجاعت" ہے، یعنی شین کے اوپر زبر لگا ہوا ہے۔ نور میں تو وضاحتاً مرقوم ہے کہ "بہ فتحِ اوّل و چہارم صحیح، بہ ضمِ اوّل غلط ہے۔"

کے میں شین کے اوپر پیش لگا ہوا ہے۔ فے میں اس لفظ پر اعراب موجود نہیں، مگر اُس کے آخر میں جو فرہنگ ہے، اُس میں اِسے بہ ضمِّ اوّل ہی لکھا گیا ہے۔ نز بانوں پر بھی اسی طرح ہے۔ فیلن نے بھی اپنے لغت میں اِسے بہ ضمِّ اوّل ہی لکھا ہے۔ کے اور فے کی مطابقت اختیار کی گئی ہے اور شین کے اوپر پیش لگایا گیا ہے۔

شَخنَہ (۱۴۵): عربی اور فارسی میں شین مکسور ہے [المنجد۔ برہانِ قاطع، مرتبہ ڈاکٹر معین، حاشیہ، جلد سوم، ص ۱۲۵۶] آصفیہ میں بھی "شِحنہ" ہے، مگر نور میں یہ صراحت بھی موجود ہے کہ: "اردو میں زبانوں پر بالفتح ہے" اور یہ بالکل صحیح ہے۔ فیلن نے اپنے لغت میں اسے بہ فتحِ اوّل ہی لکھا ہے۔ کے اور فے میں اس لفظ پر اعراب موجود نہیں، مگر فے کی فرہنگ میں اسے بہ فتحِ اوّل ہی لکھا گیا ہے، اسی نسبت سے شین کے اوپر زبر لگایا گیا ہے۔

شُعُور (۲۱۰): م، کے، فے میں شین پر پیش موجود ہے۔ بہ لحاظِ اصل بھی شین مضموم ہے۔ اِس میں شک نہیں کہ اب بیش تر لوگوں کی زبان سے "شَعور" سننے میں آتا ہے۔ آصفیہ میں بھی "شَعور" ہے، یعنی شین پر زبر موجود ہے (مگر نور میں "شُعور" ہے) چوں کہ تین نسخوں میں شین پر پیش لگا ہوا ہے، اِس بنا پر اُسے زبر سے بدلنا مناسب نہیں سمجھا گیا، جس طرح لفظ "بِہِشت" کو بہ کسرِ اوّل و دوم ہی رکھا گیا ہے؛ کیوں کہ اِن سب نسخوں میں بے کے نیچے زیر موجود ہے، اگرچہ آصفیہ میں "بَہِشت" ہے، اسی طرح اِس لفظ کو بھی اِن نسخوں کے مطابق ہی برقرار رکھا گیا ہے۔

شُغُل (۱۰۷): صاحبِ غیاث اللغات نے منتخب اللغات کے حوالے سے لکھا ہے کہ شُغل، شُغُل، شَغل، شَغَل؛ چاروں طرح درست ہے؛ "بہ ہر چہار وجہ درست"۔ یہی بات آصفیہ میں لکھی گئی ہے: "یہ لفظ بالضّم و بضمتین، بالفتح و بفتحتین چاروں طرح درست ہے"۔ م میں شین پر پیش لگا ہوا ہے۔ کے میں یہاں پر تو شین پر حرکت موجود نہیں، لیکن ص ۲۰۸ پر بھی یہ لفظ آیا ہے، اور وہاں شین پر پیش لگا ہوا ہے، اور فے میں دونوں مقامات پر شین پر پیش لگا ہوا ہے، اِسی بنا پر اسے بہ ضمِّ اوّل لکھا گیا ہے۔

شَفَقَت (۱۱۷): کے اور فے میں اِس لفظ پر اعراب موجود نہیں، لیکن فے کی فرہنگ میں بہ فتحِ اوّل و دوم (شَفَقَت) ہے۔ عربی میں "شَفَقَة" ہے (المنجد)۔ فارسی میں بیش تر "شَفقت" ملتا ہے، لیکن یہ صراحت بھی ملتی ہے کہ "در عرفِ عام بہ سکونِ ثانی شہرت دارد" (غیاث اللغات)

اُردو میں بھی یہی صورتِ حال ہے کہ شاعروں نے بہ فتحِ اوّل و دوم نظم کیا ہے، مگر استعمالِ عام میں یہ لفظ بہ سکونِ دوم آتا ہے۔ آصفیہ میں "شفقت" ہے، مگر یہ بھی لکھا گیا ہے کہ "فارسی والوں نے بہ سکونِ دوم جائز رکھا ہے"۔ اس سے اُردو کا احوال نہیں کھلتا اور بہ ظاہر یہی مترشح ہوتا ہے کہ اُردو میں بہ فتحِ اوّل و دوم ہوگا۔ البتہ نور میں یہ ضرور لکھا گیا ہے کہ: "فارسی اُردو میں بہ سکونِ دوم مستعمل ہے"۔ واقعہ یہی ہے کہ "برکت اور عظمت" کی طرح "شفقت" بھی استعمالِ عام میں بہ سکونِ دوم آتا ہے۔ میر امن نے گنجِ خوبی میں اسے بہ سکونِ ف نظم کیا ہے: جس نے شفقت میں سر بلندی کی، آنکھ دولت کی اس کے منہ پہ کھلی (مخطوطہ گنجِ خوبی، ص ۸۲) اسی بنا پر "ف" پر جزم لگایا گیا ہے۔

شَکَّر (۲۲۶): کے میں "شکّر" ہے، یعنی تشدید موجود ہے۔ فن اور ع میں "شکر" ہے۔ کے کی مطابقت اختیار کی گئی ہے۔ [واضح ہو کہ شکر اور شکّر دونوں صورتیں بجائے خود صحیح ہیں اور یہ لفظ دونوں طرح مستعمل رہا ہے۔ آصفیہ میں بھی "شکر یا شکّر" مندرج ہے اور مومن کا یہ شعر سنداً لکھا گیا ہے: کیا لاابالی ہے تری تیزیِ دہن میں شکّر، دیکھیو مجھ کو بھی اے طفلِ حسیں تھوڑی سی]

شِگُفتہ (۱۷): کے، فن: شِگُفتہ۔ م: شُگُفتہ۔ فارسی لغات میں اسے بہ کسرِ اوّل و ضمِ ثانی اور بہ ضمِ اوّل و ثانی، دونوں طرح لکھا گیا ہے (برہانِ قاطع، بہارِ عجم، غیاث اللغات)۔ آصفیہ میں "شِگُفتہ" اور "شِگُفتگی" ہے، یعنی دونوں لفظوں میں شین کے نیچے زیر اور گاف کے اوپر پیش لگا ہوا ہے اور اس سے اُردو میں استعمالِ عام کا بہ خوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ کے کے مطابق شین کے نیچے زیر لگایا گیا ہے اور گاف کے اوپر پیش۔

شِلَّک (۱۲۶۱): کے میں شین کے نیچے زیر ہے اور لام پر زبر۔ غیاث اللغات میں اس لفظ کے متعلق مرقوم ہے: "بالکسر و تشدید لام مکسور و کاف عربی، آوازِ چند بندوق کہ یکبارگی سر دہند۔ ایں لفظ ترکیست۔ از لغاتِ ترکی نوشتہ شد"۔ مطلب یہ نکلا کہ یہ لفظ اصلاً بہ کسرِ اوّل و دوم "شِلِّک" ہے۔ آصفیہ میں "شَلَک یا شَلَق" ہے اور مزید وضاحت یوں کی گئی ہے: "ت، اسمِ مؤنث، صحیح شِلِّک"۔ اس سے صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ ترکی لفظ "شِلِّک" اُردو میں بہ فتحِ اوّل "شَلَک" ہو گیا، لیکن لام کی حرکت کی صراحت نہیں، اس سے اُلجھن پیدا ہوتی ہے۔ فیلن کے لغت میں اصل لفظ "شِلِک" لکھا گیا ہے اور مقبولِ عام تلفظ "شَلَک" (بہ فتحِ اوّل و دوم) بتایا گیا ہے۔ کے کی مطابقت اختیار کی گئی ہے۔ ن میں

"سلخ" ہے (ظاہراً غلطیِ کتابت)۔

شَلُوکا (ص۱۹۸) : ن، ک، ش، ع : سب نسخوں میں اس لفظ کا یہی املا ہے، یعنی آخر میں الف ہے [صحیح املا بھی یہی ہے] یہ صراحت یوں کی گئی کہ بعض لوگ اسے "شلوکہ" بھی لکھ دیتے ہیں۔

شمشیر (ص۸۵) : ک، میں "ی" پر علامتِ مجہول موجود ہے۔ ک، میں کئی جگہ یہ لفظ آیا ہے اور ہر جگہ مع یائے مجہول (شمشیر) ہے۔ اسی کی مطابقت اختیار کی گئی ہے اور اسے مع یائے مجہول لکھا گیا ہے۔ فارسی میں یہ بہ لحاظِ اصل مع یائے مجہول ہے، مگر مع یائے معروف کی مثالیں بھی ملتی ہیں۔ اُردو میں یہ لفظ شعرا کے یہاں مع یائے معروف اور مع یائے مجہول دونوں طرح ملتا ہے۔ صاحبِ آصفیہ نے لکھا ہے کہ : "اگرچہ یہ لفظ بہ یائے مجہول ہے.... مگر اُردو والوں نے بہ یائے معروف .... باندھا ہے"۔ مولفِ نور نے کچھ زیادہ وضاحت سے کام لیا ہے : "اُردو میں بھی مستند شعرا نے تدبیر و زنجیر کے قافیے میں استعمال کیا ہے.... بعض شعرا نے "شیر" کے قافیے میں یائے مجہول سے بھی کہا ہے" اور اس کی مثال میں میر انیس کا ایک شعر درج کیا ہے جس میں "شیر" اور "شمشیر" قوافی ہیں۔ خواجہ میر دردؔ کی ایک غزل کا مطلع ہے : عاشق بیدل ترا پھاں تک جو جی سے سیر تھا : زندگی کا اُس کی جو دم تھا، دمِ شمشیر تھا۔ یہ پانچ اشعار کی غزل ہے، اس کے دیگر قوافی ڈھیر، شیر، گھیر، پھیر ہیں۔ اس سے قطعی طور پر اس کی تصدیق ہو جاتی ہے کہ یہ لفظ مع یائے مجہول بھی مستعمل رہا ہے۔

شِناسی (ص۴۴) : اس کا مصدر "شِناختن" بہ کسرِ اوّل ہے (حاشیۂ برہانِ قاطع، مرتبۂ ڈاکٹر محمد معین) اور اس اعتبار سے اس کے مشتقات کو بہ کسرِ اوّل آنا چاہیے۔ اُردو میں صورت یہ ہے کہ "شناس" اور "شناسی" شِنے میں بہ کسرِ اوّل بھی آتے ہیں اور بہ فتحِ اوّل بھی۔ نور اللغات میں لفظِ "شناسائی" کے ذیل میں لکھا گیا ہے کہ "بہ فتحِ اول"۔ اس کے مقابلے میں آصفیہ میں "شِناس، شِناسا، شِناسائی" مندرج ہیں، یعنی شین کے نیچے زیر لگا ہوا ہے۔ م، ک، اور ف، میں "شِناسی" ہے، یعنی شین کے نیچے زیر لگا ہوا ہے۔ ک، میں ص۶۲ پر "روشِناس" ہے، اور یہاں بھی شین کے نیچے زیر موجود ہے۔ علاوہ ازیں، مخطوطۂ گنجِ خوبی میں میر امن نے ہر جگہ "شناسی" کے شین کے نیچے زیر لگایا ہے، مثلاً : روشِناسی ص۲۳۵، حق شِناسی ص۲۲۷، ص۲۷۱، صورت ناشِناسی ص۲۳۷۔ اسی کی مطابقت اختیار کی گئی ہے اور ان

دونوں لفظوں کو ہر جگہ اس کتاب میں بہ کسرِ اوّل لکھا گیا ہے۔

شُنُود (گُفت و شُنُود) (۵): م، ک، ادر ف میں شین پر پیش لگا ہوا ہے، اسی کی مطابقت اختیار کی گئی ہے۔ فارسی میں "شنودن" بہ ضمِّ اوّل ہی ہے۔ برہانِ قاطع میں "شنودن" موجود نہیں تھا، اس کے ایرانی مرتّب ڈاکٹر معین نے حاشیے پر اس کا اضافہ کیا ہے (جلدِ سوم، ص ۱۳۰۴) اور اسے "بہ ضمِّ اوّل و دوم" لکھا ہے۔ اس صراحت کی ضرورت یوں محسوس ہوئی کہ اردو لغات میں سے آصفیہ اور نور دونوں لغات میں "شنودن" یا "شنود" یا "گفت و شنود" موجود نہیں۔

شَنید: ص ۲۸۳، ح ④ [آصفیہ میں "گفت و شنید" البتہ موجود ہے، مگر "شنیدن" بہ فتحِ شین ہے]۔

شوربا (آخر میں الف): ص ۴۵۵، ح ③۔

شُولا (۲۳۴): ک میں واو پر علامتِ مجہول موجود ہے۔ سب نسخوں میں اس لفظ کا یہی املا ہے، یعنی آخر میں الف ہے؛ اسی املا کو برقرار رکھا گیا ہے۔ اس لفظ کے سلسلے میں بعض باتوں کی تشریح ضروری ہے۔

فارسی میں "شُلّہ" ہے (برہانِ قاطع) اور اس کے معنی ہیں: "نوعے از طعام کہ برنج را در آب گوشت بہ طورِ ہریسہ می پزند" (غیاث اللغات)۔ صاحبِ غیاث اللغات نے یہ بھی لکھا ہے کہ ہندستان میں ناواقف لوگ اس کو "شولہ" بھی کہتے ہیں، واوِ مجہول کے ساتھ۔ یہ بھی لکھا ہے کہ میں نے بعض ثقہ حضرات کو بہ ضمِّ اوّل و تشدیدِ لام (یعنی شُلّہ) بولتے بھی سنا ہے جب کہ مذکورہ کھانے کے معنی میں "شُلّہ" کہنا بڑی بری غلطی ہے، کیوں کہ "شُلّہ" کے ایک معنی ہیں: لتّۂ حیض۔ اس کے بعد مؤلف نے سراج الدین علی خان آرزو کا یہ قول نقل کیا ہے کہ ہندستان میں "شُلّہ" کے معنی میں جو "شولہ بہ واوِ مجہول شہرت دارد، اصلِ آن دیدہ نشدہ"۔ ان مختلف اقوال سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ ایک خاص طرح کے کھانے کے معنی میں اصل لفظ "شُلّہ" تھا۔ ہندستان میں اسے مختلف لوگ "شُولہ" اور "شُلّہ" بھی کہتے تھے۔

آصفیہ میں "شُلّہ" ہے اور اس کے معنی لکھے ہیں: "ایک قسم کا کھانا جو چاولوں کو گوشت کے شوربے میں بطورِ ہریسہ نہایت گلا کر پکایا جاتا ہے اور جاہل لوگ اسے "شولہ" کہتے ہیں۔ بعض اوقات پتلی کھچڑی کو بھی "شولہ" کہتے ہیں۔"

مولفِ نوراللغات نے "شُعلہ" کا اُردو مرادف "پتلی کھچڑی" لکھا ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ "دہلی میں عوام کی زبانوں پر "شُولہ" ہے"۔ اِس کا واضح طور پر مطلب یہ نکلا کہ لکھنؤ میں اِس معنی میں "شُلّہ" کہتے ہیں۔

فارسی میں جو بھی صورت ہو، مندرجۂ بالا حوالوں سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ اُردو میں "شُلّہ" اور "شُولہ" (مع واوِ مجہول) دونوں لفظ مستعمل رہے ہیں۔ صاحبِ آصفیہ نے یہ جو لکھا ہے کہ "شولہ" جاہل لوگ کہتے ہیں، یہ اُن کی زیادتی ہے۔ خانِ آرزو کا جو قول اوپر نقل کیا گیا ہے، اُس سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ اُس زمانے میں بہت سے بولنے والوں کی زبان پر "شُولہ" (مع واوِ مجہول) تھا ("شولہ بہ واوِ مجہول شہرت دارد")۔

"شُلّہ" اور "شُولہ" دونوں لفظوں کو لغات میں مع ہائے مختفی لکھا گیا ہے، مگر ن، ک، ف، ع، سب میں "شُولا" ہے مع الف۔ اصولاً یہ املا بالکل درست ہے، اِس بنا پر کہ "شُولا" ہندی صورت ہے "شُلّہ" کی اور تہنید کی صورت میں بعض اوقات املا بھی بدل جایا کرتا ہے اور اِس کی بہت سی مثالیں موجود ہیں جیسے: بُزدلا، چوراہا، تمنزلا، بادلا۔ اِس قیاس پر "شولا" کو جو الف سے لکھا گیا ہے، وہ بالکل صحیح ہے۔

شہبال (۲۴۳): ن میں ہر جگہ "شہپال" ہے، جب کہ ک، ف، ع میں ہر جگہ "شہبال" ہے۔ چوں کہ کے اور ف میں ہر جگہ اِسے ب کے ساتھ لکھا گیا ہے، اِس لیے اِسی املا کو برقرار رکھا گیا ہے۔ یہاں اِس طرف اشارہ کرنا بے محل نہ ہوگا کہ فسانۂ عجائب میں جس جادوگر کا ذکر ہے، وہ شہپال" ہے۔ جادوگروں کے ناموں پر نظر رکھی جائے تو "شہپال" مرجح نظر آئے گا۔ ایک تاویل یہ کی جاسکتی ہے کہ باغ و بہار میں جس بادشاہ کا ذکر ہے، وہ جادوگر نہیں، بلکہ جنوں کا بادشاہ ہے؛ اِس لیے میر امّن نے "شہبال" (شہ۔ بال) لکھا ہے اور معنوی مناسبت اِسی نام میں ہے۔ "بال" کے کئی معنی ہیں، من جملہ اُن کے "پرند کے بازو کا پچھلا جوڑ جس کے زور سے پرواز کرتا ہے۔ بازو۔ پر" (آصفیہ) بھی ہیں، اور اِس لحاظ سے جنوں کے بادشاہ کا نام "شہبال" (شہ۔ بال) نہایت مناسب ہے۔

شیخیاں (۲۷): ک میں ی پر علامتِ مجہول موجود ہے (اور اُردو کے لحاظ سے یہ بالکل درست ہے)۔ ف میں شین پر زبر لگا ہوا ہے "شَیخیاں"۔ اصل لفظ "شَیخ" (بہ فتحِ اوّل) ہے، عربی یا فارسی ترکیب کی صورت میں یہ زبر برقرار رہتا ہے [جیسے: شَیخ الاسلام، شَیخِ وقت]

"شیخوخت" بھی بہ فتحِ اوّل مستعمل ہے؛ مگر اُردو محاورات میں یہ لفظ عموماً بہ کسرِ اوّل زبانوں پر آتا ہے، جیسے: شیخ چلّی بننا۔ اسی طرح "شیخی" بھی بہ کسرِ اوّل مستعمل ہے۔ آصفیہ اور نور میں تبدیلِ حرکات کی صراحت موجود نہیں؛ مگر فیلن نے وضاحت کردی ہے کہ عام تلفظ بہ کسرِ اوّل ہے اور پلیٹس نے بھی امثال میں ایسے سب لفظوں کو بہ کسرِ اوّل لکھا ہے۔ کے کے مطابق یہاں شین کے نیچے زیر لگایا گیا ہے۔

صاحب (۵): م، کے، ف میں ح کے نیچے زیر لگا ہوا ہے۔ اِن نسخوں میں جہاں بھی یہ لفظ آیا ہے، ہر جگہ ح کے نیچے زیر موجود ہے۔ [بہ لحاظِ اصل بھی یہ لفظ بہ کسرِ سوم ہے] اِسی بنا پر اِس کتاب میں ہر جگہ "صاحِب" لکھا گیا ہے۔

اِس لفظ کے سلسلے میں کچھ وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے۔ تنفّظ میں "صاحَب" بھی آتا ہے؛ اور انگریز جب تک یہاں تھے، تو اُن کے لیے بھی "صاحَب بہادر" تلفّظ میں آجایا کرتا تھا۔ غالب نے اِسے بہ فتحِ سوم نظم بھی کیا ہے اور صاحبِ نور اللّغات نے اِس طرف توجّہ دلائی ہے۔ انھوں نے لکھا ہے: "اُردو میں "صاحب" بہ فتحِ سوم بھی ہے: دل لگا کر آپ بھی غالب مجھی سے ہوگئے؛ عشق سے آتے تھے مانع میرزا صاحب مجھے۔ طلب، مکتب قافیے ہیں" مگر دراصل یہ شعری ضرورت کا کرشمہ ہے؛ ایسے کئی اور لفظوں کی طرح۔ مثلاً ایک لفظ ہے "کافر"، یہ مسلّمہ طور پر بہ کسرِ سوم (کافِر) ہے، لیکن اِسے "خنجر" اور "دل بر" جیسے الفاظ کا ہم قافیہ کیا گیا ہے؛ اِس کے باوجود اصل لفظ "کافِر" ہی رہا۔ یہی صورت "صاحِب" کی ہے۔ "صاحَب" یا تو ضرورتِ شعری کی بنا پر قافیے میں آیا ہے، یا پھر وہ گفتگو تک محدود رہا۔ اِس لفظ کے سلسلے میں صراحت کی خاص کر ضرورت یوں محسوس ہوئی کہ صاحبِ نور اللّغات نے یہ جو لکھا ہے کہ "اُردو میں بہ فتحِ سوم بھی ہے"؛ اِس سے صحیح صورتِ حال سامنے نہیں آتی۔ یہ وضاحت بھی ضروری تھی کہ جب یہ لفظ ترکیبِ فارسی کے ساتھ آتا ہے، تو اُس صورت میں بہ کسرِ سوم ہی آتا ہے۔ مثلاً: صاحِبِ دولت (مع اضافت) یا صاحِب دل (بغیرِ اضافت)۔ اِسی طرح "صاحِبان" اور "صاحِبو" میں بھی ح مکسور رہتی ہے۔

صاحِبِ جمال (مع اضافت): ص ۲۹۰، حاشیہ (۸)۔

صاحِبِ قِران (مع اضافت): ص ۲۶۶، حاشیہ (۳)۔

صُبح (۱۴) : یہ لفظ اِس کتاب میں کئی جگہ آیا ہے اور م، کے، فہ میں صرف صاد پر پیش لگا ہوا ملتا ہے (ب خالی ہے) البتہ فہ کی فرہنگ میں اِسے "صُبْح" لکھا گیا ہے۔

دل چسپ بات یہ ہے کہ مخطوطۂ گنجِ خوبی میں بھی یہ لفظ اِسی طرح ملتا ہے یعنی صرف ضاد پر پیش لگا ہوا ہے۔ اصلاً "صُبْح" ہے، اضافت کی صورت میں یہی تلفظ نمایاں رہتا ہے؛ جیسے : صُبحِ قیامت؛ مگر مفرد صورت میں یہ "صُبَح" بھی سُننے میں آجایا کرتا ہے ("جَمَع" اور "نَفَع" کی طرح)۔ میں نے بھی اصل کی مطابقت میں ب کو خالی رکھا ہے۔ چوں کہ کسی نسخے میں ب پر زبر موجود نہیں، اِس لیے اِس قیاس کے لیے بجا طور پر گنجایش موجود ہے کہ ب کو ساکن کہا جا سکتا ہے؛ اور یوں "صُبْح" کہنا مناسب ہو سکتا ہے۔

صُبح خیزیے (۱۰) : کے، فہ، ع میں اِسی طرح ہے۔ م (اور ن) میں یہ ٹکڑا یوں ہے : "اور چور چکار، جیب کترُوں، صُبح خیزیوں، اٹھائی گیروں، دغا بازوں کو..." "صُبح خیزے" کا واحد "صبح خیز" یا "صبح خیزا" ہوا اور "صبح خیزیوں" کا "صبح خیزیا"۔ شاعروں کے یہاں "صبح خیزیا" نظر سے گزرا ہے، آصفیہ میں اِس کی مثال میں یہ اشعار مندرج ہیں : بچ سکے کیوں کر اب کسی کی شے ؛ ملّا مسجد کا صبح خیزیا ہے (سودا)۔ شیخِ حرم، موذّن دونوں چلن کے بد ہیں؛ یہ صبح خیزیا ہے تو وہ اُٹھائی گیرا (مصحفی)۔ انشا نے دریاے لطافت میں "صبح خیزیا" لکھا ہے (ترجمۂ دریاے لطافت، ص ۱۶۸)، مگر آصفیہ میں "صبح خیز۔ یا۔ صبح خیزیا" مندرج ہیں، یعنی مولّف نے دونوں لفظوں ("صبح خیز" اور "صبح خیزیا") کو درجِ لغت کیا ہے اور اور اِس طرح "صبح خیز" سے "صبح خیزے" بنے گا۔ پلیٹس کے لغت میں "صبح خیز"، "صبح خیزا"، "صبح خیزیا" تینوں لفظ موجود ہیں۔ فہ کی فرہنگ میں "صبح خیزا" لکھا گیا ہے، اور اِس کا واضح طور پر مطلب یہی ہے کہ فہ کے مرتّب نے (اصل نسخے کے مطابق) اِس عبارت میں "صبح خیزے" ہی لکھا ہے (یعنی اِس میں کتابت کی غلطی نہیں)۔ ع کی فرہنگ میں بھی "صبح خیزا" ہے۔ مقصود یہ ہے کہ "صبح خیزے" بھی بجاے خود صحیح ہے۔ م میں جو "صبح خیزیوں" ہے، اُس کا واحد "صبح خیزیا" ہوا اور اِس کا مطلب بہ ظاہر یہ نکلتا ہے کہ روایتِ اوّل میں "صبح خیزیا" ہی کو اصل مانا گیا تھا اور بعد کو روایتِ ثانی میں جب جملے کو بدلا گیا تب اُسے "صبح خیزے" بنا دیا گیا۔ چوں کہ "صبح خیزے" بھی بجاے خود درست ہے اور کے میں (جو

روایت ثانی ہے) وہی مندرج ہے، اِس بنا پر اُسی کو برقرار رکھا گیا ہے۔

صحیح (ص ۱۸۴): سب نسخوں میں اِسی طرح ہے۔ اصل لفظ بھی یہی ہے، بعد کو یہ "سہی" میں بدل گیا اور اب عام طور پر ایسے مواقع پر "سہی" لکھتے ہیں۔ انشا نے دریاے لطافت میں لکھا ہے: "اُن الفاظ کی کتابت جو اُردو میں اصل کے خلاف مستعمل ہوتے ہیں، مختلف ہے۔ کہیں تو اصل کی رعایت رکھی جاتی ہے اور کہیں نہیں ... "سہی" کو ہندی قرار دے کر، صاد اور حاے حطّی کی جگہ سین اور ہاے ہوّز سے لکھتے ہیں اور آخر کی ح کو حذف کر دیتے ہیں" [ترجمۂ دریاے لطافت، ص ۳۵۸] باباے اُردو مولوی عبدالحق مرحوم نے ع کے مقدّمے میں زبان پر بحث کرتے ہوئے اِس لفظ کے متعلق لکھا ہے: "بعض الفاظ کے املا میں بھی فرق پایا جاتا ہے ... لیکن ایک جگہ اصل لفظ ہی لکھ دیا ہے: "کہو تو صحیح"۔ اب اِس کی جگہ "سہی" لکھتے اور بولتے ہیں۔" ["سہی" کی سند میں قائم چاندپوری کا یہ شعر بھی پیش کیا جا سکتا ہے: مگر بندگی اِس کی ہے مقتضی کہ صاحب جو فرمائے، سو ہے سہی [کلیاتِ قائم، جلدِ دوم، مرتّبہ اقتدا حسن، شائع کردہ مجلسِ ترقیِ ادب لاہور، ص ۴۰] ۔

صَفَدَر: ص ۳۸۸، ح (۱۰) ۔

صلوٰۃ (ص ۴): م: صلوٰۃ۔ کے: صلواۃ۔ فے: صلْواۃ۔ ع: صلواۃ۔

مفرد لفظ "صلوٰۃ" ہے [اِس کا املا "صلاۃ" بھی ہے (المنجد)] کے میں جو "صلواۃ" چھپا ہوا ہے، یعنی واو کے بعد الف لکھا ہوا ہے، تو غالباً یہ ٹائپ کی مجبوری کی بنا پر ہوا ہے، کیوں کہ واو کے نیچے جو چھوٹی سی لکیر کھنچی ہوئی ہے، اِس علامت کا مطلب گل کرسٹ کے مقرر کردہ اصول کے مطابق یہ ہے کہ واو یہاں ملفوظ نہیں، اور اِس طرح واضح طور پر معلوم ہو جاتا ہے کہ مصنّف نے "صلوٰۃ" ہی لکھا تھا، جو چھپائی کے وقت (ٹائپ کی مجبوری کی بنا پر) "صلواۃ" بن گیا۔

فے میں جو صلْواۃ (بہ سکونِ لام) ہے، یہاں پر یہ اِس لیے درست نہیں کہ "صلوٰۃ" کی جمع "صَلَوات" آتی ہے۔ فارسی میں اِسے بہ سکونِ دوم بھی نظم کیا گیا ہے (چراغِ ہدایت) مگر یہاں پر عبارت میں یہ لفظ بہ طورِ واحد آیا ہے۔ یہ بات بھی ذہن میں رہے کہ جمع کی صورت میں اِس کے آخر میں تاے دراز لکھی جائے گی (صلات) تاے مدوّر (ۃ) نہیں لکھی جائے گی۔

کے میں جو اِس لفظ کے آخر میں تاے مدوّر ہے، اور واو کے نیچے غیر ملفوظ کی علامت (ۃ)

بنی ہوئی ہے؛ اِس کا مطلب یہی ہے کہ یہاں مصنف نے اِس لفظ کو بہ طورِ واحد (اوزبروزنِ نجات) استعمال کیا ہے۔ اِسی بنا پر متن میں (م کے مطابق) "صلوٰۃ" لکھا گیا ہے۔ [املا: صلوٰۃ۔ تلفّظ: صَلات]۔

ضُروری (۱۰۷): ضرور، ضروری، ضرورت؛ یہ سب لفظ اصلاً بہ فتحِ اوّل ہیں (المنجد)۔ آصفیہ میں بھی اِن لفظوں میں ضاد کے اوپر زبر لگا ہوا ہے۔ پلیٹس نے اپنے لغت میں اِن کو بہ فتحِ اوّل لکھ کر، یہ بھی لکھا ہے کہ بہ ضمِّ اوّل عامیانہ تلفّظ ہے۔ اِس کے برخلاف فیلن نے اپنے لغت میں "ضرور" اور "ضروری" کو صرف بہ ضمِّ اوّل لکھا ہے اور اِس سے یہ اندازہ ہوجاتا ہے کہ دہلی میں یہ لفظ بہ ضمِّ اوّل بھی مستعمل رہے ہیں اور یہ عامیانہ تلفّظ نہیں تھا۔

کے میں ضاد کے اوپر پیش لگا ہوا ہے۔ کے میں جہاں کہیں یہ لفظ آئے ہیں، وہاں ضاد کے اوپر پیش ملتا ہے، مثلاً: "ضُرور" ص۱۲۳، "ضُروریات" ص۱۳۵۔ یہی صورت ف کی ہے کہ اُس میں بھی ہر جگہ ضاد کے اوپر پیش ملتا ہے۔ اِس کی مزید تصدیق ہوتی ہے مخطوطۂ گنجِ خوبی سے، جس میں میر امّن نے اپنے قلم سے ضاد کے اوپر پیش لگایا ہے: ضُرور ص۱۱۱، ص۱۸۱، ص۳۳۹، ص۳۴۲، ص۳۴۶۔ اِس سے مکمل طور پر یہ ثابت ہوجاتا ہے کہ میر امّن نے اِن لفظوں کو بہ ضمِّ اوّل استعمال کیا ہے۔ اِسی کی مطابقت اختیار کی گئی ہے اور اِن لفظوں کو ہر جگہ بہ ضمِّ اوّل لکھا گیا ہے۔

طَرَح (۱۶): م اور کے میں رے پر زبر لگا ہوا ہے۔ ف کی فرہنگ میں بھی اِسے بہ فتحِ اوّل و دوم (طَرَح) لکھا گیا ہے۔ اِسی کی مطابقت اختیار کی گئی ہے۔

طلبہ کے استفادے کے لیے ضمنی طور پر یہ صراحت کی جاتی ہے کہ فارسی میں "طَرح" (بہ فتحِ اوّل و سکونِ دوم) ہے اور وہاں یہ کئی معنوں میں مستعمل ہے [تفصیل کے لیے دیکھیے بہارِ عجم، غیاث اللغات]۔ "میری طرح" یا "اُس کی طرح" یا "طرح طرح سے"؛ یہ اُردو کا اندازِ استعمال ہے۔ یہ تو معنوی تصرف ہوا۔ ایک تصرف تلفّظ میں بھی ہوا ہے اور وہ یہ کہ مختلف معانی میں "طَرَح" بھی مستعمل رہا ہے، اِسے مہنّد صورت کہنا چاہیے۔ مؤلفِ آصفیہ نے اِس کی وضاحت کردی ہے، "طَرَح" کے ذیل میں لکھا ہے: "یہ لفظ جو بہ فتحِ ثانی مشہور اور اکثر شعراے اُردو کے کلام میں موجود ہے، اِسے صورت میں اُردو خیال کرنا چاہیے، کیوں کہ عربی فارسی کلام میں بہ سکونِ دوم ہی آیا ہے۔"

شعراے اُردو نے "انداز" اور "جیسا" کے مفہوم میں "طَرَح" اور "طَرح" دونوں طرح

نظم کیا ہے۔ دونوں کی مثالیں عام ہیں، صرف ایک مثال بہ سکونِ دوم کی پیش کی جاتی ہے :

آئنے کی طرح غافل! کھول چھاتی کے کواڑ ٭ دیکھ تو ہے کون، بارے تیرے کاشانے کے بیچ

(خواجہ میر درد) لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ "اس طرح، اس کی طرح، طرح طرح، طرح دار" جیسے مرکبات میں اُردو میں یہ لفظ عموماً بہ فتحِ دوم مستعمل رہا ہے اور یہ اُردو کا خاص اندازِ استعمال ہے، اِسی کی طرف مؤلفِ آصفیہ نے اشارہ کیا ہے۔

طَرَفَین (۲۱۱) : کے میں ی کے اوپر ماقبل مفتوح کی علامت تو موجود ہے، لیکن رے خالی ہے ("طرَفَین")۔ یہی صورت ف کی ہے۔ فنے کی فرہنگ میں یہ لفظ موجود نہیں۔ عربی کے قاعدے سے "طَرَفَین" ہونا چاہیے، مگر اُردو میں زبانوں پر "طَرْفَین" ہے۔ آصفیہ میں تو یہ لفظ موجود ہی نہیں، البتہ فیلن نے اپنے لغت میں "طَرْفَین" کو بہ سکونِ دوم ہی لکھا ہے۔ اِسی طرح "طَرْفَینی سلسلہ"۔ پلیٹس نے وضاحت بھی کر دی ہے کہ "طَرَفَین" لکھ کر قوسین میں صراحت کی ہے کہ عربی میں "طَرَفَین" ہے اور اِس سے صاف طور پر معلوم ہو جاتا ہے کہ اُردو میں مستعمل لفظ "طَرْفَین" ہے۔ یہی صحیح صورت ہے اور اِسی بنا پر اِسے بہ سکونِ دوم لکھا گیا ہے۔

اِس لفظ کے سلسلے میں یہ بات بھی ذہن میں رکھنے کی ہے کہ جب یہ عربی کے طریقِ ترکیب کے مطابق مرکب ہو تب تو یہ بہ فتحِ را مرجح ٹھہرے گا، جیسے : نجیبُ الطَّرَفَین۔ لیکن مفرد صورت میں یا اُردو کے طریقِ ترکیب کے ساتھ آنے کی صورت میں بہ سکونِ را ہی مرجح قرار پائے گا، جیسے : طَرْفَین، طَرْفَینی سلسلہ [شاعری سے یہاں بحث نہیں، اشعار میں "طَرَفَین" مل سکتا ہے]۔

طَبعِنا رِمِہنا (بہ کسرِ میم) : ص ۲۸۲، حاشیہ ①۔

طمانچہ (۲۱۹) : لت، کے، فنے، ع میں یہی املا ہے، یعنی طا (میم اور نونِ غنّہ کے ساتھ)۔ اصولاً تو اِسے تے کے ساتھ لکھنا چاہیے، اِس بنا پر کہ طا عربی الفاظ کے ساتھ مخصوص ہے۔ مؤلفِ آصفیہ نے "تماچہ" کے ذیل میں لکھا ہے : "یہ لفظ فارسی رسم الخط میں طائے مہملہ سے "طپانچہ" لکھا جاتا ہے، لیکن لکھنا تائے فوقانی سے واجب تھا، کیوں کہ یہ لفظ فارسی ہے۔" مگر یہ بھی واقعہ ہے کہ اِس لفظ کو طا کے ساتھ بھی لکھا جاتا رہا ہے۔ نونِ غنّہ کے شاملِ لفظ ہونے اور نہ ہونے کے لحاظ سے بھی اِس کے املا میں اختلاف ہے۔ ایسا ہی اختلاف طا کے بعد میم یا پے کے لکھے جانے کا ہے کہ مختلف مقامات پر دونوں طرح اِس کا املا ملتا ہے۔ ک کے مطابق اِس کا املا اختیار کیا گیا ہے۔

طمنچے کی جوڑنی (ص۲۰۶) : پیشِ نظر سبھی نسخوں میں "طمنچے" کا ہی املا ہے، یعنی اسے ط کے ساتھ لکھا گیا ہے۔ اصولاً "تمنچے" لکھنا چاہیے (ط تو عربی الفاظ میں آتی ہے) مگر اس میں بھی شک نہیں کہ پرانے اندازِ نگارش کی بنا پر اس لفظ کو ط سے بھی لکھا جاتا رہا ہے۔ کے کے املا کو برقرار رکھا گیا ہے۔

عجمی (بہ جیم مفتوح) : ص ۳۵۵ ، ح ⑤ ۔

عجوبہ (ص۸۵) : کے اور ف میں اس لفظ پر اعراب موجود نہیں ، البتہ ف کی فرہنگ میں اس کو بہ فتحِ عین لکھا گیا ہے۔ آصفیہ میں بھی عین کے اوپر زبر لگا ہوا ہے ، اسی نسبت سے اس لفظ کو بہ فتحِ اوّل لکھا گیا ہے۔

عربی میں "اُعجوبہ" ہے۔ فارسی میں یہ تصرّف ہوا کہ اس کی مخفّف صورت "عجوبہ" بھی استعمال میں آگئی۔ سند بہارِ عجم میں موجود ہے، لیکن وہاں عین پر پیش ہی رہا۔ اُردو میں مزید تصرّف یہ ہوا کہ "عَجوبہ" کہنے لگے۔ اب صورت یہ ہے کہ بعض لوگ "عُجوبہ" کہتے ہیں ، مگر اکثر "عَجوبہ" بولتے ہیں۔ اس سلسلے میں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ سلیمان حیّم نے اپنے لغت میں "عجوبہ" کو بہ فتحِ اوّل اور بہ ضمِّ اوّل ، دونوں طرح لکھا ہے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ جدید فارسی میں بھی یہ لفظ دونوں طرح مستعمل ہے۔

عُرُوس (ص۸۷) : کے اور ف میں ع پر پیش لگا ہوا ہے۔ کے میں ص۱۹۰ پر "عُروسی" آیا ہے، وہاں بھی (ان دونوں نسخوں میں) ع پر پیش موجود ہے۔ اس تلفّظ کی قطعی طور پر تائید ہوتی ہے مخطوطۂ گنجِ خوبی سے ، اس میں دو جگہ یہ لفظ ملتا ہے اور دونوں مقامات پر میر امّن نے ع کے اوپر پیش لگایا ہے (ص۳۶)۔ کے کی مطابقت اختیار کی گئی ہے اور "عروس" اور "عروسی" دونوں لفظوں میں ع کے اوپر پیش لگایا گیا ہے۔ یہ وضاحت یوں کی گئی کہ اصلاً "عَروس" ہے ، یعنی ع مفتوح ہے۔ لغات میں اس کی صراحت موجود ہے۔ صاحبِ نور اللغات نے تو یہ بھی لکھا ہے کہ "عُروس" بہ ضمِّ اوّل غلط ہے، صحیح "عَروس" ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ بہت سے لوگوں کی زبان سے "عُروس" سننے میں آتا ہے۔ میرا خیال تھا کہ تلفّظ کی یہ تبدیلی اسی زمانے کی چیز ہے ، مگر مخطوطۂ گنجِ خوبی سے اور باغ و بہار کے دونوں نسخوں (کے اور ف) سے یہ معلوم ہوا کہ یہ تبدیلی اب سے بہت پہلے عمل میں آچکی تھی اور شاملِ تلفّظ ہو چکی تھی۔

عَصے بَردار (ص۳۵) : م ، ن ، کے اور ف میں "عصے بردار" ہے ، ع میں "عصیٰ بردار" ہے۔

اصل لفظ "عصا" ہے (المنجد) "عصا" محرّف ہوکر (خواہ بہ صورتِ جمع، خواہ کسی دوسری صورت میں) "عَصے" (بہ یائے مجہول) بن سکتا ہے۔ ہر چند کہ اِس لفظ کی یہ صورت کسی دوسری جگہ نہیں دیکھی گئی، لیکن میر امّن نے "عصا" سے "عصے" بنا لیا ہے، اور اسے اُن کی خصوصیاتِ زبان میں شمار کرنا چاہیے۔

عَقْل (۱۹) عَقْل مَنْد (۱۲): لفظ "عقل" خواہ مفرد آیا ہو، یا ترکیب کے ساتھ (جیسے: عقل مند) دونوں صورتوں میں م اور ک میں اِس لفظ پر اعراب موجود نہیں۔ ف کے متن میں "عقل" پر اعراب موجود نہیں، مگر "عقل مند" میں قاف پر جزم لگا ہوا ہے اور اُس کی فرہنگ میں "عقل" اور "عقل مند" دونوں کو قاف کے جزم کے ساتھ لکھا گیا ہے۔ بہ لحاظِ اصل بھی "عَقْل" بہ فتحِ اوّل و سکونِ دوم ہی ہے اور مفرد لفظ عموماً استعمال میں بھی اِسی طرح آتا ہے، یعنی قابلِ لحاظ افراد اِسے عام طور پر اِسی طرح بولتے ہیں۔ گنجِ خوبی میں یہ دونوں لفظ ملتے ہیں، مخطوطۂ گنجِ خوبی میں بھی کہیں بھی اِن لفظوں پر اعراب موجود نہیں، مگر کئی جگہ میر امّن نے اِن کو بہ سکونِ حرفِ دوم نظم کیا ہے اور اِس طرح حرکات کا تعیّن ہو جاتا ہے: مناسب نہیں شرع اور عقل میں یہ، کہ بے شادی حکمِ سلطان دیوے (اٹھائیسواں باب)۔ مصلحت سے تو کام کرتا نہیں، عقل کی راہ تو نے کیوں چھوڑی (اٹھائیسواں باب)۔ عقل مندی سے بات جو کہیں، یہ عاقلوں کو پسند آتی ہے (چالیسواں باب)۔ اِس طرح یہ بات معلوم ہو جاتی ہے کہ میر امّن نے لفظِ "عقل" کو مفرد صورت میں بھی اور مرکب صورت میں بھی بہ سکونِ دوم ہی استعمال کیا ہے۔ اِسی نسبت سے "عقل" اور "عقل مند" دونوں میں ق پر جزم لگایا گیا ہے۔

عَلاوَہ (۲۴): ک اور ف میں اِس لفظ پر اعراب موجود نہیں، البتّہ ف کی فرہنگ میں اِسے بہ فتحِ اوّل لکھا گیا ہے۔ اصلاً یہ لفظ بہ کسرِ عین (عِلاوہ) ہے۔ آصفیہ میں بھی اِسی طرح مرقوم ہے، مگر نور میں اصل اعراب لکھ کر، یہ وضاحت بھی کر دی گئی ہے کہ: "اردو میں بہ فتحِ اوّل و چہارم ہی مستعمل ہے" اور یہ بالکل صحیح ہے۔ فیلن کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ ایسے الفاظ کے اندراج میں عموماً وہ استعمالِ عام کی نشان دہی کر دیا کرتا ہے، یہاں بھی اُس نے اِس لفظ کو بہ کسرِ اوّل لکھنے کے بعد یہ بھی لکھا ہے کہ بہ قبولِ عام تلفّظ "عَلاوَہ" (بہ فتحِ اوّل) ہے۔ نور کی وضاحت اور فیلن کا یہ اندراج، دونوں ف کی فرہنگ کے اندراج سے مطابقت رکھتے ہیں۔ اِسی بنا پر اِس لفظ کو

بہ فتحِ اوّل لکھا گیا ہے۔ [یہ لفظ ص ۲۳۷ پر بھی آیا ہے]۔

عمّامہ (مع تشدید): ص ۴۵۴، ح ⑦۔

عَیال (۶): ک اور ف نے میں عین مفتوح ہے (اور اُردو میں مستعمل بھی اسی طرح ہے) ک کے مطابق عین پر زبر لگایا گیا ہے۔ یہ عربی کا لفظ ہے اور عربی میں عین مکسور ہے۔ صاحبِ غیاث اللّغات نے صراحت بھی کر دی ہے کہ "بہ فتح خطاست"۔ غالباً اسی کی تقلید میں آصفیہ میں عین کے نیچے زیر لگا ہوا ہے اور صاحبِ نور اللّغات نے صراحتاً لکھا ہے کہ "بہ کسرِ اوّل صحیح، بہ فتحِ اوّل غلط ہے"۔ لیکن یہ محض عربی لغات کی (اور نوشتۂ صاحبِ غیاث اللّغات کی) کورانہ تقلید ہے۔ اُردو میں خواص ہوں یا عوام، سبھی "اہل وعَیال" کہتے ہیں۔ غیاب اور عیال، یہ دو لفظ ایسے ہیں کہ عربی میں دونوں بہ کسرِ اوّل ہیں، لیکن اُردو میں دونوں عموماً بہ فتحِ اوّل مستعمل ہیں۔ اِس موقعے پر مولانا نظم طباطبائی کی ایک عبارت نقل کر نا بے جا نہ ہوگا: "فارسی و عربی کے بعض الفاظ اُردو میں غلط بولے جاتے ہیں، اور اُن کو غلط ہی بولنا چاہیے۔ اُن کو صحیح کر کے بولنا ہندیوں کی زبان پر ثقیل ہے؛ جیسے: عیادت، عیال، عیاں بہ کسرِ عین ہیں، مگر بولتے بہ فتحہ ہیں۔ ایک نقل میں نے سنی ہے کہ حکیم میر ضامن علی مرحوم جلال سے نواب کلب علی خاں مرحوم والیِ رام پور نے پوچھا کہ آپ "عَیاں" کو "عِیاں" کہیں گے؟ تو اُنھوں نے جواب دیا کہ "عِیاں" تو ہم کبھی نہ کہیں گے" (رسالۂ اُردوے معلّیٰ، بابت فروری و مارچ ۱۹۱۲ء)۔

غُربا (۵): ک میں غ پر پیش اور ر پر زبر لگا ہوا ہے (یہ لحاظِ اصل بھی اسی طرح ہے)، اسی کی مطابقت اختیار کی گئی ہے۔

غضبی: ص ۴۸۴، ح ⑦۔

غِلاف (۸۷): ک اور ف نے دونوں میں غ کے نیچے زیر لگا ہوا ہے۔ ک میں ص ۱۴۷ اور ۲۳۸ پر بھی یہ لفظ آیا ہے، اور اُن مقامات پر بھی غین مکسور ہے۔ اِس لفظ میں غین اصلاً مکسور ہی ہے (المنجد)۔ آصفیہ میں بھی غین کے نیچے زیر لگا ہوا ہے۔ فصحا کی زبان سے سنا بھی اسی طرح گیا ہے۔ اِسی کی پابندی کی گئی ہے۔ وضاحت کی ضرورت یوں محسوس ہوئی کہ یہ لفظ بہ فتحِ اوّل بھی سننے میں آتا ہے اور فیلن نے اپنے لغت میں اسے بہ کسرِ اوّل اور بہ فتحِ اوّل، دونوں طرح درج کیا ہے۔

غَلَبَہ (۴۴) : ک اور ف میں اعراب موجود ہیں۔ اصل کے لحاظ سے غین، لام اور ب تینوں حرفوں پر زبر ہے (غَلَبَہ) آصفیہ میں اس لفظ کو اسی طرح لکھا گیا ہے۔ حد یہ ہے کہ "غَلَبہ کرنا" اور "غَلَبہ رائے" میں بھی لام پر زبر لگا ہوا ہے، یہ نری عربی کی پیروی ہے۔ اُردو شاعری میں یہ لفظ بہ سکونِ لام بھی مستعمل رہا ہے اور گفتگو میں تو یہ سکونِ لام ہی زبان پر آتا ہے۔ صاحبِ نور اللّغات نے یہ لکھ دیا ہے کہ : "اُردو میں بہ سکونِ دوم بھی مستعمل ہے" اور سند میں واجد علی شاہ اختر اور غالب کے اشعار لکھے ہیں : جانِ دلِ مشتاک بو ردی تھا ؛ اور غَلْبۂ شوق ہر گھڑی تھا (اختر)۔ ہوا نہ غَلْبہ میسّر کبھی کسی پہ مجھے ؛ کہ جو شریک ہو میرا، شریکِ غالب ہے (غالب)۔ ف کی فرہنگ میں بھی اسے بہ سکونِ لام لکھا گیا ہے اور اسی کے مطابق لام پر جزم لگایا گیا ہے۔

غُول (غُولِ بیابانی) (۱۹) : ک میں واو پر مجہول کی علامت موجود ہے۔ فارسی میں بھی یہ لفظ (ان معنوں میں) بہ واوِ مجہول ہی ملتا ہے (برہانِ قاطع)۔ جہاں تک اُردو کا تعلق ہے تو صاحبِ نور اللّغات نے صراحتاً لکھا ہے کہ : "اُردو میں واوِ مجہول ہے"۔ اسی کی پابندی کی گئی ہے۔

فارِس (۶۸) : ک میں رے کے نیچے زیر لگا ہوا ہے، اسی کی پابندی کی گئی ہے۔ ک میں ص ۱۴۴ اور ص ۲۴۸ پر بھی یہ لفظ آیا ہے اور وہاں بھی رے کے نیچے زیر موجود ہے۔ وضاحت کی ضرورت یوں محسوس کی گئی ہے کہ مُلک کے معنی میں اکثر فارسی لغات میں اسے بہ سکونِ را لکھا گیا ہے، شعرا نے بھی اسی طرح نظم کیا ہے۔ "فارِس (بہ کسرِ را) کے معنی ہیں : سوار۔ البتہ صاحبِ غیاث اللّغات نے دونوں معانی میں اسے بہ کسرِ را لکھا ہے۔ مزید لکھا ہے : "و در رسالۂ معربات نوشتہ کہ فارِس بہ کسرِ را، معربِ پارس، کہ بہ سکونِ راست، ولایت معروف"۔ اس کی تصدیق ہوتی ہے المنجد سے، کہ اس میں اس معنی میں "فارِس" ہی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ "فارْس" کی معرب صورت "فارِس" ہے۔ یہ بھی واضح ہے کہ اُردو والوں کے لہجے میں "فارْس" کے مقابلے میں "فارِس" کو زیادہ دخل ملنا چاہیے تھا اور ک میں رے کے نیچے جو زیر لگا ہوا ہے، وہ غالباً اسی سہل پسندی کی نمایندگی کرتا ہے۔ اس سرگذشت میں "فارس" سے مراد بہ ظاہر ایران ہے، اس بنا پر کہ ذرا آگے چل کر حاتم طائی کا قصہ سن کر کہتا ہے : "میں خدا کے حکم سے بادشاہ تمام ایران کا ہوں"۔ اس سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ "فارس" کو "ایران" کے مفہوم میں لایا گیا ہے، مگر اس کتاب کے آخر میں (ص ۲۴۸ پر) یہ ہے : "مُلکِ فارِس کے شہزادے کا نکاح بصرے

کی شہزادی سے کر دیا اور عجم کے بادشاہ زادے کو فرنگ کی ملکہ سے منسوب کیا"۔ یہاں واضح طور پر یہ دو مختلف ملک ہیں۔

فائِدہ (۴۹): کے میں "فائدہ" ہے یعنی ی کے اوپر ہمزہ لگا ہوا ہے۔ م میں "فایِدہ" ہے یعنی ی پر ہمزہ موجود نہیں، اُس کے نیچے زیر ہے۔ فنے میں "فائِدہ" ہے، یعنی شوشے کے اوپر ہمزہ ہے اور اُس کے نیچے زیر لگا ہوا ہے۔ م میں جو "فایِدہ" ہے، اُس کا مطلب یہی ہے کہ تیسرے حرف کے نیچے زیر ہے۔ ی جو لکھی گئی ہے تو اُس کی وجہ اُس زمانے کا اندازِ نگارش ہے۔ "قایِل، مایِل، فایِدہ، مایِدہ" جیسے لفظ بہت سی تحریروں میں ملیں گے۔ اب اِن کو عموماً مع ہمزۂ مکسور لکھا جاتا ہے (یعنی: قائِل، مائِل وغیرہ۔ اِسی طرح فائِدہ)۔ کے میں ایک جگہ "مضایِقہ" ہے (جس طرح م میں "فایِدہ" ہے) وہاں بھی "مضائِقہ" لکھا گیا ہے، کیوں کہ جب "مضایِقہ" لکھا گیا تو اِس کا مطلب یہی ہوا کہ تیسرے حرف کو مکسور مانا گیا ہے۔

فَتْح (۲۱۵): کے اور فنے میں اِس لفظ پر اعراب موجود نہیں، البتہ فنے کی فرہنگ میں "فَتْح" ہے۔ گنجِ خوبی کے مخطوطے میں بھی اِس لفظ پر کہیں بھی اعراب نہیں ملتے، مگر میر امّن نے اِسے بہ سکونِ ت نظم کیا ہے: آسی کو فتح پر ہے فتح حاصل ؛ لڑائی میں ہے جس کی فوج یکدل (۳۰ واں باب)۔ ملک گیری کے ارادے پر جو وہ ہووے سوار ؛ فتح آکر ہووے حاضر اور جلو اُس کی کرے (ایضاً) اِس لحاظ سے اِسے "فَتْح" پڑھا جانا چاہیے، اِسی لحاظ سے ت پر جزم لگایا گیا ہے۔

فِرِشتہ (۳۷): م، کے، فنے میں "فِرِشتہ" ہے یعنی فے اور رے دونوں کے نیچے زیر لگے ہوئے ہیں۔ "فرشتہ" آگے چل کر ص ۹۹ پر بھی آیا ہے اور وہاں کے میں "فَرِشتہ" ہے، یعنی فے پر زبر ہے، مگر فنے میں "فِرِشتہ" ہے۔ یہ لفظ ص ۲۱۳ پر بھی آیا ہے اور وہاں کے اور فنے دونوں میں فے اور رے کے نیچے زیر موجود ہیں۔ یہ لفظ گنجِ خوبی میں بھی آیا ہے اور میر امّن نے اپنے قلم سے شروع کے دونوں حرفوں کے نیچے زیر لگائے ہیں [مخطوطۂ گنجِ خوبی، ص ۱۳۶، باب چھبیسواں] اِس سے واضح طور پر اِس کا تعین ہو جاتا ہے کہ میر امّن نے "فِرِشتہ" لکھا ہے۔ "بِہِشت" اور "فِرِشتہ" یہ دو لفظ ایسے ہیں کہ میر امّن نے اِن کو بہ کسرِ اوّل و دوم ہی لکھا ہے۔ اِس کا مطلب یہ ہوا کہ یا تو اُس زمانے میں یہ لفظ اِسی طرح مستعمل تھے، یا پھر یہ کہ میر امّن اِن کو اِسی طرح استعمال کرتے تھے۔ میر امّن کی تحریر کے مطابق اِس لفظ کو

ہر جگہ بہ کسرِ اوّل و دوم لکھا گیا ہے۔ فارسی میں بھی "فِرِشتہ" ہے (برہانِ قاطع) اور آصفیہ میں بھی "فِرِشتہ" مندرج ہے۔

فَرمایِش (ص۵): م، ک، فنے، ع: سب نسخوں میں یہ لفظ اسی طرح لکھا ہوا ہے (یعنی شین سے پہلے یَ ہے)۔ ک، م اور ع میں یَ کے نیچے زیر بھی لگا ہوا ہے، اور اِس سے واضح طور پر معلوم ہو جاتا ہے کہ اِس لفظ میں شین سے پہلے یَ ہے، ہمزہ نہیں۔ ایسے الفاظ کے املا میں ہر جگہ اِس کی پابندی کی گئی ہے اور ایسے جملہ حاصل مصدروں میں یَ لکھی گئی ہے اور اُس کے نیچے زیر لگایا گیا ہے۔ وضاحت کی ضرورت یوں محسوس ہوئی کہ کچھ لوگ "فرمائش" بھی لکھتے ہیں۔ یہ بھی واضح کر دیا جائے کہ مخطوطۂ گنجِ خوبی میں میر امن نے اپنے قلم سے فارسی کے ایسے حاصل مصدروں میں ہر جگہ یَ لکھی ہے اور اُس یَ کے نیچے التزام کے ساتھ زیر بھی لگایا ہے، مثلاً: گنجایِش (ص۳)، زیبایِش (ص۸)، آسایِش (ص۱۱، ۴۲، ۸۹)، کشایِش (ص۲۲، ۲۲)، فرمایِش (۸۰)، آزمایِش (ص۱۲، ۲۴۵)، پالایِش (۳۲۱)۔ ک، سے میں بھی ایسے الفاظ کا بیشتر یہی املا ملتا ہے، مثلاً: آرایِش (۸۳)، زیبایِش (۸۳)، فرمایِش (۳، ۲۶)، پیدایِش (۱۷)۔ اِن سب الفاظ میں یَ کے نیچے زیر لگایا گیا ہے، صرف ایک جگہ "پیدائش" مع ہمزہ نظر آتا ہے (ص۶۹)۔

فِرِنگی (ص۱۹۶): ک، سے میں فَ کے نیچے زیر لگا ہوا ہے اور رَ پر زبر ہے۔ ص۱۰۸ پر "فرنگ" آیا ہے اور وہاں بھی ک، سے میں فَ کے نیچے زیر لگا ہوا ہے۔ اِسی کی مطابقت اختیار کی گئی ہے۔ آصفیہ و نور میں یہ دونوں لفظ (فرنگ۔ فرنگی) موجود ہیں، مگر اعراب کی صراحت کے بغیر۔ ہاں، فنے میں "فرنگ" اور "فرنگی" کے پہلے دونوں حرفوں پر حرکات موجود نہیں؛ البتہ اُن کی فرہنگ میں اِنھیں بہ فتحِ اوّل و دوم لکھا گیا ہے۔

فُروخت (ص۲۰): ک اور فنے میں اِس لفظ پر اعراب موجود نہیں۔ فارسی میں حرفِ اوّل مکسور ہے: "فِروختہ، بہ کسرِ اوّل؛ بیع کردہ شدہ" (برہانِ قاطع)۔ لیکن برہانِ قاطع کے ایرانی مرتب ڈاکٹر معین نے اِس کے حاشیے پر "فروختن" کا اضافہ کیا ہے اور اِسے "بہ ضمِ اوّل و دوم و فتحِ سوم" لکھا ہے اور یہ صراحت کر دی ہے کہ "در زبانِ کنونی"، یعنی قدیم فارسی میں پہلا حرف مکسور تھا (فِروختن) اور جدید فارسی میں پہلا حرف مضموم ہے (فُروختن)۔ آصفیہ میں "فِروخت" اور "فِروخت کرنا" ہے یعنی فَ کے نیچے زیر لگا ہوا ہے۔ یہ نری فارسی کی تقلید ہے۔ اِس کے

برعکس نور میں "فَروخت" لکھا ہوا ہے، یعنی فَ کے اوپر زبر ہے؛ یہ اُردو میں استعمالِ عام کے عین مطابق ہے۔ فن کی فرہنگ میں "فرخت" موجود نہیں، مگر "فروش" ہے اور اسے بہ فتحِ اوّل درج کیا گیا ہے، اور اس سے بھی "فروخت" کا بہ فتحِ اوّل ہونا متعین ہوتا ہے۔ اسی بنا پر فَ کے اوپر زبر لگایا گیا ہے۔

فَریب (۲۲۱) : ک اور فن میں اس لفظ پر اعراب موجود نہیں، البتہ فن کے آخر میں جو فرہنگ ہے، اُس میں اسے بہ فتحِ اوّل لکھا گیا ہے۔ اصلاً "فِریب" (بہ کسرِ اوّل و دوم و یائے مجہول) ہے اور آصفیہ میں صرف "فِریب" ہے یعنی فَ کے نیچے زیر لگا ہوا ہے، مگر صاحبِ نور اللّغات نے یہ صراحت کی ہے کہ اُردو والے اِس لفظ کو بہ فتحِ اوّل بولتے ہیں : "اُردو میں بہ فتحِ اوّل مستعمل ہے" اور یہ بالکل صحیح ہے۔ فریب، فریبی، فریبیا، فریفتہ، فریفتگی؛ یہ سب لفظ اُردو والوں کی زبان پر بہ فتحِ اوّل ہیں۔ اِسی بنا پر (فن کی فرہنگ کے مطابق) اِس لفظ کو بہ فتحِ اوّل لکھا گیا ہے۔

فَرِیفتہ (۱۲۰) : ک اور فن میں فَ اور رے پر حرکت موجود نہیں۔ فارسی میں "فِریفتہ" (بہ کسرِ اوّل و دوم و یائے مجہول) ہے (غیاث اللّغات)۔ آصفیہ میں یہ لفظ موجود ہے، مگر اعراب کے بغیر؛ البتہ نور میں یہ وضاحت کر دی گئی ہے کہ فارسی میں بہ کسرِ اوّل و دوم ہے اور اُردو میں "زبانوں پر بہ فتحِ اوّل وکسرِ دوم ہے"۔ فن کی فرہنگ میں بھی اسے بہ فتحِ اوّل لکھا گیا ہے؛ اِن وجوہ سے فَ کے اوپر زبر لگایا گیا ہے۔ ک میں ی پر علامتِ مجہول موجود ہے۔ اسی کی مطابقت اختیار کی گئی ہے۔

فِشانی [جاں فِشانی] (۹۶) : م، ک اور فن میں فَ کے نیچے زیر لگا ہوا ہے۔ نیز مخطوطہ گنجِ خوبی میں میر امّن نے خود بھی اِس لفظ میں فَ کے نیچے زیر لگایا ہے : "جاں فِشانی" ص ۹۶؛ ص ۲۲۲۔ اِسی کی مطابقت اختیار کی گئی ہے۔

یہ وضاحت بھی بے محل نہ ہوگی کہ غیاث اللّغات میں "فشاندن" کو صرف بہ کسرِ اوّل لکھا گیا ہے۔ برہانِ قاطع میں بھی "فشان" کو بہ کسرِ اوّل لکھا گیا ہے، مگر اِس لغت کے ایرانی مرتب ڈاکٹر معین نے حاشیے میں "فشاندن" کو بہ فتحِ اوّل اور بہ کسرِ اوّل دونوں طرح لکھا ہے۔ آصفیہ میں "جاں فِشانی" ہے یعنی فَ کے نیچے زیر لگا ہوا ہے اور اِس سے اُردو میں تلفّظ کا بہ خوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

فُوّارہ (۳۳) : م، ک اور فن میں اِس لفظ پر اعراب موجود نہیں۔ اِس لفظ کو بہ فتحِ اوّل اور

بہ ضمِ اوّل دونوں طرح لکھا گیا ہے (اور سننے میں بھی دونوں طرح آیا ہے)۔ سب سے مفصّل بحث صاحبِ غیاث اللّغات نے اِس لفظ سے متعلق کی ہے اور اُن کی تحریر سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ بہ ضمِ اوّل کو ترجیح حاصل ہونا چاہیے؛ اِسی لیے فت پر پیش لگایا گیا ہے۔

نور میں اِس لفظ پر حرکات موجود نہیں، ہاں آصفیہ میں فت پہ زبر لگا ہوا ہے، مگر اِس کے ذیل میں مولّف نے اِس کی اصل پر گفتگو کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ "ہندی "پھُہارا" سے بنایا گیا ہے جو "پھُہار"... سے مشتق ہے" اور یوں بھی فت کے زبر کے مقابلے میں پیش کی ترجیح ظاہر ہوتی ہے۔

قِبالہ (ص ۵۵): م اور ک میں قاف کے نیچے زیر لگا ہوا ہے۔ ف میں اِس لفظ پر اعراب موجود نہیں مگر اُس کی فرہنگ میں یہ بہ فتحِ اوّل ہے۔ اصل لفظ "قَبالہ" (بہ فتحِ اوّل) ہے۔ صاحبِ غیاث اللّغات نے لکھا ہے: "بالفتح ... و بکسر چناں کہ مشہور ست" اِس لغت کا میرے پاس جو نسخہ ہے، اُس میں اِس کے بعد کے الفاظ موجود نہیں؛ جملہ ناتمام ہے، مگر یہ بات قطعی طور پر واضح ہے کہ "غلط است"، یا اِسی مفہوم کو ظاہر کرنے والا کوئی ٹکڑا ہوگا۔ مطلب مولّف کا یہ ہے کہ یہ لفظ صحیح بہ فتحِ اوّل ہے اور بہ کسرِ اوّل (قِبالہ) جیسا کہ مشہور ہے، صحیح نہیں۔ اِس آخری جُز سے یہ صاف طور پر معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ لفظ بہ کسرِ اوّل بھی استعمال میں رہا ہے [اگرچہ اربابِ لغات نے اِسے نہیں مانا] اور اِس سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ م اور ک میں قاف کے نیچے جو زیر ہے، وہ محض بے اصل نہیں؛ اور یہ بھی نہیں کہ اِس کو غلطیِ طباعت قرار دیا جائے۔ یہ لفظ اِس طرح بھی استعمال میں رہا ہے۔ م اور ک، دونوں نسخوں میں [یعنی اِس کتاب کی روایتِ اوّل اور روایتِ آخر، دونوں میں] قاف کے نیچے زیر کا موجود ہونا بہ ظاہر اِسی پر دلالت کرتا ہے کہ مصنّف نے اِسے بہ کسرِ اوّل ہی لکھا ہے۔ گویا اُس زمانے میں عام لوگوں کی زبان پر؛ یا یوں کہ لیجیے کہ مصنّف کی زبان پر یہ لفظ بہ کسرِ اوّل ہی تھا۔ م اور ک کی مطابقت اختیار کی گئی ہے اور قاف کے نیچے زیر لگایا گیا ہے۔

قِبلہ گاہ۔ قِبلہ گاہی: ص ۳۳۳، ح ⑨

قُبول (ص ۷): ک میں اِس لفظ پر اعراب موجود نہیں، البتّہ ف میں ق پر پیش لگا ہوا ہے۔ اصلاً یہ لفظ بہ فتحِ اوّل (قَبول) ہے اور آصفیہ و نور میں اِسی طرح مندرج ہے؛ مگر سننے میں بیش تر بہ ضمِ اوّل آتا ہے۔ پلیٹس نے اپنے لغت میں اِسے کسی صراحت یا ترجیح کے بغیر بہ فتحِ اوّل اور بہ ضمِ اوّل دونوں طرح لکھا ہے لیکن فیلن نے اپنے لغت میں بہ ضمِ اوّل (قُبول) کو مرجّح اور فصیح بتایا ہے۔

ف کے مطابق ق پر پیش لگایا گیا ہے۔

قِدامت (ص۱۳) : ک اور ف میں قاف کے نیچے زیر لگا ہوا ہے۔ اصلاً قَدامت (بہ فتحِ اوّل) ہے۔ میر امن نے ایسے کئی لفظوں کو بہ کسرِ اوّل لکھا ہے جو اصلاً بہ فتحِ اوّل ہیں، مثلاً رِفاقت، قِناعت، رِحاقت، خِجالت؛ کہ یہ سب بہ لحاظِ اصل بہ فتحِ اوّل ہیں، مگر ک اور ف دونوں میں یہ لفظ بہ کسرِ اوّل آئے ہیں) اور یہ وہ تلفظ ہے جو بول چال سے تعلق رکھتا ہے۔" قِدامت" کو بھی اسی فہرست میں شامل سمجھنا چاہیے۔ ک اور ف کے مطابق قاف کے نیچے زیر لگایا گیا ہے۔

قدر دان (ص۵) : قدردان، قدردانی، قدردانوں؛ یہ مرکب اس کتاب میں کئی جگہ آئے ہیں، مثلاً: ص۲ : قدردانوں، قدردان۔ ص ۵ : قدردان۔ ص۶ : قدردانی۔ ص ۷ : قدردان، قدردانی۔ ص ۸ : قدردانِ منصف۔ ص۴۴ : قدردان۔ ک میں ہر جگہ لفظِ "قدر" پر ایک زبر ملتا ہے۔ ایک مقام کو چھوڑ کر، جہاں یہ کہنا بہ ظاہر مشکل معلوم ہوتا ہے کہ یہ زبر ق پر ہے یا دال پر، باقی سب مقامات پر یہ زبر واضح طور پر دال پر لگا ہوا ہے اور اس طرح کہ بہ ظاہر کسی اشتباہ کی گنجایش نظر نہیں آتی۔

ف کے متن میں کسی بھی جگہ ان مرکبات پر اعراب موجود نہیں، مگر اس کی فرہنگ میں " قَدَر، قَدَردان، قَدَردانی" (دال کے زبر کے ساتھ) ملتے ہیں۔

گنجِ خوبی میں یہ مرکبات کئی جگہ موجود ہیں۔ اس کے مخطوطے میں (ک کی طرح) پہلے جز (قدر) پر ہر جگہ صرف ایک زبر ملتا ہے، مگر یہ زبر ہر جگہ نہایت واضح طور پر دال پر لگا ہوا ہے، ذرا بھی اشتباہ کی گنجایش نظر نہیں آتی، مثلاً: " اُن کی تربیت اور قدَردانی یہ ہے" (ص ۲۸۹)۔ " نوکروں کی تربیت اور قدَردانی میں" (ص۲۷۴)۔ یہ تو نثر کا احوال تھا۔ نظم کی صورت یہ ہے کہ گنجِ خوبی میں "قَدَر" بہ فتحِ دوم بھی ملتا ہے : قدَردانی سے اُن کی سب کو ہے چین ؛ شہنشاہِ عالم کا سلطان حُسین (مخطوطۂ گنجِ خوبی، ص ۰)۔ کوئی ایسا عادل، قدَردانِ عمدہ ؛ نہ ہوا نہ ہوگا، خدا کی دُہائی (کذا) (مخطوطۂ گنجِ خوبی، ص۴)۔ [گنجِ خوبی کا پہلا مطبوعہ اڈیشن مطبعِ احمدی کلکتہ کا ہے، سالِ طبع : ۱۸۴۶ء، اس میں دوسرا مصرع یوں ہے : ہوا ہے نہ ہوگا خدا کی دُہائی] ۔ اور بہ سکونِ دال بھی موجود ہے : ابوالحسن وہ شاہِ ناموَر ہے ؛ جو ہے انصاف میں سنجر کا ثانی ۔ ہے سرداری کی مسند اُس سے نامی ؛ ہے اُس پر ختم عدل اور قَدْردانی (؍؍ ؍؍ تینتیسواں باب) لاف سے قدْر آدمی کی نہیں ؛ مرد وہ ہے جسے ہے صبر و یقین (ایضاً پانچواں باب، ص۲۳) گنجِ خوبی میں

ایک جگہ (نثر میں) "بے قدر" آیا ہے (پچیسواں باب، ص ۱۴۲) اور یہاں مخطوطے میں "بیقدر" لکھا ہوا ہے یعنی "ی" پر علامتِ مجہول تو موجود ہے، مگر کسی اور حرف پر اعراب نہیں لگائے گئے ہیں۔ اس صورتِ حال کے پیشِ نظر میں نے ازراہِ احتیاط، اِن سب مرکّبات پر اعراب نہیں لگائے ہیں۔ اِن کو اگر "قدَر دان، قدَر دانوں" پڑھا جائے گا، تب بھی درست ہوگا، اور اگر "قدْر دان، قدْر دانی، قدْر دانوں" کہا جائے گا تب بھی درست ہوگا (اِس لیے کہ میر امّن کے یہاں دونوں کی مثالیں موجود ہیں)۔ اصلاً "قدْر" بہ سکونِ دوم ہے؛ اِس سے "قدْر دان" بننا چاہیے۔ پڑھے لکھے لوگ اِسی طرح بولتے ہیں؛ مگر یہ بھی واقعہ ہے کہ عام سطح پر بہت سے لوگ "قدَر دان، قدَر دانی اور قدَر دانوں" بھی کہتے ہیں۔ انشا نے دریاے لطافت میں اِس بحث کے ذیل میں کہا: "اُردو کے طالبوں سے پوشیدہ نہ رہے کہ عربی اور فارسی کے بعض سہ حرفی الفاظ کے درمیانی حرف کو اُردو میں ساکن سے متحرک بنا دیتے ہیں" (ترجمۂ دریاے لطافت، ص ۴۵) اِس کی مثالوں کے تحت آگے چل کر لکھا ہے: "قدَر، حرفِ دوم متحرک، بہ معنیِ مرتبہ؛ بجاے قدْر دالِ ساکن"۔ اِس سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ "قدَر" اور "قدَر دانی" اُس عہد کے استعمالِ عام کے خلاف نہیں۔ —— اِس وضاحت کے بعد یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ فارسی ترکیب کی صورت میں ایسے لفظ عموماً اصل کے مطابق استعمال میں آتے ہیں اور لفظ "قدر" بھی اِس میں شامل ہے۔ ص ۷۱ پر "قدر و منزلت" آیا ہے؛ اِس عطفی مرکّب میں "قدْر" مع دالِ ساکن ہی مرجّح ٹھہرے گا۔ "ک" اور "ف" میں یہاں بھی "قدر" پر اعراب موجود نہیں۔ اِسی قاعدے کے مطابق اِسے "قدْر و منزِلت" لکھا گیا ہے۔ یہ تخصیص ہے، اور اِس خاص استعمال سے اصل بحث پر کچھ اثر نہیں پڑے گا۔ "قدر دان" بھی فارسی مرکّب ہے، مگر وہ استعمالِ عام میں اِس طرح آ رہا ہے کہ اُس نے روزمرّے میں منفرد لفظ کے طور پر اپنی جگہ بنا لی ہے؛ یہی احوال "قدر دانی" کا ہے؛ مگر "قدر و منزلت" ہر لحاظ سے مختلف ترکیب ہے۔

قصّائی (ص ۸): ک، ف، ع: تینوں نسخوں میں اِسی طرح ہے اور اِسی کی پابندی کی گئی ہے۔ صراحت کی ضرورت یوں محسوس کی گئی کہ بیشتر اُردو لغات میں اِس لفظ کو سین کے ساتھ لکھا گیا ہے۔ صاحبِ آصفیہ نے "قاف مع صاد" کی فصل میں "قصائی" لکھ کر اُس کے آگے یہ لکھا ہے کہ: "دیکھو قسائی"۔ پھر مزید وضاحت یوں کی ہے: "چوں کہ یہ لفظ "قصّ" سے بگاڑ کر "قسائی" اُردو

زبان میں بنالیا گیا ہے اور عربی الاصل نہیں رہا، اِس وجہ سے سینِ مہملہ سے لکھنا واجب ہے۔ چناں چہ اِس کے تمام مشتقات بھی اُسی جگہ دیے گئے ہیں۔"

نور میں "قصائی" موجود ہی نہیں، اُس میں صرف "قسائی" ہے۔ مولّف نے وضاحت کردی ہے کہ "قسائی" "اُردو" ہے۔ جلاؔل نے بھی اپنے لغت سرمایۂ زبانِ اُردو میں صرف "قسائی" درج کیا ہے۔ ہاں اِس میں شک نہیں کہ بہت سی قدیم مطبوعات میں اِس لفظ کا املا صاد ہی کے ساتھ (قصائی) ملتا ہے اور یہی صورت اِس کتاب باغ و بہار کی ہے۔

قطع : ص ۳۱۰، ح ④ ۔

قِطْعَہ (ص ۱۹۴) : کے اور فے میں ق پر حرکت موجود نہیں، اور فے کی فرہنگ میں یہ لفظ شامل نہیں؛ مگر مخطوطۂ گنجِ خوبی میں یہ لفظ کئی جگہ ملتا ہے (مثلاً ص ۲، ۲۴۰، ۲۷۰) اور ہر جگہ میر امّن نے ق کے نیچے زیر لگایا ہے۔ اِسی کی مطابقت اختیار کی گئی ہے اور ق کے نیچے زیر لگایا گیا ہے۔ یہ بھی واضح کر دیا جائے کہ بہ لحاظِ اصل بھی یہ لفظ بہ کسرِ اوّل ہے۔ آصفیہ میں بھی "قِطعہ" ہے۔ یہ صراحت بھی ضروری ہے کہ یہ لفظ بہ فتحِ اوّل بھی استعمال میں رہا ہے: اِسے تصرف کہنا چاہیے۔ لغات میں اِس تصرف کا ذکر موجود ہے: "قطعہ : بہ کسرِ اوّل و سکونِ ثانی۔ پارہ از ہر چیز؛ و در اصطلاحِ شعرا دو بیت یا زیادہ از غزل یا قصیدہ، مطلع دارد یا ندارد؛ گویا کہ آن پارہ از غزل یا قصیدہ بریدہ شدہ است .... و بہ این معنی بالفتح خطاست، مگر بعضے فصحاے متاخرین جائز ہم داشتہ اند" (غیاث اللغات)۔ یہی بات صاحبِ نور اللغات نے لکھی ہے: "قطعہ : بالکسر و فتحِ سوم .... بعض فصحاے متاخرین نے بالفتح بھی جائز رکھا ہے" [یہ واقعہ ہے کہ اب بہت سے لوگوں کی زبان سے "قَطعہ" (بہ فتحِ اوّل) سننے میں آتا ہے]۔

قَفَس (ص ۱۷۷) : کے، فے، ع : قفس۔ ن : قفص۔ کے میں کہیں تو "قفس" ہے (ص۱۲۲، ص۱۲۶، ص۱۳۰، ص۱۴۶) اور کہیں "قفص" : ص ۲۰۳ (دوبار) ۲۰۴۔ ن اور فے میں بھی اختلافِ املا کی یہی صورت ہے، البتہ ع میں ہر جگہ "قفس" ہے۔ عربی میں "قفص" ہے (المنجد)۔ فارسی میں "قفس" اور "قفص" دونوں املا ملتے ہیں: "استعمالِ این لفظ در فارسی بہ سین و صاد ہر دو می شود" (غیاث اللغات) لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ فارسی کتابوں میں اکثر "قفس" ملتا ہے۔ اُردو میں بھی یہی صورت ہے کہ اکثر "قفس" اور کم تر "قفص" ملتا ہے۔ [مجھے یاد پڑتا ہے کہ میر علی اوسط رشک کے

ایک دیوان میں ضاد کی ردیف میں ایک غزل ہے، جس کی ردیف "قفص ہے" ہے]۔ حسنِ اتفاق سے میراثر نے مخطوطۂ گنجِ خوبی میں اسے اپنے قلم سے "قفس" لکھا ہے (ص ۱۸۹) اور اسی بِنا پر اس لفظ کا املا "قفس" مرجّح مانا گیا ہے اور ہر جگہ اسی طرح لکھا گیا ہے۔

قِلعہ (ص۸) : م، ک، ف؛ سب میں قاف کے نیچے زیر لگا ہوا ہے (دوسرے حروف پر حرکت یا جزم موجود نہیں)۔ ک میں ص ۱۴۱، ۲۲، ۴۵ پر بھی یہ لفظ موجود ہے اور وہاں بھی یہی صورت ہے (یعنی قاف کے نیچے زیر لگا ہوا ہے)۔ مخطوطۂ گنجِ خوبی میں بھی یہ لفظ آیا ہے (ص۳) اور اس میں بھی قاف کے نیچے زیر لگا ہوا ہے۔

اصلاً "قَلْعَہ" (بہ فتحِ اوّل و سکونِ دوم و فتحِ سوم) ہے (المنجد۔ بہارِ عجم)۔ نور میں بھی اسے بہ فتحِ اوّل لکھا گیا ہے، لیکن آصفیہ میں "قَلْعہ" لکھا ہوا ہے، یعنی قاف کو بالفتح اور بالکسر دونوں طرح صحیح مانا گیا ہے؛ مگر اس کے مرکبات مثلاً "قلعہ باندھنا"، "قلعہ دار" میں قاف کے نیچے زیر لگایا گیا ہے اور اس سے یہی مترشح ہوتا ہے کہ مولفِ آصفیہ کے نزدیک مرجح بہ کسرِ اوّل ہے (جس طرح ک میں ہے)۔

تلفظ کا احوال یہ ہے کہ عام بول چال میں لام کا سکون، زبر میں بدل جاتا ہے اور عین کی آواز شاملِ تلفظ نہیں ہوتی، یعنی "قلعہ" (بروزنِ فعل) زبان سے ادا ہوتا ہے۔ کتاب کے زیرِ نظر جملے میں اگر کوئی شخص لُغت کی رعایت کو ملحوظ رکھتے ہوئے "قِلْعِے (قِ لْ عِ ے) سے" کہے، تو گفتگو کی روانی اور اردو پن، ان دونوں خوبیوں پر حرف آجائے گا۔ "قلیعے" (قِ لِ ئے) کہنا فصاحت کا حق ادا کرنا ہوگا۔ ایسے کئی لفظ ہیں جن میں ع کی آواز بول چال کی حد تک شاملِ تلفظ نہیں رہتی، مثلاً "رقعہ"۔ اصلاً "رُقْعَہ" ہے، مگر بہ قولِ مولفِ نور اللغات استعمالِ عام میں "رُقّہ" (رُ قہ) ہے۔ یا جیسے "قلعی" کہ اصلاً "قَلْعی" ہے، مگر بولتے ہیں قلَعی۔ خواجہ میر درد کا شعر ہے: دیکھ کر رخسار تیرے کی صفا، آئنے کی یاں اُکھڑ تی ہے قلعی (قلعی بروزنِ فَعِل)۔ یا جیسے "مشعلچی" کہ "مشالچی" اور پھر "مَتالچی" بن گیا۔

ہاں فیلن نے اپنے لغت میں اصل اعراب درج کرنے کے بعد یہ بھی لکھا ہے کہ مقبولِ عام تلفظ QILA ہے۔ بہ ہر صورت، اس کتاب میں جہاں بھی یہ لفظ آئے، اسے "قلعہ" (بروزنِ فعل) پڑھنا بہتر ہوگا۔ [یہ لکھنا بھی ضروری ہے کہ بہت سے لوگ "قلعہ" بھی کہتے ہیں]۔

فارسی ترکیب کی صورت میں اسے اصل اعراب کے ساتھ بھی پڑھا جا سکتا ہے۔ یہ دیکھا گیا ہے کہ عربی فارسی کے ایسے لفظ جن کا تلفظ اردو میں کسی قدر بدل گیا ہے، جب وہ فارسی ترکیب کے ساتھ آتے ہیں، تو اصل کے مطابق ہی زبان سے ادا ہوتے ہیں۔ مثلاً "جمع" کو لوگ "جمع" کہتے ہیں (جیسے روپیا جمع کر دیا)، مگر ترکیب کی صورت میں "جمع و خرچ" کہیں گے۔ یا جیسے "رَد" تشدید کے بغیر مستعمل ہے، مگر ترکیب کی صورت میں تشدید واپس آ جاتی ہے، جیسے: ردّ و قبول، ردِّ بلا۔ ترکیبی صورت میں اس طریقِ استعمال سے مفرد لفظ کے استعمال پر کچھ اثر نہیں پڑتا، وہ اردو میں استعمالِ عام کے مطابق ہی مستعمل رہتا ہے۔ اسی طرح اس لفظ میں بھی یہ تغیر جگہ پا سکتا ہے۔ آگے چل کر ص ۸ پر "قلعۂ مبارک" آیا ہے اور وہاں "قَلْعَۂ مبارک" کہنا صحیح ہوگا، بل کہ انسب ہوگا؛ اسی بنا پر وہاں لام پر جزم اور عین پر زبر لگایا گیا ہے؛ مگر یہاں (اور ایسے دوسرے مقامات پر) "قلیع (قِ، لِ سے) سے تین کوس" کہنا مناسب تر ہوگا۔

قُلَنج (ص ۱۴۴) : ک میں اسی طرح ہے، یعنی ق پر پیش لگا ہوا ہے اور لام پر زبر۔ ف میں "قُلنج" ہے، یعنی ق پر پیش تو لگا ہوا ہے؛ مگر لام پر زبر یا زیر کچھ نہیں۔ ن اور ع میں "قلنج" ہے۔ گویا سب نسخوں میں یہ لفظ واو کے بغیر (قلنج) ہے۔

اس سلسلے میں یہ وضاحت ضروری ہے کہ اصل لفظ "قولنج" (مع واو) ہے۔ "قلنج" اس کی مخفف صورت ہے۔ آصفیہ میں تو "قلنج" موجود نہیں، مگر نور میں اور فیلن اور پلیٹس کے لغات میں یہ موجود ہے۔ فیلن نے "قولنج" لکھ کر یہ صراحت بھی کی ہے کہ اس کی مستعملِ عام صورت "قلنج" ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ "قولنج" بہ لامِ مفتوح اور بہ لامِ مکسور دونوں طرح درست ہے: "بہ ضم اول و فتحِ لام و بہ کسرِ لام نیز آمدہ" (غیاث اللغات)۔ آصفیہ میں "قولَنج" ہے، یعنی لام کے اوپر زبر بھی لگا ہوا ہے اور اس کے نیچے زیر بھی موجود ہے۔ مطلب یہی ہے کہ یہ لفظ دونوں طرح درست ہے۔ ک میں اس مقام پر "قُلَنج" لکھا ہوا ہے، یعنی ق کے اوپر پیش لگا ہوا ہے اور لام پر زبر۔ ک میں ص ۱۹۰ پر بھی یہ لفظ آیا ہے، مگر وہاں "قولِنج" ہے، یعنی قاف کے بعد واوِ مجہول ہے اور لام کے نیچے زیر۔ ن، ف، ع میں بھی اس مقام پر "قولنج" ہے۔ چوں کہ "قولنج" اور "قلنج" دونوں صورتیں بجائے خود درست اور مستعمل ہیں؛ نیز "قولنج" بہ فتحِ لام بھی درست ہے اور بہ کسرِ لام بھی؛ اس بنا پر ان دونوں شکلوں کو اپنے اپنے مقام پر برقرار رکھا گیا ہے، اسی طرح جس طرح

وہ پیشِ نظر نسخوں میں (خاص کر ک ے میں) موجود ہیں۔ لام کی حرکت میں بھی کسی طرح کی تبدیلی نہیں کی گئی ہے، ایک تو ک ے سے مکمل مطابقت کی بنا پر، مگر خاص کر یوں کہ اس کا احتمال بل کہ امکان ہے کہ اُس زمانے میں مخفف صورت "قلنج" تو بہ فتحِ لام زبانوں پر ہو اور اصل لفظ "قولنج" بہ کسرِ لام تلفظ میں آتا ہو۔

قَلْیان (ص ۱۵۵) : ک ے میں اس لفظ پر اعراب موجود نہیں۔ البتہ ف میں ق کے نیچے زیر لگا ہوا ہے مگر اس کی فرہنگ میں یہ بہ فتحِ قاف مندرج ہے۔ آصفیہ میں یہ لفظ تو موجود ہے مگر اعراب کی صراحت کے بغیر۔ صاحبِ غیاث اللغات نے اسے بہ کسرِ اوّل اور بہ فتحِ اوّل، دونوں طرح لکھا ہے: "فارسیان ... بہ کسرِ اوّل و گاہے بہ فتحِ اوّل و سکونِ دوم .... آرزو"۔ فیلن اور پلیٹس دونوں کے لغات میں اسے بہ فتحِ اوّل لکھا گیا ہے اور اُردو کے لحاظ سے یہی مرجح صورت ہے۔ فیلن نے "قَلِیان" (بہ فتحِ اوّل و کسرِ دوم) لکھا ہے اور پلیٹس نے "قَلْیان" اور "قَلیان" دونوں طرح درجِ لغت کیا ہے۔ بہ لحاظِ اصل یہ لفظ بہ سکونِ دوم ہے اور اُردو میں بھی مستعمل اسی طرح ہے؛ اسی نسبت سے اسے "قَلْیان" لکھا گیا ہے۔

قِناعت (ص ۴۴) : عربی میں بہ فتحِ اوّل ہے۔ صاحبِ غیاث اللغات نے بہ فتحِ اوّل لکھ کر آخر میں یہ بھی لکھا ہے کہ: "در کشف بہ کسر نوشتہ"۔ آصفیہ اور نور میں یہ لفظ موجود ہے، مگر اعراب کی صراحت کے بغیر۔ ک ے اور ف ے دونوں میں قاف کے نیچے زیر لگا ہوا ہے۔ مخطوطہ گنجِ خوبی میں بھی یہ لفظ موجود ہے (ص ۲۰۷) اور وہاں میر امن نے اپنے قلم سے قاف کے نیچے زیر لگایا ہے۔ اسی کے مطابق قاف کے نیچے زیر لگایا گیا ہے۔

قُورما (ص ۷۷) : ک ے، ف ے، ع میں یہی املا ہے، یعنی آخر میں الف ہے۔ غیاث اللغات، آصفیہ اور نور میں "قورمہ" ہے۔ یہ صراحت تینوں لغات میں موجود ہے کہ یہ ترکی لفظ ہے۔ [صاحبِ غیاث اللغات نے یہ بھی لکھا ہے کہ ترکی میں بہ فتحِ اوّل و ضمِّ دوم و سکونِ سوم "قَوُرْمہ" ہے۔ نور میں بھی اسی کو نقل کیا گیا ہے اور یہ صراحت بھی کی گئی ہے کہ اُردو میں "قورمہ" ہے] اگر یہ لفظ ترکی ہے، تب تو اس کا مرجح املا "قورما" ہونا چاہیے کیوں کہ ہائے مختفی عربی و فارسی الفاظ کے آخر میں آتی ہے۔ بہ ہر صورت، چوں کہ ک ے، ف ے، ع میں "قورما" ہے (اور اصولاً اس کا جواز موجود ہے) اس بنا پر اسی املا کو برقرار رکھا گیا ہے۔ ہاں ک ے میں واو پر علامتِ مجہول۔

موجود ہے اور مستعمل بھی اِسی طرح ہے۔

کاربار : ص ۳۳۵، ح (۱۲)۔

کاشکے (شین پر جزم، کاف کے نیچے زیر) (ص ۱۲۰) : کے کے متن میں یہاں "کاشکے" چھپا ہوا ہے، مگر غلط نامے میں اِس کی تصحیح کی گئی ہے اور صحیح صورت "کاشکہ" بتائی گئی ہے۔ فے اور ع میں "کاشکے" ہے۔ کے میں ص ۵۶ اور ص ۱۲۴ پر بھی یہ لفظ آیا ہے اور متن میں اِن دونوں مقامات پر "کاشکے" چھپا ہوا ہے، مگر غلط نامے میں اِن کی تصحیح نہیں کی گئی۔ اِس کا مطلب یہ ہوا یہاں "کاشکے" ہی لکھا جائے گا۔ فے اور ع میں اِن دونوں مقامات پر بھی "کاشکے" ہے۔ اِس لفظ کا متعارف املا "کاشکے" ہے، اگرچہ اصلاً یہ "کاش کہ" تھا۔ ڈاکٹر معین نے حاشیۂ برہانِ قاطع میں "کاشکے" کے ذیل میں لکھا ہے : "گاہ بعد از لفظِ "کاش" لفظِ "کہ" آورند۔ و "کاشکہ" باشباعِ کسرہ "کاشکی" شدہ (فرہنگِ نظام) ودر رسم الخطِ قدیم "کہ" را "کی" می نوشتہ اند"۔ مخطوطۂ گنجِ خوبی میں یہ لفظ موجود ہے اور میر امّن نے اِسے "کاشکے" لکھا ہے : "کاشکے دولت ہمارے گھر میں جوں کی توں رہے" (ص۲)۔ اِس لفظ کا املا میر امّن کی تحریر میں "کاشکے" مرجّح قرار پاتا ہے اور یہی متعارف املا بھی ہے، اِسی بنا پر اِس املا کو برقرار رکھا گیا ہے۔

کاہلہ : ص ۳۸۴، ح (۹)۔

کٹّر (ص ۵۸) : م، ن، کے اور فے میں ٹ پر تشدید موجود نہیں، البتہ ع میں مع تشدید (کٹّر) ہے۔ یہ لفظ مع تشدید اور بغیرِ تشدید، دونوں طرح مستعمل رہا ہے۔ نور میں اِسے صرف مع تشدید لکھا گیا ہے (سند کا شعر بھی مندرج ہے)۔ اِس کے برخلاف آصفیہ میں اِسے صرف بغیرِ تشدید لکھا گیا ہے اور سند میں یہ شعر بھی لکھا گیا ہے : بڑا ہے ایسے کٹر سے معاملہ دل کا ؛ نکل سکا نہ کبھی ایک حوصلہ دل کا۔ پلیٹس اور فیلن نے اِسے دونوں طرح (کٹر، کٹّر) لکھا ہے؛ لیکن فیلن نے سند میں جان صاحب کا یہ شعر لکھا ہے، جس میں یہ بغیرِ تشدید آیا ہے، اور اِس سے ترجیح ظاہر ہے : درد بیچی کو لگے کیسی اچی ہو بی کٹر ؛ فال کھلوائی نہیں ہو، پاس کر کے مال کا (دیوانِ جان صاحب، مطبعِ حیدری، لکھنؤ، ص ۹) (فیلن کی تحریر کے مطابق اِس کی اصل "کٹھور" ہے)۔ اِن اندراجات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ "کٹر" (بغیرِ تشدید)

مستعمل لفظ تھا اور م، کے اور فنے میں تشدید کا نہ ہونا اسی پر دلالت کرتا ہے؛ اسی بنا پر اِس لفظ کو تشدید کے بغیر ہی لکھا گیا ہے۔

کٹھن (ص ۵۴) : م اور فنے میں ٹھ کے نیچے واضح طور پر زیر موجود ہے۔ کے میں یہ لفظ اعراب کے بغیر ہے۔ م اور فنے کی مطابقت اختیار کی گئی ہے۔ وضاحت کی ضرورت یوں محسوس کی گئی کہ متعدد لغات میں اِس لفظ کو بہ فتحِ دوم اور بہ کسرِ دوم دونوں طرح لکھا گیا ہے۔ پلیٹس اور فیلن کے لغات میں اِس لفظ کو دونوں طرح لکھا گیا ہے۔ فیلن نے اِس کے ذیل میں جو دو مثالیہ فقرے لکھے ہیں، اُن میں یہ لفظ بہ فتحِ دوم ملتا ہے۔ نور میں بھی اِسے دونوں طرح لکھا گیا ہے: "بہ کسرِ دوم نیز بہ فتحِ دوم" اور سند میں داغ کا یہ شعر لکھا ہے (جس میں مؤلف کی صراحت کے مطابق یہ لفظ بہ فتحِ دوم آیا ہے): طریقِ محبت میں رہ بر ہوا اچھا: یہی راہ آسان بھی ہے، کٹھن بھی۔ "دہن، وطن، سخن تافیے ہیں"۔ اِس سے بہ ظاہر یہ مستنبط ہوتا ہے کہ فصحاے دہلی نے اِسے بہ فتحِ دوم استعمال کیا ہے۔ آصفیہ میں اِس لفظ پر اعراب موجود نہیں۔

ایسے کئی لفظ ہیں جو اصلاً بہ فتحِ دوم ہیں، مگر بول چال میں بہ کسرِ دوم رائج ہیں؛ مثلاً "بہن" کہ اصلاً "بَہن" ہے، مگر استعمالِ عام میں "بہِن" ہے، یعنی سُننے میں بہ کسرِ دوم ہی آتا ہے (اِس لفظ کی بحث اِسی ضمیمے میں آچکی ہے، اُسے دیکھا جا سکتا ہے)۔ جو طریقہ لفظِ "بہن" کے ذیل میں اختیار کیا گیا ہے، اُسی کے مطابق یہاں بھی م اور فنے کے مطابق اِسے بہ کسرِ دوم لکھا گیا ہے۔

کرتا (ص ۹۸) : ن، کے، فنے، ع: سب نسخوں میں اِس لفظ کا یہی املا ہے، یعنی آخر میں الف ہے۔

کرچھال (ص ۱۶۷) : پلیٹس کے لغت میں "کَرچھال" اور "کُرچھال" دونوں طرح اِسے لکھا گیا ہے۔ کے اور فنے میں اِس لفظ پر اعراب موجود نہیں، البتہ فنے کی فرہنگ میں اِسے بہ فتحِ اوّل لکھا گیا ہے؛ اِسی بنا پر کاف کے اوپر زبر لگایا گیا ہے۔

کڑوڑ ڑول (ص ۱) : سب نسخوں میں اِسی طرح ہے (یعنی دونوں "ڑ" ہیں) اِسی کی مطابقت اختیار کی گئی ہے۔ یہ لفظ تین طرح سُننے میں اور دیکھنے میں آیا ہے: کڑوڑ ڑول، کروڑول، کروڑول۔ یہ تینوں شکلیں لغات میں بھی موجود ہیں۔ آصفیہ میں "ک مع ر" کی فصل میں "کرد ڑ، کروڑپتی، کرہ وڑول" مندرج ہیں اور اِس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مؤلف کے نزدیک صحیح یا مرجح

صورت یہی ہے (پہلی رے، دوسری ڑے)۔ اِس کے بعد "کاف مع ڑے" کی فصل میں "کڑوڑ" بھی ملتا ہے، مگر اس کے آگے قوسین میں یہ بھی لکھا ہوا ہے: "عوام"۔ مزید یہ کہ اسی کے ذیل میں یہ وضاحت بھی کی گئی ہے: "آج کل فصحاے دہلی اوّل راے مہملہ اور دوم مثقلہ سے بولتے ہیں؛ اور اہلِ لکھنؤ یا تو دونوں جگہ راے مثقلہ یا مہملہ کا استعمال کرتے ہیں .... اہلِ دہلی اسے بالکل ناپسند کرتے ہیں۔" اِس سے بات صاف ہو جاتی ہے کہ مولفِ آصفیہ نے "کروڑ" کو فصیح لفظ مانا ہے اور اسے اہلِ دہلی کا مستعمل لفظ بتایا ہے۔ لیکن عبارت کے شروع میں جو "آج کل فصحاے دہلی" کی تحدید ہے، اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ پہلے ایسا نہیں تھا اور میر امّن کے یہاں "کڑوڑ" کا موجود ہونا اسی پر دلالت کرتا ہے۔ جسے لال نے اپنے لغت "سرمایۂ زبانِ اردو" میں "کاف مع ڑے" کی فصل میں لکھا ہے: "کڑوڑ، عددِ معروف۔ میر تقی مرحوم؛ ع: سنتے ہی نام آنکھ سے آنسو گرے کڑوڑ۔ اور یہاں قافیہ "جوڑ"، "موڑ" ہے اور اس لغت میں دونوں جگہ راے ثقیلہ کے عوض راے مہملہ بھی بولتے ہیں؛ چناں چہ رشک مرحوم کہتے ہیں: فائق ہزار چند ہوں داغوں میں مور پر ؛ ایسے ہیں میرے طائرِ جاں کے کرور پر"۔ اس سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ اس لفظ کی قدیم مستعمل صورت "کڑوڑ" ہے، جس طرح میر کے یہاں آیا ہے؛ اور باغ و بہار میں بھی یہ اسی طرح آیا ہے۔ ہاں "کڑوڑا" ایک عہدے کا نام ہے؛ اس میں جملہ لغت نویسوں نے بالاتفاق دونوں راے ہندی (ڑ) لکھی ہیں اور "کڑوڑا" کی اصل یہی "کڑوڑ" ہے۔ یہ مزید ثبوت ہے اِس بات کا کہ اصل لفظ "کڑوڑ" تھا، بعد کو اس میں تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں۔ اِس سلسلے میں غالب کے ایک شعر کا حوالہ دینا بے جا نہ ہوگا، شعر یہ ہے: اے خوں چکاں کفن میں کڑوڑوں بناؤ ہیں ؛ پڑتی ہے آنکھ تیرے شہیدوں پہ حور کی۔ دیوانِ غالب نسخۂ عرشی (اشاعتِ اوّل) میں یہاں "کڑوڑوں" ہے (ص ۲۴۴)۔ اِس کے اختلافِ نسخ کے ضمیمے سے معلوم ہوتا ہے کہ دیوانِ غالب کے صرف ایک مطبوعہ اڈیشن (پانچواں مطبوعہ اڈیشن ۱۲۸۰ھ) میں "کروروں" ہے، باقی جملہ خطّی و مطبوعہ نسخوں میں "کڑوڑوں" ہے اور اس سے صورتِ حال مزید واضح ہو جاتی ہے۔

گِشتی (ص ۲): کے، م اور فتے میں کاف کے نیچے زیر لگا ہوا ہے۔ مزید برآں مخطوطۂ گنج خوبی میں جہاں بھی یہ لفظ آیا ہے، میر امّن نے کاف کے نیچے التزام کے ساتھ زیر لگایا ہے؛ اسی بنا پر

کاف کے نیچے زیر لگایا گیا ہے۔

فارسی میں یہ لفظ بہ فتحِ اوّل ہے (برہانِ قاطع، غیاث اللغات، بہارِ عجم)۔ برہانِ قاطع کے ایرانی مرتب ڈاکٹر معین نے اس لفظ پر جو حاشیہ لکھا ہے، اُس میں یہ بھی لکھا ہے کہ ایران کا موجودہ تلفّظ "کِشتی" ہے: "ولے امروز بہ کسرِ اوّل تلفّظ می شود۔" علاوہ ازیں، بہارِ عجم (مطبوعۂ مطبعِ نول کشور) میں اس لفظ پر ایک حاشیہ ملتا ہے: "بعضے از افاضل شعرا بر حاشیۂ برہانِ قاطع نوشتہ اند کہ از معمائے کہ ملّا میر حسن نیشاپوری در جملہ معمّیات عمل ترکیب نوشتہ، معلوم می شود کہ لفظِ کشتی بہ معنی سفینہ بہ کسرِ اوّل است، چناں چہ زبان زدِ اہلِ ہند است۔" آخری جملہ ہمارے کام کا ہے اور اس سے بہ کسرِ اوّل کی ترجیح معلوم ہوتی ہے۔ صاحبِ فرہنگِ آصفیہ نے اس لفظ کو (فارسی کے مطابق) "کَشتی" لکھنے کے بعد، آخر میں لکھا ہے: "اُردو والے بہ کسرِ کاف بولتے ہیں۔"

کفنی (ص ۳۰): م اور ک میں اعراب موجود نہیں۔ اصل لفظ "کفن" ہے اور اس سے اصولاً "کَفَنی" بننا چاہیے؛ اس طرح بنا بھی ہے؛ شعرا نے اس طرح استعمال بھی کیا ہے؛ آصفیہ اور نور میں سند کے اشعار موجود ہیں؛ لیکن بول چال میں زبانوں پر "کَفْنی" آتا ہے، "کَفَنی" کوئی نہیں کہتا، نہ پڑھا لکھا، نہ بے پڑھا؛ سب "کَفْنی" کہتے ہیں۔ میر امّن کے یہاں جو غالب رجحان ہے تلفّظ کے سلسلے میں، اُس کی مطابقت کا یہ لازمی تقاضا ہوگا کہ اسے استعمالِ عام کے مطابق "کَفْنی" لکھا جائے (اور "کَفَنی" کو استعمالِ شعرا تک محدود سمجھا جائے)۔ فیلن نے اپنے لغت میں "کَفْنی" ہی لکھا ہے اور پلیٹس نے بھی مستعمل لفظ "کَفْنی" لکھا ہے۔ یہی صحیح صورت ہے اور اسی کی پابندی کی گئی ہے۔ ہاں، یہ بات بھی نظر میں رہے کہ عربی کے لفظ "کَفَن" کو فارسی کے اساتذہ نے اصل کے مطابق بھی استعمال کیا ہے اور تصرّف کے ساتھ بہ سکونِ فا (کَفْن) بھی نظم کیا ہے۔ اسناد بہارِ عجم میں موجود ہیں۔ جب "کَفَن" "کَفْن" بن سکتا ہے، تو "کَفَنی" "کَفْنی" بھی بن سکتی ہے۔

کلاوَنت (ص ۳۶): لغات میں اس لفظ کے تین املا ملتے ہیں: کلاوَنت، کلاوَنت، کلاونتا [آصفیہ، نور، پلیٹس کا لغت]۔ م اور ن میں یہاں "کلانوت" ہے۔ ف اور ع میں "کلاونتا" ہے اور ک میں "کلاونت" ہے، چوں کہ "کلاونت" بھی لغت میں ملتا ہے اور اصل نسخے یعنی ک میں بھی اسی طرح مندرج ہے، اس بنا پر ک کے املا کی مطابقت اختیار کی گئی ہے۔

کانچھواں: ص ۲۸۸، حاشیہ ①

کَلِمہ (ص ۹۰) : اصلاً "کَلِمہ" ہے، مگر استعمالِ عام میں یہ لفظ بہ سکونِ لام بھی آتا ہے اور شعرا نے اِس طرح بھی نظم کیا ہے (مثالیں آصفیہ میں)۔ کے اور فے میں "مَلکہ" اور "کلمہ"۔ یہ دونوں لفظ جہاں بھی آئے ہیں، ہر جگہ لام کے نیچے زیر لگا ہوا ہے (مَلِکہ، کَلِمہ)۔ اِسی کی مطابقت اختیار کی گئی ہے اور اِسی بنا پر اِن دونوں لفظوں کو بہ کسرِ لام لکھا گیا ہے۔

کلیجا (ص ۲۴) : م، ن، ک، فے، ع؛ سب نسخوں میں یہاں اِس لفظ کا یہی املا ہے یعنی آخر میں الف ہے۔ اِس لفظ کی صورت یہ ہے کہ کے اور فے میں اکثر مقامات پر تو یہ لفظ اِسی طرح (یعنی آخر میں الف کے ساتھ) ملتا ہے اور چند مقامات پر "کلیجہ" ہے۔ چوں کہ کے میں بیش تر "کلیجا" ہے اور اِس لفظ کا مرجح املا بھی یہی ہے؛ اِس بنا پر ہر جگہ اِسی املا کو اختیار کیا گیا ہے۔

کُمَک (ص ۲۱۵) : کے میں "کُمَک" ہے، یعنی کاف پر پیش ہے اور میم پر زبر۔ یہ صراحت یوں کی گئی کہ غیاث اللغات میں اسے "کُمُک" (بہ ضمِ اول و دوم) لکھا گیا ہے۔ آصفیہ میں "کُمک" ہے اور مولف نے غیاث اللغات کے اِس اندراج پر بھی بحث کی ہے اور یہ صحیح کیا ہے کہ فارسی میں بھی "کُمَک" نظم کیا گیا ہے۔ اُردو میں بھی اِسی طرح مستعمل ہے۔

کِنارے (ص ۲۲) : م، کے اور فے میں کاف کے نیچے زیر لگا ہوا ہے۔ مخطوطۂ گنجِ خوبی میں بھی میر امّن نے اِس لفظ میں کاف کے نیچے ہر جگہ زیر لگایا ہے، مثلاً: کِنارہ ص۱۲۱، کِنارے ص۳، کِناروں تلک ص۶۳۔ اِسی کی پابندی کی گئی ہے۔

فارسی میں یہ بہ فتحِ اوّل ہے۔ آصفیہ میں "کَنارہ" مندرج ہے، یعنی کاف پر زبر لگا ہوا ہے، لیکن اِسی کے ذیل اِس کی جمع "کِنارے" ملتی ہے، یعنی کاف کے نیچے زیر لگا ہوا ہے۔ نور میں اسے (فارسی کے مطابق) صرف بہ فتحِ اوّل لکھا گیا ہے۔

کن انکھیوں : ص ۱۹۶، حاشیہ ① ۔

کنکھجورا : ص ۳۲۹، ح ③ ۔

کنّواں (ص ۹۲) : کے: کوا۔ فے: کؤا۔ ن، ع: کنّواں ــــ کے میں ص ۱۳۱ پر بھی یہ لفظ ہے اور وہاں اِس کا املا "کواں" ہے اور ص ۱۳۲ پر اِس کی جمع "کوئے" ہے۔

مخطوطۂ گنجِ خوبی میں ص ۱۶ اور ۹۱ پر "کونواں" ہے اور ص ۸۷ اور ۹۱ پر اس کی جمع "کوئیں" ملتی ہے۔ غرض کہ کے میں اور گنجِ خوبی میں اس لفظ میں املا کا خاصا اختلاف ملتا ہے۔ مخطوطۂ گنجِ خوبی میں واحد لفظ دو جگہ "کونواں" ملتا ہے یعنی دو نونِ غنّہ کے ساتھ، ایک درمیان میں اور ایک آخر میں، اور یہ املا موجودہ طرزِ کتابت سے قریب تر ہے۔ واو کو اگر قدیم اندازِ کتابت کے مطابق پیش کا ظاہر کرنے والا فرض کر لیا جائے (یہ طرزِ کتابت اُس زمانے میں عام تھا اور مخطوطۂ گنجِ خوبی میں بھی کئی مثالیں ایسے واو کی موجود ہیں) تو پھر اس کا املا "کنواں" مانا جائے گا، جس طرح ن اور ع میں ہے۔ اسی بنا پر اس کتاب میں اس لفظ کو ہر جگہ اسی طرح (کنواں) لکھا گیا ہے اور اُس کی جمع "کنوئیں"۔

گورنشات (ص ۱۶): کے میں یہاں یہ لفظ مع واوِ مجہول (کورنشات) ملتا ہے، مگر ہم نے اسے مع واوِ معدولہ لکھا گیا ہے۔ یہ لفظ ص ۱۳۳ پر بھی آیا ہے اور وہاں کے میں یہ مع واوِ معدولہ ہے۔

یہ جمع ہے، اس کا واحد "کورنش" ہے۔ اہلِ لغات کی صراحت کے مطابق یہ ترکی لفظ ہے اور اس میں واو غیر ملفوظ ہے، یعنی کتابت میں تو شامل ہے مگر تلفظ میں شامل نہیں۔ آصفیہ میں "گورنش (ت) صحیح کُرنش"۔ اس سے بہ ظاہر یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ ترکی لفظ تو اصلاً "کُرنش" ہے، مگر اردو میں "گُورنش" مستعمل ہے۔ فیلن کے لغت میں بھی صرف "گورنش" مندرج ہے، اس سے بھی اسی کی تائید ہوتی ہے۔ نور میں قلق کا یہ شعر منقول ہے:

شغلہ جس وقت سامنے آئے
آتے ہی کورنش بجا لائے

اس سے مزید تصدیق ہوتی ہے کہ اردو میں مستعمل لفظ "کُورنش" ہے [یا یہ کہ "کُورنش" بھی مستعمل ہے] چوں کہ کے میں ایک جگہ "کُورنش" ملتا ہے، اور دوسرے قرینے بھی اسی کی ترجیح کو ظاہر کرتے ہیں، اسی لیے ان دونوں مقامات پر "گُورنشات" (مع واوِ مجہول) لکھا گیا ہے۔ ہاں، صاحبِ آصفیہ نے اس لفظ کے متعلق لکھا ہے: "کورنشات ..... جمعِ کورنش بہ قاعدۂ عربی، جو خلافِ فصاحت اور ناجائز ہے"۔ ظاہر ہے کہ مؤلف کا یہ قول اُردو والوں کے لیے قابلِ قبول نہیں ہو سکتا، میر امّن کی سند ہی کافی ہے۔ اس لفظ میں گویا اُردو میں دو تصرف ہوئے ہیں۔ ایک تو یہ کہ "کورنش" میں اصل کے لحاظ سے واو شاملِ تلفظ نہیں، اُردو

میں واؤ شاملِ تلفظ ہوگیا اور دوسرے یہ کہ عربی کے قاعدے کے مطابق اِس ترکی لفظ کی جمع "کورنشات" بنائی گئی۔

گوکا (ص ۲۰۸): ن، ک، ف، ع: سب نسخوں میں اِس لفظ کا یہی املا ملتا ہے (یعنی آخر میں الف ہے)۔ یہ لفظ اس کتاب میں کئی جگہ ملتا ہے، مثلاً ص ۲۰۹ پر دو بار آیا ہے اور پھر ص ۲۱۰ پر بھی ایک بار آیا ہے اور ان سب مقامات پر ک، ف اور ع میں یہی املا ہے۔ اُردو لغات میں "کوکہ" ملتا ہے۔ اِس پر سب کا اتفاق ہے کہ یہ لفظ ترکی زبان کا ہے اور اِس صورت میں تو اس کے آخر میں الف آنا چاہیے۔ ہائے مختفی تو عربی فارسی لفظوں کے آخر میں آتی ہے۔ آصفیہ میں بھی "کوکہ" ہے، مگر مثال میں جس قدر اشعار لکھے گئے ہیں، اُن سب میں "کوکا" ملتا ہے اور رنگین کی ایک غزل کے جو دو شعر لکھے گئے ہیں اُن کی ردیف "کوکا" ہے اور اِس سے یہ بات واضح طور پر معلوم ہو جاتی ہے کہ اِس لفظ کے آخر میں الف بھی لکھا جاتا رہا ہے۔ اِنھی وجوہ سے ک کے املا کو برقرار رکھا گیا ہے۔

کوکو پکارو (ص ۷۷): ف کی فرہنگ میں اسے مع واوِ معروف لکھا گیا ہے۔ ک میں بہ طورِ عموم یہ طریقۂ کار ملتا ہے کہ جس لفظ میں واوِ مجہول ہوتا ہے، تو واو پر علامتِ مجہول ملتی ہے، اور جن لفظوں میں واوِ معروف ہوتا ہے تو اُس واو پر کوئی علامت نہیں ہوتی۔ یہاں بھی "کوکو" ہے، یعنی واو پر (دونوں ٹکڑوں میں) کوئی علامت موجود نہیں اور اِس سے اِسی کی تصدیق ہوتی ہے کہ اِس لفظ کو مع واوِ معروف لکھا گیا ہے۔ اصل لفظ "کوکو" فارسی میں مع واوِ معروف ہی ہے۔

کونا کُھترا (ص ۱۵۹): ن: کونا کھترا۔ ف، ع: کونا کُھترا۔ ک: کونا کھترا۔ آصفیہ میں "کونا کُھدرا یا کونا کُھترا" ہے۔ نور میں بھی اِسی طرح ہے، یعنی "کُھترا" اِن میں سے کسی لغت میں موجود نہیں، لیکن پلیٹس کے لغت میں "کونا کُھترا" موجود ہے۔ ک کی مطابقت اختیار کی گئی ہے۔

کہہ (ص ۹۰): ک: کہہ۔ ف: کہہ۔ ع: کہ۔ [ع میں ہر جگہ "کہنا" کا امر "کہ" ملتا ہے]۔ "کہنا" مصدر کا امر "کہ" (ک ہ) ہوگا۔ یہ دو حرفی لفظ ہے (ک۔ ہ)۔ کہہ میں کاف کے بعد دو ہ ہیں، ایک کہنی دار (ملفوظ) اور ایک مختفی؛ اِس طرح تین حرف

ہو جاتے ہیں۔ ہاے ملفوظ کے نیچے شوشہ بہ ہر حال موجود ہے۔ اِس لفظ کا صحیح املا وہی ہے جو ع میں ہے۔ اِسی بنا پر ع کی مطابقت اختیار کی گئی ہے اور اسے ایک ہاے ملفوظ کے ساتھ لکھا گیا ہے اور اُس کے نیچے شوشہ لگایا گیا ہے (جو ہاے ملفوظ کی پہچان ہے) یہ شوشہ کے میں بھی موجود ہے۔ لفظ کے آخر میں جہاں بھی ہاے ملفوظ آئی ہے، کے میں وہاں نیچے کا شوشہ موجود ہے، اگرچہ پُرانے اندازِ کتابت کے مطابق وہاں اُسے کہنی دار لکھا گیا ہے۔ ہم نے ایسے سب مقامات پر اُس شوشے کو برقرار رکھا ہے اور چوں کہ یہ ہ لفظ کا آخری جز ہے، اِس لیے اُسے کہنی دار شکل میں نہیں لکھا گیا ہے [ہ کی کہنی دار شکل ہمیشہ درمیان میں آتی ہے] مثلاً: پہر، پہہ، جگہ، سہہ، منہہ، نہہ۔

دِکھلَو لَوں (ص ۸۹): کے میں واو کے اوپر علامتِ مجہول موجود ہے۔ کے میں ص ۲۴۲ پر "کھلونے" آیا ہے اور وہاں بھی واو پر علامتِ مجہول موجود ہے۔ اِس کے برخلاف ف میں دونوں جگہ لام پر زبر لگا ہوا ہے۔ کے کی مطابقت اختیار کی گئی ہے۔

"بچھونا" اور "کھلونا" یہ دو لفظ ایسے ہیں جن کے تلفّظ میں کچھ اختلاف نظر آتا ہے۔ زبانوں سے "بچھونا" بھی سُنا گیا ہے، لیکن فصحا کے یہاں (وہ دہلی کے ہوں یا لکھنؤ کے) "بچھونا" ملتا ہے۔ اِس کی بحث اِسی ضمیمے میں آچکی ہے [اِس کتاب میں "بچھونا" لکھا گیا ہے] "بچھونا" کے مقابلے میں "کھلونا" میں یہ اختلاف زیادہ نمایاں ہے اور دہلی میں اکثر لوگوں کی زبان سے "کھلونا" سُنا گیا ہے۔ آصفیہ میں لام کے اوپر زبر یا پیش موجود نہیں مگر اِس کے ذیل میں ایک مثل اِس طرح لکھی گئی ہے: "بَونا جورو کا کھلَونا" اور اِس میں "بونا" کی ب کے اوپر اور "کھلونا" کے لام کے اوپر زبر لگا ہوا ہے اور اِس سے واضح طور پر معلوم ہو جاتا ہے کہ مولّف کے نزدیک یہ لفظ بہ فتحِ لام ہے۔ اِسی ذیل میں مزید وضاحت اِس طرح کی گئی ہے: "خواجہ آتش نے بہ ضمِ لام بھی رونا، دھونا، ہونا وغیرہ کے ساتھ باندھا ہے اور اکثر عوام، خصوصاً ہندو، یا بچّے بھی بولتے ہیں"۔ اِس سے بہ فتحِ لام کی ترجیح ظاہر ہے۔

نور اللغات میں بھی اِسے بہ فتحِ سوم مرجّح لکھا گیا ہے: "کھلونا: ہندی میں بہ ضمِ سوم و بہ فتحِ سوم دونوں طرح ہے۔ اُردو میں بیش تر بہ فتحِ سوم زبانوں پر ہے۔ ... آتش نے رونا، دھونا کے قافیے میں باندھا ہے ... لیکن فصحا کی زبانوں پر اب بہ فتحِ سوم ہی ہے"۔

اثر لکھنوی مرحوم نے فرہنگِ اثر میں اِس سے اختلاف کیا ہے اور لکھا ہے: "لکھنؤ میں اب بھی کھلونا بہ ضمِّ لام بولتے ہیں" اور یہ واقعہ ہے کہ میں جہاں تک معلوم کر سکا، یہی معلوم ہوا کہ لکھنؤ میں اربابِ اعتبار کی زبان پر "کِھلّونا" (بہ ضمِّ سوم) ہے۔ فیلن نے اِسے کسی ترجیح یا صراحت کے بغیر دونوں طرح درجِ لغت کیا ہے۔

اِس وقت قطعیت کے ساتھ اِن دونوں میں سے کسی ایک تلفّظ کے لیے یہ کہنا میرے لیے ممکن نہیں کہ عہدِ میر امّن میں یہی ایک تلفّظ تھا۔ اِس کی ایک وجہ تو یہی ہے کہ کے میں "کھِلّونا" ہے اور فے میں "کِھلَونا"۔ میرے سامنے ایسا کوئی قرینہ نہیں جس کی بِنا پر اِن میں سے ایک تلفّظ کو ترجیح دے سکوں؛ اِس لیے محض تقدّم کے لحاظ سے کے میں مندرج تلفّظ کو اختیار کیا گیا ہے۔ فیلن کے لغت میں جو اندراج ہے، اُس سے یہ تو بہ ہر صورت معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ لفظ اُس زمانے میں دونوں طرح مستعمل تھا اور آصفیہ میں بھی اختلافِ تلفّظ کی نشان دہی کی گئی ہے؛ یوں کسی ایک تلفّظ کو اختیار کیا جا سکتا ہے اور چوں کہ اِس کتاب میں کے کے مندرجات کو علی العموم ترجیح دی گئی ہے، اِس لیے اُس کے مطابق اِسے "کِھلَونا" لکھا گیا ہے۔

کھوپری (مع رائے مہملہ): ص ۳۲۹، ح ② ۔ نیز ص ۳۵۴، ح ⑧ ۔

کھیسے (ص ۲۸): م، ن، کے، فے، ع؛ سب نسخوں میں اِسی طرح ہے۔ اصل فارسی لفظ "کیسہ" ہے، "کھیسا" اُس کی مہنّد صورت ہے اور یہ آصفیہ میں اور پلیٹس کے لغت میں موجود ہے۔

کھینچ کر (ص ۹): م اور کے میں جہاں بھی "کھینچنا" کے مشتقّات آئے ہیں، وہاں "ی" پر ماقبل مفتوح کا نشان بنا ہوا ہے اور یہاں بھی "کھَینچ" لکھا ہوا ہے (کے ص۹)۔ فے میں بھی ہر جگہ کاف پر زبر موجود ہے۔ اِس کے علاوہ، مخطوطۂ گنجِ خوبی میں جہاں بھی یہ لفظ آیا ہے، وہاں التزام کے ساتھ اِسے بہ فتحِ کاف لکھا گیا ہے [مثلاً ص ۱۳۹، ۱۵۲، ۱۶۵، ۲۰۰، ۲۷۲، ۳۱۴، ۳۱۵، ۳۳۰] اِسی کی پابندی کی گئی ہے۔ [دلّی والے آج بھی اِسی طرح بولتے ہیں] ۔ البتّہ "کِھنچنا" بہ کسرِ اوّل ہی مستعمل ہے اور کے میں اِسے بہ کسرِ اوّل ہی لکھا گیا ہے، مثلاً: "کیتکی کی شراب، یا گلِ گلاب کِھنچوائیے" (ص ۲۲) کے میں کاف کے نیچے زیر لگا ہوا ہے۔

کیدھر (ص ۱۹): م، ن، کے، فے، ع؛ سب نسخوں میں اِسی طرح (مع "ی") ہے۔ وضاحت یوں کی گئی کہ شاید کسی کے ذہن میں یہ بات آئے کہ اِس میں "ی" محض اعراب بالحروف

کی پرانی روش کے مطابق لکھی گئی ہوگی، اس لیے اسے "کدھر" لکھنا چاہیے تھا۔ میر امّن کے زمانے میں اور اُن کے کچھ بعد کے زمانے تک "ایدھر" "کیدھر" "اودھر" "جیدھر" (مع یاے معروف و واوِ معروف) مستعمل تھے۔ گنجِ خوبی اور باغ و بہار میں متعدد مقامات پر یہ لفظ ملتے ہیں۔ مثلاً باغ و بہار (نسخۂ کـ) میں: جیدھر کی کروٹ لیتا (ص ۴۷) جیدھر سے آیا تھا اودھر کو چلا (ص ۷۹) دروازہ کہاں، دیوار کیدھر (ص ۸۳) کیدھر جاتے ہیں (ص ۱۵)۔ مخطوطۂ گنجِ خوبی میں: "ایدھر اودھر" (ص ۱۵۴) "اودھر سے" (ص ۱۲۹) "کیدھر گئے" (ص ۲۱) "جیدھر جاتا ہے" (ص ۳۴۱) "شیخ نے ایدھر اودھر نگاہ کی" (ص ۱۴۲)۔ اِس کا مزید ثبوت یہ ہے کہ اَنشا نے دریاے لطافت میں "پرانی دلی کی خصوصیات" کے ذیل میں لکھا ہے:

"اور شہرِ قدیم کے رہنے والے، جس کا نام "پرانا شہر" ہے، "اِدھر" کو "ایدھر"، "اُدھر" کو "اودھر"، "کدھر" کو "کیدھر" کہتے ہیں" (ترجمۂ دریاے لطافت، ص ۲۶)۔ اُس عہد کے شعرا کے یہاں بھی یہ لفظ جگہ جگہ ملتے ہیں۔ صرف میر کے دیوانِ سوم سے ایک مثال پیش کی جاتی ہے: کعبے کے در پہ تھے ہم، یا دیر میں در آئے ؛ آوارگی تو دیکھو، کیدھر سے کیدھر آئے۔ اِنھی وجوہ سے یہ التزام کیا گیا ہے کہ جہاں بھی یہ الفاظ اِس طرح (یعنی مع یاے معروف و واوِ معروف) لکھے ہوئے ہیں، اِن کے اصل املا کو برقرار رکھا گیا ہے۔ یہ بات بھی ذہن میں رہے کہ یہ صرف املا کا معاملہ نہیں، تلفظ کا مسئلہ بھی ہے۔ "کدھر" اور "کیدھر" یہ دو مختلف تلفظ ہوئے۔ اِس سلسلے میں یہ لکھنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ باغ و بہار سے انچاس[۴۹] پچاس سال پہلے شاہ حاتم "ایدھر" اور "کیدھر" کو متروکات میں شامل کر چکے تھے۔ اُنھوں نے جہاں اپنے متروکات کا تذکرہ کیا ہے، وہاں اِن دونوں لفظوں کا بھی ذکر کیا ہے: "یا" "ادھر" را "ایدھر" و "کدھر" را "کیدھر"، "کہ در آن زیادتیِ حرف باشد" [دیباچۂ دیوان زادہ، مشمولۂ شاہ حاتم حالات و کلام، ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار] مگر ایسے کئی لفظ اشباعی صورت میں (اور بہ قولِ حاتم "مع زیادتیِ حرف") اُس زمانے میں بہ طورِ عموم مستعمل رہے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک اور لفظ "جاگہ" کو لیجیے، جو "جگہ" کی مشبع صورت ہے۔ یہ لفظ بھی اُس زمانے میں بہ طورِ عموم ملتا ہے، صرف ایک مثال: رحم نے جاگہ کی ہے پیدا شاید اُس کے دل میں بھی ؛ دیکھ رہا ہے منھ کو ہمارے، حال ہمارا سُن کر آج (میر۔ دیوانِ چہارم)۔

کیفیّت (ص ۵۶) : م، کے، ف؛ تینوں نسخوں میں یہاں تشدید موجود ہے (کیفیّت)۔ یہ لفظ اِس کے بعد والے پیراگراف میں بھی آیا ہے اور وہاں بھی اِن تینوں نسخوں میں تشدید موجود ہے (کیفیّت) ـــ اوّل الذکر پیراگراف سے قبل جو پیراگراف ہے، اُس میں بھی یہ لفظ موجود ہے اور وہاں اِن تینوں نسخوں میں یہ تشدید کے بغیر ہے۔ م: کیفیت۔ کے: کیفیت۔ ف: کیفیت۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ اوّل الذکر دونوں مقامات پر، جہاں تشدید موجود ہے، وہاں دوسری ی پر زبر نہیں، صرف اُس کے اوپر تشدید ہے۔ اور جس ایک مقام پر تشدید موجود نہیں، وہاں دو نسخوں میں دوسری ی پر زبر موجود ہے۔ کے میں یہ لفظ کہیں تو مع تشدید ہے اور کہیں بغیرِ تشدید۔ ہر جگہ کے کی مطابقت اختیار کی گئی ہے، یعنی کے میں جہاں تشدید ہے، وہاں اِس کتاب میں بھی تشدید لگائی گئی ہے اور جہاں تشدید موجود نہیں، وہاں اِسے بغیرِ تشدید لکھا گیا ہے۔

کیفیت، نیت، خاصیت، ماہیت جیسے لفظوں کا احوال یہ ہے کہ یہ مع تشدید اور بغیرِ تشدید دونوں طرح مستعمل رہے ہیں اور اب بھی یہی صورت ہے؛ اِس بنا پر ایسے لفظوں کے سلسلے میں طریقہ یہ اختیار کیا گیا ہے کہ کے میں جس مقام پر ایسے کسی لفظ پر تشدید ہے، تو وہاں تشدید لگائی گئی ہے اور جہاں تشدید موجود نہیں، وہاں تشدید نہیں لگائی گئی۔ چوں کہ یہ لفظ دونوں طرح صحیح اور دونوں طرح مستعمل رہے ہیں، اِس لحاظ سے یہ طریقِ کار مناسب تر نظر آیا۔ اِس طرح اِن لفظوں کی یہ دونوں صورتیں سامنے آجائیں گی اور برقرار رہیں گی اور طلبہ کو معلوم ہوتا رہے گا کہ یہ لفظ دونوں طرح استعمال میں آتے رہے ہیں۔ اِس طریقِ کار کے تحت سب سے پہلے پیراگراف میں، جہاں کے میں تشدید موجود نہیں: "غرض عجب کیفیت اُس دم تھی" وہاں تشدید نہیں لگائی گئی اور بعد کے پیراگراف میں دونوں مقامات پر کے میں تشدید موجود ہے: "سارے باغ کی کیفیّت کو دل سے بھلا دیا"۔ "بڑی کیفیّت ہوئی" اِس لیے اِن دونوں مقامات پر تشدید کو برقرار رکھا گیا ہے۔ [اِس سلسلے میں مزید دیکھیے اِسی ضمیمے میں لفظ "نیت"]

کیکڑا (ڑ کے ساتھ) : ص ۳۸۶، ح ①۔

کیئوں کر (ص ۲۶): "کیوں" اور "کیوں کر" کے اور م میں ہر جگہ اِس طرح ملتے ہیں کہ ی کے نقطے نیچے اوپر ہوتے ہیں (کیوں، کیوں کر)۔ یہ نشان دہی ہے اِس بات

گی کہ لفظ "کیوں" میں یاے مخلوط ہے۔ اسی کی مطابقت اختیار کی گئی ہے؛ اسی لیے اس لفظ کو ہر جگہ مع علامتِ یاے مخلوط (کیئوں) لکھا گیا ہے۔

گانْو (ص ۲۲۶): ن، ک، فنہ، ع: سب نسخوں میں اس لفظ کا یہی املا ہے۔ کہ اور ع میں "ن" پر غنّہ کی علامت بھی موجود ہے [ک: گانْو۔ ع: گانْو] مزید تفصیل کے لیے دیکھیے اسی ضمیمے میں "پانْو" کی بحث۔ ہاں یہ لکھنا بھی مناسب ہوگا کہ مخطوطۂ گنجِ خوبی میں میرامن نے اپنے قلم سے "گانو" لکھا ہے، صفحات ۳۴، ۵۶، ۱۸۸۔

گپت: ص ۱۵۳، ح (۹)۔

گدِیلا (ص ۱۲۲): فیلن کے لغت میں اسے دال کے زیر کے ساتھ (گدِیلا) لکھا گیا ہے۔ پلیٹس نے "گدَیلا" اور "گدِیلا" دونوں طرح لکھا ہے۔ کہ میں اس لفظ پر اعراب موجود نہیں، لیکن اس کے آخر میں جو غلط نامہ شامل ہے، اُس میں اس کی صحیح صورت "گدِیلا" بتائی گئی ہے، یعنی دال کے نیچے زیر ہے۔ فنہ میں بھی اس لفظ پر اعراب موجود نہیں، مگر اس کے آخر میں جو فرہنگ شامل ہے، اُس میں اسے دال کے زیر کے ساتھ لکھا گیا ہے۔ انھی وجوہ سے اس لفظ کو بہ کسرِ اوّل لکھا گیا ہے۔

گذری (ص ۱۴۴): ک، فنہ: گذری۔ ع: گزری۔ کہ اور فنہ کی مطابقت اختیار کی گئی ہے، اس بنا پر کہ یہ لفظ "گذر" سے بنا ہے (راہ گذر) اور اُس میں ذال ہے۔ "گذشتن" مصدر کے جملہ مشتقات میں ذال ہے۔ [جلال نے اپنے لغت سرمایۂ زبانِ اُردو میں لفظِ "گدڑی" کے ذیل میں لکھا ہے: "اہلِ دہلی ..... اس لفظ کو "گذری" ذالِ معجمہ سے بولتے ہیں، چنانچہ ذوق دہلوی کہتے ہیں: گذری ہے اُس کی راہ گذر پر لگی ہوئی"]۔ شعرا نے اس لفظ کو بہ فتحِ دوم بھی نظم کیا ہے اور بہ سکونِ دوم بھی۔ اوّل الذکر کی مثالیں زیادہ ملتی ہیں۔ آصفیہ، نور، فرہنگِ اثر اور تذکرۂ چمنستانِ شعرا سے مثالیں نقل کی جاتی ہیں:

جنسِ وفا کی بو نہیں بازارِ دہر میں — بے وقت اپنا اس گذری میں گزر ہوا (صبا)

گذری میں گزر اُس طفلِ حسیں کا ہوگا — لے ہی نکلے گا اُسے شوقِ کبوتر باہر (زند)

بیٹھے ہیں دل کے بیچنے والے ہزار ہا — گذری ہے اُس کی راہ گذر پر لگی ہوئی (ذوق)

گیا جہانِ گذران میں بھی لگی ہے گذری — مول لے جاتے ہیں غم یاں سے گزرنے والے (داغ)

پیری میں کریں سیرِ جوانی تو مزہ ہے   دن ڈھلتے ہی ہوتا ہے تماشا گُذری کا   (ناسخ)
والہِ زلف و رُخ و خال و خط و حُسن و نمک   مت ہو اے دل، کہ یہ ہے سب گُذری کا عالم   (انشا)

پیری میں کریں سیرِ جہاں کی تو بجا ہے
ہوتا ہے ڈھلے دن سے تماشا گُذری کا   (محمد صلاح آگاہ ــــ چمنستانِ شعرا)

اِن چھے شعروں میں سے چار شعروں میں یہ لفظ واضح طور پر بہ فتحِ دوم آیا ہے۔ ذوقؔ کے شعر میں یہ بہ سکونِ دوم نظم ہوا ہے اور داغؔ کے شعر کے متعلق کوئی بات قطعیت کے ساتھ یوں نہیں کہی جا سکتی کہ وزن کے لحاظ سے اُسے "گُذَری" بھی پڑھا جا سکتا ہے اور "گُذْری" بھی۔ ["جہانِ گُذَراں" کی صوتی مناسبت مدِّ نظر ہو تو "گُذَری" مرجّح قرار پائے گا] کے اور فے میں، ذال پر نہ زبر ہے نہ جزم؛ البتہ فے کے آخر میں جو فرہنگ ہے، اُس میں اِسے بہ سکونِ دوم درج کیا گیا ہے۔ ایک قرینہ بہ سکونِ دوم کی تائید میں یہ ہے کہ شاعرانہ استعمال سے قطعِ نظر کر کے اگر دیکھا جائے تو واضح طور پر اندازہ ہوگا کہ بول چال میں ذال کا سکون نمایاں رہتا ہے اور اِس لحاظ سے نثر میں یہی صورت مرجّح معلوم ہوگی۔ اِس کی تائید کے لیے اثر لکھنوی مرحوم کا یہ قول بھی پیش کیا جا سکتا ہے: "اور امرِ واقع یہ ہے کہ صحیح لفظ بہ معنیِ بازار "گُذَری" ہے، بہ ضمِّ اوّل و فتحِ دوم؛ اور بول چال میں "گُذْری" بہ ضمِّ اوّل و سکونِ دوم" (فرہنگِ اثر ص ۴۹۸)۔ فے کی فرہنگ کے اندراج کے مطابق ذال پر جزم لگایا گیا ہے۔ ["گُدڑی" بازار کے معنی میں، اِسی "گُذری" کی بدلی ہوئی صورت ہے اور اِس لیے بھی بہ آسانی قیاس کیا جا سکتا ہے حرفِ دوم کے ساکن ہونے پر]۔

گِردباد: ص ۳۷۵، ح ⑧۔

گُرسنگی (ص ۱۹۰): اصل لفظ "گرسنہ" کو فارسی لغات میں کئی طرح لکھا گیا ہے: گُرُسْنہ، گُرِسْنہ، گُرُشنہ، گُرسنہ [غیاث اللغات، بہارِ عجم، حاشیۂ برہانِ قاطع مرتبۂ ڈاکٹر معین، بہ ذیلِ "گرسنہ"، جشیم]۔ آصفیہ میں "گُرَسنہ" اور "گُرَسنگی" ہے، یعنی دونوں لفظوں میں سین کے اوپر زبر بھی لگایا گیا ہے اور اُس کے نیچے زیر بھی موجود ہے، مطلب مؤلف کا یہی ہے کہ یہ لفظ دونوں طرح صحیح ہیں۔ نور میں "گُرِسْنہ، گُرُسْنہ، گُرُسنہ" تین طرح لکھا گیا ہے، مگر "گُرِسنگی" کو ایک ہی طرح درج کیا گیا ہے اور سند میں امیرؔ کا یہ شعر لکھا ہے: دیکھنے والوں کو بھولی طلبِ آب و غذا، یہ پیاس کی ہے نہ آنکھیں گرسنگی کی پروا۔ کے میں اِس لفظ پر اعراب موجود نہیں۔ فے میں "گُرِسنگی" ہے (گاف پر پیش، سین کے نیچے زیر)۔ ڈاکٹر معین نے حاشیۂ برہانِ قاطع میں "گرسنہ" کے ذیل میں لکھا ہے: "و در شعر بہ ضرورت بہ ضمِّ اوّل و سکونِ دوم و فتحِ سوم و چہارم"۔ اور یہ اندراج نور میں "گُرِسنگی" اِسے مطابقت رکھتا ہے اور اِسی بنا پر یہاں اِسی تلفظ کو ترجیح دی گئی ہے اور "گُرِسنگی" لکھا گیا ہے۔

گرِفتار (ص ۱۸۰): اِس مقام پر کے میں "گرفتار" ہے یعنی صرف ایک زیر ہے، مگر م اور فنے میں "گرِفتار" ہے، یعنی دو زیر لگے ہوئے ہیں۔ ص ۱۴۹ پر بھی یہ لفظ آیا ہے اور اُس مقام پر کے میں "گرِفتار" ہے (کے ص ۱۴۱) یعنی گاف کے نیچے زیر ہے اور رے کے اوپر زبر ہے؛ مگر اِس ایک مقام کے علاوہ اور جہاں بھی یہ لفظ آیا ہے، ہر جگہ کے میں "گرِفتار" ملتا ہے، یعنی گاف اور رے کے نیچے زیر لگے ہوئے ہیں۔ فنے میں بھی ہر جگہ "گرِفتار" ہے۔ میں نے ہر جگہ اِس لفظ کو "گرِفتار" لکھا ہے، اِس بنا پر کہ م اور فنے میں ہر جگہ اِسی طرح ہے اور کے میں بھی صرف ایک مقام کو چھوڑ کر اور ہر جگہ "گرِفتار" ہے اور اِس بنا پر یہ مان لینا بے جا نہ ہوگا کہ کے میں صرف ایک جگہ جو "گرفتار" ہے، وہ ترجیح کے کام نہیں آ سکتا۔

ضمنی طور پر یہ عرض کردوں کہ "گرِفتن" اِس کا مصدر ہے اور اِس سے جس قدر مشتقات بنتے ہیں، اُن میں شروع کے دونوں حرفوں (گاف اور رے) کو مکسور رہنا چاہیے۔ آصفیہ میں بھی گرِفت، گرِفتار وغیرہ میں گاف اور رے کے نیچے زیر لگے ہوئے ہیں۔ اِس میں شک نہیں کہ اب سُننے میں "گرَفتار" بھی آتا ہے اور فیلن کے لغت میں اِسے رے کے زبر کے ساتھ بھی لکھا گیا ہے؛ مگر اِس کتاب میں اِس اختلاف کے لیے گنجایش نہیں معلوم ہوتی۔

گریباں (ص ۵۹): م اور کے میں ی پر علامتِ مجہول موجود ہے۔ مخطوطۂ گنج خوبی میں بھی میر امن نے اِسے مع یائے مجہول ہی لکھا ہے (ص ۲) اِسی کی مطابقت اختیار کی گئی ہے۔

ضمنی طور پر بعض ضروری باتیں بھی لکھی جاتی ہیں۔ اِس لفظ کے متعلق صاحبِ بہارِ عجم نے لکھا ہے: "بالکسر... در فارسی بیای مجہول شہرت دارد"۔ صاحبِ غیاث اللغات نے بھی اِسے بہ یائے مجہول لکھا ہے، اور آخر میں یہ بھی لکھا ہے: "و یای مجہول را اگر معروف خوانند، مضائقہ نباشد، بلکہ فصیح نماید"۔ مطلب یہ نکلا کہ فارسی میں مشہور بہ یائے مجہول ہے؛ چوں کہ فارسی میں متاخرین ہر ی کو معروف پڑھنے لگے، اِس لیے اِسے بہ یائے معروف بھی پڑھا جا سکتا ہے۔ "اُردو لغات کا احوال یہ ہے کہ صاحبِ فرہنگِ آصفیہ نے اِسے مع یائے معروف لکھا ہے، اور مولفِ نور اللغات نے صراحت بھی کر دی ہے کہ: "صحیح یائے مجہول سے، اور فصیح یائے معروف سے"۔ فیلن نے اپنے لغت میں اِسے دونوں طرح لکھا ہے، لیکن امثال میں اِسے صرف بہ یائے مجہول لکھا ہے اور اِس سے یائے مجہول کی ترجیح ظاہر ہے۔ اِسی طـرح پلیٹس نے اپنے

لغت میں جس قدر مثالیں لکھی ہیں، اُن سب میں اِسے بہ یائے مجہول لکھا ہے اور اِس سے استعمالِ عام کا بہ خوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ سننے میں عموماً یہ لفظ بہ یائے مجہول آتا ہے۔

گُڑھا (ڑے کے ساتھ): ص ۳۵۴، ح ⑨ ۔

گُڑھنا: ص ۳۵۶، ح ① ۔

گُزْران (ص ۱۵): کے میں گاف پر پیش لگا ہوا ہے، اور فے کی فرہنگ میں "خوش گزران" میں زے ساکن ہے۔ آصفیہ میں بھی "گزران" ہے۔ اِسی نسبت سے زے پر جزم لگایا گیا ہے۔

گُسائیں۔ گوسائیں: ص ۳۲۷، ح ④ ۔

گُل رکھ رستا: ص ۲۶۱، ح ⑮ ۔

گُنبذ (ص ۱۰۳): کے اور فے میں اِسی طرح (یعنی مع ذال) ہے۔ ع میں "گنبد" (مع دالِ مہملہ) ہے۔ فے کے آخر میں جو فرہنگ شامل ہے، اُس میں بھی اِسے GUMBAZ لکھا گیا ہے اور اِس سے قطعیت کے ساتھ ذال کا وجود متعین ہو جاتا ہے۔

صاحبِ نور اللغات نے "گنبد" کے ذیل میں لکھا ہے کہ: "صحیح دال سے ہے، ذال سے غلط ہے" مگر یہ اُن کی غلطی ہے۔ "گنبذ" (مع ذال) قدیم صورت ہے اِس لفظ کی۔ برہانِ قاطع کے مرتب ڈاکٹر محمد معین نے "گنبد" کے حاشیے میں لکھا ہے: "پہلوی: GUMBAT در تہران و اراک (سلطان آباد) GUNBAZ معرب "جنبذ"، (معجم البلدان در جنبذ) .... و "جنبذہ" (ذہبی ج ۱ ص ۲۲۲) اصلاً از آرامی و سریانی ماخوذ است....."

ڈاکٹر عبد الستار صدیقی مرحوم نے ذال اور زے پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے: "واقعہ یہ ہے کہ ذ عربی کے ساتھ مخصوص نہیں اور حقیقت میں ث بھی مخصوص نہیں۔ یونانی اور قدیم ایرانی زبانوں میں اِن دونوں حرفوں کی آوازوں کا وجود تھا ..... یہ سمجھنا صحیح نہیں کہ "اُستاد" کی د پر عربوں نے تصرف کر کے ایک نقطہ لگا دیا۔ اصلیت یوں ہے کہ انھوں نے ایرانیوں سے "اُستاذ" ہی سُنا اور اُسی طرح بولنے لگے۔ خود ایرانیوں کی زبان میں بعد کو وہ ذ، د ہو گئی .....

"گنبذ" ایک ایسا لفظ ہے جو دونوں طرح سے بولا اور لکھا جاتا ہے، یعنی "گنبد" اور "گنبذ"۔ ہندستان میں لوگوں نے اِس لفظ کی اِسی دوسری صورت سے "گُمزّ" بنا لیا اور اُس کی تصغیر

"گُزری" "ہلدی" ...... خلاصہ یہ ہے کہ اِن فارسی لفظوں میں اگر آواز کا لحاظ کیجیے تو "ز" ہے اور قدیم زبان اور کتابت کو مانیے تو "ذال"۔ [مقالاتِ صدیقی، جلدِ اوّل، ص ۱۵۱] اُردو میں "گنبذ" (مع ذال) مستعمل رہا ہے (کم سہی)۔ آصفیہ میں "گنبد" اور "گنبذ" دونوں صورتیں موجود ہیں۔ پلیٹس نے بھی اپنے لغت میں دونوں لفظ درج کیے ہیں۔ اُس نے "گنبذدار" اور "گنبذ کی آواز" (دونوں جگہ مع ذال) بھی لکھا ہے اور "گنبذی" بھی درجِ لغت کیا ہے۔ فیلن کے لغت میں بھی یہ دونوں صورتیں پائی جاتی ہیں۔ اُس نے "گُزری" بھی درجِ لغت کیا ہے۔ یہ فقرہ بھی لکھا ہے: "آج کل تو خوب گنبذ پر ہاتھ پھیرتے ہوگے" (مع ذال)۔ اُس نے "گنبذدار" (مع ذال) بھی لکھا ہے۔ غرض کہ یہ مسلّم ہے کہ "گنبذ" (مع ذال) "گنبد" کی قدیم صورت ہے، جو اُردو میں بھی مستعمل رہی ہے۔ ع میں جو "گنبد" ہے، اِس کو تحریف کہنا چاہیے۔ "گنبذ" لکھنا چاہیے تھا، جس طرح ک اور ف میں ہے۔ اِسی کی مطابقت اختیار کی گئی ہے اور اِس لفظ کو مع ذال برقرار رکھا گیا ہے۔ ہاں مرزا غالب نے "گنبذ" (مع ذالِ نقطہ دار) کو غلط لکھا ہے: "گنبد کو گنبذ بہ ذالِ نقطہ دار ہم نے لڑکوں کے اور رفوبایہ لوگوں کے سوا کسی سے نہیں سُنا جو اِس کے املا میں دخل دیں..... گنبد کی دال پر نہ اسلاف نقطہ دیتے تھے نہ اخلاف دیتے ہیں" [تیغِ تیز، مشمولہ قاطعِ برہان مع رسائلِ متعلقہ، مرتبہ قاضی عبدالودود، ص ۲۸۴] ظاہر ہے کہ مرزا صاحب کا یہ قول نہ فارسی کے لحاظ سے درست ہے نہ اُردو کے لحاظ۔

گوگھرو (ص ۱۸۱): محض احتیاطاً یہ صراحت کی جاتی ہے کہ ک میں پہلا واو مجہول ہے اور آخری واو معروف ہے۔ اِسی کی مطابقت اختیار کی گئی ہے۔

گھاس (ص ۱۰۰): ک، ف، ع: سب میں اِسی طرح ہے۔ وضاحت کی ضرورت یوں محسوس کی گئی کہ آصفیہ میں "گھاس یا گھانس" دونوں طرح لکھا گیا ہے۔ ایک جملے میں بھی یہی املا ملتا ہے: "کوڑا کرکٹ، جیسے: کیا گھانس اُٹھا لایا"۔ اِسی ذیل میں آگے چل کر امانت کا ایک شعر درج کیا ہے، جس کے دوسرے مصرعے میں یہ لفظ آیا ہے، اور یہاں بھی "گھانس" لکھا ہوا ہے: "ترے دوپٹے کی گھانس اے صنم ہری ہوجائے"۔ لیکن اِس کے بعد ہر جگہ "گھاس" ملتا ہے، جیسے: گھاس کھانا، گھاس کھودنا وغیرہ۔ یعنی مولفِ آصفیہ کی تحریر کے مطابق یہ لفظ دونوں طرح (گھاس۔ گھانس) ٹھیک ہے۔ یہ وہی غنّہ آواز کا سیال پن ہے

جس کا ذکر "پنچ کو" اور "چوسّا" کے ذیل میں کیا جا چکا ہے۔ وہ دونوں لفظ تو اِس کتاب (باغ و بہار) میں مع نونِ غنّہ ملتے ہیں، مگر یہ لفظ (گھاس) بغیر نونِ غنّہ ہے۔

صاحبِ نفائس اللّغات نے بھی اِس لفظ کو دونوں طرح درجِ لغت کیا ہے؛ مگر اُن کے اندازِ نگارش سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے نزدیک مرجّح صورت "گھانس" ہے: "گھانس، بہ فتحِ اوّلِ مخلوط التّلفّظ بہ ہا؛ الف و نونِ غنّہ و سینِ مہملہ در آخر۔ بہ حذفِ نون ہم آمدہ" (نفائس اللّغات)۔ صاف ظاہر ہے کہ مؤلّف نے مرجّح صورت "گھانس" مع نونِ غنّہ کو قرار دیا ہے؛ مگر جلالؔ نے اپنے لغت سرمایۂ زبانِ اُردو میں "گھانس" کو صحیح اور "گھاس" کو غلط بتایا ہے، لکھا ہے: "گھانس، بھانس کے وزن پر۔۔۔ اور جو اِس لغت کو بعد الف کے نونِ غنّہ کے ساتھ نہیں بولتے، یا نہیں لکھتے، مؤلّف ہیچ مدان کے نزدیک اُن کی غلطی ہے"۔ اِس کے برخلاف صاحبِ نوراللّغات نے "گھاس" لکھ کر، مزید لکھا ہے کہ: "عوام گھانس نونِ غنّہ کے ساتھ بولتے ہیں"۔ یہی بات فیلن نے اپنے لغت میں لکھی ہے۔ سماعت کا احوال یہ ہے کہ یہ لفظ دونوں طرح سننے میں آتا ہے؛ البتہ "گھسیارا" میں غنّہ آواز دخل نہیں پا سکی ہے۔ لکھاوٹ کی صورت یہ ہے کہ عام طور پر "گھاس" لکھا جاتا ہے، "گھانس" شاید ہی کوئی لکھتا ہو۔

گھائل (ص ۲۶): ک میں ص ۲۲ پر "گھایل" ہے، ص ۴۵ پر "گھایل" ہے اور ص ۲۴ اور ص ۷۵ پر "گھائل" ہے۔ اِس لفظ کے املا اور تلفّظ میں اختلاف رہا ہے اور اِس پر سب سے مفصّل بحث شوقؔ نیموی نے اپنے رسالے اصلاح میں کی ہے۔ راقم الحروف نے اپنی کتاب اُردو املا میں اِس بحث کے ضروری اجزا کو یک جا کر دیا ہے۔ مختصر یہ ہے کہ بعض شعرا نے اِس لفظ کو "بسمل" اور "دل" جیسے قوافی کے ساتھ "گھائل" نظم کیا ہے اور بعض اساتذہ نے "محمل" اور "بادل" جیسے قوافی کے ساتھ "گھایَل" لکھا ہے۔ قدیم صورت بہ ہر حال "گھایَل" ہے۔ یہ لفظ جب "دِل" کا ہم قافیہ ہوگا، تو اسے "گھائِل" لکھا جائے گا (مع ہمزۂ مکسور) اور جب یہ "بادل" کا ہم قافیہ ہوگا تو اسے "گھایَل" لکھا جائے گا (مع یاے مفتوح)۔ یہ صحیح ہے کہ قدیم صورت گھایَل (مع یاے مفتوح) ہے، لیکن اب بیش تر لوگوں کی زبان سے "گھائل" سننے میں آتا ہے۔ اِس سلسلے میں یہ پہلو بھی ہمارے سامنے رہنا

چاہیے کہ عربی کے اسم فاعل، قائل، مائل، سائل وغیرہ اور کچھ جمعیں، جیسے: مسائل، وسائل، رسائل وغیرہ؛ ایسے سب لفظ مع ہمزۂ مکسور تلفظ میں آتے ہیں۔ "گھائل" بھی اسی وزن اور اسی قماش کا لفظ ہے، اور یوں یہ بھی مع ہمزۂ مکسور زبانوں پر آتا ہے۔ کے میں دو جگہ "گھائل" ملتا ہے (ص ۴۳، ص ۵۷) اور ایک جگہ "گھایل" ہے، یعنی ی کے نیچے زیر ہر جگہ لگا ہوا ہے۔ جیسا کہ لکھا جا چکا ہے، جب اس لفظ کو ی کے ساتھ لکھا جائے گا، تو پھر اسے مع یائے مفتوح پڑھنا ہوگا؛ اس صورت میں ی کے نیچے زیر نہیں آئے گا۔ ان وجوہ سے اس لفظ کو اس کتاب میں ہر جگہ "گھائل" لکھا گیا ہے۔

گھاؤں ("گھاو" کی جمع): ص ۲۸۵، حاشیہ ①۔

گھسٹتے ہیں (ص ۱۵۹): کے میں اسی طرح (بہ کسرِ اوّل و فتحِ سوم) ہے۔ آصفیہ میں بھی "گھسٹنا" ہے (اور "گھسٹے گھسٹے پھرنا")۔ "گھسٹنا" کے ذیل میں یہ وضاحت بھی موجود ہے: "اہلِ لکھنؤ کافِ فارسی مفتوح و سینِ مہملہ مکسور بولتے ہیں، مگر اہلِ دہلی اوّل مکسور، دوم مفتوح استعمال کرتے ہیں"۔ جلال نے اپنے لغت سرمایۂ زبانِ اردو میں "گھسٹنا" کے ذیل میں لکھا ہے: "تنبیہ: اس لفظ کو حرفِ اوّل کے کسرے اور حرفِ دوم کے فتحے سے بولنا مؤلف کے نزدیک غیر فصیح ہے"۔ صاحبِ نور اللغات نے بہ کسرِ اوّل و فتحِ دوم لکھ کر، مزید لکھا ہے: "گھسٹنا: اردو میں بہ فتحِ اوّل و کسرِ دوم بھی بول چال میں ہے"۔ اس کے بعد بہ کسرِ اوّل و فتحِ دوم کی مثال میں امیر مینائی کا ایک شعر لکھا ہے: "امیر مینائی نے بہ کسرِ اوّل و فتحِ دوم بھی کہا ہے..... امیر: زور سا زور ہے کچھ پاؤں میں اس کے جو پڑے ٭ عرش آئے ابھی زنجیر کے ہمراہ گھسٹ۔ سرپٹ، تلپٹ قافیے ہیں"۔ مختصر یہ کہ لکھنؤ میں اگرچہ اسے بہ فتحِ اوّل و کسرِ دوم فصیح بتایا گیا ہے، مگر بہ کسرِ اوّل و فتحِ دوم بھی استعمال کیا گیا ہے۔

نیز دیکھیے ص ۳۶۴، ح ⑤۔

گھگیانا، گھگھیانا: ص ۳۶۴، ح ⑦۔

گھونگرو: ص ۳۶۷، ح ⑪۔

گیارہ (ص ۱۳۱): کے اور ضم میں "گیارہ" ہے، یعنی اس لفظ کو مع یائے مخلوط لکھا گیا ہے۔ آگے چل کر یہ لفظ ص ۱۷۹ پر بھی آیا ہے: "گیارھویں روز" اور وہاں بھی کے میں

یہ مع یاے مخلوط ہے؛ اسی کی مطابقت اختیار کی گئی ہے [مستعمل بھی اسی طرح ہے]۔
گیٗاں (ص ۸): ک میں "گیاں" ہے، یعنی یٗ کے نقطے نیچے اوپر رکھے گئے ہیں۔
گل کرسٹ کے مقرر کردہ نظامِ املا کے تحت یاے مخلوط التلفظ کی پہچان یہ تھی کہ اُس کے نقطے نیچے اوپر رکھے جائیں گے۔ اسی کی مطابقت اختیار کی گئی ہے اور اِس لفظ کو مع یاے مخلوط لکھا گیا ہے [مستعمل بھی اسی طرح ہے]۔
لاڈ (ص ۲۲۳): ن میں اِس مقام پر "لاڈ" ہے۔ باقی سب نسخوں میں یہاں "لاڑ" ہے۔
یہ لفظ اِس سے پہلے بھی پہلے درویش کی سرگزشت کے آغاز ہی میں آیا ہے: "غرض جس کے گھر میں اتنی دولت اور ایک لڑکا ہو، اُس کے لاڈ پیار کا کیا ٹھکانا ہے" (ص ۲۱) اور وہاں سب نسخوں میں" لاڈ" ہے۔ اپنے اپنے مقام پر اِن دونوں لفظوں کو برقرار رکھا گیا ہے، اِس بنا پر کہ ڑ اور ڈ کا ابدال متعدد لفظوں میں عام ہے، اور اِس لفظ کی بھی یہی صورت ہے۔ اِس لفظ کی دونوں صورتوں کی اِس اختلافِ املا سے نشان دہی ہوتی ہے۔ اسی لیے کسی کے مطابق دونوں صورتوں کو برقرار رکھا گیا ہے۔ یہاں "لاڈ پیار" دونوں لفظ ایک ساتھ آئے ہیں (اسی طرح آتے بھی ہیں)" پیار" کو مع یاے مخلوط لکھا گیا ہے، اور وضاحت اِس لفظ کے تحت، اسی ضمیمے میں کر دی گئی ہے۔
لانچی: ص ۳۱۰، ح ۴ ۔
لتا (ص ۲۳۲): سب نسخوں میں یہی املا ہے، یعنی آخر میں الف ہے۔ اصلاً "لتہ" ہے اور ترکیبی صورت میں اسی طرح آتا ہے، جیسے: لتہ حیض۔ اِس کو "لتا" لکھنے کا مطلب یہ ہے کہ اِسے اُردوا لیا گیا ہے۔ "کپڑا لتا" میں تو اکثر "لتا" ہی دیکھا گیا ہے اور غالباً اسی طرح یعنی "کپڑا لتا" لکھے جانے کی وجہ سے مفرد لفظ کو بھی "لتا" لکھا گیا ہے۔ چوں کہ سبھی نسخوں میں یہی املا ہے اور اِسے ایک اعتبار سے چہتد صورت کہا جا سکتا ہے، اِس بنا پر اسی املا کو برقرار رکھا گیا ہے۔
لعل (شرح): ص ۳۶۶، ح ۸ ۔
لفنتیاں: ص ۳۶۰، ح ۸ ۔
لکھا (ص ۱۱)۔ لکھا (ص ۱۷): ک میں پہلے مقام پر "لکھا" مع تشدید ہے (ک ص ۸)

اور دوسرے مقام پر "لکھا" بغیرِ تشدید ہے (کے ص ۱۳)۔ مصدر "لکھنا" کے مشتقات کے میں کہیں تو مع تشدید ملتے ہیں اور کہیں بغیرِ تشدید۔ مخطوطۂ گنجِ خوبی میں بھی لکھنا، اٹھنا، رکھنا کے مشتقات کہیں تو مع تشدید ملتے ہیں اور کہیں بغیرِ تشدید (مگر اس فرق کے ساتھ کہ اکثر مقامات پر تشدید ملتی ہے اور کم مقامات پر تشدید موجود نہیں)۔ جہاں تک استعمالِ عام کا تعلق ہے، تو اِس میں بھی اِن مصادر کے مشتقات دونوں طرح ملتے ہیں۔ چوں کہ "لکھنا" کے مشتقات کے میں دونوں طرح ملتے ہیں اور مخطوطۂ گنجِ خوبی میں بھی دونوں صورتیں مل جاتی ہیں (اور استعمالِ عام کا احوال بھی یہی ہے) اِس لیے طریقہ یہ اختیار کیا گیا ہے کہ کے میں جن مقامات پر یہ افعال مع تشدید ہیں، وہاں تشدید کو برقرار رکھا گیا ہے اور جہاں کے میں تشدید موجود نہیں، وہاں تشدید نہیں لگائی گئی ہے۔ "لکھنا" کی طرح "رکھنا" کے مشتقات بھی کے میں مع تشدید اور بغیرِ تشدید، دونوں طرح ملتے ہیں۔ اِس مصدر کے مشتقات کو بھی ہر جگہ کے کے مطابق لکھا گیا ہے، مثلاً اِس کتاب میں ص ۷۲ اور ص ۹۴ پر "رکّھے"، ص ۹۵ پر "رکّھا تھا" اور "رکّھی تھی" لکھا گیا ہے، مگر ص ۸۷ اور ص ۹۲ پر "رکھے"، اور ص ۱۲۱ پر "رکھا" (بغیرِ تشدید) ملیں گے؛ اِس بنا پر کہ کے میں اِن سب مقامات پر یہ الفاظ اسی طرح ملتے ہیں۔ بعض مقامات پر حواشی میں اِس کی صراحت بھی کر دی گئی ہے۔

لَنْبوٹ (لمبوٹ): ص ۳۵۷، ح ④۔

لَنْبے (ص ۱۸۳): م، ن، کے، فے میں اسی طرح۔ ع: لمبے۔ مخطوطۂ گنجِ خوبی میں جہاں بھی یہ لفظ آیا ہے، اسے مع نون لکھا گیا ہے، مثلاً: لنبے: ۴۷، ۳۴۶، ۳۴۳۔ لنبی: ۲۰۶۔ یہ پرانا اندازِ کتابت ہے اِن لفظوں کا؛ اسی بنا پر اِس قدیم املا کو برقرار رکھا گیا ہے۔ [ایسے متعدد الفاظ کو میر امّن نے (مخطوطۂ گنجِ خوبی میں) مع نون ہی لکھا ہے، مثلاً: اچنبھا]۔

لُہُو (ص ۲۶): کے میں اِس لفظ پر اعراب موجود نہیں، البتّہ م اور فے میں لام پر پیش لگا ہوا ہے۔ آصفیہ میں "لُہو" ہے، یعنی لام پر پیش بھی ہے اور زبر بھی۔ مطلب یہ نکلا کہ دونوں طرح درست ہے، مگر اِس کے ایک مرکّب کو "لُہو لُہان" لکھا گیا ہے، یعنی دونوں جگہ لام پر پیش لگے ہوئے ہیں۔ مولّف نے "لہو" کو "لوہو" کا مخفّف لکھا ہے، اور اِس سے لام کے پیش کی ترجیح ظاہر ہوتی ہے۔ اِس میں شک نہیں کہ اب اکثر لوگوں کی زبان پر

"لَہو" ہے، مگر اس کا قدیم تلفظ "لُہو" بھی تھا۔ "لوہو" کو اگر اصل مانا جائے تو پیش کی قدامت مسلّم رہے گی۔ "لوہو" قدیم شعرا کے یہاں ملتا ہے۔ پلیٹس نے اپنے لغت میں اسے دونوں طرح (لَہو، لُہو) لکھا ہے۔ چوں کہ "لُہو" (بہ ضمِ لام) کا قدیم زبان میں ہونا مسلّم ہے اور م اور ف میں لام پر پیش لگا ہوا بھی ہے، اِسی بنا پر اِس لفظ کو م اور ف کے مطابق بہ ضمِ اوّل لکھا گیا ہے۔

ما (ص ۲۱) : م، ک، ف میں اِسی طرح۔ ن اور ع میں "ماں" ہے۔ ک میں عموماً یہ لفظ نونِ آخر کے بغیر ہی ملتا ہے، صرف ایک جگہ ص ۱۹۲ پر "ماں باپ" ملتا ہے۔ یہاں ف میں بھی "ماں" ہے۔ ن میں تقریباً ہر جگہ "ماں" (مع نونِ غنّہ) ہے۔ مخطوطۂ گنج خوبی میں یہ لفظ بہت سے مقامات پر آیا ہے اور ہر جگہ "ما" ملتا ہے، مثلاً ص ۵۷، ۱۵۲، ۲۱۸۔ امّا: ۶۱۔ مائی ۲۱۴۔ "ما" اور "ماں" یہ دونوں صورتیں بجائے خود درست اور مستعمل ہیں؛ البتہ اکثر قدیم مخطوطوں میں (اور بہت سی مطبوعہ کتابوں میں بھی) "ما" ملتا ہے۔ یہاں مصنف کا املا ہمارے سامنے ہے کہ اُس نے کسی استثنا کے بغیر ہر جگہ اِس لفظ کو صرف ایک طرح (یعنی "ما") لکھا ہے، اِس بنا پر اِس لفظ کا یہی املا مرجّح قرار پائے گا اور اِسی بنا پر ص ۱۹۱ پر بھی "ما" لکھا گیا ہے۔ یہ لکھا جا چکا ہے کہ ک میں صرف اُس ایک مقام کے علاوہ، ہر جگہ "ما" ملتا ہے۔ اِسی طرح "مائی" ص ۱۶۹ (ک : ص ۱۱۹) "ماجائی" (بہن کے معنی میں) ص ۳۳ (ک : ص ۱۹)۔ نیز "امّا" ص ۱۳۰ (ک : ۱۱۲) ص ۱۶۴ (ک : ۱۲۳)۔ [یہ بھی ذہن میں رہے کہ "ما" کے آگے علامتِ جمع "ؤں" بڑھانے سے "ماؤں" بنتا ہے اور "ما" ہی سے "مائی" بنا ہے]۔

ماجرا : ص ۳۰۴، حاشیہ (۳)

ماندگی : ص ۳۰۵، ح (۳)۔ نیز ص ۳۶۹، ح (۹)۔

مانُس (ص ۱۵۱) : ک اور ف میں نون پر پیش لگا ہوا ہے۔ ک میں ص ۱۷۱ اور ص ۱۸۰ پر بھی یہ لفظ آیا ہے اور دونوں جگہ دونوں نسخوں (ک ۔ ف) میں نون پر پیش موجود ہے، اِسی کی مطابقت اختیار کی گئی ہے۔ پلیٹس کے لغت میں "مانَس" اور "مانُس" دونوں شکلیں موجود ہیں۔ اب عموماً "بھلا مانَس" (بہ فتحِ نون) کہتے ہیں۔ ترکیب کے بغیر "مانس" اب شاید ہی استعمال میں آتا ہو۔ اِس عبارت میں یہ لفظ مفرد طور پر آیا ہے، مگر یہ بھی خیال رہے کہ یہ مقولہ ایک ہندو عورت کا ہے۔

مانند (ص ۲) : کے اور فے میں اِس لفظ پر اعراب موجود نہیں۔ اِس کے بعد یہ لفظ ص ۱۱ پر آیا ہے ("مانند تارِ مقیش کے چمک رہا ہے") اور وہاں بھی اِن دونوں نسخوں میں اس لفظ پر اعراب موجود نہیں، البتہ م میں "مانِند" ہے، یعنی پہلے نون کے نیچے زیر لگا ہوا ہے۔ اِس کے علاوہ شے کی فرہنگ میں بھی اِسے بہ کسرِ نون لکھا گیا ہے، مگر سب سے بڑھ کر نون کے مکسور ہونے کا ثبوت یہ ہے کہ میر امّن نے مخطوطہ گنج خوبی میں ہر جگہ اِس لفظ کو "مانِند" لکھا ہے، مثلاً ص ۵، ۴۷، ۹۶، ۱۰۳، ۱۴۶، ۱۹۲، ۱۸۳، ۲۱۰، ۳۶۶۔ اِسی بنا پر اِس لفظ کو ہر جگہ بہ کسرِ نونِ اوّل (مانِند) لکھا گیا ہے۔ یہ وضاحت بے محل نہ ہوگی کہ بہ لحاظِ اصل یہ فارسی کا لفظ ہے اور فارسی میں "مانَند" ہے یعنی پہلے نون پر زبر ہے۔ فرہنگِ آصفیہ میں اِسے اِسی طرح (یعنی فارسی کے مطابق) لکھا گیا ہے، لیکن صاحبِ نور اللّغات نے یہ صراحت کر دی ہے کہ : "اُردو میں زبانوں پر بہ کسر سوم ہے" اور میر امّن کی محوّلۂ بالا تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ تلفّظ کا یہ اختلاف اُردو میں اب سے بہت پہلے رونما ہو چکا ہے۔

مُتعہ (ص ۱۸۹) : کے میں "مُتَعہ" ہے، یعنی میم پر پیش لگا ہوا ہے اور ت پر زبر۔ فے میں "مُتعہ" ہے، یعنی صرف میم پر پیش ہے، لیکن اِس کی فرہنگ میں اِسے بہ ضمِّ اوّل و سکونِ دوم درج کیا گیا ہے۔ آصفیہ میں "مُتِعَہ" ہے، یعنی میم پر پیش لگا ہوا ہے اور ت اور ع دونوں پر زبر ہے۔ [یہ اصل کے بھی خلاف ہے اور اُردو میں استعمال کے بھی مطابق نہیں] نور میں اِسے "بالضّمّ اوّل و فتحِ دوم" لکھا گیا ہے۔ پلیٹس کے لغت میں اِسے بہ ضمِّ اوّل و سکونِ دوم و فتحِ سوم (مُتْعَہ) لکھا گیا ہے، اِس لفظ کا اصل تلفّظ یہی ہے (المنجد) مگر یہ بھی اپنی جگہ پر درست ہے کہ استعمالِ عام میں "مُتَعہ" بروزنِ "جُدا" آتا ہے۔ کے میں جو اعراب لگے ہوئے ہیں، وہ استعمالِ عام کے عین مطابق ہیں، اِسی کی مطابقت اختیار کی گئی ہے۔ "مُتَعہ" سے اُردو والوں نے "مُتاعی" بنا لیا ہے، جانصاحب کا شعر ہے : نکاحی بیاہی کو چھوڑ بیٹھے، متاعی رنڈی کو ڈالا گھر میں : بنایا صاحب امام باڑہ، خدا کی مسجد کو تم نے ڈھا کر (دیوانِ جانصاحب، مطبعِ حیدری لکھنؤ، ص ۵۲)۔

رِمِتّی (ص ۳) : م، کے، فے میں میم کے نیچے زیر لگا ہوا ہے۔ اِس لفظ کے سلسلے میں کچھ وضاحت ضروری ہے۔ اِنشا نے دریائے لطافت میں اِس لفظ کو بہ کسرِ اوّل اور بہ فتحِ اوّل (رِمِتّی، رَمَتّی) دونوں طرح فصیح لکھا ہے (ترجمۂ دریائے لطافت، ص ۲۲۲) آصفیہ میں بھی "رَمِتّی" لکھا

ہوا ہے، لیکن مولّف نے یہ وضاحت بھی کی ہے کہ: "عوام مَٹّی بہ فتحِ میم"۔ اِس سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ مولّف کے نزدیک فصیح بہ کسرِ اوّل (مِٹّی) ہے۔ باغ و بہار میں جہاں بھی یہ لفظ آیا ہے، وہاں کے بیں میم کے نیچے زیر لگا ہوا ہے، مثلاً: صفحات ۱، ۱۴، ۲۰، ۸۷، ۸۸؛ یہی صورت نسخۂ فاربس کی ہے، اور اِس سے صاحبِ آصفیہ کے قول کی تائید ہوتی ہے؛ اِسی بنا پر اِس کتاب میں اِس لفظ کو بہ کسرِ اوّل (مِٹّی) لکھا گیا ہے۔

اصل بحث کے بعد، اِس لفظ کے سلسلے میں ضمنی طور پر یہ وضاحت بھی بے جا نہ ہوگی کہ بہت سے علاقوں میں یہ لفظ بہ فتحِ اوّل بھی سُننے میں آتا ہے؛ مولّفِ نوراللغات نے لکھا ہے: "مِٹّی، مَٹّی، یہ لفظ بالکسر اور بالفتح دونوں طرح استعمال میں ہے، لیکن بالکسر زیادہ فصیح سمجھا جاتا ہے"۔ اور یہی صحیح صورتِ حال ہے۔ فیلن نے اپنے لُغت میں اِس لفظ کو بہ کسرِ اوّل و بہ فتحِ اوّل، دونوں طرح درج کیا ہے؛ مگر اِس لفظ کے ذیل میں جس قدر مثلیں اور مثالیں لکھی ہیں، اُن سب میں اِس لفظ کو بہ کسرِ اوّل (مِٹّی) ہی لکھا ہے، اور اِس سے ترجیح کی وضاحت خود بہ خود ہو جاتی ہے۔

فیلن کے لکھنے کے مطابق پالی میں MATTIKA ہے، گویا "ماٹی" میں اِسی زبر نے الف کی صورت میں اِشباع پایا ہے۔ ہندی دوہوں میں "ماٹی" بہ کثرت آیا ہے اور اُردو میں بھی عہدِ میر و سودا تک یہ ملتا ہے، مثلاً: ہر ذرّہ خاک تیری گلی کی ہے بے قرار ؛ یاں کون سا ستم زدہ ماٹی میں رَل گیا (میر، کلیاتِ مرتبۂ آسی، ص ۱۷۰)۔ خلقت تمام گردشِ افلاک سے بنی ؛ ماٹی ہزار رنگ کی اِس چاک سے بنی (میر سوز، دیوانِ سوز، رسالۂ اُردوئے معلّیٰ (دہلی) سوز نمبر، ص ۴۲۱)۔

مَٹیانا، مَٹیار، مَٹیالا، مَٹیا (مٹیا بھوس، مٹیا سانپ، مٹیا محل، مٹیا بُرج) اُردو میں مستعمل ہیں اور اِن سب میں میم پر زبر ہے، اور اِس طرح "مَٹّی" (بہ فتحِ اوّل) کا جواز ظاہر ہے؛ لیکن یہ بھی درست ہے کہ دہلی اور لکھنؤ، دونوں جگہ فصاحت کی سند "مِٹّی" (بہ کسرِ اوّل) ہی کو حاصل رہی ہے۔

مجھ پر (ص ۴): ک: مجپر۔ ف: مجھپر۔ ہائے مخلوط کا استعمال عمومی طور پر عجیب سی حالت میں رہا ہے۔ خود میر امّن نے مخطوطۂ گنج خوبی میں (اپنے قلم سے) ایک ہی لفظ کو ایک جگہ مع ہائے مخلوط لکھا ہے اور دوسری جگہ اُس کے بغیر لکھا ہے۔ کوئی ایک اصول یا ایک انداز نہیں ملتا؛

مثلاً مخطوطۂ گنجِ خوبی میں کہیں "ہاتھ" لکھا ہے، کہیں "ہات"۔ کہیں "جھوٹھا" لکھا ہے، کہیں "جھوٹا"۔ کہیں "بھوکھا" لکھا ہے، کہیں "بھوکا"۔ اسی طور پر "مجھے، مجھ تلک، تجھے، تجکو، مجھے، تجھپر" ملتے ہیں۔ ہاں "مجھے" کی جگہ "مجے" یا "تجھے" کی جگہ "تجے" کہیں نہیں ملتا۔ اور "مجھ" ملتا ہے (مجھ تلک ص ۱۹۱) مگر "مج" کہیں نہیں ملتا ــــ باغ و بہار کے نسخۂ ک کا احوال بھی اس لحاظ سے کچھ ایسا ہی ہے، مثلاً اس میں "مجھ کو" بھی ملتا ہے (ص ۱۰) اور "مجھپر" بھی ملتا ہے (ص ۲)، اور "مجھ" بھی موجود ہے (مجھ فقیر نے ص ۱۷)۔ مختصر یہ کہ اصل لفظ "مجھ" اُس مخطوطے میں بھی اور اس مطبوعہ نسخے میں بھی ہر جگہ مع ہائے مخلوط ملتا ہے، اور "مج" کہیں نہیں ملتا؛ اس بنا پر اس لفظ سے مرکب جملہ الفاظ کو اس کتاب میں ہر جگہ مع ہائے مخلوط ہی لکھا گیا ہے (مثلاً: مجھ پر، مجھ کو، مجھ سے وغیرہ) اور اسی کے قیاس پر "تجھے، تجھ کو، تجھ پر، تجھ سے (وغیرہ) لکھے گئے ہیں۔

محاورہ: ص ۲۶۳، حاشیہ (۳)۔

مَحَبَّت: اس کتاب میں یہ لفظ کئی جگہ آیا ہے اور ک میں کہیں بھی اس لفظ پر اعراب موجود نہیں۔ فت میں "مُحبّت" ہے، یعنی میم پر پیش لگا ہوا ہے۔ آصفیہ (اور نور) میں "مَحبّت" ہے۔ آصفیہ میں اس کے جملہ مرکبات میں میم پر زبر لگایا گیا ہے اور اس تکرار سے ظاہر ہوتا ہے کہ مؤلف نے اس کو بہ فتحِ میم صحیح اور مستعمل قرار دیا ہے۔ نور میں تو یہ صراحت کر دی گئی ہے کہ بہ ضمِ میم غلط ہے۔ خیر، غلط تو نہیں کہا جا سکتا، کیوں کہ "مُحبّت" بھی سننے میں آتا ہے اور بہت سے لوگوں کی زبان سے؛ لیکن میں نے آصفیہ کی مطابقت اختیار کی ہے اور اسی لیے میم پر ہر جگہ زبر لگایا گیا ہے۔

مَحَل (ص ۱۱): ک میں ح پر زبر موجود ہے۔ یہ لفظ اس کتاب میں متعدد مقامات پر آیا ہے اور ک میں ہر جگہ ح پر زبر لگا ہوا ہے، مثلاً ص ۷۶، ۷۷، ۸۰، ۲۲۰۔ اس وضاحت کی ضرورت یوں محسوس ہوئی کہ تلفظ میں یہ لفظ کچھ اس طرح آتا ہے کہ ح کے زبر کی آواز ترچھی ہو کر نکلتی ہے، جو زیر کی آواز سے قریب تر معلوم ہوتی ہے۔ یہ لہجے کی بات ہے۔ تلفظ میں تو یہ لفظ اسی طرح آئے گا کیوں کہ فصاحتِ بیان کا تقاضا یہی ہے۔ طلبہ کے استفادے کے لیے یہ لکھنا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اصلاً تو "مَحَلّ" تھا: "محل [ع: بہ فتحِ اوّل و دوم و تشدیدِ سوم۔ ٹھہرنے کی جگہ، اُترنے کی جگہ۔ ۲ بہ معنیِ قدر و منزلت۔ ۳ فارسیوں نے بہ تخفیف استعمال کیا۔ اور وقت،

موقع کے معنی اضافہ کیے۔] مذکر؛ اترنے کی جگہ، مکان، جگہ، ٹھکانا ... موقع، وقت ... بادشاہوں، نوابوں، راجاؤں کے عالی شان مکانات، قصر، ایوان، زنانہ مکان ...“ یہ بات اُن کے لکھنے سے رہ گئی کہ قصر کے معنی کا اضافہ اُردو میں ہوا ہے۔ اُردو میں جب یہ لفظ بہ طورِ مفرد آتا ہے تو تشدید کے بغیر ہی استعمال میں آتا ہے، خواہ قصر کے معنی میں آئے اور خواہ دوسرے معنی میں۔ البتہ ترکیب کی صورت میں تشدید واپس آجاتی ہے اور ح کا زیر واضح ہو جاتا ہے، جیسے: محلِّ وقوع، محلِّ نظر، محلِّ خاص۔

مُحلّہ (ص ۲۷) : م، کے اور ف‌ے میں یہاں اِس لفظ پر اعراب موجود نہیں۔ یہ لفظ آگے چل کر ص ۱۶۹ پر بھی آیا ہے، اور وہاں کے اور ف‌ے دونوں میں میم پر پیش لگا ہوا ہے۔ اصلاً یہ لفظ بہ فتحِ اوّل ہے اور آصفیہ میں بھی ”مَحلّہ“ ہے۔ نور میں لکھا گیا ہے: ”یہ لفظ صحیح بہ فتحِ اوّل ہے، عوام کی زبانوں پر بہ ضمِّ اوّل ہے۔“ ممکن ہے کبھی ایسا ہو، مگر اب تو عام لوگ اِسے عموماً بہ ضمِّ اوّل ہی بولتے ہیں۔ کے اور ف‌ے میں میم پر پیش کا موجود ہونا واضح طور پر اِس پر دلالت کرتا ہے کہ اُس عہد میں بھی ”مُحلّہ“ مستعمل تھا۔ فیلن نے صحیح طریقہ اختیار کیا ہے کہ ”مَحلّہ“ لکھ کر یہ وضاحت بھی کر دی ہے کہ مقبولِ عام تلفظ ”مُحلّہ“ ہے اور یہی صحیح بات ہے۔ کے اور ف‌ے کے مطابق میم پر پیش لگایا گیا ہے۔

مُحلّی (ص ۱۲) : م، کے : محلی۔ ف‌ے، ع : محلّی۔ ن : محلی۔
ف‌ے میں ”محلّی“ (مع تشدید) ہے اور ع میں بھی اِسی طرح ہے۔ چوں کہ مولوی عبدالحق مرحوم نے فاربس کے نسخے کو پیشِ نظر رکھا ہے، غالباً اِسی بنا پر اُنھوں نے اپنے نسخے میں فاربس کی تقلید میں ”محلّی“ کو مع تشدید رکھا ہے اور فاربس کا حال یہ ہے کہ وہ ایسے مفرد عربی لفظوں کے آخری حرف کو مشدّد لکھتا ہے جو اُردو میں تشدید کے بغیر مستعمل ہیں، مثلاً: خاصّ، عامّ، حدّ۔ (یہ سب لفظ کے میں تشدید کے بغیر ہی ہیں) اِس لیے اُس کے نسخے میں کسی ایسے لفظ پر تشدید کا موجود ہونا اِس کی دلیل نہیں کہ وہ حرف لازماً مشدّد ہوگا۔ لغات میں صورت یہ ہے کہ آصفیہ اور نور میں ”محلّی“ ہے۔ (نور کا اندراج بہ ظاہر آصفیہ کی نقل ہے) پلیٹس نے اصل لفظ ”محلّی“ لکھا ہے اور ”محلی“ (بغیر تشدید) کو عامیانہ زبان بتایا ہے۔ اِس کے برخلاف فیلن نے صرف ”محلی“ (بغیر تشدید) لکھا ہے۔ ”محل“ قصرِ شاہی کے معنی میں مہنّد ہے اور تشدید کے بغیر مستعمل ہے۔ بہ ظاہر ”محل“ سے ”محلی“

ہونا چاہیے۔ کـ میں "مُحِلّی" ہی ہے۔ یہ بات ذہن میں رہے کہ کـ میں تشدید کا اہتمام، بل کہ بڑی حد تک التزام نظر آتا ہے۔ میں نے کـ کی مطابقت اختیار کی ہے اور اِس لفظ کو تشدید کے بغیر ہی لکھا ہے۔ یہ لفظ اِس کتاب میں جہاں بھی آیا ہے، م اور کـ دونوں میں تشدید کے بغیر لکھا ہوا ملتا ہے۔ اور اِنھی کی مطابقت میں اِسے تشدید کے بغیر ہی مرجّح قرار دیا گیا ہے۔

مُختارِ کار (بغیرِ اضافت): ص ۲۵۱، حاشیہ (۴)۔

مَدارُ المُہام: ص ۲۱۱، ح (۵)۔

مددِ معاش (اضافت کے بغیر): ص ۳۸۷، ح (۱)۔

مردِ آدمی (ص ۴۴): م، کـ اور فـ میں "مرد" کی دال کے نیچے اضافت کا زیر لگا ہوا ہے۔ یہ مرکب اِس کتاب میں تین جگہ آیا ہے۔ دو مقامات پر کـ میں "مردِ" ہے (کـ ص ۳۹، کـ ص ۱۷۹) اور ایک جگہ اضافت کا زیر موجود نہیں (کـ ص ۷۷) مگر فـ میں تینوں مقامات پر اضافت کا زیر موجود ہے۔ یہ مرکب معِ اضافت اور بغیرِ اضافت، دونوں طرح سُننے میں آیا ہے، لیکن معِ اضافت اکثر، اور اضافت کے بغیر اُس کے مقابلے میں کچھ کم۔ نور میں دال کے نیچے اضافت کا زیر موجود نہیں اور اِس سلسلے میں کسی طرح کی صراحت بھی نہیں؛ البتہ آصفیہ میں "مردِ آدمی" ہے، اور فیلن اور پلیٹس کے لغات میں بھی معِ اضافت مندرج ہے۔ م، کـ، فـ کی مطابقت میں ہر جگہ اِس مرکب کو معِ اضافت (مردِ آدمی) لکھا گیا ہے۔

مردِ آدمیّت (ص ۷۴): کـ اور فـ میں "مردِ آدمیّت" ہے، یعنی دال کے نیچے اضافت کا زیر لگا ہوا ہے۔ "مردِ آدمی" تو معِ اضافت مستعمل ہے، مگر "مرد آدمیّت" کے متعلق ذہن میں یہ خیال آتا ہے کہ اسے معِ اضافت نہیں ہونا چاہیے۔ اِس کی تائید کا بھی ایک پہلو موجود ہے۔ مخطوطۂ گنجِ خوبی میں یہ لفظ تین جگہ آیا ہے: (۱) شیوہ مرد آدمیّت اور بخل سنائی کا ہے (ص ۲۲۹)، (۲) مروّت کی بات اور مرد آدمیّت کا شیوہ نہیں (ص ۲۲۸)، (۳) مرد آدمیّت سے باہر ہے (ص ۲۳۱) اور اِن تینوں مقامات پر اضافت کا زیر موجود نہیں (جب کہ اِس مخطوطے میں اضافت کے زیر عموماً لگائے گئے ہیں)۔ تینوں مقامات میں سے کسی ایک جگہ بھی اضافت کے زیر کا موجود نہ ہونا بہ ظاہر اِسی پر دلالت کرتا ہے کہ اِس کو اضافت کے بغیر استعمال کیا گیا ہے

(حُسنِ بیان اور لطفِ زبان کا تقاضا بھی یہی ہے) اسی بنا پر یہاں کؔ کے مقابلے میں مخطوطۂ گنجِ خوبی کو (یعنی مصنّف کی اپنی تحریر کو) ترجیح دی گئی اور اضافت کا زیر نہیں لگایا گیا۔ یہاں یہ بات بھی ذہن میں رہنا چاہیے کہ کؔ میں بعض ایسے مقامات پر بھی اضافت کے زیر ملتے ہیں، جہاں اُن کو (کسی بھی طور پر) نہیں ہونا چاہیے۔ مثلاً ص ۲۷ پر "اہلِ کاردن" اور ص ۶۲ پر "شاہِ زادہ" کی بحث دیکھی جاسکتی ہے۔ اِن مقامات پر کؔ میں اضافت کا زیر ہے، مگر اِن لفظوں کو اضافت کے بغیر لکھا گیا ہے۔ وہی صورت یہاں ہے۔

مَردانگی (ص ۶۲) : جن لفظوں کے آخر میں ہائے مختفی ہوتی ہے، اور اُن کے آگے "گی" کا لاحقہ شامل کیا جاتا ہے؛ اُس صورت میں بہ لحاظِ اصل اور بہ لحاظِ قاعدہ، ہائے مختفی سے پہلے والے حرف پر جو زبر ہوتا ہے، وہ برقرار رہنا چاہیے۔ بہت سے لفظوں میں یہ زبر اپنے آپ کو پوری طرح نمایاں رکھتا ہے، جیسے : بے پردَگی، تشنَگی، خستَگی، گہنَگی، طرفَگی۔ کچھ لفظ ایسے ہوتے ہیں کہ وہ عام بول چال میں اِس طرح زبانوں پر آتے ہیں کہ زبر دب کر، جزم کی سی کیفیت حاصل کرلیا کرتا ہے، جیسے : سادگی، تازگی، بے چارگی، دیوانگی۔ ضرورتِ شعری سے ایسے لفظوں میں "گی" سے پہلے زبر آسکتا ہے (اور قاعدے کے لحاظ سے یہ بالکل صحیح صورت ہوگی) مگر عام بول چال میں زبر کی جگہ جزم ہی کی سی کیفیت کارفرما رہتی ہے۔ یہی صورت "مردانگی" کی ہے۔ "مَردانہ" سے "مَردانَگی" ہونا چاہیے، شاعری میں اِس طرح کوئی کھپانا چاہے تو اُسے اس کا اختیار حاصل ہے، مگر بول چال میں "مردانگی" ہی رائج ہے۔ "مردانَگی" میں ایسی ثقیل کیفیت پیدا ہوجائے گی کہ گفتگو کی فصاحت اور روانی دونوں پر حرف آجائے گا۔ فرزانگی، دیوانگی، بے گانگی، پروانگی جیسے لفظوں کا احوال تلفّظ کے لحاظ سے ایک جیسا ہے؛ اُردو والوں کے تلفّظ میں اِن سب میں "گی" سے پہلے والا نون گویا ساکن رہتا ہے۔ کؔ اور متن میں نون پر نہ زبر ہے نہ جزم، میں نے بھی اِسے خالی ہی رکھا ہے، یہ وضاحت اِسی لیے کی گئی ہے کہ طلبہ اِس لفظ کے تلفّظ میں اِس صورتِ حال کو پیشِ نظر رکھیں۔

مردِ سچا (بغیرِ تشدید، آخر میں الف) : ص ۳۶۲، ج (۴) ۔

مُروّت (ص ۱۴۹) : کؔ میں میم کے اوپر پیش لگا ہوا ہے، لیکن رے خالی ہے۔ اگلی سطر میں "بے مروّتی" کا احوال بھی یہی ہے کہ صرف میم کے اوپر پیش لگا ہوا ہے۔ اِس سے

بہ ظاہر یہ خیال ہوتا ہے کہ پیش صرف میم پر ہے۔ اصلاً یہ لفظ بہ ضمِّ اوّل و دوم ہے، مگر زبانوں پر "مُرَوَّت" ہے (بہ ضمِّ اوّل و فتحِ دوم)۔ بات یہ ہے کہ ایسے الفاظ میں ایک ساتھ دو پیش شروع ہی میں تلفّظ کے لحاظ سے کم مانوس معلوم ہوتے ہیں اور تلفّظ کی روانی کم ہو جاتی ہے، غالباً اسی بنا پر "مُرَوَّت" نے چلن پایا، کہ تلفّظ کی روانی کے لحاظ سے یہ "مُرُوَّت" کے مقابلے میں بہتر ہے۔ فیلن نے اپنے لغت میں اس لفظ کو دونوں طرح درج کیا ہے، البتہ آصفیہ میں صرف بہ ضمِّ اوّل و دوم ہے۔

مزاخ (ص ۴۹): ف: مزاخ۔ ع: مزاح۔ [م، ک: مزاخ]۔
مستعمل عام لفظ "مذاق" ہے، لیکن بول چال کی زبان میں "مزاخ" بھی ہے (جو "مذاق" ہی کی بدلی ہوئی صورت ہے)۔ گنجِ خوبی میں بھی یہ لفظ کئی جگہ آیا ہے، مثلاً: ص ۱۲، ۲۶۹، ۲۷۲ (مخطوطۂ گنجِ خوبی) اور ہر جگہ خ کا نقطہ موجود ہے۔ ع میں جو "مزاح" (میم حائے حطّی) ہے، اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ مولوی عبدالحق مرحوم نے یہ خیال کیا ہوگا کہ یہاں اصلاً "مزاح" ہوگا، ح پر نقطہ غلطی سے لگ گیا ہے۔ ف میں چوں کہ "مزاخ" ہے، یعنی میم کے نیچے زیر لگا ہوا ہے، اس لیے اس خیال کا پیدا ہونا کہ یہاں "مزاح" ہے، نقطہ غلطی سے لگ گیا ہے، قابلِ تعجب نہیں۔ یہ خیال رہے کہ مولوی صاحب مرحوم نے اپنے نسخے کے متن کی بنیاد نسخۂ ف پر رکھی ہے اور مجھے یقین ہے کہ نسخۂ ک اس وقت اُن کے سامنے تھا ہی نہیں، اور اس لیے اصل لفظ "مزاخ" اُن کی نظر کے سامنے نہیں آپایا۔ ہاں، ص ۲۲۴ پر بھی یہ لفظ (جمع کی صورت میں) موجود ہے: "ہر ایک آشنائی کی راہ سے گلے ملتا اور مزاخیں کرتا۔" تذکرۂ میر حسن میں کمترین کا یہ شعر مرقوم ہے، جس میں "مزاخیں" آیا ہے: دیکھو پکڑ [illegible] والی کی مزاخیں: خصم کے رو بہ رو دیتی ہے تناخیں۔ انشا کا شعر ہے: ارے ہنس مکھ! تو اسے "پھول کلی" کہہ کے پکار: کھلی پڑتی ہے یہ کرتی ہوئی لوگوں سے مزاخ (کلامِ انشا، ص ۹۰۔۴)۔ اس غزل کا مطلع یہ ہے: کھا کھلا تا ہے مرے آگے جو ہو کر گستاخ: کیا بھلا گل نے نکالی ہے کوئی تازہ شناخ۔ یہ لفظ قصۂ مہر افروز و دلبر میں بھی ہے (مرتبہ مسعود حسین خاں، طبعِ دوم، ص ۵۲)۔

مَزَہ (ص ۱۱۴): م، ت، ک، ف، ع: سب میں اس مقام پر اس لفظ کا یہی املا ملتا ہے (یعنی آخر میں ہ)۔ یہ لفظ اس کتاب کے ص ۱۰۴ پر بھی آیا ہے اور وہاں ت، ک

ف، ع میں "مرا" ہے۔ چوتھے درویش کی سیر میں بھی ایک جگہ یہ لفظ آیا ہے (ک، ص ۲۳۱)، اور وہاں بھی ف، ک، فے، ع میں "مرا" ہے۔ اُردو کی کتابوں میں اس لفظ کے یہ دونوں املا ملتے ہیں۔ آصفیہ میں "مزہ" کو فارسی اور "مزا" کو اُردو بتایا گیا ہے: "مزا: [ا، اسم مذکر] [صحیح ف: مزہ] اگرچہ اُردو میں الف سے بھی بعض موقع پر بہ لحاظِ قافیہ، بعض موقع پر بہ لحاظِ بول چال لکھتے ہیں، مگر ہم نے صحت پر خیال کر کے اس لغت کو اپنی جگہ پر لکھا ہے۔" نور میں صرف "مزہ" ہے۔ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی نے لکھا ہے: "ایسے لفظوں کو، جو اُردو میں گھل مل گئے ہیں اور اُن کی غیریت محسوس نہیں ہوتی، "ہ" کی جگہ الف سے لکھنا جائز ہے، جیسے: "مزہ" کی جگہ "مزا"۔ [مقالاتِ صدیقی۔ جلدِ اوّل، ص ۹]۔ اس بحث کا ماحصل یہ ہے کہ اصل لفظ تو "مزہ" ہے، مگر اس کی ایک (جہنّد) صورت "مزا" بھی ہے اور لوگ اس طرح بھی لکھتے ہیں اور باغ و بہار میں ("مزہ" اور "مزا" کے) اختلافِ املا سے واضح طور پر یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ املا کا یہ اختلاف کچھ نیا نہیں۔ چوں کہ اس لفظ کی یہ دونوں صورتیں اس لفظ میں اختلافِ املا کی نمایندگی کرتی ہیں، اس لیے اس لفظ کے سلسلے میں یہ طریقہ اختیار کیا گیا ہے کہ اپنے اپنے مقام پر ان کی صورتوں کو برقرار رکھا جائے؛ اس لیے اس مقام پر "مزہ" لکھا گیا ہے، اور جن مقامات پر ک اور متن میں "مزا" ہے، وہاں اسی املا کو برقرار رکھا گیا ہے۔

مُشْعَل (ص ۲۰۹): ک اور متن میں اس لفظ پر اعراب موجود نہیں، البتہ فے کی فرہنگ میں اسے "مِشْعَل" لکھا گیا ہے۔ عربی لغت المنجد اور اُردو لغات آصفیہ و نور میں "مَشْعَل" ہے، اسی نسبت سے اسے بہ فتحِ اوّل و سوم لکھا گیا ہے۔ [یہ صراحت یوں ضروری سمجھی گئی کہ کچھ لوگوں کی زبان سے "مِشْعَل" بھی سننے میں آتا ہے]۔

مُشْتَقا سیا (ص ۷۷): ک اور متن میں میم پر پیش موجود ہے۔ فے کی فرہنگ میں بھی اسے بہ ضمِ اوّل لکھا گیا ہے۔ آصفیہ میں بھی میم پر پیش لگا ہوا ہے۔ اس صراحت کی ضرورت یوں پیش آئی کہ فرہنگِ اصطلاحاتِ پیشہ وراں (جلدِ سوم، ص ۱۲۸) میں "مِشتقایہ" (بہ کسرِ اوّل) لکھا گیا ہے۔

مُصاحَبَت (ص ۴۸): یہ لفظ اس داستان میں تین جگہ آیا ہے: ص ۴۸ پر دو جگہ اور ص ... پر ایک جگہ۔ ک میں پہلے دونوں مقامات پر میم پر پیش لگا ہوا ہے اور ح پر زیر [کے

[ص ۴۴] اور تیسرے مقام پر ک میں "مُصاحِب" ہے۔ یہاں فت میں بھی "مُصاحِب" ہے، مگر واضح طور پر یہ طباعت کی غلطی ہے جو ک سے فت میں نقل ہو گئی ہے۔ م، ن (اور ع) میں اِس مقام پر "مصاحبت" ہی ہے۔ م میں اِن تینوں مقامات پر میم پر پیش تو لگا ہوا ہے، مگر باقی کسی حرف پر کوئی حرکت موجود نہیں۔ فت میں بھی پہلے دونوں مقامات پر صرف میم پر پیش ہے؛ ح خالی ہے، مگر اُس کی فرہنگ میں اِسے "مُصاحِبت" (ح کے زیر کے ساتھ) لکھا گیا ہے۔ یہ لفظ آگے چل کر (ص ۱۷۵) پر بھی ہے اور وہاں ک میں صرف میم پر پیش ہے، ح خالی ہے۔ فت میں اُس مقام پر "مُصاحِبت" ہے، یعنی میم پر پیش ہے اور ح کے نیچے زیر لگا ہوا ہے۔ اصل کے لحاظ سے "مصاحَبت" ہے۔ عربی میں اِس کا وزن "مُفاعَلَۃ" ہے۔ اِس باب کے بہت سے مصدر اُردو میں مستعمل ہیں اور اصل کے لحاظ سے اُن سب میں چوتھا حرف مفتوح ہے۔ اِن سب لفظوں (یعنی مصدروں) کے تلفظ کا احوال یہ ہے کہ اِن میں بعض تو اُردو والوں کی زبان پر اِس طرح آتے ہیں کہ چوتھے حرف کا زبر، اِس قدر ترچھا ہو کر نکلتا ہے کہ زیر کی آواز سے قریب تر ہو جاتا ہے، جیسے: مشاعرہ۔ بعض میں جزم کی سی کیفیت نمایاں ہو جاتی ہے، جیسے: مقابلہ۔ اور بعض میں زبر کی آواز بہت ہلکی ہو کر نکلتی ہے۔ "مصاحبت" کا بھی شمار ایسے ہی لفظوں میں کیا جا سکتا ہے۔ ک سے کے مطابق ح پر زیر لگا دیا گیا ہے، مگر طلبہ کے ذہن میں یہ بات ضرور رہنا چاہیے کہ تلفظ میں زبر پوری طرح یا یوں کہیے کہ اچھی طرح نمایاں نہیں ہوگا اور اُردو میں تلفظ کی نصاحت کا تقاضا یہی ہے۔

مَصالِح (ص ۲۲۷): سب نسخوں میں یہی املا ہے (یعنی آخر میں حائے حُطّی ہے)۔ مخطوطۂ گنج خوبی میں بھی اِس لفظ کا یہی املا ملتا ہے: "پلاو بہت اچھا پکا ہوا و میوہ اور مصالح بہت سا پیجو" (ص ۱۸)۔ اِس لفظ کا پُرانا املا یہی ہے اور دلّی والے اِسی طرح لکھتے رہے ہیں، لکھنؤ میں "مسالا" لکھا جانے لگا۔ اِس لفظ سے متعلق مفصّل بحث امیر مینائیؔ نے اپنے ایک خط میں کی ہے، جو مکاتیبِ امیر مینائی، مرتبہ احسن اللہ خاں ثاقب میں موجود ہے اور مؤلّفِ نوراللغات نے اِس خط کی مکمّل عبارت لفظِ "مسالا" کے ذیل میں (حوالے کے بغیر) نقل کر دی ہے؛ اُسے دیکھا جا سکتا ہے۔ محمد حسین آزاد نے آبِ حیات کے دیباچے میں بھی اِس لفظ پر گفتگو کی ہے: "بہت سے الفاظ ہیں کہ عربی فارسی نے اُردو کو دیے؛

اُردو نے کہیں تو لفظوں میں کچھ تصرّف کیا، معنی وہی رکھّے۔ کہیں لفظوں کو سلامت رکھا، معنی کچھ سے کچھ کر دیے"۔ اِس بیان کے تحت لفظِ "مصالح" کا بھی ذکر کیا ہے: "مصالح، جمعِ مصلحت، یا "مَسالِح" کا مخفّف ہے۔ اُردو میں "گرم مصالح" وغیرہ، اور سامانِ عمارت کو بھی "مصالح" کہتے ہیں"۔ آصفیہ میں "میم مع صاد" کی فصل میں "مصالح" موجود ہے۔ اِس میں "میم مع سین" کی فصل میں "مسالا" بھی ہے، مگر مولّف نے قوسین میں یہ بھی لکھ دیا ہے کہ "صحیح مصالح"۔ اِس سے اہلِ دہلی کے استعمال کا بہ خوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔

مُصَلّا (ص ۱۱): کے، فے، م، ن؛ یعنی جملہ قدیم نسخوں میں "مُصلّا" ہے، البتہ ع میں "مصلّی" ہے۔ قدیم نسخوں کے مطابق اِس لفظ کا املا اختیار کیا گیا ہے، جیسا کہ لفظ "معلّا" کے ذیل میں لکھا گیا ہے، میر امّن نے مخطوطۂ گنجِ خوبی میں اپنے قلم سے ایسے متعدد لفظوں کے آخر میں الف ہی لکھا ہے، جن کے آخر میں بعض لوگ "ی" لکھتے ہیں اور بعض لوگ الف۔ مثلاً اِس مخطوطے میں ہر جگہ "عقبا" ملتا ہے، دیکھیے ص ۹، ۱۴، ۳۷ (دو جگہ)، ۱۵۵۔ اِسی طرح ہر جگہ "ادنا" اور "اعلا" (مع الف) ملتے ہیں۔ "مصلّا" کو بھی اِنھی پر قیاس کیا جا سکتا ہے۔

مُضائِقَہ (ص ۳۵): کے، فے: مُضایِقہ۔ ع: مضائقہ۔ عربی کے لحاظ سے یہ لفظ بہ فتحِ حرفِ چہارم ہے اور چوتھا حرف ی ہے (مُضایَقہ)۔ صاحبِ غیاث اللّغات نے اِس کی وضاحت بھی کر دی ہے: "بہ ضمِ میم، و فتحِ تحتانی، نہ بکسرِ آں۔ ہم چنیں ہر لفظیکہ بروزنِ مفاعلہ باشد، حرفِ چہارمِ آں مفتوح باشد۔ بعض مردم از بے اتفاقی مکسور خوانند"۔ لیکن اُردو میں یہ لفظ بہ کسرِ حرفِ چہارم زبانوں پر ہے اور چوتھا حرف ہمزہ ہے۔ صاحبِ نور اللّغات نے اِس کی وضاحت کر دی ہے: "ع: صحیح مضایقہ بہ فتحِ حرفِ چہارم ہے، جو یائے تحتانی ہے۔ زبانوں پر بہ کسرِ حرفِ چہارم ہے، جو ہمزہ کی طرح بولا جاتا ہے"۔

کے اور فے میں "مُضایِقہ" ہے، یعنی چوتھے حرف کے نیچے زیر لگا ہوا ہے۔ یہ اُردو میں مستعمل تلفّظ کے عین مطابق ہے، مگر اُردو کے لحاظ سے زیر کی صورت میں یہاں ہمزہ آئے گا (جیسے: گھایَل۔ اور گھائل۔ پایَل۔ اور پائل، کویَل۔ اور کوئل)۔ اِسی کے مطابق اِس لفظ کو مع ہمزۂ مکسور لکھا گیا ہے (جس طرح ع میں ہے)۔ نیز اِس سلسلے میں دیکھیے اِسی ضمیمے میں "فائدہ"۔ یہ وضاحت بھی بے جا نہ ہوگی کہ "مُضائِقہ" کو "مُلاحَظہ" اور "مُصاحَبت" پر قیاس نہیں کرنا چاہیے

(جو اسی ضمیمے میں مندرج ہیں) الف اور ہمزہ کا اجتماع (جو "مضائقہ" میں ہے) الف اور ع کے اجتماع سے (جو اُن دونوں لفظوں میں ہے) لسانی اعتبار سے مختلف حیثیت رکھتا ہے]

مُطالعہ (ص ۱۷) : اصل کے لحاظ سے اس لفظ کا تلفظ "مُطالَعَہ" ہے، لیکن زبانوں پر یہ لفظ فعولن کے وزن پر ہے [یعنی عین اور ہائے مختفی یک جان ہو کر ساکن مفرد حرف کی شکل میں بدل جاتے ہیں، اُسی طرح جس طرح "قلعہ" کے لام کو (جو اصلاً ساکن ہے) مفتوح کر کے، عین کو ساکن کر دیتے ہیں، اور "قلعہ" بروزنِ "ضلَع" بولتے ہیں] - آتش اور ولی کے مندرجۂ ذیل اشعار میں یہ لفظ اسی طرح نظم ہوا ہے : دیکھنا ہر صبح تجھ رخسار کا ؛ ہے مطالعہ مطلعِ انوار کا (کلیاتِ ولی، مرتبہ نورالحسن ہاشمی، ص ۲۷) - لکھے ہیں سرگذشتِ دل کے مضمون یک قلم اس میں ؛ تماشا قابل کہ کا ہے مطالعہ میرے دیوان کا (کلیاتِ آتش، نول کشور پریس، ص ۶۷) - بعض لوگوں نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ اِن دونوں اشعار میں دونوں شاعروں نے غلطی سے "مطالَعہ" کو "مطالِع" نظم کر دیا ہے ؛ مگر یہ غلطی نہیں، رواجِ عام کی پیروی ہے - اِن شعروں میں اس لفظ کو لکھا تو جائے گا اصل کے مطابق، یعنی مطالعہ، لیکن پڑھتے ہیں "مطالِع" بروزنِ فعولن آئے گا - یعنی اس لفظ کے اس طرح نظم ہونے سے اس کا املا نہیں بدلے گا - اسی کے مطابق یہاں بھی اصل کے مطابق "مطالعہ" لکھا گیا ہے، بس اس طرف متوجہ کرنا مقصود ہے کہ تلفظ میں یہ لفظ فعولن کے وزن پر آئے گا -

مَعِ (ص ۲۴) : م "، ک"، "ف" نسخے میں ع کے نیچے اضافت کا زیر موجود ہے - ک" میں جہاں بھی یہ لفظ اس طرح آیا ہے، اضافت کا زیر ملتا ہے - اسی کی مطابقت اختیار کی گئی ہے - [یہ وضاحت یوں کی گئی کہ بول چال میں ایسے مرکبات میں اضافت کا زیر پوری طرح ادا نہیں ہوتا اور کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے اضافت موجود نہ ہو، مگر دراصل وہ موجود اور کارفرما ہوتی ہے، زبان سے ادا کسی طرح ہو] ہاں یہ صراحت بھی ضروری ہے کہ ک" اور "ف" میں بعض مقامات پر اس لفظ کا املا "معۂ" بھی ملتا ہے، مگر خاص بات یہ ہے کہ ایسے سب مقامات پر اضافت کا ہمزہ ضرور موجود ملتا ہے - اسی بنا پر ہر جگہ اس لفظ میں ع کے نیچے اضافت کا زیر لگایا گیا ہے اور ہر جگہ اس لفظ کو اسی طرح (معِ) لکھا گیا ہے -

مَعْذِرَتْ (ص ۲۴۶) : ک" اور "ف" میں اس لفظ پر اعراب موجود نہیں - یہ لفظ ص ۲۴۶ پر بھی آیا ہے اور وہاں بھی ک" اور "ف" میں اعراب موجود نہیں - "ف" کی فرہنگ میں یہ لفظ موجود نہیں -

المنجد میں اسے مَعْذَرَة ، مَعْذُرَة ، مَعْذِرَة ، تینوں طرح درج کیا گیا ہے۔ صاحبِ غیاث اللغات نے اسے صرف بکسرِ سوم (معذِرت) لکھا ہے۔ نور میں اسے بہ کسرِ سوم اور بہ فتحِ سوم (معذِرت، معذَرت) دونوں طرح درجِ لغت کیا ہے اور یہ صراحت نہیں کی ہے کہ اُردو میں مرجّح صورت کیا ہے۔ آصفیہ میں اسے صرف بہ کسرِ سوم (مَعْذِرَت) درج کیا گیا ہے اور اس سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ اُردو میں مؤلف نے اسے بہ کسرِ سوم مرجّح قرار دیا ہے۔ اسی کی مطابقت اختیار کی گئی ہے۔

مُعلّا (ص ۸۰) : م، ن، کے اور ف میں اسی طرح (مُعلّا) ہے۔ ع میں "معلّی" ہے۔ یہ مرکب "اُردوے مُعلّا" اس کتاب میں دو جگہ آیا ہے، ایک تو اسی مقام پر اور ایک جگہ میر امّن کی عرضی میں: "چار درویش کے قصّے کو ..... اُردوے مُعلّا کی زبان میں باغ و بہار بنایا" کے اور ف میں یہاں بھی "مُعلّا" ہے اور ع میں بھی یہاں "معلّا" ہے۔ اِنھی وجوہ سے ان دونوں مقامات پر "معلّا" کو برقرار رکھا گیا ہے۔ یہ وضاحت کر دی جائے کہ "معلّا" کی طرح "اعلا" کا املا بھی میر امّن نے اپنے قلم سے ہر جگہ اسی طرح لکھا ہے۔ گنجِ خوبی کے مخطوطے میں یہ لفظ جہاں بھی آیا ہے، وہاں اسی طرح ملتا ہے (اور کسی ایک جگہ بھی "اعلیٰ" نہیں ملتا) مثلاً حضورِ اعلا: ۱۱۵، ۱۰۳، ۱۷، ۱۰۹؛ ادنا اعلا: ۳۳۸، ۳۴۴، ۳۳۱، ۱۳۱؛ دیوانِ اعلا: ۲۸۰، ۷۱، ۱۲۰، ۱۲۹، ۱۳۰، ۱۴۷، ۱۴۸، ۱۸۳، ۲۵۰، ۲۶۴ – "ادنا آدمی کو اعلا کرے" ۳۰۲۔ ["ادنا" کو بھی میر امّن نے اپنے قلم سے ہر جگہ "ادنا" لکھا ہے، اور اسی طرح "مصلّا" لکھا ہے]۔

ہاں یہ وضاحت بھی کر دی جائے کہ م، ن، کے، ف، ع: سبھی نسخوں میں "اُردوے" میں "ے" پر ہمزہ موجود نہیں۔ (صحیح املا بھی یہی ہے) یہ وضاحت یوں ضروری سمجھی گئی کہ کچھ لوگ غلطی سے ایسے مواقع پر اضافت کے لیے "ے" پر ایک ہمزہ بھی لگا دیا کرتے ہیں [یعنی "اُردوئے مُعلّا" لکھتے ہیں]۔

معنے (ص ۳۹) : ع میں "معنی" ہے، لیکن م اور کے میں اس لفظ کو مع یاے مجہول (معنے) ہی لکھا گیا ہے۔ کے میں ص ۶۹ پر بھی یہ لفظ آیا ہے، اور وہاں بھی (م اور کے دونوں میں) یہی املا ملتا ہے: "اس کے معنے مجھے سمجھاؤ"۔ مخطوطۂ گنجِ خوبی میں میر امّن نے اس لفظ کو ہر جگہ اسی طرح (معنے) لکھا ہے، مثلاً ص ۵، ص ۴۰، ص ۱۵، ص ۲۶۷۔ مخطوطۂ گنجِ خوبی میں

"معنے" اور "یعنے" ان دونوں لفظوں کو ہر جگہ مع یاے مجہول لکھا گیا ہے، لیکن ص ۹ پر "ملکِ معنی" ملتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ترکیب کی صورت میں اسے "معنی" لکھا گیا ہے، اور ترکیب کے بغیر جب یہ آیا ہے تو اسے "معنے" لکھا گیا ہے۔ کے میں بھی ص ۳۸ پر "ملکِ معنی" ملتا ہے اور اس کا مطلب یہی ہے کہ ترکیبی صورت میں "معنی" لکھا گیا ہے۔ گفتگو میں بہت سے لوگوں کی زبان سے اب بھی "معنے" سننے میں آتا ہے۔ یہ دراصل امالے کا اثر ہے۔ عربی میں "معنیٰ" ہے، جو املائی نسبت سے "معنی" (مع یاے معروف) بن گیا اور امالے کے عام قاعدے سے وہی "معنی" "معنے" بن گیا اور اردو میں زبانوں پر چڑھ گیا (اسی طرح "یعنے" بھی اردو والوں کی زبان سے سننے میں آتا ہے) یہ لفظ جب ترکیبی صورت میں آتا ہے، تو مع یاے معروف ہی استعمال میں آتا ہے، جیسے: معنیِ نازک، معنیِ بیگانہ، بے معنی، ملکِ معنی وغیرہ۔ مفرد صورت میں دونوں طرح استعمال میں آتا ہے (معنی۔ معنے)۔ اس کتاب میں جہاں بھی یہ لفظ ترکیب کے بغیر آیا ہے، اسے نسخۂ م اور کے (اور مخطوطۂ گنجِ خوبی) کے مطابق "معنے" لکھا گیا ہے، اور ترکیبی صورت میں "معنی" (جیسے: ملکِ معنی، معنیِ نازک)۔ اردو میں "معنے" (اور "یعنے") کے استعمال کی بہت سی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں، ازاں جملہ:

کہاں تک وہ سہے یاں ہر کس و ناکس کے اب طعنے کمک کو اس غلام اپنے کی اتنی دیر کیا معنے
تماشا تک یداللّٰہی کا دکھلا دیجیے یعنے سلیماں کی مدد کو ذوالفقار اپنی علم کیجے
امیر المومنین اب اے مرے مولا کرم کیجے انشا (کلامِ انشا ص ۲۰۸)

مَقبَرہ (ص ۱۸): المنجد میں اسے بہ فتحِ سوم، بہ کسرِ سوم، بہ ضمِ سوم (مقبَرہ، مقبِرہ، مقبُرہ) لکھا گیا ہے۔ آصفیہ اور نور میں اسے صرف بہ فتحِ سوم لکھا گیا ہے۔ کے اور ف میں "ب" کے نیچے زیر لگا ہوا ہے؛ اسی کی پابندی کی گئی ہے۔

مَقصِد (ص ۱۵): کے میں "مقصِد" ہے، یعنی صاد کے نیچے زیر لگا ہوا ہے۔ کے میں ص ۹۱ پر بھی "مقصِد" ملتا ہے۔ ف میں دونوں جگہ صاد پر حرکت موجود نہیں؛ مگر اس کتاب کے آخر میں جو فرہنگ شامل ہے، اس میں اسے بہ فتحِ صاد (Maksad) لکھا گیا ہے۔ عربی میں صاد کے نیچے زیر ہے (المنجد)۔ فارسی میں اس میں تصرف ہوا کہ اسے بہ فتحِ صاد بھی استعمال کیا گیا، مثلاً: صفا از عقدۂ دلہاست آں زلفِ معقّد را بحمد اللہ کہ ربطے ہست با مطلق

مقیّد را ٭ ہمسکن بستر از پہلوے گرمش سرد ناگشتہ ٭ کنید طے بر براقِ معرفت اقصاے مقصد را (نظیری)۔ آصفیہ میں اِس کو بہ کسرِ صاد لکھا گیا ہے، لیکن مؤلّفِ نور نے صحیح طریقہ اختیار کیا ہے، لکھا ہے: "یہ لفظ عربی میں بہ کسرِ صاد ہے...... اُردو میں بالفتح و فتحِ سوم زبانوں پر ہے" اور سند میں اسیر لکھنوی اور محسن کاکوروی کا ایک ایک شعر درج کیا ہے۔ اُردو میں بہ فتحِ سوم کی مثالیں بہ کثرت ملتی ہیں [تفصیل کے لیے راقم الحروف کی کتاب زبان اور قواعد کو دیکھا جا سکتا ہے، ص ۳۹۔ ۴۰] اُردو میں یہ لفظ بالعموم بہ فتحِ سوم مستعمل رہا ہے، بہ کسرِ سوم کو عربی سے مخصوص سمجھنا چاہیے؛ اِسی بنا پر فسانے کی فرہنگ میں اندراج کے مطابق صاد کے اوپر زبر لگایا گیا۔ میر امّن کا جو عام انداز تھا ایسے لفظوں کے تلفّظ کے سلسلے میں، کہ چلن کو ترجیح دی ہے اُنھوں نے، یہ تلفّظ اُس سے بھی مطابقت رکھتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اِس مقام پر بھی کسی مصحّح کی کارگزاری ہے کہ لُغت کی مطابقت میں صاد کے نیچے زیر لگا دیا۔

مَکَر چَکَر (ص ۱۹۰): آصفیہ اور نور میں یہ مرکّب موجود ہے مگر اعراب کے بغیر؛ ہاں فیلن کے لُغت میں "مَکَر چَکَر" ہے۔ کے میں دونوں لفظوں کے کاف پر زبر لگا ہوا ہے۔ فسانے کے متن میں اِس لفظ پر اعراب موجود نہیں، مگر اُس کی فرہنگ میں اِسے "مَکَر چَکَر" لکھا گیا ہے۔ مستعمل صورت وہی ہے جو فیلن کے لغت میں ہے۔ کے کی مطابقت اختیار کی گئی ہے اور دونوں جگہ کاف پر زبر لگایا گیا ہے۔

مُلاحَظہ (ص ۱۷۶): کے میں "مُلاحَظہ" ہے، یعنی میم پر پیش ہے اور ح پر زبر۔ اصل کے لحاظ سے بھی یہ لفظ اِسی طرح ہے۔ کے کی مطابقت اختیار کی گئی ہے۔ طلبہ کی توجّہ اِس طرف منعطف کرانا چاہتا ہوں کہ عربی میں "مُفَاعَلَۃ" کے وزن پر ایسے متعدد لفظ ہیں جن میں چوتھا حرف مفتوح ہے؛ مگر اُردو میں جب وہ تلفّظ میں آتے ہیں، تو چوتھے حرف کا زبر زبان سے ادا اِس طرح ہوتا ہے کہ آواز مُحرّف ہو کر زیر سے قریب ہو جاتی ہے۔ (لفظ "مصاحبت" کے ذیل میں بھی اِس کی وضاحت کی جا چکی ہے) تلفّظ میں یہ لفظ اِسی طرح آئیں گے، کیوں کہ اُردو میں فصیح تلفّظ اِسی کو سمجھا جاتا ہے۔ اِس لفظ میں آواز کا ترچھا پن کچھ زیادہ نمایاں ہو جاتا ہے، مگر ح کے نیچے زیر یوں نہیں لگایا گیا کہ کے میں اُس پر زبر موجود ہے اور کسی نسخے کی بنا پر اِس سے انحراف مناسب نہیں تھا۔ "مصاحبت" میں کے میں ح پر حرکت موجود نہیں، مگر "ملاحظہ"

میں ح پر زبر موجود ہے"، اور اِس سے "مصاحبت" کے متعلق قیاس کیا جا سکتا ہے اور اِسی بنا پر اِن دونوں لفظوں میں ح پر زبر لگایا گیا ہے۔

مُلازمت : ص ۳۸۶، ح ⑨ ۔

مُلایمت : ص ۳۸۹، ح ⑦ ۔

مَلغُوبہ (ص ۷۷) : کے، فے، ع ؛ سب میں یہی املا ہے (یعنی آخر میں ہاے مختفی ہے)۔ آصفیہ اور نور میں "ملغوبا" ہے (آخر میں الف) اور اِسے ترکی بتایا گیا ہے۔ پلیٹس کے لغت میں بھی "ملغوبا" ہے، مگر اُس نے اِسے ہندی بتایا ہے اور یہی مرجح ہے۔ اگر یہ لفظ ترکی ہوتا، تب بھی اِس کا املا "ملغوبا" مرجح قرار پاتا اور ہندی ہونے کی صورت میں تو آخر میں الف آنا ہی چاہیے، مگر یہاں کے اور فے کی مطابقت اختیار کی گئی ہے، اِس بنا پر کہ ایسے متعدد لفظ ہیں جو شکل صورت کے لحاظ سے عربی یا فارسی معلوم ہوتے ہیں اور یوں اُن کے آخر میں ہاے مختفی لکھی جانے لگی تھی؛ اِس اعتبار سے "ملغوبہ" قدیم املائی صورت ہے اور اِسی وجہ سے اِسی کو برقرار رکھا گیا ہے۔

مَلِکہ (ص ۴۶) : م اور کے میں لام کے نیچے زیر لگا ہوا ہے۔ فے میں بھی "مَلِکہ" ہے۔ م اور کے میں جہاں بھی یہ لفظ آیا ہے، لام کے نیچے زیر لگا ہوا ہے، مثلاً ص۸۲، ص۸۶، ص۸۸ (وغیرہ)۔ اصل لفظ بھی اِسی طرح ہے۔ صراحت کی ضرورت یوں محسوس ہوئی کہ بول چال میں زبانوں پر یہ لفظ بہ سکونِ لام بھی آتا ہے (لیکن خواص کی زبان سے بہ کسرِ لام ہی سنا گیا ہے) م اور کے کے مطابق لام کے نیچے زیر لگایا گیا ہے۔

مُنافَع (ص ۲۴) : "مَنافِع" جمع ہے "مَنفَعَت" کی۔ اُردو میں یہ لفظ بہ طورِ واحد بھی استعمال میں آتا ہے (نفع کے معنی میں) یہ تصرف ہے اُردو کا۔ دوسرا تصرف یہ ہوا کہ اِس صورت میں میم پر پیش آجاتا ہے اور فے پر زبر (مُنافَع)۔ میرا خیال تھا کہ یہ صورت محض بول چال تک محدود ہے، مگر میر امن کی اِس عبارت میں یہ لفظ بہ طورِ واحد ہی استعمال میں آیا ہے (نفع کے معنی میں)۔ کے میں میم پر پیش لگا ہوا ہے، مگر فے پر کوئی حرکت موجود نہیں۔ فے میں "مُنافِع" ہے (میم پر پیش، فے کے نیچے زیر) اور م میں "مُنافَع" ہے (میم پر پیش، فے پر زبر) اور یہ صورت استعمالِ عام کے عین مطابق ہے۔ اِسی کی پابندی اختیار کی گئی ہے۔

مُنڈا (ص ۵۲) : کے اور فنے، دونوں میں "مُنڈا" ہے، مم میں اِس لفظ پر حرکات موجود نہیں اور فنے کی فرہنگ میں یہ لفظ شامل نہیں؛ لیکن فاربس نے اپنے لغت میں MANDA درج کیا ہے۔ "مُنڈا" مجھے اُردو، ہندی کے کسی لُغت میں نہیں ملا۔ آصفیہ میں اِس لفظ پر اعراب تو موجود نہیں؛ لیکن مؤلف نے یہ صراحت کی ہے کہ یہ لفظ یا تو سنسکرت کے मंद سے یا فارسی کے لفظ "مَندہ" سے بنا ہے" اور اِس سے یہی مترشح ہوتا ہے کہ مؤلف نے "مندا" کو بھی بہ فتحِ اول مانا ہے۔ فارسی میں "مَندہ" اور "مَندک" دونوں کے معنی ہیں: "کسادی و نارواییِ بازار و اسباب و متاع" (برہانِ قاطع) سنسکرت لفظ मण्ड یا मंड کے بھی قریب قریب یہی معنی ہیں (پلیٹس)۔ بہر صورت یہ "مَندا" بہ فتحِ اوّل ہی بنے گا اور اسی طرح لُغات میں اِسے لکھا گیا ہے اور استعمالِ عام میں بھی اِسی طرح ہے۔ فیلن کے لُغت میں بھی اِسے بہ فتحِ اوّل درج کیا گیا ہے۔ بہ ظاہر یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ کے میں طباعت کی غلطی کی بنا پر میم پر پیش لگ گیا اور فاربس نے اپنے نسخے میں اُسی کی نقل کی۔

منڈھپیا (ص ۱۰۶) : سب نسخوں میں اِس مقام پر یہ لفظ اِسی طرح، یعنی بہ "ہائے مخلوط" ہے۔ یہ لفظ بعض اور مقامات پر بھی آیا ہے، (مثلاً ص ۱۴، ۱۸۴) اور اُن سب مقامات پر کے، فنے، ع میں "منڈپیا" ہے۔ آصفیہ میں صرف "منڈپ" ہے۔ نیز فیلن اور پلیٹس کے لُغات میں بھی صرف "منڈپ" ہے، البتہ فنے کی فرہنگ میں "منڈھپیا" موجود ہے، مگر اُس میں "منڈپ" نہیں۔ کے کی مطابقت اختیار کی گئی ہے اور اپنے اپنے مقام پر اِن دونوں صورتوں کو برقرار رکھا گیا ہے۔

مَنشا (ص ۴) : مم، کے، فنے، ع سب میں یہ لفظ اِسی طرح لکھا ہوا ہے (عام طور پر بھی اِسی طرح لکھا جاتا ہے)۔ یہاں وضاحت کی ضرورت یوں پیش آئی کہ عربی طریقِ کتابت کے لحاظ سے اِس لفظ میں الف کے اوپر ہمزہ بھی لکھنا چاہیے (منشأ)۔ فارسی والوں نے اِس طرح استعمال بھی کیا ہے: مثلاً: منشأِ ایجادِ ہر عالم یکیست ؛ گر دو صد عالم بود، خاتم یکیست (غالب۔ مثنویِ ششم) قدیم اُردو میں بھی اِس کی مثالیں مل سکتی ہیں۔ اُردو (اور فارسی) میں ایسے الفاظ کے آخر سے ہمزہ عموماً ساقط ہو گیا ہے اور اسی بنا پر اِسے "منشا" لکھا گیا ہے اور لکھا جاتا ہے۔

مُنع (ص ۱۴) : مم، کے، فنے میں اِس لفظ پر اعراب موجود نہیں، البتہ فنے کی فرہنگ میں

اِسے "مَنَع" (بہ فتحِ اوّل و دوم) لکھا گیا ہے۔ گنجِ خوبی میں یہ لفظ کئی جگہ آیا ہے اور مخطوطۂ گنجِ خوبی میں کسی ایک جگہ بھی اِس لفظ پر اعراب نہیں ملتے، البتہ میر امّن نے اِسے "مَنْع" (بہ سکونِ نون) نظم کیا ہے: منہ سے پھر منع کر جو یہ بھی نہ ہو۔ دل سے اپنے تو اُس سے ہو بیزار (اکتیسواں باب) ایک نے اپنے پیر سے یہ کہا۔ بدی سے منع سب کو ہوں کرتا (اکتیسواں باب)۔ اصل لفظ "مَنْع" ہے (جس طرح میر امّن نے نظم کیا ہے) مگر یہ بھی واقعہ ہے کہ عام طور پر لوگ "مَنَع" کہتے ہیں (جس طرح فے کی فرہنگ میں ہے)۔ میں نے کے کی مطابقت اختیار کی ہے اور اِس لفظ پر (لفظِ "جمع" کی طرح) اعراب نہیں لگائے ہیں۔ اِسے اگر "مَنْع" کہا جائے گا، تب بھی صحیح ہوگا (کہ اصلاً اِسی طرح ہے) اور اگر "مَنَع" کہا جائے گا تب بھی درست ہوگا (کہ استعمالِ عام میں اِسی طرح آتا ہے۔ فے کا اندراج اِس پر گواہ ہے۔ لفظِ "جمع" کا بھی احوال یہی ہے)۔

موچھوں (ص ۱۱): یہ وضاحت کرنا ہے کہ اِس لفظ کا ایک املا "مونچھوں" (مع نونِ غنّہ) بھی ہے (نور اللغات میں بھی اِسے دونوں طرح لکھا گیا ہے)۔ کے، فے، م، ن، ع: سب نسخوں میں یہ لفظ اِسی طرح لکھا ہوا ہے (یعنی پہلے نونِ غنّہ کے بغیر) اِس لیے اِسی املا کو اختیار کیا گیا ہے۔

مُوسِقی (ص ۵۴): م، ن، کے، فے میں اِسی طرح ہے۔ ع میں "موسیقی" ہے۔ اصل لفظ "موسیقی" ہے اور "موسقی" اُس کا مخفف ہے (بہارِ عجم)۔ اُردو میں بھی یہ مخفف صورت ملتی ہے، نور میں ذوق کا یہ شعر سنداً لکھا گیا ہے: ماہرِ موسقی ایسا کہ ادا کرتا تھا: کبھی میں بارہ مقام اور کبھی چار دِن گت۔ کے میں "موسِقی" (بہ حذفِ یا اور مع واوِ معروف ہے)۔ اُسی کی مطابقت اختیار کی گئی ہے۔

مَوسِم (ص ۵۵): م میں "مَوسِم" ہے، یعنی میم مفتوح ہے اور سین کے نیچے زیر ہے۔ کے میں یہاں تو "مَوسَم" ہے، یعنی میم مفتوح ہے اور سین خالی ہے، مگر ص ۵۶ پر بھی یہ لفظ آیا ہے اور وہاں "مَوسِم" ہے، یعنی میم مفتوح اور سین مکسور۔ فے میں دونوں مقامات پر "مَوسِم" ہے۔ اِسی کی مطابقت اختیار کی گئی ہے۔ وضاحت کی ضرورت یہاں یوں محسوس کی گئی کہ یہ لفظ اصلاً تو "مَوسِم" ہی ہے، لیکن فارسی اور اُردو میں شعرا نے اِسے بہ فتحِ دوم "نَم" اور "جَم" کے قوافی کے ساتھ بھی نظم کیا ہے۔ اِس تصرّف کا ذکر لغات میں موجود ہے۔ آج کل

سُننے میں یہ لفظ دونوں طرح آتا ہے، لیکن اِس فرق کے ساتھ کہ "مَوسَم" بیش تر اور "مَوسِم" کم تر؛ مگر یہ آج کل کے استعمالِ عام کی بات ہے۔ م، کے اور فے میں "مَوسِم" ہے اور اِس سے یہ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اُس زمانے میں بیش تر اسی طرح مستعمل ہوگا۔ ہاں آصفیہ میں بھی سین کے نیچے زیر لگا ہوا ہے اور اِس سے اُس زمانے کے اِس استعمال کی مزید تائید کا پہلو نکلتا ہے۔

مَولا (ص ۱۱۴): کے، فے، ع: تینوں نسخوں میں اِسی طرح ہے، اِسی کی مطابقت اختیار کی گئی ہے۔ وضاحت یوں کی جارہی ہے کہ عربی کے لحاظ سے اِس کا املا "مولیٰ" ہونا چاہیے۔ اعلا، ادنا اور مُعلّا کے ذیل میں (اِسی ضمیمے میں) یہ لکھا جاچکا ہے کہ عربی کے ایسے بیش تر الفاظ کو میر امّن نے مخطوطۂ گنجِ خوبی میں اپنے قلم سے الف کے ساتھ (اعلا، ادنا، مُعلّا) لکھا ہے اور کے میں بھی عموماً اِن لفظوں کا یہی املا ملتا ہے۔ کے اور فے کے مطابق "مولا" کو برقرار رکھا گیا ہے۔

مُونڈ مُنڈا (ص ۱۹۲): محض احتیاطاً یہ صراحت کی جاتی ہے کہ کے میں پہلا جز (مونڈ) مع واوِ معروف ہے، اِسی کی مطابقت اختیار کی گئی ہے۔

مُونہا مُنہ ۔ مُونہا مُونہ: ص ۳۶۳، ح (۷)۔

مُوئی (ص ۲۴): م اور کے میں یہ لفظ مع واوِ معروف ہے۔ تلفّظ میں آج کل یہ جس طرح بھی آتا ہو، مگر یہ واقعہ ہے کہ بہ لحاظِ اصل اِس میں واوِ معروف ہے اور یہ تلفّظ "چھوئی موئی" میں بڑی حد تک نمایاں ہوجاتا ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ واوِ معروف کی آواز اِس لفظ میں پوری طرح شاملِ تلفّظ نہیں ہوپاتی، کچھ دبی سی رہتی ہے۔ م اور کے کے مطابق اِسے مع واوِ معروف لکھا گیا ہے۔ "مُوا" ص ۴۴ اور ص ۱۱۱ پر آیا ہے، ظاہر ہے کہ اِس کا تلفّظ "ہُوا" کے وزن پر ہوگا۔

مُہیب (ص ۹۹): کے اور فے میں میم پر پیش لگا ہوا ہے۔ کے میں ص ۲۳۱ پر بھی یہ لفظ آیا ہے، اور وہاں بھی (دونوں نسخوں میں) میم پر پیش ہے۔ عربی میں "مَہیب" بہ فتحِ اوّل ہے (المنجد)۔ غیاث اللّغات میں بھی اِسے اِسی طرح لکھا گیا ہے۔ نور میں ہے: "مہیب... بہ فتحِ اوّل صحیح، بہ ضمِّ اوّل غلط"۔ لیکن حقیقی صورتِ حال یہ ہے کہ اُردو میں

زبانوں پر بہ ضمِ اوّل ہے۔ آصفیہ میں میم کے اوپر پیش لگا ہوا ہے اور فیلن نے بھی اپنے لغت میں اِسے بہ ضمِ اوّل ہی لکھا ہے اور یہ اندراجات استعمالِ عام کے عین مطابق ہیں۔ اِنھی وجوہ سے میم پر پیش لگایا گیا ہے۔

مہینا (ص ۹۸) : کے، ف، ع : سب میں اِس لفظ کا یہی املا ہے۔ کے میں ایسے اکثر ہندی الفاظ کے آخر میں الف ملتا ہے، جیسے : تارا (ص۱) پتا (ص۱۱) کلیجا (ص۱۱) بھروسا (ص۵۵) سندیسا (ص۴۹) پیسا (ص۴۵)۔ کے کے مطابق اِسے مع الف لکھا گیا ہے۔

میان (نیامِ تلوار کے معنی میں، ص ۱۴۹) : کے میں "میان" ہے، یعنی اِس میں یائے مخلوط نہیں، یائے مظہرہ ہے؛ اِسی کی مطابقت اختیار کی گئی ہے۔ صراحت کی ضرورت یوں محسوس کی گئی کہ اردو میں یہ لفظ مع یائے مظہرہ اور مع یائے مخلوط، دونوں طرح مستعمل رہا ہے۔ آصفیہ میں اِس اختلاف کی نشان دہی تو نہیں کی گئی ہے، مگر دو مثالیہ شعر جو لکھے ہوئے ہیں، اُن میں سے ایک شعر میں یہ لفظ مع یائے مخلوط نظم ہوا ہے [یہ شعر ناسخ کا ہے] اور دوسرے میں مع یائے مظہرہ [یہ شعر ظفر کا ہے] اور اِس طرح اختلافِ تلفّظ کی نشان دہی ہو جاتی ہے۔ نور میں البتّہ صراحت موجود ہے : "میان : اردو میں بروزنِ مکان اور بروزنِ دھیان، دونوں طرح مستعمل ہے۔ ناسخ : ہے تصوّر مجھ کو ہر دم ابروئے خم دار کا ؛ دل نہیں، گویا بغل میں میان ہے تلوار کا۔ پھر کوئی کارزارِ سخن میں نہ منہ چڑھے ؛ تیغِ زباں رہے جو دہن کے میان میں (بحر)"

میانا : ص ۲۹۴، حاشیہ (۸) -

میں نے (ص ۳) : کے، ف، م : مینے۔ ن، ع : میں نے۔

اِس مرکّب لفظ کے املا کے سلسلے میں یہ دل چسپ صورتِ حال پائی جاتی ہے کہ لفظ "میں" جب تنہا آیا ہے تو اُسے "میں" ہی لکھا گیا ہے اور لفظ "نے" جب کہیں علاحدہ آیا ہے تو اُسے بھی "نے" لکھا گیا ہے۔ جب یہ دونوں کلمے ایک ساتھ آئے ہیں اور اِن کو الگ الگ لکھا گیا ہے، تب بھی اِن کی یہی حقیقی صورت (میں نے) برقرار رہی ہے۔ لیکن جب اِن دونوں کو ملا کر لکھا گیا ہے (پرانے زمانے کی عام روش کے مطابق) تو اُس صورت میں بہت سی پرانی کتابوں میں (خطّی بھی اور مطبوعہ بھی) "مینے" لکھا ملتا ہے، یعنی ایک نون غائب ہو گیا ہے ——— باغ و بہار کے نسخۂ کے میں صرف ایسی ایک جگہ "مینے" چھپا ہوا ملتا ہے، ورنہ ہر جگہ "میں نے" لکھا ہوا ہے۔ اور

مخطوطۂ گنجِ خوبی کا احوال یہ ہے کہ میر امّن نے اپنے قلم سے صرف دو جگہ "میں نے" لکھا ہے، باقی ہر جگہ "مینے" لکھا ہے ـــــ چوں کہ اصل الفاظ "میں" اور "نے" ہیں، اور میر امّن نے بھی اِن لفظوں کو اِسی طرح لکھا ہے، نیز مرکّب صورت میں اِس لفظ کا صحیح املا "میں نے" بھی اُن کے قلم سے نکلا ہے، مطبوعہ نسخے میں بہ طورِ عموم "میں نے" ہی ملتا ہے (اور صحیح املا بھی یہی ہے) اِن وجوہ سے اِس کتاب میں ہر جگہ "میں نے" لکھا گیا ہے۔

یہ بات ہمارے ذہن میں رہنا چاہیے کہ لفظوں کو ملاکر لکھنے کی پُرانی روش سے جو خرابیاں پیدا ہوا کرتی تھیں، اُنھی میں سے ایک شکل یہ بھی ہے کہ اچھا خاصا "میں نے" جب ملاکر لکھا جاتا ہے، تو "مینے" بن جاتا ہے۔ یہ صورت حقیقی اختلافِ املا کے ذیل میں نہیں آتی۔ یہ محض لفظوں کو غیر ضروری طور پر ملاکر لکھنے کی وجہ سے ظہور میں آئی ہے کہ دو لفظوں کی جگہ صرف ایک نقطہ رکھا گیا، جس کے نتیجے میں ایک حرف (نون) غائب ہوگیا۔ یہ واقعہ ہے کہ "مینے" اگر لکھا جائے تو یہ بہ ظاہر اجنبی صورت آنکھوں کے لیے بہ مشکل قابلِ قبول ہو سکتی ہے، اور غالباً اِسی تغیر میں ایک نقطہ غائب ہوگیا، جس نے لفظ کی شکل ہی بدل دی۔

رِمیوڑے (ص ۵۱): م اور کے میں ہی پر علامتِ مجہول موجود ہے، یعنی ہی ساکن ہے (مخلوط نہیں) یوں، اِس کا تلفّظ بروزنِ فاعلن ہوگا۔ تلفّظ کے لحاظ سے اِس لفظ کا بھی وہی احوال ہے جو "تیوری" ، "ڈیوڑھی" اور "رِیوڑی" کا ہے (اِن لفظوں سے متعلق نوٹ اِسی ضمیمے میں دیکھے جاسکتے ہیں)۔

ناتوانی (ص ۱۴۶): کے اور فے دونوں میں تے کے اوپر زبر لگا ہوا ہے۔ فارسی لغات میں "توان" کو بہ ضمِ اوّل لکھا گیا ہے، مگر برہانِ قاطع کے ایرانی مرتب ڈاکٹر معین نے اُس کے حاشیے میں "توانا" اور "توانستن" کے ذیل میں یہ وضاحت کردی ہے کہ "در تداولِ امروز بفتحِ اوّل"۔ اِس کا مطلب یہ ہوا کہ جس طرح اُردو میں توانائی، ناتوانی، ناتواں کو اکثر لوگ بہ فتحِ اوّل بولتے ہیں، جدید فارسی میں بھی یہ بہ فتحِ اوّل استعمال میں ہیں اور کے اور فے میں "ناتوانی" جو لکھا ہوا ہے، وہ اُردو میں استعمالِ عام کی نمایندگی کرتا ہے۔ کے کی مطابقت اختیار کی گئی۔

ناخون (ص ۱۷۸): فے، ع: ناخن۔ ت اور کے میں "ناخون" ہے۔ کے

کی مطابقت اختیار کی گئی ہے۔ طلبہ کے استفادے کے لیے اس لفظ کے سلسلے میں یہ وضاحت کی جاتی ہے کہ "ناخون" اور "ناخن" دونوں لفظ بجائے خود صحیح ہیں [ڈاکٹر معین نے حاشیہ برہانِ قاطع (جلد چہارم، ص ۲۰۸۹) میں دونوں لفظ لکھے ہیں] اس میں شک نہیں کہ شعرا نے اکثر "ناخن" لکھا ہے، مگر "ناخون" کی مثالیں بھی ملتی ہیں۔ آصفیہ و نور سے "ناخون" کے مثالیہ اشعار نقل کیے جاتے ہیں: آصفیہ: آج زہر غمِ ہجراں سے بچے یا نہ بچے، تھی نِلاہٹ ترے بیمار کے ناخونوں میں (معروف)۔ چٹکی لیتے ہی، مرے آگ سی لگ اٹھی، اُف! کیا بلا زہر ہے سرکار کے ناخونوں میں [آصفیہ میں "ناخون، ناخون پر لکھنا، ناخون سے لکھنا، ناخون کاٹنا، ناخون گڑانا، ناخون نیلے ہونا، ناخون لینا، ناخونوں، ناخونوں سے گوشت جدا نہیں ہوتا، ناخونوں میں پڑے ہیں، ناخونوں میں کھو رکھنا" بھی مندرج ہیں]

نور: ساری دیکھی ہوئی یہ گھاتیں ہیں — میرے ناخونوں میں یہ باتیں ہیں (شوق)

کی جو کچھ عرضِ تمنا اُن سے میں، تو یہ کہا — بیہدہ، چل جا یہاں سے عقل کے ناخون لے (ظفر)

ناشتا (ص ۲۰۷): ن، ک، ف، ع: سب میں اس لفظ کا یہی املا ہے (یعنی آخر میں الف ہے۔ صحیح املا بھی یہی ہے) اسی کی مطابقت اختیار کی گئی ہے۔ وضاحت کی ضرورت یوں معلوم ہوئی کہ کچھ لوگ اُن جانے میں اسے "ناشتہ" بھی لکھتے ہیں اور اسی کو صحیح املا سمجھتے ہیں۔ اس کا اندازہ یوں کیا جا سکتا ہے کہ (۱) ف کے متن میں "ناشتا" ہے، مگر اس کی فرہنگ میں اسے "ناشتہ" لکھا گیا ہے۔ آصفیہ و نور میں "ناشتا" ہے، مگر فیلن کے لغت میں "ناشتہ" ہے اور پلیٹس کے لغت میں "ناشتا" کو فارسی اور "ناشتہ" کو ہندی لکھا گیا ہے۔ ایک بات اور: ک اور ف میں شین پر حرکت موجود نہیں۔ فارسی لغات میں اسے "ناشِتا" (بہ کسرِ سوم) لکھا گیا ہے۔ نور میں "ناشتا" ہے، مگر اعراب موجود نہیں۔ آصفیہ میں "ناشِتا" ہے یعنی شین کے نیچے زیر لگا ہوا ہے۔ اُردو میں یہ لفظ بہ سکونِ شین زبانوں پر ہے اور اسی نسبت سے شین پر جزم لگایا گیا ہے۔ طلبہ کے ذہن میں یہ بات بھی رہے کہ فارسی "ناشتا" کے معنی ہیں نہار منہ، جس نے صبح سے کچھ نہ کھایا ہو۔ اُردو میں معنی بدل گئے ہیں اور صبح کی خوراک کو کہتے ہیں۔ اس لحاظ سے بھی "ناشتا" کا "ناشتا" بن جانا کچھ غیر مناسب نہیں۔ برہانِ قاطع کے ایرانی مرتب ڈاکٹر معین نے اس لفظ کو مرکب اور ہندی الاصل بتایا ہے۔ تفصیل

کے لیے اُسے دیکھا جا سکتا ہے (بہ ذیلِ "ناشتا")۔
ناشُدَنی (ص ۶۱) : م، کے اور فے میں یہاں دال پر نہ تو حرکت ہے نہ جزم۔ یہ لفظ اِس کتاب میں ص ۲۳۲ پر بھی آیا ہے اور وہاں کے میں "ناشُدَنی" ہے، یعنی شین پر پیش ہے اور دال پر زبر۔ فے میں وہاں بھی دال خالی ہے، مگر اُس کی فرہنگ میں اِسے بہ فتحِ دال ہی لکھا گیا ہے۔ اصل کے لحاظ سے بھی "ناشُدَنی" (بہ فتحِ دال) ہونا چاہیے۔ آصفیہ میں اِسی طرح (ناشُدَنی) ہے؛ لیکن مولّفِ نور نے یہ بھی لکھا ہے کہ عورتیں اِسے "بدنصیب، کم بخت" کے معنوں میں استعمال کرتی ہیں، اور اِن معنوں میں "بہ سکونِ دال بول چال میں ہے"۔ سند میں نواب مرزا شوق کا یہ شعر بھی لکھا ہے : دل پہ گزرا ہے کیا ملال تو کہہ منہ سے ناشُدْنی اپنا حال تو کہہ۔ بول چال کی حد تک مولّفِ نور کا قول بالکل درست ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ عورتوں کی زبان سے "ناشُدْنی" شاید ہی ادا ہوتا ہو (ہاں پڑھے لکھے مردوں کی بات دوسری ہے)۔ فیلن نے اپنے لغت میں "ناشُدَنی" لکھا ہے، مگر جو دو مثالیہ فقرے اِس کے ذیل میں درج کیے ہیں، اُن میں "ناشُدْنی" (بہ سکونِ دال) ہی لکھا ہے : (۱) "ایسا ناشُدْنی ہے، کہنا نہیں مانتا"۔ (۲) "کم بخت، ناشُدْنی وہاں کیوں گیا تھا؟"۔ اِن مثالوں سے استعمالِ عام کا بہ خوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے، اور یوں بہ ظاہر "ناشُدْنی" کی ترجیح ظاہر ہوتی ہے؛ مگر میں نے کے کی مطابقت کو ترجیح دی ہے اور دونوں مقامات پر اِسے "ناشُدَنی" لکھا ہے۔
نخرے تِلّے (ص ۵۸) : کے، م، فے میں تے کے نیچے زیر موجود ہے۔ (مستعمل بھی اِسی طرح ہے۔ آصفیہ میں بھی "نخرا تِلّا" ہے۔ "نخرا" کے ساتھ "تِلّا" بہ طورِ تابع آیا ہے۔ "توبہ تِلّا" میں بھی یہی "تِلّا" بہ طورِ تابع ہے)۔
نِشَست (ص ۶۸) : کے میں نون کے نیچے زیر اور شین کے اوپر زبر لگا ہوا ہے۔ فے میں بھی نون کے نیچے زیر موجود ہے۔ مخطوطۂ گنجِ خوبی میں ایک جگہ "نشست برخاست" ملتا ہے اور میر امّن نے بھی وہاں نون کے نیچے زیر لگایا ہے (ص ۲۸۵)۔ فیلن اور پلیٹس کے لغات میں بھی اِس مرکب کو بہ کسرِ اوّل لکھا گیا ہے؛ اِنھی وجوہ سے نون کے نیچے زیر لگایا گیا ہے۔ فارسی کا مصدر "نشستن" بہ کسرِ اوّل ہی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُس زمانے تک اِس خاص مرکب "نشست و برخاست" یا "نشست برخاست" میں پہلے حرف کی اصلی حرکت برقرار تھی۔

(آج کل بہت سے لوگ "نشست و برخاست" بھی کہتے ہیں)۔

اِسی مصدر کا امر "نشیں" ہے، جس سے گوشہ نشیں، مسند نشیں، مسند نشینی، ذہن نشیں، حاشیہ نشیں، تنہا نشیں، صحرا نشیں جیسے بہت سے مرکبات بنے ہیں اور اُردو میں بہ کثرت مستعمل رہے ہیں اور مستعمل ہیں؛ یہ حقیقت ہے کہ اِن مرکبات میں لفظِ "نشیں" کو اُردو والے بالعموم بہ فتحِ اوّل بولتے ہیں۔ اِس کا مطلب یہی ہے کہ اِس خاص لفظ میں پہلے حرف کی حرکت بدل گئی۔ اِس کی وجہ بہ ظاہر یہ سمجھ میں آتی ہے کہ "نشست" میں پہلے حرف کے نیچے زیر ہے تو دوسرے حرف کے اوپر زبر ہے۔ اور "نشیں" میں شروع کے دونوں حرفوں کے نیچے زیر ہے۔ فارسی کے ایسے متعدّد لفظ جن میں شروع کے دونوں حرفوں کے نیچے زیر ہے؛ اُردو میں اُن کے پہلے حرف کا زیر، زبر سے بدل گیا ہے۔ مطلب یہ نکلا کہ جب شروعِ لفظ میں دو زیر ایک ساتھ آتے ہیں تو اکثر صورتوں میں اُردو والوں کے لہجے کی تسہیل پسندی پہلے زیر کو زبر سے بدل دیتی ہے۔ اور "نشست" میں چوں کہ ایسا نہیں، اِس لیے ن کے نیچے زیر برقرار رہا تھا۔ میرامّن نے جو نون کے نیچے زیر لگایا ہے، اُس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے؛ اِسی بنا پر "نشست" میں نون کے نیچے زیر لگایا گیا ہے (جس طرح ک میں ہے اور جس طرح مخطوطۂ گنجِ خوبی میں ہے)۔ یہ دل چسپ بات ہے کہ میرامّن نے فارسی کے ایک اور مصدر "شناختن" کے مشتقات میں بھی ہر جگہ شین کے نیچے زیر لگایا ہے، جیسے: حق شناسی، رو شناسی۔

نشیں (ص ۱۵): فارسی میں مصدر "نشستن" بہ کسرِ اوّل ہے (حاشیۂ برہانِ قاطع، طبع تہران) اور اِس لحاظ سے اِس مصدر کے جملہ مشتقات کو بھی بہ کسرِ اوّل ہونا چاہیے؛ لیکن اُردو میں یہ بالعموم بہ فتحِ اوّل زبانوں پر ہیں، مثلاً "مسند نشینی" اور "گوشہ نشیں" سننے میں آتا ہے، آج تک کسی کی زبان سے "گوشہ نشیں" اور "مسند نشینی" نہیں سُنا گیا۔ اِس سلسلے میں یہ بات دل چسپی سے خالی نہ ہوگی کہ برہانِ قاطع میں "نشیں" کو بروزنِ "نگیں" لکھا گیا ہے اور "نگیں" بالاتفاق بہ فتحِ اوّل ہے؛ اِس لحاظ سے "نشیں" بھی بہ فتحِ اوّل (نَشیں) قرار پاتا ہے۔ اِسی طرح فیلن نے اپنے لغت میں "نشیں" کو صرف بہ فتحِ نون لکھا ہے۔

اُردو لغات کا احوال یہ ہے کہ نور میں لفظ تو موجود ہے، مگر اعراب کی صراحت کے بغیر؛ البتہ آصفیہ میں ن کے نیچے زیر لگا ہوا ہے (یہ فارسی کی تقلید ہے)۔ اُردو میں ایسے متعدّد

لفظ شروع ہی سے بہ فتحِ اوّل مستعمل رہے ہیں، جو اصلاً بہ کسرِ اوّل ہیں، مثلاً "نَشیمن" کے متعلق صاحبِ نور اللّغات نے یہ صراحت کر دی ہے کہ اُردو میں زبانوں پر بہ فتحِ اوّل ہے۔

ک میں اِس لفظ پر اعراب موجود نہیں، البتّہ ف میں (غالباً لُغت کی رعایت سے) "نِشیمن" لکھا ہوا ہے۔ میر امّن کا عام انداز یہ ہے کہ وہ لُغت کے مقابلے میں رواجِ عام کو ترجیح دیتے ہیں اور اسی بنیاد پر یہاں (اُردو والوں کے تلفّظ کے مطابق) نون پر زبر لگایا گیا ہے۔ نیز اِس سلسلے میں دیکھیے "نشست و برخاست" کی بحث۔

نَفع (ص ۲۰۱): ک اور ف میں اِس لفظ پر اعراب موجود نہیں، البتّہ ف کی فرہنگ میں "نَفع" ہے۔ اِس کے برخلاف مخطوطۂ گنجِ خوبی میں دو جگہ (نثر میں) فے پر زبر لگا ہوا ملتا ہے: "اِس تقیید میں یہ نفَع ہے" (ص ۴۴)۔ "اور وہ کرتا ہے جس سے نفَع یا فائدہ منظور ہوتا ہے" (ص ۲۸۸)۔ دونوں مقامات پر فے پر زبر اِس قدر واضح ہے کہ ذرا سا اشتباہ پیدا نہیں ہوتا کہ یہ نون پر ہوگا۔ میر امّن نے اِس طرح نظم بھی کیا ہے:

پھر اس سے بہت سا نفع لوگ پائیں ۔۔۔ کریں لین دین اور سب آئیں جائیں

(گنجِ خوبی، ۳۹ واں باب)

کام کا جب تک نہ پہنچے وقت، کام آتا نہیں ۔۔۔ یاروں کی یاری سے کوئی کچھ نفع پاتا نہیں

(ایضاً، ۳۹ واں باب)

کام جو کچھ کرے، صلاح سے کر ۔۔۔ تو نفع اُس میں تو بڑا پاوے

(۴۸ واں باب)

اصلاً "نَفع" ہے، مگر اِس میں ذرا سا بھی شک نہیں کہ عام طور پر استعمال میں "نَفَع" آتا ہے۔ ک کی مطابقت کے طور پر میں نے اِس لفظ پر اعراب نہیں لگائے ہیں، مگر مناسب تر یہی ہوگا کہ اِس کو "نَفَع" پڑھا جائے، میر امّن کی سند موجود ہے (میر امّن نے "نَفَع" تو لکھا ہے، مگر "نَفع" کسی ایک مقام پر نہیں لکھا ہے)۔

اِس سلسلے میں یہ بات بھی پیشِ نظر رہے کہ ص ۲۹ پر ایک جملہ ہے: "اِس فقیر پاس جو کچھ جنس اور نقد اصل و نفعے کا تھا"۔ ک میں اِسی طرح (یعنی "اصل و نفعے") ہے۔ اگر "اصل و نفع" لکھا ہوتا تو یہ خیال کیا جا سکتا تھا کہ فارسی ترکیب کی رعایت سے "اَصل و نَفع" پڑھنا انسب

ہوگا"، مگر "اصل و نَفع" کو "اصل و نَفَعے" پڑھنا بہت عجیب معلوم ہوگا۔ ظاہر ہے کہ یہاں "اصل و نَفعے" (ف کے زبر کے ساتھ) پڑھنا ہر لحاظ سے بہتر ہوگا۔

نِقاب (ص ۶۶): ک اور ف میں ن کے نیچے زیر لگا ہوا ہے۔ بہ لحاظِ اصل یہ لفظ بہ کسرِ اوّل (نِقاب) ہی ہے، مگر اب زبانوں پر بہ طورِ عموم بہ فتحِ اوّل (نَقاب) آتا ہے۔ مؤلّفِ نور نے اِس کی نشان دہی کی ہے: "صحیح بہ کسرِ اوّل ہے، ہندستان میں زبانوں پر بہ فتحِ اوّل ہے۔" البتّہ آصفیہ میں "نَقاب" ہے، یعنی ن مفتوح بھی ہے اور مکسور بھی؛ اور اِس سے بہ ظاہر مفہوم مؤلّف کا یہ معلوم ہوتا ہے کہ خواہ "نِقاب" کہو اور خواہ "نَقاب" دونوں طرح ٹھیک ہے۔ چوں کہ ک اور ف میں ن کے نیچے زیر لگا ہوا ہے اور اصلاً بھی یوں ہی ہے، اِن وجوہ سے ک کی مطابقت اختیار کی گئی ہے۔

نَقَب (ص ۵۲): ک میں قاف پر زبر لگا ہوا ہے۔ اصل کے لحاظ سے یہ لفظ بہ سکونِ دوم (نَقْب) ہے، لغات میں بھی اِسی طرح مندرج ہے اور شعرا نے بھی اِسی طرح نظم کیا ہے؛ مگر یہ واقعہ ہے کہ زبانوں پر جب یہ لفظ آتا ہے تو بہ فتحِ دوم ہی آتا ہے۔ یہ کوئی نہیں کہتا کہ "اُس نے نَقْب لگائی تھی"، سب یہی کہتے ہیں کہ "اُس نے نَقَب لگائی تھی"۔ ک میں قاف پر جو زبر ہے، وہ اِسی صورتِ حال کی آئینہ داری کر رہا ہے۔ مولانا محمد حسین آزاد دہلوی کی نظم "شام کی آمد اور رات کی کیفیت" میں یہ لفظ بہ فتحِ دوم موجود ہے:

اے رات! تیرے پردۂ دامن کی اوٹ میں ۔۔۔ دزدِ سیاہ کار بھی ہے اپنی جوٹ میں
بیٹھا نَقَب لگا کے کسی کے مکان میں ہے ۔۔۔ اور ہاتھ ڈالا اُس کے ہر اک امن و آن میں ہے

(نظمِ آزاد، مطبعِ مفیدِ عام پریس لاہور، سالِ طبع ۱۸۹۹ء، ص ۱۳)

اِس سے مزید معلوم ہوتا ہے کہ دہلی کے پڑھے لکھے لوگ "نَقَب" بولتے تھے اور لکھتے بھی تھے۔

نکھر سکھر (ص ۱۸۵): سب نسخوں میں اِسی طرح (یعنی دونوں لفظ مع ہاے مخلوط)۔ ک اور ف میں نون پر حرکت موجود نہیں، البتّہ س کے نیچے زیر لگا ہوا ہے۔ ف کی فرہنگ میں اِسے "نکھر سِکھر" لکھا گیا ہے۔ نوراللغات میں "نِک سِک" ہے اور اِس کے ذیل میں یہ لکھا گیا ہے:

"نِک سِک: (ہندی میں "نکھ" بالفتح: ناخن۔ "سِکھ" بالفتح: سر)۔ دہلی میں بالکسر و ضمِ سوم، لکھنؤ میں بالکسر و کسرِ سوم بہتر ہے۔"

اِس پر اثرؔ مرحوم نے تبصرہ کرتے ہوئے لکھا:

"لاحول ولا قوۃ! باوصفِ ناواقفیت لکھنؤ کی زبان کے ماہر بننے کی حد ہوگئی۔ لکھنؤ میں بھی بہ کسرِ اوّل و ضمِّ سوم بولتے ہیں" (فرہنگِ اثرؔ، ص ۵۵)۔

یعنی اِس پر اتفاق ہوا کہ لکھنؤ میں "نِک سُک" ہے۔

آصفیہ میں "نَکھ سِکھ سے" ہے (نون کے اوپر زبر اور سین کے نیچے زیر لگا ہوا ہے) اور تشریح یوں کی گئی ہے: "لفظِ دوم "سکھ" شاید "سیس" کا بگڑا ہوا لفظ ہے۔ سر سے پیر تک، پاؤں کے ناخن سے سر کی چوٹی تک، ایڑی سے چوٹی تک، اوّل سے آخر تک۔"

اِس کے بعد قوسین میں یہ لکھا گیا ہے:

"مسلمان عورتیں "نِک سُک سے" بولتی ہیں، جیسے: نِک سُک سے درست۔)"

مگر اس کے بعد "نکھ سِکھ سے درست" اور "نکھ سے سِکھ تک" لکھا گیا ہے۔ اوّل الذّکر کے ذیل میں جرأت کا یہ شعر لکھا گیا ہے:

"نکھ سکھ سے درستی ہو تو زیبندہ ہو گرمی کیا لطف ہے اے چرخ، جو خورشید ہوا گرم"

اِن اندراجات سے ایک بات تو یہ واضح ہوئی کہ لکھنؤ اور دہلی دونوں جگہ خواتین کی زبان پر "نِک سُک" ہے۔ یعنی نون کے نیچے زیر، سین کے اوپر پیش اور دونوں لفظوں کے آخر میں کاف (ھ کے بغیر)۔ دوسری بات یہ کہ اصلاً "نَکھ سِکھ" تھا (اِن دونوں اجزا کی تشریح کے لیے دیکھیے پلیٹس کا لغت)۔ چوں کہ باغ و بہار میں (اصل کے مطابق) "نکھ سکھ" ہے، اِس بنا پر نون مفتوح رہے گا اور سین مکسور (جیسا کہ آصفیہ میں ہے)؛ اِسی لیے اِس کتاب میں "نَکھ سِکھ" لکھا گیا ہے۔ (ضمنی طور پر یہ عرض کردوں کہ نور میں جو یہ لکھا گیا ہے کہ "ہندی میں ... سِکھ بالفتح، سر" یہ درست نہیں۔ تفصیل کے لیے دیکھیے پلیٹس کا لغت بہ ذیلِ "نکھ سِکھ")۔

نَمَش، (ص ۷۸): فارسی میں "نمشک" ہے۔ برہانِ قاطع کے مرتب ڈاکٹر معین نے (حاشیۂ لغت میں) اِسے "بہ فتحتین" لکھ کر، مزید لکھا ہے کہ "و بعضے بہ کسرتین گفتہ اند"۔ یعنی فارسی میں "نَمَشک" ہے اور بعض لوگوں نے اِسے "نِمِشک" بھی لکھا ہے۔ اُردو میں مستعمل لفظ "نمش" اِسی "نمشک" کی بدلی ہوئی صورت ہے۔ آصفیہ میں "نَمَش" ہے یعنی نون اور میم دونوں کے اوپر زبر لگا ہوا ہے۔ فیلن نے بھی اپنے لغت میں اِسی طرح لکھا ہے۔

اِس کے برخلاف نوراللغات میں اِسے "بہ فتحِ اوّل و کسرِ دوم" لکھا گیا ہے، مگر اثر لکھنوی مرحوم نے اِس سے اختلاف کیا ہے اور فرہنگِ اثر میں لکھا ہے کہ: "لکھنؤ میں بہ فتحِ اوّل و دوم بولتے ہیں"۔ لکھنؤ میں جن قابلِ ذکر اصحاب سے میں نے دریافت کیا، اُن سب نے بہ فتحِ اوّل و دوم ہی کی تائید کی۔ میری درخواست پر جناب صباح الدین عمر نے نوّاب صاحب شیش محل کے یہاں دریافت کیا، وہاں بیگمات نے بتایا کہ یہ لفظ بہ فتحِ اوّل و دوم (نَمَش) ہے۔ دہلی میں جن بعض پرانے باخبر افراد سے میں نے دریافت کیا، اُنھوں نے بھی اِسی تلفظ کی تائید کی، اِن میں ایک قابلِ ذکر نام محترمہ حمیدہ سلطان صاحبہ کا بھی ہے۔ اِس سے اِس بات کی مکمل طور پر تائید ہوئی کہ لکھنؤ اور دہلی دونوں مقامات پر فصحا کے استعمال میں یہ لفظ بہ فتحِ اوّل و دوم (نَمَش) رہا ہے۔

ک، اور ف، دونوں نسخوں میں "نِمش" ہے، یعنی ایک زیر لگا ہوا ہے، جس کے متعلق یہ طے کرنا بہ ظاہر مشکل معلوم ہوتا ہے کہ یہ نون سے متعلق ہے یا میم سے؛ مگر ف کے آخر میں جو فرہنگ ہے، اُس میں اِسے NAMASH OR NIMASH لکھا گیا ہے؛ اِس سے یہ بات تو قطعی طور پر معلوم ہو جاتی ہے کہ ف میں جو زیر لگا ہوا ہے، اُس کا تعلق میم سے نہیں، نون سے ہے، یعنی مرتّب کتاب نے اِس لفظ کو بہ کسرِ اوّل لکھا ہے۔ اِس کے بعد قطعیت کے ساتھ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ک میں جو زیر ہے، وہ لازماً میم سے متعلق ہے۔ وہ بھی نون سے متعلق ہو سکتا ہے اور بہ کسرِ اوّل ایسا تلفظ ہے جس کی تائید کسی اور ذریعے سے نہیں ہوتی۔ لکھنؤ اور دہلی دونوں مقامات پر دو چار حضرات نے اِسے "نَمِش" (بہ فتحِ اوّل و کسرِ دوم) تو کہا، مگر "نِمَش" (بہ کسرِ اوّل و فتحِ دوم) کسی نے نہیں کہا۔ اِس صورت میں یہ تلفظ قابلِ قبول نہیں معلوم ہوتا۔ چوں کہ ک اور ف میں تلفظ کی صورتِ حال قطعی اور واضح نہیں، اور اُس کی بنا پر کوئی فیصلہ کرنا مشکل معلوم ہوتا ہے؛ اِس وجہ سے مناسب یہی معلوم ہوا کہ آصفیہ کے اندراج کے مطابق اِس لفظ کو بہ فتحِ اوّل و دوم لکھا جائے۔

اِس لفظ کے سلسلے میں ایک اور اندراج کا ذکر ضروری ہے۔ پلیٹس نے اپنے لغت میں "نَمِش" (بہ فتحِ اوّل و سکونِ دوم) لکھا ہے اور "نَمَش" (بہ فتحتین) کو عامیانہ

تلفّظ بتایا ہے۔ پلیٹس کو غلط فہمی ہوئی۔ "نَمْش" (بہ فتحِ اوّل و سکونِ دوم) ایک دوسرا لفظ ہے، جس کا اِس (ہندی) لفظ "نِمِش" سے معناً کچھ تعلق نہیں۔ اِس سلسلے میں برہانِ قاطع کا یہ اندراج وضاحت کے لیے کافی ہوگا: "نمش، بفتحِ اوّل و سکونِ ثانی و شینِ قرشت، مکر و حیلہ و دغا بازی را گویند۔ و بفتحِ اوّل و میم در عربی خطہا و شکلہا و نقطہ ہای سیاہ و سفید باشد، بہ بفتحِ اوّل و کسرِ میم ہم در عربی گاو و کوہی را گویند کہ برو نقطہ ہای سیاہ و سفید باشد۔"

دہلی میں اب "نِمِش" کا رواج نہیں رہا، لکھنؤ میں البتہ اب بھی یہ چیز بکتی ہے۔ لکھنؤ میں بعض حضرات نے یہ بھی بتایا کہ اب کچھ بیچنے والے اِسے "مکھن ملائی" کہہ کر بھی بیچتے ہیں۔ دہلی میں جب یہ چیز بنتی اور بکتی تھی، تب بیچنے والے اِسے "دولت کی چاٹ" کہہ کر بیچا کرتے تھے۔ مجھے دہلی میں ایسے افراد بھی ملے جو "نمش" سے تو واقف نہیں تھے، مگر "دولت کی چاٹ" کو اچھی طرح جانتے تھے، کیوں کہ اُنھوں نے ابتدائے عمر میں اِسی نام سے یہ چیز خریدی اور کھائی تھی۔

اگر یہ قول صحیح ہے کہ لکھنؤ میں اب بعض بیچنے والے اِسے "مکھن ملائی" کہہ کر بھی بیچتے ہیں، تو یہ اِس بحث کا ایک اور دل چسپ ضمنی پہلو ہوگا کہ پُرانے اور اصل لفظ "ملائی" نے، جسے لکھنؤ سے گویا دیس نکالا مل چکا تھا، اپنے فروغ کا نیا سامان پیدا کر لیا ہے۔

نَمْکِین (ص ۸۲): کے اور ف میں اِس لفظ پر حرکات موجود نہیں اور ف کی فرہنگ میں یہ لفظ شامل نہیں۔ بہ لحاظِ اصل اور بہ لحاظِ قاعدہ یہ لفظ بہ فتحِ اوّل و دوم ہے۔ شاعروں نے اِس طرح نظم بھی کیا ہے۔ یہی احوال "نمکینی" کا ہے۔ نور میں دونوں کی اِسناد مندرج ہیں، مگر واقعہ یہ ہے کہ یہ صورتِ حال شاعری سے مخصوص ہے، استعمالِ عام میں "نمکین" ہے۔ اثر لکھنوی مرحوم نے نور اللغات کے اندراج پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے: "بول چال میں "نمکین" بہ سکونِ دوم و اعلانِ نون ہے" اور یہ بالکل درست ہے۔ آصفیہ میں "نمکین" (بہ فتحِ اوّل و دوم) ہے، مگر "نمکینی" میں میم پر جزم لگا ہوا ہے۔ اگر "نمکینی" درست ہے، تو "نمکین" بھی صحیح ہے۔ فیلن نے "نمکین" (بہ سکونِ دوم) لکھا ہے۔ اِنھی وجوہ سے میم پر جزم لگایا گیا ہے۔

نَمُود (ص ۳۶): کے میں اِس لفظ پر اعراب موجود نہیں۔ فارسی کے بیش تر لغات میں

"نمودن" اور اس کے مشتقات کو بہ ضمِ اوّل لکھا گیا ہے، لیکن برہانِ قاطع میں "نمودار" کو بہ فتحِ اوّل لکھا ہے۔ "نمودار" اگر بہ فتحِ اوّل ہے، تو "نمود" کو بھی بہ فتحِ اوّل مان لینے میں کچھ قباحت نہیں ہو سکتی۔ نور اللغات میں "نمود" کو بہ ضمِ اوّل و دوم "نُمُود" لکھا گیا ہے؛ لیکن "نمودار" کے ذیل میں صراحت کی گئی ہے کہ "فارسی میں بہ ضمِ اوّل و دوم، اردو میں بہ فتحِ اوّل وضمِ دوم زبانوں پر ہے"۔ حقیقت یہ ہے کہ اردو میں "نمودن" کے جملہ مشتقات زبانوں پر بہ فتحِ اوّل ہیں۔ فرہنگِ آصفیہ میں "نمود" اور "نمودار" دونوں لفظوں کے نون پر زبر لگا ہوا ہے؛ اسی بنا پر نون پر زبر لگایا گیا ہے۔

نِنگیانا (مع نونِ ساکن، بروزنِ فاعلاتن): ص ۳۵۴، ح (۴)۔

نوّاب (ص ۷): ع میں "نواب" (تشدید کے بغیر) ہے، لیکن ک، م اور ف میں "نوّاب" (مع تشدید) ہے (اور یہی اس لفظ کی اصل صورت ہے) اسی کی مطابقت اختیار کی گئی ہے۔ اس لفظ کے سلسلے میں ضمنی طور پر ایک دل چسپ مثال کا اندراج فائدے سے خالی نہ ہوگا: مولوی نجم الغنی خاں نے اپنی کتاب بحر الفصاحت میں عیوبِ قافیہ کی بحث میں نوّاب یوسف علی خاں ناظم (والیِ رام پور) کا مندرجۂ ذیل شعر نقل کیا ہے:

غلطیِ غیر کی گفتار کی دیکھی ناظم! میں جو آتا ہوں، تو کہتا ہے: نواب آتے ہیں

چوں کہ اصل لفظ "نوّاب" شعر میں بہ طورِ قافیہ نہیں آ سکتا تھا، اس لیے "نواب" نظم کرنا پڑا؛ مگر شاعرانہ انداز سے اسے مقولۂ غیر بنا کر اور غلطیِ گفتار کہہ کر پیش کیا ہے۔

یہ صحیح ہے کہ اب بہت سے لوگ "نواب" کہتے ہیں اور قدما کے یہاں بھی "نواب" مل جاتا ہے، مثلاً: یوں چلا آتا ہے خوباں بیچ \ فوج کے بیچ جوں نواب آتا (آبرو، دیوان ص ۱۳) نیز نواب مرزا شوق کے اس شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ خواتین کی زبان پر بھی یہ لفظ اسی طرح تھا:

اے لو میں بھلی کہوں سبب کیا ہے ارے تو یہی نواب مرزا ہے!

لیکن اساتذۂ متاخرین کے یہاں یہ لفظ مع واوِ مشدد ملتا ہے، اسی طرح "نوّابی"، مثلاً:

محفلِ غسلِ صحتِ نوّاب رونق افزائے مسندِ تمکیں (دیوانِ غالب نسخۂ عرشی طبع اوّل ص ۲۸۰)

حق گوی و حق پرست و حق اندیش و حق شناس نوّاب مستطاب، امیرِ شہ احتشام (" " ص ۲۸۲)

بادشاہی کا جہاں یہ حال ہو غالب! تو پھر کیوں نہ دلّی میں ہر اک ناچیز نوّابی کرے (" " ص ۱۰۱)

نہیں۔ قدیم طرزِ کتابت کے مطابق پہلے اِس کو مع واو "نہوڑانا" لکھا جاتا تھا۔ یہ واو اعراب بالحروف کے طور پر شامل ہو گیا تھا (ایسے اور بہت سے الفاظ کی طرح) جس طرح "اب" اور "اِس" کو "اُس" اور "پہونچنا" کو "پہنچنا" لکھتے ہیں، اُسی طرح "نہوڑانا" کو "نہڑانا" لکھتے ہیں (اور لکھنا چاہیے) ن میں جو "نہڑایا" ہے، وہ اِسی تبدیلی کی نشان دہی کر رہا ہے۔

نور میں "نہڑانا" ہے اور وضاحت بھی ہے کہ "بہ کسرِ اوّل و ضمِّ دوم"۔ سند میں آتش کا ایک شعر اور میر انیس کا ایک مصرع لکھا گیا ہے:

تواضع دشمنِ جاں کی زیادہ قتل کرتی ہے ٭ خمِ شمشیرِ معشوقوں کا نہڑانا ہے گردن کا (آتش)

ع: نہڑالیا سر بانوئے اور اشک بھر آئے (انیس)

دونوں مثالوں میں واو شاملِ تلفظ نہیں۔ آصفیہ میں "نہوڑانا" ہے، مگر مثال میں آتش کا وہی شعر لکھا گیا ہے جو نور میں بھی مندرج ہے، متن کی ذرا سی تبدیلی کے ساتھ۔ بہ ہر حال یہ بات مسلّم ہے کہ اصل لفظ "نہڑانا" ہے، واو شاملِ تلفظ نہیں، اسی لیے اُسے شاملِ کتابت نہیں ہونا چاہیے۔ اِس بنا پر اِس لفظ کا املا ن کے مطابق اختیار کیا گیا ہے اور چوں کہ کے میں اِس لفظ کو مع واو لکھا گیا ہے، اور اِس کا مطلب صاف طور پر یہی ہے کہ ہ پر پیش ہے، اِس لیے ہ پر پیش لگایا گیا ہے۔

نہلوانا: ص ۳۴۳، ح (۱۶)۔

نئے سر سے (ص ۲): لفظ "سر" کے ذیل میں (اِسی ضمیمے میں) اِس لفظ سے متعلق ضروری وضاحت کی جا چکی ہے۔ یہ لکھا جا چکا ہے کہ مفرد لفظ کو "سر" لکھا گیا ہے اور جب یہ فارسی ترکیب کے ساتھ آیا ہے (جیسے: سرِ محفل، از سرِ نو وغیرہ) تب سین پر زبر لگایا گیا ہے۔ یہاں یہ وضاحت کرنا ہے کہ کے، ف، م میں "نئے سر سے" ہے، یعنی سین کے نیچے زیر لگا ہوا ہے ("نئے سر سے" جہاں بھی آیا ہے، کے میں سین کے نیچے زیر لگا ہوا ہے)۔ م میں یہ جملہ یوں ہے: "زبانِ ہندوستان کی از سرِ نو قاعدے پر آئی اور نئے سر سے رونق پائی"۔ "از سرِ نو" میں سین کے اوپر زبر لگا ہوا ہے (یہ فارسی کی رعایت ہوئی) اور "نئے سر" میں سین کے نیچے زیر لگا ہوا ہے۔ ہاں یہ بھی لکھنا ضروری ہے کہ مخطوطۂ گنج خوبی میں میر امّن نے اپنے قلم سے کئی جگہ "نئے سر سے" لکھا ہے، یعنی سین کے نیچے زیر لگایا ہے، مثلاً "نئے سر سے توبہ کی" (ص ۲۱۲)

"پھر نئے سرے سے مسلماں ہو" (ص۲۱۲)۔ "نئے سرے" (ص۲۷۱)۔

نیّتوں (ص ۱۵) : م، ن، کے، ف، ع : سب نسخوں میں یہاں تشدید موجود ہے۔ نیّت، کیفیت، خاصیت جیسے لفظ اُردو (اور فارسی) میں مع تشدید اور بغیر تشدید دونوں طرح مستعمل رہے ہیں (اور اب بھی یہی صورت ہے)۔ کے اور ف میں بھی یہی صورتِ حال پائی جاتی ہے۔ لفظ "کیفیت" کے ذیل میں یہ بحث آچکی ہے۔ جو طریقہ وہاں اختیار کیا گیا ہے، اُسی کی پابندی اِس لفظ کے سلسلے میں بھی کی گئی ہے۔ ہاں یہ وضاحت بھی بے محل نہ ہوگی کہ مخطوطۂ گنجِ خوبی میں میر امّن نے اپنے قلم سے ایسے لفظوں پر عموماً تشدید لگائی ہے، مثلاً: کیفیّت ص ۵، ۱۰۲، ۱۴۴۔ انسانیّت ص ۶۔ نیّت ص ۱۵، ۱۷، ۵۹، ۷۴، ۱۳۸۔ نیک نیّتی ص ۱۰۸۔ قبولیّت ص ۱۷۔ امنیّت ص ۷۴۔ خاصیّت ص ۵۳۔ آدمیّت ص ۸۷۔ قومیّت ص ۱۴۹۔ وحدانیّت ص ۲۲۱۔ شخصیّت ص ۲۲۶۔

نیّر : ص ۳۰۸، ح (۹)۔

نیر ے (مع یاے مجہول) ص ۳۵۱، ح (۴)۔

نیشا پور : ص ۳۳۲، ح (۲)۔

نیک نہ لگی (ص ۲۲۲) : ن، کے، ف، ع : سب نسخوں میں یہی ہے۔ جن معنوں میں یہاں یہ محاورہ آیا ہے، اُن معنوں میں آصفیہ اور نور میں "نیگ لگنا" ملتا ہے ("نیگ" گافِ کے ساتھ) اور اِس کے معنی ہیں: "سوارت ہونا، بجا صرف ہونا، خوشی کے موقعے پر کام میں آنا" (آصفیہ)۔ اِس عبارت میں "نیک نہ لگی" کے معنی ہیں: اتنی محنت کام نہ آئی۔ اگر لغت پر اعتماد کیا جائے تو "نیگ" ہونا چاہیے، مگر سب نسخوں کے متن میں "نیک" (کافِ عربی کے ساتھ) ہے۔ یہ فرض کیا جا سکتا تھا کہ یہاں طباعت کی غلطی ہے کہ گاف کا ایک مرکز چھوٹ گیا ہے، مگر دو باتیں ایسی ہیں جن کی بنا پر اِس بات کو ماننے میں تامّل ہوتا ہے۔ ایک تو یہ کہ کے (اور ف) میں گاف کے دو مرکزوں کا التزام ملتا ہے۔ اگر کہیں ایک مرکز چھوٹ گیا ہے، تو غلط نامے میں اُس کی تصحیح کر دی گئی ہے اور کے کے غلط نامے میں یہ تصحیح موجود نہیں۔ دوسرے یہ کہ ن، کے اور ف : تینوں نسخوں میں "نیک" کی تکرار ہے؛ اور اِس تکرار کی بنا پر یہ ماننا بہ ظاہر مشکل معلوم ہوتا ہے کہ "نیک" لازماً طباعت کی غلطی ہے۔ مزید یہ کہ اِسی سلسلۂ بیان

میں آگے چل کر پھر یہ محاورہ آیا ہے: "خدا کا شکر ہے ہماری محنت نیک لگی" (ک ص ۲۳۶) اور یہاں بھی سب نسخوں میں "نیک" ہے۔ یہ تکرار بھی اس بات کے ماننے میں مانع آتی ہے کہ دونوں جگہ طباعت کی غلطی مان لی جائے۔ اس کے مقابلے میں یہ مان لینا آسان ہے (اور بہ ظاہر مناسب بھی) کہ میر امّن نے اسی طرح لکھا ہوگا۔ آج ہم یقین کے ساتھ اور قطعیت کے ساتھ اُس عہد کے ایسے استعمال کے متعلق اور خصوصاً میر امّن کے طریقِ استعمال کے متعلق کوئی بات نہیں کہہ سکتے۔ میر امّن کی عبارت میں متعدد مقامات پر لفظوں کی اور جملوں کی عجیب عجیب صورتیں سامنے آتی ہیں، جو آج اجنبی معلوم ہوتی ہیں، اور اُن میں سے بعض کا لغت میں بھی پتا نشان نہیں ملتا؛ اِس بنا پر یہاں یہ مان لینا احتیاط کے زیادہ قریں معلوم ہوتا ہے کہ میر امّن نے "نیک لگنا" استعمال کیا ہے ("نیک" کافِ عربی کے ساتھ)۔

اِسی سلسلے میں پلیٹس کے لغت کا ایک اندراج بھی توجہ طلب ہے۔ اُس نے "نیگ" کے ذیل میں "نیگ کرنا" اور "نیگ لگنا" کو درج کیا ہے اور پھر یہ بھی لکھا ہے کہ اِن دونوں محاوروں میں لفظِ "نیگ" فارسی لفظ "نیک" کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ یہ اندراج واضح طور پر میر امّن کے طریقِ استعمال کی تائید کرتا ہے۔ "نیگ" کے اصل معنی ہیں: حصّہ، بخرہ، "نذر، بھینٹ، بیاہ میں رشتے داروں کو حقِّ شادی یا اپنے خدمتیوں کو انعام، جو بہ طورِ رسم دیا جاتا ہے۔ دولھا دلھن کی بہنوں یا بھائیوں کا حق" (آصفیہ)۔ اِسی سے "نیگ دینا" بنا ہے۔ "نیگ لگنا" کے جو معنی لغات میں لکھے گئے ہیں (جو اوپر منقول ہیں) یہ واقعہ ہے کہ اُن میں اور اِن معنوں میں بہت دور کی نسبت ہے۔ غرض کہ اِن مختلف وجوہ کی بنا پر اصل نسخوں کی مطابقت اختیار کی گئی ہے اور "نیک" (کافِ عربی کے ساتھ ہی) برقرار رکھا گیا ہے۔

نیہو (ص ۹۳): ک میں "نیہُو" مع یائے مجہول ہے، یعنی ہٗ پر علامتِ مجہول موجود ہے؛ گویا اِس لفظ کی بھی وہی صورت ہے جو تیوری، ریوڑی، ڈیوڑھی جیسے لفظوں میں پہلے جُز کی ہے (اِن الفاظ سے متعلق نوٹ اِسی ضمیمے میں دیکھے جا سکتے ہیں)۔

نور د آصفیہ میں رشک کا یہ شعر سنداً منقول ہے:

پھیلی جو آمدِ رشکِ شکستہ پا　　دیوارِ قلعۂ نیہو سے بیٹھی پہ آگ میں

اور اِس سے تلفّظ کا تعیّن قطعی طور پر ہو جاتا ہے، یعنی "نیہو" بروزن "فاع"۔ اِس کی اور سندیں

بھی پیش کی جا سکتی ہیں۔ حالی کے یہاں سے ایک سند :

عملِ واعظوں کے اگر قول پر ہے | تو بخشش کی امید بے صرفِ زر ہے
نماز اور روزے کی عادت اگر ہے | تو روزِ حساب اُن کو پھر کس کا ڈر ہے

اگر شہر میں کوئی مسجد بنا دی
تو فردوس میں نیو اپنی جما دی (مسدس حالی، تاج کمپنی، ص ۵۳)

وارِدات (ص ۳۹) : ک اور ف میں بھی رے کے نیچے زیر لگا ہوا ہے۔ ک میں ص ۴۲ پر بھی یہ لفظ آیا ہے، اور وہاں بھی رے کے نیچے زیر لگا ہوا ہے۔ علاوہ ازیں، مخطوطۂ گنجِ خوبی میں جہاں بھی یہ لفظ آیا ہے، رے کے نیچے زیر لگایا گیا ہے (مثلاً ص ۹ پر)۔ انھی وجوہ سے رے کے نیچے زیر لگایا گیا ہے۔ اس وضاحت کی ضرورت یوں محسوس ہوئی کہ بول چال میں یہ لفظ زبان پر اس طرح آتا ہے کہ رے ساکن معلوم ہوتی ہے، حالاں کہ وہ مکسور ہوتی ہے۔

واقفِ کار (بغیرِ اضافت) : ص ۲۹۸، حاشیہ (۲)۔

وِداع (ص ۴۷) : ک اور ف میں واو کے نیچے زیر لگا ہوا ہے۔ مخطوطۂ گنجِ خوبی میں بھی واو کے نیچے زیر لگا ہوا ہے : "وِداع ہوا" (ص ۱۰۸)۔ اسی کی مطابقت اختیار کی گئی ہے اور واو کے نیچے زیر لگایا گیا ہے۔ اصلاً واو پر زبر ہے۔ صاحبِ غیاث اللغات نے اسے بہ فتحِ اول لکھ کر، مزید لکھا ہے : "و بہ کسر خواندن نوعے از تفریس باشد"۔ اس سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ یہ لفظ بہ کسرِ واو بھی مستعمل رہا ہے۔ نور میں ہے : "بہ کسرِ اول غلط، بہ فتحِ اول صحیح۔ فارسی والے بہ کسرِ اول بولتے ہیں"۔ اس کے برخلاف آصفیہ میں "وداع" ہے۔ فیلن کے لغت میں صرف "وِداع" (بہ کسرِ اول) ہے، اور پلیٹس کے لغت میں اسے بہ فتحِ اول اور بہ کسرِ اول دونوں طرح لکھا گیا ہے۔ ان اندراجات سے یہ بات ضرور معلوم ہو جاتی ہے کہ یہ لفظ بہ کسرِ اول بھی مستعمل رہا ہے۔ [اس کی ایک بدلی ہوئی صورت "بِدا" ہے اور اس میں بے کے نیچے زیر ہے اور یہ زیر بھی واو کے زیر کے جواز کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ میر امن نے (مخطوطۂ گنجِ خوبی میں "بدا کروا آیا" (ص ۲۰۷) لکھا ہے۔ نیز، اسی ضمیمے میں دیکھیے لفظ "خراج"]۔

وُرثہ : ص ۱۴۱، ح (۱)۔

وِرخرچی (ص ۲۲) : ن، ف اور ع میں "درخرچی" (دال کے ساتھ) ہے، لیکن یہ صحیح

نہیں۔ م اور کے میں "ورخرچی" (واو کے ساتھ) ہے اور یہی صحیح ہے۔ آصفیہ، نور اور فیلن کے لغت میں یہ مرکب (واو یا دال کی ردیف میں) موجود نہیں۔ ہاں پلیٹس کے لغت میں واو کی ردیف میں "ورخرچ" اور "ورخرچی" دونوں لفظ موجود ہیں۔ "ورخرچی" فضول خرچی کا ہم معنی ہے۔ حسبِ معمول کے کی مطابقت اختیار کی گئی ہے۔

وَرغلانا ("ورغلانا" کا ماضیِ مطلق) : ص ۳۳۰، ح (۲) ۔ نیز ص ۳۵۶، ح (۲) ۔

وَرَقِ الْخِیال (ص ۴۹) : لفظِ "خیال" کو اس کتاب میں ہر جگہ کے کی مطابقت میں بہ کسرِ اوّل لکھا گیا ہے اور اسی ضمیمے میں (لفظِ "خیال" کے تحت) اس کی وضاحت بھی کر دی گئی ہے۔ یہاں یہ لفظ عربی ترکیب کے ساتھ آیا ہے، عربی میں "خَیال" (بہ فتحِ اوّل) ہے؛ اس بنا پر اصولاً تو "وَرَقُ الخَیال" ہونا چاہیے تھا، مگر م، کے، ف، تینوں نسخوں میں خ کے نیچے زیر لگا ہوا ہے؛ اس بنا پر یہاں بھی "وَرَقُ الخِیال" کو برقرار رکھا گیا ہے۔

وُرُقُون (وَرَق کی جمع) : ص ۴۱۴، ح (۸) ۔

وضعِ قطع : ص ۴۸۷، ح (۴) ۔

وَلی نعمت (ص ۶۱) : کے اور ف میں اسی طرح (اضافت کے بغیر) ہے؛ یہ لفظ ص ۹۱ اور ۱۹۴ پر بھی آیا ہے اور وہاں بھی کے اور ف میں اضافت کے بغیر ہے۔ گنجِ خوبی میں یہ لفظ ایک شعر میں آیا ہے اور اضافت کے بغیر : بخت اور دولت اُس سے مُنہ موڑے ۔ جو ولی نعمت اپنے کو چھوڑے (چالیسواں باب)۔ اس طرح یہ متحقق ہو جاتا ہے کہ اس مقام پر "ولی نعمت" اضافت کے بغیر ہی لکھا جانا چاہیے۔

اس مرکب کے سلسلے میں ضمنی طور پر کچھ ضروری تفصیل بھی بے محل نہ ہوگی۔ اس مرکب کی مرجح صورت اضافت کے بغیر ہی ہے (اور شستے میں بھی بغیرِ اضافت آیا ہے)۔ بعض لغات میں تو یہ صراحت کر دی گئی ہے کہ لفظ "ولی" (خداوند کے معنی میں) "مقطوع الاضافت" ہے، یعنی ایسا لفظ جو اضافت کے بغیر آتا ہے۔ صاحبِ غیاث اللغات نے لکھا ہے: "ولی : ..... این لفظ مقطوع الاضافت می آید، چنانکہ ولی عہد و ولی نعمت"۔ بہارِ عجم میں بھی یہ صراحت موجود ہے : "ولی : .... بہ قطعِ اضافت، چون ولی عہد و ولی نعمت۔ خواجہ نظامی :

زلبس رانزو نعمت کردہ راندہ اند ۔ ولی نعمتِ عالمش خواندہ اند

اُردو لغات میں سے آصفیہ میں " ولی نعمت " اضافت کے بغیر ہی مندرج ہے، مگر صراحت کے بغیر؛ البتہ نور میں لفظ " ولی " کے ذیل میں یہ صراحت موجود ہے : " ولی .... صاحب؛ جیسے : ولی عہد، ولی نعمت ۔ اس معنی میں بغیرِ اضافت مستعمل ہے ۔ " اس کے بعد " ولی نعمت " کے ذیل میں لکھا ہے : " ولی نعمت : صفت ۔ خداوند نعمت، پرورش کرنے والا ۔ ذوق :

کیا اللہ نے جب تجھ سا ولی نعمت خلق　　　کیونکے واجب نہ خلائق پہ ہو شکرِ نعمت "

لغات کے اندراج اور شعرا کے استعمال کو پیشِ نظر رکھا جائے تو اس مرکب لفظ کے بغیرِ اضافت ہونے میں کچھ شبہہ نہیں رہتا ۔ اس سلسلے میں ایک یہ بات ضرور قابلِ ذکر ہے کہ مرزا غالب کے (اُن کے ہاتھ کے لکھے ہوئے) متعدد خطوط میں " ولیّ نعمت " لکھا ہوا ملتا ہے، یعنی ی کے اوپر تشدید لگی ہوئی ہے ۔ جب ی مشدّد ہوگی، تو لازماً مکسور ہوگی ؛ یعنی اُس کے نیچے اضافت کا زیر آئے گا ۔ پرتھوی چند (مرحوم) نے اپنی کتاب مرقعِ غالب کے حصّۂ دوم میں نوابینِ رام پور کے نام لکھے ہوئے غالب کے خطوں کے عکس بھی شامل کیے ہیں ۔ ان میں سے کچھ خطوں کے القاب میں " ولی نعمت " لکھا ہوا ہے اور کچھ خطوں کے القاب میں " ولیّ نعمت " ۔ میں نے جو شمار کیا تو معلوم ہوا کہ جن خطوں کے القاب میں یہ لفظ آیا ہے، اُن میں پچاس ۵۰ خط ایسے ہیں جن میں " ولی نعمت " لکھا گیا ہے اور تیس ۳۰ خط ایسے ہیں جن میں " ولیّ نعمت " لکھا ہوا ہے ۔ یہ سب خط مرزا صاحب کے اپنے ہاتھ کے لکھے ہوئے ہیں ۔ اگر قواعد کی رو سے دیکھیے تو اصولاً " ولیِ نعمت " درست ہے، " خداوندِ نعمت " کے معنی میں ۔ اِس لحاظ سے " ولیِ نعمت " کو غلط تو نہیں کہا جا سکتا، مگر یہ بات اپنی جگہ پر ہے کہ استعمالِ عام میں " ولی نعمت " (اضافت کے بغیر) رہا ہے ۔

وُو نہیں (ص ۳۴) : کے تئیں یہ لفظ جہاں بھی آیا ہے، واوِ مجہول کی علامت موجود ہے ۔ اسی کی پابندی کی گئی ہے ۔ اس سے پہلے، اسی ضمیمے میں، " چُون تُون " اور " جُو نہیں " کے ذیل میں یہ وضاحت کی جا چکی ہے کہ یہ لفظ بہ واوِ مجہول اس کتاب میں آئے ہیں ؛ یہی صورت " وُو نہیں " کی ہے ۔

وَہِیں : ص ۲۸۰، حاشیہ (۴) ۔

وُوے (ص ۵۰) : اس کتاب میں بطورِ عموم " وہ " واحد کے لیے، اور " وُوے " جمع کے لیے

آیا ہے۔ فیلن کے لغت میں اِسے بہ کسرِ واو لکھا گیا ہے، مگر پلیٹس نے اپنے لغت میں اِسے بہ کسرِ واو (وِے) اور بہ فتحِ واو (وَے) دونوں طرح لکھا ہے۔ کے (اور مخطوطۂ گنجِ خوبی) میں جو خصوصیاتِ املا بہ طورِ خاص قابلِ ذکر ہیں، اُن میں سے ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ آخرِ لفظ میں واقع یاے ماقبل مفتوح کو کشتی نما لکھا گیا ہے (مثلاً: نہی) اور یاے مجہول کو متعارف طریقے کے مطابق لکھا گیا ہے [مثلاً: دِے، لے]۔ اِس طریقِ املا کا اِن تینوں نسخوں میں التزام ملتا ہے۔ اِن نسخوں میں زیرِ بحث لفظ کو ہر جگہ یاے مجہول کے ساتھ "وے" لکھا گیا ہے اور اِس سے قطعی طور پر متعین ہو جاتا ہے کہ واد کے نیچے زیر ہے۔ اِسی کی پابندی اختیار کی گئی ہے اور "وِے" لکھا گیا ہے۔

ہاں مرزا غالب نے لکھا ہے: "وِے، گنوار و بولی ہے" (فرہنگِ غالب، ص ۲۹)۔ ظاہر ہے کہ مرزا صاحب کی اِس راے سے اتّفاق نہیں کیا جا سکتا۔

ہاتھ (ص ۱۲): سب نسخوں میں اِسی طرح (مع ہاے مخلوط) ہے۔ یہ وضاحت یوں کی گئی کہ پُرانی تحریروں میں اِس لفظ کا املا "ہاتھ" اور "ہات" دونوں طرح ملتا ہے۔ خود میر امّن نے مخطوطۂ گنجِ خوبی میں اپنے قلم سے اِسے دونوں طرح لکھا ہے، مثلاً: ہاتھ: ص ۱۰۵، ۱۰۹، ۹۳، ۹۹، ۱۱۹، ۱۳۹، ۷، ۱۵۵، ۱۷۸، ۱۸۵، ۱۵۵، ۲۹۱، ۲۸۸، ۳۱۹۔ ہاتھوں ۳۲۷۔ ہتّھا بانہیں ۲۷۲۔ ہات: ص ۸۵، ۱۰۹، ۲۶۹، ۲۹۱، ۳۱۹۔ ہت چلی ۲۵۲۔

لیکن "ہاتھ" اکثر ملتا ہے اور اُس کے مقابلے میں "ہات" کم تر ہے۔

ہَرج مَرج (ص ۹۷): کے اور فے میں اِن لفظوں پر اعراب موجود نہیں۔ ص ۱۲۴ اور ص ۲۳۶ پر بھی یہ لفظ آئے ہیں اور وہاں بھی کے میں اعراب کے بغیر ہیں۔ فے میں بھی اعراب موجود نہیں، البتہ فے کی فرہنگ میں دونوں لفظوں کو بہ سکونِ دوم "ہَرج مَرج" لکھا گیا ہے۔ آصفیہ میں بھی اِن کو اِسی طرح لکھا گیا ہے: "ہَرج مَرج۔۔۔۔۔"مرج" بفتحتین بہ معنیِ آشفتگی و فساد و تباہی آیا ہے، مگر جب لفظِ "ہَرج" کے ساتھ آتا ہے تو بہ سکونِ راے مہملہ پڑھتے، بولتے، لکھتے ہیں، یعنی "ہرج مرج"، دونوں لفظوں کو بہ سکونِ ثانی استعمال کرتے ہیں"۔ اِسی کے مطابق اِن لفظوں کو بہ سکونِ دوم لکھا گیا ہے۔

ہِرَن (ص ۱۶۷): کے اور فے دونوں میں ہ کے نیچے زیر لگا ہوا ہے۔ یہ لفظ بہ کسرِ اوّل

اور بہ فتحِ اوّل دونوں طرح مستعمل ہے اور لغات میں بھی اسے دونوں طرح لکھا گیا ہے۔ انشا نے دریاے لطافت میں لکھا ہے: "ہرن میں حرفِ اوّل مفتوح بھی ہے اور مکسور بھی" [ترجمہ دریاے لطافت، ص ۲۳۲]۔ آصفیہ میں "ہَرِن" ہے، یعنی ہ کے اوپر زبر بھی ہے اور اُس کے نیچے زیر بھی ہے، مطلب یہی ہے کہ یہ لفظ دونوں طرح مستعمل ہے۔ نور میں بھی یہی صورت ہے: "ہرن: بہ فتحِ اوّل و دوم و نیز بہ کسرِ اوّل و فتحِ دوم"۔ البتہ نفائس اللغات میں اسے صرف بہ کسرِ اوّل لکھا گیا ہے۔ اِس کتاب میں اِس لفظ کو مرجّح بہ کسرِ اوّل مانا جائے گا، ایک تو یوں کہ کے میں ہ کے نیچے زیر لگا ہوا ہے اور دوسرے یوں کہ مخطوطۂ گنجِ خوبی میں میر امّن نے ہ کے نیچے زیر لگایا ہے۔ "ہِرن" (ص ۱۷۷) "ہِرنی" (ص ۸۲)۔ اِنھی وجوہ سے ہ کے نیچے زیر لگایا گیا ہے۔

ہَریسا (ص ۷۷): کے، ف، ع میں یہی املا ہے [یعنی آخر میں الف ہے]۔ یہ عربی کا لفظ ہے اور عربی میں "ہریسہ" ہے۔ فارسی میں بھی یہی املا ہے، یعنی آخر میں ہاے مختفی ہے۔ آصفیہ و نور میں بھی "ہریسہ" ہے۔ میں نے یہاں بھی اصل کی مطابقت کو ترجیح دی ہے، اِس بنا پر کہ اِس کا قوی امکان ہے کہ مؤلف نے اِس کو ہندی لفظ فرض کرلیا ہو، یا یہ کہ اُس کے نزدیک صحیح املا یہی ہو۔ عربی، فارسی کے ایسے متعدد لفظ ملتے ہیں جن میں اِس قسم کے تصرفات نے راہ پائی ہے، اور اِس اعتبار سے اِس لفظ میں بھی یہ املائی تبدیلی بعید از قیاس نہیں ہوسکتی؛ اِسی لیے یہاں بھی اصل کی مطابقت کو ترجیح دی گئی ہے۔

ہِمیانی (ص ۱۷۸): کے اور ف میں ہ کے نیچے زیر موجود ہے، اِسی کی مطابقت اختیار کی گئی ہے۔ اِس لفظ کے سلسلے میں کچھ وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے۔ اصل لفظ فارسی میں "ہمیان" ہے۔ م پر زبر بھی ہے اور سکون بھی [ہَمَیان۔ ہَمْیان]۔ اور "ہِمیان" اُس کی معرب صورت ہے: "ہمیان: بالتحریک و بالسکون، نوعے از کیسہ کہ درم و دینار درآں گذارند۔ "ہِمیان" بالکسر معرب (بہارِ عجم)"۔ ڈاکٹر معین نے اِس لفظ کے ذیل میں حاشیۂ برہانِ قاطع میں "ہمیان" کے معرب ہونے کے متعلق منتہی الارب کی عبارت درج کی ہے: "در عربی ہمیان بالکسر...... کیسہ ای کہ درآں درم نہند، پارسی است و معرب" (منتہی الارب)"۔ آصفیہ میں بھی "ہِمیانی" ہے۔ نور میں یہ صراحت بھی کی گئی ہے کہ اصل لفظ "ہمیان" ہیں "اُردو میں ی اضافہ کردی اور

بالکسر بولنے لگے۔" مطلب یہ ہے کہ "ہمیانی" اُردو ہے اور اِس کے بہ کسرِ اوّل ہونے پر اُردو میں اتفاق ہے۔ ڈاکٹر معین نے برہانِ قاطع کے محولۂ بالا حاشیے میں یہ بھی لکھا ہے کہ:

"کُردی: HEMIIAN (ہمیانی کہ زر در آن پول نہند)۔"

مَعین کے اندراج سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ جدید فارسی میں "ہمیانی" موجود ہے۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کُردی زبان میں "ہمیان" بہ کسرِ اوّل ہے اور اِس سے "ہمیانی" کے زیر کی اصلیت کا سُراغ بھی ملتا ہے۔

ہِندُوستانیوں (ص ۵): ک۔ اور ف۔ میں یہاں یہ لفظ واو کے بغیر "ہندُستانیوں" ہے۔ یہ لفظ اسی دیباچے میں ذرا آگے چل کر پھر آیا ہے: "اِس قصّے کو ٹھیٹھ ہندوستانی گفتگو میں"، اور وہاں ک۔ اور ف۔ دونوں میں یہ لفظ مع واو ہے۔

لفظ "ہندوستان"، سب سے پہلے ک۔ کے سرورق پر آیا ہے اور وہاں ک۔ میں "ہندُستان" مع واو ہے۔ اُس کے بعد یہ لفظ ایک جگہ میر امّن کی عرضی میں آیا ہے، اور وہاں بھی ک۔ اور ف۔ دونوں میں "ہندوستان" مع واو ہے۔ اُس کے بعد دیباچۂ کتاب میں یہ لفظ تین جگہ آیا ہے، اور تینوں مقامات پر ک۔ اور ف۔ دونوں میں "ہندوستان" (مع واو) ہے۔

مخطوطۂ گنجِ خوبی میں ہر جگہ اِس لفظ کو میر امّن نے اپنے قلم سے "ہندوستان" لکھا ہے، یعنی واو موجود ہے اور اُس پر علامتِ مجہول لگائی گئی ہے، اِس طرح اِس لفظ کا تلفّظ واضح طور پر مع واوِ مجہول متعیّن ہو جاتا ہے۔

مختصر یہ کہ شروعِ کتاب میں (سرورق سے لے کر دیباچۂ کتاب تک) لفظِ "ہندوستان" پانچ جگہ آیا ہے اور ک۔ میں ہر جگہ اُسے مع واو لکھا گیا ہے۔ لفظِ "ہندوستانی" دو جگہ آیا ہے، ک۔ میں ایک جگہ "ہندوستانی" مع واو ہے اور ایک جگہ "ہندستانی" بغیرِ واو۔

چوں کہ مصنّف کا املا ہمارے سامنے ہے اور ک۔ میں بھی سات میں سے چھے جگہ اِسے مع واو لکھا گیا ہے، اِس لیے یہ مان لینا قطعی طور پر درست ہوگا کہ یہ لفظ مع واو ہے اور ایک جگہ جو وہ موجود نہیں، تو یہ طباعت کی فروگذاشت ہے؛ اِسی بنا پر یہاں اِسے "ہندوستانی" لکھا گیا ہے۔ ہاں، ط م میں بھی "ہندوستان" اور "ہندوستانی" مع واو ہی ملتے ہیں۔ اِس سے اِس املا کی مزید تائید ہوتی ہے۔

دوسرا مسئلہ اِس لفظ کے تلفّظ کا ہے۔ کـ میں ہر جگہ واو خالی ہے، یعنی اُس پر علامتِ مجہول موجود نہیں، اور گل کرسٹ کے مقرر کردہ قاعدے کے مطابق واوِ معروف کی پہچان یہی تھی کہ اس پر علامتِ مجہول نہ ہو، اُسے خالی رکھا جائے۔ یوں کـ کے مطابق اِس کا تلفّظ "ہِندُوستان" اور "ہِندُوستانی" ہوگا۔ اگر اصل پر نظر رکھی جائے [ہِندُو۔ستان] تو یہ لفظ مع واوِ معروف ہی مرجّح ٹھہرے گا۔ اِس کے مقابلے میں مخطوطۂ گنجِ خوبی میں مصنّف نے اپنے قلم سے التزام کے ساتھ اِس لفظ میں ہر جگہ واو پر علامتِ مجہول لکھی ہے، یعنی اسے "ہِندوستان" مانا ہے۔ میں نے خود مصنّف کے مقرر کردہ تلفّظ کو ترجیح دی ہے، اِسی بنا پر "ہِندوستان" اور "ہِندوستانی" [مع واوِ مجہول] لکھا ہے۔ ـع میں سبھی مقامات پر یہ لفظ واو کے بغیر ["ہندستان، ہندستانی"] ملتے ہیں مگر یہ انجمن ترقیِ اُردو کی مقرّرہ روش کی ترجمانی کرتے ہیں۔ انجمن ترقیِ اُردو نے [اور الٰہ آباد کی ہندستانی اکیڈمی نے بھی] اِس لفظ کا املا واو کے بغیر "ہندستان" مانا تھا، اور اسی طرح "ہندستانی" اور اُس زمانے کی انجمن کی مطبوعات میں اِن الفاظ کا یہی املا ملتا ہے۔ اِس میں شک نہیں کہ اب اِن لفظوں کا یہی املا مرجّح ہے [یعنی: ہندستان، ہندستانی، ہندستانیوں] لیکن میر امّن کے زمانے میں [اور اُس کے بعد بھی] عام طور پر اِن لفظوں کو مع واو لکھا جاتا تھا۔ اور اگر کہیں بغیر واو لکھا جاتا تھا، تو کوئی خاص ضرورت اِس کی مقتضی ہوتی تھی۔ اِس کی ایک مثال میرے سامنے ہے: ناسخ نے سودا کا جو معروف قطعۂ تاریخِ وفات کہا ہے، اُس میں مصرعِ تاریخ یہ ہے: "شاعرِ ہندستاں داویلا" اور اِس مصرعے میں "ہندستاں" واو کے بغیر آیا ہے اور یہ تقاضا تھا اعدادِ تاریخ کا [اگر اِس کو "ہندوستاں" لکھا جائے تو اصل تاریخ میں چھے عدد کا اضافہ ہو جائے گا] لیکن یہ اُس زمانے کے لحاظ سے استثنا تھا اور ضرورتِ تاریخ گوئی اِس کی متقاضی تھی۔ عام اندازِ نگارش سے اِس کا تعلّق نہیں تھا۔ یہ بات بھی ذہن میں رہے کہ "ہندستان" اور "ہندُوستان" میں املا اور تلفّظ دونوں کا فرق ہے۔ میر امّن نے واو پر مجہول کی علامت بنائی ہے [حوالہ اوپر آچکا ہے] اور یہ واضح ثبوت ہے اِس کا۔

شاعری میں "ہندستان" اور "ہندوستان" دونوں مستعمل رہے ہیں اور آج بھی مستعمل ہیں، لیکن یہ بحث دوسری ہے۔ ["ہندستان" کی بحث کے لیے دیکھیے ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کا مقالہ: "ہندستان بغیر واو کے صحیح ہے"، مشمولہ مقالاتِ صدیقی، جلد اوّل]۔

ہندوؤں (ص ۷) : م اور کے میں پہلا واو معروف ہے، اور بہ لحاظِ اصل [یعنی "ہندو" کی نسبت سے] ہونا بھی اسی طرح چاہیے۔ یہ صراحت یوں کی گئی کہ تلفظ میں بالعموم یہ لفظ اس طرح آتا ہے کہ پہلے واو کی آواز دب کر نکلتی ہے، مگر یہ لہجہ ہے اور اس کا اثر اس لفظ نیز ایسے دیگر الفاظ کے املا پر نہیں پڑتا [جیسے: آنسوؤں (ص ۴۴) کہ کے میں بھی یہ مع واوِ معروف ہے۔ واحد: آنسو، جو مع واوِ معروف ہے]۔

ہَنُوز (ص ۲۲۹) : کے میں ہ پر زبر لگا ہوا ہے اور واو پر علامتِ مجہول موجود ہے۔ فنے کے متن میں تو اس لفظ پر اعراب نہیں، مگر فرہنگ میں اسے بہ فتحِ اوّل و واوِ مجہول ہی لکھا گیا ہے۔ اسی کی مطابقت اختیار کی گئی ہے۔ [غیاث اللغات میں بہ فتحِ اوّل و واوِ معروف ہے]۔

ہواو : ص ۳۴۴، ح ⑫ ۔

ہوجیے (ص ۱۳۰) : مصدر "ہونا"، مع واوِ مجہول مستعمل ہے اور اس میں کچھ اختلاف نہیں۔ قاعدے کے مطابق تو "ہوجیے" میں بھی واو کو مجہول رہنا چاہیے، مگر استعمالِ عام میں "ہوجیے" مع واوِ معروف ہے۔ کے میں بھی اسے مع واوِ معروف لکھا گیا ہے۔ کے میں واوِ مجہول پر علامتِ مجہول ہ ملتی ہے اور واوِ معروف کو خالی چھوڑ دیا جاتا ہے۔ اس کا التزام آخر تک ملتا ہے۔ یہاں بھی واو خالی ہے یعنی اُس پر علامتِ مجہول موجود نہیں اور اس طرح اس واو کا معروف ہونا متعیّن ہو جاتا ہے۔ آصفیہ میں "ہوجیے" موجود ہی نہیں، نور میں ہے مگر معروف یا مجہول کی صراحت کے بغیر؛ البتہ پلیٹس کے لغت میں اسے واوِ معروف کے ساتھ ہی لکھا گیا ہے۔ انھی وجوہ سے اس لفظ کو مع واوِ معروف لکھا گیا ہے۔

ہُونٹھ (ص ۲۹) : م، ل، کے، فنے، ع؛ سب میں یہی املا ہے [آخر میں ہائے مخلوط] اور مخطوطۂ گنجِ خوبی میں بھی یہ لفظ مع ہائے مخلوط ہی ملتا ہے [ص ۲۰۵، ص ۳۰۵] اسی کی پابندی کی گئی ہے۔

ہیلہ : ص ۳۷۷، ح ① ۔

یَسا وَل (ص ۳۵) : کے اور فنے میں یہاں تو اس لفظ پر اعراب موجود نہیں، مگر کے میں ص ۱۰۱ پر بادشاہ آزاد بخت کی داستان کے شروع ہی میں یہ لفظ آیا ہے اور وہاں کے اور فنے دونوں میں واو پر زبر لگا ہوا ہے۔ فنے کے آخر میں جو فرہنگ ہے، اُس میں بھی

اِسے بہ فتحِ واو لکھا گیا ہے۔ غیاث اللغات میں اِسے بہ ضمِّ واو (یساوُل) لکھا گیا ہے۔ برہانِ قاطع میں یہ لفظ موجود نہیں تھا؛ اُس کے ایرانی مرتّب ڈاکٹر معین نے حاشیے پر اِس کا اضافہ کیا ہے اور اِسے بہ ضمِّ واو ہی لکھا ہے۔ اُردو لغات [آصفیہ۔ نور] میں بھی اِسی طرح مندرج ہے۔ فیلن کے لغت میں تو یہ لفظ موجود نہیں، البتّہ پلیٹس کے لغت میں ہے اور اُس میں اِسے بہ فتحِ واو لکھا گیا ہے۔ چوں کہ اِس کا امکان ہے کہ اُس زمانے میں اُردو والے اِس لفظ کو اِسی طرح [بہ فتحِ واو] بولتے ہوں، یا یہ کہ مصنّف کی زبان پر یہ لفظ اِسی طرح ہو؛ اِس بنا پر کے اور فے کی مطابقت اختیار کی گئی ہے اور ہر جگہ واو کے اوپر زبر لگایا گیا ہے۔

یعنے (ص ۹۱): م، ن اور کے میں اِسی طرح ہے۔ ع میں "یعنی" ہے۔ "معنے" کے ذیل میں اِسی ضمیمے میں اِن دونوں لفظوں سے متعلّق ضروری باتیں لکھی جا چکی ہیں۔ یہاں صرف یہ کہنا ہے کہ مخطوطۂ گنجِ خوبی میں بھی میر امّن نے اپنے قلم سے ہر جگہ "یعنے" لکھا ہے: ص ۱۱، ۱۲، ۱۴، ۱۵، ۱۷، ۲۴، ۲۵، ۲۷، ۲۸، ۵۱۔ اِسی کی پابندی کی گئی ہے اور "یعنے" لکھا گیا ہے۔ [اُردو میں بہت سے لوگوں کی زبان سے اب بھی "یعنے" اور "معنے" سُننے میں آتا ہے]۔

یوں ہی [یوں ہیں]: اِس ایک لفظ کے یہ دونوں املا اُردو کی کتابوں میں ملتے ہیں اور وہی صورت اِس کتاب کی بھی ہے کہ اِس میں بھی دونوں املا موجود ہیں۔ مثلاً ص ۴۳ پر "یوں ہی" لکھا گیا ہے، اِس بنا پر کہ کے اور فے میں اِس مقام پر یہی املا ہے۔ اور ص ۴۶ پر "یوں ہیں" ملے گا، اِس بنا پر کہ وہاں کے اور فے میں اُسی طرح ہے۔ مختصر یہ کہ اِس لفظ کو کے کے مطابق ہر جگہ لکھا گیا ہے۔

یوں ہیں (ص ۴۶): کے میں واو پر علامتِ مجہول موجود نہیں، یعنی واو خالی ہے۔ ص ۲۱۸ پر بھی یہ لفظ آیا ہے اور وہاں بھی کے میں یہی صورت ہے کہ واو خالی ہے۔ گل کرسٹ کے مقرّر کردہ اصولِ املا کے مطابق، واوِ مجہول پر گول علامت ہوگی اور واوِ معروف کو خالی رکھا جائے گا اور نسخۂ کے میں اِس طریقِ کار کی مکمّل طور پر پابندی ملتی ہے؛ اِس اعتبار سے اِس لفظ میں واوِ معروف ہے۔ ص ۱۹۲ پر مفرد لفظ "یوں" آیا ہے اور وہاں بھی کے میں واو پر کوئی علامت نہیں، جس کا مطلب یہ ہوا کہ "یوں" میں واوِ معروف ہے۔ اِس لحاظ سے بھی "یوں ہیں" میں واوِ معروف کا تعیّن ہو جاتا ہے۔ نور میں لفظِ "یوں" کے ذیل میں لکھا گیا ہے کہ: "لکھنؤ

میں واوِ مجہول سے اور دہلی میں واوِ معروف سے ہے۔" آصفیہ میں "یوں" کو مع واوِ معروف لکھا گیا ہے، مگر حاشیے میں یہ بھی لکھا گیا ہے کہ: "بہ واوِ مجہول بھی درست ہے"۔ اِس سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ یہ لفظ دونوں طرح استعمال میں رہا ہے۔ بہ ہر صورت، اِس کتاب میں اِس لفظ کو مع واوِ معروف پڑھنا چاہیے۔

یِہ (ص ۳) : کسے اور ریختے میں تقریباً ہر جگہ یؔ کے نیچے زیر لگا ہوا ملتا ہے۔ اِسی التزام کی مطابقت اختیار کی گئی ہے اور ہر جگہ یؔ کے نیچے زیر لگایا گیا ہے۔

اِس لفظ کے تلفظ کے سلسلے میں سید انشا کی یہ عبارت پیشِ نظر رہنا چاہیے:

"کلمۂ "یہ" [اشارۂ قریب] میں بالکسر تو اُردو ہے، لیکن بالضم ساداتِ بارہہ کی زبان ہے، اور بالفتح دہلی کے اطراف میں بولتے ہیں" [ترجمۂ دریائے لطافت ص ۲۲۲]۔

یہ بات بھی طلبہ کے ذہن میں رہنا چاہیے کہ یہ دو حرفی لفظ ہے جو یؔ اور ہؔ سے مل کر بنا ہے۔ اِس میں ہائے ملفوظ ہے۔ ایک مثال سے اِس کا صحیح طور پر اندازہ کیا جا سکے گا:

غل تھا کہ وہ چمکتی ہوئی آئی، یہ گری — برچھی سے اُڑ گئی وہ سناں، یہ گرہ گری
ترکش کٹا، کمانِ کیانی سے زہ گری — یہ سر گرا، وہ خود گرا، یہ زِرہ گری
آتی ہے لشکروں پہ تباہی اسی طرح
گرتی ہے برقِ قہرِ الٰہی اِسی طرح [میر انیس]

نظم میں کبھی کبھی ضرورتِ شعری سے "یہ" اور "وہ" دونوں کو بہ اخفائے ہؔ نظم کیا جاتا ہے، مگر یہ مسئلہ شعری زبان کا ہے، اصلاً اِن دونوں لفظوں [وہ۔ یہ] میں ملفوظ ہؔ ہے۔

اِس لفظ کی کتابت کی صورت یہ تھی کہ پرانی روشِ کتابت کے مطابق اِس کو اِس طرح لکھا جاتا تھا کہ آخر میں ایک ہائے مختفی کا اضافہ ہو جاتا تھا اور اِس طرح درمیان میں جو ہؔ آتی تھی، اُسے [نستعلیق کے اصول کے مطابق] کُھنی دار لکھا جاتا تھا۔ یوں یہ دو حرفی لفظ [ی۔ ہ] گویا تین حرفی بن جاتا ہے [یہہ]۔ فؔ اور کؔ میں یہ لفظ اِسی طرح ملتا ہے، البتہ عؔ میں اِسے ہر جگہ "یہ" لکھا گیا ہے۔ ایک فرق یہ بھی ہے کہ کؔ میں عموماً "یِہہ" ہے، یعنی یؔ کے نیچے زیر ہے اور درمیانی ہؔ کے نیچے شوشہ ہے۔ فؔ میں یؔ کے نیچے زیر تو ملتا ہے، مگر درمیانی ہؔ کے نیچے شوشہ نہیں ملتا اور عؔ میں نہ یؔ کے نیچے زیر ہے اور نہ آخری ہؔ

کے نیچے شوشہ ہے۔

یہ بات مسلّمات میں سے ہے کہ ہاے مختفی، جو آخرِ لفظ میں آیا کرتی ہے، اُس کا کام دراصل یہ ہوتا ہے کہ وہ حرفِ ماقبل کے زبر کو سہارا دے سکے، وہ تلفّظ میں نہیں آتی، اِس کے برخلاف "وہ" اور "یہ" دونوں کے آخر میں جو ہ ہے، وہ ملفوظ ہے۔ جب ملفوظ ہ ملاکر لکھی جاتی ہے [خواہ شروع میں، جیسے: ہو؛ خواہ درمیان میں جیسے: بہت] تو اُس کے نیچے ایک شوشہ بھی لگایا جاتا ہے اور یہ شوشہ پہچان ہے ملفوظ ہ کی۔ مختفی ہ کے نیچے شوشہ کبھی نہیں لگایا جاتا، کیوں کہ وہ تلفّظ میں نہیں آتی۔ "ماہ" کے مخفّف "مہ" میں اور "نامہ" کے "مہ" میں یہی فرق ہے کہ "مہ" کے آخر میں ہاے ملفوظ ہے اور "نامہ" کے "مہ" کے آخر میں ہاے مختفی ہے؛ اِسی لیے "مہ" کے نیچے شوشہ لگایا جائے گا اور "نامہ" کے "مہ" کے نیچے شوشہ نہیں لگایا جائے گا۔ صورتِ حال یہ ہے کہ ک اور ن میں ی کے نیچے زیر موجود ہے، اِس لیے اِس زیر کو پابندی کے ساتھ لگایا گیا ہے۔ ک میں ہ کے نیچے شوشہ بھی موجود ہے، اِسی لیے ی کے زیر کے ساتھ ہ کے اُس شوشے کو بھی لازمی طور پر لگایا گیا ہے اور چوں کہ اِس لفظ میں صرف ایک ہ ہے [ی - ہ] اِس لیے اِس لفظ میں صرف ایک ہ لکھی گئی ہے [جس طرح ع میں ہے] اور یوں اِس لفظ کو ہر جگہ "یہ" لکھا گیا ہے۔

یہاں (ص ۱۸۳): ن، ک، ف، ع؛ سب میں "یہاں تک" لکھا ہوا ہے۔ اِسے اگر "یہاں تک" [بہ ہاے ملفوظ] پڑھا جائے تو مصرع ساقط الوزن ہو جائے گا؛ لازماً "یھاں تک" [مع ہاے مخلوط التلفّظ] پڑھنا پڑے گا۔ "یھاں" اور "وھاں" [دونوں لفظ مع ہاے مخلوط] غالب کے زمانے تک استعمال میں رہے ہیں۔ مولانا امتیاز علی خاں عرشی مرحوم نے مقدمۂ مکاتیبِ غالب میں املاے غالب پر گفتگو کرتے ہوئے یہ لکھا ہے: "یہاں" کے مخفّف کو دلّی والے "یھاں" بولتے تھے، مرزا صاحب نے اِس تلفّظ کو افصح قرار دیا ہے"۔ [ص ۲۲۹] عرشی صاحب کا یہ قول، مرزا غالب کی ایک اصلاح پر مبنی ہے۔ نوّاب ناظم کا شعر تھا: سیّاحِ جہاں گرد ہیں، آنکلے یہاں بھی کچھ تیرے پجاری تو نہیں اے بتِ چیں ہم اِس کے پہلے مصرعے کو مرزا صاحب نے یوں بنایا: "سیّاحِ جہاں گرد ہیں، آنکلے ہیں یھاں بھی" اور اِس طرح وضاحت کی ہے: "یہاں" بروزنِ "دہاں" فصیح نہیں، بے ضرورت نہ چاہیے۔

"یہاں" بہ ہائے مخلوط التلفّظ افصح ہے" [ایضاً ص ۱۵۴]۔
یادگارِ غالب کا پہلا اڈیشن [نامی پریس کان پور ۱۸۹۷ء] میرے سامنے ہے، اُس میں ایسے مقامات پر التزام کے ساتھ "یھاں" اور "وھاں" لکھا ہوا ملتا ہے۔ مولانا عبدالباری آسی نے میر کا کلیات مرتب کیا تھا، جو نول کشور پریس سے چھپا تھا، اُس میں بھی یہ التزام ملتا ہے کہ ایسے الفاظ کو "وھاں" اور "یھاں" لکھا جائے۔ متعدد غزلوں کی ردیف "وھاں" اور "یھاں" ہے۔ "وہ" اور "یہ" کی آوازیں اُردو صوتیات کا جُز تھیں، جو "وھاں" اور "یھاں" کی صورت میں نمایاں ہوتی تھیں۔ اب چوں کہ عموماً "واں" اور "یاں" کہتے اور لکھتے ہیں، اِس لیے "وھاں" اور "یھاں" اجنبی صورتیں معلوم ہوتی ہیں، مگر اُس زمانے میں یہ مانوس شکلیں تھیں اور تلفظ میں بھی یہ لفظ اِس طرح آتے تھے۔ اِس کا ایک اور ثبوت یہ ہے کہ انشا نے دریاے لطافت میں اُردو کے حروفِ تہجّی کے بیان کے ذیل میں اُن حرفوں کی تفصیل لکھی ہے جو "ہاے ہوّز کے ساتھ مخلوط ہو کر آواز دیتے ہیں"۔ اُن میں واو اور ی کو بھی شامل کیا ہے [ترجمۂ دریاے لطافت ص ۱] پھر ص ۱۳ پر اِن حرفوں کی مثالیں دی ہیں، وہاں لکھا ہے: " واو اور ی کے اختلاط کی مثال ہے یھاں اور وہاں"، اور اِس سے قطعی طور پر تعیّن ہو جاتا ہے۔

ییے: اِس کتاب میں جمع کے لیے اکثر مقامات پر اشارۂ قریب کے لیے "ییے" اور اشارۂ بعید کے لیے "وو" استعمال میں آئے ہیں۔ "ییے" میں پہلی ی مکسور ہے اور دوسری مجہول [ی ے]۔ انشا نے دریاے لطافت میں لکھا ہے:

> " "یہ" اور "وہ" کے ساتھ اکثر یہ بھی ہوتا ہے کہ اوّل کی ہ کو ی سے بدل کر "ییے" اور دوم کی ہ کو واو سے بدل کر "وو" بنا لیتے ہیں۔ یہ تبدیلی شہر کے فصحا کے اختیار میں ہے" [ترجمۂ دریاے لطافت ص ۲۲۳]۔

اضافہ

آتش (دو آتشہ، ص ۵۸): م، ک، ف میں "آتشہ" کی ت پر حرکت موجود نہیں، البتّہ ف کی فرہنگ میں اِس کو تاے مفتوح کے ساتھ [ĀTASHA] لکھا گیا ہے۔ لفظِ "آتش"

کو فارسی لغات میں بہ فتحِ تا بھی لکھا گیا ہے اور بہ کسرِ تا بھی۔ غیاث اللغات کے اِس اندراج سے صورتِ حال واضح طور پر سامنے آجاتی ہے: "آتش: بالفتح و کسرِ فوقانی، ہر دو درست است از جہانگیری و سراج اللغات۔ و در برہان بہ کسرِ تا۔" برہانِ قاطع کے ایرانی مرتب اور معروف زبان شناس ڈاکٹر معین نے اِس لفظ کے حاشیے میں ت کی حرکت کے متعلق تو کچھ نہیں لکھا ہے، مگر اُنھوں نے مختلف علاقائی اور قدیم زبانوں میں اِس لفظ کی اصل صورت کی نشان دہی ضرور کی ہے اور اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ اصلاً تو تیسرا حرف مفتوح تھا؛ البتہ ایک دو علاقائی بولیوں میں یہ مکسور بھی رہا ہے اور اس سے اختلافِ تلفظ کی مزید وضاحت ہوجاتی ہے اور "تائے مفتوح کی ترجیح بھی ظاہر ہوتی ہے۔ فارسی شعرا کے یہاں لفظِ "آتش" بہ طورِ عموم "سرکش" جیسے لفظوں کا ہم قافیہ ملتا ہے اور اس سے بھی واضح طور پر یہ بات سامنے آتی ہے کہ اساتذۂ فارسی نے عموماً اِس لفظ کو تائے مفتوح کے ساتھ نظم کیا ہے اور اس طرح "آتَش" مرجّح قرار پایا ہے۔ اُردو کے لغت نویسوں نے اِس لفظ میں اختلافِ حرکت کا ذکر ضرور کیا ہے، مگر اُن کے اندراجات سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب لوگ بہ فتحِ تا کو مرجّح سمجھتے تھے۔ مثلاً مولّفِ نوراللغات نے لکھا ہے: "آتش: بہ کسرِ تا، بہ فتحِ تا دونوں طرح صحیح ہے، لیکن اساتذہ کے کلام میں عموماً بہ فتحِ دوم پایا جاتا ہے۔" یہی بات امیر مینائی نے امیراللغات میں لکھی ہے۔ اُنھوں نے اپنے لغت میں اِسے صرف ت کے زبر کے ساتھ "آتَش" درج کیا ہے اور لکھا ہے: "...... اور حق یہی ہے کہ جہاں تک تتبّع کیا گیا، "سرکش" اور "شش" وغیرہ کے قوافی میں پایا گیا۔" آصفیہ میں بھی اِسے صرف ت کے زبر کے ساتھ "آتَش" لکھا گیا ہے؛ مولّف نے وضاحت بھی کی ہے: "...... جہاں تک فارسی کے اشعار ہماری نظر سے گزرے، ہم نے برابر "سرکش" اور "مشوّش" وغیرہ کے ساتھ "آتش" کا قافیہ پایا۔" اِس کے بعد دو فارسی کے شعر لکھے ہیں اور ایک اُردو کا شعر درج کیا ہے:

آہ! تن سوزِ دروں سے شکلِ آتش ہے مرا دل کسی آتش کے پرکالے پہ جو غش ہے مرا (جرأت)

حریص و جہانسوز و سرکش مباش ز خاک آفریدندت، آتش مباش (سعدی)

دیوانہ ام ز خانۂ مشوّش برآمدہ طوفانم از تنورِ پُر آتش برآمدہ (نظیری)"

اِنھی وجوہ سے اِسے "دوآتشہ" [بہ فتحِ تا] لکھا گیا ہے۔ یہ بات لکھی جاچکی ہے کہ

فنے کی فرہنگ میں بھی یہ لفظ اسی طرح مندرج ہے۔
اب کے بار، اب کی بار : ص ۳۹۷، س ۴ :
یا جیسے امیر اللہ تسلیم کا یہ شعر :
کوچے میں ترے ضعف کا یہ حال ہے اب کے
پس جاتے ہیں ہم سایۂ دیوار سے دب کے [ماخوذ از رسالۂ اصلاح]
اور جیسے میر کی یہ رباعی، اور ایک غزل کے دو شعر :
ہیں قید قفس میں تنگ یوں تو کب کے رہتے تھے گلے ہزار نیچے لب کے
اس موسم گل میں، میر، دیکھیں کیا ہو ہے جان کو بے کلی نہایت اب کے
[کلیات میر، مرتبہ آسی، ص ۸۰۷]
کیا کہیں اس کی، اپنی شب کی بات کہیے، ہووے جو کچھ بھی ڈھب کی بات
نکتہ دانان رفتہ کی نہ کہو بات وہ ہے، جو ہووے اب کی بات
[ایضاً ص ۵۹]
تیوری : ص ۴۴۷
"تیوری" کی محض ایک مثال میر کے یہاں سے پیش کی جاتی ہے :
ہم خستہ دل ہیں تجھ سے بھی نازک مزاج تر تیوری چڑھائی تو نے کہ یہاں دم نکل گیا
[میر، دیوان اوّل، کلیات مرتبہ آسی، ص ۱۷]
اس لفظ کی بحث میں امیر مینائی کے ایک خط کو پیش کرنا افادیت سے خالی نہ ہوگا۔ یہ خط رسالۂ تحقیق [شمارہ ۳، ۱۹۸۹ء، مجلۂ شعبۂ اردو، جام شورو یونی ورسٹی، سندھ] میں شائع ہوا ہے :
"" تیوری" میں جو بحث تم نے لکھی ہے وہ میں نے دیکھی۔ فعلن کے وزن پر فقط رشک نے نہیں کہا ہے بلکہ انشا اور سرور، نکہت، ناسخ، وزیر، صبا ان سب کے کلام میں اسی وزن پر پایا گیا ہے۔ البتہ یاد پڑتا ہے کہ داغ "تیوری" کو اس طرح پڑھتے تھے کہ تحتانی اور واو دونوں میں سے کوئی تائے قرشت مکسور کے ساتھ تلفظ میں مخلوط نہ ہوتا تھا۔ یاے تحتانی کو مجہول اور واو کو ساکن ادا کرتے تھے اور شاید ان کے کسی شعر میں بھی یوں نہیں موزوں ہے کہ

وہ اِس وقت یاد نہیں مگر تلاش سے مل سکتا ہے۔ اور تعیین اِس بات کی کہ اس کی اصل "تیوری" بضم واو ہے، یہ بھی دشوار ہے، بخلاف "پیارا" کے کہ اس کو قدما نے بفتح یاے تحتانی کہا ہے، گو اب کثرت استعمال سے وہ فتحہ فقط بو دیتا ہے، پورا پڑھا نہیں جاتا؛ یہاں زبان کا کوئی لغت مبسوط موجود نہیں۔ پنڈت نرائن ملازم ریاست ایک مرد قابل ہے اور دفتر امیر اللغات میں اکثر الفاظ کی تحقیق اس سے کی جاتی ہے۔ وہ آج کل بیمار ہے۔ میں نے حالت بیماری میں بھی اس کو بلوایا اور پوچھا تو کوئی بات اچھی طرح سے نہ ہوئی۔ وہ صحیح ہوتا تو تلاش کرکے کچھ بتاتا۔ "تیور" اور "تیوری" میں لفظاً اور معناً قرب ظاہری اور تیور میں تو واو مفتوح ہے۔ پھر کس بنا پر تجویز کیا جائے کہ اصل میں "تیوری" کا واو مضموم ہے اور بر تقدیر تسلیم ضمۂ واو بھی "پیارا" پر اس کا قیاس قیاس مع الفارق ہے۔ غور سے دیکھو کہ "پیارا" میں یاے تحتانی جو زبان حال میں یاے عجمی مکسور کے ساتھ مخلوط التلفظ ہے، اصل میں استعمال قدما سے مفتوح معلوم ہوتی ہے۔ بخلاف "تیوری" کے اس میں یاے تحتانی تو کسی حالت میں متحرک نہیں ہے۔ اگر احتمال ہے تو واو کے متحرک ہونے کا ہے۔ پھر "تیور" کا "پیارا" پر قیاس کیوں کر ٹھیک ہو سکتا ہے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ جو تمھارے خیال میں ہے کہ جب "پیارا" "ہارا" کے وزن پر درست ہے تو "تیوری" "چوری" کے وزن پر درست ہونا چاہیے اور دونوں کو ایک قاعدے کے تحت میں ضبط کرنا چاہیے۔ .... یہ خیال میری راے ناقص میں اقرب الی الصواب نہیں ہے۔ اور کچھ "تیوری" ہی پر موقوف نہیں، ڈیوڑھی، چیونٹی، نیولا، نیوتنا، بیورا اور بہت سی اس کی امثال کا یہی حال ہے۔ اگر تم "تیوری" کو چوری کے وزن پر لانا قاعدے کے موافق نہ جانو اور جیسا کہ متقدمین و متاخرین نے استعمال کیا ہے اس کو صحیح مانو تو سر دست تو اس قدر اس لفظ کی تحقیق میں کافی ہے۔

[مکتوب امیر بنام احمد علی شوق - ۲۵ ستمبر ۱۸۹۰ء]

بسیم : ص ۱۲۹

کَفے، قفے، ع میں اِسی طرح [یعنی مع ہاے مختفی] ہے۔ اِس لفظ کے املا اور تلفظ کے سلسلے میں کچھ وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے۔ یہ فارسی کا لفظ ہے۔ برہان قاطع

میں مفردِ الفاظ کے ذیل میں یہ موجود نہیں تھا، اِس لغت کے ایرانی مرتّب ڈاکٹر محمد معین نے حاشیے پر اِس کا اضافہ کیا ہے، مگر یہ صراحت نہیں کی کہ اِس میں ہ مختفی ہے یا ملفوظ۔ البتّہ بہارِ عجم میں اِس کی صراحت ہے: "سہ: بہای ساکن، ترجمۂ ثلاث"۔ "بہ ہاے ساکن" کا واضح طور پر مطلب یہ ہوا کہ ہ ملفوظ ہے، مگر اِس کے مرکّبات [سہ دیگر، سہ گانہ وغیرہ] کے ذیل میں سند کے جو اشعار لکھے گئے ہیں، اُن سب میں یہ لفظ اِس طرح آیا ہے کہ ہ شاملِ تلفّظ نہیں۔

شوق نیموی نے اپنے رسالے ازاحۃ الاغلاط میں لکھا ہے: "سہ بالکسر و خفاے ہا..... و جائیکہ ایں ہاے مختفیہ در تقطیع محسوب شود، باشباعِ سین باید خواند، نہ بہ اظہارِ ہا، چنانکہ دریں شعرِ بدرِ چاچی:

دایۂ مہر و را بہرِ بلوغِ سہ پسر خوابگاہِ چار زن در زیرِ این نہ شوہر است

و آنانکہ از تحقیق بہرہ ندارند، در مثالِ شعرِ بدرِ چاچی "سہ" را بہ اظہارِ ہا خوانند" [ص ۴۶]۔

یہ لفظ ایک زمانے میں زیرِ بحث آچکا ہے۔ وسیم خیرآبادی کے لڑکے اثیم خیرآبادی کے تین استفسار رسالۂ مرقّع [اڈیٹر: وصل بلگرامی] کے شمارۂ فروری سنہ ۱۹۲۶ء میں شائع ہوئے تھے، اُن میں سے ایک استفسار یہ تھا:

"لفظ سہ بہ معنی تین میں ہاے مختفی ہے یا مظہرہ۔ اس کے ہم قافیہ لفظ "دہ" بہ معنی گاؤں، "مہ" [بہ معنی بزرگ و سردارِ قوم] ہیں یا نہیں..... "طمع را سہ حرف است و ہر سہ تہی" اس مصرع میں دوسرا "سہ" قابلِ دریافت ہے، یعنی اِس کا تلفّظ بالکسر بہ اشباعِ حرکت صحیح ہے یا بہ اظہارِ ہاے ہوّز۔ اگر یاے بطنی ہے، تو یہ لفظ "سے" یا "نے" وغیرہ کے ساتھ ہم قافیہ ہوسکتا ہے یا نہیں؟"۔

معروف فاضل مولانا اولادحسین شاداں بلگرامی نے اِس کے جواب میں لکھا تھا:

"اعداد میں ہمیشہ ہاے مظہرہ ہے۔ قاعدہ مقتضی اس کا ہے کہ اس کو حذف نہ کیا جائے، مگر شعرا ہاے مظہرہ کو بھی گرا دیتے ہیں، علی الخصوص اعداد میں۔ عرفی:

بسلکِ یازدہ عقدِ گراں دو لولو زاد علی است ابرِ مطیر و بتول دریا بار

اسی طرح اُردو کے "یہ" اور "وہ" میں ہائے مظہرہ ہے۔ جیسے فارسی میں، جی چاہتا ہے باقی رکھتے ہیں، جی چاہتا ہے حذف کر دیتے ہیں۔ یہی حالت اُردو کی بھی ہے۔ جامی:

نوزدہ حرفست بوقت شمار — فیض رسانندہ بشر دہ ہزار

کبھی ہائے مختفی کو بھی باقی رکھتے ہیں، خاقانی:

آنجا شدہ بیک دم، کز بہر بازگشت — زانجا ہزار سال رہش بود تا جہان

ان استعمالات سے معلوم ہوتا ہے کہ ہائے مظہرہ اور مختفی دونوں کے ایفا و حذف کا اختیار ہے۔ "سہ" میں ہائے مظہرہ ہے، اس کا قافیہ تو "سے" اور "زہے" سے ہو نہیں سکتا، بلکہ ہائے مختفی ماقبل مکسور کا بھی قافیہ "سے" اور "زہے" سے غلط ہے۔"

[یہ پوری بحث رسالہ نقوش (لاہور) کے ادبی معرکے نمبر کی پہلی جلد میں شامل ہے، میں نے اسے وہیں سے نقل کیا ہے]۔

یہ واقعہ ہے کہ بہ لحاظِ اصل اعداد کے آخر میں ہائے ملفوظ ہے؛ مگر یہ بھی واقعہ ہے کہ یازدہ، دوازدہ جیسے اعداد اکثر بغیر اظہارِ ہا نظم میں دیکھے گئے ہیں، "نُہ" اور "دہ" کو بہ طورِ عموم مع اظہارِ ہ دیکھا گیا ہے اور "سہ" کو اکثر بہ اخفائے ہ دیکھا گیا ہے۔ جیسا کہ شادان صاحب نے لکھا ہے، اس میں شاعر کو آزادی حاصل ہے کہ وہ ان لفظوں کو چاہے تو مع ہائے ملفوظ اور چاہے تو مع ہائے مختفی نظم کر سکتا ہے، مگر جہاں تک "سہ" کا تعلق ہے، یہ حقیقت ہے کہ اس کو عموماً بہ اخفائے ہ استعمال کیا گیا ہے اور اُردو میں بھی یہی صورت ہے۔ اس لحاظ سے فصیح صورت یہی ہو گی کہ اسے مع اخفائے ہ استعمال کیا جائے۔ شعرائے اردو کے یہاں عموماً اسی طرح ملتا ہے اور باغ و بہار میں بھی اسی طرح اسے لکھا گیا ہے۔ یہ طویل وضاحت اس لیے کی گئی ہے کہ اس لفظ کے متعلقات طلبہ کے سامنے آجائیں اور وہ اس کے تلفظ اور املا میں اس کا لحاظ رکھیں [یعنی تلفظ میں ہ کی آواز نہیں نکلے گی، "س" کا زیر بس نمایاں رہے گا؛ اور املا میں اس کا لحاظ رکھا جائے گا کہ اسے مع ہائے ملفوظ نہ لکھا جائے، مع ہائے مختفی لکھا جائے اور پوری صورتِ حال کا صحیح طور پر علم بھی ہو]۔

اِستدراک

(۱) ص ۸۰۴ پر "خوش خبری" [بہ سکونِ دوم] کے تحت "خبریں" [بہ فتحِ اوّل و دوم] کی مثال میں محسن کاکوروی کا یہ شعر پیش کیا گیا ہے:

تارِ نظر نے دیں خبریں اضطراب کی
اللہ! خیر ہو دلِ خانہ خراب کی

بعد کو یہ خیال آیا کہ اصولاً اِس سند کو پیش نہیں کیا جا سکتا۔ اِس شعر کا وزن ہے: مفعولُ فاعِ لاتُ مفاعیلُ فاعِلن [بحرِ مضارع مثمن اخرب مکفوف محذوف] اور اِس میں تیسرے رکن پر تسکینِ اوسط کا زحاف آسکتا ہے اور اُس صورت میں پہلے مصرعے کا وزن یوں متعین کیا جائے گا: مفعولُ فاع لاتن مفعولُ فاعلن "اور اِس طرح اِس مصرعے میں "خبریں" [بہ سکونِ دوم] پڑھا جائے گا۔ اِس زحاف کے امکان کے پیشِ نظر اصولاً اِس شعر کو "خبریں" کی سند یا مثال میں پیش نہیں کیا جا سکتا۔

اِسی صفحے پر، اِسی بحث کے سلسلے میں "خوش خبری" (بہ فتحِ با) کی سند میں داغ اور انشا کا ایک ایک شعر نقل کیا گیا ہے۔ اِن اشعار کو بھی اِسی تسکینِ اوسط کے زحاف کے امکان کی بنا پر سند میں پیش نہیں کیا جا سکتا۔

ضمیمہ ۳

الفاظ اور طریقِ استعمال

[اس ضمیمے میں افعال کی مختلف شکلیں، ضرب الامثال، خاص خاص الفاظ اور بہت سے توجہ طلب طریقِ استعمال کی ضروری تفصیلات یک جا کر دی گئی ہیں۔ ص۱۱۰ سے ص۱۲۷ تک مقدمے کے صفحات بھی اس سلسلے میں پیشِ نظر رہنا چاہیے، جہاں تذکیر و تانیث اور بعض دوسری لسانی خصوصیات سے متعلق کچھ تفصیلات پیش کی گئی ہیں]۔

حضور میں اس پری کے گزرانیاں ص۴۰۔

گھوڑوں کی باگیں ڈال دیاں ص۱۹۴۔

یہ باتیں ہوتیاں تھیں ص۱۱۱۔

سب آئیاں ص۱۹۹۔

نذریں… گزرانیں ص۱۶۔

آپس میں بتیاتے ہیں ص۲۰۳۔

سب سرکاروں میں جو تحفہ چاہیتا ص۱۳۷۔

کہا چاہیے ص۱۸، چلا چاہیے ص۱۹۸، حقیقت جانا چاہیے ص۱۹، کیا چاہیے ص۵۵، ص۹۸، کیا چاہتا ہوں ص۷۶، دیکھا چاہیے ص۱۸، ص۷۹، جایا چاہتے ہو ص۷۹، آیا چاہتا ہوں ص۹۴، لکھا چاہوں ص۳، ہوا چاہیے ص۱۴۰۔

آرام دنیا کا جو چاہیے، سب موجود تھا ص۱، چاہیے کہ دن کچھ بھلے آویں ص۷، چاہیے… انسان صبر کرے ص۱۰۳، قدر دانِ منصف چاہیے جو تجویز کرے ص۸، جتنے وصف سرداروں کو چاہییں ص۴۔

تنگیالیں گے ص۱۵۶۔

مسلمان کہاتا ہوں ص۱۳۴۔

مجھے بھی بادشاہ زادی کہوانا ص۹۱۔

چڑھواں جوتا اڑایا ص۷۱۔

شیطان نے ورغلانا (ورغلایا) ص۱۱۲، ورغلاتا ہے (ورغلایا ہے) ص۱۶۴۔

اگر زمین پھاٹے ص۵۷۔

لگ رہیں تھیں ص۴۰، پڑ رہیں تھیں ص۵۵، ہو رہیں تھیں ص۱۰۴، سہیں تھیں ص۱۰۰، کھڑیں تھیں ص۲۰۰، بیٹھیں تھیں ص۸۹، ہوئیں تھیں ص۲۰۳۔

لٹکتیں ہوئیں ص۴۸، چینیں ہوئیں ص۵۵، چینیں گئیں ص۲۰۰۔ باتیں بنائیں مجھے خوش نہیں آتیں ص۳۷۔

رکھتیں ہیں ص۸۹، آتیں ہیں ص۱۲۷، گزرہیں ہیں ص۱۲۲۔

لو لگائے رہیں تھیں ص۹۲۔

ہو تی رہا تھا ص۵۸۔

لشکر دیکھ کر اچنبھے ہو رہا ص۱۳۱۔

مرتبہ سگ کا نگاہ کیا ص۱۳۲۔

خبرگیری میں ضیافت کی لگ رہی ہے ص۳۷۔

قیافہ پہچان جانتے ہو ص۴۲۔

یہ تجویز ٹھہری ص۱۲ ۔
یہ ارادہ رکھتا ہوں ص۱۴ ۔
یقین آیا ص۱۹ ۔
جنس تجارت کی خرید کرو ص۲۴، جنس تجارت کی
خرید کر (خرید لے) ص۱۲۱، دو سانڈنیاں خرید
کیں ص۲۲۹، کپڑا خرید کیا ص۲۲۸، ایک حویلی خرید
کی ص۱۳۷، خرید کرنے کو بھیجا ص۶۰، حضور کی
عنایت سے خرید ہوئی (خریدی گئی) ص۵۴، باغ
اور لونڈی کو خرید کر دیا (خرید لیا) ص۵۵ ۔
مجوز ہوتا تھا (اصرار کرتا تھا) ص۳۷، مجوز ہوا
ص۸۴، ناحق میں مجوز ہوں ص۱۲۹ ۔
جو تجویز کرے (انصاف کرے) ص۸ ۔
خجالت سے مُوا جاتا ہے ص۴۴ ۔
شفق پھولے ہے ص۵۵، پکھیے ہے ص۴۹ ۔
اپنے تئیں تھانبا ص۸۶، تھانبوں ص۱۱۲ ۔
وہ رات تلپھتے کاٹی ص۲۰، گھر میں تلپھے ہے
ص۲۰۴، ساری رات تلپھتے کٹی ص۴۰ ۔
تڑپھے ہے ص۲۰۴، تڑپھتا ہے ص۲۳۰، تڑپھنے
ص۱۸۹، تڑپھ تڑپھ کر ص۲۱۲ ۔
کولھو میں پیڑا جائے گا ص۲۴۴، کولھو میں
پیڑ ڈالے ص۲۰۳ ۔
بنیج بانچ کر ص۲۱۲، بنیج لاؤ ص۹۳، بنیج بنیج کر
ص۱۳۶، چھوتا ص۲۳۸ ۔

گھوڑے کو ٹنگیا کر ص۲۱۵ ۔
سرفراز کر کر ص۶ ۔ ("کر کر" جگہ جگہ آیا ہے،
مقدمے میں اس کی متعدد مثالیں پیش کی گئی ہیں)۔
گفت و شنود کریں ص۴ ۔
نہ مجلس خوشی کی خوش آوے ص۴۸ ۔
میرے گال پر پانچوں انگلیوں کا نشان اُکھڑ
آیا ص۲۱۹ ۔
اُس کی چھاتی پر سانپ پھر گیا ص۲۲۰ ۔
میں سلطنت سے گزرا (مجھے نہیں چاہیے)
ص۲۲۱ ۔
وہ بہن جو بجائے والدہ کے میری خاطر رکھتی تھی
ص۲۲۳ ۔
کب شام ہو جو میرا مطلب تمام ہو (حاصل ہو)
ص۸۸ ۔
تو نے واقعی عشق کی بڑی محنت اُٹھائی ص۱۱۳
ذرا سُرت آئی ص۱۴۵ ۔
ہزار محنت سے وہ کئی منزلیں کاٹ کر (طے
کرکے) ص۲۲۴ ۔
اتنی بات بول کر ص۱۴۰ ۔
وہاں سے لے بھاگ کر ص۲۲۵ ۔
دیکھتے ہی یقین آیا ص۱۹۰ ۔
اس کا بدلا بھی اُتارو گے ص۲۵ ۔
حسن و جمال دیکھ کر مُرجھا گیا (غش آ گیا) ص۱۹۷ ۔

اپنے جینے کا بھروسا بند ہے ص۲۴۴ ۔
جو گزرا تھا، راست کہ سنایا ص۴۲ ۔
اُس کا سخن راست ہوا ص۱۱۹ ۔
کوٹ باندھ بیٹھا ص۱۹۶ ۔
جاں بحق تسلیم ہوئے (مر گئے) ص۲۱۸ ۔
جاں بحق تسلیم ہوا ص۱۸۹ ۔
اندھے نے ایک آہ ماری ص۲۲۹ ۔
سلطنت کو برباد دے ... آپہنچا ہے ص۲۰۹ ۔
سلطنت کی نوبت چھوٹے بھائی پر آئی ص۲۰۴ ۔
کان دھر کر سنو ص۱۰ ۔
اپنی زبان کو لحاظ میں رکھا ہوگا ص۹ ۔
آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا کر چُپکا ہو رہا ص۲۳ ۔
اتنی بات بول کر ص۱۴ ۔
دُکھ دھندے سے چھوٹ جاتے ص۱۵ ۔
لون روٹی میسر آوے ص۴ ۔
نام... زبانوں پر بہ خوبی چلا جائے گا ص۴۹ ۔
سنتے ہی کاٹھ ہو گیا ص۱۴۱ ۔
ایسے اچھے کاموں اور نیک نیتوں کی
برکت سے ص۱۵ ۔
خوشی خاطر شریف کو ہو جاوے ص۱۵ ۔
زمین و آسمان برپا ہیں ص۱۶ ۔
اپنے اپنے پایے اور مرتبے پر آ کر کھڑے
ہوئے ص۱۹ ۔

جب دوپہر ہوئی، برخاست ہو کر اندرونِ محل
داخل ہوئے ص۱۶ ۔
یہ بات دل میں مقرر کر کر (طے کر کے) ص۱۸ ۔
بادشاہ نے یہی مقرر کیا ص۲۰۵، یہ سزا مقرر کی ص۲۳۱ ۔
اُس پہاڑ پر اپنا رہنا مقرر کیا ص۲۰۵ ۔
ایک مکان میرے رہنے کو مقرر کیا ص۲۳ ۔
ایک حویلی خرید کر کے بود و باش مقرر کی ص۱۵۲ ۔
اپنے دل میں مقرر یہ سمجھا (یقیناً) ص۲۲۱ ۔
اُس دن سے بادشاہ نے یہی مقرر کیا ص۱۶ ۔
جب یہ نصیحت کتاب میں مطالعہ کی ص۱۷ ۔
اُس کے آنے کی آہٹ کی خبر نہ ہوئی ص۱۹ ۔
چراغ کو اُکسایا ص۱۹ ۔
ڈاڑھ مار کر رویا ص۱۳ ۔
تم اپنے جوگا کام کرو ص۱۵ ۔
حیران ہو کر (پریشان ہو کر، شکست کھا کر)
ص۷ ۔
رعیت کو حیران پریشان کیا ص۱۴۳ ۔
آپ کی فکر سے سب حیران پریشان ہو رہے
ہیں ص۱۶ ۔
اس حیرانی و مفلسی کے بدلے ص۲۴ ۔
حیرانی و پریشانی سہتا ہوا ص۲۲۹ ۔
اسی واسطے دل حیران اور خاطر پریشان تھا ص۵۴ ۔
نوبتیں جھڑنے لگیں ص۱۴۰ ۔

نیند ٹوٹ گئی ص۲۳۵ ۔
کیا کیا ہرج مرج اُٹھایا ص۲۳۶ ۔
یہ تعجبات سُن کر ص۲۴۱ ۔
تو بوڑھا آڑھا ہو ص۲۴۲ ۔
دوڑتا دھوپتا ساتھ ہولیا ص۹۸ ۔
نہایت ادب سے نہڑ کر سلام کیا ص۹۸ ۔
پیٹ غم غصہ کھا کر ص۲۴۶ ۔
کہنا شروع کیا تھا (لکھنا) ص۲۴۹ ۔
قفل کر دیا ص۱۴۴ ۔
میرا قصہ بہت دور دراز ہے ص۲۰۵ ۔
اُن کے گھر میں دو لڑکے پیدا ہوئے : ایک تو
یہی فقیر... دوسری ایک بہن ("لڑکے" بہ معنی
اولاد) ص۲۰۵ ۔
مسلمانوں کا عمل ہوا (حکومت ہوئی) ص۷ ۔
ہم چار صورتیں (شخص) ص۲۰ ۔
چاروں صورتوں کو طلب فرمایا ہے ص۱۱۴ ۔
ایک گت رہیں ص۲۰ ۔
والد اس عاجز کا ص۲۰ ۔
وہ عزیز تبسم کر کے بولا ص۱۸۸ ۔
میری خاطر رکھتی تھی ص۲۳ ۔
خدا کے توکل پر بھروسا کر کے ص۲۵ ۔
فقیر اُس کو دیکھ کر خوش ہوا ص۲۶ ، ص۸۹ ۔
ہر ایک آدمی اور دکان دار سے حویلی کرایے کی تلاش
کرنے لگا ص۲۵ ۔
مجھے بھی باعث ہوا (مجھ سے بھی کہا) ص۲۰۶ ۔
تم سلطنت سے کنارہ پکڑتا ص۲۱۸ ۔
ایسا جواہر کبھو نہ دیکھا تھا ص۱۱۶ ۔
خوشی ہوئے ص۱۱۴ ۔
آپس میں بغل گیری ہوئی ص۱۲۳ ۔
کھانے میں ہاتھ ڈالا ص۱۲۵ ، ص۱۱۴ ۔
اُس کے ہاتھ پانو پڑی ص۱۲۱ ۔
برائے خود ایک لشکر ہو گیا ص۱۲۹ ۔
وہی غضب ہوا ہے ، وہی مہربان ہوگا ص۱۲۰ ۔
سردار اگر کسو پر غضب ہوں ص۱۱۹ ۔
بارہ دانے لعل کے پٹے میں نصب کر کر ص۱۱۸ ۔
کئی دن میں غصہ جاتا رہے گا (چند روز میں)
ص۱۱۹ ۔
سر کھلے، پانو ننگے ... گھر میں گئی ص۱۲۰ ۔
یہ بپتا بیتی ہے ص۱۲۰ ، ص۱۴۹ ۔
مشکل کسو کی اٹکی نہیں رکھتا ص۱۲۰ ۔
وقت صبح کا شروع ہونے پر آیا ص۱۱۴ ۔
چاروں درویش آپس میں ایک ایک کو تکنے لگا ص۱۱۴ ۔
لاچار ہو کر ہونٹھ چاٹنے لگا (افسوس کرنے لگا) ص۱۲۵ ۔
جتنے تجار تھے ص۱۲۹ ۔
سوداگر بچے کو اچنبھا آیا ص۱۲۲ ۔
مجھ کو خفگی آئی ص۱۳۲ ۔

تعجب آیا ص۱۳۲ ، مجھے تعجب آیا ص۲۲۶ ۔
بے سبب دانت کھولنے ادب سے باہر ہیں ص۱۳۲ ۔
جب تجہیز و تکفین سے فراغت ہوئی اور پھول
اُٹھ چکے ص۱۳۵ ۔
ایک بات مُنہ پر نہ رکھی (نہ کہی) ص۱۴۰ ۔
یہ ارادہ رکھتی ہوں ص۱۲۱ ۔
دوستی کا بھر وسا رکھتے ہو ص۱۵۴ ۔
ایک گرہست اُس موضع کا ص۱۴۰ ۔
جوں توں اپنے تئیں خشکی میں ڈالا ص۱۴۲ ۔
رات کو وہاں گزر رہا ص۱۴۲ ۔
اپنے تئیں نیشاپور پہنچایا ص۱۹۱ ۔
خوب پیٹ بھر کر سویا ص۱۹۴ ۔
اُس پاس سے جاؤ ص۲۰ ۔
جوہری پاس گیا ص۳۵ ۔
تمھیں بڑا حِس ہوگا ص۲۸ ۔
فقیر اُس کے حکم میں حاضر رہتا ص۲۹ ۔
رد کھے پھیکے ہو کر کہا ص۳۲ ۔
وہاں سے اُٹھنا انسانیت کے مناسب نہ جانا
ص۳۲ ۔
مجلس خوشی کی جا کر ص۳۲ ۔
فرش ستھرا بچھا تھا ص۳۳ ۔
فقیر سے صحبت بہت گرم کر ، مزے کی باتیں
کرنے لگا ص۳۳ ۔

اب ہمارے تمھارے دوستی جانی ہوئی ص۲۳۳ ۔
اپنے قدیمی کپڑے پہن لیے ص۲۴۲ ۔
تمھارا فرمانا میں تو سر آنکھوں سے بجالایا ص۲۴۵ ۔
سوائے میرے کوئی فرزند نہ رکھتے تھے ص۱۹۴ ۔
قدم قدم سیر کرتے ہوئے چلے جاتے تھے ص۱۹۴ ۔
خاطر جمع سے چرتا پھرتا ہے ص۱۹۵ ۔
میں بہ خاطر جمع ... کرتا ہوں ص۲۰۶ ۔
جو میری خاطر جمع ہو ص۲۲۱ ۔
میری بہت خاطر جمع کی ص۲۲۱ ۔
بہ خوشی و خاطر جمعی ص۲۲۹ ۔
سلطنت تو بہ خاطر جمع کرے ص۲۲۳ ۔
بہ خاطر جمع چلے جاتے تھے ص۱۶۴ ۔
اگرچہ خاطر جمع ہوئی ص۲۱۰ ۔
اپنی دل جمعی کر کے ص۲۲۴ ۔
وہ ہرن تو نظروں سے چھلاوا ہو گیا ص۱۹۵ ۔
خدا اُس کو میرا سا دُکھیا بناوے ص۱۹۶ ۔
ایک بزرگ ریش سفید بیٹھا ہے ص۱۹۶ ۔
اگر ان جان میں یہ حرکت ہوئی ص۱۹۶ ۔
چاروں طرف بھیانک ہو کر دیکھنے لگا ص۱۹۶ ۔
عورت برس چودہ ایک کی ص۱۹۶ ۔
میں اُس نازنین کا حُسن و جمال دیکھ کر مُرجھا گیا
(بے ہوش ہو گیا) ص۱۹۶ ۔
شہر میں ڈیرا کیا ص۱۹۹ ۔

عجائب گل بوٹے ص۱۹۹ ۔

سب جنس لائق پسند کے تھی ص۲۰۰ ۔

جب پرچا ہوا ص۲۰۱ ۔

پرچا ہونے لگا ص۹۳ ۔

میری تعلیم کی خاطر چشم نمائی کرتے ہیں ص۱۳۶ ۔

سب سیاستیں سہتا ص۱۳۵ ۔

قلمدان یاد فرمایا ص۲۰۱ ۔

سلطنت کی نوبت چھوٹے بھائی پر آئی ص۲۰۴ ۔

چوکی گاڑھی چاروں طرف باغ کے رکھی ہے

ص۲۰۴ ۔

یہ خبر بجنسہٖ بادشاہ کو پہنچائی ص۲۰۴ ۔

دل کا مدعا بجنسہٖ پایا ص۲۱۲ ۔

اُس کو بجنس، احتیاط سے جلد اُٹھا کر لے

آؤ ص۲۴۵ ۔

تیر... دوسار ہو گیا ص۲۰۵ ۔

شیر کی مانند گونجتا ص۲۰۶ ۔

شیر کی مانند گونج کر ص۲۱۵ ۔

فاتحہ پڑھیں ص۲۰۹ ۔

خوبیاں اور محبوبیاں ص۲۰۹ ۔

منادی پھرنے لگی ص۲۱۱ ۔

مجھے جو کم بختی لگی ص۲۱۲ ۔

کماؤ کی پگڑی قائم رہے ص۲۱۲ ۔

اگر یہاں دل برداشتہ ہوا ہو ص۲۱۴ ۔

اُن کی بھی لڑائی جوان نے مار دی (جیت لی)

ص۲۱۵ ۔

بخوبی تربیت ہوا ص۲۱۵ ۔

والد مرحوم کی خدمت میں تربیت ہوا تھا ص۲۱۹ ۔

قاعدے اور قانون سلطنت کے تربیت کرنے

کے واسطے ص۹۸ ۔

یہ حادثہ زد بہ کار ہوا ص۲۱۸ ۔

جوان ہوا اور شعور سنبھالے ص۲۱۸ ۔

اُس کی چھاتی پر سانپ پھر گیا ص۲۲۰ ۔

میں سلطنت سے گزرا، کسو طرح میرا جگا سبچے

ص۲۲۱ ۔

اِس بات سے کوئی دوسرا مطلع نہ تھا ص۲۲۱ ۔

جواب میری اِس بات کا مسکرا کر فرمایا ص۲۲۱ ۔

اِتنی محنت کچھ نیک نہ لگی ص۲۲۱ ۔

ہماری محنت نیک لگی ص۲۳۶ ۔

غالب ہے کہ وہ ایک لوزنہ مجھے دے ص۲۲۳ ۔

غالب ہے کہ تمہیں کو بخش دے ص۲۳۷ ۔

وے تحفے لے کر ص۲۲۴ ۔

روشنی قرینے سے روشن ہے ص۲۲۴ ۔

تامقدور کسو طرح کی ہم سے کمی نہ ہوگی اور

درگذر نہ کروں گا ص۲۲۵ ۔

اُس کی نعت کہوں ص۲۲ ۔

میں رئیس اور اکابر اِس شہر کا ہوں ص۲۲۹ ۔

بدلی گھمنڈ رہی تھی ص۵۵ ۔
ہوا نرم نرم بہتی تھی ص۵۵ ۔
پھوہیاں پڑ رہی تھیں ص۵۵ ۔
دن ہو چکا ص۵۶ ۔
یہ تحفہ علت کون ہے ص۵۷ ۔
یہ ارادہ جی میں ٹھہرا کر ص۵۸ ۔
ہم نے تو تجھ سے جان تلک بھی درگذر نہ کی
ص۵۹ ۔
اور میری طرف سے مطلق دھڑکا جی سے اٹھا دیا
ص۵۸ ۔
رہا سہا ہوش جو تھا، وہ بھی گم ہوا ص۵۸ ۔
وہ شراب بوند کی لوند تھی ص۵۷ ۔
نہ جانے کی فرصت پاتی تھی اور نہ بیٹھنے کو جی
چاہتا تھا ص۵۷ ۔
اُس کے چنگے ہونے کی دعا مانگتا ص۲۸ ۔
اِس جوان کو جلد چنگا کر کے غسل شفا کا دے
ص۲۰ ۔
اب چنگا ہو جاوے گا ص۱۵۸ ۔
ہرگز آنکھ نہ جھپکی (ذرا بھی) ص۱۶۰ ۔
ہرگز اُس کو ہوا نہیں لگتی ص۱۹ ۔
ہرگز کسو نے دریافت نہ کیا ص۱۹۶ ۔
ہرگز رحم نہ کھایا ص۱۴۳ ۔
مَیں سر مو تفاوت کہتا ہوں (جھوٹ) ص۱۴۴ ۔

آپ سے آپ مارے بھوکوں کے بے آب و
دانہ مر جاوے ص۱۴۵ ۔
اُس کا نام زندانِ سلیمان کہتے تھے ص۱۴۵ ۔
ذرا سرت آئی ص۱۴۵ ۔
یہ بات گپت رکھی ۔
جب بہت بیاکل ہوئی ص۱۴۵ ۔
بہت دن اس عشق مشک میں کٹے ص۱۴۵ ۔
میرے تئیں بھی سکھاؤ ص۱۵۲ ۔
تجارت کا ٹھاٹھ پھیلایا ص۱۵۳ ۔
شاید غیرت کو کام فرمایا ص۱۵۴ ۔
میں یوں کرنے کو بیٹھا ص۱۵۵ ۔
لہو اتنا بدن سے گیا (نکلا) ص۱۵۶ ۔
کہانی انوٹھی کہہ کر ص۱۵۹ ۔
ملکہ نے ہاتھ مجھ پر جھاڑا ص۱۶۱ ۔
تم سار کا محبوب ص۱۶۲ ۔
تین درویش تجھ سار کے ص۶۶ ۔
وہ کافر مجھ سے ملے (مباشرت کرے) ص۱۶۲ ۔
یہی صلاح مقرر ہوئی ص۱۶۴ ۔
جب صبح خوب روشن ہوئی ص۱۶۴ ۔
عورتوں کا سا لباس بنا کر ص۱۶۷ ۔
تدبیر دل میں سوجھی ہے ص۱۶۸ ۔
سر سے پانو تلک رعشہ ہو گیا (کانپنے لگا) ص۱۷۳ ۔
جو بال باندھی کوڑی ماریں ص۱۷۴ ۔

دوستی اور آمد و رفت پیدا کی تھی ص۲۲۲ ۔
ڈھونڈھ ڈھانڈھ کر پیدا کر دو ص۲۲۸ ۔
جہاں سے ہاتھ آوے، پیدا کریں ص۲۱۱ ۔
تلاش کر کے، میری خاطر پیدا کر کے لا ص۲۲۶ ۔
رو پیٹ کر تجہیز و تکفین کیا ص۲۲۵ ۔
حکم کیا ص۲۱ ۔
میں نے حکم کیا ص۱۵۵ ۔
مجھے حکم کیا ص۲۱۹ ۔
مجھے کہا ص۲۲۱ ۔
کل تمھیں کہ دوں گی ص۸۳ ۔
البتہ آویں گے (ضرور) ص۹۵ ۔
بادشاہ کو اور بھی حیرت نے لیا ص۹۵ ۔
اپنا خون ناحق میری گردن پر چڑھاتا ہے ص۹۹ ۔
کیا جان بھاری پڑتی ہے ص۹۹ ۔
وہ اندر بیٹھا ص۹۹ ۔
دریا میں بیٹھا ص۲۱۶ ۔
میں نے دل چلا کر کہا ص۱۰۱ ۔
زندگی سے بہ تنگ آیا ہوں ص۲۰۰ ۔
موافقت آنی مشکل ہے ص۱۱۱ ۔
جیدھر تیدھر بھاگی ص۲۳۱ ۔
جیدھر سے آیا تھا، اودھر کو چلا ص۸۵ ۔
زور ظلم ان پر نہ کرو ص۲۳۱ ۔

خوف سے غش میں آ گئی ص۲۳۲ ۔
جب تلک نتھنوں میں دم ہے (زندہ ہوں) ص۹۱ ۔
بہ مجرد اس مکان میں جاتے ہی بھیچک رہ گیا ص۸۹ ۔
جو میرا مطلب تمام ہو (حاصل ہو) ص۸۸ ۔
کلیجا تھلکنے لگا ص۸۶ ۔
اس کے تحقیق کرنے کی خاطر دو دلی ہو رہی ہے ص۸۵ ۔
تجھے بے خرچ اور دو دلا دیکھ کر ص۵۹ ۔
یہ تعجب دیکھ کر (عجیب واقعہ) ص۸۵ ۔
اس ماجرے کی حقیقت ص۸۵ ۔
میں شرم کھا کر چپ ہو رہا ص۸۲ ۔
دست بہ سر ہوا (سلام کیا) ص۸۲ ۔
مختار کار اور دیرینہ سمجھ کر ص۸۲ ۔
تم مالک مختار ہو ص۸۱ ۔
تفنن کی خاطر میوے کھلائے ص۸۰ ۔
جب دن ہو چکا، شام کی نمود ہوئی ص۵۶ ۔
جواہر میں جڑی اور عہدے لیے کھڑی ہیں ص۸۶ ۔
کئی خدمت گار معقول عہدے لیے ہوئے ص۸۰ ۔
یہاں تلک آنا اور محنت اٹھانا ص۸۲ ۔
اگر تجھے آرزو کمال ہے ص۸۸ ۔
اس کو حاتم کے ساتھ دشمنی کمال ہوئی ص۶۹ ۔

کمال شوق ہوا ص۵۲ ۔
اُس کا چہرہ تغیر ہو گیا ص۱۰ ۔
مجھے اس خدمت سے تغیر کر کر ص۸۰ ۔
چوتھے روز میں نے رخصت مانگی ص۷۹ ۔
تو اب مزید کرو (دسترخوان بڑھاؤ) ص۸۲ ۔
اس گم نام کا نام بیدار بخت کہتے ہیں ص۸۲ ۔
آج کے دن بھی مقام کر ص۸۸ ۔
جا کر مقام کرتا ص۷۶ ۔
فقیری بھیس کر ص۷۶ ۔
اب حیا و شرم پکڑ اور صبر و قناعت کو کام فرما
ص۷۵ ۔
گیروا بستر پہن ص۷۶ ۔
جب ایسے ہو، تب ایسے ہو ص۷۳ ۔
جتنے جھوٹھ دعوے کرتے تھے (جھوٹے)
ص۷۴ ۔
اس ردّ و بدل کے سوال جواب میں ص۷۱ ۔
اس دُکھ دھندے سے چھوٹ جاتے ص۷۰ ۔
آب و ہوا وہاں کی خوش ص۹۸ ۔
بادشاہ سے بھی روشناس اور جان پہچان ہو
ص۹۸ ۔
سارا جہاں روند مارا ص۹۹ ۔
سُرت جاتی رہی ص۹۵ ۔
اس سے ایسی حرکت واقع ہوئی ص۹۲ ۔

اسباب گزارے کا (دریا پار کرنے کا) ص۹۴ ۔
اُس وقت میں ص۲ ۔

ادسی چوکی ڈومنی گاوے تال بے تال ص۵۸ ۔
اونٹ چڑھے کتّا کاٹے ص۵۵ ۔
اونٹ کے گلے میں بلّی ص۵۴ ۔
پیٹ کی پیٹ رہے اور چیت کا پیٹ ہاتھ
لگے ص۲۲۶ ۔
آدمی کا شیطان آدمی ہے ص۲۲ ۔
جب بیل پھوٹی، رائی رائی ہو گئی ص۲۱۵ ۔
جس کی نہ پھٹی ہو بوائی، کیا جانے پیر پرائی
ص۱۰۱ ۔
دھوبی کا کتّا نہ گھر کا نہ گھاٹ کا ص۴۳ ۔
سارے ڈیل میں زبان حلال ہے ص۴۲ ۔
صورت نہ شکل، چولھے میں سے نکل ص۵۹ ۔
کس برتے پر تتّا پانی ص۴۶ ۔
گھر میں رہے نہ تیرتھ گئے، مونڈ منڈا فضیحت
بھئے ص۱۹۲ ۔
سر سے سر واہ ص۲۱۵ ۔

خانہ زادِ موروثی ص۲ ص۱۳ ۔

ٹھپپ ص۲۰ ۔
شدّت (مصیبت) ص۲۰ ۔
اے یاراں ص۲۰ ۔
خوشامد برآمد ص۲۳۴ ۔
چاڈچوز ص۲۱ ۔
روزنامہ (روزنامچہ) ص۲۱ ۔
بوڑھا بڑا ص۲۱ ۔
دیدارو (خوب صورت) ص۲۲ ۔
بچھا نکڑسے ص۲۲ ۔
گلِ گلاب ص۲۲ ، شرابِ گلِ گلاب ص۱۰۳ ۔
آہستے سے ص۲۶ ۔
کئی مرتبے ص۲۰۴ ۔
ورخرچی ص۲۲ ۔
راہ باٹ ص۲۲ ۔
فاقے کراکے ص۲۳ ۔
خاصی پوشاک ص۲۳ ، ص۴۵ ۔
موئی سٹی کی نشانی ص۲۴ ۔
طعنہ جہنا ص۲۴ ۔
سرسے پاو (خلعت) ص۲۵ ، ص۱۲۴ ، ص۲۳۶ ۔
خاص دان (ناشتے دان) ص۲۵ ۔
کاریگر (ماہر) ص۲۶ ۔
قبیلہ (بیوی) ص۲۷ ، ص۱۲۰ ، ص۱۴۸ ۔
کچھ رقم جواہر کے ص۳۱ ۔

جوانِ شکیل ص۳۱ ، ص۷۷ ۔
بنگلہ ص۳۳ ۔
مہمانی (دعوت) ص۳۴ ، مہمانیاں ص۳۵ ۔
بجد ہونا ص۳۰ ، ص۳۵ ، ص۷۹ ، ص۲۲۴ ۔
غصے بردار ص۳۵ ۔
خوزادی ص۳۶ ۔
تہ پوشی ص۳۹ ۔
بچھا ہند سے چوچلے ص۴۴ ۔
امراؤں ص۹ ، ص۱۴ ، سلاطینوں ص۴۸ ، ص۱۱۸ ۔
مزاج ص۴۹ ، مزاجیں ص۲۲۴ ۔
بھیدو ص۵۱ ۔
تدان ص۵۲ ۔
سہی سانجھ ص۵۲ ۔
بیت کہاو ص۵۴ ، ص۲۳۸ ۔
گائن ص۵۴ ، گائنیں ص۸۹ ۔
ملین ص۵۴ ، ص۲۱۳ ۔
حاضری (کھانا) ص۱۹۴ ، ص۱۵۵ ۔
نخرے تلے ص۵۸ ۔
چچلا پند ھالکر ص۵۸ ۔
کگر ص۵۸ ۔
بے خرچ ص۵۹ ۔
والدہ شریفہ ص۶۰ ۔
ملک گیری (ملک کا انتظام) ص۶۱ ۔

ناشتا کر کے ص۹۳، ناشتا کیا ص۱۰۷ ۔
کدھو ص۹۴، ص۹۵ ۔
چکمک (چقماق) ص۹۴ ۔
اَن جیت ص۹۴، ص۱۱۱ ۔
جیب تیتن (جیب تک) ص۹۵ ۔
کپڑے و پڑے ص۹۵ ۔
محنت (مصیبت) ص۹۶، ص۸۷ ۔
ہزار محنت سے ص۲۳ ۔
چار زانو ص۹۸ ۔
تواریخ داں ص۹۹ ۔
جیبھ ص۷۲ ۔
مردآدمیت ص۷۳ ۔
جن نے ص۷۳، اُن نے ص۷۴ ۔
دُھر (دھار) ص۷۶ ۔
سوں (قسم) ص۸۲ ۔
پرواہ ص۲۲۱، ص۲۳۴، بے پرواہی ص۸۰ ۔
بندی (بیٹی) ص۸۰ ۔
مہربانگی ص۲۲۴، ص۲۴۲، ص۱۸۱ ۔
رنجیدگی ص۱۵۳ ۔
گپ (گوی) ص۸۱ ۔
یتیم (غلام) ص۸۵، ص۱۲۱ ۔
شمیانہ ص۸۸ ۔
جوڑا کھوڑا ص۹۱ ۔

بھونی ص۹۱ ۔
کچکول ص۹۲ ۔
رسیلی ص۹۳ ۔
کارخانہ جات ص۹۴ ۔
محلات ص۹۴ ۔
دولتِ خداداد ص۹۶ ۔
ہزاری بزاری ص۹۶، ص۲۴۱ ۔
گنبذ ص۱۰۳، ص۱۹۵ ۔
برسویں دن ص۱۰۶ ۔
بیمارداری ص۸۰، ص۲۳۴ ۔
بعضی بعضی باتیں ص۸۷ ۔
تر و تازگی ص۱۴۱ ۔
نکمی بات چیت ص۱۴۲ ۔
پنڈت خانہ (قیدخانہ) ص۱۱۹، ص۱۲۰، ص۱۳۰،
ص۱۴۴، ص۱۹۲ ۔
محبوس خانہ ص۱۱۹ ۔
بندی خانہ ص۱۱۹، ص۱۴۴، بندی وان ص۱۴۴ ۔
گذری (عام بازار کے معنی ہیں) ص۱۲۳ ۔
تنتری ص۱۳۰ ۔
شتا ہو ص۱۳۰ ۔
بھائی چاری ص۱۳۵ ۔
مانجھ دھار ۔
لڑھتا پڑھتا ص۱۴۸ ۔

فرہنگ

آب دار (۸۷): وہ شخص، بادشاہوں یا امیروں کے یہاں پینے کے پانی سے متعلق جملہ سامان رکھنے اور پانی پلانے کی خدمت جس کے سپرد ہوتی تھی۔

آب دار خانہ (۳۹): وہ جگہ جہاں پینے کا پانی اور اُس سے متعلق سامان رکھا جاتا ہو۔ بادشاہوں یا امیروں کے یہاں اِس کا اہتمام خاص طور پر ہوتا تھا۔

آبِ رواں (۲۴۱): ایک قسم کی نہایت عمدہ باریک (سفید) ململ۔

آبشورہ (۸۷): پکّی املی یا اچور اور ہڑ کو پانی میں بھگو کر، نتھار کر اور ضرورت کے مطابق زیرہ، سونٹھ (وغیرہ) مسالے ملاکر بنالیا جاتا ہے۔ (ہاضمہ درست رکھنے کے لیے سہ پہر کے ناشتے یا کھانے کے بعد پیا جاتا ہے۔ چوں کہ اِس کے مسالوں میں سونٹھ اور زیرہ مقدار میں دوسرے مسالوں سے زیادہ ہوتا ہے، اِس لیے اِس کو جل زیرا (جلجیرا) اور جل سونٹھ بھی کہا جاتا ہے۔ اِس کا ایک نام گھنٹو مر بھی ہے۔

آب و دانہ (۶): دانہ پانی، مراد ہوتی ہے روزی، رزق۔

آپنا کے دروجے (۹۲): محبّت سے مجبور ہوکر، دلی محبّت کے سبب سے۔

آخر نقش (۴۵): آخر کار۔

آدمی کا شیطان آدمی ہے (۲۲): آدمی کو آدمی ہی بہکاتا ہے۔

آذر بایجان (۱۷۸): [آذربیجان، آذربایگان] ایران کا بہت مشہور علاقہ۔ یہ علاقہ دو حصّوں میں تقسیم ہوگیا ہے۔ ایک حصّہ روسی حکومت میں شامل کرلیا گیا تھا اور ایک حصّہ ایرانی سلطنت میں شامل ہے۔ ایرانی صوبۂ آذر بایجان کے مشہور شہر تبریز، آردبیل، مراغہ ہیں (دائرۂ معارفِ اسلامیہ۔ لاہور۔ جلد اوّل)۔

آرزو کمال ہے (۸۸): بہت آرزو ہے۔

آڑھا (۲۴۲): دیکھیے بوڑھا آڑھا۔

آزر (۱۹۷): حضرت ابراہیمؑ کے والد یا چچا کا نام، جو مشہور بُت تراش تھے۔

آزوقہ (۱۴۶): تھوڑی سی غذا، تھوڑا سا کھانا۔ ص ۱۵۱ پر یہ مطلق "خوراک" کے معنی میں آیا ہے: "آٹھ دن کا آزوقہ دیے جاتی ہوں"؛ یعنی آٹھ دن کے کھانے کا سامان دیے جاتی ہوں۔ اِسی طرح ص ۱۸۶، ۱۸۸، ۱۸۹ پر بھی یہ اِسی مفہوم میں آیا ہے۔

استریون (دیکھیے ص ۶۸۳)

آسن (۱۰۶، ۱۰۸): وہ جگہ جہاں جوگی یا فقیر رہتے ہیں، آستھان۔ (آصفیہ)۔

آشنائی کی راہ سے (۲۲۴): دوستی کے طور پر، دوستوں کی طرح۔

آفتاب دو نیزے بلند ہوا (۳۹): سورج دو نیزے بھر اونچا ہوا، یعنی دن چڑھ گیا، دھوپ خوب پھیل گئی۔

آفتابہ (۷۸، ۸۶، ۱۰۰): وہ بڑا لوٹا (جو عموماً تانبے کا ہوتا تھا) جس میں پکڑنے کے لیے (ایک طرف یا دونوں طرف) لمبی سی دستی لگی ہوتی تھی اور اُس کے مُنہ پر سرپوش (ڈھکّن) بھی ہوتا تھا۔ اِس میں گرم پانی رکھا جاتا تھا ہاتھ مُنہ دُھلانے کے لیے۔ اِس کی گردن لمبی سی ہوتی تھی۔ (اِسے ایک طرح سے جگ اور صراحی کا مجموعہ کہیے)۔

آگے (۱۰): اب سے پہلے، پچھلے زمانے میں۔

آگے ہی (۹۸): پہلے ہی۔

آگیا (۱۵۰): حکم۔

آلت (۱۸۳): مرد کا عضوِ تناسُل۔

آلتمغا (۲۴۱): انعام میں دی گئی یا بخشی گئی جاگیر، نیز اُس جاگیر کی سند کا کاغذ۔ [یہ تُرکی لفظ ہے اور ترکی میں شاہی مُہر کو کہتے ہیں۔ ہندستانی بادشاہو کے دفتروں میں آلتمغا کے معنی ہیں ایسی جاگیر بخشنا جو اُس کے بعد اُس کی اولاد کو ملے (مغلوں کے قانون کے مطابق منصب دار کے مرنے پر اُس کا سارا اثاثہ وغیرہ بہ حقِ سلطنت ضبط ہو جایا کرتا تھا) اُس جاگیر کو بھی کہتے ہیں جو انعام کے طور پر بخشی جائے]

(بہارِ عجم)

آمد (۸۷): آمدنی۔

آمنّا (۳۸): بجا ہے، درست ہے۔ (لفظی معنی: ہم ایمان لائے)۔

آنا کانی دینا (۹۹): جان کر اَن جان بننا۔

آنچل پلّو (۴۱): آنچل: دوپٹّے کے عرض کا کنارہ، اِس کے کونوں پر عموماً ترنج بنا دیے جاتے تھے۔ پلّو: آنچل کے آگے، یا دلے کا بنا ہوا تقریباً آدھ گز چوڑا حاشیہ۔

(آصفیہ)

آنکھیں پتھرا جانا (۹۲): آنکھوں کا بے حس و حرکت ہو جانا، بے نور ہو جانا۔

آنکھیں کھُل گئیں (۲۱): حیران رہ گیا، [بے شمار دولت دیکھ کر اِس قدر خوشی ملی ہوئی حیرت ہوئی کہ تعجب میں پڑ گیا، دیکھتا رہ گیا]۔

آنول نال (۹): جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو اُس کی ناف، انتڑی کی طرح بڑھی ہوئی ہوتی ہے، دائی اُسے اُسی وقت کاٹ ڈالتی ہے۔ اُس کے اخیر میں ایک ٹکیا بھی لگی ہوئی ہوتی ہے۔ اِس کل ہیئتِ مجموعی کا نام "آنول نال" ہے۔ اِسے کاٹ کر زمین میں دبا دیتے ہیں (آصفیہ)۔ "کٹا ہوا نال تو ضرور ہی گھر میں گاڑا جاتا ہے مگر جس عورت کے بچے نہیں جیتے، وہ گھر کے باہر بھی دبوا دیتی ہے۔"

(رسومِ دہلی)

آنول نال وہیں گڑا ہے (۹): "جب کہتے ہیں کہ فلاں شخص کا آنول نال وہاں گڑا ہے، تو اُس سے یہی مراد ہوتی ہے کہ وہ اُس کا مقامِ پیدائش ہے،

جس نے اُسے فطرتاً محبت اور لگاو ہے۔" (آصفیہ)

آواگون (۱۸۷) : مرکر پھر جنم لینا، مرنے کے بعد کسی دوسری جون (شکل، صورت) میں پھر پیدا ہونا۔ بار بار جنم لینا۔ تناسخ ۔

آویزہ (۹۹) : دراصل کان کا زیور ہے، مگر یہاں مراد ہے کسی ایسے جواہر سے جو خنجر میں لگا ہوا ہو (جڑا ہوا نہ ہو) اُسی طرح جس طرح بُندے میں نیچے کے رُخ صراحی نما موتی یا کوئی قیمتی پتھر (مثلاً زمرد) لگا ہوتا ہے اور ہلکی سی جنبش سے حرکت کرتا ہے۔ (اسی کی نسبت سے اِس قماش کے بُندے کو آویزہ کہا جاتا ہے)۔

آئین (۱۳۳) : قاعدہ، طریقہ، روش، مشرب۔

آئینہ بندی (۲۴۸) : مراد ہے شہر کو آراستہ کرتے ہے۔

ابراہیم اَدہَم (۲۰۹) : بلخ کے رہنے والے مشہور صوفی اور باعمل زاہد تھے۔ ۱۶۰ھ اور ۱۶۶ھ کے درمیان کسی وقت وفات ہوئی [دائرۂ معارفِ اسلامیہ۔ لاہور۔ جلد اوّل]۔ آپ کے متعلق یہ روایت مشہور ہے کہ آپ بادشاہ تھے، پھر خدا کی محبت ایسی غالب ہوئی کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر فقیری اختیار کی۔ باغ و بہار میں اِس مقام پر آپ کا ذکر اسی نسبت کے ساتھ آیا ہے [مگر واقعہ یہ ہے کہ محض افسانہ ہے۔ آپ شروع ہی سے متوکل، زاہد اور صوفی تھے]۔

ابوجہل (۲۲۳) : مراد ہوتی ہے سخت بے رحم، دشمن اور حاسد سے۔ [ابوجہل: رسول اللہؐ کے زمانے میں مکّے کا ایک مشہور کافر، جس کا نام عَمر بن ہشام تھا۔ اِسے رسول اللہؐ کے ساتھ بہت زیادہ عداوت تھی اور اِس کی جہالت اِس درجہ بڑھی ہوئی تھی کہ آپ نے اِس کو "ابوجہل" فرمایا۔ یہ کنیت نام کی جگہ مشہور ہو گئی۔ (امیر اللغات)]

ابھی دِلّی دور ہے (۷۵) : اُس مقام پر بولتے ہیں جہاں یہ کہنا ہوتا ہے کہ ابھی کسی کام کے ہونے میں بہت زمانہ باقی ہے، ابھی مقصد پورا ہوتا نظر نہیں آتا۔

اُپرالا کرنا (۱۳۰) : مدد کرنا۔ [اُپرالا کرنا: مدد کرنا، طرف داری کرنا، حفاظت کرنا۔ (پلیٹس)]۔

اپنے تئیں : اِس کتاب میں یہ لفظ "مجھے" اور "اپنے آپ کو" کے مفہوم میں متعدد مقامات پر آیا ہے۔ جیسے: "اپنے تئیں سب سے بہتر سمجھتا ہے" (ص ۸) یعنی اپنے آپ کو سب سے اچھا سمجھتا ہے۔ "اگر آج اپنے تئیں مقدور ہوتا" (ص ۳۵) یعنی اگر آج مجھے مقدور ہوتا۔

اُتارا (۸۶) : مجمع، جمگھٹ۔

اَتالیق (۹۰) : وہ اُستاد جس کو اُمرا کے بچّوں کو پڑھانے اور آداب سکھانے کے لیے رکھا جاتا تھا۔ اتالیقی کے لیے: پڑھانے کے لیے۔

اُٹھائی گیرا (۱۰۰) : اُچکّا، وہ چور جو ہر ایک چیز بازار وغیرہ سے آنکھ بچا کر لے جائے۔ مراد ہوتی ہے

معمولی درجے کے چُور سے، جو لوگوں کی نظر بچا کر چیزیں اُٹھا لیا کرتا ہے۔

اَٹھوائی کھٹوائی لے کر پڑنا (۲۲۹) : غم یا غصّے کے سبب سے الگ پڑ رہنا، تنہائی اختیار کر لینا۔ سب سے علاحدہ ایک پلنگ پر پڑ رہنا۔

اَٹھواڑے میں (۱۵۰) : آٹھ دن میں۔ [اٹھواڑا : آٹھ دن]۔

اَجَل گرفتہ (۱۸۷) : جس پر موت کا سایہ پڑ چکا ہو۔ موت اپنے پھندے میں پھنسانے ہی والی ہو۔

اَچھوانی (۲۱۱) : "اصل میں 'اجوانی' تھا۔ ایک قسم کا شیرہ ہے جو زچہ کو دیا جاتا ہے۔ اِس کا قاعدہ یہ ہے کہ اجوائن کے شیرے کو کھانڈ ملا کر کڑکڑاتے گھی میں چھوڑ دیتے ہیں۔ جب وہ پک جاتا ہے تو سونٹھ ڈال کر زچہ کو پلاتے ہیں۔ مگر اب مسلمانوں میں اجوائن کی بجائے عنّاب کا شیرہ پکا کر اچھوانی بنانے لگے ہیں۔" (آصفیہ)

اِحتیاج (۷۴) : حاجت، ضرورت۔

اَحدی (۲۲۴) : تیر انداز۔ [اکبر نے ایک خاص قسم کے تیر اندازوں کا نام "احدی" رکھا تھا، جو کسی فوج کے زمرے میں تو نہیں ہوتے تھے مگر علاحدہ، کسی خاص وقت کے لیے تنخواہ پاتے تھے۔ (آصفیہ)]

اِختلاط (۲۴۵) : دوستی، دوستانہ بے تکلفی۔

اَدَّھچہ (۸۷) : وہ چادر جسے بطورِ آرائش پلنگ پر بچھاتے ہیں اور پھر اُس پر بچھونا بچھاتے ہیں۔ اِس کا آدھ آدھ گز کے قریب حاشیہ نیچے لٹکتا رہتا ہے۔ یہ حاشیہ کارچوبی یا کلابتونی کام سے مزیّن ہوتا ہے۔

اَدھار (۲۱۲) : ناشتے کے طور پر کچھ کھانا۔ مراد ہے تھوڑی سی غذا۔ [اَدھار ہو : تھوڑی سی غذا کا سہارا ہو]۔

اَدّھی (۲۱۱) : پُرانے پیسے کا آٹھواں حصّہ، یہ آدھا چھدام ہوا۔ [ایک روپے میں ۶۴ پیسے ہوتے تھے۔ ایک پیسے میں ۲ دو ادھیلے، ایک ادھیلے میں ۲ دو چھدام، اور ایک چھدام میں ۲ دو ادھیاں ہوتی تھیں۔ گویا ایک پیسے میں ۲ دو ادھیلے، یا چار چھدام، یا آٹھ ادھیاں ہوتی تھیں]۔

ادینہ (۱۳۸) : جمعہ۔

اُردا بیگنی (۸۴) : وہ مردانہ لباس پہنے ہوئے ہتھیار بند عورت، جو شاہی محلوں میں چوکی پہرا دیتی تھی اور احکام بھی پہنچایا کرتی تھی۔ (آصفیہ)

ترکستان کی عورت، جو بادشاہوں کے حرم کا انتظام رکھتی ہے۔ ہندی میں اِسے "ترکنی" کہتے ہیں (دریائے لطافت)۔

اُردو کے لوگ (۵) : لشکر سے تعلق رکھنے والے (سپاہی اور فوج سے متعلق دوسرے آدمی۔ میر امّن کی مراد ہے لال قلعے اور اُس کے اطراف کے رہنے والوں سے)۔

اُردوئے مُعلّیٰ کی زُبان (۴۲) : مراد ہے دلّی کی مستند، فصیح، معیاری زبان سے۔ نور میں عرش (غالباً میر کلو عرشؔ، فرزند میر تقی میرؔ) کا یہ شعر بھی مندرج ہے:

ہم ہیں اُردوئے معلّیٰ کے زباں داں اے عرشؔ
مستند ہے، جو کچھ ارشاد کیا کرتے ہیں

["اُردو" کے معنی ہیں: لشکر، فوج کے رہنے کی جگہ (بہارِ عجم)۔ چوں کہ یہ خیال ظاہر کیا گیا تھا کہ یہ زبان پہلے پہل شاہ جہاں کے زمانے میں اُس کی فوج میں مختلف لوگوں کے یک جا ہونے کی وجہ سے بننا شروع ہوئی؛ یوں اِس زبان کو "اُردو" کہا جانے لگا۔ "اُردوئے معلّیٰ کی زبان" کے اصلی معنی تو ہوئے: لشکر (یا دربارِ شاہی) کے اعلا لوگوں کی زبان؛ مگر مراد ہوتی ہے دلّی کی معیاری، ٹکسالی زبان سے]۔

اَرکان (۱۶۷) : (رُکن کی جمع) بڑے بڑے سردار اور امیر وزیر (جنھیں حکومت کے رُکن (یعنی ستون) سمجھا جاتا تھا)۔

اَرکانِ دولت (۱۹) : حکومت کے اراکین، سردار۔ (دولت: حکومت)۔

اَڑا لیا (۱۰۷) : پہنا۔ (پیر میں جوتا پہنا)۔

اَز بس کہ : چوں کہ۔ [یہ کلمہ عموماً "چوں کہ" کے معنی میں آتا ہے اور اِس کتاب میں بھی عموماً اِسی معنی میں متعدد مقامات پر آیا ہے۔ البتّہ ص ۱۲۸ اور ص ۱۳۱ پر یہ جس طرح آیا ہے، اُس میں "بہت زیادہ" کا مفہوم بھی شامل معلوم ہوتا ہے]۔

اِزدِحام : ہجوم، بھیڑ۔

اَسبابِ گُزارے کا (۶۴) : جس کی مدد سے دریا سے پار اُترا جا سکے، جیسے: کشتی۔ [گزارا: دریا سے پار اُترنا، دریا کو عبور کرنا]۔

اِستاد (۸۰) : "اِستادن" مصدر کا ماضی۔ اِستادن: کھڑا کرنا۔ اِستاد کر: (اُس خیمے کو بہت سی چوبوں پر) کھڑا کر کے۔

اِستادے (۸۰) : خیمے کی چوبیں (یا ستون) جن پر شامیانہ کھڑا کیا جاتا تھا۔ [جڑاؤ اِستادے: ایسے ستون جن میں جواہرات جڑے ہوئے تھے]۔

اُستخوان : ہڈّی۔

اِستدعا کر (۹۰) : درخواست کر [اُس کی استدعا کر: اُس کو دعوت دے، اُس سے یہاں آنے کی درخواست کر]۔

اِستفسار کیا (۲۴۶) : پوچھا۔

اِستقامت کا مکان (۸۸) : قیام گاہ، جہاں ٹھہرا ہوا تھا۔

اِستنبول (۱۰) : ترکی کے مشہور تاریخی شہر قسطنطنیہ کا دوسرا نام ہے۔

آستھان (۱۰۶) : جگہ، مقام، بزرگوں کے رہنے کی جگہ۔ (آصفیہ)

اِسرار (۲۳۲) : دیکھیے ضمیمۂ تلفظ و املا میں "اسرار"۔
اِسمِ اعظم (۱۰۹، ۲۲۸، ۲۳۲) : خدا کے ناموں میں سب سے بڑا نام۔ (اِس میں اختلاف ہے کہ وہ کون سا نام ہے)۔
اِسم با مُسمّیٰ (۱۲) : جیسا نام ہو، ویسی ہی صفت آدمی میں ہو۔ (مثلاً کسی کا نام شجاعت علی ہو اور وہ ہو بھی بہادر، تو کہیں گے کہ وہ تو اسم با مسمّیٰ ہیں)۔
اَسپر (۱۵) : وہ بچہ جس کی ماں مرگئی ہو (اِس لفظ کی بحث کے لیے دیکھیے ضمیمۂ تلفظ و املا)۔
اَسیر (۲۴۸) : قیدی۔
اَشرفُ الاَشراف (۴) : شریفوں کے شریف (مطلب ہے سب سے زیادہ شریف)۔
اَشرفُ البِلاد (۶) : شہروں میں سب سے بہتر، سب سے برتر شہر۔
اِصفہان (۶۸) : ایران کا مشہور شہر۔ ایک زمانے میں صفوی خاندان کے بادشاہوں کا دارالحکومت رہ چکا ہے۔ خاقانی کا مشہور قصیدہ اصفہان کی تعریف میں ہے، مطلع ؛

نکہتِ حوراست یا صفای صفاہان
جبہتِ جوزاست یا لقای صفاہان

اصفہان کی تلوار مشہور تھی (دائرۂ معارفِ اسلامیہ، لاہور)۔
اَصیل (۲۴) : خادمہ، ماما۔
اِضطِرار (۲۶) : دیکھیے دلِ پُر اضطرار۔
اَغلب (۶۶) : قوی گمان، یقین کے قریب گمان۔ ایسا خیال جس کا واقع ہونا یقینی معلوم ہوتا ہو۔
اَغلب ہے : قوی گمان ہے، قریب قریب یقین ہے۔
اَفزوں : زیادہ، بڑھتے رہنے والا۔
اَفسون (۱۱۲) : منتر، جادو، ٹونا۔
اَفشانی کاغذ (۲۴۲) : وہ کاغذ جس پر سنہری بندکیاں پڑی ہوئی ہوں۔
اَفلاطون (۱۰۶) : یونان کا مشہور فلسفی، سقراط کا شاگرد اور ارسطو کا استاد تھا۔ [افلاطون طبیب نہیں تھا، مگر اِس عبارت میں یہ نام طب کی مناسبت کے ساتھ آیا ہے اور غالباً اِس کی وجہ یہ ہے کہ لفظ "حکیم" طبیب اور علمِ حکمت کے ماہر دونوں کے لیے مستعمل ہے، یوں افلاطون حکیم کو فلسفی ہونے کے ساتھ ساتھ حکیم یعنی طبیب بھی فرض کر لیا گیا]۔
اَقسام اَقسام کے (۸۳) : طرح طرح کے ("اقسام" جمع ہے "قِسم" کی)۔
اِقلیم : مُلک۔
اَکابِر (۲۲۹) : سردار، امیر۔ ["اکابر" جمع ہے مگر یہاں یہ لفظ بہ طورِ واحد آیا ہے]۔
اَکابرِ عالَم (۸۳) : بہت بڑے عالِم۔
اَکابر و اَصاغِر (۱۵۲) : چھوٹے بڑے۔ مراد ہے عام آدمی اور امیر، تاجر وغیرہ۔ [اکابر: اکبر کی جمع۔ اصاغر: اصغر کی جمع]
اُکَت (۸) : اُپج، ذہانت، ذہنی طاقت۔
اُکھڑ آیا (۲۱۹) : اُبھر آیا۔

اُلاقْ (۱۰۷) : فورنبس نے اپنے نسخے کی فرہنگ میں اِس کے معنی لکھے ہیں: ایک طرح کی چھوٹی سی کشتی۔ مگر فرہنگِ اصطلاحاتِ پیشہ وراں (جلدِ پنجم) میں "اُلانگ" کے ذیل میں لکھا گیا ہے: "پُرانی وضع کی ایک قسم کی بڑی کشتی، جس کے تختے گودر پر گودر چڑھا کر جڑے ہوئے، اور اوپر ایک بڑی کمان لٹکی ہوئی رہتی ہے۔" میرا خیال ہے کہ الاق اور الانگ ایک ہی چیز کے دو ذرا سے بدلے ہوئے نام ہیں اور فرہنگِ اصطلاحات میں جو کچھ لکھا گیا ہے، وہ مرجّح حیثیت رکھتا ہے۔

اَلْاَمْرُ فَوْقَ الْاَدَب (۳۸) : حکم کا درجہ ادب سے بڑھ کر ہے۔ (یعنی حکم ماننا لازم ہے)۔

اَلبَتّہ : ضرور۔

اِلتماس : گزارش، عرض۔

اَلْجُوْع (۱۶۸) : بھوک۔

اُلُشِ خاص (۸۸) : بادشاہ کی طرف سے بھیجا گیا کھانا۔ [اُلُش : امیروں یا بادشاہوں کے آگے جو کھانا رکھا جائے، اُس میں سے کچھ کھانا نکال کر کسی خاص شخص (امیر یا سردار) کو عطا کرنا۔ اِسے خاص التفات اور بہت عزّت کی بات سمجھا جاتا تھا]۔

اَلقصّہ : غرض کہ، مختصر یہ کہ۔

اَلماس : ہیرا۔

اَلَنگ (۱۸۰) : اِس کے معنی ہیں: پہلو، سمت، طرف۔ یہاں مراد ہے قلعے کی دیوار۔ یعنی اُس قلعے کی چاروں دیواروں میں سے ہر ایک طرف کی دیوار دو دو کوس لمبی تھی۔

اولو العزم (۹۰) : بڑے ارادے والا، عالی حوصلہ، عالی ہمّت۔

اِلٰہ العالمین (۲۴۹) : جہانوں کا معبود۔ سب جہانوں کا خُدا۔

اِمامِ ضامن (۲۵) : حضرت علی موسیٰ رضاؓ۔ حضراتِ شیعہ کے عقیدے کے مطابق آٹھویں امام۔ "جب کوئی سفر کو جانے لگتا ہے تو گھر والے اور عزیز و احباب اُس کے بازو پر امام ضامن کا روپیا باندھ دیتے ہیں اور وہ منزلِ مقصود پر پہنچ کر خیرات کر دیا جاتا ہے۔ روپے کی تخصیص نہیں، دولت مند اشرفی اور غریب پیسا باندھتے ہیں۔" (نور)

امانت (۳۰، ۱۶۴) : جوں کا توں، کسی طرح کی کمی بیشی کے بغیر۔

امانت دھرا ہے (۷۸) : اُسی طرح رکھا ہوا ہے (یعنی ذرا بھی کم نہیں ہوا)۔

امانت سے چلو (۱۵۷) : بہت احتیاط کے ساتھ اِسی طرح سے چلو۔

اُمَرا زادیاں (۴۸) : امیروں کی لڑکیاں۔

اَمرد (۱۲۲) : نوعمر خوب صورت لڑکا، جس کے ابھی داڑھی مونچھیں نہ نکلی ہوں۔

اِملاک (۷۳) : ("مِلک" کی جمع) جائداد، مال اسباب۔

انتظار کھینچنا : انتظار کرنا۔

آن چیتا (۶۴، ۱۱۱) : اچانک۔

اِنْدَر (۸۹) : ہندوؤں کے نزدیک دیوتاؤں کا بادشاہ۔
اندر کا اکھاڑا : راجا اندر کی سبھا، جس میں پریاں ناچتی تھیں۔ کنایتًا : خوب صورت عورتوں کا مجمع (نور)۔

اَندیشہ (۸۹) : خیال۔

اِنْصِرام (۴) : انجام کو پہنچنا، انتظام، بندوبست۔ (انصرام کر : انجام کو پہنچا کر۔ مراد یہ ہے کہ خدا اور رسولِ خدا کی تعریف لکھنے کے بعد۔)

اَنْگا (۴۹، ۱۰۳، ۱۴۱) : انّا، دودھ پلائی، دایہ۔

اَنگُشتری : انگوٹھی۔

آن گنا جینا (۱۸۶) : حمل کا آٹھواں مہینا۔

انگور کر لائے (۲۹، ۱۵۷) : زخم بھر گئے۔

اَنوٹھی (۱۵۹) : نئی، عجیب۔

اُنھیں پاؤں پھر آئی (۸۹) : فوراً لوٹ آئی۔

اُوپچی (۱۴۹، ۲۱۴) : ہتھیاربند۔ پانچوں ہتھیار باندھے ہوئے سپاہی (آصفیہ)۔

اَوسر چوکی ڈومنی گاوے تال بے تال (۵۸) : مثل ہے۔ اَوسَر : موقع۔ راگوں کا وقت۔ اَوسر چوکنا : بے سُرا ہونا۔ اِس مثل کا مطلب یہ ہے کہ ڈومنی (گھروں کے اندر گانے والی عورت، جو مختلف تقریبوں میں بلائی جاتی تھی) جب راگ اور تال بھول جاتی ہے، تو بے سُری ہو جاتی ہے۔ اُسی طرح بعض دفعہ آدمی اپنی غلطی کی بنا پر کسی مصیبت میں بُری طرح مبتلا ہو جاتا ہے اور ساری سمجھ بوجھ رخصت ہو جاتی ہے۔

اونٹ چڑھے کُتّا کاٹے (۵۵) : مثل ہے۔ عقل کے خلاف اور ناممکن بات کو کہتے ہیں؛ یعنی جو شخص اونٹ پر سوار ہے اُسے کُتّا کیسے کاٹ سکتا ہے! یہاں مراد یہ ہے کہ جب شامت آتی ہے تو لاکھ احتیاط کیجیے، مگر نقصان پہنچ ہی جاتا ہے۔

اونٹ کے گلے میں بِلّی (۴۵) : مشہور کہاوت ہے۔ کسی قیمتی چیز کے ساتھ ایک کم قیمت چیز کا شامل کر دیا جانا۔ ایک ضروری چیز کے ساتھ ایک غیر ضروری چیز کے خریدنے کی شرط۔ [یہ کہانی بیان کی گئی ہے کہ ایک عرب کا اونٹ گم ہو گیا۔ اُس نے قسم کھائی کہ اگر وہ مل گیا تو اُسے ایک درہم میں بیچ ڈالوں گا۔ اتفاقاً وہ اونٹ مل گیا۔ قسم کو پورا کرنے کے لیے اُس نے یہ کیا کہ ایک بلّی کے گلے میں ڈوری باندھ کر اُس ڈوری کا سرا اونٹ کے گلے میں باندھ دیا اور آواز لگانے لگا کہ یہ اونٹ ایک درہم میں بکاؤ ہے، اور یہ بلّی ایک ہزار درہم میں، مگر یہ دونوں ایک ساتھ بکیں گے۔ یہ حکایت میں نے اپنے لڑکپن میں فارسی کی ایک ابتدائی کتاب گلزارِ دبستان میں پڑھی تھی۔ واقعہ پورا یاد رہ گیا، مگر قیمت صحیح طور پر یاد نہیں رہی؛ ایک ہزار درہم تھے کہ پانچ ہزار درہم قیمت جو بھی ہو، واقعہ یہی تھا۔]

ایک بات منہ پر نہ رکھی (۱۴۰) : کچھ بھی نہ کہا۔

ایک چِلّے میں (۱۵۰) : چالیس دن میں۔

ایک ساعت (۷۹) : ذرا دیر۔

باٹ (۲۲) : راستہ۔

بادامی (۷۷) : مراد ہے گوشت کا ایسا سالن جس میں بادام (خواہ پیس کر، خواہ کتر کر) ڈالے گئے ہوں۔

بادشاہِ علی الاطلاق (۹۰) : مراد ہے خدا سے۔ [علی الاطلاق : مالکِ کُل، مختارِ مطلق]۔

بادلا (۴۱) : زری کا کپڑا جو ریشم اور چاندی یا سونے کے تاروں سے بُنا جاتا تھا۔

بادیہ (۸۷) : تانبے کا بڑا کٹورا یا پیالہ۔

باربردار (۱۴۴) : سامان اُٹھانے والے لوگ۔

باربرداری (۱۲۷، ۱۳۹) : اسباب لے جانے کا سامان، سامان ڈھونے کے لیے جانور، چھکڑے وغیرہ۔

بار خدایا (۱۰۱، ۱۴۴) : اے خدائے برتر۔

بار کرنا (۱۰۱) : سامان چڑھانا۔ [بار کرلو : سارا سامان کشتیوں میں بھر لو]۔

بارہ آبھرن (۹۰) : بارہ زیور۔

بارہ پُلا (۲۱۵) : دیکھیے ضمیمۂ تشریحات، اختلافِ نسخ۔

بارہ دری (۵۶) : بارہ دروں (یا دروازوں) کی ہوادار عمارت، جسے اکثر دریا کے کنارے یا باغ میں بناتے تھے۔ بعد کو بارہ سے کم دروازے والی عمارت کو بھی کہنے لگے۔

باری دار (۵۱، ۲۰۰) : پہرے دار، پہرے پر موجود سپاہی "جو اپنی باری یا نوبت پر بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہو" (دریائے لطافت)۔

بارے : آخر کار، بہر حال۔

بازدار (۱۳۱) : جس کے ذمے باز کو سدھانے کی اور اُس کی دیکھ بھال کی خدمت ہو۔

باشا (۱۴۴) : ایک شکاری پرندہ، یہ باز کی ایک قسم ہے (پلیٹس)۔

باعث : سبب، وجہ۔

باعث ہوا (۲۰۷) : اِصرار کیا، مجھ سے بھی کہا۔

باقرخانی (۷۷) : شیرمال کی قسم کی روٹی، ذرا سے فرق کے ساتھ۔ یہ شیرمال کے مقابلے میں ذرا ہلکی اور کچھ چھوٹی ہوتی ہے۔

باگ (۷۰) : شیر۔

بالاپوش (۸۷) : پلنگ پوش۔

بال بال گج موتی پروتا (۹۰) : مراد ہوتی ہے بہت زیادہ بناؤ سنگار سے۔

بال باندھی کوڑی مارنا (۱۷۴) : نشانہ خطا نہ کرنا، بالکل صحیح نشانہ لگانا۔

بال بیکا نہیں کر سکتا (۳) : کچھ نہیں بگاڑ سکتا، ذرا بھی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔

بالعکس (۱۹۲) : برخلاف، برعکس، اُلٹا۔ [بالعکس کام ہوا : جیسا ہونا چاہیے تھا، اُس کے خلاف ہوا، اُلٹا کام ہوا]۔

بالفعل : فی الحال، اِس وقت۔

باد (۱۹۵) : ہوا۔ [باد سے باتیں کرتا تھا : ہوا کی طرح تیز دوڑ رہا تھا]۔

بادبتاس (۲۳۱) : آسیب، کسی بُری رُوح کا سایہ۔
باوَر : یقین۔
بَت کہاو (۵۴ - ۲۳۸) : بات کرنے کا ڈھنگ، بات کہنے کا انداز۔
بتیاتے ہیں (۲۰۳) : باتیں کرتے ہیں۔
بَجِد ہونا (۳۲، ۶۰، ۷۹) : اصرار کرنا۔
بجرا (۱۰۷) : ہلکی پھلکی سیر و تفریح کی سبک رفتار چھوٹی کشتی، جس کو ایک آدمی آسانی سے کھے سکے۔
بُجھرا (۳۶، ۸۷) : گھڑے پر چھپانے کا سرپوش، جو لمبوترا سا بنا ہوا ہوتا ہے (عام گھروں میں بالعموم مٹی کا ہوتا تھا)۔
بَچَن (۱۷۳) : قول، بات۔
بُخارا (۱۳۹) : علاقۂ ماوراء النہر کا مشہور شہر، جو اسلامی علوم اور اسلامی تہذیب و تمدن کا عظیم الشان مرکز رہا ہے۔ اب روسی ترکستان کے علاقے ازبکستان میں شامل ہے۔ یہاں رُوئی بہت پیدا ہوتی ہے (دائرۂ معارفِ اسلامیہ۔ لاہور)۔
بُخور (۲۲۳) : وہ چیزیں جن کے آگ پر ڈالنے یا جلانے سے خوش بو نکلتی ہے، جیسے لوبان۔
بَدا تھا (۹۴) : لکھا تھا۔ (قسمت میں لکھا تھا)۔
بدخشاں (۱۱۹) : افغانستان کا مشہور قدیم شہر۔ اس کا بہت سا علاقہ اب روسی حکومت کا حصہ بن گیا ہے۔ شہر افغانستان کی حکومت میں شامل ہے۔ لعل کی نسبت سے یہ شہر مشہور رہا ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے دائرۂ معارفِ اسلامیہ۔ لاہور۔
بَدَر رَو (۱۶۷) : پانی باہر جانے کا راستہ، موری۔
بدرہ (۳۱، ۱۳۸) : تھیلی (جس میں روپے یا اشرفیاں ہوں)۔ ہزار روپے کی تھیلی۔
بدطالع (۹۰) : بدنصیب۔
بَدّوؤں (۱۵۹) : جمع ہے بَدّو کی۔ بدّو، ڈاکو، لٹیرا۔ [اِس لفظ کے کئی معنی ہیں، ایک معنی یہ بھی ہیں (تو) اور اِس مقام پر یہی معنی مراد ہیں]۔
بدہَیئت (۱۲۲) : بدشکل، ایسا شخص جس کی بدصورتی میں ڈراؤنا پن ہو۔ (ہیئت: شکل صورت، وضع قطع، انداز)
برائے خود (۱۲۹) : اپنے طور پر، اپنی جگہ۔
بُرجِ حَمَل (۲۴۰) : سیاروں کے لحاظ سے آسمان کے دائرے میں بارہ بُرج بانٹے گئے ہیں۔ اِس دائرے کے بارہ بُرجوں میں سے پہلا بُرج "بُرجِ حمل" کہلاتا ہے، جس کی شکل مینڈھے کی سی ہے۔ جس دن سورج اِس میں آتا ہے، شرفِ آفتاب کا دن ہوتا ہے اور وہی دن ایرانی تہوار "نوروز" کا ہوتا ہے، جس سے موسمِ بہار کا آغاز ہوتا ہے اور ایرانی سال شروع ہوتا ہے۔
بَرداشتہ ہوا ہو (۲۱۴) : اُکھڑ گیا ہو (جی نہ لگتا ہو)۔
بَرس دِن (۹۷) : پورا ایک سال۔ [برس دن کے عرصے میں : پورے ایک سال میں]۔
برس دن گزر گیا (۱۰۸) : ایک سال گزر گیا۔

سال پورا ہوگیا۔

بُرقع پوش (۱۱۴، ۲۱۶، ۲۳۹) : نقاب پوش۔
["برقع" کے ایک معنی نقاب بھی ہیں (نور)]

بَرقَنداز (۱۷۳) : بندوقچی۔ عدالت یا پولیس کا سپاہی۔

بَرگ و بار (۲۴۹) : پھل اور پتے [برگ : پتا۔ بار : پھل]۔

بڑی فجر (۱۶۶) : صبح تڑکے، صبح سویرے۔ (نور)
[بڑی فجر ہوئی : صبح ہوگئی]۔

بِس (۱۸۶) : زہر۔

بَستر (۷۶) : لباس۔

بِسیکھ (۴۱۶) : خاصیت، عادت۔

بَشارت (۹۷) : خوش خبری۔ وہ بات یا اچھی خبر جو خواب میں یا کسی خدا رسیدہ شخص کی زبان سے معلوم ہو۔

بَشرہ (۸۱) : چہرہ۔

بعید ہے (۷۳) : خلاف ہے۔ (انسانیت اور بہادری کے خلاف ہے۔ بعید کے لفظی معنی ہیں : دور)۔

بغدادی اونٹ (۱۲۹) : سب سے اچھا اونٹ، اونٹ کی ایک سب سے بہتر قسم۔ (اس کو "بغدی" بھی کہتے ہیں۔ آصفیہ)۔

بکاوَل (۷۷، ۱۵۵) : اس لفظ کے کئی معنی ہیں : باورچی، باورچی خانے کا داروغہ، وہ شخص جو امرا و سلاطین کے سامنے کھانا چُنے (نور)۔ ص ۱۵۵ پر یہ پہلے معنی (یعنی باورچی کے معنی) میں آیا ہے اور ص ۷۷ پر آخری معنی میں۔

بکاوَلی (۸۷) : ایک طرح کی تشتری (نور)۔

بکتر پوش (۲۱۵) : زرہ پہنے ہوئے۔

بگانی تریا (۱۷۱) : غیر عورت [بگانی : بے گانی، غیر۔ تریا : عورت]۔

بگانے ستر پہ نگاہ مت کر (۲۲۸) : غیر عورت کو نہ دیکھ۔

بلبلِ ہزار داستان (۱۴۴) : مراد ہے خوش بیان، شیریں کلام۔ ["داستان" دراصل "دستان" تھا، نغمے کے معنی میں۔ بلبل کی خوش آوازی کی بنا پر اُسے "ہزار دستان" کہا گیا : ہزار نغمے گانے والی، یعنی بہت خوش بیان۔ یہی مرکب "ہزار داستان" بن گیا]۔

بَل بلے (۷۲) : کلمۂ تعریف و استعجاب ہے۔ ایسے موقعوں پر استعمال کیا جاتا تھا جب کوئی بہت حیرت میں ڈالنے والی بات سامنے آئی ہو، یا کسی نے بہت قابلِ تعریف کام کیا ہو۔

بَلخ (۲۰۹) : ایک قدیم شہر، جو اب موجود نہیں، مگر اُس کے آثار افغانستان کے شہر مزار شریف کے قریب اب بھی موجود ہیں۔ یہ بدھ مذہب کا بڑا مرکز رہا ہے۔ (دائرۂ معارفِ اسلامیہ۔ لاہور)

بُلدہ (۶، ۲۲۷) : شہر۔

بلّلی (۵۷) : نا سمجھ، بے وقوف۔

بلیّاں (۱۴۰) : بلائیں۔ [بلیّاں لوں : بلائیں لوں،

صدقے جاؤں]۔

بِنا (۱۰۲) : بنیاد۔ [بنا ڈالی: بنیاد رکھی، عمارت بنوانا شروع کی]۔

بنات (۲۰۶) : بغیر بناوٹ کا اونی کپڑا، جو پشم یا اون کے روؤں کو جما کر، کاغذ بنانے کے طریقے کے طور پر بنایا جاتا ہے اور پتلا، موٹا، ادنا، اعلا ہر طرح کا ہوتا ہے۔ اس کی کئی قسمیں ہوتی ہیں۔ عموماً اسے "بانات" کہا جاتا ہے۔

بَناس پتّیاں (۱۷۸) : جنگل کی پتّیاں، گھاس، بوٹیاں، جنگلی پھل۔

بندر : بندرگاہ۔

بندش (۲۲۳) : تدبیر، سازش۔

بنّدوڑ (۵۸) : ("باندی" کی تصغیر، بہ طورِ کلمۂ حقارت) نہایت کم رتبہ باندی۔

بَندی (۸۰) : کوئی آرائش کی چیز، جیسے کمر میں باندھنے کی مرصّع پیٹی۔

بندی خانہ (۱۱۹، ۱۷۷) : قید خانہ۔

بندی وان (۱۴۴) : قیدی۔

بوائی (۱۰۱) : سردی کے موسم میں ایڑیوں کے پھٹ جانے سے جو دراڑیں سی پڑ جاتی ہیں، اُن کو "بوائی" کہتے ہیں۔

بوٹ، بوٹنٹ (۱۸۰) : کچے ہرے چنے۔

بود و باش : رہن سہن۔

بود و باش مقرر کی : رہنا سہنا شروع کیا، رہنے لگا۔

بوڑھا آڑھا ہو (۲۲۲) : بہت بوڑھا ہو، بہت عمر پائے ["آڑھا" یہاں "بوڑھا" کا تابع مہمل ہے۔ پلیٹس نے اپنے لغت میں لکھا ہے کہ بوڑھا آڑھا "بوڑھا بڑا" کا ہم معنی ہے۔]

بوزنہ (۲۲۲) : بندر۔

بوزہ خانہ : بوزہ: جو، چاول وغیرہ کی بنی ہوئی دیسی شراب۔ بوزہ خانہ: جہاں یہ شراب ملتی ہو۔

بوعلی سینا (۹۴) : ابوعلی الحسین ابن عبداللہ، جو "ابن سینا" کے نام سے بھی مشہور ہے۔ نہایت مشہور اور مقتدر فلسفی، حکیم، طبیب، ریاضی داں اور ماہرِ فلکیات تھا۔ "شیخ الرئیس" کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ وفات: رمضان ۴۲۸ھ / جون ۱۰۳۷ء۔ ایران کے مشہور شہر ہمدان میں مدفون ہے (دائرۂ معارفِ اسلامیہ۔ لاہور)۔

بوقلموں (۱۷۸) : رنگارنگ۔ [بوقلموں ہو گیا: کئی رنگوں کے عکس سے بھر گیا۔ "بوقلموں" اصلاً ایک رنگین ریشمی کپڑے (دیبائے رومی) کو کہتے تھے، جس میں (غالباً روشنی کے پڑنے سے) کئی رنگوں کی جھلک نظر آتی تھی]۔

بَول (۱۵۵) : پیشاب۔

بوند (۵۷) : نہایت تیز شراب [بوند کی بوند تھی: بہت زیادہ تیز شراب تھی]۔

بَہا : قیمت۔

بھاٹ (۷۹) : ہر شخص کی تعریف کر کے مانگنے والا۔

مراد ہے خوشامدی اور لالچی سے۔

بھاکھا (۷) : زبان۔

بھبھوت (۱۰۷) : وہ راکھ جس کو جوگی اور سنیاسی اپنے بدن پر ملتے ہیں۔

بھٹا سا اُڑ گیا (۱۷۴) : ایک ہی ضرب میں سر (گردن سے کٹ کر) صاف اُڑ گیا۔

بہ جنس (۲۴۵) : اسی طرح، بہت حفاظت کے ساتھ۔

بہ جنس پایا (۲۱۲) : پوری طرح پایا۔

بھچھلیا (۵۶) : آتش بازی کی ایک قسم (ص)۔ [نورالحسن ہاشمی صاحب نے نوطرز مرصع کے حاشیے میں اس مقام پر لکھا ہے کہ بھوچھیا ایک جھاڑ دار درخت ہوتا ہے]۔

بہ خاطر جمع : اطمینان کے ساتھ۔

بہری (۱۹۹) : چنریا۔

بہری (۱۹۴) : ایک شکاری پرندہ، جو اکثر کبوتروں کا شکار کیا کرتا ہے۔

بہ سر و چشم : دل و جان کے ساتھ، بہت شوق اور دل چسپی کے ساتھ۔ بہت اچھا، بہت خوب۔

بھسم (۱۰۷) : راکھ۔

بھگتیے (۳۶) : "بھگتیا" کی جمع۔ بھگتیا : سوانگ بھرنے والا اور ناچنے والا، عورتوں کے سے کپڑے پہن کر ناچنے والا۔

بھگنا (۱۵۰) : بھائی۔

بھلاوا دینا (۱۹۵) : دھوکے میں ڈالنا۔

بہلیے (۲۴) : "بہلیا" کی جمع۔ بہلیا : تیر کمان سے مسلح ملازم (جو شکار میں ساتھ رہتا تھا)، پرندوں کا شکاری۔

بہم پہنچائی (۱۰۸) : حاصل کی۔

بہم پہنچے (۵۴) : (کسی کی دکان پر) ملتے۔

بہ مجرد (۸۹) : یہ کلمہ کسی بات کے فوری طور پر واقع ہونے کے مفہوم کو ظاہر کرتا ہے، یعنی جیسے ہی اس مکان میں گیا، حیران رہ گیا۔

بہ مجرد سننے اس قصے کے (۲۰۹) : اس قصے کے سنتے ہی۔

بہ موجب : مطابق۔

بھنور کلی (۱۹۴) : وہ گھنڈی دار (لوہے یا پیتل وغیرہ کا حلقہ) جو بعض جانوروں (جیسے بکری، کتے) کے گلے میں پہناتے ہیں۔ [بھنور کلی مرصع کی : جواہرات جڑا ہوا گلے بند]۔

بھوبھل (۶۲) : جلتی ہوئی راکھ۔

بھوئی (۸۸) : حمال (سامان اٹھانے والے)۔

(ص ۹۱) : کہار (ڈولی اٹھانے والے)۔

بھوتنا پیری (۲۳۰) : منحوس۔

بھیانک ہو کر (۱۹۶) : دہشت زدہ ہو کر، خوف زدہ ہو کر۔

بھیچک (۸۹، ۱۳۳) : بھونچکا، حیران۔

بھینٹ (۱۷۵) : نذر۔

بھینٹ ملاقات ہو جاتی (ص ۲۱) : آمنا سامنا ہو جاتا۔

بیاکل (۱۵۰) : بے کل، بے قرار۔
بے بہا : بیش قیمت، جس کی قیمت کا اندازہ ہی نہ لگایا جاسکے۔
بے تقصیری (۱۱۹) : بے گناہی۔
بیجو باورا (۳۴) : ہندستان کا مشہور ماہرِ موسیقی، جو (غالباً) شہنشاہ اکبر کے عہد میں تھا۔
بے چوبا (۱۲۹) : وہ چھوٹا خیمہ (راوٹی) جس میں خیمے کی طرح چوبیں نہیں لگائی جاتیں۔
بید مشک : ایک درخت کا نام، جس کے پھول نہایت نازک اور خوشبودار ہوتے ہیں، زرد رنگ کے مگر مائل بہ سیاہی، اِس کے پھولوں کا عرق کھینچا جاتا ہے جو مفرحِ قلب ہوتا ہے۔
بیرن (۲۴) : بھائی۔
بے سروپائی (۲۱۸) : بے سروسامانی۔
بے سر ہوگیا (۹) : شہر میں کوئی حاکم نہیں رہا۔
بیسن دان (۷۸) : وہ ظرف جس میں بیسن رکھیں۔ [کھانا کھانے کے بعد چکنائی سے ہاتھوں کو صاف کرنے کے لیے (صابن کی طرح) استعمال کیا جاتا تھا]۔
بے کم و کاست : پورا پورا، ذرا بھی کم کیے بغیر۔
بیل (۲۱۵) : دیکھیے "جب بیل..." کے تحت۔
بیل نہ کودا کودی گون یہ تماشا دیکھے کون (۵۸) : مثل ہے، عموماً اُس جگہ کہتے ہیں جہاں کوئی شخص اُمید کے خلاف کام کرے (نور)۔
بیمار داری (۵) : بیمار کی خبرگیری، اُس کی دیکھ بھال اور خدمت کی ذمے داری۔
بے محابا (۴۹) : بے دھڑک (کچھ سوچے سمجھے بغیر)۔
بے نوا : بے سروسامان، جس کے پاس کچھ نہ ہو۔
بے نیاز (۱۹) : مراد ہے خدا سے۔
بے وسواس ہوکر (۲۱۵) : بے خوف ہوکر۔
پارۂ ابر (۲۴۲) : بادل کا ٹکڑا۔
پاکھر (۱۴۹) : لوہے سے بنی ہوئی زرہ کی مانند ایک پوشاک، جسے (جنگ کے موقع پر) گھوڑے کو پہنا دیتے تھے۔
پال (۱۳۹) : چھوٹا خیمہ، چھولداری۔
پانچوں ہتھیار : ڈھال، تلوار، تیر، کمان، برچھی (یا نیزہ) (پلیٹس)۔
پانو اُکھڑے (۶) : وہاں سے بھی نکلنا پڑا، اُس شہر کو بھی چھوڑنا پڑا۔
پانو پھیلا کر سو رہتا ہوں (۷) : آرام و اطمینان کے ساتھ گزر رہی ہے۔
پانو دیا (۲۴۴) : قدم رکھا (ساتواں برس شروع ہوا)۔
پانو گور میں لٹکا چکا ہوں (۵۴) : مرنے کے قریب ہوں۔
پانی دیوا (دیکھیے ص ۶۸۳) ———
پاو روٹی (۱۰۰) : ڈبل روٹی۔
پائیں باغ : وہ باغیچہ جو محل (یا مکان) کی چار دیواری کے اندر، محل یا مکان کی سطح سے ذرا نیچا ہو۔
پایۂ تخت (۱۰) : راج دھانی۔
پایے پر (۱۱۷) : اپنے اپنے مرتبے کے مطابق اپنی

مقرّرہ جگہ پر۔ [شاہی دربار میں مختلف امیروں کے درجے کے مطابق اُن کے کھڑے ہونے کی جگہ مقرر ہوتی تھی]۔

پَت (۱۵۱) : عزّت، آبرو۔

پٹڑی (۵۵) : چاندی یا تانبے کی تختی، جس پر کوئی نقش یا تعویذ کھدوا کر گلے میں ڈالتے ہیں۔ [زمرّد کی پٹڑیوں پر ۔۔۔ : زمرّد کی تختیوں پر موتی جڑے ہیں۔ زمرّد ہرے رنگ کا جواہر ہوتا ہے، اسی نسبت سے اُسے پتّے سے تشبیہ دی ہے]۔

پَٹیلی (۱۰۷) : چوڑے پیندے کی کشتی، جس پر تختے بچھا کر، بیل گاڑی کو پار لگاتے ہیں۔

پچھل پائی (۵۸) : چڑیل۔

پدمنی (۱۸۵) : نہایت نازک بدن اور خوب صورت عورت۔ کنول کے پھول کی طرح نازک اندام۔ [شاستروں میں عورتوں کی جو چار قسمیں بتائی گئی ہیں، اُن میں سب سے اوّل و اعلا قسم "پدمنی" ہے (آصفیہ)]۔

پذیرا ہوا (۱۱۹) : مان لیا گیا۔

پذیرا نہ کیا (۱۲۴) : قبول نہیں کیا، نہیں مانا۔

پراگندہ ہوا (۲۳۸) : پریشان ہوگیا۔

پراگندہ ہوئے (۲۴۵) : پھیل گئے۔

پر پیچ (۱۶۸) : جوڑ توڑ، داؤ پیچ، چال بازی۔

پرتل (۱۳۹) : گھڑ سوار کا جھولا، تھیلا، جس میں اُس کا ساز و سامان آجاتا ہے۔

پرچھا ہوا (۲۰۱) : بھیڑ چھٹ گئی، سب چلے گئے۔

پرچھا ہونے لگا (۹۳) : صبح ہونے لگی (یعنی رات کی سیاہی چھٹنے لگی)۔ [پرچھا ہونا : بھیڑ چھٹنا، ہجوم کا کم ہونا (آصفیہ، نور)]۔

پَرداز (۸۹) : پرداز کے معنی ہیں : آراستگی، جلا، نقش و نگار، نقّاشی (وغیرہ)۔ اِس عبارت میں جس طرح یہ لفظ آیا ہے، اُس سے بہ ظاہر یہ مفہوم نکلتا ہے کہ حلبی آئینوں کے چوکھٹوں میں چاروں طرف جواہرات جڑے ہوئے تھے۔

پُرسِش (۲۵۰) : پوچھ گچھ، مراد ہے گناہوں کی پوچھ گچھ سے۔

پَرَند (۱۹۵) : تیز رفتار، بہت تیز دوڑنے والا۔

پَر نہیں کٹے تھے (۲۱۴) : یہ اصطلاح مجھے کسی لغت میں نہیں ملی۔ فے اور ع کی فرہنگ میں بھی نہیں۔ بہ ظاہر مراد اِس سے یہ معلوم ہوتی ہے کہ گھوڑی کی عمر زیادہ نہیں تھی مگر وہ شرارتی نہیں تھی، بہت سدھی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔

پروانگی : یہ لفظ اجازت اور حکم، دونوں معنوں میں مستعمل رہا ہے (آصفیہ)۔ اِس کتاب میں بھی متعدد مقامات پر یہ لفظ آیا ہے، کہیں اجازت کے مفہوم میں اور کہیں حکم کے مفہوم میں۔ محض بہ طورِ مثال لکھا جاتا ہے کہ ص ۹۲ پر یہ حکم کے مفہوم میں آیا ہے اور ص ۱۳ اور ۱۷۶ پر اجازت کے مفہوم میں۔

پری پیکر (۸۶) : (کلمۂ صفت ہے) پری جیسی، بہت

خوب صورت۔ [پیکر: چہرہ، جسم، صورت شکل۔ پری پیکر: پری جیسی صورت شکل اور حُسن رکھنے والی]۔

پری زاد (۶۴۳): یہ لفظ خوب صورت کے مفہوم میں آتا ہے، یہاں دراصل مراد ہے بہت تیز چلنے والے گھوڑوں سے۔ یا یوں کہ لیجیے کہ خوب صورت اور تیز رفتار گھوڑے۔ پُرانی روایت کے مطابق پریوں کے پَر ہوتے تھے، جن کی مدد سے وہ اُڑا کرتی تھیں (اور خوب صورت تو ہوتی ہی تھیں) یوں اِس لفظ کو یہاں اِسی مناسبت سے لایا گیا ہے۔

پری کا سایہ (۱۰۴): جن یا بھوت پریت کا اثر۔

پریوں کا اَکھاڑا (۵۹۸): پریوں کا مجمع جیسیوں کا جمگھٹ۔

پژمردہ نہ ہوگا (۱۷): نہیں مُرجھائے گا۔

پس ماندہ (۷): کسی شخص کے وارث جو بچ گئے ہوں، موجود ہوں۔ یہاں "پس ماندوں" سے مراد ہے پٹھانوں سے، یعنی شیر شاہ سوری کے بعد جو لوگ اُس وقت ہندستان میں حکومت کر رہے تھے۔

پُشتہا پُشت (۲): کئی پیڑھیوں سے، باپ دادا کے وقت سے، نسلاً بعد نسل۔

پشمینہ: بھیڑ، بکری اور دُنبے کی پشم کا بنا ہوا کپڑا۔ [پشم: نہایت باریک، ملائم اور چھوٹے بال، جو لمبے بالوں کے درمیان، کھال کے اوپر بطور رُوئیں کے پیدا ہوتے ہیں۔ اُن کو اون سے علاحدہ کر کے، اعلا قسم کی شال اور کپڑا بنایا جاتا ہے۔ "پشم" کو بعض مقامات پر "لُس" بھی کہتے ہیں۔ اُون: کپڑا بنانے کے کام میں لائے جانے والے بھیڑ، بکری، اونٹ اور بعض دیگر چوپایوں کے باریک اور لمبے بال۔ (اصطلاحات)]۔

پشواز (۲۱): انگرکھے کی وضع کا گھیر دار دامن کا لباس۔ گھیر لہنگے کی طرح کا ہوتا ہے۔ پہلے زمانے میں بیگمات اور اُمرا لباس کے اوپر پہنا کرتے تھے اور "جامہ" کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا۔ اِس زمانے میں دِلّی اور لکھنؤ کی گانے والی عورتیں، گانے کی محفل میں گاتے ناچنے کے لیے پُر تکلّف جامہ پہن کر آتی ہیں، جو پشواز کے نام سے مشہور ہے۔ (اصطلاحات)۔

پکھاوَج (۱۱۹): طبلے کی وضع کی لمبوتری ڈھولک، مِردنگ۔

پکھروٹا (۷۸): سونے یا چاندی کا ورق، جو پان کے بیڑے پر لپیٹ دیا جاتا تھا۔

پَلاس (۱۹۹، ۱۷۰): ٹاٹ۔

پلشت (۵۷): بدذات، پلید، گندگی۔

پَلوار (۱۰۷): بار برداری (سامان ڈھونے) کی کشتی، جو پندرہ بیس ٹن بوجھ لے جا سکے۔ بجرے کی قسم کی، سامنے سے چوڑی اور پیچھے سے تکونی ناو۔ (اصطلاحات)۔

پَن بھتّا (۷۸): پتلے پکے ہوئے چاول۔ [پن: پانی۔ بھتّا: بھات، چاول]۔

پنجتن پاک (۲۴۹): مراد ہیں (شیعہ حضرات کے معتقدات کے مطابق): رسول اللہؐ، حضرت فاطمہؓ،

حضرت علیؓ، حضرت حسنؓ، حضرت حسینؓ۔

پنجشنبہ (۹۴) : جمعرات۔

پنڈا (۱۶۸، ۱۷۰، ۱۸۴) : پجاری، مندر کی خدمت کرنے والا برہمن۔

پنڈت خانہ (۱۱۹، ۱۲۰، ۱۳۰، ۱۴۴، ۱۹۴) : قید خانہ۔

پنڈھلانا : پھسلانا۔

پنڈیائن (۱۷۵) : پجارن، مندر کی سب سے بڑی پجارن۔

پن سوئی (۱۴۰) : چھوٹی سی کشتی۔

پنگھوڑا (۱۴۴) : ایک طرح کا جھولا، جس میں چھوٹے بچے کو سلانے کے واسطے لٹا کر جھونٹے دیتے ہیں (آصفیہ)

پوست (۱۴۸) : کھال۔

پوشاکی (۲۴۳) : پہننے کے لائق۔ [مراد ہیں عمدہ کپڑوں کے تھان، جن سے پوشاک بنائی جا سکے]۔

پوکھر (۶۳) : تالاب، جوہڑ۔

پھانکڑے (۴۲) : مسٹنڈے، بانکے ترچھے، لفنگے۔

پھبتے ہے (۴۶) : زیب دیتا ہے۔

پھڑپھڑی اڑ (دیکھیے ص ۲۴۲)

پھسا ہنڈا (۴۲) : گندا، بدبودار، نامعقول۔

پھسا ہنڈے چوچلے : نامعقول باتیں۔ بے مزہ اور غیر مناسب ناز و انداز کی باتیں۔

پھسلا پنڈھلا کر (۵۸) : خوشامدانہ باتوں کا فریب دے کر، چکنی چپڑی باتوں میں لگا کر۔

پھسلایا (۲۱۲) : بہکایا (یعنی غلط اطلاع دی)۔

پھول اٹھ چکے (۱۳۵) : تیجا ہو گیا۔

پھوئیاں (۵۵) : پھوار۔

پھیپھڑی (۹۲) : گرمی یا پیاس کے سبب ہونٹوں کے سوکھ کر پپڑی سی بندھ جانے کو کہتے ہیں۔

پھینٹا (۳۰) : چھوٹی پگڑی، صافہ۔

پیادہ (۱۳۶، ۱۳۸، ۱۴۳، ۱۴۴) : ہرکارہ، چپراسی، حاکم یا قاضی کی عدالت کا ملازم۔

پیت کی پیت رہے اور میت کا میت ہاتھ لگے (۲۴۲) : دوستی بھی قائم رہے اور مقصد بھی حاصل ہو جائے۔

[پیت : دوستی، محبت۔ میت : دوست، ساتھی]۔

پیٹھا (۲۱۶) : اندر داخل ہوا۔ (دریا کے پانی میں اترا)۔

پیٹھنا (۹۹) : داخل ہونا، اندر آنا۔

پیدا کر کے (۲۲۹) : ڈھونڈھ کر۔

پیدا کریں (۲۱۱) : حاصل کریں، ڈھونڈھ کر لائیں۔

پیدا ہوا (۹۲) : ظاہر ہوا۔

پے در پے (۵۷) : مسلسل، ایک کے بعد ایک۔

پیر (۱۰۱) : درد۔

پیر زال (۱۷۰) : بوڑھی عورت۔

پیر زن (۱۴۷) : بوڑھی عورت۔

پیر غلام (۱۲) : بوڑھا غلام (یہ مرکب مقلوب ہے، اصلاً "غلام پیر" تھا)۔

پیریں لگیں (۱۸۶) : درد زہ شروع ہوا۔ [دردِ زہ :

بچّہ پیدا ہونے سے پہلے جو درد ہوتا ہے]۔

پیڑھی بہ پیڑھی (۸) : ایک ہی خاندان میں، باپ کے بعد بیٹا اور اُس کے بعد اُس کا بیٹا۔ بابر کے بعد آخری مغل بادشاہ تک کے لیے کہا جا سکتا ہے کہ اِس خاندان میں پیڑھی بہ پیڑھی سلطنت چلی آئی۔

پیزارین (۷۲) : پیزار کی جمع۔ پیزار: جوتی۔

پیش کش : وہ نذرانہ (نقد یا مختلف قیمتی چیزیں) جو بادشاہ کے سامنے حاضری کے وقت پیش کیا جاتا تھا۔

پیکھنے کا کھیل (۱۷) : کٹھ پتلیوں کا کھیل، (پیکھنا: کھیل تماشا)۔

پیہم چلا گیا (۲۲۴) : برابر چلتا رہا، مسلسل سفر کرتا رہا۔

تا بہ مقدور : اپنی طاقت بھر، ممکن حد تک۔

تابوت : وہ صندوق جس میں لاش رکھی جائے۔

تاراج کیا (۶) : لوٹ لیا۔

تارکشی کا رومال (۱۳۲) : عمدہ کڑھائی کا رومال۔ (یا سونے چاندی کے تاروں سے جس میں نقش و نگار بنائے گئے ہوں)۔

تازی (۱۲۹) : عربی گھوڑے کے لیے آتا ہے، مگر اِسی عبارت میں "عربی" بھی موجود ہے پھر "تازی" کس معنی میں آیا ہے؟ میں یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتا، بہرحال گھوڑے کے لیے آیا ہے۔

تالیف (۴) : ربط دینا، ترتیب کے ساتھ جمع کرنا، مختلف کتابوں کے مضامین کا نئے پیرایے میں ترتیب دینا۔ تصنیف و تالیف کا فرق: تصنیف: اپنے دلی اجتہاد کے موافق کوئی تحریر لکھنا۔ تالیف: اوروں کے خیالات خاص رنگ میں یا اپنے رنگ میں ظاہر کرنا (نور)۔ چوں کہ یہ میر امّن کا اپنا لکھا ہوا قصہ نہیں، پہلے لکھا جا چکا تھا، اُس کو اپنے انداز میں لکھا ہے؛ اِسی لحاظ سے اِس کتاب کو "تالیف" کہا ہے۔

تالیف ہوئیں (۵) مرتب ہوئیں، (ترجمہ کرائی گئیں)۔

تالیقہ (۱۶۱) : مال و اسباب کی ضبطی۔ [تالیقہ۔ تعلیقہ]۔

تان سین (۳۳) : شہنشاہ اکبر کا درباری گائک، جو مشہور ماہرِ موسیقی تھا اور جس کا نام آج تک اُستادِ کامل کی حیثیت سے ادب و احترام کے ساتھ لیا جاتا ہے۔

تبر (۲۱۴) : کلھاڑی کی وضع کا بنا ہوا ہتھیار۔ یہ ہتھیار بھی ہوتا ہے اور اِس سے لکڑی بھی چیرتے ہیں مگر اِن دونوں کی بناوٹ میں ذرا سا فرق ہوتا ہے۔ تبر کا سر، کلھاڑی کے پھل سے مختلف ہوتا ہے۔ اور ہتھیار کے طور پر استعمال میں آنے والا تبر نسبتاً کچھ ہلکا ہوتا ہے۔ یہ ہتھیار اب بھی دیکھنے میں آتا ہے، سکھ سواروں کے پاس بھی ہوتا ہے۔

تپ (۲۳۱) : بخار۔

تتری (۱۳۰) : آوارہ۔

تجّار : تاجر کی جمع۔

تجویز کرے (۸) : فیصلہ کرے۔ مراد یہ ہے کہ حق بات

گئے، انصاف کرے۔

تجھ سارکے (۹۶): تجھ جیسے، تیری طرح۔

تحفہ (۲۴۲): عجیب و غریب، عمدہ، نفیس۔

[تحفہ کھلونے: عجیب عجیب کھلونے]۔

تحفہ علّت (۵۷): یہ کلمہ نفرت و حقارت کے اظہار کے لیے آیا ہے: عجیب و غریب مصیبت، انوکھی بیماری، عجیب چیز۔ [علّت: بیماری]۔

تختہ نرد (۱۹۴): شطرنج کے انداز کا ایک کھیل، جس کے لیے کہا جاتا ہے کہ اسے شطرنج کے جواب میں ایران میں ایجاد کیا گیا تھا۔ اسے چار پانسوں سے کھیلتے تھے۔

ترازو ہونا (۱۹۵): آدھے تیر کا نشانے سے گزر کر لٹکا رہنا۔

ترپولیا (۳۰): تین دروں کی شان دار عمارت، جس میں بیچ کا در نسبتاً بڑا ہوتا تھا۔ یہ در اہم بازاروں میں یا کسی خاص مقام پر بنائے جاتے تھے شاہی جلوس کے نکلنے کے لیے (ضمیمہ تلفظ و املا میں اس کی مزید تفصیل لکھی گئی ہے)۔

ترت (۷۱): فوراً۔

ترقیم کیا (۲۴۳): لکھا۔

ترک (۱۹۰، ۱۷۳): مسلمان۔

ترکِ حیوانات (۱۰۰): گوشت، انڈا، مچھلی، دودھ، دہی، گھی اور وہ چیزیں جن میں یہ ملے ہوئے ہوں، اُن کا کھانا چھوڑ دینا (بعض ایسے عمل ہوتے ہیں، جن کے لیے عمل کرنے والے (عامل) کو عمل کی مدت میں یہ چیزیں چھوڑنا پڑتی ہیں)۔

ترکش (۲۰۲): تیر رکھنے کا خانہ۔

تریا (دیکھیے ص ۶۸۳)

تسخیر (۱۰۸): حاضرات کا وہ عمل جس میں جنوں کو بلایا جا سکتا ہے، جنوں کو قابو میں لانے کا عمل۔

تشخیص (۴۵): مرض کا پہچاننا۔

تصدیع (۲۳): تکلیف۔

تعفّن (۱۸۸): بدبو، سڑاہند۔

تغافل ہوا (۱۲): غفلت کی گئی، توجہ نہیں کی گئی۔

تغیر کر کر (۸۰): ہٹا کر، نوکری سے الگ کر کے۔

تغیر ہو گیا (۱۰۴): چہرے کا رنگ اُڑ گیا۔

تفاوُت: تفاوت: فرق، غلط۔ یہ لفظ "غلط" اور "فرق" دونوں معنوں میں مستعمل رہا ہے۔ ص ۶۷ اور ۲۲۸ پر یہ "فرق" کے معنی میں آیا ہے اور ص ۱۴۴ پر "غلط" (یا جھوٹ) کے معنی میں آیا ہے۔

تفنّن (۸۰): دل بہلانا، تفریح، مشغلہ۔

تقصیر: کوتاہی، قصور، خطا۔

تقیّد (۹۲، ۱۰۲، ۲۰۵): تاکید، اصرار، روک ٹوک، تنبیہ۔

تکش (۱۹۵): ترکش، وہ خانہ جس میں تیر رکھتے ہیں۔

تکیئی (۸۷): چھوٹا تکیہ۔

تکیہ (۱۹۲): فقیر کے رہنے کی جگہ، فقیر کا گھر۔

تگ و دو (۲۰۵): دوڑ دھوپ، کوشش اور محنت۔

تل (۱۸۰): تیلا۔

تَلپھتے (۴۰، ۲۰۱) : تڑپتے، تڑپتے ہوئے۔
تلپھتے ہے (۲۴۲) : تڑپتا ہے۔
تَمامی (۲۴۲) : ایک قسم کا ریشمی کپڑا، جس کی بناوٹ میں سنہری یا رُپہلی بادلے کا چارخانہ بُنا ہوتا ہے۔ بعض مقامات پر خاص قسم کے سوتی کپڑے کو کہتے ہیں (اصطلاحات)۔
تُم سار کا (۱۶۲) : تم جیسا۔
تَمَسُّک (۱۳۸) : وہ تحریر جو قرض کی سند میں، قرض دینے والے کو دی جاتی ہے۔
تَمَلُّق : چاپلوسی، خوشامد، عاجزی۔
تناوُل فرمانا، تناوُل کرنا (۸۸، ۱۰۱) : کھانا کھانا۔
تُنکی (۷۷) : بہت پتلی اور چوڑی چکلی روٹی، جو عام طور پر پلاؤ وغیرہ کی قابوں پر ڈھکنے کے لیے پکائی جاتی تھی تاکہ چاول نرم اور گرم رہیں۔ اِس کا ایک نام "مانڈا" بھی ہے (اصطلاحات)۔
تو (۶۸) : تاکہ، اِس لیے کہ۔
تواضع کرنا : خاطر مدارات کرنا، مہمان داری کرنا، خوش اخلاقی سے پیش آنا۔ کوئی چیز عطا کرنا۔ [ایک گھوڑا... تواضع کیا (ص ۲۵) : ایک گھوڑا مجھے دیا۔ ایک پیالہ تواضع کیا (ص ۳۸) : خوش اخلاقی کے ساتھ شراب کا پیالہ میری طرف بڑھایا۔ کچھ تواضع کر کر رخصت کیا (ص ۹۵) یعنی خاطر مدارات کرکے اور کچھ نقد یا سامان دے کر رخصت کیا۔ تواضع کرتا (ص ۳۵) : خاطر مدارات کرتا، مہمان داری کرتا۔ تواضع کر کر شریک کیا (ص ۳۴) : مہمان نوازی کے طور پر شریک کیا۔]
توبڑا (۱۸۱) : تھیلا۔ [توبڑا اصلاً اُس تھیلے کو کہتے ہیں جس میں دانہ بھر کر گھوڑے کے منہ پر چڑھا دیا جاتا ہے۔ یہاں عام تھیلے کے معنی میں آیا ہے]۔
تورہ پوش (۸۷) : بانس کا بنا ہوا وہ خوان پوش جس سے تورے کے خوان کو ڈھانکتے تھے، اِس پر کارچوبی کے کام کا غلاف پڑا ہوا ہوتا تھا۔
تورے کا تورا چُن دیا (۷۷) : بہت زیادہ کھانا سامنے لاکر رکھ دیا۔ [تورہ : مختلف کھانوں کا ایک خوان یا کئی خوان، جو امرا کے یہاں شادی وغیرہ کے موقع پر کچھ روز پیش تر تقسیم کیے جاتے تھے۔ مختلف قسم کے لذیذ کھانے جو خوانوں میں لگاکر بڑے تکلف کے ساتھ تقریبات میں تقسیم کیے جاتے تھے]۔
تُوڑ (۲۳۷، ۲۴۱) : جھالر۔ (موتیوں کی توڑ : موتیوں کی جھالر)۔
تُوڑا : ایک ہزار روپے یا اشرفیوں کی بھری ہوئی تھیلی (آصفیہ)۔
تَوَقُّف کا مکان نہیں (۱۴۹) : یہ ٹھہرنے کی جگہ نہیں۔
تَوَقُّف کرو (۱۵۴) : رُک جاؤ، ٹھہر جاؤ (ابھی سزا نہ دو)۔
تَوَقُّف کیجیے (۷۹) : ٹھہریے، انتظار کیجیے۔

توقف ہوگا (۲۴۴): اگر دیر ہوگی، تاخیر ہوگی۔

تول (۱۶۸): وزن۔ جواہرات کی تین صفات قابلِ لحاظ ہوتی ہیں: سنگ، ڈھنگ، رنگ یعنی وزن اور قطع یا جسامت اور رنگ۔ یہاں وہی تینوں صفتیں مذکور ہوئی ہیں۔

تولّد (۱۰۲): بچے کا پیدا ہونا۔ [تولد ہوا ہے: پیدا ہوا ہے]۔

تونگر (۱۶۸): مال دار۔

تھالی (۳۶): تانبے، پیتل یا کانسے کی چھوٹی رکابی۔ [یہاں تھالی سے وہ تشتری مراد ہے جس پر کٹورا یا گلاس رکھ کر اور سرپوش سے ڈھک کر مہمان کے سامنے پیش کیا جاتا ہے]۔

تھانبنا (۸۶): تھامنا۔

تہ پوشی (۳۶): مولوی سید احمد دہلوی نے اپنی کتاب رسومِ دہلی میں "ساچق" کی جو تفصیلات لکھی ہیں، اُن میں دلھن کے چوتھی کے جوڑے کے ذیل میں لکھا ہے: "اس میں زربفت کی کلیوں دار تہ پوشی، آنچل پلّو کا لال دوپٹّا..." اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کلیوں دار پاجامے کی ایک قسم کو تہ پوشی کہتے تھے۔ [آج کل کے لحاظ سے اسے "پیٹی کوٹ" کہا جاسکتا ہے]۔

تھل بیڑا (۶۴): ناؤ یا جہاز کے ٹھہرنے کی جگہ؛ بندرگاہ؛ کنارہ۔ (آصفیہ)۔ [تھل بیڑا نہ پایا: نہ تو ساحل نظر آیا اور نہ ایسی کوئی چیز دکھائی دی جس کے ذریعے سے اس دریا کو پار کیا جاسکے]۔

تھلکنا (۸۶): دھڑکنا۔

تئیں: کو، واسطے، لیے۔ یہ کلمۂ ربط ہے اور متعدد لفظوں کے ساتھ استعمال کیا جاتا تھا، اس کتاب میں بھی جگہ جگہ یہ لفظ آئے ہیں، جیسے: اپنے تئیں: اپنے آپ کو۔ میرے تئیں: مجھے۔ بےکسوں کے تئیں: بےکسوں کو۔ اس کے تئیں: اس کو۔ (وغیرہ)

تیرے کارنے (۲۰۹): (تیرے کارن) تیری خاطر۔

تیزآب (۵۰۷): ایک کیمیائی مرکب جسے انگریزی میں "ایسڈ" کہتے ہیں۔ مجازاً: بہت تیز مشروب، عرق۔

تیہے میں آکر (۴۷): بہت غصے میں آکر۔

ٹک: ذرا۔

ٹنڈیاں (۱۵۴،۷۲): آدمی کے دونوں بازو۔ ٹنڈیاں کسنا: مجرم کے دونوں بازوؤں (یا ہاتھوں) کو جکڑنا۔ دیکھیے مشکیں کسنا۔

ٹنگیانا (۲۱۵): گھوڑے کو اڑنگا لگانا (ع)۔

ٹھڈّیاں (۲۲): "ٹھڈّی" کی جمع۔ ٹھڈّی: بھنے ہوئے اناج کا وہ دانہ جو کھلا نہ ہو، خستہ نہ ہوا ہو۔

ٹھہرا اور سادھ کر (۱۰۲): دیکھ بھال کر، سوچ بچار کرکے اور اچھی طرح حساب لگا کر۔

ٹہل (۱۲۹): خدمت، خدمت گاری، کام کاج۔

ٹھیپ (۱۹): وہ ٹھیکرا جس میں فقیر آگ رکھتے ہیں (ع۔ پلیٹس)۔

ٹینٹی (۲۳۹): ایک کانٹے دار جھاڑی جسے "کریل" بھی کہتے ہیں۔ [اس کے پھل کو بھی ٹینٹی کہتے ہیں اور اس پھل کا اچار بھی بنایا جاتا ہے]۔

ثابت خانی (۲۲): مسلح سپاہی۔ [ظاہر ہے کہ سپاہیوں کی کوئی خاص قسم ہوگی، میں اس کے متعلق قطعی طور پر کوئی بات معلوم نہیں کرسکا]۔

ثانی (۴): دوسرا، مانند (اُس جیسا)۔

ثانیُ الحال (۲۴۴): اُس کے بعد۔

جاروب کشی (۱۳۹): جھاڑو لگانا، صفائی کرنا۔

جاگیر (۲۴۰): وہ قطعۂ زمین، گاؤں یا علاقہ، جو بادشاہ کی طرف سے امرا اور منصب داروں کو عطا کیا جاتا تھا کہ اُس کی آمدنی (لگان، محصول وغیرہ) اپنے خرچ میں لائیں۔ دفتر کی اصطلاح میں اسے "یتول" کہتے تھے۔ ملک کا ایک حصّہ جو ماہانہ تنخواہ کے عوض عطا کیا جاتا تھا۔ (بہارِ عجم)۔

جاں باز (۶۳): جفاکش، محنتی۔ (مراد ہے ایسے گھوڑوں سے جو بہت دیر تک دوڑ سکتے ہوں اور بہت دور تک پہنچ سکتے ہوں)۔

جان بہ حق تسلیم ہونا (۱۵۶، ۲۱۸، ۲۲۵): مرجانا۔

جاں فشانی (۹): بہت محنت، بہت کوشش۔

جاں فشانی بجالاتے رہے: جان توڑ کر کام کرتے رہے، بہت زیادہ کوشش کرتے رہے۔

جاں کندنی: جان نکلنا۔ نزع کا عالم۔

جاہی جوہی (۵۶): ایک قسم کی آتش بازی جس میں جنگلی چنبیلی کی طرح کے بہت سے پھول نکلتے ہیں۔

جائی (۱۳۰): بیٹی۔

جب بیل پھوٹی، رائی رائی ہوگئی (۲۱۵): بیل کا چھلکا (جو گویا اُس کا خول ہوتا ہے) بہت مضبوط ہوتا ہے، مگر جب وہ ٹوٹ جاتا ہے تو پھر اُس کا گودا بکھر جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ فوج کی بہادری اور مضبوطی سردار کے وجود پر منحصر ہے، جب سردار مرگیا تو فوج بکھر گئی۔

جب تئیں (۹۵): جب تک۔

جٹا دھاری (۱۰۹): وہ شخص جس کے سر کے بالوں کی لمبی لمبی لٹیں ہوں۔ شوجی کا پجاری۔

جدّوکد: کوشش، محنت مشقت۔

جُدی (۸): الگ۔

جُدی جُدی (۴۳، ۸): الگ الگ۔

جُرّہ (۱۹۴): مشہور شکاری پرندہ، باز کی ایک قسم، نر باز کو بھی جُرّہ کہتے تھے۔

جڑاؤ: جس میں جواہرات جڑے ہوئے ہوں، مرصّع۔ (عام نگینے جڑے ہوں تو اُس کو بھی جڑاؤ کہتے ہیں)

جڑاؤ کے (۶۷): مرصّع برتن، ایسے برتن جن میں جواہرات جڑے ہوئے ہوں۔

جڑاؤ کا بنا ہوا (۲۲۱): مرصّع کے کام کا، جس میں جواہرات جڑے ہوئے ہوں۔

جزبز ہوا (۲۴۸): غصّے ہوا، ناراض ہوا۔

جَست کرکر (۱۴۹): کُدا کر (گھوڑے کو کُدا کر)۔

جس کی نہ پھٹی ہو بوائی کیا جانے پیر پرائی (۱۰۱): (مثل) جس کو کبھی دکھ نہیں پہنچا، وہ دوسرے کی تکلیف کو کیا سمجھے گا۔

جُسن ہوگا (۲۸) : ثواب ملے گا۔
جُفت (۹۳) : برابر کا، مثل، طرح۔ [طاقِ کسریٰ کا جُفت ہو: نوشیروان بادشاہ کے محل جیسا ہو]۔
جگر سوز (۱۰۱) : جس کا دل جلا ہوا ہو۔ [بادشاہ زادۂ جگر سوز: ایسا شہزادہ جو عشق کی آگ کا جلا ہوا ہے]۔
جَلا وطن ہوا (۲) : اُس شہر کو چھوڑنا پڑا۔
جَل بَل کر (۶۲) : جل بھُن کر۔ (بَلنا: سلگنا، جلنا، بھڑکنا)۔
جَلد (۲۱۴) : تیز رفتار۔
جَلد دست (۹۳) : تیز ہاتھ چلانے والے، جلدی کام کرنے والے۔
جَلد گیا (۱۴۹) : تیز دوڑایا۔
جِلَو کر کر (۹۵) : پیشوائی کر کے، ساتھ چل کر۔
جِلَو میں لے کر (۲۱۵) : ساتھ لے کر۔
جِلَو میں ہو لیے (۱۷۲) : ساتھ چلنے لگے۔
جنابِ باری میں (۱۳۷) : خدا کی درگاہ میں۔
جنتر منتر کرنا (۲۳۱) : بُری روحوں کو آتارنے اور بھگانے کے لیے ٹوٹکا کرنا، منتر پڑھنا اور ایسے ہی عمل کرنا۔
جنم بھُوم (۲) : وہ جگہ (گانو، شہر وغیرہ) جہاں کوئی شخص پیدا ہوا ہو۔
جنم پتری (۱۰۲) : زائچہ، لگن کنڈلی۔ وہ کاغذ جو بچے کی پیدائش کے وقت جوتشی، ستاروں کے حساب کے مطابق تیار کرتے ہیں، جس میں پیدائش کے وقت ستاروں کا نقشہ اور اُن ستاروں کی نسبت سے اُس کی عمر کا احوال اور احکام کا حساب لگایا جاتا ہے۔
جِنّیات (۲۴۵) : جن کی جمع۔ [عالمِ جنّیات کو: سب جنّوں کو]۔
جواب دے کر (۱۱) : منع کر کے۔ یعنی سب امیروں اور مصاحبوں کو دربار میں حاضر ہونے سے منع کر دیا۔
جواں مردی : بہادری، سخاوت۔
جواہر میں جڑی (۸۶) : بہت سے جواہرات پہنے ہوئے۔
جُوگا (۱۵) : لائق۔ (اپنے جوگا: اپنے لائق)۔
جُوگنی کو پیٹھ دے کر (۱۴۹) : بُری ساعت اور سمت بچا کر۔ [جوگنی: علم نجوم کے مطابق وہ روحیں جن کے اختیار میں اچھے بُرے وقت ہوتے ہیں۔ یہ مقرر ہے کہ کن تاریخوں میں وہ کس سمت میں ہوں گی۔ (تفصیل آصفیہ میں) اُن تاریخوں میں اُس سمت میں سفر نہیں کرتے، اُس کے مخالف سمت میں سفر کا آغاز کرتے ہیں]۔
جون پور کا پُل : دیکھیے ضمیمۂ تشریحات و اختلافِ نسخ میں ص ۱۵ کا حاشیہ (۲)۔
جَوتَرا بھَوتَرا (۹۱) : الگ مکان، تہ خانہ (ع) [مراد یہ ہے کہ دنیا کو نہیں دیکھا تھا، محل کے اندر پرورش پائی تھی]۔
جھاڑ (۴۹) : بلوریا آبگینے یا دھات، پیتل کا، درخت کی شکل کا فانوس، جو بادشاہوں اور امیروں کے

مکانوں میں روشنی اور آرائش کے واسطے لٹکایا جاتا تھا۔
[جھاڑ : جھاڑی، کانٹوں کی جھاڑی، وہ چھوٹا درخت جس میں کانٹے اور پتے بہت ہوں۔ جھاڑ دار : جو جھاڑ کی شکل کا ہو]۔

جھاڑا جھٹکا پھر (۱۱۴) : ضروریات (پیشاب پاخانہ) سے فارغ ہو کر۔

جہاں تہاں کا (۱۹۸) : ادھر ادھر کا، یعنی مختلف ملکوں کا۔

جہاں دیدہ (۶۹) : دنیا دیکھے ہوئے، تجربے کار۔

جھروکا (۱۵۰) : وہ کھڑکی جو شاہی محل یا ایوان میں، پائیں باغ کی طرف یا میدان یا دریا کی طرف کھلتی تھی (اسے "جھروکۂ درشن" بھی کہتے تھے)۔

جھڑنے لگیں (۲۴۰) : بہنے لگیں۔

جھلابور (۱۰۳) : چمکیلا، جگمگاتا، زرق برق۔

جھلم (۲۰۶) : پتلی زنجیروں کی بنی ہوئی وہ نقاب جو خود (لوہے کے بنے ہوئے سر پر پہننے کے ٹوپ) میں لٹکتی رہتی تھی اور لڑائی کے وقت منہ پر ڈال لی جاتی تھی۔ جھلم کا ٹوپ : وہ ٹوپ جس میں جھلم لگی ہوئی ہو۔

جھول (۱۹۴) : وہ کپڑا جسے مختلف جانوروں (جیسے ہاتھی، گھوڑے، بیل وغیرہ) کے اوپر (سردی سے بچاؤ کے لیے یا محض آرائش کے لیے) ڈالتے ہیں۔

جی (۲۳۴) : شخص، انسان۔ [دونوں جی : ہم دونوں۔ دونوں آدمی]۔

جیدھر تیدھر (۲۳۱) : ادھر ادھر۔

چار آئینہ (۱۴۹) : ایک طرح کی زرہ، جس میں چار لوہے کے تختے، بانات اور مخمل میں منڈھ کر سینے اور پیٹھ کی طرف لگائے جاتے تھے۔

چار چند (۸۲) : چوگنا۔

چار دانگ : چاروں سمتیں۔ (دانگ : سمت)۔

چار دانگ ملک (۱۹۸) : چاروں سمتوں میں جو ملک ہیں، مراد ہے ساری دنیا۔

چار دانگ دنیا (۲۴۵) : ساری دنیا۔

چار زانو بیٹھنا (۹۸) : آلتی پالتی مار کر بیٹھنا۔

چارقب (۲۲۴) : ایک طرح کا لباس جسے امرا پہنتے تھے (غیاث اللغات) [صدری کی طرح کا ایک لباس (ع)۔ چارقب موتیوں کی : موتیوں سے آراستہ چارقب]۔

چار گردے کے گھوڑے (۹۴) : بہت مضبوط اور دم خم رکھنے والے گھوڑے، جو بہت دیر تک دوڑ سکیں، جلدی نہ تھکیں۔

چالاک (۹۳) : تیز رفتار۔

چاندنی (۸۷، ۱۲۵) : سفید فرش، وہ سفید چادر جو فرشی دری کے اوپر بچھائی جائے۔

چاؤ چوز (۲۱) : لاڈ پیار، ناز و نعمت۔

چاہیتا (۱۴۷) : چاہیے ہوتا۔

چٹلا (۹۳) : سونے یا چاندی کا گچھا سا، جو چوٹی کے پیچھے عورتیں لگا لیتی ہیں۔

چپے بپے (دیکھیے ص ۶۶۳)

چراغاں (۴۹) : بہت سے چراغوں کا روشن ہونا، دیپ مالا۔

چَرتَر (۱۹۲) : مکر، فریب۔

چرخی (۵۹) : آتش بازی کی ایک قسم جس میں ایک چھوٹا (یا بڑا) چکر تیزی سے گھومتا ہے اور آتش بازی کے پھول چاروں طرف برستے ہیں۔

چرم (۱۴۲) : چمڑا، کھال۔

چَرَن بَرداری (۲۱۳) : خدمت۔ [چرن: اصلی معنی: پیر۔ مجازی معنی: جوتا۔ چرن بردار: امیروں کی جوتیاں اٹھانے والا، خادم، کفش بردار]۔

چَرَڑھواں جوتا (۱۰۷) : اُٹھی اڈی کا مردانہ جوتا، جس میں پیر جما رہتا ہے۔ [اڈی: ہندستانی جوتے یا جوتی کا پچھلا کھڑا حصہ، جو پیر کی ایڑی پر چڑھایا جاتا ہے۔ "چڑھواں" کے مقابل "بٹھواں جوتی" ہوتی تھی، بغیر اڈی کی، بٹھائی ہوئی جوتی یا جوتا۔ (اصطلاحات)]۔

چشم نمائی (۱۳۶) : تنبیہ کرنا، جھڑکنا۔

چَکماک (۲۴) : چقماق یا چوتمق، وہ پتھر جس سے آگ نکلتی ہے۔ (اِس پتھر کے ٹکڑوں کو باہم رگڑنے سے چنگاریاں نکلتی تھیں، پرانے زمانے میں اِسی طرح آگ سلگائی جاتی تھی)۔

چِلّا : چالیس دن کی مدت۔ [ایک چلّا گزرا (۱۰۸) : چالیس دن ہو گئے۔ ایک چلّے میں (۲۰۵) : چالیس دن میں]

چلمچی (۲۸۷) : ہاتھ منہ دھونے کا ایک خاص ڈھنگ کا بنا ہوا برتن، جس کے منہ پر سوراخ دار ڈھکن ہوتا تھا، تاکہ پانی اُس کے نیچے پیندے میں جمع ہو۔ (یہ برتن عموماً تانبے کا ہوتا تھا)۔

چِلّہ (۱۹۵) : کمان میں تانت کا وہ حصّہ جہاں پر تیر جوڑ کر چلایا جاتا ہے۔

چلّے بیٹھنا (۱۱۰) : چالیس دن تک گوشۂ تنہائی میں بیٹھنا اور (کسی مقصد کے حاصل کرنے کے لیے) مقررہ وظیفہ پڑھنا۔

چُمّاق (۱۸۲) : لوہے کا شش پہلو (چھے پہلوؤں والا) گرز۔ موٹا ڈنڈا جس کا سر گرہ دار ہو۔

چِملا (۲۴۱) : بھیک کا کاسہ۔

چند در چند (۳۴۲) : بہت سے، کئی ایک۔

چندے : کچھ دن، تھوڑی سی مدت۔

چنگیر : پھیلے ہوئے منہ کا برتن یا اتھلی ٹوکری، جس میں پھول (اور پھل) رکھتے ہیں۔ پھولوں کی ٹوکری۔

چوبدار (۵۱) : محل کا دربان۔

چوبے (۱۷۰) : برہمنوں کی ایک شاخ، متھرا اور اُس کے اطراف میں ان کی بیش تر آبادی تھی۔ یہاں مراد ہے اُس چوبے سے جو مندر میں پجاری ہو یا ایسا ہی کوئی اور کام کرتا ہو۔

چوپَڑ (۱۹۴) : چوسر، پچیسی، مشہور کھیل۔ اِس میں ۱۶ مُہرے ہوتے ہیں چھالیا کی شکل کے، چار رنگ کے۔ انھیں "نرد" یا "گوٹ" کہتے ہیں۔ "چوسر"

پانسے سے کھیلی جاتی ہے اور "پچیسی" کوڑیوں سے۔

چَوجُگی (۷) : بہت پُرانا۔ مراد یہ ہے کہ یہ بہت پُرانی آبادی ہے۔ [چَوجُگی : "چار جُگ والی۔ ہندوؤں کے عقیدے میں دُنیا کی عمر چار جُگوں کی ہے، ہر جُگ کئی لاکھ سال کا ہوتا ہے" (ع)۔]

چَوڈُول (۳۷، ۲۳۷) : (لفظی معنی : چاروں طرف باڑ والا) تام جھام کی طرح کی سواری، جس کو کہار کندھوں پر اُٹھاتے تھے۔ چوپہلا، سُکھپال۔ (اصطلاحات)۔

چَوکی (۲۰۴) : پہرا [گاڑھی چَوکی : سخت پہرا]۔

چَوکی آن بیٹھی (۲۱۱) : پہرا لگ گیا۔

چَوکی میں تھے (۲۳۰) : پہرے پر تھے۔

چَوگان بازی (۱۵۰) : پولو کی طرح کا ایک پُرانا کھیل، جو گھوڑے پر بیٹھ کر پولو کی طرح کھیلا جاتا تھا۔ ["چَوگان" اُس ڈنڈے کو کہتے تھے جس سے یہ کھیلا جاتا تھا اور جس کا نیچے کا سِرا، ہاکی کی اسٹک کی طرح، مُڑا ہوا ہوتا تھا]۔

چَوگوشہ (۳۰، ۸۸) : چوکھنٹی کشتی، جس میں چیزیں اُسی طرح رکھی جاتی تھیں اور بھیجی جاتی تھیں جس طرح لکڑی کے خوان میں یا تانبے کی سینی میں بھیجی جاتی تھیں۔ البتہ "خوان" بڑا ہوتا تھا۔ پُرانا لفظ اِس کے لیے "کشتی" ہے، جو اب بھی سُننے میں آجاتا ہے۔ خیال یہ ہے کہ چَوگوشہ (خوان کی طرح) لکڑی کا بنا ہوا ہوتا ہوگا۔

چَوگھرا (۸۰) : چار خانوں کا، سونے چاندی یا تانبے کا بنا ہوا ظرف جس میں کھلوریاں، لونگ، الائچی اور چکنی سپاری رکھتے تھے۔

چھاپ (۱۸۲) : اِس لفظ کے معنی ہیں : مُہر، ٹھپّا۔ مگر یہاں یہ لفظ انگوٹھی کے لیے آیا ہے۔ چونکہ پُرانے زمانے میں مُہر کے لیے ایک خاص طرح کی بنی ہوئی انگوٹھی کو بھی استعمال کیا جاتا تھا، اِس نسبت سے یہ لفظ یہاں نشان کی انگوٹھی کے مفہوم میں آیا ہے۔

چھاتی پر سانپ پھر گیا (۲۲۰) : بہت صدمہ پہنچا، بہت ملال ہوا۔

چہاردہ معصوم (۲۴۹) : حضراتِ شیعہ کے عقیدے کے مطابق مراد ہیں : بارہ امام، رسول اللہؐ اور حضرت فاطمہؓ (دیکھیے "بارہ امام")۔

چھب تختی (۵۱) : سینے اور جسم کی خوب صورتی، جسامت کا خوش وضع ہونا۔ چھب تختی درست ہوئی : جسم بھر گیا، سڈول ہوا۔

چھپر کھٹ (۸۷) : (چھپر + کھاٹ = چھپر کھٹ) پُرانے زمانے کا بھاری پلنگ، جس پر شہتیری یا چھت گیری لگانے کے لیے چار ڈنڈوں کے اوپر چوکھٹا لگا ہوتا تھا اور چاروں طرف باریک کپڑے کے پردے لگے ہوتے تھے۔ امرا کے یہاں اِس کے پایے (جو ایک خاص وضع کے اور بھاری ہوتے تھے) چاندی کے بھی ہوتے تھے۔ بھرت کے اور لکڑی کے پایے بھی ہوتے تھے۔ دُلھنوں کے لیے

اِس کا استعمال خاص تھا۔ جہیز کے سامان میں یہ شامل ہوتا تھا۔ [مسہری میں اور اِس میں خاص فرق یہ تھا کہ مسہری تکیے دار بنتی تھی اور تکیہ (سرھانا) منقش ہوتا ہے۔ مسہری کے پایے بھی مختلف وضع کے ہوتے تھے]۔

چھتر باندھے ہوئے (۶۵): چاروں طرف پھیلا ہوا، چھتری بنائے ہوئے۔

چھتر (۱۱): ایک طرح کی مرصّع چھتری، جو بادشاہوں کے سر پر لگائی جاتی تھی۔ چتر۔

چھتّیس فرقۂ رعیت (۱۸۶): ہر طبقے اور فرقے کے سب لوگ۔ مراد ہے ساری رعیت، اُس ملک یا شہر کے سب رہنے والے، امیر غریب چھوٹے بڑے عورت مرد (وغیرہ)۔

چہچہی (۵۵): بہت شوخ سُرخ رنگ کی۔

چھڑیاں (۹): جھنڈیاں۔ چھڑیوں کا میلا: وہ میلا جو کسی بزرگ کی چھڑیوں کے نام سے کیا جاتا ہے، جیسے: مدار کی چھڑیاں، میراں جی کی چھڑیاں (آصفیہ)۔

چھلاوا ہو گیا (۱۹۵): غائب ہو گیا [چھلاوا: آسیب۔ مطلب یہ ہے کہ جس طرح آسیب اچانک نظروں سے غائب ہو جاتا ہے، اُسی طرح وہ بھی غائب ہو گیا]۔

چھوٹ (۱۳۳): چمک، عکس۔

چھوچھو: بچے کے پوتڑے دھونے اور کھلانے والی عورت۔

چیلا (۱۴۴، ۲۲۴): خاص شاہی ملازم، شاہی غلام۔

چیں بہ جبیں ہو کر (۴۷): پیشانی پر شکنیں ڈال کر۔ ناراض ہو کر۔

حاتم: زمانۂ جاہلیت (زمانۂ قبلِ اسلام) کا ایک شاعر، جو قبیلۂ طے سے تعلّق رکھتا تھا اور بہادری اور سخاوت میں مشہور تھا۔ سخاوت کے لیے اِس کا نام ضرب المثل کے طور پر لیا جاتا ہے۔ اِس کا دیوان پہلی بار لندن میں ۱۸۷۲ء میں چھپا ہے۔ اِس کا ترجمہ جرمن زبان میں بھی ہوا ہے (المنجد حصّۂ دوم، اشاعتِ نوزدہم)۔

حاذق (۱۰۵): ماہر، کامل (طبیب کی صفت کے طور پر آتا ہے)۔

حاضرات (۱۰۹، ۱۱۰): وہ عمل جس کی مدد سے بُری روحوں، نیز جنوں کو بلایا جاتا ہے۔ [حاضراتِ جن و پری: وہ عمل جس کی مدد سے جنوں کو بلایا جا سکے]۔

حاضری (۱۵۵): ناشتا۔ (۱۹۶): تھوڑا سا کھانا جو اُس وقت موجود ہو۔

حُباب (۵۵): شیشے کے کنٹول۔ میرامن نے یہاں اِسے شراب رکھنے کے اُس شیشے کے معنی میں استعمال کیا ہے جو حباب (بلبلے) کی شکل کا ہو۔

حتّی المقدور (۲۲۹): جہاں تک طاقت ہے، امکان بھر۔

جراحی (۱۵۶): ڈاکٹر۔

حرفِ زندگی پر ہے (۸۰) : زندگی کو خطرہ ہے، (شاید موت کی سزا ملے)۔

حصار (۱۸۸) : چہار دیواری، احاطہ۔

حظ (۱۸۵) : لطف، لذت۔

حلبی آئینے (۸۹) : حلب۔ (ملکِ شام کے مشہور شہر) کے بنے ہوئے آئینے، جو پرانے زمانے میں بہت مشہور تھے اور اعلا درجے کے مانے جاتے تھے۔

حلقہ بہ گوش (۲۲۸) : تابع دار، فرماں بردار [حلقہ بہ گوش کرکے : مراد ہے کہ شکست دے کر پکڑ کرکے آئے]۔

حیران ہوکر (۷) : پریشان ہوکر، مصیبتیں اٹھاکر۔ مطلب ہے شکست کھاکر، لڑائی میں ہار کر۔

حیص بیص (۳۵) : مراد یہ ہے کہ انھی مختلف خیالوں میں الجھا ہوا۔ [لفظی معنی ہیں : بحث، جھگڑا، تکرار، ردّ و قدح وغیرہ]۔

حیف ہے (۶۲) : افسوس ہے۔ (۶۶) : بے کار ہے، قابلِ افسوس ہے۔

خاتم : انگوٹھی۔

خاص بردار (۲۲) : بندوق اٹھاکر ساتھ چلنے والا ملازم۔ ایک قسم کے سپاہی جو بادشاہ یا امیروں کی سواری کے آگے، کندھوں پر بندوق رکھ کر ساتھ چلتے تھے۔

خاصدان (دیکھیے ص ۶۸۳) ____________

خاصہ (۱۶، ۹۶) : بادشاہوں (یا امیروں) کا کھانا (خاصہ نوشِ جان فرماکر : کھانا کھاکر)۔

خاصی پوشاک (۴۵) : بہت اچھا لباس۔

خاصے (۴۷) : عمدہ، اچھے۔

خاطر جمع کرنا : اپنا اطمینان کرلینا، مطمئن ہوجانا۔

خاطر جمع ہونا : اطمینان ہونا۔

خاطر جمعی : اطمینان۔

خاک نشین (۸۲) : (کلمۂ عاجزی ہے) خاکسار۔

خاگینہ (۷۷) : کتری ہوئی پیاز ملاکر قیمے کی طرح پکایا ہوا انڈوں کا سالن، تلے ہوئے انڈے۔

خام ہوا (۱۹۲) : غلط ثابت ہوا۔

خانساماں (۹۲، ۲۰۰) : مہتمم، ناظر، میر ساماں۔

خانہ زاد : غلام، نوکروں یا پرانے زمانے میں لونڈیوں غلاموں کی وہ اولاد جو آقا کے گھر میں پیدا ہوئی ہو اور بڑھی پلی ہو۔ کنایتاً : بہت پرانا ملازم : گو ایک بادشاہ کے سب خانہ زاد ہیں ؛ در بار دار لوگ بہم آشنا نہیں (غالب)

خانہ زادِ موروثی (۹، ۱۴، ۲۲۰) : مراد ہے ایسے ملازم سے جس کے باپ دادا بھی شاہی ملازمت میں رہے ہوں۔ یا وہ پرانے ملازم جو باپ دادا کے وقت سے چلے آرہے ہوں۔

خاوند (۲، ۸۵، ۱۴۹) : آقا، مالک۔ (یہ خداوند کا مخفف ہے)۔

خاوند (۱۷۰) : شوہر۔

خبر شرط (۸۴، ۲۷۲) : کلمۂ تنبیہ کے طور پر آیا ہے، مراد یہ ہے کہ اس راز کی حفاظت ضروری ہے،

احتیاط ضروری ہے۔

خجالت : شرمندگی۔

خجل : شرمندہ۔

خداوند : آقا، مالک۔

خدمت (۱۹۰) : عہدہ، منصب، ذمے داری۔

خراج (۱۷۸) : سالانہ محصول۔ وہ مقررہ رقم جو ماتحت حاکم یا حکمراں کی طرف سے سالانہ شاہی خزانے میں جمع کی جاتی تھی۔

خرد خام کرنا (۱۴۳) : خوب مارنا پیٹنا، ہڈی پسلی ایک کر دینا۔

خردسالی (۱۹۰) : بچپن، لڑکپن، کم عمری۔

خرد ماغی (۵۳) : غرور، گھمنڈ۔

خریطہ (۲۰۲) : تھیلی، وہ لفافہ جس میں اُمرا کے نام شقہ بھیجا جائے۔

خزانۂ عامرہ (۵۵) : شاہی خزانہ۔

خشت (۲۲۲) : اینٹ۔

خط (۵۵) : تحریر، دستاویز۔

خطا (۱۷۹) : چینی ترکستان (شمالی چین) کے ایک علاقے کا نام (تفصیل کے لیے دیکھیے برہانِ قاطع مرتبہ ڈاکٹر معین مفصل حاشیہ بذیلِ لفظ "خطا")

خلش کر رہا ہے (۸۶) : چبھ رہا ہے، کھٹک رہا ہے۔

خلعت : دیکھیے ضمیمہ تشریحات و اختلافِ نسخ میں صواہم کا حاشیہ (۹)۔

خلقت (۳) : مخلوق۔ مراد ہے انسانوں سے۔

خلوت : تنہائی۔

خلوت خانہ (۱۰۸، ۱۰۹) : تنہائی میں بیٹھنے کی جگہ، رہنے کی جگہ

خمارشکنی (دیکھیے ص ۶۸۳) ————

خمس (۱۴۳) : فقہِ جعفریہ کے مطابق مال کا پانچواں حصہ جو غریبوں اور لاوارثوں کے لیے دیا جائے۔ (اصلی معنی: پانچواں حصہ)۔

خمیں (۲۲۱) : جمع ہے "خم" کی۔ خم : مٹکا۔

خوابِ خرگوش (۲۲۳) : غفلت کی نیند، غفلت۔

خواجہ سرا (۳۹) : وہ خصی غلام جو محل کے اندر آتے جاتے تھے۔ [وہ غلام جن کا عضوِ تناسل بچپنے ہی میں کاٹ دیا جاتا تھا۔ یہ عضو بریدہ لوگ بادشاہوں اور امیروں کی محلسراؤں میں بلا تکلف ہیں آتے جاتے تھے اور احکام پہنچانے کی خدمت بھی بجالاتے تھے۔ "ہیجڑے کا اعزازی نام خواجہ سرا قرار پایا" (آصفیہ)]۔

خواص (۲۳۷) : خاص شاہی ملازم۔

خواص پُرا (۲۰۰) : محل کا وہ حصہ جو مسلازمین (خواصوں اور کنیزوں) کے لیے مخصوص کر دیا گیا ہو۔

خواصیں (۴۸، ۱۰۳) : وہ خاص ملازمائیں یا مصاحب عورتیں جو شہزادیوں اور امیرزادیوں کے ساتھ رہتی تھیں۔

خوجہ (۳۷، ۴۰) : دیکھیے خواجہ سرا۔

خود رَو (۱۵۵) : اپنے آپ اُگنے والا۔

خورجی (۴۷) : وہ بڑا تھیلا جو ٹٹو کی پیٹھ پر ضروری اسباب رکھنے کے واسطے باندھ دیتے ہیں۔

خُورِش (۲۳۶): کھانا، خوراک، (خواب و خورش، سونا اور کھانا)۔
خُوزادی (۳۶): "خوزادہ" کی تانیث۔ خوزادہ: سردار۔
"سادی خُوزادی" کا مطلب ہے کہ بغیر گہنے پاتے اور بناؤ سنگار اور رکھ رکھاؤ کے حُسن اور امارت کی شان نمایاں تھی۔
خوش (۹۸): اچھی۔
خوش خوری کے سبب سے (۵۰): اچھی اچھی غذائیں کھانے کی وجہ سے۔
خوگیر (۱۴۹): نمدے کی بنی ہوئی وہ گدّی جو گھوڑے کی کاٹھی کے نیچے پسینا جذب کرنے اور گھوڑے کی پیٹھ نہ چھِلنے کی غرض سے رکھی جاتی ہے۔ نمدزین۔
دادا: بڑی عمر کا شخص۔ پُرانا بوڑھا ملازم۔ جس شخص کو کسی مرد نے پالا ہو، یا خدمت کی ہو تو وہ پالنے والا اور خدمت کرنے والا بھی "دادا" کہلاتا ہے (آصفیہ)۔ اِس کتاب میں یہ لفظ جہاں بھی آیا ہے (مثلاً ص ۱۲۱، ۲۲۰، ۲۲۳، ۲۲۷) ایسے پُرانے بوڑھے ملازم کے مفہوم میں آیا ہے جس نے بچپنے میں پرورش و پرداخت میں حصّہ لیا ہو اور خدمت کی ہو۔
دادِ الٰہی (۲۱۵): خُدا کی دین۔
داد و دہش: سخاوت، ["داد" اور "دہش" دونوں کا مصدر "دادن" ہے]۔

دارُالخِلافت (۸): راج دھانی، پایۂ تخت۔
دارُالشَّرع (۱۳۶): قاضی کی عدالت۔
دارُالشِّفا (۴۴): شفاخانہ۔
دارُو دَرمَن (۲۹، ۱۰۹): دوا علاج۔
دامن ہاتھ لگا ہے (۶): سہارا ملا ہے۔
دانت کاٹی روٹی کھاتے تھے (۲۲): بہت زیادہ دوست تھے، ہر وقت کا ساتھ رہتا تھا۔
دائی (۴۹): انّا، دودھ پلانے والی عورت۔
داؤدی (۵۶): اصلاً یہ ایک مشہور پھول کا نام ہے جو عام طور پر باغوں اور گھروں میں دیکھنے میں آتا ہے۔ اب تو یہ بہت سے رنگوں کا ہوتا ہے، مگر پہلے یہ عموماً سفید رنگ کا ہوتا تھا۔ یہاں مراد کسی ایسی آتش بازی سے ہے جس میں گُلِ داؤدی جیسے سفید سفید پھول نکلتے ہوں۔
دباتے ہوئے (۲۱۴): بڑھائے ہوئے، دوڑاتے ہوئے، تیز رفتاری کے ساتھ۔
دَدا: "وہ کنیز جس کی گود میں پرورش پائی ہو" (دریائے لطافت)۔
دَرپے ہونا (۲۳۴): پیچھے پڑنا، کسی چیز کو حاصل کرنے کا ارادہ کرلینا۔
دَرِ دامن (۴۱، ۲۴۲): گوٹ، جھالر، حاشیہ، مغزی۔
درگذر کرنے کو (۵۷): معاف کرنے کو، نظرانداز کردینے کو۔

درگذر نہ کروں گا (۲۲۵): کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھوں گا۔

درگذر نہ کی (۵۹): مطلب یہ ہے کہ میں نے تو اپنی جان بھی تجھ سے بچا کر نہیں رکھی، جان بھی تجھ پر نچھاور کردی۔

درماہا (۵۱): ماہانہ تنخواہ۔

دروغ: جھوٹ۔

دریغ نہ کروں (۲۲۴): پہلو تہی نہ کروں یعنی انکار نہ کروں۔

دریغ نہ کروں گا (۲۱۳): کوتاہی نہ کروں گا۔ [جان مال سے دریغ نہ کروں گا: جان اور مال دونوں سے کمی نہ کروں گا، یعنی دونوں کو آپ پر نثار کردوں گا]۔

دریغ نہیں کرتا (۷۳): جان نہیں چراتا۔ اپنی جان کی بھی پروا نہیں کرتا۔

دِساکریں (۱۱۴): کسی طرف چلیں، سفر شروع کریں۔ (دِسا: سمت)۔

دستِ بستہ کھڑا کیا (۲۲۸): اس حالت میں پیش کیا کہ دونوں ہاتھ بندھے ہوئے تھے۔

دست بہ سر ہوا (۸۲): سلام کیا۔

دست پناہ (۱۰۹): چمٹا۔

دستخطِ خاص سے (۳۰): اپنے قلم سے۔

دَستکی (۲۲۶): چھوٹی سی جیبی کتاب جو یادداشت وغیرہ لکھنے کے کام آتی ہے، پاکٹ بک۔

دست گیر (۱۶۴): قید۔

دست گیری (۲۲۵): مدد۔

دشتِ قبچاق (۱۲۹): ترکستان میں ایک بڑا صحرائی علاقہ تھا، وہاں کے رہنے والے ترک اپنی بہادری کے لیے بھی مشہور تھے۔

دشمنی کمال ہوئی (۶۹): بہت زیادہ دشمنی ہوئی۔

دَغدغہ (۲۲۳): اندیشہ، ڈر، دھڑکا۔

دَل بادَل (۸): اصلاً اسمِ صفت ہے جو بہت وسیع و عریض کے مفہوم کو ظاہر کرتا ہے۔ یہ شاہجہانی خیمے کا نام تھا (اسی وجہ سے کہ وہ خیمہ بہت بڑا تھا)۔

دلِ پُر اضطرار (۶۶): مجبوری اور پریشانی سے بھرا ہوا دل۔ [اضطرار: بے اختیاری۔ بے قراری کے معنی میں بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ پُر: بھرا ہوا۔]

دل جمعی کرکے (۲۲۴): اطمینان کرکے۔

دل چلا کر (۱۰۱): ہمت کرکے۔

دَلدا پیش گیر (۷۸): چھوٹا سا نمگیرا، جو پلنگ یا چھپر کھٹ کے آگے لگایا جاتا تھا۔ [نمگیرا: وہ کپڑا جو اُوس کی نمی سے محفوظ رہنے کے لیے پلنگ پر، چھت گیری کی طرح لگا دیتے ہیں]۔

دل داری سے (۵۴): ہمدردی سے، تسلّی دے کر، دوستانہ انداز سے۔

دل رِیش (۲۱۷): جس کا دل دکھا ہوا ہو، غم زدہ۔

دَلْق (۹۸) : گُدڑی (وہ لباس جسے اکثر فقیر پہنتے ہیں)۔ دلق پوش : گدڑی پہنے ہوئے، فقیر۔
دل گیر : اُداس، غمگین۔
دُرْنِیمیان (۲۰۱) : تھیلی، بَٹوا۔ وہ تھیلی جس میں خط (یا ایسا ہی کوئی کاغذ) رکھ کر بھیجا جاتا تھا (پلیٹس) [اِس مقام پر یہی آخری معنی مراد ہیں]۔
دَم پُخْت (۷۷) : وہ سالن (یا چاول) جس کو دم لگا کر گلایا گیا ہو۔ [دم لگانا : دیگ کی بھاپ روکنے کے لیے آٹے (وغیرہ) سے اُس کا منہ بند کر دینا]۔
دَمڑی (۴۲) : پُرانے پیسے کا چوتھا حصّہ، چھدام۔ [لغت نویسوں نے لکھا ہے کہ چھدام، جو پُرانے پیسے کا چوتھا حصّہ ہے (ایک پیسے میں چار چھدام ہوتے تھے) اُس کا دوسرا نام دمڑی ہے؛ البتّہ پورب میں ادھی کو دمڑی کہتے تھے یعنی اِس حساب سے "دمڑی" پیسے کا آٹھواں حصّہ ہوا]۔
دمشق : مشہور شہر، مملکتِ شام کا دارُالحکومت۔
دَم لیا (۹) : ذرا اطمینان کا سانس لیا، قیام کیا۔ (یعنی کئی برس تک عظیم آباد میں رہا)۔
دوازدہ امام (۲۴۹) : بارہ امام۔ [دیکھیے "بارہ امام"۔ دوازدہ : بارہ]۔
دو پارہ (۱۵۵) : دو ٹکڑے۔
دو پیازہ (۷۷) : گوشت کے اِس سالن میں گھی میں بھنی ہوئی پیاز بھی ڈالی جاتی ہے اور زیرکاری کے طور پر) بہت سی کچّی پیاز بھی کتری جاتی ہے، یوں اِسے دو پیازا کہا جاتا ہے۔ (اِس میں شوربا نہیں ہوتا؛ یہ اسٹو کی قسم کا سالن ہے)۔
دو جی سے ہے (۲۱۱) : حاملہ ہے۔ [دو جان دار ہیں : ایک وہ لڑکی خود اور دوسرا وہ بچّہ جو پیٹ میں ہے]۔
دو چند : دُگنی۔
دو دِلا : متفکّر، پریشان، اُلجھن میں گرفتار، جس کے دل میں کسی بات کے متعلّق شک ہو۔
دودھ بڑھایا (۱۹۰) : دودھ چُھڑایا۔ [جب بچّے کی ماں کا دودھ پینے کی مدّت ختم ہوئی اور ماں کا دودھ چُھڑایا گیا]۔
دُور پار (۱۰۴) : خدا نہ کرے (کلمۂ نفرت ہے جو عورتیں استعمال کیا کرتی ہیں)۔
دور دراز ہے (۲۰۷) : طویل ہے، بہت لمبا ہے۔
دو رستہ (۱۹۹) : رستے کے دونوں طرف۔
دو رُویہ (۸۹) : دونوں طرف۔
دو سار ہو گیا (۲۰۵) : آر پار ہو گیا۔
دوگانہ : دو رکعت نماز۔
دونوں جی (۲۳۲) : ہم دونوں۔ [جی : جان دار، انسان۔ مراد ہے باپ اور بیٹی سے]۔
دَھر (۷۹) : دھار [دھر نہ ماروں : اُس پر پیشاب بھی نہیں کروں گا۔ یہ انتہائی نفرت ظاہر

کرنے کے لیے کہا جاتا ہے]۔

دِہرا (۱۷۰) : مسند۔

دَھرا پَہر (۱۵۰) : پوشیدہ کمرا، رہنے کی ایسی جگہ جہاں کسی کو چھپایا جا سکے۔

دھوبی کا کُتّا نہ گھر کا نہ گھاٹ کا (۴۳) : نکمّا اور بے کار آدمی۔ ایسے آدمی کے لیے کہتے ہیں جس کا کوئی مصرف اور ٹھکانا نہ ہو، اِدھر اُدھر بے کار مارا مارا پھرتا رہے۔

دَھول جَھکّڑ (۱۸۸) : لات گھونسا۔ [دھول جھکڑ کروں : ماروں پیٹوں]۔

دَہ یَکّی (۱۶۶) : دس فی صدی محصول۔

دِل آرا رُو (۶۲) : خوب صورت۔

دیرینہ (۸۲) : بزرگ، پُرانا ملازم۔

دیوار گیری (۸۵) : وہ رنگین کپڑا جو دیواروں پر خوش نمائی کے لیے لگایا جاتا ہے۔

دیوان (۲۲۴) : وزیرِ مال، محکمۂ مال کا بڑا افسر۔

ڈاکا آیا (دیکھیے ص ۶۸۳)

ڈُوریا کر لے آئیں (۱۵۵) : باگ ڈور پکڑ کر (پیدل چلتے ہوئے) گھوڑوں کو لے آئیں۔ [باگ ڈور: ایک لمبی رسّی ہوتی ہے جس کا ایک سرا باگ (لگام) کے ساتھ گھوڑے کے دہانے میں باندھ دیا جاتا ہے اور سوار کا ہم رکاب سائیس اُس کو پکڑے رہتا ہے۔ قیام کے وقت اُس کو کسی چیز سے باندھ کر گھوڑے کو کھڑا کر دیا جاتا ہے (اصطلاحات)]۔

ڈنڈا (۱۴۵) : ڈنڈے بردار ملازم (سپاہی)۔

ڈونگے (۳۶) : "ڈونگا" کی جمع۔ ڈونگا: کسی ظرف میں سے پانی نکالنے کا برتن، جس میں ڈنڈی لگی ہوئی ہو۔ وہ آب خورا، جس میں ڈنڈی لگی ہوئی ہو (آصفیہ۔ نور)۔

ڈَھلَیت (۲۲) : وہ ملازم جو ڈھال تلوار لیے ہوئے ساتھ رہے۔

ذُوالفَقار (۲۳۹) : حضرت علیؓ کی تلوار کا نام۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیے ضمیمہ تلفظ و املا میں "ذوالفقار"۔

راس (۹۵، ۲۱۴) : یہ لفظ عدد کے طور پر بعض جانوروں، خاص کر گھوڑے کے ساتھ آتا ہے، مثلاً ایک راس گھوڑا، یعنی ایک عدد گھوڑا۔

[دس راس اسپ عراقی و یمنی (۹۵) : دس عدد عراق اور یمن کے گھوڑے۔ ان دونوں ملکوں کے گھوڑے مشہور تھے]۔

راست آئی (۲۲۱) : (اگر) بات بن گئی، تدبیر ٹھیک پڑی۔

راست ہُوا (۱۱۹) : سچ ثابت ہوا۔

رام ہوتی چلی (۱۸۹) : اجنبیت کی وحشت کم ہوتی گئی، دوست بنتی گئی۔

رانْدے ہوئے (۱۸۴) : مردود، نکالے گئے۔ مطلب یہ ہے کہ اس بستی کے لوگ خدا کے قہر میں گرفتار ہیں۔

راہ داری : سڑک کا محصول۔ چُنگی۔

راہ داری کی سند (۱۱۶) : وہ تحریری اجازت نامہ جو حاکم کی طرف سے سفر کرنے والوں کو دیا جائے۔ یہاں مراد ہے اُس اجازت نامے سے جو کسی تاجر کو دیا جائے اور جس میں یہ اطلاع دی گئی ہو کہ اِس شخص کے لیے چُنگی کا محصول معاف کر دیا گیا ہے۔

رجا (۱۹۰) : اُمید۔ (خوف و رجا : اُمید اور نااُمیدی)۔

رحلت فرمائی (۹۶) : مر گئے۔ (رحلت : کوچ، روانگی، موت)۔

رَحَم (۱۱۹) : چاولوں کا کچا حلوا، جو خاص اللہ میاں کی نیاز کے لیے کسی خوشی کی تقریب میں یا بیاہ میں عورتیں بناتی ہیں۔

رسولِ کبار (۲۵۰) : سب سے برتر رسول، مراد ہے رسول اللہؐ سے۔ [کبار : جمع ہے کبیر کی، بڑے آدمی، بزرگ آدمی۔]

رعشہ ہو گیا (۱۷۳) : کانپنے لگا۔

رقم (۱۳۱) : اِس لفظ کے متعدد معانی ہیں۔ عدد کے مفہوم میں بھی آتا ہے اور جواہر کے معنی میں بھی آتا ہے۔ اِس عبارت میں چوں کہ لفظ "جواہر" موجود ہے ("کچھ رقم جواہر کے بیش قیمت") یوں یہاں یہ تعداد کے مفہوم کو ظاہر کر رہا ہے، یعنی: چند قیمتی جواہرات بھی خرید لاؤ۔

رَقَم (۱۳۲، ۱۱۷) : جواہر۔ [رقم بے بہا : بیش قیمت جواہر]۔

رِکاب (۹۶) : "رکاب" کے معنی ہیں، لوہے کا وہ حلقہ جو گھوڑے کی زین میں دونوں طرف لٹکتا رہتا ہے اور سوار جس پر پاؤں رکھ کر گھوڑے پر چڑھتا ہے۔ یہاں "رکاب میں" سے مراد ہے کہ بادشاہ کی خدمت میں رہے، خاص ملازمین میں رہے۔

رِکاب میں آ رہیں (۹۵) : بادشاہ کی سواری کے ساتھ آئیں۔

رَمّال (۱۰۳) : علمِ رمل کا جاننے والا، جوتشی۔ [رمل : ایک علم کا نام، جس میں ہندسوں اور لکیروں وغیرہ کے ذریعے غیب کی بات اور قسمت کا حال دریافت کیا جاتا ہے]۔

رمز کی باتیں (۲۲) : اِشارے، بھید کی باتیں، پوشیدہ باتیں۔

رَنڈی (۱۷۸، ۱۹۲) : عورت۔

رنڈیا (۲۱۱) : رانڈ، بیوہ۔

رنگترا (۴۹) : سنترا۔

رنگ محل (۱۱۹) : آراستہ مکان، بہت سجا ہوا مکان۔ وہ مکان جس میں بادشاہ یا اُمرا عیش منائیں۔

رو بہ کار ہوا (۲۱۸) : واقع ہوا، پیش آیا۔

روپیہ کی۔ روپیہ کے (۳۹، ۸۷، ۹۷، ۸۳) : چاندی کی، چاندی کے۔ [روپا : چاندی]۔

روز راتب (۱۵) : روزانہ کی مقررہ خوراک، روزینہ (روز راتب کر دیجیے : روزانہ کا وظیفہ

مقرر کر دیجیے)۔

رُوزِ شمار (۲۴۹): قیامت کا دن (کہ اُس دن ہر چیز کا حساب ہوگا)۔

رُوزگار نے موافقت نہ کی (۹): زمانے نے ساتھ نہیں دیا، حالات موافق نہیں رہے۔

رُوزنامہ (۲۱): روزنامچہ۔ وہ بہی (رجسٹر) جس میں ہر روز دن بھر کا حساب لکھا جائے گیا کرتا۔

رَوِش (۵۹): باغ کا چھوٹا سا راستہ، جس پر گھاس بو دیتے ہیں، پٹری۔

رُوشناس (۹۷): جان پہچان۔

رُوم: عام طور پر مسلمان لکھنے والے رُوم سے ترکی سلطنت یا قسطنطنیہ کا علاقہ مراد لیتے ہیں، اس کتاب میں بھی یہ لفظ اسی مفہوم میں آیا ہے۔

رومالی (۳۴۹): وہ رومال جو عورتیں سر سے باندھ لیتی ہیں (آصفیہ)۔

رَوَنّا (۵۱): وہ نوکر جو عورتوں کا کام کاج کرنے اور سودا سلف لانے کے لیے دروازے پر رہتا تھا (آصفیہ)۔

رونْدھ مارا (۴۹): چھان مارا، ہر جگہ جا کر دیکھ لیا۔

رَوْنقیں (۴۳، ۵۵): تری، تازگی، چہرے کی رونق۔

رہا سہا (۵۷): رہا سہا، جو کچھ باقی رہا تھا۔

ریاضت (۷۴): اپنے نفس کو مارنا، خواہش پر قابو پانا۔

رِیش: داڑھی۔

رَیَن (۱۵۰): رات۔

ریوڑی کا پھیر (۷۵): چند دوست ایک جگہ اکٹھا ہوتے ہیں تو کبھی کبھی باہم یہ شرط بھی لگاتے ہیں کہ تم کتنی ریوڑیاں کھا سکتے ہو، اِس طرح کہ پہلے ایک، پھر ایک کا دُگنا، پھر اُس سے دُگنے کا دُگنا۔ کوئی نہ کوئی اُن میں سے بول اٹھتا ہے کہ ہم اِس طرح دس دفعہ کھا سکتے ہیں۔ ریوڑیاں کھانے کی نوبت آتی ہے تو کھاتے کھاتے منہ دُکھنے لگتا ہے اور یار لوگ قہقہہ لگاتے ہیں کہ اب ریوڑی کے پھیر میں آ گیا (نور، آصفیہ)۔

زادِ بوم (۱۴۳): جائے پیدائش، وہ جگہ جہاں آدمی پیدا ہوا ہو۔

زادِ راہ (۱۳۹): راستے کا خرچ۔

زار بزار رونا (دیکھیے ص ۶۸۳) ——————

زَربفت: بادلے (سونے چاندی کے باریک تار) کے تانے اور ریشم کے بانے سے بُنا ہوا کپڑا، جو مختلف نمونوں کا بنایا جاتا تھا۔ [زربفت، کمخواب، تاش، گرگری تاش؛ یہ سب ایک ہی قسم کے کپڑے کی مختلف قسمیں ہیں، ان میں زربفت اعلا درجے کا کپڑا مانا جاتا تھا، اُس میں کلابتون کی دھاریاں اور بوٹیاں قریب قریب ہوتی تھیں۔ دوسرے درجے پر کمخواب تھا، اُس میں ریشمی بوٹی زیادہ ہوتی تھی اور زری کی کم اور اُس کا کپڑا بھی سخت ہوتا تھا۔ اِس قسم

میں سب سے کم درجے کا کپڑا مشجر ہوتا تھا۔ تفصیل کے لیے دیکھیے فرہنگ اصطلاحات پیشہ وراں، جلد دوم]۔

زردوزی: کپڑے پر زری کی کڑھت، سلمے ستارے یا کلابتوں کا کام۔

زرق برق: بھڑک دار۔

زرگری (۱۰۰): سناروں کا کام۔ [ہتھیار زرگری کے، سناروں کے اوزار]۔

زرہ بکتر (۱۷۹، ۲۰۹، ۲۱۴): فولاد کا بنا ہوا کڑیوں دار کرتا، جسے لڑائی کے موقع پر پہنا جاتا تھا۔

زمانہ سازی (۱۱۷): ظاہرداری، بناوٹ، مکاری، خوشامد۔

زمین چومی: جھک کر آداب بجا لایا۔

زنبور (دیکھیے ص ۶۸۳) ______

زنجیر (۹۵): ہاتھی کے ساتھ تعداد کے لیے یہ لفظ آتا ہے۔ دو زنجیر فیل: دو عدد ہاتھی۔

زنداں: قیدخانہ۔

زندہ درگور (۱۷۹): جیتے جی مُردہ۔ زندہ مگر مُردوں کی طرح۔

زنگ (۱۲۹): [زنگبار۔ زنجبار] مشرقی افریقہ کا ایک جزیرہ، جو مشرقی افریقہ کے بحری راستے میں غلاموں کی تجارت کا ایک زمانے میں بڑا مرکز رہا ہے۔ یہاں کی خاص پیداوار لونگ ہے۔ [اب یہ افریقی ملک تنزانیہ کا ایک حصہ ہے]۔

زنگی (۱۴۴، ۲۰۳): زنگبار (یا زنجبار) کا بسنے والا۔ افریقہ کے لوگ بہت صحت مند، محنتی اور جفاکش ہوتے ہیں اور غربت وہاں عام تھی، یوں اُن لوگوں کو غلام بنا کر دنیا کی منڈیوں میں فروخت کیا جاتا تھا۔ اُن میں سے کچھ سپاہی اور محافظ بنا لیے جاتے تھے اور باقی کام کاج کیا کرتے تھے۔ زنگ (زنگبار) ایک زمانے میں افریقی غلاموں کی تجارت کا بڑا مرکز رہا ہے اور افریقہ کے رہنے والے عموماً سیاہ فام ہوتے ہیں، ان نسبتوں کی بنا پر "زنگی" اور "حبشی" عام افریقی سیاہ فام کے معنی میں بھی استعمال کیے جانے لگے۔

زہر مار کرنا (۵۷): غصے کی حالت میں کھانا پینا، بے دلی سے کھانا۔ [زہر مار کیا: اُسی غصے کی حالت میں پی لیا]۔

زہر ہلاہل: ایسا قاتل زہر جس کا توڑ کسی دوا سے نہ ہو سکے۔

زہے: کلمۂ تحسین، واہ واہ، سبحان اللہ۔ [زہے نصیب، زہے طالع: کیا اچھی قسمت ہے]۔

زیر انداز (۶۸، ۱۰۰): وہ کپڑا جو چلمچی (یا حقّے) کے نیچے بچھایا جاتا تھا تاکہ پانی فرش پر نہ گرنے پائے۔

زیرباد (۱۴۹): ڈنکن فوربس نے نسخۂ ف کی فرہنگ میں لکھا ہے کہ "زیرباد" ایک ملک کا نام ہے جسے اب برما کہتے ہیں۔ غیاث اللغات میں "زیرباد" ہے اور معنی اطراف بنگال کا ایک شہر لکھا ہے۔

زیروزبر (۲۰): تباہ و برباد۔

زیر و زبر کر کے (۲۴۷): شکست دے کر۔

زیر و زبر کیا (۱۱): تباہ و برباد کیا۔

زین پوش (۲۵): گھوڑے کی زین کے اوپر ڈالنے کا کپڑا، چار جامہ۔

سارے ڈیل میں زبان حلال ہے (۶۲): دیکھیے ضمیمہ تشریحات و اختلافِ نسخ میں ص۶۲ کا حاشیہ ②۔

ساعتِ سعید (۱۹۲): مبارک گھڑی، شبھ گھڑی۔

ساقِ عروس (۷۸): ایک طرح کی مٹھائی (ع) تفصیل میں معلوم نہیں کر سکا۔

سالک (۱۰۵): صوفیوں کی اصطلاح میں وہ شخص جو خدائے تعالیٰ کی قربت کا طلب گار ہو اور عقلِ معاش بھی رکھتا ہو۔ مجذوب کی ضد؛ پابندِ شریعت درویش۔

سانڈنی (۲۳۶): تیز رفتار اور لمبی مسافت طے کرنے والی اونٹنی، جو نر کی نسبت لمبی منزل طے کرتی ہے اور تیز چلتی ہے۔

سائیں اللہ (۱۱۳): فقیروں کا کلمۂ خطاب۔

سائبان (۸۷): مکان کے آگے جو کپڑے یا بانات کا نم گیرا کھڑا کرتے ہیں۔ وہ شامیانہ جسے دھوپ یا بوچھار سے بچنے کے لیے مکان یا خیمے کے آگے لگایا جاتا تھا۔

سبحان اللہ (۳): تعریف کا کلمہ ہے، لفظی معنی: پاک ہے اللہ۔ اس میں اعتراف اور تعجب دونوں مفہوم شامل ہیں۔

سُبھ لگن (۱۰۲): اچھا وقت، اچھی ساعت، جب دو اچھے ستارے ایک جگہ جمع ہوں۔

سپاہ گری (۲۱): سپاہی کا کام [جیسے: "سپاہ گری کے چھتیس فن ہیں" (آصفیہ)۔] نیز دیکھیے "کسب"۔

سپاریاں (۷۸): (سپاری کی جمع) چھالی، سپاری۔ ڈلی۔

ستّار (۱۹۶): عیب ڈھانکنے والا۔ (خدا کا ایک نام ہے)۔

ستارے (۵۹): ایک قسم کی آتش بازی، جس میں سفید پھول ایسے برستے ہیں جیسے تارے جھڑ رہے ہوں۔

ستوانسا (۱۸۹): حمل کا ساتواں مہینا۔

ستھورا (۲۱۱): (سٹھورا) گیہوں کا آٹا، شکر، سونٹھ ملا کر، گھی میں بھون کر بنایا جاتا تھا۔

سخت (۱۴۲) بہت [سخت اداس ہوا: بہت اداس ہوا]۔

سخن گویوں (۴): جمع ہے "سخن گو" کی۔ سخن گو: شاعر۔

سراپردہ (۱۲۹): وہ اونچی قنات جو خیمے کے چاروں طرف لگا دیتے ہیں۔

سراچوں (۲۲۴): "سراچہ" کی جمع۔ سراچہ: بڑا خیمہ۔

سرانجام (۱۰۷): ضروری سامان، لوازم۔

سرانجام نہیں ہو سکتے (۵۴): (اتنے روپوں کا) انتظام نہیں ہو سکتا۔

سراندیپ (۱۵۴): عرب سیلون کو "سراندیپ"

کہتے تھے (انہیں کا نام "شری لنکا" ہے)۔
سر بہ سر (۱۱۶) : پورا پورا، شروع سے آخر تک۔
سَر پیچ (۸۰) : "سرپیچ" جسے سرپیش بھی کہتے ہیں، سونے چاندی یا جواہرات موتی کا ایک زیور ہوتا ہے جسے پگڑی میں سامنے کے رُخ باندھتے ہیں۔ بعض اوقات اس میں سونے کی پتّر زنجیریں ہوتی ہیں جو آپس میں بندھی ہوتی ہیں اور ہر ایک میں قیمتی پتّھر جڑے ہوتے ہیں۔" [مولانا امتیاز علی خاں عرشی، حواشی مکاتیب غالب، طبع ششم، ص ۱۳۱]۔
سَرِ رِشتہ (۶۵، ۱۲۵) : ہوش۔ [سررشتہ جاتی رہی: ہوش جاتے رہے، شعور یا ہوش کھو بیٹھا]۔
سر تا پا (۷۳) : سر سے پیر تک، پوری طرح۔
سُرخاب (۱۹۴) : ایک آبی پرندے کا نام جس کا رنگ سُرخ ہوتا ہے اور جس کے متعلق یہ روایت بیان کی جاتی ہے کہ وہ رات بھر اپنی مادہ سے جدا رہتا ہے اور اسے پکارتا رہتا ہے۔ نر اور مادہ کی محبت ضرب المثل ہے۔ نر کو چکوا اور مادہ کو چکوی بھی کہتے ہیں۔ ہندی اور اُردو شاعری میں اس پرندے کا ذکر بہت ملتا ہے۔ آصفیہ سے یہ دو شعر بھی نقل کیے جاتے ہیں: ملتی ہے عاشق کو لذّت فرقتِ معشوق میں: اختیاری ہجر ہے سُرخاب سے سُرخاب کا (ناسخ)۔ شام سے تا صبح دیتے ہو مجھے رنجِ فراق: کیا رہا اب آدمی میں فرق اور سُرخاب میں (ناسخ)۔
سرخوش ہو گئے (۱۲۵) : شراب کا نشہ چڑھ گیا، مسرور ہو گیا۔
سرِ دربار (۱۱۷) : دربار میں، دربار میں سب کے سامنے۔
سرزنش کرنا (۲۴۸) : ملامت کرنا، بُرا بھلا کہنا۔
سر سے سرِ واہ (۲۱۵) : سر سے تو پگڑی بھی ہے۔ (سرِ واہ: پگڑی)۔ [مطلب یہ ہے کہ سر وارنے تو فرض بھی ہے]
سر ملاقات کھینچ کر (دیکھیے ص ۳۶۴) ______
سرگذشت (۴۸) : گزرا ہوا حال، واقعہ۔
سرگرداں (۴۲) : حیران پریشان۔
سرِ مو : بال بھر، ذرا سا۔
سرو چراغاں (۵۶) : لکڑی کے ٹکڑوں سے سرو کے درخت کی شبیہ بناتے تھے اور اس کی شاخوں پر چراغ روشن کرتے تھے۔
سرو قد : سیدھا (سرو قد اٹھنا: سیدھا کھڑا ہونا)۔
سرے پاؤ (۲۵، ۱۶۴، ۲۲۷) : خلعت، پورا جوڑا۔
سَعید (۲۴۰) : مبارک (نحس کی ضد)۔
سعی : کوشش۔
سُکھپال (۱۲۹) : ایک طرح کی پالکی جس میں امرا کی خواتین سوار ہوتی تھیں۔ [اس عبارت میں یہ لفظ بڑی پالکی کے مفہوم میں آیا ہے]۔
سِلاح (۲۱۴) : ہتھیار۔
سِلپچی (۱۰۰) : دیکھیے چلمچی۔
سلخ (۹۸) : مہینے کا آخری دن جس کی شام کو اگلے مہینے

کا نچانہ دیکھا جائے۔
سلسبیل (۱۵۴) : بہشت کی ایک نہر کا نام۔
سلونے (۹۵) : نمکین۔
سنجاف (۴۱) : گوٹ، جو کپڑوں کے کنارے زیبائش کے لیے لگائی جاتی ہے، چوڑی اور آڑی گوٹ۔
سنگ (۱۱۷) : وزن۔
سنگ (۱۱۷) : پتھر۔
سنگت (۱۰۶) : ڈیرا، دھرم شالا۔
سنگسار کرنا (۱۵۲) : یہ شرعی سزا تھی کہ زنا کے جرم میں آدمی کو کمر تک زمین میں گاڑ کر پتھر مارتے تھے اور اس طرح اس کو مار ڈالا جاتا تھا۔
سن و سال : عمر (یہ سن و سال ہوا : اتنی عمر ہوئی)۔
سنگھاسن (۱۷۱، ۱۸۵) : تخت۔ [سنگھاسن عموماً شاہی تخت کے لیے آتا ہے، مگر ان دونوں مقامات پر مراد ہے اس تخت سے جس پر اس بت کا مجسمہ تھا]۔
سُن ہونا (۲۶) : انتہائے حیرت میں خاموش رہ جانا۔
سواد (۱۴۲) : جب مسافر کسی شہر کے قریب پہنچتا ہے اور دور سے ایک قسم کی سیاہی سی فضا میں نظر آتی ہے، اُسے بھی سواد کہتے ہیں۔ یہاں یہی مراد ہے۔
سودائیوں (۱۰۹) : سودائی کی جمع۔ سودائی کے معنی ہیں، دیوانہ، پاگل، خبطی، مگر مصنف نے اس عبارت میں اسے بیمار کے معنی میں استعمال کیا ہے۔ البتہ ص ۱۱۳ پر اصلی معنی میں بھی استعمال کیا ہے:
"سودائی سا ویرانے میں خاک چھانتا پھرا"، یعنی دیوانوں کی طرح۔۔۔۔
سوزنی (۱۹۹) : وہ فرش جس کے اندر پتلی پتلی روئی بھر کر، اوپر سے سوئی کا باریک کام کیا گیا ہو، بیل بوٹے بنائے گئے ہوں۔
سوگند : قسم۔
سولہ سنگار (۸۹) : وہ سولہ طرح کی آرائش جو ہندوستان کی عورتوں سے مخصوص ہے اور انتہا درجے کے بناؤ میں داخل ہے، جیسے سرمہ، مسّی، کاجل، کنگھی چوٹی، مانگ پٹّی، زیور اور کپڑوں کی سجاوٹ، چوڑیاں، مہندی، پان وغیرہ (آصفیہ) (نور میں مکمل تفصیل موجود ہے)۔
سوں (۴۲) : قسم۔
سونا اُچھالتے چلے جانا (۱۰) : مطلب ہوتا ہے کسی ملک میں بہت امن اور بہت اچھا انتظام ہونے سے، کہ لوٹ مار بالکل ختم ہو گئی ہو۔
سویرے (۲۲۷) : جلدی، وقت سے پہلے۔
سہ شبانہ روز (۱۷۹) : تین رات دن۔
سہو (۲۴۹) : بھول چوک۔ [سہو و خطا، بھول اور غلطی]۔
سہی سانجھ ہوتی (۵۲) : شام ہو جاتی۔
سی (۲) : تیس۔ (سی سال، تیس سال)۔
سیاست (۱۳۵) : سزا۔

سیاست کردن (۱۷۱) : سزا دیں۔
سیانے (۱۰۵، ۱۳۱، ۲۳۱) : گنڈا تعویذ کرنے والے، جھاڑ پھونک کرنے والے، بھوت پریت اتارنے والے۔ ("سیانا" کی جمع)۔
سیتل پاٹی (۸۷) : ایک خاص قسم کی چٹائی جو بہت چکنی ہوتی ہے۔ (پہلے عموماً آسام سے آیا کرتی تھی)۔
سیج بند (۸۷) : وہ ڈوری جس سے پلنگ کی چادر کو پایوں سے کس کر باندھتے ہیں۔
سیر ہوئے (۱۲۷) : بیزار ہو گئے۔
سیف : تلوار۔
سیلی : یہ لفظ دو معنوں میں آتا ہے : (۱) سیاہ ریشم یا تاگوں کی ڈوری، جو فقیر اور جوگی گلے میں پہنتے ہیں۔ (۲) پتلی سی رسّی یا ڈوری (پلیٹس) غالباً کمر میں باندھنے کی۔ ص ۲۰ پر یہ لفظ پہلے معنی میں آیا ہے اور ص ۹۲ پر دوسرے معنی میں۔
سینا : پرندوں کا انڈوں پر بیٹھنا (گرمی پہنچانے کے لیے، تاکہ بچے نکل سکیں)۔ گھر سیتا ہے (ص۲)، گھر میں پڑا رہتا ہے، گھر میں گھسا رہتا ہے۔ جنگل پہاڑ کیوں سیتا ہے (ص ۱۹۷) : جنگل پہاڑ میں کیوں پڑا رہتا ہے۔
سینگ سمانا (۹) : جگہ ملنا، حفاظت کی جگہ ملنا۔ مطلب یہ ہے کہ جس شخص کو جس شہر میں روزی روٹی اور حفاظت کی صورت نظر آئی، وہ دہلی سے نکل کر وہاں چلا گیا۔
شادیانے (۱۴) : خوشی کے گیت۔ خوشی کے باجے۔
شادی مرگ ہو جانا : خوشی کی زیادتی سے مر جانا؛ یعنی اچانک کوئی بہت اچھی خبر سُن کر مر جانا۔
شاطر (۱۳۱) : سپاہیوں کا ایک خاص گروہ، جو اپنے مخصوص لباس میں بادشاہوں یا امیروں کی سواری کے آگے آگے دوڑتے ہوئے چلتے تھے۔
شاگرد پیشہ (۱۷۵) : نوکر چاکر، خدمت گار۔
شال باقی (۱۷۴) : "شال بافتہ" ایک طرح کا سُرخ ریشمی کپڑا ہوتا ہے (نور)۔ "شال باقی" سے غالباً وہی مراد ہے۔ اِس میں یٰ نسبت کی ہے۔
شاہ نامہ (۲) : ایران کے مشہور شاعر فردوسی کی مشہور ترین تصنیف، جس کو فارسی شاعری کی بے مثال کتاب اور ایران کی قومی اور ملکی تاریخ کا قابلِ احترام صحیفہ مانا جاتا ہے۔ [بہ قولِ ڈاکٹر محمد معین، فردوسی نے ۴۱۱ھ یا ۴۱۶ھ میں وفات پائی تھی۔ حاشیہ برہانِ قاطع، مرتبہ ڈاکٹر معین، جلد سوم، ص ۱۴۵۷]۔
شایاں ہے (۴) : لائق ہے۔ (سب طرح شایان ہے : ہر لحاظ سے زیبا اور لائق ہے)۔
شاید کہ باشد (۱۸۰) : ہو سکتا ہے ایسا ہی ہو۔
شبانہ روز (۱۵۲) : رات دن۔
شب دیگ (۷۷) : وہ سالن جو رات بھر دم دے کر پکایا جائے۔ اِس سے مراد ہے ایک خاص قسم کا قورما، جس میں ثابت شلغم ڈالا جاتا ہے اور انکھیں کی شکل جیسے

قیمے کے مسالے دار کباب بھی ڈالے جاتے ہیں اور رات بھر دم دے کر ہلکی آنچ پر پکایا جاتا ہے۔ یہ سالن بہت خوش ذائقہ اور مرغن ہوتا ہے۔

شبنم (۲۰۱): روزمرہ کے استعمال کا سادہ، باریک، ملائم سفید سوتی کپڑا۔ یہ یا تو ململ ہی کا دوسرا نام ہے یا پھر یہ ململ کی ایک قسم ہے۔

شتاب: جلد۔

شتابی: جلدی۔

شتّا ہو (۱۳۰): بے حیا۔

شحنہ (۱۴۵): کوتوال۔

شدّت (۲۰): مصیبت۔ [جو کچھ کہ پیش آئی ہے شدّت مرے تئیں: مجھ پر جو مصیبتیں گزری ہیں]۔

شرابِ پرتگالی (۲۱۱): پرتگال کی بنی ہوئی شراب، جو اپنی عمدگی کے لیے ایک زمانے میں بہت مشہور تھی۔ "اس کو "پورٹ وائن" بھی کہتے ہیں" (نور)۔

شرابِ دو آتشہ (۵۸): دو مرتبہ کھینچی ہوئی شراب، بہت تیز شراب۔

شراب کا شیشہ (۵۶): شیشے کا بنا ہوا کسی بھی شکل کا ظرف، جس میں شراب رکھی جاتی ہے، بوتل، مینا۔

شرطِ خدمت کی تھی (۲۱۳): جتنی خدمت کرنا چاہیے تھی۔

شطرنجی (۸۷): ایک قسم کا دبیز سوتی فرش، کئی رنگ کے سوت سے بنی ہوئی دری، جس میں خانے بنے ہوئے ہوتے ہیں۔

شُقّہ: پرچہ، خط، حکم نامہ۔ وہ رقعہ جو بادشاہ کی طرف سے اُمرا کو لکھا جائے۔ وہ رقعہ جو اُمرا اپنے سے کم درجہ امیر کو لکھتے ہیں۔

شکار بند (۲۵، ۲۱۲): وہ تسمہ جو گھوڑے کی دُم کے قریب شکار لٹکا لینے یا ضروری سامان باندھ لینے کے واسطے لگا ہوا ہوتا ہے۔

شَلّاق: دیکھیے "ضربِ شَلّاق"۔

شلّک (۱۶۴): توپوں یا بندوقوں کی باڑ۔ توپ یا بندوق کی آواز۔

شلیتہ (۱۲۹): ٹاٹ کا بڑا تھیلا، بورا۔

شورے کی صراحیاں (۳۶): پانی سے بھری صراحی کو شورے ملے ہوئے پانی میں ڈال کر اور ہلا ہلا کر ٹھنڈا کیا جاتا تھا۔ [شورہ: ایک قسم کا کھار جو آتش بازی بنانے میں کام آتا ہے یا اُس سے پانی ٹھنڈا کرنے کا کام لیا جاتا تھا۔ کیاریاں کھود کر اسے جمایا جاتا تھا (آصفیہ۔ نور)]۔

شولا (۲۳۴): (فارسی لفظ "شُلّہ" کا اُردو تلفظ) مسالے دار پتلی پکی ہوئی کھچڑی۔ پُرتکلف بنانے کے لیے اِس میں گوشت بھی شامل کر دیا جاتا تھا۔ عام طور پر مونگ کی دال اور چاول یا باجرا ملا کر پکایا جاتا ہے (اصطلاحات)۔

شہر پناہ (۹۴): وہ چوڑی مضبوط دیوار جو پُرانے زمانے میں شہر کے چاروں طرف حفاظت کے لیے بنائی جاتی تھی۔ (اسے فصیل بھی کہتے تھے)۔

شہ نشین (۳۶، ۱۴۱، ۱۰۰) : بادشاہ کے بیٹھنے کی جگہ۔ وہ برآمدا سا جو آگے نکلا ہوا ہو، جس پر بادشاہ بیٹھ کر لوگوں کو درشن دیا کرتے تھے (آصفیہ)۔ دالان کے اندر کا چھوٹا سا دالان جس کے چھوٹے چھوٹے در ہوتے ہیں۔

شیر برنج (۷۷) : کھیر۔ [شیر: دودھ۔ برنج: چاول]۔

شیرمال (۷۷) : میدے میں گھی ملا کر اور دودھ سے گوندھ کر، تندور میں پکائی ہوئی اعلا قسم کی روغنی روٹی۔ اس میں چاشنی پیدا کرنے اور خمیر اٹھانے کے لیے حسبِ ضرورت نمک اور دہی بھی ملایا جاتا ہے۔

شیطان کے کان بہرے (۱۰۴) : عورتیں اس کلمے کو اُس وقت بولتی ہیں جب یہ کہنا ہوتا ہے کہ اس بات کو کوئی چغل خور نہ سُننے پائے۔ نیز کسی بُری خبر کے سُننے کے وقت اِس غرض سے کہتی ہیں کہ خُدا کرے یہ خبر جھوٹ ہو۔

شیطان لگنا (۲۳۱) : شرارت سوجھنا، فتنہ و فساد اُٹھانے پر تیار ہونا۔

شیورات (۱۰۹) : (شیوراتری) ہندوؤں کے ایک بڑے تہوار کا نام، جو شِو کی یاد میں پھاگن بدی چودس کو منایا جاتا ہے۔ اُس دن برت رکھتے ہیں اور خوشی مناتے ہیں۔

صاحبانِ والاشان (۲) : یہاں مراد ہے فورٹ ولیم کالج کے اربابِ اختیار انگریزوں سے۔

صاحبِ ذوالفقار (۲۳۹) : حضرت علی رض۔

صاحبِ قِران (۸) : وہ شخص جس کے پیدا ہونے کے وقت (اور ایک قول یہ ہے کہ ماں کے پیٹ میں نطفہ ٹھہرنے کے وقت) زہرہ اور مشتری، یہ دونوں ستارے ایک بُرج میں جمع ہوں (ایک قول یہ ہے کہ زحل اور مشتری ایک برج میں ہوں) ایک بُرج میں یہ دونوں ستارے بہت مدت کے بعد یک جا ہوتے ہیں اور ایسا شخص بہت اقبال مند ہوتا ہے۔ چوں کہ امیر تیمور کی ولادت کے وقت یہ قران ہوا تھا، اِس لیے اُس کا لقب "صاحب قران" پڑگیا۔

صاحبوں (۳) : یہاں مراد ہے فورٹ ولیم کالج سے تعلق رکھنے والے انگریزوں سے۔

صافی نامہ (۱۴۴) : راضی نامہ (نون) سرٹی فکٹ (ف)۔ یہاں مراد ہے ایسا کاغذ جس سے معلوم ہو کہ مدعی کو اب کوئی شکایت باقی نہیں رہی۔ اِس کو سرٹی فکٹ ہی کہنا بہتر ہوگا۔

صانع (۳، ۱۶۲) : بنانے والا۔ مُراد ہے خُدا۔

صُبح خیزے (۱۰) : جمع ہے۔ وہ چور جو مسافروں سے پہلے اُٹھ کر اُن کا سامان چُرا لیں۔

صُحبت گرم ہوئی (۲۴۵) : دوستانہ بات چیت خوب ہونے لگی۔

صد و بیست سال (۱۴۰، ۱۷۷) : ایک سو بیس سال۔ [مراد برسوں کا تعین نہیں، بلکہ یہ مراد ہے کہ بہت زیادہ عمر ہو۔]

صلاحِ دولت (۱۸) : حکومت کی مصلحت۔

(بادشاہ کے لیے مناسب صلاح یہ ہے کہ)۔

صَلوٰۃ (۴) : درود، خدا کی رحمت۔

صندلی : ایک طرح کا چھوٹا سا تخت، جسے چوکی کہتے ہیں (غیاث اللغات)۔

صنعتیں (۱۰۳) : صنعت کی جمع، ہنر

صورت نہ شکل، چولھے میں سے نکل (۵۶) : بدصورت شخص (عورت) کے لیے کہتے ہیں۔

ضربِ شلاق (۱۴۸) : ہاتھوں سے یا لکڑی سے مارنا۔ [ضرب مارنا بہ شلاق : کسی کو لکڑیوں سے مارنا۔ ہاتھوں کی ضرب لگانا۔]

طاقِ کسریٰ (۹۳) : ایران کے مشہور بادشاہ نوشیروان کا بنوایا ہوا محل۔

طالع : قسمت، نصیب۔

طالع مند (۱۲۲) : خوش نصیب، بختاور۔

طعام بخش (۸۷) : ڈوئی، سالن نکالنے کا بڑا چمچہ۔

طعنہ مہنا دینا (ص ۲۴) : طعنے دینا ["مہنا" تابع مہمل ہے]۔

طلابافی (۹۵) : وہ کپڑا جس پر سونے کے تاروں سے نقش و نگار بنائے گئے ہوں، یا جن کی بنائی میں سونے کے تار شامل ہوں۔

طلب (۲۴۰) : تنخواہ۔

طناب : ڈوری، رسی (خاص کر خیمے کی رسی)۔

طہارت (۱۵۹) : عموماً مراد ہوتی ہے استنجا کرنے اور وضو کرنے سے، مگر اس عبارت میں غسل کرنا مراد ہے۔

طے (۴۳) : عرب کا ایک مشہور قبیلہ، حاتم کا تعلق اسی قبیلے سے تھا۔ اسی نسبت سے اسے "حاتم طائی" کہا جاتا ہے۔ [اصلاً یہ قبیلہ یمن کا تھا، وہاں سے ہجرت کرکے عرب میں آکر آباد ہوگیا تھا (المنجد)]

ظلّ اللہ (۲۴۹) : خدا کا سایہ۔ (عموماً بادشاہ کے لیے آتا ہے)۔ (ظل : سایہ)۔

ظلِ سبحانی (۹۴) : خدا کا سایہ۔ بادشاہ کو کہتے تھے۔

عاصی : گنہ گار۔

عاقلاں خود می دانند (۸) : عقل مند خود جانتے ہیں۔

عالمیاں (۱۰۵، ۱۰۶) : عالمی کی جمع، سب دنیا والے، اس دنیا کے سب لوگ۔ [بادشاہ زادۂ عالمیاں : سب دنیا والوں کے شہزادے]۔

عامل (۲۳۱) : جنات یا بھوت پریت کو اتارنے کا عمل جاننے والا۔

عجم : ایران۔

عجمی : ایران کا رہنے والا۔

عجوبہ (۸۵) : عجیب چیز۔ (یہاں مراد اس عجیب و غریب واقعے سے ہے)۔

عدالت (۱۰) : انصاف۔

عرش پر جھنڈا گاڑا ہے (۷۱) : بہت بڑا کام کیا ہے۔

عصے بردار (۳۵) : وہ خاص ملازم جو سونے یا چاندی کا خول چڑھا ہوا عصا (ایک خاص طرح کی بنی ہوئی لاٹھی) لے کر بادشاہوں (یا امیروں) کی سواری کے آگے آگے چلتے تھے۔

عفو : معافی۔

عَقد باندھنا (۲۴۸) : نکاح کرنا۔
علامت (۲۳۰) : یعنی مردانگی کی علامت عضوِ تناسل۔
عَلَیہمُ الصّلواۃ وَالسّلام (۲۴۹) : اُن سب پر درود اور سلام۔ [صلواۃ جمع ہے صلوٰۃ کی - صلوٰۃ : درود۔ رحمت]۔
عُمان (۲۴۶) : پرشین گلف کے علاقے کی ایک چھوٹی سی سلطنت۔
عُہدہ (۱۲، ۹۵، ۱۱۹، ۲۴۳) : سردار، اعلا عہدے دار۔
عَمَل میں (۱۰) : حکومت میں۔
عَمَل ہوا (۷) : حکومت ہوئی۔
عَمّو (۲۱۹) : چچا۔
عمیق (۹۳) : گہرا۔
عُود سُوز (۱۷۱) : وہ ظرف جس میں لوبان سلگایا جاتا ہے، اگردان۔ [عود : لوبان]۔
عُہدے (۸۹) : مرتبے اور منصب کے مطابق نشانات۔ مثلاً سونے کا عصا یا ایسی ہی اور چیزیں، جن سے کسی شخص کا عہدہ اور مرتبہ ظاہر ہوتا ہو۔
عہدے لیے ہوئے (۸۰) : اپنے مرتبے اور منصب کے نشانات لیے ہوئے۔
عیال و اَطفال (۲) : بال بچّے۔
عَیاں راچہ بیاں (۲) : جو چیز صاف ظاہر ہے، اُس کو بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔

غالب ہے (۲۳۷) : زیادہ خیال یہی ہے، گمانِ غالب ہے۔
غَٹ (۲۱۴) : لوگوں کا ہجوم۔
غُراب (۱۶۵، ۱۶۶) : عربی جہاز کی ایک قسم (ف)۔
غُرّہ (۹۷) : چاند کی پہلی تاریخ۔
غَریب (۸۶) : مسافر۔
غُسلِ صحّت (۵) : بیماری سے صحّت پانے کے بعد (پہلی بار) نہانا۔
غَضَبی (۲۳۶) : غضب، غصّہ۔ [غضبی میں پڑیں : غصّے اور قہر کا نشانہ بنیں]۔
غلامِ کافری (۱۳۱) : مراد ہے سیاہ فام افریقی غلام سے۔ [''کافر'' کے ایک معنی ''شبِ تاریک'' بھی ہیں (غیاث اللغات) غالباً اسی اندھیرے کی رعایت سے سیاہ فام افریقی غلام کو ''غلامِ کافری'' کہا گیا ہے]۔
غَنی (۸۴) : مال دار۔
غَنیموں (۱۲) : غنیم کی جمع۔ غنیم : دشمن۔
غَور پرداخت (۲۲۹) : دیکھ بھال، پرورش۔
غَور میں گیا (۱۰۸) : سوچنے لگا، غور سے دیکھنے لگا۔
غوطے میں گئی (۴۹) : سوچنے لگی، فکر میں ڈوب گئی۔
غُولِ بیابانی (۱۹) : جنگلوں میدانوں میں بھٹکتی پھرتی بُری روحیں، بھوت پریت۔ اگیا بیتال۔
غَیبانی (۵۸) : بدکار عورت (یہ کلمہ عورتوں کے لیے بطور گالی کے مستعمل ہے)۔

فاخرہ (۱۵، ۱۲۱) : عمدہ، بیش قیمت۔

فارس : اصلاً ایران کے ایک علاقے کا نام ہے جو:

"از مشرق بہ کرمان، از جنوب بہ خلیج فارس، از مغرب بہ خوزستان، و از شمال بہ بختیاری و یزد و اصفہان محدود است"۔ [حاشیۂ برہانِ قاطع، مرتبۂ ڈاکٹر معین] ڈاکٹر معین نے "راہ نمائی جغرافیائی ایران" کا حوالہ دیا ہے۔ باغ و بہار میں کہیں تو فارس ایک علاحدہ سلطنت اور ملک کے مفہوم میں آیا ہے اور کہیں اس سے ملکِ ایران مراد ہے۔ [دیکھیے ضمیمۂ تلفظ و املا میں "فارس"]۔

فالودہ (۷۷) : پکا ہوا اور جما ہوا نشاستہ، جس کے تنکوں کو باریک، باریک چاول کی شکل میں یا سِویّوں کی شکل میں کتر لیا جاتا ہے، دودھ اور شکر ملا کر اور برف ڈال کر یا شربت کے ساتھ گرمی کے موسم میں پیتے ہیں۔

فانوسِ خیال (۵۶) : ایک طرح کا کاغذ کا بنا ہوا فانوس، جس میں ہاتھی گھوڑے وغیرہ کاغذ کے بنا کر اس طرح رکھ دیتے تھے کہ وہ ہوا سے خود بہ خود گردش کرتے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔

فانوسیں (۵۶) : فانوس کی جمع۔ "فانوس" ایک طرح کی بڑی قندیل کو بھی کہتے ہیں اور یہاں یہی معنی مراد ہیں۔

فانوسیں (۳۶) : فانوس کی جمع۔ فانوس: شمع کی چمنی، جو اپنے اندر کی روشنی باہر ظاہر کرتی ہے (نور)۔

فبہا (۲۴۷) : تو بہتر ہے، ٹھیک ہے۔

فحوائے کلام (۵۴) : اندازِ گفتگو۔

فرّاش (۲۱) : فرش بچھانے والا۔ وہ ملازم جس کے سپرد فرش فروش اور روشنی وغیرہ کی خدمت ہوتی تھی۔

فرّاشی سلام (۱۰۰) : وہ سلام جس کے لیے فرش تک سر جھکایا جائے؛ مراد ہوتی ہے بہت ادب اور تعظیم کے ساتھ سلام کرنے سے۔

فرد (۲۰۰) : حساب کا کاغذ۔ وہ کاغذ جس پر سامان کی فہرست (وغیرہ) لکھی ہوئی ہو۔

فردوسی (۲) : ایران کا مشہور ترین شاعر، جس کی تصنیف شاہ نامہ، فارسی ادبیات میں اعلا ترین مرتبہ رکھتی ہے۔ "تاریخِ وفاتِ او را سال ۴۱۱، یا ۴۱۶ نوشتہ اند۔ مدفنِ فردوسی در طوس است" (ڈاکٹر معین، حاشیۂ برہانِ قاطع، جلد سوم، تحت فردوسی)

فرسخ (۱۵۴) : تین میل کا فاصلہ۔

فرنگ : یہ لفظ اس کتاب میں کئی جگہ آیا ہے اور بہ ظاہر یہی خیال ہوتا ہے یہ انگلستان کے لیے آیا ہے۔

فقر (۷۴) : درویشی، فقیری۔

فہمیدہ (۹۴) : سمجھ دار۔

فی الجملہ (۱۹۷) : کسی قدر، بہ ہر حال۔

فی الواقع : حقیقت میں، واقعی۔

قاری (۲۴۹) : پڑھنے والا۔
قاصِر نہیں (۲۲۴) : کمی کرنے والا نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ آپ نے جو کچھ فرمایا ہے، میں اُس کام کو انجام دینے سے معذور نہیں، ضرور انجام دوں گا۔
قاصِر ہوں (۱۴۹) : مجبور ہوں (یعنی حاضر نہیں ہو سکتا)۔
قافلہ باشی (۱۵۴) : قافلے کی سرداری۔ قافلے کا سردار۔
قالیچہ (۱۲۲، ۱۲۳) : چھوٹا قالین، غالیچہ۔
قباحت (۵۴) : بُرائی، خرابی۔
قبالہ (۵۵) : مکان، جاگیر وغیرہ کا وہ کاغذ جس سے ملکیت ثابت ہو، مکان کا بیع نامہ۔
قبلہ گاہ : والد۔
قبولی (۷۷) : چنے کی دال اور چاول ملا کر پکائی ہوئی بھُنی ہوئی کھچڑی۔ عام طور پر ایک حصّہ دال اور دو حصّے چاول ملا کر اور گھی میں بھون کر پکاتے ہیں۔ میں نے میٹھی قبولی بھی کھائی ہے، یعنی شکر کے قوام میں پکی ہوئی، جس کا پکانا بہت مشکل سمجھا جاتا تھا، کہ چنے کی دال اینٹھنے نہ پائے۔
قبیلہ (۲۷، ۱۲۰، ۱۵۳، ۱۵۹، ۱۷۸، ۱۸۵) : بیوی۔
قحبہ (۶۲) : بدکار عورت۔
قدم بوس کیا : آداب بجا لایا۔
قدموں پر گرنے لگیں (۴۹) : میرے پیروں پر اپنا سر رکھنے لگیں، یعنی عاجزی اور خوشامد کرنے لگیں۔
قدم رنجہ فرمانا (۷۷) : کسی کے گھر تک جانے کی تکلیف اُٹھانا۔ [قدم رنجہ فرماؤ : تشریف لائیے، میرے گھر تک چلنے کی تکلیف گوارا فرمائیے]۔
قَراوُل (۱۳۱، ۱۳۲) : بندوق سے شکار کھیلنے والا سپاہی۔
قُربان (۱۹۵) : وہ تسمہ جس میں ترکش بندھا ہوا پیٹھ پر لٹکتا رہتا تھا، اُس میں کمان رکھنے کا خانہ بنا ہوتا تھا۔
قِصاص (۱۳۴) : بدلا۔ (قتل یا ایسے ہی کسی گناہ کا عوض)۔
قصرِ نعمان (۹۴) : حیرہ کے عرب بادشاہ نعمان بن منذر کا بنوایا ہوا مشہور محل، جس کا نام "خورنق" تھا، اور جسے اُس نے ایرانی شہزادے بہرام گور کے لیے بنوایا تھا (غیاث اللغات)۔
قُصور (۱۷۷) : یہ لفظ کمی اور غلطی جیسے مفاہیم میں آتا ہے، یہاں بھی اصل نسبت "کمی" کی ہے، یعنی حرم زدگی کی کمی نہیں؛ مگر آج کل کے روزمرّہ کے لحاظ سے یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ در اصل شک کا مفہوم یہاں ہے، یعنی اُن کی حرم زدگی میں ذرا بھی شک نہیں۔
قضا کار (۱۳۲) : اتفاقاً۔
قضائے الٰہی (۲۱) : خدا کا حکم۔
قطع کرنا (۷۵، ۲۲۸) : بیونتنا، تراشنا (کپڑے کو)۔ [سخاوت کا جامہ اُس عورت پر قطع کیا ہے : سخاوت کا لباس اُسی کے لیے بنایا ہے، یعنی خدا نے سخاوت کو اُسی کے لیے بنایا ہے، اُسے ہی سخی بنایا ہے]

قطعہ: ٹکڑا۔ [قطعہ بہار کا نظر آیا (۱۹۴) : زمین کا ایک ایسا ٹکڑا (میدان) نظر آیا جہاں بہار چھائی ہوئی تھی]۔

قلب مکان ہے (۲۴۷) : ایسی کڈھب جگہ ہے جہاں پہنچنا بہت مشکل ہے۔ [قلب : پہاڑ کی پیچ در پیچ راہ، کڈھب راستہ، دشوار گزار گھاٹی (آصفیہ)]۔

قلزم (۲۴۶) : [دریائے قلزم] بحرِ احمر، جسے انگریزی میں RED SEA کہتے ہیں۔

قلماقنیاں (۶۲، ۸۶) : قلماقنی کی جمع۔ وہ ترک عورتیں جو پانچوں ہتھیاروں سے مسلح، شاہی محلوں میں سپاہیوں کی طرح پہرا چوکی دیتی تھیں۔

قلمرو (۱۱۶) : حکومت، سلطنت۔ [تمام قلمرو میں: پورے ملک میں]۔

قولنج : وہ درد جو پسلی کے نیچے ہوتا ہے، یہ بہت تکلیف دہ اور مہلک درد ہوتا ہے۔

قلیان : حقہ۔

قلیہ (۲۳، ۷۷) : دیکھیے ضمیمۂ تشریحات ص ۳۱۲، ج ۹۔

قمچی (۱۳۸) : پتلی چھڑی، جو جھک جاتی ہے، لچک جاتی ہے۔

قمقمہ (۵۶) : ایک طرح کی چھوٹی قندیل۔ ایک قسم کا شیشے کا گولا، جو مختلف رنگوں کا ہوتا ہے اور جسے چھت میں لٹکاتے ہیں۔

قند (۱۵۱) : شکر، گاڑھا شیرہ پکا کر جمائی ہوئی کھانڈ۔

قوت (۲۰۹) : خوراک، غذا۔

قورچی (۱۳۳) : اسلحہ خانے کا محافظ سپاہی۔

قورما پلاؤ (۷۷) : یہ یخنی پلاؤ کے برعکس مسالے دار پکایا جاتا ہے۔ اس میں تودے کے مسالے کا بھنا ہوا گوشت ڈالا جاتا ہے۔

قہر درویش برجان درویش (۳۰) : غریب کا غصہ اپنے ہی اوپر نکلتا ہے (یہ کہاوت ہے)۔

قہوہ دان (۱۵۵) : سماوار کی طرح کا ظرف، جس میں قہوہ تیار کر کے رکھا جائے۔

کاٹھ (۲۵) : لکڑی۔

کاٹھ ہو گیا (۴۱) : بالکل بے حس و حرکت ہو کر رہ گیا۔ گم سم ہو گیا۔

کار آزمودہ (۱۰۳) : تجربے کار۔

کار کردہ (۹۴) : کام کیے ہوئے، تجربے کار۔

کارواں سرا (۱۲۱) : قافلوں کے ٹھہرنے کی جگہ، سرائے۔

کاشانی مخمل (۷۸) : کاشان (ایران کے مشہور شہر) کی بنی ہوئی مخمل، جو بہت عمدہ سمجھی جاتی تھی۔ [مخمل : ریشمی روئیں دار کپڑا، جو سوتی بانے پر تیار کیا جاتا ہے اور نوعیت کے لحاظ سے روآں چھوٹا بڑا رکھا جاتا ہے]۔

کافوری شمع (۳۶) : کافور کی بنی ہوئی شمع، جس کی روشنی نہایت صاف ہوتی تھی۔ (نور)۔

کاکا (۲۳۵) : وہ غلام جو گھر میں رہتے رہتے بوڑھا ہو گیا ہو، بوڑھا خانہ زاد غلام۔

کانوں پر ہاتھ رکھنا (۹۴) : صاف صاف انکار کرنا، اپنی ناواقفیت اور لاعلمی ظاہر کرنا۔

کان دھر کر سنو (۱۰۰) : غور سے سنو۔

کاوا دینا (۱۵۰) : گھوڑے کو حلقہ باندھ کر چکّر دینا، کہ اُس کے سُموں کے نشانوں سے دائرہ سا بن جائے۔

کاہلہ ہوا (۲۳۴) : بیمار ہوا۔

کَب (۸۱) : کبت کہنے والا شاعر۔

کِبار (۲۵۰) : (کبیر کی جمع) بڑے آدمی، بزرگ لوگ۔ رسولِ کبار : پیغمبروں میں سب سے برتر، سب سے افضل۔ مراد ہے رسول اللہؐ سے۔

کتخدا کرنا : شادی کرنا۔

کتخدائی : شادی۔

کتنے دن پیچھے (۲۳۵) : کچھ دنوں کے بعد۔

کٹّر : بے رحم، سنگ دل۔

کجاوہ (۲۳۶) : سواروں کے بیٹھنے کے لیے اونٹ کی کمر کے دونوں طرف لٹکی ہوئی ہودے یا ٹوکرے کی وضع کی نشستیں، جن میں ایک دو یا زیادہ سواریاں بیٹھ سکیں۔

کچکول (۹۲) : فقیروں کا کاسہ، (جھولی، تونبی) جس میں بھیک رکھتے ہیں، کشکول۔

کدھو (۶۴، ۶۵) : کبھی ("کبھو" کی بدلی ہوئی شکل)۔

کرچھال (۱۹۵) : چوکڑی (ف)۔ (ہرن کے کلانچیں مارتے ہوئے تیر بھاگنے کو چوکڑی بھرنا کہتے ہیں)۔

کردگار : بنانے والا، مراد ہے خدائے تعالا۔

کُرسی نشین نہ ہوگی (۱۹۱) : صحیح ثابت نہ ہوگی۔

کرم کی ریکھا (۵۹) : قسمت کی لکیر، قسمت کا لکھا۔

کرّوبیاں (۷۰) : فرشتے۔

کُریاں میں گُلیلا لگنا (۱۰۴) : کوئی مقصد حاصل ہونے کو ہو کہ بیچ میں کوئی خلل پیدا ہو جائے۔ رنگ میں بھنگ۔

کُس (۱۸۶) : عورت کی شرمگاہ۔

کَسب : ہنر، فن۔ [سپاہ گری کا کسب (۲۱) : سپاہیوں کے ہنر، جیسے تیر، تلوار، نیزہ چلانا (وغیرہ)۔
جرّاحی کا کسب (۲۷) : جرّاحی کا ہنر۔
کسب کر رہا تھا (۱۵۰) : ہنر دکھا رہا تھا، کمال دکھا رہا تھا]

کس برتے پر تتّا پانی (۴۶) : لفظی معنی : کس بھروسے پر گرم پانی کی فرمائش۔ کس بات پر یہ دعوا ہے، یہ فرمائش ہے۔

کسریٰ : مشہور ایرانی بادشاہ نوشیرواں کا لقب۔

کِشتیاں (۶۰) : کشتی کی جمع۔ کشتی : ایک مستطیل تختہ لکڑی کا، جس کے چاروں طرف چار لکڑیاں شل لگ کے جڑی ہوتی ہیں، تاکہ جو چیز اس میں رکھی جائے، وہ گر نہ پڑے۔ ایسے پیالے چننے

یا پوشاک وغیرہ کے رکھنے کے کام لایا جاتا ہے (نور)
[اسے خوان کی ایک قسم سمجھیے۔ خوان اس سے بڑا
ہوتا تھا اور عموماً گول یا چار پہلو یا شش پہلو
ہوتا تھا۔ انگریزی مرادف اس کا "ٹرے" سمجھا
جا سکتا ہے]۔

کفِ دست میدان (۶۴، ۱۸۰): وہ لق و دق
میدان جس میں دور تک درخت اور آبادی کا
نام نہ ہو۔ [کفِ دست: ہاتھ کی ہتھیلی یعنی ہتھیلی
کی طرح صاف، چٹیل میدان]۔

کفنی (۱۸، ۲۰۰): فقیروں کا ایک خاص طرح کا
ڈھیلا ڈھالا لباس۔ وہ بغیر سِلا کپڑا جسے بیچ سے
پھاڑ کر فقیر لباس کے طور پر گلے میں پہن لیتے ہیں۔

کلاونت (۳۶): خاندانی گویا۔ گانے کا بہت
بڑا استاد، ماہرِ موسیقی۔

کلچھواں (۳۰): سیاہی مائل، سنولایا ہوا۔

کلچہ: گول چھوٹی خمیری روٹی، جسے تنور میں پکایا جاتا ہے۔

کلمہ کلام ہونے لگا (۲۴۳): بات چیت
ہونے لگی۔

کلنک کا ٹیکا (۶۱): بدنامی کا داغ۔

کلہ جبڑا (۲۰۶): یہاں مراد ہے چہرے اور
صورت کی پُر وقار ہیبت ناکی ہے۔
[کلہ: کھوپڑی۔ جبڑا: منہ کے اوپر اور نیچے کا
حصہ۔ کلہ جبڑا: مجموعی طور پر سر اور چہرے کی
ہیئت]۔

کماحقہٗ (۸۵): مکمل طور پر، پوری طرح۔ (لفظی
معنی: جیسا کہ اس کا حق ہے)۔

کمال شوق ہوا (۵۵): بہت شوق ہوا۔

کمک (۲۱۵): فوجی مدد۔

کمند (۱۵۱): باریک رسّی کا بنا ہوا پھندا، رسّی
کی بنی ہوئی سیڑھی (جسے بلند مکانوں پر چڑھنے
کے لیے عموماً چور استعمال کرتے تھے)۔

کناری (۲۲۳): دیکھیے "گوٹا"۔

کنچنیاں: ناچنے گانے والی پیشہ ور عورتیں۔

کنڈلا (۱۲۹): ایک طرح کا خیمہ (ف)۔

کندن (۹۲): سونا۔

کنول (۵۹): کنول کے پھول سے مشابہ شیشے کا
خوب صورت ظرف، جس میں شمع جلاتے تھے۔
[سروکنول کے (۳۲): لکڑی کے ٹکڑوں سے سرو
کی شکل بنا کر اس میں کنول روشن کرنا]۔

کنولا (۳۹): سنترے کی ایک قسم (ف)۔

کنیا (۱۴۹): لڑکی (جس کی شادی نہ ہوئی ہو)۔

کواکب (۶۸): کوکب کی جمع۔ کوکب: ستارہ۔ [ساتوں
کواکب: سات ستارے یعنی: سورج، چاند، زہرہ،
مشتری، مریخ، زحل، عطارد]۔

کوچہ گردی (۹): گلیوں گلیوں پھرنا۔ مراد یہ ہے کہ
دہلی کی گلیوں کو خوب چھاننا ہوگا اور وہاں کے لوگوں
کی باتیں خوب سُنی ہوں گی۔

کوٹ (۱۸۰، ۱۸۸): قلعہ۔

گُوٹ باندھ کر بیٹھنا (۱۹۴) : پلتھی مار کر بیٹھنا (ع)۔

کُور (۲۲۶) : اندھا۔

کُورنشات (۱۹، ۱۳۳) : کورنش کی جمع۔ کورنش : جھک کر سلام کرنا، آداب بجا لانا۔

کُوکا (۲۰۸، ۲۰۹) : دودھ شریک بھائی۔

کُوکُو پلاؤ (۷۷) : وہ پلاؤ جس میں کباب (یا گوشت کے پارچے) اور سالم انڈے (اُبلے ہوئے) یا انڈے سُوتل کر (چلا یعنی آملیٹ بنا کر) اُس کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کاٹ کر ڈالے جاتے ہیں۔ ایرانی کوکو پلاؤ میں آملٹ کے ٹکڑوں کے ساتھ بعض سبزیاں بھی ڈالی جاتی ہیں۔

کَولا (۱۰۹) : دونوں بازوؤں کا حلقہ [کولے میں پکڑ کر : درخت کو اپنے دونوں بازوؤں کے گھیرے میں لے کر]۔

کَوُن (۱۸۹) : مقعد۔

کَونین : دونوں جہان، یعنی دُنیا اور آخرت۔

کُوہستان (۲۴۹) : پہاڑی علاقہ۔

کُوہِ قاف (۱۰۴، ۲۴۷، ۲۴۸) : ایک پہاڑ کا نام ہے، جسے انگریزی میں MOUNT CAUCASUS کہتے ہیں (پلیٹس)۔ یہ پہاڑ ایشیائے کوچک میں، روسی ترکستان اور ایران کے درمیان، روسی علاقے میں ہے۔ یہ علاقہ روس کی ریاست آرمینیا میں ہے، جس کا دارالخلافہ جارجیا ہے اور جو ازبکستان اور تاجکستان کی سرحدوں سے ملا ہوا ہے۔ تیس زین آئی آرمینیا (یا کوہِ قاف کے علاقے) کی رہنے والی تھی۔ یہاں کی عورتیں اپنی خوب صورتی کے لیے مشہور ہیں۔ غالباً اِس پہاڑ کو پریوں کا مسکن بھی اِسی نسبت سے کہا جانے لگا (اِن معلومات کے لیے میں اپنے کرم فرما ڈاکٹر عبدالودود اظہر، استادِ فارسی جواہر لال نہرو یونی ورسٹی، دہلی کا ممنون ہوں)۔ اِس پہاڑ سے بہت سی اساطیری روایتیں بھی وابستہ ہیں۔ اِن روایتوں کو انسائیکلو پیڈیا آف اسلام میں بلفظِ QĀF کے تحت یک جا کر دیا گیا ہے، تفصیل کے لیے اُسے دیکھا جا سکتا ہے۔

کوئی نوالہ (۲۳۴) : ایک دو نوالے، چند نوالے۔

کُھب گئی تھی (۵۰) : دل میں بیٹھ گئی تھی۔

کُھپرا (۱۹۷) : چوڑے پھل کا تیر۔

کھلوریاں (۷۸) : دھنیا، سونف (وغیرہ) بُھنی ہوئی چیزیں، جنھیں مُنہ صاف کرنے کے واسطے کھاتے ہیں (خاص کر کھانا کھانے کے بعد)۔

کھیسا (۲۸) : تھیلی۔

کھیل (۹۲) : بُھنے ہوئے چاول، جوار، مکئی کا دانہ۔ مراد ہوتی ہے بہت کم مقدار سے [کھیل اُڑ کر مُنہ میں نہیں گئی : کچھ بھی نہیں کھایا]۔

کھیلنا (۱۰۷) : ایک طرح کی کشتی (ف)۔

کیا اِمکان ہے (۳) : ممکن نہیں۔ (خُدا کی تعریف پوری طرح بیان نہیں کی جا سکتی)۔

کیتکی (۲۲) : ایک مشہور خوش بو دار پھول اور اُس کے

پودے کا نام، جو کیوڑے کے درخت سے مشابہ ہوتا ہے۔ "ہندی شعرا کا خیال ہے کہ بھونرا اس (پھول) پر عاشق ہے" (نور)۔

کیفی (۲۰۹) : نشے میں ڈوبا ہوا، مخمور۔ [کیفی ہو کر (۳۹، ۶۲) : نشے میں ڈوب کر، مست ہو کر]۔

کیکر (۲۳۹) : ڈیکر، ببول۔

کینچلی سی ڈال دی (۵۰) : صورت بدل گئی تھی (رنگ نکھر آیا تھا)۔

گاڑھی چوکی (۲۰۴) : سخت پہرا۔

گاو دیدہ (۷۷) : گائے کی آنکھ کی طرح گول، باقرخانی، شیرمال یا خمیری روٹی۔

گاو زبان (۷۷) : گائے کی زبان کی شکل کی باقرخانی یا شیرمال۔

گاو سوار (۹۷) : بیل پر سوار۔ ["گاو" گائے اور بیل دونوں کے لیے آتا ہے؛ چوں کہ یہاں بیل کا مذکور ہے، یوں قطعی طور پر اس عبارت میں یہ لفظ بیل کے معنی میں آیا ہے]۔

گاین (۵۴) : گانے والی، مغنیہ۔

گپت رکھی (۱۵۰) : چھپائی۔

گج موتی (۹۰) : بہت بڑا موتی۔

گدھے کا ہل پھروا دینا (۲۴۷) : کسی جگہ کو پوری طرح ویران کرا دینا۔

گذربان (۲۱۱) : راستے کا محافظ، جو ضروری کاغذات دیکھ کر آگے جانے کی اجازت دیتا ہے۔

گذری (۱۲۴) : اس کے اصلی معنی تو ہیں : وہ بازار جو شام کے وقت سڑک کے فٹ پاتھ پر (دونوں طرف یا ایک طرف) لگتا ہے؛ مگر عام بازار کے معنی میں بھی ایک آدھ جگہ مل جاتا ہے، جیسے داغ کا یہ شعر (جو آصفیہ میں منقول ہے) : کیا جہانِ گذراں میں بھی لگی ہے گذری ؛ مول لے جاتے ہیں غم یاں سے گزرنے والے۔ میر امن نے بھی اس عبارت میں اس لفظ کو عام بازار کے معنی میں استعمال کیا ہے : "جب گذری کا وقت ہو چکا" یعنی جب بازار بند ہونے کا وقت آیا۔

گردا (۱۲۹، ۱۴۷) : گول چھوٹی روٹی۔

گرد باد ہو گیا (۲۱۴) : ہر طرف گرد غبار چھا گیا۔ [گرد باد : بگولا، ہوا جس میں گرد غبار ملا ہوا ہو]۔

گرز بردار (۲۲۴) : وہ سپاہی جن کا اصل ہتھیار گرز ہوتا تھا، جسے وہ کندھے پر رکھ کر چلتے تھے۔ [گرز: ایک ہتھیار کا نام، جو اوپر سے گول، موٹا اور نیچے سے پتلا ہوتا ہے (بعض پہلوانوں کی تصویروں میں اب بھی نظر آ جایا کرتا ہے) اسے عموماً سر پر مارا جاتا تھا]۔

گرسنگی (۱۹۰) : بھوک۔ [جب گرسنگی ہوتی ہے ... جب بھوک لگتی ہے]۔

گرگا (۱۳۹) : خدمت گار، کم درجے کا نوکر، مشعلچی، برتن دھونے والا۔

گرمابہ (۴۵) : حمام۔

گریباں گیر ہونا (۵۹) : دعوے دار ہونا۔ یہاں مطلب یہ ہے کہ ایسا نہ ہو کہ کوئی شخص تجھ پر میرے خون کا دعوا کرے، میرے قتل کے الزام میں تجھے پکڑے۔

گڑھ (۲۴۷) : قلعہ۔

گزارے کا اسباب (۶۴) : دریا پار کرنے کا کوئی ذریعہ (کشتی وغیرہ)۔

گزرانیاں (۳۰) : گزرانیں، پیش کیں۔

گزک (۲۱۱) : وہ چیز جسے شراب پینے کے ساتھ (یا اُس کے بعد) تبدیلِ ذائقہ کے لیے کھاتے ہیں، جیسے: کباب، پستہ، بادام، تلی ہوئی دال یا ایسی ہی اور نمکین چیزیں۔

گسائیں : سنیاسی، سنت، ہندو درویشوں کا تعظیمی خطاب (گوسائیں کا مخفف ہے)۔

گفت و شنود کریں (۵) : مراد یہ ہے کہ ہندستانیوں سے باتیں کرسکیں اور اُن کی باتوں کو سمجھ سکیں۔ [گفت : کہنا۔ شنود : سننا۔ گفت و شنود : بات چیت]۔

گلابی (۳۶، ۲۱۱) : چھوٹی رنگین بوتل، بل کہ یوں کہیے کہ بوتل نُما ظرف، جس میں شراب اور گلاب رکھتے تھے، مینا۔ [اِسے شراب کے گلاس کے معنی میں بھی استعمال کیا گیا ہے]۔

گل اندام : کلمۂ صفت ہے، نازک، خوب صورت۔ [گل : گلاب کا پھول۔ اندام : جسم۔ گل اندام : پھول جیسا نازک اور حسین جسم رکھنے والا]۔

گل تکیہ (۸۷) : وہ چھوٹا سا گول تکیہ جس کو سوتے وقت رخساروں کے نیچے رکھتے تھے۔ (گل : گال)۔

گل عذار (۲۳۶) : خوب صورت۔ [گل : گلاب کا پھول۔ عذار : رخسار : جس کے رخسار گلاب کے پھول جیسے ہوں۔ کلمۂ صفت کے طور پر آتا ہے]۔

گلیارا (۳۵) : گلی، کوچہ۔

گماشتہ (۲۰، ۲۱، ۱۲۴، ۱۲۸، ۱۶۴) : کارندہ، ایجنٹ۔ وہ ملازم جس کے سپرد لین دین اور تجارت سے متعلق کوئی خاص کام کردیا گیا ہو، مختار، نائب۔

گمت (۲۰) : ٹولی، سنگت۔ (ایک گمت رہیں : ایک ساتھ رہیں۔)۔

گنجفہ (۱۹۴) : ایک کھیل کا نام، جو تاش کی طرح کھیلا جاتا تھا۔ اِس میں ۹۶ پتّے اور آٹھ رنگ ہوتے تھے اور تین کھلاڑی کھیلتے تھے۔ اِس کا پتّا گول اوسط درجے میں انگریزی روپے کے برابر ہوتا تھا۔ (مزید تفصیل کے لیے دیکھیے اصطلاحات)۔

گوٹا کناری (۲۳۴) : چاندی سونے کے تاروں کی لیس، جو ریشم کے بانے سے بُنی جاتی ہے۔ (نور)۔ ["گوٹا" عام لفظ ہے، جو آدھ اِنچ سے ایک بالشت بل کہ اُس سے بھی زیادہ چوڑا بنایا جاتا تھا۔ منقش گوٹے کو (یعنی جس گوٹے پر موٹی سوئی یا ایسی ہی کسی نکیلی چیز سے دبا دبا کر نقش بنالیے گئے ہوں) "ٹھپّا" کہا جاتا تھا، اور اِسی کا دوسرا نام "کناری"

تھا۔ "کناری" یا پیچھے انگلی جوڑا گوٹا ہوتا تھا۔ گوٹے یعنی زری کی گوٹ اور کناری کو اصطلاحاً "گوٹا کناری" کہا جانے لگا (اصطلاحات)]۔

گور : قبر۔

گورستان : قبرستان۔

گوش پیچ (۸۰) : ایک طرح کا آرائشی زیور جو پگڑی میں (غالباً دونوں طرف کانوں کے محاذی) لگا ہوتا تھا (ت)۔

گوشمالی (۷) : سزا۔ گوشمالی دی : مراد ہے شکست دی۔

گوکھرو (۴۱) : تکھنٹا مُڑا ہوا گوٹا۔ عورتیں مقیش، دھنک یا گوٹے سے گوکھرو کے مانند بنا کر، اُس میں انگلیوں سے شکنیں اور پیچ ڈال کر، لباس کی زیبائش کے واسطے گرد اگرد لگاتی ہیں۔

گولی (۲۲۱، ۲۲۲) : مٹکا۔

گویائی (۸) : بات چیت، بول چال۔

گھاٹ باٹ (۶۵) : مراد ہے ایسی جگہ جہاں سے دریا کو پار کیا جا سکے۔ [گھاٹ کے ایک معنی ہیں : دریا خواہ ندی سے اُترنے کا وہ مقام جہاں پانی کم ہوتا ہے، پایاب۔ باٹ : راستہ]

گھر سیتا ہے (۲۴) : گھر میں پڑا رہتا ہے۔

گھر گھالنا (۲۰۷) : کسی کا گھر تباہ کر دینا۔ [کس کس کا گھر گھالا : کس کس کا گھر تباہ کیا]۔

گھر میں رہے نہ تیرتھ گئے، مونڈ منڈا فضیحت بھئے (۱۹۴) : ساری محنت اکارت گئی (نجم الامثال)۔

گھمنڈنا (۵۵) : بادل چھانا، بادلوں کا اُمنڈنا۔

گہوارہ (۲۴۲) : پالنا، بچوں کے سُلانے کا جھولا۔

گیدی (۱۷۱) : بے غیرت، بے حیا۔

گیروا بستر (۶۹) : گیروے رنگ کے کپڑے، جو بعض فقیر اور اکثر سادھو سنیاسی پہنا کرتے ہیں۔ [بستر : لباس]۔

لاحق : لفظی معنی : پیچھے سے آنے والا، پہنچنے والا۔ [فکر لاحق ہوئی (۱۳) : فکر لگ گئی۔ لاحق ہو (۱۷) : لگی ہوئی ہو، یعنی ایسی فکر اور ایسا غم لگا ہوا ہو]۔

لاشریک (۱۵۱) : جس کا کوئی شریک نہیں۔

لال کر دیے (۹۴) : خون سے سرخ کر دیے، خون میں ڈبو دیے۔

لبالب (۵۵) : کناروں تک بھری ہوئیں۔

لبِ فرش (۱۹۴) : فرش کا کنارہ، جہاں سے فرش شروع ہوتا ہے۔

لَپ (۹۳) : دونوں ہاتھوں کو باہم ملا کر جو ایک پیالہ سا بن جاتا ہے، اُسے کہتے ہیں۔

لُترا (۱۲۰) : چغل خور، اِدھر کی اُدھر لگانے والا۔

لچکا (۱۰۷) : سیر و تفریح کی کشتی، بجرا۔

لحاظ میں رکھنا ہوگا (۹) : مطلب یہ ہے کہ اِس کا خیال رکھنا ہوگا کہ طرح طرح کے لوگوں سے بات چیت کرنے کے باوجود اپنی زبان پر اُن کا اثر نہ پڑنے پائے۔

لخلخہ (۲۹) : کئی خوشبوؤں کا مجموعہ، جسے دماغ

کی تقویت کے لیے) سونگھتے ہیں۔ وہ ٹکڑی جو عنبر، مُشک، عودِ قِماری، کافور وغیرہ کو ملا کر بنائی جاتی ہے اور دماغ پر رکھتے ہیں یا سونگھاتے ہیں۔ عوام قُمقُمے یا قندیل کو بھی کہتے ہیں (آصفیہ)۔ اِس مقام پر غالباً مراد یہ ہے کہ لوبان کی طرح خلخلے کی لگری کو بھی جلایا جا رہا تھا۔

لُقمان (۹۲): ایک مشہور حکیم کا نام، جن کے بہت سے حکیمانہ قول اور نصیحت آمیز باتیں مشہور ہیں۔ اُن کا ذکر قرآنِ پاک میں بھی آیا ہے۔ مراد ہوتی ہے بہت بڑا دانا، عقل مند، تجربے کار۔

لَنبوٹ (۱۹۴): لمبی کشتی (ع)۔

لَن ترانی تراالا (۷۱): ڈینگ مارنے والا، بڑے بڑے دعوے کرنے والا۔

لنگری (۱۲۵): لگن، وہ اتھلی تھالی جس میں لنگر کا کھانا بانٹتے ہیں۔

لَوازمہ: کسی چیز سے متعلق ضروری سامان۔

لوازمِ شاہانہ سے تیار رہے (۷۷): بادشاہی محلوں جیسا ساز و سامان موجود ہے۔

لوتھ (۱۸۸، ۲۰۴): لاش۔

لَوزِیات (۲۴، ۷۸): (لَوز کی جمع۔ لَوز: بادام) بادام سے بنی ہوئی مٹھائی۔ عام طور پر اسے "لوزات" کہتے ہیں۔ دودھ میں سفید قند کا قوام پکا کر، جب اُس قوام کو پتلا جما کر ٹکیے چوپہل ٹکڑوں کی شکل میں کاٹ لیتے ہیں، اُسے "لوزات" کہتے ہیں۔ برفی یا لوزات کو پُرتکلف بنانے کے لیے گھوٹے میں قوام پکایا جاتا ہے اور اُس میں خشک میوہ مثلاً بادام یا پستہ پیس کر ملایا جاتا ہے، تو اُس میوے کی نسبت سے اُس برفی کو موسوم کرتے ہیں، جیسے: بادام کی برفی۔ (اصطلاحات)

لہر (۴۱): گوٹے یا کچکے وغیرہ کی لہردار ٹنکائی۔ عورتیں عموماً دوپٹے، رضائی پر ٹانکتی ہیں۔ (آصفیہ)

لے اُبھرا (۲۵): لے گیا، لے بھاگا۔

لَیل و نَہار (۲۴۹): رات دن۔ [لَیل: رات۔ نَہار: دن۔ مراد ہے ساری زندگی]۔

ماتم سرا (۱۱۹): وہ گھر جہاں کسی کا ماتم کیا جائے۔

ماجائی (۲۳): بہن۔

ماخوذ نہ ہوئیں گے (۱۱۹): نہیں پکڑے جائیں گے۔

مانجھ دھار میں (۱۴۱): دریا کے بیچ میں۔ (مانجھ دھار = منجدھار)۔

ماندگی: تھکن۔

ماندی: طبیعت ماندی ہوئی (۵): بیمار ہوئے۔

مانس (۱۵۱، ۱۷۱): شخص، آدمی۔

مان مَہَت (۱۶۴): عزت، احترام۔

ماہیت (۸۸): حقیقت۔

مَبادا: ایسا نہ ہو۔

مُباف (۹۳): ["مُوباف" کا مخفف] خاص طرح کی بنی ہوئی پٹی، یا کپڑے کی دھجی، جسے عورتیں چوٹی میں گوندھتی ہیں۔

مُبلغ (۸۷) : رقم، روپیے۔

مُتبنّیٰ کرنا (۱۹۱) : گود لینا، بیٹا بنانا۔ کسی دوسرے کے بچّے کو پالنا اور اُسے اپنا بیٹا بنانا۔

متعدّد (۱۰۲) : کئی ایک (مکانِ متعدّد : کئی مکان)۔

مُتعرِض (۴۷) : لفظی معنی : روکنے والا، مخالفت کرنے والا۔ کسی بات کے متعرض نہ ہو جو : کسی بات میں دخل نہ دینا۔

مُتعرّض نہ ہو (۲۳۱) : اِن سے مت اُلجھ، اِن کو اِن کے حال پر چھوڑ دے۔ (مُتعرّض : روکنے والا، مزاحم)۔

مُتعہ (۱۸۹) : شیعہ مذہب کے مطابق ایک مقررہ مدّت کے لیے (مہر کے تعیّن اور مدّت کے تعیّن کے ساتھ) نکاح کرنا۔

مُتعیّن : مقرر۔

مُتعیّنہ (۲۴۸) : مقرر کیا گیا۔

مُتکلّم ہوا (۹۸) : بولا (مُتکلّم : بولنے والا)۔

مُتنجن پلاؤ (۷۷) : پُر تکلّف پکائے ہوئے میٹھے چاول، جس میں خشک میوے مثلاً بادام اور پستے کے علاوہ، گوشت بھی بھون کر ڈالا جاتا ہے، جو اُس کو زیادہ سوندھا بنا دیتا ہے۔ (اسے میٹھا پلاؤ بھی کہہ سکتے ہیں)۔

مُتنفّس (۲۲۷) : جان دار، انسان۔

مُتوطّن (۱۸۲) : رہنے والا۔ (وطن سے بنا ہے)۔

مٹّی کی مورتیں (۳) : انسان۔

مِثقال (۱۱۶) : ساڑھے چار ماشے کا وزن (نور)۔

مجذوب (۱۰۵) : وہ درویش جو خدا کی محبت میں اِس طرح غرق ہو کہ دُنیا سے بے خبر ہو۔ سالک کی ضد۔ مجذوب اکثر ایسی باتیں کرتے ہیں جو بہ ظاہر بہکی بہکی اور بے معنی سی معلوم ہوتی ہیں۔

مُجرا شاہانہ (۹۵) : بادشاہوں کو سلام کرنے کے جو آداب مقرر ہیں، اُن کے مطابق۔

مُجرائی (۱۱) : آداب بجا لانے والا، حاضر ہونے والا، مراد ہے اُن امیروں اور منصب داروں سے جو دربار میں حاضر ہوتے ہیں۔

مُجرے گاہ (۱۶) : دربار میں وہ جگہ جہاں مجرا کرنے والے جھک کر بادشاہ کی خدمت میں آداب بجا لاتے تھے، سلام کرتے تھے۔

مُجرے میں حاضر ہوا (۱۸۵) : سلام کرنے کے لیے دربار میں حاضری دی۔

مُجوّز ہونا (۳۸، ۷۸، ۱۲۶) : اصرار کرنا۔

محاورے سے (۹) : مطلب ہے اُسی انداز سے، اُسی ڈھنگ پر۔ [''محاورہ'' ''بول چال'' کے معنی میں بھی آتا ہے اور ''بول چال'' کا مطلب ہے : ''ایک خاص قسم کی ترتیبِ الفاظ جو اہلِ زبان کی زبان پر ہو اور جس کے خلاف بولنا فصاحت کے خلاف ہو'' (نور) میر امّن نے یہاں ''محاورے سے'' جو لکھا ہے، تو اُن کے ہاں اِس مفہوم کی نسبت بھی شامل ہے، یعنی جس طرح لوگ بولتے ہیں، اُسی طرح اِس قصّے کو لکھنا شروع کیا]۔

محبوس (۱۴۵، ۱۴۶) : قیدی۔
محبوس خانہ (۱۱۹) : قید خانہ۔
محرم : واقف، راز دار۔
محرم نہ ہوگا (۲۲۳) : واقف نہ ہوگا، نہیں جان پائے گا۔
محصل (۱۵۳، ۱۷۲) : محصول وصول کرنے والے، تحصیل کے سپاہی، سپاہی۔
محظوظ ہونا : خوش ہونا، لطف اٹھانا۔
محلی : خواجہ سرا (دیکھیے خواجہ سرا)۔
مختار کار : مہتم، سربراہ، انتظامی امور کا ذمے دار۔
مخفی (۴۹) : چھپی ہوئی۔
مخلصی : نجات، رہائی۔ [مخلصی کی صورت نظر نہیں آتی (۲۲۴) : اس کے سوا کوئی اور صورت نجات کی (جان بچانے کی) نظر نہیں آتی]۔
مخمل کاشانی (۲۰۶) : کاشان کی بنی ہوئی مخمل، جو اپنی نفاست اور عمدگی کے لیے مشہور تھی ["کاشان" ایران کا مشہور شہر ہے]۔
مدار المہام (۷۶) : (لفظی معنی: جس پر بڑے کاموں کا دار و مدار ہو) وہ سب سے بڑا سردار جو سلطنت کے کاروبار میں مرکزی حیثیت رکھتا ہو۔
مدد معاش (۲۴۱) : وہ جاگیر جو علما، فضلا اور فقرا کے لیے وقف کر دی جائے۔
مدرسہ (۲) : مراد ہے کلکتے کے فورٹ ولیم کالج سے۔
مدعی ہونا (۷۳) : مخالفت رکھنا، دشمن ہونا۔
مذکور کیا (۹۹) : ذکر کیا، بیان کیا۔
مرد آدمی : مہذب، شریف، جواں مرد، بھلا مانس۔
مرد آدمیت (۷۳) : انسانیت، بہادری۔
مردک (۱۷۲) : حقیر، ذلیل آدمی ("مرد" کی تصغیر)۔
مردمی : انسانیت، آدمیت، مروت، بہادری۔
مرشد اللہ (۲۱۸) : فقیروں کا کلمۂ خطاب۔
مرصع کا تخت (۱۰۳) : جڑاؤ تخت، جس میں جواہرات جڑے ہوئے ہوں۔
مرفّہ (۱۰) : خوش حال۔
مرفہ الحال (۱۷۵) : خوش حال، دولت مند۔
مرکب : گھوڑا۔
مرکب ز سہو و خطا (۲۴۹) : انسان کی فطرت میں بھول چوک اور غلطی کرنا شامل ہے۔
مرگ چھالا (۷۸) : ہرن کی بالوں سمیت کھال [جس پر بیٹھ کر درویش عبادت کرتے ہیں۔ مرگ: ہرن]۔
مروارید (۵۶) : کسی ایسی آتش بازی سے مراد ہے جس میں موتیوں کی طرح چمک دار چھوٹے چھوٹے گول گول پھول نکلتے ہوں۔
مزاحم : روکنے والا۔
مزاحم نہ ہو (۲۳۱) : ان سے کچھ نہ کہو، روک ٹوک نہ کرو۔
مزاحم محصول کا نہ ہو (۱۱۶) : محصول نہ لیا جائے۔
مزید کرو (۷۸) : بڑھاؤ (یعنی دستر خوان بڑھاؤ)۔
مسبب الاسباب (۱۲۴) : سبب پیدا کرنے والا۔

(کاموں کے بننے کے اسباب پیدا کرنے والا؛ مراد ہوتی ہے خدا سے)۔
مسکہ (۱۸۱): مکھن۔
مسیں (۵): مونچھوں کے روئیں جو شروع میں نکلتے ہیں [مسیں بھیگنے لگیں: مونچھوں کا رُواں نکلنے لگا (جوانی کا آغاز ہوا)]۔
مشائخ (۲۴۰): بزرگ، درویش، خدا رسیدہ۔
مشرف (۱۶۴): ناظر، محکمۂ خزانہ کا افسر جو حساب کتاب کا نگران ہوتا ہے (پلیٹس)۔
مشرف: عزت دیا گیا۔ مشرف ہوا (۶۷، ۱۲۷): عزت حاصل کی، یعنی حاضر ہونے کی عزت حاصل کی۔
مشقاب (۷۷): بڑی قاب، وہ طباق نما بڑی پلیٹ، جس میں چاول رکھے جاتے ہیں۔
مشکیں باندھنا (۱۳۸): مجرم کے دونوں بازوؤں کو پشت کی طرف لے جاکر رسّی یا کسی اور چیز سے کمر پر کس کر باندھ دینا (مشکیں: دونوں بازو، دونوں شانے)۔
مشورت (۷۶): مشورہ۔
مصاحبت: ساتھ رہنا، پاس اٹھنا بیٹھنا، ہم نشینی۔
مصمم: مضبوط، پکا۔
مصنوع (۱۶۲): بنایا گیا، مخلوق۔
مضاعف (۱۳۴): دُگنا۔
مضائقہ نہیں (۶۰): شرمندگی یا پشیمانی کی کوئی بات نہیں، کچھ ہرج نہیں۔

مطالعہ کی (۱۷): پڑھی۔
مطلع صاف ہوا (۲۱۵): میدان صاف ہو گیا، فوج سب بھاگ گئی۔
معبود اللہ (۶۳): فقیروں کا ایک کلمۂ خطاب۔
معتمد (۱۲): جس پر بھروسا کیا جائے۔
معلم (۱۰۵): اتالیق، اُستاد۔
معلم (۱۶۹): جہاز کا ناخدا، ملاح۔
معمور (۱۰، ۹۳): بھرا ہوا۔
مغرق (۴۱، ۸۰): جگمگاتا ہوا، سونے چاندی میں لپا ہوا۔ [مغرق مسند: ایسی مسند جس میں سونے یا چاندی کے تاروں کی کثرت ہو اور وہ جگمگا رہی ہو]۔
مغزی (۲۳): "ایک قسم کا نہایت سفید حلوا، جس میں پستے، بادام کے مغز ڈال کر قرص بناتے ہیں" (نور)۔
مغفور (۲۲۱): (لفظی معنی: بخشا گیا) جو شخص مر گیا ہو، اُس کے نام کے ساتھ یا اُس کے لیے بطور کلمۂ احترام آتا ہے، مرحوم۔
مقابل (۴): برابر کا، حریف۔
مقام کریں (۱۵۵): قیام کریں، رُک جائیں۔
مقام ہے (۱۵۵): قافلہ سفر نہیں کرے گا، قیام کرے گا۔
مقتضا (۲۱۳): تقاضا۔ [مقتضا عقل کا یہ ہے: عقل کا تقاضا یہ ہے]۔
مقدور (۱۰۱): طاقت۔ [بہ مقدور اپنے: اپنے

امکان بھر؛ اپنی طاقت بھر]۔

مقدور (۵۴) : حیثیت۔ [اِس مقدور کو پہنچا : یہ حیثیت حاصل ہوئی]۔

مُقرّب (۱۲) : وہ شخص جو بہت قریب ہو، مصاحب، ہمراز۔

مُقرّر : ضرور، یقیناً۔

مُقطّع (۱۰۸) : بہت سلیقے کے ساتھ سجا ہوا۔

مُقلّبُ القلوب (۴۵) : دِلوں کو پھیر دینے والا، خدا۔

مُقیش (۱۱) : چاندی یا سونے کے چوڑے تار۔ سونے چاندی کے تاروں کا بنا ہوا کپڑا۔

مُقیشی (۷۸) : سونے چاندی کے تاروں کا بنا ہوا کپڑا، زری۔

مکان (۱۵۴، ۱۵۵، ۱۹۴) : جگہ۔

مُکلّف (۲۹، ۳۶) : شان دار، آراستہ، پُرتکلف۔

ملازمت حاصل کرنا (۱۰۶) : بادشاہ (یا کسی امیر) کی خدمت میں حاضر ہونا۔

ملازمت حاصل ہوئی (۲۳۹) : خدمت میں حاضر ہونے کا موقع ملا۔

ملازمت کے اشتیاق نے (۱۳۰) : خدمت میں حاضر ہونے کے شوق نے۔

مَلاگیر (۱۰۷) : اعلا درجے کا صندل۔

ملغوبہ (۷۷) : اِس کے اصلی معنی ہیں : اچار بنانے کے لائق چیزوں کا کچل کر اور مسل کر تازہ بہ تازہ اور جھٹ پٹ تیار کیا ہوا اچار، جو اُسی وقت کھانے کے لائق ہو جائے (اصطلاحات)۔ مگر میر امّن اِس لفظ کو مختلف کھانوں کے ساتھ اِس طرح لائے ہیں کہ واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ اِس سے کوئی کھانا مراد ہے اور یوں یہ خیال ہوتا ہے کہ مختلف چیزوں کو ملا جلا کر پکائی جانے والی یہ کوئی چیز ہوگی (جیسے "دیوانی ہانڈی" ہوتی ہے)۔

مَلِکُ التّجّار (۲۰، ۱۹۲) : تاجروں کا بادشاہ، یعنی سب سے بڑا سوداگر۔ [مَلِک : بادشاہ۔ تجّار : تاجر کی جمع]۔

مَلَکُ الموت (۱۶۹) : موت کا فرشتہ [مَلَک : فرشتہ]۔

ملک گیری (۶۰، ۶۱) : ملک کا انتظام، دیکھ بھال۔

مَلول (۵۴، ۲۱۴) : اُداس، شکستہ، غم زدہ۔

مملکت : سلطنت، بادشاہت۔

مِنبر (۱۴۶) : یہاں مراد ہے لکڑی (یا لوہے) سے بنی ہوئی اُس چیز سے جو زینے دار ہوتی ہے اور جس پر دکان دار اپنی چیزیں رکھتے اور سجاتے ہیں۔

منّت اُٹھانا (۱۴۱) : احسان اُٹھانا۔

منّت دار (۲۳۰) : احسان مند۔

منّت دار ہوئے (۱۸۵) : احسان مند ہوئے، احسان ماننے لگے۔

مُنڈا تخت (۹۵) : کھلا ہوا تخت (جس پر چھتر نہ ہو، جو شاہی تخت پر عام طور پر ہوا کرتا تھا) پالکی کی طرح کا کھلا ہوا تخت۔

منڈل (۱۶۲) : گھیرا؛ یہاں مراد ہے سمندر کی اُس

عمارت ہے جہاں وہ بُت یا بُن موجود تھی۔

مَنڈھپ (۱۰۶): چھوٹا گول مندر یا مٹھ۔
["منڈپ" (یا منڈھپ) دراصل اُس جگہ کو کہتے ہیں جہاں ہَوَن کیا جاتا ہے، یا ایسی ہی کوئی اور مذہبی تقریب ہوتی ہے۔ یوں منڈپ ہر اُس جگہ کو کہا جاتا ہے جس کی عمارت اِس طرح بنائی گئی ہو، یا اُسے عارضی طور پر چھایا گیا ہو، سایہ دار بنایا گیا ہو، کہ وہاں ایسی کوئی تقریب ہو سکے۔ اِس کتاب میں یہ لفظ بالعموم مندر کے مفہوم میں آیا ہے]۔

منسوب کیا (۲۴۸): شادی کی۔

منصب: وہ مرتبہ یا عہدہ جو بادشاہ کی طرف سے خاص خاص افراد، ملازمین یا اُمرا کو عطا کیا جاتا تھا۔

منصب دارِ قدیمی (۶): میر امّن نے یہاں بظاہر اِس مرکب کو اِس معنی میں لکھا ہے کہ ایسا منصب دار جس کا عہدہ اُس کے بعد بھی اُس کی اولاد میں برقرار رہے۔

مُنکر پاک ہوئے (۲۴۶): صاف انکار کرنے لگے۔

منگل کوٹی (۸۷): ایک طرح کا قالین، جو منگل کوٹ میں بنایا جاتا تھا (پلیٹس، ع)۔

مُنہ میں کے دانت ہیں (۱۰): مطلب یہ ہے کہ ذرا بھی روک ٹوک نہیں تھی۔ کوئی شخص کتنا ہی مال دار ہو اور کتنی ہی دولت اُس کے پاس ہو، اُس سے کوئی بھی کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔

مُوا (۱۱۱): مر گیا۔ موا جاتا ہے (۲۴۴): مرا جاتا ہے۔

مُور پنکھی (۱۰۷): ایک طرح کی توپ صورت کشتی، جو مور کی شکل کی بنی ہوئی ہوتی ہے۔

مولا مشکل کشا (۹۷): حضرت علیؓ کا لقب ہے۔

مونگے کے درخت (۱۴۱): موتی کی طرح مونگا بھی سمندر سے نکالا جاتا ہے۔ یہ ایک بے برگ شاخ در شاخ درخت کی طرح مغربی سمندروں میں ہوتا ہے، جس کو ایک کیڑا دیمک کی طرح سمندر کے اندر اپنے پیٹ کے لعاب دار مادّے سے بناتا ہے۔ یہ مادّہ سرخ، سفید، زرد اور سیاہ رنگ کا بنسلوچن یا رومی مصطگی کے مادّے سے ملتا جلتا ہوتا ہے۔ سرخ رنگ مونگا بہت پسند کیا جاتا ہے۔ اُس کے دانے بنا کر ہار اور کنٹھے بناتے ہیں۔ نگ بھی بنائے جاتے ہیں۔ (اصطلاحات)۔

موئی مٹی کی نشانی (۲۴): مرے ہوئے آدمی کی نشانی۔

مہادیو (۱۰۶): شو جی کا ایک نام۔

مہتر (۱۴۶): سب سے بڑا (مہ: بڑا۔ تر: کلمۂ تفضیل)۔ (یہاں یہ "حضرت" کے مفہوم میں آیا ہے، یعنی: حضرت سلیمانؑ)۔

مہدِ زرّیں (۲۴۳): سنہرا پالنا۔ [مہد: گہوارہ، پالنا]۔

مُہر (۲۲۷، ۲۳۲): اشرفی۔

مِہر (۶۱): محبت۔

مِہر (۳۰): سورج۔ مہر و مہ: سورج اور چاند۔

مُہیب (۹۹، ۲۳) : ہیبت ناک۔

میاں اللہ (۱۱۴) : فقیروں کا کلمۂ خطاب۔

میِنتا (۲۴۱) : فقیروں کا پیالہ۔

میرِ بحر (۲۱۵) : امیر البحر، بحری فوج کا سالارِ اعلا۔

میر بخشی (۲۱۴، ۲۴۹) : سلطنت کا ایک اعلا عہدے دار۔ فوج کی تنخواہ کی تقسیم بھی اِس سے متعلّق ہوتی تھی۔

میرِ شکار (۱۳۱) : شکاری پرندے اور جانوروں کی دیکھ بھال کرنے والے ملازموں کا افسر۔

مُیرِ عمارت (۷۳) : داروغۂ تعمیرات۔ (وہ شخص جس کے سپرد شاہی عمارتوں سے متعلّق ذمّے داری ہوتی تھی، نئی عمارتیں بنوانا، عمارتوں کی دیکھ بھال)۔

مُیرے تئیں : مجھے۔

مَیمُوں (۲۲۲) : بندر۔

میوڑا (۵۱) : ملازم، چوکیدار؛ (میوات کے علاقے کا رہنے والا۔ میو (میواتی) اپنی بہادری کے لیے مشہور تھے)۔

نام آوری (۶۹) : شہرت۔

ناحق شناسی (۴۴) : بے انصافی، ظلم، بے وفائی۔

ناخُدا (۲) : کشتی چلانے والا، ملّاح، جہاز کا معلّم۔ [اصلاً "ناو خدا" تھا، مخفّف ہوکر "ناخدا" رہ گیا (غیاث اللغات)]۔

ناخن لیے (۱۵۱) : ناخن تراشے۔

ناشُدنی (۲۳۲، ۶۱) : کم بخت، بدنصیب، نالائق۔

نافرمان (۱۵۵) : اودے رنگ کا ایک پھول۔ اِسے لالے کی ایک قسم کہا گیا ہے۔

نافرمانی (۵۶) : اودے رنگ کا، سرخی مائل نیلے رنگ کا۔

نافِ شہر (۵۴) : شہر کے بیچوں بیچ۔

ناکتخدا : جس کی شادی نہ ہوئی ہو۔

ناگند (۱۴۷) : گھوڑے کا دو سال سے کم عمر بچہ جس کے دودھ کے دانت نہ ٹوٹے ہوں۔ [گھوڑا ہر دوسرے سال دودھ کے دو دانت توڑتا ہے اور اُن کی جگہ دو بڑے دانت نکلتے ہیں، اُسی سے اُس کی عمر کا اندازہ کیا جاتا ہے (اصطلاحات)]۔

ناگاہ : اچانک۔

نانِ نعمت (۷۷) : اعلا درجے کی روٹی کی کوئی قسم ہے، جس کی تفصیل مجھے معلوم نہیں ہوسکی۔ نور میں اِس لفظ کے ذیل میں یہ شعر مندرج ہے : ہمیں داغِ جگر ہے نانِ نعمت ؛ کریں منعم تکلّف کی غذا نوش اور اِس کے معنی لکھے ہیں : "کنایۃً : بڑھیا لذیذ نعمت"۔

ناوَک (۱۹۷) : تیر۔

نِپَٹ : بہت۔

نجس العین (۱۲۵) : جو کبھی پاک نہ ہوسکے : وہ چیز جس کا ہر حصّہ ناپاک ہو۔ چھونا، لگانا سب ناجائز ہو۔

نچھاکر (۱۶۶) : غور کرکے، نظر جما کر۔

نجیبوں (۲) : جمع ہے "نجیب" کی۔ نجیب : شریف (مراد ہے اچھے خاندان والے شریف لوگوں سے)۔

نخرے سے (۵۸) : ناز نخرے سے۔

نِدان (۸، ۵۲) : آخر کار۔

نِڈر دھڑلّے (۴۴، ۲۱۱) : بے دھڑک، بے خوف ہوکر۔
نَرسِنگا (۲۳۱) : ایک طرح کا بجانے کا سِینگ، سِینگ کی طرح کا بنا ہوا بگل، بِگل۔
نَرگاؤ (۱۰۰) : بَیل۔
نَرگِس دان (۲۹۰) : وہ گُل دان جس میں نرگس کے پھول لگائے جائیں۔ (ف)۔
نَرگسی (۷۷) : نرگسی کوفتے اور نرگسی کباب (گولے کے) دیکھے ہیں، نرگسی قورما میں نے نہیں سُنا۔ انڈے کو اُبال کر، قیمے میں لپیٹ کر پکاتے ہیں اور پکانے کے بعد اُس کو بیچ میں سے کاٹ کر رکھا جاتا ہے، جس کی وجہ سے وہ آنکھ کی شکل بن جاتا ہے، اسی نسبت سے اُسے نرگسی کہتے ہیں۔ قورمے میں انڈے پڑتے نہیں تھے، غالباً کوئی ایسا سالن ہوگا جس میں گوشت کے ساتھ انڈے پکائے جاتے ہوں گے اور پھر اُن کو بیچ میں سے کاٹ دیا جاتا ہوگا۔
نَسَقچی (۱۳۳) : چوب دار، وہ سپاہی جن کے ذمے شہر کے انتظام کی دیکھ بھال ہو۔
نَعل بندی (۱۰) : وہ مقررہ رقم جو نذرانے کے طور پر بادشاہ یا شہنشاہ کی خدمت میں پیش کی جائے۔ خراج۔
نَفروں (۱۵۵) : جمع ہے نفر کی۔ نفر: سائیس۔
نُقرائی (۸۰) : چاندی کے۔ (نُقرہ: چاندی)۔
نقشِ دیوار ہو رہے ہیں (۱۸) : حیران اور عجیب چاپ ہیں۔
نقش کالحجر (۱۳۰) : پتھر کی لکیر۔
نُکتہ رَس (۸) : باریکیوں کو سمجھ لینے والا، بات کی تہ تک پہنچ جانے والا۔
ناک گھسنی کرنا (۱۴۸) : سجدے کرنا، دعا مانگنا، رونا گڑگڑانا۔
ناک گھسنی کی (۱۴۰) : ناک رگڑی، یعنی شکر کا سجدہ کیا۔
نَکھ سِکھ سے درست (۱۸۵) : پانو سے سر تک ہر طرح سے بے عیب۔ [نکھ: ناخن۔ سِکھ: بِس، سر۔ نکھ سکھ سے: پانو کے ناخن سے سر کی چوٹی تک۔ ایڑی سے چوٹی تک]۔
نکیر، مُنکر (۱۴۵) : وہ دو فرشتے جو دفن کے بعد آکر قبر میں مُردے سے سوالات کرتے ہیں کہ تیرا دین کیا ہے (وغیرہ) [انھیں "نکیرین" بھی کہتے ہیں]۔
نَمدا (۱۰۲) : بغیر بُناوٹ کا اونی کپڑا، جو اون کے روؤں کو جما کر، کاغذ سازی کے طریقے پر بنایا جاتا ہے۔ اُسے "بانات" کہتے ہیں۔ یہ پتلا، موٹا، اَدنا، اعلا، ہر طرح کا ہوتا ہے۔ نمدا: بانات کی وضع پر تیار کیا ہوا موٹا اور گھٹیا قسم کا پارچہ، جو فرش پر بچھانے یا گھوڑوں کے ساز میں لگانے کے کام آتا ہے (بعض اعلا صنعتوں میں چمڑے اور کاغذ کے بجائے استعمال کیا جاتا ہے)۔
نمش (۸۷) : دودھ کا مصنوعی جھاگ، سردی کے

موسم میں دودھ کو تھوڑی سی مصری کے ساتھ خوب گاڑھا پکا کر اور رات میں اُوس میں رکھ کر صبح تڑکے اُچھال کر اس کو بنایا جاتا ہے۔ صبح کے وقت پھیری والے اِس کو بیچتے پھرتے تھے۔ دہلی میں اِس کا عوامی نام "دولت کی چاٹ" تھا۔

نم گیرا : وہ کپڑا جو بہ طور سائبان، اُوس سے محفوظ رہنے کے لیے چھت گیری کی طرح لگا دیتے ہیں۔

نمود ہوا (۲۱۴) : ظاہر ہوا۔

نمود ہوئی (۵۱) : مشہور ہوئی۔

نمود ہوئے (۴۲) : ظاہر ہوئے۔ [نمود ہونا: ظاہر ہونا، مشہور ہونا]۔

ننگ و ناموس (۵۳) : لحاظ اور شرم، عزّت و حرمت۔

ننگیا لینا (۱۵۶) : سب کچھ چھین لینا۔ (سب سامان چھین لینا اور کپڑے تک اُتار لینا۔)

ننگے مادر زاد (۱۸۰) سر سے پیر تک بالکل ننگے (جیسے ماں کے پیٹ سے پیدا ہوتے ہیں)۔

نواڑا (۴۴، ۱۰۷، ۲۱۵) : مور پنکھی کو کہتے ہیں، جو سیر و تفریح کے لیے مور کی شکل کی بنائی گئی کشتی ہوتی ہے۔ (اصطلاحات)۔

نَوچندی جمعرات (۲۰۸، ۲۴۴) : ہر چاند کی پہلی جمعرات۔

نَوخرید (۵۵) : نیا خریدا ہوا۔

نور بافی (۹۵، ۱۶۴) : ایک طرح کا (غالباً سوتی) نہایت نفیس کپڑا (فا)۔

نَورتن (۲۴۲) : نَو طرح کے جواہرات۔

نور کے وقت (۲۳۵) : صبح تڑکے، پَو پھٹتے وقت۔

نَوروز (۹۵) : ایرانی سال کا پہلا دن جو ۲۱ یا ۲۲ مارچ کو واقع ہوتا ہے۔ یہ موسمِ بہار کا آغاز ہوتا ہے۔ ایران میں کئی دن تک جشن منایا جاتا تھا۔ اُس دن آفتاب برجِ حمل میں آتا ہے [اِسی نسبت سے اِس عبارت میں "آپ کی ذات مشابہ آفتاب کے ہے" آیا ہے] "نوروز" کی تفصیل کے لیے دیکھیے برہانِ قاطع مرتبہ ڈاکٹر معین کا طویل حاشیہ۔

نَوشت خواند (۱۱۹) : لکھنا پڑھنا۔

نَوشت خواند (۲۴) : لکھا پڑھی۔

نوشِ جاں فرماویں (۴۹) : پییں۔

نَول (۱۹۳، ۱۹۴) : کرایہ۔

نہار (۱۰۸) : نہار منہ، صبح سے کچھ نہ کھانا۔

نہایت کو : آخر کار۔

نہوڑا (۲۳۰) : جھکا۔

نہوڑایا (۲۰۲) : جھکایا۔

نہوڑ کر (۹۸) : جھک کر۔

نیّرِ اعظم (۹۸) : "نیّرِ اعظم" سورج کو کہتے ہیں اِس بنا پر کہ وہ سب ستاروں میں سب سے زیادہ روشن ہے۔ یہاں مراد یہ ہے کہ وہ درجے میں سب سے بڑھ کر ہے، سب سے برتر ہے۔

نیڑے (۱۵۰) : پاس، نزدیک۔

نیشاپور: ایران کا مشہور شہر۔ فرید الدین عطّار اور عمر خیام کے مقبرے اِسی شہر کے اطراف میں ہیں۔

نیک اندیش (۱۴): بھلائی سوچنے والا۔ ("بداندیش" کا متضاد۔ بداندیش: بُرائی چاہنے والا، دشمن)۔

نیک لگی (۲۳۶): کام یاب ہوئی، ٹھیک طور پر کام بنا، حُسن و خوبی کے ساتھ کام انجام کو پہنچا۔

نیک نہ لگی (۲۲۲): کام نہ آئی، فائدے مند نہ ہوئی۔

نیم روز: برہانِ قاطع میں لکھا ہے کہ نیم روز سیستان کو کہتے ہیں۔ ڈاکٹر معین نے برہانِ قاطع (طبعِ تہران) کے حاشیے میں، اس لفظ کے ذیل لکھا ہے کہ ساسانیوں کے زمانے میں ایران کو چار حصّوں میں تقسیم کیا گیا تھا: علاقۂ خراسان (مشرقی حصّہ) علاقۂ آذربایجان (شمالی حصّہ) خوربران (مغربی حصّہ) اور علاقۂ نیمروچ (نیمروز) جنوبی حصّہ تھا۔ کابل اِسی حصّے میں شامل تھا۔

نیمہ آستین (۱۲۲): مرزئی سے کسی قدر چھوٹی آدھی آستینوں اور چھوٹے یا آدھے دامنوں کی مرزئی، جو انگرکھے کی وضع پر ہوتی تھی۔ (مرزئی میں آستینیں پوری بھی ہوتی ہیں اور آدھی بھی)۔

وَ اِلّا نہ (۷، ۱۱، ۲۲۶، ۲۴۰): ورنہ۔

واللّٰہ اعلم (۲۴۰): خدا جانے۔

وام (۲۹): اُدھار۔

وَرخرچی (۲۲): فضول خرچی، بے تحاشا خرچ کرنا۔

وَرغلانا (۱۱۴): ورغلایا، بہکایا۔

ورغلانا ہے (۱۶۲): ورغلایا ہے، بہکایا ہے۔

وَرَقُ الخیال (۴۹): بھنگ۔ ورق الخیال کا ترجمہ: گھُٹی ہوئی بھنگ، اسے "ٹھنڈائی" بھی کہتے ہیں۔

وَسواس: وہم، ڈر، خوف۔

وُقوف (۴۷): شعور، سمجھ، ہوشیاری۔

وکیلِ مطلق: مختارِ کُل، مدارالمہام، وہ امیر جسے حکومت کے کاموں میں مکمل طور پر اختیارات حاصل ہوں۔

وِلایت (۷): ایران۔

ولی نعمت: آقا، مربّی۔

وونہیں: اُسی وقت، فوراً۔

وُہیں: فوراً، اُسی وقت۔

ہادی (۲۱۷): (لفظی معنی: ہدایت دینے والا)۔ مرشد، پیر۔

ہانکے پکارے (۲۱۴): سب کے سامنے، اعلان کے ساتھ، ڈھنڈورا پیٹتے ہوئے۔

ہبہ نامہ (۱۹۷): وہ کاغذ یا دستاویز جس میں قانونی طور پر کسی چیز کے بخش دینے کا اقرار لکھا جائے۔

ہتھ پھول (۵۶): پھُل جھڑی، یا اُسی کی طرح کی کوئی بھی ایسی آتش بازی جسے ہاتھ میں لے کر چھوڑا جائے۔

ہدایا (۱۹۸): ہدیہ کی جمع۔ تحفے، پیش کش، نذر کرنے کے لیے سامان۔

ہرج مرج (۹۷، ۲۳۷): مصیبتیں، پریشانیاں۔

ہرچہ بادا باد (۹۹، ۲۳۴) : جو ہونا ہے ہو، جو ہو سو ہو۔

ہرگز (۲۳۲) : ذرا بھی، کچھ بھی، قطعاً۔ (ہرگز اطلاع نہیں : کچھ بھی حال معلوم نہیں)۔

ہرنا (۲۵) : (گھوڑے کی) کاٹھی کا اگلا اُبھرا ہوا حصہ، جس میں سوار بعض چیزوں کو لٹکا لیا کرتا ہے۔

ہریسا (۷۷) : ایک طرح کا حلیم، جو گیہوں کے آٹے، گوشت کی یخنی اور دودھ سے پکایا جاتا ہے۔

ہزاری بزاری (۹۷، ۲۴۱) : خاص اور عام لوگ، بڑے چھوٹے، مال دار اور غریب۔

ہفت اِقلیم : اقلیم : ملک۔ پُرانی تقسیم کے مطابق دُنیا کی آبادی کو سات حصّوں میں تقسیم کیا گیا تھا، اِس لحاظ سے "اقلیم" دُنیا کی آبادی کا ساتواں حصّہ ہوا۔ "ہفت اقلیم" سے عموماً ساری دنیا مُراد ہوتی ہے۔ بادشاہِ ہفت اقلیم: ساتوں ولایتوں کا بادشاہ، یعنی پوری دُنیا کا مالک۔

ہفت قلم (۱۰۴) : سات مختلف قسم کے خط، مثلاً: ثُلث، محقّق، توقیع، رقاع، ریحان، نسخ، نستعلیق۔

ہَل بَلا کر (۱۷۶) : گھبرا کر، ہڑبڑا کر۔

ہَم (۲۴۹) : بھی، نیز۔ [ہم نام و ہم تاریخ اِس میں نکلتی ہے : یہ نام بھی ہے اور اِس سے تاریخ بھی نکلتی ہے]۔

ہمیانی (۱۷۸) : رقم (روپے، اشرفی وغیرہ) رکھنے کی وہ پتلی سی تھیلی جسے کمر سے باندھ لیتے تھے۔

ہنوز : اب تک، ابھی تک۔

ہوا بہنا (دیکھیے ص ۶۸۳) ——————

ہواو (۱۲۳، ۲۰۹) : ہمّت، حوصلہ۔ (ہواو نہ پڑا : ہمّت نہیں پڑی)۔

ہَوائی (۵۶) : ایک قسم کی آتش بازی جسے خدنگا یا خدنگا اور اگنی بان یا اگن بان بھی کہتے ہیں۔ اِس کے فتیلے میں آگ لگا کر آسمان کی طرف رخ کر کے چھوڑ دیتے ہیں اور وہ سیدھا یا ترچھا (جیسا بھی ہاتھ کا رُخ ہو) آسمان کی طرف چلا جاتا ہے اور فضا میں پھوٹتا ہے۔

ہیژدہ ہزار (۱۴) : اٹھارہ ہزار۔

ہیکل (۱۷۸) : روپے یا اشرفیوں کا ہار، جسے عورتیں گلے میں پہنتی تھیں۔ گلے میں پہننے کا ایک زیور، جس میں تعویذ کی طرح گھر بنے ہوتے ہیں۔ [ہیکل نورتن کی (۲۴۲) : ایسی ہیکل جس میں نَو جواہرات ہوں]۔

ہیلہ مار کر (۲۱۶) : تیزی کے ساتھ گھوڑا بڑھا کر، یا کُدا کر۔

یاجوج ماجوج (۲۰۴) : کنایتاً مفسد اور متفنّی لوگوں کو کہتے ہیں، یہاں وہ دونوں پیادے (سپاہی) مراد ہیں۔

یتیم (۸۵، ۱۳۱) : غُلام۔

یخنی پلاو (۷۷) : سادہ پلاو، جس میں خوشبو کے لیے معمولی گرم مسالا ڈالا جاتا ہے۔

یَساوَل : چوب دار، نقیب۔ [ص ۱۵ پر یہ عام پہرے دار سپاہی کے مفہوم میں آیا ہے]۔

یکتا (۳۴) : اکیلا، بے مثال۔ (جس کی طرح کوئی نہ ہو)۔

یکّہ (۲۶) : بے مثل، بے نظیر۔

یکّہ (۲۱۵) : اکیلا۔

اضافے :

اِستریوں (۱۷۱) : اِستری کی جمع۔ اِستری : عورت۔
پانی دیوا (۱۱) : لفظی معنی : پانی دینے والا۔ مراد ہے وارث : بیٹا۔
پھرتی بار (۱۰۸) : لوٹتے وقت، واپس ہوتے ہوئے۔
تِریا (۱۷۱) : عورت۔
چھٹے بَنّے (۲۴۲) : چھوٹے بچوں کے ایک قسم کے کھلونے، جن میں چھنّے اور لٹّو پڑے ہوئے ہوتے ہیں [آصفیہ]۔
[اِس کے ایک معنی اور بھی ہیں : وہ چھوٹے چھوٹے گولے اور گولیاں، جو مداری تماشے میں دکھا کر دھوکا دیتے ہیں [آصفیہ] یہ معنی محض احتیاطاً لکھے گئے ہیں، متعلقہ عبارت میں اوّل الذکر معنی ہی مراد ہیں]۔
خاصدان (۲۵) : مراد ہے ناشتے دان کی طرح کے کسی ظرف سے، جس میں کھانا رکھا جا سکے۔ [آج کل اِس سے مراد ہوتا ہے "گلوریوں کے رکھنے کا ظرف"]۔
خمار شکنی (۳۴) : نیند کے زور اور رات کے نشے کے اُتار کی ٹوٹن اور بدمزگی کو دور کرنا۔
[اِس کے لیے صبح کے وقت یا بیدار ہونے کے بعد، شراب کے ایک دو پیالے پی لیے جاتے تھے، تاکہ نشے کے اُتار کا اثر کم ہو جائے]۔

ڈاکا آیا (۱۴۰) : ڈاکو [ڈاکا ڈالنے کے لیے] آئے۔
زار بزار رونا (۱۳) : بہت رونا، روتے رہنا۔
زنبور (تلفظ : زَمبُور۔ ص۱۰۹) : لوہے کا بنا ہوا سنسی کی طرح کا ایک اوزار۔
سرِ غلاف کھینچ کر (۲۳۸) : مراد یہ ہے کہ خنجر [یا اِسی قسم کے کسی چھوٹے ہتھیار] کا دستہ پکڑ کر اُسے غلاف سے باہر نکال لیا۔ [سرِ غلاف : خنجر وغیرہ پر جو خول چڑھا ہوتا ہے، اُس کا شروع کا حصّہ]۔
ہَوا بہنا (۵۵) : ہوا چلنا۔
[ہوا نرم نرم بہتی تھی : ہوا آہستہ آہستہ چل رہی تھی]۔

اِشاریہ

PREFACE.

THIS work has long been admired in the original Persian, under the name of the "*QISSUI CHUHAR DURWESH*" or "the tale of the Four Dervises;" it was composed in that beautiful tongue by UMEER KHOOSRO, for the purpose of entertaining his friend and religious instructor, NIZAMOOD DEENI UOLIYA, during a fit of sickness.

*UTA HOO*SUEN KHAN originally translated it, under the name of *Nuo-turzi Mooruss*u; but as a specimen of this language, it was rendered objectionable, by his retaining too much of the phraseology and idiom of the Persian and Arabic.

To obviate this, the present version, from the translation now mentioned, has been executed by MEER UMMUN of *Dihlee*, one of the learned natives attached to the College; and the Hindoostanee Scholar will quickly perceive how happily he has succeeded in attaining a plain and perspicuous stile, at the same time preserving the idiom of the *Rekhtu* in such purity as fully to evince his intimate acquaintance with the language.

The tale itself contains a pleasing description of the manners and customs of *Asia*; and the classical purity in which it now appears, and which gives it in a great degree the air of an original composition, makes it a valuable addition to the works lately published in the popular language of India.

باغ وبہار طبع اوّل میں شامل گل کرسٹ کا پیش لفظ

THIS WORK IS INSCRIBED

AS A TOKEN OF RESPECT

FOR HIS ZEAL AND ABILITY,

IN THE

CULTIVATION OF HINDOOSTANEE LEARNING;

TO

CAPTAIN JAMES MOUAT,

OF THE

CORPS OF ENGINEERS,

ON THE

BENGAL ESTABLISHMENT,

BY HIS SINCERE FRIEND,

JOHN GILCHRIST.

باغ و بہار طبعِ اوّل کے آخری ورق کا اندرونی صفحہ

BAGH O BUHAR.

A TRANSLATION

INTO THE HINDOOSTANEE TONGUE,

OF THE CELEBRATED PERSIAN TALE,

ENTITLED

QISSUI CHUHAR DURWESH.

BY

MEER UMMUN

UNDER THE SUPERINTENDENCE OF

JOHN GILCHRIST.

FOR THE USE OF THE STUDENTS

IN THE

COLLEGE OF FORT WILLIAM.

Calcutta;

PRINTED AT THE HINDOOSTANEE PRESS,

1804.

باغ و بہار طبع اوّل کا آخری صفحہ

کتاب منداول پالکچکوزل ہندی

وزارت و تعلیم کے مدرسے میں بہ مجموعہ واسطے طالبانِ زبانِ ہندی کے حسبِ حکم اور حکم سے مسٹر جان گلکرسٹ صاحب کے جمع کیا گیا

ہے ترجمے اور کتابیں کہ ہندوستانی زبان میں ہوئی ہے انہیں شاعروں عالموں منشیوں کی تالیف

و تصنیف ہیں جو اس سرکار دولت مدار فیض آثار دام اقبالہ کے موافق تفصیل ذیل منوسل و نمک خوار ہیں

یہ کتابیں چھاپی گئیں ان چھاپے خانوں میں بموجب تفصیل

اخلاق ہندی — میر بہادر علی حسینی — ٹیپاگراف

مرثیہ — میر عبداللہ مسکین — ہرکارہ

مرزا کاظم علی جوان وغیرہ

سنگھاسن بتیسی — للوجی لال، مظہر علی خان ولا وغیرہ — اپٹفا

مادھونل — للوجی لال، مرزا کاظم علی جوان — اپٹفا

سکنتلا ناٹک — وغیرہ للوجی لال، مظہر علی خان ولا — کلکتہ گزٹ

بیتال پچیسی — وغیرہ للوجی لال — مرزر

طوطا کہانی — میر حیدر بخش حیدری — ٹیپاگراف

باغ و بہار — میر امن لطف — ہرکارہ

تہذیب الطبر — میر بہادر علی حسینی — کلکتہ گزٹ

باغ اردو — میر شیر علی افسوس — مرزر

ہندی مینول کا پہلا صفحہ

THE

HINDEE MANUAL,

OR

CASKET OF INDIA;

COMPILED FOR THE USE OF THE HINDOOSTANEE STUDENTS,

IN THE

COLLEGE OF FORT WILLIAM,

UNDER THE DIRECTION AND SUPERINTENDENCE

OF

JOHN GILCHRIST;

CONTAINING THE

	By the following learned Hindoostanee Poets, Scholars, and Moonshees, employed under the patronage and protection of the present liberal and patriotic Government:	Respectively printed at the following Offices:
UKHLAQI HINDEE,	Meer Buhadoor Ulee *Hosynee,*	Telegraph.
MURSEEU,	Meer Ubdoollah *Miskeen,*	Hurkaru.
SINGHASUN BUTTEESEE,	Mirza Kazim Ulee *Juwan* and Sree Lulloojee *Lal,*	Ditto.
MADHONUL,	Muzhur Ulee Khan *Wila,* and Sree Lulloojee *Lal,*	Ditto.
SUKOONTULA NATUK,	Mirza Kazim Ulee *Juwan,* and Sree Lulloojee *Lal,*	Cal. Gaz.
BYTAL PUCHEESEE,	Muzhur Ulee Khan *Wila,* and Sree Lulloojee *Lal,*	Mirror.
TOTA KUHANEE,	Meer Hydur Bukhsh *Hydree,*	Telegraph.
BAGH O BUHAR,	Meer Ummun *Looif,*	Hurkaru.
NUSRI BENUZEER,	Meer Buhadoor Ulee *Hosynee,*	Cal. Gaz.
BAGHI OORDOO.	Meer Sher Ulee *Ufsos,*	Mirror.

CALCUTTA:

PRINTED AT THE HINDOOSTANEE PRESS.

1802.

ہندی مینول کا آخری صفحہ

عرضی کی جو مدراس کے مختار کار صاحبوں کے حضور میں دی گئی

صاحبان والا شان نجیبوں کے قدر دانوں کو خدا سلامت رکھے

اس بے وطن نے حکم اشتہار کا سنکر چار درویش کے قصے کو ہزار جتن کر کے اردوے معلّا کی زبان میں باغ و بہار بنایا۔ فضل الٰہی سے سب صاحبوں کے سیر کرنے کے باعث سرسبز ہوا۔ اب امیدوار ہوں کہ اسکا پھل مجھے بھی ملے تو میرا غنچۂ دل بھی مانند گل کے کھلے۔ بقول حکیم فردوسی کے کہ شاہنامے میں کہتا ہے

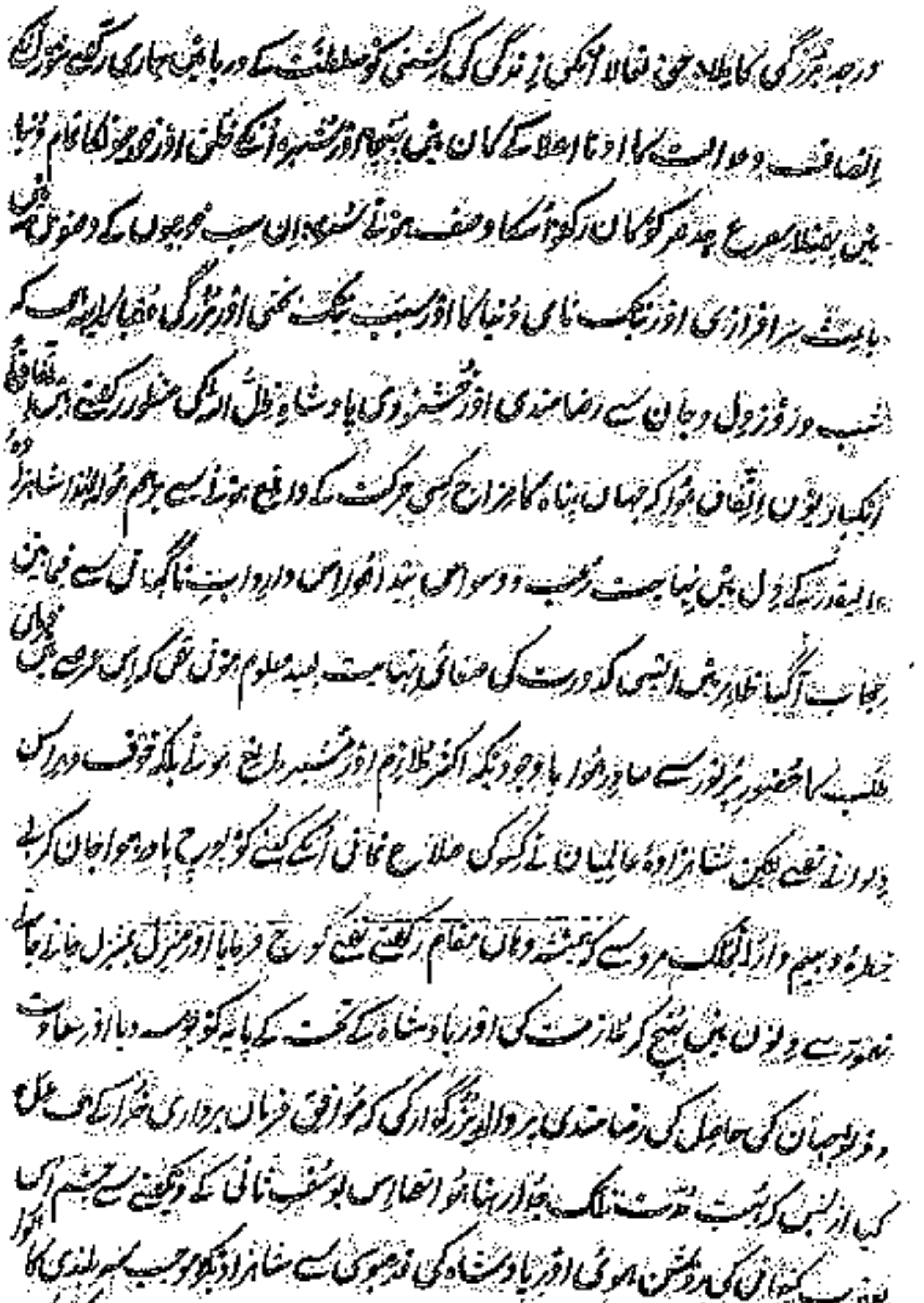
بسے رنج بردم درین سال سی　　عجم زنده کردم بدین پارسی

معز اردو کی آراستہ کر زبان　　کیا میں نے بنگالا ہندوستان

خداوند آپ قدردان ہیں حاجت عرض کرنے کی نہیں۔ الٰہی تارا اقبال کا چمکتا رہے

عرضی میر امن دلی والے کی

باغ و بہار طبع اول میں شامل میر امن کی عرضی



درجہ بزرگی کا ملا، چونکہ تقاضا اُنکی زندگی کی کشتی کو سلطنت کے دریا میں جاری رکھنے [illegible]
انصاف و عدالت کا اور نام اعلا کے کان میں پہنچا اور شہرہ اُنکے خلق اور جود کا تمام دنیا
میں پھیلا مصرع چہ عذر کو کان رکھو اُسکا وصف ہوتا نہیں، ان سب خوبیوں کے حصول میں
باعث سرافرازی اور نیک نامی دنیا کا اور سبب نیک بختی اور بزرگی عقبا کا یہ ہے کہ
شب و روز دل و جان سے رضامندی اور خوشنودی بادشاہ ظل اللہ کی منظور رکھتے ہیں، اتفاقاً
ایک بار یوں اتفاق ہوا کہ جہاں پناہ کا مزاج کسی حرکت کے واقع ہونے سے برہم ہوا الغرض شاہزادہ
والاقدر نے کہ دل میں نہایت رعب و وسواس پیدا ہوا اور اس دار و رابطہ ناگہاں تن سے جدا ہو کر
حجاب آگیا ظاہر میں ایسی کدورت کی صفائی نہایت بعید معلوم ہوتی تھی کہ اس عرصے میں جہان
طلب کا حضور پُرنور سے صادر ہوا باوجودیکہ اکثر ملازم اور مشیر دل رنج ہوئے بلکہ توقف درپیش
دلواتے تھے لیکن شاہزادہ عالیشان نے کسو کی صلاح نہ مانی اُنکے کہنے کو ہیچ پادر ہوا جان کر لیے
جلدی و بیم وار ملک مرو سے کہ ہمیشہ وہاں مقام رکھتے تھے کوچ فرمایا اور منزل بمنزل جاتے جاتے
تھوڑے دنوں میں پہنچ کر ملازمت کی اور بادشاہ کے تخت کے پایہ کو بوسہ دیا اور سعادت
دو جہان کی حاصل کی رضامندی پدر والا قدر بزرگوار کی کہ موافق فرمان برداری تھا آگے سے عمل
کیا اور نسب کی بیت قدرت ملک بحال رہا اور انتظار یوسف ثانی کے دیکھنے سے چشم اُنکا
یعقوب کنعانی کی روشن ہوئی اور بادشاہ کی قدردانی سے شاہزادہ کا موجب سربلندی کا ہوا
سب کچھ لکھا

میر امّن کی تحریر کا عکس
[گنج خوبی کا ایک صفحہ]

۴.۱۱

رشید حسن خاں شاہ جہاں پور میں ایک ایسے خاندان میں پیدا ہوئے جس میں فوجی ملازمت خاندانی روایت بن چکی تھی۔ تعلیمی اسناد کے مطابق اُن کی تاریخ ولادت ۱۰ جنوری ۱۹۳۰ء ہے۔ اُن کے والد امیر حسن خاں کٹر قوم پرست تھے۔ تحریکِ عدم تعاون کے زمانے میں انھوں نے سرکاری ملازمت سے سبک دوشی حاصل کر لی تھی اور اس کے بعد سے سرکاری ملازمت کو مسلمانوں کے لیے ناجائز سمجھتے رہے۔ رشید حسن خاں نے سب سے پہلے درسِ نظامی کی تعلیم مدرسۂ بحر العلوم شاہ جہاں پور میں حاصل کی۔ ۱۹۴۸ء تک وہ فیلڈ ورکر کی حیثیت سے مقامی ٹریڈ یونین سے منسلک رہے۔ ۱۹۵۹ء کے وسط تک اسلامیہ ہائر سکنڈری اسکول شاہ جہاں پور میں اُردو فارسی کے اُستاد کی حیثیت سے کام کرتے رہے اور اس کے بعد سے دہلی یونی ورسٹی کے شعبۂ اُردو سے وابستہ ہیں۔

ادبی تحقیق، لغت، املا، قواعدِ زبان، قواعدِ شاعری، عروض اور تدوین اُن کے پسندیدہ موضوعات ہیں۔ اُن کی کتاب اُردو املا اپنے موضوع پر سب سے مفصل اور بہت وقیع تصنیف ہے۔ تلفظ اور قواعدِ شاعری سے متعلق اُن کی مشہور کتاب زبان اور قواعد ہے، جو دو بار شائع ہو چکی ہے۔ اُن کا ایک تاریخی کام مقدمۂ کلامِ ناسخ ہے، جس میں پہلی بار یہ ثابت کیا گیا ہے کہ ناسخ سے تحریکِ اصلاحِ زبان کا انتساب درست نہیں۔ جن قواعد کو ناسخ سے منسوب کیا گیا ہے، اُن کے وضع کرنے والے دراصل رشک [تلمیذِ ناسخ] تھے۔

اُن کی دوسری تصانیف میں اُردو کیسے لکھیں، تلاش و تعبیر [تنقیدی مضامین کا مجموعہ] اور ادبی تحقیق خاص کر قابلِ ذکر ہیں۔ تحقیق میں وہ قاضی عبدالودود کی روایت کے پیرو ہیں اور تدوین میں مولانا عرشی کو اپنا معنوی اُستاد مانتے ہیں۔ وہ ہمارے زمانے کے سب سے زیادہ حق گو اور بے باک محقق ہیں، جن کے تبصروں نے احتساب کی روایت کو تسلسل بخشا ہے اور زندہ رکھا ہے۔

اُن کو بہت سے اعزازات سے نوازا گیا ہے، جن میں دہلی ساہتیہ کلا پریشد ایوارڈ [۱۹۷۷ء] اور غالب ایوارڈ [۱۹۷۹ء] شامل ہیں۔ وہ انجمن ترقیِ اُردو کی مجلسِ عاملہ، مجلۂ غالب نامہ کی مجلسِ ادارت اور ترقیِ اُردو بورڈ کی املا کمیٹی کے رُکن ہیں۔

ISBN 81-7160-040-9